سب ایک دوسرے
سے پوچھتے ہیں!
"کہیئے مزاج کیسا ہے؟"
یہی وہ الفاظ ہیں جو ملاقات کے وقت سب سے پہلے زبان پر
آتے ہیں۔ مگر کیا سچ مچ اس کا جواب ہمیشہ درست اور حسب دلخواہ
ہوتا ہے؟ صحت کی طرف تھوڑی سی توجہ ہماری بہت سی عام
شکایات کا خاتمہ کر سکتی ہے۔
ماء اللحم کا استعمال خصوصاً اس موسم میں ہماری صحت اور توانائی کی
ضمانت ہے جدید طبی تحقیق کی مدد سے اس کے خواص اور خوبی کو کمال تک پہنچا دیا
گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک بن گیا ہے جو
صحت اور شباب کو قائم رکھتا ہے۔
ماءُ اللحم دو آتشہ
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

فارھنس، خاندان کے لئے ٹوتھ پیسٹ!

مضبوط اور صحتمند
مسوڑوں کے معنی ہیں
چمکدار اور سفید دانت!

فارھنس استعمال کیجئے۔

آپکا دنداں ساز آپکو بتائیگا کہ مسوڑوں کی حفاظت ہی دانتوں کی صحیح حفاظت ہے
مضبوط مسوڑے صحتمند دانتوں کی بنیاد ہیں۔ ہر روز فارہنس سے برش کے ذریعہ
اپنے دانتوں کو صاف کرتے وقت مسوڑوں پر بھی برش ملنے کی عادت ڈالئے۔
فارہنس آپکی سانس میں خوشبو اور مسکراہٹ میں دلکشی پیدا کردے گا۔

بڑے سائز کا ٹیوب۔ قیمت ۲ روپے ۲ آنہ۔ چھوٹے سائز کا ٹیوب۔ ایک روپیہ ۶ آنے ۶ پائی۔

اِس سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے۔

تیارکنندگان

ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ

ویسٹ وھارف۔ کراچی۔

جلد ۱۳

جنوری ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

ڈرامے کی فنی اور ادبی قدریں

وقار عظیم

ادب میں جو چیزیں مختلف وقتوں میں بحث و تمحیص اور اس لئے ادبی اور ذہنی اختلاف کا موضوع رہی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ڈرامے کو ادب کہا جائے یا فن۔ جن لوگوں نے ڈرامے کو ادب کی ایک صنف تسلیم بھی کیا ہے، ان کا انداز عموماً ایک طرح کی معذرت کا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ادبی اوصاف ڈرامے کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ اس کے حسن میں البتہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف سوچنے والوں کا ایک گروہ تو ایسا بھی ہے کہ وہ ڈرامے کے لئے کسی طرح کے ادبی سہارے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور اس لئے اسے ادب کہنے کے بجائے فن کہتا ہے۔

اس بدیہی طور پر دلچسپ اور ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے اہم مسئلے کی صحیح حیثیت کے متعلق کسی ایسے نتیجے تک پہنچنے کے لئے جسے معقول بھی کہا جا سکے اور قابلِ قبول بھی، تجزیے کے مراحل کا طے کرنا ضروری ہے اور تجزیے کی منطق کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے یہ سوچے کہ ڈراما جس خاص شکل و صورت میں اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے وہ اسے کس طرح ملی، اس کا آغاز کیوں اور کیسے ہوا؟ اور آغاز کی ابتدائی منزل میں وہ کون کون سی باتیں تھیں جنھیں اس کی امتیازی خصوصیات سمجھا گیا۔

جدید تحقیق نے انسان کی تہذیبی زندگی کے آغاز اور اس کے گوناگوں مظاہر کے متعلق جو نتائج ہمارے سامنے پیش کئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ انسان نے اپنے تجربات کے اظہار و ابلاغ کے جو وسائل و ذرائع اختیار کئے ہیں ان میں سب سے پہلی شکل ڈرامے کی ہے۔ ابتدائی انسان نے اپنے ان تجربات کی کہانی کو جو روپ دیا اور اپنے ہمسروں کے سامنے اپنی زندگی کے جو کارنامے بیان کئے ان میں اشاروں اور حرکات و سکنات سے لفظوں کو موثر اور دل نشیں بنانے کا کام لیا گیا اور اس طرح گویا عہدِ عتیق کی ہر کہانی ایک ڈراما ہے۔

انسان کہانی کے ذریعے اپنے تجربات کا اظہار کرتا ہے تو اظہار کے اس عمل کے پیچھے اس کی یہ خواہش اور یہ آرزو کام کرتی دکھائی دیتی ہے کہ وہ اپنے باطن کو ظاہر کی شکل دے اور اپنے چھپے ہوئے آپ کو ظاہر کی نظر کے سامنے لائے۔ اپنے باطن کو ظاہری روپ دینے کی یہ خواہش جس طرح بچوں میں ہوتی ہے اور طرح طرح کی حرکات اور مختلف قسم کے اعمال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اسی طرح ابتدائی انسان کے دل کو بھی بے چین رکھتی تھی۔ یہی بے چینی اظہار و ابلاغ کا وسیلہ تلاش کر کے بیان کا پیکر اختیار کرتی اور کہانی بنتی ہے۔ لیکن اس کہانی میں لفظ اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنے اشارے اور حرکات۔ کہانی کی یہی ابتدائی صورت حقیقت میں ڈراما ہے اور آج بھی غیر مہذب اور غیر متمدن قبیلوں میں اسی صورت میں موجود ہے۔ آج بھی ان کے ناچ گانے اور کھیل تماشے، جو ان کے تجربات اور مشاہدات اور اندرونی کیفیات کی ظاہری صورتیں ہیں، تاثیر اور دل نشینی کے لئے لفظوں کے زیادہ محتاج نہیں۔ تاثیر اور دل نشینی کی صفات ان میں حرکات اور اشارات سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی لئے ڈرامے کے آغاز و ابتدا کے متعلق کسی کا یہ فقرہ مزے دار بھی ہے اور معنی خیز بھی کہ ڈرامے کی زندگی کا نقطۂ آغاز کہانی کہنے والا نہیں بلکہ اداکار ہے۔ یوں گویا ڈرامے میں حرکت اور عمل کی بنیادی حیثیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی خیال کو ایک مغربی مبصر نے یہ کہہ کر ادا کیا ہے کہ "ڈرامے کا فن ڈراما نگار کا نہیں بلکہ اداکار اور ہدایت کار کا فن ہے۔"

ڈرامے کے آغاز اور اس کی ابتدائی شکل و صورت کے متعلق یہ چند بیانات جن باتوں کی طرف اشارے کرتے ہیں انہیں اگر مرتب کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شخصی تجربے کے اظہار کے وسیلے کی حیثیت سے کہانی جب سب سے پہلے دوسروں کے سامنے آئی تو اس کا انداز وہی تھا جس نے آگے چل کر ڈرامے کی

عمل اختیار کیا یعنی ایک شخص نے اپنے تجربات دوسروں کے سامنے پیش کئے اور انہیں پیش کرنے کے لئے کچھ تو الفاظ سے اور اس سے زیادہ اشارات و حرکات سے مدد لی اور یوں کہانی سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ بیان کی ہوئی اس کہانی کا جو نقشہ ہماری نظر کے سامنے آتا ہے اس میں بعض چیزوں کا وجود ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کہانی ایک شخص بیان کر رہا ہے جو اپنی کہانی میں دلچسپی اور اثر پیدا کرنے کے لئے الفاظ، حرکات اور اشارات استعمال کرتا ہے۔ یہ کہانی سننے والوں کے ایک گروہ کے سامنے بیان کی جاتی ہے، جو ایک خاص وقت میں کسی ایسی جگہ جمع ہیں جو بعض اسباب کی بنا پر کہانی سننے اور سنانے کے لئے ایک موزوں جگہ ہے۔ یہ خاص جگہ جہاں کہانی سنائی جا رہی ہے اور کہانی سننے والے ایک خاص انداز سے بیٹھے ہیں وہی جگہ ہے جسے آگے چل کر ڈرامے اور تھیٹر کے فن میں اسٹیج کا نام ملا اور جس کی نوعیت مختلف زمانوں میں حالات اور مذاق کے مطابق بدلتی رہی۔ کہانی سننے والا جو کہانی سناتے وقت حرکات و اشارات کا استعمال ضروری سمجھتا ہے، اس اسٹیج کا ایکٹر ہے، اور جن سننے والوں کو یہ کہانی سنائی اور ساتھ ساتھ دکھائی جا رہی تھی، وہ تماشائی ہیں جن کے وجود کے بغیر کسی ڈرامے کے وجود کا تصور ممکن نہیں۔ یہی اسٹیج، یہی اداکار اور یہی تماشائی ہیں جو آگے چل کر ڈرامے کے فن کے بنیادی عناصر بنے اور یہی عناصر ہیں جن کے الگ الگ اثرات نے مل جل کر وہ چیزیں پیدا کیں جنہیں ہم ڈرامے کے فن، اور یقیناً عظیم فن، کی روایات کہتے ہیں۔

ان روایات میں سے بعض کا تعلق اسٹیج سے ہے، بعض کا ایکٹر سے اور بعض کا تماشائیوں سے۔ لیکن ڈراما نگار کو ڈراما لکھتے وقت چونکہ زیادہ خیال اس بات کا رکھنا پڑتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھے گا اسے اسٹیج پر پیش کیا جائے گا اور تماشائیوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اس لئے ایک طرف تو اس کا فنی مقصود یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تماشائیوں کے سامنے آئے وہ ان کے لئے دلچسپ ہو اور انہیں اپنی طرف متوجہ رکھ سکے اور دوسری طرف یہ کہ سب کچھ ان حدود کے اندر رہ کر اور ان پابندیوں کا لحاظ رکھ کر کیا جائے جو اسٹیج نے اس پر عائد کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامے کی روایات کی تشکیل میں ان دو چیزوں نے زیادہ نمایاں حصہ لیا ہے اور اس کے اصول و ضوابط کی تفصیلی طور پر حد درجہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ البتہ ان اثرات میں سے بعض اہم ہیں اور بعض غیر اہم اور اس لئے ان اثرات کے تحت وجود میں آنے والی روایات کی نوعیت بھی اہم اور غیر اہم، فروعی اور اصلی، ضمنی اور بنیادی ہے۔

مثال کے طور پر اگر ہم ان روایات پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ڈرامے کی بے شمار ایسی روایات ہمارے سامنے آئیں گی جنہیں ڈرامے کی نشوونما کے مختلف دوروں میں اہم تر سمجھا گیا ہے لیکن انہیں بنیادی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی حیثیت البتہ ایک طرح کے سمجھوتے یا مفاہمت کی ہے جو فنکار اور اس کے مخاطب یا ڈراما نگار اور تماشائی کے درمیان قائم اور استوار ہوتی ہے اور اسی مفاہمت کی بنا پر ڈراما نگار کی پیشکش تماشائی کے لئے دلچسپ اور پرکشش بھی بنتی ہے اور ذہنی لطف و انبساط کا سرمایہ بھی مہیا کرتی ہے۔ ڈرامے کی یہ روایتیں حقیقت اور صداقت کے نقطۂ نظر سے تو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوتیں لیکن اسٹیج، تماشائی اور ڈراما نگار کے باہمی رشتے کے پیدا کئے ہوئے حدود انہیں جواز کی سند دے دیتے ہیں اور اس لئے انہیں وہی مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو حقائق کو۔ ڈرامے کے کردار نثر کے بجائے نظم، یا سیدھی سادی روزمرہ کے بجائے مقفیٰ اور مسجع اور رنگین باتیں کرتے ہیں، بسترِ مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لیتا ہوا انسان بھیرویں کی تانیں لگاتا ہے، عرب، ایرانی، افغانی، چینی، جاپانی اور ہندوستانی سب آپس میں ایک ہی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، کردار جو کچھ اپنے دل میں سوچ رہا ہے یا کسی دوسرے کردار کی سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا ہے اسے اجازت ہے کہ ایسی آواز میں کہے کہ تماشائی اس کی بات سن سکیں۔ کردار جنگل کی تنہائیوں میں گانا گائے تو اسے سازوں کی پوری سنگت ہے، وہ رات کی بھیانک تاریکی میں کسی عمل میں مصروف ہو تو اس پر اتنی روشنی ڈالی جائے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی تماشائیوں کی نظر سے پوشیدہ نہ رہے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں ہم عام حالات میں ہرگز قابلِ قبول نہیں سمجھتے لیکن اسٹیج کے تقاضے اور تماشائی کی طلب نے انہیں اس حد تک جائز بنا دیا ہے کہ ان پر کسی طرح کا اعتراض وارد کرنے کے بجائے ہم انہیں ڈرامے کی تاثیر کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

اسٹیج کی مجبوریاں اور ان مجبوریوں کے پیدا کئے ہوئے تقاضے ہیں جنہوں نے ڈرامے کے فن میں اس چیز کی تخلیق کی ہے جسے ہم ڈرامے کی روایتیں کہتے ہیں۔ ڈراما نگار کو اسٹیج کی حدبندیوں اور پابندیوں

کی وجہ سے ڈرامے کے عمل کو وقت اور مقام کے لحاظ سے اُس حد کے اندر رکھنا پڑتا ہے جو آسانی سے اسٹیج پر بھی پیش کی جا سکے اور جس سے تماشائی کی توجہ بھی ایک ہی نقطہ پر مرکوز رہے۔ اس کی اس فنی کوشش کو وحدتِ زماں و وحدتِ مکاں کے فنی نام دئے گئے ہیں اور ان کی اہمیت پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ جب تک ڈراما نگار تماشائی کے سامنے وقت اور مقام کا کوئی واضح تصور نہ پیش کر سکے اور جب تک وہ ڈراما دیکھتے وقت یہ نہ محسوس کر سکے کہ اسٹیج پر کردار جس عمل میں مصروف ہیں اور جس پر حقیقت میں ڈرامے کی دلچسپی کی ساری بنیاد قائم ہے، وہ کس مقام اور کس وقت پر پیش آیا ہے، وہ اس عمل میں کوئی براہ راست دلچسپی نہیں لے سکتے۔ ان کا اپنے آپ کو اس عمل کا ایک حصہ سمجھنا (خواہ ناظر ہی کی حیثیت سے سہی) صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ ان کی نظر کے سامنے وقت اور مقام کی ایسی تصویر موجود ہو کہ انہیں ڈرامے کے کرداروں کا عمل حقیقی معلوم ہو۔ یوں گویا ان دو وحدتوں کے فنی تصور پر اس تیسری وحدت کے موثر وجود کا انحصار ہے جسے ڈرامے کے فن کی اساس کہا گیا ہے۔ اس وحدت کا نام وحدتِ عمل ہے۔ عمل اور حرکت کے وجود کے بغیر فنی حیثیت سے کسی ڈرامے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ڈراما نگار کے فنی منصب اور فنی چابکدستی کا امتحان اسی میں ہے کہ وہ کس طرح ڈرامے کو عمل کے راستے پر ڈالتا اور اسے مختلف مدارج و مراحل سے گزارتا ہے۔

ڈراما نگار کے فنی عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ڈراما نگار کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ عمل کا آغاز کس طرح کرے کہ اس کے سفر کی اگلی منزلیں بغیر کسی رکاوٹ کے طے ہوتی چلی جائیں اور ایک مرحلہ دوسرے مرحلے کی طرف رہنمائی کرتے کرتے بالآخر عمل کو منطقی انجام تک پہنچا دے۔ عمل کی ابتدا ہو جائے اور واقعات ایک معین رخ اختیار کر لیں تو ڈراما نگار کا کام یہ ہے کہ وہ عمل کے مختلف مرحلوں اور منزلوں میں تماشائی کی توجہ اس عمل کی طرف سے نہ ہٹنے دے۔ یوں گویا ڈرامے کے عمل اور تماشائی کی دلچسپی اور توجہ میں ایک لازمی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ڈرامے کا عمل واقعات کی شکل میں آگے بڑھتا رہتا ہے، اور عمل کو وہ کردار جن کی زندگی ڈرامے کے واقعات کا موضوع ہے اپنی گفتار و رفتار سے آگے بڑھاتے رہتے ہیں اور جوں جوں عمل کبھی دھیمی اور ہموار اور کبھی تیز اور ڈرامائی رفتار سے آگے بڑھتا اور ابھرتا رہتا ہے تماشائی کی دلچسپی اور توجہ ایک متحرک حیثیت حاصل کرتی رہتی ہے۔ عمل کی حرکت کی اسی رفتار کے لحاظ سے تماشائی کے جذبات میں مد و جزر کی بدلتی ہوئی کیفیتیں نمایاں ہوتی رہتی ہیں اس کے دل کی دھڑکن کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہوتی رہتی ہے۔ گویا تماشائی کے دل کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے جس فنی عمل کا آغاز ڈراما نگار نے ڈرامے کے ابتدائی حصوں میں کیا تھا اس کی کامیابی اسی بات پر منحصر ہے کہ ڈرامے کا عمل ایک موزوں اور مناسب رفتار سے حرکت کرتا اور آگے بڑھتا رہے اور کسی ایک جگہ بھی اتنی دیر تک رک کر نہ رہ جائے کہ تماشائی کو اپنے خیال اور جذبے میں رکاوٹ اور ٹھیراؤ محسوس ہونے لگے۔ ڈرامے میں خیال اور جذبے کا یہ ہلکا سا ٹھیراؤ یا معمولی سی رکاوٹ بھی اس کے لئے گھٹن بن جاتی ہے۔ تماشائی کو گھٹن کے اس احساس سے محفوظ رکھنا ڈراما نگار کا فنی منصب ہے اور یہ بات ڈرامائی عمل کے متحرک رہنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ڈرامے کے عمل کے متحرک رہنے اور اس کے برابر آگے بڑھتے رہنے پر فنی اعتبار سے جو زور دیا جاتا ہے وہ ڈرامے میں اس چیز سے پیدا ہوتا ہے جسے فن کی اصطلاح میں تصادم یا کشمکش CONFLICT کہا گیا ہے جس چیز کو ہم ڈرامائی عمل کہتے ہیں وہ کسی کردار کی عملی حالت میں ظاہر یا نمودار ہونے کا دوسرا نام ہے۔ کردار کی اس عملی حالت میں تماشائی کے لئے اس وقت تک کوئی دلچسپی ممکن نہیں جب تک اسے کسی الجھن، اور کشمکش میں مبتلا نہ دکھایا جائے یہی الجھن اور کشمکش ہے جو حقیقت میں عمل کو آگے بھی بڑھاتی ہے اور اس میں اتار چڑھاؤ کی وہ کیفیتیں بھی پیدا کرتی ہے جن سے تماشائی کی توجہ ایک نقطے پر مرکوز رہتی یا اس نقطے کے محور پر گردش کرتی ہے۔ یہ الجھن یا کشمکش ڈرامے میں مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے۔ کبھی اس کی شکل دو افراد کے درمیان ایک تصادم کی ہوتی ہے، کبھی یہ کشمکش حالات اور تصورات کے اختلاف اور تصادم سے پیدا ہوتی ہے، کبھی خود انسان کے اپنے جذبے کی متفرق اور متضاد کیفیتوں سے۔ اسی کشمکش اور تصادم سے پلاٹ بنتا اور اس کے مختلف مدارج قائم ہوتے ہیں۔ ابتدا کے بعد اضطراب (بحران)، نقطۂ عروج اور انجام اسی تصادم کی مختلف منزلیں ہیں۔ ڈراما نگار ان مختلف مرحلوں اور منزلوں کو وحدت کے ایک رشتے میں جوڑتا اور اس طرح تماشائی کی توجہ کے سفر کے لئے

ایک راستہ معین کرتا ہے تاکہ وہ اِدھر اُدھر نہ بھٹکے، ڈرامے کے شروع میں اس نے تماشائی کے جذبۂ تحیّر کو روشن کیا اور آہستہ آہستہ اس کی لَو کو ابھارا یا تقاضے برابر بلند رکھنا اور بالآخر اس کی تسکین کا سامان مہیا کرنا اس کے فن کی کامیابی ہے اور یہ کامیابی حقیقت میں اس بات پر منحصر ہے کہ اس نے ڈرامے کے اس عمل کو کس طرح اور کس حد تک اپنے فکر، تخیل اور جذبے کی آنچ سے پختہ کیا ہے جس پر ڈرامے کی اساس قائم ہے اور جسے فنی حیثیت دینے میں ڈراما نگار اور تماشائی بہ یک وقت برابر کے شریک ہیں۔ اس ڈراماتی عمل میں اگر کشمکش کا رنگ موجود ہے اور ڈراما نگار نے اس کشمکش کو پوری طرح کرداروں کی زندگی سے مربوط کیا ہے تو اس کی حرکت اور رفتار میں بھی تسلسل اور موزونی ہوگی، اور تماشائیوں کی توجہ کا مرکز بھی قائم رہے گا اور وہ ڈرامے کو شروع سے آخر تک دلچسپی کے ساتھ دیکھیں گے۔ اس چیز کا نام ڈرامے کے فن میں اشتیاق تذبذب یا SUSPENSE ہے۔ ڈراما نگار ایک طرف تو یہ کرتا ہے کہ تماشائی کی نظر دل توجہ اس عمل کی طرف رہے جو اس وقت اسٹیج پر پیش آرہا ہے اور دوسری طرف اس سے بھی زیادہ یہ کہ اُن کا ذہن برابر آنے والے واقعات اور ہونے والے عمل کا منتظر رہے جو کچھ اس وقت اسٹیج پر ہو رہا ہے وہ اس کے لئے کشش انگیز ہے لیکن اس سے بھی زیادہ کشش اس خیال اور احساس میں ہے کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہو! یہی خیال، یہی احساس اور یہی اشتیاق ہے۔ جس سے تماشائی کے لئے ڈراما ایک نشاط آور تجربہ بنتا ہے۔

ڈراماتی تجربہ کو تماشائی کے لئے مسلسل دلچسپی، کشش اور انبساط کی ایک چیز بنانے کے لئے ڈرامے کے فن میں تنوع اور تضاد کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور ڈراما نگار کبھی واقعات کی رفتار میں کبھی کرداروں کے مکالمے کے لہجے میں، کبھی عمل کی کیفیت میں اور کبھی بیان کے اسلوب میں شدت و خفت اور کبھی واقعات کی اہمیت کرداروں کے عمل اور خود اظہار کے لہجے اور اسلوب میں تضاد کی کیفیتیں نمایاں کر کے تماشائی کے جذباتی ہیجان میں توازن اور نرمی پیدا کرتے ہیں اور اسی لئے ڈراماتی عمل کی پیش کش اور ڈراماتی صورتِ حال کی تعمیر و تشکیل میں ان دونوں وسائلِ فن کو بھی کم و بیش وہی دخل حاصل ہوتا ہے جو اشتیاق یا SUSPENSE کو۔ اور یوں ڈرامے کو ایک ایسی صنفِ ادب سمجھا جاتا ہے جس کے ادبی مرتبے کا تعین کرتے وقت ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی پڑتی ہے کہ ڈراما ڈراما نگار کا نہیں بلکہ اسٹیج اور تھیٹر کا فن ہے اور ہم اسے ناول، افسانے، رزمیہ نظم اور انشا کی طرح محض ادبی قدروں سے نہیں جانچ سکتے۔ چونکہ ڈراما نگار ڈرامے کی تخلیق یہ بات پیشِ نظر رکھ کر کرتا ہے کہ ایکٹر انہیں اسٹیج پر تماشائیوں کے دیکھنے کے لئے پیش کریں گے اس لئے ان کی اچھائی برائی کی کسوٹی یہ خیال ہے کہ وہ اسٹیج پر کامیاب رہا یا نہیں۔ ڈرامے اور اسٹیج کو لازم و ملزوم قرار دینے کی یہ روایت دنیا کے ڈرامے کی پوری تاریخ کا بنیادی عنصر ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کے بعض بڑے بڑے ڈراما نگاروں نے جن میں مولیئر اور شیکسپیر بھی شامل ہیں، کبھی اس خیال کو اہمیت نہیں دی کہ ان کے ڈرامے چھاپے بھی جائیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی عام مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ بعض ایسے ڈرامے جو اسٹیج پر حد درجہ کامیاب سمجھے گئے تھے جب چھپ کر پڑھنے والوں کے سامنے آئے تو ان کی ساری تاثیر اور کشش ختم ہوگئی۔

ان سب باتوں سے جو بدیہی نتیجہ نکلتا ہے اور جس کی تائید ڈرامے کی پوری تاریخ کو دیکھ کر ہوتی ہے یہ ہے کہ ڈرامے کی تخلیق میں اصل بنیاد اس کے فن کو بنایا گیا ہے اور اس کے ادبی پہلو کو محض ضمنی حیثیت دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عموماً دنیا کے دو عظیم ڈراما نگاروں کے بیانات پیش کئے جاتے ہیں اور ان کے بیان کو اس خیال کی تائید میں استعمال کیا جاتا ہے کہ ڈرامے میں ادبی اقدار کی باری فنی اقدار کے بعد آتی ہے SCRIBE نے کہا کرتا تھا کہ میرے ڈرامے کا موضوع اچھا ہو اور میں اس کا ایک واضح اور مکمل خاکہ بنا لوں تو اسے لکھنے کا کام اپنے ملازم کے سپرد بھی کر سکتا ہوں۔ ڈرامے کی مجموعی فضا اس کے لکھنے کا کام کرنے کی اور ڈراما اسٹیج پر کامیاب رہے گا۔ یونانی ڈراما نگار مینانڈر سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آپ کا نیا ڈراما، اب کس منزل میں ہے تو اس نے جواب دیا۔ "ڈرامے کی موسیقی مرتب ہو چکی ہے اور وہ بالکل تیار ہے۔ اب صرف اسے نظم کرنا باقی ہے" ان دونوں بیانات میں سے پہلے پر یقیناً مبالغے کا گہرا رنگ ہے لیکن مجموعی حیثیت سے دونوں میں واضح طور پر یہ اشارہ موجود ہے کہ ڈراما لکھنے میں اصل چیز اس کی فنی تشکیل و ترتیب ہے۔ ادبی تہذیب اس کے مقابلے میں

محض ایک ثانوی اور فروعی چیز ہے اور حقیقت میں ڈرامے کی کامیابی کا انحصار اس دوسری چیز پر نہیں بلکہ پہلی پر ہے۔ ڈرامے کو ایک فن سمجھنے والوں کے اس دعوے نے (جس کی بنیاد یقیناً ڈراما نگاروں کا عمل ہے) کہ ڈرامے کی کامیابی میں بیان کے حسن کو کوئی دخل نہیں ڈرامے کی ادبی اہمیت پر حد درجہ اثر انداز ہوئی ہے اور ڈرامے کی قدر و اہمیت کا تعین کرنے وقت اس کی فنی اور ادبی حیثیتوں میں امتیاز کیا جانے لگا ہے اور اس امتیاز میں فن کو ادب پر تفوق دینے کا رجحان عام ہو گیا ہے۔ اور یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ایک اچھے ڈرامے کی تخلیق لفظوں کے اس سرمائے کی طرف سے بے اعتنائی برت کر بھی ہو سکتی ہے جو ادب میں اظہار کا واحد وسیلہ بھی ہیں اور حسنِ اظہار کا موثر ذریعہ بھی۔ اس میں شک نہیں کہ ڈراما نگار بھی اپنے خیال کے اظہار کے لیے الفاظ ہی کا محتاج اور دست نگر ہے لیکن ناول نگار اور افسانہ نگار کی طرح وہ لفظوں کے نازک اور لطیف صرف اور استعمال کا پابند نہیں۔ اس کے استعمال کیے ہوئے لفظوں کی نزاکت اور لطافت اسی وقت مکمل نہیں ہو جاتی جب وہ اس کے قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر وارد ہوتے ہیں۔ یہ ادھورا کام اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اسٹیج پر اداکار اسے اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور اس لیے لفظوں کی اپنی حیثیت کے علاوہ انہیں زبان سے ادا کرنے والے اداکار کی شخصیت، آواز، لہجہ، حرکات و سکنات، اشارے بھی ان کے لطیف اور نازک تصور کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔

ڈرامے کی تاریخ کے ہر دور میں اس رجحان کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے اور ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ بے شک ڈرامے کا مکمل وجود تھیٹر اور اسٹیج کے بغیر ممکن نہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ تھیٹر کا مکمل وجود بھی ڈرامے کے بغیر ممکن نہیں، اور دوسری طرف اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس کے باوجود کہ ڈراما نگاروں نے ڈرامے اسٹیج کے لیے لکھے عظیم ڈراما نگاروں کا عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے ڈرامے کو ایک عظیم فن سمجھتے ہوئے بھی یہ بات کبھی فراموش نہیں کی کہ وہ ادب بھی ہے اور یہی ادب ہے جس کی بدولت ڈرامے کو حیات جاوداں ملتی ہے۔

ڈرامے پر فنی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو اس بدیہی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ چونکہ ڈراما نگار ڈرامہ فوری تاثر پیدا کرنے کی غرض سے لکھتا ہے اس لیے اس کی نظر فن کے ان وسائل پر ہوتی ہے جو اسے اس مقصد کے حصول میں مدد دیں اور جن کی مدد سے وہ طلسم و فریب کی ایک عارضی دنیا کی تشکیل کر سکے۔ ڈرامے کی پوری دنیا عارضی طلسم کی ہی دنیا ہے اور اس دنیا کی قدروں پر تصنع اور تکلف کا سایہ ہے۔ تصنع اور تکلف کی انہیں قدروں کا نام ڈرامے کا فن ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ایک سچا اور حقیقی فن کار فریب و طلسم کی اس دنیا میں خوش نہیں رہ سکتا اور اپنے تصور، تخیل اور فکر کو اس کی محدود قدروں کی زنجیروں کا پابند نہیں رکھ سکتا۔ حقائق کی کشادہ و فراخ سرزمین کو ترک کر کے تکلفات کی اس گھٹن پیدا کرنے والی دنیا کا مکین بننا اس کے فن کارانہ مزاج کے منافی ہے۔ اسی لیے اچھا ڈرامہ نگار، اس کے باوجود اپنے فن کی بنیاد تکلفات و طلسمات کی عارضی قدروں پر رکھتا ہے، اپنے آپ کو انہیں کے اندر مقید اور محصور نہیں رکھ سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی فنی تخلیق کا جائزہ اسی محدود دنیا کے ضابطوں کے مطابق لیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی فنی تخلیق کا سرچشمہ اس دنیا سے باہر کی حقیقی دنیا اور زندگی ہے اور اس لیے اگر ہم ڈرامے کی پوری تاریخ کا مطالعہ ذرا دقت نظر سے کریں تو یہ حقیقت ہماری نظر کے سامنے آتی ہے کہ دنیا کے سب عظیم ڈراما نگاروں نے تھیٹر اور اسٹیج کے حدود میں رہ کر بھی، اور ان کی فنی قدروں کو اپنے تخلیقی فنی عمل کا رہنما بناتے وقت بھی ان قدروں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیں جو زیادہ مستقل، زیادہ پائدار اور اس لیے ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں — یہ قدریں ہیں حقائق، انسانی صداقت اور ادبی حسن کی قدریں ہیں۔ اور چیز فن سے قطع نظر ادبی حسن کی ہی قدریں ہیں جن کی بدولت ڈرامائی ادب کے شاہکاروں کو ہمیشگی ملی ہے۔ ادبی قدروں کی اسی اہمیت کا احساس ہے جو ڈراما نگاری کے مختلف ادوار میں مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا ہے یہاں تک کہ احساس کا اظہار سب سے زیادہ لفظوں کے فن کارانہ اور حسین استعمال کی شکل میں ہوا ہے — اور جن ڈراما نگاروں نے اس جمالیاتی احساس کو ڈرامے کے تخلیقی عمل کی شکل دی ہے۔ انہوں نے گویا اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ

ڈرامے کے حسن اور تاثیر میں الفاظ کے موزوں استعمال کو کوئی دخل نہیں۔ حالانکہ اس بحث سے قطع نظر کہ ڈراما اسٹیج کے لئے خاص ہونے کی وجہ سے کوئی ادبی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں عام ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس بات سے انکار ممکن ہی نہیں کہ ڈراما فن ہونے کے ساتھ ساتھ ادب بھی ہے۔ ادب تخئیلی تجربے کے اظہار اور ابلاغ کا دوسرا نام ہے جس میں لفظوں کی ایک خاص ترتیب و تنظیم سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ڈراما بھی ادب ہے کہ وہ الفاظ کی موزوں ترتیب و تنظیم کے ساتھ تخئیلی تجربے کے اظہار کی ایک خاص صورت ہے۔ چونکہ الفاظ کی اس ترتیب و تنظیم میں ڈراما نگار کے فنی اور جمالیاتی ارادے، احساس اور عمل کو دخل ہے اس لئے یہ بھی ادب کی دوسری اصناف کی طرح ادب کی ایک صنف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ الفاظ کی اس ترتیب و تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ انہیں کوئی کردار یا کئی کردار اسٹیج پر ادا کریں گے اور اس طرح اپنی ادائیگی سے ایک تخئیلی تجربے کو دوسرے تک پہنچائیں گے لیکن اس مقصد کی تکمیل میں الفاظ ابلاغ کا واحد وسیلہ ہیں اس لئے اُن کی حیثیت محض ثانوی یا جزوی ہونے کے بجائے بنیادی ہے۔

ڈرامے کو طلسم و فریب کی ایک دنیا کہا گیا ہے اور طلسم و فریب کی اس دنیا میں کرداروں کے حرکات و سکنات اور اس سے بھی زیادہ مکالمے سے جان پڑتی ہے، اس لئے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ طلسم و فریب کی اس دنیا کی تشکیل و تعمیر لفظوں کی ایک خاص طرح کی ترتیب و تنظیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور لفظوں کی اس ترتیب و تنظیم کا نام ادب ہے۔ یہ بات لفظوں کے اس استعمال پر بھی صادق آتی ہے جس میں مکالمے کو زندگی کی عام سطح پر رکھا جاتا ہے اور اس نظم و ترتیب پر بھی جس میں شاعر بقول شخصے انسانوں کی زبان کے بجائے "دیوتاؤں کی زبان" استعمال کرتا ہے پچھلی ایک صدی کا مغربی ڈراما اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے کہ عام بول چال کی زبان اور بیان کے حسن اور رنگینی میں کتنا قریبی اور ایک حد تک لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔ ابسن ـــــ IBSEN کے ڈرامے اس لحاظ سے سادگی و پُرکاری اور بہ یک وقت فنی اور ادبی حسن کے شاہکار ہیں کہ اس نے سیدھی سادی روزمرہ زبان کو نازک سے نازک تخئیلی تجربے اور پیچیدہ سے پیچیدہ انسانی کیفیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں ڈراما میں زبان و بیان کی حیثیت کو مسلّم بنایا ہے۔ یہ الفاظ اسی کے ہیں کہ "میں ڈرامے کے ذریعے انسانی زندگی کی مصوری کرنا چاہتا ہوں اس لئے ان سے دیوتاؤں کی زبان میں گفتگو نہیں کرواتا"۔ ابسن نے جس زبان کو دیوتاؤں کی پرتکلف اور پُرشکوہ زبان کہا ہے اس کے مقابلے میں انسانوں کی بے تکلف اور سادہ زبان لکھنے کا فن کہیں زیادہ دشوار اور اس سے کہیں زیادہ فنی اور ادبی کاوش اور عمل کا طالب ہے۔ بحیثیت ڈراما نگار کے ابسن کی تخلیقی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان چار ادوار میں سے تیسرا دور نثری ڈراموں کا وہ دور ہے جس میں اس نے اپنے ڈرامے GHOST اور A DOLL'S HOUSE لکھے۔ ان دونوں ڈراموں کو جہاں ایک طرف ڈرامائی فن کے نقطۂ نظر سے شاہکار سمجھا گیا ہے، دوسری طرف ان کے ادبی محاسن کی بنا پر پچھلی صدی کے چند منتخب ڈراموں میں جگہ دی گئی ہے۔

ڈرامائی فن کی ادبی اہمیت کے متعلق اس دور کے عظیم ڈراما نگار برنارڈ شا کا نقطۂ نظر بھی ابسن کے نقطۂ نظر سے ملتا جلتا ہے۔ اپنے ایک بہت مشہور ڈرامے کے متعلق (جو نظمِ معرّیٰ میں لکھا گیا ہے) شا نے یہ بات لکھی ہے کہ "میں نے یہ ڈراما نظمِ معرّیٰ میں اس لئے لکھا کہ مجھے فرصت کم تھی"۔ گویا شا کے نزدیک ادنیٰ درجے کی نظم کا لکھنا اعلیٰ درجے کی نثر لکھنے کے مقابلے میں آسان ہے۔ شا نے ایک اور جگہ تھیٹر اور ڈرامے کے رشتے کے ضمن میں ڈرامے کی ادبی اہمیت کی بڑی پرزور وکالت کی ہے۔ وہ کہتا ہے تھیٹر ڈرامے کی بدولت زندہ ہے نہ کہ ڈراما تھیٹر کی بدولت وہ اسٹیج کے سہارے سے نہیں بلکہ اس قوت سے زندہ اور قائم ہے جو اس کی فطرت کا جزو لازم ہے"۔ ڈرامے میں ایک نیا انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا ہے "ڈرامے کو ایک بار اس کا ادبی مقام ملنا چاہئیے۔ ڈرامے کو دوسروں کے سہارے سے نہیں بلکہ اپنے ادبی اوصاف کی قوت سے ایک نئی زندگی مل سکتی ہے" B. SHAW کے بیان کی تائید انگریزی کے شاعر اور نقاد W.B. YEATS کے ایک معنی خیز جملے سے ہوتی ہے "ڈرامے کو اس کی عظمت لفظوں کی بدولت ملی۔ اور اب اسے شاندار مقام صرف لفظوں ہی کی بدولت

مل سکتا ہے۔"

لفظوں کی یہی عظمت اور ان کا یہی شاہانہ مقام ہے جسے پہچان کر عہدِ الزبتھ کے ڈراما نگاروں اور خصوصاً شیکسپیئر نے ڈرامے کو ادبی عظمت بھی دی اور اس کی ادبی حیثیت میں وہ شاہانہ شکوہ بھی پیدا کیا جس کی طرف ابسن اور برنارڈ شا نے اشارتاً اور ایٹس نے واضح لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔ عہدِ الزبتھ کے ڈراما نگاروں نے ڈرامے کی فنی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے بھی اس کی ادبی اہمیت کو اس پر قربان نہیں کیا اور زبان و بیان کے حسن کو بھی ڈراماتی فن کے لازمی عناصر میں سے ایک جانا اور اسی ادبی احساس کا نتیجہ ہے کہ شیکسپیئر کے ابتدائی ڈراموں کے متعلق مبصروں نے یہ حکم لگایا ہے کہ انہیں محض ان کے حسنِ بیان کی وجہ سے حیاتِ جاوداں ملی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کی انہیں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے برنارڈ شا نے دو باتیں لکھی ہیں جن سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ فنی اقدار سے زیادہ اپنی ادبی اقدار کی وجہ سے زندہ اور قائم ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شیکسپیئر بحیثیت ایک خوش فکر اور نغز گو شاعر، ایک ولولہ انگیز خطیب، ایک سحر طراز فسانہ گو اور دل نواز مطرب کے بے مثل اور لاثانی ہے اور اپنے ڈراموں میں اپنے ان سب اوصاف سے سحر و طلسم کی کیفیت پیدا کرتا ہے کسی ایسے ڈرامے کا خالق نہیں بن سکا جسے ڈرامے کے فن کے لحاظ سے ایک مربوط اور مرتب وحدت کہا جا سکے یا جسے ڈراماتی فن کے علمی تقاضوں کا بہترین مظہر سمجھا جا سکے۔ دوسری بات یہ کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کے مطالعے کے بعد سوائے چند سطروں کے (جو یقیناً ادبی لحاظ سے بھی زیادہ اہم نہیں ہیں) باقی سب جسے آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور اس کے مقابلے میں عہدِ جدید کے زیادہ ڈرامے جنہیں اسٹیج پر انتہائی کامیابی حاصل ہوئی، ایسے ہیں کہ انہیں اسٹیج کے باہر لا کر سمجھنا بھی مشکل ہے۔ اور یہ سب کچھ شا کے نزدیک اس لئے ہے کہ ان ڈراما نگاروں نے ڈرامے کی ادبی قدروں کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو فنی قدروں کا پابند اور حلقہ بگوش بنا لیا ہے۔ یعنی ڈرامے میں لفظوں کی جو بنیادی حیثیت ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

ڈرامے کی فنی قدروں کے مقابلے میں اس کی ادبی قدروں کا جو مقام ہے اس کا اندازہ ایک طرف یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ دنیا کے عظیم ڈراما نگاروں نے ڈراماتی فن میں لفظوں کو یا بیان کے حسن کو کتنی اہمیت دی ہے اور دوسری طرف یہ دیکھ کر کہ ان مختلف چیزوں کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اور انداز فکر کیا ہے جنہیں ڈرامے کے فن کی اساس یا اس کی فنی قدروں کا بڑا اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ ہم بحیثیت مجموعی ادبی تخلیق کے عمل کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ادب کی سطح خواہ کچھ بھی ہو ادیب، افسانہ نگار یا ڈراما نگار کی بنیادی دلچسپی کہانی سے، کہانی کے کردار سے یا کردار کے عمل سے نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقت میں وہ ان چیزوں کو مختلف وقتوں میں یا کبھی کبھی بہ یک وقت اپنے احساس اور جذبے کے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ ڈراما نگار کے دل میں زندگی کے مشاہدے سے کسی خاص تاثر کے ماتحت ایک جذبہ پیدا ہوا ہے اور اس نے ایک خیال یا فلسفے کی صورت اختیار کی ہے۔ اسی جذبے، خیال یا فلسفے کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے وہ کہانی سے، کردار سے، اس کے عمل سے کام لیتا ہے اور یوں گویا یہ چیزیں تو اس کے تجربے کے اظہار کا ایک وسیلہ اور علامت بنتی ہیں۔ ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ڈی۔ ایچ لارنس نے ان فنی مظاہر کو انسانی شعور کی علامتی تخلیقات یا مخلوق کہا ہے۔ ان کی حیثیت محض شاعرانہ تخیل یا تصور کی علامتوں کی ہے۔ جن ڈراما نگاروں نے ان علامتوں کو علامت کے بجائے حقیقت سمجھا انہوں نے ڈرامے کی ادبی حیثیت کو اس کی فنی حیثیت پر قربان کیا۔ لیکن چونکہ بڑے فن کاروں نے ہمیشہ حقیقت اور علامت کا یہ امتیاز قائم رکھا ہے اس لئے ان کے ڈراموں نے ڈرامے کی ادبی قدروں کو زندہ رکھا ہے۔

ڈرامے کی ان ادبی قدروں نے اپنی حیات کو مستحکم بنانے کے لئے ڈراماتی فن کے ہر شعبے میں علامتوں سے مدد لی ہے اور ابسن اور چیخوف جیسے ڈراما نگاروں نے اس احساس کے تحت کہ لفظ اپنے روزمرہ کے لغوی مفہوم میں گہرے اور لطیف معانی اور مفاہیم کے حامل نہیں ہو سکتے انہیں علامتی سطح پر استعمال کرنا شروع کیا اور لفظ کو تصویر کی جگہ دے کر ہر طرح کی نزاکت اور لطافت کے اظہار کے لئے آسانی پیدا کر لی۔ عام ڈراما نگاروں نے کردار اور عمل کو مقصود بالذات بنا کر ان دونوں چیزوں کی علامتی حیثیت میں جو غیر ضروری اور غیر معمولی مفہوم پیدا کر دیا تھا، ابسن اور چیخوف نے اسے حقیقت کی فطری سطح پر

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

سرودِ رفتہ مولانا محمد علیؒ کی ایک قدیم تحریر

اکبر علی خاں

مولانا محمد علی صرف ہندوستان کی تحریک آزادی و حریت کے راہنما ہی نہیں تھے بلکہ تعلیم کے معاملے میں بھی ایک باغی اور انقلابی سوچ رکھتے تھے۔ انہیں ایک کامیاب ماہر تعلیم کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ سے مایوس ہو کر جامعہ ملیہ کا جو عملی نقشہ مرتب کیا وہ ان کے بھرپور خلوص، توجہ اور لگن کی وجہ سے ہندوستان کے تعلیمی تجربات میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ وہ ہمارے سیاسی رہنماؤں میں اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت کو سختی سے محسوس کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ نئے ذہنوں کو ذہنی اور روحانی غذا بھی میسر آتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ان کی رہنمایانہ زندگی میں بے باک جذباتیت کا کوئی نشان نہیں۔ وہ شاید اس حیثیت سے بھی منفرد قرار دئے جائیں گے۔

خود ان کے ذہن کی تشکیل میں بی اماں کا ہاتھ برائے نام نہیں تھا۔ ان کی سوجھ بوجھ، ان کے انداز فکر اور ان کی تربیت کا اقرار مولانا محمد علی نے بھی سرسری طور پر نہیں کیا ہے۔ وہ پوری شدت سے بی اماں سے متاثر ہوئے۔ ان کی تعلیمی زندگی ختم ہونے کے بعد قومی مصروفیتوں میں بھی ان کا بہت بڑا سہارا بنی رہیں۔ وہ بڑی روشن دماغ اور دور بیں ہستی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے قدامت پرست خاندان کی شدید مخالفت کے باوجود محمد علی کو مغربی تعلیم کے سپرد کر دیا۔ شاید ان کا یہ اقدام ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کے لئے ایک بیش قیمت انعام تھا جس نے محمد علی کو وہ کچھ بنا دیا جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھا۔

محمد علی کی قومی تحریکات اور مشغولیتوں میں جو رخ بی اماں نے اختیار کیا تھا اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے محمد علی کی دنیاوی زندگی ہی کا سدھار نہیں تھا بلکہ وہ اپنے بیٹے کو قوم کے سپرد کرنے کے لئے تیار کر رہی تھیں۔ "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" صرف لفظی اور کھوکھلا نعرہ نہیں ہے، اس کے ذریعے بی اماں کے سارے جذبات اور ان کی بزرگ، ہمدرد اور وطن دوست شخصیت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے اپنے تمام انقلابی ولولوں کے ساتھ۔

محمد علی بھی اپنے بچپن ہی سے تنگ و تاریک روایات کے حبس بیجا سے باہر نکلنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں اور ان کی خاندانہ شان کے نقوش بہت واضح طور پر مل جاتے ہیں۔ وہ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود نہ رہ سکے۔ اور بچپن میں ان کے ذہن نے جس روشنی کا اکتساب کیا وہ ہندوستان کے چپے چپے پر پھیل کر رہی۔

جو تحریر ہم آگے چل کر پیش کرنے والے ہیں اس سے اس محمد علی کا سراغ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی جو مغربی تعلیم کو فقط پسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس دولت بیدار کو عام کرتا چلے جس کا وہ خود سرمایہ دار ہے۔ اس تحریر سے تنگ اور محدود ذہنی کی نفی بھی ہوتی ہے اور وسعتِ خیال کا پتہ بھی چلتا ہے۔

یہ تحریر مولانا محمد علی کی عام شاعرانہ بے کیفی کو پرکھنے میں بھی مددگار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مجاز سے جو فرار اختیار کیا ہے اس کے لئے ان کے ذہن میں بچپن ہی سے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ اور وہ "ما معشوقان کوئے دلداریم" کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پاکبازی سے دلدادگی کا رجحان اور شاعرانہ رندی و بیباکی سے دوری کا اظہار، یہ دونوں باتیں اسی تحریر میں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ وہ کسی بھی "شعریت" کو زندگی میں داخل کرنا تو کجا صرف شاعری میں بھی داخل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجئے۔ وہ تو امیر مینائی بھی نہ بن سکے۔ اسی لئے ان کے

ہاں شاعرانہ تاثرات، رنگ رنگ احساسات اور بارغ و بہار خیالات کا فقدان ہے گا۔ ان کی شاعری صرف وہیں جاندار نظر آتی ہے جہاں انہوں نے اپنے انسانی خلوص کے تحت شاعری کی ہے۔ اس میں سیاست بھی شامل ہے اور دین سے محبت بھی، قوم بھی موجود ہے اور قوم پر سب کچھ نچھاور کر دینے کا جذبہ بھی۔

یہ تحریر رام پور کے اسٹیٹ گزٹ کی اشاعت دوشنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۹۰ء مطابق ۷ صفر ۱۳۰۸ھ جلد ۲ نمبر ۳۸ صفحہ ۱۰ پر درج ہے۔

مولانا محمد علی نے اپنی عمر اپنی خود نوشت ڈائری میں یوں لکھی ہے:

"جس خالق نے مجھے ۸ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ میں میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کئے۔"

یہ ہجری تاریخ پیدائش عیسوی حساب سے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء ہوتی ہے۔ گویا اوّل الذکر تحریر لکھتے ہوئے وہ اپنی عمر کے بارھویں سال میں تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا اس ۱۸۹۰ء میں انھیں مڈل کلاس کا طالب علم ہونا چاہئے۔ لیکن مولانا محمد علی کے کسی سوانح نگار اور خود مولانا نے بھی زد پہ کے کسی اسکول میں طلب علم کا ذکر نہیں کیا۔ "حیات جوہر" میں عشرت رحمانی کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

"ابتدا میں مولانا کو قرآن کریم کی مکمل تعلیم دلائی گئی اور جب اس کی تکمیل ہوگئی تو جدید اصول کے مطابق ضروری درسیات سے فراغت ہوئی بعدازاں بریلی ہائی اسکول میں داخل کرائے گئے۔ ابنائے وطن کے لئے عموماً اور تمام اعزا و احباب کے لئے خصوصاً یہ طریقہ تعلیم پسند نہ آیا اور انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے خوف دلایا گیا اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا مگر دھن کی پکی عظیم المرتبت روشن دماغ خاتون نے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کی اور اپنی رائے کے مطابق اپنے بچوں کی تعلیم جاری رکھی۔

کچھ عرصہ بریلی اسکول میں رہے۔ چند دنے بعد علی گڑھ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے اور وہاں نہایت شاندار کامیابی کے ساتھ اسکول سے فراغت کر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں اعلیٰ تعلیم پانے لگے۔ اس وقت تک یونیورسٹی کی تاریخ میں کبھی نہیں پڑی تھی جو اعلیٰ کامیابی اسکول میں حاصل ہوئی تھی اس سے زیادہ اپنی خاص ذہانت اور طباعی کا ثبوت کالج میں دیا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔"
(صفحہ ۳۵ کتاب مذکور)

رئیس ملّا حراسے کے مشہور سوانح نگار رئیس احمد جعفری کی عبارت بھی دیکھتے چلئے:

"بچپن کی وہ بہاریں دیکھی تھیں کہ داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا لیکن خوبیٔ قسمت سے آغوش مادر سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ بی اماں مرحومہ نے جس بے نظیر استقلال اور ایثار نفس کا مظاہرہ کر کے اپنے صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم دلائی وہ ہندوستان کی تاریخ نسائیات کا ایک اہم باب ہے۔ پہلے اردو فارسی کی تعلیم تو مکان ہی پر ہوئی پھر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے۔" (سیرت محمد علی ص۳)

گھر اور بریلی ہائی اسکول کے درمیانی وقفے کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ان بیانات کے پیش نظر تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ گھریلو تعلیم کے فوری بعد وہ بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے۔ اس طرح رام پور کی کسی باقاعدہ درسگاہ میں ان کی موجودگی کا علم ابھی تک کسی کو نہیں۔ جو تحریر میں آج پیش کر رہا ہوں وہ اس راز سے بھی پردہ اٹھاتی ہے اور عظیم رہنما کی پرخلوص، پرمحبت اور پرعزم، باشعور زندگی کی داستان کی یہ کڑی اس شکل میں سامنے آتی ہے کہ بچپن کا محمد علی اپنی غور و فکر کی پرچھائیاں بھی واضح اور نمایاں طور پر آشکار کر دیتا ہے۔

گزشتہ اسی شمارے میں اسکول اس کی ایک رپورٹ بھی شریک اشاعت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"مارچ ۱۸۸۸ء میں انگریزی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ شہر میں کھولا گیا اس مدرسے نے اس وقت تک جو ترقی کی ہے بہر وجوہ باقاعدہ اور قابل اطمینان ہوئی ہے۔"

رپورٹ میں آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

"ابتدا میں یہ صرف جماعت ششم تک تھا۔ پھر ۱۸۹۰ء میں درجۂ مڈل بھی قائم کر دیا گیا (مذکورہ رام پور گزٹ صفحہ ۱۴)

اسلئے ۱۸۹۰ء میں مولانا محمد علی کا اس مدرسۂ انگریزی کے درجۂ مڈل میں ہونا قرینِ قیاس ہے۔
مبینہ نتیجے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد علی گڑھ چھوڑ کر مولانا محمد علی رامپور آئے ہیں۔ جس انگریزی اسٹیٹ ہائی اسکول کے پرنسپل مقرر کئے گئے تھے در اصل اُسی کے وہ اولڈ بوائے بھی تھے اور اُس نے بھی اپنے لائق متعلم کی تعمیر میں ایک مدلل ادا کیا تھا۔
یہ مضمون مولانا محمد علی کی ذہنی اور ساتذی زندگی کے دو رخ پیش کرتا ہے۔
۱۔ انگریزی تعلیم کے لئے فراخ دلی اور ذہنی وسعت۔
۲۔ گھریلو دینی تعلیم کے بعد اور ہائی اسکول میں داخلے سے پہلے درمیانی وقفے کی تعلیمی مشغولیت کا حال اسکول کے باقاعدہ طالب علم کی صورت میں۔

مولانا نے اپنی اس تحریر میں انگریزی تعلیم کی جس شدومد سے تائید کی ہے اسے کورانہ فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مضمون مولانا حالی اور سر سید احمد خاں کے قلم سے نکلا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ انہیں کی بازگشت ہو۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لئے بھی مولانا محمد علی کی عملی زندگی کو دیکھنا چاہئے جس کے بعد یقیناً یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر خالص مشرقی عادات وخصائل کے آدمی تھے۔ اپنے لباس میں بھی کسی نہ کسی حد تک اپنی عمر کے ہر حصے میں انہوں نے مشرق و مغرب کو برقرار رکھا ہے۔ وہ ان لوگوں میں کبھی نہ تھے جو مغربی ماحول کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہوں اور احساس کمتری کا شکار اس انداز میں ہوتے ہوں کہ اپنی مادری زبان بولنا بھی انہیں گناہ معلوم ہو۔ انہوں نے خود سپردگی کی وہ روش بھی اختیار نہ کی جس میں قومی مزاج کی نفی اور مذہبی احترام سے لاپروائی ثابت ہوتی ہو۔ وہ جذباتی ضرور تھے لیکن بگڑتے ہوئے نہیں مبتلا ہوئے افراط و تفریط سے دور۔

اصل تحریر سے پہلے یہ بات نذرتنا بتلانی کہ انسپکٹر مدارس کی رپورٹ اور طالب علم محمد علی کے مضمون کی تاریخ ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں مدرسہ انگریزی کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھیں۔ اس لئے گزٹ میں دونوں پر ۱۰ اگست ۱۸۹۰ء اندراج تاریخ ہے۔
مولانا محمد علی کا یہ مضمون اس لئے قابل قدر ہے کہ یہ ایک ذہنی انقلاب کا نمائندہ ہے اور ایک تعلیمی انقلاب کی یادگار ہے جو آگے چل کر ہندوستان کی سرزمین خصوصاً مسلمانوں کی دنیا میں آیا۔ لیکن یہ اس لئے بھی مزید قابل قدر اور اہم ہو جاتا ہے کہ یہ اب تک کی قدیم ترین معلومہ تحریر ہے جسے رئیس الاحرار مولانا محمد علی سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس ایک چراغ سے ابھی کئی اور چراغ جلائے جا سکیں اور امید ہے کہ بطلِ حریت کی یہ قدیم ترین تحریر اپنی افادیت اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر ملک کے ثقافتی سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہوگا:

مضمون محمد علی خاں طالب علم مدرسۂ انگریزی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جب ہم غور سے دیکھتے ہیں ایک بڑا حصہ ہماری ابتدائی عمر کا افسوسناک نمونہ دکھاتا ہے۔ ہماری ابتدائی تعلیم محض ناقص اور ادھوری بلکہ خطرناک مرحلہ ہے۔ ایک مدت بغیر معنی الفاظ کے تعلیم پاکر فقط قوتِ حافظہ کو کام میں لاتے ہیں، فکر و غور کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ غرض کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ فکر و تامل کے معرکے میں ہماری عقل غیر مفید اور فکر نارسا ثابت ہوتی ہے۔ وہی ابتدائی زمانہ عجب زمانہ ہے، جس میں دل و دماغ صاف اور غیر مکدر ہوتے ہیں۔ فکر و غور کرنے کی عمدہ اور مضبوط بنیاد اسی وقت قائم ہو سکتی ہے۔ اس قوت کے پیدا ہو جانے سے شائستگی، تہذیب، علم و ہنر انواع اقسام کی دولت پر ثابت قدمی سے تصرف کر سکتے ہیں۔ اور جو باقی زندگی کہ ہم کو اس دنیا میں بسر کرنا ہے نہایت فارغ البالی سے بسر

کر سکتے ہیں۔ نہیں ہم ایسے اقبال مند کہاں تھے جو یہ دولت ہمارے ہاتھ آتی۔ ہم کو تو اول ہی حسن و عشق کی سوسائٹی میں شامل ہونا پڑا۔ قیس و فرہاد کی آشفتہ حالی کا نقشہ لیلیٰ و شیریں کے خوبی و جمال کی تصویر ہماری تعلیم کا جزو سمجھی گئی اول جب ہی مکتب میں قدم رکھا کسی کے یہ شعر بر زبان تھا:

اے داغ بر دل از غم حال تو لالہ را
شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را

اور کوئی یہ شعر از بر پڑھتا:

ما مقیمان کوئے دلداریم   رخ بدنیا و دیں نمی آریم

یہ پرانے فیشن کی (دقیانوسی) تعلیم ہے۔ جس تعلیم میں حکایاتِ عشق آمیز اور فسانہ ہائے جنوں خیز داخل ہوں اس سے بہتر نتیجے کی امید رکھنا محض فضول خیال ہے۔ بلکہ سادہ اور صاف طبیعت کو بڑے خطرناک رنگ میں رنگتی ہے۔

ہر تعلیم کے واسطے قدیم ہو یا جدید طبیعت کا یکسو ہونا بہت ضروری بات ہے۔ شاعرانہ خیال کی پابندی یا عشقیہ شعر و سخن کا مطالعہ طالب علم کے واسطے خراب اثر پہنچاتا ہے جیسے رداءت موسم، ہوا کو اور ہوا طبیعت کو اور طبیعت جسم کو اور جسم جان کو۔ تعلیم جدید کی جو ایشیائی رنگ سے بالکل سادہ اور جس کے اصول نہایت قیمتی اور قابل قدر ہیں ہمارے واسطے نہایت ضرورت ہے جیسے نابینا کو بینائی کی۔ باوجود کسی قدر تعلیم قدیم پانے کے ہنوز نامبارک لقب نیم وحشی انسان کا ہم سے واپس نہیں ہوا ہے۔ لیکن اب زمانہ بدل چلا ہے، زمانہ پہلے سے غیر ہے۔ مگر بیشتر ہم کو اپنی عادت کی اصلاح کرنا فرض ہوگی۔ ہماری رفاہ اور صلاح کا سارا سامان مہیا ہے، ہماری حالت بھی بدل جائے گی، ترقی کے زینے پر قدم جمائیں گے اور انشاء اللہ ضرور ترقی مدارج کو طے کریں گے۔

خدا کے فضل سے عالی جناب جنرل محمد اعظم الدین خاں صاحب بہادر وائس پریذیڈنٹ نے ان ضرورتوں کو ملاحظہ فرما کر یہ مدرسۂ علوم جدید نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ قائم کرایا۔ جناب ممدوح کی دلی توجہ اس مدرسے کی سرپرستی میں مصروف ہے۔ یہ ہونہار و تعلیم یافتہ نوجوان کا فرض ہے کہ اپنی عمدہ کوشش سے اپنی اعلیٰ لیاقت کا ثبوت جناب محتشم الیہ کے حضور میں پیش کرے۔ اس روز عالی جناب اپنی خاص توجہ کا آخری نتیجہ ملاحظہ فرما کر کس درجہ اظہار خوشنودی فرمائیں!

اے خدا جلد وہ مبارک دن دکھلا

محمد علی طالب علم مدرسۂ انگریزی رام پور اسٹیٹ
۱۸ر اگست ۱۸۹۰ء

★

ساہی محافظ دستہ کی سلامی (ایران)

رضا ساہ پہلوی کے مزار پر

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں :

(دورہٴ ایران و ترکی)

فیلڈ مارسل اپنے ساہی میزبان ، سہنشاہ ایران کے سا
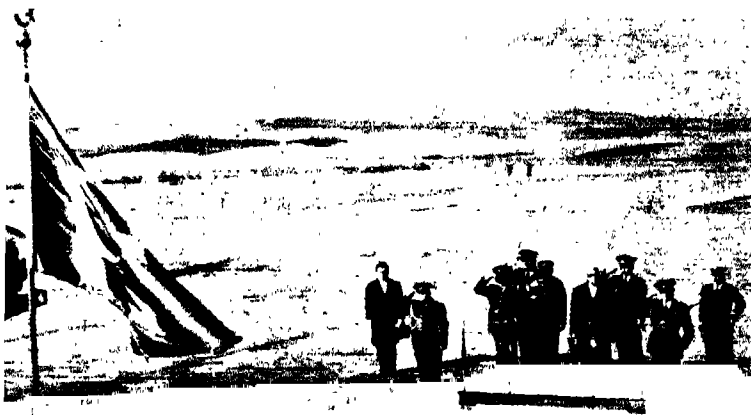
اتاترک کو خراج عقیدت
(مزار کی طرف روانگی)

ترکی دستہ کی سلامی
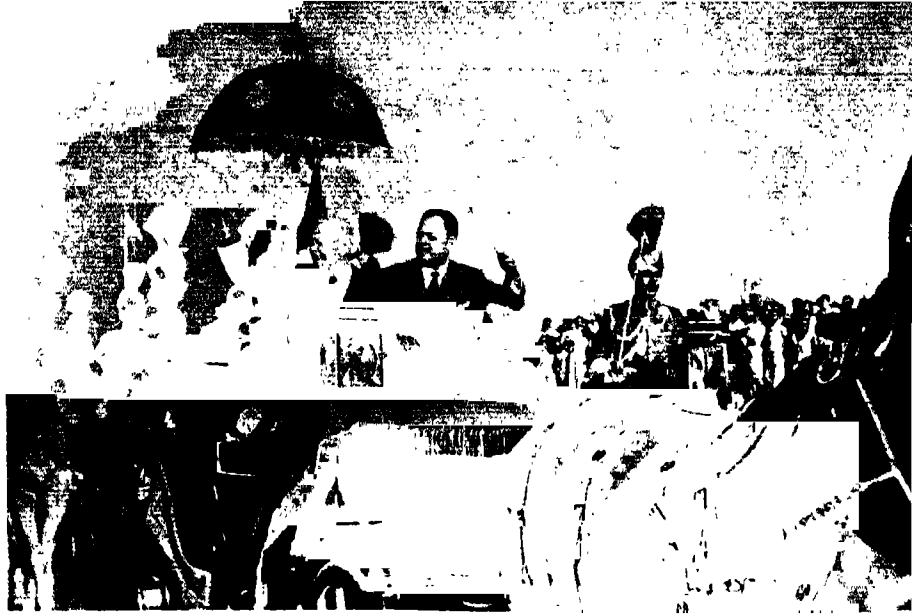
صدر آئزن ھاور پاکستان میں

۱ : صدر پاکستان کے خیر مقدم کا جواب
۲ : شاہی سواری
۳ : فضا سے کورنگی کی نوآبادی کا نظارہ
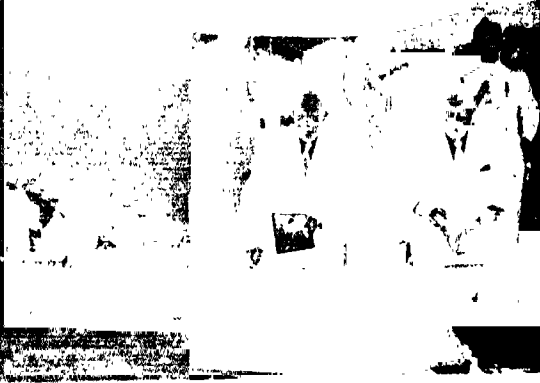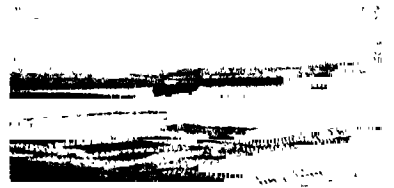
۴ : محافظ دستہ صدر پاکستان (مظاہرہ نیزہ بازی)
۵- ''آئی لائک آئیک!''
۶ : ''خوش آمدید''

اک شمع رہ گئی تھی ....

جمیل نقوی

بزمِ سخن آج پھر ماتم میں ہے۔ اسد ملتانی جو حالی، اکبر اور اقبال کے دور کی یادگار تھے ہم سے جدا ہو گئے۔ اس ماہ کو جہاں اقبال جیسے عظیم ہم بزمِ سخن کے سب مسافر ہم نشین ہیں۔ مرحوم کو ماہِ نو کے ساتھ ایک ربطِ خاص تھا اور وہ ہمیشہ بصد شوق اسے اپنے رشحاتِ قلم سے مستفید فرماتے رہے۔ ہم آج اپنی محرومی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں جو تمام شیدائے ادب کی محرومی بھی ہے۔ ہم ذیل میں مرحوم اسد ملتانی کے متعلق ایک مختصر نگارش پیش کر رہے ہیں جس میں ان کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے خدوخال اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے (مدیر)

محمد اسد خان اسد ملتانی ۱۳ دسمبر ۱۹۰۲ء کو کوہی افغانان ملتان شہر میں پیدا ہوئے ۔۔۔۔ نومبر ۱۹۵۹ء بمقام راولپنڈی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے والد خان غلام قادر خان قوم افغان خیرانی سے تعلق رکھتے تھے۔ اسد ملتانی مرحوم نے مشن اسکول ملتان اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا سیکرٹریٹ میں ملازم ہوئے۔ فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور سپرنٹنڈنٹ رہے۔ پاکستان بننے کے کچھ دنوں بعد وزارت ریاستہائے سرحدات میں اسسٹنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، اور آخر وقت تک اپنے فرائض منصبی کو بڑی دیانت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

اسد مرحوم بڑے مرنجان مرنج اور ملنسار بزرگ تھے۔ ان کی نظر اردو اور فارسی شاعری پر بہت وسیع تھی۔ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور اکثر اچھے شعر نکال لیتے تھے۔ کراچی آنے کے بعد ہی، غالباً ۱۹۴۹ء میں، میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے خواہ ان کا مقام کچھ ہی ہو لیکن بحیثیت ایک انسان انھوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ ان کی خاکساری کم سخنی بزرگانہ شفقت اور ایک ایسا خلوص جو عام طور پر میسر نہیں آتا، ان سب خصوصیتوں نے مل کر ان کی شخصیت کو نہایت پرکشش اور محبوب بنا دیا تھا۔ اس پر ہمدردی اور اسلام دوستی مستزاد تھی۔

مرحوم اسد ملتانی آج کی دنیا میں اگلے وقتوں کے بزرگوں کا ایک عمدہ نمونہ تھے۔ مغربی تعلیم نے انہیں مشرقی تصورات اور اسلامی معاشرت کا اور بھی زیادہ گرویدہ کر دیا تھا۔ انہیں اسلام اور مسلمان سے عشق تھا۔ قرآن اور حدیث پر انہیں کامل ایمان تھا۔ اور اس سلسلہ میں وہ کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے ایک دیرینہ عزیز دوست نے ایک مشہور رسالہ میں جب اس مسئلہ پر ایسے خیالات کا اظہار کیا جن سے اسد مرحوم کو اختلاف تھا تو مرحوم نے اپنے مکان پر ہفتہ وار جلسوں کا انتظام کیا اور ایک مشہور عالمِ دین کو اس "فتنہ" کو دبانے کے لئے مواعظ کی دعوت دی۔ پند و موعظت کا یہ سلسلہ اُن کے راولپنڈی جانے تک جاری رہا۔

خود اسد ملتانی صاحب کے بیان کے مطابق انہوں نے نو دس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن کالج میں پہنچنے کے بعد باقاعدگی سے شاعری کرنے لگے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں کالج میں نظم گوئی کا ایک مقابلہ ہوا تھا جس میں ان کی نظم کو اول قرار دیا گیا تھا اور انعام بھی ملا تھا۔ مقابلہ میں داخل کرنے سے پہلے انہوں نے اپنی نظم علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پیش کی تھی جس پر انہوں نے ازراہِ کرم اصلاح فرما دی اور نظم کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اور انعام کی مستحق قرار پائی۔ زمانہ طالب علمی میں سخن وری اور سخن فہمی کی چار دیواری تک ہی محدود رہی لیکن یہی وہ زمانہ تھا جبکہ اسد ملتانی نے مشقِ سخن بہم پہنچائی اور فنِ شعر پر عبور حاصل کیا۔ تعلیمی مشاغل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے باقاعدہ شعر کہنا شروع

کر دیا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اکثر نظمیں لکھیں جنہیں افغانستان کے رسائل میں بھی اکثر نقل کیا گیا۔ روزنامہ "زمیندار" اور "انقلاب" میں بھی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ نیرنگ خیال، ہمایوں، درخشاں سے ادبی رسائل میں بھی بالالتزام لکھنا شروع کیا۔ لیکن ۱۹۲۵ء سے زیادہ تر نظمیں رسالہ معارف اعظم گڑھ میں ہی چھپتی رہیں۔ یا پھر تقریباً ۱۹۳۸ء سے رسالہ "طلوع اسلام" میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ "ماہِ نو" میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ لیکن بجز "مرثیہ اقبال" اور "بانگ حرم" کے جنہیں مرحوم نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا ان کا مجموعہ کلام ابھی تک اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ سنا ہے وہ عرصہ سے اپنے کلام کو مجموعہ کی شکل میں مرتب کر رہے تھے مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

یوں تو اسد ملتانی نے صنف غزل کو بھی بہت کچھ نوازا ہے لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے۔ فی الحقیقت وہ بنیادی طور پر نظم ہی کے شاعر تھے اور ان کا بیشتر ادبی سرمایہ نظم ہی کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن ان کی نظمیں جدید شعرا کی نظموں سے باعتبار مزاج اور باعتبار انداز بیان یکسر مختلف ہیں۔ ان کی نظموں کو مذہبی، سیاسی، وطنی، اور اصلاحی وغیرہ عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اسد ملتانی کی نظموں میں اکبر کا طنز، حالی کے پند و نصائح قومی درد اور اقبال کا تفکر اور حب الوطنی کا ایک نہایت عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ موجودہ دور میں وہ واحد شاعر تھے جس نے حالی اور اقبال کی روش شاعری کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ برتا بلکہ اس نے کو آگے بڑھایا اور اس کی مصلحانہ شان برقرار رکھی۔ قومی شاعری جدید انداز میں بھی کی جاتی ہے لیکن وہ دل سے زیادہ دماغ کی شاعری ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں جو بات ہے وہ جدید قومی شاعری میں نہیں ملتی۔ حالی اور اقبال براہ راست قلب و روح کو متاثر کرتے ہیں۔ اسد ملتانی بھی اسی ڈگر پر چلے ہیں اور انہوں نے بھی اپنی شاعری کی بنیاد خلوص اور حب الوطنی پر رکھی ہے۔ انہوں نے سچی باتیں بڑی سادگی اور سلاست کے ساتھ بڑے معصومانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ خواہ غزل ہو یا نظم ان کے یہاں دونوں کا مزاج یکساں ہے۔ دینی اصلاح کی کوشش، اسلام اور مسلمانوں کی بہبودی و بہتری کے مضامین، مذہبی اور سیاسی مسائل کا بیان۔ قومی اور ملی عظمت کے ترانے اخلاقی اور اجتماعی قدروں کا پرچار۔ حسن عمل کی تلقین، بنی نوع انسان کا درد، یہ تمام موضوعات یوں دیکھنے میں تو بہت آسان نظر آتے ہیں مگر انہیں شعر کے قالب میں اس طرح ڈھالنا کہ شاعرانہ وقار بھی قائم رہے اور عام فہم انداز میں بات نہ صرف پورے طور پر ادا ہو جائے بلکہ قاری اور سامع کے دل و دماغ پر وہ تاثر بھی پیدا کر سکے جو اس کا اصل مقصود ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر شاعری صنعت گری ہو جاتی ہے۔ اور اگر شاعر کا خلوص کارفرما نہ ہو اور اس کے اپنے دل و دماغ پر موضوع کلام کا بھرپور موجود نہ ہو اور اس کی تمام جزئیات پر اسے عبور حاصل نہ ہو تو ایک مصرعہ ترتیب دینا بھی مشکل ہوگا۔ اکبر، حالی اور اقبال کی طرح اسد ملتانی نے بھی یہ ہفتخواں بڑے اہتمام سے طے کیا ہے اور اکثر و بیشتر وہ خاطر خواہ طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

یوں تو اسد ملتانی نے غزلیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں اور عام روش سے ہٹ کر اچھے اچھے شعر نکالے ہیں لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے جہاں ان کے فطری جوہر پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں خصوصاً مسائل حاضرہ پر ان کی بعض نظمیں بڑی کامیاب ہیں۔ مثلاً جب شہید ملت مرحوم کی قیادت میں قرارداد مقاصد منظور کی گئی تو اسد ملتانی نے اس بنیادی اقدام کا بڑے لطیف انداز میں خیر مقدم کیا ہے:

اب پھر کسی کے حسن کا چرچا ہوا تو ہے
اس دور میں بھی عشق کا دعویٰ ہوا تو ہے
تو مضطرب کہ جلوہ ابھی عام کیوں نہیں
میں اس پہ مطمئن کہ تقاضا ہوا تو ہے
پھر ہو چلی ہے جرأت پرواز کی امید
روئے نگاہ سوئے ثریا ہوا تو ہے
آثار سربلندی اسلام ہیں عیاں
دنیا و دیں کا سلسلہ یکجا ہوا تو ہے
انجام کے لئے بھی خدا کارساز ہے
آغاز کار حسب تمنا ہوا تو ہے
افرنگ سے حجاز کی جانب پھرا ہے رخ
قبلہ بنائے قوم کا سیدھا ہوا تو ہے

ایک اور موقع پر انہوں نے کیسی اچھی بات کہی تھی ؎

ملت کی عمارت ابھی تیار نہیں
سامان تو موجود ہے معمار نہیں
ترشی ہوئی اینٹوں کے کچھ انبار نہیں
اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں

اسد ملتانی کی ملی نظموں میں مجھے ان کی نظم "آئینِ نو" سب سے زیادہ پسند ہے۔ جو ۱۹۵۶ء میں انہوں نے نیا دستور جاری ہونے پر لکھی تھی اس کا ایک ایک لفظ کیف و اثر میں ڈوبا ہوا ہے ؎

سبز ہوئی شاخ شاخ پھول بنی ہر کلی
باغ ہوا باغ باغ۔ بادِ بہاری چلی
تا کہ عروسِ بہار اس پہ ہو گرمِ خرام
سبزۂ نو رستہ کا فرش بچھا مخملی
صحنِ گلستاں میں پھر ذکرِ محبت چلا
دل کے شبستاں میں پھر شمعِ مسرت جلی
تھی افقِ شرق پر چھائی جو کالی گھٹا
اس کی سیاہی ذرا رنگِ شفق میں ڈھلی
دور تذبذب گیا، ختم ہوا اضطراب
دل کو سکوں مل گیا، دور ہوئی بےکلی
آج ہوئی رونما حریتِ کاملہ
سایۂ اغیار کی سر سے مصیبت ٹلی

اقبال کو تو اپنا امام تصور کرتے تھے انہوں نے اپنی شاعری کا نصب العین ہی اس بات کو قرار دے رکھا تھا کہ اقبال کے "نورِ بصیرت" اور "سوزِ عشق" کو عام کریں۔ ان کی کامیاب ترین نظمیں وہی ہیں جہاں انہوں نے روحِ اقبال سے فیض حاصل کیا ہے۔

قائد اعظم کے متعلق یہ اشعار تمام تر حقیقت ہی کے آئینہ دار ہیں:

قائد اعظم نے ملت پر یہ احساں کر دیا
عقل و تدبیر و سیاست کو مسلماں کر دیا
ہے کمی کوئی تو کوتاہی ہماری ہے اسد
اس نے تو آزادیٔ کامل کا ساماں کر دیا
شاعرِ مشرق نے پاکستان کا دیکھا تھا خواب
قائد اعظم نے ساماں کر دیا تعبیر کا

اگرچہ اسد ملتانی نے اپنی نظمیں ایک اضطراری کیفیت اور وقتی تاثر کے ماتحت لکھی ہیں، اسکے باوجود ان کی ایک مستقل حیثیت بھی ہے۔ وہ آج بھی اتنی ہی نئی ہیں جیسی وہ تخلیق کے وقت تھیں۔ مجھے یقین ہے ہماری ملی شاعری میں انہیں ایک باوقعت مقام حاصل رہے گا، پھر وہ نظمیں جو مذہبی مسائل پر مبنی ہیں۔ ان کی واقعی افادیت سے کسی وقت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"سفینۂ عرب" کے عنوان سے حاجیوں کی پاکستان سے روانگی کا سماں کتنے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

وہ دن بھی آخر آگیا کہ جس کا انتظار تھا
ادھر حرم کا قافلہ ادھر عزیز و اقربا
دلوں میں خیر کی دعا سلامِ شوق برملا
یہی تھا سلسلہ کہ جب
چلا "سفینۂ عرب"
وہ دوستوں کی انجمن وہ ہم نشیں وہ ہم سخن
وہ دلبرانِ سحر فن وہ گھر وہ کشت و چمن
عزیز خطۂ وطن لگی دلوں میں کیا لگن
کہ چھوڑ کر یہ سب کے سب
چلا "سفینۂ عرب"

ایسے ہی اردو کو قومی زبان بنانے کی کس خوبصورتی کے ساتھ وکالت کرتے ہیں ؎

ہر چند اردو میں محاسن ہیں جلی
اغیار سے جو داد اسے ملنی تھی مل لی
کیا ننگ کی بات اس سے اگر چھٹ گئی دلی
ہے اب بھی ہمارے لئے سرمایۂ ملی
ارباب وطن ہمدم و ہمراز ہیں اس کے
یک دل ہیں اگر دیں سے ہم آواز ہیں اس کے

اور آگے چل کر نظم کو اس طرح ختم کرتے ہیں ؎

واپس وطن آئی ہے مسافر نہیں اردو
اس ملک کی مالک ہے مہاجر نہیں اردو

حالانکہ اسد ملتانی بنیادی طور پر میدانِ نظم کے ہی یکہ تاز ہیں لیکن غزل بھی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے کافی فیضیاب ہوتی

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

اِک فرد، اِک دَور

(مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی یاد میں)

جگن ناتھ آزاد

پھر آئی ہے اردو کے گلستاں میں خزاں آج
پھر ہے لبِ افکار و حوادث پہ فغاں آج
پھر سینۂ الفاظ سے اٹھتا ہے دھواں آج
پھر دیدۂ معنیٰ سے ہوا خون رواں آج

پھر نالہ و زاری ہے صحافت کی زباں پر
ماتم کا ہے اک شور ظرافت کی زباں پر

اے بزمِ وفا! کون تجھے چھوڑ چلا ہے
ہر لب پہ جو فریاد ہے نالہ ہے بکا ہے
دنیائے سخن کون الگ تجھ سے ہوا ہے
اے شعر و ادب! تم پہ یہ کیا وقت پڑا ہے

ماتم ہے یہ آزاد! نئے طور کا ماتم
اک فرد کا ماتم ہے کہ اک دور کا ماتم

محفل کو گیا چھوڑ کے محفل کا وہ محبوب
ہر بات رہی جس کی پسندیدہ و مرغوب
جس کی نگہِ فیض سے ناخوب ہوئے خوب
کہتے تھے جسے اہلِ نظر کعبۂ مطلوب

اب کعبۂ مطلوب وہ پائیں تو کہاں ہم
اے وحشتِ دل بول کہ جائیں تو کہاں ہم

جس بزم میں تازہ تھا ابھی بخاری کا ابھی غم
اختر کا الم، حسرت و تاثیر کا ماتم
جیکش کی جہاں یاد ہوئی تھی نہ ابھی کم
جس بزم میں اک دردِ مسلسل کا تھا عالم

اس بزم سے سالک بھی ہوئے آج روانہ
یا بزم سے ہے بزم کا سرتاج روانہ

وہ پیار کا شفقت کا عنایت کا خزینہ
اخلاص و محبت کا مودّت کا خزینہ
وہ مہر و وفا کا وہ مروّت کا خزینہ
مٹتی ہوئی دیرینہ شرافت کا خزینہ

آخر کو لٹا گردشِ ایّام کے ہاتھوں
یا صبح کی تنویر مٹی شام کے ہاتھوں

کتنوں کو شرابِ سخن و شعر پلا کر
کتنوں کو حسیں نثر کے جادے پہ لگا کر
کتنوں کو نشانِ منزلِ مقصد کا بتا کر
کتنوں کو غمِ عشق کے آداب سکھا کر

ہر راہ میں نقشِ کفِ پا چھوڑ گیا ہے
قندیلِ محبت کی ضیا چھوڑ گیا ہے

اے وقت! خبر ہے کہ وہ کیا دے کے گیا ہے
کیا شے وہ تجھے مردِ خدا دے کے گیا ہے
اک دل وہ تجھے درد بھرا دے کے گیا ہے
اک روشنیٔ مہر و وفا دے کے گیا ہے

جو دردِ ازل اُس کی زباں پر تھا ترانہ
وہ درد ہے اب تیرا گراں مایہ خزانہ

سالک کے حسیں طرزِ بیاں، طرزِ ادا سے
اک سوز میں ڈوبی ہوئی پُر کیف نوا سے
جو دے کے گیا ہے تجھے اس درسِ وفا سے
اے نسلِ نوی اس کے تفکر کی ضیا سے

ممکن ہو تو کسبِ ادب و کسبِ ہنر کو
تاریکیٔ شب ہائے غمِ دل کی سحر کر

اے خاکِ وطن! منزلِ مقصودِ محبت
قرباں ترے ذرّوں پہ مرے اشکِ ارادت
مانا کہ ہے ناچیز بہت میری عقیدت
پہلے بھی کچھ آساں نہ تھی تیری زیارت

اس راہ میں اب ایک رکاوٹ سی پڑی اور
اک ٹوٹ گئی رشتۂ الفت کی کڑی اور

★

ڈرامہ:

وہ لوگ

ہاجرہ مسرور

کردار:

بابا خیرو: لمبی سفید داڑھی، سیاہ رنگت، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے — سیاہ تہمد اور کھدر کی آستینوں والی صدری جسم پر ننگے پاؤں — گلے میں کپڑے سے منڈھا ہوا تعویذ۔

اماں: خیرو کی بیوی۔ ادھیڑ عمر کی دُبلی پتلی عورت۔ ماتھے پر سیاہ کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ میلے، ڈھیلے ڈھالے چوڑی دار پاجامے اور لمبے کرتے میں ملبوس۔ سر پر دوپٹہ جس میں سے کندھوں پر پڑے ہوئے کھچڑی بال جھانکتے ہیں۔ گلے میں موٹے منکوں کی تسبیح۔

زینب: ان کی بڑی بیوہ بیٹی۔ عمر تیس سال۔ کالے دوپٹے لمبے کرتے اور چھوٹے پائنچوں کی سیاہ شلوار پہنے ہوئے ہے۔

جنت: چھوٹی بیٹی۔ عمر بیس سال جسم پر سستی ریشم کی قدرے میلی شلوار اور قمیص۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں اور ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں۔

رجو: زینب کی بارہ تیرہ سال کی لڑکی۔ اٹنگی شلوار اور اونچی سی قمیص پہنے، سر پر گز بھر کا میلا سا کپڑا، ننگے پاؤں، بکھرے ہوئے بال۔ ہر بات ہنس کر لاپروائی سے کرتی ہے۔

صدو: زینب کا لڑکا۔ عمر دس سال تہمد اور بنیان میں ملبوس۔ پاؤں میں کینوس کا پرانا جوتا۔ جلدی جلدی بے حد جوش سے بولتا ہے۔

گلو: بابا خیرو کا بیٹا۔ عمر سترہ اٹھارہ سال۔ نئی نئی پھوٹی ہوئی داڑھی مونچھیں جسم پہ پاجامہ اور کرتہ، سر پہ کپڑے کی گول ٹوپی — پاؤں میں جوتا۔

ننھا: جنت کا ڈیڑھ سالہ بچہ

مقام: ایک بڑا قصبہ

زمانہ: جو چاہے سمجھ لیجئے۔

منظر:

(پردہ اٹھتا ہے تو ایک جھونپڑا نظر آتا ہے۔ جس کا صرف سامنے کی طرف ایک دروازہ ہے۔ جھونپڑی کے اگلے حصے پر پھونس کا چھپر ہے اس چھپر تلے ایک طرف حسب کم مٹی کا چولھا بنا ہوا ہے جس میں بے تحاشہ راکھ بھری ہوئی ہے اس کے قریب ہی درختوں سے توڑی ہوئی چند سوکھی ٹہنیاں، دو چار اُپلے اور سوکھے پتے ڈھیر ہیں۔ سامنے ہی چند المونیم کے برتن اور مٹی کا گھڑا پڑا ہوا ہے۔ دائیں بائیں مٹی کی نیچی چار دیواری پر اُپلے سوکھ رہے ہیں صحن میں ایک طرف مٹی کے بدھنے اور ڈبے ڈھیر ہیں۔ یہ ہلکی سردیوں کی ایک شام ہے، سورج ابھی غروب نہیں ہوا اس لئے زرد ہوتی ہوئی دھوپ سے چھپر کا کچھ حصہ اور بائیں ہاتھ کی دیوار روشن ہے۔ اس دیوار سے ٹیک لگائے اماں حقہ سامنے رکھے بیٹھی اونگھ رہی ہے۔ چھپر تلے کھاٹ پر جنت کنگھی کر رہی ہے کنگھی سے زیادہ وہ اپنے چہرے کی طرف متوجہ ہے۔ بار بار وہ چھوٹے سے شیشے میں جھک کر اپنا چہرہ دیکھتی ہے، کبھی ناک کی کیل گھماتی ہے اور کبھی گریبان کے چاندی کے بٹنوں کو چھوتی ہے۔ اس دوران میں اکثر وہ نظر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھتی ہے جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ زینب چولھے کے پاس اکڑوں بیٹھی گندھے ہوئے آٹے کو ٹکیاں لگا رہی ہے اور بار بار غصے اور حقارت سے جنت کی طرف دیکھتی جاتی ہے — چند لمحے بعد بڑھیا اونگھتے سے چونک کر حقے کی نے ہونٹوں میں دباتی ہے اور پھر کھانسنا شروع کر دیتی ہے۔)

اماں: (کھانسی سے نجات پا کر لمبا سانس لیتے ہوئے) اری جینب (زینب) چلم میں آگ ڈال دے بجھ گئی۔

زینب: اتی دیر ہوئی جنت سے کہا تھا تو نے کہ چولھا سلگا دے۔ اب ہی

سے آگ مانگو۔ گھنٹے بھر سے بیٹھی مانگ پٹی کر رہی ہے۔

جنت: (ہاتھ پھیلا کر لڑنے کے انداز سے) ابھی سے چولھا سلگا دوں جیسے بڑے پلاؤ قورمے پکنے ہیں۔

زینب: (منہ بنا کر) ہنہ تیری سسرال میں تو روج (روز) پلاؤ پکتا ہے نا!

جنت: لے، پھر میری سسرال کا نام لیا؟ — دیکھ لے اماں! میں کوئی کہتی ہوں میرے گھر روج (روز) پلاؤ پکتا ہے؟ ہاں جب کوئی مہمان آئے تب تو جرور (ضرور) پلاؤ پکتا ہوا۔ (کنگھا رکھ کر آئینے میں منہ دیکھتی ہے اور چوٹی گوندھنے لگتی ہے)

اماں: اور کل دال نہیں پکوائی تھی اس کمیال سے کہ تیرا میاں آتا ہوگا۔

زینب: اور گھی سے بگھار بھی تو لگایا تھا — کیسی منت کی تھی بابا نے فضلو پرچونئے کی تب اُدھار دال اور گھی اس نے دیا تھا (جلدی جلدی آٹے پر مکیاں لگاتی ہے)

جنت: (گندھی چوٹی پشت پر پھینک کر) ہاں تیرے تو دل پر لکھ گیا۔ اگر وہ آکر گھی سے بگھاری دال کھا لیتا تو جانے کتنے جکر (ذکر) کرتی دنیا بھر میں۔

زینب: (ہونٹوں پر حیرت سے انگلی رکھ کر) ہائے ری جنت تو تو یوں ہی بگڑ جاتی ہے۔ میں نے تو یوں ہی کہا تیری بات پر — (سر جھٹک کر دوبارہ آٹے کی طرف متوجہ ہو کر) تیرا میاں بیچارہ کون روج روج آتا ہے۔ میں نے تو آپ اماں سے کہا تھا کہ دال جرور پکے، جنت کا میاں ایک دن کو آئے اور روکھی روٹی کھا کر جائے کیسی سرم (شرم) کی بات ہے۔

جنت: (منہ پھلا کر مگر نسبتاً کم غصے میں) کل اس کو روکھی روٹی دینا سرم (شرم) کی بات تھی اور آج؟ آج تو وہ جرور (ضرور) پہنچے گا — پھر؟

اماں: (تھوڑا سا کھانس کر) تیرے سامنے مہرو کو پرچونئے کی دکان پر نہیں بھیجا تھا؟ اب وہ اُدھار نہ دے تو تیری میّا کیا کرے۔ (کمر پکڑ کر اٹھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر) تیرا بابا کیا کرے؟ اپنے حصے کے رزق پر تو سانپ جیسے والے بابا خضر کا سایہ پڑ گیا جیسے — کتنے دن ہو گئے آج؟ کوئی نہ آیا۔ (کچھ سوچ کر تیز آواز میں) لا، جینب وہ اماں کی دیگچی اٹھا دے، اسے رکھ کر تو پرچونیا دال دے دے گا۔

جنت: (کھاٹ سے اٹھ کر ایک دم ہنستے ہوئے) لے بھلا اماں کی بات دیکھ جینب (زینب) (ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر) دیگچی پرچونئے کے پاس رکھ دے گی تو دال کاہے میں پکائی گی؟

زینب: (سنجیدگی سے) اور کیا —

(جنت ہنستے ہنستے چپ ہو جاتی ہے۔ اور پھر آئینہ اٹھا کر کوٹھری کے دروازے میں غائب ہو جاتی ہے۔ اس دوران میں بڑھیا اماں چولھے کے پاس بیٹھ کر ٹھنڈا چولھا کرید تی ہے۔ آگ نہ پا کر دیوار میں بنے ہوئے چھوٹے سے طاق پر سے ماچس کی ڈبیا اٹھاتی ہے۔ اسے ہلا کر دیکھتی ہے اور پھر ماچس خالی پا کر اس کے ڈھکنے سے ایک تنکا توڑ کر دوبارہ آہستہ آہستہ چلتی دیوار کے پاس دھوپ میں بیٹھ کر تنکے سے خلال کرنے لگتی ہے جنت کوٹھری سے نکل کر دوبارہ کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے۔)

زینب: (جنت کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے) سورج ڈوبے رہ جا بیٹھوں گی۔ شاید کوئی دیا جلا جائے۔ تیرا میاں آگیا تو اس کی روٹی پر تیل چپڑ دیں گے۔

(جنت کوئی جواب نہیں دیتی، صرف اپنی ٹانگیں ہلاتی رہتی ہے اور بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ بڑھیا آنکھیں بند کئے خلال کئے جاتی ہے، اور زینب سر جھکا کر زور زور سے آٹے پر مکیاں لگانے لگتی ہے)

(چند لمحے کے وقفے کے بعد)

(مہرو اندر بھاگتا ہوا آتا ہے، اس کے چہرے پر ہنسی ہے اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں۔ وہ بے حد بے تابی سے ادھر ادھر جیسے کچھ نظروں ہی نظروں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے)

زینب: مہرو دال لایا؟

مہرو: وہ — وہ — آگیا

جنت: (کھاٹ سے اٹھ کر) آگیا؟ اندر لے آ رے مہرو۔ (سر پہ دوپٹہ ٹھیک کرتی ہے)

مہرو: (ٹھٹک کر پھر ہنستے ہوئے) خالو تو پھر آئے گا — بابا؟ — نہیں ہے؟ (بھاگ کر کوٹھری میں دیکھ کر لوٹتا ہے) کدھر ہے؟

(کیا ہے رے کیوں ہر وقت بابا، بابا کرتا ہے — جب سے دو بار بابا کو آکر آوا جیں مار گیا — بابا کو تو سیل سپاٹا چاہئے۔ جرا کوئی بات ہوئی اور بگڑ کر گھر سے نکل گیا۔

: (خوب زور سے ہنس کر) ارے بابا کا کام آیا ہے نانی —

(تینوں عورتیں کھل اٹھتی ہیں)

: (آسمان کی طرف منہ اٹھا کر) اللہ! (ایک ہاتھ اٹھا کر مسکراتی ہے)

: (اِدھر اُدھر بے تابی سے گھوم کر) ماموں کو لے گئے موٹر میں بٹھا کر میاں مسجد کے پاس کھڑا تھا۔

: (حیرت اور خوشی سے ہاتھ بڑھا کر) موٹر میں بیٹھ کر گیا ہے تیرا ماموں؟

(جنت اور زینب بھی خوشی سے کھڑی ہو جاتی ہیں)

ت: ہا — سچ؟

: ماموں نے چلتے وکھت (وقت) کہا جلدی سے بابا سے کہدے کھودنا شروع کر دے — اور کھودے بڑی۔

پ: (آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ بڑھا کر جلدی جلدی) ہائے میرے لال تو نہیں جانتا بابا سویرے کا روٹھ کر گھر سے نکلا ہے تیرے سامنے؟ — اِدھر کیا ڈھونڈنے آیا ہے۔ جا رکھو کے اڈے پر دیکھ میرے چاند — بابا وہاں ہو تو اسے چپکے سے بلا نا الگ اور دیکھ رکھو کے سامنے کچھ نہ کہیو — نہیں تو —

ت: (بے حد بے تابی سے) ہاں وہاں نہ ہو تو پھر چونے کی دکان پر بھی دیکھنا۔ حُکّے (حقے) کی لالچ میں وہاں جرور ایک آدھ بار جائے گا۔ ہائے جلدی کر مہرو۔ کہیں تو جرور ہو گا بابا — (مہرو باہر کی طرف بھاگتا ہے۔ جنت چلا کر) اور دیکھ مہرو یوں ہنستا ہوا نہ جا۔ شاہ دین نہ تاڑ لے پرسوں کی طرح۔

: (ہاتھ اٹھا کر بھاگتے ہوئے) اچھا — اچھا۔

(جنت لوٹ کر اماں کی طرف آتی ہے جو ابھی تک آسمان کی طرف منہ اٹھائے مسکرا رہی ہے)

ت: اری اماں اللہ سے باتیں پھر کر لیجیو — جرا تو بھی باہر ایک نجر مار لے دیکھ بابا یہیں کہیں پھر رہا ہو شاید۔

(اماں غصے سے سر جھٹک کر تیز تیز چلتی کوٹھری کی طرف جاتی ہے)

: اے اماں اُدھر کہاں — (حیرت سے اس کا راستہ روکتی ہے)

اماں: (زینب کا ہاتھ جھٹک کر) چل ہٹ سامنے سے۔ (اندر جا کر دوسرے لمحے پھاوڑا اکڑاں کندھے پر اٹھائے بے حد شان سے صحن میں آجاتی ہے۔)

زینب: (تقریباً چیخ کر) اماں! (پھاوڑا ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتی ہے)

اماں (آنکھیں نکال کر اور لفظ جما جما کر) کیا میں تیرے بابا کے انتجار میں بیٹھی رہوں گی؟ اس دن بھی تو تیرا بابا گھر سے روٹھا تھا اور شاہ دین نے اپنی جیب گرم کی تھی — تو چاہتی ہے آج بھی شاہ دین — ہنہ

(بڑے غرور سے سر اٹھا کر باہر چلی جاتی ہے
جنت اور زینب ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھتی
ہیں۔ اور پھر جنت آنکھیں جھپکا کر ہنس پڑتی ہے)

جنت: (کچھ سنجیدہ ہو کر) اماں کھودے گی جینب؟

زینب: (سنجیدگی سے) اماں کھُدے (غصے) میں ہو تو کیا نہ کر لے۔! (ذرا رک کر) شاہ دین کی عورت نے دیکھ لیا تو کیا کیا باتیں نہ بنائے گی

جنت: ہنہ! باتیں بنائے گی تو بنائے۔ ہمیں کچھ دے تو نہ دے گی؟

زینب: (بے دھیانی سے دور دیکھتے ہوئے) کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا بس اللہ میاں دینے والا ہے۔ لوگ تو دوسروں کے منہ کا نوالہ چھیننے کو پھرتے ہیں۔

جنت (آن سنی کر کے دروازے کی طرف جا کر) بابا تو نظر نہیں پڑتا اماں کیسے کرے گی اتنی جلدی۔ کیوں جینب (زینب) کل بابا نے اُدھر ٹیلے پر تھوڑی کھدائی تو کی تھی — اماں بھی وہیں سے مٹی نکالے گی نا؟

زینب: ہاں — کل بابا نے کام پورا کر لیا ہوتا تو کوئی فکر نہ تھی۔ پر اسے کیا پتہ تھا کہ آج جرور ہی اللہ رزق بھیجے گا۔ (فکرمند سی ہو کر دروازے کے پاس جنت کے قریب آ کر) جو بھی گھنٹے بھر تیرے ننھے کو لے کر باہر گئی تو ابھی تک نہ لوٹی — وہ ہوتی تو اس کو اماں کے پاس بٹھاتی۔ بے چاری نے کب سے تمبا کو نہیں پی۔

جنت: (بے حد بے چینی سے) موئے مالوں کے سب کام جلدی کے

ہوتے ہیں۔ اماں بیٹھ کر حُکہ (حقہ) پیئے گی تو کام کیسے بنے گا۔ دیکھ بیجو بس چرا (ذرا) میں آ پہنچیں گے، بے کر ــــ میں نے تو سنا یہ لوگ روتے بھی نہیں جی بھر کے۔ بس جلدی جلدی اٹھا دیتے ہیں ــــ

(جنت اس اضطراری کیفیت میں ہاتھ ملتی دروازے کے پاس سے ہٹ کر اسی جگہ دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے جہاں پہلے اماں بیٹھی ہوئی تھی۔ دھوپ اب دیوار کے اوپری حصے پر پہنچ چکی ہے ــــ زینب بھی دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی دوبارہ چولھے کے پاس بیٹھ کر آٹے میں مکیاں مارنے لگتی ہے)

جنت: (منمنا کر جیسے خود سے) بابا کو اتنا کھیال (خیال) نہیں کہ میں سسرال جانے کو بیٹھی ہوں، کیا کھالی ہاتھ جاؤں گی ــــ آج ہی کے دن اسے بھی رو ٹھنا تھا ــــ کسی کو میرا کھیال نہیں ــــ سال بعد مائیکے آئی، میری سا س نہیں پوچھے گی لا دکھا کیا لائی بابا بھیا کے گھر سے، لے جھلا دیکھو تو ــــ

زینب: ارے جنت کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ میری بے باپ کی لونڈیا بارہ برس کی ہو جائے گی اب کے رجب کے چاند۔ اس کے بیاہ کے لئے تولہ بھر چاندی بھی کسی نے کھرید (خرید) کر نہ رکھی۔ (لمبی سانس لے کر مدھم آواز میں) بابا کے پاس تو اب محنت کرنے کو ہاتھ پاؤں میں طاکت (طاقت) نہیں ایک جمانہ (زمانہ) تھا اس جگہ ایک ایک دن میں دو دو تین تین کو دھرنے کا ٹھیکہ کر لیتا تھا ــــ کیا مجال ہے کسی کی مرد ہی ہوتی یا تڑاکے کی گرمی ایسے دن بابا پہ رزق برستا۔

جنت: بھیا گلّو کو جو بابا نے پڑھوا پڑھوا کر حافظ بنوایا تو کس کام کا ــــ نماج (نماز) وہ پڑھا دے۔ گسل (غسل) وہ ڈال دے۔ مسجد (مسجد) کے امام صاحب بھی بڑے دل کے نہیں آج بھی دیکھ آپ نہ گئے بھیا کو موٹر میں بھیج دیا۔ میرے ہوتے دو تین گسل تو اس نے ڈالے۔ پھر اس کی کمائی کدھر جاتی ہے؟

زینب: (رچل آتے پر دوایک تھپڑے لگا کر کونڈی ایک طرف ہٹا کر) دورت چھوڑ حساب کتاب۔ میری لونڈیا تو سورج چھپے دیئے ڈھونڈتی پھرتی ہے اور جیرا بہت تیل اکٹھا کرتی ہے۔ وہی تیل بیچ کر تو میں نے ایک شنون کی اوڑھنی کھریدی۔ وہی تو نے دیکھی اور اب بیٹھ کر بھائی کی کمائی کا حساب لینے لگی مجھ سے۔ (جھٹکے سے اٹھ کر دیوار پر ٹنگی ٹوکری اتارتی ہے اور آٹے پر الٹی ڈھک دیتی ہے) اب تو اللہ مارے لوگ دیئے بھی کم ہی جلاتے ہیں۔ بس موم بتیاں۔ ان جلی موم بتیوں کا کیا بنے؟

جنت: (نرمی سے) اری تو میں نے کب کہا کہ شنون کی اوڑھنی بھیا نے لے کر دی ہوگی ــــ تیل چن چن کر میں نے بھی چاندی کی انگوٹھیاں نہیں بنائی تھیں پیچھے کیا پتہ تو تو اس جلنے (زمانے) میں اپنی سسرال میں رہتی تھی۔

(باہر سے جنت کے بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے دونوں بہنیں ادھر متوجہ ہو جاتی ہیں۔ رجو جنت کے بچے کو کولھے پر لٹکائے اندر آتی ہے)

رجو: (ایک دم ہنس کر) اماں شاہو چچا کے گھر آج بھی گوشت پکا ہے۔ (بچے کو اتار دیتی ہے)

زینب: اری دیوانی تو وہیں بیٹھی اب تک دوسروں کی ہانڈی سونگھ رہی تھی ــــ میں نے جو مہرو کے پیچھے بھیجا تھا تجھے (فضلو کے ہاں سے دال لے آ ــــ

رجو: (اٹھلا کر) فضلو دادا نے کہا نہیں تھا مہرو سے پہلے ادھار کے پیسے دو پھر کچھ اور ملے گا ــــ (ایک دم ہنستے ہوئے) اماں شاہو چاچا آج بھی پھاوڑا لئے ادھر جا رہا تھا۔ (ہاتھ سے سمت کا اشارہ کرتی ہے)

(زینب اور جنت چونک پڑتی ہیں اور اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ زینب رجو کے قریب آ کر مدھم آواز میں)

زینب: اری کب جا رہا تھا؟

رجو: ابھی ــــ ادھر گیا ہے۔ (ہاتھ سے اشارہ کر کے یوں ہنستی ہے جیسے خوش خبری سنا رہی ہو)

جنت: (اپنے سینے پر ہلکا سا ہاتھ مار کر) ہائے لے ــــ بس دیکھ شاہو تاڑ گیا نا ــــ اری جلدی سے جا رجو! بابا کو کہیں سے ڈھونڈ لا۔

رجو: (آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے) آں ــــ بابا ــــ بابا کو ڈھونڈوں!

(دونوں بہنیں بھاگ کر اس سے پہلے دروازے پر پہنچ کر

باہر جھانکتی ہیں اور پھر پلٹ کر رجو کو دیکھتی ہیں)

زینب: (رجو کی پیٹھ پر ایک مکہ مار کر) اری جا بھی جلدی سے۔ کیا مریل گھوڑی کی طرح چلتی ہے بدنصیب۔ تو ہی قسمت والی ہوتی تو بابا یوں بیکار رہتا۔

(رجو ہنستی مٹکتی باہر غائب ہو جاتی ہے۔ جنت کا بچہ صحن میں بیٹھا رو رہا ہے۔ جنت پلٹ کر اسے گود میں اٹھا لیتی ہے۔)

جنت: بس جینب! دیکھ لیجیو آج کا دن بھی گیا۔

زینب: تو صبح صبح بابا کے سامنے اماں سے نہ جھگڑتی تو بابا کیوں گھر سے جاتا۔

جنت: واہ ری! — جھگڑتی نہ تو کیا کرتی؟ — پھر میں نے کہا ہی کیا تھا۔ بس اتنا ہی تو کہ اماں تو نے میرے لئے اوڑھنی تک نہ بنائی میری ساس کیا کہے گی۔ بس، اور تو کچھ نہ کہا تھا — اماں ہی نے چلانا شروع کر دیا — !

(مایوسی اور افسوس سے منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے اور چپکے چپکے اوڑھنی کے پلو سے آنکھیں پونچھتی ہے)

زینب: (گلوگیر آواز میں) تجھے نہیں معلوم بابا کے پاس کچھ ہوتا تو وہ تیرا منہ کھلواتے۔

جنت: مجھے کیا خبر (خبر) تھی بابا غصہ ہو جائے گا — ہائے اللہ میاں بابا کدھر گیا — (اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتی ہے اور اس کا بچہ زور زور سے دھاڑنا شروع کر دیتا ہے۔)

زینب: (جنت کو گلے لگا کر) اری تو رونے کیوں لگی؟ — واہ رونے کی کیا بات ہے — بابا یہیں کہیں ہوگا۔ اس کا روٹھنا کوئی نیا ہے — چل آنسو پونچھ — بچے کو دودھ دے۔

(جنت اور زینب چھپر تلے آجاتی ہیں — جنت کھاٹ پر بیٹھ کر بچے کو اپنا دودھ پلانے لگتی ہے۔ اور زینب گھڑے سے پانی انڈیل کر آٹے سے سنے ہوئے ہاتھ دھونے لگتی ہے)

جنت: (ایک دم پریشان سی ہو کر) اماں کھود رہی ہوگی۔ کیوں جنت؟

زینب: ہاں پر اُسے سانس کا دورہ نہ پڑ جائے۔ اس لے کاہے کو کبھی جیسے پھر جیسن بھی کھودی ہوگی۔

جنت: مہرو بابا کو ڈھونڈنے گیا اس سے اچھا تھا تو مہرو کو اماں کے ساتھ لگا دیتی۔

زینب: (ایک دم بھبک کر) جنت کیا کہتی ہے تو؟

جنت: (اسی فکرمندی کے ساتھ) دو مل کر کھودتے تو شاید کام جلدی ہو جاتا۔

زینب: (چیخ کر آنکھیں نکالتے ہوئے) زبان کھینچ لوں گی تیری جو مہرو سے تو نے یہی بات کہی۔ میرا مہرو کبھی اس پھاوڑے کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ سمجھ لے تو۔

جنت: (ہاتھ نچا کر اور منہ بنا کر) کیوں، تو اور تیرے بیٹے انوکھے اوپر کے صدکے (صدقے) میں کھا کھا کر پلیں۔ میری بڑھیا ماں ہی پھاوڑا اٹھا لے اور تیرا مہرو کالج کا بنا ہوا ہے۔ (وہ نہیں) ہاتھ لگائے گا پھاوڑے کو۔ وہ تو بڑا ڈپٹی ہے۔

زینب: بس جنت۔ بس جبان (زبان) روک لے۔ (یوں لگتا ہے جیسے جنت کو نوچ ڈالے گی مگر پھر ایک دم اپنا پلو آنکھوں پر رکھ کر بیٹھ جاتی ہے)

جنت: لے بیٹھ کیوں گئی مار آ کر — سچی بات جو نہ کہوں گی —

زینب: (روتے ہوئے) میں کیا کسی کو ماروں — اللہ نے مجھے ماردی۔ میرے دل سے یہ بات کیسے نکلے۔ ہائے مہرو کا باپ بڑا اچھا پھاوڑے سے کھودتے گڑھے میں آپ دفن ہو گیا تھا۔

جنت: (قدرے نرم پڑ کر) ٹیلے تلے کی جھین (زمین) پولی تھی اوپر سے پانی جو برسا تو بیٹھ گئی — اللہ کی یہی مرجی تھی۔ کسی کا کیا قسور (قصور) اپنے بابا نے عمر بھر یہی کام کیا۔ اور آج تو اماں بھی تیرے بچوں کا پیٹ بھرنے کو گڑھا کھودنے پہنچ گئی — مگر تیرا بیٹا — —

زینب: (چیخ کر) مت لے میرے بیٹے کا نام — (مارنے کو اٹھتی ہے)

جنت: (کھاٹ پر سے جلدی سے اٹھ کر پیچھے ہٹتے ہوئے) نہیں جیجوں کی شاہو آج بھی ہمارا رزق اپنے گڑھے میں ڈال لے اور میں نہ بولوں۔ تو نے تو مائیکے کو لوٹ لیا (پیچھے ہٹتی جاتی ہے)

(ایک دم بھاگتا ہوا مہرو ان کے درمیان آجاتا ہے)

مہرو: اماں! کھالہ! بابا مل گیا۔ (خوشی سے گھوم کر ہنستا ہے)

زینب و جنت: (یک زبان ہو کر) بابا مل گیا — کہاں تھا؟

مہرو: پہلے فضلو دادا کی دکان پر نہیں تھا — پھر فضلو دادا کی دکان پر آ کر حقہ (حقہ) پینے بیٹھ گیا — بابا کام مانگنے کی خبر سن کر فضلو دادا نے یہ ڈال دی ہے۔ (اگر تھے کے دامن میں بندھی

ہوئی پوٹلی کھول کر دوڑتا جاتا ہے اور دال ہانڈی میں الٹ دیتا ہے۔ پھر باہر کی طرف بھاگتا ہے)

زینب: (چلا کر) ارے او رے مہرو۔ ذرا تو دم لے — بابا کے لئے روٹی تو لے جا — پتہ نہیں سویرے کا کچھ کھایا بھی اس نے کہ نہیں۔

(مہرو لوٹ کر اندر آتا ہے۔ تیری طرح کوٹھری کے اندر جاتا ہے اور ہاتھ میں ایک موٹی روٹی لئے اسی تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پھر اندر آتی ہوئی اماں سے ٹکراتا غائب ہو جاتا ہے)

اماں: (پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ) ارے متانے دیکھتا نہیں۔

زینب: اماں! (قریب جاکر اسے تھامنا چاہتی ہے)

جنت: اماں رجو کہتی تھی شاہو پھاوڑا لئے اپنی کوٹھری سے نکلا تھا ابھی۔

اماں: (ہاتھوں سے مٹی جھاڑ کر) اب کھودے گا اپنی اماں کی کبر (قبر)، ہاتھ دو ہاتھ مٹی تو میں نے ہٹالی۔ اس وخت (وقت) تیرا بابا ہزار جوان کا ایک جوان ہے آتے ہی جو دو چار پھاوڑے مارے تو کمر تک مٹی ہٹالی۔
(کمر کو اپنے ہاتھوں سے سہارا دے کر تنتے ہوئے۔ اری ذرا پانی تو پلائیو جنت۔

زینب: اماں لیٹ جا میں تیری کمر دبا دوں۔

(اماں کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے اور زینب اس کی کمر دبانے لگتی ہے۔ جنت پانی کا کٹورا لئے آتی ہے اور اپنے بچے کو زمین پر بٹھا کر پانی ماں کو دیتی ہے۔)

جنت: لا اماں میں تیرے پاؤں دباؤں۔

اماں: رہنے دے تو تو میری چلم بھر دے۔ (جماہی لے کر) کتی (کتنی) دیر سے تماکو نہیں پی۔ (جنت حقے پر سے چلم اٹھا کر چولھے کے پاس جاتی ہے اور چولھا کرید کر واپس آجاتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر ادھر ادھر طاق پر اور کوٹھری میں کچھ تلاش کرتی ہے اور پھر دیا سلائی کی ایک تیلی حاصل کرکے آگ جلا دیتی ہے)

زینب: (کمر دباتے ہوئے) کیسے تونے پھاوڑا اٹھایا ہوگا اماں!

اماں: ہنھ! لے بھلا پھاوڑا اٹھانا بھی کچھ مشکل ہے۔

(اماں کھاٹ سے اٹھ کر پھاوڑا اٹھانے کی نقل کرتی ہے)

اماں: یوں پھاوڑا اٹھایا۔ یوں جبین پر مارا — بس اس طرح مٹی اٹھائی اور دور پھینک دی۔ آج تو تیرا بابا مجھے دیکھ کر حیران (حیران) رہ گیا۔ اب فیرے آگے منہ کھولے گا کبھی۔

جنت: (چلم لاتی ہے) اماں رکھو نے یا شاہو نے تجھے دیکھا تو نہیں؟

اماں: دیکھے تو میرا کیا بنالے گا۔ عورت جات ہوں تو کام نہ کروں؟ واہ اب اب تک تیرے بابا کی انتجاری کرتی تو بس — ابھی دیکھیو موٹر والوں کا کام ہے دم کے دم میں لے کر آجائیں گے۔

جنت: اماں آج تو اچھے پیسے ملیں گے بابا کو اور بھیا کو۔ ایک بار پہلے بھی موٹر والوں کا کام کیا تھا تو بیس روپے دے گیا تھا بابا کو۔

اماں: اللہ مالک ہے۔ (اماں حقے کے لمبے لمبے کش لیتی ہے — اور کھانستی ہے)۔

زینب: جا ری جنت تو دال چڑھا دے چولھے پر۔ اتنا وقت ہو گیا۔ بچے بھوکے ہوں گے۔

جنت: جا تو ہی چڑھا دے (کھاٹ پر بیٹھنے لگتی ہے۔)

زینب: پھر کل کی طرح تو کہے گی کہ میرا میاں آنے والا تھا دال میں اتا (اتنا) پانی ڈال دیا جینب نے — تو آپ ہی ہانڈی روٹی دیکھ۔

جنت: (ٹھنک کر) نہیں کہوں گی۔ تو کوئی میرے میاں سے جلتی ہے؟ میں نے ہنسی میں کہی تھی بات۔ (بے حد محبت سے) جا تو ہانڈی روٹی کر لے جلدی جلدی میں اماں کو دباتی ہوں۔

زینب: (ایک دم بگڑ کر) کیوں تو کوئی بڑی لاٹ صاحب ہے۔ میں روج ہانڈی روٹی کروں۔ ایک دن تو کر لے۔ میرے ہاتھوں میں کوئی کانٹے لگے ہیں جو میں اماں کو نہ دباؤں؟

جنت: (تیز ہو کر) میں یہاں کوئی بیٹھی رہوں گی۔ ننھے کا ابا آج پہنچے گا تو کل مجھے لے جائے گا۔ پھر تو اکیلی خوب کھدمت کر لیجیو اماں کی۔

زینب: (چلا کر) چل چل بڑی آئی کھدمت کرنے والی۔ آج بابا اور بھیا کا کام لگا تو تجھے محبت آئی اماں کی۔ روج تو پاؤں پسارے کھاٹ پر بیٹھی رہتی تھی۔

جنت: (روہانسی ہو کر) دیکھ لے اماں — کیا کہہ رہی ہے جینب۔

زینب: (ہاتھ نچا کر چڑانے کے انداز سے) سچی کہی تو مرچیں لگ گئیں تجھے۔

اماں: (بے حد مدبرانہ انداز سے سر ہلا کر) تو بھی سچی یہ بھی سچی۔ جا جینب آج بھی تو ہی ہانڈی روٹی کر لے۔ یہ آج کی رات ہے دو گھڑی میرے پاس بیٹھ لے۔

زینب: (جھلا کر چولھے کے پاس بیٹھتے ہوئے) ہاں۔ ہاں یہ جنت تیری لاڈلی کل سسرال چلی جائے گی اس لئے اس کی کدر (قدر) ہے میں تیرے دروا جے (دروازے) بیٹھی ہوں۔ اللہ نے مجھے لا کر بٹھایا ہے، میری کیا کدر (قدر)!

(اماں جواب میں کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کھانسی کا پھندہ پڑ جاتا ہے اور وہ ہاتھ سے نفی میں اشارے کرتی رہ جاتی ہے)

جنت: (ہاتھ بڑھا بڑھا کر) تیری کدر تھوڑی ہے۔ بابا اور بھیا کی ساری کمائی کو کڑک مرغی کی طرح چھاپ کر بیٹھ گئی ہے اب سن تو مجھ سے۔

زینب: (ماتھے پر ہاتھ مار کر) اری میں کمائی چھاپ کر بیٹھی ہوں۔ میرا مالک جیتا دفن ہو گیا، میرے بچے یتیم ہو گئے اور تو کہتی ہے میں کمائی چھاپ کر بیٹھ گئی ہوں۔ جیسے میں بیٹھی ہوں ویسے سب بیٹھیں آ کر۔

جنت: (ایک دم رو کر) دیکھ لے اماں، اور کوسنے دلوا لے۔

اماں: (کھاٹ سے اٹھ کر تھرتھراتا ہاتھ اٹھا کر) جنیب جبان روک لے۔

زینب: (اسی طرح) میں تو یوں ہی کہوں گی

اماں: (دھاڑ کر) اری رانڈ کلموہی بہن کو کوستی ہے۔ تیرے منہ میں راکھ۔

(زینب ایک دم خاموش ہو کر مجروح انداز سے ماں کو دیکھتی ہے اور پھر جھک کر چولھے میں پھونک مارنے لگتی ہے)۔

(جنت اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے اور منہ ڈھانک کر رونے لگتی ہے)

جنت: (رونے میں بین کرتے ہوئے) میں سال پیچھے مائکے آئی تو میری بہن کو برا لگا۔ اری میں نے کسی کا کیا لے لیا، دو نوالے روٹی کھائی ——— اور آج بہن کے کوسنے سن لئے ——— اری اماں مجھے کیوں بلایا تھا اری۔

زینب: (گھٹنوں میں سر رکھ کر آواز سے روتے ہوئے) میں بابا کے گھر نہ بیٹھتی تو کہاں جاتی۔ میرے بچوں کی دو روٹیاں سب کو کانٹے کی طرح لگتی ہیں۔ اری اماں، میں کلموہی تھی تو مجھے اس کے ساتھ جیتا کیوں نہ دفن ہونے دیا۔

(اماں پہلے تو کبھی ایک بیٹی کی طرف، کبھی دوسری کی طرف، ہاتھ پھیلا پھیلا کر روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ "اری جینب" "اری جنت" کہہ کہہ کر رہ جاتی ہے آخر ہار کر اپنے سر پہ ایک دو ہتڑ مار کر صحن میں بیٹھ جاتی ہے)

اماں: (جیسے اللہ سے فریاد کر رہی ہو) اے اللہ لے میں کیا کروں۔ دونوں وکت (وقت) ملنے پہ آئے اور گھر میں ہائے ہائے پڑی ——— آج کتے (کتنے) دن بعد رزق اترا او لیکھ شکر کے دو بول نہیں ——— (دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیتی ہے۔ پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ایک دم مسکرا کر سرگوشی کرتی ہے جیسے اپنے آپ سے مشورہ کر رہی ہو)

اماں: رونے اور جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ تمہارا اکلو بھیا جو لائے وہ جنت کا ——— اور جو بابا کو ملے وہ جینب کا ——— (زمین سے اٹھ کر کرتے کا دامن جھاڑتی ہے اور کھاٹ پر بیٹھ کر حقے کا لمبا کش لیتی ہے)

زینب: (ہانڈی میں پانی ڈال کر دال دھوتے ہوئے) تو میں نے جنت کو کیا کہا تھا ——— اس نے آپ ہی میرے بچوں کی روٹی گنی۔

جنت: (آنسو پونچھ کر) تو میں نے لے کیا کہا آپ ہی تو مجھے کوسا اس نے!

اماں: (دونوں طرف ہاتھ پھیلا کر دانت کچکچاتے ہوئے) اری چپ ہو بابا نے یہ جھگڑے سن لئے تو رات نہیں ٹکے گا گھر۔

زینب: ہاں اسے بڑا کھیال ہے بابا کا۔

جنت: اور بابا کو میرا بڑا کھیال ہے۔ پچھلے ساون آئی تھی تو بابا نے دو روپے کی اوڑھنی بھی نہ دی ——— (پھر رونے کی کوشش کرتی ہے)

اماں: ہاں ری نوٹریا اب تو بابا کو برا نہ کہے گی تو کسے کہے گی۔ بابا نے تجھے پرائے گھر کا کر دیا نا ——— تیری برات کو پلاؤ جردہ (زردہ) دیا۔

جنت: (ہاتھ جھٹک کر) دیا ہو گا برات کو ——— مجھے کیا دیا بابا نے۔ میں کوئی اتنی (اتنی) بچی تھی جب جینب کا بیاہ ہوا تھا۔ اسے

سونے کے جھمکے اور سونے کا تعویذ دیا تھا۔ اور پاؤں میں سیر
بھر چاندی کے کڑے ـــ مجھے تو ماشہ بھر سونا بھی نہ دیا۔

اماں: (زینب کی طرف فریادی انداز سے مخاطب ہوکر) ـــ لے سن
جواب (جنت سے) اری تیرے دولھا کو تولہ بھر سونے کی
انگوٹھی نہیں دی تھی۔ اس پہ اللہ نام کھودنے کے لئے شاید
نے روپیہ الگ لیا تھا۔ بول اب بول ذرا ـــ وہ انگوٹھی
کیسے بھولے گی وہ تو تیرا دولھا اب تک پہنے پھرتا ہے۔

جنت: (لاجواب سی ہوکر) میرے بیاہ کی انگوٹھی تو جبان (زبان)
پہ دھری ہے اور جینب کے سونے کے جھمکے اور تعویذ بھول گئی۔
(بچے کو دوپٹے کے اندر چھپاکر دودھ اس کے منہ میں دے دیتی
ہے اور ماں کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاتی ہے۔)

اماں: یہ جینب کی کسمت (قسمت) تھی۔ جب جینب کا بیاہ ہوا تو کتنی
کمائی تھی۔ بستی میں بیماری پھوٹی تھی۔ رات دن تیرے بابا
کی پکار پڑی رہتی تھی۔ لوگ تیرے بابا کی خوشامد کرتے تھے۔
(ٹھنڈی سانس لے کر) کیا رزق برستا تھا۔ اسپتال ڈاکٹر بابو
نے اس کے بعد ہی تو موٹر کھریدی تھی۔ اور ہم نے جینب کا بیاہ
کیا تھا ـــ (ٹھنڈی سانس لیتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھتی ہے)

زینب: اور جب تیرا بیاہ ہوا تھا کتنا مندا تھا۔ بابا دو دو دن ہاتھ پر ہاتھ
دھرے بیٹھا رہتا تھا۔ بابا تیری کھاتر (خاطر) ڈاکہ ڈالتا؟

جنت: (تنک کر) بڑی آئی مجھے بدکسمت کہنے والی جبھی تو شاہ دین
اور رکھو نے یہاں نئی نئی جھونپڑیاں ڈالی تھیں ـــ رکھو نے
جیسے بیاہ سے آٹھ دن پہلے اپنے بیٹے کا بیاہ کیسی دھوم سے
کیا تھا۔ گیس کے ہنڈے جلے تھے تو کیا رکھو نے ڈاکے
ڈالے تھے۔

(اماں ایک دم پھڑک کر یوں ہاتھ بڑھاتی ہے جنت کی طرف
جیسے مشاعرے میں پرانے لوگ داد دیتے ہیں)۔

اماں: واہ رے اب تو نے آپ ہی جھگڑے کی جڑ پکڑ لی ـــ (ہاتھ
پر ہاتھ مار کر) دیکھو پہلے بابا اکیلا تھا اپنے کام میں ـــ
پھر شاہ دین اور رکھو آ گئے۔ رزق بٹ گیا نا!۔ اب بتا
تیرے بابا کا کیا کسور جو تجھے سونے کے جھمکے نہ ملے۔ بول اب؟
(جنت لاجواب ہوکر رو پڑتی ہے)

اماں: (جنت کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) اری دیوانی بابل کے لئے تو
اور جینب برابر ہیں۔ اللہ سے دعا کر بابا کا کام بڑھے۔ بیٹیاں
تو سدا ماں باپ سے لینے کا حق رکھتی ہیں۔ اب کی تیرے گھر
بیٹی ہوا تو سونے کے جھمکے لیجیو۔

جنت: (بچوں کی طرح مچل کر) آج بھیا موٹر میں گیا ہے گُسل ڈالنے۔ اسے
ضرور روپے بھی ملیں گے اور کوئی انگوٹھی چھلا بھی۔ پر دیکھ لینا
وہ مجھے روپیہ بھی نکالے تو کہنا چھپا لے گا اپنی کمائی ـــ میرے
ننھے کا ایک نیا کرتہ بھی بننا ہے اور میری اوڑھنی بھی ـــ پر دیکھ
لیجیو تو اماں کچھ بھی نہ بنے گا۔ اور میری ساس طعنے مارے گی۔

زینب: (چولھے پر ہانڈی میں ڈوئی پھیرتے ہوئے) بابا کو کیا ملے گا؟
آٹا بھی کل ختم ہے۔ فضلو پر چونے کا ادھار بھی لوٹانا ہے۔ ابھی
تو اماں نے کہہ دیا کہ جینب بابا کے پیسے لے گی ـــ لے گی جب نا
کہ بچ جائے ـــ میری رجّو بارہ سال کی ہو رہی ہے بابا نے
اس کے بیاہ کے لئے ایک کرتہ بھی نہ کھرید کر ڈالا۔

اماں: (حقے کا ایک سوٹا لے کر) اری دیوانیو، اپنی اپنی پھکر
میں یہ بھول گئیں کہ کام موٹر والوں کا ہے ـــ اللہ کرے گا
تو کل ننھے کا نیا کرتہ اور جنت کی اوڑھنی لیں گے۔ اور رجو کے
لئے کرتے کا کپڑا بھی۔

زینب: (گھبرا کر) اور مہرو کے لئے تہمد؟

جنت: (خوشی سے منہ اٹھا کر) اور میرے لئے نئی چوڑیاں بھی اماں
(اسٹیج پر شام کا اندھیرا چھا جاتا ہے ـــ اس اندھیرے میں
رجو دھیرے دھیرے پراسرار انداز سے آکر کھڑی ہو جاتی ہے پہلے
اپنا سر کھسوٹتی ہے اور پھر ہاتھ الٹا کر کے اپنی پیٹھ کھجاتی ہے)

رجو: بابا مل گیا اماں! (دھیرے سے ہنستی ہے)

زینب: اری تجھے اب کیا لگی؟ کہاں پھر رہی تھی اب تک۔

رجو: آج کسی نے دیا نہیں جلایا، بوند بھر تیل بھی نہیں ملا۔

زینب: چل دفع کر دیوں کو ـــ تو بیٹھ کر اماں کو دبا۔

(رجو اسی طرح کھڑی سستی سے اپنی پیٹھ کھجاتی رہتی ہے)
(اندھیرا بڑھ جاتا ہے)

(ایک دم مہرو بھاگتا ہانپتا ہنستا اندر آتا ہے ـــ اور دیوار
پر ٹنگی ہوئی سیاہ لالٹین کو اتار کر واپس باہر جانے لگتا ہے

زینب اس کے پیچھے بھاگتی ہے)

[زینـ]ـب: ارے مہرو کدھر چلا۔

[مہـ]ـرو: (ٹھٹھک کر) وہ لوگ آ گئے نے کر — مسجد میں بڑا مولوی نماج پڑھا رہا تھا۔

[جنت/امـ]ـاں: ان کو تو آنا ہی تھا — بابا نے کام ختم کر لیا؟

[مہـ]ـرو: (باہر کی طرف قدم اٹھا کر ذرا سی مٹی اور نکالتا ہے۔ اندھیرے میں بابا کو نجر نہیں آ رہا۔

[جـ]ـنت: ارے بتی جلا تو لینے دے — (مہرو کے ہاتھ سے لالٹین لیکر اسے روشن کرتی ہے اسٹیج پر ایک لمحے کو روشنی ہوتی ہے اور پھر مہرو کے پھرتیلے پیروں کے ساتھ یہ روشنی غائب ہو جاتی ہے ۔۔۔ اسٹیج پر گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے)۔

[ایک لمحے کی خاموشی اور اندھیرے میں قریب کسی کتے کے رونے کی صدا بلند ہوتی ہے اور پھر اسٹیج پر روشنی ہو جاتی ہے — وہی منظر ہے۔ طاق پر رکھا چراغ مدھم سی روشنی دے رہا ہے۔ چھپر تلے اب تین کھاٹیں بچھی ہوئی ہیں۔ بابا مٹی کے بدھنے سے ہاتھ دھو کر اپنے تہمد سے ہاتھ اور منہ خشک کر رہا ہے۔ مہرو اور رجو کے سامنے کھاٹ پر المونیم کی پلیٹوں میں روٹی پڑی ہے۔ مگر وہ کھا نہیں رہے ہیں۔ زینب چولہے سے آگ نکال کر چلم میں رکھ رہی ہے اور جنت چپ چاپ اپنے ننھے کو میلے لحاف میں لئے کھاٹ پر بیٹھی ہے۔)

رجو: (روٹی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے) شاہو چاچا کے ہاں گوشت پکا ہے آج بھی۔ (ہنستی ہے)۔

مہرو: ہمارے گھر کل پکے گا۔ کیوں بابا؟

بابا: ہوں — ہوں

جنت: (جل کر) ہاں پانچ روپے ملے ہیں بابا کو کل تک سب کر لو اپنے لئے۔

زینب: (چلم اٹھا کر بابا کے قریب آتے ہوئے) سن لے بابا۔

بابا: ہوں — (چلم لے کر کوٹھری میں چلا جاتا ہے)

(چند لمحے کو سب خاموشی سے ایک دوسرے کو شکایت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ باہر کوئی کتا روتا ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں بڑھ جاتی ہے۔ زینب اپنے بچوں والی کھاٹ پر ٹک جاتی ہے)

زینب: ارے روٹی نہیں کھاتے تم دونوں۔ (رجو بے تکے پن سے ہنستی ہے)

مہرو: نانی آئے گی پھر کھائیں گے۔

زینب: (فکرمند ہو کر) (رتی (اتنی) دیر ہو گئی اماں نہیں آئی۔ مسجد اتنی دور بھی نہیں۔

جنت: کیوں رے مہرو تو نے اچھی طرح دیکھا تھا تیرا ماموں لوگوں کے ساتھ نہیں آیا تھا؟

مہرو: نہیں۔ بالکل ماموں آیا ہی نہیں

جنت: (اداس لہجے میں) آتا کیسا۔ سمجھا ہوگا گھر گیا تو بہن کو کچھ دینا پڑے گا۔

رجو: (ہنس کر) ماموں آج "سلیما" گیا ہوگا کھالہ۔

زینب: (ڈر کر) شی! — چپ! بابا سن لے گا تو بھیا سے رات ہی کو جھگڑے گا۔ ایک بار پہلے کتا (کتنا) جھگڑا ہوا تھا، مردار، بھول گئی — (اپنے آپ سے) بابا نے سچ تو کہا تھا میں نے تجھے حافج (حافظ) مولوی بنایا اور تو "سلیما" جا کر گندہ ہوتا ہے۔

رجو: سلیما کیسا ہوتا ہے اماں؟

مہرو: ہا — تجھے نہیں معلوم۔ میں بتاؤں تصبیریں (تصویریں) ناچتی اور گاتی ہیں —

(بیٹھے بیٹھے کمر پر ہاتھ رکھ کر تھرکتا ہے) "آجا مورے بالما تیرا انتجار ہے"

زینب: (ہنستی ہے اور مہرو کو دھکا دینے کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہے) چپ بے حیا۔ بابا سنے گا تو چمڑی ادھیڑ دیگا تیری۔

جنت: (تھکے ہوئے اداس لہجے میں) جو جس کی مرجی ہو کرے میں اب کے جاؤں تو آ کر منہ نہ دکھاؤں گی کبھی — اماں کہہ رہی تھی آج جیادہ پیسہ ملے گا۔ بابا نے آ کر پانچ دکھائے۔ بھیا نے صورت بھی نہ دکھائی آ کر۔

زینب: کیوں ایسی باتیں کرتی ہے بھیا کوئی برا ہے — دیکھ لیجیو اس کو جرور اچھے پیسے ملے ہوں گے۔

آنے دے، اسے کوئی کام پڑ گیا ہوگا جو اب تک نہ آیا۔

(دور لکڑی کے کھڑاؤں کی آواز آتی ہے۔ مہرو دوڑ کر دروازے

بھی جاتا ہے۔ اور شور مچاتا ہے)

مہرو: مائی آگئی۔

(اماں کھڑاؤں بجاتی لالٹین جھلاتی ہانپتی اندر آجاتی ہے جنت
بے چینی سے لحاف سر سے اٹھا دیتی ہے سب سوالیہ نظروں سے
اسے دیکھتے ہیں۔ اماں کسی کی طرف دیکھے بغیر بیچ والی کھاٹ پر
بیٹھ کر اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتی ہے)

بابا: (کوٹھری کے دروازے پہ حقہ اٹھائے آکر) آگیا کلّو؟

اماں: (ہاتھ سے نہیں کا اشارہ کرتی ہے اور بے حد دل جمعی سے
ہانپتی رہتی ہے)

بابا: کیوں نہیں آیا۔ کدھر گیا۔ حرام جادہ مجھے کرنے۔ آنے دو آج
اُدھیڑ کر رکھ نہ دیا ہو تو خیرو نام نہیں۔

اماں: (سانس ٹھیک کر کے) کیوں اُدھیڑے گا میرے لال کو۔ بہت
تیرے دس پانچ بیٹے ہیں جو مارے گا میرے کلو کو۔

بابا: (دھاڑ کر) جان نکال لوں گا جو بیٹے کی طرفداری سے بولی (مارنے
کو بڑھتا ہے)

(زینب اور جنت ایک دم بیچ میں آجاتی ہیں۔ زینب باپ کے
ہاتھ سے پٹ جاتی ہے۔ مہرو رونے لگتا ہے اور رجو مہرو کی
طرف دیکھ کر منہ پھیر کر ہنستی ہے)

بابا: چھوڑ دے مجھے آج بتاؤں بڑھیا کو بیٹے کی طرفداری کرتی ہے

اماں: (بابا کی طرف بڑھنے کی جدوجہد کرتے ہوئے) لے آج دل
کا ارمان نکال لے۔ آ مار مجھے۔ مگر خبردار جو میرے بیٹے کو کچھ
کہا۔ ہاں۔ (جنت ماں کو پیچھے ڈھکیلتی ہے)

بابا: (ہوا میں مکے چلا چلا کر) ایک بیٹا ہے یہی سوچ کر میں نے کہا
اس سے کیا پھاوڑا اٹھواؤں، آپ محنت کی اور اسے مولبی کے
پاس بٹھا دیا۔ اب کسی لائک (لائق) ہوا تو کمائی اپنی جیب میں
ڈال کر سیلے دیکھتا پھرتا ہے۔ اور تو اس کی طرفداری کرتی
ہے۔ میت کے کپھن (کفن) پہ خون تھا۔ جس پر اس نے غسل
ڈالا۔ یہ تو نہیں کہ بستر پہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والا ہو جو
مُردہ اسے پہلے سے انگوٹھی چھلے اتار لیں۔

اماں: (بات کاٹ کر) ہاں تو میں کب کہتی ہوں کہ اسے انگوٹھی
نہیں ملی ---- پھر تجھے کیا؟

بابا: مجھے کیا؟ آکر کہہ دے گا کچھ نہیں ملا۔ اچھا میں اس کی ہڈیاں
نہ توڑ دوں تو کہنا ---- بہن سسرال جانے کو بیٹھی ہے اور
تو کہتی ہے مجھے کیا؟

جنت: (اماں کو چھوڑ کر بابا کے قریب جا کر ہنستے ہنستے) بابا، اماں جی
کو خیال نہیں میرا تو مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

زینب: میرے بچوں کا کسی نے خیال کیا کبھی؟

بابا: (آپے سے باہر ہو کر) بتا مجھے سونا دکھا کر کدھر گیا؟ بتا وہ
آیا کیوں نہیں۔

اماں: (بے تعلقی سے) مولبی کے پاؤں دبا رہا ہے۔ مولبی چاہتا تو
آپ جاتا موٹر میں بیٹھ کر۔ چاہتا تو دوسرے لڑکوں کو بھیجتا
اب میرا بیٹا مولبی کے پاؤں نہ دبائے تو تیرے دبائے۔

بابا: (اور بھڑک کر) میت نہلا کر جب سے پاؤں دبا رہا ہے۔ مجھے
بناتی ہے بڑھیا۔ بول کہاں گیا تیرا بیٹا۔

(اماں بڑے غرور سے بابا کی طرف بڑھتی ہے اور بے پروائی
سے اس کے ہاتھ سے حقہ لے کر ایک کش لگاتی ہے)

اماں: سنار کے پاس گیا تھا انگوٹھی لے کر سیدھا۔ اس کی دکان
بند تھی۔ پھر اس کے گھر گیا کہ تلوا کر کسوٹی پہ پرکھوا لے۔ دیر
نہ لگتی تو کیا ہوتا!

(بابا ایک دم کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھ جاتا ہے اور لاجواب
ہو کر حقہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اماں اسے حقہ پکڑا کر
یوں کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے جیسے سارے جہان کی دولت
اس کے قدموں تلے پڑی ہو)

جنت: (خوشی سے بمشکل آواز نکالتے ہوئے) اماں! سونے کی ہے؟

زینب: (خوشی سے آنکھیں پھاڑ کر جیسے اپنے آپ سے) اور چاندی
ہوتی تو بھیا یوں مارا مارا پھرتا!

(ہوش میں آ کر رجو سے) اٹھ اماں کے پاؤں دبا رجو!
اماں مسجد سے چل کر آتی ہے۔ رجو ہنستی ہے اور بیٹھی
رہتی ہے)

(باہر کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے، ساتھ ہی جوتوں کی چاپ)

زینب: گلو بھیا آرہا ہے۔

(جنت جھپٹ کر لالٹین اٹھاتی اور دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ اس کے پیچھے زینب اور مہرو بھی دوڑتے ہیں،)

جنت: (چلّا کر) بھیا مٹی کے ڈھیر دیکھ کر۔ ٹھوکر نہ کھائیو۔

مہرو: (خوشی سے اچھلتے ہوئے) ماموں آگیا۔ ماموں آگیا۔ بابا ماں!

(گلو بھاری بھاری قدم رکھتا جھومتا جھامتا اندر آتا ہے۔ وہ سب اسے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیتے ہیں۔ گلو چھپر تلے ایک دم کھاٹ پر یوں لیٹ جاتا ہے جیسے بہت تھکا ہوا ہو۔ زینب، جنت سے آگے بڑھ کر پوچھتی ہے)

زینب: بھیا روٹی کھالے گرم گرم دال پکی ہے۔

گلو: کھاؤں گا۔ بہت تھک گیا آج تو (ٹانگیں اور ہاتھ اکڑا کر ایک جماہی لیتا ہے۔ اور پھر کھاٹ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے)

زینب: (ہنستے ہوئے بڑے پیار کے ساتھ) لے بھلا حافظ مولوی ہوگیا۔ جھوٹ بولنے کی عادت نہ گئی تیری۔ کیا مجھے معلوم نہیں موٹر میں بیٹھ کر گیا تھا گسل دینے۔ لا پاؤں دبوانے کو جی کرتا ہو تو دبا دوں۔ (گلو کی طرف جھکتی ہے)

گلو: (پاؤں سمیٹ کر) نہ — نا آپا۔

جنت: مجھ سے دبوالے، بھائی چھوٹا ہو جب بھی بہن سے بڑا ہی ہوتا ہے۔ (جنت گلو کی طرف جھکتی ہے،)

اماں: دبوالے میرے لال، کہاں کہاں مارا پھرا ہے تھک گیا ہے۔

بابا: (اماں سے مخاطب ہو کر) ہاں تیرا لونڈا بڑے کنویں کھود کر آیا ہے۔ جو بیٹھا ٹانگیں اینٹھا رہا ہے۔ (دونوں بہنیں سیدھی ہو کر غصے سے بابا کو دیکھتی ہیں۔ اماں کچھ کہنے کی کوشش میں کھانسی کا شکار ہو جاتی ہے)

گلو: (رنجیدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) بابا تجھے اپنا کام دکھتا ہے دوسرے کا نہیں۔ تو قبر کھودتا ہے میں گندے سڑے مردے نہلاتا ہوں۔

(جھرجھری لے کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بدلی ہوئی خوفزدہ آواز میں) توبہ الٰہی توبہ۔ کیا بری میت نہلائی ہے آج

مہرو: ماموں موٹر والوں کی میت بھی گندی ہوتی ہے۔

رجو: (ایک دم بے تکے پن سے ہنس کر) کیوں ماموں موٹر والے تو روز تیل کے دیئے جلائیں گے قبر پر؟

گلو: (دونوں بچوں کی طرف دیکھ کر کلیم چیخ پڑتا ہے) موٹر والے۔ موٹر والے (آواز دھیمی کر کے) وہ تو موٹر والوں کو خدا کا خوف تھا۔ کل ان کی موٹر تلے آکر کچلا گیا تھا۔ غلطی مرنے والے کی تھی، پھر بھی ان موٹر والوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحم ڈالا انہوں نے پولیس سے کہا سنا اور لاش ہسپتال سے اٹھا لائے کہ ہم آپ کفن دفن کریں گے — ایسے بھی نیک لوگ ہوتے ہیں دنیا میں۔ (ایک لحہ رک کر) بابا! قسم ہے اللہ پاک کی منہ تو بالکل پچی ہو گیا تھا۔ پانی پہ پانی ڈالتا گیا۔ پھر بھی خون ہی خون۔ (جھرجھری لے کر منہ پہ ہاتھ پھیرتا ہے)

بابا: (جھلا کر) جیادہ نقشے (نخشے) نہ کھینچ وہ تو قبر میں آتے وقت کفن پر خون میں نے بھی دیکھا تھا — یہ بتا تو تھک کیسے گیا۔

اماں: واہ رے بڈھے، میں نے نہیں بتایا کہ سنار کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ لے حقہ پی۔ پھر یاد آجائے گا۔ (حقہ اٹھا کر بابا کے سامنے رکھ دیتی ہے اور بابا غصے میں دو ایک لمبے لمبے کش لیتا ہے)

زینب: ہا — کون تھا مرنے والا؟

گلو: جانے کون تھا۔ موٹر والے صاحب کہتے تھے اس کی جیب سے پانچ روپے اور گڑ کی گٹک نکلی تھی۔ گٹک اور روپے سے کسی کا کیا پتہ نشان ملتا۔

اماں: (بے حد دانشمندی سے سر ہلا کر) اور کیا — ٹھیک تو ہے۔

جنت: (ایک دم ہنس کر) اور انگوٹھی جو تھی اس کے ہاتھ میں اس کا جکر (ذکر) نہیں کرتا بھیا۔ ڈرتا ہے جنت کو کچھ نہ دینا پڑ جائے۔ اس واسطے نا! (اٹھلا کر گلو کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) لا میں بھی دیکھوں انگوٹھی۔

گلو: (جلدی سے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں چھپا لیتا ہے) چل چل میرے پاس نہیں ہے انگوٹھی"

جنت: تو میں کھا جاؤں گی تیری انگوٹھی۔ (روٹھ کر بچوں کی طرح ہونٹ لٹکا لیتی ہے۔ لیکن ہاتھ پھیلائے رکھتی ہے)

گلو: (کچھ سنجیدگی اور کچھ ہنسی سے) اماں دیکھو جنت کو ــــ ہر سال آکر یہ لاڈ وہ لاڈ کرنے لگتی ہے۔

جنت: (ایک دم غصے میں آکر) دیکھ لے اماں کیا کہہ رہا ہے بھیا ــــ

اماں: ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ جا کل شنون کی اوڑھنی لا دے گا تیرے لئے ــــ اب بھیا کے بیاہ کے لئے بھی کچھ رہنے دے گی یا نہیں۔

جنت: (آگ بگولہ ہوکر) میں نے کیا لیا تیرے گھر سے ــ جیب کو سونے کے جھمکے دیئے تھے ــــ میں یہ انگوٹھی لوں گی آج۔ لا مجھے انگوٹھی دے ــــ (گلو کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے) (ایک دم بابا خیرو کوٹھری کی دہلیز سے اٹھتا ہے، سامنے پڑا حقہ ہاتھ سے الٹ دیتا ہے اور پھر گردن اور ہاتھ پھیلائے گلو کی طرف تول تول کر قدم بڑھاتا ہے)

بابا: (گمبھیر آواز میں) انگوٹھی مجھے دے۔

گلو: بابا اس انگوٹھی سے میں ــــ

بابا: (چیخ کر) انگوٹھی مجھے دے (خوفناک انداز سے دونوں ہاتھ گلو کی طرف بڑھاتا ہے ــ گلو کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی جیب کو بازو سے چھپا لیتا ہے)

بابا: مجھے دے نہیں تو ــــ نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا تیرا۔ (سب دم بخود بابا کو دیکھتے ہیں گلو کے ہاتھ نیچے گر جاتے ہیں۔ بابا اپنی اکڑی ہوئی انگلیاں اس کی جیب میں ڈال کر انگوٹھی نکال لیتا ہے۔ اماں، باپ بیٹے کے بیچ میں آنے کی کوشش کرتی ہے مگر بابا اُسے زور سے دھکا دیتا ہے۔ وہ اس خوفناک اور پُراسرار آہستگی سے لالٹین کی طرف انگوٹھی والا ہاتھ بڑھاتا ہے اور انگوٹھی کو غور سے دیکھ کر زور سے کہتا ہے)

بابا: اللہ (انگوٹھی ہاتھ میں لئے چھپر تلے سے نکل کر صحن میں رینگ آتا ہے)

بابا: (آہستہ آہستہ) اللہ! اللہ!

گلو: (اس کے پیچھے آکر غصے سے) بابا یہ میرا حصہ ہے۔

بابا: (لاڈ دارانہ طریقے سے) یہ پوری تولہ بھر ہے نا ــــ (گلو اثبات میں سر ہلاتا ہے)

بابا: اور اس پہ اللہ تعالیٰ کا نام کھدا ہوا ہے نا ــــ تو نے اسے نہلایا یہ تجھے مل گئی میں نے کبر کھودی، پانچ روپے میرے حصے میں آگئے۔ اور گجک ــــ اور گجک ــ (ایک دم پاگلوں کی طرح ہنستے اور چیختے ہوئے) جنت او جنت تیرے ننھے کو گڑ کی گجک لا دوں۔ اس کے حصے کی گجک موٹر تلے آگئی ــــ ہاہاہا ــــ (انگوٹھی اوپر اٹھا کر دیکھتا ہے اور پھر اُسے زمین پر گرا کر باہر نکل جاتا ہے۔ جنت لالٹین لے کر دوڑتی ہے اور انگوٹھی اٹھا کر دیکھتی ہے۔ اُس کے ہاتھ سے لالٹین گر جاتی ہے اسٹیج پر گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے باہر سے بابا کے قہقہوں اور کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سب مل کر روتے ہیں۔ اندھیرے بڑھیا اماں کے بین کی صاف صدا آتی ہے۔

اماں: ارے میرے لال ــــ پردیس میں ہو، بولو تو جرا ــ!

(پردہ)

افسانہ :

کہی، ان کہی

دیوندر ستیارتھی

اس وقت میں آپ کو ایک واقعہ سنانے جا رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے ایک کہانی بھی سمجھ سکتے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اب وہ گوٹے والا بابا میری یاد کی دہلیز پر اسی طرح کھڑا رہے گا۔ آپ بھی اس زندہ کردار کو خوب پہچان لیں۔ شاید کہیں اس سے آپ کی ملاقات ہو جائے۔ سر پر بھاری بھرکم پگڑی، کندھوں پر چادر، آنکھوں میں اداسی، چہرے پر کسی سے ملنے کا اشتیاق۔

میں نے اس کا نام نہ پوچھا، اس کا تو مجھے کوئی خاص افسوس نہیں۔

اس کا لہجہ بہت سہما ہوا تھا پھر بھی معلوم ہوتا تھا کہ اب اسے اپنے سامنے ایک نیا مستقبل نظر آ رہا ہے۔ آجکل اسی طرح کے کردار مجھے پسند آتے ہیں، جن کے دائیں بائیں کھڑا ہو کر میں اپنے نظریے کا جائزہ لے سکوں۔

گوٹے والے بابا کو میں نے قد میں اپنے سے بہت بلند پایا۔ حالانکہ ہماری ملاقات پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی نہایت مختصر۔

بجلی کی روشنی لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ یقین کیجیے چودہ برس بعد لاہور کا یہ روپ دیکھنا مجھے میسر ہوا تھا۔ اور میں بہت خوش تھا۔ اپنی کلپنا میں مجھے دور تک دیے ہی دیے نظر آ رہے تھے جیسے پرانی یادوں کی گلیوں میں بزمِ چراغاں کا منظر پیشِ نظر ہو۔ سچ جانئے۔ وہ گوٹے والا بابا بھی کسی چراغ کی لو کی طرح لپک کر سامنے آ گیا۔

میرے ساتھ ایک صاحب تھے، جو کہانیاں لکھتے ہیں۔ اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے لاہور کے ایک کالج کی بزمِ ادب میں ہم اکٹھے ہوئے، جہاں ایک کہانی پڑھی گئی۔ وہ کہانی میری ہی لکھی ہوئی تھی۔ اور بحث کے دوران میں میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کی تخلیق میں میں نے اپنی بڑھیا ساس کو سامنے رکھا تھا جس کی ذہنی الجھن یوں شروع ہوئی تھی کہ بیٹی کے گھر کا تو پانی بھی نہیں پیتے اور وہ ایک پاپن کی طرح سوا سال سے بیٹی کے گھر میں روٹیاں توڑ رہی ہے۔

بحث میں ایک صاحب بولے کہ ایسے کردار تو ہمارے معاشرے سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور اب نئی پود کے سننے اور پڑھنے والے اس طرح کی چیز سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اور اس کے جواب میں میں نے صرف اتنا عرض کیا تھا کہ کسی بھی کہانی کا خاکہ ایک ایسی وحدت ہے جسے تخیل کی مدد کے بغیر مرتب کرنا ناممکن ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ ایک کہانی کا وجود بھی ادراک آگہی کی سوگند کھاتا ہے تو پھر اسی ادراک آگہی کے بل بوتے پر آپ کسی کہانی کا جمالیاتی حظ حاصل کر سکتے ہیں۔ بزمِ ادب سے اٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچنے تک ہم اسی بحث میں الجھے رہے کہ کیسے ایک کردار یا واقعہ کو لے کر کہانی کا تانا بانا بن ڈالتے ہیں اور پھر کیسے ہمارے کردار ہمارے ساتھ سانس لینے لگتے ہیں۔ اور جناب کچھ ایسی ہی ہماری ذہنی کیفیت تھی، جب گوٹے والے بابا سے ملاقات ہوئی۔

جیسے کسی جانے پہچانے رنگ نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔ اور مجھے یہ احساس ہوتے دیر نہ لگی کہ بلانے اور سننے والے میں سب دوریاں مٹ چکی ہیں —— اور لفظوں کو توڑے مروڑے بغیر ہی میں اس رات کی بات کہہ رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرے اور میرے اور میرے دوست کے ذہن میں ان گنت احساسات رہے ہوں گے، جب گوٹے والے بابا سے ہماری ملاقات ہوئی۔

یہ پوچھنے کا تو سوال ہی نہ تھا کہ بابا تمہاری تعلیم کہاں تک ہوئی۔

نہ یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ تم نے مٹی میں ہاتھ ڈالا اور وہ سونا ہو گئی۔

لمبا اونچا قد، پاؤں میں دیسی جوتی، مٹھی بھر داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، خوش گفتار گوٹے والے بابا کی یہ باتیں تو اب ہمیشہ یاد رہیں گی۔

جیسے کوئی گیت جاگ اٹھا۔ بابا کی تپلیاں پھیل گئیں۔ اور ہاتوں میں پھولوں کی باس نزدیک آتی گئی۔

اس گڈے والے بابا کی آنکھوں میں وہ جوت تھی، جو کسی سچے دل کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ یہ بات تو پہلی ہی نظر میں کھل گئی کہ گڈے والے بابا کو غصہ بالکل نہیں آتا ہوگا۔

ہم دونوں ایسے ملے جیسے دو پربت گلے ملیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا میرا ساتھی بھی گوٹے والے بابا کی شخصیت کی چھاپ محسوس کر رہا تھا۔

اب سنیئے! قصہ یوں ہوا کہ میں نے دور سے دیکھا ایک بوڑھا میری طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھانا چاہا۔ وہ جواب میں مسکرایا۔ لیکن میں نے مسکرانے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی۔ اب وہ بوڑھا میرے قریب آچلا تھا۔ اس نے بازو پھیلائے۔ اب میں بھی جواب میں بازو پھیلائے بغیر نہ رہ سکا۔

اور پھر ہم گلے لگ کر ملے۔

میں نے کہا "پہچے کہاں سے آئے بابا؟"

"ٹپیلے سے۔"

میں دوبارہ بابا سے گلے لگ کر ملا۔ اور میں نے کہا "اچھا تو آپ ٹپیلے سے آئے نا بابا؟ میرا گاؤں بھی تو کبھی ٹپیلے میں ہی تھا۔"

"بچھڑے ساتھی یوں ہی ملتے ہیں" اس نے ہولے سے کہا۔

اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آواز بزم چراغاں بن اٹھی۔

میں نے پوچھا "یہاں کہاں رہتے ہو تم؟"

وہ بولا "سکھر میں۔"

"وہاں کیا کرتے ہو؟"

"رسیاں بانٹتا ہوں۔ اور خدا کے فضل سے روزگار میں فرق نہیں پڑا۔"

میں نے کہا "یہ تو بری بات نہیں، بابا! پیٹ لگا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ اور محنت تو ضروری ہے۔"

بابا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

میرے ساتھی نے کہا "اب چلنا چاہیئے۔" میرے ساتھی کو جیسے اس وقت کسی کہانی کے کردار سے ملاقات کرنے میں ذرا بھی دلچسپی نہ ہو۔

مجھے خاموش پاکر میرے ساتھی نے کہا "تمہاری تو وہ بات ہے کہ چپک گئے تو بس چپک ہی گئے۔ اب گاڑی آنے میں دیر نہیں۔ بابا سے چھٹی لی جائے۔"

"تھوڑا رکو" کہتے ہوئے میں نے اپنے ساتھی سے آنکھوں آنکھوں میں معذرت کی اور پھر میں نے بابا کے قریب ہو کر کہا:

"وہاں ٹپیلے میں کیا کام کرتے تھے بابا؟"

بابا بولا "وہاں اپنا گوٹے کا کام تھا۔"

"اور اب وہ گوٹا کیا ہوا؟" میں خاموش نہ رہ سکا۔

"وہ گوٹا تو وہیں رہ گیا!" اور پھر میں نے بابا کی آنکھوں میں قطرے کو گہر بنتے دیکھا۔

ظاہر تھا کہ یہ کوئی ایسا مصرعہ نہیں جس پر سینکڑوں ہزاروں لوگ نعرہ لگائیں۔ جواب میں میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔

میں بابا سے گلے ملے بنا نہ رہ سکا۔

جواب میں اپنی بات خاموشی میں ہی کہہ پایا۔

میرے ساتھی نے کہا "اب بابا سے اجازت لی جائے۔"

جونہی میں نے اپنی بانہیں بابا کے گلے سے ہٹائیں، بابا نے مجھے اپنی بانہوں میں کھینچ لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایک نئی دوستی کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "ایسے منحوس دن بھی آتے ہیں بابا، جب کسی کا گوٹا چھن جاتا ہے لیکن ــــ"

معلوم ہوتا تھا، میرے الفاظ کہیں چھن گئے۔ میرا گلا بھر آیا۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے زبان ہلائی لیکن الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔

میرے ساتھی نے کہا "بابا تم یہاں ٹھہرو ہم لوٹ کر آتے ہیں۔"

"ضرور آؤ گے نا؟" بابا نے آنسو بھری آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ رنگ گھٹا ہوا گندمی، ٹھیٹھ سندھی ٹپیلے والا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس گراموفون ریکارڈ کی یاد آگئی جس کے آخر میں یہ آواز ابھرتی تھی "بھائی چھیلا، ٹپیلے والا"۔ اور جب میں نے یہ بات اپنے ساتھی کو بتائی تو اس نے اس کا یہ جواب دیا "بھائی چھیلا" ٹپیلے والا کا جواب نہیں۔ بھائی چھیلا ٹپیالوی میں یہ رنگ پیدا نہ ہوتا۔"

میں نے بڑے غور سے بابا کے چہرے کے گندمی رنگ کا

جائزہ لیا۔ اور اس کے خالص پٹیالے والے لہجہ کو جھک کر سلام کیا، اور میں نے کہا۔ "بابا! ہمارے سامنے ایک نیا مستقبل ابھر رہا ہے!"

اور پھر اپنے ساتھی کی بات مان کر میں نے بابا سے سرِ دست اجازت لی۔

"تو آپ لوٹ کر آ رہے ہیں نا!" گوٹے والے بابا نے پوچھ لیا۔

"ضرور" میرے منہ سے نکل گیا۔

پلیٹ فارم پہ بدستور بجلی کی روشنی چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ گاڑی آنے میں ابھی بیس منٹ رہتے ہیں۔

چند لمحوں کے لئے ایک جگہ میرا ساتھی مڑ کا پھر ایک بک اسٹال کی طرف گھوم گیا۔ مجھے یہ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی کہ آخر بک اسٹال پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے لئے ہی میرا ساتھی بار بار تاکید کر رہا تھا کہ گوٹے والے بابا سے اب چھٹی لی جائے۔

بک اسٹال کے قریب کھڑے کھڑے میں سوچ رہا تھا کہ آخر گوٹے والے بابا نے کیسے یہ پتہ لگا لیا کہ میں بھی پٹیالے والا ہوں۔ آخر کیسے اس نے پتہ چلا لیا کہ میں بھی ایک بھٹکی ہوئی منزل کا مسافر ہوں۔

جناب مجھے بےحد کوفت ہو رہی تھی۔ اور میرا ساتھی یونہی بک اسٹال پر اچھے بُرے میگزینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور بار بار جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ گویا سوچنے لگتا کہ اومنی بس کے ٹکٹ کیلئے بچا کر رکھے ہوئے پیسے یہاں کیسے خرچ کئے جا سکتے ہیں۔

اس سرد ماحول میں میرے دل و دماغ ٹھٹھر رہے تھے۔ اور مجھے اپنے ساتھی پر بری طرح غصہ آ رہا تھا، جسے کہانیوں کے لئے نئے سے نیا موضوع تلاش کرنے کی ہمیشہ دھن رہتی تھی لیکن آج اس نے ایک زندہ کردار میں دلچسپی دکھانے میں بری طرح کنجوسی سے کام لیا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی میرے دل و دماغ کی بےبسی سے گلے مل رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی کا سنگ چھوڑ کر گوٹے والے بابا کے پاس چلا جاؤں اور اس سے کہوں کہ اب پچھلی باتیں یاد کر کے سسکتے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح بچھی ہوئی روشنی بھی یہی بات کہتی معلوم ہو رہی تھی کہ ہماری آنے والی خوشیوں کی باگ ڈور تو ہمارے اپنے ہاتھ میں رہنی چاہیئے۔

میں گوٹے والے بابا سے یہ بھی تو نہ پوچھ سکا کہ اس کے گھر والے کتنے آدمی ہیں۔ کم سے کم مجھے یہ تو پوچھ لینا چاہیئے تھا کہ کبھی دیوالے کر پٹیالے کا وہ گوٹے والا بازار دیکھنے کا اس کا ارادہ کب دوستی کے مکمل ہونے کا ڈھے گا!

میں گوٹے والے بابا کے حضور میں جھک کر کہنا چاہتا تھا کہ انسان ابھی زندہ ہے اور دوستی کی بزم چراغاں کے لئے ہم انتظار کر سکتے ہیں، جب روٹھے ہوئے دل گلے مل کر کہیں گے — آؤ ہم چند باتوں میں مل کر چلنے کا تجربہ کریں۔

میرا ساتھی بک اسٹال کی دنیا میں گم اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ متواتر جیب میں پیسے گن رہا تھا۔

میں نے اس کا کندھا جھنجوڑ کر کہا:

"یہاں کیا رکھا ہے؟ چلو گوٹے والے بابا سے دو باتیں اور کر لی جائیں؟"

"ارے یار تم بھی کیسے کہانیاں لکھتے ہو گے؟" میرا ساتھی جھنجلایا۔ "ارے بابا کے پاس جاؤ گے تو خود بھی بور ہو گے اور اسے بھی بور کرو گے۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہی کہ کہانی کو پیاسی رہنے دو۔"

"تو دوبارہ گوٹے والے بابا کے پاس نہ چلا جائے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"لیکن ہم اس سے وعدہ کر کے آئے ہیں؟"

"وعدے کی ایسی تیسی!"

میرا ساتھی بدستور بک اسٹال پر جھک گیا۔

میں بڑی الجھن میں تھا۔ میرے ساتھی نے میرے جذبات کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ پلیٹ فارم پہ چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی روشنی سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ بیچ بیچ میں میرا ساتھی میری طرف یوں دیکھنے لگتا جیسے وہ گھوڑے کا ساز کس رہا ہو۔ جیسے میں انسان نہ تھا، اس کے تانگے میں جتا ہوا گھوڑا تھا۔

اچانک اس نے بک اسٹال سے دور ہٹ جانے کا فیصلہ کیا اور میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر دوسری طرف چل پڑا۔

میں نے کہا۔ "ہم ایک بار بابا کے پاس ہو آئیں۔ تاکہ وہ

ہمیں جھوٹا تو نہ سمجھے؟"

"وہ ہمیں جھوٹا سمجھے گا تو ہمارا کیا لے گا؟" میرے ساتھی نے ہنس کر کہا: "میاں! کہانی کو پیاسی رہنے دو۔"

کاش میں ایک منہ زور گھوڑے کی طرح تانگے سے چھوٹ کر دوبارہ بوڑھے بابا کے سامنے جا کھڑا ہوتا لیکن میرا ساتھی تو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے زبردستی مجھے دوسری طرف لے جا رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر طرح طرح کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں دوبارہ بوڑھے بابا کے پاس جا کر پوچھنا چاہتا تھا۔ بابا، تم یہ تو سمجھ گئے ہو یا نہیں کہ تمہارے ووٹ کی بہت قیمت ہے۔

بس اتنے میں گاڑی کے پہیوں کی دندناتی آواز ہمارے کانوں پر طبلہ سا بجانے لگی۔

میں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی کا ہاتھ چھڑا کر دوڑتا ہوا اس بوڑھے بابا کے پاس جا کر اسے ڈبے میں سوار کرانے میں مدد دوں۔ لیکن میری بھی تو ایک مشکل تھی۔

راولپنڈی کی طرف سے آنے والی اس گاڑی پر کراچی جانے والے ایک صاحب سے میرا ساتھی مجھے ملانے لایا تھا جس کی مدد سے کراچی میں میری رہائش کا انتظام ہو سکتا تھا۔

گاڑی ٹھیک وقت پر لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر آکر رکی۔ میرا ساتھی مجھے اپنے دوست سے ملا کر یہ وعدہ لینے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کراچی میں میری مدد کرے گا۔

اس گونٹے والے بوڑھے سے دوبارہ نہ مل سکنے کا مجھے بہت افسوس تھا۔ جب بھی مجھے کسی کردار کی ضرورت پڑی میں نے اسے یاد کی دہلیز پر کھڑے پایا۔ اور زور زور سے کہانی کے کردار کہیں بے موسم کے پھلوں کی طرح کسی مداری کے تھیلے سے تو نہیں نکلتے کہ کوئی پھانسی نہ لگنے دو، پیارے!

ہاں تو اب سنئے سارا قصہ، گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ جونہی ہم دروازے کی طرف بڑھے یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی کہ گونٹے والا بابا بدستور کھڑا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

ڈرامے کی فنی اور ادبی قدریں ——— بقیہ صفحہ ۱۲

لائے اور اس کے ساتھ ساتھ "علامتوں" کو خیال کے وسیع تر اور عمیق تر اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں ایک بار پھر ڈرامے کی فنی اور ادبی قدروں میں صحیح توازن پیدا ہوا اور ڈرامے کو محض ایک فن سمجھنے کے بجائے اسے ادب سمجھنے کے رجحان کو محض ایک محدود اور مخصوص گروہ کا رجحان نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا کا رجحان سمجھا جانے لگا۔ چیخوف نے کمترا اور ابسن نے ایک وسیع تر پیمانے پر حقیقت پسندی اور رمزیت کے لطیف اور مکمل امتزاج سے ڈرامے کو پھر اپنی وہی ادبی حیثیت حاصل کرنے میں مدد دی ہے جو اس میں فطرتاً موجود تھی، لیکن فکر اور عمل کے غلط اندازنے اسے نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ اور اب "ڈرامے" کو جس طرح ایک خاص طرح کا فن سمجھا جاتا ہے اسی طرح ادب کی بھی ایک خاص صنف تصور کیا جاتا ہے۔ اسٹیج کے ڈرامے اور ادبی ڈرامے کو دو الگ الگ چیزیں تصور کرنے کے بجائے بجا طور پر ایک ہی فنی حقیقت کے دو رخ سمجھا گیا ہے، جس کی ترتیب، تشکیل، تنظیم اور تعمیر ایسی قدروں کے امتزاج سے ہوتی ہے جن میں سے بعض کو ہم آسانی کے خیال سے "ڈرامے کی فنی قدریں" کہتے ہیں اور بعض کو "ادبی قدریں"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے "ڈرامے کو اسٹیج سے الگ کر کے محض ایک ادبی صنف کی حیثیت سے دیکھنا اور جانچنا بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ سمجھنا کہ ڈرامے کے لئے ادب ہونا ضروری نہیں۔"

*

"ماہِ نو" کی توسیع اشاعت میں حصہ لیکر پاکستانی ادب و ثقافت سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایئے۔

: ١

: ٢

: ٣

مشرقی پاکستان میں خطاطی

١- خط طغریٰ (''تیر کمان'' کا اسلوب عہد مظفر شاہ ، پانڈو
٢- نسخ (درگاہ شاہ جلال رح ، سلہٹ)
٣- ثلث (مسجع) (عہد سلطان ناصرالدین محمود شاہ ، اول)
٤- ثلث (عہد محمود شاہ)
٥- کوفی : (محراب مسجد ادینہ ، پانڈوہ)

: ٤

: ٥

وادیٔ بولان

۱- پہاڑی گاؤں

۲- برفباری

۳- اونٹوں کے قافلے
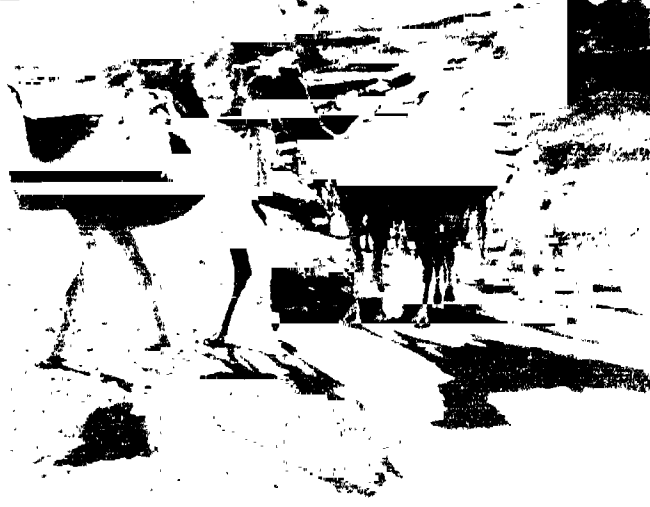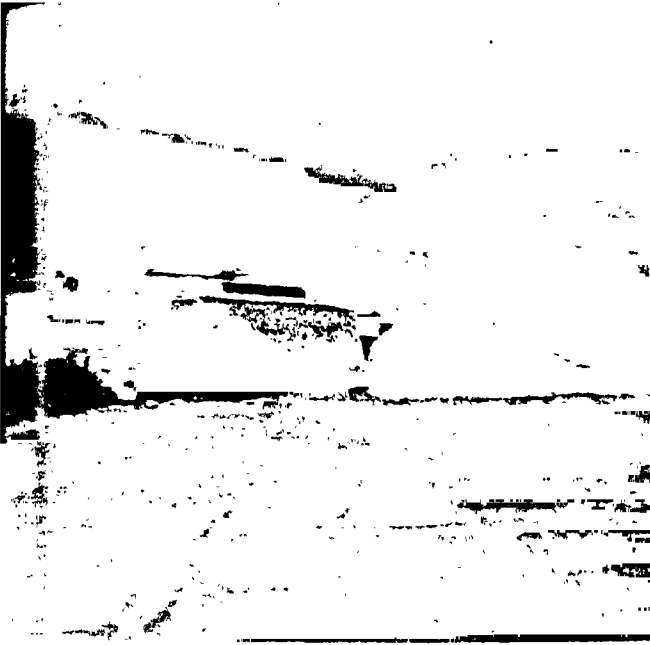
۴- شام صحرا
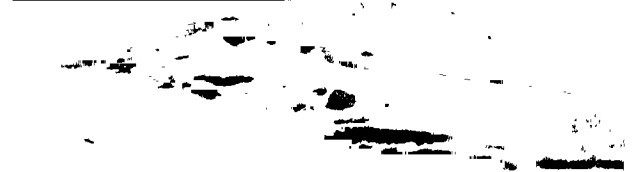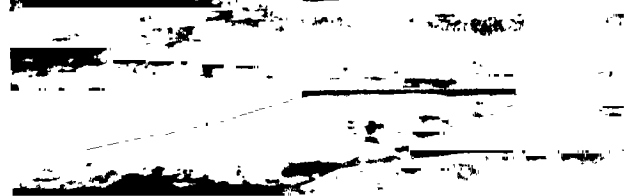
اُسے سوارِ اشہبِ دوراں بیا"

محمد حسین پلہ ڈنگری گراں بہاولپور
۱۲/اکتوبر ۱۹۵۹ء
یکم نومبر

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں:

محترم صدرِ گرامی قدر مدظلہ العالی:
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

چند روز ہوئے میں اپنے والدِ مرحوم مولانا محمد سعید عثمانی کا ایک بیاض مطالعہ کر رہا تھا۔ چند اشعار پر میری نظر پڑی جو مرحوم نے ۳۰ مئی ۱۹۵۷ء کو آنجناب کو مخاطب کرکے لکھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی کہ محترم والدِ مرحوم نے مارشل لاء کے نفاذ سے قریباً ایک سال چار ماہ قبل عجیب انداز سے آنجناب کی توجہ کو ملک و قوم کی بہبودی کی طرف مبذول کیا تھا۔ میں وہ اشعار اسی عریضہ کے ساتھ جناب والا کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ کارپردازانِ قدر و قضا کی جانب سے کتنا عرصہ پہلے آنجناب کو برسرِ کار لانے کی سعادت تفویض ہو چکی تھی اور محترم والدِ مرحوم کے یہ اشعار گویا ایک پیشگوئی تھی جو اب تک حجاب اندر حجابِ قرطاس بیاض میں مستور رہی۔ اور قبلہ والد صاحب کی وفات کے قریباً ۲½ ماہ بعد حرف بحرف صادق آئی۔

مجھے اجازت بخشئے کہ میں جناب والا کو اس سعادت پر جو بزورِ بازو نہیں بلکہ خدائے بخشندہ کی غایت عنایت ہے آج پھر ایک دفعہ صمیمِ قلب سے مبارکباد پیش کروں۔ مجھ جیسے بے بضاعت اور پُرتقصیر انسان کی یہی دعا ہے کہ مالکِ حقیقی جناب والا کا سایہ پاکستان اور ہم پاکستانیوں پر اس وقت تک قائم رکھے جب کہ بتوفیقِ الٰہی جناب والا پاکستان میں اللہ کی حکومت کا صحیح نقشہ قائم کر سکیں اور یہ بھٹکی ہوئی قوم صحیح معنوں میں مسلمان بن جائے۔ آمین ثم آمین۔ والسلام علیٰ سنت خیر الانام

خیر اندیش: احقر
(محمد حسین عفی عنہٗ)

جناب والا کو فیلڈ مارشل کا عہدہ قبول فرمانے پر یہ خاکسار تہہ دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہے

احقر، (محمد حسین)

ہم کو حسب ذیل تحریر اور یہ دو نظمیں دستیاب ہوئی ہیں جن کی اہمیت و افادیت خود واضح ہے اسلئے نذرِ قارئین کی جاتی ہیں۔ (مدیر)

دُعا برتِ العزّت

اے مالکِ ارض و سما تونے جب ملک کیا ہے ہم کو عطا
طارق سا امیر البحر بھی دے خالد سا سپہ سالار بھی دے
پھر علم و علَم اور تیغ و قلم میں رابطۂ باہم ہو عطا
ہو بدر کا سودا ہر سر میں ہو دل کو وہی ایثار بھی دے
دل میں ہے سپاہی کے جو تڑپ دربار میں بھی ہو اسکی جھلک
پھر ولولۂ انکار بھی دے، پھر غلغلۂ کردار بھی دے

گیرم بدل لشکرِ تو گرمیٔ خون است ۔۔۔ دانی کہ سر اسیمگیٔ ملک چگون است
ہم خوف برون است ہم آفات درون است ۔۔۔ بادست و زبان خیز بدل خیز و بجان خیز
از خوابِ گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

برخلق عیاں کن کہ منم مالک و مختار ۔۔۔ برخلق عیاں کن کہ منم مخزنِ اسرار
برخلق عیاں کن کہ منم نائب سرکار ۔۔۔ اے خفتہ سبک خیز و چو طوفانِ گراں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

اسرارِ نہاں چیست تو میدانی و ہم من ۔۔۔ یا سود و زیاں چیست تو میدانی و ہم من
غم چیست اماں چیست تو میدانی و ہم من ۔۔۔ سالار را چو طوفانِ سرِ فوج گراں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

برخیز کہ تو جلوۂ خورشیدِ جمالی[1] ۔۔۔ برخیز کہ تو جوہرِ شمشیر کمالی[2]
برخیز کہ تو قائدِ افواجِ ھلالی ۔۔۔ باہمتِ مردانہ و اسرارِ نہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

[1] جمال الدین افغانی [2] کمال اتاترک

بتانِ وہم وگماں

یوسف ظفر

وقت کی خاک میں صدیوں کی صدائے فردا
بت بنی اپنے تبسم کے سکوں میں گم تھی
مردہ لمحات کے تابوت میں اک عمر یہ بت
اپنے خالق کی تمنا کے تراشیدہ صنم
خاک میں خاک ہوئے مدت سے ہمدوش رہے
موت صدیوں کے جنازوں پہ کھڑی سوچتی تھی
کون اِن لاشوں کا اندازِ نظر جانے گا!
کون اِن بگڑے ہوئے چہروں کو پہچانے گا!!

ٹیکسلا! تیرے دفینوں میں بہت کچھ ہوگا
وقت کی ہنستی ہوئی گاتی ہوئی تصویریں
تیری آغوش میں ہیں، تیری فسانہ خواں ہیں،
مردہ ماضی کا صنم خانہ ہے پیکر تیرا،
تیرے سینے کے یہ ارمان، یہ پتھر کے صنم
کتنی تہذیبوں کی میراث ہیں، سرمایہ ہیں،
موت کی مٹی کے اُگلے ہوئے ہر بُت کی نظر
چیخ کر اپنے زمانے کی خبر دیتی ہے
دیکھنے والے کو اک اور نظر دیتی ہے

میں نے دیکھے ہیں وہ بُت راہوں پہ چلتے پھرتے
جن کے سینے بھی صنم خانے ہیں، جن کے ارماں
اُن کے چہروں کی لکیروں میں نظر آتے ہیں۔
ہر کوئی ٹیکسلا ہے، اپنے بتوں کا مندر
میرا سینہ بھی دفینہ ہے تمناؤں کا
لیکن اس دور میں ہم لوگ یہی چاہتے ہیں
اجنبی نظروں پہ یہ راز عیاں ہونے نہ دیں
دل کو ہم خون کریں سنگِ گراں ہونے نہ دیں

ٹیکسلا! تیرے صنم خانے میں کیا کچھ ہوگا!
لیکن اک چہرہ مری روح سے کچھ کہتا ہے
اس کو میں دیکھنے لگتا ہوں تو چُپ رہتا ہے۔
اس کے چہرے پہ سکونِ دلِ آسودہ ہے
اس کی پیشانی پہ ہیں ثبت محبّت کے نقوش
اس کی آنکھوں سے ازل اور ابد جھلکتے ہیں
اور ہونٹوں پہ وہ نوخیز تبسم کی لکیر
جو خدا دے تو دو عالم کو خوشی مل جائے
گلِ آدم کو بُت سنگ کی ہستی مل جائے

اے بُتِ سنگ! اگر تو بھی ہے اک خوابِ سکوں
تیرے خالق نے تجھے اپنی تمنا جانا
اُس کی مایوس نگاہی نے تراشا تجھ کو
اس نے پایا تجھے امیدوں کے گورستاں میں
اس کی حسرت نے ترے رخ کو تبسم بخشا
تو مری روح کو مت چھیڑ کہ مجبور ہیں ہم
اپنے خالق کی تمنا کے تراشیدہ صنم

غزل

سراج الدین ظفر

شوق راتوں کو ہے درپے کہ طپاں ہو جاؤں
رقصِ وحشت میں اٹھوں اور دھواں ہو جاؤں

کھو تجھے دوں تو پسِ قافلۂ شام و سحر
اک بھٹکتی ہوئی آوازِ فغاں ہو جاؤں

اب یہ احساس کا عالم ہے کہ شاید کسی رات
نفسِ سرد سے بھی شعلہ بجاں ہو جاؤں

لبِ معجز نفساں کی ہو اگر بخششِ خاص
ناگہاں نے کی طرح زمزمہ خواں ہو جاؤں

لا صراحی کہ کروں وہم و گماں غرقِ شراب
اس سے پہلے کہ میں خود وہم و گماں ہو جاؤں

میں نہیں خضر کہ بس زہد و اطاعت کے لئے
وقت کے دوش پہ اک کوہِ گراں ہو جاؤں

مجھ کو پیری ہے جو منظور تو اس شرط کے ساتھ
صبح کو پیر تو راتوں کو جواں ہو جاؤں

وہ تماشا ہوں ہزاروں مرے آئینے ہیں
ایک آئینے سے مشکل ہے عیاں ہو جاؤں

یوں جلائے تپشِ سینہ و رخسارِ بتاں
سرمۂ دیدۂ صاحب نظراں ہو جاؤں

بوئے مے آئے گی انفاس سے ورنہ میں تو
حلقۂ زہد کی بھی روحِ رواں ہو جاؤں

ہاتھ اُس زلف سے ہیں دور مگر کیا معلوم
کس گھڑی بے خبرِ سود و زیاں ہو جاؤں

شوق کا جب کسی صورت نہ ادا ہو مفہوم
ذہن عینِ خموشی میں زباں ہو جاؤں

اس طرح تیز ہو اے گردشِ پیمانہ کہ میں
سینۂ گردشِ دوراں میں سناں ہو جاؤں

ایسی چھلکا کوئی اے پیرِ خرابات نشیں
صبح تک واقفِ اسرارِ بتاں ہو جاؤں

میں ترے بندِ قبا سے کہ ہے بے شرح و بیاں
الجھوں اس طرح کہ بے شرح و بیاں ہو جاؤں

غرق ہو کر بھی ہے برحق ابدیت میری
پھر نہ ابھروں جو زماں سے نو زماں ہو جاؤں

ایسا اندازِ غزل ہو کہ زمانے میں ظفر
دورِ آئندہ کی قدروں کا نشاں ہو جاؤں

★

غزل

اختر احسن

راتیں دیدۂ تر سے پہلے راتیں دیدہ تر کے بعد
منزلیں مجھ سے دور رہتی ہیں میرے سیر و سفر کے بعد

ایک کرن بھی درد کی سرخی توڑ کے دل تک آ نہ سکی
دل میں کوئی رنگ نہ جاگا رنگ شام و سحر کے بعد

دید کا دروازہ نہ کھلا صحرا کی پھیلی وسعت پر
وحشت سایۂ در سے پہلے، وحشت سایۂ در کے بعد

دشت ہے وہ ویرانی کا، شب کو دیس نکالا ہے
نام نہ لوں گا ریگِ رواں کا منظرِ ریگِ سحر کے بعد

یاد کا اک تارا بھی نہیں جو شامِ افق پر آن بسے
دھول سی بن کر اُڑ گئی شامیں رحلتِ شمس و قمر کے بعد

چار طرف اب ویرانی کا پانی تنہا بہتا ہے
درد میں گھل کر بہہ گئی راہیں قتلِ شام و سحر کے بعد

نالۂ دل جب بیچ میں اُٹھا نالۂ شب بھی ماند ہوا
رات ستارے لے کر بھاگی درد کے اس منظر کے بعد

کوئی ثمر اس دل پہ نہ آیا اشک کے ایک ثمر کے بعد
آنکھ کو کوئی پھول نہ بھایا دل کے غنچۂ تر کے بعد

کوئی بھی پیاری شکل نہ دیکھی دل کی پیاری شکل کے بعد
کوئی صورت دل میں نہ جاگی صورتِ غنچۂ تر کے بعد

دل سے گئے پر ایک اداسی شام و سحر میں چھوڑ گئے
خامشیوں کی خاک جمی ہے شورشِ شمس و قمر کے بعد

پھول ہنسے تھے لیکن اب دل مدت سے ہے بھول چکا
ہاتھ قلم ہیں شاخوں کے اس قتلِ لعل و گہر کے بعد

آب و ہوا میں خاک کی آخر خاک ہی ہو کر بیٹھ رہا
کوئی الفت دل کو نہ بھائی الفتِ لعل و گہر کے بعد

کیا کیا جھوٹ تھے نور سے بن کر منزلِ دل میں آ کے رہے
نالۂ حسرت دل میں جاگا لمحہ لمحہ بھر کے بعد

شاخ شاخ پر پھول کھلے ہیں صورتِ غنچۂ تر کے بعد
نخلِ دل بھی رقص میں آیا رقصِ تیغ و تبر کے بعد

ایک گرج سی بن کے اُڑی ہے رات کی پھیلی تنہائی
پُرزے پُرزے خامشیاں ہیں یورشِ شمس و قمر کے بعد

سیلِ نور نے آن دبوچا خاک کو گھول کے پی ہی گیا
نور کا اک طوفان اٹھا ہے قتلِ لعل و گہر کے بعد

رات کہانی بن کر آئی دن بن کر اک افسانہ
رنگ میں سارے منظر بھیگے منظرِ شام و سحر کے بعد

صبح نئی اک آن کے پھر سے آئینۂ دل میں اُتری
کیا کیا پھیلے منظر جاگے وحشتِ دیدۂ تر کے بعد

کونہ کونہ صحرا دل کا نقشِ قدم سے آگ ہوا
چار طرف اک گلشن دہکا میرے سیر و سفر کے بعد

اک اک شاخ پہ ایک عجب سی صورت آن کے بیٹھ گئی
باغ تھا حیرانی کا عالم میرے ذوقِ نظر کے بعد

فن:

ہمارے عوامی رقص

شفیق بریلوی

مجھے ذوقِ تماشا اکثر کہیں نہ کہیں لے ہی جاتا ہے — جہاں سانولی سلونی شامیں فن کی گوناگوں جلوہ آرائیوں سے جگمگ جگمگ کرتی ہیں اور بھیگی ہوئی سرشار راتیں رقص و نغمہ کی سحر کاریوں سے "وہ جنت نگاہ، یہ فردوسِ گوش ہے" کا سماں پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور اور ان کے ہمراہ آنے والے امریکی مہمانوں کے اعزاز میں جن تفریحی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا تھا، میں بھی ان میں شریک تھا۔ بزم درب جہاں بھی ہو بزمِ طرب ہے۔ اور پھر ہوٹل میٹروپول کی مدہوش کن سراپا بہار فضا میں۔ ان نغمہ ہائے دلنشیں اور رقص ہائے دلنواز نے بے اختیار پاکستان کے گوشے گوشے کی یاد تازہ کردی۔ خواہ وہ مشرقی پاکستان ہو جہاں ہم چاروں طرف خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں یا مغربی پاکستان جس کے کوہسار، میدان، ریگ زار سب ایک انوکھی، ایک دلآویز فضا لئے ہوئے ہیں۔

ہمارے عوامی ناچوں کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ جیسے زندگی خود رقص کے سانچے میں ڈھل گئی ہو۔ جیسے ہر مقام کے باشندوں کی روح نے ایک نرالی وضع اختیار کر لی ہو۔ جیسے دھرتی خود جی اٹھی ہو اور ایک عجیب شان دلربائی کے ساتھ انگڑائیاں لے۔ اور اس کا انگ انگ، اس کی ہر ادا، ہر حرکت دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ان رقصوں کی دلآویزی اور فنی نفاست اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے — سچائی، تازگی اور قدرتی وضع۔

دلبری بے قاہری جادوگری است — یہ ایک حقیقت ہے۔
اسی طرح دلبری با قاہری پیغمبری است۔ اور اس کا بین ثبوت سرحد کا سنگلاخ ماحول ہے۔ یہ سرحد کی چٹانوں کے فرزند جن کی رگ رگ میں ایک بہادر اور جنگجو قوم کا خون گرم موجزن ہے۔ یہ لوگ صدہا سال سے رزم و پیکار کے دھنی ہیں۔ اور ان کے لئے شمشیر و سناں ہی زندگی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس روح اور اس زندگی کی عکاسی خٹک، [illegible] سے بہتر اور کیا کرے گا؟ یہ رقاص نہیں سرحد کے جیالے، جنگجو، شمشیر زن ہیں۔ اور ان کا والہانہ رقص تیزی سے گھومنے، اعضا کے پُرزور جھٹکوں اور ولولہ و جوش کا ایسا پُرجلال مظاہرہ ہے۔ جس میں قاہری ہی قاہری ہے — جس سے نرم رگ انسان دہم ہو جاتے ہیں۔ اور بزمیہ وضع کے تفریحی مشاغل کے شوقینوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ یہ قاہرانہ جمال ایک ایسا قوی اور پُرزور اثر دکھاتا ہے جو ناظر کے دل و دماغ پر مدت العمر چھایا رہتا ہے۔ خٹک ناچ کی حرکات تمام تر زندگی ہیں۔ اور ان میں خالصتاً اجتماعی روح کارفرما ہے۔ کیونکہ ڈھول کی گرجتی کڑکتی آواز، رقاصوں کے پاؤں کی دھمک ہی سے نہیں دھڑکتے دلوں کی شورش سے بھی ہم آہنگ ہوتی ہے — اور ڈھول کی سنگت رقص و مستی کی شان اور اٹّان کو دوبالا کرتی ہے۔

خٹک اور لختہ، زندہ دلانِ سرحد کی قومی شجاعت کا بھرپور عکس ہیں اور یہاں کے گرم خون نوجوانوں کے پسندیدہ اور محبوب ناچ ہیں جن میں رزم کا پہلو زیادہ نمایاں ہے تو رتنی رزم و بزم اور مردانگی و نسائیت کا ایک لطیف مجموعہ ہے۔ کیونکہ اسے مرد اور عورتیں مل کر ناچتے ہیں۔ اور گو اس میں بھی ورزش کا انداز پایا جاتا ہے۔ پھر بھی صنفِ نازک کا لطیف پرتو جلال کو جمال سے نرم و سبک، لوچدار اور نشیلا بنا دیتا ہے۔

بلوچستان — یہ جری بلوچوں، شتربانوں، چرواہوں، جفاکش دہقانوں کا مسکن جن کی زندگی پہاڑوں، ریگستانوں اور وادیوں ہی کی زندگی ہے — سرحد سے دور نہیں اور نہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ اس لئے یہاں کے لوک ناچ بھی سرحد کے مردانہ لوک ناچوں کے ہم وضع بھی ہیں اور حریف بھی۔ لہٰذا یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ وہ لوگ جن کے متعلق حکیمِ ملت علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ [illegible] بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا — ان کے عوامی رقصوں

میں ان کی پوری زندگی جھلکتی ہے۔

اور وہ پنجاب انتخاب ہفت کشور — اس کے جیالے جاٹ، بلند ہمت اور بلند قامت کسان شیشم اور دھیری (شاہ بلوط) کے پیڑوں کی طرح فضا میں ابھرتے ہوئے۔ اور انہی کے ساتھ وہ سرو ہی کی طرح بلند اور خوبصورت جاٹنیاں اور مٹیاریں ان کا رقص بے تحاشا گھومتا ہوا قاہرانہ رقص نہیں۔ بلکہ اچھلتا کودتا ہوا چونچال رقص ہے۔ متوازی اور حلقہ دار نہیں بلکہ عمودی۔ جب پری وشوں کا کوئی جھرمٹ دن کے بھولے اجالے یا رات کی مسحور کن سیمیائی چاندنی میں حلقہ باندھ کر یہ ناچ ناچتا ہے تو بھی گھومنے سے زیادہ یہی اچھلنے کودنے کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اپنی توانائی کی شدت سے اچھل کر ہوا میں نکل جانا چاہے۔ جیسے یہ کسی دلی خوشی کی لہر یا فتح و کامرانی کے تحرک انگیز جذبہ کا نتیجہ ہو۔ اب وہ پری وش ایک ہو یا البیلی پری وشوں کی سرمست ٹولی، وہ اپنی گھریلو زندگی اور باہر کھلے کھیتوں کی زندگی ہی کی عکاسی کرتی ہے — شاید یہی باتیں تھیں جن سے لعبتانِ چین کا وہ طائفہ جو کچھ عرصہ ہوا ہمارے یہاں آیا تھا مسحور ہوا اور اس کی نظرِ انتخاب اسی چلبلے، بہت ہی چلبلے ناچ پر پڑی۔ ناچنے والیاں بانہوں کو لہرائی، بڑی ہی مستی و بیخودی کے عالم میں ناچتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ناچتے ناچتے صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے کوئی منچلا نوجوان شیخ سعدی کی اس تعلیم کے برعکس کہ اے مرداں بکوشید۔ تا جامۂ زناں نپوشید — بڑی بے باکی سے عورتوں کا لباس پہن لیتا ہے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رومانوں کی اس سرزمین کو دیکھنے ایک بار پھر آسمان سے ہیر اتر آئی ہو اور پھر نہ جانے کتنے رانجھے اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔

بھنگڑا — جاٹوں کے اس مقبول ناچ کی آن بان ہی کچھ اور ہے۔ جہاں گیہوں کی بالیاں گدرائیں اور بیلی ہو ہو کر لہرانے لگیں، دیہات کے لوگ خوشی سے مست بلکہ بدمست ہو کر بے اختیار بھنگڑا ناچنے لگتے ہیں۔ اُف اس کی بے پناہ دھمک اور ہڑبونگ کا سا عالم! اور جب شورش و مستی اس قدر عام ہو جائے تو بچوں، بوڑھوں جوانوں کا امتیاز کیا۔ سبھی ایک ہی موج میلے میں ڈوب جاتے ہیں۔ ایک شخص گلے میں ڈھول ڈالے اس کو زور شور سے بجاتا رہتا ہے اور ناچنے والے رنگیں لنگیوں اور لانبے لانبے کرتوں میں ملبوس اس کے گرد حلقہ سا بنا کر ڈھول کی تال پر قدم اٹھاتے، تالیاں بجاتے گھنٹوں ناچتے رہتے ہیں۔

جھمر ہو یا جھومر بات تو ایک ہی ہے۔ اس میں جھوم جھوم کر لہرانے کی سی ادا ہے۔ وہی سوز، وہی نرمی، وہی لوچ اور بانکپن جو سابقہ مغربی پنجاب یعنی ملتان اور بہاولپور وغیرہ کے علاقوں میں ہے۔ اور لہندا اور مرکزی علاقہ میں فرق پیدا کرتا ہے۔ نوجوان ڈھول پر جھومر کی تال سن کر مدہوشی کے سے عالم میں اس کے گرد ناچتے ہیں جیسے فانوس کی گردش کرتی ہوئی شکلیں اندر جلتی ہوئی شمع کے گرد۔ اور اگر مردوں کی جگہ یہاں کی البیلی لانبی لانبی ڈھیلے ڈھالے لباس والی جادوگرنیاں ہوں تو پھر کیا کہنے۔

سمّی، گدّا اور کلکلی — ان ناموں ہی میں شوخی و شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ سمّی یا سماع شاید ایک ہی چیز کے دو روپ ہوں۔ اس دیہاتی ناچ کا سلسلہ ملتان اور سندھ سے ہوتا ہوا شاید عرب تک پہنچ جاتا ہو۔ سمّی کیا ہے؟ نوجوان البیلی دیہاتی لڑکیوں کا ناچ جب ان کے ولولے اور امنگیں چند گھنٹوں کے لئے سماج کی چادر ہٹا کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور اُن کے چہرے ایک دلی خوشی کی لہر سے کھل اٹھتے ہیں۔ اس ناچ میں جب لڑکیاں مٹکتی تھرکتی، آنچل لہراتی، چوڑیاں اور پازیب بجاتی مستی کے عالم میں کھوئی ہوتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس سمّی یا سہیلی کی یاد میں یہ ناچ ناچا جا رہا ہے وہ ابھی کہیں سے نکل کر آجائے گی اور ان مہ جبینوں میں شامل ہو کر ناچنے لگے گی۔

گدّا یعنی تالی — یہ بھی دلی ترنگ اور کیف و مستی کی ایک پُرلطف علامت ہے۔ اس میں لڑکیاں تو لڑکیاں بچے اور لڑکے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب اس ناچ کا سماں بندھتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ستارے آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

کلکلی کلیر کی — یہ ہیں ایک پنجابی لوک گیت کے الفاظ جیسے کوئی کلی چٹک رہی ہو یا طبیعت میں گدگدی ہو۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کا چست اچھلتا کودتا ناچ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تیزی سے اچھلتی کودتی گاتی گلہریاں۔ جہاں "کلکلی کلیر دی" کے الفاظ زبان پر آتے ہی آنکھوں کے سامنے ایک روشن ہالا اور نگینیاں ہی نگینیاں جھلک

وہ محفل رنگا رنگ جس کا شروع ہی میں ذکر کیا گیا ہے سندھی دیہات کا شوخ اور نظر فریب رنگ بھی دامن میں لئے ہوئے تھا۔ رقص اور گیت دونوں کا موضوع وہی عورت کے دل کا ازلی و ابدی موضوع تھا۔ اپنے پیارے محبوب، اپنے سائیں کی آمد پر بے اندازہ خوشی اور مسرت کا اظہار گیت کے بولوں میں سندھی اور پنجابی زبانوں اور روحوں کے ڈانڈے آپس میں ملتے نظر آتے ہیں اور عجیب کیف پیدا کرتے ہیں۔

کشمیر کو کہنے والوں نے "ایران صغیر" کہا ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اہل کشمیر کی کاریگری اور نفاست ذوق سے کون انکار کر سکتا ہے اور پھر یہ سرزمین جہانگیر، نورجہاں اور شاہ جہاں کا بھی چہیتا دیس رہا ہے۔ اس لئے یہاں کے لوک ناچوں میں ایرانی طرز اور مغلیہ مذاق دونوں کا گہرا رچاؤ نظر آئے تو کچھ عجب نہیں۔ ان میں صوفیانہ کلام اور حافظ بہت مشہور ہیں۔ اس کے برعکس بچہ نغمہ ٹھیٹ کشمیری چیز ہے۔ جو شہنائی اور ڈھولک کے ساتھ ناچا جاتا ہے۔ اور دیہات کے لوگوں میں کافی مقبول ہے فصل کاٹنے کے بعد جگہ جگہ اسی خالص کشمیر زاد ناچ کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ رَوف کشمیری عورتوں کا ناچ ہے اور تہواروں کے موقع پر یا فصل کی کٹائی کے زمانے میں اس کا خوب رنگ جمتا ہے۔

مشرقی پاکستان کی ہری بھری فضا حسب موقع اپنے آغوش میں بسنے والوں کا دل میں کیا کیا کیف و مستی نہیں پیدا کرتی بیلی بیلی ہری ہری دھرتی پر تھرکتے پاؤں اور جھومتے لہراتے بدن کبھی زیر گان اور کبھی ایک پر فسوں رقص اور کبھی دوسرے کی مست کن صورتیں اختیار کرتے ہیں اور اپنے انوکھے حسن سے دل کو لبھاتے ہیں۔

کھیتوں اور کھلیانوں کے ناچ جیسے مغربی پاکستان میں ہیں ویسے ہی مشرقی پاکستان میں بھی ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ ان کا برجستہ جواب ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کے لوگ ایک، ان کی روح ایک ان کے احساسات ایک ہیں۔ فصل کی کٹائی کے موقع پر ان ناچوں سے عجیب گھما گھمی پیدا ہو جاتی ہے اور خود دھرتی بھی پاؤں کی دھمک سے تھرکنے لگتی ہے جیسے ان کا ازلی ہی سے سنگ ساتھ ہو۔ نوجوان عورتیں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرہ سا بنا لیتی ہیں اور اپنے سانولے سلونے جسموں کو ہر سمت حرکت دیتی ہیں۔ مرد پکھراج کی قسم کے انوکھے ہلکے پھلکے ڈھول لئے جنہیں "کھولی" کہتے ہیں، بجاتے اور پھر ایک رند منش شاعر کے الفاظ میں۔

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے۔ جب تال اور ناچ کی سنگت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو ناچ میں حصہ لینے والے ہوں یا دیکھنے والے، سب یہی محسوس کرتے ہیں گویا پوری کائنات گھوم رہی ہے، ناچ رہی ہے۔ اور منی پور وہ دیار حسن و نغمہ جس کی سحر آفرینی اپنے رنگین و طرحدار رقص میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ہماری باکمال رقاصاؤں نے اسے بھی ہزار ہا میل کی حدیں پار کر کے اسے ہماری نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ یہاں کے رقص کا سب سے جاذب نظر پہلو مہ پارہ حسیناؤں کا عجیب و غریب لباس ہے۔ ریشمی سایوں کی تیاری میں کچھ ایسی حکمت برتی جاتی ہے جیسے وہ خوب پھیلے ہوئے فانوس ہوں یا جیسے برقی قمقموں کا بہت ہی نفیس مومی و شمع کا پلاسٹک شیڈ۔ اس پھیلے ہوئے زیریں لباس سے رقاصاؤں کے ابھرتے ہوئے سرخ و سفید جسم ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کتنی ہی روشن شمعیں پردۂ فانوس سے باہر نکل کر دیکھنے والوں کی نگاہوں کو مسحور کر رہی ہوں اسی لئے ان کا کیف دیکھنے کے بعد مدت تک دل و دماغ میں رسا بسا رہتا ہے۔

اسی صحبت کی ایک اور دلآویز یاد ـــ "اپوا" کی ہنر دوست خواتین کی طرف سے غالب کے اس شاندار قطعہ کی ڈرامائی پیشکش جو زندگی کے ہنگاموں اور عیش و طرب کی محفلوں کی ایک زندۂ جاوید تمثیل ہے ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ÷ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

اگرچہ یہ بظاہر عوامی رقصوں کے ذیل میں نہیں آتا لیکن یہ تھا تو پاکستانی فن کاروں ہی کی ایک دلفریب پیشکش۔ غزل کہاں اور ڈراما کہاں، یہ تو خلوت کو جلوت میں لانے کی بات ہے لیکن ان نسائی فن کاروں کی داد دینی چاہئے کہ وہ واقعی خلوت کو جلوت میں لے آئیں اور گو ان کی پیشکش میں ڈرامائی حرکت نہ پیدا ہو سکی اور نہ ہو سکتی ہے پھر بھی یہ اپنی جگہ ایک کیف، ایک ندرت کی حامل تھی۔ اور اس بزم نشاط کا ایک بہت ہی موزوں و مناسب تکملہ مرزا غالب اپنے نورانی چہرے اور سفید براق داڑھی کے ساتھ سراسر نمونۂ عبرت۔ وہ کم سن "نصیحت نیوش" سب کے سب چپ۔ مہر بلب۔ پس منظر یہ موسیقی اس کیفیت کو پوری طرح نمایاں کرتی ہوئی۔ اور حرف حرف سننے والوں کے دل میں بیٹھتا ہوا جب ساقی نوخیز صراحی لئے بزم میں آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے صحنِ مے خانہ فضا میں تیر گئی۔ اور لطفِ خرام پر واقعی جنت نگاہ اور صدائے چنگ پر نوبہو نوائے سروش کا گمان ہوتا ہے۔ دامانِ باغبان اور کفِ گلفروش کا جو نقشہ آگ سی محفل میں نظر آیا وہ بہت ہی پرلطف رہا۔ اور وہ آخری سین جو سارے قطعہ اور ساری تمثیل کی روح ہے۔ شمع جو جلتے جلتے، گھلتے گھلتے آخر روپوش ہو جاتی ہے اور گرد و پیش پھیلے ہوئے اندھیرے کو اور بھی تاریک اور سنائے کو اور بھی گہرا بنا کر دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے یہ ساری پیشکش کو ایک کبھی نہ بھولنے والی کیفیت عطا کر دیتی ہے۔ اور رقص و فن کے حلقۂ رنگین کے تمام نقطے ہمیشہ کے لئے آپس میں مل کر حلقۂ سحر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ÷

نبود وفائے عہد دمے خوش غنیمت ست
از شاہداں بنازشِ عہد وفا برقص
ذوقیست جستجو چہ زنی دم ز قطع راہ
رفتار گم کن و بصدائے درا برقص
در عشق انبساط بپایاں نمی رسد
چوں گرد باد خاک شود در ہوا برقص

(غالب)

فتح باغ کے ویرانوں میں

عارف حجازی

دوپہر کے گہرے سناٹے میں ویران، اُداس ٹیلوں پر جیسے موت کی دہشتناک پرچھائیاں چل پھر رہی تھیں۔ آس پاس ہُو کا عالم طاری تھا لیکن جب نیم گرم ہوا کے جھکڑ سرسراتے ہوئے چلنے لگتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سینکڑوں زخموں سے نڈھال انسان تپتے ٹیلوں کے درمیان پڑے سسک رہے ہیں۔

میں بڑی دیر تک فتح باغ کی خاک دخوں میں ڈوبی ہوئی داستان کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کوئی انوکھی داستان نہ تھی بلکہ اُن قدیم تاریخی روایات کی آئینہ دار تھی جن سے دنیا کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اپنے گرد و پیش ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور دل میں کہا۔ "قرطاجنہ، ٹرائے، بابل اور نینوا جیسے قدیم شہروں کو تو فنا ہوئے ہزاروں برس بیت چکے ہیں۔ مگر فتح باغ کو مٹے ابھی کونسی اتنی صدیاں گزر گئی ہیں کہ زمانہ اسے یکسر بھلا بیٹھا؟"

یہ سوچ کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور مدفون شہر کے ٹیلے پر بسنے والوں پہ غصہ بھی آیا لیکن جب میں نے اپنے ملاقاتی گدّو فقیر کو اپنے قریب بیٹھے پایا تو جیسے دل کا غبار آپ ہی آپ چھٹ گیا۔ اب اس ٹیلے پر جہاں کسی زمانے میں پُر رونق شہر ہوگا۔ گھاس پھونس کے صرف چند گھر بنے تھے اور ان کے چاروں طرف ویران ٹیلے! ایک طرف یہ منظر اور دوسری طرف اذیت ناک افسردگی چھائی ہوئی۔ میں نے یہ سادیکھکر گدّو فقیر سے باتیں چھیڑ دیں: "گدّو سائیں! تمہیں فتح باغ کے اُجڑنے کی کہانی یاد ہے؟"

یہ سن کر حبشی نژاد سو سالہ بوڑھے کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ "میرے نوجوان مسافر! آج تم نے بڑی بھولی بسری یاد تازہ کر دی۔ خدا کی شان دیکھئے، جہاں ہم آج بیٹھے ہوئے ہیں یہاں کسی زمانے میں بڑا خوبصورت شہر آباد تھا۔ یہی دو سو سال پہلے کی بات ہے۔"

میں نے فوراً کہا۔ "اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس کی تباہی کے اصل اسباب کیا تھے؟"

بوڑھا پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔ "آہ! اس شہر کی تباہی کے اسباب پوچھتے ہو۔ وہی انسانی ہوس اقتدار اور لوٹ کھسوٹ جس کی مثالیں تاریخ میں بھری پڑی ہیں۔" گدّو نے ایک لمبی سانس لیکر کہا۔ "کلہوڑہ کا آخری حکمراں میاں عبدالنبی، جو نواب سندھ کے نام سے مشہور تھا۔ اسی کے زمانے میں یہ شہر تباہ ہوا۔ نواب بڑا بزدل تھا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے اسکی مملکت پر چڑھائی کر دی اور لہنانی کے مقام پر دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر نواب شکست کھاکر کابل بھاگ گیا۔"

"کابل؟"

"ہاں۔ کابل پہونچکر اس نے والیٔ افغانستان سے مدد حاصل کی اور افغان جرنیل عزت یار خاں کے ہمراہ ایک بڑی فوج لیکر سندھ آیا۔ عزت یار خاں نے اس کی کھوئی ہوئی حکومت بحال کر دی لیکن ابھی اسے کابل واپس ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے نواب کو پھر ملک بدر کر دیا۔ آخر نواب کو پھر شاہ افغانستان کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

"یہ وہ زمانہ تھا جب مغلوں کے عروج کا چراغ دم توڑ رہا تھا۔ ہر سُو ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر سندھ پر افغانوں کا اندر بڑھ گیا تھا چنانچہ

فکاھیہ :

کیا زمانہ آلگا ہے!

تسلیم عارفی

بھائیو! زبان نہ کھلواؤ ۔ سچ نہ بلواؤ ۔ کیوں دار پر کھنچواتے ہو ۔ دیکھتے نہیں کیا زمانہ آ لگا ہے ۔ وہ بھی زمانہ تھا جب ہر طرف چھل پھل ، ہر سو گہما گہمی تھی ۔ قدم قدم پر خوشیوں کے سوتے پھوٹتے تھے۔ اب یہ بھی زمانہ ہے کہ .... بھائیو! میں ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لوں ، کوئی ہماری باتیں نہ سن رہا ہو! ۔ دیکھ لیا ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ابھی تک اپنی امان میں رکھا ہوا ہے ۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا ۔ کیا کہہ رہا تھا ۔ اب تو اتنا بھی ہوش نہیں رہا ۔ توبہ اللہ ۔ کیا زمانہ آ لگا ہے ۔ ہاں تو بھائیو! اس سنہری دور کو یاد کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ کیا کیا نیک کام کئے تھے ہم نے ۔ حج مبارک کے نیک فریضہ ہی کو لے لیجئے ۔ ہر سال اپنی نیک کمائی سے حج کا فریضہ ادا کرتے تھے ۔ بیگمات بھی ساتھ ہوتی تھیں ۔ واپسی پر سونے سے لد کر آتی تھیں ۔ کچھ جاہل لوگ اعتراض بھی کرتے تھے ۔ مگر بھائیو! کیا عورتوں کیلئے سونا پہننا ہمارے مذہب میں ناجائز ہے ۔ یہ عین جائز بلکہ واجب ہے ۔ بلکہ میں تو کہوں گا فرض ہے ۔ کیونکہ سونے کے زیور عورتیں نہیں پہنیں گی تو کیا مرد پہنیں گے؟ مگر بھائیو! اب تو آتے جاتے تلاشیاں ہوتی ہیں ۔ تلاشیاں تو پہلے بھی ہوتی تھیں ۔ مگر اب اور جب میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ اگر یہی صورت حال رہی تو ہم جیسے الحاج حج مبارک کا فریضہ ادا کرنا ہی چھوڑ دیں گے ۔ اور روز قیامت اس گناہ عظیم کی تمام تر ذمہ‌داری موجودہ حکومت کے سر ہوگی ۔ موجودہ حکومت! سبحان‌اللہ ۔ یہ نئے لوگ نجانے کس مٹی سے بنے ہیں ۔ صرف تنخواہ پر کام کرتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے یا تو انکے بیوی بچے ہیں ہی نہیں یا پھر یہ انہیں بھوکا ننگا رکھنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ بھائیو! اولاد کی محبت بڑی چیز ہے ۔ مگر یہ خاندانی منصوبہ بندی کرنے والے اولاد کی محبت کیا جانیں ۔ یہ تو یہی جانیں کہ زیادہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے ۔ کیونکہ آبادی اگر ملک کے ذرائع پیداوار سے اتنی بڑھ جائے کہ توازن قائم نہ رہ سکے تو

قوم مفلسی اور تباہی کا شکار ہو جاتی ہے - اخبار میں یونہی لکھا تھا۔ حالانکہ بھائیو! حقیقت یہ ہے کہ فوجی حکومت، جسے یہ جاہل قوم انقلابی حکومت، بھی کہتی ہے۔ لوگوں سے صرف تنخواہ پر گذارہ کرانا چاہتی ہے .... ہمارے سنہری دور میں تو یہ مسئلہ کبھی پیدا نہ ہوا - ہم ہر کام کرانے کے بعد مساوات اور اخوت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے تمام متعلقہ افسران اور کارندوں کو اپنی نیک کمائی میں سے حصہ دیتے رہے۔ یوں ایک طرح ہم خیرات دینے کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے اور

طرہ باز خاں

اللہ — حالات کیا ٹھیک ہوں گے - کیسا زمانہ آ لگا ہے - کب اس پاگل حکومت سے جان چھوٹے گی - پاگل نہیں تو اور کیا - نہ اسے زر و جواہر سے محبت، نہ رشتہ داروں کا لحاظ، نہ دوستوں کا پاس - اور تو اور کسی کاروبار میں یہ فوجی لوگ اپنا حصہ تک مقرر نہیں کرتے - کیا پاگلوں کے سر سینگ ہوتے ہیں - بھئی جو اپنے فائدے تک کی نہ سوچے وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے - اسمگلنگ، چلیئے مان لیتے ہیں بری بات ہے - مگر اس جرم میں دوستوں تک کو جیل بھیج دیا — کہاں کی عقلمندی ہے

ثواب دارین بھی ملتا رہا - فوجی حکومت کی منطق ہی نرالی ہے - یعنی یہ کیا تک ہے کہ چیزیں سستی ہو جائیں تو تنخواہ میں گذارہ ہو سکتا ہے - بھئی! چیزیں سستی ہو جائیں گی تو دکاندار غریب ہو جائیں گے - اور اگر دکاندار ہم جیسوں سے سستے داموں خریدیں تو ہمیں نقصان ہو گا - ایک کروڑ کے پچاس لاکھ رہ جائیں گے - پچاس لاکھ کا نقصان! ہائے میرے

بھائیو ! تم نے دیکھا ہوگا ان پاگلوں نے ہمارے کیسے کیسے بزرگوں کو ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں ہمارا تصور تک نہیں پہنچ سکتا تھا - کسی نے سچ کہا ہے - انقلابات ہیں زمانے کے - اب تو کسی غیر کے سامنے لب تک نہیں ہلا سکتے - آپ کے سامنے اس لئے زبان کھول رہا ہوں کہ آپ بھی میری طرح فلک کج رفتار کے ستائے ہوئے ہیں۔

سلطانیٔ جمہور

اگر ہم ایک دوسرے کے آنسو نہیں پونچھیں گے تو کیا آسمان سے فرشتے اتر کر ہمارے آنسو خشک کرینگے؟ بھائیو! آپ سوچ رہے ہونگے کہ فلک کج رفتار کے معنی کیا ہیں؟ اس لفظ کے معنی تو میں خود بھی نہیں جانتا مگر مجھے یقین ہے کہ میں نے اسکا استعمال صحیح کیا ہے۔ کیونکہ میں نے اسے دو موقعوں پر استعمال ہوتے سنا ہے۔ ایک تو اس وقت جب میرے ایک مولوی دوست کو، جو ہوٹل کا مالک تھا، صفائی کی مہم کے تحت فوجیوں نے جالی لگانے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت اسنے آسمان کی طرف دیکھکر یہ لفظ استعمال کیا تھا۔ اور دوسرا اس وقت جب ایک بہت بڑے افسر کو جو میرا دوست تھا سرکاری ملازمت سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ فوجی کام زیادہ چاہتے ہیں۔ اور باتیں کم۔ تو بھائیو! اب اگر میرا دل باتیں کرنے کو چاہے۔ تو کیا کروں۔ ظاہر ہے ہونٹ سی لوں۔ منھ کو تالا لگالوں تاکہ اس حکومت کی خوشنودی حاصل کرسکوں ۔ جی، خوشنودی۔ دیکھا آپ نے کیا زمانہ آ لگا ہے۔

ایں دفتر بے معنی۔۔۔۔

اللہ تبارک تعالیٰ اس پرانے زمانے کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جس میں محکموں کے بڑے بڑے افسر ہم ایسے شریفوں اور رئیسوں کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور انتہائی تپاک سے مصافحہ کرتے تھے۔ دفتر کے کام کاج چھوڑ کر ہماری خاطر مدارات کرتے تھے۔ مگر اب تو کلرکوں تک کو ایسی ہوا لگی ہے کہ ہمیں پہچاننے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ اگر ہم سے ایک ذرا سی بھول نہ ہوتی تو یہ جاہل عوام اس فوجی حکومت کو خوش آمدید نہ کہہ سکتے۔ وہ یہ کہ ہم شریفوں اور رئیسوں کا طبقہ دو تین گروہوں میں بٹ گیا۔ اور انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھکر فائدہ اٹھانے کی خاطر مختلف سیاسی جماعتیں بنا ڈالیں - جو آپس میں جھگڑ پڑیں۔ اور لوگوں کو بےاطمینانی کے اظہار کا موقع مل گیا۔ اگر ہم میں اتحاد رہتا تو سیاسی جماعتوں میں بھی اتحاد رہتا۔ اور یوں ساری عمر یہ کمینے اور بھوکے ننگے لوگ ہم جیسے شریفوں کے سامنے سر اٹھاکر نہ چل سکتے اور فوج کو کبھی موقع نہ ملتا کہ انکی رہائی کیلئے میدان میں اترتے۔ مگر افسوس ہماری یہ ذرا سی بھول ایک بہت بڑی خطا ثابت ہوئی۔ جسکا خم — خم — وہ کیا لفظ تھا۔ ہاں ہاں — خمیازہ ہمیں آج بھگتنا پڑ رہا ہے۔ مگر بھائیو! غیب کا علم کون

ہم خرما و ہم ثواب!
(حج بیت اللہ سے واپسی)

'' مہاجر کو ٹھکانہ ....''

جانتا ہے۔ عالم‌الغیب تو بس اللہ ہی کی ذات ہے۔ لیکن فوج میں ذرا بھی ایمان کی رمق ہوتی تو وہ ہماری صلح کرادیتی۔ مگر بھائیو! وہ تو ہمارے خدا واسطے کے دشمن ہیں۔ اسے ہم خاندانی شریفوں کا سکھ چین سے رہنا کب گوارہ تھا۔ بھلا یہ کوئی شرافت ہے کہ زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر کے بقیہ ان کمینے اور کنگال کسانوں کے حوالے کر دی جائے جن کے باپ دادا نے بھی کبھی ملکیت کا تصور نہ کیا ہو۔ جن لوگوں کو ہم سبز باغ دکھاتے تھے اب تو سچ مچ ان باغوں کے مالک بن رہے ہیں۔ فوجیوں کے کھیل سچ مچ نیارے ہیں۔ یعنی تیرے نام کی خاطر جو لوگ گھر بار چھوڑ کر پاکستان آئے اور مہاجرین کہلائے انہیں اب آباد کر کے مہاجرین اور انصار کی تمیز ہی ختم کر دی جائیگی۔ دیکھا بھائیو! مہاجرین کے خلاف کیسی کیسی سازشیں ہو رہی ہیں۔ گو میں خود انصار ہوں مگر سوچئے تو یوں بھی کسی کو مٹایا جاتا ہے۔ بھائیو! ایک نئی بات سنی آپ نے۔ میری مراد بنیادی جمہوریتوں کے قانون سے ہے۔ آپ حیران نہ ہوں۔ پہلے میری سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا کہ یہ کیا بلا ہے۔ مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے شروع ہی سے علم حاصل کرنے کا شوق رہا ہے۔ اسلئے معلوم کر ہی لیا کہ اس قانون کے تحت دیہات میں انتخابات ہونگے، پنچایتیں بنینگی۔ مگر ہم لوگ انتخابات میں، جیسے کہ امید ہے، حصہ نہیں لے سکینگے۔ صرف غریب اور جاهل دیہاتی اپنے نمائندے چنینگے۔ اور یوں دیہات کے اکثر ضروری معاملات وہیں طے ہو جایا کرینگے۔ یعنی آپ سن رہے ہیں۔ ننگے بھوکے چھوٹے پیمانے پر حکومت کرینگے! ہم شریفوں اور رئیسوں سے پوچھے بغیر اپنے نئے سکول، ہسپتال اور کھیلوں کے میدان تیار کریں گے۔ بھائیو! ہنسی نہ آئے تو کیا آئے۔ ہر روز ایک نیا اور عجیب تماشہ لگ رہا ہے اس ملک میں۔ یہ رائٹ لفٹ کرنے والے کیا جانیں کہ سیاست کیا شے ہے؟......... کیا کہا؟ آپ سمجھائینگے مجھ کو؟..... عدالت میں لے جا کر؟ تو کیا آپ میرے ہم خیال نہیں ہیں۔ بھائیو! انہیں کچھ سمجھاؤ۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ آپ کی طرح میرے ہم خیال ہیں۔ میری ہی طرح فلک کج رفتار کے ستائے ہوئے ہیں۔ کیا کہا ہوش ٹھکانے لگ جائینگے؟ .... یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ توبہ! یا اللہ توبہ۔ کیا زمانہ آ لگا ہے!!

جائیں تو جائیں
کہاں؟
ان فوجیوں نے
تو زمین کا بھی
راشن کر دیا!

طغریٰ : (تیر کمان کا اسلوب) بخط علاء الدین حسین شاہ، بابِ گرام، مرشد آباد)

اے۔ کے۔ ایم عبد العلیم

قدیم ترین عہد سے خطاطی مسلمانوں کا محبوب فنی مشغلہ رہا ہے۔ مسلم خطاطی دراصل قرآن مجید کی کتابت و تزئین کے ذوق و عقیدہ کی پیداوار ہے۔ مسلمان نہ صرف اس کتاب مقدس کو حفظ کر کے اس کی حفاظت کرتے تھے بلکہ اس کی جمالیاتی پیشکش کو بھی ایک کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فنونِ لطیفہ میں نقاشی سے زیادہ خطاطی کو عروج و قبول حاصل ہوا۔ بعض کے نزدیک اسلام میں ذی روح کی تصویر کشی اور صورت گری ممنوع ہے اس لئے شروع ہی سے ذوقِ آرائش و زینت نگاری یا خطاطی کے جوہر نمایاں ہوئے۔ تقویٰ پسند مسلمان فن کاروں نے اپنی صلاحیت اور ذوقِ جمال کو زیادہ تر اسی کام پر صرف کیا اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کے نمونوں سے ایک چمنستانِ قلم کھلا دیا۔

یوں خطاطی میں جمالیاتی حس کی تسکین کا ویسے بھی سامان موجود تھا کیونکہ عربی اور فارسی حروف کو اقلیدسی اشکال اور ترتیب و آرائش کے خطوط و نقوش میں نفاست کے ساتھ برتا جا سکتا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ، گو غیر محسوس طریقہ پر، اسلامی فنونِ لطیفہ میں خطاطی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہوتا چلا گیا۔ حروف زیادہ تر افقی یا عمودی اشکال میں ہیں۔ اس لئے تجریدی آرائش کے لئے موزوں مسالہ فوراً مل جاتا ہے اور جب ان کی پیچیدہ یا گتھی ہوئی شکلیں ترتیب میں سمو دی جاتیں تو نت نئے ڈول بنتے چلے جاتے ہیں۔ عمودی حروف سے توسع اور ترتیبی آہنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ افقی حروف سے توازن اور تسلسل کا تیجہ مرتب ہونے لگتا ہے۔ بعض حروف کے جوڑ ملانا ضروری ہوتا ہے اس لئے پیچیدہ اشکال بنانے کا رجحان ترقی کرتا رہا۔ قط، شوشہ، دوائر، میدان قلم، اعراب، سطر بندی، بین السطور، بین المنفصل نے مل جل کر روپ کا اور ہی جامہ پہنا ہے۔ بعض نمونے ایسے ہوتے ہیں کہ کسی شوشے اور گردشِ قلم کو بھی زوائد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کتابتِ حروف میں خوبصورتی کب آنے لگتی ہے اس کا جواب دیتے ہوئے توپ نے ایک جگہ لکھا ہے:

"اگر حروف و اجزائے حروف خوبی کے ساتھ متوازن ہوں اور ان کی آ اور لؔ دراز قد ہوں، پٹڑی سیدھی، سطر بندی صحیح اور موٹے باریک اترتے چڑھتے قط صحیح لگے ہوئے ہوں، ع کھلا ہوا اور د۔ ن کی طرح نہ دکھائی دے تو ایسی تحریر میں یکسانیت و ہمواری آجاتی ہے اور بین السطور نیا تملا پیدا ہو جاتا ہے، یہی خوبصورتی ہے۔"

خطاطی تمام اسلامی ملکوں میں فروغ پاتی رہی ہے مسئو ہند اور مشرقی پاکستان میں بھی اس ہنر پرور کی کاوش کی گئی ہے اور نہایت نفیس نمونے اس فن کے پیدا ہوئے ہیں۔ خان بہادر مولوی ظفر حسن نے بجا لکھا ہے کہ اس فن کو ملک ہند میں عروج و ترقی کہیں جا کر مغلوں کے عہد میں حاصل ہوئی۔

مشرقی پاکستان اور خطاطی : اس میں شک نہیں کہ دیگر علوم و فنون کی طرح دہلی ہی خطاطی کا اول مرکز رہا ہے۔ ترک اور پٹھان سلاطین کے عہد میں بالعموم اور مغلیہ سلاطین کے زمانہ میں بالخصوص اس فنِ شریف کو بہت عروج ہوا۔ مشرقی پاکستان (قدیم بنگال)

دونوں [illegible]

خطاطی [illegible]

میں اسی [illegible]

کی کتبات [illegible]

موضوع [illegible]

میں ان [illegible]

تاریخ نے [illegible]

ہیں۔ پاکستان کے اس حصے میں [illegible] یہ عہد نمونے کہاں کہاں موجود ہیں ان کا کوئی مبسوط مطالعہ نہ کبھی کیا گیا ہے نہ مواد ہی میسر ہے۔ پھر بھی بعض علمائے تاریخ و آثار نے اس طرف توجہ ضرور کی ہے مثلاً ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ دانی نے ۱۵۳۸ء تک کے کتبات بنگال کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ لیکن انہوں نے بھی پاکستان کے اس حصہ میں فنِ تحریر پہ کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی ہے اور مطالعہ کا یہ پہلو ہنوز تشنہ ہے۔

عجائب خانہ ڈھاکہ کے چند اہم ذخیرے: اس وقت ڈھاکہ کے عجائب خانہ میں مشرقی پاکستان کے کوئی بیس کتبات محفوظ ہیں۔ ان میں سے کوئی چار الیاس شاہی اور حسین شاہی دور کی یادگار ہیں اور باقی عہد مغلیہ کے" ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل (۵۲-۱۹۲۲ء) میں ان کتبات کے نمونے طبع ہوتے رہے ہیں۔ نیز" ڈھاکہ ریویو" اور کتاب موسومہ (ANTIQUITIES OF DECCAN) (سید اولاد حسین) میں بھی کچھ نمونے موجود ہیں لیکن ان کتابوں میں بھی فن خطاطی اس کی خصوصیات اور خوبصورتیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔

ضیاء الدین نے اپنی کتاب " اے مونوگراف اون مسلم کیلیگرافی"
"A MONOGRAPH ON MUSLIM CALLIGRAPHY"
میں مشرقی پاکستان کے فن خط پر بیشک ایک معقول نظر ڈالی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: "عہد انگریزی سے قبل بنگال میں آرائشی طغریٰ نگاری کے جو اسلوب نظر آتے ہیں اس کی بہترین مثالیں ہمیں ۵ اویں صدی کے مرشد آباد میں نظر آتی ہیں" لیکن مشرقی اور مغربی بنگال میں طغریٰ کے علاوہ دیگر خطوں کی پسندش کس طرح بڑے یا ادنی پیمانہ پہ ہوتی رہی اس باب میں یہ کتاب بھی خاموش ہے۔ مگر میں اس جائزہ میں یہ بات

[illegible] مشرقی [illegible] دوسرے [illegible] نہیں کر [illegible] خط کے [illegible] اس عہد [illegible] متفرق [illegible] جدید اور [illegible] کے سلاطین [illegible] ای [illegible]

قدیم ترین نمونہ ہائے کتابت: کتابت کے سلسلے میں سب سے پرانا نمونہ جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے رکن الدین کیکاؤس (نبیرہ غیاث الدین بلبن) کے عہد (۱۳۰۱-۱۲۹۱ء) اور زمانہ کا ہے جو تربینی اور گنگا رامپور کے کھنڈرات سے دستیاب ہوا ہے۔ رسم عربی ہے اور نسخ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ شمس الدین الیاس شاہ (۵۷-۱۳۴۲ء) کے عہد کا بس ایک ہی نمونہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ نمونہ آج کل کی ایک مسجد سے ملا ہے، یہ عام اینٹ کی بنی ہوئی مسجد ہے اور کلکتہ کے پاس " بنیاپور کور" میں بنی ہوئی ہے۔ یہ کتبہ دو سطروں میں ہے رسم عربی اور خط طغریٰ ہے اور " تحریر" یعنی ارد گرد کی جدول یا حاشیہ کے خط سادہ ہیں۔ اسے بنگال کی خطاطی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ حروف کے کھڑے حصوں کو ایسی خوبصورتی کے ساتھ سجا کر مرتب کیا گیا ہے جیسے نیزوں کی قطاریں چلی گئی ہوں۔ سکندر شاہ کے عہد (۱۸-۱۳۵۸ء) میں نسخ، ثلث اور کوفی کا رواج بڑھا۔ طغریٰ کو بھی اپنی جگہ مقبولیت حاصل رہی۔ اس وقت بنگال میں خط کوفی کا ایک ہی نمونہ رہ گیا ہے اور وہ مسجد آدینہ میں پایا گیا ہے، جو پانڈوہ کے مقام پر ہے۔ پیش امام کی محراب میں ایک پتھر پر یہ کتبہ کندہ ہے۔ اور قابل دید نمود ہے۔ خط کوفی کو قرآن مجید اور سکوں کی کتابت کے لئے عرصۂ دراز سے مخصوص رکھا گیا ہے۔ ابتدا میں یہ بالکل سادہ ہوتا تھا۔ مگر بعد کو اس میں پیچیدگی اور طرح اندازی اس طرح کی گئی کہ خط کوفی سے نمائش و زینت اور آرائش و نگارش لطیف کا کام زیادہ لیا جانے لگا۔ اور بارھویں صدی کے پہنچتے پہنچتے خط کوفی ایسی گنجلک تحریر ہو گئی کہ اس کو پڑھنا سوائے

مشاق کاتب دمشقی کے اور کسی کے بس کا نہ تھا۔

ہندوستان میں خط کوفی کی کمیابی : اس رجحان کے خلاف ایک ردِ عمل بھی ہوا اور ۱۳ ویں صدی عیسوی میں نوش بدلنی شروع ہو گئی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اسلامی دنیا سے اس خط کا رواج ہی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف بنگال بلکہ پورے برصغیر میں خط کوفی کے نمائندہ نمونے بہت ہی کمیاب ہیں۔ ہندوستان کی بعض کافی قدیم عمارتوں میں بیشک کچھ نمونے محفوظ رہ گئے ہیں۔ جیسے مسجد قوۃ الاسلام "(دہلی: ۱۱۹۱ء)" مقبرہ سلطان التمش (دہلی: ۱۲۳۵ء) اور مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا (اجمیر: ۱۲۰۰ء) مگر مشرقی اور مغربی پاکستان میں کسی جگہ بھی خط کوفی کا کوئی ایسا نمونہ نہیں ملتا جسے کوفی کا "فردِ اسلوب" کہہ سکتے ہیں۔ اس اسلوب میں یہ رعایت رکھی جاتی ہے کہ افقی اور عمودی خطوں کو زرفے یا جالی کی شکل میں مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی کا نمونہ گولکنڈہ (دکن) میں دکھائی دیتا ہے (مزار محمد امین۔ ۹۷۰ھ) اسی طرح کا ایک نمونہ بنگال میں بھی بمقام گنگا رامپور موجود ہے۔ یہ بھی ایک مزار ہے (مولانا عطا شاہ، عہد سکندر شاہ)۔ اس کتبہ میں بھی چار سطریں قائم کی گئی ہیں۔ رسم عربی اور فارسی ہے خط صاف ثلث ہے۔ یہ نمونہ بڑا ہی نفیس اور پختہ کاری کی اچھوتی مثال ہے اور ابھی تک ثابت و سالم ہے۔

خط ثلث میں ایک اور نادر نمونہ : جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جلال الدین محمد شاہ (۳۲-۱۴۱۰ء) کے عہد کا ایک ہی نمونہ دستیاب ہے۔ یہ ایک کتبہ ہے جو ڈھاکہ کے پاس مندرہ نامی جگہ سے ملا ہے اور اب ڈھاکہ میوزیم میں لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ کتبہ پتھر پر ہے۔ رنگ سیاہ ہے ایک رخ کندہ کاری ہے پشت پر کسی ہندو مورتی کی نمود مسخ حالت میں، دکھائی دیتی ہے صرف تین سطریں پوری طرح کھدی ہوئی ہیں۔ پانچویں اور چھٹی سطر (جز ...) پچی کاری کے [illegible] ...۱۹۶۲ء میں ایشیاٹک سو[illegible] بنا گیا ہے کہ [illegible] ہے۔ وجہ یہ [illegible] جلی میں لکھے [illegible] روف کی [illegible] ان کے مقابلہ [illegible] گئی ہیں۔ ایسا [illegible] ثلث ایسا خط ہے کہ [illegible] اعتدال و توازن کا بہ[illegible]

اور جب خطوط اس صاف مستقیم ہوں ثلث جلی ہوگا اور نسخ خفی "ثلث میں حروف کی قامت و ہیئت مثل خنجر ہوتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ ثلث ایک تزئینی روش ہے مگر خط فی الاصل نسخ ہی ہے۔

ثلث کا ایک اور نمونہ : ڈھاکہ کی میوزیم میں ایک اور کتبہ بھی محفوظ ہے جو اس شہر کی "ناصر والا گلی" کی کسی مسجد سے حاصل کیا گیا تھا۔ سید اولاد حسین نے اپنی کتاب "NOTES ON THE ANTIQUITIES OF DECCAN" میں اس پر نظر ڈالی ہے مگر انہوں نے بھی اس کے فن پر گفتگو نہیں کی ہے۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ناصر الدین محمود شاہ اول (۱۴۵۸ء) کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی یہ تحریر دو سطروں میں ہے اور رسم عربی ہے۔ ہر دو سطور کے درمیان افقی تحریر کی آرائش کی گردشوں میں سے گزرتی دکھائی گئی ہے خط ثلث ہے کتبہ کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ اسی بادشاہ کا ایک اور کتبہ پانڈوا کے مقام پر ملا ہے۔ اس کتبہ میں تیکھے عمودی خطوط کی آرائش بہت بہار دیتی ہے۔ مدور حروف کی بیٹھک میں قلم گھٹا ہوا لگایا گیا ہے۔

رکن الدین باربک شاہ (۷۴-۱۴۵۹ء) کے زمانہ کا ایک کتبہ بشیر ہاٹ میں ملا ہے جو "چوبیس پرگنہ" کا علاقہ ہے۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس اعظم نے ۸۷۰ھ میں کوئی مسجد تعمیر کرائی تھی یہ اس پر نصب تھا۔ کتبہ پر چار سطریں ہیں اور معمولی روش میں بخط نسخ لکھی گئی ہیں۔

بنگال میں خطاطی کا دورِ زرّیں : بنگالہ کا بادشاہ علاء الدین حسین شاہ اپنے وقت میں بہت مقبول حکمران گزرا ہے اور اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی۔ اس کے دور کو بنگالہ میں خطاطی کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کو فنون لطیفہ سے خصوصی لگاؤ تھا اور خطاطی کو بطور خاص پسند کرتا تھا۔ بہت سے علماء میں اس کے عہد کے کتبات شائع ہو چکے ہیں انہیں دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عہد (۱۵۱۹-۱۴۹۳ء) خطاطی کے عروج کا زمانہ تھا۔

طغرائی؛ (مزار محمد امین گولکنڈہ، دکن)

ڈھاکہ کی میوزیم میں ایک اور کتبہ محفوظ ہے یہ حاجی بابا صالح کی مسجد سے ملا تھا۔ یہ مسجد ڈھاکہ کے پاس نرائن گنج میں ہے اور اس جگہ جسے "بندر" کہا جاتا ہے۔ سید اولاد حسین نے اس کتبہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر یہ کس روش میں لکھا گیا ہے اس کی نشاندہی نہیں کی جا سکی ہے۔ کتبہ سے اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد حاجی بابا صالح نے علاءالدین حسین شاہ کے زمانہ میں تعمیر کرائی تھی چونکہ اس سنگی کتبہ کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر چکا ہے۔ اس لئے صحیح سنِ تعمیر معلوم نہیں ہو سکتا۔ کتبہ کی زبان عربی ہے اور تحریر کا خط ثلث ہے جسے پیچیدہ آرائش سے مزین کیا گیا ہے حروف کی قامت بلند ہے اور پٹیاں نہایت نفاست کے ساتھ قائم کی گئی ہیں۔ مگر مقابلتہً دوائر کی گردشیں ناقص العمل ہیں۔

فتح سلہٹ کا تاریخی کتبہ: "ڈھاکہ ریویو" اور "جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۲ء میں ایک بہت دلچسپ دو رخہ کتبہ طبع ہوا ہے جو آج کل ڈھاکہ میوزیم میں موجود ہے۔ اس کے خط کا بھی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ یہ کتبہ شاہ جلال سلہٹی کے مزار سے حاصل ہوا ہے اور اب تین ٹکڑوں میں ٹوٹ چکا ہے۔ ایک رخ پر جو عبارت درج ہے اس سے سلہٹ کی فتح کا سن معلوم ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں نے اسے ۷۰۳ھ میں فتح کیا جو شمس الدین فیروز شاہ کا عہد تھا۔ خط نسخ ہے اور معمولی، رسم عربی ہے۔ کتبے کے دوسرے رخ کو پڑھنا مشکل ہے کیونکہ تحریر بہت ہی گنجلک ہے اور قلم کو اس طرح گردش دی گئی ہے کہ سرتا سر ایک لہریا بنتا چلا گیا ہے اور حروف کی نشست کا سمجھنا یا پہچاننا محال ہو گیا ہے۔ موسم نے اس "پتھر کی لکیر" کو بھی چاٹ لیا ہے!

اب میں کچھ طغریٰ کی بابت کہنا چاہتا ہوں۔ مولوی مظفر حسن کا خیال ہے کہ طغریٰ علیحدہ کوئی خط نہیں ہے بلکہ آرائشی نمونہ ہے جس میں حروف کو اس طرح تانے بانے میں الجھایا جاتا ہے کہ اس کا پڑھنا خاصا مشکل کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ کسی بھی روش تحریر کو ایک اچھے ڈھانچے میں سمو دیا جاتا ہے۔

خطِ طغریٰ کے ابتدائی نمونے: بنگال اور مغربی پاکستان وغیرہ میں اس خط کو مغلوں کے عہد سے پہلے بڑا فروغ نصیب ہوا۔ مگر اس بات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بنگال میں اس کی مقبولیت کیوں زیادہ ہوئی۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس خط کو پتھر پر منتقل کرنے کے لئے جن اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں قدرتاً موجود تھے یعنی راج محل کے علاقہ میں پتھر کی چٹانیں۔ یہ پتھر کھدائی کے لئے نرم بھی ہے اور چکنا بھی۔ اس میں دانہ بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے حروف کی نشست بہت خوبصورت آتی ہے۔ یہ پتھر کافی پائیدار بھی ہوتا ہے۔

خطِ طغریٰ کی تین منازل: دورِ مغلیہ سے قبل بنگال میں یہ خط تین منازل سے گزرا۔ دورِ اول میں افقی خطوط تیکھے اور سیدھے تھے اور نیزوں کی باڑھ کی طرح ایستادہ رکھے جاتے تھے۔ انداز نگارش ثلث کا ہے یعنی افقی خطوط میں خم اور نیم دائروں کی گردش شامل ہے دوسرے دور میں ایسا لگتا ہے کہ خاردار نیزوں کا سلسلہ چلا گیا ہے تیسرے دور میں ن، س، ش، ی اور بعض دوسرے حروف جو تقریباً مدور ہوتے ہیں، ایک ہی بیٹھک پر لائے گئے۔ یہ خم قوس نما ہوتا تھا بلکہ کمان کی مثال، اوپر کے مستقیم خط ہیں جو نیزوں کی انیاں معلوم ہوتے ہیں اسی مماثلت کی وجہ سے یہ اسلوب "تیر کمان" کہلایا۔ یہ طغریٰ کا خاص ذیل

طغریٰ: (تیر کمان اسلوب) از عہد علاءالدین حسین شاہ، ساگر دیگی۔ مرشد آباد)

تھا جو بہت مقبول ہوا، بالخصوص خود مختار سلاطین بنگالہ کے عہد میں۔

دکن میں طغریٰ کی روش : بنگالہ کے ساتھ ساتھ دکن میں بھی طغریٰ کو قبول عام حاصل رہا۔ بالخصوص سولھویں صدی میں۔ چنانچہ قطب شاہی حکمران محمد امین (گولکنڈہ) کے مقبرہ پر سنگی لوح کو دیکھئے (سن ۱۰۴۴ھ)۔ اس کا خط بھی طغریٰ ہے اور بڑا نفیس۔ ایک اور کتبہ حیدرآباد شہر میں ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسجد پر نصب تھا اور یہ مسجد ۱۰۳۲ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کا خط بھی طغریٰ ہے۔ میرا خیال ہے کہ دکن کا فن خوشنویسی غالباً بڑی حد تک مشرقی پاکستان کی روش سے متاثر تھا۔ مشرقی پاکستان میں ایک اور روش طغریٰ بھی دکھائی دیتی ہے جس کا "نفیر" کی شکل سے تعلق ہے۔ یہ جلال الدین محمد شاہ (سلطان بنگالہ) کے سکوں پر دیکھئے۔ جونپور کے سلاطین شرقی نے بھی اس خصوصی روش کو بہت برتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نفیروں کی قطار بندی دور تک چلی گئی ہے۔ یہ عجیب طرز جونپور میں بنگالہ سے پہنچی۔

طغریٰ کے چند اور نادر نمونے : سلہٹ میں ہاٹ کھولہ کے مقام پر ایک مسجد خورشید خاں نے بعہد رکن الدین باربک شاہ (۱۴۵۹-۷۶ء) تعمیر کرائی تھی۔ اس پر ایک سطری کتبہ بزبان عربی ملا ہے۔ خط طغریٰ ہے، مگر خوبصورتی کم ہے۔ لیکن ایک اور کتبہ کلکتہ کی میوزیم میں رکھا ہے۔ جو شمس الدین مظفر شاہ کے عہد کا ہے یعنی (۹۳-۱۴۹۰ء) کا۔ اس نقش میں دو سطریں ہیں۔ زبان عربی ہے۔ ہر سطر کے [illegible] خط گزرتا ہے اور روش وہی تیر کمان کی رکھی گئی ہے [illegible] میں خط طغریٰ میں کچھ اور بھی گل بوٹے لگائے [illegible] اور پیچیدہ اشکال کی طرف رجحان بڑھ گیا۔ اس [illegible] طرزیں ماند پڑ گئیں۔ اسی طرح مرشد آباد کے مقام پر بارگرام میں بھی ایک کتبہ ملا ہے یہ علاء الدین شاہ (۱۴۹۳-۱۵۱۸) کے زمانہ کا تھا۔ یہ بھی ایک مسجد کی تعمیر کو ظاہر کرتا ہے۔ جو کسی امیر ملک عطا نے بنوائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مشرقی پاکستان میں اس سے بہتر طغریٰ کہیں نہیں ہے۔ اس کی طرز بھی تیر کمان کی ہے : ساگر ڈگی [illegible] میں [illegible] حسین شاہ کے زمانہ کا ایک اور کتبہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس کی طرز نفیری ہے۔ خط بدستور قدیم طغریٰ ہی ہے۔ عمودی خطوط ایک جلوس کی طرح بہت سلیقہ اور ستھرائی کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔

سلطان ناصر الدین نصرت شاہ کے زمانہ (۱۵۱۸-۳۲ء) کا ایک کتبہ [illegible] میں دستیاب ہوا ہے۔ یہ بھی مسجد کی تعمیر [illegible] نے تعمیر کرایا تھا۔ دو سطریں ہیں۔ خط طغریٰ ہے، بیچ میں سے خط لہریا بناتا ہوا گزرتا ہے۔ قلم بہت معمولی ہے اور فنی آب و تاب سے معرّیٰ ہے۔ اسی بادشاہ کے زمانے کے دوسرے کتبوں میں بڑی نفاست نظر آتی ہے۔ ڈھاکہ کی میوزیم میں سلطان نصرت شاہ کا ایک کتبہ محفوظ ہے جو مشرقی پاکستان کے چند بہترین کتبات میں شامل ہوتا ہے۔ یہ انصار جہاں (اشرف پور محلے پور پولیس اسٹیشن) کے مکان سے دستیاب ہوا تھا۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک مسجد کی تعمیر کے لئے بنا تھا۔ سن تعمیر مسجد ۹۳۰ھ ہے۔ یہ پتھر کی سل سنگ موسیٰ کی ہے اور دو سطروں میں بزبان عربی تحریر ہے۔ خط طغریٰ بیلدار ہے۔ کمان کے ساتھ تیر لگا کر حروف کا ڈھول بنایا گیا ہے اور بہت عمدہ نقش تیار ہوا ہے۔ حروف کی قامت، دوائر اور جوڑوں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ہر لفظ کے بیچ میں خوبصورت بیلیں لپٹتی ہوئی چلی گئی ہیں۔

یہ بات تعجب کی ہے کہ خود مختار سلاطین بنگالہ کے عہد میں قریباً سب کے سب کتبے صرف عربی میں ہیں اور فارسی میں یا عربی فارسی میں ملے جلے، کم ہیں۔ میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ زبان عربی اور علوم عربی کا بنگالہ میں چونکہ بڑا چرچا رہا ہے اس لئے زبان اور خط عربی کی طرف رجحان بھی زیادہ رہا ہے۔

خطاطی کے عروج کی کہانی — خلاصہ : مشرقی پاکستان کے علاقے میں خطاطی کے فن کا عروج عہد مغلیہ سے [illegible] پر رہا۔ مگر مغربی پاکستان کے علاقوں اور شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں جو روش تھی اس میں کچھ بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ بنگالہ میں تیر کمان اور نفیر کی طرزیں مقبول رہیں۔ دہلی میں جو روش تھی اس کو دیکھ کر توانائی شکوہ اور شوکت کا احساس ہوتا ہے بنگالہ کی روش میں نفاست اور نادرہ کاری کی طرف میلان زیادہ ہے۔

نستعلیق کی ابتدا : بنگالہ کے مسلمان حکمرانوں نے جب مغلیہ سلاطین کی بالادستی تسلیم کر لی تو بہت سی باتیں بھی اثر انداز ہوئیں۔ خط کے باب میں نستعلیق کا باب اسی وجہ سے شروع ہوا۔ مغربی پاکستان میں نستعلیق کا رواج دور مغلیہ سے ہوا اور مشرقی پاکستان بھی اسی اثر کے دائرے میں آ گیا۔ پھر تو نستعلیق اتنا چھا کر دوسرے خط معدوم ہی ہو گئے۔ اکبر کے عہد میں بقول ابوالفضل [illegible] چار چاند لگ گئے۔ ڈھاکہ کی میوزیم میں عہد مغلیہ کے کئی کتبے رکھے ہیں مگر یہ خط نسخ میں ہیں۔ ان کی طرزیں دیکھنے سے معلوم

ہے کہ دائرے اور قلم کی گردشوں پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ نستعلیق خط میں حروف کے دوائر کو بیضوی رکھا جاتا تھا۔ نرائین گنج سے کوئی پانچ میل دور چھوٹا لالی میدان گنج میں ایک خشتی پل ہے جس پر ایک کتبہ نصب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لالہ راج مل نے ۱۱۰۲ھ میں تعمیر کرایا تھا یعنی عہد اورنگ زیب میں۔ چار سطریں ہیں۔ ایک شعر فارسی کا مسلسل چلا گیا ہے۔ روش نستعلیق ہے۔ ایک اور کتبہ کھتی خانہ (ڈھاکہ) کی ایک مسجد میں سے ملا ہے۔ یہ مسجد ۱۸۹۷ء کے زلزلہ میں تباہ ہو گئی تھی۔ سن تعمیر ۱۱۱۷ھ معلوم ہوتا ہے۔ عبارت فارسی۔ بانی کا نام مسعود ہے۔ طرز خط نستعلیق ہے۔ مگر معمولی۔ "قدم رسول" کی زیارت گاہ نرائین گنج کے بالمقابل بنی ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر نو غلام نبی خاں نے ۱۱۹۱ھ کرائی۔ اس کا کتبہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس زیارت گاہ کی بنا کسی شخص معصوم خاں کابلی نے رکھی تھی۔ اور قدم رسول کا نقش یہاں زیارت گاہ عام ہو گیا۔ سید حسین نے اس کتبہ کی صرف عبارت دینے پر اکتفا کیا ہے۔ زبان فارسی ہے، خط نفیس نستعلیق۔ نستعلیق کا ایک اور نمونہ باقر گنج کی ایک مسجد میں ملا جو سلطان نوری نام کے گاؤں میں واقع تھی۔ اس مسجد کی بنا کسی صاحب غلام محمد نے ڈالی تھی اور یہ ۱۵۱۲ھ میں مکمل ہوئی۔ غالباً اس سے بہتر اور نفیس خط نستعلیق پورے مشرقی پاکستان میں کہیں نہیں ملا۔

دورِ مغلیہ میں نستعلیق کو رواج عام ہوا اگر نسخ بھی نظر سے اوجھل نہ رہا۔ خود بہادر شاہ ظفر تک کی ایک وصلی خط نسخ میں ملی ہے۔ ملکہ نور جہاں کے اکثر فرامین خط طغریٰ میں لکھے گئے ہیں۔

برصغیر میں بالعموم اور مشرقی پاکستان میں بالخصوص فنِ خط کی جو روش رہی ہے اس کا مختصر تعارف ان چند سطروں میں پیش کیا گیا۔ اس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلاطین وقت، امراء اور اشراف وقت نے فنِ خط کو بہت قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا اور فنکاروں کی ہمت افزائی کی۔ ان فنکاروں نے اپنے جو جوہر دکھائے ہیں ان سے نہ صرف پرورشِ لوح و قلم ہوتی رہی ہے بلکہ تاریخ بھی محفوظ ہو گئی ہے۔ اگر یہ کتبے، کتابے، اور وصلیاں نہ ہوتیں تو عمارتیں اور احوال و واقعات سب گونگے گونگے ہوتے اور ان کی خاموشی کی وجہ سے ان کی تاریخی اہمیت کم ہو جاتی ÷

اک شمع رہ گئی تھی ۔۔۔ بقیہ صفحہ ۱۹

ہیں۔ باوجودیکہ موضوعات کے اعتبار سے ان کی غزلیں بھی اصلاحی اور
مضامین کی حامل ہیں اور بعض موقعوں پر وہ خالص فلسفیانہ انداز
اختیار کر لیتے ہیں لیکن انہوں نے غزل کے فطری مزاج اور اس کی
روایتی دلکشی اور رکھ رکھاؤ کو حالیؔ کی طرح بڑے فن کارانہ طور پر
قائم رکھا ہے۔

ابھی تک کافری سے عقل ایماں تک نہیں پہونچی
کہیں دیر و حرم کے درمیاں معلوم ہوتی ہے

زاہد شعورِ حسن سے بیگانہ ہی رہا
حسنِ نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
خود اپنے لئے اور زمانے کے لئے اور

ہمت ہے تو پیدا کر فردوسِ حیات اپنا
بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

مندرجہ بالا اشعار خالصتاً اقبالؔ کے رنگ میں رنگے
ہوئے ہیں۔ خصوصاً وہ مسلسل غزل جسے انہوں نے "خطیب
سے خطاب" کا عنوان عطا کیا ہے:

ذوقِ ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

یہ اقبالؔ کی اس نظم کی صدائے بازگشت ہو کر:

ہوس منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من

انہوں نے اپنی غزل کے بارے میں ایک جگہ کہا ہے ؎

تعریف ہو کہ طنز یہ تھا ان کا تبصرہ
پہونچا تی ہے اسدؔ نے کہاں سے غزل کہاں

اسے شاید ہی تعلّی کہا جا سکے۔ جب بات غزل کی چل نکلی ہے
تو ، غزل کے کچھ اور موتی بھی رول لیجئے:

خلافِ موج بھی اکثر اسے رواں پایا
ضرور کشتیِ دل میں سوار ہے کوئی

دل بے تاب کہے کیوں نہ طوافِ منزل
ہے سفر ختم مگر شوقِ سفر باقی ہے

اسی سے بجھتی ہے شمع اور اسی سے روشن ہے
خبر نہیں یہ ہوا دوست ہے کہ دشمن ہے

ترکِ الفت کا بہانہ مری حالت سے ملا
مشکلِ اربابِ ہوس کی ہوئی آساں مجھ سے

وہ بوالہوس بھی جنہیں جرأتِ گناہ نہیں
ادب میں ڈھونڈ رہے ہیں علاجِ تشنہ لبی

آگیا حضرتِ واعظ کی زباں پر بھی اثر
یاد تھے اہلِ محبت کے جو افسانے چند

خیال کو بھی اسیرِ نگاہ کرتا ہے
مری نظر میں مصورِ گناہ کرتا ہے

حضرتِ ناصح کے چہرہ پر جو ہیں آثارِ کیف
پندِ ترکِ مے میں بھی شاید سرورِ بادہ ہے

جو کہتے یار کو جاتے ہیں ہوشیار رہیں
کہ خلد راہ میں پڑتا ہے امتحاں کے لئے

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اسد ملتانی کے کلام میں زبان و بیان
کی طلسم کاریاں نظر نہ آئیں گی۔ ان کے کلام میں بیشک جھنڈی فرنگما قسم
بھی ملیں گی لیکن شدتِ احساس اور خلوصِ مقصد ان کے کلام کی
جان ہے جس سے ساری کوتاہیاں خود بخود نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں
اپنے ہم وضع پیشروؤں ، حالیؔ اور اقبالؔ کی طرح اسد ملتانی کے کلام کا
بیشتر حصہ روایتی تفریحی عنصر سے مبرّا ہے ۔ ان کی تمام تر کوشش
یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح ہمارے روحانی اور ذہنی جمود کو دور کر کے
زندگی کے صحیح اور صالح عمل کے راستے پر گامزن کر دیں۔ وہ بالطبع
صلح جو اور امن پسند ہیں اس لئے ان کے یہاں جوشیلے انقلابی نعروں
کا فقدان ہے۔ وہ "ستائش کی تمنا" اور "صلہ کی پروا" کئے بغیر اپنے
حقیقی تاثرات عوام تک پہونچانا چاہتے ہیں اسی لئے وہ
ظاہری شاعرانہ طمطراق کو نظر انداز کر کے موضوع کی جزئیات کو
بڑے سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ سارا زورِ کلام
جذبات کی عکاسی پر صرف کرتے ہیں۔

مہاجرین کا عالمی سال ـــــ بقیہ صفحہ ۵۲

بقیہ صفحہ ۵۲

کرا دئے جائیں۔ اس اہم کام کے ساتھ ساتھ ان مہاجرین کی آباد کاری کو ترجیح دی جائیگی جو یورپ سے ترکِ وطن کر کے مشرقِ بعید میں پڑے ہیں۔ ان کی واپسی کے لئے تین ہزار آٹھ سو ڈالر تیار کرلئے ہیں اور مصارفِ سفر کے لئے ساڑھے بائیس لاکھ ڈالر جمع ہونے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے جنرل اسمبلی نے ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کی قرارداد میں اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل سے بھی یہ درخواست کی تھی کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال کو فروغ دینے میں ایسے اقدامات سے کام لیں جو ان کے نزدیک معقول اور مناسب ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر کلاڈ ڈی کیو لاریا کو اپنا خاص نمائندہ مقرر کر کے ہدایت کی کہ وہ ساری دنیا کا خصوصاً ان ملکوں کا جہاں مہاجرین کی آباد کاری کا مسئلہ درپیش ہے، دورہ کرتے ہوئے حکومتوں کو مشورہ دیں کہ وہ عالمی سال میں شریک ہو کر اس دشوار کام کو جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صورت پیدا کریں۔

مسٹر کیو لاریا اس غرض سے ایشیائی ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے پچھلے سال ماہ اگست میں پاکستان میں آئے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے وزیرِ خارجہ اور وزارتِ آباد کاری کے اعلیٰ افسروں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ان کو بتایا گیا کہ پاکستان میں یہ مسئلہ کچھ عرصہ پہلے یقیناً دشوار معلوم ہوتا تھا اور کسی طرح اس کا آخری حل نظر نہیں آتا تھا لیکن نئی حکومت نے روزِ اوّل سے اس مسئلہ پر خاص توجہ دی ہے کچھ مکانات نہایت تیزی سے مکانات تعمیر ہو رہے ہیں اور مہاجرین کی مستقل آباد کاری عمل میں آ رہی ہے یہاں تک کہ چند ماہ بعد یہ مسئلہ باقی نہیں رہیگا۔ اس اہم بیان سے متاثر ہو کر جنرل مسٹر کیو لاریا کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال میں پاکستان کی شرکت کا اعلان کر دیں۔

مسٹر کیو لاریا دنیا بھر کا دورہ کرنے کے بعد اقوامِ متحدہ کے صدر مقام پر واپس پہنچ گئے ہیں۔ ان کے ایک تازہ ترین اعلان سے پتہ چلتا ہے کہ اس عالمی سال کی تقریب میں پچاس ملک اور پانچ علاقے شرکت کر رہے ہیں۔ ان پچاس ملکوں کے نام یہ ہیں: پاکستان، افغانستان۔ ارجنٹائن۔ آسٹریا۔ آسٹریلیا۔ بلجیم۔ بولیویا۔ برازیل۔ برما۔ کمبوڈیا۔ کینیڈا۔ سیلون۔ چلی۔ جمہوریتِ چین۔ کولمبیا۔ کوسٹاریکا۔ کیوبا۔ اسرائیل۔ اٹلی۔ جاپان۔ اردن۔ جمہوریت کوریا۔ لے اوس۔ لبنان۔ لائبیریا۔ لکسمبرگ۔ میکسیکو۔ موناکو۔ مراکش۔ نیدرلینڈ۔ ناروے۔ ڈنمارک۔ ڈومینکن ریپبلک۔ ایکویڈور۔ وفاق ملایا۔ فن لینڈ۔ فرانس۔ وفاقی جمہوریت جرمنی۔ گھانا۔ یونان۔ گواٹی مالا۔ ہیٹی۔ ہولی سی۔ ہونڈورس۔ آئس لینڈ۔ ایران۔ آئرلینڈ۔ پاناما۔ پیرو۔ فلپین۔ پرتگال۔ سویڈن۔ سوئٹزرلینڈ۔ تھائی لینڈ۔ تیونس۔ ترکی۔ متحدہ عرب جمہوریت۔ برطانیہ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ اروگوئے۔ وینزویلا۔ جمہوریتِ ویٹ نام اور یوگوسلاویہ۔ ان کے علاوہ شرکت کرنے والے پانچ علاقوں کے نام برطانوی ہونڈورس۔ گامبیا۔ ہانگ کانگ۔ سنٹ لوسیا (ویسٹ انڈیز) اور یوگنڈا ہیں۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔

سنکارا کے روزانہ استعمال سے روزے کو راحت بنائیے
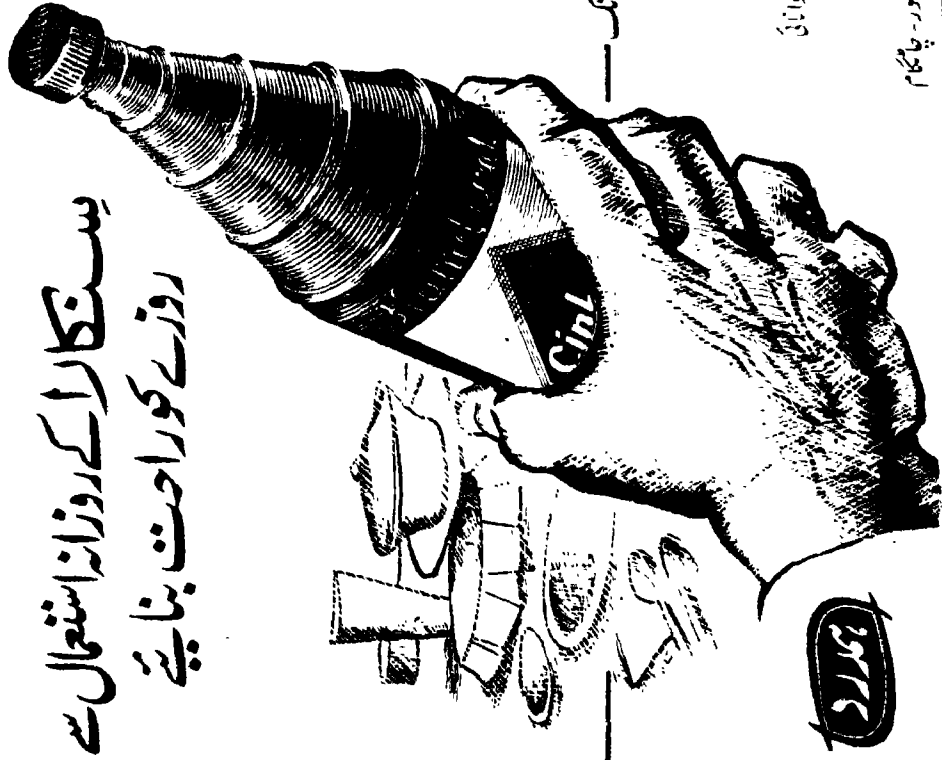
بہت سے روزہ داروں کیلئے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی کیونکہ وہ پہلے ہی سنکارا کو آزما چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ تکان دور کرنے اور تازہ دم ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔
یوں تو سنکارا ہر موسم میں یکساں مفید اور صحت بخش ہے لیکن رمضان میں اس کا استعمال آپ کیلئے اور بھی ضروری ہے۔ سنکارا ایک مکمل اور متوازن ٹانک ہے جو نہ صرف آپ کو روزے میں دن بھر ہشاش بشاش رکھتا ہے بلکہ صحت کو مستقل فائدہ پہنچاتا ہے۔

رمضان المبارک میں سنکارا کے روزانہ استعمال سے ضروری قوت اور توانائی حاصل کیجئے اور روزے کو راحت بنائیے۔

سنکارا — حیاتین آمیز ٹانک

Cinkara

ترکیب استعمال

بوقت سحر
ڈیڑھ بڑا چمچہ استعمال کرنے سے دن بھر کیلئے مکمل غذائیت حاصل ہو جاتی ہے۔

بوقت افطار
ایک خوراک استعمال کرنے سے توانائی بحال ہو جاتی ہے۔

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان — کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

نازو — خدا کے لئے تیّار ہو چکو!

پابندئ وقت کا یوں بھی نسوانی محاسن میں شمار نہیں، اور پھر جہاں مسئلہ ہو
بناؤ سنگھار کا وہاں تو نازو کی آرائش میں کوئی چیز بھی مخل نہیں ہو سکتی۔
مگر جس وقت وہ کریم، سُرخی، ماسکارا اور لپ اسٹک وغیرہ سے آراستہ
ہو چکے گی تو ہر شخص کی نگاہیں اُسی پر پڑیں گی۔
معلوم نہیں کہ نازو کو ہماری خاموش خدمات کا بھی احساس ہے
اور وہ یہ جانتی ہے کہ اُس کے سامان آرائش کا مدار تیل ہی کی بعض
مصنوعات ہیں جو ہم مہیّا کرتے ہیں

برماشیل

کا آپ کی روزانہ زندگی سے گہرا تعلق ہے

B

جلد ۱۳ شمارہ ۳

خاص نمبر مارچ ۱۹۶۰ء

بتقریبِ یومِ پاکستان

مدیر رفیق خاور نائب مدیر ظفر قریشی

نیا دور:

رائٹرز گلڈ:

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی — خاص نمبر۔ فی کاپی: ایک روپیہ چار آنے

پاکستان میں وضعِ نو

پروفیسر رشبروک ولیمز

جس ملک نے حال ہی میں اپنی ایک علیحدہ قومیت کو ہیئت دی ہو اس کے موجودہ منظرِ سیاست پر گفتگو کرتے وقت کوئی بھی پختہ کار مبصر ہوگا وہ احتیاط و تامل سے کام لے گا کیونکہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ نکتہ چینی کا حق اگر وہ اس نئی مملکت کے عوام کے سپرد کردے تو وہ زیادہ بہتر ہے۔ میرا خیال ہے اس خصوص میں یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ صادق آتی ہے جب مبصر کوئی انگریز ہو۔ میں اس وقت جس مملکت کا ذکر کر رہا ہوں وہ حال تک انگریزی راج میں رہی ہے۔

میں پاکستان ایک بار پھر آیا تھا یہاں کچھ پرانے دوستوں سے ملاقات رہی تو کچھ نئے ننا سا بھی پیدا ہوئے آپ کے معاشرہ میں جس طرح تپاک اور اظہار تکریم کیا جاتا ہے میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس گرم جوشی اور تپاک سے مراسم ملاقات ادا ہوئے کہ شاید وہ رسمی نہ تھے ورنہ میزبان و مہمان کے رسمی رشتے سطحی ہی رہتے ہیں —خلیق بالطبع ہونے کی بات جب ہی پیدا ہوتی ہے کہ عوامد رسمیہ سے ہٹ کر ہم آزادی سے مل جل سکیں۔ مجھے بھی یہ ترغیب ذہنی ہوئی کہ آپ سے رسمی تکلف سے بالا رہ کر ملوں جلوں — یہ ترغیب اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے ہموطنوں میں سے جب بھی کوئی یہاں آتا ہے تو آپ حضرات اس سے مناسب تکریم سے پیش آتے ہیں۔

لیکن ایک چیز جو مجھے ہمیشہ ہی متاثر کرتی رہی ہے وہ آپ صاحبوں کی وہ قومی خصوصیت ہے جسے میں نے آپ میں ہمیشہ ممتاز بھی پایا اور مستحسن بھی، اور وہ یہ کہ آپ پاکستانی صاف گوئی کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ جب آپ کسی غیر ملکی کو اپنا دوست، ہمدرد اور بہی خواہ سمجھ لیں تو پھر اس سے اس بات کے بھی متوقع رہتے ہیں کہ وہ آپ سے صاف صاف کھری کھری باتیں کہے جو آپ ہی کی صاف گوئی کی طرح ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں اور آپ دونوں ہی اس بات سے واقف ہیں کہ دنیا میں بہت سی اقوام و ملل — جن میں بعض بڑی بھی ہیں — اس بات کی خواہاں رہتی ہیں کہ کوئی غیر ملکی ان کے ہاں جو جو کچھ دیکھے اس کی تعریف کئے جائے اور اگر اس کی داد و تحسین میں کوئی شائبہ بھی (خواہ وہ کتنا ہی ملائم و مؤدبانہ کیوں نہ ہو) شامل ہو جائے تو اپنی گہری ناراضگی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتیں۔ وہ صاف گوئی کی خواہاں تو رہتی ہیں لیکن اگر کوئی رائے ذرا بھی ان کے اُس اونچے اندازے سے جو وہ اپنے بارے میں لگا کے بیٹھی تھیں مختلف ہو جائے تو پھر وہ منہ پھلا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میں نے یہ بات پاکستان میں نہیں پائی۔ بلکہ یہ دیکھا کہ یہاں لوگ نکتہ چینی کا خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ خامیاں گنوانے کی دعوت دیتے ہیں بشرطیکہ آپ کو پکا یقین ہو جائے کہ کہنے والا آپ کا مخلص اور سچا بہی خواہ ہے۔

پاکستان کو اپنی آزاد ہیئت ملی بھی نہ تھی کہ میں سالہا سال سے آپ کا واقف تھا۔ اب اس چیز نے آپ کے اس مہمان پر یہ فرض بھی ڈال دیا کہ رائے دیتے وقت مکمل دیانت سے کام لے۔ آپ کے قومی مسائل کی بابت مجھے اس جذبہ کے علی الرغم کچھ کہنا ضروری ہوتا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد بھی مجھے اس ملک میں آنے کا کئی بار شرف حاصل ہوا ہے اور شخصی طور پر میں کئی باتوں سے متاثر ہوا ہوں۔ انگریز۔ پاکستانی دوستی کے باب میں اگر میں کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو اس کا بہترین ذریعہ یہی تاثرات ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں جن نکات کی طرف اشارہ کروں گا ان کو برطانیہ میں ابھی تک اچھی طرح سمجھا نہیں گیا ہے۔ اس لئے پاکستان کے حالیہ واقعات کے سلسلے میں وہاں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اہلِ پاکستان کو یہ شکوہ ہے کہ ان کے ملک میں جو حالات افق پر ابھرے ہیں، اور جو آپ کی تاریخ کا بہت بڑا موڑ ہیں، ان کا صحیح تخمینہ لگانے میں انگریز بالکل ناکام رہے ہیں۔

بہت سے انگریزوں اور پاکستانیوں میں رشتۂ مودت عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ ان شخصی روابط محبت سے قطع نظر دیکھیے بھی اہلِ برطانیہ میں پاکستانیوں کے لئے جذبہ محبت ضرور موجود ہے۔

اب اگر ان اسباب کا میں تجزیہ کرنے بیٹھوں تو اس مقالے کے موضوع سے بہت دور جا پڑوں گا اس لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا۔ ان کی کچھ تو وجہ یہ بھی ہے کہ ہم انگریز روایتی طور پر ایسی قوموں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو اپنی مشکلات و آلام کو ضبط و تحمل سے برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی سعی کرتی رہتی ہیں۔ اس جذبۂ مودّت کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انگریزوں کی طبیعت میں ایک عمومی جذبہ یہ ہوتا ہے کہ معاملاتِ حیات میں کھلاڑیوں کی "اسپرٹ" ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ادھر یہ بات بھی ہے کہ آپ لوگوں میں جو سپاہیانہ شجاعت اور کڑک پن ہے وہ ہمیں بہت بھاتا ہے۔ اسی طرح آپ کی خارجہ پالیسی میں ایک کھرا پن بھی ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ آپ لوگ سیاست میں غیر جانبداری کے نظریہ کو مہمل سمجھتے ہیں اور اس سیدھی سی بات کو جانتے ہیں کہ اگر کسی ملک کی کوئی اہمیت ہے تو اس کے دوست بھی ہوں گے اور دشمن بھی۔

اہلِ برطانیہ میں آپ لوگوں کے لئے جذبات گرم جوشی ضرور موجود ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہاں عام آدمی کچھ حیران بھی ہے کہ آپ کے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ پاکستان سے برطانیہ واپس آنے کے بعد مجھے جن چند چیزوں نے سب سے زیادہ متاثر بلکہ ملول کیا ہے، وہ غلط فہمی ہے جو یہاں پاکستان کے بارے میں انگریزوں میں پائی جاتی ہے اور یہ کہ پاکستان اپنے اُس نصب العین سے ہٹ گیا ہے جو اس کو وجود میں لایا تھا طالع آزما خود غرض لیڈروں نے اسے اپنی حرص کا شکار بنا لیا اور اب اس کے قدم تنزل کی راہ پر ہی پڑ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسی بے بنیاد باتیں انگریزوں کے اعلیٰ طبقے میں نہیں سنی جاتیں اور نہ ان طبقوں ہی میں جو دونوں ممالک کے مابین تعلقات و روابط پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ پھر بھی ایسے خیالات ضرور سننے میں آئے اور ایسے لوگوں کی زبانی جن سے توقع تھی کہ وہ کچھ زیادہ ہی باخبر ہوں گے۔ اگر ان غلط باتوں اور غلط فہمیوں کی صحت نہ کی گئی تو کچھ وقت گزرنے پر وہ بڑی نقصان رساں ثابت ہوں گی اس صورتحال کا جو ہمت افزا پہلو ہے وہ نظر انداز نہیں ہونا چاہئے اصل کیفیت یہ ہے: اگر ایک دفعہ تمام حقائق سامنے آ جائیں تو ان کا ردعمل فوری اور سرگرم ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار نہیں کئی بار انگریز سامعین کے سامنے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات رکھی ہے کہ آپ کے ہاں جو انقلاب آیا ہے اس کا اصل مفہوم کیا ہے۔ مجھ سے کہا جاتا ہے۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ آپ کی باتیں سن کر ہمیں کس قدر اطمینان ہوا ہے ہمیں پہلے بھی یقین نہ تھا کہ پاکستان اس راہ پر گامزن ہو جائے گا جس پر مصر اور انڈونیشیا ہو چکے ہیں، مگر پارلیمنٹ ٹوٹنے اور مارشل لا لگنے سے ہم کو ایک ذہنی دھچکا ضرور لگا تھا۔

آپ کے ہاں جو حالیہ انقلاب آیا ہے اس کے مقاصد اور نوعیت کے باب میں جو غلط فہمیاں میرے اہلِ ملک میں پائی جاتی ہیں ان میں کئی کافی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں اپنی حد تک ان کے ازالہ کی جس قدر بھی کوشش کر سکتا ہوں اس سے دریغ نہیں کرتا ہا بالخصوص دو وجوہ کی بناء پر ایک یہ کہ میں مورخ ہوں، دوسرے میں موجودہ نسل کے ان افراد میں سے ہوں جنہیں قائداعظم محمد علی جناحؒ اور سر محمد اقبالؒ کو جاننے اور ان کی صفات و کمالات کے جاننے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اس وجہ سے میں اپنے ان دیگر ہم قوموں کے مقابلہ پر، جن کا یہ پس منظر نہ ہو، زیادہ صاف اور واضح طور پر سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کی موجودہ حکومت کیا کرنے کی سعی کر رہی ہے۔

انگریزوں میں روایت پرستی کا جذبہ بڑا شدید ہوتا ہے اور جب ان کو یہ بتایا جائے کہ آپ کے انقلاب کا مقصد یہ رہا ہے کہ ان دو عظیم ہستیوں نے آپ کے لئے جو منہاج متعین کی تھی اس پر آپ کو دوبارہ چلانے کے لئے یہ انقلاب لایا گیا ہے تو یہ بات فوراً انگریزوں کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مگر اس بات سے انکار کرنا بھی بے وقوفی ہوگی کہ میرے ملک میں بہت سے بہی خواہانِ پاکستان کے گلوں میں جو پھانس سی چبھتی معلوم ہوتی ہے وہ دو باتوں کی وجہ سے ہے۔ ایک پارلیمان کا ٹوٹ جانا۔ دوسرے مارشل لا کا نفاذ مگر جب میں یہ توضیح کرتا ہوں کہ یہ پارلیمان کس نوعیت کی تھی اور وہ کس طرح آپ کو کھوکھلا کر رہی تھی اور یہ مارشل لا کس طرح کام کر رہا ہے یعنی نظم و نسق

خلیفہ

عمل : عبدالرحمن چغتائی

فوجی تحکم کے تلے نہیں کام کر رہا ہے بلکہ سول حکام کے تعاون کے ساتھ ملک کی بہتری و بہبودی کا سامان کر رہا ہے تو پھر سارا منظر ہی آنکھوں کے سامنے بدل جاتا ہے۔ آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم انگریز اس طرح کی حکومت کے خوگر ہیں جس کی بنیاد آزاد رائے عامہ پر ہو اور اس کا اظہار بالغوں کے خفیہ ووٹ کے ذریعہ کیا گیا ہو اب جو حکومت بھی اس نمونہ کی نہ ہو ہم اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ہماری یہ افتادِ طبع کس طرح متشکل ہوئی ہے اس کی جڑ تاریخ میں جا کر ملتی ہے۔ ہمیں ابھی تک کرامویل کے "میجر جنرلوں" کی یاد آتی ہے جنہوں نے شخصی آزادیوں پر کڑی چوکیاں بٹھا رکھی تھیں۔ ہم یہ بھی نہیں بھولتے کہ ان دو نوں عالمی جنگوں کے دوران میں کیسے کیسے قاعدے قانون خود ہمارے ہاں لگائے گئے۔ پھر بھی ہمارے تصور پر جو چیز چھائی ہوئی ہے اور جسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، وہ ہے ہمارا نظام پارلیمانی جو بڑا ہی قدیم ہے۔

اس قدامت نے یہ فائدہ پہنچایا کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا رہا ہم حکمرانی کے نقائص دور کرتے چلے گئے اور اسے اپنی ضروریات کے مطابق بناتے چلے گئے، اور یہ کہ ان کی بنیاد پارلیمانی نظام سے بھی پرانی ہے یعنی شہریوں میں احساسِ ذمہ داری کی روایت، نیز مقامی انتظامات اور اداروں میں لوگوں کی رضاکارانہ و بلا معاوضہ خدمات۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگ رائے زنی کرتے وقت یہ اصل بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ دوسرے ممالک خاص کر ہم سے کم سیاسی عمر رکھنے والے ملک، ایک جدا کیفیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پس وہاں حکومت خواہ وفاقی ہو یا صوبائی، غلط رو اور بد اعمال ہو جائے اور پارلیمان غیر نمائندہ ہو تو پھر کوئی علاج ہی باقی نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ ہر چیز کو نئے سرے سے نیا کر کے پھر سے نظام تو جاری کیا جائے۔

کسی ملک میں دوسرے ملک کی نسبت معلومات جس حد تک پہنچتی رہتی ہیں، اس کا انحصار وقت پر ہوتا ہے اور یہ بالکل فطری ہے۔ اس لئے برطانیہ میں پاکستان کی بابت جس قدر بھی غلط فہمیاں ہیں ان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے قبل کا پانچ سالہ دور دیکھئے۔ گرمجوش سے گرمجوش محبِ پاکستان کے دل میں بھی جذباتِ تشویش ضرور پائے جاتے تھے کہ آخر اس ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت نے قومیت کا جو شعلہ سینوں میں روشن کر دیا تھا اور ان کی قیادت نے مشکلات کو، جو باہر کی دنیا کے لئے ناقابلِ تسخیر دکھائی دیتی تھیں جس طرح ختم کر دیا تھا، بالکل بجھ چکا ہے، کم از کم وقتی طور پر ہی سہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے ملک میں ریشہ دوانیوں، سازشوں، دھڑے بندیوں اور بدحالیوں نے سیاسی زندگی میں گہری جڑ پکڑ لی تھی جس نے آپ کے ملک کی ساکھ باہر بھی گرا دی اور اندر بھی سالمیت و استحکام کو متزلزل کر دیا۔ ادھر آپ کے جو بہترین کار آشنا سرکاری ملازم تھے ان کے حوصلے بھی پست ہو چکے تھے، صلاحیتیں مفلوج اور ان کا جوشِ عمل ٹھنڈا ہو گیا تھا آپ کی زندگی کے سبب سے جانے پہچانے اور ہر دلعزیز عوام قائدین مایوس ہو کر خدمتِ وطن سے ہی کنارہ کش ہو گئے تھے۔ عوام حوصلہ ہار بیٹھے۔ پس پردہ سازشوں نے روز روز انتظامیہ کا بدلنا ایک معمول بنا دیا تھا۔ ظاہر تھا کہ اہم و فوری اہمیت کے قومی مسائل پس پشت جا پڑے۔

اس ناگفتہ بہ حالت کا کچھ کچھ حال تو انگریزوں کے علم میں بھی آتا رہتا تھا۔ اس لئے جب اکتوبر میں یہاں انقلاب آیا تو جن لوگوں کو پاکستان کی بابت براہِ راست صحیح واقفیت نہیں تھی، ان میں قدرتی طور پر یہ رجحان ہوا کہ یہ انقلاب کسی بہتر اور نئے عہد کا آغاز نہیں ہے بلکہ نقطۂ عروج ہے زوال اور مفاسد کا آپ کے ملک میں پچھلے چند سالوں میں جو نوبت پہنچ چکی تھی اسے دیکھ کر اگر کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا تھا تو غلطی متوقع تھی، اور میں نے جن عناصر کی طرف ابھی اشارہ کیا ہے ان کے ساتھ اس بات کو دیکھا جائے تو غلط فہمیوں میں اضافہ ہونا کچھ بیجا نہ تھا۔ چنانچہ برطانیہ میں وہ پیدا ہوئیں بلکہ اب تک بعض حلقوں میں موجود ہیں۔

آپکے ہاں اس نئے دور میں جو چند نمایاں اچھے کام ہوئے ہیں ان میں بعض پر اظہار رائے کرنے میں لوگ محتاط و متامل بھی یونہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری اس روش نے آپ کو کافی پریشان بھی کیا ہوگا۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

مگر اس پوری بات پر روشنی پڑتی ہے۔

جس وقت مارشل لا کا قاعدہ ۱۹۵۹ء جاری ہوا تو اس وقت میں پاکستان میں موجود تھا اس لئے میں اس کے دور رس نتائج کی بابت خود معلومات فراہم کر سکتا تھا یعنی یہ کہ اس قاعدہ کے جاری ہونے سے مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی میں کیا انقلاب آئیگا اور کیا اصلاح ہوگی۔ جن لوگوں نے یہ قاعدہ مرتب کیا تھا اور جن پر اس کے چلانے کی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں ان میں چند حضرات سے اس کی بابت گفتگو کا بھی شرف مجھے حاصل ہوا۔ لہٰذا مجھے اچھی طرح یہ معلوم ہو سکا کہ اس قاعدہ کے اجرا کی اصل لِم کیا ہے اور آپ کے ملک کی ترقی میں یہ کس طرح ایک نقطہ انقلاب ثابت ہو رہا ہے۔ میں نے اس کی وسعت کا بھی احاطہ کیا، مگر جب میں انگلستان واپس آیا تو دیکھا کہ نسبتاً چند ہی لوگ اصل بات سے پوری طرح واقف ہیں اور جو کچھ جانتے بھی تھے ان کا رجحان بھی نکتہ چینی کی طرف ہی تھا مثلاً یہ کہ اصلاحات اراضی پر وہ ناک بھوں چڑھاتے تھے یعنی یہ کہ "مزارعوں میں زمین بانٹ دینے" کا تصور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ علمی کتابوں میں دیئے ہوئے نظریوں اور اصول و قواعد کے نظریات سے وہ مطابق نہیں دکھائی دیتا تھا۔ یعنی ان کی نظریاتی تشفی نہیں ہوتی تھی حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ آپ کے ملک میں جو اصلاحات اراضی ہوئی ہیں وہ بڑی ممتاز و نمایاں خصوصیات کی حامل ہیں اور ان کو نافذ کرنا بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے اس سے پاکستان کا نظام اراضی ہی یکسر نہیں بدل جائے گا بلکہ آپ کے ہاں جو سیاسی مفاسد پیدا ہو گئے تھے، ان کا سرچشمہ بھی بالکل بند ہو جائے گا۔ پاکستان کے اس انقلابی اقدام کو سمجھنے میں میرے ہم وطن بری طرح ناکام رہے ہیں۔ میرے پاکستانی احباب ہمارے اس رویہ پر ضرور متاسف ہوتے ہونگے — اور میرا خیال ہے کہ میں ان احباب کا شریک تاسف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں آپ کے ملک کی موجودہ کیفیت کو ہم انگریز اب آہستہ آہستہ سمجھتے جا رہے ہیں۔ بالکل تازہ شہادت تو یہی ہے کہ پاکستان میں جو انگریز تجار بزنس کر رہے ہیں ان میں یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے کہ پاکستان میں اب انگریزوں کو اپنی تجارت میں روپیہ لگانے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک شخص نے مجھے ایک رسالہ لا کر دیا اس کا نام ہے "ACHIEVEMENT"۔ یہ بزنس اور صنعت کے مسائل سے مخصوص ہے۔ میں نے جس شمارہ کو دیکھا اس میں اس رسالہ کے اپنے نامہ نگار کے کچھ تاثرات چھاپے گئے تھے جو اس وقت پورے ایشیا کے سفر پر گیا ہوا تھا۔ وہ پاکستان بھی آیا اور یہاں کے انقلاب کو دیکھکر اس نے بزنس کرنے والوں کے زاویۂ نظر سے بھی اس انقلاب کو دیکھا۔ اس مضمون پر موٹی سرخی دی گئی تھی: "برطانوی کمپنیوں کے لئے اب پاکستان میں روپیہ لگانا لیکار آمد ہے"۔ اس مضمون میں درآمد کنندگان کی مشکلات کا بھی معقول نظر سے جائزہ لیا گیا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خراج تحسین بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس وقت پاکستان میں دور عمل ہے۔ کام کرنے کی ایک لگن ہے۔ "اور کچھ کرنے" کا انداز فکر کارفرما ہے۔ تجارت اور سیاست میں جو مفاسد پیدا ہو گئے تھے ان کا استیصال ہو چکا ہے۔ آخر میں اس نے یہ پیش بینی بھی کی ہے کہ صدر پاکستان جنرل (اب فیلڈ مارشل) محمد ایوب خان ملک میں ایک مستحکم معیشت پیدا کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے اس رائے کو ایک حرفِ ہمت کے مصداق جانا ہے اور اندازہ لگایا ہے کہ پاکستان کی طرف اب جو برطانوی ہوا کا رخ رہے گا وہ کس نوعیت کا ہوگا۔ یہاں جو بزنس مین کام کر رہے ہیں، ان کی بابت یہ مشہور ہے کہ وہ بڑے باخبر ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ اب یہ لوگ جیسا محسوس کریں گے اور جانیں گے اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑے گا۔ پھر یہ باخبری اور حلقوں تک وسیع ہوگی اور ایک عومی رائے تشکیل پائے گی۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اگر کوئی غیر پاکستانی آپ کی نئی حکومت پر یا ان چیزوں پر جو اس کے اقتدار میں آنے کا موجب ہیں، فیصلے صادر کرنے بیٹھ جائے تو یہ ایک نوع کی گستاخی ہوگی مگر جب خود میرے اہل ملک نے بارہا مجھ سے کہا کہ آجکل کے پاکستان اور اس انقلاب کی بابت لب کشائی کروں تو میں مجبور ہو گیا کہ ان کے سوالوں کا جواب تیار کروں۔ ایسے جوابات جو مجھے بھی مطمئن کر سکیں اور میرے سوال کنندگان کو بھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاکستانی احباب کو بھی یہ جواب پسند آئیں گے یا نہیں مگر اتنی بات ضرور کہوں گا۔ یہ جواب میرے مرتب کئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کا سرچشمہ وہ عظیم ہستی ہے جسے

بڑی اور پرانی عظیم پاکستانی ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے گا۔ میری مراد سر محمد اقبال سے ہے۔

اس سال (۵۹ء) جب میں اپنے وطن واپس آیا تو اقبال سوسائٹی کی طرف سے ایک دعوت صدارت ملی۔ یہ سوسائٹی ہر سال لندن میں اقبال کے یوم وفات پر جلسہ کیا کرتی ہے۔ میں نے اس موقع پر اقبال کی کتابوں کو ٹٹولا اور جو اوراق میری نظر سے گزرے ان میں مجھے ایسے مقامات مل گئے جن سے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس عظیم مفکر و شاعر کے تصور میں ایک اسلامی مملکت کا کیا خاکہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ اس مملکت کا تصور و نصب العین اس نے کیا طے کیا تھا۔ اقبال صرف اس بات پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا کہ اس کی اہمیت و ضرورت پیش کر دی یا اس کی مادّی سرحدیں تک سمجھادیں۔ اسے تو یہ خلش بھی تھی کہ اس مملکت کے خصائص کو بھی اپنے پیغام میں واضح کر دے۔ تاکہ جب اس مملکت کا قیام ہو اور اس کے کوئی معنیٰ ہوں تو افراد ملت اور معاشرہ میں ان کے مقام و موقف کا تعین ہو جائے۔ اقبال کے اس تصور کو اس وقت بھی کوئی پاکستانی بھلا نہیں سکتا۔ اقبال نے بتایا ہے کہ اس مملکت کے آٹھ بنیادی اصول ہوں گے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ مملکت کا وجود دین و حدت کے پرستاروں سے عبارت ہوگا کیونکہ اس چیز کے بغیر اخوت انسانی پر مبنی کوئی بھی پالیسی یہ مملکت وضع نہیں کر سکیگی۔ دوسری بات اس نے یہ سمجھائی تھی کہ ایسے لوگ اس مملکت کی خدمت پر مامور ہوں جو اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر وطن کی خیر و فلاح کو مقدم رکھ سکیں۔ جب تک ایسی بے لوث سرشاری کام کرنے کی نہ ہو اور ایسے صالحین کام نہ کر رہے ہوں، اس وقت تک مملکت مستحکم نہیں ہوگی۔ تیسرا نکتہ یہ تھا کہ دستور عمل طے کیا جائے۔ یعنی یہ کہ پورے نظام مملکت اور عوام و خواص کا باہم رشتہ کن بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ چوتھا تصور یہ تھا کہ ایک معین و مخصوص مرکز ثقل وجود میں لایا جائے یعنی ایک خطۂ ارض جہاں ایسے لوگ بسے ہوئے ہوں جن کا عقیدہ ایک اسلامی مملکت میں سامان زیست و بود کا متلاشی ہو اور انہیں یہ آزادانہ حاصل ہوں۔ پانچواں نکتہ تصور و مقصد تھا۔ یعنی ایک ایسا نصب العین جس کی طرف مملکت اور افراد قوم دونوں ہی کو اپنے قوائے عمل راجع کرنے تھے۔ چھٹا نکتہ تھا عناصر فطرت کی تسخیر، جس میں یہ تصور بھی مضمر تھا کہ جن خوبیوں نے تسخیر فطرت کو اپنا مخصوص مطالعہ و تجربہ بنا کر فتوحات حیات کی منزلیں طے کی ہیں ان کے ساتھ پورا و جان عملی تعاون کیا جائے۔ ساتویں بات جو اقبال ہمیں سمجھا گئے یہ تھی کہ اس مملکت میں معاشری احساس اور جذبۂ شہریت وجود میں لایا جائے۔ جب یہ احساس قوی ہو کر آگے بڑھے گا تو بڑی سطح پر قومی دائرہ میں قوم اپنی سود و بہبود کو متشکل کر سکے گی اور شہریوں میں یہ احساس ذمہ داری، قوم و ملک کو بنائیگا۔ آخری بات، جو کسی بات سے کمتر اہمیت کی نہ تھی، خواتین ملت کے باب میں تھی۔ یعنی انہیں معاشرہ میں مناسب و معقول مواقع ترقی بخوبی فراہم کئے جائیں۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو کچھ ایسے ہی خیالات و اصول تھے جنہوں نے قائد اعظم کو تشکیل پاکستان کے اہم کام میں متأثر کیا۔ قوم بنانے کا وہ جذبہ جو اُن کے دستِ عمل میں آکر اپنا کام کر گیا اور پاکستان کے ابتدائی مراحل میں جو طلسماتی ترقی منظر پر آئی یہ سب اسی نصب العین کا فیضان اور قائد کی شخصیت کا طفیل تھا یعنی جس منزل پر پاکستان پہنچ گیا آج تک کوئی قوم نہ پہنچی تھی مگر قائد اعظم کی وفات کے بعد اور ان کے بہترین جانشین کی شہادت کے بعد منظر پر جو بھی ہستیاں آتی رہیں بڑی چھوٹی ہستیاں تھیں اور یہ سب اصول ان کی راہ نمائی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوم میں وہ زوال در آیا جس نے گذشتہ اکتوبر کے انقلاب تک بہت ہی المناک صورت اختیار کر لی۔ میرا تصور یہ ہے کہ انقلاب جو اَب آیا ہے قوم کو پھر ایک بار ان صالح اصولوں کی طرف موڑ رہا ہے اور ۱۹۴۷-۴۸ء میں جن حیرت انگیز مساعی نے پاکستان بنوا دیا تھا اور دنیا ششدر رہ گئی تھی اب ان عناصر کو پھر پالینے کی جستجو ہے۔ جب میرے اہل ملک آج کے پاکستان کے بارے میں اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، اس کے بارے میں پوچھتے ہیں تو میں یہ سب کچھ کہہ ڈالتا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ قوم دوسرا جنم لے رہی ہے اور یہ قوم ان اسباب کو پھر دریافت کر رہی ہے جنہوں نے اسے عظمت دلائی تھی۔ اس وقت وہ اپنے تمام وسائل و قوائے عمل کو اس بات پر مرکوز کئے ہوئے ہے کہ اپنے محب وطن، قومی رہنماؤں کی قیادت میں وہ ہارا ہوا میدان پھر جیت لے۔ وہ میدان جس میں صحیح و حوصلہ مندانہ قیادت کے موجود نہ ہونے کے باعث وہ کئی سال سے بھٹک رہی تھی۔

"شمعوں کی قطار"

(دورِ انقلاب کا جائزہ)

اللہ بخش یوسفی

حدِ نگاہ تک شمعیں ہی شمعیں، مینا ہی مینا ہے
انقلابی حکومت کے قائم ہونے سے لے کر اب تک برابر نظر آ رہی
ہیں۔ ایک ہی جانب نہیں بلکہ میدانِ حیات میں "ہر سو، ہر طرف"
اور بقولِ غالب "چراغانِ دوالی" کی طرح "صف بہ صف" اور
یہ سلسلہ یہیں نہیں رک جاتا بلکہ آئندہ بھی "گزرگاہِ خیال" نئی
نئی شمعوں نے ان کے جلووں سے "چراغاں" معلوم ہوتی ہے۔
(اس مضمون میں آپ کو انہی حسین نور کی جھلک دکھائی دے گی۔ مدیر)

آج سے بیس برس پہلے جس مملکت کے حصول کے لئے ۱۹۴۰ء
کی تاریخی قرارداد پیش کی گئی تھی وہ سات ہی برس بعد قیامِ پاکستان پر
منتج ہوئی۔ اس وقت دنیا کی آنکھیں اس سرزمین کی طرف لگی تھیں۔
اقوامِ عالم اس نوزائیدہ مملکت کے اقدامات کو دیکھ رہی تھیں۔ بہت دن
گزرنے نہ پائے تھے کہ بابائے ملت "داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ چاہئے
تو یہ تھا کہ اس دورِ ابتلا میں ہمارے زعما اخلاص و نیک نیتی کا مظاہرہ
کرتے، امانت و دیانت کے مجسمے بن کر قوم کو بامِ ترقی کی طرف لیجانے
کی سعی کرتے۔ مگر افسوس! ایسا نہ ہوا۔ ملت کو ترقی کے بجائے تنزل کے
راستہ پر ڈال دیا گیا۔ اور وہی افراد جن سے ملک و ملت کی امیدیں
وابستہ تھیں ذاتی اغراض کی آبیاری کرنے لگے۔ رشوت خوری اور
دوست پروری شروع ہوئی، مالدار کو مالدار تر بنا دیا گیا، ملازمین حکومت
نے مال و زر جمع کرنے کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس طرح اخلاقی پستی کا یہ دردناک
منظر دیکھنے میں آیا کہ نام نہاد قومی نمائندے بازیگروں کی طرح شعبدے
دکھانے لگے۔

ملت فاقہ کشی پر مجبور ہو گئی۔ بیرونی ممالک میں وقار باقی
نہ رہا۔ عوام مایوسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر جنرل
محمد ایوب خاں کی شکل میں ایک مردِ مجاہد نمودار ہوا اور اس نے میدانِ
عمل میں قدم رکھا۔ نام نہاد قومی حکمراں سرگشتہ و حیراں ایک دوسرے
کی شکل دیکھ رہے تھے۔

مارشل لا کا نفاذ کچھ کم پریشان کن بات نہیں، زمانہ قریب
میں کئی فوجی انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ لوگ ان سب کا طریقۂ کار
دیکھ چکے تھے۔ ان میں کیا کچھ نہ ہوا؟ گولیاں چلیں، قتل مقاتلے ہوئے،
تختۂ دار پر لاشیں لٹکتی نظر آئیں اور مہینوں بلکہ سالوں ملک میں صحیح طور
پر امن قائم نہ ہو سکا۔ ان حالات میں عوام کا خوف و ہراس کچھ بیجا
بھی نہ تھا۔ جنرل محمد ایوب خاں کے الفاظ میں یہی خیال کیا جا سکتا
تھا کہ "حکمرانوں کے ایک ٹولہ کی بجائے دوسرا ٹولہ برسرِ اقتدار آ گیا
تھا۔" لیکن غروبِ آفتاب کے ساتھ جب نجات دہندۂ وطن جنرل
محمد ایوب خاں کے یہ الفاظ سنائی دئے کہ:

"ہمارا مقصد جمہوریت کو بحال کرنا ہے۔
ایسی جمہوریت جسے ہمارے عوام سمجھ سکیں اور
اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔"

اور نفاذِ مارشل لا کے بعد ایک گولی تک نہ چلی، خون کا ایک قطرہ
تک نہ گرا، روزمرہ کے کاروبار میں کوئی فرق نہ آیا، ریل گاڑیاں۔
ڈاک و تار۔ آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ دکھائی نہ دی۔ حتیٰ کہ
حسبِ معمول طلبا اور طالبات بھی بلا کسی ہچکچاہٹ یا خوف کے جوق
در جوق درسگاہوں کی طرف گامزن نظر آئیں، تو عوام کے چہرے
چمک اٹھے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے انہیں کی بہتری کے لئے
ہو رہا ہے۔

پھر ۲۷ اکتوبر کو انقلابِ نو کی مستقل نوید آئی۔ اس دن
جنرل محمد ایوب خاں نے اپنے گیارہ رفقا یا وزرا کے ساتھ انقلابی
حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر محنت و استقلال سے
فرائض کی ادائیگی شروع کر دی۔ اور پھر سابقہ حکمراں "پہلے ہو تو
پھر تو ہو" کے مقولہ پر عمل پیرا ہو کر نت نئی سکیمیں مرتب کرتے رہے۔ نفاذِ

سے عوام کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہاں اس انقلابی حکومت نے "پہلے تولو پھر بولو" کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا۔ اس نے ہر سکیم کو سوچ سمجھ کر عوام کے سامنے پیش کیا اور جلد سے جلد اسے عملی جامہ پہنا دینے کی سعی کی۔ چنانچہ گزشتہ سال کے واقعات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انقلابی حکومت نے کس حیرت انگیز طریقہ پر وہ کام کر دکھایا جو سابقہ حکومتیں دس گیارہ سال میں بھی سرانجام نہ دے سکی تھیں۔ مثلاً سمگلنگ کو دور گزشتہ میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ حکومت اس کی روک تھام کا کوئی بندوبست نہ کر سکی اور کرتی بھی کیسے جبکہ خود عمالِ حکومت اس کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ کہ باہر سے بلا محصول مال درآمد کیا جانے لگا اور اندر سے چوری چھپے ملکی ضروریات کی اشیاء برآمد ہونے لگیں۔ ملک میں ہر چیز کی کمی پیدا کر دی گئی۔ عوام چلا اٹھے لیکن صاحبانِ اقتدار کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ انقلابی حکومت نے اولین فرصت میں اس مرض کی تشخیص کی اور اس کا علاج سوچا۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سمندر نے سونا اگلنا شروع کیا۔ اور صرف کراچی میں پچیس من سے زائد سونا ملا۔ سرحدوں پر انتظامات ہوئے۔ رفتہ رفتہ ملک کو اس مصیبت سے نجات مل گئی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ چور بازاری کا دور دورہ تھا۔ تاجروں نے دل کھول کر عوام کو لوٹنا شروع کیا۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ کھانے پینے اور عام ضروریات زندگی کا مہیا ہونا مشکل ہو گیا حتیٰ کہ مریض مرتے رہ گئے اور علاج کے لئے دوائی نہ خرید سکے۔ بیمہ گناہ بند رہتے ہی حکومت نے اشیاء پر کنٹرول کیا تو چھپے ہوئے خزانے کھلنے لگے۔ بازاریں اشیاء کی ایسی بہتات ہوئی کہ دکانوں کو تہہ در تہہ پتھر پر ڈھیر لگائے جانے لگے اور قیمتوں میں ۳۰ سے ۴۰ فیصدی تک کمی نظر آنے لگی۔

سمگلنگ اور چور بازاری کرنے والوں نے جہاں آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹا وہاں حکومت کو اس آمدنی کا ٹیکس تک نہ دیا۔ انقلابی حکومت نے اعلان کر دیا کہ پوشیدہ دولت کو ظاہر کر دیا جائے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایسے لوگوں کی تمام ناجائز کردہ دولت ضبط کر لی جاتی لیکن ایسا نہ ہوا۔ حکومت نے انتہائی نرمی سے کام لے کر اس کو ہاتھ نہ لگایا۔ صرف ایک حصہ بطور ٹیکس وصول کیا اور سات کروڑ روپے ترقیات عامہ کے کاموں پر خرچ کرنے کا

فیصلہ کیا۔

ظاہر ہے کہ گزشتہ دور میں ملک کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اندرون ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ مالی مشکلات سد راہ ہو رہی تھیں۔ چنانچہ مالی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے اسے مستحکم کرنے کے ذرائع سوچے جانے لگے۔ زرمبادلہ کا بہت بڑا حصہ ان اشیاء کی خرید پر صرف ہو رہا تھا جو ملک میں پہنچ کر ہم دوسرے ممالک کو چوری چھپے بھیج رہے تھے۔ چور بازاری نے بھی مالیات کا توازن خراب کر رکھا تھا۔ اور زرمبادلہ کی بقایا کی کمی دوسرے ممالک میں ہماری ساکھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ حکومت نے ایک ایک کو نہ چھان مارا۔ تجارت اندرون و درآمد برآمد کے لئے نئے قواعد وضع کئے۔ ملک کی حالت سدھرنے لگی اور جہاں ستمبر ۱۹۵۸ء میں ہمارے زرمبادلہ کو ۱۲۷ کروڑ بنایا گیا تھا وہاں انقلابی حکومت نے اپنی مستعدی سے اسے جولائی ۱۹۵۹ء میں ۲۰۴ کروڑ تک پہنچا دیا تھا۔

اس کے بعد ایک اور نظم شروع ہوا یعنی سرکاری افسروں کی اصلاح گزشتہ دور کے مصائب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں قومی صاحبانِ اقتدار کے ساتھ بہت سے سرکاری افسر بھی برابر کے شریک رہے۔ انقلابی حکومت ان سے بھی غافل نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ ان میں سے بعض نے تو مال و زر کو عزیز جانا اور بعض ایسے تھے جن پر کام چوری کی عادات راسخ ہو چکی تھی۔ چنانچہ حکومت نے افسران کی صفائی کے لئے ایک قانون نافذ کر دیا گیا اور اس کے تحت سکریننگ کمیٹیاں قائم کر دی گئیں۔ ان کمیٹیوں نے پوری طرح چھان بین کے بعد فیصلہ دیا تو فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مفادِ ملت کے پیش نظر بہت سے ایسے افسروں کو نکالنا ضروری ہو گیا جنہیں کاروبارِ حکومت کا وسیع تجربہ تھا۔ چنانچہ جن افسروں کے خلاف اس طرح کارروائی ہوئی ان میں مرکزی حکومت کے افسران درجہ اول کے ۱۳۸، درجہ دوم کے ۲۲۱ اور ۱۳۰۲ دوسرے ملازمین تھے۔ پاکستان بھر میں ایسے افراد کی تعداد تین ہزار تھی جنہیں ملازمت سے برطرف کیا گیا۔ یا پنشن دے کر علیحدہ کیا گیا۔ یا جن کے عہدوں میں کمی کر دی گئی۔

ساتھ ہی ساتھ تعمیر ملت کی طرف ٹھوس قدم اٹھائے گئے۔ جن میں اولین حیثیت زرعی اصلاحات کو حاصل ہے۔ پاکستان میں ابتدا ہی سے زراعتی املاک چند ہزار نفوس کے قبضہ میں تھی۔ بڑے بڑے زمیندار سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ کسان بچارے پشت ہا پشت سے زمینداروں کے

ان اراضی سے سونا پیدا کرنے کے باوجود خود غریب و نادار رہا۔ اس کی کمائی ہوئی دولت زمیندار کے خزانہ کی زینت بنی اور اسے کسی وقت زمین پر مالکانہ حقوق حاصل نہ ہوسکے۔ انقلابی حکومت نے قائد اعظمؒ کے اس قول کو دہرایا کہ کسان کی خوشحالی سے پاکستان کی خوشحالی بڑھے گی۔ پھر دیکھا کہ زمیندار اپنی تمام املاک کو ضروریات ملک کے لئے استعمال بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دولت کے نشہ میں اس طرف توجہ ہی نہیں دی جس سے ہر سال لاکھوں ایکڑ اراضی بنجر ہو رہی تھی۔ بنا بریں تحقیقات کے لئے ۲۳ نومبر ۱۹۵۸ء کو ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے ۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس پر جنرل محمد ایوب خاں نے زرعی اصلاحات کا اعلان کر دیا۔ یہ زرعی دنیا میں ایک یادگار انقلاب تھا۔ اس کے باعث کوئی زمیندار پانچ سو (۵۰۰) ایکڑ نہری اور ایک ہزار ایکڑ بارانی زرعی اراضی سے زائد پر قبضہ نہ رکھ سکے گا۔ البتہ باغات وغیرہ کے لئے ڈیڑھ سو ایکڑ مزید رکھنے کی اجازت ہوگی۔ بقیہ اراضی حکومت اپنے قبضہ میں لے گی۔ وہ بھی مفت نہیں۔ ۲۵ سال میں بہ اقساط اس کی قیمت بھی ادا کرے گی۔ قابض مزارعوں کو املاک کا مالک بنا دیا جائیگا اور دوسرے کسانوں میں جو اراضی تقسیم ہوگی وہ آسان قسطوں میں اس کی قیمت ادا کریں گے۔ اس فیصلہ کے مطابق مغربی پاکستان میں زمینداروں سے ۲۱۵۴۵۰۷ ایکڑ زمین حاصل ہوگی جس پر کوئی ۴۵۸۲۵ کسان آباد کئے جاسکیں گے۔ دوسرے کسانوں کو دوسرے علاقوں میں سرکاری املاک دی جائیگی اور ان کی سہولت کے لئے حکومت نے تقاوی قرضوں کے لئے تیس لاکھ روپے کی رقم بھی علیحدہ کر دی ہے۔ اس طرح صدیوں کے جکڑے ہوئے کسان زمینداروں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرلیں گے۔

زرعی اصلاحات پر توجہ کرنے کے علاوہ نئی حکومت نے ملک کا ایک دوسرا اہم مسئلہ بھی اپنی عملی تحویل میں لے لیا۔ بے خانماں اشخاص کی آبادکاری۔ پاکستان کو ابتدا ہی سے مہاجرین کی آبادکاری کا نہایت اہم مسئلہ درپیش رہا ہے لیکن اس کا کوئی حل تلاش نہ کیا جاسکا۔ ہر وزارت نے برسر اقتدار آکر اس کی اہمیت پر زور دیا۔ کوئی تحریر کوئی تقریر کوئی بیان ایسا نہ تھا جس میں اس کی اہمیت بیان نہ کی گئی ہو۔ بوقت ضرورت مہاجرین ہی کا نام استعمال کیا جاتا رہا۔ لیکن عملاً ان کی آبادکاری کی طرف کوئی اقدام نہ ہوا۔ جو لوگ فٹ پاتھوں پر پڑے تھے وہ وہیں پڑے رہے اور جو جھونپڑوں میں مقیم تھے جھونپڑوں ہی میں رہے۔ اس طرح ان بے خانماں لوگوں نے وعدۂ فردا پر پورے گیارہ سال گذار دیئے۔ انقلابی حکومت کے اراکین یہ حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ وہ اس دردناک منظر سے کیسے متاثر نہ ہوتے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اسی اہمیت کی نظر سے دیکھا جس سے اسے دیکھا جانا چاہیئے تھا۔ بے خانماں آبادی کا جائزہ لیا گیا۔ پتہ چلا کہ صرف کراچی میں چھ لاکھ بے خانماں دن رات مصائب و آلام کی زندگی گذار رہے ہیں۔

کام کرنے کا تہیہ کر لیا جاتا اور حقیقی طور پر کام کرنے کی نیت ہو تو کوئی مشکل نہیں رہتی۔ چنانچہ حکومت نے پہلے ہی اقدام میں چالیس ہزار کوارٹر تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا جن پر تقریباً چھ کروڑ اڑتیس لاکھ لاگت آئے گی۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کس طرح لفٹننٹ جنرل محمد اعظم خاں کی زیرنگرانی پانچ ماہ کے مختصر عرصہ میں پندرہ ہزار کوارٹر کورنگی کی نئی بستی میں تیار ہوگئے جن میں مہاجرین کو آباد بھی کر دیا گیا ہے۔ آبادکاری کے سلسلہ میں ایسے ہی اقدامات پورے پاکستان میں کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب کام اپنی جگہ نہایت اہم تھے مگر صدر ایوب نے اعلان کیا تھا کہ وہ عوام کو ان کا حق یعنی جمہوریت حقیقی معنوں میں واپس دلائیں گے۔ چنانچہ ان کے اور ان کی حکومت کے جس طرح اور وعدے سچے ثابت ہوئے اسی طرح بحالی جمہوریت کا وعدۂ الیٰ بھی پورا ہو کر رہا کیونکہ خلوص عمل اور سعیٔ پیہم موجود تھی۔ ملک میں بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طریقۂ انتخاب میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہزار ڈیڑھ ہزار بالغ رائے دہندگان اپنے حلقہ میں اچھی طرح دیکھ بھال اور جان پہچان کے ایسے ہی افراد کو منتخب کریں گے جو ان کے مفاد کے نگران بن سکیں۔ یہ ابتدائی جمہوریت ہوگی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں کے صدر مل کر تحصیل کونسل بنائیں گے۔ تحصیل والے مل کر ضلع اور ضلع والے اپنی اپنی کمشنری کی کونسلیں بنائیں گے۔ ملک بھر میں یہ انتخابات مکمل ہو چکے ہیں اور صدر پاکستان کے انتخاب کے بعد یکم مارچ ۱۹۶۰ء سے یہ بنیادی جمہوریتیں اپنا کام شروع کر دیں گی۔

انقلابی حکومت ملی اور ملکی ضروریات کے کسی بھی گوشہ سے بیخبر نہیں۔ اس نے بیک وقت ہر گوشے میں کام شروع کر رکھا ہے چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمارا "نظام تعلیم" انگریز کا مرتب کردہ ہے اور ہمارے مقاصد کے لئے مفید نہیں ہوسکتا، اس نے ایک تعلیمی کمیشن بھی مقرر

کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عدالتوں کا موجودہ طریقۂ کار بہت تکلیف دہ ہے۔ انصاف جلدی حاصل نہیں ہو سکتا اور اخراجات ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک قانون کمیشن کا تقرر عمل میں آیا۔ مشرقی پاکستان میں زرعی اراضی کے محصولات کے سلسلہ میں مشکلات پیش آئیں تو وہاں کے لئے لگان کمیشن قائم کیا گیا۔ اسی طرح یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اناج اور دوسری اشیا کی پیداوار کو کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے۔ کمیشن برائے خوراک و زراعت مرتب کیا گیا۔ سائنس کی ترقی، جہازرانی، پارچہ بافی، مشترکہ سرمایہ کے کاروبار کے قانون کی دیکھ بھال اور سنہری ریشہ یعنی پٹ سن کی پیداوار کے لئے علیحدہ علیحدہ کمیشن مقرر کئے گئے۔ دوسرا پانچسالہ منصوبہ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اقتصادی حالت کو سنبھالنے کے ذرائع سوچے گئے، ملک میں بیمہ کے کاروبار پر توجہ دی جا رہی ہے، صنعتی معاملات پر حکومت کی توجہ مرکوز ہے۔ درآمد برآمد کرنے والوں کو سہولتیں دی جا رہی ہیں صحت عامہ کے نظام میں رد و بدل، ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد میں اضافہ، ادویات کے حصول میں سہولتیں۔ غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی زندگی دکھائی دے رہی ہے اور جمود کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔

ملکی و ملّی ضروریات کے ساتھ انقلابی حکومت مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی معاملات کی طرف بھی پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ گزشتہ دور میں کس غلط طریقہ سے مذہب کے نام کو استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ کس طرح مذہب کے نام پر ذاتی اغراض پوری کی جاتی رہیں اور مسلمان روحِ اسلام سے دور ہوتے گئے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تاکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرے، اسلامی تعلیم کو ہمہ گیر شکل میں پیش کرے اور اس نے جو احسانات دنیا پر کئے ان کی تحقیقات کے پہلو بہ پہلو تاریخِ اسلام، فلسفہ اور نظامِ قانون (فقہ) کے سلسلہ میں تحقیق و تجسس کی ہمت افزائی کرے۔

مزدور کا مسئلہ بہت ہی اہم اور حل طلب تھا۔ صدیوں سے مزدور کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے سرمایہ دار تو فائدہ اٹھا رہا تھا۔ لیکن اس محنت کش کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اُسے کسی وقت بھی پیٹ بھر کھانے کو روٹی یا بدن ڈھانکنے کو کپڑا میسر نہ ہوا نہ سر چھپانے کو جگہ ملی نہ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام ہوا۔ انقلابی حکومت نے مزدور کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کا اقدام کرتے ہوئے انہیں زندگی کی تمام سہولتیں مہیا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان مزدوروں سے کام لینے والوں کو ہدایت ہوئی کہ وہ ان سے برابر کا انسانی سلوک کریں، تمام بنیادی سہولتیں مہیا کریں، ان کے علاج معالجہ کا خیال رکھیں اور رفتہ رفتہ مزدوروں کے لئے رہائشی مکان بھی تعمیر کرنا شروع کر دیں۔ مالک و مزدور کے باہمی اختلافات کے لئے پہلی بار انقلابی حکومت نے صنعتی عدالتوں کے قیام کا فیصلہ کیا ہے جن میں جج کے ساتھ مالکوں اور مزدوروں کا ایک ایک نمائندہ ہو گا۔ اور ایک ایسا اہم قانون بھی نافذ کر دیا گیا ہے کہ جو بقول جنرل برکی اپنی قسم کا واحد اور قابلِ تقلید قانون کہا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے دارالسلطنت کا مسئلہ بھی قیامِ پاکستان کے وقت سے زیرِ بحث رہا ہے۔ ہر وزارت نے نیا دارالحکومت بنانے کے مسئلہ کو حل کرنے کی بے دلی کے ساتھ بغیر منصوبہ بندی کے کوشش کی اور یہ کوششیں بھی سیاسی داؤں پیچ کا شکار رہیں مگر انقلابی حکومت نے اس مسئلہ کو دو ٹوک حل کر دیا۔ اس کے لئے پہلے تو ایک کمیشن مقرر کیا اور کمیشن کی رپورٹ پر غور و فکر کے بعد دارالسلطنت کو راولپنڈی کے قریب پوٹھوہار میں تبدیل کرنے کا آخری فیصلہ بھی کیا۔ اور قبل اس کے کہ جدید دارالسلطنت تعمیر ہو عارضی طور پر مرکزی حکومت کے ایک اہم حصہ کو انقلابی سال ختم ہونے سے قبل راولپنڈی کو منتقل بھی کر دیا۔

ملک کی تعمیری و اصلاحی ترقی کی نئی نئی راہیں کھلتی جا رہی ہیں اور اس کے ساتھ ملک کی ادبی و ثقافتی زندگی بھی نئے دور میں ایک نئی روح اپنے تن میں (جو ناتواں ہو چکا تھا) بیدار ہوتی محسوس کر رہی ہے۔ ادب و ثقافت حساس و باشعور معاشرہ کی ذہنی رہنمائی اور اس کے احساسات اور رجحانات فکر و نظر کو صحیح راہوں پر قائم رکھنے اور انہیں صحت مندانہ نمو دینے کے لئے لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کوئی ملک بھی محض مادی وسائل کو آگے بڑھا کر مکمل نمو شدہ معاشرت کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ادب و ثقافت کو کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملے، فنکاروں کی ہمت افزائی ہو اور ان کے لئے قوت لایموت میسر ہوتا رہے تاکہ وہ اظہار و نمو کے نئے نئے چراغ جلاتے اور صنم تراشتے رہیں۔

یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اس نئے دور کے خالقوں نے ہمارے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے طبقے کو بھی سہارا دیا ہے اور وہ جو اب تک معاشرہ کا وجود ہوتے ہوئے بھی یوسف گم گشتہ کی طرح تھے اب اُن کی ذات اور صفات بھی کوئی کام کی چیز مان لی گئی ہیں اور اس قافلہ کو بھی میر کارواں مل چکا ہے۔ وہی میر کارواں جس نے ملک کے دوسرے قافلوں کو بھی صحیح راہ پر ڈال دیا ہے۔ اب ملک میں قلم اور موقلم کے ان مجاہدین کو بھی مقام شرف و اعتنا میسر آ رہا ہے۔ ان کی مالی حالت بہتر بنانے اور مواقع ترقی پیدا کرنے کی سعی کی جا رہی ہے تاکہ نئے نئے وسائل بکمال کر لوح و قلم کی پرورش کرنے والوں کی آسودگی کا سامان بھی بہم پہنچے۔ اور ملک کا ادب و ثقافت معیار و مقدار کے باب میں بھی وقیع و ممتاز بن سکے۔ اس ضمن میں خصوصیت سے "رائٹرز گلڈ" کے قیام کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جبکہ برصغیر میں پہلی بار "ہم قلم" ایک راہ پہ فی الواقع "ہم قدم" ہوتے ہیں اور اپنی سود و بہبود کی راہ پر عملی شعور کے ساتھ گامزن ہوتے ہیں۔ ادھر رنگ و موقلم کے عالمی ہیں انہیں بھی نئے دور کی روح کو محسوس کر کے اسے مفید کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور گرد و پیش کی دنیا نے انہیں یہ آگاہی دینی شروع کر دی ہے کہ زندگی کم خطوط و فقط رنگ ہی نہیں ہے، اس سے بڑھ کر بہت کچھ ہے اور اس بہت کچھ کو انہوں نے محسوس کر کے اظہار کا جامہ بھی عطا کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ مثلاً زین العابدین (مشرقی پاکستان) اور صادقین (مغربی پاکستان) نے روح عصر کو اپنے کام میں داخل کر لیا ہے۔ صادقین نے "متفکر" کو ہمارے سامنے اپنی پوری "قامت و قیامت" کے ساتھ لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور ہم سے کہا ہے کہ اس کو خوب پہچان لو۔ نقاشی کی چند نمائشیں جو حال ہی میں منعقد ہوئیں وہ فنکاروں کے نئے کاموں کو سامنے لانے میں کامیاب ثابت ہوئیں۔

ادب و ثقافت کے ان پہلوؤں کو ملک میں ہمت افزائی اور اعتنا کی روشنی مل رہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ بھاری بھرکم حقیقتیں بھی اپنا بھیانک منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ میرا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ملک میں آبادی کا اضافہ ہمارے وسائل کی کمر توڑنے کی حد تک پہنچ چکا ہے اور اگر ہم نے اپنی آبادی کو قابو میں نہ رکھا تو بڑے نقصان رساں نتائج پیدا ہوں گے اور صدیوں تک خسارہ کا سامان پیدا کرنے والے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔ اس پہلو پر خود صدر مملکت ہمارے عوام و خواص کی توجہ مبذول کرا چکے ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کچھ سمجھدار اور دردمند لوگوں نے شروع کی ہے۔ خیال ہے کہ ملک کا فہمیدہ طبقہ اس کی اہمیت و ماہیت کو سمجھ کر اپنے دوسرے کم سمجھ ہموطنوں کو بھی سمجھائے گا اور جہاں جہاں اس کی تربیت کا اہتمام ہو چکا ہے لوگ اس کی طرف رجوع کریں گے۔ اگر ہم نے اپنی آبادی کے مسئلہ پر قابو نہ پا لیا تو ملک بہت سے مصائب کا شکار ہو جائے گا اور دوسرے شعبوں میں جو بھی ترقی ہوگی اس کا توازن بگڑ جائے گا۔

آخر میں عوامی رجحان اور گرمجوشی کی تازہ ترین مثال کا ذکر کئے بغیر اس جائزہ کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ یوں تو اول دن سے ہی عوام نے اس دور کو اس کی برکتوں کے باعث لبیک کہا تھا مگر جیسے جیسے مسائل حل ہوتے جا رہے ہیں یا تکمیل کی منزل کے قریب آ رہے ہیں۔ اس دور کے ساتھ لوگوں کی گرویدگی اور شیفتگی اور بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ عوامی ردعمل، جوش و خروش اور تحسین کے جو مظاہرے "پاک جمہوریہ اسپیشل" کے سفر کے دوران جا بجا دیکھنے میں آئے وہ شاید برصغیر کی تاریخ میں بے نظیر کے علاوہ کسی لفظ سے تعبیر نہیں کئے جا سکتے۔ مغربی پاکستان میں اس اسپیشل کا پہلا سفر بخیر و خوبی ختم ہوا تو پھر مشرقی پاکستان میں بھی اس کا سفر حال ہی میں ختم ہوا۔ دونوں جگہ دورِ نو کے معمار کو دیکھنے اور اس کی سچی سچی، کام کی باتیں سننے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ان کا بے پناہ ہجوم ایک سیلاب آدم تھا کہ سب انتظاموں کے باوجود جوشِ عقیدت و مسرت میں بے قابو ہوا جاتا تھا۔ معمارِ دورِ نو نے خود عوام تک پہنچ کر ان کا دل جیت لیا۔ وہی بات ہوئی کہ وہ آیا اور دلوں کے قلعے مسخر کر کے چلا گیا۔

اس اسپیشل کا سفر ایک بڑا بامقصد سفر تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے سوچا کہ زیادہ سے زیادہ افراد تک اس طرح بآسانی پہنچا جا سکتا ہے، ان کی مشکلات کو خود دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ دید اور شنید دونوں ذریعوں سے جب وہ عوام اور ان کی مشکلات کو جان لیں گے تو حلِ مسائل میں بڑی مدد ملے گی اور عوام کو ان کو دیکھنے کی مسرت کے علاوہ اس بات کا بھی احساس ہو جائے گا کہ اب ہماری مشکلات کو سننے والا اور فوری حل کے احکام جاری کر دینے والا بھی کوئی موجود ہے۔ اس کی عظمت اس کے کام کام کی عظمت ہے اور ہر شخص اس کا معترف ہے۔

اس گاڑی میں ایک آدمی ایک اکیلے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا، اس کے دو تین ساتھی الگ جا کر سو گئے تھے، وہ اکیلا بیٹھا سوچ رہا تھا۔

خوش گمان اور بے یقین دونوں الگ الگ سوچ رہے تھے۔

صبح سے ہنگامہ شروع ہو گیا۔

اکیلا آدمی ریل سے اترا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بہت سے لوگ بیٹھے تھے جو بولنے کے لئے بیتاب تھے۔ جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو پہلے چند آدمی مؤدب اور کچھ ہکلاتے ہوئے سے نظر آئے مگر پھر وہ فرفر بولنے لگے۔

"آپ نے یہ دورہ کیوں شروع کیا ہے؟"

"کیا آپ کو احساس کمتری ہو گیا ہے کہ مارشل لا لگا کر جمہوریت اور الکشن وغیرہ میں پڑ گئے ہیں؟"

"صدر کنونشن اور کشمیر کا فیصلہ کیوں نہیں کراتے؟"

"ہمارے گاؤں سے سڑک کیوں نہیں گذرتی؟"

"آپ مارشل لا کب اٹھائیں گے؟"

"آپ مارشل لا کیوں اٹھا رہے ہیں؟ ابھی ہمیں دو چار فصلیں آرام سے کاٹنے دیجئے۔"

"جناب صدر"

"جناب صدر میری بات سنئے۔"

"مجھے بولنے دیجئے جناب صدر"

"جواب دیجئے۔ میری بات کا جواب دیجئے۔"

"جناب صدر"

"جناب صدر"

گاڑی چلتی رہی۔ پہلا دن، دوسرا دن، تیسرا دن۔ ہر روز وہ اکیلا آدمی کئی کئی بار ٹرین سے اترتا ہے اور کبھی سینکڑوں اور کبھی ہزاروں اور کبھی لاکھوں آدمیوں کے آگے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگتی ہیں۔

"قیمتیں چڑھ گئی ہیں۔"

"بے ایمانی اب بھی ہو رہی ہے۔"

"سیم اور تھور نے زمینوں کو بنجر بنا دیا ہے۔"

"ہم بھوکے ہیں، ہم ننگے ہیں۔"

"آپ جمہوریت واپس کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں۔ آپ خود کام کیجئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

غیر ملکی صحافی زیادہ مستعد ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس نہایت حساس مائیکروفون والے ٹیپ ریکارڈر ہیں۔ جہاں کوئی بولتا ہے وہ مائیکروفون اس کے آگے کر دیتے ہیں۔ بحثوں پر وہ ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے ہیں۔ تلخیوں پر ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ مقامی افسران روز بروز پریشان نظر آتے ہیں اور چپکے چپکے ٹرین کی ملاقاتیوں سے اپنے دکھڑے روتے ہیں۔

"اب دیکھئے وہاں وہ بالکل کھلے طور پر مجمع کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں اور سوال جواب کر رہے ہیں، بتائیے، اب ہم تو خوف کے مارے سوکھ رہے ہیں۔"

"اب دیکھئے وہ ادھر صفوں میں پہنچ گئے ہیں۔ کبھی ہماری بھی کیا نوکری ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔"

"نہیں صاحب، آپ لوگوں نے ہماری کوئی عزت نہیں رکھی اس شہر میں۔ نہ چلنے نہ کھانا۔ آخر حکومت تو ہمیں چلانی ہے۔ یہاں معززین ــــــ"

"معاف کیجئے، آپ لوگوں میں خوشامدی اور بازی لوگ موجود ہیں ورنہ انہیں مشورہ دیا جاتا کہ عوام ودام کوئی چیز نہیں۔ اصل میں معاملہ معززین سے رکھنا چاہئے۔"

گاڑی چل رہی ہے۔ دو صحافی بدمزاج ہو رہے ہیں۔ ایک غصے کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔

"پاک جمہوریت۔ پاک جمہوریت۔ یار یہ کیا فراڈ ہے۔ ہم کس نقشے میں پھنس گئے ہیں۔ یہ ملک دو سو برس پیچھے جا رہا ہے۔ اپنی جان کی قسم یہ سب فراڈ ہے۔ اس میں کچھ نہیں ہے پیارے۔ یہ حکومت چل ہی نہیں سکتی۔ ان کے کوئی اصول نہیں ہیں۔ سب فراڈ ہے یار؟"

"آہستہ بول یار آہستہ!"

"ارے چھوڑ بھی، لعنت بھیج آہستگی پر۔ یہاں آج سب کی پول کھل گئی ہے۔ سالے ہم پڑھے لکھے لوگوں کو یوں تو بیوقوف بنانا ٹھیک نہیں ہے نا۔"

"چپ رہ یار چپ رہ۔ آخر بات کیا ہوئی۔"

"بات کیا ہونی تھی۔ یہ بھی ویسے ہی ہیں یار۔ بس ذرا کھ

لیا نہیں کبھی؟"

"آخر ہوا کیا؟"

"ابے تجھے نہیں معلوم۔ جب سے گاڑی اس صوبے میں داخل ہوئی ہے پاکستانی مسلمانوں کے لئے شراب بند ہے۔ یہ سالے یوروپین اپنی اپنی پی رہے ہیں۔ ہم شہر سے لاکر بھی نہیں پی سکتے۔"

"تو یار بے پئے گذار دے نا۔ آخر قانون وانون ہوتا ہی ہے۔"

"کیوں گذار دوں۔ یہ کیا قانون ہے۔ یہ کوئی روشن خیالی ہے بھئی۔ ارے میں ایک آزاد شہری ہوں۔ میں پینی چاہتا ہوں میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، قانون کیا چیز ہے! کاہے کا قانون!"

"نہیں یار، یہ سب فراڈ ہے۔ اسی لئے یہ اسکیم، یہ حکومت، یہ ملک، یہ سب کچھ فراڈ ہے، سب فراڈ ہے۔ سب ــــ"

ٹرین چل رہی ہے۔

خوش گمان، بے یقین کے سامنے بیٹھا ہے۔ بے یقین ایک ذہین پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ خوش گمان سے حقارت آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"اچھا ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا اچھا ہو رہا ہے۔"

"ڈیولپمنٹ کا کام ہو رہا ہے۔ تعمیرِ نو کا کام ہو رہا ہے۔ یعنی شاید یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

"کیا تعمیرِ نو، کا ہے کی تعمیرِ نو؟"

"تعمیرِ نو۔ تعمیر۔ قوم کی تعمیر۔ ملک کی تعمیر۔"

"کھوکھلی جاہلانہ باتیں مت کرو۔"

(خاموشی)

بے یقین کھڑا ہو جاتا ہے۔

"سنو۔ بکواس مت کرو۔ یہ جو زمینداری ختم ہوئی جس پر سب اتنی بغلیں بجا رہے ہیں، یہ اس لئے نہیں کہ عوام کو فائدہ پہنچے بلکہ اس لئے کہ زمینداروں کی کمر ٹوٹ جائے اور وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ خفیہ دولت جو نکلوائی تو صرف دھونس جمانے کے نتائج دیکھنے کے لئے۔ مہاجرین جو بسائے تو سیاسی استحکام اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے۔ افسر نکالے تو پرانی دشمنیوں اور ذاتی ناپسند کی بنا پر اور یہ پلان ولان جو ہے نہایت غیر دانشمندانہ ہے۔ اس میں کوئی بات کام کی نہیں ہے اور یہ جو بنیادی جمہوریت کا چکر ہے، تو یہ ہمیں باندھ کر معطل کر دینے کی ترکیب ہے۔ سمجھ گئے۔ یہ سب بے معنی باتیں ہیں سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا۔"

"کچھ بولو گے نہیں؟"

"نہیں"

قافلہ چل رہا ہے۔

ریت کے میدان گزر رہے ہیں اور پڑھے لکھے لوگ ڈائننگ کار میں تاش کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔

"وَن نو ٹرمپ"۔

"ٹو سپیڈز۔"

"یار، تم کس کنونیشن کے ماتحت کھیلتے ہو؟"

پاٹنر لڑ رہے ہیں اور ریت کے میدان گزر رہے ہیں۔ لائن کے دو رویہ ہزاروں بھوکی آنکھیں اور پیاسی روحیں نعرے لگا رہی ہیں۔ 'زندہ باد۔ پائندہ باد۔ زندہ باد'۔ یہ کس کو زندہ باد کہہ رہے ہیں؟ کیا اس اکیلے آدمی کو جو ایک اکیلے کمرے میں سفر کر رہا ہے۔ وہ ایک عام سا آدمی ہے جیسے سبھی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ لمبا قد تو بہتوں کا ہوتا ہے، اچھی صحت بھی بہتوں کی ہوتی ہے، خوبصورت بھی بہت ہوتے ہیں، طاقتور بھی ہزاروں گزرے ہیں۔ پھر یہ کیوں زندہ باد کہہ رہے ہیں؟ یہ لوگ، یہ عوام، یہ ان پڑھ جانور نعرے کیوں لگا رہے ہیں؟

بے یقین تلملا رہا ہے۔

خوش گمان شوق سے دیکھ رہا ہے۔

"زندہ باد!"

"پائندہ باد!"

"نو سپیڈز"

"ڈبل"

"ری ڈبل"

"زندہ باد!"

"میں نے تو پارٹنر تم سے کسی امید پہ کال بڑھائی ہے۔ تم یار

اچھا کھیلتے ہو۔ اور مجھے یقین ہے تمہارے پاس پتے بھی ہوں گے۔"

"زندہ باد!"

"زندہ باد! پارٹنر زندہ باد!"

آٹھ کروڑ آدمی ایک پارٹنر کی کال بڑھا رہے ہیں۔ یہ کال ریت کے میدانوں اور سیم اور تھور سے مجروح زمینوں کے سینے چیر کر آ رہی ہے۔ پارٹنر اپنی ہمت افزائی پر مسکراتا ہے مگر پھر اپنے پتے غور سے دیکھنے لگتا ہے۔

ڈائننگ کار میں صحافی، ادیب، افسر اور غیر ملکی بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں ریت کے میدانوں سے دلچسپی نہیں۔ وہ باہر نہیں دیکھ رہے۔ دیکھیں کیا۔ باہر بنجر زمینیں، تار کے کھمبے اور مویشی ہیں۔ پاکستانی کسان بھی تو مویشی ہوتا ہے نا، سو وہ مویشیوں کو کیا دیکھیں۔ وہ سگریٹ پی رہے ہیں، اور تاش کھیل رہے ہیں اور شکایتیں جمع کر رہے ہیں۔

"آج کی خبریں نہ لاہور پہنچیں نہ کراچی۔ یہ تار آپریٹر میرا دشمن معلوم ہوتا ہے سالا۔ تمہاری خبریں پہنچیں؟"

"پہنچیں۔ ایک ایک لفظ پہنچ گیا۔"

"پھر میرا معاملہ کیوں خراب ہوا؟"

"وائرلیس کا معاملہ ہے، گڑبڑ ہو گئی ہوگی۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں یار۔ پھر ایسی مشینیں لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کے جوتے ماروں گا آج۔"

"ہزاروں لفظ جا رہے ہیں۔ شاید دوپہر تک کلیئر ہو جائے۔ دیکھو نا کام کتنا ہے۔"

"بھئی تم بھی اب کوئی تعمیرِ نو والے وکیل ہو گئے ہو۔ ہر بات کی تشریح ضرور کرتے ہو۔"

"اور تم؟"

"چھوڑو یار۔" کوئی اور بولتا ہے۔ "مثبت بات مت کیا کرو۔ مزا منفی باتوں میں ہی آتا ہے۔ کال دو کال ——"

"یہ سالا شوربا آج پھر خراب ہے۔"

"مکھن اور لاڈ۔ مرغی اور لاڈ۔ کیا یار اتنا بڑا نام اور کل پانچ کورس کا کھانا ہے۔ امریکہ میں تو ——"

"ارے یہ پورا ملک ہی بوگس ہے۔ یہاں تو آدمی وقت عزت کے ساتھ گذار دے تو بہت ہے۔ اب آج دیکھا تم نے ہمارے لئے کیسی پرانی موٹریں آئی تھیں اور بس تو جیسے کھڑ کھڑ کر رہی تھی ہم دور سے ہی دیکھ کے بھاگے۔"

ملتان پہ ایک لاکھ آدمی جلسے میں آئے۔ انکے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انہوں نے اس دن کپڑے بھی بدلے تھے۔ معمولی مگر اُجلے کپڑے۔ وہ صحت مند تھکے ہوئے لوگ اس اکیلے آدمی کی ہر بات خاموشی سے سن رہے تھے۔

بے یقین بہت خفا تھا۔

"یہ اتنے سارے لوگ کیوں اس قدر بے وقوف ہیں۔ کیوں آئے ہیں؟ اتنے آدمی تو ساری پولیس، ساری بسیں، ساری گاڑیاں بھی جمع نہیں کر سکتیں ضرور یہ لوگ خود آئے ہیں اور اسی لئے یہ بیوقوف ہیں۔"

"کیوں؟" خوش گمان مسکرایا۔

"اسلئے کہ اس ملک میں پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور کل گیارہ آدمیوں کے ہاتھ میں سب اختیار آگیا ہے اور یہ لوگ خوش ہیں۔ کیا انہیں خوش ہونا چاہئے؟"

"تم ناخوش ہو؟"

"ہاں"

"اگر تم کو ناخوش ہونے کا حق ہے تو انہیں خوش ہونے کا حق بھی ہے۔ تمہارا ان کا ووٹ برابر کا ہے نا۔"

"تم جاہل آدمی ہو۔ جانتے ہو تم جاہل آدمی ہو۔"

"مگر یہ آٹھ کروڑ ہیں۔ یہ اکثریت میں ہیں۔ تم دس ہو یا بیس ہو۔ تم کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کے شیر ہو جہاں تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ تم دن بھر کی تھکن نفرت خیزی، تیزی طراری اور فقرے بازی سے دور کرتے ہو اور یہ راتوں کو بھی دنوں کے بوجھ اٹھائے بے خواب نیند یا سوتے ہیں۔ انہیں اچھے فقرے بولنے بھی نہیں آتے۔ انہیں تمسخر، استہزا، طنز کا کام بھی نہیں آتا۔ جانتے ہو تم کیا چاہتے ہو اور یہ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، ذرا بتاؤ تو۔"

"تم اپنی آگ میں جلتے رہنا چاہتے ہو۔ تمہارے اندر دماغی بے چینی کی آگ ہے اور یہ بڑی اچھی بات ہے، مگر تم اس کا استعمال

...مہور یہ اسپیشل

...ریب آنے ، ان کی مشکلات
...کا حل تلاش کرنے ، نیز
...ریب کا مقصد عوام کو
...لئے صدر ایوب نے ملک
...ہوں کا دورہ کیا جہاں عوام
...پناہ جوش اور مسرت و
...کا استقبال کیا

کراچی سے روانگی

صدر ایوب کی تقریر سننے کے لئے دور دور سے آئے ہوئے عقیدت مندوں کا ہجوم

عوام کی دلی مسرت کا ایک مظاہرہ

...ے سب ہی صدر ایوب تک پہنچنے کے لئے بیتاب

پاک جمہوریہ اسپیشل :

اس سفر کا سب سے دلچسپ اور مفید پہلو سوال و جواب کی وہ بے تکلف محفلیں تھیں جن میں صدر ایوب نے لوگوں کے ہر قسم کے سوالوں کا بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا

مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی عوام کا وہی بے پناہ جوش و خروش تھا

نہیں جانتے۔ جانتے ہو تو کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اس میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ تم محنت نہیں کرنا چاہتے۔ تم کو ایک گز زمین ملے تو ہزار گز مانگو گے اور ہزار گز ملے تو دس ہزار گز مانگو گے۔ مگر نہ تم ایک پر کام کرو گے نہ ہزار پر، تم صرف باتیں کرو گے۔ باتیں دلچسپ اور تیز باتیں۔ ناک چڑھا کر ادنہہ، کہہ دینے میں جو خود لذتی کا چسکا ہے۔ وہ کام میں نہیں پڑتا۔"

"ہوں۔ تو ہم بات نہ کریں۔ اب بات پر بھی پابندی ہے؟"

"نہیں۔ تم باتیں بنائے جاؤ۔ یہ لوگ کام کئے جائیں گے۔ پھر تم مر جاؤ گے اور یہ لوگ بھی مر جائیں گے اور دوسرے لوگ آ جائیں گے جن میں سے کچھ باتیں بنائیں گے اور کچھ کام کریں گے اور پھر ——"

"ہوں۔ تو بھئی کام سے کیا مطلب ہے تمہارا۔ یہ نہروں وہروں کا کام۔ پاور ہاؤس، چھوٹی بڑی صنعتیں، پل، مسجد، چاہ، تالاب، خیر کے اسباب چاہتے ہو تم۔ فصلیں اچھی ہو جائیں۔ خوراک میں خود مکتفی ہو جائیں ہم۔ ہے نا۔ یہی چاہتے ہو؟ کشمیر وشمیر مل جائے۔ زرِ مبادلہ جمع ہونے لگے۔ بیلنس آف پے منٹ۔ بیلنس آف پیمنٹ پر مر رہے ہو۔ سڑکیں بناؤ گے، ریلیں زیادہ ہوں، اسٹیمر زیادہ ہوں، جیٹ چلنے لگیں، کاغذ عمدہ بنے، تعلیم عام ہو۔ یہی کام ہیں نا؟"

"اس وقت تو یہی کام ہیں۔"

"بس؟"

"بس۔"

"اور دل و دماغ کہاں جائیں؟"

"اپنی اپنی جگہ رہیں اور کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دو نا۔"

"ہوں! اور ان سب چکروں میں گیارہ آدمیوں کا چکر چل رہا ہے اور یہ ایک اکیلا آدمی جو چاہے کرے۔"

"کام بھی تو اس ایک اکیلے آدمی نے شروع کیا ہے اور اب تو پھر الکشن بازی چل پڑی ہے۔ الکشن لڑو نا تم۔ کونسل میں آؤ، ضلع میں آؤ، صوبے میں آؤ اور پھر مرکز میں آؤ اور پھر جو جی چاہے کرو۔ باقیوں کو اپنے ساتھ ملاؤ پھر جہاں جو چیز غلط سمجھو اسے رد کر دو۔"

"کیسے رد کر دو؟"

"اپنی اکثریت بنا کر۔ اپنی پچھتر فی صدی اکثریت سے تم تنہا دستور بنا لینا۔"

"یار اب تم بھی ایسی باتیں کرتے ہو۔"

اب خوش گمان غصے میں آ جاتا ہے۔

"دیکھو میرے بے یقین بھائی! مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس لفظوں کی بڑی کمی ہے۔ میں اور زبانیں نہیں جانتا نہ معلوم ان میں کیسے بات کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں دقت یہ ہے کہ مشکل تہ دار لفظ بہت کم ہیں اور ہم سادہ الفاظ بولتے ہیں۔ سادہ الفاظ پوچ اور گھٹیا معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً میں کہوں کہ ملک میں کام کی ضرورت ہے تو یہ بڑی سطحی اور بوگس بات لگتی ہے اور تم اپنی اکسفورڈ اور کیمبرج اور ہارورڈ کی تعلیم یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ہو تمہیں بڑے بڑے مقررین یاد آ جاتے ہیں بڑی بڑی کتابیں تمہاری آنکھوں کے آگے ناچنے لگتی ہیں اور تم یہ بھولے رہتے ہو کہ تم کس سرزمین پہ کھڑے ہو۔ تم یہ بھولے رہتے ہو کہ یہاں ایک مانچسٹر ایک شکاگو نہیں ہے یہاں تو ٹنڈو آدم اور قصور اور کوہاٹ ہے سنتھاہار دانگکا ماٹی ہے۔

"تم امریکہ گئے ہو؟"

"گیا ہوں"

"تم نے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ دیکھی ہے؟"

"دیکھی ہے"

"تم نے کولمبس کے ساتھ سفر کیا تھا"

"کیا مطلب! یہ کیا بکواس ہے؟"

"تم نہیں تھے نا اس کے ساتھ۔ بس تو تم نہیں جانو گے کہ کولمبس سے آئزن ہاور تک لوگوں کو کیا کچھ کرنا پڑا۔ تم تو تین ڈالر میں ایک کتاب خرید و گے جس میں اسپوتنک دور میں عالمی سیاسی پیچیدگیوں کی قسمیں بتائی گئی ہوں اور وہ پڑھ کر تم غمزدہ ہو جاؤ گے کہ کاش اس ملک میں ان میں سے آدھی پیچیدگیاں ہی پیدا ہو جاتیں تاکہ تمہاری شامیں اور بیر پارٹیاں اور کاک ٹیل پارٹیاں اچھی گذرتیں۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ پورا ملک گھنے جنگلوں سے بھرپور امریکہ کی طرح پڑا ہوا ہے جس میں آٹھ کروڑ کولمبس گھوم رہے ہیں اور تم ان سب آٹھ کروڑ کولمبسوں کے سر پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہو جانا چاہتے ہو کہ وہ جدھر جائیں تم دوسری طرف موڑ دو

میری بات مانو گے؟

"کہو، ماننا نہ ماننا تو میرے اختیار میں ہے"

"تم اپنے تسمے جیسے پاؤں ڈھیلے کرکے انگور کے کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھکر کاک ٹیل پیو اور کتابیں پڑھو — تم نے بارہ برس ایک تماشہ دیکھا۔ اب بارہ برس نہیں تو پانچ برس اور سہی۔ جو آدمی کام کرتا ہے وہ اپنے طریقے سے کرتا ہے۔ دوسرے کے طریقے سے نہیں کرتا۔ تم ابھی ذرا ان پڑھ جانوروں کو آدمی بنا لینے دو، نہریں بہنے دو، پاور ہاؤس لگنے دو، صنعتیں جاری ہونے دو، تعلیم پھیلنے دو، مہاجروں کو بسنے دو، زمینداری ختم ہونے دو تم آرام سے بیٹھو۔ جو کام کر رہے ہیں انہیں کام کرنے دو، پہلے گھر بننے دو، پھر گھر آراستہ کرنے کی باتیں کرنا۔ اس زمین پر بنیادیں پڑے پڑے چیخ گئی تھیں — معاف کرنا میں ایک ملکی زبان میں بول رہا ہوں —"

"بولے جاؤ۔ میں نہیں سن رہا!"

کوئی آدمی اکیلے آدمی کے ساتھ نہیں تھا اور ہوتا بھی تو اسکے ذہن کی تصویر کیسے لیتا؟ مگر خوش گمان نے اوپر لیٹے لیٹے ایک کیمرہ بنایا اور اس طرف لگا دیا جدھر وہ اکیلا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک پردے پر اس کی تصویر ابھری۔ اس نے دیکھا کہ وہ اکیلا آدمی یا تو پڑھتا ہے یا سوچتا ہے یا کام کرتا ہے یا سوال و جواب کرتا ہے۔ اس اکیلے آدمی کے سامنے آٹھ کروڑ چہرے ہیں جن میں سے کچھ پر نفرت اور حسد کے آثار ہیں اور کچھ خوشی سے تمتمائے ہوئے ہیں اور باقی بے رنگ، بے کیفیت چہرے جیسے اپنے تاثرات کے منتظر کھڑے ہیں اور انہیں جیسے جیسے تاثرات ملتے جاتے ہیں ان کا اظہار ہوتا جاتا ہے۔ وہ اس اکیلے آدمی کا کام دیکھ رہے ہیں اور وہ اکیلا آدمی کام کر رہا ہے، اس کے ذہن کے کئی خانے ہیں کسی میں ماضی ہے کسی میں حال، کسی میں مستقبل کسی میں اسکیمیں کسی میں تجزیے، کسی میں انتظامی پیچیدگیاں۔ وہ یہ صاف طور پر جانتا ہے کہ اس نے روایات کے خلاف بغاوت کی ہے اور لوگ روایات کے باغیوں سے بدکتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ایک عام آدمی ہے اور ایک نہ ایک دن مر جائے گا اور اگر وہ بغاوت نہ کرتا تو اسے چند لوگ ضرور روتے اور کوئی خوش نہ ہوتا مگر اب یا تو آٹھ کروڑ آدمی روئیں گے یا آٹھ کروڑ آدمی خوش ہوں گے۔ اور یہی آٹھ کروڑ نہیں بلکہ اگلے آٹھ کروڑ یا دس کروڑ اور ان سے اگلے آٹھ یا دس کروڑ اسے اچھے یا برے لفظوں سے یاد کریں گے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک سچائی بھی ہوتی ہے جو نہ کسی کے رونے سے فروغ پاتی ہے نہ کسی کے ہنسنے سے مٹ جاتی ہے۔ اور یہ کہ اسے اس سچائی کی تلاش کرنی ہے۔ وہ یہ سب جانتا ہے اور اسی لئے اپنے بے حد و بے حساب اختیارات کے باوجود انہیں جذبات سے مغلوب ہو کر استعمال نہیں کرتا۔ وہ کھلے اعتراض سنتا ہے اور ڈھکے چھپے مخالفوں سے بھی واقف ہے۔ خوشامدیں اس کے گرد حصار ڈالے جاتی ہیں۔ طنز و تشنیع اس کے گرد الاؤ جلائے ہوئے ہیں۔ اس کا ملک اسے دیکھ رہا ہے۔ دوسرے ملک اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے پیچھے تاریخ ہے۔ شاندار، پُر وقار، دولت مند تاریخ جہاں سے اسے سقراط، ارسطو، ڈیکارٹ، کارل مارکس جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے سامنے بھی تاریخ ہے جس میں ہزاروں پلوٹارک، ہزاروں طبری، ہزاروں ملا بدایونی، ہزاروں گبن، ہزاروں ہیٹی نظر آتے ہیں۔ وہ سقراط اور ارسطو کو بھلا سکتا ہے، مگر پلوٹارک، طبری اور بدایونی اور گبن کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا جو اس کے بعد اسکی تاریخ لکھیں گے، نہ وہ اس طاقت کو دھوکہ دے سکتا ہے جو اس سے بڑی بڑی طاقتوں کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے اور جس کا نام عرفِ عام میں خدا ہے۔ خدا جو ماضی، حال اور مستقبل کا نام ہے، جو فوجوں، جہازوں، بموں اور دلیلوں کو لمحہ بھر میں خاک کر دیتا ہے، جسے نہ ماننے والے بھی اس کے مختلف نام رکھتے رہتے ہیں اور ان ناموں کو اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ خدا، چانس — اتفاق، واہمہ، لاعلمی۔ وہ کچھ بھی ہو، وہ ہے اور یہ اکیلا آدمی جانتا ہے کہ وہ ہے۔ اور وہ اس کے آگے اپنی ایک ایک بات کا ذمہ دار ہے کیونکہ اب وہ آٹھ کروڑ آدمیوں سے متعلق ہے جو حال اور مستقبل کی امانت ہیں اور جن سے کھیلنے والوں کے انجام اچھے نہیں ہوئے۔ اس نے اپنی پشت پر آٹھ کروڑ آدمیوں کا بوجھ اٹھا لیا ہے اور ایک ایک قدم ناپ تول کر چل رہا ہے۔

خوش گمان، بے یقین کی طرف دیکھتا ہے جو آرام سے سو رہا ہے۔

اس کا سلکن لحاف ایک طرف ہو گیا ہے۔ اس کی سونے کی گھڑی پاس رکھی ہے۔ اس کا پارکر قلم اور "اسپوتنک دور کے مسائل" بائیں ہاتھ کو ایک خانے میں رکھے ہوئے ہیں۔ بیئر کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی ہے جس سے گوناگوں فلسفوں کی جھلکیں آ رہی ہیں۔

"زندہ باد!"

"پائندہ باد!"

فرید پور میں ایک لاکھ آدمی جمع ہیں۔ سنتھا ہار میں پچاس ہزار۔ گوالندو کی بندرگاہ سے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی کشتیاں میری اینڈرسن اسٹیمر کے ساتھ ساتھ چل پڑی ہیں۔ ان میں مشعلیں جل رہی ہیں۔ بنگالی ماہی گیر اکیلے آدمی کو اچک اچک کر دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں۔ انہیں دلوں کے چراغ درکار ہیں اور دلوں کے چراغ اچھے بھات اور اچھے پٹ سن اور اچھے نیشکر سے جلتے ہیں۔ ایک وعدے ایک پیغام، ایک سیاسی داؤ، ایک نیشنل اسمبلی سے نہیں جلتے۔ ایک غزل سے نہیں جلتے۔ ایک افسانے سے نہیں جلتے۔ ان کا مخزن کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس اور پریس کلب نہیں ہے۔ نہ کالج ہے نہ یونیورسٹی۔ یہ چراغ معدے کی تہوں کے خلا پر کرنے سے جلیں گے۔ ان کے معدے میں چربی چاہئے جس کے لئے زر مبادلہ چاہیئے۔ جس کے لئے سمگلنگ کم اور پیداوار زیادہ کرنی پڑے گی جسکے لئے سیاسی استحکام ضروری ہے جس کے لئے یہ اکیلا آدمی بہت دن منتظر رہا اور جس سے بے یقین خوش نہیں ہے کیونکہ اس کی کافی بدمزہ اور چائے ترش ہو گئی ہے اور ملک میں ترقیاتی منصوبے بنا کر ان پر عمل بھی کیا جا رہا ہے لیکن اخباروں میں چٹپٹے اداریئے نہیں ہیں، سیاسی پارٹیوں کی لڑائیاں نہیں ہیں جن سے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں کی جلا ہوتی تھی۔ نئے بے نام نشان لوگ اوپر چڑھ آئے ہیں اور کام کام پکارتے ہیں اور ایک آدمی پچاس برس کی عمر میں کام بتانے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

ٹرین جا رہی ہے۔

ٹرین بنگال کے سبزہ زاروں سے گزرتی ہے۔ پھر قافلہ اسٹیمر میں چلتا ہے، پھر ہوائی جہازوں میں اڑتا ہے۔ بے یقین کو یہاں بھی وہ نشست ملی جس کی کھڑکی جہاز کے پر کے اوپر کھلتی تھی۔ بے یقین، چٹاگام سے ڈھاکہ تک ایک خوشنما منظر سے محروم ہے اور کھول رہا ہے، اچھی نشست ایک چھٹ بھیئے صحافی نے دبالی ہے جس کی تنخواہ دو سو روپے ہے اور جو صرف بنگلہ جانتا ہے اور ایک موٹا بے استری کیا ہوا کوٹ پہنے ہوئے ہے اور برابر باتیں کئے جاتا ہے۔ اور بے یقین کی آمد تی اسے کھائے جاتی ہے۔ اس نے اپنی کتاب مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی ہے اور الفاظ خالی خولی اس کے آگے گھوم رہے ہیں کیونکہ اصل میں وہ اپنی خراب نشست سے جل رہا ہے اور اس صحافی کا دشمن بن گیا ہے۔

ہوائی جہاز اترتے ہیں اور لوگ موٹروں اور بسوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اسٹیمر چلنے لگتے ہیں۔ غیر ملکی لوگ حیران ہیں۔ وہ ایک ایک بات نوٹ کرتے ہیں، وہ منتظر ہیں کہ کوئی ان کو (CULTIVATE) کرنے آئے کوئی ان سے لجاجت آمیز گفتگو کرے اور ان کی "ہمدردیاں" حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک ایک لفظ کا ترجمہ سنتے ہیں، ایک ایک سوال اور ایک ایک جواب کا اقتباس لکھتے ہیں، وہ بڑے بڑے مجمعوں کو پریشان نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کہیں کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی شورش نہیں۔ یہ وہ ملک ہے جہاں سائمن واپس جاؤ، ٹرلوک واپس جاؤ کے نعرے لگ چکے ہیں، جہاں زبان تک کے معاملے پر گولیاں چلی ہیں، جہاں ایک فلیتہ بڑے بڑے پہاڑوں کو بھک سے اڑا دیتا ہے۔ یہاں سب لوگ اس سے خوش کیوں ہیں؟

"کیا یہ سب لوگ نامرد ہو گئے ہیں"

"نہیں، کام میں لگ گئے ہیں"

اکیلا آدمی جذباتی باتیں نہیں کرتا۔ اس بات سے خوش گمان بھی خوش نہیں ہے۔ وہ سیدھی سیدھی باتیں کرتا ہے وہ کام کیلئے کہتا ہے۔ اس نے ایک نیا جمہوری تجربہ کیا ہے اور اس تجربے کی تبلیغ کر رہا ہے۔

تجربے اور ایجادیں اکیلے لوگ ہی کرتے ہیں اور ایسے آدمی کو شروع میں بھی کشٹ اٹھانے پڑتے ہیں اور جو اس کے ساتھ ہوں نہیں طرح طرح کے الزام لگتے ہیں اور پھر یہ سب ختم ہو جاتا ہے اور تجربہ کامیاب ہو کر سب کی رگ و پے میں جاری ہو جاتا ہے۔ وہ دور میں جس کے لئے کوئی سولی پر چڑھا دیا گیا، وہ کیا ہیں جن کے لانے والوں

کو پتھر مارے گئے، وہ یونیورسٹی جس کے بنانے والے کا مدتوں مذاق اڑایا گیا تو وہ سب آج جاری و ساری ہیں مگر معترضین آج بھی چولے بدل بدل کر چلے آ رہے ہیں۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء تک کتنے بے یقین خوش گمان بن گئے — شاید لاکھوں کروڑوں۔

مگر بے یقین باقی رہے گا۔ بے یقین کا باقی رہنا ضروری ہے۔ جتنا خطرہ خوش گمانوں کے لئے ہی نہیں ہے۔ بے یقینوں کے لئے بھی ہے ان کے بغیر خوش گمانی کا وجود نہیں رہ سکتا۔ اکیلے آدمی کو بھی بے یقین چاہئیں۔ اکیلا آدمی کھیتوں، قصبوں، شہروں میں کام کرتا رہے گا اور کافی ہاؤس میں اس پر اعتراض ہوتا رہے گا اور کھیت ہرے بھرے ہو جائیں گے اور مل بننے لگیں گے اور سڑکیں نکل آئیں گی اور زر مبادلہ بچنے لگے گا اور تعلیم عام ہو جائے گی اور — اور کافی بدمزہ ہوتی رہے گی اور چائے تلخ۔ زندگی بہت گوناگوں چیز ہے۔

اکیلے آدمی! تم کام کرو۔ ہم اعتراض کریں گے۔ ہم تعریف بھی کریں۔ مگر ہم کو اعتراض میں مزہ آتا ہے اس طرح ہمارے دوست ہماری عزت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں دانشمند اور بے چین جاننا ہی پسند کرتے ہیں ورنہ وہ ہمیں پسند نہیں کرتے کیونکہ ہم اسپوتنک دور کے سیاسی مسائل" کے طالبعلم ہیں اور ہمیں دہقانوں، مزدوروں، بیواؤں، یتیموں، محتاجوں سے دلچسپی اتنی ہی ہے کہ ہم ایک نظم کہدیں یا مضمون لکھدیں یا اداریہ کھینچ دیں ہم نہ ان میں سے ہیں نہ ان کے مسائل سے گتھے ہوئے ہیں۔ تم ان کے لئے کام کرو اور ہم تم پر اعتراض کریں گے۔ اعتراض انسان کی جبلت ہے اعتراض اور شکایت کے سوتے خشک ہو جائیں تو انسانی ارتقا ختم ہو جاتا ہے۔ تم کام کئے جاؤ ہم باتیں بناتے جائیں گے۔ ہمیں نوکری دو گے تو وہ لے لیں گے، سیاحت کراؤ گے تو خوشی سے کریں گے، الکشن لڑواؤ گے تو خوشی سے لڑیں گے، ہم کو سب مراعات چاہئیں، ہم کو سب فوائد درکار ہیں، ہم کو سب وظیفے، نقدیاں، انعامات، سب کچھ چاہئے وہ ہم ہر ایک سے لیتے رہے ہیں اور تم سے بھی لیں گے اور دو گے تب بھی باتیں بنائیں گے اور نہ دو گے تب بھی۔ ہم اپنا الگ کلچر رکھتے ہیں اور وہ ہے کافی ہاؤس کلچر۔ ہمارا کلچر ہمیں ٹھہر کر سوچنا اور کام کرنا نہیں سکھاتا۔ کام سے بھی کہاں یعنی ہماری مرضی کا کام کیونکہ کام تو ہم اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً ہم سب صدر پاکستان ہونا چاہتے ہیں یا کم از کم محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائرکٹر ہونا چاہتے ہیں اور ہم میں سے جو جو کچھ بنتے جائیں ان کو برا بھلا کہنا چاہتے ہیں اور جو کوئی آدمی کوئی مثبت بات کرے اسے خوشامدی، ٹوڈی، جاہل، زمانہ ساز، خودغرض اور بہت عزیز ہوا تو مجبور، غریب، محتاط کہکر دل ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں منفی لہریں مثبت لہروں سے زیادہ جلد کھینچ لیتی ہیں۔

ہم بیس برس پہلے پاکستان کے نعروں سے بھی ایسے ہی دل برداشتہ تھے جیسے آج نئے پاکستان کے وجود سے ہیں ہم اسوقت جناح اور لیاقت کا مذاق اڑاتے تھے اور ان پر صبح و شام اعتراض کرتے تھے ہمیں اپنی کافی، اپنی چائے کے لئے ایندھن چاہیئے۔ اکیلے آدمی ہمارا ایندھن سب بڑے اور چھوٹے لوگ ہیں۔ ہم کنفیوشس کو ذرۂ بے مقدار سمجھتے ہیں۔ ہم گوتم بدھ کو گاؤدی ملائم آدمی کہتے ہیں۔ ہم نے مسیح کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔ ہم نے محمدؐ کے پتھر مارے تھے ہم نے بڑے بڑے فلسفیوں کو تاریک کوٹھریوں میں بند کرا دیا اور ان کی کتابیں تک جلا دیں ہم نے مارکس کو جلا وطن کر دیا۔ ہم ہر نئی بات سے بلکہ ہر بات سے چراغ پا ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ہم آئزن ہاور اور خروشیف، دونوں کو حقیر فقیر ناچیز سمجھتے ہیں۔ ہم تمہیں نہیں مانیں گے۔ ہم تمہیں مانیں تو ہماری کافی ٹھنڈی ہو جائے اور ہمارے دل و دماغ کھردری زمینوں کی طرح سوکھ جائیں۔ ہم اپنے گھروں میں بیرے اور خانساماں رکھنا چاہتے ہیں اور جب وہ مل جائیں تو ہم انہیں دال کھلا کر خود مرغی کھاتے ہیں۔ اور نہ ملیں تو دال کھا کھا کر پورے معاشرے، پوری دنیا کو گالیاں دیتے ہیں۔ تم جو چاہو کرو، ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تم کیوں کر رہے ہو؟ تم نے زمینداری ختم کر دی تو ہم نے اس میں کیڑے نکالے۔ تم ختم نہ کرتے تب بھی ہم کیڑے نکالتے۔ اب تم بنیادی جمہوریت کا تجربہ کر رہے ہو تو ہم اسے برا ہی کہیں گے جب وہ کامیاب ہو گیا تو ہم اس کے فوائد اٹھائیں گے اور پھر کسی؟ اور بات کو برا کہیں گے۔ تم ٹرین چلاؤ تو ہم اس پر تمہارے ساتھ چلیں گے اور سیر کریں گے اور دن کو اچھے اچھے کھانے کھائیں گے

اور شام کو اعتراض کریں گے۔ یہ ہماری خلط میں ہے، یہ ہمارا مزاج ہے، یہ ہماری زندگی ہے۔ یہ پشتوں کا فرق ہے۔ ہم کو کام ملے ہم کو اعتراض نہ ہو ہم اپنا اپنا کام کئے جائیں۔

مغربی پاکستان کی ریتیلی ڈھری سہمی اور مشرقی پاکستان کی سرسبز و شاداب اور فاقوں ماری زمین پر یہ قافلہ سولہ دن چلا اور اس میں کوئی پچاس لاکھ آدمی شریک ہوئے یعنی وہ جنہوں نے اکیلے آدمی کی تقریریں سنیں، اسے دیکھا اور اس سے سوال و جواب کئے۔ اور وہ جو اسے دیکھنے سرد راتوں میں بیل گاڑیوں اور چھوٹی کشتیوں میں اور پیدل پچاسیوں میل سے چل کر آئے اور پھر اسے نہ دیکھ سکے مگر پھر بھی ان کے تلووں کے کانٹے اور چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں اور طویل و عریض دریاؤں کی لہریں گواہ ہیں کہ۔ اس قافلے میں ان کے دل شریک ہوئے۔ سو یہ سب کچھ پچھلے دو مہینے میں ہوا اور آٹھ کروڑ آدمیوں پہ پھیل گیا اور یہ سب اس لئے ہوا کہ ڈیڑھ برس سے اس ملک میں ایک نیا اور اکیلا آدمی کام کرنے اٹھ کھڑا ہوا ہے جس نے بہت سے مسائل حل کر دئے ہیں اور بہت سے مسائل حل کرنا چاہتا ہے۔

اور۔ اور اس اکیلے آدمی کو دو بے نیاز تجربہ کار بے خوف اور با اختیار جج بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں اور وہ ہیں:

خدا اور مستقبل! خدا اور مستقبل!!

٭

تو نگارم معنیٔ جمہوریت ٭ تو مبینی و حکایت نابیت
ترکیے بینی زرہ گشتہ ٭ لازم آید چارۂ سرگشتہ
پیش جام گفتنِ حق شد جہاد ٭ نے ز حق بستن بیفزاید فساد
پس چہ موسیٰ فاش با فرعون گو ٭ بندگاں را رستگاری باز جو
بر کرخشہ باز بتوانند برد ٭ کرسی اعزاز بتوانند برد
(مثنوی صداقت ۱۹۵۲ء)

خزاں سے بہار تک

بشیر فاروق

یاد ایام کہ تھا ذہنِ سیاست بیمار
یاد آیا ہے کہ مفلوج تھا ہر جذبۂ کار
تھا کوئی گیسوئے سلطانِ قیادت کا اسیر
تھا کوئی صوبہ پرستی کی اداؤں کا شکار
کوئی منصب کے لئے بیچ رہا تھا غیرت
تھا کوئی لیلیٔ مخلوط نیابت پہ نثار
نعرۂ ملتِ پختون کسی کو مرغوب
بھول بیٹھا تھا کوئی ربط و اخوت کا شعار
جان دیتا تھا حریفانہ ادا پہ کوئی
تھا کوئی اپنی وفاؤں کے سبب قابلِ دار
خون انسان کا انساں یہاں پیتا تھا
بندۂ جبر کو جینا بھی ہوا تھا دشوار
ملک و ملت کی وہ تقدیر بنے بیٹھے تھے
جن کا مسلک تھا، نہ ایماں تھا نہ کوئی کردار
ان کے افکار سے نالاں تھے سراسر جمہور
ان کے اطوار سے تھی ساری خدائی بیزار
خود اسی قصر کی بنیاد کے درپے تھے یہ لوگ
آہ جس قصر کے تھے قائد اعظمؒ معمار
ہم وہ ناداں کہ انہیں پیرِ مغاں سمجھے تھے
جو نہ میکش تھے نہ ساقی تھے نہ پیمانہ گسار
بانکپن چھین لیا عہدِ خزاں نے ہم سے
لوٹ لی بادِ مخالف نے گلستاں کی بہار
چشمِ افلاک سے حالات یہ دیکھے نہ گئے
اس سے دیکھا نہ گیا عظمتِ ملی کا فشار
ناگہاں قسمتِ اربابِ وطن جاگ اٹھی
کام آکر ہی رہی دردکے ماروں کی پکار
کشورِ پاک کی بدنام سیاست بدلی
شکر صد شکر کہ ناکام قیادت بدلی

سیّارۂ گیتی خرام

جمیل نقوی

زمزمے سلطانیِ جمہور کے گاتی ہوئی
یوں چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نشۂ جمہوریت میں ہر قدم پر جھومتی
میکشانِ حُرّیت کو وجد میں لاتی ہوئی
راز بتلاتی ہوئی آزادیٔ جمہور کے
جذبۂ احساسِ خودداری کو گرماتی ہوئی
مضطرب کرتی ہوئی نخوت پسندوں کے ضمیر
شر پسندوں کے دلوں پر تیر برساتی ہوئی
اپنے اعمالِ گذشتہ سے ہوں خود ہی شرمسار
خود غرض شکلوں کو یوں آئینہ دکھلاتی ہوئی
سرکشوں کو سرنگوں کرتی درِ احساس پر
زعمِ باطل توڑتی فتنوں کو ٹھکراتی ہوئی
دشت و صحرا سے گذرتی بستیوں پہ ٹھیرتی
گلشنِ مِلّت کے ہر غنچہ کو مہکاتی ہوئی
لہلہاتی کھیتیوں کو بخشتی حُسنِ دوام
وادیٔ مہران کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی
پنجند کی نقرئی لہروں سے موتی رولتی
راوی و جہلم کی موجیں رقص میں لاتی ہوئی
سینۂ آبِ رواں پر ڈولتی مستانہ وار
سرزمینِ ریشۂ زرّیں کو لچکاتی ہوئی
چائے کے باغوں کے ڈھلوانوں کے زیر و بم کی سانس
بھینی بھینی خوشبوؤں کو اور پھیلاتی ہوئی
دھان کے کھیتوں کی ہریالی پہ نظریں ڈالتی
سبز پرچم کے تقدّس کی قسم کھاتی ہوئی
شاعرِ مشرق نے جس کے واسطے کی تھی دعا
ہاں! وہی نورِ بصیرت عام فرماتی ہوئی

اے نقیبِ حُرّیت، اے داعیِ امن و سلام
اے نفیرِ انقلاب، اے دشمنِ کہنہ نظام
اے نسیمِ جانفزا، اے کاشفِ رازِ چمن
اے صبا رفتار قاصد، اے سفیرِ تیز گام
اے سریع السیر پیکر، اے نشانِ اتحاد
اے امیدِ قوم، اے سیارۂ گیتی خرام
اے دلوں کو درس دیتی، عزم کا تنظیم کا
اے نشیدِ حریت، اے نعرۂ قلبِ عوام
کوہ پیما زلزلوں کا ہمہمہ تیرا سکوت
برق آسا ولولوں کو تیرے سینہ میں دوام
تجھ سے بینا دیدۂ تہذیب و چشمِ ارتقا
تو نے انساں کو سکھایا، زندگی کا احترام
تجھ سے باطل، اہلِ باطل کی ستم آرائیاں
تجھ سے برہم دشمنانِ ملک و مِلّت کا نظام
تیری ہیبت سے ہے زلفِ فکرِ کاذب منتشر
تجھ سے آساں اہلِ دانش پر جنوں کا اہتمام
تو نے ثابت کر دیا ہے با ہزاراں انقلاب

یوں زمانہ تھام لیتا ہے مقدر کی زمام
تو نے گرمایا فسردہ دل جوانوں کا لہو
تو کہ ہے نغمہ بہ لب، شعلہ بجاں، آتش بجام
تیرے پرتو سے چراغاں اتحادِ شرق و غرب
تیرے جلووں سے فروزاں اعتبارِ صبح و شام
تیرے محور پر لچکتی ہے کمر اقتدار کی
تیرے مرکز پر سمٹتا ہے زمانہ کا نظام
تو ہے شکوہ سنجِ افتادِ جمودِ عصر سے
زندگی تیرا ترانہ، آگہی تیرا پیام
تو نے انساں پر کئے ہیں فاش اسرارِ حیات
ہے ترا ایک اک نفس عہدِ عمل انساں کے نام
تیرا مسلک اک نئی جمہوریت کی ابتدا
تیرا مقصد ملک میں اقدارِ صالح کا قیام
رہروِ درماندہ پا کے واسطے مہمیز ہے
تیرے نغموں میں حدی خوانوں کا سوزِ ناتمام

ہم نے دیکھے ہیں زمانہ کے ہزاروں انقلاب
رہزنی کا جوشِ مستی، رہنمائی کا شباب
ہر طرف چھائی ہوئی تھی اک بھیانک تیرگی
زندگی تھی یا سرِ شب نیم دیوانہ کا خواب
مسکراتی تھی زلیخائی ہوس دینار پہ
یوسفِ عصمت سرِ بازار رسوا، بے نقاب
لیلیٰ احساسِ خود داری کا چہرہ خونچکاں
سینۂ آزادیِ جمہور زخموں سے خراب
بے کسی کی دھند میں لپٹے ہوئے ماہ و نجوم
بے بسی کی ظلمتوں میں بجھ رہا تھا آفتاب
سازشوں پر نازاں ارباب حل و عقد کو
شاطری تھی مدرسوں میں جزوِ تعلیمی نصاب
تُل رہا تھا علم میزانِ عیارِ جہل پر
ثانیِ آئینۂ دانش تھا ہر عزت مآب

غیرت و احساس آغوشِ ہوس میں دم بخود
رقص فرما خلوتِ زاہد میں لیلائے شراب
دوڑتے پھرتے تھے طول و عرضِ پاکستان میں
ایک اُمّت بے پیمبر، کتنے مرسل بے کتاب
جن کا ہر وعدہ شرابی، ہر عمل باد و ہوا
جیسے اک کوزہ میں طوفاں جیسے ساغر میں حباب
دستِ آہن تھا لبِ آزادیِ گفتار پہ
ہر ستم جائز ٹھہرتا تھا بنامِ سدِ باب
کاغذی تھا پیرہن ہر پیکرِ تعمیر کا
ایک منصوبہ تھا ہر لفظِ شکایت کا جواب
طوطی و نقارخانہ کا سماں درپیش تھا
گھٹ کے رہ جاتی تھی ہونٹوں میں نوائے سینہ تاب
پانی پانی ہوگیا تھا اہلِ دانش کا لہو
اُڑ چلی تھی غیرتِ قومی کی تلواروں کی آب
یک بیک گونجی فضاؤں میں صدائے مردِ حق
زندگی کے پاسبانو، زندگی سے اجتناب
جاگ بھی اُٹھو کہ دورِ خود فراموشی گیا!
تابکے یہ بے حسی، تاچند یہ غفلت، یہ خواب!

آؤ مل کر اک جہانِ تازہ تر پیدا کریں
بطنِ شب سے ایک تابندہ سحر پیدا کریں
جن کی تابانی سے روشن ہو فرازِ آسماں
سرزمینِ پاک سے شمس و قمر پیدا کریں
قلب کی گہرائیوں میں بھر کے سوز و سازِ عشق
اپنے نالوں میں قیامت کا اثر پیدا کریں
ڈس رہی ہے زندگی کو میکدہ کی تیرہ رات
جامِ مے چھلکائیں، انوارِ سحر پیدا کریں
بخش دیں جو عزم نصیبوں کو تب و تابِ حیات
قلبِ افسردہ میں وہ برق و شرر پیدا کریں
جن کی نظریں جھانک سکتی ہوں ضمیرِ عصر میں

وہ خودی بیدار، مستقبل نگر پیدا کریں
جن کے اک ادنیٰ تبسم سے بہاریں جاگ اٹھیں
وہ چمن آرا وہ اربابِ نظر پیدا کریں
روحِ آزادی میں بھر دیں گرمیٔ تکمیلِ شوق
سوزِ دل پیدا کریں، سوزِ جگر پیدا کریں

آج پھر بیدار ہے چشمِ تقاضائے حیات
آج پھر حاصل ہے احساسِ غمِ دل کو ثبات
آج پھر دل میں چھلکتی ہے مئے حُبِّ وطن
آج پھر تقدیر نے تدبیر سے کھائی ہے مات
آج پھر دستِ تدبر میں ہے فطرت کی زمام
آج پھر بدلا نظر آتا ہے نظمِ کائنات
آج پھر نشو و نما کی قوتیں بیتاب ہیں
آج پھر گندم کے ہر خوشہ میں غلطاں ہے حیات
آج پھر کھیتوں کی ہریالی ہے فردوسِ نظر
آج پھر دہقاں ہے بے پروائے برقِ حادثات
آج پھر پھولوں کی شادابی سے روشن ہے چمن
آج پھر نغموں سے گونجا ہے جہانِ شش جہات
آج پھر محمود کے شانہ بہ شانہ ہے ایاز
آج پھر سرمایۂ انسانیت ہے حُسنِ ذات
آج پھر فرہاد کا تیشہ ہے سرگرمِ عمل
آج پھر پرویز ہے صیدِ زبونِ ممکنات
آج پھر بیدار ہے وہ نبض جو سکتے میں تھی
آج پھر ہشیار ہیں کہنہ مریضانِ سُبات
آج پھر جمہور کے سینوں کی دھڑکن ہے جواں
آج پھر فکر و عمل پر کھل گئی راہِ نجات
آج پھر فن کار کو آزادیٔ اظہار ہے
آج پھر کھل کر بیاں ہوتے ہیں دل کے واردات
آج پھر دستِ تظلم بستۂ قانون ہے
آج پھر مظلوم کی ہر جا سنی جاتی ہے بات

آج پھر نغمہ بجاں، ہر حلقۂ زنجیرِ عدل
آج پھر انصاف کے پنجہ میں ہے ظالم کا ہات
آج پھر گردش میں ہے پیمانۂ ادراک و عقل
آج پھر ممکن ہے آسانی سے حلِ مشکلات
آج پھر حقانیت ہے سرفراز و سربلند
سربسجدہ آج پھر کعبہ میں ہیں لات و منات
آج پھر دُنیا کی نظروں میں بھرم رکھتے ہیں ہم
جانتے ہیں خوب دنیائے سیاست کے نکات
ہم نے کردار و عمل کے زور پر جیتے ہیں دل
آج سب تسلیم کرتے ہیں ہمارے واجبات
ہم بیاں کرتے ہیں اقوام و ملل کے روبرو
زندگی سے بھی حسیں تر زندگی کے واقعات
نغمہ زن گلزار در گلزار اولادِ خلیل
نوحہ گر بازار در بازار نمرودی صفات

منزلِ صبحِ بہاراں پر نظر رکھتے ہیں ہم
ہر قدم پہلے قدم سے تیز تر رکھتے ہیں ہم
ہر تمنا جادہ پیما، ہر نفس منزل نشاں
رہ نوردِ شوق ہیں عزمِ سفر رکھتے ہیں ہم
وسعتِ کون و مکاں ہر آرزو پر تنگ ہے
منظرِ تازہ بعنوانِ دگر رکھتے ہیں ہم
روحِ آزادی نہیں پابندِ قصرِ زرنگار
مثلِ شاہیں شش جہت پیشِ نظر رکھتے ہیں ہم
گل بداماں ہیں بفیضِ لذتِ خود آگہی
پھول ہونٹوں پر تو سینوں میں شرر رکھتے ہیں ہم
جس کی نظریں دور رس جس کا سخن قند و نبات
اپنی محفل میں ایک ایسا دیدہ ور رکھتے ہیں ہم
جب قسم کھاتے ہیں مردانِ جری کے سامنے
ہاتھ اپنا قبضۂ شمشیر پر رکھتے ہیں ہم

★

صبح در صبح

صہبا اختر

آبشارانہ ستاروں کے شرر کار ضیا بار جزیروں سے گذرتی ہوئی رات
کبھی کرنوں کے سمندر میں رواں اور کبھی چاند کے ساحل پہ ٹھہرتی ہوئی رات
میری محبوب کی زلفوں کی طرح خلوتِ آفاق میں چھپ چھپ کے مہکتی ہوئی رات
نکہتِ گل کی طرح نیلوفری کاہکشاؤں میں نشہ بن کے بکھرتی ہوئی رات
کبھی زہرہ کبھی دامانِ ثریا کبھی ناہید کے آنچل پہ جھپٹتی ہوئی رات
سینۂ مشتری و قلبِ عطارد میں تب و تابِ تمنا سے دھڑکتی ہوئی رات
ہر نفس نیلمیں آفاق کے ہر طاق میں اک شمع کی مانند پگھلتی ہوئی رات
نمِ شبنم کی طرح سرو و صنوبر پہ اُجالوں کے دریچوں سے برستی ہوئی رات
دُور تک انجمنِ خواب میں ہر سانس پہ کلیوں کے تبسم سے چٹکتی ہوئی رات
کبھی اک پھول کی پلکوں پہ سمٹتی کبھی اک شاخ کی باہوں میں لچکتی ہوئی رات
چوڑیوں کی طرح بجتی کبھی اک شوخ کی پازیب کی مانند چھنکتی ہوئی رات
کوئی دیکھے تو ذرا انجم و مہتاب کے زینوں سے سوئے خاک اُترتی ہوئی رات
ہالۂ نور کبھی دائرۂ رقص کبھی سلسلۂ رنگ بدلتی ہوئی رات
نوعروسانہ نئی صبح کی آغوش میں خود گرمیٔ انفاس سے ڈھلتی ہوئی رات

صبحِ افسانۂ افسوں کا بکھرنے لگا ہر شہرِ صبازاد پہ جادو جیسے
پاک ہو رہی، صد روزنِ صد صندلی زمنوں میں خراماں کوئی آہو جیسے
اُفقِ نیلوفری پر رُخِ خورشیدِ درخشاں بھی ہوا رنگِ حیا سے گلنار
دیکھ کر عکسِ رخِ غنچہ دہنانِ جواں سال و حسینانِ چنار و جیسے
صبحِ دم پلک اُٹھے خوابِ سحر گاہی کے نشّوں میں کبھی آنکھ نہ کھلنے والے
ناوک انداز شعاعوں کا ہر اک ناوکِ زرکار ہوا دل میں ترازو جیسے
دور تک پھیلے ہوئے سرد گھنے سبز درختوں کی تگ و تاز کا پیکر، سماں
صورتِ باد، پریشان کسی ساحرۂ خواب کے بکھرے ہوئے گیسو جیسے
گاؤں گاؤں میں نئی دھوپ، نئی چھاؤں، نئے روپ کے ہنستے ہوئے [illegible]
قریۂ شہدلباں، کوئے نگاراں میں بیک وقت اُڑی ایک سی خوشبو جیسے
دم بہ دم غرفۂ آلام سے صد ماہ خورشید کے رقاص [illegible]
زیست افسردہ و مغموم و پریشان و ہراساں نہ رہی ہو کسی پہلو جیسے
جوق در جوق اٹھائے ہوئے محنت کے نشاں، زمزمہ کارانِ دل و جاں موجود
[illegible]

دامنِ سندھ پہ راوی کے فسوں خیز تلاطم کے اٹھائے ہوئے بادل برسے
وہ چراغاں سا ہوا، قہقہے پھوٹے، وہ لب و عارض و رخسار کے کوندے لپکے
جھٹپٹے کا یہ سماں جیسے سرِ وادیِ دل حسرت و امید کی شمعوں کا غبار
یہ کئی ریشمیں زلفوں میں نرم شام کئی آتشیں چہروں میں سحر کے تڑکے
یہ ہمہ رنگ زمیں جیسے کسی خواب کے ارژنگ کے بکھرے ہوئے رنگیں اوراق
یہ چمن زاد فضا جس کے فسوں کار تبسم کے اثر سے دلِ آذر دھڑکے
نشہ و شکر و سرور و مے و مستی کی فضاؤں میں سرِ خاک یہ بارانِ نشاط
شاخ بر شاخ یہ ہر لغزشِ امواجِ صبا بادہ شبنم کے کٹورے چھلکے
وہ ہمہ رقص ہمہ جذب ہواؤں کے لچکتے ہوئے خیموں کی طنابیں ٹوٹیں
وہ فضاؤں کے دھڑکتے ہوئے سینوں سے گھٹاؤں کے مہکتے ہوئے آنچل ڈھلکے
رات تو رات ہے زندانِ مہ و سال کی صبحوں کے دریچے بھی تھے جن سے محروم
ایک خورشید در آغوشِ تصور سے سرِ دامنِ احساس وہ شعلے بھڑکے
دیکھ کر قافلۂ عزم کی آغوش میں صد حلقہ بگوشانِ محبت کا ہجوم
خیر مقدم کے لئے وادیٔ مہران کے ذرات میں سوئے ہوئے سورج چمکے

راوی راوی مرے احساس کے طوفان، یہ بہ ہر دشتِ مغیلاں مری آہوں کے خرام
اے مسافرِ وطنِ پاک کی راہوں کے تجھے مجھ سے رفیقانِ محبت کا سلام
اس مسافت میں ترے ساتھ رہیں مجھ سے وطن دوست فقیروں کی دعائیں بن کر
صبح در صبح شعاعوں کے حنا رنگ شرارے تو ستاروں کے دئے شام بہ شام
ارضِ مہران سے تا وادیٔ کاغان فروزاں ہیں ہر اک دستِ حنائی میں چراغ
صورتِ برق سجانے لگی بنگال کی ہر زلف کو مشاطۂ خورشید خرام
تیری آنکھوں میں ہمہ وقت وطن اور وطن زاد بہاروں کے تصور رقصاں
تیرے ہونٹوں پہ ہمہ وقت محبت کے ترو تازہ کنول گلشنِ جمہور کے نام
قصرِ عشرت کے فلک بوس منارے ترے تیشے کی ہر اک ضربِ گراں سے لرزاں
دشمنِ خاصۂ خاصانِ طرب، کوشش مبارک ہو بہر گام تجھے قربِ عوام
لیکن افلاک سے تا خاک یہ یارانِ مے و کیف بھی اک خواب رہے گا جب تک
ان فسوں زاد و شفق کار بہاروں کو سرِ خاک نہ مل جائے دوام
جگمگا جائے نہ جب تک وطنِ پاک کا ہر گوشہ مسرت کی نئی کرنوں سے
دور ہو جائے نہ جب تک رخِ ایام سے ماضی کی بکھیری ہوئی گردِ آلام
حرفِ آغاز ہے یہ پاک سفر اور ابھی دور بہت دور ہے اس کا انجام
اے مسافر ترا مقسوم نہ راحت نہ کسی سایۂ دیوارِ چمن میں آرام

"رہ نوردِ شوق"

رئیس امروہوی

پلا ساقیا! بادۂ حُسن و نور
مئے پاک و طاہر، شرابِ طہور

کہاں تک یہ جام و سبو کی سبیل؟ — پلا ساقیا! ساغرِ سلسبیل
ترے نام سے ساقیٔ دل نوازا — درودِ عقیدت، سلامِ نیاز
فقط دادِ شوق و تمنّا نہ دے — جو پیماں کیا تھا تو پیمانہ دے
نہ کیوں بزم کی بزم ہو تاک میں — کہ یہ مے نہاں ہے رگِ تاک میں
نئے دور کا استعارا ہے یہ — نئی زندگی کا اشارا ہے یہ

نئی راہ؟ کہہ دورۂ انقلاب
نیا دور؟ یہ دورۂ کامیاب
ترقی کا پردہ کُشا دورِ نو
خوشا دورۂ نو، خوشا دورِ نو

نیا دور جو دورۂ نور ہے — عجب دورِ نو، چشمِ بد دُور ہے
شبِ ہجر آخر بسر ہو گئی — اٹھو سونے والو سحر ہو گئی
مبارک طلوعِ سحر کا سماں — اندھیروں کی اندھیر نگری کہاں
پیئے محتسب کیوں نہ خود بے حساب — کہ ہے دَور مے، دورۂ انقلاب
وہی دولتِ جزو و کل لا کے دے — بغضِ خود ہے مُلّا کہ بن لا کے دے
گُل دیگر از نخلِ مستی شگفت — یہ مفتی کا فتویٰ کہ جائز ہے مُفت
جو بے فیض ہے اس پہ جائز نہیں — قضا اس کی قاضی کو جائز نہیں
[illegible] انقلاب آج دے — کہ جو قلب و قالب کو معراج دے

جہاں منقلب تھا، پئے انقلاب
مئے انقلابی، مئے انقلاب!

ارضِ پاک:

خُم غیر پر تھا کب تک درانہ؟
مئے خانۂ جاں! مئے خانہ سازا

اسی خُم اسی خاک سے عشق ہے — مجھے کشورِ پاک سے عشق ہے
یہی خاک ہے خاکۂ بزمِ جم — اسی خُم کے آگے مرا سر ہے خم

یہ سلسلۂ بنگال و پنجاب و سندھ — یہ دنیائے بنگال و پنجاب و سندھ
وہ بنگال، وہ مشرقی ارضِ پاک
وہ رنگین خطہ وہ گلپوش خاک

ندی پر کنول جیسے پانی میں آگ — مچھیروں کے گیت اور لہروں کے راگ
کناروں پہ گھر کشتیوں پر چھاؤ — وہ ماجھی، وہ موجیں، وہ چپّو، وہ ناؤ
وہ پانی میں بجتے ہوئے جل ترنگ — فضاؤں میں وہ بدلیاں رنگ رنگ
نظر کا فروغ اور دل کا فراغ — وہ دھانوں کے کھیت اور چائے کے باغ
وہ نازک سے بوٹے وہ سندر سے بن — خداداد گُل زار، خود رو چمن
ہر اک دن بہاروں کی فصلِ جواں — ہر اک رات، برکھا کی رُت کا سماں
سماں ایسا پیارا کہ جی لوٹ پوٹ — وہ دریا کی چادر وہ سبزے کی گوٹ
کنول، پھول، برکھا کا بنگال دیس — جہاں آدمی زاد کا اور بھیس
نہ پشتوں کی غربت وہ نسلوں کے دکھ — وہ روٹھا ہوا ان سے صدیوں کا سُکھ
نئی زندگی کی تمنا لئے — دلوں میں خدا جانے کیا کیا لئے
سفینوں کا رُخ ساحلوں کی طرف — رواں ہیں نئی منزلوں کی طرف

اُدھر ارضِ بنگالۂ دل نشیں
اِدھر سندھ و جہلم کی یہ سرزمیں

یہ خطہ، کراچی سے کاغان تک — یہ دُنیا کہ خیبر سے بولان تک
خوشا مغربی پاک کی خاکِ پاک — شفق فام، آئینہ رو، تابناک
وہ آبادیاں جابجا پُرشکوہ — وہ دریا و بحر و بیابان و کوہ
ہوا پاک طینت، فضا خوش نہاد — کہیں حبس و خشکی کہیں برف و باد
کہیں دشت و کہسار، بنجر اُجاڑ — کہیں سبز و شاداب جنگل پہاڑ
مناظر کی جنّت کی شہزادیاں — وہ کشمیر کی لالہ رُخ وادیاں
کہیں غنچہ و گُل، کہیں خار و سنگ — زمیں گونہ گونہ، فضا رنگ رنگ
زبانوں پہ سب کی یہ راوی کا قول — عجب سندھ و جہلم کا ہے ڈیل ڈول
کہیں آب جو کی طرح نرم رَو — سمندر کی صورت کہیں تیز رَو

روش منتشر اور مقسوم ایک — زبانیں کئی اور مفہوم ایک
عوام اس زمیں کے غیور و غریب — مگر اک نئی زندگی کے نقیب

جو مشرق سے مغرب ہم احساس ہے
بہت دور تاہم بہت پاس ہے

دورۂ صدرِ مملکت

جو ہیں منزلِ شوق کے شہسوار
وہی شہسوارانِ منزل شکار

جو ہیں جادۂ عزم کے یکہ تاز — وہی یکہ تازانِ جادہ طراز
جو ہیں عرصۂ جہد کے تیز رَو — وہی تیز رو، برق پا، گرم رَو
وہی شاطرانِ بساطِ سخن — بساطِ سخن پر ہیں یوں مہرہ زن

کہ ہے جس طرح سیل کی آبرو
تگ و تاز و رد و کد و جستجو

اُسی طرح اہلِ حکومت کا طور — سدا ایک دورہ سدا ایک دَور
ہمیشہ اُمورِ ریاست میں غرق — مگر زیر پا ابلقِ سیل و برق
سدا ہو نہ کیوں حکمرانوں پہ فرض — کہ ہے طے شدہ معجزۂ طیٔ ارض
روانی لطافت پہ نہ ہو ان کی خو — سدا بہتا پانی ہے آتی ہے بو
[illegible] سیاست کے بغیر — نسیمِ سحر کی طرح نرم سیر!
کہاں پا بہ گل [illegible] — رواں اور رواں صورتِ بوئے گل

بتعمیلِ فرمان سیروا فی الارض
سفر رہ روانِ ریاست پہ فرض

قیام ایک عمارت میں رکھا ہے خاک — خوشا صدر کا دورۂ ارض پاک
کرشمہ تھا احساس و ادراک کا — سفر مشرق و مغربِ پاک کا
ادھر مغربی پاک میں یہ ندا — کہ اے صدرِ ذی قدر، خوش آمدید!
اُدھر مشرقی پاک میں یہ کلام — کہ اے ناظمِ انقلاب، السلام!
صدارت کا دورہ اِدھر سے اُدھر — حقیقت میں جمہوریت کا سفر

"پاک جمہوریت"

اُمیدوں کی دنیا تو قدرت کی دین
چلی پاک جمہوریت کی ٹرین

ٹھہرتی، اُٹھتی، گزرتی ہوئی — زمینوں کو بیدار کرتی ہوئی
قیام ایک مرکز پہ جیسے نظر — سفر جیسے موجِ نسیمِ سحر
اقامت کہ دل میں کوئی آرزو — روانی کہ جیسے کوئی آبِ جو

کراچی سے پہلے پہل وہ سفر — بنامِ خداوندِ ہر خشک و تر
وہ بحر و بیاباں میں اس کا عبور — ہزاروں کے جمگھٹ وہ نزدیک و دور
وہ مزدور، وہ پیشہ ور، وہ کسان — نئی ہر جگہ خیر مقدم کی شان
عقیدت کی کیا کیا فسوں بافیاں؟ — ترانے، غزل، زمزمے، کافیاں
وہ بنگال کی پیت رسم اور ریت — وہ دھن پیار کی، پیارے پیارے وہ گیت
رہِ خیر مقدم میں فی الفور راج — وہ جشن اور جلسے وہ رقص اور ناچ
کراچی سے تا سلہٹ و چاٹ گام — عوامی ہجوم اور ہجومِ عوام
وہ مشرق کا مغرب سے یوں ارتباط — کہ لاہور و ڈھاکہ میں جشنِ نشاط

دلوں کا وہ باہم گریبن درین
خوشا پاک جمہوریت کی ٹرین

جہاں صدرِ ملت کے پہنچے قدم — گڑا تازہ جمہوریت کا علم
ہر اک نقشِ پا رہنمائی کی چھاپ — وہ جمہور و جمہوریت کا ملاپ
دلوں میں فراخی دلوں کے بقدر — خوشا دورۂ صدر سے شرحِ صدر
حسد کی توانائیاں گھٹ گئیں — تعصب کی تاریکیاں چھٹ گئیں
جہالت کے جھگڑے تھے کیا کچھ، گئے — شرارت کے آتش کدے بجھ گئے
جو تھے بد زباں اُن کے لب سل گئے — عوام اپنے قائد سے گھل مل گئے

قرار آ گیا ناصبوری گئی
یہ دورہ کہ آپس کی دوری گئی

یہی میرِ ملت کا سب سے خطاب
بہن بھائیو انقلاب انقلاب!

سنو نعرۂ وحدت و اتحاد — کہو نظمِ جمہوریت زندہ باد!
سنو مژدۂ تازہ و نو نوازش — کہو عزمِ جمہور پائندہ باش
نئی زندگی ہے جو حسبِ مراد — کہو زندہ باد اور سنو زندہ باد

یہی صدرِ ملت کا سب کو پیام
کہ اے جمع ہائے خواص و عوام

بصد جذب و احساس آیا ہوں میں — بہت دور سے پاس آیا ہوں میں
اندھیرے دبے پاؤں جانے لگے — اُجالے وہ آئے وہ آنے لگے
جو راتیں کہ صدیوں سے تھیں بے چراغ — چراغاں سے اُن میں فروغ و فراغ
جو قیدی کہ صدیوں سے تھے قید و بند — وہ زنداں سے نکلے لگا کر کمند

اجل اوجِ دار و رسن سے گری   وہ زنجیر کٹ چھٹ کے چھن سے گری
نہ پاؤں میں بیڑی نہ گردن میں طوق   نئے ولولے ہیں نیا ذوق شوق
جہنم تھا خود جن کا حکم شدید   وہ شداد ہیں اب جہنم رسید
نئے طوق و زنجیر ڈھالے گئے   جو بل تھے بل ان کے نکالے گئے
نئے کارفرما، زمانہ نیا   زمانہ نیا، کارخانہ نیا
نئے سر سے ہاری بسائے گئے   جو ہارے ہوئے تھے جتائے گئے

نسیمِ سحر مشک بار آگئی
ہر اک گاؤں میں پھر بہار آگئی

چھڑا نغمۂ نو چمن جاگ اٹھا   وطن دوست چونکیں، وطن جاگ اٹھا
جو ظالم تھے ترکِ وطن کر گئے   جو تھے سخت جاں ڈر سے مر مر گئے
امنگیں جوانوں میں بانٹی گئیں   زمینیں کسانوں میں بانٹی گئیں
یہ کیا ہو گیا بات کی بات میں؟   نیا دور دورہ ہے دیہات میں
جو ضدی تھے اب ضد پہ قائم کہاں   وہ مجرم کہاں وہ جرائم کہاں؟
اچانک جو دنیا نے بدلی ہے جون   نہ اغوا نہ چوری نہ ڈاکہ نہ خون
مصیبت کے مارے سنبھلنے لگے   شرافت کے قانون چلنے لگے
شکار آج خود ہے شکاری پہ شیر   زبردست ہیں زیر دستوں سے زیر
اڑو طائرو بال و پر کھل گئے   اڑو، قید خانے کے در کھل گئے
جوانو! بڑھو روزِ عید آگیا   نظامِ جوان و جدید آگیا

بصیرت فزا، دل کشا، تابناک
خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک

عمل آفریں اعتقاد آفریں   جہاد آفریں، اجتہاد آفریں
محبت کا انعام، الفت کا مول   عوام اور قائد کا یہ میل جول
یہی خاص کر رہنما کا ہے کام   کہ یکتا ہو، لیکن یکے از عوام
یہی اصلِ جمہوریت ہے یہی   کہ جمہوریت کی صفت ہے یہی
فقط ضبطِ جمہور ربطِ عوام   نظام اور جمہوریت کا نظام
مسلسل ترقی، مسلسل عمل   یہی دورۂ صدر کا ماحصل
صفائی کی تنظیم، صحت کا عزم   زراعت کی اصلاح، صنعت کا عزم
مسائل میں جدت پسندی نئی   وسائل کی شیرازہ بندی نئی
نئی زندگی قوم و جمہور کی   نئی شکل آئین و دستور کی
بھلا کنجِ عزلت میں رکھا ہے خاک   خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک

ترقی کا پردہ کشا دورِ نو
خوشا دورِ نو خوشا دورِ نو!

طلوعِ صبحِ روشن

حمایت علی شاعر

اے صبحِ وطن ہم ترے سورج کی لگن میں
جلتے رہے شب بھر مہ و انجم کی طرح چپ
سہتے رہے ہر ضربتِ سنگِ غمِ ایام
اشکِ سرِ مژگاں کے تلاطم کی طرح چپ
کہتے رہے افسانۂ دل بادِ صبا سے
غنچوں کے دہن بستہ تکلم کی طرح چپ
تکتے رہے حسرت سے ہر اک ابرِ رواں کو
پھولوں کے خزاں دیدہ تبسم کی طرح چپ

آدابِ غمِ عشق کا احساس کیا ہے
ہر حال میں اس دل نے ترا پاس کیا ہے

اے صبحِ وطن تو نے ہم آشفتہ سروں کو
گل ریز بھی دیکھا ہے شرر بار بھی دیکھا
فرہاد کی مانند کبھی تیشہ بکف بھی
مجنوں کی طرح خاکِ رہِ یار بھی دیکھا
سقراط کی مانند کبھی زہر بہ ساغر
عیسیٰ کی طرح زیبِ سرِ دار بھی دیکھا
منصور کی مانند کبھی کشتۂ حق بھی
ناکردہ گناہی کا سزاوار بھی دیکھا

تکریم کی ہر حال میں پندارِ جنوں کی
توہین نہ ہونے دی کبھی سوزِ دروں کی

اے صبحِ وطن تجھ کو یہ خورشید مبارک
لے آج کئے لیتے ہیں دامن کو رفو ہم
اب مل گئی ہر درد کو درماں سے فراغت
اب زخمِ جگر کو نہ رہی حاجتِ مرہم
اب پھولوں کی غم خوار ہیں سورج کی شعاعیں
اب ختم ہوئی کشمکشِ شعلہ و شبنم
اب مل گئے دل کو نئے عنوان جنوں کے
اب عشق کے ماروں کا ہے کچھ اور ہی عالم

مانندِ صبا اب ترے گلشن میں رہیں گے
خوشبو کی طرح پھولوں کے دامن میں رہیں گے

"اُمیدگاہِ انام"

شاہد جمیل

۱۴ر فروری سنہ ۱۹۶۰ء اور ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء بہ ظاہر اتنے دور اور غیر متعلق؛ لیکن ان دونوں تاریخوں میں ایک گہرا تعلق ہے۔ تاریخیں دو ہیں مگر ان کی روح ایک ہے، واقعات دو ہیں مگر ان کا نتیجہ ایک ہے یعنی عوام کی برتری اور حقیقی جمہوریت کا عروج۔ ۲۳ر مارچ وہ یادگار دن ہے جب ہم نے ایک دولتِ خداداد وجود میں لانے کا عزم کیا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء وہ دن ہے جب ہم نے اسے بنا کر اس کے اندر قدم رکھا۔ اور ۱۴ر فروری ۱۹۶۰ء وہ مبارک دن ہے جب ہم حقیقی پاکستان، حقیقی آزادی، حقیقی جمہوریت کی عظیم الشان دنیا میں داخل ہوئے۔ ایک معاصر کے الفاظ میں یہ محض ایک دن نہیں بلکہ جمہوریت کے ایوان کا وہ بڑا دروازہ ہے جس میں داخل ہو کر پاکستان ہمیشہ کے لئے ایک جمہوری ملک بن گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا صفحہ ہے جہاں سے پاکستان میں صحیح معنوں میں ۸ کروڑ انسانوں کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ جب آٹھ کروڑ پاکستانی باشندوں نے اپنی خوشی اور مرضی سے بغیر کسی دباؤ اور ڈر کے پوری آزادی کے ساتھ اس ملک کے اعلیٰ ترین حاکم ـــ صدر ـــ کا انتخاب کیا۔

۲۳ر مارچ وہ مبارک دن ہے جسے "یوم پاکستان" ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک حقیقی معنوں میں یادگار تاریخ۔ انمٹ، ناقابلِ فراموش! کیونکہ اس دن ایک پوری قوم نے یک دل و یک زبان ہو کر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا، اس کا مطالبہ کیا تھا۔ آج ہم اس مبارک دن کو یاد کرتے ہوئے خوش ہیں کہ ۲۰ برس بعد ہی سہی ہم نے وہ حقیقی آزادی، وہ حقیقی پاکستان، وہ عوام کا مقدس پیدائشی حق، وہ سچی جمہوریت پھر پالی ہے جس نے اس تاریخی دن کو ہمارے دلوں کو گرمایا اور روحوں کو تڑپایا تھا اور جو ہمارا دلی منشاء و مقصود تھا۔

۱۴ر فروری میں وہ سب کچھ شامل ہے جو ۲۳ر مارچ اور ۱۴ر اگست میں ہے مکمل آزادی اور جمہوریت۔ لہذا ۱۴ر فروری ہماری تاریخ میں ایک اور سنگ میل، جمہوریت کی تاریخ میں ایک اور سنہری باب، ایک اور یادگار دن ہے۔ جب کہ ساری قوم نے بہ یک آواز مشرقی پاکستان سے لے کر مغربی پاکستان تک اپنے نجات دہندہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو صدر منتخب کیا۔ جو بلا شبہ ہمارے دوسرے قائد اعظم ہیں۔ عوام کے اپنے ہر دلعزیز صدر اور محبوب رہنما۔ جن سے پاکستان کے روشن مستقبل اور قوم کی بہترین امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ انتخاب حقیقی معنوں میں ایک یادگار انتخاب ہے۔ جمہوریت کا نقطۂ عروج اور اس جمہوری روح کا منطقی نتیجہ جو سالہا سال کی جدوجہد کے بعد پاکستان کی شکل میں بروئے کار آئی تھیں۔

وہ سلسلہ جس کی ابتدائی کڑی ۲۳ر مارچ سنہ ۴۰ء تھی اس کی انتہائی کڑی ۱۴ر فروری سنہ ۱۹۶۰ء ہے۔ جب کہ عوام نے بالآخر وہ سربراہ، وہ حکومت پالی ہے۔ جو خالصۃً جمہوری ہے۔ اور یوں بیداریٔ جمہور کا فطری تقاضا آخر کار پورا ہو ہی گیا ہے۔

اگر جمہوریت کو دوبارہ زندہ کرنے کا شرف کسی فرد واحد کو حاصل ہے تو وہ ہمارے محبوب و ہر دلعزیز سربراہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، کے سوا اور کوئی نہیں۔ جن کو حقیقی جمہوری احساس و جذبہ کے تحت ہی عوام نے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے اور یوں جمہوریت کا بول بالا کیا ہے۔ جن حالات کے تحت عوام سے اظہار رائے کے لئے کہا گیا، وہ اول تا آخر، مکمل طور پر، جمہوری لائحہ عمل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے صدر پاکستان اور ان کے رفقائے کار نے ملک و قوم کے سر سے بد دیانت سیاست والوں اور سیاسی جماعتوں کا کابوس اتارا، اس جبر و تشدد اور غاصبانہ جباری و قہاری کو دور کیا جو دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب" کے مصداق "جمہوریت" کے

۱؎ جانتا ہوں کہ آج دنیا میں - ایک ہی ہے امیدگاہِ انام - غالب - (مدیر)

ظلم سے مدد دے چند افراد کی ہوسِ اقتدار کو دعوت نمو دے رہی تھیں۔ ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں ملت خود کو صحیح معنوں میں آزاد محسوس کرے اور اس کے تمام حقوق بحال کئے جائیں۔ اس کے بعد سنگینوں کی نوک پر نہیں بلکہ ایک خالص پاکستانی وضع کا جمہوری نظام قائم کر کے عوام کو موقع دیا گیا کہ وہ اپنے نمائندے آپ منتخب کریں پھر یہ احتیاط برتتے ہوئے کہ کوئی شخص اپنی ذمہ داریوں، آزادیٔ رائے، اختیارات اور حقوق سے ناواقف نہ رہے، انھیں بیداری پیدا کرنے اور پوری طرح آگاہ کرنے کے لئے وسیع ترین پیمانے پر مطلع و باخبر کرنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ قائدِ قوم کا پیغام اور مقصود و منشاء تمام لوگوں کو پہنچ جائے۔ یہ پیغام کیا تھا؟۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک شہروں اور دیہاتوں میں ایک نرالی قسم کی ریل گاڑی میں صدر پاکستان کا سرد، ناخوشگوار موسم میں طول طویل سفر جس میں ملک کے ممتاز ادیب، اربابِ فکر و نظر، ملکی و غیر ملکی اخبار نویس وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ لوگ دور دور سے خود بخود کھنچے چلے آئے تاکہ وہ صدر سے ملیں۔ اور صدر انہیں ایک بڑے پُرشکوہ انسان یا آقا و مولا کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام، پُر خلوص انسان، ایک محبِ وطن، ایک سپاہی، ایک خادم، ایک مردِ باعمل، ایک خیر خواہ، ایک عام شہری کی حیثیت سے ملتے۔ وہ ان سے خود ملتے جلتے نہ کہ وہ انہیں ملنے آتے۔ اور وہ سب کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے بات چیت کرتے۔ ہمارے ملک کا غالب عنصر دیہات ہی میں تو رہتا ہے۔ اَن پڑھ، سیدھے سادے، سیاسی داؤ پیچ سے ناواقف لوگ جو بڑے بڑے مسائل تو کیا اپنے گھر اور آس پاس کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں جانتے ان کو ملکی مسائل سے آگاہ کرنا، انہیں خود حل کرنے کی دعوت دینا، انہیں جگانا، ان میں جمہوریت کی روح پھونکنا، سب سے اہم اور مقدم بات یہی تھی۔ صرف اس کے بعد ہی ان کے سامنے یہ نہایت اہم قومی معاملہ پیش کرنا مناسب تھا کہ وہ موجودہ صدر کو قابلِ اعتبار اور لائقِ اختیار سمجھتے ہیں یا نہیں تاکہ وہ اسے سوچ سمجھ کر اپنا صدر منتخب کریں یہ نہیں کہ ان پر اوپر سے کوئی حاکم یا حکومت مسلط کر دی جائے جیسے وہ عوام نہیں بھیڑوں کا گلہ ہوں، بلکہ اپنے عوامی اختیارات اور سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اپنا حاکم آپ چنیں۔

یہ دونوں سفر کیا تھے؟ مغربی اور مشرقی پاکستان کے بیچوں بیچ، عین دل میں سے گزر تاکہ انہیں جگایا جائے، مکمل طور پر باخبر کیا جائے اور ——— تو شہری زمام خود بدست آ ——— کی دعوت دیتے ہوئے۔

جب یہ مقصد بوجہ احسن پورا ہو چکا اور جمہورِ عام اس سے کہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی، معاملہ کی نوعیت سے پوری طرح واقف ہو چکے تو صدر کے انتخاب کی نوبت آئی اور یہ سب سے اہم معاملہ ان کے سامنے اظہار رائے کے لئے پیش کیا گیا۔ کوئی قید، کوئی پابندی لگائے بغیر۔ ورنہ تاریخ کے بے شمار واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ صدر عوام کی ذرا بھی پروا کئے بغیر ڈکٹیٹر کا سا رول اختیار کر لیتے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کہ صدر بھی حقیقی جمہوریت کی رُوح سے سرشار ہیں اور انہوں نے اپنے عظیم الشان دورے سے عوام میں بھی یہی احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے تمام جمہور کی رائے سے صدر ہونا پسند کیا۔ یونین کمیٹیوں نے بالاتفاق ملک و قوم کے سب سے ہر دلعزیز رہنما، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ہی کو صدر منتخب کرنا پسند کیا اور وہ اب ایک باقاعدہ منتخب صدر ہی کی حیثیت سے اس منصب پر فائز ہو کر قوم کی دیگر بلند تر و جلیل تر مقاصد کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں جن میں سے ایک دستورِ جدید کی تشکیل ہے۔ وہ دستور جو پاکستان کے لئے بہترین و مناسب ترین آئین کا ضامن ہو گا۔

اظہار رائے کی یہ دعوت اپنی قسم کی پہلی چیز ہے۔ خالص جمہوری، ورنہ دنیا میں ہونے کو کیا نہیں ہوتا رہا۔ بالخصوص جب فوجی ڈکٹیٹروں نے زبردستی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہو۔ اور پیرِ تسمہ پا کی طرح ہمیشہ قوم کے شانوں پر سوار ہو کر اس کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔ ہمارے یہاں بھی یہی کھیل بہ آسانی کھیلا جا سکتا تھا۔ اور کسی اظہار رائے کا تکلف کئے بغیر یہ امیرِ فوج مدت العمر ملک کا اعلیٰ ترین حاکم بھی رہ سکتا تھا۔ مگر یہ طرزِ عمل تمام تر غیر جمہوری ہوتا اس لئے اس اہم فیصلے کے لئے قوم ہی سے رجوع کیا گیا اور اس کو مالک و مختار بنا دیا گیا۔

اس امیرِ جنود نے خادم قوم ہی کی حیثیت میں رہنا پسند کیا۔ انہوں نے کوئی بات ذاتی خواہش کی بناء پر نہیں کی بلکہ جو کچھ کیا قوم ہی کی رضا و منشا سے کیا ہے۔ ان دونوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے۔ زور و زر یا عدل و انصاف؟ یہ سوال تھا جو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے سامنے تھا۔ اور انہوں نے ایک کھرے سپاہی کی طرح دوسری بات ہی کو ترجیح دی۔ جو ان کے مزاج اور خادم ملت کے کردار سے پوری طرح

ہم آہنگ ہے اور ان کی بلند شخصیت کے شایان شان ہیں۔

بے شک امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے پارٹی لیڈر عام انتخابات کے سلسلے میں دورے کیا کرتے ہیں لیکن ان دوروں کا مقصد تمام تر پروپگنڈا ہوتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح پری کو شیشہ میں اتار لیا جائے۔ ایک سپاہی کو ایسے طریقوں سے جبلی طور پر نفرت ہوتی ہے۔ اور یہ صدر پاکستان کی جمہور پرستی کے بالکل منافی تھے۔

عوام سے ملنے، ان کے ساتھ گھل مل کر بات چیت کرنے، ان سے قریب تر آنے، ان کو سمجھانے اور خود سمجھے جانے کی خواہش نے انہیں اتنے طویل سفروں کی زحمت گوارا کرنے پر آمادہ کیا۔ تاکہ ان کا پرخلوص پیغام گھر گھر پہنچ جائے۔ وہ خود عوام تک پہنچے نہ کہ عوام ان تک۔ اور پھر اس دورے کا سب سے بڑا مقصد تھا عوام کی تعلیم، ان کی تربیت تاکہ وہ ملک کے مسائل اور صورت حالات کو سمجھیں اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں خصوصاً صدر کے انتخاب میں۔ انہوں نے عوام کے دل میں گھر پیدا کر لیا۔ بلکہ وہ تو ان سفروں سے پہلے ہی ان کے دل میں گھر کر چکے تھے۔ ان کے چہیتے رہنما بن چکے تھے۔ اسلئے جو کچھ ان کے دلوں میں تھا وہی عملی طور پر بھی سامنے آیا

حقیقت یہ ہے کہ اعتماد کا ووٹ دئے جانے سے پہلے ہی یہ اظہر من الشمس تھا کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہے۔ چنانچہ تمام لوگوں نے بالاتفاق اس دوسرے قائد اعظم کو اپنا صدر منتخب کیا۔ صرف ووٹ دینے کے سلسلہ میں جو آزادی یونین کمیٹیوں کو دی گئیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ عوام کے اظہار رائے کا بندوبست کرنے کے لئے ایک الیکشن کمیشن قائم کیا گیا۔ صدارتی بیلٹ کی نگرانی عدلیہ کے ایسے اراکین عالی کے سپرد کی گئی جن پر نہ حکومت کا اثر تھا نہ فوج کا۔ یعنی دونوں کے تسلط یا اثر سے آزاد اور آئین شناسی اور دیانت داری جن کی مسلم اور معلوم اس لئے یہ کہنے کی گوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی کہ اظہار رائے حکومت کے زیر اثر ہوا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے بے دھڑک عدم اعتماد کا ووٹ بھی دیا۔ رائے دیتے وقت پرچی ڈالنے والے کے سر پہ کوئی تلوار نہیں لٹکتی تھی۔ نہ ظاہر نہ پنہاں۔ ایک طرف نیلا نشان اور دوسری طرف فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا عکس، جس کے حق میں وہ چاہے اپنی خوشی سے رائے دے دے۔ موصوف عوام کا دل تو پہلے ہی اپنے ہاتھوں میں لے چکے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا اقبال تھا اور ہم اپنی عقیدت کا خراج نذر کرنے کے لئے دل و جان سے مجبور۔ یہ موہنی جس میں پائی جائے اسے رائے لینے میں بھلا کیا دشواری ہو سکتی تھی

لہذا نتیجہ کے آثار پہلے ہی سے نمایاں تھے۔ اور وہی ہوا جس کی سالوں پہلے توقع تھی۔ اس طرح جو بالکل جمہوری طور پر اظہار رائے کر دیا گیا ہے، اس کو غیر ملکی غیر جانبدار مبصر وں نے بھی بے حد تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور وہ پاکستان کے قائد کی غیر معمولی ہر دلعزیزی سے حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ یہ حقیقت ایسی بات ہے جو اقوام عالم میں نہ اپنی نظیر رکھتی ہے نہ مثال۔ وہ سماں دیکھنے کے لائق تھا جبکہ صدر پاکستان یعنی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے منتخب ہونے پر، ۱۷ فروری کو گھر گھر چراغاں ہوا اور پاکستان کے ہر ہر شہر، ہر ہر گاؤں کی گلی گلی اور کوچہ کوچے میں لوگوں نے خوشی سے خود بخود، اپنے ہی خرچ پر غریبوں، محتاجوں، بوڑھوں اور بچوں کو مفت کھانا کھلایا اور دل کھول کر مٹھائیاں بانٹیں۔ اس سے زیادہ ہر دلعزیزی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور پھر اس زندہ دل انسان کا پیار، محبت اور بلند حوصلگی بھی دیکھئے کہ اس نے قوم کے نام ایک نشری پیغام میں صاف صاف کہہ دیا کہ جن لوگوں نے اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا وہ بھی اس کے اپنے ہی ہیں۔ جس بنیاد پر ان کی شکایات قائم ہیں اس کو اور ان کی شکایات کو بھی دور کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

جیساکہ اظہار رائے کے نتائج سے معلوم ہوا ہے سو فیصدی سے تھوڑی ہی کم تعداد نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے حق میں ووٹ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب قوم اپنے پرخلوص، حرکی، زندہ دل، صاحب نظر اور جہاں دیدہ مدبر و قائد کی رہنمائی میں ایک اور نہایت عظیم بالشان دور ترقی میں قدم رکھ رہی ہے۔ یہ انتخاب درحقیقت قوم کی طرف سے صدر منتخب کو پروانہ ہے کہ وہ دستور کے نہایت اہم کام پر توجہ دیں اور اس کی جلد از جلد تکمیل کریں۔ چنانچہ اب ہمارے منتخب صدر پاکستان اب ایک ایسے دستور کی تشکیل پر توجہ مرکوز کر سکیں گے جو ہمارے لئے ہر اعتبار سے موزوں و مناسب ہو۔

خدا اس بہی خواہ ملت اور ان کے رفقائے کار پر اس نئے سفر کی منزلیں آسان کرے اور قوم کو اپنے چنے ہوئے صدر کی رہنمائی میں نہایت برق رفتاری سے آگے بڑھنے کی، توفیق و ہمت عطا کرے۔

ہمارے منتخب صدر عوام کے اپنے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان زندہ باد!

پاکستان زندہ باد!
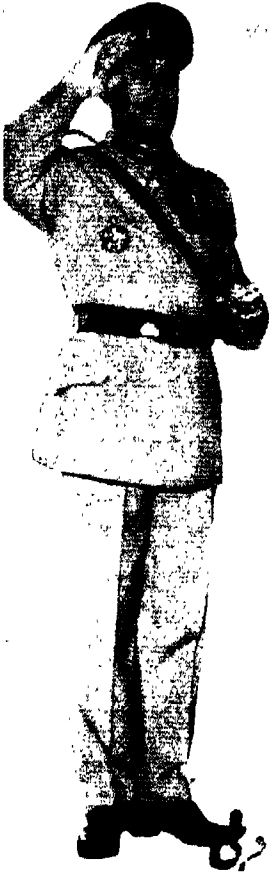
انتخاب صدر پاکستان :
فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
پر ملک کا کامل اعتماد

۲ :

۱ :

۱ - حلف اٹھانے کی رسم
۲ - حلف کے بعد قومی ترانہ (صدر کا اظہار احترام)
۳ - صدر اور صدارتی کابینہ
۴ - سارے ملک میں مسرت کا اظہار
۵ - ایوان صدر (راولپنڈی) پر چراغاں

۳ :

۴ :

۵ :

شہنشاہ ایران ـ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور جلال بایار ، صدر ترکی
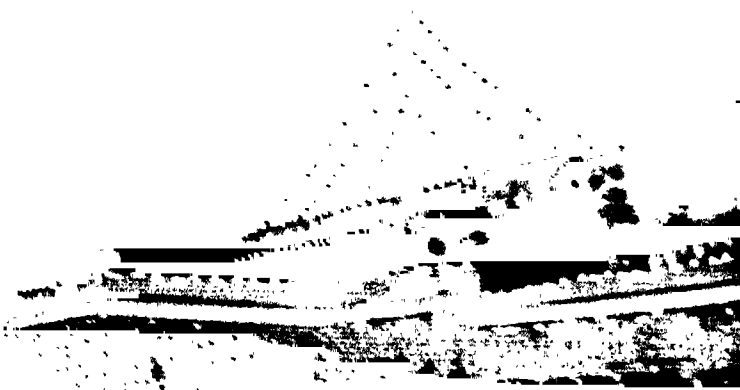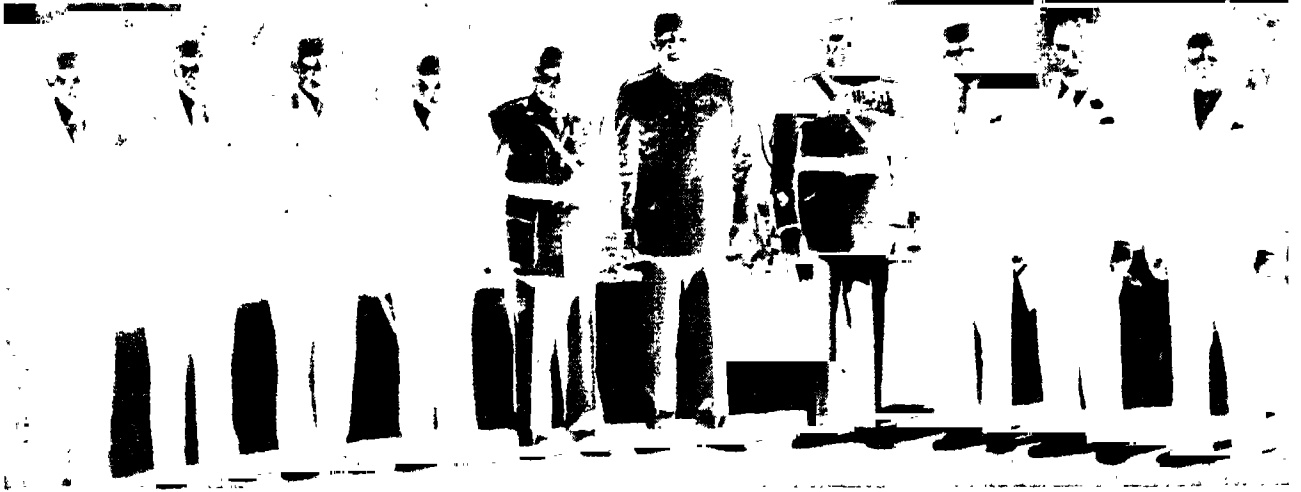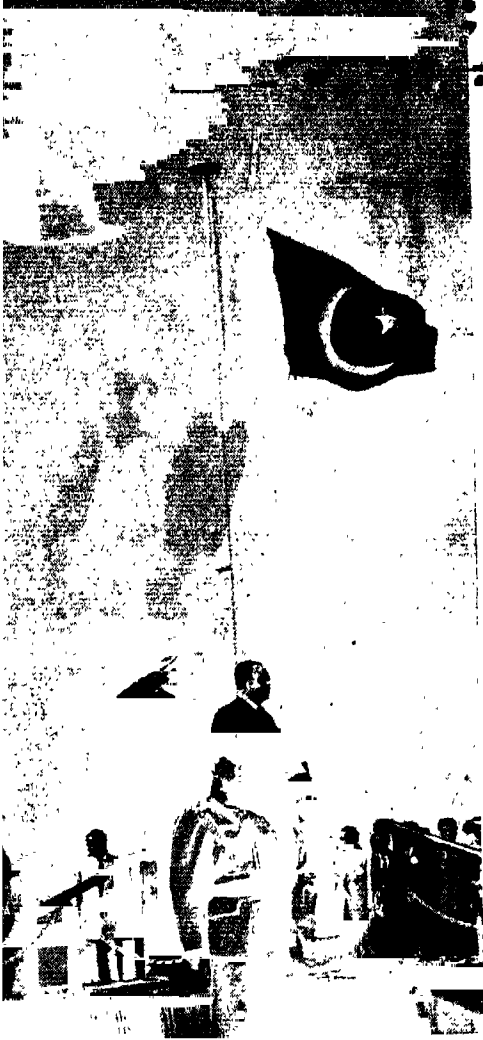
ورود شہنشاہ ایران

شہنشاہ ایران کے اعزاز میں گارڈ آف آنر

ملکہ فرح پہلوی کا خواتین کی طرف سے

جلال بایار ، صدر ترکی ، کی کراچی میں آمد
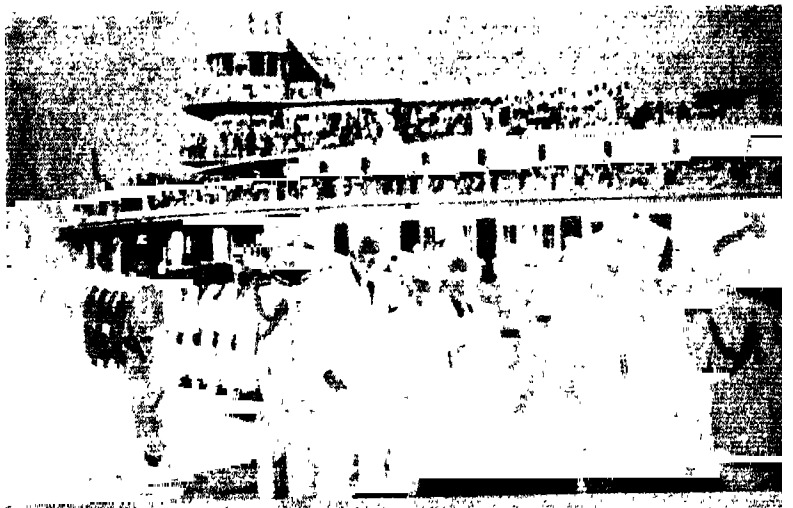
عاصمہ حسین

ا- آئین کا نام مبارک ہو جس سے ہوئی وطن کی شان نئی
اٹھا یہ سالارِ جری ایسا، ڈالی قوم کے جسم میں جان نئی
تعمیرِ حصارِ ملت کی تدبیر ہوئی ہر آن نئی
ہر چار طرف اک غلغلہ ہے، گونج اٹھی ہے ایسی تان نئی

ب- "بنیادی جمہوریہ" کے خورشید کا جلوہ عام ہوا
نئی آب و تاب سے چمکا ہے، جمہور کی قسمت کا تارا
ہر ذرّہ فضائے ہستی کا، شمعوں کی طرح لَو دے اٹھا
ہے کاہکشاں در کاہکشاں دنیائے عوام کا نظارا

پ- پاکستان کی پاک زمیں بارانِ کرم سے شاد ہوئی
ہر بستی مشرق مغرب کی ہر طور سے اب آزاد ہوئی
تقدیر مہاجروں کی جاگی، یوں غیب ہی سے امداد ہوئی
برسوں کی مصیبت کی ماری مخلوقِ خدا آباد ہوئی

ت- تاریکی کا دور گیا، عیار سیاست دانوں کا
ظلمات کے بادل چھٹ بھی گئے اور زور گھٹا طوفانوں کا
جھم جھم جمہور کے گھر چمکے اور نور بڑھا کاشانوں کا
تاریخ کے چہرے پر چھایا اب رنگ اور روپ افسانوں کا

ث- ثابت اور سیاسی تاثیریں ہم آہنگ ہوئے
اور تقدیر و قضا کے ہاتھوں میں طاؤس و رباب و چنگ ہوئے
یوں قوسِ قزح در قوسِ قزح آکاش پہ رنگ ہی رنگ ہوئے
نظارگیانِ ارض و سما اس رنگ فسوں سے دنگ ہوئے

ج- جامِ اصلاح کا دور میں ہے، اصلاحوں کے جام پہ جام آئے
ہر آن نئے دو آتشہ سے نزہتِ نشاطِ عوام آئے
ملت کے جہاد میں بالآخر افواج کے ہات ہی کام آئے
نغمے صبح کے جلوے پہلو میں، ہر چند بہ وقتِ شام آئے

چ- چاک کیا دامانِ جفا، ہر قصرِ ستم کو چور کیا
جو داغ کہ دامنِ پاک پہ تھا، اس داغ کو اک دم دور کیا
ظلمت جو پرافشاں تھی ہر سو، اس ظلمت کو کافور کیا
پیراہنِ ملت کو دھو کر پاکیزہ مثالِ طور کیا

ح- حائلِ رہ تھی جو مشکل جو سلسلہ ہائے کوہِ گراں
اس مشکل کو یوں دور کیا نے نام رہا باقی نہ نشاں
اس طرح چٹانیں گرد ہوئیں، اڑتا نظر آئے جیسے دھواں
تھی برق ہی برق ادھر، بہشت واں موج بلا طوفان و فغاں

خ- خیرِ خلائق کے جویا یہی شام و سحر ہے دل میں لگن
یہی نغمہ لبوں پر رات اور دن، "قربانِ وطن! قربانِ وطن!"
تعمیر و ترقی کے ارماں، ہوں کوہ کہ صحرا، دشت کہ بن
ہر دم اصلاح کی تدبیریں، پاکیزہ ہو کیونکر خاکِ چمن

د- داد و دہش کی دھوم مچی، یہ قدرِ سخن، یہ جود و سخا
ہر جوہرِ قابل کی تحسیں، یہ معجزہ ہائے لطف و عطا
یہ چشمہ کہ فرطِ شوق سے ہے اک بحرِ کرم، طوفان نما
یاں ریزشِ قطرۂ خونِ جگر، واں موج کہ دریا دریا

ر۔ راہنما ہے وہ ہستی ہنگامۂ دوراں [illegible]
اک مردِ مجاہد شعلہ بجاں، اک محو [illegible] جیسے
وہ سیلِ روانِ بے باکی، اُمڈا ہوا طوفاں کہئے جیسے
وہ چارہ گرِ ملک و ملت، ہر درد کا درماں کہئے جیسے

ز۔ زرعی اصلاحات نہ ہے "اعجاز اعجاز" کا غُل ہر سو
ہے ریزشِ عام بادہ دمے، تھے لوگ جہاں بے جام و سبو
طوفانِ مئے سرجوش خوشا کا سوں میں جہاں تھا صرف لہو
وہ کاہشِ تن، وہ زردیٔ رخ۔ یہ شانِ نمو، یہ سرخیٔ رو!

س۔ سندھ سے لے کر خیبر تک چلی پاک جمہوریہ ٹرین کیسی
دیکھی نہ سنی تھی دنیا نے کسی ملک میں اب تک ریل ایسی
پھر نیر کنول کے دیس میں بھی نگری نگری گردش دیسی
وہ دلوں کے بیچ عجیب سفر، کہاں شان میسر اس جیسی

ش۔ شوق ہے اس کا بے پایاں، ہر گام پہ اور ہی منزل ہے
جہاں نیل گگن سا گر سے ملے، کب اسکی نظر میں وہ ساحل ہے
جس میں ہے منزل نے ساحل، وہ نگری اس ہی کا دل ہے
بجلی ہے کہ بادل بادل ہے، دیپک ہے کہ محفل محفل ہے

ص۔ صدر جسے خود ملت نے آنکھوں پہ بٹھایا، دل میں رکھا
ہر معرکۂ دشوار طلب بے نذر یا وہ سر جس نے کیا
اعجازِ محبت جس کے لئے افسونِ سیاست سے ہے سوا
مصروفِ تدبرات اور دن تا وضع کرے دستور نیا

ض [illegible] کے لئے وہ بے اندازہ محبتیں ہیں
گویا ہر گھر میں اس کے آباد ہزاروں جنتیں ہیں
اس قائدِ اعظم ثانی کی تخئیل میں لاکھوں رفعتیں ہیں
وہی شوکتیں ہیں، وہی عظمتیں ہیں، وہی حشمتیں ہیں، وہی سطوتیں ہیں

ط۔ طرق نئے، افکار نئے، انداز نئے، اشغال نئے
سانچے میں خلوص کے ڈھالے ہوئے اقوال نئے، اعمال نئے
اوصاف نئے، اطوار نئے، اذکار نئے، احوال نئے
آفاق نئے، اعماق نئے، آکاش نئے، پاتال نئے

ظ۔ ظاہر و باطن یکساں ہیں، خاموش مگر خاموش نہیں
اے وائے وہ پیکرِ آب و گل جو پیکرِ آتش نوش نہیں
اے وائے وہ برق شعلہ بپا جو ابر میں غلغلہ کوش نہیں
اے وائے وہ شعلۂ جوالہ جو برق کے دوش بدوش نہیں

ع۔ عاصمہ شاعرہ برق نفس کیوں شمع صفت خاموش رہے
یہ دور، یہ بزم، یہ قدرِ سخن، پھر بھی نہ ترنم کوش رہے
گر سحر ہے وہ، کیوں بزم جہاں محرومِ نوائے سروش رہے
یہ نطق سراپا برق رہے، یہ بزم سراپا جوش رہے

غ۔ غیب سے مردِ کار آیا اور ملت کی تقدیر بنا
اٹھی نہ کوئی آواز کہیں اس طرح پلٹ ڈالی کایا
اک قطرۂ خوں بھی دامن پر اس پاک زمیں کے گر نہ سکا
اک دورِ وحشت خیز گیا، اک دورِ راحت خیز آیا

ف۔ فصلِ بہاراں آپہنچی اور مہکی ہر ہر پھلواری
ہریالی ہی ہریالی سے لہکی بہکی کیاری کیاری
کیا کامنی کامنی ہر شے ہے، کیا ہر صورت پیاری پیاری!
ہر بوٹا فرحِ زیبا کی طرح، ہر ڈالی ہے ناری ناری

ق۔ قمقمے نور کے روشن ہیں۔ یہ روشنیاں ہی روشنیاں
بادل کی قبا میں جھومتی ہیں کیا جل پریاں ہی جل پریاں
یہ نور کی مینائیں ہیں یا ہیں رس بھریاں ہی رس بھریاں
اور ترچھی ٹیڑھی کرنوں سے یہ گل بیاں ہی گل بیاں

ک۔ کس کا فیض ہے یہ سارا، یہ فیض فقط آقا سب کا ہے
کس کا اعجاز ہے یہ سارا، اعجاز اسی محبوب کا ہے
یہ بھینی مہک یہ اجیارا، سب کس کا اسی ہی ڈھب کا ہے
ہے کس کی نظر کا سحر مبیں، یہ سحر اس پیکر خوب کا ہے

گ۔ گلوں کی موہنی رت آئی، کلیاں ابھریں کنواری کنواری
اس پیاری رت میں ہر تیج من کو لاگے پیاری پیاری
کیا کامنی کامنی بوٹیاں ہیں کھیتوں سے اٹھیں ناری ناری
وہ پیراہن لاچہ لاچہ، شیشہ آنچل ساری ساری

ل۔ لشکرِ شوکت ہے اور دھاک ہے ساری دنیا پہ
افواجِ پاک کی عظمت کے قائل سکانِ بحر و بر
آہنگِ رجز سے گونجتے ہیں اقصائے جہاں ہیں خشک الحلقوم
اک گام نشیب کراچی میں اک گام ہے تا اوج کشمیر

دھوپ

م۔ مجموعۂ سطوت و حشمت ہے اور اس کی ترقی بے پایاں
زینت وہ بابِ عالی ہیں، شہرت کے فسانوں کے عنواں
ابیات ابیات تجلی ہے، تمکین و حشم دیواں دیواں
ہے سلسلہ سلسلہ نشو و نما اور شانِ بقا دوراں دوراں

ن۔ نام ہے پاک دیار اس کا یہ مملکتِ ذی شان اپنی
دن رات نظاروں سے جس کے ہستی ہے سدا جوان اپنی
یہ دھرتی دھرتی اجلی سی یہ دھرتی سبز نشان اپنی
یہ دولتِ عرش نما اپنی، تعمیر بلند ایوان اپنی

و۔ وقت کی بات ہے اوجِ ملی لو اپنے عروج کا وقت آیا
سمٹے تھے حدود میں ہم پہلے، اب اپنے خروج کا وقت آیا
ہوا طالع اخترِ سعد اپنا، کسریٰ جموج کا وقت آیا
ہوئے برجِ اسد میں ہم داخل، ذیشان بروج کا وقت آیا

ہ۔ ہم یہ ہے ملک کی شان رکھنا، اور صدر کی اپنے لاج رکھنا
جو کام ہو اوج و ترقی کا، اس کام سے ہر دم کاج رکھنا
اور محفلِ ہستی میں بڑھ کر ملت کے سر پہ تاج رکھنا
جو قوم و وطن کا پاس کرے، وہی صدر رکھنا وہی راج رکھنا

ی۔ یارب! ہزاروں دعائیں مری اور میری، ہزاروں امیدیں بھی
مرے دل میں ہزاروں سنہری محل اور ان کی سنہری کلیدیں بھی
مجھے پردۂ غیب سے شام و سحر جاں بخش ہزاروں نویدیں بھی
فیضانِ خدا سے پاک سے ہیں مقسوم ہزاروں عیدیں بھی

"طرح نو افگن"

(بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی)

سمیع الزماں

ایک ایسی جمہوریت جسے لوگ سمجھ بھی سکیں اور چلا بھی سکیں۔ صدر پاکستان نے ابتدا ہی میں اسی کا تو وعدہ کیا تھا۔ اور بڑی مسرت کی بات ہے کہ انھوں نے اسے پورا بھی کر دکھایا۔ انقلابی حکومت کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ۲۷ اکتوبر کو یہ اعلان جاری کر دیا گیا کہ ملک میں بنیادی جمہوریتیں قائم کی جائیں گی۔ ایک پانچ منزلہ نظام جس میں ہر منزل پر عوام اور ارباب نظم و نسق ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

آپ پوچھیں گے بنیادی جمہوریت کیا ہے؟ یہ بڑی سیدھی سادی بات ہے جس کے متعلق آپ آگے بہت کافی کچھ سن چکے ہوں گے یہ ہے تو ایک سیاسی نظام لیکن ایسا جس میں زندگی کی اصلیتوں اور اعتدال کو پیش نظر رکھتے ہوئے تدریجی ارتقا پر زور دیا گیا ہے۔ جو پاکستان میں مارشل لا کے تحت نظم و نسق کی نمایاں خصوصیت رہا ہے۔

اس کی بنیاد اس احساس پر ہے کہ جمہوریت کے معنی ہیں اکثریت کی حکومت، اور ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ دیہات ہی میں آباد ہیں۔ لہٰذا حکومت انہی کی ہونی چاہئے اور انہی کے واسطے ہونی چاہئے۔ لیکن اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دیہات کے لوگ اکثر ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ ان پر برسوں ایک اجنبی حکومت کے استعمار کا سایہ رہا ہے اور حاکم لوگ یہ سمجھتے رہے کہ گویا یہ نادان ناسمجھ بچوں کی دیکھ بھال کرنے رہے ہیں اور پھر ان پر مستزاد جاگیرداری نظام کا دور دورہ بھی رہا ہے۔ اس لئے وہ حکومت چلانے کے فن سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ نہیں نہ اپنے آپ پر اعتماد ہے اور نہ وہ اتنی صلاحیت ہی رکھتے ہیں کہ ان فرائض کو انجام دے سکیں جو ایک جمہوری نظام لازماً ان پر عائد کرتا ہے۔ ان کے لئے ہر وقت اندیشہ ہے کہ کہیں چالاک سیاست دان یا شورش پھیلانے والے چرب زبان لوگ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے انہیں دھوکہ نہ دیں۔ اس لئے یہ بات اشد ضروری ہے کہ یہ سکھایا

جائے کہ حکومت ہے کیا، اس میں وہ کیا حصہ لے سکتے ہیں اور اسے چلانے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ نیچے نچلی سطحوں پر چھوٹے چھوٹے معاملوں میں حکومت کا کام چلائیں اور رفتہ رفتہ اتنا تجربہ حاصل کر لیں کہ وہ بعد ازاں اونچی سطح پر بڑے بڑے معاملات میں کاروبار حکومت کا اہتمام کر سکیں۔

اس نظام میں ایک اور بات بھی محسوس کی گئی ہے۔ یہ کہ ملک کا سب سے تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ سرکاری نظم و نسق چلانے والوں پر مشتمل ہے۔ بالفاظ دیگر یہی لوگ ملک کا ذہین و دانشور طبقہ ہیں اور گزشتہ بارہ سال انہی کی بدولت حکومت کا نظم و نسق برقرار رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ نہ صرف روزمرہ کے انتظامی کاروبار کو چلانے کے لئے ملک کا سب سے اہم عنصر ہے بلکہ قوم کو اپنی لمبی میعاد کی پالیسیاں تیار کرنے میں بھی مدد دے سکتا ہے سچ پوچھئے تو موجودہ حکومت کی بلند نظری کا سب سے زیادہ مدبرانہ پہلو یہی ہے کہ اس نے قومی زندگی میں نئی روح پھونکنے کے لئے اس عنصر کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اب ذرا اس نظام کی مجمل کیفیت سنئے۔ اس کے مطابق مختلف حلقوں، تحصیلوں، ضلعوں، ڈویژنوں اور دونوں صوبوں میں کونسلیں قائم کی گئی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ امور عامہ کے متعلق بحث و مباحثہ ہو، فیصلے ہوں۔ انتظامی حیثیت سے سارے پاکستان کو اول تو دو صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور پھر یکے بعد دیگرے ڈویژن ہیں، ضلعے ہیں، تحصیلیں ہیں، دیہات ہیں) اور پھر ان کو مواقع بہم پہنچائے گئے ہیں کہ وہ خود کو ترقی دیں اور بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ ان ہی بنیادی حلقوں کا نام "یونین" ہے۔ جو دیہات میں "پنچایت" کہلائے گی اور شہروں میں "کونسل"۔ ان دونوں کے تقریباً ۱۰ منتخب ممبر ہوں گے اور

بلوچی رقص (تقریب شادی)

نیزہ بازی : بلوچیوں کا محبوب مشغلہ

میلہ میں نیزہ بازی کا مظاہرہ

پانچ نامزد جو سرکاری ملازم نہیں ہوں گے۔ جوں جوں کونسلوں کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے نامزد ممبروں کی تعداد کم اور منتخب ممبروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ضلعوں اور ڈویژنوں کی کونسلوں کے تمام غیر سرکاری ممبر حکومت کے نامزد ہوں گے۔ اور ۵۰ فیصدی نشستیں انہی کے لئے متعین ہوں گی اور باقی ۵۰ فیصدی سرکاری عہدہ داروں کے لئے یونین پنچایتوں یا مقامی کونسلوں کی سطح سے اوپر تمام کونسلوں میں صدر ہمیشہ علاقے کا سرکاری افسر اعلیٰ ہی ہوگا۔

ممکن ہے یہ ادارے بحث مباحثہ کے اکھاڑے بن کر رہ جائیں۔ اور ذمہ داری منتشر ہو جائے۔ اس خطرے کی پیش بندی کے لئے تمام عاملانہ اختیارات صدر ہی کو سپرد کئے گئے ہیں۔ اور مشاورت کا کام اراکین کے سپرد ہے۔ امید ہے اس طرح صدر پوری آزادی سے اور مؤثر طور پر کام کر سکے گا۔

مزید تحفظ کے لئے ان جمہوری اداروں کو انتظامیہ کی مؤثر نگرانی کے تحت رکھا گیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر، کمشنر اور گورنر ماتحت کونسلوں اور پنچایتوں کے نگراں حاکم مقرر کئے گئے ہیں۔ انہیں بنیادی جمہوریتوں پر وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں تاکہ یہ ادارے ٹھیک طرح کام کرتے رہیں۔

بنیادی جمہوریت کے صدارتی حکم میں کونسلوں کے غیر سرکاری اراکین کی تین قسمیں مقرر کی گئی ہیں۔

منتخب اراکین وہ ہوں گے جو الیکشن جیت کر مقامی کونسلوں میں جگہ لیں۔ "نمائندہ" اراکین وہ ہوں گے جنہیں ارباب اختیار بلند تر سطح کے اداروں کے لئے چنیں اور "مقرر شدہ" اراکین وہ ہوں گے جنہیں نگراں حاکم مختلف سطحوں پر جن میں مقامی کونسل بھی شامل ہے۔ حصہ لینے کے لئے مقرر کرے ان مقرر شدہ اراکین کو بالاتر کونسل کے سوا کوئی نہیں ہٹا سکتا۔

بنیادی جمہوریت میں اراکین کی حیثیت بعض ایسی نہیں ہوگی جیسے بے تنخواہ سرکاری ملازمین کی۔ وہ درحقیقت بالکل انتظامی مشنری کا جزو بن جائیں گے۔ ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے کسی صنعتی کارخانہ میں فورمین کی۔ کہ وہ مزدوروں ہی میں شامل ہوتا ہے۔ اور وہ انہیں میں سے ترقی کر کے فورمین بنتا ہے اور وہ منتظمین میں بھی شامل ہوتا ہے کیونکہ وہ مزدوروں پہ

نگرانی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ نیز عزت جو اسے مزدوروں کی نظر میں حاصل ہوتی ہے، دونوں اپنے کاریگروں کا تعاون حاصل کرنے اور انتظامی پالیسی پر عملدرآمد کرانے میں اسے مدد دیتے ہیں۔ پھر ایک کاریگر کی حیثیت سے اس کا ذاتی تجربہ اور مزدوروں کے ساتھ ربط و تعلق اسے انتظامی پالیسی کی تشکیل میں بھی مدد دیتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے بنیادی جمہوریتوں کے اراکین ایک ایسا پل بن جائیں جو حکومت اور عوام کے درمیان ربط قائم رکھتا ہے۔

اگر بنیادی جمہوریت کے حکم نامے کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اختیارات کی تقسیم اور نمائندگی کی جو وضع اس میں متعین کی گئی ہے وہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ جوں جوں لوگوں کی خود پر حکومت کرنے کی صلاحیت اور انتظامی تجربہ بڑھتا جائے گا۔ ان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ منتخب و نامزد سرکاری اراکین کی آخری حد تو مقرر کی گئی ہے مگر غیر سرکاری اراکین کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔

صدر پاکستان نے ایک ایسی جمہوریت کا وعدہ کیا تھا۔ جسے لوگ سمجھ سکیں اس بارے میں جو قانون وضع کیا گیا ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ رائے دہندہ اور اس کا منتخب نمائندہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ منتخب رکن کی سرگرمیوں کا علاقہ ووٹ دینے والے کے اس قدر قریب ہوگا کہ وہ اس کے وعدوں اور کارگزاری کا بخوبی اندازہ کر سکے گا۔ اس طرح ووٹر کو اپنے ووٹ کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی اور وہ یہ بھی سمجھ جائے گا کہ اسکے نمائندوں میں سب سے اہم کی جانچ پرکھ کیسے کی جائے۔

اس حکم کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ پہلی بار ایسا مضبوط سیاسی نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو دیہات اور صوبے کے صدر مقام میں ربط پیدا کرے۔ قبل ازیں یہ کیفیت تھی کہ انتظامیہ تو عوام تک پہنچ جاتی تھی مگر سیاسی نظام کا دیہات کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس کمی کو موجودہ نظام نے اس خلا کو پر کر دیا ہے جو برطانوی وضع کی جمہوریت میں باقی رہ گیا تھا۔ یہ نظام بالائی سطح میں تو جمہوری تھا لیکن اس سے نیچے تمام کا تمام نظم بیوروکریسی تھا لیکن اس میں نیچے کے طبقوں کا ہاتھ بھی کارفرما مفقود تھا۔

اس لئے اس کی عمارت دھڑام سے نیچے آ رہی۔

نئے نظام نے حاکموں اور عوام کے درمیان ربط و تعلق کی نئی نئی راہیں وا کر دی ہیں اور ساتھ ہی حکومت کے یکطرفہ ہونے کی وجہ سے جو کمزوری پیدا ہو گئی تھی اس کو دور کر کے اس کی بنیاد مضبوط کر دی ہے۔

آپ پوچھیں گے بنیادی جمہوریت کی اس نئی اسکیم اور معاشرتی ترقی کے منصوبوں میں کیا تعلق ہے جو کچھ عرصہ سے ملک میں نمو پاتے رہے ہیں! دونوں کا مدعا یہ ہے کہ جو اجتماعی مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں ان کے حصول میں عوام کو شریک کیا جائے۔ دونوں عوام کو کسی قدر ذمہ داری اور اختیار کو استعمال میں لانے اور زیریں سطح پر حکومت کے کچھ کام کرنے کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ دونوں معاشرتی بہبودی کے لئے مقامی وسائل کو، خواہ وہ انسانی ہوں یا مادی، کام میں لانے کے خواہاں ہیں۔ دونوں ملک کے آئندہ رہنماؤں کے لئے تربیت کا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ یہ دونوں دفتری سررشتوں پر اس امر کے لئے انحصار کرتے ہیں کہ ان کے واقف کار عمال مختلف سطحوں اور گوناگوں طریقوں سے عوام میں قیادت اور رہنمائی کی صلاحیت پیدا کریں۔ جہاں تک ان کی تنظیمی دشت بہبت، اختیارات اور انتظامی لائحہ عمل کا تعلق ہے۔ جمہوری خصوصیات دونوں میں بڑی شدت سے نمایاں ہیں۔

اس کے ساتھ ہی بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی کی تکنیک، طریق کار اور وسعت میں کچھ فرق بھی ہے۔ رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے لئے اجتماعی ترقی زیادہ تر ذہنی تربیت پر انحصار کرتی ہے اور ایسی اجتماعی تعداد سے جواز حاصل کرتی ہے جو پہلے ہی سے موجود ہوں یا انہیں پھر سے زندہ یا تخلیق کیا گیا ہو۔ اس کے برعکس بنیادی جمہوریت کی بنیاد عوام کی رضا و منشا پر ہے جس کا اظہار اس کے نمائندے یا روشن خیال افراد کریں۔

اجتماعی ترقی کا دامن ایسی ضرورتوں سے وابستہ ہے جنہیں ہم حقیقتاً محسوس کریں۔ اس لئے کام تاخیر کے بغیر ممکن نہیں بنیادی جمہوریتوں کا کام اس نوعیت کا ہے کہ جو جو باتیں عوام کی بھلائی کے لئے ٹھیک معلوم ہوئیں ان پر فوراً فیصلے کئے اور لوگوں کو ان سے بہرہ ور کر دیا گیا۔ جب تک بنیادی جمہوریتوں کے غیر سرکاری ارکین یہ اہلیت رکھتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورتوں اور خواہشوں کی نمائندگی کر سکیں معاشرے کی ان ضروریات سے باخبر ہونے میں کوئی خلل پیدا نہیں ہو سکتا۔

مقامی حکومت کے کام کرنے والے حلقوں کا تعین خود قانون ہی نے کر دیا ہے۔ لیکن اجتماعی ترقی کے عامل حلقے اس بات پر موقوف ہیں کہ معاشرہ کس درجہ ترقی یافتہ ہے کس حد تک متحد ہو سکتا ہے اور ان مسائل کو جانچنے اور ان کو قبول کرنے پر تیار ہے یا نہیں جنہیں وہ اپنی بے خبری یا بے پروائی کے باعث محسوس نہیں کر سکا تھا۔ لہٰذا اجتماعی ترقی اپنا کام چلانے کے لئے ایک یا زیادہ گروہ ذیلی گروہ یا دیہی جماعتیں چن لیتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مقصد کوئی خاص عارضی منصوبہ ہو یا بہت سے لمبی میعاد کے منصوبے ہوں۔

بنیادی جمہوریت کو اپنے سربراہ اسی طریقے سے چننے پڑتے ہیں اور ان وقفوں کے بعد جو اس قانون کے مطابق مقرر کئے جا چکے ہیں۔ لیکن اجتماعی ترقی کے ادارے سربراہوں کو پہچاننے، ان کی تربیت کرنے، چننے اور پوری طرح کام کا اہل بنانے کے لئے کئی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً سیدھے لوگوں نے مل جل کر کسی کو خود ہی سربراہ مقرر کر لیا یا آواز بلند کسی کی تائید کر دی۔ یہاں تک کہ خفیہ پرچی کے ذریعہ بھی رائیں معلوم کر لی جاتی ہیں۔ "بنیادی جمہوریت" میں صدر کا منصب ضابطے قانون پر مبنی ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت اور اختیارات بھی زیادہ ہیں۔ چونکہ اجتماعی ترقی کے صدر کی پشت پر قانون و آئین کی ایسی کوئی قوت نہیں ہوتی اس لئے ممکن ہے کہ وہ اتنے اعتماد و یقین کے ساتھ کام نہ کر سکے۔

غرض اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریت دراصل ایک ہی سلسلۂ ارتقاء کے دو مرحلے ہیں۔ ایک کا مقصد ہے کاموں کا جائزہ لینا، باضابطہ نہیں بلکہ آزمائشی۔ دوسرا بالکل منظم باضابطہ اور مستحکم۔

لہٰذا ہم بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی میں طریق کار، درجہ اور وسعت میں جو فرق محسوس کرتے ہیں وہ محض درجہ کا فرق

ہے، نوعیت کا فرق نہیں۔ بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی ایک ہی چیز کی زیادہ ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ جب بنیادی جمہوریتیں کام کرنے لگ جائیں گی تو دیہی ترقی کے کئے ہوئے کاموں یا جاری کاموں سے غیر متعلق نہ رہ سکیں گی بلکہ انہیں اپنائیں گی اور باقاعدہ اداروں کی صورت عطا کریں گی۔ یہ فرق نظری طور پر اہم نہیں اور عملی طور پر بڑے معمولی ہیں۔ لیکن ان کا دوبارہ بیان کرنا ضروری تھا تاکہ یہ حقیقت یاد رہے کہ "بنیادی جمہوریت ایک حرکی تصور ہے اور جوں جوں معاشرہ اپنی صلاحیتوں کو نمو دیتا جائے گا لوگوں کا خود اعتمادی کی طرف قدم بڑھتا جائے گا، بنیادی جمہوریتوں کے جن جن درجوں پر جو بھی سربراہ ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ہر مرحلہ پر کیا روش اختیار کریں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ایک طرف ترقی دیہات کی تحریک اور اجتماعی ترقی اور دوسری طرف مقامی حکومت کی سرگرمیوں کے سلسلے ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ در اصل دنیا کے متعدد حصوں میں جو مطالعے کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاشرہ ترقی کرتے کرتے ایک خاص درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو جو کام یہ پہلے اپنی ترقی کے لئے خود بخود انجام دیتا رہا تھا وہ انہیں باقاعدہ اداروں کی شکل دینے کی ضرورت محسوس کرنے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کو مقامی حکومت اور اجتماعی ترقی میں تضاد نظر آیا ہے۔ جہاں مقامی حکومت نہایت کمزور ہو وہاں اجتماعی ترقی کامیاب رہتی ہے۔ پھر بھی اجتماعی ترقی کی کامیابی اور بقا کا دار و مدار مقامی حکومت ہی کے استحکام پر ہوتا ہے کیونکہ اسے باقاعدہ مالی اور دوسری امداد اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تناقض یوں دور ہو جاتا ہے کہ ہم اجتماعی ترقی کو مؤثر مقامی حکومت کا زینہ خیال کریں۔ اس لئے یہ بات اجتماعی ترقی کا کام کرنے والوں کے لئے نہایت اہم ہو جاتی ہے کہ وہ مقامی حکومت کے لئے حمایت حاصل کرنے اور اس کو مضبوط بنانے کی کوششیں عمل میں لاتے جائیں۔

اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریتوں میں جو گہرا تعلق پایا جاتا ہے اس کا مشاہدہ ہندوستان میں کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے تین بہترین منصوبوں میں منصوبہ بنانے والے افسروں نے پنچایتوں اور امداد باہمی کی انجمنوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

اسی طرح ایک افریقی تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اجتماعی ترقی کے کارکنوں کے بنائے ہوئے دار المطالعہ ناکام ثابت ہوئے کیونکہ اجتماعی حکومت اور مقامی حکومت کے مابین تعاون کا فقدان تھا۔

بنیادی جمہوریت سے متعلق صدارتی حکم منتخب اداروں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور بنیادی جمہوریت کی حدود میں ان کی ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چونکہ بنیادی جمہوریت کے انتظامی یونٹوں کا پیمانہ بڑا ہے اس لئے ممکن ہے بنیادی جمہوریت کے سب سے نچلے درجہ کا انتظامی یونٹ ایک عام گاؤں سے بڑا ہو۔ لہذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقیٔ دیہات کے پروگرام کے تحت جو دیہی کونسلیں قائم کی گئی ہیں۔ یعنی زرعی و صنعتی ترقیٔ دیہات کے ادارے بڑی حد تک حسب معمول کام کرتے رہیں گے اور بلند تر سطحوں پر بنیادی جمہوریت کی اعانت کرتے رہیں گے۔ بہت اچھا ہو گا کہ اہل دیہات کو اس بنیادی ادارے اور اس کے نظام عمل کو غیر رسمی طور پر ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔ دیہات میں قانون کے ذریعہ زبردستی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش دیہی زندگی پر برا اثر ڈال سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ہو سکتا ہے کہ اس سے دیہات کے مختلف گروہوں میں دھڑے بندی اور بھی مضبوط ہو جائے۔ چنانچہ سر مالکم ڈارلنگ کی رپورٹ شاہد ہے کہ پنجاب کے ۵۰ فیصدی گاؤں ان کاشتکار ہیں۔ اور ایک ایسے معاشرے میں جمہوریت اور انتخابات کی ترویج جس میں اخوت و یگانگت کے رشتے زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوئے کچھ عجب نہیں کہ رنگ بھنگ پیدا کریں۔ ترقی دیہات کا پروگرام دیہاتیوں کی رضامندی سے کام کرنے کی تعلیم دے گا۔ اور اس طرح انہیں تیار کرے گا کہ وہ بتدریج جمہوریت کو سمجھیں اور اسے اس طرح چلائیں کہ وہ سب کے لئے باعث تسلی ہو۔

لیکن چند وجوہ کی بنا پر اندیشہ ہے کہ اگر ادارہ جاتی تحفظات نہ ہوں یا پیدا نہ کئے جائیں تو اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریت میں رقابت اور کشمکش پیدا ہو جائے۔

چنانچہ اجتماعی ترقی کے پروگراموں سے متعلق اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ "سیلون، مغربی الہند اور افریقہ کے برطانوی علاقہ میں اجتماعی ترقی کے افسروں اور ان لوگوں کے مابین جو حکومت کو استوار کرنے کے ذمہ دار ہیں، کچھ رقابت اور کشمکش پائی جاتی ہے۔ اس رقابت کا سبب یہ ہے کہ ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی کما حقہٗ توضیح نہیں کی گئی۔ بہت سارا کام جو ترقی دیہات کا سارہ مرانجام دے رہا ہے، بنیادی جمہوریت اسے دیکھتا نے ... سے قاصر ہے لیکن اس کے علاوہ اور بہت سا کام ہے ... بنیادی جمہوریت کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے بنا بریں ... پیدا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے ترقی دیہات کسی کام کو کرنے ... اہل تر ... بنیادی جمہوریت یہ چاہتی ہو کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لے حالانکہ وہ اس کی اہل نہیں اور نہ ایسا کرنے کی نیت ہی رکھتی ہے۔ لیکن بنیادی جمہوریت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے لے۔

یہ بھی امکان ہے کہ دونوں اداروں کے افراد معاشرے میں اپنا مرتبہ یا اقتدار بڑھانے کے لئے آپس میں ٹکرا جائیں۔ اگر اس رقابت کی روک تھام نہ کی جائے تو ممکن ہے وہ ان کے دیگر اراکین میں بھی پھیل جائے۔ اور پھر اس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے۔

آخر میں ایک اور خطرہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے چونکہ بنیادی جمہوریت کو قانون کی تائید حاصل ہے اس لئے ممکن ہے روایتی لیڈر اس کی طرف رجوع ہوں۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی مذکورہ بالا رپورٹ میں درج ہے کہ ممکن ہے روایتی لیڈر اور مقامی سیاست داں اجتماعی ترقی کے پروگرام کی مخالفت کریں کیونکہ وہ اسے اپنی حیثیت کے لئے خطرناک خیال کرتے ہیں۔ شاید وہ یہ پسند نہ کریں کہ موجودہ حلقۂ اختیار سے باہر کچھ قائد خود بخود پیدا ہو جائیں۔"

ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے جو دیگر ممالک کے اجتماعی ترقیاتی پروگراموں اور مقامی حکومتوں میں پائی گئی ہیں، یہ ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ان اداروں کا ایک دوسرے کا ممد و معاون ہونا ظاہر ہو تاکہ یہ ایک دوسرے کے حریف رہیں۔ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ بنیادی جمہوریت اور انتظامیہ ترقی دیہات دونوں کے عملے کی نگرانی، تربیت اور رہنمائی کی ذمہ داری کو آپس میں مربوط کر دیا جائے۔ اس انتظام کے فوائد یہ ہیں کہ پروگرام کے عاملین، فرائض اور ذمہ داریوں کو متعین کر سکیں گے۔ جس سے نہ تو کام کی خواہ مخواہ تکرار ہوگی اور نہ وسائل ضائع پائیں گے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی ہو جائے گی کہ لوگوں کا "اپنی مدد آپ" کا جذبہ کند نہیں ہوگا اور نہ گاؤں میں عمل کی خرابی پیدا ہوگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس بات کی ضمانت ہو جائے گی کہ دیہی کونسلیں اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے تحت جن منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں گی وہ بنیادی جمہوریت کے تحت برقرار رہیں گی۔ اس طرح اجتماعی ترقیاتی پروگرام "اپنی مدد آپ" کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ جس سے مقامی حکومت ایک موثر ادارہ بن جائے گی۔

علیٰ ہذا بنیادی جمہوریت ان اداروں اور قدروں کی محافظ بن جائے گی جو اجتماعی ترقی کے تحت بروئے کار آئیں گی۔

بنیادی جمہوریتوں اور دیہی ترقی کا عاملانہ نظم و ضبط ڈپٹی کمشنروں اور کمشنروں کے ہاتھ میں دے کر اس بات کو یقینی بنا دیا گیا ہے کہ یہ دونوں ادارے آپس میں پوری طرح مربوط ہو جائیں۔

اعلیٰ سطح پر ادارے قائم کر کے بنیادی جمہوریت ان سے بھی ان کی حیثیت کے مطابق اجتماعی ترقی کے لئے امداد حاصل کر لیتی ہے۔ مگر سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بنیادی جمہوریت ایک ایسے رابطہ کو ادارے کی شکل عطا کرتی ہے جو حکومت اور عوام کے مابین ہونا چاہیئے اور جس کے لئے اب تک کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ نیز بنیادی جمہوریت ناظم کردائے جامہ کی طرف اس طرح ملتفت کرتی ہے کہ یہ جمہور متنوع چا قائیوں کے ساتھ اتفاقی طور پر بعض منتخب دیہاتیوں جہاں آسانی سے پہنچا جا سکے، ... کے دورے یا بظاہر خود بخود منعقد ہونے والے جلسے،

جس کا ماتحت عہدہ داروں نے بندوبست کیا ہو، زیادہ تسلی بخش ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے رائے عامہ کو ایک خاص وقار حاصل ہوتا ہے۔ اور حکومت اور عوام میں خیالات اور معلومات کا برابر تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ حکومت نے ان جمہوری اداروں کی پرورش اور ترقی کے سلسلہ میں اپنے ملازمین ان کی ذہانت اور لیاقت پر اعلیٰ بڑی ہی خوش اعتمادی ظاہر کی ہے یہ ایک بالکل نیا کام ہے اور افسران کے اندازِ نظر میں تبدیلی کا متقاضی ہے۔ ایک شدید خرابی جو ان حالات میں پہلے ہی محسوس کی جا سکتی ہے اور جسے منتظمین کو پہلے ہی سے اپنے طور پر حل کرنا ہوگا، یہ ہے کہ رفاہِ عامہ کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط کے تقاضے کیسے پورے کئے جائیں تاکہ دونوں کام بخوبی پورے ہوتے رہیں۔ نظم و ضبط کا ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے ڈپٹی کمشنر کا فرض یہ ہے کہ مجرم کو قرار واقعی سزا دے، اس پر ذرا بھی رحم نہ کرے اور اس کے دل میں قانون کا ڈر پیدا کرے دوسری طرف رفاہِ عامہ کا کفیل ہونے کی حیثیت سے لازم ہے کہ وہ مجرم کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے، اسے بنیادی حفاظت مہیا کرے، اسے بتائے کہ وہ کیسے اچھی زندگی بسر کر سکتا ہے اور اس طرح اسے مستقل طور پر بہتر بنا دے۔ یہ وہ انتہائی صورتِ حال ہے جو امکاناً پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ان مسائل پر نمایاں روشنی ڈالتی ہے جن کا نئی انتظامیہ کو اُس وقت سامنا کرنا پڑے گا جب کہ بنیادی جمہوریتیں وجود میں آجائیں گی۔ درحقیقت نظم و ضبط کا کام صرف باہر امن و حفاظت مہیا کرنا ہے اور اصلاحی کارکنوں کا اندرِ امن و حفاظت بہم پہنچانا ہے۔ ان دونوں کے میدان الگ الگ ہیں لیکن ان کی کوششیں ایک دوسرے کا کام پورا کرتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ افسر لوگ بے حد مصروف ہوتے ہیں، اور ڈپٹی کمشنر تو اور سب افسروں سے زیادہ مصروف ہوتے ہیں۔ اور بے حد گراں بار، اور جمہوریت ایسی چیز ہے جس کے لئے بڑا صبر و سکون اور دق کرنے والی باتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت بھی۔ بسا اوقات جمہوری اداروں کے رہنماؤں کو اراکین کی پُر پوچ باتیں اور فضول تقریریں بھی سُننی پڑتی ہیں۔ اگر اکثریت کوئی فیصلہ کر دے تو ان کا دل اتنا بڑا ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مرضی یا کھلی رائے کے خلاف اسے قبول کر لیں۔

ان اداروں کو چلانے کے لئے ضروری ہے کہ سرکاری افسروں کو ان کے کام کا پورا پورا وقوف ہو۔ اس مقصد کے لئے ترقی دیہات کی پاکستانی اکادمی سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس میں یہ تربیت دی جا سکتی ہے کہ عاملانہ اختیار حاصل ہونے پر کس طرح کارگزاری کی جائے تاکہ جو لوگ ان کے زیرِ اختیار یا سربراہی میں کام کر رہے ہوں ان میں اپنے آپ پر بھروسہ اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ اب تک ترقی دیہات کا پروگرام مغربی پاکستان کے ۴۰ فیصد سے کچھ کم رقبہ ہی پر حاوی رہا ہے۔ اگلے پانچ سالہ منصوبے کے ختم ہونے تک امید ہے یہ سارے صوبے پر حاوی ہو جائے گا۔ جن علاقوں میں ترقی دیہات کا سلسلہ نہیں پہنچ سکا تھا اور وہاں میدان خالی پڑا تھا، اب بنیادی جمہوریت نے خلا پورا کر دیا ہے۔ ترقی دیہات اور بنیادی جمہوریت کے اس ربط باہمی کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ جہاں کئی علاقے ایسے ہوں گے جنہیں ترقی دیہات نے بنیادی جمہوریت کے لئے تیار کیا ہو وہاں جلد ہی ایسے علاقے بھی پیدا ہو جائیں گے جنہیں بنیادی جمہوریت ترقی دیہات کے لئے تیار کرے گی۔

لہٰذا یہ خیال کرنے کے لئے کافی وجہ موجود ہے کہ ترقی دیہات اور بنیادی جمہوریت ایک دوسرے کو تقویت بہم پہنچائیں گی اور ایک ایسے جمہوری پاکستان کی ترقی اور نشوونما کا باعث ہوں گی جو مضبوط اور تندرست ہو۔

(ترجمہ و تلخیص)

★

خراجِ آخریں

محمود نظامی

(مرحوم)

ن۔م۔ راشد

حفیظ ہوشیارپوری

ن۔م۔ راشد

گذشتہ ڈیڑھ برس میں میں نے کراچی اسٹیشن پر محمود نظامی کو تیز گام سے جب بھی رخصت کیا ہے گلے لگ کر رخصت کیا ہے۔ آج میں ابھی تیز گام سے اسے رخصت کرنے گیا تو اس نے ہاتھ تک نہیں ملایا مجھ سے بات تک نہیں کی۔ کسی سے بھی تو ہاتھ نہیں ملایا۔ کسی سے بھی تو بات تک نہیں کی۔ حالانکہ آج کراچی اسٹیشن پر اس کے دوستوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ جو اسے لاہور رخصت کرنے آئے تھے۔ آج وہ کسی سے بغلگیر نہیں ہوا۔ اس نے کسی پر فقرہ نہیں کسا۔ کسی پر پھبتی نہیں کسی۔ کل لاہور میں محمود نظامی کو سپردِ خاک کر دیا جائے گا اور اس کے مداح ہمیشہ کے لئے اس کی بذلہ سنجی اور سخن طرازی سے محروم ہو جائیں گے۔

ایسا دوست دار آدمی جس کو دوستوں کے بغیر چین نہیں پڑتا ہو۔ ایسا بذلہ سنج جس کی زبان سے فقروں کی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہوں ایسا بزم آرا جس کی موجودگی سے ہر محفل باغ و بہار بن جائے۔ ایسا مہمان نواز جس کے لئے زندگی کی سب سے بڑی لذت مہماں نوازی ہو!

یوں تو محمود نظامی سے وابستگی ایک زمانے سے چلی آتی تھی۔ اس زمانے سے جب ہم اور وہ لاہور کے دو مختلف کالجوں میں پڑھتے تھے لیکن ہمارے لئے فیضان کا سرچشمہ ایک ہی ذات تھی تاثیر مرحوم کی جن کی محفلوں میں سالہا سال شریک ہوتے رہے۔ لیکن نظامی کے ساتھ وہ ملاقات جو نیویارک میں ہوئی کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ میں نیویارک میں ابھی تازہ وارد تھا کہ چند ہی دنوں میں نظامی بھی کسی فیلوشپ پر وہاں پہنچ گئے اور ہوٹل میں قیام کیا جس میں میں مقیم تھا۔ یہ ساتھ چند ہفتوں کا رہا۔ دن بھر تو ہم لوگ اپنے اپنے کام میں لگے رہتے لیکن شام کو ہماری محفل جمتی۔ اس محفل میں دو آدمیوں کی جلوت نے وہ خلوت مہیا کی کہ شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔

ان محفلوں میں دنیا جہان کی باتیں ہوتی تھیں۔ مذہب کی باتیں۔ سیاست کی۔ ادب کی۔ فن کی۔ فلسفے کی۔ معاشرتی مسائل کی۔ اپنے اپنے پیشے کی۔ امریکہ اور امریکنوں کی۔ نظامی نہایت ہلکے پھلکے انداز میں ایسی ایسی پتے کی باتیں کہہ جایا کرتے تھے کہ آدمی گھنٹوں سر دھنتا رہ جاتا تھا۔ میں انہیں بہت سے امریکی گھروں میں لئے لئے پھرا وہ جہاں بھی گئے اپنے ذہن کی براقی کا پائدار نقش چھوڑ آئے۔

نظامی نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ براڈکاسٹر کی حیثیت سے گذارا۔ ریڈیو سے انہیں صحیح معنوں میں عشق تھا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ تنہا انہوں نے ریڈیو کے گوناگوں پروگراموں کے لئے جو مضامین یا بنیادی خیالات بہم پہنچائے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔ آج بھی ریڈیو کے اکثر پروگرام انکی اپج اور جدت طرازی کے ممنون ہیں۔

محمود نظامی کا سینتالیس برس کی عمر میں اس دنیا سے اٹھ جانا ہم سب کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ یہ عمر کی وہ منزل تھی جس میں ہم سب ان سے اور بھی پختہ تر اور وسیع تر کارناموں کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی تالیفات ان کے ذہن کے اصلی کمالات کی بہت کم نمائندگی کرتی تھیں۔ لیکن "نظر نامہ" ان میں یقیناً زندۂ جاوید تصنیف ثابت ہوگی۔ ایسے دلچسپ اور متنوع مشاہدات اردو میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

حفیظ ہوشیار پوری

"باغ و بہار انسان"

اب سے کوئی اٹھائیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں گورنمنٹ کالج میں تھا ایک دبلا پتلا شخص آیا اور اس نے اتنی تیزی سے کچھ کہا کہ میں صرف یہ لفظ سن سکا" اسلامیہ کالج " "تاثیر" میں نے کان کھڑے کئے اس نے فقرہ دہرایا تو معلوم ہوا کہ اسلامیہ کالج سے تاثیر صاحب نے "بزم فروغ اردو" کے جلسے میں بلایا ہے اور پیغام لانے والے ہیں محمود نظامی جو بزم فروغ اردو کے سکرٹیری ہیں یہ تھی نظامی سے میری پہلی ملاقات اور لاہور میں میری ادبی زندگی کا آغاز۔ چند ہی روز میں مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں پہلی ہی ملاقات کے بعد ان کی بے تکلفی بذلہ سنجی اور بے ریائی نے دل پر کچھ ایسے نقوش چھوڑے جو ہر نئی ملاقات کے بعد اور گہرے ہوتے گئے اور آج جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں یہ نقوش اور بھی ابھر آئے ہیں۔

"اسلامیہ کالج" "تاثیر" "بزم فروغ اردو" اور "نظامی" اس زمانے کی ادبی زندگی میں ہم معنی لفظ تھے۔ ادھر مصرع ثانی ان لفظوں سے مرتب تھا گورنمنٹ کالج "بخاری" "اردو مجلس" اور "آغا حمید" یہ چند لفظ اس زمانے کی ادبی زندگی کی ایک پوری داستان بیان کر رہے ہیں جن کے نہایت اہم کردار ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ نظامی ان دونوں محفلوں کی جان تھے لیکن وہ تنقید سے زیادہ تخلیق کے ماہر تھے تنقید ان کے بس کی بات نہ تھی تنقید کا مفہوم ان کے نزدیک اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جو جی میں آیا منہ پر کہہ دیا۔

دوسری جنگ عظیم نے ہم دونوں کو آل انڈیا ریڈیو لاہور میں یکجا کر دیا اور یہیں نظامی کی ڈرامائی شخصیت اور جدت پسندی کے بہترین جوہر کھلے۔ ریڈیو کی فوری اور ہنگامی ضروریات کسی کا انتظار نہیں کرتیں نظامی کے چلبلے پن اور تیزی طبع نے اس میدان کو اپنے لئے جتنا کارآمد پایا اس سے زیادہ اپنے آپ کو اس کے لئے مفید ثابت کیا۔ ریڈیو میں آکر ہمیں سب سے پہلے اس بات کا احساس ہوا کہ آسان زبان لکھنا اور پھر تیزی کے ساتھ کتنا مشکل ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ نظامی کی زبان اور ان کے قلم نے ایک دوسرے سے کبھی ہار نہ مانی۔ اور یہ بات ان کی عام زندگی میں بھی نمایاں تھی۔

اس زمانے میں لاہور ریڈیو اسٹیشن کا ڈائرکٹر ایک ایسا سر پھرا انسان تھا جس کی دقت نظر اور مشکل پسندی ہمارے "سمند شوق" کے لئے تازیانہ کا کام دیتی موسیقی اور ڈرامے سے اس کی فطری وابستگی اور اس کے انگریزی فارسی اور اردو ادب کے یکساں ذوق کی وجہ سے ہمیں نت نئی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ اور کبھی کبھی تو اس کی فہمائشیں سچ مچ تازیانے کی شکل اختیار کر لیتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے سب سے پہلا ٹاکس شڈول بنایا تو اس نے ایک ایک موضوع کو غور سے دیکھا چند موضوعات کی داد دی۔ سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ پھر ان سوالات کے جوابات کی تلاش کے لئے ایک ایسی بحث چھڑی جس سے موضوع فن اور ٹیکنیک کے اعتبار سے تحقیق اور جستجو کی نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ اس قسم کی بحثیں شروع شروع میں بڑی صبر آزما معلوم ہوتی تھیں لیکن ہوتے ہوتے ان میں ایسی جاذبیت اور کشش محسوس ہونے لگی کہ یہ نہ صرف ہمارے ریڈیائی مشاغل بلکہ ہماری عام ادبی سرگرمیوں کا بھی ایک لازمی جزو بن گئیں ایسے ڈائرکٹر کی ذہنی صلاحیتوں کا ساتھ دینا کسی فرد واحد کے بس کی بات نہ تھی۔ اور یوں بھی ریڈیو میں باہمی تعاون کی جتنی ضرورت ہوتی ہے شاید اور کہیں نہ ہو نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب نے مل کر ریڈیائی مسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ ان مسائل کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ ڈرامانگاری کے لوازمات۔ فیچروں اور روداری پروگراموں کی ٹیکنیک۔ تقریروں کے موضوعات ریڈیو کی زبان۔ اعلانات۔ شعر و موسیقی کا امتزاج۔ صوتی اثرات، اناؤنسروں اور اداکاروں کی صلاحیتیں۔ اسٹیشن ڈائرکٹر کے کمرے میں یا ان کے مکان پر ایک ایک مسئلے پر گھنٹوں بحثیں ہوتیں۔ ان بحثوں میں کون کون لوگ شامل ہوتے؟ پیرزادہ رفیع سید امتیاز علی تاج چراغ حسن حسرت صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ سید عابد علی عابد۔ پنڈت دینا ناتھ زتشی۔ آغا بشیر نظامی اور دوسرے حضرات۔

ہمیں حکم تھا کہ ہر روز نئے نئے خیالات اور اچھوتے موضوعات قلمبند کرکے لاؤ۔ حکم کی تعمیل آخر شوق میں بدل گئی شوق نے شغف کی صورت اختیار کی۔ اور شغف از خود رفتگی کی حد تک جا پہنچا کبھی صوتی اثرات کے تجربے ہو رہے ہیں۔ کبھی گانے کے لئے شعرا کے کلام کا انتخاب ہو رہا ہے۔ کبھی ایک موضوع پر فارسی،

اردو کے اشعار جمع کئے جا رہے ہیں اور پھر اس بات پر گفتگو ہو رہی ہے کہ ان اشعار کو کس طرح ایک لڑی میں پرو دیا جائے۔ ادھر میز پر کاغذ جمع ہو رہے ہیں کہ اس کے لئے الگ اسٹاف نہ تھا۔ رات کو "ٹرانسمشن" چلانے کا یہ کام بھی ہمارے ہی سپرد تھا۔ ٹرانسمشن کے وقت نظامی کی عجیب حالت ہوتی دونوں ہاتھوں سے پتلون اوپر کو اٹھاتے ہوئے اسٹوڈیو سے کنٹرول روم اور کنٹرول روم سے اسٹوڈیو کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ یہ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ راستے میں کس کس سے ٹکرائے۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ اپنے کام کو چھوڑ کر دوسروں کی امداد کے لئے بھی آ پہنچتے۔ ایک روز میں عورتوں کے پروگرام کی ریہرسل کرا رہا تھا۔ انہوں اتفاق سے لاؤڈ اسپیکر پر کچھ سنا، کھٹ سے میرے اسٹوڈیو میں آ دھمکے اور مائیکروفون کی پوزیشن بدل کر واپس چلے گئے۔

ریڈیو کو نظامی نے بہت کچھ دیا لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ابتدائی تجربے ہیں جنہیں ٹیکنیک اور فن کے اعتبار سے ریڈیائی ڈرامے کا سنگ بنیاد کہنا چاہیئے۔ ان دنوں صوتی اثرات کے ریکارڈوں کا بہت کم رواج تھا۔ اسٹوڈیوں کے اندر نئے نئے صوتی اثرات کے تجربے کئے جاتے جن کا تعلق کسی خاص ڈرامے سے نہ ہوتا۔ اور بعض دفعہ ان صوتی اثرات کی کامیابی کو آزمانے کیلئے چھوٹے چھوٹے مسودے لکھے جاتے نشر کرنے کے لئے نہیں، محض تجربے کے لئے۔ اس طرح نظامی کی تن دہی اور ذہانت نے ہمارے موجودہ ریڈیائی ڈرامے کی بنیادیں استوار کیں۔ اس فن میں نظامی کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ریڈیو کو محض ایک ذریعہ معاش کے طور پر اختیار نہ کیا تھا بلکہ اپنی بھرپور شخصیت کے پورے اظہار کے لئے۔

زبان و قلم کی بے ساختگی اور روانی بڑی فراوانی کے ساتھ ان کے حصے میں آئی تھی۔ بولتے تو سننے والوں کے کان آنکھیں بن کر رہ جاتے۔ لکھتے تو "قلم سے" مو قلم" کا کام لیتے۔ گفتگو کے وقت فوراً بھانپ جاتے کہ آپ ان سے کیا کہنے کو ہیں۔ ان کی آنکھوں کے گوشے سمٹ جاتے اور ہونٹوں پر لطیف مسکراہٹ کے ساتھ خفیف سی حرکت کا احساس ہوتا جیسے وہ اس بات کا جواب ذہن میں دہرا رہے ہوں جو آپ ابھی ان سے کہنے نہیں پائے۔

انہیں رات دن کوئی نہ کوئی دھن لگی رہتی۔ طبیعت میں ایک قسم کی بیتابی اور بے چینی تھی کسی بات کا انتظار ان کے لئے دوبھر ہو جاتا۔ اس سیمابی طبیعت نے ان کے ساتھ کچھ لطیفے بھی وابستہ کر دیئے ہیں۔ ایک روز ہم سب کو بخاری صاحب مرحوم کے ہاں جانا تھا۔ یہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی ایشورداس بلڈنگ (میکلوڈ روڈ) میں پہنچ گئے۔ اور اس زور سے انگلی رکھی کہ ملاقات کی گھنٹی کوئی ایک منٹ تک بجتی رہی۔ آخر بخاری صاحب مرحوم باہر نکلے "گھر میں کوئی نہیں نوکر بازار گیا ہوا ہے بچے کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ دس منٹ پہلے چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی نہیں سوچتے کہ گھنٹی کی آواز سن لی گئی ہے لیکن سننے والا مصروف ہے اور آپ اس کے کام میں مخل ہو رہے ہیں" یہ فقرے سن کر جن میں پطرس کے مخصوص طنز کے ساتھ ساتھ بزرگانہ متانت بھی شامل تھی نظامی صاحب ایسے رفو چکر ہوئے کہ مدتوں انہیں شکل نہ دکھائی دوسرے روز میں بخاری صاحب کے ہاں گیا تو گھنٹی کی تختی پر یہ لکھا تھا: B... PATIENT AND PATIENT

وہ سر پھرے اسٹیشن ڈائرکٹر جن کا میں ذکر کر چکا ہوں آج ہمارے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ جب یہ اسٹیشن ڈائرکٹر تھے تو نظامی ان کا "دریافت" تھے۔ جب یہ ڈائرکٹر جنرل بنے تو نظامی ان کے دست راست بن کر آئے۔ لیکن افسوس کہ موت کے آہنی پنجے نے انہیں قبل از وقت آن دبوچا۔ رشید احمد کا دایاں بازو شل ہو گیا۔ ایک ذہین اور محنتی رفیق کار اٹھ گیا۔ احباب کی محفل ایک مخلص دوست سے خالی ہو گئی۔

نظامی کی سیمابی طبیعت نے انہیں کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا کراچی آنے کے بعد زیادہ تر دورے پر رہے۔ ۹ فروری ۱۹۶۰ء کی صبح کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ ۱۲ فروری کی صبح کو دفتر آتے ہی میں نے اپنے ایک رفیق کار سے کہا میں نظامی صاحب سے ملنے جا رہا ہوں اس نے کچھ اور ہی خبر سنائی۔ میں نے جلدی میں کچھ لکھا اور کاغذ کا پرزہ میز کے ایک خانے میں ڈال دیا۔ آج جو یہ پرزہ اٹھا کر دیکھا تو یہ لکھا تھا،

اب محفل احباب میں تو ہے بھی نہیں بھی
اک عقدہ ہے گویا ترے مرنے کا یقیں بھی
(داہنگ)

آہ کیا کہئے بچارا ہم سے بھی تھا آشنا! (مدیر)

"ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (آنجہانی) کے یہ چند فارسی اشعار دراصل ایک منظوم مراسلہ میں جو انہوں نے ۱۹۴۳ء میں استاذی حافظ محمود شیرانی مرحوم کو تحریر کیا تھا۔ اس وقت حافظ صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) دریا گنج دہلی میں مقیم تھے اور پنڈت کیفی ضلع لائل پور میں۔ ہمیں یہ یادگار اشعار حافظ محمود شیرانی مرحوم کے نواسے، جاوید محمود شیرانی صاحب نے عنایت فرمائے ہیں اور پنڈت کیفی کی ایک یادگار تحریر کے طور پر نذرِ قارئین ہیں:-

(مدیر)

مارِ نعرہ یک التفات آمد گرفتم نازِ حسن — در نیازِ عشق از مایاں چہ نقصاں دیدۂ

یاد آیا مے کہ از برقِ تبسم دائما — بزمِ یاراں را مثالِ طور رخشانیدۂ

اے کہ حرفت بودہ در بزم ادب فردوسِ گوش — رو چرا از شائقینِ خویش گردانیدۂ

روزہا شد التجائے دوستاں از حد گزشت — پا مگر از جادۂ رنجیدگی نکشیدۂ

اے سرت گردم نہ ایں باشد طریقِ دوستی — گفتہ باید آنچہ از یاراں قصورے دیدۂ

رنجِ تست اے بندہ پرور رنجِ جملہ دوستاں

اے بتِ طنازِ ما، از ما چرا رنجیدۂ

★

پاکستانی ادیبوں کا منشور آزادی

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

★

مجھے یہ محسوس کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ پاکستان رائٹرز گلڈ" آج ۳۱ جنوری (۱۹۶۰ء) کو ڈھاکہ میں اپنی پہلی سالگرہ منا رہا ہے۔ پچھلے سال اسی تاریخ کو جب میں نے کراچی میں ادیبوں کے کنونشن کے ایک اجلاس میں شرکت کی تھی تو مجھے وہ کیفیت محسوس ہوئی جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے" سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ میں اس وقت سے برابر آپ کی گلڈ کی رفتار ترقی کو بڑی گہری دلچسپی سے دیکھتا رہا ہوں اور یہ جان کر بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ آپ اہل قلم نے اپنی بہبود کے لئے جو تنظیم قائم کی ہے اس کی بنیاد بہت معقول و مستحکم اصولوں پر ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ جیسے اہلِ علم و دانش کو کچھ زیادہ سمجھانے کی تو ضرورت نہیں ہو سکتی مگر ایک عام قاری کی حیثیت سے اگر کچھ کہنے کی اجازت دی جائے تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنے آپ کو فکر و تصور میں بالکل آزاد، اظہار میں بے باک اور ماحول کی عکاسی میں بے دھڑک محسوس کریں۔ دیکھئے کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کوئی اندیشہ یا مصلحت کوشی آپ کی بُرّشِ طبع کو کند کر دے۔ میں والٹیئر کی روح سے متاثر ہو کر یہ بھی کہہ دوں کہ آپ جو کچھ کہیں، ہو سکتا ہے کبھی مجھے اس سے اختلاف ہو، بلکہ کبھی اس پر میں احتجاج بھی کروں، لیکن جہاں تک آپ کے حقِ اظہار کا تعلق ہے میں ہمیشہ اس کے لئے سینہ سپر رہوں گا، بشرطیکہ اس کی زد یا ضرب خود ہمارے ملک کی بقا پر نہ پڑتی ہو۔

مجھے علم ہوا ہے کہ آپ نے کئی اہم کاموں کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ آپ حضرات پاکستانی زبانوں کے ایک دوسرے میں تراجم کرنے کے سلسلے کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز رکھیں خاص کر اردو اور بنگلہ سے ایک دوسرے میں تراجم۔

میں ملک میں تعلیم کی جو وضع نو قائم کرنا چاہتا ہوں وہ بھی آپ کے کاموں کے لئے ایک بڑا وسیع میدان مہیا کرتی ہے۔ آپ اس سلسلے میں طلبا کے مختلف درجوں کے لئے ایسی نصابی کتب تحریر کر سکتے ہیں جو احساس وطن پر مبنی ہوں۔ یہ بڑی اہمیت کا کام ہے اور مجھے یقین ہے کہ گلڈ اس کام کو ضرور اپنے اہتمام میں لے سکے گی۔

کاش میں ڈھاکہ میں کچھ زیادہ دیر ٹھہر سکتا اور آپ کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں شریک ہو سکتا مگر دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے ایسا کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے، مگر یقین رکھئے کہ میری بہترین تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں +

(محمد ایوب خاں)

روداد چمن

(پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک سال)

قدرت اللہ شہاب

آج کی صحبت میں میں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کا بنیادی تصور کیا ہے۔

جب پچھلے سال اسی دن گلڈ کے قیام نے عملی صورت اختیار کی تو ہم میں سے اکثر جن میں خود میں بھی شامل ہوں یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ ایک کے بعد دوسرا ادیب اپنے خوابوں کے شبستان، اور ایک کے بعد دوسرا انشاء پرداز اپنے سنہری روپہلی محلوں سے نکل نکل کر باہر آتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب ایکسلسیر ہوٹل کراچی کے ایک کمرہ میں اکٹھے مل بیٹھ کر کچھ وقت گزارنے لگے جہاں گذشتہ ایک سال سے گلڈ کا مرکزی دفتر واقع ہے۔ اس کمرے کی کچھ نہ پوچھئے۔ اندھیرا اندھیرا سا دم گھونٹنے والا کمرہ جہاں ٹھنڈی چائے کی ایک ذرا سی پیالی بھی پینا چاہیں تو نہ جانے اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے۔ اور جہاں بیرے ہماری طرف بڑی حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ ہم نے ابھی تک اسے کرایہ دینے کا تکلف نہیں کیا اور نہ کچھ عرصے تک یہ زحمت گوارا کر سکیں گے۔ کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ ہم میں اتنی توفیق ہی نہیں!

ادھر باہر کی دنیا میں بھی ہم سے کچھ نیک سلوک نہیں ہوتا۔ ہوٹل میں ٹھنڈی چائے سے خاطر تواضع ہوتی ہے تو باہر کوئی سخت سرد مہری سے پیش آتا ہے۔ بعض ایسے بندگان خدا بھی ہیں جو ہوٹل کے بیروں کی طرح ہمیں نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ایسے بھی جو ہوٹل کے مالک کی طرح دعا مانگتے ہیں کہ ہمارا قصہ پاک ہو جائے تو وہ خوش ہو کر گھر گھر مٹھائی بانٹیں۔ اب کیا ضرورت ہے کہ میں اندر باہر یکساں سلوک بد تلخ نوائی کا سلسلہ آگے بڑھاؤں۔ کیونکہ میں اس سے کام ہونے سے تو رہا۔ میں تو ان حالات و واقعات پر نظر ڈالنے سے

دلی مسرت محسوس کرتا ہوں کہ جب سے ایک سال ہوا گلڈ کی باقاعدہ طور پر بنیاد رکھی گئی، ہوٹل ایکسلسیر کے اس چھوٹے سے کمرے میں کیا کچھ کارگزاری ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کو تفصیلات سے گراں بار نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا یقین جانیئے گلڈ کی تہہ میں جو تصور کار فرما تھا میں نے اسے اور اس کی خارجی ہئیت کو اس دوران غیر محسوس مگر قطعی طور پر نشو و نما پاتے دیکھا ہے جس طرح کسی دوشیزہ کے گھنے گھنیرے لانبے لانبے چمکیلے گیسو۔ آج کوئی شخص خیبر سے لے کر کاکس بازار تک جائے تو محال ہے کہ آٹھ گھنٹوں کے اندر اندر کسی ایسے کمرے یا گلیا یا چھوٹے سے گاؤں میں نہ جا نکلے جہاں کسی نے ہمارے گلڈ کا بلا یعنی قلم کی نشانی والا بلہ نہ لگا رکھا ہو اور آپ کا خیر مقدم کرنے کو تیار نہ ہو۔ اس باہمی رشتوں کے تانے بانے کو تیار ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ لیکن جہاں ایسے معاملات ہوں وہاں مدت کا سوال کچھ ایسا اہم نہیں۔ جو بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ بلہ لگاتے ہوں اور جو نہ لگاتے ہوں۔ وہ اسے محبت کی نظر سے دیکھیں نہ دیکھیں مگر اس کی برابر تعظیم کریں۔ میں تو اس دن کو دیکھنے کا آرزومند ہوں جب کسٹم انسپکٹر آپ کا اسباب کھول کر نہ دیکھیں یا ٹکٹ چیکر آپ کا ٹکٹ دیکھنے پر اصرار نہ کریں۔ کیونکہ آپ نے یہ بلہ لگا رکھا ہے جو قابل اعتبار ہونے کی علامت ہے۔ وہ دن جب کہ کوئی رعونت کیش دفتری فرعون آپ کو دو گھنٹوں تک ملاقات کے انتظار نہیں رکھے گا اگر آپ اپنا ملاقاتی کارڈ بھیجیں کہ جس پر یہ علامت موجود ہو جو اسے خود بخود آپ کی تعظیم کرنے پر مجبور کر دے۔ وہ دن جب یہ بلہ نفرت کی بجائے محبت حقارت کی بجائے تعظیم اور شک و شبہ کی بجائے اعتماد پیدا کرے۔

یہ ہے وہ نصب العین جس کو حاصل کرنے کے لئے میں گلڈ کے ایک ناچیز کارکن کی حیثیت سے جدوجہد کر رہا ہوں۔ لیکن اس سلسلہ میں آپ کو تین باتوں کی تنبیہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

پہلی تنبیہ تو میں خود اپنے آپ ہی کو کروں گا۔ یعنی ان لوگوں کو جو میری طرح گلڈ کے اراکین ہیں۔ ہمیں یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ گلڈ محض ایک ٹریڈ یونین ہے۔ یہ ایک تنظیمی جماعت ہے۔ ایسی جماعت نہیں جس کا کوئی مخصوص نظریہ ہو۔ گلڈ کا واحد نظریہ۔ اگر آپ مجھے اس اصطلاح کو برتنے کی اجازت دیں۔ ایک ہی ہے۔ فکر میں خلوص اور اس کو برتنے اور بروئے کار لانے میں حوصلہ اور آزادی سے کام لینا ــــــ اس کے علاوہ ہر کوئی اپنے دل کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص ادبی اور ذہنی سطح پہ کچھ لکھتا ہے تو وہ ذاتی حیثیت سے لکھتا ہے۔ گلڈ کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں۔ خواہ اس ادارہ میں اس کا منصب یا درجہ کچھ بھی ہو۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے تاکہ اس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

اب دوسری تنبیہ کی طرف آیئے۔ اس کا تعلق دفتری چودھراہٹ کے ان طبقوں سے ہے جو یہ شبہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ ممکن ہے گلڈ سیاسی معنوں میں بائیں بازو یا دائیں بازو کا حامی ہو جائے۔ نہیں۔ گلڈ کوئی سیاسی ادارہ نہیں ہے اور گلڈ اسی صورت میں ایک سیاسی ادارہ بن سکتا ہے جب ہم لوگوں کا خاتمہ کر کے ہمارے لاشوں پر چلا جائے۔ اس سے قطع نظر میں پوچھتا ہوں، دائیں طور پر بایاں ہونے یا بائیں طور پر دایاں ہونے میں کیا برائی ہے؟ ہر تخلیقی فن کار فطرتاً ناصبور ہوتا ہے۔ وہ لازماً اپنے گرد و پیش کی صورت حال سے مطمئن نہیں ہوتا کیونکہ اسے ہمیشہ ایک ناقابل حصول نصب العین کی تلاش رہتی ہے تاوقتیکہ یہ ذہنی اضطراب کسی اندرونی یا بیرونی دباؤ یا ترغیب کے تحت تخریبی نہ بن جائے۔ ادب میں نہ کوئی دایاں ہے نہ بایاں۔ اس میں صرف ایک سمت ہے۔ صراط مستقیم۔ دائیں یا بائیں کو دبانے کی ہر کوشش کا ایک ہی نتیجہ ہوگا۔ یہ کہ ادب کا رخ سیاسی دائیں بائیں کی طرف نہ ہو جائے۔ شاید ان میں سے ایک تلخ معلوم ہو اور دوسرا شیریں لیکن جہاں تک زندگی میں ایک خوشگوار توازن کا تعلق ہے یہ دونوں اس کے حق میں زہر ہیں۔

•

میری تیسری تنبیہ ــ یہ امیر لوگوں کے لئے ہے۔ ہمارا ملک ایسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے جن کے جسم اور جان اور زر کے ہجوم سے پھٹے پڑتے ہیں۔ ادھر ہم لوگ ادیبوں کی بھلائی کے لئے ایک بے نظیر منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے اہم کام کا بیڑا اٹھا رہے ہیں۔ اس کو اپنے ہی قومی وسائل سے کامیاب بنانا چاہتے ہیں کیونکہ بیرونی امداد کے لئے ہم دست سوال نہیں بڑھاتے۔ قبل ازیں ہمارے ہم وطن مالدار لوگوں نے فیاضی اور ادیب نوازی کے باب میں کیا کچھ نہیں کیا۔ ہم ادیبوں کے ساتھ نیک سلوک اور کار خیر ہے جو ان ارباب ثروت کی توجہ چاہتا ہے۔ مجھے ایک امیر آدمی کا قصہ یاد ہے۔ ان حضرت نے ایک فرانسیسی عطر کی بیس ہزار شیشیاں خرید لی تھیں محض اس لئے کہ یہ ایک نازنین لڑکی کے جسم کو خوشبو میں بسانے کے کام آئیں۔ اور لڑکی بھی وہ جس کے ساتھ انہیں محبت نہ تھی بلکہ محض ہوس تھی۔ میں ان صاحب کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ ہماری گلڈ پر اس سے آدھا بھی کرم فرمائیں تو سارا ملک اور زیادہ شاعری اور زیادہ نثر کی خوشبو میں رس بس کر مہک اٹھے گا۔

خواتین و حضرات: آیئے ہم سب مل کر دعا کریں کہ اگلے سال جب ہم گلڈ کی دوسری سالگرہ منائیں گے تو اس کے نئے سیکرٹری جنرل کو ان تنبیہوں کو دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آخر یہ کام کوئی ایسا خوشگوار بھی تو نہیں+

★

مستقبل کی اردو

ڈاکٹر محمد صادق

زندہ زبانیں کبھی ایک سی نہیں رہتیں۔ ان میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نئے الفاظ محاورات اور اسالیب بیان بنتے اور رواج پاتے ہیں اور پرانے بگڑتے اور مرتے چلے جاتے ہیں۔ تلفظ میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور معانی کا دائرہ وسیع یا تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گرامر اپنا راستہ بدلتی ہے۔ نئی چیزیں اور نئے خیالات اپنے نام ساتھ لاتے ہیں یا انہیں وضع کیا جاتا ہے۔ یہ اور کئی اور تبدیلیاں رفتہ رفتہ، نامعلوم طور پر معرضِ وجود میں آتی ہیں لیکن پرآشوب ادوار میں جب روایات کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے یا ایسے ادوار میں جب ایک مقابلۃً کم متمدن قوم کے ایک متمدن قوم سے سیاسی یا علمی روابط پیدا ہو جاتے ہیں، تو زبانیں نہایت سرعت سے بدلتی ہیں اور ترک و اکتساب کا فطری عمل شعوری شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اردو زبان نے جو اثرات فارسی اور انگریزی سے قبول کئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو تبدیلیاں اس میں رونما ہوئی ہیں وہ اس کلیہ کی واضح شہادت ہیں۔

مستقبل کی اردو پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں ان اثرات کا محض اجمالاً ذکر کروں گا جو ایک مدت سے اس پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور جن کا عمل مستقبل میں بھی بعینہٖ اسی طرح جاری رہے گا۔ البتہ وہ لسانی تبدیلیاں جو تشکیلِ پاکستان سے معرض وقوع میں آئیں گی اور آ رہی ہیں، خصوصیت سے غور طلب ہیں۔ اور میں ان سے کسی حد تک مفصل بحث کروں گا۔

اردو زبان پر جو اثرات ایک عرصۂ دراز سے طاری ہو رہے ہیں، دو ہیں۔ اول فارسی زبان کا اثر جس کا آغاز اردو کی ابتدا سے ہم کنار ہے۔ اور دوسرا انگریزی کا اثر جو بالخصوص ۵۷ء کے غدر کے بعد شروع ہوا۔ یہ دونوں اثرات مستقبل میں بھی بدستور جاری رہیں گے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی اور عربی سے ہماری موانست اس عقیدت کا نتیجہ ہے جو بحیثیت مسلمانوں کے ہمیں ان زبانوں سے ہے۔ یہ خیال بہت حد تک درست ہے۔ لیکن یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اول اول اردو، فارسی کے حریف کی حیثیت سے میدان میں آئی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا تو مسلمان فارسی سے بدظن ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے آجکل ہم انگریزی سے بدظن ہو رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا عام احساس ہو گیا کہ فارسی پرائی زبان ہے۔ اور ان کے دلوں میں اپنی زبان کو ترقی دینے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن اس تحریک کے بانی اور مؤید، خان آرزو۔ مظہر۔ سودا۔ میر۔ اور میر درد، سب کے سب فارسی کے عالم تھے۔ لہٰذا جب وہ فارسی کی تہذیب و تربیت کی طرف ملتفت ہوئے۔ تو انہیں اردو کو مالا مال کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ نظر آیا۔ یہ کہ فارسی خیالات، الفاظ، محاورات اور تراکیب کو اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ سلسلہ آج تک برابر جاری ہے اور فارسی سے مواد مستعار لینا ہماری فطرت ثانیہ ہو گئی ہے۔ جب بھی ہم کسی نئے خیال یا علمی نکتہ سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم معاً فارسی اور عربی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ زبانیں مدت سے ہماری علمی ضروریات کی کفیل رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔

اکثر سننے میں آتا ہے کہ فارسی اور عربی کے مستعار الفاظ اور مرکبات ہماری بے مائیگی یا کم مائیگی پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ الفاظ اس لئے مستعار لئے گئے کہ ہمارے ہاں ان کے مرادف الفاظ نہ تھے۔ لیکن کسی زبان کی تہی دامنی کا واحد علاج الفاظ کی درآمد نہیں ہے۔ قومیں اپنے ملکی مواد سے نئے الفاظ تراکیب اور مرکبات تیار کر لیتی ہیں اور اس کی ایک اچھی مثال جرمن زبان ہے۔ جس فراخ دلی سے ہم فارسی اور عربی الفاظ اپنی زبان میں داخل کرتے ہیں۔ اس کی مثالیں اور زبانوں میں بہت کم ملیں گی۔ انگریزی زبان نے بھی اجنبی مواد کو بہ افراط اپنے آپ میں سمو لیا ہے۔

لیکن نہایت خوش اسلوبی سے۔ نیز انگریز دیسی مواد یعنی اینگلو سکسن کو حقارت سے نہیں دیکھتے۔ اس کے برعکس ہم دیسی مواد کو اسی ترحم آمیز یا نفرت آمیز نگاہ سے دیکھتے ہیں جس طرح ہم اپنے مفلس اقربا کو دیکھتے ہیں۔ اور انہیں درخور اعتنا خیال نہیں کرتے۔ مانا کہ فارسی اور عربی عنصر سے ہماری زبان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس بھاری بھرکم مالِ غنیمت کو بمشکل اپنے کندھوں پر اٹھا رہی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے زبان کے سیکھنے میں دشواریوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دیکھیے تخلیقِ الفاظ کے لئے فارسی کس خوش اسلوبی سے اپنے ذاتی ذرائع اور وسائل استعمال کرتی ہے۔ کیا "خوش بین" اور "بدبین" "قنوطی" اور "رجائی" سے زیادہ آسان اور موزوں الفاظ نہیں اور وائرلیس کے لئے "لاسلکی" استعمال کرنا کونسی دانش مندی ہے جبکہ لفظ "تار" عرصۂ دراز سے ہمارے ہاں استعمال ہو رہا ہے؟ غالباً سب سے زیادہ کریہہ الصوت لفظ جو اردو میں ابھی ابھی داخل کیا گیا ہے "متدوبین" ہے۔ میری رائے میں ایسے اجنبی الفاظ کو داخلِ زبان کرنا اس کی خدمت نہیں بلکہ اس سے بدسلوکی کرنا ہے۔ بہر حال، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، فارسی اور عربی کے الفاظ اردو میں داخل ہوتے رہیں گے جن کی وجہ سے وہ اور بھی بوجھل بن جائے گی۔

پچھلے سو سال سے انگریزی اردو پر نہایت گہرے اثر ڈال رہی ہے۔ انگریزی الفاظ یا تو براہِ راست مستعار لئے گئے ہیں یا ان کو تراجم کے ذریعے داخلِ زبان کیا گیا ہے، یا ان کے معانی کے پیشِ نظر نئی اصطلاحات مرتب کی گئی ہیں۔ الفاظ اور تراکیب سے گذر کر انگریزی اثر جملوں کی ساخت اور انداز فکر تک پہنچ گیا ہے۔ افراط و تفریط سے بچنا ہر حالت میں مستحسن ہے لیکن اس تاثر پذیری میں کوئی قباحت نہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا کہ انگریزی کا یہ استیلا سیاسی غلبہ کی علامت ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اثر بالکل پہلے کی طرح جاری ہے۔ انگریزی سے استفادہ درحقیقت ایک اعلیٰ تمدن کی خوشہ چینی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک علوم و فنون اور عام تمدن میں یورپ ہم سے آگے ہے، انگریزی کا غلبہ بدستور قائم رہے گا۔ مستقبل کی اردو میں انگریزی عنصر نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ اس میں اور زیادہ اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

آیئے اب دیکھیں کہ تعمیر پاکستان کا اردو کی نشو و نما پر کیا اثر ہوگا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی فضا اردو کیلئے سازگار ثابت ہوگی۔ قیام پاکستان سے پہلے اردو خطرے میں تھی لیکن اب جب کہ اردو پاکستان کی ملکی زبان قرار دی جا چکی ہے اس کا مقام متعین اور مستحکم ہو گیا ہے اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے گی۔ میری رائے میں ۱۹۴۷ء کا انقلاب اردو میں مستقل اور دور رس تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ جن میں سے چند ایک کا ہمیں اس وقت سان گمان تک نہیں۔

اس انقلاب کا اردو زبان پر سب سے پہلا یہ اثر ہوا کہ اپنے سابقہ جنم بھوم[1] سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔ اردو دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ وہاں کی زبان بالاتفاق مستند خیال کی گئی اور ہم سب نے اس کا تتبع کیا۔ اب ہمارے اور ان شہروں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب یہ شہر ہمارے لئے شمع ہدایت نہیں رہیں گے۔ اردو اپنے گھر سے بے گھر ہو کر ہمارے ہاں ایک پناہ گزین[2] کی حیثیت سے آئی ہے۔ اگرچہ ہم نے اس کا خیر مقدم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی پھر بھی اس کی روایات کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ اب یہ شہر اس کی نشو و نما نہیں کر سکتے۔

اگر یہ تعلق منقطع نہ ہوتا پھر بھی اردو کا ہندوستان میں پنپنا دشوار تھا جس زور و شور سے ہندوستان میں ہندی کا پرچار ہو رہا ہے اور اسے ہندوستان کی عام زبان بنانے کے منصوبے ہو رہے ہیں، ان کے پیش نظر اردو کا مستقبل نہ صرف دھندلا بلکہ تاریک نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اردو سے بے حد دلبستگی ہے

---

[1] اردو کی جنم بھوم پر متعدد اختلافات رہے ہیں۔ چنانچہ بعض سابق سندھ، پنجاب اور [illegible] کو اس کا ابتدائی گہوارہ خیال کرتے ہیں جن میں عملاً مقامی بولیوں ہی کا رواج رہا ہے (مدیر)

[2] پناہ گزین کی بجائے [illegible] ہوتا۔ اگرچہ یہ بھی ایک حد تک ہی صحیح ہے کیونکہ اردو پاکستان [illegible] بولی اور لکھی جاتی ہے۔ پھر اردو ہندوستان میں [illegible] کے سلسلے میں سرگرمیاں ابھی جاری ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ آئندہ اس ملک میں ان پر کیا گذرے گی۔ آگے چل کر مضمون نگار نے بھی اس کی بخوبی وضاحت کر دی ہے۔ (مدیر)

لیکن اقتصادی ضروریات کے سامنے محض جذبات کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔
اردو کے پرستاروں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، نہ صرف ہندی
پڑھنی پڑتی ہے بلکہ اس میں مہارت و مہارت کامیابی کے لئے ازبس
ضروری ہے۔ ریڈیو، اخبارات، لین دین، تجارت، ان سب میں
ہندی کو دخل ہے۔ ممکن ہے سن رسیدہ اصحاب اس ہندی پرستی کا
مقابلہ کرتے ہوئے اپنی ادبی اور لسانی روایات کو برقرار رکھیں،
لیکن نئی پود اسی فضا کو قبول کرے گی جس میں وہ سانس لے رہی ہے۔
ان کی زبان پر ہندی الفاظ چڑھ رہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں
جب اردو انہیں اجنبی معلوم ہونے لگے گی۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی
نہیں بھولنا چاہیئے کہ دلی جس کی زبان فصاحت و بلاغت میں اپنا
جواب نہیں رکھتی تھی، اب ہندوستان کا دارالحکومت ہے۔ ہندوستان
کا کونسا علاقہ ہے جس کے باشندے اب وہاں آباد نہیں؟ ان سب کے
اختلاط سے دلی کی زبان ایک معجونِ مرکب بنتی جارہی ہے جس میں غالب
عنصر ہندی کا ہوگا۔ یہی حال لکھنؤ کا ہوگا۔ وہ روایات جنہیں لکھنؤ
نے اب تک برقرار رکھا ہے، ہندی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں
خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی۔

جس طرح کوئی آبادکار یا مہاجر اپنے وطن مالوف سے علیحدہ ہو کر
اپنے ماحول کو سازگار بنانے کے لئے اپنے نئے ہمسایوں سے رشتہ مؤدت
استوار کرتا ہے، اردو کو بھی بالکل ایسا ہی کرنا ہوگا۔ پاکستان میں اردو
اپنی معیاری نفاست اور صفائی برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ اور اسے اپنے
گرد و پیش کے حالات کو قبول کرنا پڑے گا۔ اور مرورِ ایام کے ساتھ
ساتھ اس کی اصلی روایات کمزور ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن کہا جائے گا
کیا پاکستان میں ایسے لوگ آباد نہیں جن کی مادری زبان اردو ہے؟
کیا وہ اس کی پاکیزگی کو برقرار نہ رکھ سکیں گے؟ اس میں شک نہیں کہ
یہ لوگ اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے۔ لیکن ان کی مساعی کامیاب
نہ ہوں گی۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ملک کے مختلف حصوں میں
منتشر ہیں۔ ان کے ارد گرد صبح و شام پنجابی، پشتو، بلوچی، سندھی
بولی جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ان کے اثرات سے مامون و محفوظ
رہیں۔ لیکن ان کے بچے اور آئندہ نسلیں اپنے ماحول کے اثر سے
نہ نکل سکیں گی۔ وہ یہاں کے بچوں سے گھل مل جائیں گی۔ اور رفتہ رفتہ
تعلیم، کھیل کود، گلی کوچوں میں ان کے ہمجولیوں کے الفاظ ان کی زبان
چڑھ جائیں گے۔ یہ عمل بعد میں بھی جاری رہے گا۔ آپس کا میل جول،
کاروباری معاملات، ملازمت، باہمی رشتہ داریاں، شادی بیاہ۔
ان سب کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے قریب تر آتے چلے جائیں گے۔
دریں حالات ناممکن ہے کہ ان کا لب و لہجہ اور زبان اپنی اصل حالت برقرار
رکھ سکے۔ ایک مہاجر نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان "اردو اور پنجابی کا
سنگم" ہے، اس امر کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"..... میری اولاد بھی خود کو ہمسایہ بچوں کی صحبت میں اجنبی محسوس
کرتی تھی۔ میرے بچے ان کی باتیں نہ سمجھ سکتے تھے۔ آخر آہستہ آہستہ ان پر
ہمسایہ بچوں کا رنگ چڑھنے لگا۔ اور وہ پنجابی بولنے کی کوشش کرنے
لگے لیکن اس کوشش میں ان کی اپنی زبان خراب ہونے لگی۔ اب یہ حالت
ہے کہ وہ گھر میں اردو میں باتیں کرتے کرتے لاشعوری طور پر اکثر ایک آدھ
پنجابی کا لفظ بھی بول جاتے ہیں۔ انہیں بہتیرا سمجھایا جاتا ہے لیکن وہ بے بس
نظر آتے ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آہستہ آہستہ ان کی زبان کیا صورت
اختیار کرے گی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ چند برسوں میں وہ نہ اردو رہے گی
نہ پنجابی۔" میری رائے میں یہ اثر اتنا گہرا نہیں ہوگا جتنا کہ وہ خیال کیا
جاتا ہے۔ اور آخر کار مستقل طور پر وہی الفاظ داخل زبان ہوں گے
جن کی ضرورت ہے۔

ہماری بولیوں کا ایک اچھا خاصہ عنصر ایک اور طرح بھی اردو میں
داخل ہو جائے گا۔ اور اس کا داخل ہونا ضروری ہے۔ یہ کام ہمارے
ناول نویس، افسانہ نگار اور مضمون نگار سرانجام دیں گے۔ ان لوگوں کے
پیش نظر سرشار کی لکھنوی فضا یا نذیر احمد کے موضوعات اور کردار نہیں
ہوں گے۔ ان کے پیش نظر پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگ اور
ان کی زندگی ہوگی اور اپنی تصانیف کو مقامی رنگ دینے کے لئے انہیں
ایک ایسی زبان استعمال کرنی پڑے گی جس میں مقامی رنگ کی جھلکیاں ہوں۔
ادب میں واقعیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگوں کی بول چال ہو بہو
نقل کی جائے۔ اگر ایسا ہو تو پنجابی زمیندار صرف پنجابی ہی میں گفتگو کرتا
دکھائی دیا جائے گا۔ اور پٹھان پشتو میں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے
کہ افراد کا لب و لہجہ اور زبان قرین قیاس ہو۔ یا بظاہر صحیح معلوم ہو۔
یہ درست ہے کہ پاکستان کے لوگ اردو نہیں بولتے۔ لیکن اگر انہیں
اردو بولتے دکھایا جاتا ہے تو یہ از حد ضروری ہے کہ وہ لکھنؤ یا دلی
کے مخصوص محاورات استعمال نہ کریں ورنہ آپ پکار اٹھیں گے کہ یہ

یہ لوگ ہرگز پاکستانی نہیں۔ پس اپنے مضامین کو واقعیت کا رنگ دینے کے لیے مقامی رنگ آمیزی از حد ضروری ہے۔ یہ اصول دنیا کے ادب میں ہر جگہ کام کرتا دکھائی دیتا ہے والٹر سکاٹ کی بہترین تصانیف وہی خیال کی جاتی ہیں جن کے افراد سکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں اور جن کی زبان میں وہاں کے مخصوص محاورات اور الفاظ کو دخل ہے۔ مکالمے کی کامیابی یا واقعیت کا راز اسی امر میں مضمر ہے کہ افراد ایسی زبان میں گفتگو کریں جس کی ہم اُن سے توقع رکھتے ہیں اور یہاں سو فیصدی حقیقت نگاری کی ضرورت نہیں۔ ہر علاقے کے اپنے مخصوص محاورات۔ الفاظ اور جملے ہیں جنکے باموقع استعمال سے مکالمہ قرین قیاس دکھائی دیتا ہے۔ یہ امر درحقیقت قیام پاکستان سے بہت پہلے سے جاری ہے اور ہمارے افسانہ نگاروں کی تصانیف میں مقامی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یہ مقامی رنگ جو پنجابی الفاظ اور ٹھیٹھ پنجابی محاورات کے ترجمے کی شکل میں ملتا ہے، ہمارے ادب میں دن بدن بڑھتا چلا جارہا ہے اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ عنصر بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

دیکھئے ذیل کی نظم میں شیر افضل[1] جعفری نے خالص پنجابی مواد کو کس خوش اسلوبی سے اردو میں سمویا ہے:

الھڑ سوانیاں ہیں	اٹھتی جوانیاں ہیں
چاندی کی گردنوں میں	سونے کی گانیاں ہیں
چرخے کے ساتھ گاتی	باہو کی بانیاں ہیں
چڑھتی ہوئی ندی کی	دل میں روانیاں ہیں
انداز سے گھماتی	رنگیں مدھانیاں ہیں
آنکھوں میں گفتگو ہے	کیا بے زبانیاں ہیں

یہ پاک باز ہیریں
بے تاج رانیاں ہیں

اگر یہ درست ہے کہ دہلی یا لکھنؤ کا مخصوص محاورہ اور عامیانہ زبان جسے انگریزی میں سلینگ کہتے ہیں ہماری سماجی زندگی سے جوڑ معلوم ہوگی تو آخر کار اس کا کیا حشر ہوگا؟ میری رائے میں وہ صرف کتابوں میں رہ جائے گی۔ لکھے پڑھے لوگ اس سے علمی طور پر آشنا ہوں گے لیکن وہ اردو کی روزمرہ یا عام طور پر مستعمل زبان کا حصہ نہیں رہے گی۔

جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اس سے ظاہر ہے کہ قیام پاکستان اردو کے حق میں نیک فال ہے۔ اردو ہماری مادری زبان نہیں لیکن وہ ہماری ایک ملکی اور قومی زبان ہے۔ بدیں وجہ اسے تمام مقامی بولیوں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے اور رہے گی من حیث القوم ہم اسے کبھی اتنا قریب نہیں پائیں گے جتنا کہ مقامی بولیوں کو پاتے ہیں۔ لیکن مغربی علوم و فنون اس میں بدستور داخل ہوتے رہیں گے۔ جن کی وجہ سے اس کی وسعت اور اسلوب بیان میں لچک اور تنوع کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ پھر چونکہ ہماری زبان نے فارسی اور عربی سے رشتۂ عقیدت استوار کر رکھا ہے ان مطالب اور معانی کے اظہار کے لیے ہم ان زبانوں کے الفاظ داخلِ زبان کرتے چلے جائیں گے۔ نیز ہماری بولیوں کی قربت کی وجہ سے خاص کر پنجابی۔ سندھی اور پشتو الفاظ اس میں داخل ہوتے رہیں گے۔ یہ الفاظ بیشتر خاص خاص علاقوں تک محدود رہیں گے لیکن یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان میں سے بعض اپنی حدود سے باہر نکل کر عام طور پر اردو کا حصہ بن جائیں گے۔

علاوہ ازیں، جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں، اردو کی پرانی روایات دن بدن کمزور ہوتی چلی جائیں گی اس لئے یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ اردو کے مخصوص لب ولہجہ اور تلفظ میں بھی فرق آجائے گا۔ آجکل ہم دہلی یا لکھنؤ کے لب ولہجہ اور تلفظ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن جب ان شہروں کی روایات مٹ جائینگی تو صحیح تلفظ کے لیے ہمیں ایک زندہ روایت کی بجائے لغات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ بدقسمتی سے ہماری لغات نہایت دقیانوسی اصولوں پر مرتب ہوتی ہیں۔ اور عام طور پر مروجہ تلفظ کی بجائے فارسی اور عربی کے قدیم تلفظ درج کر دئے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض حالتوں میں اہلِ زبان نے ان میں تصرف کیا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا سوائے اس کے کہ تلفظ میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہو جائیں گی۔

---

[1] یہ ایک خالص پاکستانی زبان ہے جس کا سلسلہ شیر افضل جعفری نے شاعری میں بہت آگے بڑھایا ہے۔ سید ضیاء محمود منشی اسے تجید، غلام ثقلین نقوی اور کئی لکھنے والوں نے خصوصاً مجید لاہوری نے اس رجحان کو نمایاں ترقی دی ہے۔
(مدیر)

اردو کی مسلمہ روایات سے انحراف کا ایک اور بھی سبب ہو سکتا ہے۔ یہ سبب نفسیاتی ہے۔ کل تک "اہلِ زبان" ہماری تحریر اور تقریر کو ہدف استہزا بناتے رہے۔ انہیں اپنے اہلِ زبان ہونے پر ناز تھا جس کی وجہ سے ان کے خلاف اندر ہی اندر ایک دبی ہوئی بغاوت اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اب چونکہ دہلی اور لکھنؤ کا عروج قصۂ پارینہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے مصنف ان قیود کو خاطر میں نہیں لاتے اور زبان کے آزادانہ استعمال پر مصر ہیں۔

میں اس کشاکش کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا جب عنقریب اہلِ زبان ہی نہ رہیں گے تو یہ کشمکش بھی دور ہو جائے گی۔[1]

ایک لحاظ سے اردو کی حیثیت بالکل نرالی ہے۔ وہ پاکستان کی سرکاری اور ادبی زبان ہے۔ لیکن وہ ملک کے کسی حصے میں بطور مادری زبان نہیں بولی جاتی۔ اسے بطور بدیسی زبان سیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ لیکن غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ایک ایسی کمزوری جس کا علاج نہیں۔ ہر زندہ زبان کا کہیں نہ کہیں بولا جانا ضروری ہے۔ اور اسی میں اس کے ارتقا کا راز مضمر ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ وہ تمام ملک کی مشترکہ زبان ہو۔ یا اس کے بیشتر حصہ میں بطور مادری زبان استعمال ہو۔ اس کے ارتقا کے لئے صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ کسی نہ کسی شہر، طبقہ یا گروہ کی مادری زبان ہو۔ اگر کسی جماعت کے افراد جن کی ایک مشترکہ زبان ہے ایک جگہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کی قوت تخلیق میں ان کا اجتماعی شعور بروئے کار آتا ہے لیکن اگر انہیں منتشر کر دیا جائے تو ان کی اختراعی طاقتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ یہی حال آجکل اردو کا ہے۔ وہ پاکستان کے کسی حصہ کی مادری زبان نہیں۔ اور اگرچہ اس کے بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ اس لئے ان کی قوتِ اختراع و ایجاد کام میں نہیں آ سکتی۔ باقی رہی پاکستان کی اکثریت جو اسی ملک کی مختلف بولیوں کو بطور مادری زبان استعمال کرتی ہے اور جس کے لئے اردو محض سرکاری زبان ہے وہ اسے تخلیقی طور پر نہیں بلکہ تقلیداً استعمال کرتی ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ اہلِ زبان قواعد و ضوابط کی پابندی سے آزاد ہیں اور زبان میں من مانے تصرفات کرتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہ اشخاص جو کسی زبان کو بطور اجنبی زبان سیکھتے ہیں وہ اس کے قواعد سے سرِمو تجاوز نہیں کرتے لیکن اہلِ زبان قواعد کی حدود میں رہتے ہوئے بھی اس میں نئی راہیں پیدا کرتے ہیں۔ جو بعد میں قواعد میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ وہ نئے الفاظ و محاورات بناتے ہیں جنہیں بعد میں خلعت قبول حاصل ہو جاتا ہے۔ بہر حال تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جب کوئی زبان مادری زبان کے مقام سے گر جاتی ہے تو اس کی ترقی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جب تک لاطینی روم کی زبان رہی وہ پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی رہی۔ لیکن جب حملہ آوروں نے روم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس کے بولنے والے باقی نہ رہے تو اس کا عروج بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد صدیوں تک لاطینی مذہب اور علوم و فنون کی زبان رہی اور خانقاہوں اور مدارس میں اس کی تحصیل کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وہ جہاں تھی وہیں رہی۔ یہ سچ ہے کہ قرون وسطیٰ میں، اور اس کے بعد بھی، اس میں حسب ضرورت اضافے ہوتے تھے اور پرانے مواد کی ترتیب سے نئے الفاظ مرتب ہوئے لیکن یہ عمل سراسر مصنوعی تھا۔ یہی عمل اردو میں بھی جاری رہے گا۔ علمی ثقافتی اور سیاسی ضروریات کے پیش نظر نئے الفاظ اور اصطلاحیں وضع کی جائیں گی۔ اور معلوم ہوگا کہ زبان آگے بڑھ رہی ہے لیکن نہ تو اس کے قواعد میں تبدیلی ہوگی اور نہ اس میں نئی ضرب الامثال اور محاورات ہی پیدا ہوں گے۔ انگریزی اسالیب بیان سے متاثر ہو کر نئی تراکیب رواج پائیں گی۔ لیکن محاورہ، گرامر، معانی اور تلفظ میں کوئی معتدبہ تبدیلی نہ ہوگی۔

اردو زبان کو جس خطرے کا سامنا ہے وہ یہ نہیں کہ وہ ایک مخلوط زبان بن جائے گی۔ کیا وہ اس وقت ایک مخلوط زبان نہیں؟ اور اگر عربی اور فارسی کے مستعار الفاظ اس کے وقار کے منافی نہیں تو دیسی بولیوں کے الفاظ اس کی قدر و منزلت کے کیسے منافی ہو سکتے ہیں؟ یہ خیال کہ اردو بے سوچے دیسی بولیوں کے الفاظ کی بھرمار سے اردو ایک مخلوط زبان بن جائے گی، ایک بے بنیاد سی بات ہے۔ ہماری بولیوں کے الفاظ اردو میں ضرور داخل ہوں گے۔ لیکن

---

[1] محض لسانی اور محلی پہلو کے علاوہ اس کا ایک اور نہایت اہم پہلو بھی ہے۔ اردو محض صحت لفظی اور قواعد زبان سے آگے بڑھ کر ادبی، ذوقی اور تخلیقی امور پر توجہ ہے اس وقت قدیم و جدید رجحان میں سب سے نمایاں وجہ اختلاف یہی ہے۔ (مدیر)

یہ سوا اتنا ہو گا جتنا آٹے میں نمک۔ ایک اطالوی ماہر لسانیات کا کہنا ہے کہ جب ہم کوئی اجنبی زبان سیکھتے ہیں تو وہ اجنبی زبان نہیں بلکہ ہماری اپنی زبان مخلوط بنتی چلی جاتی ہے۔ اس کلیہ کی توثیق اس امر سے ہوتی ہے کہ جب ہم انگریزی بولتے ہیں یا لکھتے ہیں تو اپنی زبان کے الفاظ اس میں ہرگز داخل نہیں کرتے۔ لیکن اردو یا پنجابی بولتے وقت ہم انگریزی الفاظ بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں یہی کلیہ اردو پر بھی صادق آتا ہے۔ اردو بولتے یا لکھتے وقت ہم حتی الوسع کوشش کریں گے کہ دیسی الفاظ اس میں داخل نہ ہوں۔ مانا کہ بولیوں کے الفاظ پہلے پہل بچوں کی زبان پر چڑھ جائیں گے لیکن اس کا ازالہ ممکن ہے۔ علمی اور ادبی سطح پر اختراع و ایجاد کا سلسلہ بند نہیں ہوگا۔ قیاس کی بنا پر حسب ضرورت اصطلاحات اور مشتقات وضع ہوتے رہیں گے۔ یا انہیں عربی اور فارسی سے مستعار لیا جائے گا۔ نیز انگریزی کا اثر مدت تک جاری رہے گا اور انگریزی نحوی تراکیب و اسالیب داخل زبان ہوتے رہیں گے۔ لیکن میری رائے میں اس سلسلے میں جو کچھ انگریزی سے لینا تھا لے لیا گیا ہے اور مستقبل میں کسی معتد بہ اضافے کی نہ توقع ہے اور نہ ضرورت ہی ہوگی۔

باقی رہا زبان کا قدرتی ارتقا یعنی تخلیق و اختراع، جذب و انجذاب، ترک و اختیار کے وہ قدرتی وسائل جو کسی خاص طبقہ کی کاوشوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ جنہیں کسی ملک کے باشندے من حیث القوم غیر شعوری طور سے پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً زبان کی ہیئت اور ساخت، محاورہ، صرف و نحو، تلفظ اور معانی، الفاظ میں تبدیلیاں اور دیگر تصرفات۔ اس میدان میں ترقی کے کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔ زبان کی قدرتی نشو و نما ابتدائے تہذیب سے انہیں لوگوں کا حصہ رہا ہے جو اسے بحیثیت مادری زبان کے استعمال کرتے رہیں۔ اور چونکہ اردو ہماری مادری زبان نہیں اور نہ بن سکتی ہے۔ لہذا اس کی قدرتی نشو و نما رک جائے گی۔ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ کسی زبان کے بولنے والے قواعد و ضوابط کی پابندی کے باوجود اس کے آزادانہ استعمال سے اس میں تبدیلیاں اور اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اردو کو تقلیداً استعمال کریں گے۔ لہذا اس میں ہماری ارتقائی طاقتیں بروئے کار نہ آسکیں گی۔

جس طرح سماجی زندگی میں جمہور کی خوشنودی، ان سے عمدہ تعلقات و روابط کی خواہش اور ان کی ناراضگی یا دشمنی کا خوف وضع داری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح استاد کی تنبیہہ و سرزنش، ہمعصروں کا ٹھٹھا اور بزرگوں کی حوصلہ افزائی زبان کے استعمال میں بے راہ روی کے مانع آتے رہیں۔

اوپر کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے:

اردو زبان نے ابھی ابھی ایک نئی منزل میں قدم رکھا ہے۔ اور اپنے حالاتِ گردوپیش سے متأثر ہو کر وہ نئے ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ اگرچہ یہ نقوش ابھی تک مبہم اور غیر متعین ہیں اور عام طور پر ہمیں ان کا احساس بھی نہیں پھر بھی ان کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں وہ سطح زبان پر آہستہ آہستہ ابھر رہے ہیں اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، وہ اور واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

اردو کا رشتہ دہلی اور لکھنؤ سے منقطع ہو چکا ہے۔ کچھ ضروریات کی بنا پر اور کچھ غیر شعوری طور پر مقامی بولیوں کے خاص خاص الفاظ اردو میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ الفاظ عام طور پر ان اصطلاحات پر مشتمل ہوں گے جو خاص خاص علاقوں کی قدرتی ساخت، پس منظر، روایات، قدرتی اور صنعتی پیداوار، اشیائے خورد و نوش، لباس، رسوم اور عقاید سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالباً ان کا دائرۂ استعمال انہیں علاقوں تک محدود رہے گا۔ لیکن بالکل ممکن ہے کہ چند وجوہات کی بنا پر ان میں سے کئی ایک اپنے محدود دائرہ استعمال سے باہر نکل کر زبان میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیں۔ تلفظ کے بارے میں ابھی تک دہلی اور لکھنؤ کا تتبع رہا ہے۔ اور اسے موجب افتخار خیال کیا جاتا تھا لیکن وہ دن دور نہیں جب بیاہ شادی اور باہمی میل جول کی وجہ سے ہمارے ہاں ایک مخلوط آبادی پیدا ہو جائے اس کے بعد اردو شاید ٹھیٹھ پنجابی، سندھی اور پشاوری لہجہ میں بولی جائے۔

اقدار کا مسئلہ

ریاض احمد

سب سے پہلے آپ کے سامنے اس امر کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اس عنوان کے سلسلے میں جو کچھ اکابر علما نے لکھا ہے وہ سب کا سب اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔ اور نہ مجھے اس پر پوری طرح آگاہی حاصل ہے ان سطور کی نوعیت زیادہ تر ایک عامی کے ابتدائی تاثرات کی سی ہے۔

اقدار کا مسئلہ بنیادی طور پر اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ وہ یوں کہ سب سے پہلے ایک معاشرہ میں اخلاقی پابندیاں ہی ان اقدار کی نشاندہی کرتی ہیں جنھیں حاصل کرنے کی انسان سعی کرتا ہے۔ اقدار کا تعلق اس طرح براہ راست عمل سے قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ اس بات کو شاید اس طرح قبول نہ کریں کہ اقدار کو بالعموم ایک مجرد حقیقت کی حیثیت ہی سے پیش کیا جاتا ہے۔ عمل تو ایک انفرادی نوعیت کی چیز ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ مدارج حیات کے اختلاف کے ساتھ بدلتی رہتی ہے بلکہ اس میں یوں بھی آفاقیت شاید ممکن نہیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں کا عمل ایک خاص واقعہ کی رعایت سے ایک ہی انداز میں رونما ہو، اور قدر کے لئے یہ ضروری نظر آتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیری ہو۔ اس کا اطلاق مختلف افراد اور مختلف مقامات پر ایک ہی طرح ہو سکے۔ اس لئے ایک خالصتاً عملی قدر رفتہ رفتہ تعمیم کے سانچوں میں ڈھلتے ڈھلتے بالآخر تجرید کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ حقیقت مطلقہ کے قرب کے لئے اسے عملی انفرادیت کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اقدار کے سلسلے میں اختلاف کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ قدر بنیادی طور پر اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ اخلاق ایک ایسی چیز ہے، جس کے متعلق بغاوت گویا ہر شخص کا حق ہے۔ آخر یہ کیوں ہو کہ ایک نام نہاد ضابطۂ اخلاق کی پابندی کے لئے شخصی آزادی، شخصی جرأت اور شخصی خواہشات کو ترک کر دیا جائے۔ اخلاقیات کے علماء اس مسئلہ پر بہت پریشان رہے ہیں۔ آخر ان میں سے ایک نے بنیادی اخلاقی قدر کے لئے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ خوشی کا اصول دریافت کیا۔ اس زیادہ سے زیادہ میں پھر وہی قلیل سے قلیل بدقسمت جماعت غیر مطمئن رہ جاتی ہے جسے اس کا حق کوئی نہیں دلاتا۔ ایثار و قربانی بھی ایک قدر ہے۔ لیکن اس قدر کو اسی اصول کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ قربانی کے فارمولے میں کسی نے نہیں ڈھالا۔ ایک اتنی بڑی قدر سے آخر ایک اتنی بڑی تعداد کو محروم رکھنے میں کیا مصلحت تھی۔ ایک معمولی سی حقیر سی ہنگامی نوعیت کی چیز جسے آپ خوشی کہتے ہیں اس کے لئے ایک اتنی بڑی قدر جسے آپ ایثار کہتے ہیں۔ کیوں قربان کر دی جاتی ہے۔ ایک اور بات سوچئے۔ خوشی ایک قسم کا عملی نتیجہ ہے۔ ایثار ایک قسم کا سلبی مفروضہ ہے۔ ایک چیز حاصل ہوتی ہے۔ ایک چیز سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ جو کچھ تھا۔ یا جس کے ہونے کا امکان تھا، اسے بھی تمام کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر یہ ہوا کہ اقدار دو نوعیت کی ہیں ایک مثبت، ایک منفی۔

مثبت اقدار کے حصول کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے۔ انہیں آپ اوامر کہیے۔ منفی اقدار ایک قسم کی پابندی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ جو ہمیں بعض ایسی چیزوں سے محروم رہنے کی تلقین کرتی ہیں جنہیں ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پابندی محض اس لئے لگائی جاتی ہے کہ بعض دوسرے لوگ ان چیزوں کے حصول سے محروم نہ رہ جائیں لیکن مثبت اقدار کی جدوجہد میں یہ تفاوت نہیں ملتا، کہ ایک حاصل کرے اور دوسرا کھو دے۔ اس طرح مثبت اقدار کا تفوق خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اور اس پر ہمیں یقیناً خوش ہونا چاہیئے کہ آخر مثبت ہی نے فتح پائی۔ لیکن جو سوال ذہن میں کھٹکتا رہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ منفی اقدار میں ایک سے چھین کر دوسرے کو دینا کیوں روا رکھا جاتا ہے۔ ایک بڑی سطحی سی مثال لیجئے۔ ایک شخص کے پاس

دولت ہے۔ دوسرا اس دولت میں سے ایک حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس حصے سے پہلے شخص کی محرومی کوئی اتنا بڑا المیہ نہیں بنتا۔ لیکن دوسرا شخص جو اس سے مستقلاً محروم رہتا ہے۔ اس کے حق میں یہ یقیناً ایک المیہ بن جاتا ہے۔ فقر و فاقہ اور حاجت کو کوئی معاشرہ روا نہیں رکھنا چاہتا۔ لیکن عملاً اقدار کی رعایت سے اسی کی تلقین کرتا ہے۔ یہاں ایک اور تصور کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ جو کچھ ایک اور قدر سے منسلک ہے۔ یعنی حصول کے بعض ذرائع جائز ہوتے ہیں اور بعض ناجائز۔ پابندی جائز ذرائع پر نہیں ہے، صرف ناجائز ذرائع پر ہے۔ لیکن جائز و ناجائز کا اصول ہمیشہ یکساں نہیں رہتا ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اور اسی پر بس نہیں۔ فرض کیجئے استحصال اگر جاگیردار کی طرف سے ہو تو ناجائز۔ اور اگر ایک وقت میں اسی استحصال کو کوئی باغی گروہ، عمل میں لائے تو سنگین۔ دونوں ایک سے عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ دونوں اپنے طور پر استحصال کو جائز کہتے ہیں۔ دونوں کے حامی بھی نکل آتے ہیں۔ دونوں کے مخالف بھی نکل آتے ہیں۔ اقدار کا اختلال بدستور قائم رہتا ہے۔

یہ اختلال ظاہر ہے کہ عملی حالات ہی کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے، اگر عملی امکانات کو خارج کر دیا جائے اور پھر اقدار کا ایک نظام وضع کیا جائے تو شائد یہ مشکل باقی نہ رہے۔ اسی لئے اقدار اخلاقیات کی حدود سے نکل کر مابعد الطبیعیات کے دائرہ عمل میں جا داخل ہوتی ہیں۔ انسان، کائنات اور خالق کائنات کے باہمی رشتے کے حوالے سے اقدار کے تعین کی کوشش میں صداقت مطلقہ کو نصب العین بنایا جاتا ہے۔ اور اسی، صداقت مطلقہ سے خیر مطلق کا تصور اخذ کیا جاتا ہے۔ صداقت اور خیر اس مرحلے پر پہنچ کر عمل سے اپنا رشتہ منقطع کرنے پر مصر نظر آتی ہے اگر عمل کو درمیان سے نکال لیا جائے تو پھر صداقت یا خیر کس مصرف کی رہ جاتی ہیں۔ صرف ایک چیز باقی رہ جاتی ہے۔ صداقت اور حقیقت کا شعور ایک ایسی آگاہی، ایک ایسا اطمینان، ایک ایسی طمانیت بخشتی ہے جس کے سامنے عملی حصول اور بے حاصلی، بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اوامر اور نواہی کا ایک پورا نظام مذہب میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ اوامر کے سلسلے میں بشارتیں اور نواہی کے سلسلے میں عذاب کا خوف بہ صراحت موجود ہے۔ ثواب و عذاب کا یہ وعدہ ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتا ہے جس پہ یقین ایمان کی شرط اوّل ہے۔ لیکن اس عالم کا عملی تجربہ کسی کو بھی حاصل نہیں، اس طرح یہ عالم پھر ایک تجریدی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً اقبال نے بھی غالباً یہ کہا ہے کہ جنت و دوزخ مکان کے اس تصور سے ماوراء ہیں جس سے ہم آشنا ہیں۔ یہ شاید محض مقاماتِ نفس ہیں۔ اس کے لئے اگر آپ سند چاہیں تو اس ارشاد باری سے استنباط کرنا جائز اور برمحل ہوگا جس میں اولیاء اللہ کی صفت "ولاخوف علیہم ولا ہم یحزنون" ارشاد کی گئی ہے۔ اس استدلال کو اگر آپ قرین قیاس سمجھتے ہوں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عملی طور پر اقدار کے اختلال کو رفع کرنے کے لئے اقدار کی تجریدی حیثیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس تجریدی حیثیت میں ان کے نتائج جس عالم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ عالم خارجی اعمال کی رزمگاہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک داخلی، ذہنی، باطنی، یا نفسی کیفیات کا عالم ہے۔ جو شخص حق اور صداقت پر آگاہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے منفعت اور نقصان کے پیمانے بدل جاتے ہیں، موت و حیات کی حیثیت مٹ جاتی ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ موت اس کے لئے عین حیات بن جاتی ہے۔ کربلا کی سختیاں اس کے لئے بے معنی ہوتی ہیں۔ ایک عارضی اور ہنگامی حیات کے لمحات اپنی کشش کھو دیتے ہیں ایک جاودانی حیات اپنی مسکراتی ہوئی فضا میں اس کے قدموں پہ نچھاور کر دیتی ہے۔ موت و حیات کا فرق مٹ جاتا ہے۔ قوت و صولت، جاہ و حشمت، دولت و ثروت، جاہ و دمال، غربت و مسکنت، بیچارگی اور بے بسی کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں اور یوں ایک نئی قدر کا احساس انسانیت کو ارزانی ہوتا ہے۔ اس احساس کی نغمگی اور سرمدی سرود کو زندہ رکھنے کے گیت گائے جاتے ہیں۔ گویا ہم ایک ایسے مقام پہ آپہنچتے ہیں جہاں قدر کا معیار صرف احساس رہ جاتا ہے۔ قدر خارجی اور عملی حدود سے نکل کر خالصتاً ذہنی اور نفسی حدود میں داخل ہوتی ہے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس شخص کے ذہن میں بھی شاید یہی تصور تھا جس نے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ مسرت کے پیمانے سے اخلاقی قدر کو متعین کرنے کی کوشش کی تھی مسرت محض ایک نفسی کیفیت ہی تو ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس کیفیت کے حصول کے لئے جو اسباب ذمہ دار ہوتے ہیں انہیں خارجی اور عملی دنیا سے نکال کر ذہنی عوامل اور نتائج سے منسلک کیا جا سکتا ہے

یا نہیں۔ مذہب کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔ زمرۂ "لا یحزنون" میں منسلک ہونے والے شاید ذہنی عوامل اور نتائج ہی سے اپنی مسرتوں کو اخذ کرتے ہیں۔ مذہب کی اصطلاح میں آپ اسے روحانی مسرت اور اطمینان کہہ لیجئے۔

اس سارے تذکرے میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ عمل سے نکل کر ذہن اور نفس کی دنیا میں آ جائیں اور خارجی واقعات سے ہٹ کر نفسی واردات پر توجہ کو مرتکز کر سکیں۔ لیکن اس کوشش میں ایک چیز رہی جاتی ہے۔ اسے آپ اصطلاحاً جمالی قدر کہہ لیجئے۔ مسرت کا تعلق خواہش سے ہے یا خواہش کے حصول سے۔ عملی اندازہ کچھ اس قسم کا ہے کہ مسرت خواہش کے حصول سے وابستہ ہے۔ دولت پا کر خوشی ہوتی ہے۔ محبوب سے مل کر مسرت ہوتی ہے۔ لیکن دولت پا کر کوئی مطمئن نہیں ہوتا۔ ۹۹ کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ اگر آپ اسے صرف ایک مذاق یا لطیفہ سمجھتے ہیں تو یوں کہہ لیجئے کہ "ھل من مزید" کا مدعی بن بیٹھتا ہے۔ محبوب کو پا لیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ بات نہیں جو اس کے تصور میں تھی۔ [illegible] اور [illegible] ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں ایک شاعر کا قول ہے کہ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

دوسرے نے کہا ہے

گر تیرے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

تیسرے نے یوں بدلا ہے

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب

حصول اور تصرف میں اگر کوئی بات ہوتی تو تینوں شعر بے معنی ہو کر رہ جاتے۔ کہانی یوں ہے کہ خواہش کرنے والے کو جب یہ قوت مل گئی کہ وہ جس چیز کو چھو لے وہی سونے کی ہو جائے، تو اس کی ساری خوشی مٹ گئی۔ اور جب بیمار شہنشاہ کو ایسے آدمی کی قمیص درکار ہوئی جو خوش ہو تو، وہ آدمی جو خوش تھا، قمیص ہی نہ رکھتا تھا۔ گوتم بدھ کے پاس جب، غم کی ماری ہوئی عورت آئی تو اس نے نروان اس خیال سے حاصل کیا کہ موت کا دکھ تو ہر کسی کا مقدر ہے۔ مسرت کی فراوانی اسے تسکین نہ بخش سکتی تھی، دکھ کی ہمہ گیری اسے سکون عطا کر گئی۔ تو

پھر مسرت کو کہاں ڈھونڈیں۔

ایک شخص نے کہا کہ آرزو کو مٹا دو۔ تم خوش ہو جاؤ گے۔ لیکن نفس نے انکار کیا کہ مسرت کی تلاش تو مجھے ہے۔ اور میری مسرت میری خواہش سے وابستہ ہے۔ جب خواہش مٹ گئی تو مسرت کو لے کر کیا کروں گا۔ بودھ نے مسرت کو یوں سمجھا کہ جب آواگون کا چکر مٹ جائے گا، تو مسرت ہی مسرت رہ جائے گی۔ آواگون کا چکر زندگی کا چکر ہے۔ نروان مرگ محض ہے۔ نہ زندگی، نہ موت، نہ مایا، نہ خواہش نہ مسرت۔ اوامر و نواہی دونوں سلسلے یکسر منقطع۔ خلائے محض میں کسی چیز کا بھی تصور ممکن نہیں۔ مسرت تو درکنار، اطمینان بھی اختیاری ہی رہ جاتا ہے۔ توحید کے پرستاروں نے اس گتھی کو یوں سلجھایا کہ حقیقت کبری سے مکمل وصال عین مسرت ہے ؎

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

یعنی نفس پھر ایک طرح سے بغاوت کر رہا ہے۔ اسے اپنی خواہش اور اپنی خواہش کے مقصود کا احساس ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اطمینان کی بھی تلاش ہے۔ اس تذبذب کا عذاب بڑا ہی جاں کاہ ہوتا ہے۔ نہ یہ اوامر سے روگردانی ہے۔ نہ نواہی کا ارتکاب۔ لیکن اس کے ساتھ وہ عذاب عظیم موجود ہے جسے کوئی خارجی پیمانہ نہیں ماپ سکتا۔ یہ اقدار کا اختلال نہیں ہے نفس کا اختلال ہے۔ جو اقدار کا ماخذ بھی ہے۔ اور محک بھی۔

بات الجھ چلی ہے۔ یہ قصہ جمالی اقدار کے تصور سے چلا تھا اور یہاں جا کر ختم ہوا کہ خواہش اور اقدار کی جنگ میں ذہنی اختلال کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب نہ خواہش سے انکار ممکن ہے کہ فی الواقعہ موجود ہوتی ہے۔ نہ اقدار سے انکار ممکن کہ ایک جبر مسلسل کا نام ہے۔ جو باہر سے نفس پر عاید ہوتا ہے۔ اب تلاش اس امر کی ہوئی کہ خواہش بھی رہے۔ اور اقدار کا جبر بھی باقی نہ رہے۔

ایک لمحے کے لئے رک جائیے۔ اور نفسیات کا وہ اصول یاد کیجئے۔ جس کی رو سے اعمال کی اصل جبلت ہے۔ اعمال کی نہیں بلکہ اعمال کے محرکات کی۔ عمل تو اضطراری بھی ہوتا ہے اور ارادی بھی۔

اضطراری عمل محرک اور عمل دونوں کے شعور سے غافل رہتا ہے۔ ارادی عمل دونوں پر آگاہ ہوتا ہے۔ جبلت محرک سے اغماض کرتی ہے۔ لیکن عمل سے آگاہی تو ایک طرف رہی۔ عمل کے نشے میں مست ہو جاتی ہے۔ جبر و اختیار کی بحث یہاں چھیڑنے کا محل نہیں ہے۔ لیکن جبلت جب تک محض جبر رہتی ہے۔ مثلاً حیوانی سطح پر تو وہ عمل اور محرک، اور اس سے وابستہ کیف میں تمیز نہیں کرتی۔ جب اختیار کی حدود میں مثلاً انسانی سطح پر داخل ہوتی ہے تو محرک عمل اور کیف میں تمیز کرتی ہے۔ محرک کے عملی مقاصد اور نتائج کو نظر انداز کرتی ہے۔ اور عمل کو مقصودِ خاطر بنا لیتی ہے کہ کیف و مسرت عمل کے ساتھ از خود وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک جذباتی یا شہوانی سطح پر اس کی نوعیت کچھ ہوس یا خود غرضی کی سی ہوتی ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تمتع کی تمنا۔ اسی تصور کو جب تجریدی کسوٹی پر کسا جاتا ہے، تو اس کی صورت یوں بنتی ہے کہ کسی چیز سے خاص اس چیز کے لئے شغف یا انہماک ؎

جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
طائرک بلند بال' دانہ و دام سے گذر

اب قدر کے تصور سے محرک اور نتیجہ دونوں خارج ہوتے ہیں۔ صرف قدرِ محض باقی رہ جاتی ہے۔ قدر کا یہ تصور مختلف سطحوں پر مختلف روپ دھارتا ہے۔ مذہب میں جزا و سزا کے خیال سے نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے، معبود کی خالص، بے لوث محبت کے لئے۔ فلسفہ میں تلاشِ حق و صداقت کے لئے۔ سائنس میں نظریات کی تشکیل و تعمیر کے لئے، دنیوی معاملات میں مروجہ معاشری اقدار کی سربلندی کے لئے، میدان جنگ میں بہادری کے جوہر کے لئے یا شہادت کی جستجو کے لئے، لیکن ان سب مقامات پر نتائج پر نظر ہمیشہ مرکوز رہتی ہے۔ لیکن ابھی ایک اور سطح باقی ہے، جس میں نتائج کی بھی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ یہ سطح جمالیاتی سطح ہے۔ جہاں محرکات کو صرف ان کی جذباتی حیثیت ہی میں پہچانا جاتا ہے، اور نتائج سے یکسر قطعِ نظر کر لیا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر دکھ یا مسرت مقصودِ خاطر نہیں رہتے۔ صرف ان سے وابستہ احساس اور تاثر کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے۔ اس دنیا میں جبلی عمل سے وابستہ سرشاری سب سے بڑی قدر بن جاتی ہے۔ اسی سرشاری کو محرک اور نتیجہ سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے اور پھر محض اسی کے حصول کو مطمحِ نظر بنا لیا جاتا ہے۔ جمالیاتی عمل میں حصول اور تمتع بے معنی لفظ بن جاتے ہیں۔ حسی تجربات اور واردات مقصود بالذات بن جاتے ہیں، جہاں دوسری سطحوں پر تعقل، ادراک یا نتائج و عواقب عمل کے رخ کو معین اور منضبط کرتے ہیں وہاں جمالیاتی عالم میں تخیل راہبری کرتا ہے۔ جب جمالیاتی اقدار کا مطمحِ نظر صرف جسم ہو وہاں حسی تخیل اپنے کرشمے دکھاتا ہے۔ عمل کے لئے نت نئی محرک صورتیں تخلیق کرتا ہے۔ جہاں جسم کے تقاضے ذرا دھیمے پڑے اور خود نفسی کیفیتوں کا ادراک بڑھا وہاں وجدان آگے بڑھتا ہے۔ جذب و سرور، سوز و مستی اور ایک لگن جو کسی وقت جبلی سطح پر صرف عمل کے تابع مہمل تھے، اب عین عین بن جاتے ہیں اور اس سارے عمل کا حاصل کیا ہوتا ہے۔ صرف ایک احساس یا ایک جذبہ کی شمع کا فروغ۔ حسن جبلی محرکات کا ذہنی بدل ہے۔

جمالیات کے مظاہر فنونِ لطیفہ ہیں۔ ان سے ہمیں پھر دو قدریں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک مثبت دوسری سلبی یا منفی۔ پہلی کا نام حسن یا عشق قرار پاتا ہے۔ دوسری کو رندی کہہ لیجئے۔ ان معنوں میں کہ یہ نواہی کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے۔ جمالیات میں نواہی کی ذیل میں وہ تمام محرکات اور عمل شامل ہو جاتے ہیں جن کا منبع و ماخذ یا جن کا مقصود جذبے یا احساس کے علاوہ کچھ اور ہو ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

جمالیات کے اس اصول کو اگر آپ صرف شعر و ادب اور افسانہ و حکایات تک محدود رکھیں تو اس کی حیثیت سحر و افسوں کی رہ جاتی ہے یعنی یہ محض ایک اضافی یا فراری چیز بن جاتی ہے۔ اور یوں حسن یا عشق کی مثبت قدر بھی متزلزل ہونے لگتی ہے۔ لیکن جمالیات کے یہ مظاہر تو محض درسگاہیں ہیں۔ اس حسنِ طبیعت کی تربیت کے لئے طالبعلمانہ عشق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے کسی نے عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں کہا تھا۔

آغاز میں قدر کو ضابطہ اخلاق کا مترادف قرار دیا گیا تھا۔ اور مشکل یہ درپیش تھی کہ ضابطہ اخلاق اضافی یا ہنگامی نوعیت کا حامل ہوتا ہے جس سے مستقل قدر اخذ نہیں کی جا سکتی۔ جمالیاتی تربیت اگر اس مشکل کا کوئی حل سمجھا دے تو اس کی حیثیت قابلِ اعتماد

بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک تو وہ بات یاد کیجئے کہ جب موت کے دکھ کا مداوا موت کی ہمہ گیری میں نظر آیا تھا۔ اور دوسری یہ کہ خواہش مٹ جائے تو غم مٹ جاتا ہے۔ یعنی احساس اور جذبہ کی تہذیب میں کسی مستقل قدر کا سراغ مل سکتا ہے۔ اخلاق نے احساس اور جذبے کی تہذیب خارجی دباؤ کے ماتحت کرنی چاہی۔ لیکن نفسیات والوں نے بتایا کہ دباؤ سے ایک وقفہ کے بعد گویا لاوا پھوٹ پڑتا ہے اور زلزلے نمودار ہوتے ہیں۔ جمالیات والوں نے یہ بتایا کہ احساس اور جذبے کی تہذیب اس کے اظہار میں ہے۔ اس پر قدغن لگانے سے وہ بپھر جاتا ہے۔ یا مکر کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اظہار سے جذبے میں نکھار، سجاوٹ اور سجل پن ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں وسعت اور ہمہ گیری بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایسا شعور جاگتا ہے۔ جو صرف اپنے جذبے ہی کو نہیں پہچانتا۔ دوسرے کے جذبے کا احترام بھی کرتا ہے۔ وہ جلب منفعت اور حصول و ہوس کی حدوں سے آگے نکل کر ایثار کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ سپردگی کا ایک ایسا عالم وجود میں آتا ہے کہ راضی برضا کی صحیح تصویر روشن ہو جاتی ہے۔

یہ مقام کچھ عینیت پرستی کا سا ہے۔ دلیل کمزور ہوئی جاتی ہے۔ منطق ناقص اور جذباتیت غالب۔ لیکن صرف ایک بات کا اندازہ کیجئے۔ ایک بھکاری کو دھتکار دینے سے اخلاق کا اصول مجروح نہیں ہوتا۔ بھیک مانگنا گناہ ہے۔ ایک ملزم کو سزا دینے پر اخلاق کا ضابطہ اعزاز کرتا ہے۔ ایک بچے کے کان اینٹھنے سے اس کا مستقبل سنورتا ہے۔ لیکن بھیک مانگنا گناہ کیوں ہے۔ اقبال کہے گا۔ اس سے خودی کی نفی ہوتی ہے۔ ملزم کو سزا دینا کیوں ضروری ہے؟ اس لئے کہ اس کے جذبات نے دوسروں کے جذبات کی حدود کا احترام نہ کیا۔ بچے کے کان اس لئے اینٹھے گئے کہ اس کے نفس سے طغیان و سرکشی نکل جائے۔ لیکن جس نے فقیر کو دھتکار دیا اس نے فقیر کی خودی کی نفی ہی نہیں کی۔ اس کی خودی کی توہین کی ہے۔ جس نے ملزم کو سزا دی ہے۔ اس نے اسے انسانیت سے خارج اور شعور و احساس سے عاری سمجھا ہے۔ جس نے بچے کے کان اینٹھے ہیں اسے اس بات کا احساس نہیں کہ بچے کی انا کس بری طرح مجروح ہوئی ہے۔ تذلیل دوسرے کے جذبے کی توہین۔ کسی کی انا کی شکست اخلاقیات میں جرم ہے۔ آپ اس کے ساتھ ایک بڑا سا "مگر" چپکا دیتے ہیں۔ جو بالکل بے معنی ہے۔ قدر کے احساس و شعور کا انداز بدل ڈالئے۔ خودی کو جمالی صفات سے ہمکنار ہونے دیجئے۔ اقدار کے مسئلے کا حل خود بخود نکل آئے گا۔ مانگنے والا کا گدایانہ لہجہ۔ روتا بسورتا بچہ۔ اور ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنے ہوئے انسان یقیناً کریہہ المنظر ہیں۔ اگر اس منظر کی کراہت کا احساس بیدار ہو جائے تو آخر کوئی کیوں اس منظر کو وجود میں آنے دے۔ آپ تصویروں میں ان غلاموں کو دیکھتے ہیں جن کی کھال کوڑوں کی مار سے ادھڑ گئی ہے تو آپ کی طبیعت اکراہ کرتی ہے لیکن آپ کو شاید اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ اسکول جانے سے انکار کرنے والا بچہ اسکول میں اپنے آپ کو بالکل اسی حالت میں دیکھتا ہے۔ علم اور تعلیم آخر ایسی بھیانک چیزیں تو نہیں ہیں۔ شوق ہو تو کڑی محنت عین راحت نظر آنے لگتی ہے۔ اس ایک اتفاقیہ جملے سے معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ جمالیات کی رو سے قدر کی اصل و اساس شوق ہے۔ اسی کو پہلے کہیں حسن یا عشق کہا گیا تھا۔ گویا قدر کے احساس و شعور اور اس احساس و شعور کے بروئے کار لانے کے لئے اخلاقیات کے برعکس قوانین وضع کرنے اور ان قوانین کے منکرین پر حد جاری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قدر کو باہر سے ٹھونسا نہیں جاتا۔ قدر از خود نفس کی گہرائیوں میں جنم لیتی ہے۔

اس امر سے انکار کی مجال نہیں کہ سزا معاشری اصلاح و بہبود کے لئے ناگزیر بن جاتی ہے۔ صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ گناہ کا تصور فعل سے وابستہ نہیں۔ گناہ احساسِ قدر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جس طرح قدر مثبت یا منفی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح قدر کا تصور بھی مثبت یا منفی ہو سکتا ہے۔ سزا کا تصور اقدار کے منفی تصور سے وابستہ ہے۔ اقدار کا مثبت تصور نہ گناہ کا ذکر کرتا ہے نہ سزا کا۔ مذہب کے ابتدائی دور میں قدر کا مثبت احساس اس طرح فراواں ہوتا ہے کہ منفی احساس اور اس سے پیدا ہونے والے تعزیری احکام محض زیب قرطاس ہی رہ جاتے ہیں۔ قدر کا مثبت احساس فرائض کی بنیاد ہے۔ جب یہ احساس ارزانی ہو تو جرم و تعزیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرائض سے اغماض بے عملی کا نام ہے۔ بے عملی میں جرم کا ارتکاب ممکن ہی نہیں۔ لیکن ابتدا میں مذہب صرف فرائض کی بجا آوری کا نام تھا۔ اور فرائض کی بجا آوری کے لئے ایک زبردست تحریک یا تحریص و ترغیب کا نام تھا۔ قرآن مجید کا سرمدی سرود جرم و تعزیر کا احساس نہیں دلاتا۔ وہ تو ایک بشارت ہے۔ اطمینان قلب و سرشاری کی۔

فقہی نظام کی تشکیل اس وقت وجود میں آتی ہے، جب شوق مٹ جاتا ہے۔ قدر کا مثبت احساس باقی نہیں رہتا۔ طمانیت اور جذبۂ عمل کی سرشاری مٹ جاتی ہے۔ اس وقت انسان کا عمل جرم و تعزیر کے تصور سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ امانت جس کی تفویض کے لئے روحِ کائنات نے ہر چیز سے سوال کیا لیکن کسی کو اتنا یارانہ تھا کہ اس بارِ امانت کو اٹھا لیتا بالآخر انسان کو تفویض ہوئی۔ یہ امانت شوق کی امانت تھی۔ علمِ اشیاء سے قدر کے مثبت احساس کی تشکیل ورنہ فرائض کی بجاآوری میں فرشتے کچھ کم تو نہ تھے۔ حیوان، نباتات، جمادات اور عالمِ علوی کی یہ مخلوق یعنی فرشتے انسان کے مقابلے میں صرف قدر کے احساس سے نابلد ہیں۔

مقام بندگی دیگر مقام عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی

جوں جوں جذبۂ عمل زوال پذیر ہوتا ہے۔ اقدار کا منفی احساس بڑھتا رہتا ہے۔ جس معاشرہ میں تعزیر و جرم کی شرح سخت گیر ہو گی اس معاشرے میں قساوتِ قلبی اور خود معاشرے کے نام نہاد محافظوں کا اپنا ضمیر جرم کے احساس سے آزاد نہیں ہوتا۔ ذرا خیال تو کیجئے معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا علمبردار انسان کی فلاح و بہبود کا عظیم ترین داعی۔ اپنے عمل، اپنے جذبے، اپنی دیانت اور اپنے خلق کی وجہ سے رحمۃ للعالمین کا لقب پاتا ہے۔ یہ بارگاہ جسے شاعر نے 'زعرش نازک تر' اور 'بعد از خدا بزرگ توئی' کے خطاب سے مخاطب کیا ہے، سراپا شفقت ہے۔ اس نے اسلام کو بزورِ شمشیر نہیں پھیلایا۔ اسلام تو اس کی شفقت، محبت، غریب نوازی۔ اور عفو و درگزر سے پھیلا تھا۔ مجرم بڑا شقی القلب انسان ہوتا ہے۔ وہ رحم کرنا نہیں جانتا۔ اگر وہ شقاوتِ قلبی کا اس حد تک شکار نہ ہوتا تو کبھی کسی کو قتل نہ کرتا، کبھی کسی سے اس کا مال نہ چھینتا۔ کبھی کسی کو اس کے حق سے محروم نہ کرتا۔ وہ معاشرہ جو سزا کے تعزیری یا امتناعی ضابطوں پر زور دیتا ہے اس کی رگوں میں جرم و گناہ اپنا زہر پھیلا چکے ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند اور زندہ معاشرہ میں سزا کا صرف اصلاحی مفہوم ہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ دراصل قدر کا احساس فعل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ محرک سے وابستہ ہوتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ الاعمال بالنیات اور اس سلسلے میں سورہ کہف میں مذکور قصہ کو یاد کیجئے، ع 'کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم'۔

اس آئینے میں دیکھئے تو مکافاتِ عمل کا انداز ہی کچھ بدل جاتا ہے۔ کشتی کو عیب دار کرنا اور کسی بے گناہ کو قتل کرنا بھی عین سعادت بن جاتے ہیں۔ قدر کے مثبت احساس سے جرم یا گناہ کا کوئی تصور وابستہ ہو ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ صرف جمالیات ہی میں نہیں مذہب میں بھی اس حقیقت کا شعور ملتا ہے کہ نتیجہ یا عملی امکانات کچھ ایسے اہم نہیں ہیں۔ کیفیت کا حصول مقصود خاطر ہے۔ کہیں اسے یوں بیان کرتے ہیں کہ اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ حسنِ نیت کے مقابلے میں اعمال کے اپنے عیب و صواب بے معنی بن جاتے ہیں۔ کبھی اس بات کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

نیت کی صحت و سلامتی اور فیضانِ نظر کا مسئلہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک صاحب مدتوں کسی مرشد کی تلاش میں رہے۔ آخر مرشد ملا تو ایک کالا چور۔ وہ گھر سے اس نیت کے ساتھ نکلے تھے کہ جو بھی شخص سب سے پہلے سامنے آئے گا اسی کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔ رات کی تاریکی میں کوئی مردِ خود آگاہ تو نہ مل سکا، ملا تو ایک عادی مجرم۔ اس نے بھی پیچھا چھڑانے کے لئے کہا کہ اچھا دو رکعت نماز پڑھیئے۔ ان دو رکعتوں میں دونوں کی قلبِ ماہیت ہو گئی۔ اور دونوں قطبیت کے مقام پر جا فائز ہوئے۔ بات کچھ ایسی انوکھی نہیں۔ ایک قسم کی جذباتی اور حسی چھوت نے ایک دوسرے کو یوں متاثر کیا کہ عمروں کی منزلیں لمحوں میں طے ہو گئیں، اسی لئے تو کہتے ہیں:

ع طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

شعر و ادب یا فن کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جذبات کی تہذیب کرتے ہیں تو مطلب یہی ہے کہ وہ ایک حسی چھوت پیدا کرتے ہیں۔ اس چھوت سے جذبات اور احساسات میں لطافت اور شستگی پیدا ہوتی ہے یہ لطافت اور شستگی بعد میں غیر جمالی موثرات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور اس طرح قدر کا صرف شعور ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ قدر عملی طور پر بروئے کار آتی ہے۔

کسی نے کہا تھا کہ حسن کے مدارج نہیں ہوتے۔ حسن یا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ حسن گویا ایک قسم کی صداقت ہے۔ اب ایک بات یا سچ ہو گی یا جھوٹ ہو گی۔ سچ کے مدارج نہیں ہوا کرتے۔

سچ جھوٹ کا ملغوبہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی درجہ بندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ایک صورت ابھی باقی ہے۔ ایک بچہ سچ بولتا ہے کہ اس نے مٹھائی کھائی تھی۔ اور ایک وہ بھی انسان ہے جو سرِ دار پہنچ کر سچ بولتا ہے۔ پہلی بات کو آپ کوئی اہمیت نہیں دیتے، لیکن دوسری چیز کو اہمیت دیتے ہیں۔ مدارج کا ایک تصور اس طرح در آتا ہے۔ یہ درجہ بندی سچ کی اپنی نوعیت کے اعتبار سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس چیز کی نسبت سے متعین ہوتی ہے۔ جس سے سچ متعلق تھا۔ اس درجہ بندی کا معیار آخر کس طرح مقرر کیا جائے گا۔ بچے کے سچ کا تعلق ایک ایسی حاجت یا خواہش سے ہے۔ جو محض اس کی ذات تک محدود ہے۔ اس سے نہ کسی کا کچھ بگڑتا ہے نہ سنورتا ہے۔ نہ اس سے خود ذات یا نفس کو کوئی استحکام یا ارتقا حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا سچ خارجی دنیا میں کوئی انقلاب پیدا کرے یا نہ کرے۔ لیکن معنوی دنیا میں ایک عظیم آویزش، ایک عظیم انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے۔ دونوں میں فرق معنویت کا ہے۔ معنویت، ایک خالصتاً ذہنی قدر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ سچ کی درجہ بندی ذہنی عمل کی عظمت سے وابستہ ہے۔

حیوان اور انسان میں فرق ذہنی عمل ہی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ انسان حصولِ مراد کے لئے حیوان کی قوت سے کام لیتا ہے۔ اسے ہل میں جوتتا ہے۔ اس سے گاڑی کھچواتا ہے۔ لیکن آخر میں حیوان کو آپ خراجِ عقیدت پیش نہیں کرتے۔ صرف اس انسان کا ذکر کرتے ہیں جس نے حیوان کو اپنے کام کے لئے استعمال کیا۔ بھاپ میں ایک عظیم قوت مضمر تھی۔ ایک ذہنی عمل نے اس قوت کا راز دریافت کیا۔ قوت کو آپ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لیکن ذہنی عمل کے مصدر و منبع کو آپ نہیں بھول سکتے۔ چنانچہ قصہ کچھ یوں بنتا ہے کہ جب عاشق دریاؤں کو چیر کر، اور زندہ سانپ کے سہارے اپنی محبوبہ کے شبستانوں میں پہنچا تو محبوبہ نے کہا کہ کاش تم نے اتنی محبت اپنے رب سے کی ہوتی۔ اور عاشق پر جب اس بات کی حقیقت روشن ہوئی تو وہ اُدھر ہو گیا۔ محبوبہ کی محبت کم سے کم ذہنی عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ معبودِ حقیقی سے محبت، شعور کی معراج ہے۔ محبت کی نوعیت میں فرق نہیں آیا۔ لیکن ذہنی عمل کے اخراج سے اس کی سطح پست تر ہو گئی۔۔۔ اَن دیکھے معبود کو پہچاننے کے لئے اور پھر اسے اپنی محبت کا مرکز و مقصد بنانے کے لئے ذہنی گداز، جو جِلا درکار ہوتی ہے وہ جبلی مقصد کو پہچاننے میں صرف نہیں کرنی پڑتی۔ اب جمالیاتی قدر میں مدارج کا تعین اس طرح ممکن ہو جاتا ہے کہ اگر قدر کا تعلق جبلی حیوانی اور شہوانی سطح سے ہو تو اس میں عظمت یا بلندی پیدا نہیں ہوتی جب یہی قدر ذہنی عوامل سے وابستہ ہو جاتی ہے تو اس میں ایک عظمت جھلکنے لگتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھئے تو ترفع کا عمل بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ جبلی اعمال کو ایک ذہنی عمل میں ڈھال لیتے ہیں

ذہنی عوامل کا ذکر آ گیا ہے تو لازماً پھر اخلاقیات ـــ یا مابعد الطبیعیات کا ذکر چھڑ جائے گا۔ یعنی اگر جمالیاتی جذب و سرور بلند تر مقاصدِ خیر یا حقیقتِ مطلقہ سے وابستہ ہوں تو ان میں عظمت پیدا ہو گی ورنہ نہیں ہو گی۔ تو پھر جمالیات کی تو اپنی کوئی قدر باقی نہ رہی۔ بات شاید یوں ہے کہ جمالیاتی قدر بنیادی قدر ہے۔ اس کا تقاضہ ذہنی، جذباتی اور جسمی خلوص ہے ـــ

خوب و ناخوبِ عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

اقدار کی دنیا میں تصنع اور بناوٹ یا احتسابی غلط روی بہت عام ہیں۔ حیوان کو یہ مشکل درپیش نہیں ہوتی۔ انسان کو مسلسل اس کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے۔ جمالیاتی قدر کے ذریعے ہم جذبات اور احساسات میں ایک ایسی تہذیب۔ شائستگی اور شگفتگی پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ ہر اس چیز سے گریز کرتے ہیں جو غیر حسن ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس دنیا میں تصنع ممکن نہیں۔ آپ عشق کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اور اسی لئے شاید کہنے والے نے یہ کہا تھا۔ حسن میں مدارج نہیں ہوتے۔ حسن یا ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا اور پھر اس سے بھی بڑی بات یہ کہ جمالیاتی قدر مقصود بالذات ہے یہ کسی دوسری قدر کی محتاج نہیں رہتی۔ نہ محرکات سے الجھتی ہے۔ نہ نتائج پر نظر رکھتی ہے۔ اپنے جذب و مستی، اور ذوقِ عمل سے زندہ و پائندہ ہے ـــ

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُم الکتاب +

(حلقہ اربابِ ذوق۔ لاہور)

افسانہ :-

اُصول کی بات

احمد ندیم قاسمی

" میرے چند احباب نے یہ افسانہ سنا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ "اب تو ایسا نہیں ہوتا"
اور میں نے عرض کیا کہ "صدیوں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اگر آج ایسا نہیں ہوتا تو خدا کرے
آئندہ بھی ایسا نہ ہو"
یہ واقعہ میں نے اس لئے لکھ دیا ہے کہ ممکن ہے آپ اس افسانہ کی اشاعت سے جھجکیں۔ یہ
افسانہ زرعی اصلاحات سے پہلے کے حالات کا ایک دلگداز عکس ہے۔ اور آئندہ کے لئے ایک تنبیہ
بھی ہے اور ہماری حکومت کا نقطۂ نظر یقیناً یہی ہے"۔ (ندیم)
(بے شک "اب ایسا نہیں ہوتا" اور اس میں سارا زور 'اب' پر ہے موجودہ انقلاب کا
حقیقی مقصد تمام تر یہی ہے۔ مدیر)

★

"سو وہ تم ہو"۔ زمیندار نے عبداللہ کو سر سے پاؤں تک اور پھر پاؤں سے سر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی" عبداللہ نے خاکساری کے وہ تمام تاثرات چہرے پر بکھیر لیے جن کے بوتے پر اس نے اب تک اپنی جان سے ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔

"پر تم تو بوڑھے ہو" زمیندار نے جیسے اس پر تھوک دیا۔

عبداللہ ذرا دیر کے لئے بجھ گیا۔ پھر فوراً اپنی کمک کو پہنچا۔

"میری عمر تو سرکار یہی کوئی پانچ کم پچاس ہوگی"

"پانچ اوپر پچاس تو نہیں؟" زمیندار نے مسکرا کر بھری ہوئی چوپال پر نظریں دوڑائیں۔

"اوپر نیچے کا دھوکا تو ہو ہی جاتا ہے"

لوگ زور زور سے ہنسنے لگے اور زمیندار پچھوان کی نے کو ایک مونچھ پر پھیرتا رہا۔ قہقہے رکے تو اس نے عبداللہ سے پوچھا۔

"جب تم پیدا ہوئے تھے تو ملکہ وکٹوریا کا راج تھا نا؟"

عبداللہ لوگوں کو ایک بار پھر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے فوراً بولا "جی یہ تو یاد نہیں، پر اتنا یاد ہے کہ ان دنوں ملکہ کا روپیہ چلتا تھا"

"اور سنو"۔ زمیندار نے سب سے جیسے داد طلب کی۔

" ملکہ کا روپیہ تو ابھی کل تک چل رہا تھا" یکایک زمیندار کو جیسے کوئی بات یاد آگئی اور وہ رقت سے بولا۔ "ہا۔ کیا روپیہ تھا؟ سچی چاندی تھی۔ یوں کھنکتا تھا جیسے کٹوری بج رہی ہو۔ ہا۔ کیسے کیسے زمانے تھے جو لد گئے۔ مجھے یاد ہے۔ خدا بخشے بابا نے خوش ہو کر کبھی کسی مزارعے کو ایک روپیہ دیا تو اس نے ان کی جوتیاں اٹھا کر چوم لیں۔ اور آج کسی کو دس روپے بھی دے دو تو وہ دس روپوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ دینے والے کے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے کہ شاید وہ دس روپے اور نکالے"۔

لوگ جو پہلے محظوظ ہو رہے تھے۔ سنجیدہ ہو گئے۔ پرلے کونے سے ایک آدمی بولا "اس زمانے میں تو سرکار، ایک روپے

سے لٹھے کی چادر بن جاتی تھی۔ آج دس روپوں میں کھدر کی چادر بھی نہیں بنتی۔"

زمیندار نے پیچوان کی نے کو پلنگ کی پٹی پر پٹخ دیا: "تو کیا میں نے تم سے لٹھے اور کھدر کا بھاؤ پوچھا تھا؟ کیا کبھی تمہارے باپ نے بھی لٹھے کی چادر باندھی ہے؟"

سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں سوائے عبداللہ کے کوئی شخص زمیندار کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنی جوتیوں کی نوکوں یا تہمدوں کی تہوں کو درست کرنے لگے تھے۔ پھر جب اس سناٹے کو زمیندار کے پیچوان کی گڑگڑ نے توڑا تو سب نے ایک ساتھ زمیندار کی طرف دیکھا اور زمیندار نے جیسے سب سے پوچھا: "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

کوئی آہستہ سے بولا: "ملکہ والے روپے کی بات ہو رہی تھی"

"ہاں۔ زمانے جو لد گئے" زمیندار نے ایک آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد پہلو بدل کر بولا: "کیوں بھئی سنا ہے وہ کرمے کی شادی پر ملتان سے جو [illegible]راثی آئے ہیں وہ بلا کے شہنائی باز ہیں۔ ذرا انہیں بلاؤ تو چوپال پر۔ ایک چوکی ہو جائے۔"

ایک نوجوان بولا: "جی ان کے ساتھ تو ٹبہ، اچھے گانے والے بھی ہیں۔"

"ان سے بھی کہہ دو۔" زمیندار نے حکم دیا: "شام کی نماز کے بعد ہم لنا سے پرے کی کافیاں سنیں گے۔ گلے دھو کے آئیں۔"

"جی اچھا" اکٹھی بہت سی آوازیں آئیں۔

زمیندار بولا: "تم لوگوں نے سنا ہو گا یہ کرما پہلے مجرہ کرانے کی سوچ رہا تھا اور ملتان جا کر قدرو کنجری سے بات بھی کر آیا تھا۔"

"جی" کسی نے تائید کی۔

"میں نے اسے کہلوا بھیجا تھا کہ اگر مجرہ کرانا ہے تو پہلے چوپال پر آؤ تاکہ یہاں میں تمہاری چمڑی اتار کر رکھ لوں اور باقی کو مجرہ کرانے بھیج دوں۔ سارے گاؤں کو پلید کرنے چلا تھا بدبخت۔ ہم نے لڑکے کا کیا تو صاحب ضلع کو بلوایا۔ کرما بیاہ کرے تو قدرو کنجری کو بلوائے! حرام زادہ۔"

لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے [illegible]۔ زمیندار ان کی باتیں سن نہیں رہا تھا مگر سمجھ ضرور رہا تھا۔ اسے معلوم [illegible] اسی کی نیکی اور پرہیزگاری کی باتیں کر رہے ہیں۔ خود آسودگی کے

جذبے سے اس نے رخ بدلا اور سامنے دیکھا۔ عبداللہ جہاں کچھ دیر پہلے آ کر رکا تھا، وہیں جما کھڑا تھا۔ اور اس کے ہاتھ جو زمیندار کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے جڑ گئے تھے۔ اب تک جڑے ہوئے تھے۔ البتہ اب ذرا سے ڈھیلے ہو گئے تھے اور اس کے ایک انگوٹھے کے ناخن پر ایک مکھی ساکت و صامت بیٹھی تھی۔

"تم اب تک یہیں کھڑے ہو؟" زمیندار نے یوں پوچھا جیسے وہ کچھ دیر کے لئے سو گیا تھا۔ عبداللہ نے جواب میں جڑے ہوئے ڈھیلے ہاتھوں کو پھر سے اکڑا لیا۔

"اولاد ہے؟" زمیندار نے پوچھا۔

"جی۔ ایک بیٹی ہے۔ ایک بیٹا بھی تھا بے چارہ۔ خدا نے لے لیا۔"

"کیسے مرا؟"

"جی دق سے۔"

"تو پھر تمہیں بھی دق ہو گی۔" زمیندار نے جیسے اس کے منہ پر دوبارہ تھوک دیا۔ عبداللہ اپنی آنکھوں میں ریت ڈالے چپ چاپ کھڑا رہا جیسے مرض کی تشخیص اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

زمیندار نے جیسے آخری فیصلہ سنانے سے پہلے پوچھا: "نام کیا ہے تمہارا؟"

"عبداللہ" وہ بولا۔

"تو پھر دِلا کہو۔ پورا نام کس نے پوچھا تھا؟"

عبداللہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"دیکھو بھئی دتے۔ میں زمینوں کو جتواتا نہیں ہوں۔ میں تو انہیں کولھو میں پلواتا ہوں۔ اور یہ کولھو چلانے کے لئے مجھے بڑے بڑے مضبوط بیلوں جیسے کسان چاہئیں۔" لوگوں کی ہنسی نے زمیندار کی بات کاٹ دی۔ وہ خود بھی ذرا سا مسکرایا۔ پھر بولا: "اور تم بڈھے آدمی ہو۔ بال کھچڑی ہو رہے ہیں۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ تم کیا ہل چلاؤ گے! اور پھر فرض کیا تم نے ہل چلایا۔ پر تم اکیلے آدمی ہو۔ بیمار پڑ گئے تو کھیتوں کی رکھوالی کون کرے گا؟ بیٹی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ بیوی ہے؟"

"جی، ہے"

"چلو یہ تو اچھا ہے۔ بیوی تو ہے۔ بیوی ہونی چاہئے ــــ ہل چلاتی نہیں پر چلواتی تو ہے۔"

لوگ پھر ہنسے۔

"تو یوں کہو کہ تم تحمل تین بگہ ہو" زمیندار بولا" لڑکا ہوتا تو شاید تمہارا کام بن جاتا۔ اور ہاں تم بھاگے کیوں گئے پہلی زمینوں سے؟"

"بس اتنی بات ہوئی سرکار" عبداللہ نے جڑے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو انگلیوں کی پوروں تک لاکر کہا۔

"میں نے کہا۔ چنا مہنگا جا رہا ہے۔ بولے ۔ نکل جاؤ"

"نکالا تو ٹھیک نکالا" زمیندار نے ایک بھوں اچکائی" اب اگر میں ملک کے روپوں کی بات کروں اور کوئی لٹھے اور کھدر کا بھاؤ لے بیٹھے تو بتاؤ میں اس کے ساتھ کیا کروں گا؟ یہی کروں گا اور کیا کروں گا"

سب نے ایک دم ایک ساتھ پلٹ کر پرلے کونے کی طرف دیکھا جہاں ایک آدمی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

پہلو بدل کر زمیندار نے سامنے اصطبل کی طرف دیکھا جس میں مشکی کمیت اور سفید رنگ کے تین گھوڑے توبڑوں میں منہ ڈالے کھڑے تھے "گیہوں بھی۔ اب ٹھیک ہے نا؟" اس نے سارے مجمع سے پوچھا" تھانیدار کے گھوڑے کو ادھر بھینسوں کے پاس بندھوا رہا ہے۔ تمہی میں سے کسی نے کہا تھا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے"

کوئی بولا" اچھا خاصا ہے تھانیدار کا گھوڑا۔ پر ان گھوڑوں کے سامنے تو گدھا سا لگنے لگتا ہے"

قہقہوں کے ایک دور کے بعد زمیندار گھوڑوں، تھانے داروں اور روئی کے نرخوں کی باتیں کرنے لگا اور کچھ دیر کے بعد زور سے تھپے ہوئے جوتے بڑی بے پروائی سے گھسیٹتا، چوپال سے اتر گیا لوگ ایک دوسرے کے پاس کھسک آئے اور ہنستے گڑگڑانے لگے۔ اور عبداللہ اکیلا رہ گیا۔

وہ بہت اداس تھا۔ پہلے زمیندار نے اسے صرف اس لئے جواب دے دیا تھا کہ جب وہ شکار پر آیا تھا اور کھیتوں میں گھوڑے باندھے تھے تو عبداللہ نے ان کے لئے دانہ لاتے ہوئے بس اتنا کہہ دیا تھا کہ" آج کل چنا تو بہت اونچا جا رہا ہے سرکار" اس نے یونہی روا روی میں یہ بات کہہ دی تھی جیسے کوئی موسم کی خرابی کا ذکر کر دے۔ مگر زمیندار نے اس کا کچھ اور مطلب لیا۔ یہ چنا۔ یہی چنا جو ہمارے گھوڑے کھا رہے ہیں؟"

"جی سرکار" عبداللہ نے کہا تھا۔

اور زمیندار نے پوچھا تھا" خوب سوچ کر بتاؤ۔ بہت مہنگا جا رہا ہے نا؟"

"جی ہاں۔ بہت ہی مہنگا" عبداللہ نے پھر کہا تھا۔

اور زمیندار نے اسے چابک مارتے ہوئے کہا تھا" نکل جاؤ یہاں سے نمک حرام کہیں کے۔ کتنے برسوں سے تم ہمارا دانہ کھا رہے ہو۔ آج ہمارے گھوڑوں نے تمہارا دانہ کھا لیا تو دانے کے نرخ یاد آ گئے"

اور عبداللہ اس گھروندے سے نکل آیا تھا جس میں اس نے گیارہ برس گزارے تھے اور جب اسے لائل پور گئے ہوئے بیٹے کی چٹھی ملتی تھی کہ میں مزدوری کر کے اپنے علاج کے لئے روپیہ کما لیتا ہوں اور آپ لوگ زیادہ فکر نہ کریں تو وہ اسی گھروندے کے آنگن میں گھنگھنیوں کا دیگچا پکاتا تھا اور چڑیوں، کووں اور لالیوں میں بانٹ دیتا تھا۔ اسی کے آس پاس کے پیڑوں میں اس نے اپنی بیٹی ماکھاں کے لئے جھولے ڈالے تھے اور جب وہ ہل چلاتا تھا اور اس کی بیوی بیگاں اسے روٹی اور چھاچھ پہنچانے آتی تھی۔ تو ماکھاں جھولا جھولتی تھی اور گاتی تھی:

ڈاچیاں کچیا دے
ویر خیری آ دے
بابا میرا لسی پیوے
اماں میری لسی پیوے
ویر یاد آ دے
ڈاچیاں کچیا دے
ویر خیری آ دے

اس وقت عبداللہ کا جی چاہا کہ اونچے اونچے سروں میں "ڈاچیاں کچیا دے" گانے لگے اور ساتھ ساتھ رونے لگے اور جب لوگ اس سے وجہ پوچھیں تو انہیں بتائے کہ" میں نے عمر بھر اپنے ہاتھ کی حلال روزی کھائی ہے پر کل میں نے ایک گاؤں کی مسجد میں جا کر نماز کے بعد بھیک مانگی تھی اور جب میں بھیک مانگ رہا تھا تو میری غیرت میرے گلے میں چھریاں مار رہی تھی اور میری آنکھوں میں آنسو جلنے لگے تھے۔ پھر جب میں چار روٹیاں اور چار آنے لے کر بیوی

بٹھی کے پاس آیا تھا تو بیوی نے کہا تھا "کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے۔ پہلے تم خون پسینہ بیچ کر روٹی لیتے تھے۔ جھگڑا تو روٹی ہی کا ہے ماکھاں کے بابا۔ امام صاحب کو بھی آج اس مسجد میں روٹی نہ ملے تو کل کوئی دوسری مسجد ڈھونڈیں۔ اللہ اللہ کرو وہ جب ترس کھائے گا تو بدلہ چکا دیں گے۔ چار روٹیاں لائے ہو۔ آٹھ اپنے ہاتھ سے پکا کر اور گھی لگا کر فقیروں کو نہ کھلاؤں تو ڈائن ہو کر مروں"

"تو کیا ہم فقیر ہیں؟" ماکھاں نے پوچھا تھا۔

اور میں نے بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا جیسے وہ بولی تو میں مر جاؤں گا۔

عبداللہ اچانک اٹھا اور چوپال کے پچھواڑے کی طرف لپکا جہاں ایک کیکر کے نیچے وہ بیگاں اور ماکھاں کو بٹھا آیا تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ دونوں کیکر کے نیچے موجود نہیں ہیں۔ ذرا سا ٹھٹکا مگر پھر کیکر کے نیچے جا پہنچا اور اس کے تنے پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک آشیانوں کی طرف جاتی ہوئی چڑیوں کا ایک بہت بڑا غول کیکر پر اترا اور اس کی ہر شاخ پر گیندیں سی لٹک گئیں۔ عبداللہ کو زندگی میں پہلی بار چڑیوں کا شور بہت برا لگا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر کیکر کے تنے پر زور سے لات ماری اور سب گیندیں ایک ساتھ فضا میں اچھل کر غائب ہو گئیں۔ چڑیوں کے پروں کی جھپٹ میں آئے ہوئے کیکر کے پھولوں نے زمین پر بلدی سی بکھیر دی تھی اور آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ایک گھنی بدلی میں سے نیزوں کی طرح نکلی پڑ رہی تھیں۔

عبداللہ چوپال کی طرف پلٹا تو سامنے سے اسے بیگاں آتی نظر آئی۔ اگر گلی میں سے ایک پنہاری نہ گزر رہی ہوتی تو وہ بیگاں کے پاس بھاگ کر پہنچ جاتا۔ پھر بھی وہ بظاہر تیز نہ چلتے ہوئے تیزی سے بیگاں کے پاس پہنچا مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے بیگاں ہی بولنے لگی "ادھر ڈیوڑھی میں ایک زنانہ کسان خانہ ہے۔ ہم اس میں چلی گئی ہیں۔ سب نوکرانیاں بھی وہیں سوتی ہیں۔ بڑی اچھی لوگ ہیں ہمیں وہاں لے گئیں۔ پھر ہمیں چینی کی چائے پلائی۔ پھر اپنے اپنے دکھوں دردوں کی باتیں بھی ہوئیں۔ اس وقت ماکھاں ان کے ساتھ چائے کے برتن دھو رہی تھی۔ میں نے کہا میں تمہاری خبر لے آؤں۔ تمہیں چائے ملی؟"

"مجھے تو ابھی حقہ بھی نہیں ملا" عبداللہ نے کہا۔ "پر تمہاری بات سن کر سمجھو چائے بھی پی لی۔ ویسے بیگاں! کام بنتا نظر نہیں آتا۔ زمیندار کے منشی کا پتہ لگاتا ہوں، وہ ملے تو اس کے پاؤں پکڑ لوں۔ تم بھی کسی نوکرانی سے زمیندارن کو کہلواؤ۔ کوسوں تک پھیلی ہوئی زمینیں ہیں۔ ایک آدھ بیگہ ہمیں مل جائے تو کیا بگڑ جائے گا ان بادشاہوں کا۔"

بیگاں وعدہ کر کے چلی گئی اور عبداللہ چوپال پہ آ گیا۔ لوگ اٹھ گئے تھے۔ صرف ایک طرف سائیں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ عبداللہ سیدھا اس کے پاس جا بیٹھا۔ سائیں نے حقہ اس کی طرف گھما دیا اور جب عبداللہ چند کش لگا چکا تو سائیں بولا۔ "بڑا ہی برا زمانہ آ لگا ہے چاچا۔ پیٹ کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اب تم پکی عمر کے آدمی ہو یہ تمہارے آرام سے کھٹولے پر بیٹھ کر حقہ پینے کے دن تھے مگر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہو دربدر کی۔ خدا اگر آدمی کا پیٹ نہ لگاتا تو کوئی مُنڈا بھی نہ ہوتا۔ ذرا یہ پھاوڑا لے کر گھوڑوں کی لید تو سمیٹ لو میں جا کر گودام سے تمہارے لئے کھٹیا نکال لاؤں۔"

عبداللہ چپکے سے پھاوڑا اٹھا کر اصطبل کی طرف چلا گیا اور سائیں چوپال سے اتر گیا۔ شام کے بعد ایک آدمی عبداللہ کے لئے کھانا لے آیا۔ ذرا دیر بعد چوپال پر گاؤں والوں کا ریلا سا آ گیا۔ اکٹھی چار پانچ لالٹینیں جلنے لگیں۔ مراثی بھی آ گئے اور ڈھولوں، شہنائیوں کو سر کرنے لگے۔ پھر جب زمیندار نے چوپال پر قدم رکھا تو بالکل وہ کیفیت چھا گئی جب سینما ہالوں میں فلم شروع ہونے سے پہلے بتیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ پہلے شہنائی والے نے اپنا کمال دکھایا۔ پھر گانے والوں نے ملھے کی کافیاں اور علی حیدر کے دوہے سنائے۔ آخر زمیندار نے دس روپے کا ایک نوٹ ایک ہاتھ میں اور دوسرا نوٹ دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر دونوں ہاتھ بلند کر دئے، شہنائی والا آگے بڑھا اور ایک نوٹ لیکر سلام کرتا ہوا الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ گانے والوں میں سے بھی ایک نے یہی کیا پھر سائیں نے آگے بڑھ کر فرش پر چادر بچھا دی۔ اور ایک دونی رکھ دی۔ ہر شخص جیب میں ہاتھ ڈالے اور ٹینٹ کھولے آگے بڑھا اور سب نے ایک ایک دونی چادر پر رکھ دی۔ عبداللہ کے لئے یہ سب باتیں نئی تھیں مگر دوسروں کی دیکھا دیکھی اٹھا اور مسجد سے بھیک میں ملی ہوئی چونی ٹینٹ سے کھول کر اور آگے بڑھ کر زمیندار کے قدموں میں چادر پر ڈال دی اور ابھی وہ ایک دونی اٹھا لینے کی سوچ رہا تھا کہ زمیندار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا: "اچھا تو تم ڈوگے ہو"۔ پھر وہ سب لوگوں سے مخاطب ہوا۔

ملتی لوگوں دیکھ رہے ہو اس بڈھے کو۔ تم سب نے ایک ایک دونی دی ہے اور اس نے یہ میرے سامنے جوتی لا کر رکھ دی ہے۔ یہ فرق ہے پرانے اور نئے زمانے میں۔ اسے کہتے ہیں وضعداری کہ روزگار رہے نہیں۔ زمینوں کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ابھی میرے مزارعوں میں شامل نہیں ہوا مگر اصول کی بات، اصول کی بات ہے اور اس نے جوتی کھول کے رکھ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کبھی پرانے لوگوں کو بہت پسند کرنے لگتا ہوں، نوجوان مزارعوں کو تو اتنا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ زمیندار کی جوتی سیدھی کیسے کی جاتی ہے۔ جاؤ بھئی دُتے بیٹھ جاؤ۔ کھانا دانا تو مل گیا نا تمہیں؟

"مل گیا سرکار" دُتا مارے خوشی کے کانپ رہا تھا۔ "آپ کے بچے جئیں۔ آپ کی زمینیں پھلیں"۔

دونیوں کو گنا گیا اور انہیں برابر تقسیم کر کے شہنائی بجانے والے اور گویوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اور جب محفل برخاست ہو گئی اور چوپال میں صرف ایک دیا جلتا رہ گیا تو عبداللہ اٹھ کر اپنے کھٹولے پر آ بیٹھا۔ چوپال کے صحن کے پرلے کونے پر چار کھاٹیں بچھی ہوئی تھیں اور چاروں آدمی بار بار حقہ پی رہے تھے اور کھانس رہے تھے۔ عبداللہ کا جی چاہا کہ وہ ان کے پاس جا کر باتیں کرے مگر اتنے میں سائیس آ گیا اور اس کی پائنتی پر بیٹھ کر بولا۔ "تمہاری بات تو کچھ بنتی ہوئی معلوم ہوتی ہے چاچا۔ تمہاری جوتی کام کر گئی۔ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھتے ہیں سرکار۔ میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ وہ جس آدمی نے لٹھے اور کھدر کی بات کی تھی نا۔ اسے سرکار نے نکال دیا ہے۔ یوں سرکار کی خاص شکارگاہ والی زمینیں تمہیں ملنے والی ہیں۔ ایک تو ویسے ہی یہ زمینیں سونا اگلتی ہیں دوسرے مہینے میں دو بار نہیں تو ایک بار تو سرکار ضرور وہاں جاتے ہیں۔ چھوٹی سی بنگلی بنی ہوئی ہے، وہاں ٹھہرتے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں۔ تمہیں یہ زمینیں مل جائیں تو سمجھو تمہارے دلدر دور ہو گئے۔ پرانے مزارعوں نے سنا کہ بنگلی کا علاقہ تمہیں مل رہا ہے تو وہ اب چوکی کے بعد سرکار کے پیچھے پڑ گئے کہ ہم پرانے خدمت گار ہیں۔ اور ان زمینوں پہ ہمارا حق زیادہ ہے مگر سرکار نے ڈیوڑھی کے اندر جاتے ہوئے بڑے مزے کی بات کہی۔ بولے۔ شاید پہلے میں کچھ سوچتا مگر اب تو اصول کی بات ہے۔ تمہیں جلانے کے لئے یہ زمینیں دُتے ہی کو دوں گا۔ میں مٹھائی نہیں چھوڑوں گا چاچا"۔

عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائیس کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ اچانک سائیس اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "نہیں چھوڑوں گا مٹھائی"۔ اور پھر چلا گیا۔

اور عبداللہ نے کھٹولے پر لیٹتے ہوئے اتنی لمبی انگڑائی لی کہ اس کے تمام جوڑوں میں سے پٹاخے چھوٹنے لگے۔ پھر اس نے کچھ پڑھ کر اپنے چاروں طرف پھونک دی، جوتے کا ایک بٹن کھول کر اپنے سینے پر پھونک دی اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔

ذرا سویا تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے ہلا دیا۔ "کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ وہ سائیس تھا۔ پائنتی کی طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔ "دیکھو چاچا۔ بڑا ضروری کام ہے اس لئے تمہیں جگا دیا۔ وہ بنگلی والی زمین سرکار نے تمہارے نام کر دی تھی منشی سے بھی کہہ دیا تھا اور یہ بھی انتظام کر دیا تھا کہ صبح کو تم بیلوں کی ایک جوڑی بھی پسند کر لو۔ مگر اب معاملہ کچھ بگڑ گیا ہے۔ تم سے کچھ ہو سکتا ہے تو کرو"۔

عبداللہ نے چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی اور سائیس کے قریب ہو کر بولا: "کیا ہو گیا ہے ایک دم۔ تم بتاؤ تو سہی مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کر دوں گا"۔

سائیس آہستہ سے بولا "میں تمہیں لے چلتا ہوں ڈیوڑھی میں یوں کرو کہ تمہاری بیٹی ہے نا ماکھاں۔ اس کو سمجھا دو"۔

"کیا سمجھا دوں؟ وہ کیا کرے گی؟" عبداللہ نے پوچھا۔

اور سائیس بولا: "ارے چاچا۔ اس کو سمجھا دو نا۔ اس سے کہہ دو کہ مان جائے۔ آدھی رات ہونے کو آئی ہے اور وہ اب تک نہیں مانی۔ نہ وہ مانتی ہے۔ نہ اس کی ماں اسے مناتی ہے۔ اب اگر تم بھی نہ منا سکو تو سرکار کہتے ہیں کہ اپنی راہ لو۔ اصول کی بات ہے!

∴

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ رنگت، گال پہ لالی، آنکھیں بہت اداس
اے رانی تو جگ جگ جیوے ہاتھ میں رے مرے ہاتھ
اے راجہ میں آج تری، کل اور کسی کے ساتھ!
(عالی)

سنّاٹا

(ایک افسانوی تأثر)

ابن سعید

پاکستانی ہوائی سروس ۔ جو ہفتہ میں دو مرتبہ کراچی اور لندن کا سفر طے کرتی، پاکستان اور انگلستان کے درمیان ایک غیر مرئی پُل تھی۔ اور بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے کراچی کے اسٹاک ایکسچینج اور بازار کے گھٹتے بڑھتے نرخوں سے فائدہ اٹھا کر روپیہ پیدا کر لیا تھا۔ یا جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ جانے کے عادی تھے۔ یا پھر اس سفر کو طے کرنے کی خواہش میں اپنا ماضی اور حال سب فراموش کر دینے پر ہی آمادہ ہو گئے تھے، ایسے بہت سے لوگ اس غیر مرئی، ان دیکھے پُل پر سے گزر کر کراچی سے لندن پہنچ جاتے۔ اور چلچلاتی دھوپ اور خاک سے لبریز ہواؤں اور جھونپڑیوں اور جدید اطالوی اور فرانسیسی وضع کے محلوں کی عجیب و غریب، پُر اسرار، ناقابل فہم دنیا کو پیچھے چھوڑ کر لندن پہنچ جاتے جہاں ایک قسم کی دائمی خنکی اور دھند کے مرغولوں میں لپٹی ہوئی ایک وسیع دنیا اُن کا استقبال کرتی۔ یہ غیر مرئی پُل دراصل اُن دو خلیجوں کے درمیان حائل تھا جس کا ذکر برسوں پہلے فاسٹر* نے اپنے ناول میں کیا تھا۔ اور اس پُل کو عبور کرنے کے لئے اب محض ایک ہوائی ٹکٹ کی قیمت درکار تھی۔

اور سید سخاوت حسین جن کی بیوی دائمۃ المریض تھیں، بچوں کی تعلیم کا بہانہ کر کے کسی نہ کسی طور اس پُل کو عبور کر کے کراچی سے لندن چلے آئے تھے۔ اور اب پٹنی کے ایک کاٹج نما مکان میں مقیم تھے۔

سید سخاوت حسین میں ممتاز کو اپنی پہلی ملاقات ہی میں ایک بڑی دلچسپی محسوس ہونے لگی، سید صاحب انتہائی سرپرستانہ انداز میں ہنسے تھے۔

"میاں صاحبزادے۔ بات یہ ہے کہ اور تو کنگسٹن پر جو دوکمیٹی ... جمشید ہے ہمیشہ اس کی دکان پر اور تو سب کچھ مل جاتا ہے۔ مگر یہ کمبخت پان نہیں ملتے ہیں۔"

پان اُن کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی، اور ان کے علاوہ ان اَن گنت کلرکوں اور افسروں اور بے دیوان شاعروں اور غیر مطبوعہ کتابوں کے مصنفوں اور اُن کے گھروں کی بے گنتی عورتوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ جو لندن میں اپنی زندگیاں بِتا رہے تھے۔ وہ پان کی خاطر اُس ہوائی سروس کی تاریخوں کا بے تابی کے ساتھ انتظار کرتے۔ اور ہوا بازوں کی خوشامدیں کرتے۔

ہوائی سروس کی آمد کی خوشی میں سفارت خانے میں کام کرنے والے ادنیٰ درجے کے ملازمین کی بیویاں بھی آپس کی کدورتیں فراموش کرنے پر آمادہ ہو جاتیں۔ اور جب ہوائی سروس کا دن قریب ہوتا تو آپس میں ایک نئی محبت اور یگانگت کی بنا ڈال دیتیں۔ اور پھر پُرانی ملاقاتوں کی تجدید ہوتی۔ ایک دوسرے سے ملتے رہنے کی قسمیں کھائی جاتیں۔ فریئر روڈ اور پاکستان چوک اور ناظم آباد، پیر الٰہی بخش کالونی کی گلیوں کو یاد کیا جاتا اور پان کھانے اور کھلانے کا یہ سلسلہ کم از کم کچھ مدت کے لئے اُن کے آپس کے تعلقات میں ایک گرمی پیدا کر دیتا۔

ممتاز نے سید سخاوت حسین کو ستانے کی غرض سے کہا۔

"آپ لوگ بھی خوب ہیں۔ ایک طرف تو خود ہی جلا وطن ہو کر یہاں چلے آتے ہیں اور پھر یہاں آن کر میلاد شریف منعقد کئے جاتے ہیں، محرم منایا جاتا ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں ... کی دکان سے ... کر اگر لوبان کی خوشبو سے گھر کو معطر کرتے ہیں گھیس ... چولھے پر سری پائے پکاتے ہیں۔ اور ہوائی جہاز ... کو حسرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ... جانتے ہیں کہ اسی دنیا میں برٹش میوزیم ہے۔ چلتی ... پارک ہے۔

---

* ای۔ایم فاسٹر: A PASSAGE TO INDIA

فلیٹ اسٹریٹ ہے، شاور ہے، سوہو ہے! — سفید فام عورتیں ہیں!

ممتاز نے ابھی اپنی بات ختم نہ کی تھی کہ سید سخاوت حسین کے کمرے میں ایکا ایکی سکینہ وارد ہوگئی۔ سکینہ ان کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ پچھلے پانچ سال میں لندن نے اس کی زندگی میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اپنے نیم دیہاتی قصبے سے نکل کر جہاں وہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد کراچی پہنچی تو اس کی عمر دس بارہ سال کی تھی۔ کراچی میں آکر پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک چھوٹے سے کابک نما مکان میں اُس نے جوانی کی ابتدائی منزلیں طے کیں اور اُسی علاقے کے ایک پرائیویٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر سید سخاوت حسین کی قسمت نے زور مارا تو وہ لندن پہنچ گئی۔ یہاں تو اس کے لئے دنیا ہی اور تھی۔ اب وہ ایک ہوم سائنس کالج میں ڈپلوما کورس کر رہی تھی۔ اور آکسفورڈ اسٹریٹ اور کنسنگٹن میں کپڑے والوں کی دکان پر سیل کی منتظر رہتی اور ہفتے میں ایک مرتبہ ایک فورن لینگوئجز کلب میں اطالوی زبان سیکھنے کی غرض سے جاتی اور اپنے خالی اوقات میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے سات آٹھ پونڈ ہفتہ کما لیتی۔

سکینہ کے یوں ڈرامائی انداز میں سید سخاوت حسین کے کمرے میں داخل ہونے پر تمام دفتر کی فضا میں ایک لہر سی دوڑ گئی جیسے وہ سب کلرک جو اس وسیع کمرے میں بیٹھے تھے ایک دوسرے سے ایک بے آواز لہجے میں کہہ رہے ہوں۔

"یہ سکینہ بھی بہت ولیسی لڑکی ہے!" دفتر کی فضا میں ایک ہلچل پیدا کر کے سکینہ ایک بے ساختگی کے ساتھ سید سخاوت حسین کی میز پر اُچک کے بیٹھ گئی۔

"ابو!" اس نے اِٹھلا اِٹھلا کر کہا۔ "آپ نے اب تک شوکت میاں کو ٹیلیفون نہیں کیا؟" سید سخاوت حسین نے چھالیہ کی ڈلی چباتے ہوئے کہا "کیا کروں بیٹا فرصت ہی نہیں ہوتی" پھر ممتاز سے مخاطب ہو کے کہنے لگے "شوکت میاں بھی اپنے ہی قصبے کے رہنے والے ہیں۔ ہفتے میں دو بار نہیں تو ایک مرتبہ ضرور ہمارے لئے پان لے آتے ہیں، کبھی کبھار قوام بھی۔ پر وہ ...... کسٹم والے بہت پریشان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں "ان پانوں کے ذریعے بھی بیماری کے کیڑے ولایت میں آسکتے ہیں۔ ان کو پہلے دوائی سے دھوؤ، تب لے جانا ملے گا!

سکینہ ایک لمحے کے لئے ممتاز کی شخصیت کا جائزہ لینے لگی۔ مگر پھر اُسی اٹھلاہٹ کے ساتھ کہنے لگی "بس ابو! آپ کو تو ہمارے کاموں کو ہی فرصت نہیں ہوتی۔ آپ مت بیٹھا رہیے ہم خود ہی فون کر لیں گے"۔ پھر وہ بلا تعارف ہی ممتاز سے مخاطب ہوگئی "آپ ہوائی سروس کے شوکت میاں کو جانتے ہیں؟"

ممتاز نے جھوٹ بول دیا۔ "ہاں تھوڑی بہت تو ...... واقفیت ہے!"

"تو پھر آپ ہم کو اُن کے پاس لے چلئے۔ وہ ہمارے لئے کراچی سے ایک سوغات لے کر آئے ہیں!"

ہوائی کمپنی کے دفتر کی طرف جاتے ہوئے ممتاز نے سوچا کہ نہ جانے لڑکی کونسی سوغات کی منتظر ہے! — وہ اب سکینہ کے قرب کو شدید طور پہ محسوس کر رہا تھا۔ اچانک سکینہ نے اٹھلا کر اس سے ایک سگریٹ مانگ لیا۔

"ابو کو مت بتائیے گا۔ مگر ہمیں سگریٹ پینا بہت پسند ہے۔" اس نے کہا۔

اُس کا سگریٹ پینے کا انداز کافی شوخ تھا۔ ممتاز نے سوچا کہ نہ جانے اس نے یہ سب طور کہاں پر سیکھے تھے۔ اس کو معاً خیال آگیا کہ کراچی اور لندن کے درمیان غیر مرئی پل اس نوجوان تیکھی لڑکی کو الٰہی بخش کالونی کی دور افتادہ زندگی سے بہت زیادہ دُور لے آیا تھا۔ اور اگر اس پل پر سے گزر کر وہ دوبارہ کراچی جانے کا ارادہ کرے گی۔ تو نہ جانے کیا ہوگا!

وہ سوغات جس کے لئے سکینہ اس قدر بے تاب تھی۔ دراصل ایک ٹیپ ریکارڈر کا ٹیپ تھا جو کسی نے اس کے واسطے کراچی سے لندن بھیجا تھا۔ سکینہ نے ممتاز کو بتایا کہ اس فیتے پر بہت سے شاعروں کا مترنم کلام ریکارڈ کیا گیا تھا۔

اس سوغات کو پاتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک ہویدا ہوگئی۔ اس نے کہا۔ "مجھے ترنم سے پڑھتے ہوئے کلام سے بے حد عشق ہے۔ اگر آپ ہمارے گھر آئیں تو آپ بھی اس کلام کو سن سکیں گے۔"

ممتاز نے کہا۔ "شاید میں آہی جاؤں، کیونکہ کل تو میں

،، تلاش عام ،،
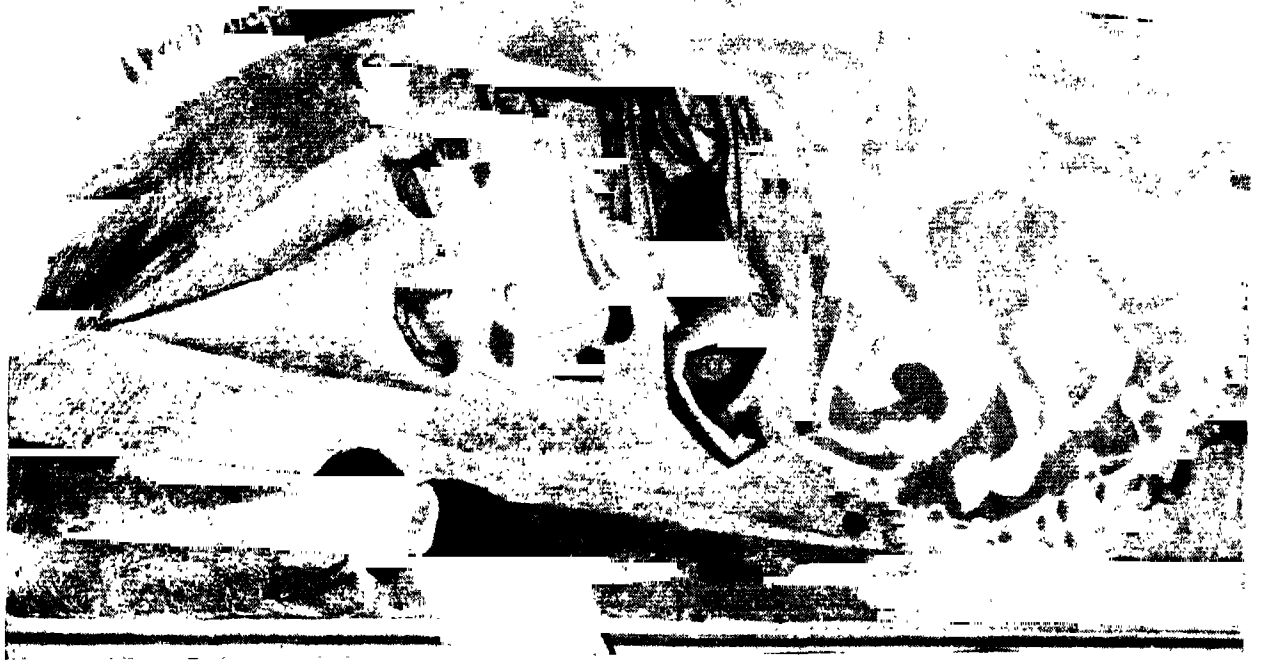
دور انقلاب کا مرقع نگار صادقین

ایک تصور (روغن فرانسی کی تکنیک)

ملک کا بدترین دشمن : ،، اسمگلر ،، ۔۔(کردار اور کیفر کردار) (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۱۱۱)

،، بہار ،،
عمل : رضیہ فیروز

،، خزاں ،،
عمل : طلعت

یہاں سے چلا ہی جاؤں گا"

"کہاں؟" سکینہ نے بیتابی کے ساتھ پوچھا۔

"واپس" ممتاز نے کہا — "رخصت اے بزم جہاں وغیرہ وغیرہ"۔

سکینہ مسکرا دی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اب ایک کھوئی کھوئی سی کیفیت تھی۔

پر جب وہ دوبارہ ممتاز سے سگریٹ مانگ کر سلگانے لگی تو یہ کیفیت اس کی غائب ہو گئی اور وہ دوبارہ وہی شوخ نوجوان لڑکی ہو گئی جس کے سگریٹ پینے کے انداز میں ایک عامیانہ سی جھلک تھی اور وہ اپنے مخصوص اترا ہٹ آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ "اچھا خدا حافظ — جاؤ تم بھی سدھارو!"

دن بھر ممتاز اپنے مختلف کاموں میں جتا رہا۔ وہ ایک عرصے سے یہاں لندن میں مقیم تھا اور اس کی زندگی بغیر کسی پروگرام کے گذرتی رہی تھی۔ مگر اب یہ چند آخری لمحے بہت قیمتی تھے قیمتی اور اہم — اور ان چند لمحوں کے اختتام پر اس کو معلوم تھا کہ وہ ہوائی جہاز کی نرم گدیلوں والی سیٹ میں دھنس جائے گا۔ اور چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنے والا ہوائی جہاز زمین کی مقناطیسی کشش کا مقابلہ شروع کر دے گا۔ اور وہ سوچے گا کہ نہ جانے سکینہ کی آنکھوں میں وہ ایک مدھم مدھم کھویا پن پیدا بھی ہوا تھا یا یہ اس کا محض واہمہ ہی تھا۔

جب ٹیوب اور بس سے مسلسل چالیس منٹ تک سفر کرنے کے بعد ممتاز پٹنی میں سکینہ کے بتلائے ہوئے بس سٹاپ پر اترا تو اس کو اس علاقہ کی مضافاتی فضا میں خواہ مخواہ ایک اداس کیفیت نظر آئی۔ مگر اس وقت اسے اس کیفیت پر زیادہ وقت صرف کرنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سکینہ کی بتائی ہوئی ہدایتوں کے بموجب دس منٹ میں سید سخاوت حسین کے مکان پر پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں فرش پر سکینہ اور اس کے ہم عمر تین چار اور لڑکے لڑکیاں بے تکلفی کے ساتھ نیم دراز تھے ان کے درمیان ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا جیسے وہ سب کے سب اس سائنسی ایجاد کے گہرے پرستار ہوں!

ممتاز کو دیکھ کر سکینہ اچھل پڑی اور اپنے مخصوص بے تکان طریقے پر باتیں کر کے اس کا اوروں سے تعارف کرانے لگی۔

"آپ ذرا دیر سے پہنچے اگر آپ مقررہ وقت پر آتے تو آپ کو کافی کے ساتھ دہی بڑے بھی کھانے کو ملتے اب کافی پر ہی قناعت کرنی ہوگی — یہ زاہدہ ہے یہ قمر یہ ریحانہ — یہ شاہد — یہ محمود!"

وہ تیزی کے ساتھ بول رہی تھی۔ جیسے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ دینا چاہتی ہو یا شاید وہ تیز تیز بول کر اپنی گھبراہٹ کی سی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو سکینہ بے تکلفی کے ساتھ اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی ٹیپ ریکارڈر کے پاس لے گئی — "تکلف برطرف آپ بھی یہاں ہمارے ساتھ زمین پر بیٹھ جائیے" اور وہ پھر اپنے ساتھیوں کو ایسے دیکھنے لگی جیسے اپنی باتوں پر داد طلب کر رہی ہو۔ وہ قالین سے زمینی فرش پر گدیلوں کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔ اور سکینہ نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ دبا دیا اور ٹیپ میں مقید ایک اداس مترنم آواز نے ایک غزل پڑھنی شروع کر دی۔ رسمیہ انداز کے نپے تلے مصرعے غزل کی روایتی بندشیں پھر بھی ممتاز کو اس مترنم آواز کی اداس کیفیت متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ نجانے غزل کے اشعار یوں ترنم سے پڑھتے وقت شاعروں کا موڈ خواہ مخواہ کچھ اداس کیوں بن جاتا ہے۔ سکینہ متوقع انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔ جیسے وہ بھی یہی سوال اس سے کرنا چاہتی ہو! جب ممتاز نے سکینہ کی طرف دیکھا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگی۔ "یہ غزل تو نہ جانے کس کی ہے، مگر پڑھی ہمارے ایک عزیز نے ہے۔ اُن کی آواز میں بیحد ترنم ہے۔"

ٹیپ ریکارڈر کی مترنم اداس آواز ابھرتی گرتی رہی اور ممتاز کو اس ڈرائنگ روم سے قالین سے مزین فرش پر نیم دراز لڑکوں اور لڑکیوں سے پٹنی کی خاموش فضا سے ایک بیزاری سی محسوس ہونے لگی۔ ایک وحشت جیسے کوئی اَن جانا جذبہ اس کو ان سب چیزوں سے دور کھینچ کر لے جانے پر آمادہ تھا۔ نہ جانے اگر وہ اپنے کو اس جذبے کے بہاؤ پہ چھوڑ دے تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

ڈرائنگ روم کی فضا میں ایک غزل کا [illegible]

دوسرا کنارہ

غلام الثقلین نقوی

رحمتے نائن نے کہا "شاداں ماشاءاللہ جوان ہو چکی ہے"۔
سیداں اناج پھٹک رہی تھی۔ اس نے چھاج کو ایک جھٹکا دیا اور کہا "لڑکیاں جوان ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ تو نے کون سی نئی بات کی؟"
رحمتے نائن کھسیانی ہو کر یونہی ہنس دی۔ دوسرے لمحے اس نے سنجیدہ بنتے ہوئے کہا "چودھرائن! شاداں تو تیری چھوٹی بہن لگتی ہے۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو تیری جوانی یاد آجاتی ہے"۔
سیداں نے دھیمے سے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو؟ گزرے دن کیوں یاد دلاتی ہو؟"
"نہیں..... میرا مطلب تھا..... شاداں تیری جوانی کی تصویر ہے۔ چنبے کی کلی کی طرح نازک۔ کنوار گندل ایسا لچکتا ہوا بدن۔ چودھرائن! تیری آنکھوں کا جادو پھر سے زندہ ہو گیا ہے"۔
سیداں نے مسکرا کر کہا "رحمتے! تو نائن نہیں میراسن ہے۔ تجھے کسی کے منہ پر تعریف کرنا خوب آتا ہے"۔ "تیرا نائی کہہ رہا تھا چودھری کرم دین تو افیم کی پینک میں مست ہے جس کے گھر میں جوان لڑکی ہو اسے بھلا نیند کیسے آسکتی ہے"۔
سیداں کا چہرہ یکدم اداس ہو گیا۔ اس چہرے پر چند لمحے پہلے ہنسی کی دھیمی سی بہار تھی اور یہ ہنسی اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ گزری ہوئی جوانی کا ایک لمحہ اپنی پوری آب و تاب سے زندہ ہو گیا تھا۔ بیس سال پہلے کی جوانی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی آئی تھی اور بیس سال کا گرد و غبار دھل کر مطلع نکھر آیا تھا۔ پھر بیس سال آنکھ جھپکنے میں گزر گئے تھے!
نائن نے کہا "نائی کہہ رہا تھا کہ اب شاداں بی بی کا بیاہ ہو جانا چاہیے"۔
سیداں نے نائن کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈال کر کہا "ہوں! اب پتہ لگا تو میری جوانی کے گن کیوں گا رہی تھی؟ نائیوں کا اور کام ہی کیا ہے؟ تیرے نائی سے کہہ دینا تجھے اپنے لاگ، سے غرض ہے۔ فکر نہ کر شاداں کے بیاہ پر اتنا دوں گی کہ ساری عمر کسی سے نہ ملا ہو گا"۔
رحمتے نے خوش ہو کر پوری بتیسی نکال دی۔ پھر اس نے متانت کا لبادہ اوڑھتے ہوئے کہا "اس گھر سے جھولیاں بھر بھر کر لیا ہے بی بی! لینے دینے کے سر پہ خاک۔ ایک بات پوچھوں؟"
"کہو"۔
"شاداں کا ناطہ کہاں طے کیا ہے؟"
"کہیں بھی نہیں"۔
"تیرا نائی کہہ رہا تھا کہ چودھری شاہ دین کا لڑکا شریف..."
"دیکھا جائے گا" سیداں نے تھوڑا سا چڑ کر کہا۔
رحمتے نائن نے حوصلہ نہ ہارا "میں نے تیرے نائی سے کہا شریف کے لچھن اچھے نہیں"۔ اور پھر کچھ دیر سوچ کر اس نے ایک تیر اور چھوڑا "چودھری لال دین کا بیٹا سرفراز....." نائن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سیداں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا "سرفراز..... پر چودھری تو اس گھر کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔ جب کبھی اسے نشے کی ترنگ سے ہوش آتا ہے تو وہ لال کے خاندان کی تباہی کی بات کرتا ہے"۔ رحمتے نے محسوس کر لیا کہ چودھرائن اس رشتے پر خوش ہے۔ اس نے کہا "سنا ہے سرفراز نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو ایسا شریف لڑکا نہ مل سکے گا"۔
"ہاں..... ہاں..... پر چودھری کو کون راضی کرے"۔
اور اس اثنا میں شاداں باہر سے آگئی۔ نکھری ہوئی دھوپ جیسی شاداں نو دمیدہ کلی کی طرح تر و تازہ لگ رہی تھی۔ شاداں دیہاتی کی روایات کے برعکس دبلی پتلی تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا اور نازک تھا البتہ اس کے [illegible] دلوں کے بیچ درمیان سرخیوں کے نقش [illegible] جنہیں دھو

نے تمازت بخش دی تھی۔ بال سیاہ تھے اور آنکھیں شبنم کے قطروں کی طرح جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ شاداں کی چال میں نئی نئی جوانی کا تازہ تازہ شعور تھا اور اس شعور میں غرور نہیں تھا لیکن بلوغت کی آمد آمد کا لوچ ضرور تھا اور نادیدہ خوشبوؤں کے وہ لطیف سانس بھی تھے جو بہار کے آتے ہی فضاؤں میں رچ جاتے ہیں۔

وہ نائن کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر وہ آگے بڑھ کر وہاں آگئی جہاں سیداں بیٹھی ہوئی تھی۔ نائن نے اپنی نظر اس کے چہرے پر گاڑ دی۔ یہ نظر چہرے سے پاؤں تک چیونٹی کی طرح رینگتی رہی۔ یہ نظر شاداں کے ایک ایک انگ کو ٹٹول رہی تھی۔ شاداں بے چین سی ہوگئی۔ اس کے گال تمتمائے اور رخساروں کے نقطے پھیلے۔ کانوں کی لویں تپنے لگیں۔ آنکھیں جھک گئیں اور پلکوں نے ان پر سایہ کر دیا تو نائن نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "بالکل تیری تصویر ہے چودھرائن! تیری کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی اس نے" شاداں شرماتے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ کمرے کے اندر چلی گئی۔ سیداں نے چھاج ایک طرف رکھ کر نائن کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ پھر یہ نظریں اپنے آپ میں کھو گئیں اور اپنے آپ میں کھوئی ہوئی نظریں اپنے آپ سے بھی بے نیاز ہوگئیں۔ ان کا رشتہ اپنے ماحول سے ٹوٹ گیا تو نائن نے اٹھتے ہوئے کہا "میں جاؤں بی بی؟" سیداں نے بے خیالی میں سر ہلا دیا۔ نائن اٹھ کر چلی گئی تو شاداں باہر آنگن میں آگئی۔ اس نے سیداں سے پوچھا "ماں! یہ نائن کیا کہہ رہی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ یونہی ادھر ادھر کی باتیں"

"باقی اناج میں پھٹک دوں ماں؟" شاداں نے کہا۔

"نہیں تو اپنا کام کر" شاداں چپکے سے اندر گئی اور سوئی دھاگے والی پٹاری اٹھا لائی اور ماں کے پاس بیٹھ کر ایک دوپٹے پر بوٹے کاڑھنے لگی۔ دونوں ماں بیٹی خاموش تھیں اور دونوں کام کرتے کرتے کچھ سوچ رہی تھیں۔ دونوں کے سوچتے ہوئے چہروں اور کھوئی کھوئی آنکھوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ دونوں کی آنکھیں خواب دیکھنے کی عادی تھیں۔ آنگن میں دھوپ کھلی ہوئی تھی اور ایک کونے میں بکائن کا ایک درخت تھا جس پر نئے نئے پتے آئے ہوئے تھے۔ دوران میں پھدکتی ہوئی چڑیوں کا ایک جھنڈ تھا۔ یہ چڑیاں چہچہا کر اڑ رہی تھیں اور اڑ اڑ کر چہچہا رہی تھیں۔ بکائن کے نیچے پتیوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ کے دھبے کانپ رہے تھے۔ سیداں نے آخری بار چھاج پھٹکا اور ایک چلبلاتی ہوئی نظر شاداں کے چہرے پر ڈالی اور اسے اپنا وجود شاداں کے جسم میں گھلتا ملتا محسوس ہوا۔ پھول کی خوشبو کی طرح جو نظر نہیں آتی لیکن فضا میں رس بس کر اپنا وجود بھی نہیں کھوتی۔ شاداں جوان تھی۔ کلی کی طرح نازک تھی اور سورج مکھی کے پھول کی طرح دھوپ اور چمک دمک کی طرف مائل تھی لیکن پھول کی نزاکت اندھیروں میں کب پنپ سکتی ہے۔ اندھیرے.... اور دنیا میں اجالا کہاں ہے؟ اندھیرے..... سیداں کی آنکھیں اداس ہوگئیں اور ان کے کونوں سے اندھیرے کا ایک غبار لپکا اور دھوپ کملا کر رہ گئی!

ڈیوڑھی میں کوئی کھنکارا اور پھر ایک نحیف و نزار جسم نے کھلے آنگن میں ایک منحنی سے سائے کا اضافہ کر دیا۔ سیداں چونک کر بیٹھ گئی۔ سائے میں سرد کپکپاہٹیں تھیں۔ اس کی نگاہیں ایک انجانے خوف سے کانپیں۔

"ماں بیٹی میں کیا ملی بھگت ہو رہی تھی؟" شاداں بھی چونک گئی۔

"کچھ بھی نہیں۔ تو نے ہمیں کوئی بات کرتے ہوئے سنا چودھری؟" سیداں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ چودھری کھلکھلا کر ہنسا "ہا ہا... آ..... آ..... آج بکنے میں بڑا مزا رہا" سیداں نے کوئی توجہ نہ دی۔ "سیداں"! چودھری نے اسے متوجہ کرنے کے لئے ذرا خشونت سے کہا "آج لالی کو بکنے میں بڑی جوتیاں پڑیں" سیداں کسمسا کر رہ گئی۔ اس کے حساس چہرے پر ناگواری کا ایک زخمی جذبہ ابھر کر چھا گیا اور ہونٹ زرد پڑ گئے۔ "ساری پنچایت نے اسے جھوٹا کیا۔ عدالت میں اگلی پیشی پر ساری برادری میرا ساتھ دے گی۔ پھر دیکھنا چودھری کرم دین کی زمانے بھر میں واہ واہ ہوگی۔ شاداں! جا اندر سے ایک کھاٹ تو اٹھا لا"

شاداں بادلِ ناخواستہ اٹھی اور کھاٹ اٹھا لائی۔ دھوپ میں چارپائی بچھ گئی تو چودھری نے اس پر بیٹھتے ہوئے کہا "تھوڑی سی زمین باقی رہ گئی ہے۔ برادری نے ساتھ دیا تو لالی بوریا بستر باندھ کر گاؤں سے چلا جائے گا۔ ہا ہا ہا...... چودھری نے قہقہہ لگایا اور یہ قہقہہ آہستہ آہستہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ گلے میں دم توڑ گیا۔ شاداں نے ایک کھیس تہہ کر کے چارپائی کے سرہانے پر رکھ دیا۔ چودھری نے ڈب سے چمڑے کی ایک تھیلی نکالی اور تھیلی میں سے ایک ڈبیا نکال کر اسے کھولا اور ایک گولی

زبان پر رکھ کر آنکھیں میچ لیں اور آہستہ آہستہ کھیس پر سر رکھ کر دراز ہوگیا۔ پتلے دبلے جھریوں سے میرے چہرے پر مسرت کی ایک ترنگ آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔

سیداں نے اناج اکٹھا کیا اور ایک گٹھڑی میں باندھ کر اندر رکھ دیا۔ شاداں مونڈھے پر بیٹھ کر پھول کاڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ سیداں نے ایک نظر چوہدری کے چہرے پر ڈالی اور دوسری شاداں کے چہرے پر اور اس کے پتلے پتلے زرد ہونٹ کسی خفیہ جذبے کے تحت کانپتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں نمی کا ایک غبار جمع ہو کر کپکپانے لگا۔ سیداں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ لیں۔ چوہدری نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں، پلکیں جھپکائیں اور تیز دھوپ سے بچنے کے لئے پگڑی کا پلو آنکھوں پر کر لیا۔

اب سیداں کی آنکھوں میں نمی کا غبار نہیں تھا۔ ایک تلخ نفرت تھی جو کچلے ہوئے سانپ کی طرح بل کھا رہی تھی۔ اس نے دھیمے سے کہا "شاداں! تیرا باپ اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے۔"

"کیوں ماں؟" شاداں نے حیران ہو کر کہا۔

"آج برادری اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ کل اس کے منہ پر جوتی بھی مار سکتی ہے۔"

"ماں!" شاداں کی حیرت چیخ میں بدل گئی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں شاداں! دنیا ہارے ہوئے کو پاؤں تلے روندتی ہے پر جیتنے والے کا سر بھی چپکے سے کاٹ لیتی ہے۔"

"پر ماں! ماموں لال نے بھی تو کبھی ہار نہ مانی۔"

"ہاں!" سیداں اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

سارا جھگڑا ایک کھیت پر تھا۔ یہ کھیت چوہدری لال کی ایک لاولد ماسی نے اس کے نام ہبہ کر دیا تھا۔ کرم دین بھی اس زمین کا اپنے آپ کو حقدار سمجھتا تھا۔ مدت سے مقدمہ چل رہا تھا۔ چوہدری کرم دین، چوہدری شاہ دین کے پاس مقدمہ لڑنے کے لئے تین کھیت رہن رکھ چکا تھا۔ چوہدری لال کوئی بڑا زمیندار نہ تھا پر تھا بڑا جگر رس۔ جھگڑے والے کھیت کی ساری آمدنی مقدمے کی نذر کر کے بڑے فخر سے کہتا "کنویں کی مٹی کنویں میں ہی لگ جایا کرتی ہے۔ اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟" پھر لال اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عار نہ سمجھتا تھا۔ منہ اندھیرے کام میں جتتا تو شام تک ہل کی ہتھی سے ہاتھ نہ اٹھاتا۔ پھر جب پیشی کی تاریخ آتی تو اجلے کپڑے پہن کر عدالت میں جاتا۔ پنچایت میں بیٹھتا تو اس کی پگڑی کا طرہ ڈھیلا نہ پڑتا۔ برادری کو اس کی یہ پندار ادائیں ایک آنکھ نہ بھاتیں۔ اس لئے چپکے چپکے ایک ایک کر کے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

چوہدری لال میکے کی طرف سے سیداں کا قریبی تھا۔ سیداں کے ماں باپ مر چکے تھے اور سگے بھائیوں میں سے کوئی جوانی نہ پا سکا تھا۔ جب لال اور کرم دین کی آپس میں صلح تھی تو لال سیداں کا بھائی بن کر عید، شبرات کے تہوار پر اس کے گھر کچھ نہ کچھ ضرور بھجواتا۔ یہی ایک دو روپئے شکر اور سویاں اور سیداں کو محسوس ہوتا رہتا کہ اس کے میکے زندہ ہیں اور وہ سسرال والوں کے ہاں بے سہارا نہیں۔ اور اب یہ سہارا بھی چھن رہا تھا اور سیداں کو اس بات کا بے انتہا قلق تھا۔ یہ جذباتی اور روحانی رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ دو خاندانوں میں مخالفت کی خلیج پھیل رہی تھی اور اب شاداں جوان تھی اور لال کا لڑکا سرفراز دسویں کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اس رشتے کا بیج مدت سے سیداں کے دل میں پرورش پا رہا تھا اور اب ننھا سا شگوفہ جڑ سے کٹ رہا تھا۔

سیداں مضطرب ہو کر اندر چلی گئی۔ زیادہ دیر تک دھوپ میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اندر خنکی تھی اور اندھیرا۔ وہ دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی چارپائی پر نڈھال اور نیم جاں ہو کر گر پڑی۔ اندھیرے میں رچی ہوئی خنکی تیکھے اور تیز احساس کا ایک تیر بن کر اس کے دل میں پیوست ہوگئی۔ اس کا جسم سن سے بیدار ہوا اور جاگ کر لرزنے لگا۔ ایک جھرجھری سی آئی اور رواں رواں نوکِ خار کی طرح تن گیا۔ اس تھرتھری، اس چونکی ہوئی لرزش میں جہاں تسکین کے مرہم کی ٹھنڈک تھی وہاں ایک دلدوز کرب بھی تھا جیسے زندگی خارج ہو رہی ہو، حال ماضی کی طرف دوڑ رہا ہو اور مستقبل نے حال کی تلخیوں میں پناہ لے لی ہو۔ ایک عجیب سا احساس جس میں درد کی شدت بھی تھی اور اس درد میں لذت بھی تھی۔ صبح کے پھوٹتے ہوئے نور میں شام کے سائے بھی تھے اور شفق کی سرخیاں بھی رچ رہی تھیں اور ان میں سیداں کا ماضی بھی زندہ ہوگیا تھا۔ اس نے چارپائی کی پٹی پر سر رکھ دیا۔

"سیداں!" یہ آواز اس کے دل میں اتر گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ فضا خالی تھی۔ نہ جانے یہ آواز کون سے کونے سے ابھری تھی۔

لیکن یہ دوا بڑی میٹھی اور پیاری تھی۔ اس نے بھولے ہوئے نغمے کے دوسرے آہنگ کو روح میں رچا لینے کے لئے آنکھیں بند کر لیں ــــ

تیداں؟"

"ہاں ماں!"

"جا بلے کے اس پار اپنے باپ کو روٹی دے آ۔"

سیداں نے لسی کا مٹکا سر پہ رکھا اور رکھدر کے رومال میں لپٹی دو چار بڑی روٹیاں لپیٹ لیں چپڑی ہوئی روٹیوں پر پسی ہوئی لال مرچ اور نمک تھا۔

گاؤں کے باہر دھوپ تھی اور بہار کی اس دھوپ میں شعاعیں بھی تھیں اور تیزی بھی اور پگڈنڈی دھوپ کی ایک بل کھاتی ہوئی لکیر تھی جس کے دونوں طرف جوبن پہ آئے ہوئے کھیت تھے۔ اس کا باپ نالے کے پار والے کھیتوں میں تھا اور نالے کے دونوں طرف شیشم کے بڑے بڑے اور پرانے تناور درخت تھے۔ ان کے گھنے تنوں میں ہریالی تھی اور دھوپ کی تیز چمک اس ہریالی میں جذب ہو گئی تھی۔ نالہ سوکھا ہوا تھا اور نالے کے دونوں کناروں اونچے اونچے تھے۔ نالے کے اندر شیشم کا گھنا سایہ تھا اور اس گھنے سائے میں تاریک خنکیاں تھیں اور آسمان اس سائے میں چھپ گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر تیز دھوپ شبنم کے چند قطرے نثار کر گئی تھی۔ وہ نالے کے عین درمیان گھنے سائے میں کھڑی ہو گئی اور شبنم اڑنے لگی۔ ایک ڈال کے پتے دھیرے دھیرے کپکپانے اور ہوا کا ایک چھوٹی موٹی جھونکا بڑی شوخی سے اس کی پیشانی کو چھو کر پتوں میں گم ہو گیا۔ سیداں اس شوخی پر مسکرا دی اور اس مسکراہٹ کی ایک شوخ کرن سے ایک ہیولیٰ ابھرا۔ اس ہیولے نے اس کی مسکراہٹ میں سے جھانک کر کہا "چنبے کی کلی!"

سیداں بانسری کے نغمے کی طرح تھرتھرائی۔

"چنبے کی کلی!" سیداں نے سوچا "کون چنبے کی کلی؟"

"تو!" ایک نغمے نے تھرتھرا کر کہا۔ اب سیداں چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی "میں!" اور اسے باپ کی بھوک یاد آ گئی۔ اس نے ایک قدم بڑھایا۔ دوسرے نے رک کر کہا "سیداں! دیکھو تو سہی یہ کون ہے جس نے تجھے بانسری کا گیت بن کر پکارا" اور سیداں نے شرمائی شرمائی نظریں اٹھائیں تو مسکراہٹ کے نقرئی غبار میں سے دلاور کا چہرہ چاندنی کی ایک کرن کی طرح ابھرا۔ اس چہرے پہ شوخی تھی اور آنکھیں اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے سیداں کا راستہ کیوں روک لیا تھا؟ "دے! میرے رستے سے ہٹ جا۔ دیکھتا نہیں میں اپنے ابا کو روٹی دینے جا رہی ہوں۔" سیداں نے شوخی سے کہا اور دلاور نے رستہ چھوڑ کر اپنے دل سے کہا "سیداں! تیرا غصہ کتنا پیارا ہے!" اور سیداں نے نجانے کیسے اس کے دل کی سرگوشی کو سن لیا اور اس نے واقعی غصے میں آنا چاہا اور اس کا جی چاہا کہ لال انگارا بن کر کہے "جا بڑا آیا سیداں سے پیار کرنے والا!" اور اس نے دلاور پر آگ برساتی ہوئی ایک نظر کا بھرپور وار کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا "چنبے کی کلی!" اور سیداں پھر چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی اور نظریں جھکا کر ہولے ہولے دوسرے کنارے پر چڑھنے لگی ....

"ماں!" سیداں نے کوئی جواب نہ دیا "ماں!" سیداں نے آنکھیں کھول دیں۔ "تو سو گئی تھی کیا؟" شاداں نے پوچھا۔

"نہیں تو!" سیداں نے ایک نیم وا خواب آلود نظر شاداں پر ڈالی "کیوں شاداں! تو مجھے اس طرح کیوں پکار رہی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں یونہیں گھبرا گئی تھی۔ دیکھو تو سہی گھر میں کتنا سناٹا ہے!"

سیداں کی آنکھوں کے کونے تر ہو گئے۔ اس نے دیوار کی طرف منہ کر کے انگلیوں سے آنسو پونچھ لئے۔ باہر چارپائی چرچرائی چوہدری کرم دین نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں نیند اور بیداری عرصے تک آنکھ مچولی کھیلتی رہیں۔ دیر بعد آنگن کو خالی پا کر چوہدری نے کہا "سیداں" "سیداں"! سیداں نے کوئی جواب نہ دیا تو چوہدری نے چڑ کر کہا "ماں بیٹی نے پھر کوئی کہانی چھیڑ دی؟"

"کون سی کہانی؟" سیداں نے بجھی بجھی آواز میں کہا "ماں اگر بیٹی سے بات نہ کرے تو کس سے کرے؟"

"خالی آنگن سے؟" چوہدری نے اٹھتے ہوئے خمار کی ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ سیداں نے پھر کوئی جواب نہ دیا تو چوہدری نے کہا "اتنے میرے گھر کو خالی دیکھ کر ......"

"کہو چوہدری! بات پوری کرتے کرتے کیوں رہ گئے؟" سیداں نے تھوڑا سا چمک کر کہا۔

چوہدری اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھوں پہ ہاتھ پھیرا مونچھوں کو درست کیا۔ سرہانے رکھی ہوئی پگڑی کا گز سر پہ جما کر

کہا "سیداں! تو نے ایک لڑکی کو جن کر ٹرا تیر مارا۔ لوگوں کے آنگن بھر گئے پر تیری کوکھ تو بنجر زمین کی طرح سوکھ گئی۔"

"چوہدری! تیری اس بات سے اب مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔" سیداں نے خشک آواز میں کہا۔

"دکھ کیوں ہو؟ میں نے سدا تیرا خیال رکھا۔ اب تک دس سوکنیں لا بٹھاتا پر.... " سیداں نے چوہدری کی بات کاٹ کر کہا، "آپ لے آنا۔ تجھے روکتا کون ہے؟" اس سے پہلے سیداں چوہدری کے اس جملے پر چپکے ہوکر رو پڑتی تھی۔ آج اس کی بات میں تیزی اور تندی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ نہیں تھا۔ نچڑا نچڑا سا چہرہ تنا ہوا تھا۔ البتہ آنکھوں میں دئے جل رہے تھے۔ چوہدری نے جوتیاں پہنتے ہوئے کہا "سیداں! آج تو نے پہلی بار آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کی۔" سیداں خاموش رہ کر بدستور راستہ تکتی رہی اور اس کی آنکھوں میں دئے ٹمٹماتے رہے۔ چوہدری نے اٹھ کر دروازے کی راہ لی تو سیداں کی بجائے شاداں رکے ہوئے طوفان کی طرح پھٹ رہی۔ اس نے سسکیاں بھریں تو سیداں نے بڑے پیار سے کہا "تو کیوں رو رہی ہے شاداں؟"

"ماں!" شاداں نے سیداں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ سیداں طوفان میں گھرے ہوئے مضبوط درخت کی طرح پہلے تن کر رہی۔ پھر ایک تیز ریلا آیا اور درخت بے بس ہو کر ہل گیا۔ آنکھوں کے دئے شوں شوں بجھ گئے۔ اس نے شاداں کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "بیٹی! جب تک تیری ماں زندہ ہے تجھے کس بات کا ڈر؟"

"مجھے تیرا خیال ہے ماں۔"

"میری تو بیت گئی تو...." سیداں بات پوری نہ کر سکی۔

"ماں! ایک بات پوچھوں؟" شاداں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"پوچھو!"

"تو نے بابا کے گھر میں کوئی سکھ نہ پایا پر تو نے یہ پہاڑ ایسے دن کیسے بتائے؟"

"بیت گئے شاداں!"

"پر اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔"

"نہیں.... نہیں.... " سیداں نے ماں بنتے ہوئے کہا۔ "کسی کو کیا پتہ شاداں! کیا خبر! دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔"

کہنے کو تو سیداں یہ بات کہہ گئی پر اسے اپنی بات پر خود شک ہوا۔ کیا یہ سچ تھا؟ سیداں آج سے بیس سال پہلے اس گھر میں آئی تھی۔ اس کی یاد اب تک باقی تھی۔ آج اس دن کو یاد کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ اس دن سیداں نے تقدیر کے سامنے یوں سر جھکا دیا تھا جیسے قصائی کی چھری تلے آنے والی بھیڑ ہو۔ پھر وہ دن لمبا ہو کر اس کی ساری زندگی پر چھا گیا تھا۔ آج تک وہ ایک دن نہ بدل سکا تھا۔ وہی ایک دن جو روپ بدل بدل کر آتا رہا۔ وہی ایک دن جو کبھی چمکیلی دھوپ کے جلو میں آتا کبھی بادل اور دھند میں لپٹا ہوا۔ کبھی اندھیرا بن جاتا اور کبھی اجالا۔ سیداں اس ایک دن کو بتا بتا کر زندہ تھی۔ نجانے کیوں؟

آنگن کی دھوپ سمٹ کر مشرق کی دیوار کے ساتھ لگ گئی تھی۔ دھوپ زرد تھی اور دیوار کے ساتھ لپٹ کر کانپ رہی تھی۔ سایہ گہرا ہو رہا تھا اور اس میں ٹھنڈک رچ رہی تھی۔ سیداں کے جسم پر کپکپی کی ایک لہر آئی۔ اس نے کہا "شاداں بیٹی! اٹھ چولھا گرم کر۔ دیکھ تو سہی شام ہو رہی ہے۔" شاداں اٹھ کر چولھے کے پاس جا بیٹھی تو سیداں نے سوچا "یہ دن جو بار بار آتا ہے گزرتا کیوں نہیں؟"

"سیداں! تم ہر ڈوبتے ہوئے دن کے ساتھ، جب شام کے سائے گہرے ہوں گے، اپنے جی سے کہو گی یہ دن گزرتا کیوں نہیں؟"

"نہیں دلاور! دن گزر جائیں گے۔" سیداں نے روتے ہوئے کہا "اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"سیداں! سوچ لے میں تجھے چناب کے اس پار لے جاؤں گا۔ ابھی چناب میں طوفان نہیں پر چناب بپھر گیا تو تجھے کنارہ نہیں مل سکے گا۔"

"نہیں۔" سیداں نے کہا اور دلاور نے اس پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی اور پھر چناب میں طوفان آگیا۔ پہاڑ جیسی لہریں کناروں کو توڑ کر نکل گئیں اور سیداں کو دوسرا کنارہ پھر کبھی نہ مل سکا۔

"اس میں میرا کیا دوش؟" سیداں نے زیر لب کہا۔

"دوش کس کا ہے؟" ایک آواز نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تقدیر کا۔" سیداں نے جواب دیا "سوہنی چناب کی موجوں سے لڑی پر اسے کنارہ نہ مل سکا۔"

"لیکن لوٹنے لٹنے والے بغیر احسان لا سیداں ۔ اب تو ہر روز چناب کی لہروں میں کوئی ڈوب کر ابھرتی ہے اور ابھر ابھر کر ڈوبتی ہے۔" سیداں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے وہ طوفان سے ڈر گئی تھی ، ورنہ بھی طوفان آیا بھی تھا ، اس نے گھپ اندھیری رات میں طوفان کا شور سنا تھا ۔ اس میں سوہنی کی چیخیں تھیں ، ہیر کے بین تھے اور صاحباں کے دل کا درد تھا ۔

"میں نے آج تک شکایت نہ کی ۔ میں ہر غم کو چپکے چپکے سہتی رہی ۔ میرے ہونٹوں پر آہ تک نہ ابھری ۔ میرا پیار میرے دل میں بیج کی طرح پھوٹا ۔ میں نے کونپل کو پروان چڑھایا اور اسے کسی نے نہ دیکھا پھر میں نے اسے اپنے ہاتھوں مسل دیا۔" سیداں کی سرگوشیاں ہونٹوں تک پہنچ گئیں تو شاداں نے حیران ہو کر پوچھا "ماں تو کس سے باتیں کر رہی تھی ؟"

"کسی سے نہیں۔" سیداں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور پھر وہ اچانک چونک کر بولی "شاداں ! دیکھ لٹنے والے بغیر احسان جتنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔"

"ماں !" شاداں کی آنکھوں میں حیرت تھی ۔

"آج پہلی بار میں نے تیرے باپ کی جلی کٹی باتوں کا جواب دیا ۔ میں نے بیس سال اس گھر میں گذار دے ۔ میں نے ایک دن گزار کر یہی سمجھا کہ دوسرا دن میرا ساتھ دے گا مگر وہ دن کبھی نہ آسکا۔"

"ماں ! پھر اس میں کس کا دوش ہے ؟"

"میرا"

"نہیں تقدیر کا۔"

"شاداں !" سیداں کی آواز میں غصے کی چمک تھی "آج رحمتے نائن کہہ رہی تھی تو میری جوانی کی تصویر ہے ۔ دیکھ شاداں ! میں نے تقدیر پر بھروسہ کیا پر اس نے میرا ساتھ نہ دیا ۔ تو بھی اگر میرے راستے پر چلی تو تقدیر تیرا گلا گھونٹ دے گی۔"

سیداں کا غصہ گلوگیر ہو گیا ۔ شاداں کے روپ میں اس نے اپنی بے بس جوانی کو دیکھا تو اس کا غصہ ابلتے پانی کی طرح اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑا ۔ یہ جلتے بلتے آنسو آگ کے انگارے تھے ۔ ان شعلوں نے ساری دنیا کو آگ لگا دی تھی ۔ شاداں نے ماں کو روتے ہوئے دیکھا تو چرخہ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اس نے ماں کے گلے میں بازو ڈال کر کہا "ماں ! تجھے کیا ہو گیا ہے ؟"

"کچھ بھی نہیں شاداں ! جا اپنا کام کر۔"

★

رحمتے نائن نے آنگن میں قدم رکھا تو سیداں نے جھٹ سے کہا "کیوں رحمتے ! آج پھر کوئی نئی بات سوجھی ہے تجھے ؟"

"نہیں تو بی بی !"

"پر تو دیکھتی ہے شاداں جوان ہو چکی ہے۔" سیداں کی مسکراہٹ میں طنز تھی ۔

"ہاں بی بی ..... تو نے کچھ سنا ؟"

"نہیں تو ..... ؟"

"چوہدری لال کو مقدمے میں ہار ہو گئی۔"

"پھر کیا ہوا ؟" سیداں نے مسکرا کر کہا "اس نے مقدمہ لڑا پر اپنے کھیت تو رہن نہ رکھے ۔ ایک کھیت کے لئے تین کھیت رہن رکھ کر جیتنے والے کو کیا ملا ؟"

"پر بی بی ! گاؤں والے چوہدری لال کو ہار دے کر بہت خوش ہیں۔"

"آج ان کی باری ہے ۔ کل چوہدری لال کی باری ہو گی۔"

"بی بی ! شاداں کی بات کا کیا بنے گا ؟"

"کیا بنے گا ؟" سیداں کی لرزتی ہوئی آواز میں اچانک اٹھنے والی لہر کا جوش تھا "جب تک میں زندہ ہوں ۔ شاداں کو کیا خطرہ ہے۔"

رحمتے نائن زمین پر بیٹھ گئی ۔ اس نے ناخن سے زمین کریدتے ہوئے نظریں جھکا کر کہا "لوگ ایک اور بات بھی تو کہہ رہے ہیں !"

"کیا ؟"

"کیسے کہوں بی بی ؟"

"کہو"

"چوہدری اپنا بیاہ رچا رہا ہے اس کلموہی ڈائن سے ..... شاہ دین کی سالی سے ..... !"

"سچ ؟" سیداں نے مسکرا کر پوچھا ۔ رحمتے نائن نے اس مسکراہٹ کو دیکھا ، تو اس کا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا "بی بی ..... بی بی ..... !"

"رحمتے !" سیداں کی آواز میں خوشی کی لرزشیں تھیں "تیرے منہ میں گھی شکر ۔ ذرا ٹھہر تو۔" اور سیداں تیر کی طرح مکان کے اندر گئی ۔ ایک تھال میں گڑ کی بھیلیاں رکھ کر جھپاک سے آنگن میں آگئی "لے رحمتے !

تیرا منہ تو میٹھا کرا دوں۔" رحمتے نائن نے احتجاج کے لئے منہ کھولا تو سیداں نے ہنستے ہنستے ایک بھیلی اس کے منہ سے چھوڑ دی۔ "بی بی! کیا کر رہی ہو یہ بھی کوئی خوشی کی بات ہے؟" اور سیداں کے ہاتھ سے بھیلی خود بخود گر پڑی اس کی ہنسی اس کے گلے میں پھنس گئی تمتمایا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور آنکھوں کی غیر فطری آنچ بجھ گئی رحمتے نائن نے مڑ کر دیکھا تو شاداں کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"شاداں! تو رو رہی ہے۔ تیرے ماموں لال کو مقدمہ ہارنے پر مردانی چھوٹی سی بات کو کیا سمجھتے ہیں؟"

"نہیں ماں یہ بات نہیں"

"تیرا باپ دوسرا بیاہ کر رہا ہے تو کیا ہوا؟ مرد عورت کو سدا پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ جب چاہا بدل لیا۔"

"نہیں ماں یہ بات بھی نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے شاداں؟"

"ماں!" شاداں کے آنسو بولنا چاہتے تھے لیکن بول نہ سکے لیکن شاداں چاہتی تھی کہ سیداں ان آنسوؤں کا لرزتا ہوا پیغام خود پڑھ لے "ماں" شاداں نے مایوس ہو کر کہا "وہ شریف ہے نا!" اور شاداں کا بھیگا ہوا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور گالوں پر ٹپکتے ہوئے آنسو بھی تمتما کر رہ گئے۔

"ہاں؟" سیداں نے تڑپ کر کہا "ہاں کہو"

"مجھے کیوں؟ ماں!..... اس نے کئی بار میرا راستہ روک لیا ..... میں نے منہ سے ایک لفظ نہ کہا..... میں کترا کر نکل جاتی رہی اور ماں! میں لاج کے مارے تجھ سے کچھ نہ کہہ سکی..... پر آج اس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھ دیا..... میں نے ڈر کر کہا تو کیا چاہتا ہے بول۔ میرا ہاتھ چھوڑ دے۔ میں اپنے بابا سے کہوں گی۔ اس نے ہنس کر کہا شاداں! تو تو اپنے گھر کی مچھلی ہے پر میں نے چاہا تھوڑا سا ہیر رانجھے کا کھیل بھی کھیل لوں۔ دیکھو شاداں! پیار کا رس تو میں اس وقت تیرے کانوں میں گھولوں گا جب تو گھونگھٹ کاڑھے سر نہوڑائے اپنے پیتم کی راہ دیکھ رہی ہوگی..... آج..... پر ماں..... جانے سرفراز کہاں سے آ گیا اس نے کہا شریف گاؤں کی لڑکیوں پہ ہاتھ ڈالنا آسان نہیں شریف نے میری کلائی چھوڑ دی اور پھر وہ دونوں لڑ پڑے..... ماں! میں بھاگ آئی..... سرفراز..... "

"سرفراز مرد ہے شاداں! تو فکر نہ کر"

"پر ماں! شریف نے یہ کیوں کہا شاداں! تو تو اپنے گھر کی مچھلی ہے۔" سیداں کا بند بند غصے سے کانپ گیا اور بیرونی ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور چوہدری کرم دین ہاتھ میں حقہ لئے آنگن میں آ گیا۔ اس کا طرہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور منحنی سا جسم فخر اور جیت کے اظہار کے لئے تنا ہوا تھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا "چودھرائن! لال اگر ذرا سا غیرت مند ہو تو گاؤں سے منہ چھپا کر نکل جائے۔"

"چوہدری!" سیداں نے تن کر کہا "لال کو گاؤں سے نکلنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ مرد ہار جیت کی پروا نہیں کرتے پر تو اگر غیرت مند ہو تو گاؤں چھوڑ کر کہیں منہ چھپا لے۔ اب لوگ تیری عزت پر ہاتھ ڈالنے لگ گئے ہیں۔"

"سیداں!" کرم دین [illegible] میری عزت سے کھیلنا آسان نہیں۔ وہ کون ہے جس نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالا؟" "شاداں [illegible] شریف نے [illegible] شاداں کی کلائی پکڑی۔ اس نے کہا شاداں! تو تو اپنے گھر کی مچھلی [illegible] کرم دین نے کوئی جواب نہ دیا [illegible] پانی پانی ہو کر [illegible] گر پڑا۔ اس کا [illegible] خود بخود سرنگوں ہو گیا۔

"کیا کہا! شاداں [illegible] کے لڑکے شریف نے [illegible] اتنی بڑی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تو نے [illegible] ہو گا [illegible] پاس [illegible] ہیں۔"

کرم دین نے چارپائی پر لیٹ کر مری ہوئی آواز میں کہا [illegible] نے [illegible] رہی ہے۔ سیداں! اپنی عزت [illegible] نہیں رکھی تھی۔ شاداں! ایک [illegible] شاداں کہیں سے آ گئی تو کرم دین [illegible] لئے [illegible] اور اس ایک نظر میں حسرت کی تلخیاں [illegible] ہوئی تھیں۔

"سیداں! کاش تو ایک بیٹا بھی جنا ہوتی آج میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کون کرتا؟"

"چوہدری!" سیداں نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا اور چوہدری نے حقے کی نے پر منہ رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

★

"سیداں بی بی!" رحمتے نائن نے کہا۔

"کہو آج کون سی نئی خبر لے کر آئی ہو؟" سیداں نے تلخی سے پوچھا۔

(باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

ڈرامہ،

"ستاروں کی چال"

انور عنایت اللہ

افراد

افضل :۔ ایک نوجوان۔ عمر تقریباً تیس سال۔
سیمیں :۔ افضل کی جوان بہن جو اس سے تقریباً تیرہ سال چھوٹی ہے
ظہیر :۔ ایک دولتمند نوجوان۔ عمر تقریباً چھتیس سال
صفیہ :۔ افضل کی منگیتر۔ عمر تقریباً پچیس سال۔

[افضل کے کمرہ سے پردہ اٹھتا ہے۔ اس فلیٹ میں صرف ایک کمرہ خاصا کشادہ ہے دائیں طرف لکڑی کی اسکرین لگا کر اس کے دو حصے کئے گئے ہیں جو حصہ نظروں سے اوجھل ہے وہ دونوں بھائی بہن کی خوابگاہ کا کام دیتا ہے۔ بقیہ حصہ کو ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بائیں طرف، ونگ میں اس فلیٹ کا صدر دروازہ ہے جو اندر سے بند ہے۔ اس سے ذرا پرے ایک کھڑکی جس پر ریشمی پردے پڑے ہیں۔ دروازوں پر بھی پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے بیچوں بیچ ایک اور دروازہ ہے جس کی دوسری طرف غالباً باورچی خانہ اور غسل خانہ ہے۔ کمرہ خاصے معقول فرنیچر سے سجایا گیا ہے۔ ایک طرف، فٹ لائٹ کے قریب تپائی پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ سینٹر ٹیبل پر رسالے پڑے ہیں۔ ایک رسالہ صوفے پر کھلا پڑا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ریڈیو بھی کھلا ہوا ہے، دھیمی سی آواز ہے۔ پردہ اٹھنے پر اسٹیج خالی ہے۔ شام کا وقت یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور کچھ دیر تک بجتی رہتی ہے۔ کوئی نہیں آتا۔ پھر خوابگاہ میں سے سیمیں تیزی سے اسٹیج پر آتی ہے حسین ناک نقشہ۔ صحت مند جسم۔ اس وقت صرف شلوار اور قمیص میں ہے۔ غالباً وہ اندر کپڑے بدل رہی تھی۔ دوپٹہ جلدی میں بھول آئی ہے۔ سر کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ میں کنگھی وہ ریسیور اٹھاتی ہے]

سیمیں : ہیلو! مسٹر افضل ریسیڈنس ہیئر۔ جی کون؟ ان کے اسٹینو؟ کتنی دیر لگے گی صاحب کو؟ ۔ اچھا، کیا نام بتایا آپ نے؟ مہربانی کر کے ذرا آہستہ فرمایئے ۔ بشیر صاحب؟ ۔ جی؟ ۔ ظہیر صاحب؟ اچھا، دیکھئے صاحب کانفرنس سے فارغ ہوں تو ان سے کہئے گا میں باہر جا رہی ہوں، لیکن گھر پر ملازم رہے گا ۔ جی شکریہ۔

(ریسیور رکھ دیتی ہے اور پھر کچھ سوچ کر ایک نمبر ملاتی ہے اس وقت گنگنا رہی ہے)

سیمیں : ہیلو! دیکھئے مجھے شاہد صاحب سے بات کرنی ہے ۔ جی؟ ۔ کہیئے گا میں شمسی ۔ بہتر (وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر گنگنانے لگتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد) ہیلو! کون شاہد! ۔ سیمیں ہیئر ۔ ارے بھئی بالکل تیار ہوں۔ ابھی تو صرف (دستی گھڑی دیکھ کر) چھ بجے ہیں شو تو ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا ہے۔ ہاں ہاں، پہنچ جاؤں گی یہ فون کس نے ریسیو کیا تھا؟ ۔ لینڈ لیڈی صاحبہ؟ عجیب شئے ہیں یہ بھی! جب بھی فون کرتی ہوں نام ضرور پوچھتی ہیں دراصل میں نے فون اس لئے کیا تھا کہ تمہیں اخباروں کے بارے میں یاد دلاؤں۔ بھولنا نہیں، کل میرا اسکول بند ہے دن بھر مکان ڈھونڈوں گی خدا حافظ! (ریسیور رکھ دیتی ہے۔ مڑ کر ریڈیو بند کر دیتی ہے اور تیزی سے خوابگاہ میں چلی جاتی ہے۔ جاتے ہوئے کنگھی کئے جاتی ہے۔ اسٹیج ایک بار پھر خالی ہے۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے۔

(سیمیں اندر ہی سے جواب دیتی ہے)

سیمیں : (چیخ کر) کون؟ – زمان خان؟ – دروازہ کھلا ہے، حد ہو گئی بھئی! اب آرہے ہو!

(دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے اور صفیہ داخل ہوتی ہے۔ وہ دبلی پتلی نازک سی لڑکی ہے۔ یوں تو وہ عمر میں سیمیں سے بڑی ہے لیکن ایسی معلوم نہیں ہوتی۔ شکل صورت بھی سیمیں سے بہت اچھی ہے۔ اس وقت ہلکے گلابی رنگ کی سادہ ساڑی میں ملبوس۔ سر کے گھونگریالے بال شانوں تک کٹے ہوئے چہرہ پر ہلکا سا میک اپ)

صفیہ : (اندر آکر) کہاں کی تیاری ہے سیمیں؟ (پرس تپائی پر رکھکر صوفہ پر بیٹھ جاتی ہے اور ایک باتصویر رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے)

سیمیں : (اندر سے) اوہ! صفیہ باجی! معاف کیجئے، میں نے زمان ہوگا۔ کمبخت دوپہر تک کی چھٹی لے کر گیا تھا – آپ بیٹھئے۔ بس میں ابھی آئی۔

صفیہ : کہاں کی تیاری ہے! پکچر

سیمیں : جی ہاں، لاہور سے ایک سہیلی آئی ہوئی ہے

صفیہ : سہیلی؟

سیمیں : (فوراً، جی ہاں (خوابگاہ سے باہر آجاتی ہے اور باہر جانے کے لئے تیار ہے۔) آداب صفیہ باجی!

صفیہ : (بزرگانہ انداز میں) جیتی رہو بیٹیا! (مسکرا کر) کونسی فلم ہے؟ میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟

سیمیں : (گھبرا کر) آپ؟ ہاں ہاں کیوں نہیں – لیکن – آج پہلا دن ہے۔ ہم نے کئی دن پہلے بکنگ کرا رکھی تھی (بیٹھ جاتی ہے)

صفیہ : (مسکرا کر) گھبراؤ نہیں سیمیں بیگم! ہم نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا۔ ویسے ہم آپ کے ان "سہیلی صاحب" سے خوب واقف ہیں! –

سیمیں : جی! اوہ صفیہ باجی، آپ بھی –!

صفیہ :- (فوراً) ارے بھئی، گھبراؤ نہیں۔ ہم تو تمہارا ساتھ دینگے ہی (سنجیدگی سے) لیکن سیمیں! تمہارے بھائی جان اس انتخاب سے متفق نہیں ہیں۔

سیمیں : کیوں باجی؟ کیا خرابی ہے شاہد میں؟ بھائی جان نے اپنے لئے لڑکی خود ہی چنی۔ اب یہی حق وہ مجھ سے کیوں چھیننا چاہتے ہیں؟

صفیہ : صرف اس لئے کہ ان کا خیال ہے تم ابھی ناتجربہ کار ہو اور یہ دنیا بے حد مکار ہے سیمیں۔

سیمیں : جی ہاں، جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں! بھائی جان اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں مجھے یقین تھا وہ مجھے بھی اپنی پسند سے شادی کی اجازت دے دینگے۔ لیکن اب لگتا ایسا ہے جیسے مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

صفیہ : (خشک لہجے میں) اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں! (یوں کہتی ہے جیسے اس نے سیمیں کی بقیہ باتیں سنی ہی نہیں) وہ تو چار سال سے اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں!

سیمیں : چار سال؟ منگنی کو چار سال ہو گئے؟! (جیسے یہ کہنا چاہتی ہو کہ وقت کتنی تیزی سے گذر جاتا ہے)

صفیہ :- (آہستہ سے) ہاں، چار سال! (مختصر سا وقفہ۔ دونوں خیالوں میں کھو جاتی ہیں)

سیمیں :- (آہستہ سے) میں جانتی ہوں آپ لوگوں کی شادی اب تک کیوں ملتوی ہوتی رہی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں۔ یہ چار سال آپ دونوں کے لئے کس قدر پہاڑ سے گذرے ہوں گے۔ اس کمبخت شہر میں دنیا کی ہر نعمت مل جاتی ہے۔ مگر نہیں ملتا تو گھر ہی نہیں ملتا۔ بھائی جان کو پچھلے مہینے اپنے گزیٹیڈ ہونے کی اتنی خوشی صرف اسی لئے ہوئی تھی کہ انہیں یقین تھا اب انہیں سرکاری گھر ضرور مل جائے گا۔ پھر بھی سنا ہے انہیں کئی مہینے انتظار کرنا ہوگا۔

صفیہ :- (خاصی بیزاری سے) کئی مہینے۔

سیمیں :- مجھے سخت شرمندگی ہے صفیہ باجی! میری وجہ سے آپ لوگوں کی شادی کھٹائی میں پڑ گئی ہے لیکن دیکھئے۔ شاید جلد ہی کوئی صورت نکل آئے۔

صفیہ :- (اکتا کر) کیا صورت نکل آئے گی؟ میں نے سنا ہے شاہد بھی اب تک بے گھر ہی ہیں۔

سیمیں :- جی ہاں، لیکن ہم دونوں نے چھوٹے موٹے فلیٹ کی

کوشش شروع کر دی ہے۔ آجکل بہت سے گھر خالی ہو رہے ہیں۔ (یکایک گھڑی دیکھ کر) اف او! چھ بج گئے۔ (جلدی سے اٹھ کر) معاف کیجئے۔ شاہد انتظار کر رہے ہوں گے۔ آپ کچھ دیر انتظار کر لیجئے گا۔ بھائی میاں آ ہی رہے ہوں گے۔ ان کے کوئی دوست بھی آ رہے ہیں۔ کوئی ظہیر صاحب! اچھا خدا حافظ۔ صفیہ باجی! (تیزی سے پرس لے کر چلی جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد صفیہ ٹھنڈی سانس لیتی ہے۔ اٹھ کر ریڈیو تک جاتی ہے اور ایک اسٹیشن ٹیون اِن کرتی ہے۔ یکایک صدر دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ گھنٹی دوبارہ بجتی ہے۔ وہ جا کر دروازہ کھولتی ہے۔ افضل داخل ہوتا ہے — سانولا رنگ، قبول صورت۔ سر کے بالوں سے پتہ چلتا ہے جیسے بہت جلد گنجا ہو جائے گا۔ سوٹ پہنے ہوئے ایک ہاتھ میں چرمی بیگ۔ دوسرے میں کئی تھیلیاں، چہرہ سے تھکا ہوا لگ رہا ہے)

افضل :۔ (صفیہ کو خلاف توقع دیکھ کر خوشی سے) اوہ! صفو؟ تم؟ کب آئیں؟

صفیہ :۔ ابھی ابھی آئی ہوں۔ (دروازہ بند کر کے مڑتی ہے۔ افضل کے ہاتھ سے اس کا بیگ لے لیتی ہے۔ وہ تھیلیاں ایک طرف میز پر رکھ دیتا ہے۔ دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

افضل :۔ سیمیں چلی گئی؟

صفیہ :۔ ابھی ابھی گئی ہے۔ تمہیں آج بہت دیر ہو گئی۔

افضل :۔ ہاں، آجکل کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ روز چھ بج جاتے ہیں۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میرا ارادہ آج رات کھانے کے بعد تمہارے یہاں جانے کا تھا۔

صفیہ :۔ چائے لے آؤں؟

افضل :۔ ہاں، سر میں سخت درد ہے۔ (پیشانی کو دائیں ہاتھ سے دباتا ہے) زمان کہاں ہے؟

صفیہ :۔ چھٹی لے کر گیا تھا، اب تک نہیں آیا۔ میرے خیال میں تم نہا لو تو تھکن دور ہو جائے گی میں اتنی دیر میں چائے بنا لوں گی (رک کر) سنا ہے کوئی ظہیر صاحب آنے والے ہیں؟

افضل :۔ ہاں چائے ان ہی کے ساتھ پی لیں گے۔ (گھڑی دیکھ کر) چھ بجے آنے کو کہا تھا۔ چھ بج بھی ہو گئے۔

صفیہ :۔ کون ہیں یہ؟ میں نے تو کبھی تم سے ان کا نام نہیں سنا

افضل :۔ خاصا کام کا لڑکا ہے۔ ظہیر قادری نام ہے۔

صفیہ :۔ ظہیر قادری؟ وہی تو نہیں جن کی نئی کوٹھی پر رقص و سرود کی محفل جمی تھی، اور اس میں کئی فلم اسٹاروں نے حصہ لیا تھا؟ یاد نہیں تمہیں؟ پبلک نے گانا سننے کے لئے دھاوا بول دیا تھا؟ پولیس کو آنا پڑا تھا۔ اردو اخباروں میں تو بڑی تفصیلی خبریں آئی تھیں۔

افضل :۔ اچھا؟ اپنی مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ اخبار پڑھے مہینے ہو گئے۔

صفیہ :۔ تم کب سے جانتے ہو انہیں؟ سنا ہے لکھپتی ہے۔

افضل :۔ ہاں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کے والد امپورٹ لائسنسوں کے لئے ہمارے دفتر کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ لکھپتی بن گئے۔ باپ مرے تو اکلوتے بیٹے کو کئی لاکھ کی جائداد مل گئی شہر میں چار تو نہایت عمدہ کوٹھیاں ہیں ان کی۔

صفیہ :۔ چار کوٹھیاں؟ تب تو برخوردار کے عیش ہوں گے۔

افضل :۔ مزے کرتا ہے (آہستہ سے) دراصل آج میں نے ایک خاص مقصد کے لئے بلایا ہے۔

صفیہ :۔ خاص مقصد کے لئے؟

افضل :۔ ہاں۔ (رازدارانہ لہجے میں) میں سیمیں کو اس سے ملانا چاہتا ہوں۔ بڑا اسمارٹ لڑکا ہے صفو۔

صفیہ :۔ (یکایک سب کچھ سمجھ کر) اوہ! تو یہ بات ہے، لیکن افضل سیمیں کو شاہد سے محبت ہے۔

افضل :۔ جانتا ہوں، اسی لئے تو سخت پریشان ہوں۔

صفیہ :۔ تمہیں شاہد سے کیا شکایت ہے؟

افضل :۔ سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس کے پاس رہنے کو علیحدہ گھر نہیں ہے۔ (اُسے سمجھاتے ہوئے) اوہ صفو! یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ سیمیں کی شادی شاہد سے اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کے

پاس علیحدہ گھر نہ ہو وہ ایک جگہ پیئنگ گیسٹ کے طور پر رہتا ہے جہاں سب کنوارے رہتے ہیں۔ وہاں سیمیں کیسے رہ سکے گی؟ میں چاہتا ہوں اب اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ آخر ہم دونوں کب تک صرف منگیتر ہی رہیں گے؟

صفیہ :۔ تو جناب نے اسی لئے آج ایسے نوجوان کو چائے پر بلایا ہے جو حسین ہے، دولتمند ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی ایک نہیں بلکہ چار نہایت عمدہ کوٹھیاں ہیں؟

فضل :۔ (خوش ہو کر) شاباش! اب دعا کرو میری اسکیم کامیاب ہو جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی سے اکتا گیا ہوں منگنی کو چار سال ہو رہے ہیں اور شادی صرف اس لئے نہیں ہو سکتی کہ اس کمبخت ایک کمرہ کے فلیٹ میں جوان کنواری بہن بھی رہتی ہے۔ (دفعتاً ایک فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ اٹھ کر ریسیور اٹھاتا ہے)

فضل :۔ ہیلو! افضل ہیر۔ کون؟ ظہیر صاحب؟ — ہاں بھئی — بس آ جاؤ۔ کتنی دیر لگے گی؟ — بیس پچیس منٹ؟ بہت بہتر، ہاں۔ چوتھی منزل پر ہے۔ باہر میرے نام کی تختی لگی ہے۔ خدا حافظ! (ریسیور رکھ دیتا ہے) بس وہ آ ہی رہا ہے۔ (جھنجھلا کر) یہ سیمیں کہاں چلی گئی؟ اس کا تو اب گھر میں جی ہی نہیں لگتا۔ ظہیر بے حد مصروف آدمی ہے بڑی مشکل سے تو اس نے وقت نکالا ہے۔ نہ جانے پھر آئے یا دآئے۔ مجھے تو اس لڑکی نے بہت ستا رکھا ہے۔

صفیہ ہو سکتا ہے سہیلی نے روک لیا ہو تم فکر نہ کرو۔ میں اس کے سامنے سیمیں کی ایسی تعریفیں کروں گی کہ وہ بغیر دیکھے ہی ریجھ جائے گا مطمئن رہو۔

فضل :۔ ارے! میں نے تو جیتے بھرے تعریفیں کر کے اس کا اشتیاق بڑھا رکھا ہے۔ اسی لئے تو سخت کوفت ہو رہی ہے۔

صفیہ :۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ جاؤ نہا لو۔ ہو سکتا ہے سیمیں لوٹ آئے۔ اور نہ بھی آئی تو میں معاملہ سنبھال لونگی۔ تم نہانے میں خاصا وقت لیتے ہو کہیں وہ آ نہ جائے۔

فضل :۔ اب تو نیا خدا کے حوالے ہے (ٹھنڈی سانس لے کر) میں چائے کے لئے کچھ چیزیں لیتا آیا ہوں۔ (یہ کہہ کر وہ خوابگاہ میں چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد کچھ سوچ کر صفیہ اٹھتی ہے۔ غور سے خوابگاہ کی طرف دیکھتی ہے جیسے یہ یقین کر لینا چاہتی ہو کہ افضل اندر ہی ہے پھر چپکے سے ریسیور اٹھاتی ہے اور ایک نمبر ڈائل کرتی ہے۔ نظریں خوابگاہ ہی کی طرف ہیں)

صفیہ :۔ (آہستہ سے) ہیلو؟ کون نادر؟ صفیہ ہیر۔ سنو بھئی، آج رات کا پروگرام منسوخ۔ ہاں ہاں، ہے کچھ ایسی ہی بات تم چاہو تو کل کی بکنگ کرا لینا بھئی، نرے احمق ہی رہے۔ اس وقت نہیں بتا سکتی۔ کل کالج سے فون کر لوں گی۔ خدا حافظ۔ (یکایک افضل خوابگاہ سے باہر آتا ہے۔ اس وقت وہ بیدنگ گاؤن میں ہے نہانے جا رہا ہے)

افضل :۔ (دور ہی سے) کسے فون کر رہی تھیں؟

صفیہ :۔ (گھبرا کر) فون؟ (ریسیور اب تک ہاتھ میں ہے) ہاں، ایک سہیلی نے آج رات کھانے پر بلایا تھا۔ اسے بتا رہی تھی کہ آج وہاں نہ پہنچ سکوں گی۔ پتہ نہیں یہاں کتنی دیر ہو جائے

افضل :۔ (خوش ہو کر آگے بڑھتا ہے) تم نے بہت اچھا کیا صفو! ظہیر کے جانے کے بعد ہم چل کر کہیں باہر کھانا کھائیں گے پھر وقت ملا تو پکچر دیکھیں گے۔ خدا کی قسم! زندگی اس قدر مارئیڈ ہو گئی ہے کہ تم سے ہنسے بولے مہینوں ہو گئے۔ (صفیہ کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے اس پروگرام سے اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ افضل کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ صفیہ کے قریب جا کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام لیتا ہے اور غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا ہے)

افضل :۔ (آہستہ سے) بات کیا ہے صفو؟ آج کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہو! (وہ خاموش رہتی ہے اور نظریں نیچی کر لیتی ہے) کیا مجھ سے خفا ہو؟ یہ صحیح ہے کہ پچھلے دنوں میں نے تمہیں نظر انداز کیا لیکن صفو! کیا تمہیں یقین نہیں کہ میں تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں؟ میرا بس چلتا تو خدا کی قسم! آج سے چار سال پہلے تم سے منگنی کی بجائے شادی کر لیتا

صفیہ : (فوراً) لیکن کیا کروں۔ رہنے کو مناسب مکان

تے نا۔

فضل :۔ (حیرت سے) صفو؟

صفیہ :۔ ہاں فضل! اگر تم واقعی مجھے دیوانہ وار چاہتے تو جناب فضل حسین شمسی! آج میں تمہاری بیوی ہوتی، مگر ایک منگیتر نہیں۔ خیر چھوڑو ان فضول سی باتوں کو۔ جاؤ نہالو۔ اب ظہیر صاحب آہی رہے ہوں گے۔

فضل :۔ (ہچکچا کر) مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم نے مجھے غلط سمجھا (بےچینی سے) کمبخت ظہیر کو بھی آج ہی آنا ہے۔

صفیہ :۔ ظہیر کو گالیاں نہ دو۔ اب تو وہی تمہاری مشکل آسان کر سکتا ہے۔

فضل :۔ تمہیں آج میرے ساتھ باہر چلنا ہوگا صفو! تم سے تفصیلی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

صفیہ :۔ اچھا بابا، چلیں گے۔ تم جا کر نہا تو لو۔ خاصا وقت لگاتے ہو۔ اب وہ آہی رہا ہوگا۔

(فضل کو زبردستی بھیج دیتی ہے۔ اس کے بعد ریڈیو آن کرتی ہے، ٹھنڈی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور اس کی پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ پس منظر میں دھیمی اداس موسیقی۔ یکایک گھنٹی بجتی ہے۔ وہ چونک کر آنکھ کھولتی ہے اور غور سے سنتی ہے۔ باہر کوئی ہے۔ وہ اٹھ کر دروازہ کھولتی ہے)

صفیہ :۔ تشریف لائیے (ظہیر داخل ہوتا ہے۔ خاصا خوش شکل نوجوان ہے۔ گورا رنگ، بھولا چہرہ، قیمتی نفیس سوٹ پہنے ہوئے آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک)

ظہیر :۔ (اندر آکر) معاف کیجئے۔ افضل صاحب ہیں؟ مجھے ظہیر کہتے ہیں۔

صفیہ :۔ جی ہاں، آپ تشریف رکھئے (غور سے اس کا جائزہ لیتی ہے۔ ظہیر شکریہ کہہ کر آگے بڑھتا ہے اور صوفے پر بیٹھنے کے بعد کوٹ کے بٹن کھول لیتا ہے) وہ ابھی ابھی دفتر سے آئے ہیں۔ منہ ہاتھ دھو رہے ہیں۔ سگریٹ لیجئے۔ (تپائی پر سے سگریٹ کیس اٹھا کر اس کے حوالے کرتی ہے۔ وہ شکریہ کہہ کر لیتا ہے اور جیب سے لائٹر نکال کر سلگاتا ہے)

یہ بتائیے، آپ چائے پئیں گے یا کافی؟

ظہیر :۔ جی تکلف کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں۔۔۔

صفیہ :۔ (فوراً) جی نہیں، تکلف کاہے کا۔ چائے کا وقت ہے۔ تو کافی ٹھیک رہے گی نا؟

ظہیر :۔ جی ہاں۔

صفیہ :۔ (اٹھ کر) معاف کیجئے، میں ابھی آئی۔ (چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد افضل غور سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر ایک رسالہ اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دیتا ہے۔ اس دوران میں ریڈیو پر کوئی تقریر شروع ہو جاتی ہے۔ صفیہ چند لمحوں کے بعد لوٹ آتی ہے اور آتے ہوئے ریڈیو بند کر دیتی ہے۔ وہ قریب ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)

صفیہ :۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے افضل آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔

ظہیر :۔ اچھا؟ نوازش ان کی۔ میں نے بھی ان کی زبانی آپ کی اتنی بہت سی تعریف سنی ہے کہ (ہچکچاتے ہوئے) یعنی مجھے ملاقات کا خاصا اشتیاق تھا۔

صفیہ :۔ (دلچسپی سے) اچھا؟

ظہیر :۔ (فوراً) جی ہاں۔ میرا خیال ہے وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں۔ (یکایک صفیہ کچھ سوچتی ہے اور غور سے اسے دیکھنے لگتی ہے)

ظہیر :۔ (اسے خاموش دیکھ کر) معاف کیجئے، آپ نے میری صاف گوئی پر برا تو نہیں مانا۔

صفیہ :۔ جی نہیں، میں خود بے حد صاف گو ہوں۔ سوچ رہی تھی آپ کو کہاں دیکھا ہے۔

ظہیر :۔ جی، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ غالباً کسی جلسے وسلے میں وغیرہ

صفیہ :۔ جی نہیں، میرے کالج کے اوقات بڑے نامعقول ہیں۔ اسی لئے میں برسوں سے کسی جلسے میں نہیں گئی

ظہیر :۔ کچھ عجیب بات ہے سیمیں صاحبہ! مجھے یقین ہے۔۔۔ یعنی۔۔۔ ہم ضرور مل چکے ہیں!

(صفیہ سیمیں کے نام پر چونکتی ہے۔ اب سمجھ میں آجاتا ہے کہ

ظہیر اسے سمیں سمجھے ہوئے ہے)

ظہیر :- ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کالج میں رہے ہوں۔ آپ کس کالج میں تھیں؟

صفیہ :- (فوراً) معاف کیجیے ظہیر صاحب! میں سمیں نہیں، صفیہ ہوں، صفیہ کلیم افضل میرے منگیتر ہیں (ظہیر کے چہرہ پر بالکل ہونقوں کا سا رنگ ہے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہا ہے)

ظہیر :- (حیرت سے) یعنی آپ؟ حیرت ہے! (ہنس کر) بھئی کمال ہو گیا۔ معاف کیجیے۔ افضل صاحب نے اپنی بہن کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اور سمیں کی جو تصویر میں نے ذہن میں بنائی تھی، وہ آپ پر بالکل پوری اترتی ہے یعنی اعلیٰ تعلیم یافتہ حسین۔ معاف کیجیے (رک کر) کیا نام بتایا آپ نے؟ صفیہ کلیم؟ (کچھ سوچ کر) پاکستان کے قیام سے پہلے آپ کہاں تھیں؟

صفیہ :- ناگپور میں۔ بچپن وہیں گذرا۔ کیا آپ کا تعلق بھی سی پی سے ہے؟ (یوں کہتی ہے جیسے اسے بھی کچھ یاد آ رہا ہے

ظہیر :- جی ہاں، بالکل۔

صفیہ :- اوہ! (رک کر) آپ کے والد صاحب کا نام منشی — یعنی — معاف کیجیے مسٹر قدیر خاں تو نہیں تھا؟

ظہیر :- (فوراً) جی ہاں، غلامی لائنز میں رہتے تھے ہم۔ ہمارے پڑوس میں ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے۔ ہومیوپیتھک — کلیم الدین صاحب نام تھا ان کا۔ عجیب اتفاق ہے (خوشی سے) ان کی ایک لڑکی تھی، منی سی صفن نام یعنی معاف کیجیے۔ صفیہ بانو!

صفیہ :- (خوشی سے فوراً) جی ہاں جی ہاں۔ بالکل ٹھیک یاد آیا آپ کو۔ صفیہ میں ہی ہوں! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظہرو آپ ہیں۔ منشی۔ معاف کیجیے۔ چچا قدیر کے اکلوتے صاحبزادے! (خوشی سے اٹھ کر اس کے قریب اسی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) دنیا واقعی کتنی مختصر ہو گئی ہے ظہیر صاحب۔

ظہیر :- یہ لیجیے۔ ظہیر صاحب۔ یعنی ہم تو ظہرو ہوا کرتے تھے صفیہ صاحبہ۔

صفیہ :- صفیہ صاحبہ؟؟؟ (دونوں ایک ساتھ ہنستے ہیں)

ظہیر :- اچھا بھئی، صفن ہی سہی۔ تمہیں وہ مہاراج باغ کی شامیں یاد ہیں جب ہم بندروں کا منہ چڑایا کرتے تھے؟

صفیہ :- جی ہاں، کیسے بھول سکتی ہوں! یہ دیکھو (بلاؤز کی آستین ہٹا کر ایک زخم کا نشان دکھاتی ہے) — یہ دیکھو، ایک بندر نے نوچ لیا تھا۔

ظہیر :- میں نے پتھر برسائے تھے۔ اور پھر چوکیدار نے پکڑ کر میری ٹھکائی بھی کی تھی۔ (ہنس کر) آج خوب ملاقات ہوئی میں نے تو یہاں آ کر اپنے تمام بچپن کے دوستوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ تمہیں بھی برسوں ڈھونڈتا رہا۔ چچا کیسے ہیں؟ اور وہ تمہاری چھوٹی بہن — کیا نام تھا اس کا؟ — رضیہ؟

صفیہ :- ابا کا تو ۱۹۴۸ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ امی میرے ساتھ رہتی ہیں۔ رضیہ اس سال بی اے کا امتحان دے گی۔ چچا قدیر — (یکایک رک کر) مجھے ابھی ابھی افضل نے بتایا کہ چچا قدیر کا انتقال ہو گیا۔

ظہیر :- ہاں صفن! اب چار سال سے سارا کاروبار میں نے سنبھال رکھا ہے۔ (اشتیاق سے) چچی کیسی ہیں؟ خیریت سے تو ہیں نا؟ اماں کے مرنے کے بعد کتنا خیال رکھتی تھیں وہ میرا! کہاں رہتی ہو تم؟

صفیہ :- پاکستان چوک میں ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ رضیہ، رفیعہ اور حفیہ بھی اب بڑی ہو گئی ہیں۔ حفیہ کو تو تم نے بھلایا نہ ہو گا اسے وہی منی سی گڑیا جسے تم پیٹھ پر لادے لادے پھرتے تھے!

ظہیر :- (پیار سے) میں نے اپنے عزیز دوستوں کو کبھی نہیں بھلایا منی!

صفیہ : (چونک کر) منی — ؟ (ظہیر پیار سے اسے دیکھ رہا ہے)

ظہیر :- (آہستہ سے) ہاں، تم مجھے چنے پکارا کرتی تھیں منی۔ بھول گئیں؟ دادی اکثر کہا کرتیں: یہ چنے منی کی جوڑی کتنی اچھی ہے! (کچھ سوچ کر) چلو منی، دادی سے مل آئیں۔

صفیہ :- دادی؟ وہ بھی یہیں ہیں؟

(باقی صفحہ پر)

لوک کہانی

"آئینہ بی بی"

یونس احمر

مشرقی پاکستان کی سوندھی سوندھی مٹیوں اور قوس قزحی
ںاؤں میں ان گنت لوک گیت اور لوک کہانیاں روپوش ہیں
ن کہانیوں اور گیتوں میں بنگال کے صحیح رنگ روپ ملتے ہیں۔
ن میں ملاحوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں، چرواہوں کے دلرس
ے ہیں۔ ان کے اندر ان کنواری ناریوں کے جذبات کی دبی ہوئی
پنگاریاں ہیں جو پنگھٹ کنارے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہیں
رہ ماشی گیت، اساڑھ میں ندیوں نالوں کا شور، جاڑے کی ماتمی شامیں
ھادوں کی چاندنی راتیں، بسنت میں رنگ برنگ کے پھولوں
پر بھونروں کی وارفتگی —— ان موسموں کی مختلف کیفیتوں کا اندازہ
لگانا ہو تو ان منظوم لوک کہانیوں کو پڑھئے جن کے خالق کاشتکار
و ملاح ہیں۔ گاؤں دیہات کے ان ان پڑھ شاعروں نے
زندگی کے ہر پہلو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں لفظوں
کے جال نہیں بنتے ان کی زبان سیدھی سادی مگر پُراثر ہے وہ
رمزیت اور اشاریت سے گریز کرتے ہیں۔

"آئینہ بی بی" بھی مشرقی پاکستان کی نہایت پُراثر لوک
کہانی ہے۔ اس میں عشق و محبت کی دل سوزی و دل گرفتگی ہے
گاؤں کی گوری کا حسنِ ضیا پاش عشق کی چشم نیم باز کو خیرہ کر
رہا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن گیتوں کی پھوار بن رہی ہے۔ سہمی
سہمی ہوئی عطر بیز سانسیں کھیتوں میں دھان کے خوشوں کو بہلا
رہی ہیں۔ گاؤں کے نوجوان کاشت کار محمود نے آئینہ بی بی کے
چندن جیسے روپ کو دیکھا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

دیس میں اپنے سندر سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے روپ کے آگے سب ہے لیکن دھول

محمود کا جذبۂ عشق آئینہ بی بی کے حسن معصوم کو تپا گیا۔ وہ ندی کنارے
دم بخود نگاہیں نیچی کئے کھڑی رہی اس کا چہرہ شرم کے مارے
شفق زار بن گیا۔ وہ نوجوان کے سامنے سے بھاگ جانا چاہتی تھی
لیکن قدم سو سو من کے ہو گئے۔

محمود بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ اس کی ماں نے دکھ
جھیل کر اسے پالا پوسا اور بڑا کیا۔ سولہ سال کی عمر ہوئی تو اس نے
ہل بیل سنبھال لئے۔ کاشت کاری شروع کر دی۔ شب و روز کی
محنتوں کا پھل جلد ہی مل گیا۔ دھان کے خوشے سر اٹھانے لگے۔
ہواؤں میں بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ بیٹے کی محنت کا پھل ماں
کو سرور و کیف دے گیا۔ اس نے پیر صاحب کی درگاہ میں منت
مانی تھی۔ منت پوری ہو گئی۔ اس کی کٹیا کے در و بام جھوم اٹھے
اور یک بارگی دعاؤں کے لئے اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے،

میرے پُتر کو آہنی کاٹھ دے
یہاں سورما کی طرح وہ جئے!

محمود سچ مچ گبرو جوان تھا۔ اس کے انگ انگ سے شجاعت
مردانگی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ گاؤں کی گوریاں اسے دیکھتیں
اور کٹ کٹ جاتیں۔ مگر:

کاٹے نہیں کٹتے ہیں دن جیٹھ مہینے کے
اور آنکھیں جھپکتے ہی ہو جاتی ہے پربھات

محمود کو کسی کل چین نہیں۔ نہ جانے یہ کیسی چبھن ہے۔ اسے کسی پہلو
آرام نہیں ملتا۔ ایک انجانا سا درد ہے جس کے باعث اس کا من
بیکل ہو رہا ہے۔ اب کھیت میں اس کا جی نہیں لگتا۔ اب ہل بیل
اسے خوشی نہیں دیتے اتو:-

"آم پاکے' جام پاکے کاگا بولے را"

اور کاگا" کی کائیں کائیں دم بھر کے لئے امید بندھا جاتی ہے کہ اس

هرن

عمل : سجاد

کی کٹیا میں ضرور کوئی مہمان آنے والا ہے۔ لیکن اس کی کٹیا میں کوئی نہیں آیا۔ اس کی ماں کی امیدیں بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوئیں حالانکہ :

اسی مہینے گھر ہیں بناتے بن کے سارے پنچھی نے
بہو نہ آئی ہائے لیکن بھاگ جلی کی کٹیا میں !

اب اساڑھ کا مہینہ بھی آگیا۔ میگھ رانی کی سواری دور دور تک جانے لگی۔ سوکھی ندیاں جل تھل بن گئیں۔ گاؤں کے نوجوان کمائی کے لئے دور دیس جانے لگے۔ جدھر آنکھیں اٹھتی ہیں بادبان اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ محمود نے بھی دور دیس جانے کا قصد کیا۔ بھلا ماں کا دل کیسے مانتا۔ اس نے بیٹے کی منت سماجت کی۔ اسے بہلایا پھسلایا مگر وہ نہ مانا۔ ماں کی آنکھوں میں اساڑھ کے بادل سما گئے۔ محمود رخصت ہونے لگا۔ آسمان کالی بدلیوں سے ڈھک گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کی ناؤ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ چھ ماہ جدائی میں بیت گئے مگر محمود کا کچھ پتہ نہ چلا۔

محمود کی ناؤ ایک انجانے دیس کے کنارے آکر رکی اس نے ندی کنارے اُگے ہوئے درخت کی جڑ سے اپنی ناؤ کو باندھا۔ وہ گاؤں کے اندر داخل ہوا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس کی نگاہ ایک کٹیا پر پڑی جو کھٹ پر ایک بڈھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ بڈھے نے محمود کو بلایا اور اس سے اپنی کیفیت بیان کرنے لگا۔ اتنے میں آئینہ بی بی نہ جانے کہاں سے گاگر بھر کر آ گئی۔ اس نے ایک اجنبی جوان کو دروازے پر دیکھا تو۔

شرم کے مارے لال ہوا منہ، تھر تھر کانپے انگا[1]
جانا چاہا پر نہیں اٹھے کنہیا کے دو پا[2]

محمود، آئینہ بی بی کے روپ رنگ کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ایسا بے پناہ حسن اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر کے کالے کالے بال پاؤں کو چھو رہے تھے، آنکھوں میں کٹاری تھی۔ جسم کے انگ انگ میں جادو سمایا ہوا تھا اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا :

دیس میں اپنے سندر سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے روپ کے آگے سب ہے بیکن دھول

محمود نے بڈھے سے جب اپنا تعارف کرایا اور ماں باپ کے نام بتائے تو اس کی آنکھیں رو پڑیں۔ بڈھے نے کہا ـ "زمانہ ہوا جب میں اور تمہارے باپ دوست تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے ہائے"۔ محمود کو اپنے باپ کے بارے میں بہت سی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے بڈھے کو سلام کیا اور مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک اس کی نگاہیں آئینہ بی بی کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔ پھر وہ رخصت ہو گیا اور اس کی ناؤ پورب دیس کی سمت بہنے لگی

محمود کی روانگی کے بعد آئینہ بی بی کی کیفیت دگرگوں ہونے لگی۔ اب اس کی آنکھیں کسی چت چور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اب اس نے اپنے من میں محبت کا دیپ جلتا ہوا محسوس کیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ شام ہوتی اور کٹیا میں چراغ جلانا بھول جاتی۔ ندی کنارے پنیاں بھرن کو جاتی مگر آنکھیں کسی اور کو تلاش کرتیں اور دل ہی دل میں کہتی جاتی :۔

اپنے نگر میں کس نگری سے بہہ کر آئی نیا رے
کس نے من میں تیر چلایا؟ بول ذرا پردیا رے ؟
کون بھلا بوجھے گا پیارے اپنے من کو روگ ہے کیا
جنتا ایسا روگ ہے بندھو جس کی نہیں ہے کوئی دوا

ادھر محمود نا فرے کر آتے پڑھتا گیا۔ اب پورب سے بہہ کر آنے والی ہوائیں اس کے من میں کانٹے چبھونے لگیں۔ اس کا جی بکل ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں، لیکن آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی اسے چین نہ آیا۔ آئینہ بی بی اس کے سامنے اس طرح کھڑی تھی جیسے آسمان کی گود میں تنہا ایک تارہ جھلملا رہا ہو۔ تین ماہ اس طرح بیت گئے۔ وہ پھر آئینہ کے گاؤں میں واپس آگیا اس نے جتنے مال و اسباب خریدے تھے سب منہ مانگے دام میں بیچ دیے۔ اس کا من آئینہ سے ملنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مگر جب کٹیا کے اندر داخل ہوا تو وہاں آدمی تھا نہ آدم زاد — اس کے احساسات و جذبات میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ وہاں سے مایوس و نامراد لوٹ گیا۔ کتنے گاؤں گھوم گھوم کر اس نے آئینہ کی تلاش کی مگر لاحاصل۔ اب وہ اپنی جھولی پھیلا کر گھر گھر جانے لگا۔ کہیں سے اس کو بھیک مل جاتی۔ کوئی اسے گالیاں دیتا۔ کسی نے اس کو اچکا اور لفنگا سمجھا،

---

[1] انگا: جسم [2] پا: پاؤں بنگلا میں پاؤں کو پا کہتے ہیں۔

کسی نے پاگل اور دیوانہ گردانا۔ اس طرح تین گاؤں کے اس نے پھیرے لگا دیئے۔

جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو محمود نے دوسرے گاؤں کا راستہ لیا۔ اس وقت گاؤں کی جھونپڑیوں سے دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے۔ وہ تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے رات اسی کے نیچے بسر کرنے کی ٹھانی۔

صبح ہوئی تو اس نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔ وہ جھولی پھیلا کر بھیک مانگتے مانگتے ایک دروازہ کے پاس آیا کہ اس کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی۔ جھولی ہاتھ سے گر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ محمود نے کہا:۔

"یہ روپ دھارن میں نے تمہارے لئے کیا ہے پیاری!
تمہاری تلاش و جستجو میں نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا، کتنے
گاؤں کی خاک چھانی۔
یہ سلسلۂ لامتناہی چھ مہینے سے جاری تھا۔
جس نے مجھے اس روپ میں دیکھا پاگل سمجھا۔
پیاری میں چاول اور پیسے کی بھیک نہیں مانگتا ہوں۔
میں تو تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں۔
میں تو تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں، چلو اپنے دیس
لوٹ چلیں۔"

آئینہ نے روتے روتے جواب دیا ــــ

"ظالم باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے، یہ ماموں کا گھر ہے۔
چھ ماہ سے میں بھی آنکھوں سے گنگا بہا رہی ہوں
جہاں جی چاہے مجھے لے چلو پیارے!
پریت سے بڑھ کر اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔
پریت ہی تو رتن ہے، پریت ہی جتن اور گلے کا ہار ہے۔"

ماموں کے لڑکے سے آئینہ کی نسبت طے پائی تھی لیکن وہ محمود کے ساتھ فرار ہو گئی اور اس کے گھر میں آ کر اس نے محمود سے شادی کر لی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ محمود جب بھی بازار جاتا آئینہ اس سے فرمائش کرتی ــــ

"پیارے تم میرے لئے کنگھی ضرور لانا ــــ اور ہاں نتھ
اور آسمانی رنگ کی ساڑھی بھی!
میں یہ ساری پہن کر ندی کنارے جاؤں گی اور
تم مجھے دیکھ کر مسکراؤ گے۔
پیارے خوشبودار تیل لانا بھی نہ بھولو۔"

خوشی اور مسرت کے یہ دن مختصر ثابت ہوئے۔ محمود نے پھر دور دیس جانے کی ٹھانی۔ اساڑھ کے اس مہینے میں وہ دور دیس جا کر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا چاہتا تھا۔ آئینہ کو جب معلوم ہوا تو اس کی آنکھوں تلے تاریکی چھا گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی زندگی کا سورج گہنا گیا ہے۔ وہ اداس ہو گئی۔ اس کا دل بھر آیا اور اسی عالم بے قراری میں وہ محمود سے مخاطب ہوئی:۔

پیارے مجھے چھوڑ کر تم دور دیس نہ جاؤ۔
تمہارے بنا یہ پہاڑ سے دن کیسے کاٹوں گی۔
جوانی کے دنوں میں شوہر تو پھولوں پر بھونرا جیسا ہوتا ہے۔
پیارے نہ جاؤ!
دیکھو ندی کیسا شور مچا رہی ہے،
میں اپنی اس بھری جوانی کو کیسے سنبھال کر رکھوں گی؟
میرے پاس نہ تو سونا ہے۔ نہ چاندی ہے اور نہ پیتل،
دل میں بس ایک آس ہے تمہاری، اسے نہ توڑو!"

لیکن محمود نہ مانا اور اپنے دوستوں کو لے کر دور دیس روانہ ہو گیا۔ چند ہی دنوں کے بعد یہی دوست واپس آئے اور آئینہ کو اطلاع دی کہ ناؤ ڈوب جانے کی وجہ سے محمود بھی زندہ نہ بچ سکا۔ اس خبر کو سن کر آئینہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پاگل ہو گئی اور گھر سے نکل گئی۔ کسی طرح وہ ندی کنارے آئی تھی کہ ایک خانہ بدوشوں کی ناؤ کنارے آ گئی۔ اس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان عورتوں سے اس نے اپنی حالت زار بیان کی۔ اس کی روداد غم سن کر وہ اس حد تک متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اس کو اپنی ناؤ میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اس کے علاوہ ان خانہ بدوش عورتوں نے محمود کی تلاش میں آئینہ کی مدد بھی کی لیکن "چاند محل" نہ ملا۔ مسلسل تلاش و جستجو کے بعد آئینہ مایوس نہ ہوئی۔ تین سال تک ابیدوں کا گھروندا بنتا اور بگڑتا رہا۔ یکایک ایک دن چرواہے کی زبانی معلوم ہوا کہ جہاں ندی ختم ہو جاتی ہے وہیں "چاند محل" ہے۔ اور اس "چاند محل" میں ایک دلہن شام سے چراغ جلاتی ہے۔ یہ سن کر

آئینہ بی بی خانہ بدوش ناری کا لباس پہن کر باہر نکلی۔ اس نے جُوڑا بھی ویسا ہی باندھا۔ گلے میں تعویذ گنڈے تھے اور سر پر بوجھ۔

ندی پار کر کے آئینہ ٹھیک "چاند محل" کے قریب پہنچ گئی۔

درخت اسی طرح سرسبز تھے اور ان کی شاخوں میں پرندوں نے آشیانے بنا رکھے تھے۔ یہیں اس کا عیش کدہ تھا۔ جہاں اس نے کتنی حسین راتیں گزاری تھیں۔ اس نے جلدی جلدی "چاند محل" میں داخل ہونا چاہا مگر پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آج تین سال کے بعد وہ اپنے گھر آئی ہے۔ آج وہ اپنے جیت چور سے ملے گی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ساڑھی کے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھا۔ صحن میں مہندی کا درخت اسی انداز سے کھڑا نظر آیا۔ یہ مہندی کا درخت آئینہ نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس "چاند محل" کے در و دیوار میں اس کے کتنے سپنے سانس لے رہے ہیں، اس کی تمناؤں کے کتنے دیپ جل رہے ہیں مگر اس "چاند محل" پر آج اس کا اختیار نہیں۔ محمود یعنی اس کے جیت چور نے دوسری شادی رچالی ہے اور اب اس گھر پر اس کی نئی بیاہتا کا راج ہے۔

اس کی ساس اسے پہچان نہ سکی، اس نے پوچھا:۔

اے لڑکی کون ہے تو؟ کہاں سے آ رہی ہے؟ اس طرح نڈر"

اور آئینہ نے جواب دیا؛

کیا بتاؤں میں کون ہوں — ہاں اتنا یاد ہے
کہ جب میں روتی تھی تو تم تڑپ اٹھتی تھیں اور اپنے
آنچل سے میرے آنسو پونچھتی تھیں
مگر اب میری ڈھارس بندھانے والا بھی کوئی نہیں"

ساس نے پوچھا۔

"تو کیا تم واقعی آئینہ ہو جس کے غم میں روتے روتے میری آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی ہے۔ آؤ میرے پاس آؤ اب تم اپنی دکھی ماں کو چھوڑ کر نہ جاؤ" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی مگر آئینہ نے خون کا گھونٹ پی کر جواب دیا "نہیں میں اس گھر میں نہیں آؤں گی ہرگز نہیں۔ اب میں یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں رہ سکتی" اور اتنا کہہ کر آئینہ ناؤ میں بیٹھ گئی اور اس نے دل ہی دل میں کہا:

پنکھ پکھیرو چاند محل کے تم سے اتنا کہتی ہوں
اس کو میرے آنے کی سُن گُن تک نہ ہو پائے
میرے من کی آشا کیا ہے، اتنی سی بس آشا ہے
سکھی رہے جیت چور سجن وا من میرا اور کیا چاہے

آئینہ بی بی کی ناؤ چل پڑی — بہت دور — یہاں تک کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور جب محمود گھر واپس آیا اور اسے معلوم ہوا کہ آئینہ اسے تلاش کرتے کرتے چاند محل تک آئی تھی اور کسی نے اسے روکا تک نہیں تو اس کا ذہن مفلوج ہو گیا۔ وہ گھر سے نکل گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

★

شمعوں کی قطار

بقیہ صفحہ ۱۷

صدر پاکستان اور وزراء نئے دارالحکومت میں منتقل ہو چکے ہیں۔ اس متنوع اور حیرت انگیز کامیابی پر صدر مملکت پاکستان، انکے رفقاء، حکام اور باشندگانِ پاکستان جس قدر بھی اظہار مسرت کریں کم ہے۔ گزشتہ دس گیارہ سالہ مصائب و آلام سے نجات دینے پر ملک جس قدر بھی فخر و ناز کرے بجا ہے۔ اور گزشتہ یکسالہ کارہائے نمایاں کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ انقلابی حکومت پاکستان کے مستقبل کو اپنے انقلابی کارناموں سے اور بھی چار چاند لگائے گی۔ دنیا میں پاکستان سربلند ہو گا، اس کے باشندے صحیح معنوں میں آزادی سے ہمکنار ہو کر فخر سے اپنا سر بلند رکھ سکیں گے۔ اور جب صدر پاکستان کے وعدہ کے مطابق آئین کمیشن بھی اپنا کام شروع کر دے گا، جس کا اعلان کیا جا چکا ہے، اور انقلابی حکومت کی سرپرستی میں "جدید آئین" مرتب ہو جائے گا، تو یقین ہے کہ دنیا کی بہت سی حکومتیں اسی طرح اس پر رشک کریں گی جس طرح ہمارے بلا خون بہائے فوجی انقلاب پر رشک کیا جا رہا ہے۔

پاکستان پائندہ باد!

فریاد کی لے

دیوندر ستیارتھی

کمرے میں بک شیلف کے پیچھے گرد کی تہوں میں لپٹی، دیوار کے سہارے کھڑی کی ہوئی "رُدر وینا" پڑی تھی جس پر مکڑی نے جالا تن رکھا تھا۔ نیلی روشنی میں ڈوبے ہوئے کمرے میں ستار بجتا رہا اور میری روح کی جھیل میں نیل کنول کھلتا چلا گیا۔

پھر سجاد بھائی نے عیسیٰ فاروقی کی بات چھیڑ دی جس کی موت کے بعد ہی وہ یہ ستار خرید پائے تھے۔ عیسیٰ فاروقی کی زندگی ہی میں وہ یہ ستار کیوں نہ خرید سکے، یہ سوال میرے ذہن میں رہ رہ کر خلش کرتا تھا۔

"دیکھا آپ نے میرا ستار کتنا بھیگ کے بولتا ہے" سجاد بھائی مسکرا کر بولے "بڑے ٹھاٹھ کا ستار ہے۔ دوہرے ٹھاٹھ کا۔ ابھی پچھلے دنوں پانچ چھ طربیں ٹوٹ گئی تھیں۔ خود ہی بیٹھ کر لگا دُوں گا کسی روز۔ پھر دیکھئے اور بھی سُر میں بجے گا۔"

بک شیلف میں کتابیں بالکل سجا کر نہیں رکھی گئی تھیں۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ان پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ بک شیلف پر رکھے ہوئے گلدان کے پھول بھی مرجھا چکے تھے۔ ان کی پتیوں پر بھی گرد جمی ہوئی تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ سجاد کے ستار کی بھی ایک کہانی ہے جس پر گرد کی موٹی تہیں جمی ہوئی ہیں۔

نیلے بلب والے ٹیبل لیمپ کا شیڈ بھی نیلے رنگ کا تھا۔ اور اس شیڈ پر جمی ہوئی گرد کی تہہ اس بات کی ضمانت تھی کہ سجاد بہت دنوں بعد اس کمرے میں آئے ہیں۔

ستار پر سجاد بھائی کا نغمہ بہت دور نکل گیا تھا۔ اور میں مناسب مقامات پر داد دیا کرتا رہا۔ نیلی روشنی میں سجاد کا سانولا چہرہ بڑا ہی پیارا لگنے لگا۔ اس وقت مجھے امیر خسرو کی یاد آئی جنہوں نے رُدر وینا میں ضروری تبدیلیاں کر کے ستار ایجاد کرتے ہوئے

نغمہ کو آواز دی تھی۔

میں نے کہا "سجاد بھائی، یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ موسیقی کے موجودہ ساز صدیوں میں جا کر مکمل ہوئے ہیں۔ پہلے دنوں میں تو یہ ساز بہت ہی سادہ رہے ہوں گے۔ اب ستار ہی کو لو۔ پہلے کسی پرانے راگ کے رسیلے ایک لرزتے ہوئے تار کو جھنجھناتے ہوئے سن کر رُدر وینا، وچتر وینا اور سرسوتی وینا جیسے ساز ایجاد کئے ہوں گے۔ پھر صدہا سال بعد امیر خسرو نے ستار کو ایجاد کرتے ہوئے یہ سوال دہرایا کہ روپ رنگ کے جادو کو اب کس سحر کا انتظار ہے؟"

"میں نے تو اسے بہت دنوں سے ہاتھ ہی نہیں لگایا" سجاد بھائی کہتے چلے گئے، "ویسے وہ بھی اسی عیسیٰ فاروقی سے لی تھی۔ الاپ کرنا ہو تو یہی وینا ٹھیک ہے۔ لیکن گت کا مزا تو ستار کے بغیر کہاں؟"

سجاد نے ستار کی اتنی تعریف کر ڈالی کہ مجھے کہنا پڑا "ستار تو بہت دیکھے ہیں مگر ویسے اس میں ایسی کیا بات ہے؟" وہ بولے "اتنا بھیگ کے بولتا، کیا یہ معمولی بات ہے؟"

اس خیال سے کہ وہ برا نہ مان جائیں، میں نے یہ شکایت بالکل نہ کی کہ کمرے میں جگہ جگہ گرد کیوں جمی ہے اور وہ صفائی کی طرف سے اتنے بے پروا کیوں ہیں۔ بک شیلف پر رکھا ہوا الارم والا بند ٹائم پیس بھی تو اسی کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اس گھر کو ابھی تک بسانے والی نصیب نہیں ہوئی۔

ستار پر سجاد کو پورا اعتماد تھا۔ ان کی انگلیاں خوب چلتی رہیں اور لمبے ریاض کی سوگند کھاتی چلی گئیں۔

میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "تو گھر آباد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں؟"

"ارے یہ بھی کر لیں گے ایک نہ ایک دن" انہوں نے ستار کی کھونٹی کستے ہوئے کہا "لیکن کیا یہ اتنا ہی ضروری ہے؟" اور پھر وہ قہقہہ لگا کر بولے "بس ہمیں کوئی ثروت لیا مل ہی جائے گی"!

ثروت کی بات میں مجھے اجنبیت نظر نہیں آئی میں اور بھی تن کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ثروت کا قصہ پیچھے ہوگا پہلے ستار کی کہانی کے کواڑ کھولو"۔

"اس کی کہانی کے کواڑ کھلوا کر کیا کرو گے؟" سجاد جیسے سپنے میں بول رہے ہوں، اور انہوں نے دوسرا نغمہ چھیڑ دیا جسے سنتے سنتے میرے تخیل میں روپہلے ستونوں اور سنہرے کٹاؤ دار محرابوں والا سُر منڈپ گھوم گیا۔ ستار کے سُر رگ رگ میں اتر رہے تھے۔ میں نے کہا "واہ واہ! سچا سُر تو قدم قدم پر دئیے جلاتا ہے۔ قدم قدم پر دیپ آرتی اتارتا ہے"۔

"باتیں پیچھے ہوں گی۔ پہلے ستار سنو" سجاد نغمے کی لے بڑھانے چلے اور میں اپنے سر کو کرسی کی پشت پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ لے ذرت کا آنچل تھام کر آگے بڑھتی گئی۔ نغمہ ساز کی بند آنکھیں نغمے کے پاتال میں اترتی گئیں اور میری نگاہیں راگ کی وسعتوں میں تیرتی چلی گئیں۔ یکایک میرے منہ سے نکل گیا "بہتے پانی میں ہاتھ ڈالنا تو ہر لڑکی کو پسند ہوتا ہے لیکن ستار میں شاید ہر لڑکی رس نہیں لے سکتی۔ ایک بات بتاؤ۔ کبھی ثروت کو بھی تم نے ستار سنایا ہے؟"

"اس کی بات چھوڑو" سجاد نے جیسے ٹالنا چاہا۔ "اسے اتنی سمجھ ہی کہاں تھی۔ ایک بار ٹیپ ریکارڈ پر اس نے میرے ستار کے دو تین بول ضرور محفوظ کر لئے تھے۔ اب کون جانے وہ بول اس نے اب تک سنبھال کر رکھ چھوڑے ہیں اور انہیں کبھی کبھی سن لیتی ہے یا اس نے وہ نغمے مٹا کر کسی دوسرے گیت کے بول بھر لئے ہوں۔ ٹیپ ریکارڈ کی بات تو ایسی ہی ہے۔ چھوڑیئے!"

انہوں نے "چھوڑیئے" کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ ثروت کی کہانی کو بھی گرد کی موٹی تہہ کے نیچے دبا کر رکھنا چاہتے ہوں۔

"تو کیا تم ستار سکھانے جایا کرتے تھے؟" میں نے کہا "خیر اسے چھوڑو۔ پہلے ستار کی کہانی سناؤ"!

"تم نے پہلے بھی کسی ساز کی کہانی سنی ہے؟" سجاد نے مسکرا کر کہا "عیسٰی فاروقی یہ ستار اس لئے نہیں بیچتا تھا کہ یہ اسکے یہاں مرمت کے لئے آیا تھا اور جس کا یہ ستار تھا وہ سات برس سے اسے لینے نہیں آئی تھی"! پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ گنگنانے لگا۔

"گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس"

مجھے یہ محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ سجاد کی ستار کی کہانی بہت مزیدار ہوگی۔ ستار بجانے اور اسکی تیاری سے بھی کہیں زیادہ مزیدار۔ اور میرے تصور میں ستار کے موجد، امیر خسرو کا دوہا جیسے گھنگھروؤں کی جھنکار بن کر گونج اٹھا۔

خسرو کے اس دوہے میں سانجھ کی جو منظر کشی کی گئی تھی، وہ کسی جدید مصور کی دلکش تصویر کی طرح سامنے ابھری۔ جیسے ہمارے اور خسرو کے دور میں چند گھڑیوں کا فاصلہ بھی نہ رہ گیا ہو۔

"یہ ستار کسی نے مرمت کے لئے عیسٰی فاروقی کی دوکان پر بھیجا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھ لیا۔

"ثروت کی ماں نے" سجاد مسکرائے۔

مجھے بڑی گدگدی سی ہوئی۔ کیونکہ میں نہ جانتا تھا کہ یوں یکدم کہانی کا دامن ثروت سے جا ملے گا۔ میں نے کہا "کمرے میں صفائی کا انتظام کرو۔ ثروت کبھی بھولی بھٹکی یہاں آنکلی تو کیا کہے گی؟"

خالص لکھنؤ وضع کے کرتے پاجامے میں سجاد کی شخصیت نیلے بلب کی نیلی روشنی میں اور بھی جاذب نظر معلوم ہو رہی تھی۔ ثروت کا ذکر سن کر وہ شرما گئے۔ "چھوڑو۔ کیا وہ اب تک میرے لئے یونہی بیٹھی ہوگی؟" انہوں نے بات ٹالنی چاہی۔ جیسے وہ اب تک اپنے تصور میں اپنے ارمانوں کی اس کہانی کی گونج سن رہے ہوں جو انہوں نے ثروت کے سامنے بیان کی تھی۔

"کیا ثروت اپنے چہرے پر پاؤڈر کی موٹی تہہ جمایا کرتی تھی؟ اور یہ بھی بتاؤ اس کا دلپسند شعر کونسا تھا؟" میں نے سجاد کا کندھا جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"اسے تو بس ایک ہی شعر پسند تھا ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے"

سجاد گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"اور ثروت کی ماں خسرو کا دوہا گاتی ہوگی" میں نے

سنجیدگی سے کہا۔

"خسرو کا وہ دوہا تو ہر کسی کو پسند آئے گا"

سجاد نے بتایا کہ جب وہ ثروت کو ستار سکھلانے جاتے تو ان میں یہ بحث چل پڑتی کہ ستار سیکھنے کے لئے بڑے ٹھاٹھ کا ستار ہونا چاہیے یا معمولی سا۔ ثروت کہتی "میں تو تمہارے والے ٹھاٹھ کے ستار پر ہی نیا سبق لوں گی" اس کی امی تھی کہ اس بات کے لئے مطلق راضی نہ ہوتی۔ اس کا سبھاؤ نہ بدلنا تھا نہ بدلا۔ وہ تو ثروت کی یہ بات سن کر ہمیشہ چونک پڑتی اور جھنجھلا کر کہتی "تمہیں کب سے سمجھا رہی ہوں۔ اپنے ستار کو تو میں کسی کو بھی ہاتھ نہ لگانے دوں گی۔ دیکھتی نہیں، میں نے تو کبھی عیسیٰ فاروق پر بھی اتنا بھروسہ نہیں کیا کہ اسے مرمت کے لئے اس کی دوکان پر بھیج دوں۔ ہمیشہ اس کو یہاں آ کر کھونٹی وغیرہ لگانی پڑتی ہے۔ چاہے اسے راضی کرنے کے لئے مجھے کتنی بار بھی اس کی دوکان پر جانا پڑے۔"

میں نے کہا "تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ثروت اپنے چہرے پر پاؤڈر کی ہلکی سی تہہ جماتے وقت بھی وہی فریاد کی کوئی لے نہیں ہے، والا شعر گنگناتی ہوگی۔ اور دیکھی ہوگی کہ ایک لہراتی ہوئی زلف اس کے دائیں گال کو چھوتی۔ جیسے یہ سچ مچ کسی فریاد کی لے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا ثروت کو بھی نیلے بلب کی نیلی روشنی پسند تھی؟ ستار بجاتے وقت اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ نرم پڑ جاتا ہوگا۔ اور وہ تو ہمیشہ پلکیں جھکا کر ستار بجانا پسند کرتی ہوگی اور اس کا انداز یقیناً ایک مشرقی لڑکی کا انداز ہوگا۔"

سجاد نے بتایا کہ اس کی امی کسی کے دل کو ٹھیس تو نہیں لگانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ستار کی مرمت کے سلسلے میں اسے عیسیٰ فاروق پر ذرا بھی اعتماد کیوں نہیں تھا۔ جب ثروت اپنی بالکونی میں سج دھج کر بیٹھتی اور ستار بجاتی یوں معلوم ہوتا کہ وہ عمر رفتہ کو آواز دے رہی ہے۔ ویسے اسے ستار بجاتے سننا تو عیسیٰ فاروق کو بھی پسند تھا۔ سارے شہر میں اس کے ستار کی دھوم تھی۔ اور بڑے بڑے موسیقار تہہ دل سے یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح بیگم اشفاق کا ستار ان کے ہاتھ لگ جائے۔

"لیکن یہ راز کسی کو بھلا کیسے معلوم ہوتا" سجاد مسکرا کر بولے "یہ بات تو ثروت کے ابا جان بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ ستار بیگم نے خریدا تھا یا وہ کسی کے نغمے کی یادگار تھی جسے وہ اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھی۔"

میں نے کہا "تم بھی تو چھپا رہے ہو۔ میرا تو خیال ہے یہ ستار کسی زمانے میں خود عیسیٰ فاروق نے ہی بیگم اشفاق کی نذر کیا ہوگا!"

"تم نے کیسے بوجھ لیا!" سجاد الاؤ میں سوکھے پتے ڈالنے کے انداز میں بولے "ثروت کے ابا جان سے یہ بات آج تک پوشیدہ رکھی گئی کہ بیگم کی اٹھتی جوانی میں عیسیٰ فاروق نے اسے دے ڈالا تھا۔ شاید بیگم ستار کی مرمت کے بہانے اسے اپنے یہاں بلا کر ان دنوں کی یاد تازہ کر لیتی تھی۔"

"یہ بات ثروت کو تو ضرور معلوم ہوگی۔"

"بالکل نہیں۔"

"اب آجکل بیگم اشفاق اور ثروت کہاں ہیں؟"

"کوئی نہیں جانتا"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"عیسیٰ فاروق کو مرنے سے پہلے سات سال تک یہ راز معلوم نہ ہو سکا۔"

"یعنی بیگم ستار کو مرمت کے لئے عیسیٰ فاروق کی دکان پر بھیجنے کو تو راضی ہو گئی تھیں۔ پھر اس کی سدھ بدھ لینے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ ایسا کیونکر ہوا؟ اس سے پہلے تو وہ کبھی ایک گھڑی کیلئے اس ستار کو اپنے سے جدا نہیں کرتی تھی۔"

سجاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ ہی شعر گنگنانے لگا......

"پہلے یہ بتاؤ" تمہارے پاس یہ ستار آئے کتنا عرصہ ہوا؟"

"تین سال"

"تو گویا دس سال سے بیگم ثروت اس شہر سے غائب ہیں؟"

سجاد نے نرم اور مدھم آواز میں کہا "مجھے یقین ہے ثروت کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہوگی۔"

"وہ کیسے؟"

"اس نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کرے گی تو مجھ سے ورنہ ساری عمر..."

"آخر شادی میں رکاوٹ کیا تھی؟"

"بیگم نہیں مانتی تھی۔ حالانکہ ثروت کے ابا جان نے کہہ دیا تھا کہ اگر ثروت بھی چاہتی ہے تو کیا مضائقہ ہے۔"

"تو پھر کیا رکاوٹ تھی؟"

"کیا بتاؤں۔ اس روز سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پہلے میری ٹیوشن چھوٹ گئی۔ پھر میرے لئے ثروت کو گھڑی پل کیلئے دیکھنا بھی محال ہو گیا۔ بیگم نے یہ شہر چھوڑ دیا۔ نہیں نہیں یہ ملک ہی چھوڑ دیا۔"

"یعنی وہ اپنے خاوند اور بیٹی کے ساتھ کہیں باہر چلی گئیں۔"

"جی ہاں"

"اور جاتے ہوئے یہ ستار عیسٰی فاروق کے پاس کیوں چھوڑ گئیں؟"

"اب یہی تو نکتے کی بات ہے"

"عیسٰی فاروق نے تمہیں کچھ تو بتایا ہوگا۔"

"وہ تو یہی کہتا رہا کہ بیگم ضرور آئیں گی ایک دن اور اسکے آنے بلکہ کسی بار اصرار کرنے پر ہی اس کی مرمت کی جائے گی۔"

"اور وہ لوٹ کر نہ آئیں۔"

"جیسے سات برس بیتے ویسے ہی تین برس اور بیت گئے۔ اور آج تک نہ وہ آئیں نہ ثروت۔ وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ انہیں میری یاد بھی ضرور آتی ہوگی۔"

"کیا تمہاری خاطر ہی بیگم اور ثروت نے یہ ملک چھوڑ دیا"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے" سجاد نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "لیکن ایسا کیوں ہوا، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ آخر انہیں ملک چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ چاہتے تو یہاں رہتے ہوئے بھی مجھ سے قطع تعلق کر سکتے تھے۔"

سجاد کے جسم میں تھرتھری سی پیدا ہوئی۔ بولے "بیگم کے لیے عیسٰی فاروق کے دل میں محبت کی آگ ضرور سلگتی تھی۔ یہ بات مجھ سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ جب وہ اس کی دکان پر یہ درخواست کرنے آئی کہ وہ اس کے گھر پر جا کر اس کے ستار کی نئی کھونٹی لگا آئے تو وہ اس طرح مسکراتی اور پھر آنسو بہاتی کہ عیسٰی پہلے تو یہی رٹ لگاتا رہتا کہ دیکھیے بیگم ہم دکان کھول کر بیٹھے ہیں تو کوئی ہمیں اتنا بے ایمان کیوں سمجھے کہ اپنا ستار مرمت کے لئے ہماری دکان پر نہ بھیج سکے۔ وہ بہت جھنجھلاتا لیکن دھیرے دھیرے بیگم کی مسکراہٹ اور پھر اس کے آنسو اس کے منہ سے یہ لفظ نکلوا کر ہی چھوڑتے "اچھا بیگم صاحبہ میں آجاؤں گا۔"

میں سمجھ گیا۔ عیسٰی فاروق سے بیگم اشفاق کو واقعی محبت تھی۔ مگر ثروت کو حاصل کرنے کے لئے تم نے عیسٰی فاروق سے مدد کیوں نہ لی؟"

"عیسٰی فاروق کی تو وہ بات تھی کہ اندھے کے ہاتھ پر بیگم نے سونے کی مہر رکھ دی۔ اندھا یہی کہتا چلا گیا کہ یہ تو کھوٹا سکہ ہے"

"تو اب ثروت کا کیا بنے گا؟"

"وہ تو ایک روز میری ہو کر ہی رہے گی۔ وہ ضرور آئے گی"

"خیر یہ بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ یہ ستار تمہیں کیسے ملا؟"

"جب تک عیسٰی فاروق زندہ رہا اس ستار کو بیچنے سے برابر انکار کرتا رہا۔ کیا بتاؤں یہ ستار اس کی دکان میں فرش پر دیوار کے ساتھ پڑا رہتا، گرد سے اٹا ہوا۔ میں جب بھی اس کی دکان پر جاتا، وہ میرے دل کی بات سمجھ کر کہتا "دیکھو مجھ سے امانت میں خیانت کرنے کی کبھی کوئی بات نہ کرنا۔ میں وہ ستار بالکل نہیں بیچ سکتا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے بیگم آئیں گی اور آ کر کہیں گی میرا ستار کہاں ہے؟" اور اس وقت وجد میں آ کر وہ خسرو کا دوہا الاپتا۔ اور جب اس کی زندگی کی سانجھ اتر آئی تو وہ جاتا ہوا اپنے بیٹے سے کہہ گیا کہ وہ بیگم اشفاق کا ستار بالکل نہ بیچے۔

میں نے آنکھوں میں شرارت بھر کر کہا "اور عیسٰی فاروق کے مرنے کے بعد تمہارا داؤ چل گیا۔"

"جی ہاں۔ آخر میں نے عیسٰی فاروق کے بیٹے کو راضی کر لیا کہ وہ میرے لئے اس ستار کی مرمت کر ڈالے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کی تونبی ٹوٹ گئی تھی۔ اور اتنی بڑی تونبی کہیں بھی نہیں ملتی تھی۔"

"پھر یہ تونبی کہاں سے ملی؟"

"یہ ایک نیکر والڑکی سے ہاتھ لگی جو میری زد رونیا رنجیدہ گئی تھی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ وائی ڈبلیو سی اے میں رہتی تھی اور ایک روز عیسیٰ فاروقی کی دوکان پر اپنے وائلن کی مرمت کرانے آنکلی۔ میں وہاں بیٹھا تھا اس نے وہ ٹوٹا ہوا ستار دیکھا اور باتوں باتوں میں بتایا کہ اسی کے سائز کی ایک فالتو تونبی اس کے پاس پڑی ہے۔ عیسیٰ فاروقی کے لڑکے نے اس سے میرا تعارف کرا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ رُدر وینا بجانے میں میرا شہر بھر میں جواب نہیں۔"

"تو وہ تمہاری تعریف سن کر تم پر فریفتہ ہو گئی!"

"وہ تو چاہتی تھی کہ مجھ سے شادی کر لے۔"

"اور تم نہ مانے؟"

"میں نے ٹھیک کیا اور جہاں بھی ثروت رہتی ہے اس نے بھی ٹھیک ہی کیا ہوگا۔ اس نے تو میری خاطر خوبصورت سے خوبصورت لڑکے کا ہاتھ جھٹک دیا ہوگا۔ اب میری مشکل یہ ہے کہ وہ نیگرو لڑکی میرے ستار پر ہی نہیں، خود ستار نواز پر ہی ریجھ گئی ہے۔ اسے لاکھ ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں وہ مانتی ہی نہیں کبھی تو ثروت میرے پاس آئے ہی گی۔"

"تو پھر وہ اب تک تمہارے پاس آئی کیوں نہیں؟"

"اسے بھی کسی کی موت کا انتظار ہوگا جیسے اس ستار کو میرے پاس چلے آنے سے پہلے عیسیٰ فاروقی کی موت کا انتظار تھا۔"

میں نے کہا "یہ تو ظلم ہے کہ تم اپنی محبوبہ کے لئے اس کی ماں کی وفات کا خیال کرو۔"

سجاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں وہ بہت مجبور ہیں۔

کمرے کے کونے میں گرد سے اٹی ہوئی وینا پڑی تھی اور ایک شلیف پر رکھے ہوئے گلدان میں مرجھائے ہوئے پھولوں پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی پیلے بلب والے ٹیبل لیمپ کے نیلے شیڈ پر بھی گرد کی تہہ ہمارا منہ چڑا رہی تھی۔

سجاد بولے "ثروت آ تو جائے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ کر یوں ستار بجاؤں گا جیسے ماضی کے کانوں میں سُر کے جھمکے اور ماتھے پر سُر کے چاند کا ٹیکہ لگانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہو، وہ خود دیکھے گی کہ میں نے اس کے لئے محبت کے پھولوں کو مرجھانے نہیں دیا۔"

میں نے ہنس کر کہا "وعدہ کرو کہ تم ثروت کی یاد میں کمرے کی صفائی کا خیال رکھا کرو گے۔ اتنی گرد تو ٹھیک نہیں"

"گرد سے کیسے بچا جائے!" سجاد نے جھنجلا کر کہا "کئی کئی دن تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔ کسی نہ کسی گھر رات گذارنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور میں وہیں رہ جاتا ہوں۔"

"جب گھر میں کوئی سہاگن نہ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ہو نہ ہو۔ ٹھاکر کا ستار تو ہے جسے میں ثروت کی امی کی طرح کبھی اپنے سے الگ نہیں کرتا۔ ساڑھے تین سو روپے ادا کرنے پڑے تھے عیسیٰ فاروقی کے بیٹے کو پانچ قسطوں میں۔ دن بھر موسیقی سکھاتا ہوں۔ ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی آتی ہے۔ لیکن ثروت کا چہرہ نہیں بھولتا۔ اسی طرح جس طرح عیسیٰ فاروقی کو بیگم اشفاق کا چہرہ نہیں بھولتا تھا۔ وہ سات برس اس نے کس کس طرح تڑپ تڑپ کر گذار دیئے، کوئی مجھ سے پوچھے۔"

میں نے کہا "تو تم ہمیشہ اس ستار کو اٹھائے اٹھائے پھرتے ہو؟"

سجاد بولے "کیا بتاؤں رات کو سوتے میں اٹھ کر پاس پڑے ستار کو ٹٹول کے دیکھ لیتا ہوں کہ کوئی اسے لے تو نہیں گیا!"

اور تھوڑی خاموشی کے بعد گرد سے اٹی ہوئی رُدر وینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جیسے رُدر وینا سے امیر خسرو نے ستار بنایا ویسے ہی اللہ میاں نے بیگم اشفاق کی بیٹی ثروت کو پیدا کیا۔ ایک دن آئے گی آنے والی آکے رہے گی۔ آخر فریاد کی بھی لَے ہے!" اور پھر وہ تھوڑی خاموشی کے بعد بولے "اس نیگرو لڑکی کو ایک نہ ایک روز یہ وینا دینی ہی ہوگی۔"

اور وہ ستار پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولے "آؤ میں تمہیں ثروت کی یادوں کے شبستاں میں لے چلوں۔ تم اسے دیکھ کر خود بخود خسرو کا وہ دوہا گنگنانے لگ جاؤ گے۔"

اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی اور سجاد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

وہ نیگرو لڑکی اندر آئی اور لجاتی ہوئی بولی "میری وہ رُدر وینا کہاں ہے؟"

(باقی صفحہ [illegible] پر)

افسانہ

واپسی

عنایت اللہ

اس کی آنکھ کھل گئی ۔۔

اکتوبر کی آخری رات کی خنک ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی کے باریک ریشمی پردوں سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے اس کے تھکے ہارے اعصاب اور سوچ بچار کے مارے دل و دماغ کو سہلا رہے تھے۔ اس نے انگڑائی لی اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چاند کوٹھی سے ذرا ہی دور شیشم کے پیڑ کی اوٹ میں اونگھ رہا تھا اور کمرہ تھکی ہوئی چاندنی کی کرنوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ چاند کے سامنے شیشم کی جھومتی ہوئی شاخیں کمرے میں چاندنی کی لہریں پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی تپائی سے گھڑی اٹھا کر چاند کی روشنی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اس کے بستر سے اٹھنے میں تو ابھی چار پانچ گھنٹے باقی تھے۔ اس نے گھڑی رکھ کر ایک بار پھر شیشم کی گھنی شاخوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ اس نے گزشتہ نو برس میں کئی چاندنی راتیں کراچی جا کر ہاکس بے، کلفٹن اور سینڈز پٹ میں گزاری تھیں۔ یہی چاند ہوتا تھا۔ اور یہی چاندنی لیکن اس نے اس میں یہ روح افزا دلکشی نہیں دیکھی تھی جو وہ آج کی سحر دیکھ رہا تھا۔ اس نے چاند کو اتنی غور سے دیکھا ہی کب تھا۔ شاید اس لئے کہ سمندر کے کنارے ٹھنڈی ریت پر وہ اپنی کار سے ذرا دور وسکی کے نشے میں نت نئی ناظورہ کے پہلو میں بدمست بیٹھا ہوتا تھا اور چاند بادلوں کی اوٹ میں کبھی چھپتا کبھی اوٹ سے جھانکتا، سمندر کی لہروں کی اوٹ میں چھپ جاتا تھا۔ راوی میں چاندنی رات میں اس نے چاند کو کبھی نہیں دیکھا تھا حالانکہ وہاں دو چاند ہوتے تھے۔ ایک آسمان کی وسعت میں اور دوسرا راوی کی لہروں پہ تیرتا ہوا۔ لیکن اس کی نگاہیں دائیں طرف دخترِ رز اور بائیں طرف دخترِ نازآفریں میں الجھی رہتی تھیں۔

اس نے زندگی کی ان گنت راتیں کھلی فضا میں کھلی ہوئی چاندنی میں گزاری تھیں لیکن چاندنی میں یہ نکھار نہ تھا جو وہ آج دیکھ رہا تھا۔ تھکا تھکا سا چاند اسے کچھ یاد دلا رہا تھا۔ حسن کی یہ تھکن یا تھکن کا یہ حسن وہ پہلی بار نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہی حسن ۔۔۔ اس نے غیر ارادی طور پر سر بائیں طرف کیا۔ اس کے پلنگ کے ساتھ لگے ہوئے پلنگ پر زاہدہ سو رہی تھی۔ چاندنی میں اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کی بے عیب خوبصورتی اس شہزادی کی تصویر پیش کر رہی تھی جو شہزادے کے انتظار میں سو گئی ہے۔ اس نے زاہدہ سے نظریں ہٹا کر پھر چاند کی طرف دیکھا۔ چاندنی کی لہروں میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا اور اس میں سے ایک یاد ابھری جو لہروں پہ تیرنے لگی۔۔

گیارہ برس پہلے کی ایسی ہی ایک رات تھی جب زاہدہ ہر نئی نویلی دلہن کی طرح اس کے کمرۂ عروسی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ رات بھر اسے دیکھتا رہا تھا۔ منتظر عشق نے جانے کتنے سجدے بکھیر دیئے تھے جنہیں حسن نے اپنی نظروں نظروں میں چرا کر حجاب کے پردوں میں چھپا لیا تھا اور اس سہانی رات نے آج ہی کی طرح ایک سحر کو جنم دیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ صبح کے چار بج رہے تھے جب اس نے زاہدہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر دیکھا تھا۔ اس معصوم کمسن اور شباب سے دمکتے ہوئے چہرے پہ ایسی ہی تھکن تھی جیسی وہ آج، گیارہ سال بعد صبح کے اس چاند میں دیکھ رہا تھا۔ اس صبح زاہدہ کی پلکیں جھکی جھکی تھیں۔

آج اسے اس چاند میں وہ گیارہ برس پہلے والی زاہدہ نظر آئی اور رات جس کے انتظار میں اس نے تیس برس گزار دیئے تھے۔ آج بھی وہی زاہدہ تھی۔ گیارہ برس پہلے کی طرح۔ پورے گیارہ برس اس نے تمام راتیں اسی پلنگ پہ گزاری تھیں لیکن اس قرب میں اب کتنی دوری پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے درمیان ایک

خلیج حائل ہو گئی تھی جو گذشتہ چند برسوں سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی فرق صرف یہ تھا کہ برسوں پہلے یہاں اتنے قیمتی پلنگ نہیں تھے۔ سستی سی قسم کے دو نواڑی پلنگ تھے۔ ایک وہ جو اُس نے شادی سے پہلے ایک ماہ پہلے صرف پچیس روپوں میں خریدا تھا اور مزدور کی اجرت بچانے کے لئے خود ہی سر پہ اٹھا لایا تھا۔ دوسرا زاہدہ کے جہیز کا تھا جو اس کے ماں باپ نے قلیل سی آمدنی میں سے اٹھارہ روپوں میں خریدا تھا۔ گیارہ برس پہلے یہ محل نما دو منزلہ کوٹھی نہیں تھی، لاہور کے ایک کونے میں گھٹیا سا مکان تھا جس کے گھٹیا پن میں بھی ایک دلگداز سکون تھا۔ اُس وقت اُس کی چھوٹی سی کریانے اور سگریٹوں کی ایک دکان تھی، لاہور سے کراچی تک پھیلا ہوا زمین دوز کاروبار نہیں تھا۔ گیارہ برس پہلے وہ کبھی کبھی نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ اسے کبھی "بچّے" کی نہیں سُوجھی تھی۔ اب ان دو پلنگوں کے درمیان تین "بچّے" ہزاروں کے بستر پر سونا اور پورا گھر رعب آگیا تھا!

اُس نے ایک بار پھر زاہدہ کی طرف دیکھا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہ آئی حالانکہ رات سوچتے سوچتے اسے ایک بج گیا تھا۔ غالباً ڈیڑھ بجے اس کی آنکھ لگی ہوئی۔ ابھی چار ہی بجے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور نیند بھی غائب ہو گئی۔ روز مرہ کے معمول کے مطابق اس کی آنکھ ساڑھے آٹھ بجے کھلنی چاہئے تھی۔

وہ دوسری کروٹ سے سو گیا۔ آنکھیں بند کیں مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں کھل کر شیشم کی ڈالیوں پہ جھولتے ہوئے چاند کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے جھنجھلا کر کروٹ بدل لی۔ اُس طرف اُسے زاہدہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ اکتا کر پیٹھ کے بل ہو گیا۔ اور چھت میں لٹکتے ہوئے پنکھے کو دیکھنے لگا۔

اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ سو نہیں سکے گا۔ اس کی نگاہیں چاندنی سے بھرے ہوئے کمرے میں آہستہ آہستہ گھومنے لگیں جیسے وہ اجنبی مہمان کی طرح آج پہلی بار اس کمرے میں داخل ہوا ہو اور یہ ساز و سامان اور شاہانہ فرنیچر جو اُس نے اپنی آسائش کے لئے خریدا تھا۔ جیسے اس کا اپنا نہیں تھا اور نہ اس کو اس کمرے میں رہنے کا ہی کوئی حق تھا حالانکہ گذشتہ آٹھ برس سے وہ اس میں رہ رہا تھا اور زاہدہ کے روکنے اور منت سماجت کے باوجود یہاں شراب پیتا اور پی کر آتا تھا۔

وہ آج کی سحر کسی چیز کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی نگاہیں اسے سب کچھ دکھا رہی تھیں۔ وہ سامنے قد آدم آئینہ اور سنگار میز جو بنانے والے نے تو عورتوں کے لئے بنایا تھا۔ لیکن اس نے ساڑھے تین سو روپوں میں اپنے لئے خرید کے رکھا ہوا تھا۔ یہ دو پلنگ ساڑھے پانچ سو کی مالیت کے تھے۔ تپائیاں اور ان کے اوپر گلدان جن پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ نائیلون کے پردے دیواروں کے ساتھ آویزاں نیم برہنہ عورتوں کی تصویریں اور فرش کے پورے سائز کا نہایت قیمتی قالین۔ صرف چھت کی گلکاری پر اُس نے دو ہزار روپیہ صرف کیا تھا۔ یہ اس کے سونے کا کمرہ تھا جو کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا۔ اس کی نگاہیں بند دروازے سے نکل کر کوٹھی کے تمام کمروں اور غلام گردشوں میں گھومنا چاہتی تھیں لیکن اُس نے انہیں بعد مشکل روک لیا اور انھیں پلکوں میں بند کر لیا۔ اُس نے پلکوں کے اندھیرے میں پناہ ڈھونڈنی چاہی تھی لیکن اس اندھیرے میں سے کچھ خیال محسوس ہیکے اور تلخ حقائق بن کر اس کے سامنے آگئے اُس نے سٹپٹا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ چاند جو اسے ابھی ابھی اچھا لگا تھا اور اسے شب عروسی یاد دلا گیا تھا اب اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ تھکے ہوئے دماغ میں خیالوں کا سیل امڈ آیا۔ پھر وہی خیال، پھر وہی باتیں، جنہیں وہ رات ڈیڑھ بجے نیند میں ڈبو چکا تھا جوں کی توں موجود تھیں۔

وہ اٹھ بیٹھا۔ جیسے ہارا ہوا بادشاہ زخمی ہو کر نئے رہیں آ چھپا ہو

وہ آج بیس پچیس روز سے اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ گیارہ برس پہلے کا دور اور آج کا وقت اسے چکی کے پاٹوں کی طرح پیس رہا تھا۔ اسے کوئی راہِ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے صرف اس قدر اطمینان تھا کہ وہ نئے قانون کی زد سے بچ گیا ہے لیکن اس کی لاکھوں کی دولت ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت صرف دس ہزار روپیہ تھا۔ باقی تمام اُس نے اپنے ایک حصہ دار کو پیشگی ادا کر کے باہر بھیج دیا تھا لیکن مال کراچی کی بندرگاہ سے پچاس میل دور سے ہی واپس چلا گیا تھا۔ مال بھی گیا اور حصہ دار بھی مع رقم لا پتہ! اسے معلوم تھا یہ دولت ناجائز اور غیر قانونی تھی وہ کسی عدالت میں اس نقصان کا دعوے نہیں کر سکتا تھا۔ حصہ دار وقت کا فائدہ اٹھا گیا تھا۔ ۲۸ اکتوبر کی صبح ہی بحیرۂ عرب کے اس کنارے کے بیوپاریوں نے اُس پار کے کاروباریوں کو اطلاع بھیج دی

تھی کہ مال روک لو، خطرہ ہے۔

خطرہ تو ٹل گیا تھا لیکن اس کا تین لاکھ روپیہ جو اس نے اس امید پر حصہ دار کو دے دیا تھا کہ چھ لاکھ ہو جائے گا، بحیرۂ عرب پر تیرتا ہوا عرب کی ریت میں مل گیا تھا۔ اب اس کے پاس دس ہزار روپیہ، ایک کوٹھی کراچی میں اور ایک لاہور میں رہ گئی تھی۔ ایک کار تھی۔ دونوں کوٹھیوں پر اس نے لکیر پھیر دی کیونکہ دونوں متروکہ جائداد تھیں اور دونوں کی تعمیر نو غیر قانونی۔ نئی حکومت نے متروکہ جائداد کے ظاہر کرنے کے احکام اور احکام کی خلاف ورزی کی سزاؤں کا اعلان کر دیا تھا۔ کار اسے اب سفید ہاتھی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آسمان سے گر پڑا تھا لیکن کس بے ڈھب طریقے سے۔

اس نے بیٹھے بیٹھے سر گھٹنوں پہ رکھ دیا اور اپنے آپ کو حقائق کے سپرد کر دیا۔ لمحات نہایت آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ اخباروں میں ہر وزارت نئی تجویز اور اس کے اپنے خیالات کی تلخیاں سنسناتی ہوئی گولیوں کی طرح اس کے وجود سے پار ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے اخباروں پہ غصہ آنے لگا جو اس قسم کی خوفناک خبریں شائع کر رہے تھے۔ اس نے سوچا کیا خوب زمانہ تھا کہ کسی وزارت کے ٹوٹنے کی خبر آتی تھی۔ آئے دن نئے وزیر بنتے تھے۔ وہ انہیں دوست بناتا، ایک آدھ کو اپنے کاروبار کا حصہ دار بناتا۔ پھر کیا مجال جو کراچی کی بندرگاہ پر کوئی اس کے مال کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ لیکن یہ انقلاب! وہ تڑپ اٹھا جیسے اس کے سارے جسم میں درد کی ٹیس اٹھی ہو۔ کمرے میں ایسا سکوت تھا کہ نائلون کے پردوں کی لرزش بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ پلنگ سے اٹھا، ہاری ہوئی سی ایک انگڑائی لی۔ کھڑکی کے قریب جا کر باہر اس انداز سے جھانکا، جیسے کوئی قیدی لوہے کی سلاخوں میں سے اس دنیا کو دیکھ رہا ہو جو اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی کتنی دور ہو جاتی ہے۔

وہ شب بیداری، تفکرات سے بوجھل دماغ اور دکھتا ہوا بوجھل ضمیر کو سنبھالتا ہوا پیچھے گھوما اور قالین پر بے آواز پا خراماں خراماں چلتا ہوا زاہدہ کے سرہانے جا رکا۔ وہ سو رہی تھی — گہری نیند۔ اس نے سوئی ہوئی نسائیت اور اس کی معصومیت کو برسوں بعد محسوس کیا۔ یہ بھی دیکھا کہ زاہدہ کے بھولے بھالے چہرے پر وہی برسوں پہلے کی تازگی ہے لیکن آنکھوں کے گرد اور ہونٹوں کے کونوں میں شکوے تڑپ رہے ہیں: "میں نے غربت میں تیرا ساتھ دیا ہے۔ تجھے دولت ملی تو غیر ہو گئی!" اُسے یوں لگا جیسے زاہدہ کی لطیف سی سانسیں اُسے بآوازِ بلند کہہ رہی ہیں "کیا تیری محبت کو بیچنے کے لئے میں بھی خود فروش بن جاؤں؟ تو کار لے کر میرے دروازے پر آتے اور میں تیرے ساتھ چل پڑوں؟ تو غیر عورت کی راہ میں دولت بچھاتا ہے۔ میں نے تیری راہ میں آنکھیں بچھائی ہیں۔ جن راہوں پہ تو سرِ شام نکل جاتا ہے میں اُن پہ آنسو بکھیرتی ہوں۔ تو نے سچ کہا ہے میں نے تیرا ہاتھ تھام لینے کی کوشش کی ہے کہ سچ اکبر ہے۔ مگر پہلے تو تجھ سے کہا بھی نہ تھا۔ لگا اب دو سال ہوئے میرے ساتھ کلام کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

وہ سوئی ہوئی زاہدہ کو دیکھتا رہا۔ اس کا ایک ہاتھ لاشعوری طور پر اس کی پیشانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زاہدہ نے کروٹ بدلی۔ ایک گزرتا ہوا سنسناہٹ ... وہ چونکا اور لرز کر پیچھے ہٹ گیا۔ راوی کے پُل پر مال گاڑی گزر رہی تھی۔ اس نے بکھرے ہوئے خیالوں کو پھر چُن لیا اور دونوں ہاتھ زاہدہ کے پلنگ پر ٹیک کر ذرا سا جھکا۔ ہوا کے جھونکوں نے جیسے اسے کہا "تجھے دولت ملی تو زاہدہ تجھے بُری لگنے لگی۔ کہاں گئی وہ دولت؟ آج تیرے پاس دولت نہیں رہی۔ اسمگل کیا ہوا سونا بحیرۂ عرب اور شراب کی لہروں میں بہہ گیا ہے۔ دولت کراچی اور لاہور کی ہوس رانیوں نے چوس لی۔ کچھ رعنا کے بھائی اور ماں باپ اسے تیری زوجیت میں دینے کے فریب میں لے گئے۔ تیرے پاس آج کیا رہ گیا ہے؟ بس جرائم۔ گناہوں کا بوجھ تیری کمر کو سوکھی شاخ کی طرح توڑ چکا ہے۔ پہلے تو نے دولت کو سمیٹا تھا، اب گناہوں کو سمیٹ لے۔ یہی تیری پونجی ہے!"

اس کے اپنے ضمیر کی آوازیں اس کے چہرے پر زنائے دار تھپڑ مار رہی تھیں۔ اس نے چاہا زاہدہ کو جگا دے، اس کے قدموں پہ سر رکھ کر گناہوں کا اعتراف کرے اور اس سے کہے "تو ہی میری پناہ ہے، تو ہی میری ہمسفر ہے۔ میں تھک گیا ہوں، ہار گیا ہوں۔ مجھے تھام لے۔" لیکن اُس میں اقبالِ جرم کی ہمت نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ لاہور کے ہنگامے سوئے ہوئے تھے۔ راوی جاگ رہا تھا۔ لہروں کا ہلکا ہلکا شور فضا میں خنک سا ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں ہی سڑک پہ جا پہنچا اور دریا کی طرف چل پڑا۔ تصور میں اسے چھوٹی سی ایک دکان نظر آئی۔

جس میں چند کنستر اور بوریاں رکھی ہوتی تھیں۔ دال، مرچ، مصالحہ، چاول اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزیں۔ چند ایک سگریٹ، بیڑیاں اور ٹافیاں ہوتی تھیں۔ اڑھائی تین روپے کی روز آمدنی ہوتی تھی۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ بڑا سارا گھر تو واہگہ کے اُس پار رہ گیا تھا۔ اسے یہی چھوٹا سا گھر اچھا لگنے لگا تھا۔ پھر زاہدہ اس گھر میں داخل ہوئی تو اسی محدود سی چار دیواری میں کس قدر وسعت پیدا ہوگئی تھی! زندگی، شگفتگی اور ٹھہرے ہوئے چپے تلے سے رومان کی لہروں پہ تیرتی جا رہی تھی۔

اُسے وہ دن بھی یاد آیا جب اس کا ایک عزیز دوست اس کے پاس دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے ایک گاہک کو گولڈ فلیک کا پیکٹ ساڑھے آٹھ آنے میں دیا۔ یہ نو برس پہلے کا واقعہ تھا۔ گاہک چلا گیا تو دوست نے کہا تھا "نیک بخت! کیوں روزی کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہو۔ یہ سگریٹ آج چودہ آنے میں بک رہا ہے۔ ۔ ۔ بس سو منٹوں کے پیسے اور ..." اور دوست نے اسے ایسا ہنر سکھا دیا تھا کہ تمام سگریٹ، کنستروں اور بوریوں کے نیچے غائب ہوگئے۔ پھر چودہ آنے اور کچھ منٹ بعد ایک ایک پیکٹ نکلنے لگا۔ اس سے پہلے وہ پچاس ڈبیوں کا پیکٹ جس میں سے وہ بمشکل دو روپے منافع کماتا تھا۔ اب اسے پچیس کے بدلے پچیس روپے دینے لگا۔ اسی دوست نے اسے سفید چینی بلیک کرنے کا ہنر سکھا دیا تھا اور ڈپو سے بوگس کارڈوں پہ ایک روپیہ ایک آنے سیر خریدی ہوئی چینی دو روپے سیر بکنے لگی۔ چھوٹا سا گھر بڑا ہونے لگا۔ اور دکان چھوٹی نظر آنے لگی۔ ایک سال کے اندر اندر دکان غائب ہوگئی، زمین کے اندر چلی گئی، پھر زمین کے اندر ہی اندر کراچی تک جا پہنچی اور کراچی سے عرب تک! پھر حج کے لئے پاسپورٹ بنے۔

پہلے حج کے لئے وہ اکیلا گیا تھا؛ دو باقی دو حجوں میں اس کا سارا "کنبہ" ساتھ گیا تھا۔ کراچی کی ایک رسوا عورت اس کی "اہلیہ"، ایک اور اس کی "بیٹی" اور دو جرائم پیشہ لڑکے اس کے "بیٹے" بنے ــــ جعلی پاسپورٹوں پہ ان حجوں نے لاکھوں روپوں، ایک کار اور دو کوٹھوں کو جنم دیا۔ پھر حج کی ضرورت نہ رہی کیونکہ سمندر کے اُس پار زمین دوز ایجنسی قائم ہو چکی تھی اور دولت تیرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ زاہدہ زر و دولت کی بھول بھلیوں میں اپنے خاوند کو تلاش کرنے لگی لیکن خاوند اس سے دور ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آج کراچی تو کل واہگہ ہوتا۔ دوپہر گھر میں اور رات ـــــ اگر وہ کبھی کبھار بھولے بھٹکے رات گھر میں گزارتا بھی تو زاہدہ سے قریب ہوتے ہوئے بھی اُس سے بہت ہی دور رہتا۔ اس کی نظر میں زاہدہ ایک دو سالوں میں ہی پرانی ہو چکی تھی۔

زاہدہ نے شکوے کئے، روئی بھی۔ اُن دنوں کی معصوم اور بھولی بھالی محبت کے واسطے بھی دیئے جب وہ اسے دکان پر روٹی دینے جایا کرتی تھی اور دروازے میں کھڑی اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن وہ کوسوں دور نکل گیا تھا۔ نئے ماڈل کی کار کی رفتار بہت تیز تھی، اور دولت کا نشہ اس سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ زاہدہ آخر تھک ہار کر چپ ہوگئی اور اس انتظار میں گھر کے ایک کونے میں پھینکی ہوئی بیکار شے کی طرح بیٹھ گئی کہ اس کا خاوند ایک نہ ایک دن اُس کی دنیا میں واپس آجائے گا لیکن اسے بہت کم اُمید تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ابھرتے ہوئے محلات چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کو اجاڑ دیا کرتے ہیں۔ اُس نے کتنی ہی پاکدامن بیویاں دولت کے انباروں میں دفن ہوتے دیکھی تھیں اور ان انباروں میں سے نئی سے نئی بیویوں کو ابھرتے دیکھا تھا۔

وہ راوی کی طرف چلا جا رہا تھا اور گزرتے ہوئے وقت کے لمحات اس کے سر کے اوپر شہد کی بھڑکی ہوئی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ وہ سر جھکائے جا رہا تھا کہ لاشعوری طور پر اس کی گردن بائیں طرف گھوم گئی۔ اسے چھوٹا سا کوٹھی نما مکان نظر آیا۔ اس کے قدم ایک عادت کے تحت رکنے لگے۔ یہ رعنا کا گھر تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی نوجوان اور شوخ رعنا جس کا رشتہ اس کے بھائی اور ماں باپ اچھی قیمت پر دینا چاہتے تھے۔ اس نے اس کی خاطر آٹھ دس ہزار روپیہ لٹا دیا تھا اور ایک کار کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس کے بھائی اور ماں باپ کھاتے جا رہے تھے اور بھائی در پردہ کسی اور بڑے گاہک کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ رعنا بھی ان سودے بازیوں سے واقف تھی اور وہ اُسے خوب بنا رہی تھی۔۔

اُس نے اس گھر کو دیکھا تو غصے کا ایک شعلہ اس کے سارے جسم کو جلا گیا۔ اُس نے سوچا ۲۸ اکتوبر کے بعد حالات نے کیسا پلٹا کھایا ہے کہ چند روز ہوئے وہ رعنا کے ہاں اسے پکچر پہ لے جانے کے لئے گیا تو اس نے بے رُخی سے کہہ دیا "میری طبیعت خراب ہے" اور اس کے دونوں بھائیوں نے ایسی ہی بے رُخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ غصے میں ان پر برس پڑا تھا اور کہا تھا۔ "تم لوگ میرا آٹھ دس ہزار روپیہ کھا چکے ہو

اور تم نے اپنی بہن کا رشتہ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ میں چاہوں تو......"

جانے وہ کیا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رعنا کا بڑا بھائی، جو بلیک میلنگ میں ماہر تھا، نہایت احترام سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بول پڑا تھا۔ "حاجی صاحب! آپ کو تو خود علم ہونا چاہئے کہ آپ حاجی نہیں ہیں۔ آپ اسمگلر ہیں اور اب بھاگے ہوئے مجرم! کون جانے آپ کو کس وقت مارشل لاء والے پکڑ کے لے جائیں۔ سی آئی ڈی والے گھر کے بھی چکر کاٹ چکی ہے۔ فوجی کسی کو بخشیں گے نہیں۔ ہم اپنی بہن کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتے"۔ اور وہ باقی باتیں سنے بغیر وہاں سے لوٹ آیا تھا۔

اور آج؟ دولت گئی، رعنا ہاتھ سے گئی، زاہدہ کو الگ ناراض کیا۔ اب زاہدہ کی پاکیزہ دنیا میں واپس جائے تو کیسے؟ وہ دھتکار نہ دے۔ وہ یہ طعنہ نہ دے بیٹھے کہ تم تو دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ کہاں ہے وہ دوسری؟

اس کے قدم رک رہے تھے۔ اسے بہت کچھ یاد آیا اور وہ [illegible] قدموں کو گھسیٹتا ہوا تیز چل پڑا۔ رعنا کے مکان سے بہت دور [illegible] بہت جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کے بند دروازے کے عقب سے جیسے اس پر کسی نے فقرہ چست کر دیا تھا اور ایک طنزیہ قہقہہ۔ "حاجی صاحب! آؤ شادی کرو گے؟ دس ہزار لگیں گے۔ ہے کچھ پاس پیسے؟" وہ اور تیز چل پڑا۔

وہ راوی کے کنارے بیٹھ گیا۔ صبح کی سپیدی پھیلنے لگی تھی۔ پرندے گھونسلوں سے نکل کر دریا کے کنارے پانی پینے بیٹھ رہے تھے۔ اڑ رہے تھے۔ ماہی گیروں کی دو کشتیاں دور بہتی جا رہی تھیں۔ اس نے کنارے پر بیٹھ کر پاؤں پانی میں رکھ دیئے۔ اس کا انگ انگ جل رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کی خنکی اس کے دماغ تک پہنچ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانسیں لیں۔ چڑیوں کا ایک غول اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور گردوپیش کو نظر بھر کے دیکھا۔ ایک ایک چیز کو، قدرت کے ایک ایک رنگ کو۔ صبح کی سپیدی کو دیکھا شفق کی مسکراہٹ کو دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک انوکھا سا قرار اس کے پیاسے سینے میں سرایت کرنے لگا۔

فطرت کی یہ بارش اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ پانی کی روانی کو اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ سامنے دریا کے اس پار درختوں کے جھنڈ نکھرتے جا رہے تھے ستارے چینی کے ذروں کی طرح پگھل کر صبح کے نور میں تحلیل ہو گئے تھے۔ لہروں کا جل ترنگ اور پرندوں کی طرح طرح کی بولیاں ایک ہی راگ پہ منظم تھیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تھکے ہوئے ضمیر نے کرب آلود انگڑائی لی۔ اس کے جلتے ہوئے سینے سے آہ نکلی۔ ایک ہوک!

"اے صبح کے نور کے خالق! میں نے تین بار تیرے حبیب کی تربت کی بے ادبی کی ہے۔ میں نے تیرے نام پر قوم کو دھوکے دیئے ہیں۔ تو خدا ہے، میں بندہ ہوں۔ میں نے گناہ کئے۔ شاید اس لئے کہ ایک دن راہ پہ آ جاؤں گا اور تو بخش دے گا۔ میرے مالک! اپنی اس صبح کے نور کا ایک ذرہ میرے سینے میں سمو دے۔ صرف ایک ذرہ! میں بھٹک گیا ہوں۔ راہ دکھا دے۔"

ستاروں کا جھنڈ اس کے سر کے بہت اوپر سے چاند کی شکل میں اترتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال آیا جیسے اندھیرے میں ایک کرن۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اور حقائق کا جائزہ نئے سرے سے لینے لگا۔ اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ نئے قانون کی زد سے باہر تھا۔ کیونکہ پہلا مال فروخت ہو چکا تھا اور دوسرا مال واپس ہو چکا تھا۔ اس نے دریا کے کنارے کھڑے کھڑے طے کر لیا۔ "کار بیچ دوں گا۔ لاہور کی کوٹھی والا فرنیچر وغیرہ فروخت کر کے دونوں کوٹھیاں حکومت کے حوالے کر دوں گا۔ اور اچھا سا ایک مکان بنوا لوں گا جس میں زاہدہ نئی نویلی دلہن کی طرح آباد ہو گی۔"

وہ بہت تیزی سے واپس آ رہا تھا۔ ضمیر نے ایک جھٹکے سے سارا بوجھ راوی میں پھینک دیا تھا۔ جب وہ کوٹھی میں داخل ہوا تو سورج نکل رہا تھا۔ وہ بیش قیمت فرنیچر اور سامان زیبائش و آسائش سے آراستہ کمروں میں سے گزرتا ہوا سونے کے کمرے میں جا پہنچا۔ زاہدہ کو آواز دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

آج برسوں بعد اس کی آواز میں وہی چاہت اور وہی محبت تھی جو آٹھ نو برس پہلے تھی۔ زاہدہ نے اسی آواز کے انتظار میں یہ لمبے لمبے سال کوٹھی کے ایک کونے میں رو رو کر گزار دیئے تھے۔ وہ بھاگی ہوئی آئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس کے خاوند نے بلایا ہے۔ آج برسوں بعد اس کے منہ سے وہ اپنا نام سن رہی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو اس نے اسے اپنے پاس بلایا۔

زاہدہ ایک اجنبی کی طرح اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اُس نے اُسے اشارے سے پلنگ پہ بیٹھنے کو کہا وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ دریا سے واپس آتے وقت اس نے کتنی باتیں سوچی تھیں جو وہ زاہدہ سے کہے گا لیکن وہ سامنے آئی تو کوئی بات منہ سے نکل نہ سکی۔ اس نے زاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی پیشانی پہ رکھ دیا۔ اس ہاتھ کے لمس نے جیسے اس کے وجود کا سارا زہر چوس لیا۔ سینے میں باتوں کا طوفان امڈ آیا جسے وہ سنبھال نہ سکا۔ اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ صرف اسی قدر کہہ سکا۔ "زاہدہ" اس کے ہونٹ کانپ کے رہ گئے!

زاہدہ چند دنوں سے اس کی گھبراہٹ اور بے تابی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ وہ ساری بات بھانپ چکی تھی۔ وہ ملک کے عظیم انقلاب اور نئی حکومت کی سرگرمیوں سے آگاہ تھی اُس نے نادند کو خفت سے بچانے کے لئے کہا "آپ کہیں باہر چلے گئے تھے؟"

"ہاں" وہ بمشکل کہہ سکا۔ "ذرا راوی کی طرف سیر کو نکل گیا تھا۔"

"کس وقت؟"

"ابھی ابھی" اُس نے بلاوجہ جھوٹ بولا۔ "تھوڑی ہی دیر ہوئی۔"

زاہدہ کی باتوں اور انداز نے اسے سنبھالا دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھینپ گیا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"آپ کہتے ہیں آپ ابھی ابھی گئے تھے۔" زاہدہ نے پیار سے کہا۔ "صبح کی سیر اچھی ہوتی ہے۔ آپ اتنی جلدی واپس آ گئے۔ ذرا دیر اور......"

"ہاں زاہدہ!" اُس نے بے بس ہو کر زاہدہ کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے دکھ بھری آواز میں کہا۔ "میں واپس آ گیا ہوں۔"

اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔ جنہیں زاہدہ نے دوپٹے سے یوں پونچھ ڈالا جیسے خدا نے اس کے ضمیر سے گناہوں کی نمی پونچھ ڈالی ہو۔

★

"... رندوں کی ... " بقیہ صفحہ ۸۶

ظہیر :- ہاں زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہیں۔ میرے ہی ساتھ رہتی ہیں۔ تم سے مل کر یقیناً انہیں بے انتہا خوشی ہوگی۔ چلو، اٹھو ناں۔

صفیہ :- (اٹھتے ہوئے) چلو۔ (ظہیر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ دونوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ پھر ظہیر یک جاتا ہے)

ظہیر :- ارے! ہم نے ــ یعنی افضل صاحب؟

صفیہ :- (خشک لہجے میں) تم افضل کی فکر نہ کرو۔ وہ بالکل برا نہیں مانیں گے (طنزاً) بڑے فراخدل ہیں وہ (اشتیاق سے) ہم دادی سے مل لیں تو پھر تم ہمارے یہاں چلے چلنا۔ امی بیچاری کل ہی ناگپور ــــــ!

(باتیں کرتے ہوئے اسٹیج سے باہر چلے جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہونے کے چند لمحوں بعد افضل تیار ہو کر اسٹیج پر آتا ہے۔ اسٹیج خالی دیکھ کر خاصا پریشان لگتا ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر چیختا ہے)

افضل :- صفیہ؟ صفیہ؟ کہاں ہو بھئی تم دونوں؟

(پردہ اچانک گرتا ہے)

"فریاد کی لَے" بقیہ صفحہ ۹۶

سجاد کی انگلیاں ستار پہ چلنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا عروسِ بہار کی اجنبی نگاہ فریاد کی لَے کے ساتھ اٹھ رہی ہے۔ اس کے منہ سے نکلا "معلوم نہیں ستار کس کے لئے رو رہا ہے؟"

میرے تصور میں بیگم اشفاق اور علی فاروق کے چہرے خلط ملط ہو رہے تھے اور ان پر ثروت اور سجاد کے چہرے اپنے نقوش اجاگر کر رہے تھے۔

نیگرو لڑکی نے اٹھ کر کونے میں پڑی گرد دینا اٹھالی اور اسے رومال سے صاف کرنے لگی۔ پھر وہ بک شیلف کی کتابیں رومال سے صاف کرتے ہوئے انہیں سجا کر رکھتی چلی گئی۔ بار بار اس کی نگاہ سجاد کی طرف اٹھ جاتی تھی جن کے سر کے بال ثروت کے انتظار میں آدھے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے اور انگلیاں گرد سے اٹے ہوئے اس کمرے میں نغمے کے پھول کھلا رہی تھیں۔

فیچر

موت آتی ہے پر نہیں آتی

سعید احمد رفیق

نقلِ کفر کفر نباشد۔ مشہور مقولہ ہے "ایک دن مہمان" دوسرے دن مہمان تیسرے دن ---" سنا تو یہ آپ نے بھی ہوگا اور آپ کی طرح ہم نے بھی سن رکھا تھا۔ لیکن سوچتے تھے، مہمان کی یہ تعریف کیسے ہوسکتی ہے۔ یا وہ خدا نخواستہ "بے ایمان" کیسے بن سکتا ہے؛ دانے دانے پہ مہر ہوتی ہے' جو آتا ہے اپنی قسمت کا کھاتا ہے۔ کچھ دن رہتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ وہی بات کہ ؎

زندگی انساں کی ہے مانند مرغِ خوشنوا
آ کے بیٹھا شاخ پر کچھ چہچہایا، اڑ گیا!

ایک عرصہ بعد ملنے اور ساتھ رہنے سے جو خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ لیکن صاحب اب تو ہم بھی ایمان لے آئے کہ یہ مقولہ سو فیصدی صحیح ہے۔ بس ذرا سی تصحیح کی ضرورت ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ "ایک دن کا مہمان عذابِ جان۔ دوسرے دن کا بے ایمان اور تیسرے دن کا ---" لاحول ولا قوۃ۔

ہمارے ایک نامور ادیب دوستوں سے بڑے پریشان تھے اور ایک ادیبہ بچوں سے۔ لیکن یقین کیجئے اگر ان میں سے کسی کو بھی اس جنس سے واسطہ پڑ جاتا تو دوست اور بچے بسا غنیمت معلوم ہوتے --- بھلا دوست بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ "مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"۔ دوست کا کیا، کبھی آئے کبھی نہ آئے۔ اور آئے تو آ کر چلا جائے۔ نہ ہوئے مہمان جو آنا تو جانتے ہیں، جانا نہیں جانتے۔ اور رہے بچے۔ بچے تو خدا کی ایسی نعمت ہے جو ہو تو مصیبت اور نہ ہو تو ارمان۔ مگر بچے اور مہمان کا کیا مقابلہ؟ ایک کے جانے کا ڈر اور دوسرے کے تشریف لے جانے کی تمنا۔ ڈر تو کبھی کبھار سامنے آ ہی جاتا ہے۔ لیکن تمنا تو کبھی بھی پوری نہیں ہوتی وہ تمنا ہی کیا جو پوری ہو جائے، جو حسرت نہ بن جائے۔ اور وہ مہمان ہی کیا جو آ کر چلا جائے۔ نہ مہمان کو عقل آتی ہے کہ چلا جائے --- نہ ملک الموت کو کہ اس بلائے بے درماں کو لے جائے۔ اور بیچارہ میزبان کہ "موت آتی ہے پر نہیں آتی"۔

کوئٹہ کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ہل اسٹیشن کہلاتا ہے۔ ویسے تو یہاں ہلز یعنی پہاڑیاں بھی بہت سی ہیں، اور ایک اسٹیشن بھی ہے۔ لیکن ایک کو دوسری چیز سے کوئی واسطہ نہیں۔ پہاڑیاں الگ ہیں اور اسٹیشن الگ۔ بہرحال ہے کوئٹہ ہل اسٹیشن۔ ہو یا نہ ہو بہرحال کہلاتا ہی ہے۔ اور کیوں نہ کہلائے صرف تین چار مہینے تو دن میں زیادہ سے زیادہ چار۔ پانچ گھنٹے درجۂ حرارت تقریباً سو رہتا ہے۔ یہاں موسم گرما اکیلا نہیں آتا بلکہ اپنے ساتھ مہمان بھی لاتا ہے۔ خدا کی اس مخلوق کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ بعض مہمان خطرہ کی گھنٹی بجا کر آتے ہیں۔ دوست اور رشتہ دار اپنی تشریف آوری کی اطلاع تار سے دیتے ہیں اور اپنے دوستوں کی آمد کا مژدہ خط کے ذریعے سناتے ہیں۔ بعض حضرات تو اس قسم کے بیکار تکلفات کے بھی قائل نہیں۔ وہ اپنی آمد کی اطلاع دینے خود ہی تشریف لے آتے ہیں۔ آپ نہایت آرام سے گھر میں بیٹھے ہیں یا لیٹے ہیں، کھانا کھا رہے ہیں یا گھر والی سے گھرکیاں۔ وہ آپ سے ناراض ہیں یا آپ ان سے خوش۔ بہرحال بچوں کو گھرک رہے ہیں، مار رہے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کر ہی رہے ہیں کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور مہمان صاحب موجود! غالبؔ کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ جب موت کے لئے دن کا وقت معین ہے تو پھر رات کو نیند کیوں نہیں آتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں لاشعوری طور پر اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے

ہم سو رہے ہوں اور موت ہماری اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر چپکے سے آجائے۔ اور جب ہم بیدار ہوں تو معلوم ہو کہ ہم غائب۔ ہم تو مر بھی چکے۔ نہ معلوم موت کے بعد اس قسم کی باتیں سوچنے کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن مہمان کی آمد کے بعد تو سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور بڑی مشکل یہ ہے کہ موت کے لئے بقول غالب (دن) کا وقت معین ہے (اگر آپ کو غالب کے شعر کے معنی صحیح نہیں معلوم تو میرا کیا قصور؟ کسی اسکول ٹیچر سے پوچھ دیکھئے۔ وہ ایسی تشریح کرے گا کہ نہ آپ زندہ رہیں گے نہ موت آسکے گی۔ عالم برزخ اسے ہی تو کہتے ہیں نا) لیکن مہمان کے لئے وقت کی بھی کوئی قید نہیں۔

یہ وقت کا مسئلہ بھی بڑا عجیب ہے۔ ایک مرتبہ ہمیں فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا۔ اپنے خیال میں پڑھا اور خوب خوب پڑھا۔ فلسفہ کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ سمجھ میں آجائے۔ وہ فلسفہ ہی کیا جو سمجھ میں آجائے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ مادّہ اور ہیولیٰ کیا ہوتا ہے لیکن یہ زمان کا مسئلہ، یقین کیجئے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ زمانؔ مکاں، دوراں، لامتناہیت، قدیم، حادث، اور پھر فارابیؔ، غزالیؔ ہیگل، برگساں، اقبال اور آگے آیت! لیکن یہ مسئلہ اب حل ہوگیا ہے۔ مہمانوں کی آمد نے اس مسئلہ لاینحل کو اس طرح سمجھا دیا ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ مہمان کا جب جی چاہے آئے۔ اور اگر کبھی نہ جائے۔ بلکہ آنے کا سوال ہی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ وہ ازلی اور ابدی ہے موت صرف ایک مرتبہ آتی ہے۔ اور مہمان اس وقت تک آتے رہتے ہیں۔ جب تک موت نہیں آتی۔ نہیں صاحب وہ تو موت کے بعد بھی آتے ہیں۔ اور سنا ہے بہت آتے ہیں۔ خیر آتے رہیں، ہمیں کیا، کبھی تو انہیں بھی ...

مہمان خدا کی رحمت ہے۔ بے شک، بلکہ اس سے بھی ایک نقطہ زیادہ۔ قلیل آمدنی چھوٹا سا مکان، ماشا اللہ، کئی کئی بچے اور ایک سے ایک تمیزدار۔ ویسے تو بچے کبھی کبھار غلطی سے کہنا مان بھی جاتے ہیں۔ لیکن کوئی مہمان آیا اور بچوں کو پورا سوراج ملا۔ جانتے ہیں، اب کوئی کچھ کہہ تو سکتا نہیں۔ یہاں چڑھ وہاں چڑھ۔ یہ لے وہ پھینک۔ کشتی، مار پیٹ۔ آپ خاموش ہیں نہ کچھ کر سکتے ہیں نہ کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لال پیلی آنکھیں کئے بیٹھے ہیں، لیکن بیوقوف ہیں بچے جو آپ کی طرف دیکھیں۔ انہیں جو موقع ملا ہے اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ مہمان صاحب شروع میں دو چار دن تو بچوں سے کچھ لاڈ پیار کرتے ہیں اور جب بچے لاڈ پیار شروع کرتے ہیں تو گھبرانے لگتے ہیں۔ اب بھلا اس کا کیا علاج؟ ان سے پوچھئے آپ نے شروع ہی میں بچوں کو سر کیوں چڑھایا تھا کہ اب ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک صاحب تھے تو "فارغ البال"۔ نوکر پر بہت خفا ہوئے کہنے لگے تم بہت سر چڑھ گئے ہو۔ یہ حضرت تھے حقیقتاً سر چڑھے۔ (یقین کیجئے حضرت سعدیؔ کی نصیحت کا اس سے کوئی تعلق نہیں) صدمیت سے کہنے لگے "صاحب مجھے پھسانا تو نہیں ہے!" پھر تو یہ مہمان صاحب ایسے گئے، جیسے خود ان کے سر سے سینگ۔ اور اب تک تو ہم ان سے محفوظ ہیں۔ دیکھئے کب تک محفوظ رہتے ہیں اور وہ صاحب کب تشریف لاتے ہیں۔ خیر مجھے اس نوکر کا پتہ معلوم ہے۔ ذرا آنے تو دو انہیں۔

آپ کہیں گے یہ قلیل آمدنی کا کیا ذکر — دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ مہمان آتا ہے اپنی قسمت کا کھاتا ہے پھر بھلا کیا فکر، میں بھی قسمت کا قائل ہوں۔ قائل نہ ہوں تو کیا کروں، مجبوری کا نام صبر ہے۔ مہمان اپنی قسمت کا کھاتا ہے۔ اور دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ لیکن ان مہر شدہ دانوں تک رسائی اور انہیں اپنے گھر لانے میں جو خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے، نہ معلوم یہ ہماری قسمت میں کب اور کیوں لکھا گیا منکر نکیر اس کا حساب بھی رکھتے ہیں یا نہیں، اور صرف دانوں ہی پر تو مہر ہوتی ہوگی۔ یا باقی تمام چیزوں پر بھی۔ ہمیں تو خطوط وغیرہ کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ گھر کی کونسی ایسی چیز ہوتی ہے جو مہمان صاحب اپنے لئے وقف نہ کر لیں۔ بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ گھر اپنا گھر نہیں۔ یہاں کی کوئی چیز اپنی نہیں۔ ہر چیز پر قبضہ غاصبانہ کر لیا گیا ہے۔ نہ معلوم ان مہمانوں کو کتابوں اور رسالوں سے کیوں اتنا بیر ہوتا ہے۔ کبھی یہ کتاب اٹھاتے ہیں اور کبھی وہ رسالہ۔ تمام کتابوں اور رسالوں کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر اس پر ستم ظریفی کہ نئی نئی

تجاویز ... نے سلیم صاحب کا "تیر" دیکھا۔ ابن اکرم کا "مغرور" پڑھا۔ "چراغ" کتنا پیارا رسالہ ہے۔ اور "فلم ڈکٹیٹر" کیا کہنے ہیں اس کے۔ آپ بھی یہ کیا ... اور بیکار کتابیں اور رسالے پڑھتے ہیں جی چاہتا ہے ان حضرات پر تو ... نہیں، اپنا ہی سر پھوڑ لیں۔ نہ قلم کا پتہ نہ پیڈ کا۔ دوات پنسل غائب۔ ڈاک کی ... کا پتہ نہیں معلوم حضرت کو ... لئے لفافے اور ٹکٹ بھی ختم۔ غرض ایک مصیبت ... جیسے لوگ مہمان کہتے ہیں۔ خدا بچائے اس بلا سے بیچارے میزبان ... اور اگر وہ بھی نہ بچ سکے تو! ارے ایسے کفر کے کلمے زبان پر نہیں لاتے توبہ توبہ!

مہمان کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے کم خطرناک وہ ہیں، جو صرف سیر و تفریح کی غرض سے کوئٹہ آتے ہیں۔ بعض مرتبہ اکیلے ہوتے ہیں لیکن اکثر دوستوں کے ساتھ اور کبھی کبھار مع اہل و عیال۔ ان میں سب سے اچھی بات یہ ہوتی ہے کہ آ کر جانا نہیں بھول لیتے ہفتہ عشرہ تک ان پر سیر و تفریح کا دورہ پڑا رہتا ہے صبح ہوئی اور یہ گھر سے نکلے۔ اور رات کو پھر آن موجود! شروع میں ایک دو دن ہمراہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں اور پھر ناامید ہو کر کتابوں کے کیڑے کا خطاب دے کر جان بخشی کر دیتے ہیں۔ لیکن رات کو سیر سے واپس آنے کے بعد تمام دن کی روئیداد سنائیں گے اور داد کے متمنی ہوں گے نصیحتیں کرنا تو مہمان کا پیدائشی حق ہے، لیکن اس قسم کے مہمان زیادہ نصیحتیں نہیں کرتے۔ انہیں وقت ہی نہیں ملتا! جلد ہی چلے جاتے ہیں۔ گھر کو مسافر خانہ سمجھتے ہیں اور صرف رات کو قیام کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ مہمان ہوتے ہیں جو گرمی سے بچنے کے لئے وادیٔ شال میں پناہ لینے آتے ہیں اور صرف دو ایک مہینے قیام کرتے ہیں۔ یہ عموماً دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور صرف اس بنا پر مہمان بننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ "فی الحال ہوٹل میں انتظام نہیں ہو سکا" روزانہ کسی نہ کسی ہوٹل کا نام لے کر اطمینان دلاتے رہتے ہیں کہ کل اس میں کمرہ ضرور خالی ہو جائے گا۔ اور ہم ... لیکن وہ کل کبھی نہیں آتی۔ گرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ مہمان تشریف لے جاتے ہیں۔ چلتے ہوئے بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہیں، اور یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ سال ہوٹل میں قیام فرمائیں گے۔ اگلے سال پھر آتے ہیں۔ مہمان بن کر ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہماری قسمت میں وہی گردش لیل و نہار!

مہمان کی تیسری قسم بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو بیمار کہتے ہیں۔ کسی ڈاکٹر کے مشورے سے صحت کی تلاش میں کوئٹہ آتے ہیں۔ اور اس وقت تک قیام کرتے ہیں جب تک میزبان میں ذرا سی بھی سکت باقی رہتی ہے۔ اس کی موت کا انتظار غالباً اس لئے نہیں کرتے کہ آئندہ سال کہاں دوسرے میزبان کو تلاش کرتے پھریں گے اور بیکار پریشان ہوں گے۔ یہ آتے ہیں اور اس طرح آتے ہیں کہ تمام گھر کو ہسپتال بنا دیتے ہیں اور گھر والوں کو مریض! اور خدا کی شان خود ڈاکٹر بن بیٹھتے ہیں۔ یہ نہ کرو۔ وہ مت کرو۔ وہ نہ کرو۔ یہ مت کرو۔ یہ صرف نہ اور مت جانتے ہیں اور ہر وقت ان کی گردان کرتے رہتے ہیں نفی کی دنیا میں رہتے ہیں۔ نصیحتیں تو سب ہی مہمان کرتے ہیں لیکن اس قسم کے مہمان تو نصیحتوں کے سوا اور کچھ کرتے ہی نہیں ہر وقت نصیحتیں، ہر کسی کو نصیحتیں۔ اور پھر ہر موقع پر اپنی مثال "دیکھئے آپ رات کو اتنی دیر نہ پڑھا لکھا کیجئے۔ ورنہ میری طرح آپ کو بھی عینک لگانی پڑے گی"۔ اب ان حضرت کو کون بتلائے کہ پڑھ لکھ کون مسخرا رہا تھا۔ حساب لگا رہے تھے کہ اس مہینے گزر کس طرح ہو گی۔ "آپ کا یہ ثاقب تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ جالب بہت نٹ کھٹ ہے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھتا پڑھاتا کچھ نہیں۔ اور دیکھئے، آج پوچھ رہا تھا کب جائیں گے آپ؟" جی چاہا کہہ دو بچہ ہے، جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا، دل کی بات زبان پر آ گئی۔ لیکن اگر اتنی ہمت ہوتی تو پھر یہ مہمان آتے ہی کیوں؟ "آپ کی شہلا کا تلفظ بہت غلط ہے۔ ذرا خیال رکھئے"۔ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن ادھر بھی ہنسی - بلکہ ہنسی کا دورہ۔ اور بچے پوچھ رہے ہیں۔ "امی کیا بات ہوئی؟ ہنس کیوں رہی ہو اتنی؟" اب کیا بتائیں کہ ہنس نہیں رہے، اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ کاش ہماری قسمت بھی ایسی ہوتی کہ کسی کے مہمان بن سکتے!

اس مرتبہ ایک نئے قسم کے مہمان سے واسطہ پڑا۔ زندگی

میں بہت سی تمنائیں ہیں۔ بہرحال ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خدا اس قسم کے مہمان سے سابقہ نہ ڈالے! دوپہر کا وقت تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا۔ تو ایک صاحب عجیب و غریب حلیہ میں موجود، سر پر تنکوں کی ٹوپی، قمیص اور پاجامہ بوسیدہ، جوتے ندارد۔ "آپ نے مجھے پہچانا"۔ "معاف کیجئے نہیں"۔ "دیکھئے میں نے آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا"۔ "شکریہ" "تو کیا آپ مجھے حقیقتاً نہیں پہچانے؟" "میں صرف ضرورتاً جھوٹ بولتا ہوں۔ ہمیشہ نہیں"۔ "دیکھئے آپ سے بہاولپور میں ملاقات ہوئی تھی"۔ اور اس کے بعد انہوں نے رشتہ جو بتایا تو میں صرف اتنا سمجھا کہ اگر حضرت نوحؑ تک نہیں تو حضرت آدمؑ تک ہمارا ان کا شجرہ نسب ضرور مل جاتا ہوگا۔ اور پھر اس رشتہ پر "آپا" کی تصدیق چاہی۔ "آپا" ہم سے بھی زیادہ جاہل۔ لیکن صاحب وہ مہمان ہی کیا جو ٹل جائے۔ آئے اور اس طرح آئے کہ کپڑے اور جیب خرچ تک ہمارے ذمے! فرمانے لگے۔ "جیکب آباد کے اسٹیشن پر گاڑی تبدیل کرنی تھی (نہ معلوم کونسی گاڑی؟) گاڑی کے انتظار میں آنکھ لگ گئی۔ کھلی تو دیکھا کہ بستر اور سوٹ کیس سب غائب! بمشکل تمام یہاں پہنچا۔ بہاولپور بھائی کو بھی خط لکھ دیا ہے۔ جلد ہی وہاں سے منی آرڈر آجائے گا۔ بس دو ایک دن کی بات ہے"۔

لیکن یہ منی آرڈر نہ آنا تھا نہ آیا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے یہ حضرت شاعر بھی تھے۔ شعر کے معاملے میں میرا ذوق اس قدر بلند ہے کہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ تک کے اشعار بغیر تصحیح کے نہیں پڑھتا۔ اور پھر پڑھتا اس انداز سے ہوں کہ آپ کیا کوئی شخص بھی اس پر شعر ہونے کا گمان تک نہیں کر سکتا! میرے ایک دوست ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے استدعا کی تھی کہ خدا کے لئے میں شعر نہ پڑھا کروں۔ وگرنہ وہ خودکشی پر مجبور ہو جائیں گے! خون ناحق کا میں قائل نہیں۔ اس لئے اب شعر نہیں پڑھتا، صرف کہتا ہوں۔ ہاں تو یہ صاحب شاعر بھی تھے۔ اور سنانے کے مرض میں گرفتار۔ اور سناتے تھے گا گا کر۔ شاعری اور اس پر موسیقی۔ کسر لبس کی تعریف کی جانے۔ انشا کو تو عظیم بیگ سے صرف یہ شکایت تھی کہ۔ "بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے"۔ لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ۔ بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے۔ سنئے اور سر دھنئے۔ ان حضرت کا نہیں اپنا۔ ان کے صرف دو کام تھے! شعر سنانا اور (فضیحتیں) کرنا۔ نہیں صاحب ایک اور بھی کام تھا۔ منی آرڈر کا انتظار! اور چونکہ منی آرڈر ابھی نہ چکتا تھا، اس لئے تار بھیجنے کے لئے روپے بھی دینے پڑتے تھے۔ نجات کی صرف ایک صورت تھی۔ کہ کسی بہانے اسٹیشن پر لے جا کر بہاولپور کا ٹکٹ ان کے حوالے کیا جائے اور جب تک گاڑی روانہ نہ ہو جائے، پلیٹ فارم سے نہ ہٹا جائے۔ بہرحال خدا خدا کر کے وہ مہمان صاحب تشریف لے گئے۔ اس کے بعد کئی مرتبہ وہ مختلف سڑکوں پر نظر پڑے۔ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لیں میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

اب پھر گرمیاں آرہی ہیں۔ دیکھئے اس مرتبہ کیا گزرتی ہے۔ گزرنی کیا ہے، جب تک مہمان نہیں گزر جاتے ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہم پر کیا گزرے گی —

مرد ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر! +

ہڑپے کا کتبہ

مجید امجد

ہڑپے سے ، زمانہ قبل از تاریخ کے جو نوادر کھدائی میں دریافت ہوئے ہیں ان میں ایسے کتبے بھی ہیں جن پر رقم شدہ پُر اسرار تحریریں اور تصویریں آج تک پڑھی نہیں جا سکیں۔ حال ہی میں چند کوششیں جو اس بارے میں ہوئی ہیں ، ان کو قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ چند کتبوں پر بیلوں کی تصویریں ہیں جن کے معانی فکرِ شاعر پر یوں اجاگر ہوتے ہیں :

بہتی راوی! تیرے تٹ پر،
کھیت اور پھول اور پھل !
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کی چھل بل،
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی،
اک ہالی ، اک ہل !

سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان :
"مٹی کاٹے ، مٹی چاٹے ،
ہل کی انی کا مان !
آگ میں جلتا پنجر ۔ ہالی ۔ کاہے کو انسان !"

کوئی مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ !
ہل کو کھینچنے والے جنوروں ایسے اس کے لیکھ ،
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں ۔ تین بیل ہیں، دیکھ!

ؔ ہاری کا ماضی خواہ کچھ بھی رہا ہو، اس کا حال اور مستقبل "انقلاب نو" کی بدولت اتنا ہی درخشاں ہے جتنا اس کا ماضی تاریک تھا۔ (مدیر)

براق شاہیںؔ

شیر افضل جعفری

یہ شاہیں کلب کے پری چال کوتل
یہ جن پہ ہوں قربان غزلوں کے چھل بل
یہ براق خمرے ، یہ مصری کی ڈلیاں
یہ نقرے فرشتے ، یہ طوبےٰ کی پھلیاں
یہ سیماب زادے ، یہ لرزاں بتاشے
یہ گورے بچھیڑے ، یہ ابرق تراشے
یہ چمکیلے چمکیلے سلمہ ستارے
یہ جلووں کے ٹکڑے یہ بجلی کے پارے
یہ ناچیں تو موروں کو بھی رشک آئے
یہ ٹہلیں تو بادِ صبا خار کھائے
یہ دوڑیں تو دوڑ میں ہار جائے
یہ ابھریں تو قدموں تلے چاند آئے
یہ جوبن کی جھیلوں کے چوپائے گجلے
انہیں دیکھ کر ہوں سیلانے بھی پگلے
قطاروں کی جیسے ہو گوٹا کناری
حسیں ، بھاؤنی ، دلربا اور پیاری
یہ نخریلے ، گھڑ دوڑ میں دندنائیں
تو بانکے ہرن چوکڑی بھول جائیں
کبھی موج میں آ کے یہ ہنہنائیں
تو نیزے بھی ساتھ ان کے ملہار گائیں
خمیں گردنیں ، ریشمیں گائیاں ہیں
فدا ان پہ شیروں کی سلطانیاں ہیں

ؔ "شاہین حیدری کلب" سرگودھا میں حسین و تباق گھوڑوں کی انجمن ہے "براق شاہین" اسی کے سفید براق اور "شیر مست" نقروں کی طرف اشارہ ہے ۔ "شیر مست" وہ جانور ہوتا ہے جس نے ماں کا پورا دودھ پیا ہو) (مدیر)

غزل

ضمیر اظہر

ایسا بھی کوئی دل ہے کہ قیدِ الم نہیں
اِس دامِ رنگ رنگ سے امکانِ رم نہیں

جلتا ہے سارا جسم تفکر کی آنچ سے
سوزِ حیات سوزِ محبت سے کم نہیں

قُربِ ستم سے یوں ہوئے سارے ستم عزیز
میرے لئے جہاں میں کوئی اب ستم نہیں

امید و یاس و بیم کی منزل عجیب ہے
رُکنے کی تاب ہی نہیں چلنے کا دم نہیں

آسان ہیں ابھی مری گنجان مشکلیں
ان گیسوؤں کے ان میں ابھی پیچ و خم نہیں

یوں کھو گئے غبار میں چُپ چاپ کارواں
جیسے کہ ان کا کوئی بھی نقشِ قدم نہیں

راضی رضائے یار پہ ہر حال میں ہیں ہم
اک گونہ بیخودی ہے غمِ عیش و غم نہیں

اظہر حیات و موت کا رشتہ عجیب ہے
اب تک یہ ایک راز ہے ہم ہیں کہ ہم نہیں

قمر جمیل

طائرِ جاں کی خبر لاتی ہے
کوئی آواز اگر آتی ہے

جانے کس سمت ہوا کی زنجیر
کھینچ کر مجھکو لئے جاتی ہے

قالبِ جاں میں زمانے کی بہار
آئینہ دیکھ کے شرماتی ہے

شام ہوتی ہے تو پھر کاہشِ جاں
رات کے روپ میں لہراتی ہے

کیسا عالم ہے کہ تنہائی بھی
در و دیوار سے ٹکراتی ہے

کائنات اپنے خدا کے مانند
ایک ذرے میں سمٹ آتی ہے

ہمنشیں میرے قریب اور نہ آ
یہ کلی سائے سے کمھلاتی ہے

کبھی ہم پر بھی جمیل آئی تھی
وہ قیامت جو گذر جاتی ہے

غزل

احمد ظفر

چاند نے مجھ سے چپکے چپکے کچھ تو کہا ہے
رات نے جیسے پیار سے تیرا نام لیا ہے

تو اک بھولی بسری بات ہے اس دنیا میں
وقت نے جانے مجھ سے کیا کیا چھین لیا ہے

جب بھی تیرے درد نے دل میں کروٹ لی ہے
ہم نے سمجھا شاید کوئی پھول کھلا ہے

پہلے چپ کی آگ میں دل نے جلنا سیکھا
اب جو بات کروں تو میرا دل جلتا ہے

سنگ اٹھاتے ہیں کیوں مجھ پر دنیا والے
میرا دل تو جنبشِ لب سے ٹوٹ گیا ہے

میرا اندھا پن بھی میرے کام نہ آیا
دل کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھ لیا ہے

میرے زخم تو رفتہ رفتہ بھر جائیں گے
تیری سوچ کو جانے کیا اندازہ ہے

دل کو ظفر یہ کس کی آہٹ سی آئی ہے
ویرانے میں جیسے کوئی ساز چھڑا ہے

شیدا گجراتی

گلوں کے لب پہ تبسم کا نام بھی تو نہیں
بھرے چمن میں کوئی خوش خرام بھی تو نہیں

کسے خبر کہ دلِ مضطرب پہ کیا گزری
نگاہِ دوست کا مفہوم عام بھی تو نہیں

نئے جہاں کے تقاضے نئے سہی لیکن
برائے دل کوئی تازہ پیام بھی تو نہیں

ہم اپنی تشنگیٔ بیکراں کہاں لے جائیں
بقدرِ شوق و طلب اہتمام بھی تو نہیں

حدیثِ درد کہیں بھی تو کیا کہیں ان سے
بہت دنوں سے پیام و سلام بھی تو نہیں

بہ ایں خلوصِ دل و جاں، بہ ایں جنونِ وفا
پیامِ شوق، طرب کا پیام بھی تو نہیں

بقدرِ لذتِ سوز و گداز دل کے لئے
متاعِ درد متاعِ دوام بھی تو نہیں

حیات محرمِ اسرارِ عشق کیا ہو گی
دل و نگاہ میں وہ ربطِ تام بھی تو نہیں

جنوں شریکِ غمِ کائنات ہے شیدا
خرد حریفِ غمِ صبح و شام بھی تو نہیں

غزل

مشتاق مبارک

وہ بیقرار نہیں جلوۂ قمر کے لئے
ترس رہے تھے جو رعنائی سحر کے لئے

نہ زلفِ شام نہ رنگینیٔ سحر کے لئے
تڑپ رہا ہوں ترے حسنِ معتبر کے لئے

بہ فیضِ عشق ہوں اب اس مقام پہ کہ جہاں
قدم قدم پہ ہیں رنگینیاں نظر کے لئے

دل و نگاہ نے کیا کیا فریب کھائے ہیں
رہِ حیات میں اک خضرِ دیدہ ور کے لئے

دو پیچ و خم بھی ہمارا نصیب ہو کے رہے
جو وقف تھے کبھی اس زلفِ منتشر کے لئے

خود اپنی ذات کا عرفاں نہ ہو سکا اس کو
تڑپ رہا ہے جو تسخیرِ بحر و بر کے لئے

ہر ایک منظرِ بزمِ جہاں ہے خوب مگر
خلش ہے دل میں بدستور خوب تر کے لئے

نہ جانے دیدہ و دل فرشِ راہ ہیں کب سے
کسی کی ایک نظر، صرف اک نظر کے لئے

یہ التفات کہ ہر چند مختصر ہی سہی
یہ التفات بھی کافی ہے عمر بھر کے لئے

تو اپنے دل کی بصیرت کو رائیگاں نہ سمجھ
یہی تو آئینہ ہے فرقِ خیر و شر کے لئے

ہماری لغزشِ پا کس قدر مبارک ہے
کہ راہ ہو گئی آسان راہبر کے لئے

جگن ناتھ آزاد

باغباں کا شکوہ اب کیا کریں زمانے سے
ہم کہ خود نکل آئے اپنے آشیانے سے

کس طرح بیاں ہو گی حالِ دل سُنانے سے
جو گزر گئی دل پر تیرے مسکرانے سے

حیف اُس مسافر پہ جس کو یہ نہیں معلوم
کس نے اُس کو لوٹا ہے اور کس بہانے سے

یہ تو ناصحِ مشفق آگ ہے محبت کی
یہ تو اور بھڑکے گی اس طرح بجھانے سے

قطعہ

وقت کے تقاضے سے ہم چمن کے شیدائی
آشیاں کو چھوڑ آئے گرچہ اک زمانے سے
مانگتا ہے دل اب تک خیر آشیانے کی
اتنا ربط ہے باقی دل کو آشیانے سے

★

فن:

دورِ انقلاب کا مرقع نگار - صادقین

حق نواز حیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ دورِ انقلاب کی فضا ادب و فن کیلئے بہت خوشگوار ثابت ہوئی ہے۔ وہ گھٹا گھٹا ماحول جس نے ہم سب کے اعصاب اور دل و دماغ پر بڑا بھاری بوجھ ڈال رکھا تھا، ایسے اٹھا ہے کہ ہمیں اپنے جسم و جاں میں یکایک فرحت بخش تازگی کا احساس ہوتا ہے جیسے یک بیک کتنے ہی روزن کھل گئے ہوں اور ان کے ذریعہ دل و جاں کو بشاشت بخشنے والی ہوا اور پیاری پیاری سہانی کرنیں شادمانی کا پیغام لائی ہوں اور ہماری رگ رگ اور ریشے ریشے میں رس بس گئی ہو۔

یہ کیف زا احساس ایک دو لوگوں تک ہی محدود نہیں بلکہ سب میں علی العموم نظر آتا ہے۔ اور اہلِ قلم، ادیبوں، فنکاروں کا تو کہنا ہی کیا، یہ تو عام انسانوں سے کہیں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ شدت سے گرد و پیش کی فضا میں خفیف سی خفیف تبدیلی کو بھی آناً فاناً محسوس کر لیتے ہیں اور اس کی طرف شدت و تیزی کے ساتھ ردِ عمل بھی کرتے ہیں۔

جب ماحول میں گھٹن ہی گھٹن ہو تو طبیعتوں میں ترنگ کیسے پیدا ہو اور ذہن کیسے کشادہ ہوں! یہی حادثہ تو تھا جس سے پہلے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس" مدتوں دو چار رہے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے فیضان کے سوتے بند ہو گئے۔ اہلِ فن اپنے اپنے گوشۂ خلوت میں گم ہو گئے اور انہوں نے اپنے ارد گرد کی دنیا سے بہت کم سروکار رکھا۔ آخر ان کے لئے اس بیرونی دنیا میں ایسی کشش ہی کیا تھی کہ وہ اس کی طرف خوشی سے اعتنا کرتے اور کوئی فنکار اپنا قلم یا مصور اپنا موقلم ہاتھ میں لے کر زندگی کے کسی اہم واقعہ یا کسی مایۂ ناز ہستی کی تصویر کھینچتا؟

لیکن جونہی دورِ انقلاب طلوع ہوا، ساری قوم کے ساتھ اہلِ فن کی دنیا بھی بدل گئی اور یہ کیفیت ہو گئی کہ

پھر بہار آئی قفس کا در کھلا

اس نئی بہار کی دل خوش کن فضا میں سب اپنے ماحول میں دلچسپی لینے لگے۔ فنکاروں نے بھی محسوس کیا کہ:

خلوت کی گھڑی گذری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے دامان سحاب آخر

اور فی الحقیقت بجلی سے دامانِ سحاب چھوٹ گیا۔ اہلِ فن نے دورِ انقلاب کی عکاسی میں دلچسپی لینا شروع کی اور ایک جواں سال مصور صادقین نے تو بڑے وسیع کینواس پر اس کے بعض اہم پہلوؤں کو رنگ و روغن کے روپ میں پیش کیا اور اس اہتمام سے کہ ان پر حقیقت کی بجائے شوخ و رنگین خوابوں کا گمان ہو۔ اس کامیابی کا سہرا جہاں مصور کے سر ہے وہاں دورِ انقلاب کی کارفرمائیوں کو بھی کچھ کم دخل نہیں جو فنکار کے ذوق و شوق کے لئے تازیانہ ثابت ہوئیں۔ اور ایک صادقین ہی نہیں کتنے ہی باکمال اور بھی ہیں — مصور، مغنی، اداکار — جو اپنے اپنے طور پر نئی فضا سے متاثر ہو کر فن کی دنیا میں ایک نئی ہماہمی، ایک نئی ہلچل پیدا کر رہے ہیں۔ اسقدر کہ پچھلے دنوں جو آرٹ سنٹر کراچی میں قائم کیا گیا تھا، اس کی عمارت ابھی سے

دامانِ نظر تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

کی مصداق معلوم ہوتی ہے۔

صادقین کوئی ایسا مصور نہیں جس نے ابھی ابھی سر ابھارا ہو۔ وہ ایک مدت سے مصوری کر رہا ہے اور اپنے ہم چشموں میں کافی امتیاز حاصل کر چکا ہے۔ دیکھنے میں شاید اس تیس سالہ نوجوان

میں کوئی بڑی بات نظر نہ آتے۔ ایک چھوٹے قد کا دھان پان، چپ چاپ، سیدھا سادا شخص، شاید آپ اسے لڑکا ہی خیال کریں، لیکن اس کی مصوری جیسے مشکل فن میں مہارت اتنی ہی زیادہ ہے، اور پھر اس کا دوسروں سے مختلف اپنا ہی ایک انداز ہے جو خاصا نمایاں اور دلکش بھی ہے۔ وہ جس شوریدہ مستی سے اپنے کام میں منہمک ہوتا ہے، وہ اس کے قد و قامت اور مریضانہ وضع کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز ہے۔ اسے فن کے ساتھ وہی لگن ہے جو ایک حساس اور پرخلوص فن کار کو ہونی چاہیے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ بعض مشاہیر کی طرح جنہیں قدرت نے عمدہ صحت سے محروم رکھا تھا، عمر گریزپا کے احساس نے اسے اور بھی اہمیت کے ساتھ سرگرم کار کر دیا ہو۔ بہر حال یہ محض قیاسات ہیں۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس نوعمر نقاش نے تھوڑی ہی مدت میں ایسی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے جن کی توقع بالعموم زیادہ پختہ عمر کے ارباب فن سے کی جاتی ہے۔ اس نے آرٹ کے ایسے متنوع اور اہم نمونے پیش کئے ہیں جو پاکستانی مصوروں کی تخلیقات میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اچھی شراب مدتوں میں جاکر تیز ہوتی ہے — اسی طرح اچھا فن کار بھی برسوں کے ریاض کے بعد فنی اور تکنیکی مہارت پیدا کرتا ہے اور صادقین کو ابھی عمر کی کتنی بہاریں دیکھنا نصیب ہوئی ہیں کہ اس سے غیر معمولی مشاقی کی توقع کی جا سکے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ اس اعتبار سے جو بھی کمی ہو اسے یہ ہونہار مصور اپنے ذوق و شوق، اپنے والہانہ پن سے پورا کر لیتا ہے۔ اور یوں فن کے تقاضے بڑی حد تک پورے ہو جاتے ہیں۔

صادقین ایک بہت تیز مصور ہے۔ جس قدر زود قلم، جتنی تیزی سے اس کا ذہن سوچتا ہے اتنی ہی تیزی سے وہ نقوش پر نقوش بنائے جاتا ہے۔ اور ہم اس کی تیز دستی سے حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسے تصویریں بنانے میں زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کا موقلم ہوا کی طرح سبک ہے اور اسی کی طرح سبک سیر بھی۔ چند تیز تیز جنبشیں اور نقش تکمیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور سال سوا سال سے تو جیسے دور انقلاب نے اس کے جسم ناتواں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ وہ دھڑا دھڑ تصویریں کھینچے چلا جاتا ہے جن سے ابھی نہیں کئی نگار خانے آراستہ ہو سکیں۔

اگر دور انقلاب کے کارناموں میں ایک یہ بھی شمار کیا جائے کہ اس نے اس شوخ فکر و تیز دست نقاش کو اس کے بعض کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے کی تحریک دلائی تو بے جا نہیں۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ انقلاب اپنے جلو میں کیا کچھ لایا ہے، اور ملک و ملت اس باب میں افواج پاکستان کے کس قدر ممنون ہیں تو یہ کچھ محل تعجب بھی نہیں۔ درحقیقت یہ ساری قوم کا جذبۂ تشکر ہی ہے جس نے اس کے ایک حساس فرد کے تاثرات کی راہ سے ان نقوش میں راہ پائی ہے۔ جن کا اس کے دیگر نقوش کے برعکس یہاں خصوصیت سے ذکر لازم ہے۔ کیونکہ صدر پاکستان کا انتخاب افواج پاکستان کے حسن کارکردگی اور مقبولیت پر پوری طرح مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔

ان نقوش کی نوعیت دو وجہ سے منفرد ہے۔ اول ان میں حسن کا فقدان نہیں۔ اسی لئے یہ مصور کی شوخیٔ تحریر یا اپنی ایذا رسانی کے فریادی بھی نہیں۔ نقاش نے ان میں سے دو کے لئے ٹھوس گتے کی دیوار نما زمین تلاش کی ہے۔ اس لئے ان کا کینوس بھی بہت وسیع ہے اور یہ ناظر کے دیدہ و دل پر اتنا ہی کشادہ اثر بھی مرتب کرتے ہیں۔ دوسرے ان میں کچھ نئے طریقے برتے گئے ہیں۔ جن سے نقاش کی اپج ظاہر ہوتی ہے اور وہ اعجاز فکر بھی جو فن کار کو نادر حالات میں نادر تدابیر اختیار کرنے کی تحریک دلاتا ہے۔ جہاں تک زیر بحث نقوش کا تعلق ہے فن کاری کی بدولت الا اسلوبی کے ساتھ ہی ساتھ ایجاد کی ندرت بھی نمایاں ہے۔

دور انقلاب سے پہلے ناجائز درآمد برآمد نے ہماری قومی زندگی میں کیا کچھ آشوب و ابتری پیدا نہیں کی۔ اس لئے انقلابی حکومت کا ایک مہتم بالشان کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے اس فتنۂ عظیم کا سر کچل دیا۔ مصور کے ذہن نے اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح اس کارنامے کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ صادقین نے ماتکانچ (کراچی) کی "سنٹرل ایکسائز اینڈ لینڈ کسٹمز کلب" کے لئے ایک داستانی یا ڈرامائی قسم کی تصویر تیار کی ہے جس میں انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کی صورت حال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بعض حلقوں میں ناجائز درآمد برآمد کرنے والوں کو "قاپوچی" کہتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں یہ نام اس نقش کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے۔

دراصل "اسمگلر" کی تصویریاں متعدد قلمکاریوں میں سے ایک ہے

مزار حضرت سید احمد شہید رح

مزار حضرت سید شاہ اسماعیل شہید رح (دہ

پرانی بستی

مسجد : (حضرت سید احمد شہید رح کا فوجی مستقر)

مشہد بالا کوٹ

برصغیر میں اسلامی نشاۃالثانیہ کے مفکر
و مجاہد شاہ اسماعیل شہید رح (دہلوی)
ور حضرت سید احمد شہید رح (رائے بریلوی)
کے مزارات
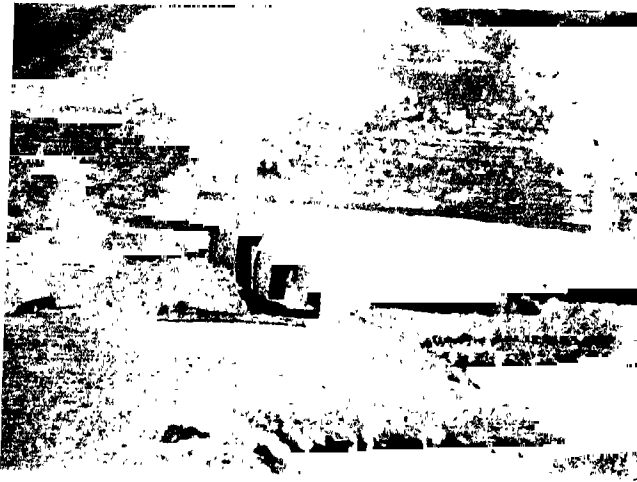
دریائے کنہار (جو بالا کوٹ کے وسط سے گذرتا ھے)

دیہی تعمیر و ترقی

۱— گھریلو صنعتوں کے گر

۲— تعلیم کا بڑھتا ہوا شوق

۳— اپنے گاؤں میں صفائی کا کام

۴— اچھی شہریت کا آغاز

جو صادقین نے مذکورہ کلب کے لئے تیار کی ہیں۔ اور اس کے وسیع و عریض اور نہایت خوبصورتی سے آراستہ ہال کی زینت ہیں۔ یہ تصویر مذکورہ محکمہ کی کارگزاریوں کو نہایت موثر و برجستہ پیرایہ میں پیش کرتی ہے۔ دائیں ہاتھ، عرض کی طرف، کشادہ دیوار پر ۱۰۔ ۲۰ فٹ لمبا، سات آٹھ فٹ چوڑا نقش ہے۔ اور جب وہ اپنی چادر اٹھاتی جاتی ہے جو اس کو گرد و غبار سے بچاتی ہے تو ناجائز درآمد برآمد کرنے والوں کی کارستانیوں سے پردہ اٹھتا ہے۔ اور تجریدیت، تمثیل اور رنگ و روشنی کی زبان میں جیسے ہم کچھ توفی الفور ہی سمجھ جاتے ہیں اور کچھ کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے ہیں، سماج دشمن انسانوں کی "زیرِ زمین" کارروائیوں کا کچا چٹھا بھی سامنے آ جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں بعدہٗ پہلے مانس شہریوں کی آسودہ اور خوشحال زندگی بھی سامنے آ جاتی ہے۔ یہ تصویر بھی مرکب ہے، مفرد نہیں۔ کئی الگ کڑیوں کا سلسلہ جس کے متعلق یہاں چند جستہ جستہ اشارے ہی کئے جا سکتے ہیں۔

درمیانی حصہ یا نقش میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطنت کس طرح کھل کھیل رہی ہے۔ اسمگلر کا کالا پیسہ کس طرح برے کاموں پر ضائع جاتا ہے۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت! اس کے پیچھے شیطانوں کی بھیڑ دوڑ رہی نظر آتی ہے۔ جن کے سروں پر سینگ ہی سینگ ہیں۔ کالے بھجنگے دیو ایک کے پیچھے دوسرا، جو انسان کو برائی پر اکساتے ہیں۔ ناجائز طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت۔ نوٹ کے نوٹ ہاتھ بڑھا کر کسی عصمت فروش عورت کو پیش کئے جا رہے ہیں۔ نیچے تاش کے بکھرے ہوئے پتے بتا رہے ہیں کہ یہ ٹھکانہ جوا بازی کا اڈہ ہے۔ اوپر سے شاید کوئی انسان کی خطاؤں اور لغزشوں پر رحم کھانے والی شفیق ہستی برائی کے اس افسوسناک منظر کو دیکھ رہی ہے۔ تجریدی آرٹ سے انسانی شکلوں اور لباسوں کا اشتباہ پیدا کرنے میں بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے۔ اور ذہن کبھی ایک ترتیب پیدا کرتا ہے کبھی دوسری۔ پرے، دروازے کے پاس ملت کے نگہبان فوجی اور غلہ اکسائز و کسٹم کے ارکان بھی دکھائی دیتے ہیں جو ایسے قوم دشمن لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں۔ دائیں پہلو میں غالباً ایک اچھے شہری اور اس کے کنبے کی تصویر ہے جو محنت و مشقت اور حلال کی کمائی پر تنگی ترشی سے گزر اوقات کرتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں سکون و اطمینان کا دور دورہ ہے۔ صحن میں کبوتر دانہ چگ رہے ہیں، بچہ کھیل رہا ہے، لڑکی ہاتھ میں سیب لئے ہوئے ہے۔ اور اس طرح کی مطمئن فضا دوسری اشکال سے بھی جھلکتی ہے۔

دوسرے نقوش کی نوعیت اور بھی مختلف ہے۔ ان میں سے ایک "تشلا ڈیم پروجکٹ" کے لئے تشلا (مغربی پاکستان) میں بنایا گیا ہے۔ دیکھتے ہی ایک انوکھے رقص کا منظر دل و نظر پر چھا جاتا ہے۔ اور ہم خود بخود ترقی کا احساس کرنے لگ جاتے ہیں جس سے اس کو موسوم کیا گیا ہے۔

تیسرا نقش۔ اگر اسے نقش کہا جا سکے کیونکہ "ترقی" کی طرح اس میں بھی تراش خراش کی تکنیک برتی گئی ہے جس کی میں ابھی تشریح کروں گا، "مرو منز کلب کراچی" کے لئے اس کے دار المطالعہ میں تیار کیا گیا ہے۔ وہ طلسمی سے گھوڑے اور ان کے سوار، ان کے آگے بڑھنے کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ یہ لوگ حدیث شریف "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کے مصداق چار دانگ عالم میں تلاشِ علم کے لئے رواں دواں ہیں۔ اور ان کی یہ تلاش ایک تلاش جاودانی ہے۔ گھوڑوں کے پاؤں اٹھانے کا طمطراق آمیز انداز ہی بتلائے دیتا ہے کہ وہ ہو بہو "تیز ترک گام زن" کی روح سے سرشار ہیں۔

شاید اس ضمن میں مذکورہ حدیث کا حوالہ محض ایک فقرہ یا زیبِ داستان معلوم ہو لیکن غور کرنے پر اس کے کچھ وسیع تر قرائن بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مصور محض مشرقی ہی نہیں بلکہ اس کا ذہن اسلامی روایات میں رچا ہوا ہے۔ جیسے تجریدی آرٹ کی شکل میں چغتائی کی روح سرایت کر گئی ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا تخیلی اور علامتی انداز بھی۔

تلاش کا تصور رہبری، با ساز و یراق، نیزہ بردار شہسواروں اور ان کے طلسمی حقیقی ہوائی گھوڑوں سے ظاہر کیا گیا ہے جیسے ان میں کچھ کچھ براق کی شانِ پرواز ہو۔ لہٰذا تلاشِ علم محض مجازی و دنیاوی علم ہی کی تلاش نہیں بلکہ ماورائی علم کی تلاش بھی ہے۔ جیسے یہ صوفیائے کرام کی "طلب" ہو یعنی جامع ترین علم و عرفان اور الٰہیت کی تلاش۔ (منزل ما کبریاست) گھوڑوں کے آگے ہاتھ بڑھا کر اٹھائی ہوئی بڑی کعب قسم کی کتاب ہے۔ آپ اسے کتابِ علم کہہ لیجئے یا قرآن مجید

کیونکہ اس میں معارف کونین پنہاں ہیں اور اسی کی روشنی میں انسان کی تلاش علم جدید عہد بہ عہد اور دور بہ دور آگے بڑھتی ہے۔ اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آسمان کی بلندیوں پر کوئی شے جو تمثیلی شکل کلید پیش کرتی ہے۔ یہ شاید آسمان کی کلید ہے یا تمام علوم و اسرار کی۔ اس کی ہر طرح توجیہ کی جا سکتی ہے۔

اس اہتمام کے ساتھ کچھ عجب نہیں کہ یہ شہسوار کوئی معمولی شہسوار نہ ہوں بلکہ ادبیات قدیم کے مرغوب پیرایۂ بیان میں "غازیان بیشۂ حکمت" اور "مجاہدین بادیۂ عرفان" ہوں۔ جو ذوق جہاد میں "جملہ قلعہ افلاک یا اسرار پر حملہ کناں ہوں"۔ ایسے شہسوار عرصۂ شہود و وجود جو مکاں سے گذر کر لامکاں کی حدود تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہوں۔ ان کی غازیانہ شان ان کے تیر کشادہ دست کے علاوہ مضبوطی و اولوالعزمی سے تولے ہوئے نیزوں سے بھی ظاہر ہے۔ تصویر سکونی نہیں، حرکی ہے۔ ایک مسلسل حرکت کی آئینہ دار۔ اس تلاش مسلسل میں انسان کو ہر لمحہ ہوشیار و متحرک رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے تیر ولے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اب چھوٹے کہ چھوٹے اور انہوں نے اپنے صید کو جا لیا۔ کیسا صید؟ یہ نہ تصویر میں واضح ہے اور نہ ایسا ہونا ہی چاہیئے۔ کیونکہ عشق کی طرح علم کی کوئی انتہا یا کائنات کا راز تو ہمیشہ راز ہی رہے گا اور انسان اس کی تلاش میں سرگرم — براؤننگ اور اقبال کے تصور کے مطابق — تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے۔ اس لئے تیر و سناں، دونوں ہتھیاروں کا رخ ایک پُر اسرار شخصیت کی طرف نظر آتا ہے جو کہیں دھندلکوں میں روپوش ہے۔ اس گوشہ میں جہاں کلید زرکسی مرغ ہوائی کے پنجہ میں نظر آتی ہے۔ یہ کلید کا تصور بھی قدامت کا طلسمی انداز لئے ہوئے ہے کیونکہ اس کا تذکرہ مشرق و مغرب کی داستانی داستانوں میں بار بار نظر آتا ہے۔ اور رمزی اہمیت رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ رہرو راہ طلب کی جد و جہد کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایک مقام طے ہوا تو اس کی جگہ دوسرا موجود ہے۔ ایک حریف پنجہ فگن زیر ہوا تو اس کی جگہ دوسرا تیار ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہی وجہ ہے کہ دور دراز کونے میں ایک فاختہ کا نقش دکھائی دیتا ہے۔ جو سکون کی علامت ہے فرض کیجئے علم کی راہ میں پیادہ یا سوار، پرواز کرنے والا انسان کسی وقت چاند تک پہنچ جائے۔ پھر بھی اس کا سفر ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ "ان ستاروں کے پرے اور بھی دنیائیں ہیں" نامعلوم، اور انہیں کی طرف انسان کی سعی تلاش رہتی ہے۔ تصویر میں پرواز کرنے والوں کو چاند سے گذرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کیونکہ انسان اسپوتنک کے ذریعہ چاند تک پہنچ چکا ہے اور یوں اس نقش کی تاریخ بھی متعین ہو جاتی ہے۔ گویا شیلے کے الفاظ میں مصور کو پورا پورا "ساحرانہ شعور" حاصل ہے اور اس نے قدیم روایات اور جدید حقائق و مشاہدات کو آپس میں آمیز کر کے ایک خالصتہً جدید شاہکار تخلیق کیا ہے۔ مرجانہ نقش ابھی دور ہی کی پیداوار ہے۔ اور بالکل دائیں طرف جو اشمی وضع کا ڈیزائن ہے وہ اس کی مزید تصدیق کرتا ہے۔ جیسے یہ ایک یادگار تاریخی مہر ہے۔ اللہ دہ مشعل جو پہلے سوار نے دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر اٹھائی ہوئی ہے، تلاش کی نوعیت اور خود ذوق تلاش پر روشنی ڈالتی ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ ۔۔۔ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ کی مفصل تشریح۔

ان امور سے فکر و خیال کے دیگر متلازم سلسلے خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے حکیم ملت علامہ اقبالؒ نے زمان کے متعلق کیا کچھ کہا ہے۔ لاتسبوا الدھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی حدیث مشہور ہے۔ کیونکہ اسلامی تصور کے مطابق خدا خود دھر ہے۔ اسی تصور سے کام لیتے ہوئے گھوڑوں کے چہرے گھڑیال جیسے بنائے گئے ہیں۔ اور "مسلسل حرکت زماں" کا تصور پیش کرتے ہیں۔ اور انسان خود کیا ہے؟ "شہسوار اشہب دوراں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصور کا کیا اسلامی کے ساتھ ہی تخیلات اقبال میں کسقدر گہرا ڈوبا ہوا ہے۔

کبھی کبھی فن کاروں کی ذہنی پرواز حیرت انگیز طور پر ایک ہی مقام پر جا نکلتی ہے۔ ڈاکٹر خالد کی نظم "راہ دیکھی نہیں" ہو بہو اسی تصویر کا لفظی روپ معلوم ہوتی ہے یا پھر نادرین کا نقش اس نظم کا تصویری روپ:

"راہ دیکھی نہیں اور دور ہے منزل میری
کوئی ساتھی نہیں، میں ہوں مری تنہائی ہے
دیکھتی ہے مجھے حیرانی سے تاروں کی نگاہ:
دور، ان سے بھی کہیں دور مجھے جانا ہے

اس بلندی پہ اڑا جاتا ہے تو سرِ میرا
کہکشاں گرد دکھا دیتا ہے دکھائی مجھ کو
رفعتِ عرش سے ملتا ہوا مبہم سا غبار
مری منزل ہے کہاں یہ کبھی سوچا ہی نہیں
اس کی فرصت ہی کسے دل میں مگر رہتا ہے
درد۔ وہ درد کہ ہے جس سے تمنا جیتا ب
چاند کچھ راہ مرے ساتھ ہوا تھا لیکن
رہ گیا دور کہیں ہار کے ہمت اپنی
زہرہ کہنے لگی، اے بزم فلک کے قاصد
زرد رو پہلی ہی منزل میں ہوا تو کیونکر
جب کہ وہ خاکئ بے مایہ بڑھے جاتا ہے
پست ہر ایک بلندی کو کئے جاتا ہے"

اب تراش خراش کے بارے میں کچھ عرض۔ بقول مصور ریناڈ تکنیک ایجاد بندہ ہے۔ اولاً تو نقاشی برتی گئی ہے یعنی روغن پر روغن تہ بہ تہ، تو بہ تو۔ لیکن اس کے بعد ایک اور عمل شروع ہوتا ہے جو اسے نقاشی کی بجائے کچھ اور بنا دیتا ہے۔ روغن تراشی۔ کیونکہ نقاش کوئی تیز لیکی دھار کی چیز لے کر بعض جگہوں پر رنگوں کو چھیل دیتا ہے۔ اس طرح جو رنگ وہ جس جگہ چاہتا ہے اس کو برآمد کر لیتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے نقش رنگین پنسل سے بنائے گئے ہوں۔ جیسے رنگوں میں جان پڑ گئی ہو، وہ بول اٹھے ہوں۔ ان میں ایک جنبش، ایک حرکت، نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ چمک دمک، نزاکت اور بلور نما شفاف وضع بھی۔ دار المطالعہ کی پرسکون فضا کے حسب حال اس نقش میں بھی ایک سکون آفریں کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جیسے اس کے رنگ اور روغن چپکے ہی چپکے دل پر سکون کا افسوں پھونک رہے ہوں۔

یہ نقش محض تجریدی نہیں۔ خطوط اور اشکال کا ہجوم کبھی کبھی بسا اوقات روکھا پھیکا اور غیر خوشگوار آئند معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں ایک غیر معمولی دلکشی نظر آتی ہے۔ یہ حقیقت، واقعیت اور تصوریت سب کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اور سب کے مخصوص اثرات بھی۔ جو اس کی جامعیت کے ضامن ہیں۔ ان کے ذریعہ مصور کچھ کہنا چاہتا ہے جو اس کا دلی مقصود ہے۔ اور تجریدی انداز میں بدلی ہوئی حقیقی اشکال سے اس کا شوقِ اظہار بھی ظاہر ہوتا ہے اور سچی اظہاریت بھی۔

ظاہر ہے کہ جہاں فن کی نوعیت تمثیلی ہو وہاں ہر قسم کی توجیہوں اور تشریحوں کے لئے میدان کھلا ہوتا ہے۔ ہم چاہیں تو اس کو بہت وسیع معنی عطا کر دیں اور چاہیں تو دائرہ کو تنگ کرتے کرتے ایک ہی نقطہ پر لے آئیں۔ چونکہ یہ نقش ہمارے زمانے، یعنی دورِ انقلاب میں بنایا گیا ہے۔ اور وہ بھی سرد سبز کلب کے لئے، اس لئے بعض نے اس کو ہماری انقلابی حکومت کی مہم سے تعبیر کیا ہے جو اس نے شروع ہی سے تاریک عناصر کے خلاف جاری کر رکھی ہے۔ اور وہ بھی خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جن کی علامت قرآن مجید ہے۔ اس لحاظ سے اس کا ہدف وہ پُراسرار ہستی ہے جو کلیدِ زر کو اپنے پنجے میں پکڑے ہوئے ہے اور کچھ چمگادڑ جیسی بھیانک اور ڈراؤنی معلوم ہوتی ہے۔ جب یہ چیز تیر کا شکار ہو جائے گی تو انسان کی ترقی کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ اس طرح تصویر کی معنویت محدود ہو جاتی ہے۔ اور بمصداق فن کی حیثیت سے ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم توضیح و تشریح کا دروازہ کھلا چھوڑ دیں۔

جب ہم سفید گتے کی زمین پر کھینچے ہوئے نقش پر آخری بار مجموعی نظر ڈال کر رخصت ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کیا یہ سارے متفرق اجزا جو کچھ حقیقی ہیں اور کچھ تمثیلی، وحدت کے رشتے میں منسلک ہو سکے ہیں یا نہیں۔ اور وہ تناسب کے اصول پر بھی پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ ممکن ہے بعض اذہان وحدت کی بجائے کثرت سے زیادہ متاثر ہوں اور ان کا یہ احساس بے جا بھی نہ ہو کیونکہ فن جب بھی مرکب اور پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس میں یہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ رہا تناسب کا سوال تو اس وضع کی مصوری میں اس کو چنداں ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔

باایں ہمہ یہ امر مسلم ہے کہ ان نقوش کو دیکھنے کے بعد ہم غم ہائے روزگار سے بوجھل دل لے کر رخصت نہیں ہوتے بلکہ ہمیں اپنے اردگرد امید ہی امید اور شادمانی ہی شادمانی کی روشن فضا دکھائی دیتی ہے۔ ہمارا دل آغاز بہار کی ہری بھری کونپل کی طرح لہراتا ہے یا اس کلی کی طرح جھوم جھوم اٹھتا ہے جس میں یکایک آفریں رت پہلے پہل اپنی روح پھونکتی ہے۔

سلاطین بنگال:

خلجی دور

(۱۱۹۵ء تا ۱۲۲۷ء)

سید فیضی

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نویں صدی عیسوی میں بنگال نے عالم اسلام سے کافی ربط و ضبط پیدا کر لیا تھا۔ اس تعلق کی یا بھی کڑیاں اُن عرب تاجروں کے ہاتھوں استوار ہوتی تھیں جو سمندر کے ساحلی علاقوں کے ساتھ تجارتی مراسم رکھتے تھے۔ ان عرب تاجروں کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جنہیں سیر و سیاحت کی زندگی عزیز تھی اور ان میں اکثریت صوفیا اور مبلغین حضرات کی ہوا کرتی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے لوگوں نے عام طور پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور یہیں خلق خدا کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر ڈالی تھی۔ بنگال کی سرزمین اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ دور افتادہ ہونے کے باوجود اسلامی اثر و نفوذ یہاں بہت تیزی سے سرایت کرتا رہا۔ یہ صوفیا حضرات کی جد و جہد کا نتیجہ تھا کہ بنگال میں تحریک اسلام کی آبیاری ہوتی رہی اور سیاسی فتوحات کا دور شروع ہونے سے قبل ہی مسلمانوں کا تہذیب و تمدن یہاں جڑیں پکڑ چکا تھا۔ اصل میں ۱۲۰۰ء سے بنگال مسلمانوں کے قبضے میں آتا ہے لیکن تین سو سال کا یہ درمیانی عرصہ جس میں بنگال مسلمان تاجروں اور درویشوں کے لئے سیاحانہ آمد و رفت کے اسباب فراہم کرتا رہا۔ مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت کا وہ شاندار دور ثابت ہوا ہے جو آج بھی سرزمین بنگال کے لئے مائی ناز ہے۔ غالباً یہی وہ تبلیغی جذبہ تھا جس کے تحت بنگال نے مسلمان حملہ آوروں کو اپنی جانب متوجہ کیا اور ان میں اوّلیت کا سہرا ایک ایسے غیر معروف شخص کے سر رہا جو ہندوستان سے دور سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد تن تنہا یہاں پہنچا اور اپنی بہادری، عزم، جد و جہد اور مستقل مزاجی کی بدولت تاریخ میں ملک اختیار الدین محمد بختیار خلجی کے نام سے مشہور ہو کر فاتح بنگال کہلایا۔

سلطان محمود غزنوی کو آنکھیں بند کئے ابھی ڈیڑھ سو سال ہی گذرے تھے کہ اسلامی فتوحات کا رُکا ہوا سیلِ بے پناہ ایک دفعہ پھر نکلا اور دریائے سندھ کی مشرقی جانب رُخ کئے تیرہویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان تک پھیل گیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی موجیں اسی وقت کناروں سے آشنا ہوئیں جب بختیار خلجی نے جنوبی بہار کے مشرقی علاقوں میں پرچم توحید کو بلند کر کے بھاگیرتی اور کراتویہ دریاؤں کے کناروں تک اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ کون جانتا تھا کہ خلجی نسب کی یہ پژمردہ شاخ جو سرسبزی و شادابی کے نام کو ترس رہی تھی ایک دن خود چمنستانِ بنگال کی شگفتگی کا باعث بنے گی اور وہ محمد بختیار جو بے سر و سامانی کی حالت میں گھر سے غریب الدیار ہو کر نکلا تھا ایک دن سلطان الدنیا والدین کے لقب گرانمایہ سے نوازا جائے گا لیکن وقت کی تبدیلی آنکھیں گواہ ہیں کہ ۱۱۹۵ء میں یہی غیرت مند انسان جب اپنے آبائی وطن گرم سیر کے علاقے پر حسرت و یاس کی نگاہیں ڈالتے ہوئے نکلا تو اس کے قدم خود بخود ہندوستان کی طرف اٹھنے لگے۔ تلاش معاش کی سرگردانی نے کچھ عرصہ بعد اسے شہاب الدین غوری کے لشکر میں پہنچا دیا لیکن قد و قامت کی غیر موزونی اور شکل و صورت کی بدنمائی نے اسے افواج سلطانی میں کوئی جگہ نہ دلا سکی۔ دل برداشتہ ہو کر دلی کا رُخ کیا کہ شاید قطب الدین ایبک کے دربار میں گوہر مقصود ہاتھ آئے۔ یہاں بھی نصیب نے یاوری نہ کی ؎

ملک خدا تنگ نیست　　پائے گدا لنگ نیست

کے مصداق سیر و سیاحت کرتا ہوا بدایوں پہنچ گیا۔ یہاں کے سپہ سالار ملک ہژبر الدین نے اس پر رحم کھا کر تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے پاس رکھ لیا۔ بختیار کی مطلق العنان طبیعت اس ننگ کو کب گوارا کر سکتی تھی، چٹانوں میں بسیرا کرنے والا شاہین قصر سلطانی کے گنبد کو نشیمن نہیں بنا سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں سے علیحدہ ہو کر وہ اودھ پہنچا جہاں کے حاکم ملک حسام الدین نے اپنی فراست نظری سے بختیار کی قدر و قیمت کو پہچان لیا اور اُسے

موجودہ مرزاپور کی جنوب مشرقی جانب دور کے لئے بعوض جاگیر عنایت کرکے اپنے صدر مقام سے کافی فاصلے پر متعین کردیا۔ ان حدود میں ابھی تک کسی اسلامی لشکر کا گذر نہیں ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ بختیار کے لئے اس سے بڑھ کر موزوں کوئی جگہ نہ ہوسکتی تھی جہاں وہ اپنی طبیعت آزاد کے پوشیدہ جوہر دکھا سکتا۔

اپنی جاگیر کو محفوظ رکھنے کے خیال سے بختیار نے پہلے وہیں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو مطیع کیا اور بعد ازاں منیر اور بہار کے اضلاع پر دست درازی شروع کردی۔ اس کی بڑھتی ہوئی جنگجویانہ ناموری نے بہت جلد ان خلجی اور ترکمان سپاہیوں کو اس کے پرچم تلے اکٹھا کردیا جو طلبِ معاش کی خاطر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آوارہ و پریشان پھرا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ قطب الدین ایبک کے کانوں میں بھی بختیاری فتوحات کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ سلطنتِ دہلی بھی اس ابھرتے ہوئے ستارے کی چمک دمک کو دیکھ رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ افقِ بنگال پر یہ ستارہ اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ چمک کر رہے گا۔ چنانچہ بختیار کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اُسے خلعتِ آفریں سے نوازا گیا۔ قرب و جوار کے علاقے تو پہلے ہی سے اُس کے زیرنگیں آچکے تھے۔ اب اس کی فتح جو طبیعت نے اور بڑی وسعتوں کو ناپنا شروع کیا۔ حصارِ بہار نظروں میں تھا یہی تھا پایا کہ اس سرزمین کفر کو نورِ ایمان سے جگمگایا جائے۔ بختیاری لشکر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح بہار کی طرف بہنے لگا اور آن کی آن میں اس کے چاروں طرف پھیل گیا۔ بہار کے رہنے والے سرمنڈے بھکشو مقابلے کی تاب نہ لاکر اس آتشِ حرب کا ایندھن بننے لگے اور اسلامی لشکر نے کسی روک ٹوک کے بغیر یہاں پرچم اسلام نصب کردیا۔ بعد میں جب مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوا کہ حصارِ بہار در اصل "وہار" یعنی مدرسہ تھا اور وہ بھکشو جنہیں لقمۂ شمشیر بنایا گیا تھا، یہاں کے طالبِ علم تھے تو انہیں بہت افسوس ہوا اور آئندہ غیر سکالی کے جذبے کے ماتحت اس تمام مفتوحہ علاقے کو بہار کا نام دے دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ بہار میں اس وقت کئی ایک بدھ عبادت گاہیں تھیں جو بیک وقت مکاتب و مدارس بھی کہلاتی تھیں اور یہ قلعہ جس پر بختیار نے ۱۱۹۹ء میں اپنا پرچم لہرایا تھا اسی قسم کی ایک عبادت گاہ تھا جسے مرکزی حیثیت حاصل تھی اور جس کا نام "اودنتا پورہ وہار" تھا۔ ۱۲۰۰ء میں بہار پر حملہ کرنے کی دوبارہ ضرورت محسوس ہوئی۔ اس دفعہ پورے بہار کو زیرِ شمشیر قبضے میں لایا گیا اور خلجیوں نے مضبوطی سے وہاں اپنے پاؤں جمانا شروع کئے۔

ادھر بنگال راجہ لکشمن سین کی راجدھانی بنا ہوا تھا۔ کفر والحاد کی یہ سرزمین بختیار کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔ چنانچہ وہ بہار سے فارغ ہوکر اپنی فوجیں لئے سیدھا بنگال پہنچ گیا۔ راج محل پر قبضہ کرنے کی یہ تجویز ہوئی کہ فوج کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کردیا جائے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے یکے بعد دیگرے شہر میں داخل ہوں اور راجہ سینا کا مقابلہ کرکے اسے شکستِ فاش دیں۔ اس کام کے لئے بختیار نے خود پہل کی اور ۱۹ سواروں کو ہمراہ لئے ندیہ شہر میں داخل ہوگیا۔ جون ۱۲۰۱ء کی گویا اپنے شباب پر تھیں۔ سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ندیہ کے راجا اور پرجا آرام سے اپنی اپنی جگہ فروکش تھے کہ مٹھی بھر منچلوں کا یہ مختصر سا قافلہ اس جھلستی ہوئی گرمی میں راج محل کی طرف منہ اٹھائے بڑھا جارہا تھا۔ مزاحمت کرنے کے لئے جو بھی آگے آیا، تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سرحد اجنبیوں کی آمد سے چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ راج محل کی ہاہاکار سے فضائیں گونج رہی تھیں لیکن حملہ آوروں کی تلواریں میان سے باہر نکل چکی تھیں اور زیادہ وقت گذرنے نہ پایا تھا کہ راج محل اور راج سنگھاسن پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ تازہ دم بختیاری فوجیں دستہ در دستہ پیچھے چلی آرہی تھیں، اور لکشمن سین جان بسلامت کشتی میں سوار ہوکر راہِ فرار اختیار کرچکا تھا۔

راج محل پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا اور سچ پوچھئے تو مسلمانوں کو آج بختیار کی سرکردگی میں وہ شاندار فتح حاصل ہوئی تھی جس نے بنگال میں ہندو کی خود مختاری کا طلسم توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ندیہ کو فتح کرنے کے بعد بختیار نے خلجی امرا کو یہاں متوطن کیا اور خود گوڑ کو مسخر کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ تاریخ وہ تفاصیل پیش کرنے سے قاصر ہے جن سے یہ معلوم ہو کہ بختیار نے کب اور کس طرح گوڑ پہ فتح پائی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ گوڑ فتح کرکے جو کچھ مالِ غنیمت ہاتھ لگا اسے سمیٹ کر بختیار یہاں سے نکلا اور بہار کے راستے ہوتا ہوا ملک قطب الدین کی خدمت میں زمین بوس ہوا۔ قطب الدین نے ابھی ابھی کالنجر، مہوبہ اور کالپی کی فتوحات کو مکمل کیا تھا۔ چنانچہ قطب الدین کو نذر نیاز پیش کرکے وہ اپنے مفتوحہ علاقوں کو واپس ہوا اور ۱۲۰۳ء سے ۱۲۰۵ء تک یہاں کے انتظامی معاملات کو سنوارنے میں مصروف رہا۔ اس دوران میں بختیار نے بت شکنی بھی کی، مسجدیں بنوائیں، مکاتب و مدارس قائم کئے اور تبلیغِ مذہب کے کاموں میں بھی پیش پیش رہا۔

تبت کی مہم بختیار کا آخری معرکہ تھا جس کی ناکامیابی سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ یہ مہم اس نے کیوں اختیار کی۔ تاریخ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ کیا ہندوستان کی وسیع سرزمین اس کی فتح مندیوں کے لئے ناکافی تھی؟ کیا مہاراجہ لکشمن سین کی حریفانہ سرگرمیاں دب چکی تھیں؟ کیا شمالی ہند کے میدانوں میں ہندو راجدھانیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ نہیں!! تو پھر بختیار کی نگاہوں میں تبت، چین اور ترکستان کے مناظر کیوں گھوم اٹھے؟ ان سوالوں کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی معرکہ پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھا۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں

وہ گلستاں کہ نہ ہو جس کی گھات میں صیاد

اس کے کانوں نے یہ داستانیں سُنی ہوئی تھیں کہ ان پہاڑی علاقوں میں سونے کی کانیں موجود ہیں۔ وہ ان قیمتی ذخائر کو حاصل کرنا چاہتا تھا ــــ نہیں! وہ اپنی متجسس طبیعت کے باعث صرف یہ چاہتا تھا کہ ترکستان پہنچنے کا چھوٹے سے چھوٹا راستہ معلوم کر لے۔ بہر حال تبت کی مہم اس کا سوچا سمجھا ہوا اقدام تھا۔ اہل بنگال کے لئے یہ کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جس کے نام سے وہ ناواقف ہوں بلکہ اس کے برعکس پال خاندان کے راجاؤں کے زمانے سے تبت نے پیشواؤں اور دھرم پرچارکوں کی پود و باش کے سبب مذہبی مقام ہونے کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور تبت کے تجارت پیشہ لوگ دارجلنگ کے رستے جنوبی بنگال کے سالانہ میلوں ٹھیلوں میں اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۲۰۶ء کے اواخر سرما میں بختیار ایک لشکر جرار لئے جس میں دس ہزار گھڑ سوار تھے، دیوکوٹ سے تبت کی مہم پر روانہ ہوا۔ رستے کی دشوار گزاریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بردھان کوٹ نکل کر پہاڑی سفر شروع ہوا اور راستہ طے کر کے بختیاری لشکر سولہویں دن ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں پہاڑی باشندوں سے مقابلہ ہوا۔ وہ غضب کا رن پڑا کہ بختیاری لشکر نے پہاڑی حملہ آوروں کے چھکے چھڑا دئے لیکن رسد ختم ہو جانے اور دشمن کے ہر وقت گھات میں لگے رہنے کی وجہ سے سلطان کی فوجوں کو ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا اور آہنی پوشی مسلح فوج میں معدودے چند سپاہی سلطان کے ساتھ بچ کر خستہ و خراب حالت میں دیوکوٹ پہنچے۔

بختیار کی اسی ناکامی نے نصف صدی بعد تک بنگال کی تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس دوران میں ہندو راجاؤں کو اپنی کھوئی ہوئی قوت جمع کرنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ گو زمین کمی سپاہ کے باعث دامن سلطنت کی وسعتیں بھی رکی ہوئی تھیں اور بہار کا علاقہ جہاں سے بختیار کو بہ آسانی لشکری مل جایا کرتے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بنگال سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اندرونی خلفشار کا یہ عالم تھا کہ اخلاقی قدریں روبہ زوال پذیر ہو رہی تھیں اور مرے کو مارے شاہ مدار ادھر بنگال کی سرزمین میں فتنہ و فساد کی آگ مشتعل ہو رہی تھی۔ یہی وہ دکھ تھے جن کا احساس بختیار کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ شرم و ندامت کے باعث وہ بہت کم باہر نکلتا تھا اور کسی کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا اندیشہ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ ان خطرات نے اسے صاحب فراش بنا رکھا تھا۔ آخر ایک روز جبکہ بنگال کا یہ فاتح مرگ و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھا، علی مردان خلجی نے اپنے خنجر کے ایک ہی وار سے، اس کے دیوکوٹ پہنچنے کے صرف تین ماہ بعد ۱۲۰۶ء میں اسے عذاب زیست سے نجات دیدی۔

●

ملک اختیار الدین محمد بختیار خلجی بنگال کے قرون وسطی کا وہ معمار گردانا جاتا ہے جس کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی دیواروں نے آج سارے مشرقی پاکستان کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ اس نے آزادی کی فضاؤں میں پرورش پائی تھی، آزاد رہ کر زندگی بسر کی اور ایک عظیم فاتح کہلاتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ موت نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ اپنی فتوحات کو مستحکم کر لیتا اور ان کے دروبست میں اپنی منصرمانہ قابلیتوں کا اظہار کرتا۔ یہ واقعہ ہے کہ بختیار اپنے ہم عصر فاتحوں میں بے جگری، جاں سپاری اور دلاوری کے لحاظ سے بے نظیر تھا اور اگر اس میں کچھ ذاتی کمزوریاں تھیں تو ان کا سبب ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور پے بہ پے کامیابی کا حصول تھا۔ اس کے عہد میں ملکی انتظام کا طریقہ ذاتی جاگیرداری پر مشتمل تھا اور امراء کے تحت ملک کے بیشتر علاقے ترک یا خلجی افسروں کی تحویل میں رہا کرتے تھے۔ ہر افسر اپنے علاقے کا خود مختار سردار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان نے سرحدوں پر بڑی بڑی چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں جو خلجی خاندان کے تین جری سرداروں یعنی علی مردان، حسام الدین عوض اور محمد شیران کے سپرد تھیں۔ اس طرح پورے بنگال پر خلجیوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حقیقت میں تاریخ

بنگال پر بالعموم اس کا بہت گہرا اثر ہوا ہے۔

بختیار خلجی کے سانحۂ قتل کے بعد ایک عرصے تک بنگال خانہ جنگیوں کا گہوارہ بنا رہا اور یہ بھڑکتی ہوئی آگ کہیں ۱۲۱۲ء میں جا کر علی مردان کے خون کے چھینٹوں سے ٹھنڈی ہوئی۔ ادھر محمد شیران کو جب اپنے ولی نعمت سلطان بختیار کے قتل ہو جانے کی خبر پہنچی تو وہ فوراً لکھنور سے اپنے لشکر سمیت دیوکوٹ آ گیا کہ علی مردان کو اس کے کئے کی سزا دے۔ علی مردان اس وقت اپنی جاگیر گھوڑا گھاٹ میں پناہ گزیں تھا۔ بختیار کے مراسم عزا سے فارغ ہو کر محمد شیران نے علی مردان پر چڑھائی کی اور گرفتار کر کے اسے زنداں میں ڈال دیا۔ امرائے خلج نے متفقہ طور پر محمد شیران کو لکھنوتی کا حاکم منتخب کر لیا اور ۱۲۰۸ء میں وہ ملک عز الدین محمد شیران خلجی کے نام نامی سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ زمانہ داخلی اور خارجی خلفشار کا زمانہ تھا۔ بنگال سے باہر اہم واقعات رونما ہو چکے تھے۔ سلطان معز الدین غوری کا قتل، قطب الدین ایبک کی تاجپوشی اور دہلی، سندھ کے اس پار غزنی، فیروز کوہ اور خراسان کے حاکموں کی باہمی چپقلش ——— ان تمام حالات نے رفتار وقت کو اور بھی تیز بنا رکھا تھا۔ کہنے کو تو شیران لکھنوتی کے تاج و تخت پر متمکن تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر خلجی امیر کے دل میں اس وقت خود سلطان بن جانے کی امنگ موجود تھی۔ شیران ایک مرد جنگجو، کار آزمودہ سپاہی اور دانش پژوہ انسان ہونے کے باوجود امرائے خلج کی ریشہ دوانیوں کے سامنے اپنے آپ کو مجبور محض پاتا تھا۔ ایک طرف اپنے امیروں کی سازشیں تھیں تو دوسری جانب سلطنت دہلی کی طرف سے خوف و ہراس تھا۔ بہرکیف اپنے ذاتی وقار کو قائم رکھنے کے لئے اس نے تمام امرا کے مناصب برقرار رکھے اور علی مردان کے حامیوں سے بھی کسی قسم کی بازپرس نہ کی۔ نتیجتہً سلطان کے اس غیر دانشمندانہ فعل کی وجہ سے بار کا سارا مفروضہ ملاقہ خلجیوں کے دائرۂ اقتدار سے نکل کر سلطان قطب الدین کے ملک محروسہ میں شامل ہو گیا۔

گھوڑا گھاٹ میں علی مردان کے فرار ہو جانے سے بنگال کے امن و سکون میں پھر اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔ علی مردان نے دہلی پہنچ کر سلطان ایبک کے دربار میں پناہ ڈھونڈ لی اور اسے ملک عز الدین کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کیا۔ قطب الدین نے اپنے صوبیدار اودھ قیماز رومی کو لکھنوتی پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ بظاہر امرائے خلج کے باہمی مناقشات کو دور کرنے کی کوشش کرے اور بباطن بنگال کو سلطنت دہلی سے منسلک کر دے۔ قیماز ابھی دریائے کوسی عبور کر کے بنگالہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ گنگا رائے خلجی حاکم حسام الدین نے بڑھ کر اس کا شاہانہ استقبال کیا اور حسبِ مراسم خدمات بجا لایا۔ ملک عز الدین کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ دیوکوٹ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ قیماز نے دیوکوٹ پر قبضہ کر لیا اور اسے حسام الدین کے تصرف میں دے کر خود اودھ کو واپس ہوا۔ اس انتظام کی رو سے خلجی جاگیریں بھی دیوکوٹ کی عملداری میں شامل تھیں جہاں سلطان دہلی کا گماشتہ برسرِ حکومت تھا۔ قیماز کو اودھ جاتے ہوئے راستے میں علم ہوا کہ ملک عز الدین نے خلجی امیروں کو جمع کرتے پھر دیوکوٹ پر حملہ کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ راستے ہی سے واپس لوٹا اور ملک عز الدین کو شکست دے کر سنتوش (ضلع بوگرہ) کی طرف مار بھگایا۔ ملک عز الدین کو اپنی فرمانروائی کے سال بھر کے مختصر عرصے میں مسلسل مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے دوبارہ دیوکوٹ پر حملہ آور ہونے کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ چنانچہ زندگی کے باقی ماندہ ایام سنتوش ہی میں گزار کر وہ راہی عالم بقا ہوا۔

حسام الدین ۱۲۰۸ء سے ۱۲۱۰ء تک سلطان دہلی کا باجگذار حاکم بن کر لکھنوتی اور اس کے گرد و نواح پر حکومت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سلطان قطب الدین نے علی مردان کو ترکوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ لکھنوتی کا گورنر بنا کر بنگال روانہ کیا۔ علی مردان کسی مزاحمت کے بغیر ۱۲۱۰ء میں بنگال وارد ہوا۔ حسام الدین نے امرائے خلج کی معیت میں اس کا استقبال کیا اور عنانِ حکومت اس کے سپرد کر کے خود لکھنوتی میں گوشہ گزیں ہو گیا۔ علی مردان اب بلا شرکتِ غیرے بنگال کا مطلق العنان حاکم تھا۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ اس کے ولی نعمت سلطان قطب الدین ایبک نے سفرِ آخرت اختیار کر لیا ہے۔ سلطان کی وفات حالات کی ابتری کے لئے ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی کیونکہ معزی اور قطبی امیروں میں سلطان کی جانشینی کے لئے جھگڑے شروع ہو چکے تھے۔ لاہور اور دہلی ان جھگڑوں کا مرکز بنے ہوئے تھے جہاں آرام شاہ اور التمش کو ہندوستان کے تخت و تاج کا وارث سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملتان اور سندھ میں ناصر الدین قباچہ نے علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ بنگال میں علی مردان خلجی نے جملہ اختیارات سنبھال لئے تھے۔ اس طرح "منہاج سراج" کے بیان کے مطابق

ہندوستان چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور لکھنوتی کے علاقہ پر خلجی ملک اور سلاطین پوری طرح قابض رہے تھے۔

علی مردان اب سلطان علاء الدین کے لقب سے بنگال کی قسمت کا مالک بنا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہترین سپاہیانہ قابلیتیں رکھتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بہت خونریز اور قتال تھا۔ سینکڑوں خلجی امیر اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بن چکے تھے۔ راعی کے خوف سے رعایا تھر تھر کانپ رہی تھی یہی وجہ تھی کہ مالگذاری اور خراج کی رقمیں بن مانگے وصول ہو رہی تھیں اور سرکاری خزانہ روز بروز معمور ہوتا جا رہا تھا۔ حکومت اور دولت کے اس نشے نے علی مردان کا دماغ خراب کر دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو عالم اسلام کا فرماں روا سمجھنے لگ گیا تھا۔ خوشامدی اور بدھو کے باز امرا اس کے اس خبط سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ رعایا علیحدہ تشدد کا شکار بن رہی تھی۔ آخر خلجیوں کی رگِ حمیت پھڑکی اور انہوں نے اپنے سردار حسام الدین کی سرکردگی میں سازشی طریقے سے علی مردان خلجی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس طرح بختیار خلجی کا خونِ بے گناہ رنگ لا کے رہا ہے

تمہارے کشتوں کا خونِ ناحق چھپے گا کیونکر بروزِ محشر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

حسام الدین نے اپنے خلجی امرا کے اصرار پر سلطان غیاث الدین کا لقب اختیار کر کے زمامِ سلطنت کو سنبھالا اور اپنی پہلی توجہ اس جانب منعطف کی کہ لکھنوتی میں اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرے اور علی مردان کے ساتھ دہلی سے جو ترک سپاہی آئے تھے، انہیں اپنے ساتھ ملائے رکھے۔ اس دوران میں اسے ہندو راجاؤں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جس میں اسے شکست ہوئی۔ ۱۲۱۴ء میں سلطان نے لکھنوتی کو ہندو تغلب سے واگذار کرانے کی کوشش کی اور بڑے شدید محاصرے کے بعد یہ علاقہ سلطان کی تحویل میں آ گیا۔ یہیں سے سلطان کی آئندہ فتوحات کی ابتدا ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت کے ساتھ بہت سے نئے علاقے بھی مل جاتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قوت مجتمع کر کے سلطان نے پورے بنگال کو زیرِ قبضہ لانے کی کوشش شروع کر دی اور اس غرض کے لئے اپنے پایۂ تخت کو دیوکوٹ سے لکھنوتی لے جانا بہتر سمجھا۔ چنانچہ ۱۲۱۹ء میں سرکاری طور پر لکھنوتی کو حکومت کا صدر مقام قرار دے دیا گیا۔ یہاں سلطان نے کئی ایک نادر تعمیری اصلاحات نافذ کیں جن سے اس علاقے کی مقامی حیثیت میں قابلِ قدر اضافہ ہو گیا۔ سلطان کے زمانے میں لکھنوتی اور بہار پندرہ سال تک امن و امان کا گہوارہ بنے رہے یہاں تک کہ ۱۲۲۵ء میں سلطان التمش نے بنگال پر پہلا حملہ کیا۔ لکھنوتی سے سلطنت دہلی کے تعلقات تو علی مردان کے عہد ہی سے منقطع ہو چکے تھے۔ التمش تخت و تاج سنبھالتے ہی ہمایوں، بنارس، قنوج اور اودھ کی طرف متوجہ ہوا۔ بنگال اور بہار پر بھی اس کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ راستے میں کچھ ایسے حالات کا سامنا ہوا کہ لکھنوتی کے حاکم کو اپنا جھگڑا نپٹا کر صلح کر لی۔ ادھر بہار میں ملک علاء الدین جانی کو حاکم بنا دیا جسے غیاث الدین نے شکست دی اور وہ بہار کو پھر اپنے قبضے میں لے آیا۔ سلطان التمش کو خبر ملی تو وہ غیاث الدین کی بدعہدی پر مصلحتاً خاموش رہا۔ کچھ عرصہ بعد التمش نے اودھ کی تسخیر کے لئے اپنے خلف اکبر شاہزادہ نصیر الدین محمود کو ایک بڑی فوج دے کر روانہ کیا تو اسے غیاث الدین کو بدعہدی کا مزا چکھانے کی تاکید بھی کر دی۔ چنانچہ نصیر الدین محمود نے پہلے لکھنوتی پر حملہ کیا۔ غیاث الدین اس وقت ہندو راجاؤں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ یہ خبر ملتے ہی فوراً لکھنوتی کی طرف واپس ہوا لیکن شاہزادے کا لشکر پہلے ہی سے شہر میں داخل ہو کر بسن کوٹ پر قبضہ کر چکا تھا۔ غیاث الدین نے بڑی بے جگری سے شاہی افواج کا مقابلہ کیا لیکن تقدیر غنیم کا ساتھ دے رہی تھی۔ بالآخر وہ اپنے سپہ سالاروں سمیت گرفتار ہوا اور ۱۲۲۷ء میں شہزادے کے حکم سے ان سب کو تہِ تیغ کروا دیا گیا۔

غیاث الدین کا ۱۴ سالہ عہدِ حکومت سلطنت اور رعایا کے لئے امن و خوشحالی کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چنگیز خان خراسان اور ماوراء النہر کے اسلامی مرکزوں کو پامال کرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور بمصداق ع خدا شرے برانگیزد کہ خیرِ ما درآں باشد، ہندوستان کی اسلامی ریاستیں روز بروز قوت حاصل کر رہی تھیں کیونکہ ترکمانی دستوں کے دستے نقل مکانی کر کے مغرب کی سمت ایشیائے کوچک میں اور جنوب مشرق کی سمت بنگال تک پھیلتے چلے آ رہے تھے۔ اس طرح نہ صرف اسلامی ہندوستان کی عسکری قوتوں میں اضافہ ہو رہا تھا بلکہ یہ ایک اسلامی تہذیب و تمدن کا اہم مرکز بن رہا تھا جو حملۂ مغول سے خوف کھائے ہوئے لوگوں کو جمنا اور رہا ندی کے ساحلوں تک

(باقی صفحہ ۲۲۴ پر)

مشہد بالاکوٹ

عارف حجازی

چاروں طرف گہری کہر چھائی ہوئی تھی اور شہر بالاکوٹ وہاں کے پُراسرار پہاڑ خاموش بدامیاں نگاہوں سے ابھی تک اوجھل تھے دور سے دریائے کنہار کے بہنے کی مترنم آواز تنگ گھاٹی اور کہستانی وادیوں میں گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی جیسے کسی نے زندگی کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ زندگی کا یہ سیل رواں، خاموش دھندلی دھندلی صبح اور ایسے میں بالاکوٹ کی خونیں آشام تاریخ کے بارے میں سوچ کر دل میں جیسے ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اور میرے قدم تیزی سے مسجد کی جانب اٹھ رہے تھے۔

مسجد تک پہنچنے میں کافی لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ راستہ بھر ذہن میں جیسے تاریخ کا ایک ایک ورق کھلتا چلا گیا۔ اسلام جب ایران اور افغانستان کے راستے برصغیر ہند میں پہنچا تھا تو وہ اپنی بہت کچھ تازگی اور زندگی کھو چکا تھا۔ ترک پٹھان مغل فاتحین کے اسلام میں کوئی شبہ نہیں لیکن مذہب و تہذیب فتح کرنے کے لئے ان کی روحانی قوت ناکافی تھی اور ان کی حالت ایسی تھی کہ ان کی دینی اصلاح کی جاتی لیکن یہ فاتحین اپنی کامرانی اور فتحمندی کے نشے میں چور بتکدہ ہند کو برباد و تاراج کر کے عظیم الشان سلطنتیں قائم کرنے میں مصروف ہو گئے اور اپنی ضرورت کے مطابق احکام اور قوانین نافذ کرتے رہے۔ ان میں سے چند ہی ایک ایسے تھے جنہوں نے عین اسلام کے مطابق اپنی حکومت قائم کی ہو۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ مذہب حکومتِ وقت کی سرپرستی اور حمایت سے محروم ہو گیا۔ عہد اکبری میں تو کفار برملا کفر اور الحاد پھیلاتے رہے۔ اگر ہندوستان میں اس زمانے میں اسلام کے دو عظیم المرتبت پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ رحمۃ اور شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ (دہلوی) پیدا نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ اسلام یا تو فنا ہو جاتا یا پھر اس کی اتنی بگڑی ہوئی صورت ہوتی جیسے اور مذاہب کی ہے۔ ان بزرگان دین کی خیر و برکت نے اسلام کے قدم سرزمین ہند میں اتنی مضبوطی سے جما دیے تھے کہ آئندہ کی راہیں ہموار ہو گئی تھیں پھر آگے چل کر اسلام کے احیاء

میں ہندوستان کے ایک جلیل القدر فرمانروا اور خدا ترس دین دار بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر مرحوم نے بھی بہت بڑا کام انجام دیا لیکن اس کی موت کے کچھ عرصہ کے بعد سلاطین تیموریہ صرف خلعت نشین ہو گئے۔ ان کا سنبھلنا دشوار ہو گیا اور اس طرح اسلام کی مرکزیت میں پھر شگاف پڑ گئے۔ مسلمانوں کو کمزور پا کر بیسیوں فتنوں نے سر اٹھایا۔ دکن سے لے کر دہلی تک مرہٹے چھا گئے تھے۔ پنجاب میں افغانستان کی حدود تک سکھوں کا راج تھا۔ اور ہندوستان کے ساحلوں پر یورپی قوموں خصوصاً انگریز کا قبضہ تھا اور ان کا کافی اثر و رسوخ قائم ہو چکا تھا۔ ان حالات کے مقابلے کے لئے اگر کوئی باقی رہ گیا تھا تو وہ ترکشِ اسلام کا آخری خدنگ سلطان ٹیپو شہیدؒ تھے لیکن یہ ترکش بھی ۱۷۹۹ء میں ناپید ہو گیا تو اسلام کی شیرازہ بندی کے سارے امکانات ختم ہو گئے۔ اور ملک کے گوشے گوشے میں اسلام بہت کمزور ہو گیا۔ کہیں قوت کے آثار باقی نہ رہے۔ ہر جگہ جمود طاری ہو گیا۔ مسلمان قوم ہر شعبۂ زندگی میں تنزل پذیر ہو گئی اور زراعت اور تجارت بھی تباہ ہو گئی۔ علم کے راستے مسدود ہو گئے۔ مسجدیں ویران ہو گئیں بداعتقادی نے جاہل مسلمانوں کو اسلامی نظریہ حیات اور تعلیمات سے کوسوں دور کر دیا اور وہ تعویذ، گنڈہ، فقیروں اور دیوانوں پر اعتقاد کرنے لگے چنانچہ جہاں ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی قوت فنا ہو چکی تھی وہاں دوسری طرف معاشرتی و تمدنی انحطاط نے انہیں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا عادی بنا دیا تھا۔ خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی حالت سب سے بدتر ہو چکی تھی۔ رنجیت سنگھ اور دوسرے سکھوں کے گھرانوں میں مسلمان اور افغان عورتیں لونڈیوں اور باندیوں کی خدمات انجام دیا کرتی تھیں۔ اذان اور گاؤکشی سخت ممنوع تھی اور بات بات پر مسلمانوں کے گھر، جائداد اور املاک ضبط کر لی جاتی انہیں کسی قسم کی مذہبی و تمدنی آزادی نہ تھی۔ مساجد کی کھلے عام بے حرمتی کی جاتی تھی۔ لاہور کی بادشاہی مسجد سکھ پلٹن کا اصطبل

تھی۔ ان حالات ـــ اور ذہنی غلامی نے انھیں اتنا اخلاقی طور پر گرا دیا تھا کہ بقول علامہ اقبال ؎

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

مسلمانوں کے اس زوال و انحطاط کے زمانے میں قدرت نے حضرت مجدد الف ثانی سرہندی اور حضرت مجدد دہلوی کے فضل و کمال کے دو آتشہ سے رائے بریلی کے نمکدہ میں ایک ایسا آتشہ تیار کیا جس نے مسلمان قوم کے تنِ بے جان میں پھر سے اسلام کی روح پھونک دی تھی اور یہ روحِ مقدس حضرت سید احمد شہیدؒ (رائے بریلوی) تھے جنہوں نے اسلام کی حفاظت اور تجدید دین کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں کو ذلت اور پستی سے نکال کر پھر انہیں ان کے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ اور شاہ سید اسمٰعیل شہیدؒ (دہلوی) جیسے بزرگانِ دین نے سید صاحبؒ کی تحریکِ اسلامی کو ایسے چار چاند لگائے۔ اور یہ تحریک اس شان و شوکت سے ابھری کہ سارے ہندوستان میں اس کا عام چرچا ہو گیا۔ حضرت سید صاحبؒ کی اس تحریکِ اسلامی کے بارے میں ایک انگریز مورخ ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر (جو اس تحریک کا سب سے بڑا دشمن تھا) اپنی تصنیف "مسلمانانِ ہند" میں لکھتا ہے ؎

"یہ لوگ ...... بے شبہ بے غرض تھے
ان کا طریق زندگی ہر شے سے بالاتر تھا ......
ان کا اصل کام تزکیہ نفس اور اصلاحِ دین تھا۔
میرے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں ان کی عزت و تعظیم کئے بغیر ان کا ذکر کر دوں ...... یہاں تک مجھے اس تحریک کا علم ہوا ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہابی مبلغین بہت بڑے روحانی پیشوا تھے اور کم سے کم خود غرض لوگ تھے۔ ان کی تحریک بڑی منظم اور ہمہ گیر تھی۔ ان میں ایسے دین دار اور خدا ترس رہنما تھے جنہوں نے اپنی علمی اور عملی زندگی کا بہترین نمونہ پیش کر کے بہت تھوڑے عرصے میں اپنی تحریک کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا اور لاکھوں مسلمان ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے"

ایک اور جگہ ایک دوسرا متعصب مورخ جیمس، کنبلی بنگالی مسلمانوں کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"کمزور اور ڈرپوک بنگالی مسلمان خونخواری اور جوشِ جہاد میں افغانوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔"

ان غیر ملکی مورخوں کے تاریخی حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تحریک میں کتنی جان تھی اور اس زمانے میں ایک ایسی ہی تحریک کی سخت ضرورت تھی۔ خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ سید صاحبؒ کی ساری توجہ انہیں غلامی اور پستی سے نکالنے کی طرف مرکوز ہو گئی۔ اور سب سے پہلے اس وقت اسی کی ضرورت بھی تھی کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" ـــ یہ سعادت ازل سے پشاور سے راس کماری تک چھ کروڑ مسلمانوں میں رائے بریلی (یو پی) کے ایک اولوالعزم سیدؒ کی قسمت میں تھی کہ وہ کفر اور ظلم کے خلاف جہاد کرے۔ اگرچہ اس تحریکِ اسلامی کے بانی حضرت سید احمد شہیدؒ کو اور ان مسلمانوں کو جو ان کے ہمرکاب تھے لاکھوں دشواریاں جھیلنے کے بعد بھی کامرانی نصیب نہ ہوئی اور قوم کے غداروں نے سینکڑوں سازشیں کیں لیکن یہ تحریک ختم نہ ہو سکی۔ اور اسی بالاکوٹ کے مقام پر یہ بزرگان دین اسلام کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)

مگر بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور یہ بات یہاں بھی صادق آئی حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ سید اسمٰعیل شہیدؒ اور ہزاروں شہدائے اسلام کے شہید کئے جانے کے بعد بھی اسلامی تحریک اور قومی آزادی کی جدوجہد کی بنیادوں کو پھر بھی کوئی غدار سے غدار شخص ہلا نہ سکا۔ اس قومی جہاد اور آزادی کا آخری معرکہ اسی بالاکوٹ کی تنگ وادیوں میں ہوا تھا۔

میں نے چلتے چلتے جب تاریخ کی اس خونیں داستان کے بارے میں سوچا تو جیسے میرا دل جوشِ حریت سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور میں اس پر غور کرتا ہوا جب مسجد میں داخل ہوا تو نماز ہو چکی تھی۔ لوگ واپس ہو رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی میں لوگوں کی کالی کالی اور سفید داڑھیاں اور عمامے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں مسجد سے ہوتا ہوا آگے چشمہ کر دریا پر پہنچا جہاں ٹھنڈے پانی سے وضو کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر کا

پھر وہ بالاکوٹ کی تسخیر سے مایوس ہو کر لاہور واپس جانے ہی والا تھا کہ ناکوں کے محافظ دستے میں سے کسی غدار نے اس پہاڑی راستے کا پتہ بتا دیا۔ چنانچہ راجہ کی ہمت بندھی اور اس نے ایک دن پچھلی رات سے تیاری کر کے اچانک دونوں ناکوں پر زبردست یلغار کر دی۔ ادھر سید صاحبؒ کو خبر ہوتے ہوتے دشمن کا لشکر پہاڑوں پر چھا گیا وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑتے رہے، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جوشِ جہاد سے سرشار بڑی مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ حضرت سید احمدؒ بھی فوج میں نہیں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے شہید ہوتے ہی تمام مجاہدین نے اور زیادہ جوش و خروش سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ آخر غنیم کی بھاری فوج اور توپخانے کے آگے مٹھی بھر فوج زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکی اور وہ تمام لوگ ایک ایک کر کے شہید ہو گئے جو بہ حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے بیش قیمت سرمایہ تھے۔ آج بالاکوٹ کی اس تنگ وادی میں ہزاروں مجاہدین خاک میں مل کر خاک ہو چکے ہیں۔ سکھوں نے روایت کے مطابق حضرت شاہ شہیدؒ اور سید صاحب شہیدؒ کے جسدِ مبارک کو شناخت کرا کے نہایت احترام سے اسلامی طریقے پر دفن کروا دیا۔

اسلامی تاریخ کے اس خونیں باب کا سارا منظر نگاہوں کے سامنے اُجاگر تھا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش میں بھی ان مجاہدین میں شریک ہو سکتا۔ پھر خیال آیا کہ تیرہویں صدی میں اس تحریک نے جو تنظیم اور سیاسی اثرات چھوڑے تھے پھر وہ کسی طرح زندگی اور باوجود مسلمانوں کے اپنے مقصد میں شکست کھانے کے ان میں بھی اصلاحی اور سیاسی شعور اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ ان بزرگانِ دین کی شہادت کے بعد سے لے کر قیامِ پاکستان تک کی تاریخ اور اس کے سیاسی پہلو کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہماری آزادی کی جد و جہد اور تحریک اسلامی کی ساری کڑیاں سید صاحبؒ شہید کی تحریک سے جا ملتی ہیں یہی وہ تحریک تھی جس نے مسلمانوں میں نیا سیاسی شعور پیدا کر دیا تھا اسی اجتماعی احساس نے ۱۸۵۷ء میں بھی اپنی جولانیاں دکھلائی تھیں اور پھر اس سیاسی شعور کا میدان اتنا وسیع ہو گیا کہ ٹھیک نوے سال کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء میں جاری تحریکِ اسلامی اور آزادی کی جنگ نے پاکستان کی عظیم الشان مملکت کی بنا ڈالی اور جس مشن کو حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ لے کر اٹھے تھے اسی مشن کو آخر قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے پورا کر کے ان بزرگانِ دین کے اسمائے گرامی کو ہماری قومی تاریخ میں اور زیادہ اجاگر کر دیا۔

گو آج ہم میں یہ بزرگانِ دین موجود نہیں ہیں لیکن ان کی قومی خدمات اور کارنامے ایسے ہیں جن کی وجہ سے ان کے مبارک نام تاقیامت ہماری قومی تاریخ میں قائم و دائم رہیں گے۔!!

★

[illegible]

علمی دور ——— بقیہ صفحہ ۱۲۰

بقیہ صفحہ ۱۲۰

کھینچ کر لا رہا تھا۔ لکھنوتی کو اس وقت علوم و فنون میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور سرزمینِ بنگال کو قدرت نے علی مردان جیسے ظالم کی جگہ غیاث الدین ایسا حلیم، منصف مزاج اور علم دوست سلطان دے رکھا تھا۔ وہ ظاہر و باطن بادشاہانہ خصائل کا مالک تھا۔ بنگال کا یہ پہلا خود مختار فرماں روا تھا جس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا، علم و فن کی سرپرستی فرمائی اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصہ لیا۔ اس نے جنوبی بہار کو دوبارہ اپنی قلمرو سے ملحق کیا اور اس کی سرحدیں دہلی اور اودھ کو چھوتے ہوئے شمالی بہار سے ہم آغوش ہونے لگیں۔ غیاث الدین نے فتح بنگال کی بنیادوں کو اس طرح مستحکم کیا کہ اس کی وفات کے سو سال بعد انہی بنیادوں پر بلبن کے خاندان نے بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں کھڑی کر کے صفحاتِ تاریخ میں اپنے لئے باعزت جگہیں وقف کرا لیں۔

"میری سنو!"

(سید آفاق حسین)

(کارٹون۔ ریحان)

جوگوش نصیحت نیوش ہے۔ اگرچہ میں کہاں کہاں اور غالب کہاں۔ اور نہ میں حالی ہوں جو مصلح قوم بن کر یہ طرز خطاب اختیار کر سکوں: اے ماؤ، بہنو، بیٹیو۔ اور بھائیو! گو میرا خطاب آپ ہی سے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی عزت آپ ہی کے دم سے ہے۔ اور آپ جانیں عزت یعنی تعظیم کا مسئلہ اور سب مسئلوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور پھر آجکل کے زمانے میں! کسی نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ:-

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

اور پھر میر صاحب یا شیخ صاحب پر کیوں جائیے۔ قوموں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ان کا دنیا میں وقار ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اللہ بخشے! شہنشاہ ظرافت، لسان العصر اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا تھا:

"واہ کیا دھج ہے میرے بھولے کی
رنگ کولے کا ہیٹ سولے کی!"

آج بھی رنگ کولے سے بھی بڑھ چڑھ کر سہی۔ ہیٹ تو ضرور سولے کی ہوگی۔ یہ باہر کی چیز

رنگ کولے کا ہیٹ سولے کی!

ہی تو ہے - اپنے وطن کی تو نہیں - اور پھر بات پھولوں اور سولوں تک ہی نہیں رہتی - جہاں پھولے ہوں وہاں پھولیاں بھی ہوں گی - اور ہیٹ کی جگہ اسکارف وغیرہ لے لیتے ہیں اور یہ چیزیں بھی تو محض نام لینے ہی کیلئے چن لی گئی ہیں - ورنہ بقول حکیم ملت رح :

''چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں''

یہ مسئلہ ایک بہت بڑے مسئلے کا جزو ہے — اپنی صلاحیتوں' اپنے ساز و سامان' اپنی پیداوار' اپنے وسائل سے منہ موڑ کر دوسروں کی طرف رخ کرنا - اپنے قومی ذرائع کو ترقی دینے سے پہلوتہی - آئیے ہم تھوڑی دیر سولہ ہیٹ اتار کر دماغ کو ذرا ٹھنڈی ہوا لگنے دیں اور سکون دل سے کچھ کام کی باتیں کریں -
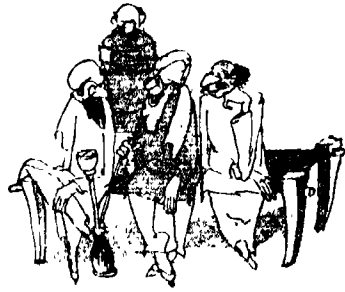
نہ ملا کھیت کو کچھ روز جو پانی نہ سہی !

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل واقعی مغرب میں بری طرح جا اٹکا ہے - حضرت اکبر کے زمانے میں بوٹ تھا تو ڈاسن کا اور اب جانے اس کی جگہ کون کون سے جوتے چلتے ہیں ! تماشں ہے تو بدیسی - مشینیں ہیں تو غیر ملکی - اور تو اور ملکی بلیڈ کی وہ دھار کہاں جو ولایتی کی ہے - جو ہیں تو ''بارلی موتیوں'' کی شکل میں - گندم ہے تو ''فلیکس'' کے روپ میں - گھڑیوں کا بدیسی میک کہاں اور دیسی مال کہاں - صاف بات ہے جب ہماری نظروں میں بدیسی کپڑے ہی جچیں تو یہاں کے کارخانے اچھا مال کیوں اور کیسے تیار کریں ؟

یہ جو میں نے کھانے پینے کا ذکر کیا تو خدانخواستہ ! اس سے میری یہ مراد نہیں کہ میں آپکو فاقوں سے دیکھنا چاہتا ہوں یا یہ کہ آپکو '' تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس '' کی تعلیم دوں - بلکہ سچ پوچھئے تو فاقوں اور تن کی عریانی کا جتن تو آپ خود کرتے ہیں

دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار !

کہ دھڑادھڑ پرایا مال خریدتے چلے جاتے ہیں اور اپنے ملک کی دولت اندھادھند باہر دھکیلتے جاتے ہیں - اس طرح زر مبادلہ کی بچت کا پلہ تو ہمیشہ دوسروں ہی کی طرف جھکا رہے گا -

اس سب سے بڑی نعمت کو لیجئے جو قدرت نے ہمیں عطا کی ہے — ہمارے وطن عزیز کی پیاری مٹی - اتنا سونا اگلنے والی - وہ سونا جو پیداوار، معدنیات' آبی وسائل کتنی ہی شکلوں میں سامنے آتا ہے - مگر ہم اسے لفظاً ومعناً ٹھکرا دیتے ہیں - اور اسکا سبب محض ہماری لاعلمی ہے ، بے حسی ہے - ہر سال دھنواں دھار بارشیں ہوتی ہیں اور اس اکسیر جیسی مٹی کو بہا لے جاتی ہیں - نیچے بیکار' بانجھ مٹی' کھردری چٹانیں رہ جاتی ہیں جن سے کچھ بھی تو نہیں نکلتا - بڑے بڑے کھیت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ جاتے ہیں - جن میں کھیتی باڑی بھی مشکل اور محنت و مشقت کا نتیجہ بھی برائے نام - پھر جوں جوں پودے کم ہوتے جاتے ہیں' پانی کے ریلے زور شور سے آتے ہیں - پھر ہم اپنی نادانی سے اس مصیبت کو کچھ اور بھی بڑھا لیتے ہیں- غم نداری بز بخر- جہاں بکری پالنا خود ایک درد سر ہے - وہاں یہ

ایک اور خطرے سے بھی خالی نہیں - جو بھی ہری چیز ہو، یہ جانور اسکے حق میں بلا ہے - اور انجان دیہاتی اسے کم خرچ جان کر اسکے ریوڑ کے ریوڑ پالتے جاتے ہیں - چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہری بھری جگہیں صاف ہوجاتی ہیں - سیلاب اور بھی زور شور سے آنے لگتے ہیں اور دریا اتنے چڑھتے ہیں کہ گاؤں کے گاؤں' شہر کے شہر بہا لے جاتے ہیں - یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں زمین کی ٹوٹ پھوٹ کی رفتار دنیا میں سب سے زیادہ ہے - اور اس سے بے اندازہ نقصان ہوتا ہے جو برابر بڑھتا ہی چلا جارہا ہے - ہمنے نادانی سے جنگلوں کے جنگل صاف کر ڈالے ہیں - اور انکی جگہ کوئی درخت نہیں اگائے - اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں - کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ جنگلات جیسی اہم قومی دولت کو محفوظ رکھیں، اسے ترقی دیں - ہم زمین سے طرح طرح کی فصلیں اگاتے ہیں تو اس کی طاقت بھی بڑھانی چاہئیے اور اسکے لئے کچی یا کیمیاوی کھاد برتنی چاہئیے - رہی بی بکری، تو اگر ہم اسکی جگہ بھیڑیں پالیں تو گوشت، اون، دودھ، سب کچھ ملے گا - اور قومی دولت بھی بڑھے گی -

''دونوں جہاں ہیں اب تو مرے اختیار میں''

دنیا میں جو بھی چیز ہے اس کا ذخیرہ لامحدود نہیں - غذا، ایندھن، پانی، تیل، دھاتیں وغیرہ جتنا ہم ان کو برتتے چلے جاتے ہیں اتنی ہی یہ چیزیں کم ہوتی جاتی ہیں - یہاں تک کہ ان کا قحط پڑنے لگیگا - اور ہم چیخنے لگیں گے کہ چائے کم ہوگئی، چاول نہیں رہے، گندم نہیں، لکڑی نہیں، کوئلہ نہیں، وغیرہ وغیرہ - ہم صنعتیں چلاتے ہیں، کارخانے بناتے ہیں - یہ بے شک بڑی فائدہ کی بات ہے - لیکن اس میں اس طرح کی چیزیں ہی تو کام آتی ہیں - اور پھر قدرتی طور پر کچے سامان کا توڑا پڑتا ہے - یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ بعض لوگ اپنا شوق پورا کرنے کیلئے رات دن شکار کھیلتے ہیں - اسکے لئے ایک تو گولیاں، کارتوس باہر سے لانے پڑتے ہیں - دوسرے جنگلات کی دولت— جانور اور پرندے بھی کم ہوتے جاتے ہیں -

ہمنے دن رات ات گت کھانے کی قسم کھا رکھی ہے اور وہ بھی گوشت - لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اسطرح ہماری ایک بڑی قیمتی قومی دولت کم ہوتی جا رہی ہے - جس سے اب سچ مچ ہمارے لئے ایک مسئلہ پیدا ہوگیا ہے -

یہ شوقینی بعض اوقات بڑی عبرتناک ثابت ہوتی ہے - لیجئے ہم یہاں کسی بڑے ٹھاٹھ دار ہوٹل میں بیٹھے ہیں، شراب ارغواں کا دور چل رہا ہے اور کسی دوسرے ملک سے مہ جبین رقاصاؤں کا ایک حشر آفریں طائفہ آیا ہوا ہے - جس کی جیبیں کیا کچھ نہیں بھری گئی ہوں گی - ہمنے اپنا شوق پورا کرنے کے لئے یہ جنس تو درآمد کرلی - لیکن ادھر ہسپتال میں ایک مریض دم توڑ رہا ہے - اور اسکے لئے کوئی نہایت ضروری، جان بچانے والی دوا موجود نہیں - اسلئے کہ ہم نے اسکو فضول سمجھکر درآمد ہی نہیں کیا - اگر ہم نے ایسی چیزیں منگوائی ہوتیں تو ہزاروں لاکھوں جانیں ضائع نہ جاتیں - بے شک ہم یہاں پی رہے ہوتے ہیں اور بڑی بڑی مہنگی لیکن ادھر کوئی شخص

بھوکا مر رہا ہوتا ہے ! پھر سوڈا اور سگریٹ ہیں تو بڑی معمولی چیزیں ۔ سگریٹ سے غم غلط ہوتا ہے ، دل بہلتا ہے ۔ اور سوڈے سے چھوٹے چھوٹے نفیس بلبلے پیدا کرنے والی میٹھی گیس پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن اسکو تیار کرنے کے لئے مشینی سامان اور سرمایہ کہاں سے آتا ہے اور ان کی شکل میں ہمیں کتنی قومی دولت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے ؟

آپ کہیں گے ہم بھی کیسی فضول باتیں کرنے لگ گئے ۔ ہم صاحب لوگ ٹھہرے اسلئے ہزاروں ٹن ٹائلٹ پیپر درآمد کرتے ہیں ۔ آپ جانتے ہی ہونگے کہ یہ شے لطیف کیا ہے ۔ پھر فلموں کو دیکھئے ۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے آنکھیں تو خوش ہوتی ہی ہیں لیکن ہمیں اپنی پونجی دوسروں کو نذر کرنی پڑتی ہے ۔

ہم طرح طرح کی مشینوں ، فریجیڈیئر ، اور کاروں وغیرہ کے دیوانے ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ جن کیلئے ہمیں دوسروں کا زیر بار ہونا پڑتا ہے ۔

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ دنیا میں کارکن اور سرمایہ برابر بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں ۔ اور انکو کام میں لگائے رکھنا ضروری ہے ۔ جس کے

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی !

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں !

لئے قدرتی وسائل لازمی ہیں ۔ وہ کہاں سے آئیں ؟ ہماری زمینی دولت، معدنی دولت، جنگلاتی دولت وغیرہ وغیرہ کب تک ہمارا ساتھ دے سکتی ہے ؟ لہذا ہمیں ان دولتوں کو صرف کرنے میں

''گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی
کتنی اونچی ہے بات بکری کی''

احتیاط سے کام لینا چاہئے، ان کی حفاظت کرنا چاہئے، جیسے بھی ہو سکے انہیں بڑھانا چاہئے ۔

ہمارے دیہاتی بھائی بھی اس دوڑ میں کچھ پیچھے نہیں ۔ گاؤں میں شادی بیاہ ، مرنے جینے اور دوسرے موقعوں پر رسموں ریتوں کے سلسلے میں کیا کچھ نہیں ہوتا ۔ پھر کتنے ہیں جو سال کا ایک تہائی حصہ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے گذار دیتے ہیں ۔ چوپال میں دن رات چوکڑی جمی رہتی ہے اور دے غپوں پر غپیں لڑائی جاتی ہیں ۔ اسطرح قومی وقت بھی، جو ایک نہایت اہم قومی دولت ہے ، ضائع ہو جاتا ہے ۔ پیسہ بچے گا تو اس سے امداد باہمی کی انجمنیں چلائی جاسکیں گی، گھریلو دستکاریوں کو مدد دی جاسکے گی ، صنعتی ترقی کے نئے نئے امکانات پیدا ہونگے۔قومی دولت کچھ روپے پیسے، صنعت و حرفت ہی تک محدود نہیں ۔ ہمارے طور طریق، پوشاک تہذیب ، روایات ، علوم و فنون ۔ یہ بھی تو بڑا اہم قومی سرمایہ ہیں ۔ اسکو بھی تو سنبھالنے سنوارنے، بڑھانے کی اتنی ہی ضرورت ہے ۔ مگر یہاں سوال ذرا عمرانی نوعیت کا بن جاتا ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو یہ ناچیز نہ اکبر الہ آبادی ہے نہ اقبال اور نہ ٹوائن بی جو اس موضوع کی داد دے سکے ۔ اسلئے بہترین داد یہی ہے کہ جو کچھ میں اپنی دانست میں دوسری دانائی کی باتیں کہ چکا ہوں ، انہیں پر اکتفا کروں *

دوسرا کنارہ — بقیہ صفحہ ۸۱

"لوگ کہتے ہیں چوہدری نے شاداں کا رشتہ طے کر دیا۔"

"چوہدری نے؟" شاداں نے حیران ہو کر کہا "اس نے مجھ سے کوئی بات نہ پوچھی!"

"شاہ دین ٹھیکیدار کے لڑکے شریف کے ساتھ۔"

"چوہدری کی غیرت کو کیا ہوا رحمتے؟ میں اگر زندہ رہی تو یہ رشتہ کبھی طے نہیں ہو سکتا۔"

"بی بی! تیری بات کون پوچھے گا؟ چوہدری ایک کھیت اور رہن رکھ رہا ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں شاداں کے ہاتھ پیلے کر کے وہ اپنا گھر بھی بسائے گا۔"

"مجھے چوہدری کی دوسری شادی پر کوئی دکھ نہیں رحمتے! پر شاداں میری بیٹی بھی تو ہے۔"

"بی بی! میں نے جو کچھ سنا تجھے بتا دیا۔" رحمتے نائن نے کہا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نائن کے جانے کے بعد سیداں چند لمحوں تک یوں کھڑی رہی جیسے زمین کے ساتھ چپک گئی ہو۔ اس کا جسم بت کی طرح بے حس و حرکت تھا۔ اس کی آنکھوں میں بیس سال کا سارا دکھ منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر شاداں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "ماں! تجھے کیا ہو گیا ہے؟" سیداں نے دکھ بھری ایک نظر شاداں پر ڈالی اور یہ نظر شاداں کے جسم کو پار کر گئی۔ اس نے تھرتھرا کر ماں کا بازو چھوڑ دیا۔

"شاداں! کیا تو چناب کے اس پار جانا چاہتی ہے؟"

"ہاں!" شاداں نے تڑپ کر کہا۔

"دیکھ میں نے تجھے وقت پر بتا دیا ہے۔ سوچ لے اگر چناب بپھر گیا تو تجھے دوسرا کنارہ نہ مل سکے گا۔"

"ہاں!" شاداں کا جسم کانپا اور ہونٹ تھرتھرا کر زرد پڑ گئے!

کیا آپ ٹائر میں ہوا کا صحیح دباؤ نہ رکھنے کے قصوروار ہیں؟

پٹرول کی بچت کرنے کے لئے ٹائر میں ہوا کے دباؤ کی جانچ کیجئے

ایسے ٹائر، جن میں ہوا کم ہو، نہ صرف جلد ضائع ہو جاتے ہیں بلکہ سڑک پر ٹائر کے زیادہ رگڑ کی وجہ سے آپ کی کار میں پٹرول بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنی گاڑی کے ٹائروں میں ہوا کے دباؤ کو کار کے ساتھ دی جانے والی ہدایات کے مطابق صحیح رکھا کیجئے، اور اس طرح پٹرول کی بچت کیجئے۔
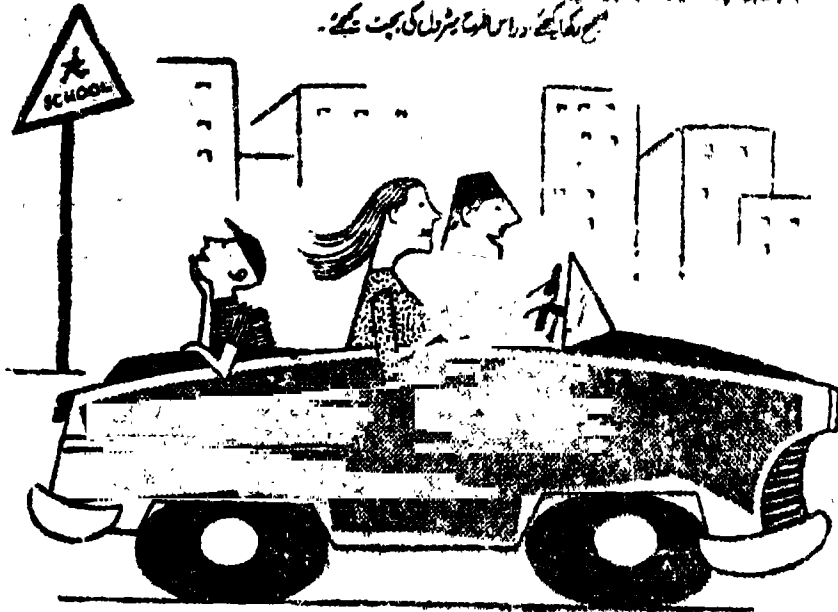
اور ہر میل پر پیسے کی بچت کے لئے

موبل گیس

استعمال کیجئے۔ اس کی بہترین گیس سے آپ کی کار زائد میل چلتی ہے

موبل آئل

کے استعمال سے آپ کی کار کا انجن زیادہ عرصہ تک کارآمد رہتا ہے

اسٹینوک کے یہ دونوں پراڈکٹس زیادہ بالکفایت ڈرائیونگ کیلئے مشہور ہیں

اسٹینڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے میں قائم شدہ) کراچی۔ ڈھاکہ۔ لاہور۔
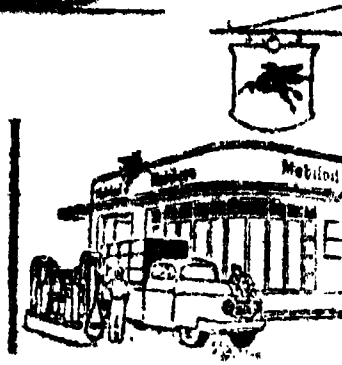
نزلہ؟
کھانسی؟
اس کا فوری علاج
لیکوفروٹا
یہ بچوں کیلئے بھی نہایت مفید ہے
آج ہی
ایک شیشی
خریدیئے
تفصیلات کے لئے: ایس جے اینڈ جی فضل الٰہی لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۴۹۱۱۳ کراچی

تعمیر کا دور

آنکھوں کا تارا۔ مستقبل کا سہارا

بچے والدین کی آنکھوں کا تارا اور مستقبل کا سہارا ہیں کیونکہ آگے چل کر یہی قوم کے
دست و بازو بنیں گے۔ ان کی صحت و توانائی اور صحیح تربیت پر ملک کی بہتری کا انحصار ہے۔
کیا مرد اور کیا عورتیں اب تو سب کو مل کر اپنے ملک کو عروج پر پہنچانا ہے۔ اس
مقصد کے پیش نظر معالجوں اور دواساز اداروں پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ قوم کے
ہر فرد کو امراض سے نجات دلانے میں پوری پوری کوشش کریں۔
ہمدرد اس فریضے کو ادا کرنے میں مقدور بھر کوشاں ہے۔ اس کے
ماہرین جو قدیم تجربات اور جدید تحقیقات سے بہرہ ور ہیں دن رات اسی دھن میں
لگے رہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ اور نئی نئی دوائیں کم سے کم قیمت پر مہیا
کریں تاکہ ہر خاص و عام کو فائدہ پہنچے۔

ہمدرد دواخانے نے اپنے آپ کو نوع انسانی کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے تاکہ بہتر سے بہتر طبی سہولتیں میسر آسکیں۔

یونانی طب کے
علم بردار
اور دواساز

جسم میں تازگی
لائف بوائے صابن کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد کے
ہر مسام سے جراثیم آلود میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف اور
ستھرا ہو جاتا ہے اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان
کر لیجیے کہ آپ کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن سے محفوظ رہے۔
لائف بوائے صحت مند زندگی کا ضامن ہے
LIFEBUOY
SOAP

اپریل ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور　　نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ
پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ
ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی

فی کاپی
آٹھ آنے

بیادِ مجلسِ اقبالؒ...

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے جہاں اور تدبیریں کی تھیں وہاں ۱۹۳۵ء میں میں نے ایک تجویز یہ پیش کی تھی کہ ہر صوبے اور علاقے اور دیسی ریاستوں میں اردو زبان کا جائزہ لیا جائے: یعنی اس قسم کی معلومات فراہم کی جائیں کہ وہاں اردو بولنے والوں اور لکھے پڑھوں کی کیا تعداد ہے۔ اردو کی تعلیمی اور دفتری حیثیت کیا ہے۔ کون کون سے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں۔ کس قسم کی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اردو مطبعوں اور اخباروں کی کیا حالت ہے۔ بول چال کی زبان کیسی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ ہمیں صحیح طور سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس برعظیم میں اردو کی کیا حیثیت ہے اور اس کا پھیلاؤ کہاں کہاں تک ہے۔ دوسرے جب ہر مقام کے حالات ہمارے سامنے ہوں گے تو جہاں جیسی ضرورت ہوگی اس کے مطابق کام کا ڈول ڈالا جائے گا۔ اس غرض سے میں لاہور بھی گیا اور اس تجویز پر غور کرنے کے لئے ایک مشاورتی مجلس کی۔ میں اور میرے ایک دو رفیق ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی ملنے گئے۔ ہم ملنے کے کمرے میں جا بیٹھے۔ کمرے کی دیواریں سب خالی تھیں۔ صرف ایک دیوار میں ایک جانب کوئن وکٹوریہ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ نہ معلوم کس نے لگا دی تھی۔ ہمارے آنے کی اطلاع پر ڈاکٹر صاحب فوراً تشریف لے آئے۔ میں نے اپنی تجویز بیان کرنی شروع کی اور آخر میں کہا میں چاہتا ہوں سارے ہندوستان میں اردو کی اشاعت کا جال پھیلا دوں۔ سن کر فرمایا "صرف ہندوستان میں؟" یہ تین لفظوں کا انتہائی مختصر جملہ بہت پُرمعنی تھا۔ یہ ایک حکیم شاعر کے دل کی آواز تھی۔ یعنی وہ اردو کو صرف برعظیم پاک و ہند ہی کی نہیں سارے ایشیا کی ممتاز زبان دیکھنا چاہتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور نے اپنے سالانہ جلسے میں "یوم اردو" بھی رکھا تھا اور اس کی صدارت کے لئے مجھ سے فرمائش کی تھی۔ میں لاہور گیا تو علامہ اقبال مرحوم نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔ مرحوم دن ہی میں کھانا کھا لیتے تھے۔ رات کو نہیں کھاتے تھے۔ میرا معمول اس کے برعکس تھا۔ دن میں نہیں کھاتا تھا رات کو کھاتا تھا۔ مرحوم نے میری خاطر اس روز دن میں کھانا نہ کھایا اور شب کے وقت میرے ساتھ کھایا۔ اس دعوت میں مولانا ظفر علی خاں اور چودھری محمد حسین بھی شریک تھے۔ کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس مضمون کا ایک بیان شائع کریں کہ ہم اردو رسم خط کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ دوسرے صاحبوں نے بھی اس کی تائید کی۔ میں سن کر چپ رہا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان حضرات کو میرے متعلق کچھ شبہ ہے اور یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میں کانگریس والوں سے اتفاق کر کے دیوناگری خط کی تائید نہ کر بیٹھوں۔ کیونکہ اس زمانہ میں ہندی والوں سے میری گفت و شنید بلکہ تنازعہ جاری تھا۔ میری خاموشی سے ان کا یہ شبہ اور قوی ہو گیا۔ جب یہ بات پھر چھڑی تو میں نے عرض کیا کہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ ہمارے حریف بڑے شاطر اور عیار ہیں۔ آپ ان سے معاملہ کرنا جانتے ہیں، نہ مقابلہ کرنا۔ میں ان کو خوب سمجھتا ہوں اور کوئی بات ایسی نہیں کرنا چاہتا جس میں پہل میری طرف سے ہو اور قابلِ الزام ٹھہروں۔ آپ چند روز صبر کیجئے اور پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہوگا وہی جو آپ کا منشا ہے مگر اس کا الزام ان کے سر رہے گا۔ میری یہ بات کچھ اُن کی سمجھ میں آئی اور شبہ بدستور باقی رہا۔

خدا کا کرنا کہ اس کے کچھ ہی دن بعد ناگپور میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا سالانہ جلسہ ہوا۔ میں اس کی مجلس عاملہ کا رکن تھا۔ وہاں مجھ میں اور گاندھی جی میں زبان کے متعلق جو گفتگو ہوئی اس میں قدرے گرمی پیدا ہو گئی تھی۔ اس بحث کو اب تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جب گاندھی جی نے ذرا جھنجھلا کر یہ کہا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ آپ اسے چاہے رکھیں یا نہ رکھیں۔ اس پر میں نے کہا کہ جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں۔ ہم اسے انشاء اللہ زندہ قائم رکھیں گے اور حدِ کمال تک پہنچا کے چھوڑیں گے۔ اب علامہ اقبال میری مذکورہ بالا گفتگو کی تہ تک پہنچے۔

اس زمانے میں انجمن کا صدر مقام ریاست حیدر آباد دکن میں

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

اقبال - ایک آفاقی شاعر

ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم
مترجمہ، صوفی احمد وحید اختر

اقبال کی نظمیں دُنیا کی بیشتر زبانوں خصوصاً انگریزی، جرمن، اٹالین اور روسی میں ترجمہ کی جاچکی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں فرانسیسی ترکی اور عربی میں بھی ترجمہ کی جاچکی ہیں۔ اقبال نے زیادہ تر اردو اور فارسی میں لکھا۔ اور بعض نقادوں کا دعویٰ ہے کہ نہ صرف ضخامت بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی اقبال کی فارسی شاعری اس کے کلام کا بہترین حصّہ ہے۔ اقبال نے ایران، عرب اور ہندوستان کے میل جول کی اس عظیم روایت کو، جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے معرضِ وجود میں آئی تھی، قائم رکھا۔

مسلمان تقریباً ۷۱۲ء میں مکران پہنچ چکے تھے۔ مسلمانوں کی سلطنتیں اس کے بعد ہندوستان میں قائم ہوئیں۔ اور ان ہی کی وجہ سے ہندوستان مستقل طور پر مغربی ایشیا سے منسلک ہوگیا، عرب، ایران اور ہندوستان کے اس تہذیبی اور تمدنی تعلق نے ایک نئے ادب اور ایک نئی زبان کو جنم دیا۔ یہ ادب "اردو ادب" اور یہ زبان "اردو زبان" تھی۔ یہ زبان عربی اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس کے ذخیرۂ الفاظ میں ہزارہا عربی اور فارسی الفاظ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ڈھانچہ خالص ہندوستانی ہے۔

اقبال نے اس مشترکہ تہذیبی اور تمدنی میراث کو اپنی شاعری کی بنیاد قرار دیا۔ اسی لئے بعض مغربی نقادوں نے (اور مغربی انداز میں سوچ بچار کرنے والے بعض دوسرے نقادوں نے بھی!) اقبال کو محض مسلمان شاعر قرار دیا۔ یعنی ایسا مسلمان شاعر جس کی شاعری کا محور صرف مسلمان قوم ہے۔ اور جو انہی کے متعلق سوچ بچار کرتا ہے۔ بالفاظِ دگر اقبال کی شاعری آفاقی نظریات کی حامل نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی اقبال کی شاعری کو غلط معانی دینے سے پیدا ہوئی اور اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اٹلی کا عظیم شاعر "ڈانٹے" ایک راسخ الاعتقاد عیسائی تھا۔ اس کی شہرۂ آفاق تصنیف "ڈیوائن کامیڈی" کا دوسرا حصّہ "جہنم" غیر عیسائیوں اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں پر متعصبانہ اعتراضات سے پُر ہے۔ اس کے باوجود ڈانٹے کا شمار دنیا کے عظیم ترین شعراء میں کیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اقبال نہ کٹر قسم کا مذہبی انسان تھا اور نہ متعصب۔ اس کی شاعری کسی بھی مذہب کے متعلق توہین آمیز انداز اختیار نہیں کرتی۔ اس کا اعتقاد عالمی اتحاد و یگانگت پر راسخ تھا۔ چونکہ اسلام اسی نظریہ کا حامی ہے، اسلئے اقبال نے اپنے شاعرانہ وجدان کے لئے اسلام ہی کو موزوں و مناسب خیال کیا۔ عالمی اتحاد و یگانگت پر اقبال کا ایمان کس قدر راسخ تھا، اس کا اندازہ ان کے نظریۂ عظمت آدم سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے، لہٰذا اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا خود انسانیت کی بہت بڑی توہین ہے ؂

آدمیت ، احترامِ آدمی!

اقبال اس نظریہ کا حامی ہے کہ ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ اور آزاد انسان کو کسی دوسرے آزاد انسان کا غلام ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ چونکہ ہم آزاد ہیں اسلئے ہم میں امتیاز من و تو ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔

انسانی آزادی سے گہری محبت اور لگاؤ ہی اقبال کی شاعری کو آفاق کی بلندیوں میں بہت اونچا لے جاتا ہے۔ اقبال کی پہلی کتاب "اسرارِ خودی" تھی۔ جسے ڈاکٹر نکلسن نے انگریزی میں "SECRETS OF SELF" کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ "اسرارِ خودی" ایک مثنوی ہے۔ یہ تصنیف جنگِ عظیم اوّل سے قبل ترتیب دی جاچکی تھی۔ اس میں اقبال نے اپنا فلسفۂ خودی پیش کیا ہے، انسان کی شخصی آزادی اور شخصیت کی حفاظت پر زور دیا ہے اور خودی سے متعلق اپنے اصول اور نظریات واضح کئے ہیں۔ اسکا پہلا ہی شعر یہ ہے ؂

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است

ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

اپنی جگہ پہ یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان چونکہ "مخلوق" ہے، اسلئے وہ "خالق" کے تابع ہے لیکن اقبال کا کہنا ہے کہ "خالق" بھی "مخلوق" کا دست نگر ہے۔ اور "مخلوق" کے بغیر "خالق" کا وجود محلِ نظر! اور وہ اس طرح کہ "کوئی مخلوق بغیر خالق کے نہیں اور کوئی خالق بغیر مخلوق کے نہیں۔"

اقبال کہتے ہیں ؎

نہ اُو را بے نمودے ما کشودے

نہ ما را بے کشودِ اُو نمودے

اسی نقطہ پہ اس نے دوبارہ ان الفاظ میں زور دیا ہے ؎

نہ اُو بے ما نہ ما بے او چہ حال است!

فراقِ ما فراق اندر وصال است

نہ ما را در فراقِ او عیارے

نہ او را بے وصال ما قرارے

یہ خیال بڑی حد تک شیخ اکبر کے اس عربی شعر سے ملتا جلتا ہے ؎

فلولاہ ولولا نا م

فما کان الذی کا نام

لیکن اقبال ایک صوفی شاعر نہیں کہ وہ اس مابعد الطبیعاتی فکر میں کھو جائے۔ انسان اور خدا کے درمیان یہ روحانی رشتہ جسے "الوھیۃ" کہا جا سکتا ہے، اقبال کو ایک نیا نقطہ سمجھاتا ہے۔ کہ وہ انسان کو اپنی روح کو بلند کرنے کا سبق دے! چنانچہ اقبال یہ کہتے ہیں ؎

اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن

یکتائی و بسیاری، پنہائی و پیدائی

اور یہ کہ انسانی "الوھیۃ" اور عظمت کسی کٹر قسم کے مذہبی جنون کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اقبال تو یہاں تک کہہ گیا کہ اگر موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ بھی ہو تو بھی زندگی اس طرح گزارنی چاہیئے کہ جب انسان مرنے لگے تو خود خدا بھی یہ سوچنے پہ مجبور ہو جائے کہ میں یعنی خدا نے اُسے حیاتِ جاوید کیوں نہ عطا کی ؎

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگِ دوام

خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

اقبال کے نزدیک زندگی ہر لمحہ بدلتی ہوئی متحرک اقدار سے عبارت ہے ؎

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نہ سازد

دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے

تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے

سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم

غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے

نہ نوائے دردمندے نہ غمے، نہ غم گسارے!

زندگی جد و جہد ہے ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا

نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است!

ایک پرانی کہاوت ہے کہ "اگر دنیا تمہارا ساتھ نہیں دیتی تو تم دنیا کا ساتھ دو"۔ اقبال نے اس سے بالکل مختلف نظریہ پیش کیا ہے ؎

مسلمانے کہ داند رمز دیں را

نساید پیش غیر اللہ جبیں را

اگر گردوں بکامِ او نہ گردد

بکامِ خود بگرداند زمیں را

اقبال کے تمام شعری مجموعوں — "اسرارِ خودی"، "رموزِ بے خودی"، "پیامِ مشرق"، "جاوید نامہ"، "زبورِ عجم"، "ارمغانِ حجاز"، "ضربِ کلیم"۔ اور "بانگِ درا" میں یہی بنیادی تصور رہا ہے۔ اس کی تمام نظمیں زندگی سے محبت اور محبت کی زندگی سے بھرپور ہیں۔ انسانی آزادی اور انسانی عظمت، اقبال کی شاعری کی جان ہیں۔ یہاں میں صرف ایک غزل اور ایک نظم کا حوالہ دینے پر اکتفا کروں گا۔ جن سے فکرِ اقبال کے مختلف گوشے روشن ہو جائیں گے۔ نظم ہی کی طرح غزل بھی مسلسل ہے۔ اور اس میں ایک ہی خیال بیان کیا گیا

۴- غزل کا عنوان ہے "میلادِ آدم" ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اس غزل کا بنیادی خیال "تصورِ خودی" ہے۔ انسان خودگر، خودشکن اور خودنگر ہے، اور یہ انسان، یہ خودگر و خودشکن اپنے ماحول کی ناخوشگواریوں پر کبھی قناعت نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ اپنی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ایک نئی آزاد دنیا کا خواہاں ہوتا ہے ایک ایسی دُنیا جو ظلم و ستم اور سود و زیاں سے آزاد ہو۔ اپنے حالات سے یہ بے اطمینانی انسان کو اقتصادی دنیا اور اس کی ناانصافیوں سے بھی آگے لے جاتی ہے۔ اور پھر وہ ان تمام پابندیوں کے خلاف بغاوت پہ آمادہ ہو جاتا ہے جو قدرت نے انسان پہ لگائی ہیں۔ وہ انسان کی بنائی ہوئی دنیا اور خدا کی بنائی ہوئی دنیا، دونوں سے بہت اونچا پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان اور خدا کے مابین ایک مکالمہ میں خدا کہتا ہے:

جہاں را زیک آب و گل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیغ و تفنگ آفریدی!
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

اور اس کا جواب انسان یوں دیتا ہے ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال کی نظمیں اگرچہ فلسفیانہ موضوعات کی حامل ہیں لیکن وہ تغزل کی چاشنی سے بھی محروم نہیں۔ اقبال کے اعتقادات صرف خشک قسم کے نظریات نہیں اور نہ اس کا پیغام محض پند و نصیحت ہے۔ اقبال نے مغربی فکر اور فلسفہ کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اس وقت کیمبرج اور ہائیڈلبرگ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی جب کہ ہائیڈلبرگ کو ایک علمی درسگاہ کا مقام حاصل تھا۔ اور آج کی طرح وہ نازی پروپیگنڈے کا مرکز نہ تھی۔

اگرچہ اقبال نے مغرب کی سائنسی ترقی کو ہمیشہ سراہا اور مغربی یونیورسٹیوں میں خاصی دیر تک تعلیم کی غرض سے رہا۔ پھر بھی اس نے مغرب کی اندھا دُھند تقلید نہیں کی۔ وہ بین الاقوامیت کے حامی تھے۔ اسی لئے وہ یورپی ریاستوں کے ان نظریات کی مخالفت کرتے تھے جو قوموں میں تفریق و امتیاز کریں۔ اس کا ایمان انسان کے عالمی اتحاد و یگانگت اور مساوات پر تھا۔ اسی لئے وہ معاشرتی طبقات کی تقسیم کے سخت خلاف تھا۔

علامہ اقبال عربی، فارسی اور ہندوستانی فکر و فلسفہ میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا جامع اور ٹھوس تھا۔ وہ مشرق کی بیداری اور حیاتِ نو کے بے حد خواہاں تھے۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے فکر اور خیالات کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ایک پُل کا کام کیا ہے۔

★

اقبال کا نظریۂ حرکت

عبدالرحمٰن فگار

کائنات کی آفرینش کا راز، انسان کی تخلیق کا مقصد اور اس وسیع کائنات میں انسان کا مقام، یہ ایسے سوالات ہیں جن کا حل تلاش کرنے میں انسانی فہم آج تک سرگرداں ہے اور یہی سوالات فلسفہ کی بنیاد ہیں۔ جس طرح تقریباً تمام علوم کا سرچشمہ یونان ہے اسی طرح ان مسائل پر فلسفیانہ تحقیق و جستجو کی ابتدا بھی یونان ہی سے ہوئی۔

چھٹی صدی قبلِ مسیح کا فلسفی اینے کسی مینڈر غالباً پہلا شخص ہے جس نے ایک لامتناہی حرکت کو کائنات کے وجود کا سبب قرار دیا۔ پانچویں صدی قبل مسیح کے مفکرین ایمپی ڈوکلیز، ہراکلیٹس اور اناکساگورس نے بھی قانونِ حرکت کو کائنات کے وجود کا سبب بتایا اور ذہن کو طبیعی تبدیلیوں کا موجب ٹھہرایا۔ ان کے نزدیک ذہن حرکت کا سبب اور تمام تخلیق اور کائناتی حرکت کا موجب ہے۔ ان کے بعد لیوسیپس اور دیموقراطیس نے نظریۂ جوہر پیش کیا۔ دیموقراطیس ایک خاص مادی مفکر تھا جس نے نظریۂ حرکت کو سائنٹفک بنیادوں پر استوار کیا۔ اس کے نظریہ کی رو سے کائنات جوہروں کا مجموعہ ہے حتیٰ کہ روح بھی جوہروں سے مل کر بنی ہے اور ذہن ایک طبیعی عمل کا نتیجہ ہے۔ کائنات میں کوئی مقصد یا ارادہ کارفرما نہیں ہے۔

ہرکلیدس (۳۸۸ تا ۳۱۵ ق.م) نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ زہرہ اور عطارد سورج کے اطراف گردش کرتے ہیں اور زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔

ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲ ق.م) بھی حرکت کے نظریہ کا قائل تھا مگر اس کے نزدیک حرکت کا موجب ایک غیر متحرک علتِ اولیٰ (خدا) ہے۔ ارسطو کے طبیعی نظریات سولھویں صدی عیسوی تک ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کئے جاتے رہے لیکن بعد میں جدید سائنس نے ان نظریات کو ناقابلِ تسلیم قرار دیا۔

سترھویں صدی عیسوی میں جدید سائنس کی بنیاد پڑی۔ اگرچہ اس کی ابتدا کوپرنیکس ہی کے زمانہ سے ہو چکی تھی۔ سترھویں صدی میں گلیلیو (۱۵۶۴ تا ۱۶۴۲ء) نیوٹن، (۱۶۴۲ تا ۱۷۲۷ء) اور کیپلر (۱۵۷۱ تا ۱۶۳۰ء) کی تحقیقات اور انکشافات نے قدیم سائنس، خصوصاً ارسطو کی طبیعات کو ناقابلِ فہم بلکہ تقریباً مہمل ٹھہرایا۔ گلیلیو اور نیوٹن کے نظریات نے حرکت کے قدیم تصور کو یکسر بدل دیا۔ نیوٹن کا "پہلا اصولِ حرکت" قدیم سائنس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس سے پہلے حرکت کے موجب بیرونی عوامل کو غیر مادی یا مابعدالطبیعاتی حیثیت کا حامل سمجھا جاتا تھا لیکن جدید سائنس نے ایسے کسی غیر مادی عوامل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کائنات میں انسان کے مقام اور اس کی اہمیت کے بارے میں تصورات بھی بدل گئے۔ اس وسیع کائنات میں کرۂ ارض ایک حقیر ذرہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور زمین پر انسان کے وجود کا کائناتی نظام سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جب کائنات کی آفرینش کے پیچھے کوئی ارادہ کارفرما نہیں ہے تو اس میں انسان کے وجود کی کیا اہمیت رہی۔

جدید مادیت کے نزدیک کائنات ایک وسیع میکانی نظام ہے جس کی بنیاد اصولِ حرکت پر ہے۔ زندگی دورِ ارتقا کا ایک حادثہ ہے۔ ایک اتفاقی واقعہ جس کے دوران مادہ میں شعور پیدا ہو گیا۔ مادہ ہی ایک بنیادی حقیقت ہے

اور زندگی کے تمام مظاہر اسی بنیادی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ مادّہ اصولِ حرکت اور اصولِ سلسلۂ اسباب کا پابند ہے انسان کی زندگی اور اُس کی ہر حرکت اسی قانون پر مبنی ہے۔

سترھویں صدی کا اہم ترین عمرانی مفکر ہابس (۱۵۸۸ تا ۱۶۷۹ء) ہے جس نے گلیلیو کے نظریات پر عمرانی فلسفہ کو تشکیل دینے کی کوشش کی اور اصولِ حرکت پر ایک مکمل سیاسی نظام پیش کیا۔ ہابس کے نزدیک معاشرہ نامیاتی نہیں بلکہ ایک میکانی نظام ہے جس کا وجود قانونِ حرکت پر ہے۔ انسانی زندگی کی بقا اور تسلسل کا دار و مدار کسی مقصد پر نہیں بلکہ ایک سلسلۂ اسباب پر ہے اور یہ سلسلۂ اسباب ایک نفسیاتی میکانی نظام ہے۔ انسان میں احساس و شعور ہے مگر یہ بھی ذرات کی حرکت کا دوسرا نام ہے۔ ہر ذہنی حادثہ (EVENT) اور ہر انسانی عمل ذرات کے انتقال، ترتیب و بے ترتیبی اور حرکت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس حرکت کے پس پردہ تحفظِ ذات کا جبلّی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔

ان بنیادوں پر ہابس نے وہ سیاسی نظریہ پیش کیا جو منطقی حیثیت سے تو معقول ہے مگر اس کے نتائج بڑے خوفناک ہیں۔ اس منطقی ترتیب و یکسانیت کے باوجود ہابس نفسیات اور طبیعات کو ہم آہنگ کرنے اور مادّہ و شعور کو یکساں قرار دینے میں ناکام رہا۔

مادّی مفکرین کے لئے یہی سب سے بڑی دشواری تھی۔ سترھویں صدی کے عظیم مفکر ڈیکارٹ نے اس معمہ کا حل پیش کرنے کی کوشش کی اور مادّہ و شعور کی دوئی کا تصور پیش کیا مگر زندگی کی یہ گتھی پھر بھی سلجھ نہ سکی۔

فلسفۂ مادّیت کے نزدیک کائنات کے پیچھے کوئی ارادہ کارفرما نہیں ہے۔ زندگی ارتقاء کا نتیجہ ہے اور یہ عالمِ مادّی ایک بے شعور مادّی قانون کا پابند ہے۔ انسان بھی اس بے شعور نظام کا ایک بے بس اور نہایت حقیر پرزہ ہے انسان کی تخلیق کا بھی کوئی مقصد نہیں اور نہ وہ اپنے اعمال کے لئے کسی قوت کے سامنے جوابدہ ہے۔

اقبالؔ نے مادیت کی اس ہمہ گیری سے انکار کیا۔ مادّی فلسفہ کی تردید ان ہی بنیادوں پر کی جاسکتی تھی جن پر اس کی تعمیر ہوئی۔ چنانچہ حرکت کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اسی بنیاد پر دوسرا مثبت فلسفہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک زندگی کی اصل ایک یزدانی وحدت ہے جو کثرتِ مظاہر میں جلوہ ریز ہے۔ ؎

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر

زندگی مسلسل حرکت کا دوسرا نام ہے۔ یہ ازل سے رواں دواں ہے۔ یہ ایک سیل ہمہ گیر ہے جس کی موجِ بلا میں انقلاباتِ زمان و مکاں اور گردشِ مہ و سیارہ اسیر ہیں۔ زندگی ایک بے تاب اور مضطرب قوت ہے جسے سکون و ثبات نصیب نہیں ؎

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

زندگی مسلسل حرکت اور آزاد قوت کی شکل میں، کمال کی جستجو میں رواں ہے۔ کائنات اسی مضطرب قوت کے ذوقِ کمال کا تراشیدہ ایک عارضی پیکر ہے مگر اس کا ہر نقش ناتمام اور ہر پیکر فریبِ نظر ہوتا ہے کیونکہ یہ اُس انتہائے کمال کا آئینہ دار نہیں ہوتا۔ کائنات میں مسلسل شکست و ریخت اور تبدیلی اسی لئے ہوتی رہتی ہے کہ یہ ابھی ارتقا کی منزلوں سے گزر رہی ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

در اصل یہ کائنات اُسی ایک قوتِ حیات کے ذوقِ نمود کا ایک مظہر ہے جسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، جس کے مظاہر تخلیق رنگا رنگ اور بوقلموں ہیں اور قانونِ انقلاب و تغیر کے زیرِ اثر فنا و بقا کے اضافی مدارج سے گزرتے ہوئے ایک خوب تر پیکر کی تخلیق کے لئے راستہ ہموار کرتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کائنات نقاشِ ازل کا ایک تخیلی پیکر ہے جو ابھی ناتمام ہے اور اُس کے ذہن میں کمال کے مدارج طے کر رہا ہے۔

گماں مبر کہ بسر شتند در ازل گل ما
کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیرِ وجود

اسرارِ خودی میں اقبال نے اسی خیال کو زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے:

"کائنات ایک مکمل تخلیق نہیں بلکہ اب بھی معرضِ تشکیل میں ہے۔ یہ ایک مکمل نظام نہیں کیونکہ تخلیقی عمل اس میں مسلسل جاری ہے اور اس عملِ تخلیق میں انسان بھی اپنا حصّہ ادا کرتا ہے۔" (دیباچہ اسرارِ خودی)

زندگی ایک متحرک ملکوتی قوت ہے۔ جب اس قوت کو اپنے وجود، اپنی انفرادیت اور عظمت کا احساس ہوتا ہے تو یہ "خودی" کہلاتی ہے اور اس طرح یہ ایک محسوس قوت کی شکل میں مظاہرِ عالم میں ظاہر ہوتی ہے ؎

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

یہ ہنگامۂ بود و نبود اور رستخیزِ حیات خودی کی سیمابی فطرت اور اس کی بے تابی و آشفتگی کا نتیجہ ہے اور اس بے تاب قوت کے وجود و بقا کا انحصار اس کی دائمی حرکت پر ہے۔ خودی مسلسل حرکت اور حالتِ کشاکش کا دوسرا نام ہے لیکن اس قوت کا تعین اسی وقت ہوتا ہے جب یہ کسی محسوس اور مادی پیکر میں موجزن ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے تعین اور احصا کے لئے انسانی وجود کا انتخاب کیا اور اس طرح یہ انسانی شعور سے ہم آہنگ ہو کر خودی کہلائی۔ انسانی وجود میں خودی کی جلوہ گری زندگی کا نقطۂ کمال ہے۔ اس طرح انسان خدا کی تخلیق کا شاہکار ہے۔ اب کائنات میں انسان کو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی۔ اب اس کا وجود کسی بے شعور مادی قانون کا پابند نہیں بلکہ کائنات کی آفرینش کا مقصد قرار دیا گیا ؎

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

پہلے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ کائنات میں ایک ہی قوت جاری و ساری ہے اور اس کی حرکت اور کشاکش پر خود اس کے وجود کا انحصار ہے جیسا کہ خود اقبال نے اس بات کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

"خودی ایک حالتِ کشاکش کا نام ہے۔ یہ اسی وقت تک باقی رہ سکتی ہے جب تک اس میں یہ کشاکش باقی رہے" (دیباچہ اسرارِ خودی)

جب سارے نظامِ کائنات کا دارومدار اصولِ حرکت پر ہے تو اس کائناتی نظام کا اہم ترین جزو ہونے کی حیثیت سے انسان اس قانون سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ کائناتی نظام اور انسانی نظام میں بھی ہم آہنگی ہو۔

چنانچہ کائناتی خودی کے اظہار کا پہلا مرحلہ انسان کا اپنی عظمت کا احساس و شعور ہے۔ اس شعورِ عظمت کے بعد کائنات میں انسان کو صرف اپنا ہی وجود دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ اپنے ماسوا ہر موجود سے انکار کرتا اور اس طرح اپنے وجود کا اثبات کرتا ہے۔ انکار انسانی فطرت کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا اقرار و اثبات۔ انکار شعورِ انفرادیت کی علامت ہے۔ انکار سے حرکت پیدا ہوتی ہے اور محض اثبات سے جمود و سکون۔ خود اعتمادی، آزادی اور اپنی قوت کا احساس پیدا کرنے کے لئے انکار ضروری ہے۔ تخلیقی تحریک انکار ہی سے پیدا ہوتی ہے ؎

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست
ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز
تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز
ہر کرا ایں سوز باشد در جگر
ہولش از ہولِ قیامت بیشتر
لا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے
ایں غوِ رعد است نے آواز نے
ضربِ او ہر بود را سازد نبود
تا بروں آئی ز گردابِ وجود

انکار کی تندی سے دل میں سوز و گداز اور تپش و اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ شیطان کے دل کا وہ سوز و گداز جس نے

مجاد — ایک نیا ستارۂ فن

(مضمون : ص : ۵۴)

اشکال نگاری

''کاشے'' کا کام (طائران خوش الحان)

کندہ کاری ۔ (ہرن)

عشق کو شوریدگی اور عقل کو آسماں پیمائی عطا کی جرأتِ انکار ہی کی رہینِ منت ہے۔ جبریل کے طنز پر کہ ؎

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

شیطان جواب دیتا ہے ؎

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

جرأتِ انکار انسان کو کورانہ تقلید کی بندش سے آزاد کرتی ہے۔ توحید کی حقیقت تک رسائی کا پہلا مرحلہ ماسوا سے انکار ہے یہ ایک براہیمی حرکت ہے۔ اس سے طبیعت میں قوت و ہیجان، بغاوت و جستجو اور سخت کوشی پیدا ہوتی ہے۔ انکار ایک خدائی صفت ہے، یہ ایک کبریائی قوت ہے جس کے شرار کی حرارت خاکِ آدم میں شعلہ زن ہونی چاہیئے۔ انکار سے نظر میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبۂ پیدائی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ انسان کے ذوقِ انکار سے بیگانہ ہو جانے پر شیطان بھی اس کمزور اور خام حریف کی نا اہلی کا خدا سے شکوہ کرتا ہے ؎

اے خداوندِ صواب و ناصواب   من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچگہ از حکمِ من سر بر نتافت   چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ ابا بیگانۂ   از شرارِ کبریا بیگانۂ

لیکن مطلق انکار بھی اصولِ حرکت کے خلاف ہے کیونکہ حرکت حالتِ کشاکش یا دو قوتوں کی متوازن کشمکش کا نام ہے مطلق انکار شیطانی صفت ہے اور ایسا انکار انسان کو کسی منزل پر نہیں پہنچاتا بلکہ شک و بے یقینی کی تاریکیوں میں گمراہ رکھتا ہے۔ اس لئے انکار کے ساتھ اثبات بھی ضروری ہے موجودہ بے خدا مادیت جس نے انسانیت کو دو عظیم جنگوں کی ہولناکی کا نشانہ بنایا اسی مطلق انکار کا نتیجہ ہے ؎

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا اِلّا
پیامِ موت ہے جب لا ہوا اِلّا سے بیگانہ

وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اُس ملت کا پیمانہ

انکار و اثبات میں ہم آہنگی اور توازن سے فطرتِ سلیمہ کا ظہور ہوتا ہے اور خودی میں تخلیقی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ انکار کی تخریبی قوت بے لگام ہو کر خود کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور اس کا مقصد دنیا میں صرف تخریب رہ جاتا ہے اور انسان دیوِ بے زنجیر کی طرح شکست و ریخت کی قوت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ع دیوانہ بہ کارگہ شیشہ گر رسید

قوموں کی زندگی اور بقا و عروج کے لئے دونوں قوتوں میں توازن ضروری ہے ؎

در مقامِ لا نیاساید حیات   سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا سازو برگِ امتاں   نفئ بے اثبات مرگِ امتاں
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نوں   حرکت از لا زاید از اِلّا سکوں

خودی کی بقا اُس کی تخلیقی حرکت پر منحصر ہے اور خودی مسلسل شعوری حرکت کا نام ہے۔ چونکہ وجود سے مراد جوہرِ خودی کی نمود ہے (وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود) اور انسانی وجود کائناتی خودی کی آماجگاہ ہے لہذا اس کے لئے بھی تخلیقی عمل ضروری ہے۔ انسان کا تخلیقی عمل اُس کی قوتِ فکر سے ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی فکر کی یہی تخلیقی قوت ہے جو اُسے خدائی صفت کا حامل بناتی ہے۔ انسان اپنی قوتِ فکر سے ایسے جہانِ نو پیدا کرتا ہے جو اس جہانِ ناپائیدار کے مقابلہ میں لافانی، زیادہ حسین اور دلکش ہوتے ہیں ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

لیکن فکر میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے اس میں مسلسل تبدیلی اور ندرت ضروری ہے۔ فکر میں سکون اور ٹھیراؤ اُس کی تخلیقی صلاحیت کو ختم کر دیتا ہے۔ فکر میں جدت اور اُس کی سیمابی فطرت سے زندگی میں حرارت اور ارتقا و جِلا پیدا ہوتی ہے۔ فکر و عمل کی اس حرکت کو اقبال نے "ندرتِ فکر و عمل" کا نام دیا ہے۔

؎ ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب

جب انسان میں بلند نظری پیدا ہوتی ہے تو لافانیت کا حصول اس کا آخری اور انتہائی مقصد ہو جاتا ہے۔ لافانیت سے زیادہ کسی چیز میں لذت نہیں۔ ہر تخلیقی فکر کے پیچھے یہی آرزو کارفرما ہوتی ہے فاتح، موجد، ادیب و شاعر، ان سب کی تخلیقات اور معجزاتِ ہنر کا محرک صرف یہی لافانیت کی آرزو ہوتی ہے اور انسانی خودی کے لافانی بننے کا انحصار بھی "ندرتِ فکر و عمل" پر ہے۔ اسی بات کو اقبال نے اسرارِ خودی کے دیباچہ میں وضاحت سے پیش کیا ہے۔ "خودی کی لافانیت ایسا مقصد ہے جس کا حصول زندگی میں ایسے طرزِ فکر و عمل کے اختیار کرنے پر منحصر ہے جو خودی کی حالتِ کشاکش کو باقی رکھ سکے۔ اس طرح اگر ہمارا عمل اس حالتِ کشاکش کو باقی رکھتا ہے تو خودی موت کے صدمہ سے بھی متاثر نہیں ہو سکتی ؎

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

لیکن ندرتِ فکر و عمل کے لئے بھی ایک محرک ضروری ہے اور یہ محرک سوزِ آرزو ہے۔ آرزو سے جمود میں حرکت پیدا ہوتی ہے، گرمیٔ آرزو سوزِ حیات کی باعث ہے۔ نگار خانۂ حیات کی ساری رونق اور یہ سارا ہنگامۂ مسابقت گرمیٔ آرزو کی وجہ سے ہے۔ آرزو جذبۂ اظہار ذوقِ کمال اور خودشناسی و خودنگری پیدا کرتی ہے ؎

زندگی بر آرزو دارد اساس　　خویش را از آرزوئے خودشناس
آب و گِل را آرزو آدم کند　　آرزو ما را ز خود محرم کند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی　　موجِ بے تابے ز دریائے خودی

لیکن قانونِ حرکت کا تقاضا ہے کہ آرزو میں بھی مسلسل تبدیلی، تغیر و حرکت و انقلاب ہو ورنہ دیرینہ آرزوئیں سرد ہو کر حسرتوں میں بدل جاتی ہیں اور خودی کی آب و تاب اور زندگی کی حرارت ختم ہو جاتی ہے ؎

درگذر از رنگ و بوہائے کہن　　پاک شو از آرزوہائے کہن
این کہن ساماں نیرزد باد و جَو　　نقشبندِ آرزوئے تازہ شو

ہر آرزو کے پیشِ نظر کسی مقصد کا حصول ہوتا ہے۔ بے مقصد آرزو بے معنی چیز ہے۔ مقصد کی لگن آرزو میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ خودی کی بقا اور اس کی تابناکی کے لئے بھی ایسی خلاق آرزو چاہئے۔ جو ہر لمحہ بلند مقاصد کی تخلیق کرتی اور ان کے حصول کے لئے بےچین رہتی ہے ؎

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز　　از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثلِ سحر تابندۂ　　ماسوی را آتشِ سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالاترے　　دلربائے، دلستانے، دلبرے
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　وز شعاعِ آرزو تابندہ ایم

"زندگی ایک ترقی پذیر اور جاذب حرکت ہے جو اپنے راستہ کی تمام رکاوٹوں کو اپنے میں سمو کر دور کرتی ہے اور جس کی بقا آرزوؤں اور مقاصد کی مسلسل تخلیق پر منحصر ہے"۔ (دیباچہ اسرارِ خودی)

عشق اسی گرمیٔ شوق اور سوزِ آرزو کا نام ہے جو کسی مقصد کی لگن میں ہو۔ عشق وہ نور ہے جو ایک ذرۂ بے مایہ کو پروانگی سکھاتا اور زندگی کی شب تاریک کو فروزاں کر دیتا ہے۔ عشق کی تادیب سے عقل کی سرکشی و ہرزہ گردی دور ہوتی ہے۔ عشق سے وہ جرأت پیدا ہوتی ہے جو انسان کو خدائی کا رازداں بناتی اور اسے خدا سے قریب کرتی ہے۔ عشق کائنات میں حسن و جمال تلاش کرتا اور انسانی فطرت کو کمال پر پہنچاتا ہے۔ جذبۂ عشق انسان اور ذاتِ مطلق کی انفرادیت کو باقی رکھتا اور دونوں میں ایک لطیف پردہ حائل کرتا ہے۔ عشق سے جذبہ کی تہذیب ہوتی ہے اور شریعت و اخلاق کے مقاصد کا تعین ہوتا ہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

"عشق سے خودی کا استحکام ہوتا ہے اور استقرارِ مقاصد کی تخلیق اور ان کے حصول کی جدوجہد پر عشق کے کمال کا انحصار ہے"۔ (دیباچہ اسرارِ خودی)

عشق انسان اور خدا کے درمیان فاصلہ اور انفرادیت باقی رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اور انسانی خودی کے لئے انفرادیت کے تصور کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انفرادیت ہی بندہ اور خالق کے درمیان حد پیدا کرتی ہے۔ انفرادیت کی بقا سے اختیار حاصل ہوتا ہے اور عدمِ انفرادیت یا جذب و کلیت سے جبر۔ "زندگی انفرادی حقیقت کا نام ہے اور کائناتی زندگی کی کوئی اصلیت نہیں کیونکہ خدا خود بھی ایک فرد ہے جو انتہائی منفرد حقیقت ہے۔

انسان کا اخلاقی و مذہبی مقصد نفیٔ خودی نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے جس کو وہ زیادہ سے زیادہ یکتائی اور انفرادیت کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے۔" (اقبال)

معاشرہ کی بقا اور ارتقا کے لئے فرد کی آزادی اور انفرادیت ناگزیر ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت کے توازن سے صحت مند معاشرہ ظہور میں آتا ہے۔ لیکن انفرادیت اُسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے جب یہ قانونِ حرکت کے تحت کسی اجتماعی نظام، کسی معاشرہ کا جزو بنے۔ بالکل اسی طرح جیسے مختلف اجرام سماوی اپنی جداگانہ حیثیت باقی رکھتے ہوئے ایک نظام شمسی کا جزو بنتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص حلقہ میں گردش کرتا ہے۔ اِس گردش اور توازنِ حرکت میں فرق آجائے تو پورا نظام شمسی تباہ ہو جائے۔

جس طرح کئی سیاروں کی باہمی کشش اور حرکت سے ایک نظام شمسی بنتا ہے اسی طرح افراد کے اجتماع اور باہمی تعاون سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے اور ایک نامیاتی۔ میکانی نظام کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس سے ایک وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اس وحدت کے بغیر کائنات میں توازن باقی نہیں رہتا ؎

برگ و سازِ کائنات از وحدت است
اندریں عالم حیات از وحدت است

"اِس نئی تہذیب (اسلام) میں عالمی وحدت کی بنیاد اصولِ توحید پر ہے اور اسلام ایک نظام تمدن کی حیثیت سے انسان کی جذباتی اور فکری زندگی میں اس اصولِ وحدت کو ایک زندہ حقیقت بنانے کا قابلِ عمل ذریعہ ہے۔"
(سات لیکچر)

افراد کے اس تعاون اور وحدت سے قوم بنتی ہے۔ اس وحدت یا اکائی کے وجود اور اس کی حرکت کا مقصود اس معنی نظام کا قیام ہے جو ابھی ضمیر کائنات میں پوشیدہ ہے۔ قوم کی زندگی اور بقا بھی قانونِ حرکت کی پابند ہے۔ لیکن قوم کی زندگی میں یہ قانون کس طرح کار فرما ہوتا ہے؟ قوم کی زندگی میں یہ قانون "تمدنی حرکت" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اِس تمدنی حرکت کو اسلام کی اصطلاح میں "اجتہاد" کہتے ہیں۔ اجتہاد سے مراد علم و حکمت کی راہوں میں نئے مرحلوں کی دریافت، ایجادات، انکشافات ہیں۔ جب کسی قوم میں تعمیری فکر اور اجتہاد زوال پذیر ہوتا ہے تو اُس کے افراد کا اندیشۂ پست اُس کی شاندار روایات کا مدفن بن جاتا ہے۔

قوم کی بقا اور ابدیت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فکر و تخیل میں جولانی اور خلاقی باقی رہے۔ فکر کی مسلسل تخلیقی صلاحیت سے قوم کی حیات وابستہ ہے:۔

"ایک تمدنی تحریک کی حیثیت سے اسلام کائنات کے ساکن تصور کی نفی اور متحرک تصور کا اثبات کرتا ہے۔ زندگی کی بنیاد روحانی اور ابدی اقدار پر ہے اور اِس ابدیت کا دار و مدار تنوع اور تبدیلی پر ہے۔ جس معاشرہ کی بنیاد حقیقت کے اس تصور پر قائم ہوگی وہ یقیناً تبدیلی و انقلاب کے قانون سے ہم آہنگ ہوگا۔ اس کی حیات اجتماعی کی تنظیم کے لئے ابدی اصول ضروری ہیں۔ کیونکہ اس ہر لحظہ تبدیل ہونے والی کائنات میں ہم ابدی قوانین اور اصولوں ہی کے سہارے زندہ رہ سکتے ہیں۔ وہ اصولی حرکت جو زندگی کے ابدی قوانین سے ہم آہنگ ہوتا ہے اسلام کی اصطلاح میں "اجتہاد" کہلاتا ہے۔" (سات لیکچر)

اِسی اصولِ اجتہاد کو اقبال نے مختلف مقامات پر "انقلاب" بھی کہا ہے۔ انقلاب سے مراد کسی قوم کی ایسی ہی فکری ندرت اور تحریکِ عمل ہے ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب ✦

★

اقبال اور آئن سٹائن

ضمیر علی

بعض ماہرینِ نفس کا خیال ہے کہ علامہ اقبالؒ ایک جدید نفسیاتی اصطلاح کے مطابق "نرگسیت" یعنی "برخود غلطی" کا شکار تھے لیکن یہ رجحان رکھنے والا کبھی دوسروں کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ مکمل طور پر اپنی ہی ذات میں مستغرق ہوتا ہے۔ اقبال نے مغرب و مشرق کے کتنے ہی اربابِ فکر و فن کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے ہیں۔ بلکہ اقبال کے نفسیاتی تجزیہ سے جو شخصیت ان کے فکر و فن سے اُبھرتی ہے ہرگز مکمل "برخود غلطی" کی آئینہ دار نہیں کیونکہ اقبال کے پردۂ تصور پر ہمیشہ ایک مکمل تر اور جمیل تر شخصیت کا نقش چھایا رہا۔ کامل مبتلائے خود وہ ہے جس کی چشمِ تصور "برون از خویشتن" کچھ کبھی نہ دیکھ سکے۔ وہ ایک آئینہ خانہ کا زندانی ہے۔ جہاں کے شش جہات اپنے ہی پرتوِ ذات سے زیادہ نہیں۔

اقبال کے ذہن نے اپنے عہد کے تقریباً ان تمام مفکرین و شعراء سے جو اس کی مخصوص انفرادیت سے ہم آہنگ ہیں، اثر و تحرک حاصل کیا ہے۔ "پیامِ مشرق" میں جہاں اقبال نے گوئٹے، نیٹشے، دانتے اور دیگر افراد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، وہاں آئن سٹائن کی فکری و ذہنی خدمات کا اعتراف بھی بڑے پُرشکوہ الفاظ میں کیا ہے۔ آئن سٹائن عہدِ حاضر کا عظیم ترین سائنس داں تھا۔ امریکہ کے ایک پروفیسر نے مختلف ممالک سے چودہ اکابرینِ سائنس کے نام طلب کئے تھے۔ ان میں سے بہتوں نے نیوٹن اور گلیلیو کے نام لئے لیکن سب نے متفقہ طور پر آئن سٹائن کا نام لیا تھا۔ اس لئے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے۔ کہ آئن سٹائن عظیم ترین سائنس داں تھا۔ اس کے نظریات نے سائنس، فلسفہ اور ما بعد الطبیعات تینوں کو کم بیش متاثر کیا ہے۔

اہل الرائے کے نزدیک نظریۂ اضافیت کا سب سے اہم پہلو "مکان - زماں" کا انکشاف ہے۔ اس لئے ہماری زندگی کا امتداد اور جو فاصلہ ہم نے زمانے کے وسیع میدان میں طے کیا ہے، بالکل غیر اہم ہو جاتا ہے۔ وہ جڑواں بچے اپنے ذاتی اعداد و شمار کے مطابق ممکن ہے ہم عمر ہوں لیکن موت کے وقت اگر وہ ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی عمروں میں حیرتناک اختلاف ہوگا۔ دو مسافر ایک ہی منزل سے آغاز سفر کریں لیکن جب وہ بحالتِ قرار ایک دوسرے کا جائزہ لیں گے تو باوجود ایک ہی جانب سفر کرنے کے ان میں قطعی طور پر غیر متوقع فاصلہ حائل ہوگا اسکی وجہ یہ ہے کہ نظریۂ اضافیت امتداد (DURATION) اور فاصلہ دونوں کے اضافی ہونے پر اصرار کرتا ہے۔ نظریۂ اضافیت سے پہلے زماں اور مکاں دو مختلف خارجی حقائق تسلیم کئے جاتے تھے۔ مکان کا یہ تصور تھا کہ وہ ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور ہمارا ہر طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور زماں ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں صرف چھو کر گذر رہا ہے۔ اس کا تعاقب نہ تو چشم و بصارت کر سکتے ہیں اور نہ گوش و سماعت اس کی آواز پا کو اسیر کر سکتے ہیں۔ ہم مکان کے ابعادِ ثلاثہ میں حرکت کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ اس کے پس و پیش، یمین و یسار اور پست و بالا ہمارے حلقۂ اختیار میں ہیں۔ لیکن زماں ایک ایسی خارجی رو جس کا لمس صرف ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ نہ ہم زماں میں آزادانہ حرکت کر سکتے ہیں اور نہ اس کے مرور میں دخل انداز ہو سکتے ہیں۔ نظریۂ اضافیت کے مطابق فطرت اس زمانی و مکانی تقسیم سے بالکل ناآشنا ہے[1]۔ یہ ایک دوسرے سے جدا حقیقتیں نہیں۔ بلکہ یہاں ان دونوں کی ایک مربوط شکل پائی جاتی ہے۔ زماں، مکاں کا چوتھا بُعد ہے۔ کیونکہ فطرت اشیاء کی بجائے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس لئے کسی واقعہ کو متعین کرنے کے لئے طول، عرض اور عمق ہی کی صراحت کافی نہ ہوگی بلکہ یہ بھی بتلانا ہوگا کہ وہ واقعہ کب ظہور میں آیا۔ اس طرح زماں ایک پراسرار طریقے سے مکان میں مدغم ہو جاتا ہے۔ منوسکی جو نظریۂ اضافیت کا ایک لائق شارح و مؤید ہے، آئن سٹائن کے اس انکشاف کے متعلق لکھتا ہے۔

"زمان و مکاں اپنی جداگانہ حیثیتوں میں تو محض پرچھائیاں بن کر

---

[1] MYSTERIOUS UNIVERSE BY SIR JAMES JEANS

رہ گئے ہیں۔ البتہ ان دونوں کا کسی قسم کا اختلاط ہی کچھ حقیقت کا حامل ہے۔"

مکاں۔زماں کے اس سنسنی خیز انکشاف نے ہمارے تصورِ کائنات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ بقول برٹینڈرسل، نظریۂ اضافیت نے زمانے کو مکاں، زماں میں مدغم کرتے ہوئے شے کے روایتی تصور پر جو ٹھوکر لگائی ہے، وہ فلسفیوں کے دلائل سے آج تک نہیں لگی۔

عام نظریۂ اضافیت کا یہ انکشاف اس کا اہم ترین پہلو ہے۔ آئن سٹائن نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر مکاں، زماں کو اس نظریہ سے الگ کر دیا جائے تو وہ محض ایک نام نہاد نظریہ رہ جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر مکاں۔زماں کا ابطال ممکن ہے تو عام نظریۂ اضافیت کا اغلب حصہ سخت تنقید کی زد میں آجائے گا۔

آئن سٹائن کے اس انکشاف نے قانونِ تعلیل کی صحت بھی مشتبہ کر دی ہے۔ زماں کا مستقبل کی طرف بہاؤ علت و معلول کے رشتہ کی جان ہے۔ لیکن نظریۂ اضافیت کی رو سے زمانہ کا مستقبل کی طرف بہاؤ نمودِ سراب سے زیادہ نہیں۔ چونکہ زمانہ مرور نہیں کرتا بلکہ وہ مکان کا چوتھا بُعد شمار ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے لئے یہ کہنا کہ ان میں سے ایک واقعہ دوسرے واقعہ کا سبب ہے، اسی طرح ٹھیک نہیں ہے[۶] جس طرح شاہراہِ عام پر تار کے جو مسلسل کھمبے لگے ہوں ان کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان میں ہر ایک دوسرے کا سبب ہے۔ سترہویں صدی کے علمائے سائنس قانونِ تعلیل کی صحت پر اس قدر یقین رکھتے تھے کہ تقریباً جملہ مظاہرِ فطرت کی تشریح انہوں نے اسی بنیاد پر کی۔ یہ میکانکی طریق تشریح اس قدر ناقابلِ انکار ہو گیا کہ ہلم ہولٹز نے دعویٰ کیا کہ علم طبیعات کا مقصود علم میکانکیت میں تبدیل ہو جانا ہے۔ لارڈ کلون نے کہا کہ ان کے لئے ایسی شے کا تصور میں لانا ممکن نہیں جس کا میکانکی نقشہ اپنے ذہن میں نہ لے آئیں۔ انہوں نے کہا کہ نیوٹن اور گلیلو کے دماغ اپنی مشینی ساخت کے اعتبار سے کسی قدر پیچیدہ ہیں۔ اور ایسی مشین بنائی جا سکتی ہے جو نیوٹن کی فکر، باخ کے احساسات اور مائیکل اینجلو کے تخیلات کو پیدا کر سکے۔ اس نظریہ کی رو سے انسان مجبورِ محض قرار پایا۔ کیونکہ اس کی پوری شخصیت قانونِ تعلیل کی پیدا کردہ ہے۔ اس کا پورا وجود توارث اور احوال و ظروف کے درخت پر پھل کی طرح لٹک رہا ہے۔ جتنے مادی مکاتیب فکر ہیں وہ سب اسی ہی کی پیداوار ہیں[۵]۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت اور پلانک کے نظریۂ مقادیر برقی (کوانٹم تھیوری) نے فطرت کے اس میکانکی طریق کار کو باطل قرار دیا ہے۔ پلانک نے یہ توجیہ پیش کی کہ تسلسل کا دامان لینے سے چھوٹے پیمانہ پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ واقعات توانائی کے تغیر پر مبنی ہیں اور توانائی میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ غیر مسلسل ہوتی ہے۔

نظریۂ اضافیت کا دوسرا اہم انکشاف مادہ و توانائی کا ایک ثابت ہونا ہے۔ اضافیت کے انکشاف سے پہلے بقائے مادہ اور بقائے توانائی دو الگ اور مستقل قوانین کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے تھے۔ مادہ توانائی کی کئی اشکال ہیں۔ نہ توانائی مادہ میں تبدیل ہو سکتی ہے اور نہ مادہ توانائی میں۔ یونانی فلسفیوں سے لیکر پچھلی صدی کے اواخر تک مادہ و توانائی کو دو مختلف آفاقی عناصر کی حیثیت حاصل تھی۔ آئن سٹائن نے سائنس کو جن بہت سے غیر ضروری مفروضوں سے آزاد کرایا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مادہ و توانائی ایک ہی حقیقت کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ راست تجربوں نے اضافیت کے اس انکشاف پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

علامہ اقبال آئن سٹائن کے اس انکشاف کو نظریۂ اضافیت کا اہم ترین جزو سمجھتے ہیں۔ ایوانِ فکر و نظر میں کائنات کے مادی نقطۂ نگاہ نے جو نقش و نگار بنائے تھے، بصورتِ خدا وہ سب غائب ہو رہے ہیں۔ ایٹم کے تجزیہ میں اس نے صرف مادہ و قوت ہی کی کارفرمائی نہ دیکھی۔ بلکہ ایک ایسی قوت کا بھی تصرف دیکھا جو ہماری حدودِ ادراک سے بہت دور ہے۔ اور ہم ریاضی محض کی مدد سے اس کا سراغ نہیں لگا سکتے۔

اقبال نظریۂ اضافیت کی فلسفیانہ قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس نظریہ کی دو خوبیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ نظریۂ اضافیت نے اس خیال کی نفی کی ہے جس کی رو سے کلاسیکل طبیعات کو مادیت کا قائل ہونا پڑا تھا اور جس کے تحت جوہر کی حیثیت وقوع فی المکان سے زیادہ نہیں رہتی۔ آئن سٹائن نے فطرت کے خارجی وجود سے انکار نہیں کیا۔ اسی وجہ

---

[۶] MYSTERIOUS UNIVERSE

[۵] PHYSICS AND PHILOSOPHY: BY SIR JAMES JEANS.

سے جدید طبیعیات میں جوہر کی حیثیت یہ ہوئی کہ یہ باہمدگر مربوط حوادث کا ایک نظام ہے، شے نہیں کہ اپنی متغیر حالتوں کے ساتھ زمانے میں مرور کرے۔ اس نظریہ کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کی رو سے مکاں کا انحصار مادے پر ہے۔ لہٰذا آئن اسٹائن کے نقطۂ نظر سے کائنات کا یہ تصور درست نہیں کہ اس کی مثال ایک ایسے جزیرے کی ہے جو لامتناہی مکاں میں واقع ہے۔ اس لئے کہ مکان بجائے خود متناہی ہے گو غیر محدود۔ بایں صورت اس کے ماورا مکانِ محض کا کوئی وجود ہی نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ اگر مادہ نہ ہوتا تو کائنات بھی سمٹ کر ایک نقطہ پر آجاتی"۔ [۱]

یہ بھی تاریخ کی کرشمہ سازیوں کا ایک عجیب لطیفہ ہے۔ کہ وہ آئن اسٹائن جس کے امریکہ میں ورود پر وہاں کے مذہبی علماء نے "دہریہ آئن اسٹائن سے بچو" کا امتناعی اشتہار در و دیوار کلیسا پر چسپاں کرنا ضروری سمجھا، آج اس کے انکشافات مذہب کے اس قالب میں شگفتگی و تازگی کی روح پھونک رہے ہیں جو مادیت کی پیہم ترکتازیوں سے نیم جاں ہو چکا تھا۔ اس کی تحقیقات ہمیں اخلاقی قدروں کی صداقت کا یقین دلانا چاہتی ہیں۔ مادہ کے اس تصور پر جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے جملہ مکاتبِ فکر کی بنیاد ثابت ہوا تھا، اب ضرب کاری لگ چکی ہے اور وہ حدود جن کے اندر ہم مادے سے واقف تھے، اب غائب ہو رہی ہیں۔ ہمارا علم، فطرت کے عمیق تر طریق کار کا سراغ لگانا چاہتا ہے۔ مادہ و توانائی کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے بقول برٹرانڈ رسل، آئن سٹائن نے مادہ کو غائب کر دیا۔ اسی لئے سائنس داں بھی کہنے لگے کہ "مادہ غائب ہو رہا ہے"۔ اس سے مقصود یہ نہیں کہ اضافیت نے مادہ کے وجود سے انکار کیا ہے بلکہ وہ مادے کا ایک مختلف تصور پیش کرتا ہے۔ مادہ کی وہ تمام خصوصیات جو تسلیم شدہ حقائق کی حیثیت رکھتی تھیں آج وہ بدل چکی ہیں۔ مادے کے خواص و اعمال کی جگہ مجرد قوت نے لے لی ہے۔ اضافیت کے اس انکشاف نے جو بیشتر محققین کے نزدیک بیسویں صدی کا سب سے عظیم اور انقلاب انگیز انکشاف ہے، عینیت (آئیڈیلزم) اور خارجیت پسندی (ریلزم) کے مابین جو پرانی نزاع تھی اس کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ عینیت کے حق میں ہوا ہے۔ [۲]

علامہ اقبال آئن اسٹائن کے اس انکشاف کو بہ نظرِ ستائش دیکھتے ہیں۔ انہیں اس امر کا اعتراف ہے کہ آئن اسٹائن نے عینیت کے حق میں فیصلہ دے کر ایک زبردست خدمت انجام دی ہے۔ علم و نظر کی وہ راہیں جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مادہ پرست رجحان نے بند کر دی تھیں اب سرِ نو باز ہو چکی ہیں۔

جہاں علامہ نے بیشتر امور میں آئن اسٹائن کے انکشافات سے اتفاق ظاہر کیا ہے، وہاں بعض امور میں انہیں سخت اختلاف بھی ہے۔ "مکان و زماں" کا انکشاف جو عام نظریۂ اضافیت کا اہم ترین کارنامہ ہے اس سے اقبال کو سخت اختلاف ہے۔ چونکہ اقبال، برگساں کی مانند حقیقتِ زماں کے قائل ہیں، اس لئے آئن اسٹائن کے اس انکشاف سے جو بظاہر زمانے کا ابطال کرتا ہے، انہیں اتفاق نہیں۔ اضافیت کی رو سے مکان کی حیثیت واقعات کے غیر متحرک حامل (PASSIVE CONTAINER) ہی کی نہیں [۱] وہ حوادث کے وقوع میں اپنا ایک خاص کردار ادا کرتا ہے۔ بلکہ وہ مکاں کو زماں سے زیادہ اساسی بتلانے کا رجحان ظاہر کرتا ہے۔ وقت کو اقبال حقیقت کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ آئن سٹائن نے زماں کو مکاں کا بعد قرار دے کر جبر و اختیار کی پرانی نزاع کو از سرِ نو تازہ کر دیا ہے۔ زمانہ کوئی آزاد تخلیقی حرکت کی حیثیت سے باقی نہیں رہتا۔ اضافیت جبریت کی تائید کر کے ہم سے جملہ اختیارات چھین لیتی ہے۔ جبر و بیچارگی کا یہ یاس انگیز تصور ہمیں امید و عمل کی بلندیوں سے قنوطیت و بے عملی کی پستیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں۔

"آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت سے ایک زبردست مشکل رونما ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اگر اس کا نظریہ صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زمانے کا وجود بھی غیر حقیقی ہے۔ کیونکہ جس نظریہ کی رو سے زمانے کی حیثیت بُعدِ رابع سے زیادہ نہیں، اس سے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ ماضی کی مثل استقبال کا وجود بھی پہلے سے قائم ہے اور اس لئے متعین۔ لہٰذا زمانہ کوئی آزاد تخلیقی حرکت نہیں۔ وہ مرور نہیں کرتا نہ حوادث رونما ہوتے ہیں۔ ہم ان سے صرف دوچار ہوتے ہیں"۔

(خطبات مدراس)

۱۔ "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید"۔ مترجمہ نذیر نیازی

۲۔ MYSTERIOUS UNIVERSE

۱۔ THE WORLD AS I SEE IT: BY: ALBERT EINSTEIN

اقبال کی رائے یہ ہے کہ آئین سٹائن نے ریاضی میں محدود ہوکر زماں کی دوسری خصوصیات کو نظرانداز کر دیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا صریحاً حقیقتِ حال کے خلاف ہوگا کہ زمانے کی حقیقت صرف انہی خصائص پر مشتمل ہے۔ جن سے آئن سٹائن نے اس لئے بحث کی ہے کہ عالمِ فطرت کے اُن گوشوں کی تشریح صحیح طریقہ سے ہوتی رہے جو اصولِ ریاضی کا موضوع ہیں۔ علامہ اس کا اعتراف صاف لفظوں میں کرتے ہیں کہ ہم غیر ریاضی دانوں کے لئے آئن سٹائن کے تصورِ زماں کی صحیح ماہیت کا سمجھنا ایک مشکل امر ہے۔ تاہم زمانے کو چوتھا بُعد قرار دینے سے زمانے کی نفی ہو جاتی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ برگسان کا زمانہ جسے وہ استدام (PURE DURATION) سے تعبیر کرتا ہے، اور آئن سٹائن کے زمانے کی ماہیت اور ہے۔

اقبال کامل طور پر کسی سے متفق نہیں۔ وہ برگسان کے نظریۂ زمانِ خالص کے قائل ضرور ہیں لیکن برگسان کائنات کو بے غایت بتلاتے رہے۔ کیونکہ کائنات کو بامقصد مان لینے سے اس کی فکری کاوشوں کا مرکزی تصور بے معنی قرار پاتا ہے اور زمانے کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ اقبال نہ زمانے کی نفی کرتے ہیں اور نہ کائنات کو بے غایت بتلا کے اس کے حسن و خوبی کی روح ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کائنات کا مرور فی الزماں مطلب سے خالی نہیں۔ اس کی غایات اس کے سفر کی نہایات ہیں۔ یہ غایات و مقاصد وہ ہیں جو معرضِ امکاں میں ہیں معرضِ وجود میں نہیں۔ زمانہ کوئی خطِ کشیدہ نہیں بلکہ ہنوز منت کشِ کشیدن ہے۔ اس سے مقصود وہ ممکنات ہیں جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں یا نہ آئیں۔ کائنات کو بامقصد ٹھہرانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زمانے کے اس عمل کی نوعیت انتخابی ہے۔ وہ ماضی کے تحفظ و اضافہ کے ساتھ اپنی کوئی غرض بھی پوری کر رہا ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن مجید کے مطمحِ نظر سے کائنات کا کوئی تصور اس قدر مہمل و بے معنی نہیں جتنا یہ کہ وہ کوئی پہلے سے سوچا ہوا منصوبہ ہے اور یہ اس منصوبہ کی زمانی نقل ہے۔ قرآن کی رو سے کائنات ایک وسعت پذیر حقیقت ہے۔ وہ پہلے سے مقررکردہ کوئی منصوبہ نہیں جس کو اس کے خالق نے بہت پہلے تیار کیا تھا مگر وہ اب مادے کے ایک مردہ ڈھیر کی مانند مکانِ لامتناہی میں پڑا ہوا ہے جس پر زمانے کا کوئی تصرف نہیں۔ اس لئے اس کا وجود و عدم بے معنی ہے۔

اقبال کے یہاں چونکہ ہر چیز کی قدر و قیمت کا معیار ان کا نظریۂ خودی ہے، اسلئے جو شے بھی خودی کو استحکام بخشتی ہے مستحسن ہے اور جو اس کو مضمحل کرے قابلِ مذمت ہے۔ چونکہ نظریۂ اضافیت اپنے چوتھے بُعد کی تعبیر سے زمانے کی نفی کرتا ہے، اس لئے جبریت لازم آتی ہے۔ اس لئے وہ اضافیت کے اس انکشاف کو آئن سٹائن کی ریاضیاتی ذہنیت کا عجز قرار دیتے ہیں۔ جبریت کے حق میں اضافیت کا یہ فیصلہ سازِ خودی کے تاروں کو ڈھیلا کر دیتا ہے اور ہمیں جبر و بیچارگی اور یاس و قنوطیت کی پستیوں میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ اقبال عالمِ فطرت کی اس جبریت کو کسی صورت میں بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ہر فرد کو ذوقِ اختیار کی لذت آشنا بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اقبال جو رومی کے فرشتہ صید، پیمبر شکار، یزداں گیر انسان کے پُرشکوہ تصور میں گم ہیں، جنھوں نے عالمِ انسانیت کو قہاری و جباری کے سبق دئے ہیں۔ اور خودی کی جلوتوں میں مصطفائی اور خودی کی خلوتوں میں کبریائی دیکھی ہو وہ بھلا اضافیت کے پیدا کردہ بے دست و پا انسان کی پذیرائی کس طرح کر سکتے ہیں؟

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ نظریۂ اضافیت سائنس کا نظریہ ہے۔ سائنس داں چونکہ فطرت کا مطالعہ ریاضیاتی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے اور واقعات کا مثالی نمونہ صرف ریاضی کی حدود میں بیان کیا جا سکتا ہے؟ اس لئے نظریۂ اضافیت، جو کہ واقعات کے مشہود نمونے سے مستخرج ہے۔ صرف ریاضیاتی علائم و مصطلحات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ اشیاء کی پیمائش سے سروکار رکھتا ہے، بذاتِ خود اشیاء سے بحث نہیں کرتا۔ اس لئے یہ زماں و مکاں کی ماہیت کے متعلق ہمیں کچھ نہیں بتلا سکتا۔ اسکے باوجود نظریۂ اضافیت، جبریت کی تائید کرتا نظر آ رہا ہے؎۱ زمان و مکان کے سلسلہ (CONTINUUM) میں ایک نقطۂ مکان کو زمان کے ایک لمحہ میں پیش کرتا ہے، کسی تجاذبی کمیت (GRAVITATING MASS) جیسے سورج نے فضا کے ایک مخصوص نقطہ کو کسی خاص زمان کے لمحہ میں گھیر لیا ہو، وہ صرف واحد نقطہ کی حالت میں ہی اس سلسلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لمحہ میں اس کی حالت بتدریج دوسرے نقطوں کی صورت میں بدلتی جائے گی۔ اس طرح ان نقطوں کو آپس میں ملانے سے کائناتی لکیروں کا ایک پورا جال بچھ جاتا ہے جس میں پوری فطرت اور اس کے اعمال اسیر ہیں۔ اگر یہ کائناتی لکیریں واقعی کوئی وجود اس سلسلہ میں رکھتی ہیں تو

؎۱ (PHYSICS AND PHILOSOPHY—P.119)

کائنات کی پوری تاریخ جس کا استقبال و ماضی قطعی طور پر پہلے ہی سے متعین ہے۔

اضافیت نے اشیاء کو منطقی تحلیل کے بعد اس چوکھٹے میں اسیر کر دیا ہے جس سے مادہ کسی حد تک غیر مادی ہو گیا ہے۔ اس سے طبیعات کا حالیہ میلان عینیت کی طرف مڑ گیا ہے۔ سائنس کو اپنی خارجیت کا جو یقین تھا وہ اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ بقول رسل جب عام انسان سائنس کے انکشافات پر اعتبار کرنے لگا تو تجربہ گاہ کا عامل اپنے اعمال کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جدید طبیعات عینیت پسند فلسفی برکلے کے ثمرات فکری کی تائید کرتی نظر آ رہی ہے۔ برکلے نے انگلی اٹھا کر جن فکری بلندیوں کی طرف اشارہ کیا تھا، بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی سائنس نے اسی جانب پرواز کا آغاز کر دیا۔ اضافیت کا یہ عینی تصورِ کائنات اقبال کے نظریات سے ہم آہنگ ہے۔ اس سے منطقی طور پر شعور کی برتری لازم آتی ہے۔ جتنے مادی مکاتب فکر ہیں وہ اس بنیاد پر قائم ہیں کہ مادہ شعور سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ موجودہ طبیعات کا عینیت کی طرف یہ رجحان دراصل پچھلی دو صدیوں کی مادہ پرستی کے ردِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوا، سائنس اضافیت کے لئے تیار ہو چکی تھی، اسی لئے پلانکار نے ایک موقع پر کہا تھا کہ وہ بجائے خود اضافیت کے محدود نظریہ کے انکشاف سے بہت قریب تھا آئن سٹائن کی کائنات میں صرف مادہ کی ظلمت ہی چاروں طرف نہیں پھیلی ہوئی ہے، بلکہ وہ ایک ایسی ہستی کا بھی اثبات کرتا ہے جو اپنی ماہیت میں روحانی واقع ہوئی ہے اور ہم اپنے مادی و ذہنی طریقِ تفتیش سے اس کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ اضافیت کے انکشاف کے ساتھ شبستانِ فکر میں ایک نئی صبح اپنے جلو میں نور و تابندگی لئے طلوع ہوئی۔ ہمارا شاعر ظلمتِ گریز پا اور آفتابِ تازہ دونوں کو دیکھتا ہے۔ اور اس پیکرِ تابش و تنویر کا ان لفظوں میں خیر مقدم کرتا ہے:

جلوہ می خواست مانندِ کلیم ناصبور
تا ضمیرِ مستنیر او کشود اسرارِ نور
از فرازِ آسمان تا چشمِ آدم یک نفس
زود پرواز سے کہ پروازش نیاید در شعور
بے تغیر در طلسمِ چون و چند و بیش و کم
برتر از پست و بلند و دیر و زود و نزد و دور
در نهادش تار و شید و سوز و ساز و مرگ و زیست
اہرمن از سوز او و ساز او جبریل و حور
من چہ گویم از مقامِ آن حکیمِ نکتہ سنج
کردہ زردشتے ز نسلِ موسیٰ و ہارون ظہور

★

بیا بہ مجلسِ اقبال

بقیہ صفحہ ۶

تھا۔ وہ دور کانگریس کی قوت اور عروج کا تھا۔ ہر صوبے میں کانگریس کی حکومت تھی اور ہمیں ان سے اور ہندی کے بڑے بڑے مہاتماؤں سے اردو کے معاملے میں لڑنا جھگڑنا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے ہندی والے اور ان کے اخبار ریاست کو بدنام کرتے تھے۔ اس لئے میں نے انجمن کا مستقر بدلنا مناسب سمجھا۔ تبدیلیٔ مقام اور آئندہ نظامِ عمل کے فیصلے کے لئے ایک کل ہند اردو کانفرنس کی تجویز کی۔ اس کا ذکر میں نے ایک خط میں علامہ اقبال سے بھی کیا۔ انہوں نے لکھا کہ "پہلے سے اچھا ہوں مگر افسوس ابھی سفر کے لائق نہیں..... بہرحال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہو گیا تو انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانئے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے"

اس کانفرنس کا علی گڑھ یونیورسٹی میں ہونا قرار پایا۔ اس میں ہر جگہ کے اکابر شریک ہوئے۔ علامہ اقبال نے میری دعوت کے جواب میں لکھا:

"میں علی گڑھ حاضر ہونے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا۔ مگر افسوس کہ کمر کے درد سے ابھی تک افاقہ نہیں ہوا..... آپ کی تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی"۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

"نغمہ کجا و من کجا"

کرم حیدری

اقبالؒ کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے کہ ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اسی مضمون کے کئی اور اشعار بھی ہیں جن کے ذریعے علامہ مرحوم اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ ان کی شاعری کی بنیاد لفظ و بیاں پر نہیں، فکر و معنی پر استوار ہے۔ شعر سے ان کا مقصود الفاظ کی تصویر گری نہیں، معانی کی نقاب کشائی ہے۔ اس لئے انہیں دعوائے فن نہیں اور نہ وہ اپنے آپ کو خدائے سخن کہتے ہیں بلکہ وہ نغمے سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے متعلق لکھنے والوں نے اُن کے فکر، تخیل، فلسفہ اور پیغام کے متعلق تو بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کے شاعرانہ فن کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبالؒ کا کلام فکری نادرہ کاریوں کا بے بہا خزینہ ہے اور اس میں اسرار و رموز کے نہایت بیش بہا موتی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ موتی صناعانہ چابکدستی کے آئینہ دار بھی ہیں یا نہیں۔ شاعر بیک وقت غوّاص بھی ہے اور جوہری بھی۔ جب تک وہ فکر و تخیل کے موتیوں کو فنکارانہ چابکدستی سے جاذبِ نظر نہ بنائے، انہیں مقبولیت حاصل نہیں ہو سکے گی۔

اقبالؒ کے کلام کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اس کے حسن و خوبی کی ایک قوی دلیل ہے۔ اس دعوے پر دو قسم کے لوگ معترض ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سرے سے اقبالؒ کے کلام کی قبولیت عامہ کے منکر ہیں اور دوسرے وہ جو اس کو تسلیم تو کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے نزدیک اس کی وجوہ حُسنِ کلام کی بجائے کچھ اور ہیں۔ کہا جاتا ہے ان کے کلام میں فلسفے کی اتنی بھرمار ہے کہ عام آدمی کا ذہن اس کے معانی تک رسا نہیں ہو سکتا۔ بیشک اقبالؒ نے اپنے کلام میں مسائلِ حیات پر زیادہ توجہ دی ہے اور ان کو پیش کرنے کے لئے فلسفیانہ اندازِ بیان بھی اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ نہ تو خشک ہے اور نہ اوسط درجے کے پڑھے لکھے انسان کی رسائی سے باہر۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کلامِ اقبالؒ کی مقبولیت ہیئت کی رعنائی اور اسلوب کی دلآویزی سے زیادہ اپنی معنوی خوبیوں سے ہے یعنی انہوں نے جن مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، وہ بذاتِ خود اہم اور لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ لہٰذا اس دور کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں اُن کے کلام کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اگرچہ اس دلیل میں بہت وزن ہے لیکن محض موضوعات کی اہمیت کو مقبولیت کی اساس قرار دینا مبالغے سے خالی نہیں۔ موضوعات کی اہمیت بجائے خود مسلّم اور زندگی سے قریبی تعلق کی بنا پر پڑھے لکھے لوگوں کا ان میں دلچسپی لینا درست، لیکن ان مسائلِ حیات پر بیسیوں دوسرے علما نے بھی قلم اٹھایا ہے اور جہاں تک تجزیۂ مسائل اور اُن کے حل پیش کرنے کا تعلق ہے۔ ان کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ پھر بھی ان کی تصنیفات محض کتب خانوں کی الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں اور بس، اس سے ظاہر ہے کہ حسنِ بیاں کے بغیر موضوعات کی اہمیت سے کچھ نہیں بنتا۔ یہ انسانی ذہن کی خصوصیت ہے کہ وہ کسی نہایت اہم مسئلے کو بھی اسی صورت میں قبول کرتا ہے۔ جب اس کا بیان دلنشیں انداز میں کیا جائے۔ خود قرآن حکیم جو کلام الٰہی اور سرتا سر دانش و حکمت کا سرچشمہ ہے اس لئے انسان کو براہِ راست متاثر کرتا ہے کہ اس میں حسنِ کلام بدرجۂ کمال موجود ہے۔

عظیم ادب وہی ہو سکتا ہے جس میں افادیت نمایاں ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا ادب ہونا بھی ضروری ہے۔ ادب کی

دوسری اصناف کے لئے بھی ادبیت شرطِ اولیں ہے۔ پھر شاعری میں توجب تک شعریت نہ ہو افادیت اور مقصدیت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے جس چیز کو لوگ ادب برائے ادب کہتے ہیں اُس میں بھی ایک مقصد ضرور ہوتا ہے یعنی ایسے ادب کی تخلیق جس میں ادبیت دوسرے تمام پہلوؤں سے زیادہ نمایاں ہو۔ یہ درست ہے کہ شعر و ادب انسان کی بنیادی ضرورتوں میں شامل نہیں۔ ہزاروں لاکھوں انسان ایسے ہیں جنہیں شعر و ادب سے قطعاً کوئی مس نہیں لیکن وہ نہایت مطمئن اور آسودہ زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر اُن کی زندگی ادب سے شغف رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں مطمئن تر اور آسودہ تر ہوتی ہے۔ اگر شعر و ادب بنیادی ضرورت کی چیز ہوتی تو بھی اس میں حسن اور رنگینی کی ضرورت تھی کیونکہ ان سے ہماری بنیادی ضرورتیں بھی احسن طریقے سے سرانجام پاتی ہیں۔

اس سے ہم منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کوئی شاعر جتنا بڑا ہوگا اُس کے اشعار میں لفظ و صوت کا حسن اتنا ہی جامع اور مکمل ہوگا۔ ہمارے تنقید نگار اقبال کو ایک بہت بڑا فلسفی، دانائے اسرارِ حیات، معلّمِ خودی، مفکرِ اسلام اور حکیم الامت کہتے ہیں۔ لیکن اگر شاعرِ اقبال ان تمام حیثیات کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہے، تو لازماً اُس کے کلام میں لفظ و صوت کا حسن بھی اوجِ کمال پر ہونا چاہیئے۔

اقبال نے جہاں خطباتِ مدراس میں اپنا فلسفۂ حیات پیش کیا ہے۔ وہاں اس کی جھلکیاں اپنی شعری تخلیقات میں بھی پیش کی ہیں۔ ان کے مطالعے سے جو لذّت حاصل ہوتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کا شمار دنیا کے بلند ترین شعرا میں ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں حسنِ معنی کے ساتھ حسنِ صورت بھی نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہونا چاہیئے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ ؎

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

اسی لئے انہوں نے شروع سے آخر تک فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔

کلامِ اقبال کا ایک نہایت دلکش پہلو شگفتہ و مترنم بحروں اور دلآویز و خوش آئند قافیوں اور ردیفوں کا انتخاب ہے۔ انہوں نے بحروں میں کوئی نئے تجربے نہیں کئے اور نہ کوئی نئے زحافات استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ نئے نئے تجربوں کی ضرورت اس لئے محسوس کی جاتی ہے کہ شاعر انفرادیت پیدا کرے۔ اقبال کی انفرادیت زیادہ تر ان کے جدید اور انوکھے موضوعات کی وجہ سے ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے بحروں کے انتخاب میں نہایت فنکارانہ سوجھ بوجھ سے کام لے کر ایسی شگفتہ اور مترنم بحروں میں نظمیں اور غزلیں کہی ہیں کہ کلام میں خود بخود موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ عمدہ قوافی اس موسیقیت میں اور بھی اضافہ کرتے ہیں جو اچھی شاعری کی جان ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ دیکھئے ان میں بحروں اور شگفتہ قافیوں نے کیا سماں باندھا ہے :۔

با نشۂ درویشی درساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن
گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن
عقل است چراغِ تو؟ در راہگزارے نہ
عشق است ایاغِ تو؟ با بندۂ محرم زن

رخت بہ کاشمر کشا، کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں، لالہ چمن چمن نگر
دخترکے برہمنے، لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او کشا، باز بہ خویشتن نگر

این ہم جہانے آن ہم جہانے — این بیکرانے آن بیکرانے
ہر دو خیالے ہر دو گمانے — از شعلۂ من موجِ دخانے
این یک دو آنے آن یک دو آنے — من جاودانے من جاودانے

صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
آن سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من
در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من
در دیر نیازِ من در کعبہ نمازِ من
زنّار بدوشم من، تسبیح بدستم من

شاعری الفاظ کا طلسم ہے اور الفاظ و تراکیب کا حسن اور ان کا فنکارانہ استعمال ہی اس کو سحرِ حلال بنا دیتا ہے۔ درحقیقت

کسی زبان میں کوئی دو لفظ پورے طور پر مترادف نہیں۔ کلام میں
میں جہاں ایک لفظ کوئی معنی دے رہا ہے وہاں دوسرا
لفظ مکمل طور پر وہی مفہوم ادا نہیں کر سکتا۔ باکمال ادیب
ہر لفظ و ترکیب کے مزاج سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔

اقبال کے ہاں الفاظ کی یہ سحر آفرینی اوجِ کمال پر نظر
آتی ہے۔ انہیں الفاظ پر اتنی قدرت ہے کہ انہوں نے بہت
سے الفاظ کو نئے مفہوم عطا کئے ہیں۔ وہ فارسی محاورہ کا
نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ اور ایسی ایسی
تراکیب پیدا کرتے ہیں۔ جنہیں سن کر اہل ایران بھی متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک غزل کے چند اشعار سنئے:۔

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام
تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچیدمش
شعلۂ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما

یہ غزل حافظ شیراز جیسے مسلم الثبوت استاد کی زمین میں
لکھی گئی ہے۔ اور اہل نظر جانتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے
کس قدر قریب ہیں:۔

اے فروغِ ماہِ حسن از روئے رخشانِ شما
آبروئے خوبی از چاہِ زنخدانِ شما
عزمِ دیدارِ تو دارد جاں بر لب آمدہ
باز گردد یا بر آید چیست فرمانِ شما
دل خرابی می کند دلدار را آگہ کنید
زینہار اے دوستاں جانِ من و جانِ شما

حافظ کی غزل کے چودہ قافیوں میں سے اقبال نے
صرف ایک قافیہ "جان" استعمال کیا ہے۔ اور وہ بھی جانِ من و
جانِ شما کی ترکیب لانے کے لئے۔ جس چابکدستی سے اقبال
نے اسے استعمال کیا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

نظیری کی ایک مشہور غزل ہے:۔

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست — کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

اس کے جواب میں اقبال کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلیِ دگرے در خورِ تماشا نیست
نظر بہ خویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست
غلامِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت
بہ جادۂ کہ دراں کوہ و دشت و دریا نیست

الفاظ کا یہ فصیح اور فنکارانہ استعمال۔ اس کے
بعد اُن کے ترنم اور لوچ سے شعر میں موسیقی پیدا کرنا
ایسا ہنر ہے جو شعر کے حسن و تاثیر میں بے بہا اضافہ کرتا ہے۔
شعر کا پہلا تاثر اُس کا صوتی تاثر ہوتا ہے جو ہمارے وجدان
کو براہِ راست متاثر کرتا ہے۔ اس سے ذہن شعر کے معنوی
تاثر کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں
الفاظ کا ترنم بھی بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے:۔

شوقِ غزل سرائے را رخصتِ ہا و ہو بدہ
باز بہ رند و محتسب بادہ سبو سبو بدہ
شام و عراق و ہند و پارس خو بہ نبات کردہ اند
خو بہ نبات کردہ را تلخیٔ آرزو بدہ
مردِ فقیر آتش است میری و قیصری خس است
فال و فرِ ملوک را حرفِ برہنہ بس است

اسلوب میں اقبال اساتذۂ فارسی سے بہت متاثر ہیں۔
انہوں نے حافظ کے سحر بیان کو اپنا سحر کلام بنا لیا ہے۔ غزلوں
پر غزلیں حافظ ہی کی زمینوں میں ہیں۔ چونکہ ان کا موضوع حافظ
کے موضوع سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس لئے جو شخص
حافظ کے کلام پر بھی نظر رکھتا ہے۔ وہ اقبال کی غزلوں سے
خاص طور پر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اقبال نے حافظ کی بعض
غزلوں کی ردیفیں بدل کر ان کی زمینوں کو آسمانوں پر پہنچا دیا
ہے۔ حافظ کی ایک مشہور غزل ہے:۔

ایں خرقہ کہ من دارم در رہنِ شراب اولیٰ

اقبال نے اسی زمین میں "اولیٰ" کی جگہ "آخر" رکھ کر
اردو میں ایسی غزل لکھی ہے جو صوتی تاثر سے لبریز ہے:۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

قدیم شعرا اپنے کلام میں صنائع بدائع کا اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ یہ لفظی رعایتوں کا گورکھ دھندا بن کر رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ عرفی و نظیری جیسے معنی پرست شعرا بھی ان کا التزام کئے بغیر نہ رہ سکے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاعری میں جذبے کی کمی آجاتی۔ اور شعر حسین الفاظ کا ایک ایسا نگار خانہ بن جاتا جو دیکھنے میں تو آنکھوں کو خیرہ کر دیتا۔ لیکن اس کے اندر کچھ بھی نہ ہوتا۔

اقبال کے ہاں جذبے کی فراوانی ہے، اس لئے صنائع بدائع کا التزام نہیں۔ الفاظ کی موسیقیت اور اُن کی در و بست کا لحاظ انہوں نے ہمیشہ رکھا ہے۔ نئی نئی تشبیہات و تراکیب کے علاوہ وہ محاکات و تلمیحات سے بھی بہت کام لیتے ہیں۔ محاکات کے لئے جس بلندیٔ تخیل کی ضرورت ہے اس سے وہ بدرجۂ اتم بہرہ ور ہیں۔ اور جس خوبی سے وہ قدرتی مناظر اور باطنی واردات کو خارجی پیکر عطا کرتے ہیں۔ اس سے محاکات کا پورا پورا حق ادا ہوتا ہے۔ تلمیحات کے لئے ایک وسیع ذہنی پس منظر کی ضرورت ہے۔ اقبال کی نظر مشرقی و مغربی زبانوں کے ادب کے علاوہ فلسفۂ نفسیات اور تاریخ پر بھی تھی۔ اسی لئے ان کے یہاں تلمیحات کی غیر معمولی فراوانی نظر آتی ہے۔ اور فارسی و اردو کے کم ہی شاعر اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے تلمیحات کو ایسی معنوی وسعت عطا کی ہے کہ یہ ہمارے ادب میں علائم کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
شانِ خلیل ہوتی اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اگر تاجِ کئی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

داخلی محاسن میں سب سے پہلی چیز اقبال کا فنی خلوص ہے کیونکہ وہ شاعری کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ خیال کرتے ہیں ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

وہ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فن کے ذریعے ملک و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

اسی خلوص کی بدولت اقبال کی شاعری ہمیشہ ارتقا پذیر رہی اور ان کی شاعری اُن بلندیوں تک جا پہنچی جہاں اُس کی سرحدیں پیغمبری سے مل جاتی ہیں۔

اسے خلوص فن کا نتیجہ سمجھئے یا جبلی صلاحیت کا کرشمہ کہ اقبال کے انداز بیان میں بے انتہا نکھار اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ نہایت دقیق اسرار و رموز کی ترجمانی کرتے ہیں پھر بھی ان کے بیان میں کوئی الجھن، پیچیدگی یا ابہام دکھائی نہیں دیتا۔

خلوصِ فن اور جلائے فکر کا لازمی نتیجہ شاعر کے طرزِ بیان میں ہم آہنگی ہے جو عظمتِ کلام کا سنگِ بنیاد ہے

باقی صفحہ ۱۴۱ پر

از بادۂ الاستؔ: اقبال

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

مرگ نے بھینچ لیا تیرے تنِ خاکی کو،
تو مگر مر نہ سکا،
قبر تیرے لئے آغوش کشا بیٹھی ہے،
مرگ سمجھی تری منزل ہے یہی،
"اُن ستاروں کے پرے اور بھی دنیائیں ہیں"
اسے معلوم نہ تھا،
مرگ خود شہپرِ پروازِ بنی،
رُوحِ بیباک نے "خورشید کا سامانِ سفر تازہ کیا"
راہ تکتی ہی رہی قبر کہ اب آتا ہے،
کتنی افسردہ و مایوس ہے قبر!
قبر کی منزلِ تاریک ترا مسکن ہو؟
تو کہ "روشن ہے جبیں" تیری ستاروں کی طرح!
بے خبر تھی ترے جوہر کی تواتابی سے،
گرمیٔ عشق نے کی تیرے وہ مشعل روشن،
جس کے شعلے کی لپک ہے ابدیت بکنار،
مرگ بیٹھی ہی رہے گی ترے مرقد کے حضور،
تو چمکتا ہی رہے گا سرِ دامانِ سحاب!

پروانہ و شمع

(اقبالؒ کے حضور میں)

ڈوسَن کاک برن (واشنگٹن)
مترجم: شہاب رفعت

دریا سا دریا!
میں چلتے چلتے
پہنچا ہوں آخر
اس کے کنارے
شاید کہ پا لوں
گہرائیوں میں
ہلکا سا پرتو
اُس اک نفس کا
جو ماوراء ہے
یوں این و آں کو
یہ ابتدا ہیں
وہ انتہا ہے
یہ عامِ انساں
وہ دیوتا ہے!
اے مردِ کامل!
ہے تیری ہستی
جلوہ سراپا
میں تیرے آگے
ناچیز سایہ
بے نور آنکھیں
دشتِ طلب کا
بے تاب راہی
مغرب سے آیا
پروانہ آسا
کرنوں کا پیاسا
ہر ایک لمحہ
جلووں کا جویا!

افکار جدید:

سرریلزم: خواب اور حقیقت کا سنگم

(ایک مغربی فنی تحریک کا جائزہ)

دیویندر اسّر

چند برس ہوئے لندن کے ایک ہال میں کوئی شخص آرٹ پر تقریر کر رہا تھا۔ اس نے سر پر غوطہ خوری کا خود پہن رکھا تھا۔

"آخر یہ ہیئت کذائی کیوں؟"

"میں تحت الشعور میں غوطہ لگانا چاہتا ہوں۔" مقرر نے جواب دیا۔

یہ مقرر مشہور سرریلیسٹ مصور، سلوادور دالی تھا جس کی تصویر "یاد کا دوام" سرریلیسٹ آرٹ اور طرز زندگی کا نمائندہ اور نادر نمونہ ہے۔

اس قسم کی ہیئت کذائی اور خودنمائی شاید سطحی، مبالغہ آمیز، طفلانہ اور غیر عادی قرار دی جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دالی نے اس طرح سرریلزم کے فکر و فن کا جوہر پیش کر دیا ہے۔ تحت الشعور میں ڈوب کر تخلیق فن ہی سرریلزم ہے۔ دالی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرریلزم ایک طرز فن ہی نہیں بلکہ طرزِ زندگی بھی ہے۔ چنانچہ اس نے جو وضع اختیار کی وہ سرریلزم کے نظریے کی آئینہ دار تھی۔

تحت الشعور کیا ہے؟ — شعور اور لاشعور کا سنگم جس کی سرحد پر فن کار لاشعور کی گہرائیوں سے اپنے فن کا مواد اخذ کرتا ہے۔ اور اسے شعور کے ذریعہ پیش کرتا ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس پر خارجی دنیا سے تشکیل شعور کا عکس نہ پڑنے پائے۔ سرریلیسٹ فن کار کے لئے اعلیٰ تر حقیقت لاشعور کی پہنائیوں میں مستور رہتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ حقیقت شعور یا کسی سطحی اور خارجی معیار سے مسخ ہو جائے، اسے فنی گرفت میں لانا ضروری ہے کسی بھی جبلت یا جذبے کو اخلاقی یا مخرب اخلاق قرار دینا، اس جبلت یا جذبے پر شعور کے ذریعے غور کرنا ہے جس سے وہ غیر حقیقی ہو جاتا ہے، اس کی اصلیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور ہمیں حقیقت کی مسخ شدہ صورت نظر آتی ہے۔ سرریلزم کے تحت فنی تخلیق عالم جذب میں تخلیق کرنے کے مترادف ہے۔ جس میں ادیب یا فن کار کے ذہنی عمل پر کوئی شعوری یا خارجی بندش نہیں ہوتی۔ اس طرح سرریلزم نے انسانی ذہن کے حقائق کو صداقت سے مکمل طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ادب میں لاشعور کو بنیادی اہمیت دی ہے۔

سرریلزم کو منفی تحریک کہہ کر مطعون کرنا صحیح نہیں۔ سرریلزم ذہن انسانی کے اُن سربستہ رازوں کی ترجمانی ہے جنہیں خارجی دنیا کی رسوم و قیود، سماجی اقدار اور ان سے پروردہ اخلاق و ضمیر کے باعث ظاہر ہونے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اور وہ لاشعور کے تہہ خانے میں نمو پانے کے لئے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ سرریلزم کا سرچشمہ لاشعور ہے جو حقائق خواب کے ذریعہ تمثیلی انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں، سرریلزم ان میں معنی خیز اور اہم تمثیلوں کی فن کارانہ تنظیم ہے جو بظاہر بے ربط، منتشر، بے ہنگم اور غیر منظم نظر آتے ہیں لیکن جن میں گہرا ربط اور وحدت پائی جاتی ہے۔ سرریلٹی ایک ایسی حقیقت ہے جو ابھی شعور سے ملوث نہیں ہوتی۔ سرریلیسٹ فن کار سمبل یا تمثیل کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اسے وہی چیز سمجھتا ہے جس کا کہ وہ سمبل ہے۔ سرریلزم میں تمثیل حقیقت کے مماثل نہیں بلکہ خود ہی عین حقیقت ہے۔

لاشعور کی غیر ارادی، غیر منطقی اور خودکار (AUTOMATIC) فینٹسی یعنی عجیب و غریب قسم کی خیال آرائی اور آزاد تلازم ایک برتر قسم کی حقیقت (SUPER REALITY) کو پیش کرتے ہیں چنانچہ سرریلزم کے معنی ہی بالائی یا فوقانی قسم کی اصلیت یا حقیقت کے ہیں کیونکہ فرانسیسی میں 'سر' کے معنی ہیں پر یا اوپر۔ یہ حقیقت روزمرہ کی عملی اور خارجی زندگی اور نام نہاد حقیقت نگاری کی دنیا سے مسخ ہو جاتی ہے۔ سرریلیسٹ فن کار خواب کی اس دنیا کو پیش

کرتے ہیں جن کی تمثیلیں لاشعور سے تشکیل پاتی ہیں۔ اور جن کی تفسیر ناظرین یا قارئین اپنی لاشعوری ساخت کے مطابق خود کرتے ہیں۔ اس لئے وہ خودکار تحریروں اور تلازماتی تخلیقات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ سرریلٹی شعور سے پوشیدہ رہتی ہے، اس لئے وہ خواب، خواب بیداری، پاگل پن اور خودکار تحریروں میں ہی جھلکتی ہے۔ سرریلزم میں اُسی ذہنی حالت کی عکاسی کی جاتی ہے۔ جس سے اس کے غیر استدلالی عنصر کو مسخ کئے بغیر تحت الشعور کو شعور میں پیش کیا جاتا ہے۔ سرریلزم میں ہر قسم کی خارجی و شعوری سعی کو مصنوعی اور فن کے لئے مضر قرار دیا گیا ہے۔

سرریلزم دو عظیم جنگوں کے مابین فرانس اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں ایک ممتاز ادبی و فنی تحریک کی شکل میں مقبول ہوئی۔ سرریلسٹ فن کار، لاترے موں (LAUTRE MAUNT) کو اپنا استاد مانتے ہیں اور اپنے نظریات کی مابعد الطبیعاتی منطق کی وضاحت ہیگل کے فلسفے میں تلاش کرتے ہیں۔ لاترے موں کا یہ فقرہ جو کافی مشہور ہوا، سرریلزم کی بوجہ احسن نمائندگی کرتا ہے:۔ "عمل جراحی کے میز پر کپڑا سینے کی مشین اور چھتری اتفاقیہ ملاقات کی طرح حسین"۔ فرانسیسی ادب میں اپولینیئر (۱۹۱۸ - ۱۸۸۰) نے ۱۹۱۷ء میں اپنے ایک ڈرامہ کو سرریلسٹ ڈرامہ قرار دیا تھا۔ لہٰذا اگر اسے سرریلزم کا بانی نہ تسلیم کیا جائے تو بھی اُس کی شاعری میں سرریلسٹ رجحانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کی شاعری میں الفاظ اور علامات کا آزاد تلازم نہیں تھا پھر بھی اُس نے اِن کا فیصلہ کن استعمال کیا ہے۔ اِس سے قبل الفریڈ جارَی (۱۸۷۳ء — ۱۹۰۷ء) کی تخلیقات سماجی اور ادبی تخریب کو پیش کر چکی تھیں جنہیں سرریلسٹ تکنیک میں پیش کیا گیا ہے۔ آندرے سالموں نے روسی انقلاب اور بورژوائیت کے خلاف اپنے خیالات کو سرریلسٹ شاعری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ لیوَن پول فارگ جو سمبالزم اور سرریلزم کے سلسلہ کی کڑی تصوّر کیا جاتا ہے۔ شروع شروع میں سرریلزم کو تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا۔

سرریلزم اپنے پیش رَو داداازم اور فرائیڈ کے نظریات کا سنگم ہے۔ دادا ازم ادبی روایت پرستی کے خلاف ایک تخریب پرست احتجاج تھا جو کسی بھی نظریہ، تصور یا روایت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے مقولے کے مطابق۔ داداازم خود دادا کے خلاف تھا۔ یہ تحریک تمام تر مروجہ منطق، اداروں، اقدار اور نظریات کے خلاف شروع ہوئی۔ جون ۱۹۲۲ء میں پیرس میں داداازم کی آخری عظیم کانفرنس ہوئی جس میں داداازم کے ممتاز مفسّر زارا اور دوسرے اہم رکن آندرے برتیوں میں اختلاف رائے ہو گیا۔ اِس نظریاتی کشمکش میں آندرے برتیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ دادا ازم کے بہت سے پیرودں نے جن میں لوئی آرگوں پول ایلور اور فلپ سوپول بھی شامل تھے، آندرے برتیوں کا ساتھ دیا۔ لوئی آرگوں اور پول ایلور سرریلسٹ تحریک کے باقاعدہ بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بعد میں دونوں مارکسی نظریے کے زیر اثر اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ اگرچہ پال ایلور نے مکمل طور پر اس تحریک سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ اُس نے سرریلزم کو سہل انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ دادا ازم سے الگ ہونے کے دو سال بعد آندرے برتیوں نے باقاعدہ طور پر سرریلزم کی داغ بیل ڈالی جس میں دادا ازم کے غیر استدلالی طرزِ فکر اور تحت الشعور کی دنیا کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ۱۹۲۰ء اور اس کے بعد فرائیڈ کے نظریات کا بڑا چرچا تھا۔ فرائیڈ کے نظریات کے بغیر سرریلزم کا تصور ممکن نہیں۔ اس نے خواب کی دنیا دریافت کی اور سرریلسٹ فن کار اسی دنیا ہی کے باسی ہیں۔ برتیوں کو لاشعور کے نظریات اور تحلیل نفسی سے بڑی مدد ملی۔ آندرے برتیوں اور فلپ سوپول کی مشترکہ کاوش "دی میگنیٹک فیلڈ" (۱۹۲۱ء) سرریلزم کا اولیں نمونہ ہے۔ انہوں نے کئی آٹومیٹک تحریریں شائع کیں اور سرریلسٹ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے آندرے برتیوں نے کئی پمفلٹ شائع کئے۔ اس نے لکھا ہے:۔

> "ہمارا سب سے پہلا فرض روحانی
> ورثے کو ختم کرنا ہے۔ یہ ہماری جبلتوں پر
> ثقافتی و روحانی ورثے کا بوجھ ہے اور جب
> تک ہم اسے ختم نہیں کریں گے ہم اپنی جبلتوں
> کے مطابق زندہ نہیں رہ سکتے۔"

آندرے برتیوں نے ۱۹۲۴ء میں سرریلزم کا اولیں منشور شائع کیا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ:

سرریلزم خالص نفسیاتی آٹومیٹزم ہے جس کا مدعا زبانی، تحریری یا دوسرے ذرائع سے فکر کے حقیقی عمل کا اظہار ہے۔ ادراک کی کسی آمیزش کے بغیر اور تمام جمالیاتی و اخلاقی اقدار سے آزاد نفسیاتی عمل کو پیش کرنا سرریلزم کا نصب العین ہے۔ یہ تلازماتی اشکال کی برتر حقیقت کے اعتقاد، خواب کی قدرت کا ملہ اور فکر کی آزادی عمل پر مبنی ہے۔ اس حقیقت کو ابھی تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ سرریلزم ان کے علاوہ تمام دوسرے نفسیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کرتی ہے اور ان کے مقام پر زندگی کے اہم مسائل کو اپنا مرکز بناتی ہے"۔

اس منشور سے واضح ہے کہ سرریلزم محض طرزِ فن ہی نہیں بلکہ طرزِ زندگی بھی ہے۔ دالی کی مذکورہ بالا —— مشہور تصویر "یادکا دوام" میں پگھلتی ہوئی کرم خوردہ گھڑیوں کو پیش کیا گیا ہے جن کے بارے میں خود دالی رقم طراز ہے:

"THE TENDER EXTRAVAGANT AND ARBITR-ARY PAR ANIAC-CRITICAL COMEMBERT OF TIME AND SPACE."

سرریلزم کے محاورے ملاحظہ ہوں: " باتھی متعدی ہوتے ہیں"۔ (پال الوار ڈ) "اپنی ماں کو اس وقت پیٹو جب وہ جوان ہو" (بنجامن پیریٹ)۔ آندرے بریتوں نے تحلیل ہونے والی مچھلی کا تصور پیش کیا ہے۔ سرریلزم کی ایک نظم ملاحظہ ہو:

AR DIN SAUVAGE
AL ONNE' DE
ON C HETS
ARDIN PIE'TINE' COMME UN CORPODE
FEMME QUE AIME 4
IME'ON EST UN JOLI PRE'NOM
IX EST UN JOLI NOM DE FAMILLE
I ME'ON
IX CE NEST PAS LONG
SILENCE EST PLUS LENT ET PLUS LONG
ILENCE
ILE NCE
ILE NCE ET PASSION

ہربرٹ ریڈ نے ان نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

" ہمیں علم ہونا چاہیے کہ اب ہمارا تعلق منطقی نشوونما سے نہیں جس کی کوئی تاریخی مثال ملتی ہو بلکہ تمام روایت سے اچانک علیحدگی ہے۔ ہر اس تصور سے علیحدگی جو یہ بتاتی ہے کہ فنِ مصوری کو کیا ہونا چاہیئے۔ بہت اچھا ہوگا کہ اس حقیقت کے لئے ہم لفظ مصوری کو بالکل چھوڑ دیں۔ لیکن جب تک یہ کینواس اور رنگ کا معاملہ ہے یہ امید کرنا لاحاصل ہے۔ تاہم ہمیں محسوس ہونا چاہئے کہ خارجی دنیا سے ہمارے تمام رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ اور ٹھوس سے وابستگی جو صدیوں سے یورپی فن کا خاصہ رہا ہے اور جو تصور سے الگ نہیں ہو سکتا، اس کو دانستہ طور پر خیرباد کہہ دیں۔ اس کے بجائے مصوّر کو اپنی تمام تر توجہ دی جس صلاحیت کا رخ اندر کی طرف یعنی اپنے داخلی تصورات، خواب بیداری اور قبل از شعور دنیا کی طرف موڑ دینا چاہیئے۔ مشاہدے کے بجائے وجدان، تجزیہ کے بجائے امتزاج اور حقیقت کے بجائے تمثیل کی طرف جانا ضروری ہے"۔

سرریلزم کے نقطۂ نظر سے زندگی بالخصوص ذہنی زندگی دو مختلف سطحوں پر وجود رکھتی ہے۔ ایک سطح وہ ہے جس کی تفصیلات واضح اور ظاہر ہیں۔ دوسری سطح غیر واضح، غیر معین اور پوشیدہ ہے۔ ذہن کی یہ دوسری سطح ہماری زندگی کا وسیع اور اہم حصہ ہے۔ ذہن کو ایک زیر آب برف کی چٹانوں سے مشابہت

دی گئی ہے جس کی محض بالائی سطح ہی پانی سے باہر نظر آتی ہے۔ لیکن جس کا بیشتر حصہ زیرِ آب ہوتا ہے۔ نظر آنے والی سطح اصلی حقیقت نہیں بلکہ حقیقت وہ حصہ ہے جو پانی میں پوشیدہ ہے۔ جسے ہم بادی النظر میں نہیں دیکھ سکتے۔ انسانی ذہن کا یہ عمل لاشعوری ہے جو ہماری زندگی کا اہم ترین عمل ہے۔ فنی تخلیق کا سرچشمہ لاشعور ہے۔ خاص طور پر لاشعور کی وہ پہنائیاں جنہیں فرائیڈ نے اِڈ کا نام دیا ہے۔ اگر ہم اپنے خیالات کو آٹومیٹک ہونے دیں اور تخیل کو آزاد چھوڑ دیں تو ہم لاشعور کے سرچشمے سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ جس حد تک فن لاشعور سے پروردہ اہم تمثیلات پیش کرتا ہے۔ اسی حد تک وہ اثر انگیز اور جمالیاتی طور پر اعلیٰ ہوتا ہے۔ فن ان تمثیلات کا سلسلہ پیش نہیں کرتا بلکہ ان تمثیلات کی وحدت اور ان کے ربط کو ایک پُر اثر اسطور (MYTH) کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ دراصل سرریلزم میں نئی اساطیر (MYTHOLOGY) کو جنم دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پوشیدہ زندگی کے عناصر اور اعمال کی عکاسی کرنے کے لئے فن کار خوابوں کی تصوریت اور ذہن کی خواب کے مانند حالت کا سہارا لیتا ہے۔ اسی لئے آندرے بریتوں نے کہا ہے کہ سچی سرریلٹی دو بظاہر متضاد حالتوں، خواب اور حقیقت، کا باہمی امتزاج ہے۔ خوابوں کو منتشر تمثیلات کے سلسلہ کے بجائے ایک اسطور کے روپ میں دیکھنا ہی وحدتِ خواب ہے۔ اور ایک فنی وحدت کے روپ میں ایک نئی حقیقت ہم پر آشکار ہوتی ہے۔ شاعرانہ فیضان خواب کی تشکیل سے مکمل طور پر مماثلت رکھتی ہے۔ ہربرٹ ریڈ لکھتا ہے:۔

> " سلویدار دالی بیان کرتا ہے کہ کس طرح
> اس کی طشتری پہ رنگ چڑھ گئے سے ایک مسخ شدہ
> کھوپڑی کی شکل بن گئی جس کا علم اس کے شعوری
> ذہن کو نہیں تھا اور جس کو وہ شعوری طور پر دریافت
> کرنے میں ناکام رہا۔ یہ آٹومیٹزم کا دوسرا پہلو ہے
> اس لئے سوپر ریلٹی کی صداقت سے انکار نہیں
> کیا جا سکتا جو کہ شعور سے کچھ زیادہ حقیقت ہے
> جس میں ہمارے تمام اعمال شامل ہوتے ہیں۔"

ذہن کے یہ سربستہ راز جنہیں سرریلزم عیاں کرتی ہے تمام انسانوں میں یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن، نہیں فن کار ان کی تمام جامعیت سے عیاں کر سکتا ہے۔ ذہن کی اِس حقیقت کی تشکیل لاشعور سے ہوتی ہے اور جتنا زیادہ ہم لاشعور کا علم حاصل کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ وہ اجتماعی لاشعور نظر آتا ہے۔ اجتماعی لاشعور مشترک جذبات اور خیالات کا مجموعہ ہے جو آفاقی صداقت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرریلزم نے نہ صرف فرائیڈ کے نظریات کو ہی قبول کیا ہے بلکہ اس میں ژونگ کے اجتماعی لاشعور کی آمیزش بھی ہے۔ جب سرریلزم میں ایک نئی اساطیر کی تخلیق کی بات کی گئی ہے۔ تو یہ اجتماعی لاشعور اور تمام انسانی ذہن کی مشترک ہئیت اور اُس کی آفاقی صداقت ژونگ کے نظریے کی بازگشت ہے۔ یہ تحریک جہاں فرائیڈ کے نظریۂ خواب اور علامات پر مبنی ہے وہاں جس طرح ابتدائی تہذیب کی اساطیر کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی طرح کا عمل سرریلیسٹ فن کار کا ذہن بھی قبول کرتا ہے۔ اِسی لئے سرریلیسٹ فن کاروں کا خیال ہے کہ سرریلیسٹ رجحانات ابتدائے فن سے ہی اس کا اہم عنصر رہے ہیں۔ خاص طور پر قدیم فن اور گیتوں میں سرریلیسٹ رجحانات کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ ابتدائی گیت کسی حد تک اجتماعی تخلیق ہیں۔ اپنے جنم میں نہ سہی لیکن نشو و نما میں یہ ضرور اجتماعی لاشعور کے پروردہ ہیں اور کسی حد تک آٹومیٹک تخلیقات ہیں۔ اے. سی. بریڈلے نے اس بات پہ صاد کیا ہے۔ حالانکہ وہ سرریلزم سے وابستہ نہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

> " اگرچہ شاعروں میں غور و فکر کی غیر معمولی
> قوتیں ہوتی ہیں لیکن شاعر کی مخصوص صلاحیت
> ان میں نہیں بلکہ اس کے تخیل میں ہوتی ہے
> اس لئے اس کی گہری تخلیقی تغیر تخیل کے
> کے ذریعہ ہوتی ہے اور تخیل کی مخصوص شکل
> شعوری فکر کے ذریعہ پیش کرنے کے بجائے اُسے
> نیم شعوری طریقے سے پیش کرنے میں مضمر ہے۔
> اُس کی تخلیق کے بعد قاری اگر چاہے تو خیالات
> اخذ کر سکتا ہے۔"

ہربرٹ ریڈ "جدید فن کا فلسفہ" میں لکھتا ہے کہ مندرجہ ذیل الفاظ اب بھی زندہ ہیں جب کہ ان کا خالق مر چکا ہے

اور لوگ اس کا نام تک بھی بھول چکے ہیں۔

"اک گلاب رنگ شہر جو سارے زمانے کے بہ قدر نصف قدیم ہے"

شاعر کے سارے کلام میں سے صرف یہی الفاظ زندہ رہ گئے ہیں۔

سرریلزم کے دو بڑے اسکول ہیں۔ فوٹوگرافک اور غیر متشکل۔ پہلے مدرسۂ فکر کی رو سے تصویر کے جزئیات کو عکاسانہ وضاحت سے پیش کیا جاتا ہے۔ چاہے ایسی کسی شے کا وجود بھی نہ ہو، یا دالی کی طرح ان اشیا کو ایسے مسخ کرکے پیش کیا جاتا ہے کہ ان کو پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ جیسے کہ دالی کی تصویر THE PERSISTENCE OF MEMORY میں ڈھکی ہوئی گھڑیاں ہیں۔ کئی بار اشیاء کو نئی ترکیب سے پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ ہاتھی کو مکڑی کے پاؤں لگا دینا۔ اس مدرسۂ فکر کے تحت ہر شے عکاسانہ حقیقت پرستی سے پیش کی جاتی ہے۔ سرریلزم کا یہ بنیادی نظریہ ہے کہ حقیقی کو غیر حقیقی مرکب میں پیش کیا جائے۔ عکاسانہ سرریلزم اس کی تفسیر ہے۔ سرریلزم کا دوسرا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ آزاد عمل کے ذریعے خواب کی قدرتِ کاملہ کو پیش کیا جائے۔ فرانسیسی مصور آندرے ماسوں اور اسپینی مصور جوآن میرو اسی مدرسۂ فکر کے مقلد ہیں ایسی تصویریں آٹومیٹک تحریروں سے مماثلت رکھتی ہیں جن میں فکر کی شعوری ہدایت کے بغیر ہاتھ کو آزادانہ عمل کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے سرریلزم کی رُو سے ادبی تخلیق زیادہ سے زیادہ ادیب کے اولین ذہنی ردِ عمل کے مطابق ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ سرریلزم میں استعجاب پر زور دیا جاتا ہے۔ آندرے بریتوں کی نظر میں تعجب انگیز ہی ہمیشہ حسین ہوتا ہے۔ ہر چیز جو تحیّر پیدا کرتی ہے حسین ہے۔ تحیّر کے علاوہ کچھ بھی حسین نہیں۔

سرریلزم کے تحت ناول، افسانے، ڈرامے اور شاعری کے موضوع، مواد اور تکنیک کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ اس تحریک کا مقصد محض بغاوت اور تخریب ہی نہیں تھا بلکہ انسانی نفسیات کی صحیح اور جاندار ترجمانی کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔ لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر لکھی گئی بعض تحریریں ہمارے ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ یولیس، میلکون، والی پول، ینگ اور سوفٹ کی تحریروں میں بھی سرریلیٹ رجحانات ملتے ہیں۔ عزیز احمد کے افسانے "چھوٹا خواب" اور احمد علی کی تخلیق "موت سے پہلے" اور "قید خانہ" میں اظہاریت پرست رجحان کے ساتھ ساتھ سرریلزم کا عنصر بھی نمایاں ہے۔

سرریلزم کے خلاف کئی نقادوں نے آواز اٹھائی ہے کچھ نقادوں کی رائے میں سرریلیٹ فن کار، فن اور ہیئت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ سرریلزم ہیئت کے مسئلہ کا کوئی تسلی بخش حل پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس اس سے ہیئت غیر منظم اور غیر متوازن ہو گئی ہے۔ ہر تخلیق کی کوئی نہ کوئی ہیئت لازم ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی غیر منظم کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی تحریر وجود میں نہیں آ سکتی ہیئت سے بے پروائی کے باعث سرریلیٹ نثر اور نظم کا فرق بہت کم رہ گیا ہے۔ رمز و کنایہ پر زور دینے سے سرریلیٹ نثر اکثر شاعرانہ نظر آتی ہے۔ سرریلیٹ فن کار فن کو شعوری سطح پر پیش نہیں کرتے وہ استدلالی نقطۂ نظر کے بجائے تخیلی تخلیق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کسی فطری حقیقت یا جامد اور ٹھوس حقائق کو پیش کرنا فن نہیں سمجھتے جس کی ہیئت سے لوگ واقف ہیں کیونکہ وہ خواب اور لاشعور کے حقائق پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے اس کی ہیئت عام ہیئت سے الگ ہوگی سرریلیٹ فن کار جمالیاتی پہلو کو نظرانداز نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں جمالیاتی قدر ہمیشہ خارجی اقدار سے وابستہ نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق شخصیت اور ذہنی ساخت سے ہوتا ہے۔ سرریلیٹ فن کار کے نزدیک فن شخصیت کی توسیع ہے۔ رنگ کو استعمال کرنے کا کوئی ایک طریقہ معین نہیں کیا جا سکتا۔ فن کی پرکھ اس بات سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ کس طرح کس میڈیم کا استعمال کرتا ہے بلکہ وہ اپنے محسوسات اور خیالات پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔

سرریلزم کی اخلاقی طور پر بھی مذمت کی گئی ہے سرریلیٹ اخلاق کے خلاف نہیں بلکہ اُن اخلاقی روایات کے خلاف ہے جو غیر فطری ہیں۔ جن میں کوئی اصلیت نہیں۔ بلکہ وہ انسانی ذہن اور شخصیت کی نشو و نما میں سدِ راہ ثابت ہوئی ہیں، وہ اخلاق جو ہماری جبلتوں اور فطری رجحانات کو دبا دیتا ہے جس سے بیمار ذہن کی پرورش ہوتی ہے۔ وہ صحت مند

باقی ص ۵۸ پر

مکان

حمید کاشمیری

اس مکان کے مل جانے پر میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو تو نہیں آئے البتہ مجھے اپنی قسمت پر رشک ضرور آنے لگا۔ رشک کیسے نہ آتا۔ جو مشکلات مجھے یہ مکان حاصل کرنے سے پہلے پیش آئی تھیں ان کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ سال بھر تو میرا عجیب و غریب قسم کے دلالوں سے سابقہ پڑتا رہا۔ سینکڑوں پیالیاں چائے کی پلائیں اور ہزاروں سگریٹ۔ اس کے بدلے میں انہوں نے مجھے بیسیوں مکان دکھلائے اور پچاسوں ناکامیاں۔ مکان کوئی ڈھنگ کا ملا نہیں۔ اگر ملا تو دام ہیبت ناک۔ یہ مکان جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اگر کسی اور مقام پر واقع ہوتا تو ممکن ہے میں اسے باہر سے دیکھ کر ہی واپس چلا جاتا کیونکہ اس کی چھت کھپریل کی تھی اور دیکھنے میں نہایت ہی خستہ معلوم ہوتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ یہ ایسی سڑک پر واقع ہے جسے ہم اس شہر کا دل کہتے ہیں، جس پر سے ہر آدمی فخر کے ساتھ گزرتا ہے جو بڑے بڑے مہمانوں کی آمد پر سال میں کئی بار دلہن کی طرح سجائی جاتی ہے اور لوگ خوش آمدید کہنے کے لئے دن دن بھر دو رویہ قطاروں میں کھڑے آنے والوں کا انتظار کرتے ہیں۔ اور یہ شہر تو پاکستان کا دل ہے ہی، اس میں آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے مکان کو اندر سے دیکھ لینا بھی مناسب سمجھا۔ اور جب اندر سے دیکھا تو دل کے کنول کھل گئے اور شکر کیا کہ کہیں نیچے سے ہی دیکھ کر واپس نہ چلا گیا۔

اس وقت اس مکان میں ایک ریٹائرڈ جج صاحب رہتے تھے۔ جنہوں نے اسے بڑے اہتمام سے سجا رکھا تھا۔ اگرچہ اس کے تینوں کمرے آگے پیچھے تھے تاہم بہت بڑے تھے۔ اور چونکہ رُخ مغربی سمت تھا اس لئے اندر کمروں میں ہوا اتنی تیز تھی کہ کھڑکیوں میں ٹنگے ہوئے پردے تو کیا سر کے بال تک اڑنے لگتے۔ ایسا ہوا دار اور اتنا بڑا فلیٹ اس سڑک پر مشکل ہی سے مل سکتا تھا۔ اور پھر طرہ یہ کہ اتنی گنجان آبادی میں بھی الگ تھلگ! نیچے ایک بہت بڑی قالین کی دکان تھی اور اوپر یہ تنہا فلیٹ۔ ہوادار اور پردے دار!

مکان تو مجھے پسند آگیا مگر اب پگڑی سننے کی ہمت نہ تھی۔ اور جب سنی تو ہمت بھی پیدا ہوگئی۔ قیمت اتنی کم کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، دلال نے مجھ سے کہا یہ تو جج صاحب نے محض اپنی لاگت مانگی ہے۔ اور بات بھی ٹھیک تھی۔ اتنی قیمت پر تو دو دو رانے کے معمولی گھٹیا اور تنگ فلیٹ بھی نہیں مل سکتے تھے۔ میں نے مزید انتظار خود کیا نہ ریٹائرڈ جج صاحب کو کرنے دیا اور نہ دلال کو۔ بس جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ادھر مکان دیکھا اور ادھر سودا کر لیا۔ جج صاحب کی صرف ایک خواہش تھی کہ مکان لینے والی پارٹی شریف ہو۔ یعنی ہم لوگ شریف ہوں۔ تاکہ بعد میں مالک مکان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ میں نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور ذمہ داری دلال نے لی جو سودا کرا رہا تھا۔ جج صاحب کو اطمینان ہوگیا۔ پھر میں نے ویسے ہی ان سے مکان چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ وہ حج کو جا رہے ہیں اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہیں گے۔ پھر ہم مکان میں داخل ہوگئے اور جج صاحب جو حج کو جا رہے تھے خارج۔ ان کا سامان دو گاڑیوں میں لادا گیا لیکن ہم نے جو دعائیں انہیں دی تھیں وہ دس گاڑیوں میں بھی نہیں سما سکتی تھیں۔ میری بیوی کہنے لگیں "پرانے زمانے کی شرافت اب بھی دنیا میں باقی ہے" اور میں نے تائید کی۔ بہرحال جج صاحب چلے گئے لیکن اپنی شرافت کا سکہ ہمارے دلوں پر بٹھا گئے۔

ہم جب اپنا سامان وغیرہ پوری طرح قرینے سے لگا کر

اس گھر میں خوشی و خرم طریقے سے آباد ہو گئے تو اس وقت محسوس ہوا کہ مکان کے پچھلے کمرے میں روشنی نہیں آتی۔ ہم نے روشنی کی خاطر برابر والی کھڑکیاں کھولنی چاہیں لیکن وہ بہت سخت جام ہو گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب سے مکان بنا ہے کھڑکیاں بند ہیں۔ بڑی مشکل سے ہتھوڑے مار مار کے کھڑکی کھولی۔ اس کے کھلتے ہی روشنی تو خیر جو آئی سو آئی لیکن بدبو کے جھکڑ سے چلنے لگے اور مچھروں کی بوچھاڑ اندر آن گری۔ ایک دم ناک سڑنے لگی۔ اور بیوی کی طبیعت بری طرح متلانے لگی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور اوپر سے ہتھوڑے مار مار کے درزیں بٹھا دیں۔

میری بیوی نے جج صاحب کو جو جج پر گئے ہوئے تھے، چند بڑے ہی سنگین کلمات سے یاد کیا۔ ان کی خرافت کے مجسمے کو توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے جج ان کی وکالت کر کے وقتی طور پر اس مجسمے کو ٹوٹنے سے بچا لیا۔ میں نے بیوی کو قائل کر لیا کہ آخر اس میں جج صاحب کا کیا قصور ہے۔ بدبو اور مچھر باہر سے آئے ہیں۔ کیوں نہ دیکھ لیا جائے کہ اسکے اسباب کیا ہیں۔ پچھلی طرف جو صحن تھا اس کے باہر والے دروازے سے صرف بھنگی آیا جایا کرتا تھا۔ ہم نے اس دروازے کو کھول کر حالات معلوم کرنے چاہے لیکن وہ دروازہ انتہائی تاریک اور گندی گلی میں کھلتا تھا۔ اس لئے ہم نے اسے پھر بند کر دیا اور بھنگی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ بھنگی آیا تو اس نے بتایا کہ اس گلی میں کبھی کسی آدم زاد کا گذر نہیں ہوا اور اس میں صدیوں کی غلاظت اور گندگی کے انبار پڑے سڑ رہے ہیں۔ حتیٰ کے ہمارے فلیٹ سے جو استعمال کا پانی باہر جاتا ہے وہ بھی اس گلی میں گرتا ہے اور نیچے گٹر کا کوئی انتظام نہیں۔ گٹر کا مسئلہ تو خیر دوسرا تھا۔ پہلا مسئلہ جو ہمیں درپیش تھا وہ پانی کا تھا جس کے لئے گٹر کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جج صاحب نے ہمیں بتا دیا تھا کہ مکان میں پانی نہیں ہے۔ لیکن ہم نے مکان کے محل وقوع کے پیش نظر اسے بغیر پانی کے ہی قبول کر لیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ جس طرح جج صاحب گذارا کرتے رہے ہیں اسی طرح ہم بھی کر لیا کریں گے۔ جج صاحب کیسے گذارا کرتے تھے۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ بھنگی نے بتایا کہ وہ صرف دو میاں بیوی تھے اور چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بالٹی پانی کی استعمال کرتے تھے اور یہ بالٹی جج صاحب صبح پانچ بجے ہی سامنے والے کمپا ؤنڈ سے بھر کر لے آتے تھے۔ اور جب کبھی غسل کرنا ہوتا دو بالٹیاں لے آتے تھے۔ لیکن ہمیں تو ایک ٹنکی پانی کی روز درکار تھی۔ اس سلسلے میں جب ہم نے ماشکیوں سے رجوع کیا تو وہ صاف انکار کر گئے۔ دراصل ہمارے فلیٹ میں پانی بھرنے سے انہیں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ ایک تو تینوں طرف سے باہر کا بڑا مرحلہ کرنا پڑتا اور پھر تین کمرے عبور کر کے پچھلی طرف غسل خانہ آتا تھا جس میں پانی ڈالا جاتا۔ غور سے دیکھنے پر ان تین کمروں کی طوالت ایک ریل گاڑی کی سی لگتی تھی۔ لہٰذا کوئی بھی ماشکی پانی بھرنے کے لئے تیار نہ ہوا اور میں بیٹھے بٹھائے جج صاحب بن گیا یعنی صبح پانچ بجے اٹھ کے سامنے والے کمپاؤنڈ کے نلکے سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے لاتا رہا۔ ایک ہفتہ لگاتار یہ مشق کرنے سے محسوس ہوا کہ مجھے دمے کی بیماری ہو گئی ہے اور اگر نہیں ہوئی تو ہونے والی ضرور ہے۔ اس دن پھر میں نے ماشکیوں کی منت سماجت کی۔ آخر ایک ماشکی کو مجھ پر ترس آگیا۔ وہ آٹھ آنے فی مشک دینے پر رضامند ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے صدیوں کا لدا ہوا بوجھ سر سے نیچے اتار دیا ہو۔

پانی کا مسئلہ حل ہوا تو ایک ہفتے بعد یہ انوکھی بات محسوس ہوئی کہ جب ہم چلتے ہیں تو مکان ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل جاتا ہے۔ یعنی اس طرح جیسے کوئی ہلکا ہلکا زلزلہ آ رہا ہو۔ یہ بات تو میں نے پہلے بھی محسوس کی تھی لیکن شدت سے اس لئے نہیں کہ ایک تو پانی کی مشکل حل کرنی تھی۔ دوسرے جس دن ہم نے بند کھڑکی کھولی تھی اس دن بدبو کے ساتھ مچھروں کا ایک جم غفیر اندر گھس آیا تھا۔ اور اس دوران میں ہم پانی کا مسئلہ حل کرنے اور مچھر مارنے میں مصروف رہے تھے۔ خیر مچھر تو کسی حد تک ختم ہو گئے۔ اس لئے کہ اوپر ہوا بہت چلتی تھی اور پانی کے لئے ماشکی کا خدا بھلا کرے! چاہے اٹھنی مشک ہی پر رضامند ہوا تو سہی۔ لیکن اب مکان کے لرزنے سے ہمارے دل بھی لرزنے لگے۔ مرد تو خیر حوصلہ کر ہی لیتے ہیں لیکن بیوی کا یہ عالم تھا کہ دن میں بیس بیس مرتبہ بآواز بلند کلمہ پڑھتی۔ میں نے کہا چلو یہ بھی اچھا ہے۔ اسی بہانے خدا رسول کو تو یاد کرتی ہیں۔ اس پر وہ چڑ گئیں۔

اور اللہ کی بجائے جج صاحب کو سو بہتر وں سے یاد کرنے لگیں پھر رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بیوی نے جج صاحب کے شرافت کے مجسمے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ میں نے بھی جج صاحب کی وکالت کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ کسی حد تک بیوی ہی کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اب چوبیں گھنٹے ہمیں بلڈنگ لرزتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ مالک مکان کی حالت مکان سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ بلدیہ سے رجوع کرتے تو مکان کو خطرناک قرار دے دیا جاتا اور ہمیں خالی کرنے کا نوٹس مل جاتا۔ اور ساری رقم ڈوب جاتی۔ لہذا مجبور ہو کر صبر کر لیا اور فرش جو پاؤں کے نیچے تھا اس کا خطرہ سر پر سوار ہو گیا۔ خطرے کا مقابلہ کرنے کی تاب تو تھی نہیں لہذا میں نے پھر دلالوں سے رابطہ قائم کر لیا۔ اور ایک آدھ پارٹی خریدار بن کر روز میرا مکان دیکھنے کے لئے آنے لگی لیکن مکان کم دیکھتی اور باہر بالکونی میں ٹھہر کر نیچے بارونق سڑک کا نظارہ زیادہ کرتی۔ جو ہمیں کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ مکان کی اصلیت جاننے کے بعد نظارے میں ہمارے لئے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔

اسی طرح کئی پارٹیاں آئیں لیکن تھوڑی دیر بالکونی سے نظارہ دیکھ کر چلی گئیں۔ دلال جس نے یہ مکان دلوایا تھا اب پارٹیاں لانے میں بہت سرگرمی دکھا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے مکان فروخت کرنے کی وجہ تک نہ پوچھی۔ البتہ لوگوں کے سامنے مکان کی تعریف اسی انداز سے کرتا تھا جس طرح خریدنے سے پہلے میرے سامنے کیا کرتا تھا۔ ہم مکان فروخت کرنے کی کوشش میں مصروف ہی تھے کہ ایک دردناک خبر ملی یہ کہ ہمارا پانی بھرنے والا ماشکی مر گیا ہے ہم نے ماشکی کے مرنے کا یوں افسوس کیا جیسے وہ کوئی ہمارا عزیز ہو۔ یہ بھی ہماری خود غرضی کی علامت تھی۔ اس کے بعد کوئی ماشکی ہمارے گھر میں ایک روپیہ فی مشک کے حساب سے بھی پانی لانے کو تیار نہ ہوا۔ ماشکیوں کا خیال تھا کہ مرنے والا ماشکی دمے کا مریض ہو کر مرا ہے۔ اور یہ دمہ اسے ہماری سیڑھیاں چڑھنے میں برآمدے کا چکر کاٹنے اور فلیٹ کے ریل نما کمرے عبور کرنے سے ہوا ہے۔ واللہ عالم یہ کہاں تک سچ ہے لیکن پھر ہمیں کوئی پانی ڈھونے والا نہیں ملا۔ ہم بوند بوند پانی کو ترسنے لگے اور ترس ترس کر خدا نے ہمارا گھر کے اندر پانی ہی پانی ہو گیا۔

قریباً نصف رات ہو گی کہ ساون کی پہلی جھڑی شروع ہو گئی۔ چھت نے جگہ جگہ سے ٹپکنا شروع کر دیا اور سامان بھیگنے لگا۔ ہم سامان کو بچاتے، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے جہاں کہیں بھی ٹپکنے کے آثار نہ ہوتے لیکن کہاں تک۔ تھوڑی ہی دیر میں فلیٹ کے اندر چھ چھ انچ پانی جمع ہو گیا! پہلے تو چھت ٹپک ہی رہی تھی اب پرنالے چلنے لگے۔ جہاں تک چادریں وغیرہ ڈال کے سامان کو بچایا جا سکتا تھا، ہم نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن سب بیکار آخر نا امید ہو کر کوشش ہی ترک کر دی۔ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ باہر گھپ اندھیری رات میں بجلی زور شور سے چمک رہی تھی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور اندر ہم سکڑتے سکڑتے درمیان والے کمرے میں ایک چارپائی پر سمٹ کے بیٹھ گئے تھے۔ پانی باہر کم اور اندر زیادہ برس رہا تھا۔ تمام کمرے تالاب کی طرح بھر گئے تھے صرف یہی ایک چارپائی کسی حد تک محفوظ تھی جہاں پانی نسبتاً کم ٹپک رہا تھا۔ اس رات ہمارے گھر میں پانی اتنا تھا کہ سب اگلی پچھلی کسریں نکل گئیں۔ پانی کی قلت کا مسئلہ فوراً ختم ہو گیا۔ ہم نے ماشکی کو بھلا دیا۔ اور اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ بیوی زور زور سے کلمہ پڑھ رہی تھیں۔ اور چڑچڑے پن سے جج صاحب کے عزیزوں تک کو نام لے لے کر یاد کرنا شروع کر دیا۔ میں نے خطرے کو جب بہت زیادہ قریب دیکھا تو پھر وہ بدبو والی کھڑکیاں کھول دیں اور پانی کی کڑاہیاں بھر بھر کے کھڑکیوں سے باہر پھینکنے لگا۔ اس وقت ہمیں بدبو، سڑاند اور مچھروں کا قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تمام رات میں نے پانی باہر پھینکتے ہوئے اور بیوی نے جج صاحب کو خطابات پیش کرتے ہوئے گزاری۔

صبح بارش تھمی اور دھوپ نکل آئی تو ہم نے بھنگی کو بلوا کر سارا مکان صاف کروایا اور پھر کئی روز تک گھر کے سامان کو دھوپ میں رکھ کر سکھاتے رہے۔ اس عرصے میں مکان کی اندر سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ آسیب زدہ معلوم ہوتا تھا۔ لہذا ہمارے موقع شناس دلال نے جو اپنے پیشے میں ثانی نہیں رکھتا تھا اس دوران میں کسی پارٹی کو مکان دیکھنے کی دعوت نہیں دی۔ میں نے دل پہ ضبط کر کے کچھ رقم اور خرچ کر ڈالی اور مکان کی اندر سے بہت اچھی ٹیپ ٹاپ کروا دی۔ اس طرح کر

پلنے کا ایک نشان بھی کہیں چھت یا دیوار پر باقی نہ رہا۔

ایک دن دلال نے بڑے وثوق سے کہا کہ اب جو پارٹی آئے گی وہ سوفیصدی خریدنے والی ہوگی۔ میں نے کہا ایسی پارٹی دلانے کا ایک دن مقرر کرلو۔ دلال نے دن مقرر کرلیا اور میں نے پارٹی کی آمد سے ایک دن پیشتر ہی تینوں کمروں کو رئیسانہ طریقے سے سجادیا، چاروں طرف کھڑکیوں اور دروازوں پر خوبصورت ریشمی پردے ٹانگ دیئے۔ اور جب پارٹی، جو صرف ایک آدمی پر مشتمل تھی، ہمارا مکان دیکھنے آئی تو ہمارے گھر کی فضا بڑی پُر وقار معلوم ہو رہی تھی۔ ہم نے دلھن کی طرح سجے ہوئے تینوں کمروں میں اگربتیاں سلگا رکھی تھیں۔ اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی عطر کی شیشی نجانے کیسے الٹ گئی تھی کہ ہلکی ہلکی خوشبو تمام کمروں میں پھیل گئی تھی۔ پارٹی اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے مکان کو نہایت ہی سرسری طریقے سے دیکھا جیسے کوئی گاہک معمولی سبزی ترکاری کو دیکھتا ہے۔ ہم لوگ پارٹی کے ساتھ باہر کے ہوادار کمرے میں بیٹھ گئے اور نہایت دوستانہ ماحول میں گفتگو ہونے لگی۔ اسی گفتگو میں مکان کا سودا بھی ہوگیا اور پارٹی نے بیعانہ دے دیا۔ سودا میری لاگت سے اوپر ہی ہوا تھا لیکن دلال اس وقت میری وکالت کر رہا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ پارٹی کو یقین دلا رہا تھا کہ ہم نے منافع نہیں لیا بلکہ صرف اپنی لاگت پر سودا کیا ہے۔ نیز یہ کہ ہمیں منافع سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ پارٹی شریف ہو تاکہ آئندہ مالک مکان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ جواب میں پارٹی نے اپنی شرافت کا یقین دلایا اور دلال نے حسب معمول ذمہ داری لی۔ میں بھی جج صاحب کی طرح مطمئن ہوگیا۔ پھر پارٹی نے مجھ سے مکان چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا۔ "حج کو جا رہے ہیں اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہنے کا ارادہ ہے۔" ہماری یہ گفتگو جس دوستانہ ماحول میں شروع ہوئی تھی اسی میں ختم ہوگئی۔ جاتی دفعہ ہم نے پارٹی سے مکان خالی کرنے کے لئے چار دن کی مہلت مانگ لی۔

چوتھے دن صبح جب ہمارا سامان جا چکا تھا اور مکان کو ہم نے اس طرح صاف کرایا جیسے وہ چٹیل میدان ہو۔ خیر خریدار بھی آگیا اور دلال کے روبرو اس نے بقایا تمام رقم ادا کردی۔ ہم مصافحہ کرکے رخصت ہوگئے۔ اس وقت ہم بہت اداس تھے اور خریدار ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ میری بیوی اس بات سے بہت متاثر ہوئیں۔ چلتے چلتے کہنے لگیں۔ "کتنا شریف آدمی ہے!"

میں نے کہا۔ "جی ہاں، آئندہ سال یہ بھی حج کو جائے گا۔ اور واپسی پر اپنے ذاتی مکان میں آکر اترے گا۔"

★

سجاد — ایک نیا ستارۂ فن: بقیہ ص ۴۸

یہی قرب اسے اپنے ابنائے جنس سے بھی ہے۔ چنانچہ ایک اور خاکے سے پھر ایک گھرانے کا تصور ابھرتا ہے۔ اس میں سب سے نمایاں خاکہ مرد کا ہے۔ کسا ہوا بدن! شاید کوئی جفاکش پردیسی۔ وطن سے دور، تصورات میں گم!۔۔۔ سامنے عورت اور دو بچوں کے خاکے نسبتاً ہلکے اور چھوٹے۔ صریحاً یہ سوچنے والے کے سپنوں ہی کی جھلکیاں ہیں۔ عورت کے چہرے، خصوصاً آنکھوں، نیم وا ہونٹوں اور دیکھنے کے انداز سے۔ بچھڑے ہوئے ساتھی کی یاد جھلکتی ہوئی! ایک بار پھر سایوں اور روشنیوں میں وہی میل اور وہی تضاد بھی یا شاید محض اشکال نگاری ہی کا شوق ہو۔

ابھی تک اس ہونہار پاکستانی فن کار کا فن کچھ ان ہی منزلوں تک پہنچا ہے کیا خبر جو جذبۂ بے اختیار شوق اسے یہاں تک لے آیا ہے، اسے اور کن منزلوں تک لے جائے۔ یہ ابھی دیکھنا باقی ہے۔ عنوان بہرحال بہت امید افزا ہے۔

ڈرامہ

کاروبار

آغا ناصر

پہلا منظر

شہر کے کسی رہائشی ہوٹل کا ایک عام سا کمرہ۔ مالک فخرالدین بیٹھے آج کا تازہ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں بھائی ننھے داخل ہوتے ہیں جو ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود بڑے زندہ دل معلوم ہوتے ہیں۔

ننھے السلام علیکم ملک صاحب

ملک او ہو، بھائی ننھے! ارے بھائی وعلیکم السلام۔ کہو، خیریت سے تو ہو نا؟

ننھے بالکل بالکل۔ بس دعا چاہیئے آپ کی ملک صاحب جی۔ ہم تو خیریت ہی سے ہوتے ہیں ہمیشہ۔ آپ سنایئے کیا حال ہیں۔ ایسے چپکے سے آ گئے کہ خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ تو کہیئے چار چھ دن ہوئے بالکل اتفاقاً مجھے منشی وزیر احمد کا لڑکا مل گیا بس اسٹاپ پر۔ کہنے لگا ننھے بھائی! پتہ بھی ہے ملک صاحب آئے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا لو اور لو۔ اپنے ملک صاحب شہر میں آئیں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ لعنت ہے بھائی ننھے کی زندگی پر۔ بس اس دن سے کھوج میں لگا ہوا تھا سو آج ہو ہی گئی ملاقات۔ ورنہ آپ تو بغیر ملے ہی چلے جاتے شاید، ملک صاحب۔

ملک (ہنستے ہوئے) ارے بھئی نہیں۔ ایسا بھی کیا۔ میں تو خود تمہیں بڑا یاد کر رہا تھا۔ اور سناؤ کیا کر رہے ہو آجکل۔

ننھے کچھ بھی نہیں۔ اپنے کو کرنا کرانا ہی کیا آتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے ملک صاحب (ہنستا ہے) مگر بس شکر ہے۔ اس پاک پروردگار کا کسی کا محتاج نہیں۔ روکھی سوکھی جیسی بھی ہے، مل ہی جاتی ہے۔ دونوں وقت۔

ملک کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔

ننھے آپ سنایئے۔ سنا تھا مستقل طور پر شہر آنے کا ارادہ کر لیا ہے آپ نے۔

ملک ہوں، خیال تو کچھ ایسا ہی ہے۔ بڑے لڑکے نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ اور سہیلہ کا رشتہ بھی شہر ہی میں طے ہو رہا ہے۔ اب ان کی ماں کہتی ہے کہ جب بچے ہی شہر میں ہیں۔ تو ہم گاؤں میں رہ کر کیا کریں۔

ننھے ٹھیک ٹھیک۔ سولہ آنے سچی بات ہے ملک جی۔ پھر یہ کہ گاؤں میں تو کھیتی باڑی کا کام چلتا ہی رہے گا۔ آپ اپنا اطمینان سے شہر میں رہیئے۔ دوسرے تیسرے مہینے جب جی چاہا چکر لگا آئے۔

ملک ہاں بس۔ کچھ اس قسم کا مشورہ دیا اور لوگوں نے بھی۔

ننھے بڑا نیک مشورہ دیا ہے۔ شہر میں ہزاروں سہولتیں ہیں۔ میری بات مانیں تو بس چلے ہی آئیں فوراً۔ مکان میں دلادونگا فسٹ کلاس۔

ملک (ہنستے ہوئے) شکریہ۔ پر ابھی مکان دکان کا کیا کرنا ہے۔ پہلے آنے کا قصد تو کر لیں۔

ننھے اجی قصد تو ہو ہی جائے گا۔ بلکہ بس ہوا ہی سمجھیں اب آپ۔ میں تو کہتا ہوں ملک صاحب جی کہ بس آپ حکم دیں مجھے۔ اور میں آپ کو گھر دلاؤں۔ کچھ تو خدمت کرنے کا موقع ملے ہم گنہ گاروں کو بھی۔

ملک ہو ہو ہو۔ کیوں نہیں دیکھو میں فی الحال تو کچھ اور کام سے آیا تھا۔ اس کے بعد جب آؤں گا تو تم سے بات چیت ہوگی اس سلسلے میں۔

ننھے — ہاں ہاں، جیسا آپ حکم دیں (خاموشی) پھر ویسے میری نظر میں
ایک مکان ہے آجکل۔ بڑے اول درجے کا ایک انجینیر کا
مکان ہے۔ حال ہی میں بنوایا تھا بچارے نے۔ اٹھارہ ہزار کی
لاگت سے۔ مکان کیا ہے، سمجھو کوٹھی ہے، اچھی خاصی کوٹھی۔

ملک — لیکن میرا تو ابھی کوئی خیال ہی نہیں ہے بھائی ننھے فی الحال
تو......

ننھے — اوہو ہو۔ تو میں کب کہتا ہوں۔ میں تو ایسے ہی بات کر رہا تھا۔
قسمت کے کھیل ہیں ملک جی۔ سچ کہتا ہوں میں ایسے مکان کو
بیچنے کے لئے بھی پتھر کا دل چاہیئے۔ کیا مکان ہے صاحب!

ملک — تو پھر فروخت کیوں کر رہے ہیں؟

ننھے — کیا بتاؤں ملک صاحب۔ وقت ہی کچھ ایسا آپڑا قسمت کے
ماروں پر۔ انجینیر صاحب کا تو ہو گیا انتقال۔ اب ان کے
دو ہیں بچے۔ بیوی بیوہ ہے۔ مکان فروخت نہ کریں تو کیا کریں۔
بچوں کی تعلیم، گھر کا خرچ۔ ایک ہزار ایک پریشانیاں ہوتی
ہیں تم جانو ملک جی۔ عورت ہو تو ایسی سگھڑ اور سمجھدار،
واہ وا! مجھ سے کہنے لگی بھائی ننھے، میرا گھر بکوا دو مناسب
قیمت پر تو پھر بڑے لڑکے کو کوئی دکان کھلوا دوں۔

ملک — ٹھیک ہی تو کہتی ہے بچاری۔

ننھے — پر مکان کیا زوردار ہے ملک صاحب جی۔ آپ جانیں انجینیر کا
خود بنوایا ہوا مکان۔ پھر موقعہ ایسا کہ بس کیا کہوں۔ اول تو
بالکل لب سڑک، ڈاک خانہ سامنے، ہسپتال برابر میں،
اسٹیشن چار قدم پر۔ میں کہتا ہوں اپنی قسم! بیس ہزار بھی کم ہیں
اس مکان کے۔

ملک — اور مکانیت کیا ہو گی؟

ننھے — مکانیت۔ بس سمجھ لیں کہ تین کمرے تو اندر ہیں، ایک بڑی
بیٹھک باہر، آگے پیچھے دو برآمدے، باورچی خانے، غسل خانے
اور صحن علیحدہ رہا۔ مکان کیا ہے، پوری حویلی ہے حویلی —
میری مانیں تو ایک نظر دیکھ ہی لیں ملک صاحب۔

ملک — ارے نہیں نہیں بھئی میں تو یں یوں ہی پوچھ بیٹھا تم سے
مکان کے بارے میں ورنہ .....

ننھے — میں سمجھتا ہوں۔ میں نے یہ کب کہا کہ خرید لیں مکان —
پر ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ سچ کہتا ہوں طبیعت
خوش ہو جائے گی۔ آپ ہی کہیں گے کہ جیسے ہو سودا ہی
کرا دو۔

ملک — (ہنستے ہوئے) بہت باتیں بنانا سیکھ گئے ہو بھائی ننھے۔
بھلا میں سودا کیا کروں گا۔ اس وقت تو میرے پاس
روپیہ بھی نہیں۔ بس یہی کوئی پندرہ سولہ ہزار روپیہ
لایا تھا ساتھ کسی کام کے لئے۔

ننھے — پندرہ سولہ ہزار۔ ارے تو کیا کم ہے۔ اگر اٹھارہ ہزار کا
مکان آپ کو پندرہ ہزار میں نہ دلایا تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔

ملک — لیکن ابھی تو میرا کوئی ارادہ نہیں ہے ننھے میاں۔

ننھے — ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ پر میری خاطر ایک نظر دیکھ تو لیں
ویسے بھی ثواب کا کام ہے ملک جی۔ بیوہ کا مکان ہے۔
اچھا تو اب چلا میں کل شام کو آؤں گا۔ بس ٹہلتے ہوئے
چلئے گا میرے ساتھ ذرا کی ذرا ایک نظر دیکھ لینے میں
کیا حرج ہے۔ دیکھ لیں۔ پھر انکار کریں تو جانوں (ہنستے ہوئے)
اچھا تو میں کل آؤں گا شام کو خدا حافظ!

ملک — (ہنستے ہوئے) خدا حافظ!

دوسرا منظر

ایک مکان کا کمرہ۔ خالہ چارپائی پر بیٹھی کچھ بن رہی ہیں
(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

خالہ — ارے حفیظ! او حفیظ! دیکھنا ذرا کون ہے۔
(قدموں کی چاپ، دروازہ کھلنے کی آوازیں)

حفیظ — (بلند آواز سے) بھائی ننھے ہیں بوا۔

خالہ — ارے بلا لے نہ پھر۔ (قدموں کی چاپ)

ننھے — سلام خالہ۔ اوہ یہ سلائی ہو رہی ہے۔

خالہ — کہو آج کیسے راستہ بھول گئے؟ تم نے تو آن جان ہی
بند کر دی بالکل۔

ننھے — ارے نہیں خالہ۔ بس کچھ فرصت ہی نہ مل سکی

خالہ — ہاں بھیا۔ تم ٹھہرے بڑے آدمی۔ ہم غریبوں کے ہاں
کاہے کو آنے لگے۔

ننھے — کیسی باتیں کرتی ہو خالہ ہم تو ہمیشہ تمہارے خادم ہی رہیں گے۔ تم چالو مزدور آدمی ہیں۔ رات دن محنت کرتے ہیں تب دو ہفتوں کی روٹی ملتی ہے۔ اور کہو سب خیریت ہے نا۔

خالہ — شکر ہے اللہ کا

ننھے — امین کہاں ہے؟

خالہ — اسکول گیا ہے۔ امتحان ہو رہے ہیں آجکل۔

ننھے — اللہ کامیاب کرے! کونسی میں ہے اب؟

خالہ — اس سال نویں سے دسویں میں چڑھے گا۔

ننھے — اللہ کامیاب کرے! بس ہماری تو یہی دعائیں ہیں کہ خدا جلد از جلد حفیظ کو کسی قابل کر دے (خاموشی) یہ سفیدی پھر کرائی ہے کیا خالہ مکان میں؟

خالہ — نہیں تو، بس جب بنا تھا تب ہی کی سفیدی ہوئی وی ہے۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے۔ اس محرم میں دوسرا برس لگے گا بنے ہوئے۔

ننھے — ہاں مکان کے بننے کے ایک ہی مہینہ بعد تو انتقال ہو گیا انجنیئر صاحب کا۔ بچارے کو مہینہ بھر بھی رہنا نصیب نہ ہوا اس گھر میں!

خالہ — (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں کس چاؤ سے بنوایا تھا مکان! پر۔۔۔

ننھے — سب قدرت کے کھیل ہیں خالہ۔ یہ اس کے بھید ہیں، وہی جانے۔

خالہ — ہاں بھیا، اب افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو بس یہی دعا ہے کہ خدا ان بچوں کو لکھا پڑھا کر کسی قابل کر دے۔

ننھے — اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر خالہ ارادہ کیا ہے؟ امین کیا کرے گا پڑھائی ختم کرنے کے بعد؟

خالہ — ابھی تو کچھ سوچا نہیں بھیا۔ پہلے ساتھ خیریت کے دسویں پاس کرے۔ پھر کوئی نوکری دیکھیے۔

ننھے — آجکل نوکری میں تو کچھ بھی نہیں رکھا ہے خالہ۔ میری مانو تو تجارت میں ڈالو امین کو۔

خالہ — کہتے تو ٹھیک ہو پر تجارت کے لئے روپیہ کہاں ہے؟

ننھے — روپیہ کا کیا ہے خالہ۔ آدمی کو ارادہ کرنا چاہیئے۔ کونسی بات ناممکن ہے دنیا میں؟ تم ارادہ تو کرو کسی تجارت کا، پھر دیکھو سو راستے نکل آتے ہیں روپیہ حاصل کرنے کے۔

خالہ — تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو بھائی ننھے۔ کوئی چھپر پھاڑ کر تھوڑی ہی مل جائیں گے روپے۔ میں تو آج شروع کر دوں کپڑے کا کاروبار اگر پیسہ ہو تو۔ میرا چھوٹا بھائی بیکار ہے۔ کپڑے کی دکان کھلوا کر اسے بٹھا دوں۔

ننھے — تو پھر دیر کیا ہے۔ کھلوا دو نا اسے دکان۔

خالہ — پھر وہی بات۔ میں کہتی ہوں آخر پیسہ کہاں ہے؟

ننھے — پیسہ، میری مانو تو مکان فروخت کر دو خالہ اٹھارہ ہزار سے تو کیا کم کا بکے گا۔

خالہ — نہ بھیا نہ مکان تو میں کبھی نہ بیچوں۔ ایک ہی تو نشانی ہے امین کے ابا کی۔

ننھے — واہ واہ خالہ! تم بھی کیا باتیں کرتی ہو۔ یہ امین اور حفیظ نشانی نہیں ہیں ان کی۔ دیکھو، میں آج ہی ذکر کر دوں گا۔ کوئی کام کا آدمی مل جائے تو

خالہ — مگر مکان میں ایک لاکھ تک بھی نہ بیچوں گی۔

ننھے — افوہ! تو میں کب کہتا ہوں کہ آنکھیں بند کر کے بیچ دو۔ بھئی میں دیکھوں گا۔ اگر کوئی اچھا گاہک ملا تو پھر سوچ لیں گے مل بیٹھ کر۔

خالہ — نہ نہ بس گاہک واہک کی فکر نہ کرو تم۔ میں نہ بیچوں گی مکان۔

ننھے — اس میں بیچنے کا کیا سوال ہے۔ تمہاری چیز ہے۔ تمہاری مرضی ہے چاہے بیچو چاہے نہ بیچو۔ میں تو یوں کہوں تھا کہ ذرا اندازہ ہی ہو جائے گا۔ سولہ ہزار کی لاگت سے بنوایا تھا انجنیئر صاحب نے۔ دیکھیں تو سہی ذرا لوگ کیا لگاتے ہیں اس کا۔

خالہ — ہا ایسے بات چیت نہ کرنا کسی سے بھائی ننھے۔ میں نے تم سے کہا ناکہ۔۔۔

ننھے — حد ہو گئی۔ تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے کوئی ہاتھ سے جھپٹ کر لے جائے گا۔ مکان دیکھو نا۔ تم بھی ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ امین سے بھی بات کر کے دیکھو۔ اب تو ماشاءاللہ سیانا ہو گیا ہے۔ اپنا اچھا برا سمجھ سکتا ہے۔

خالہ — نہ بھیا نہ۔ امین بھی راضی نہ ہوگا مجھے معلوم ہے۔ تم ہی سوچو بھائی ننھے۔ دنیا نہ تھوکے گی ہمارے جنم کرم میں کہ شوہر تے تو اتنی جائیداد سے مکان بنوایا اور بیوی نے اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی بیچ کھایا!

ننھے — بیچ کھایا! کون کہہ سکتا ہے خالہ! بھلا تم کوئی گلچھرے اڑانے کے لئے بیچ رہی ہو۔ آدمی کیا نہیں کہتا اور پھر لوں بھی امین اس روپے سے کپڑے کا کاروبار کرے گا۔ اگر چل نکلا تو اللہ نے چاہا ایسے ایسے چار مکان بنوا لینا۔ اچھا اب میں چلا۔ موقعہ ہوا تو شام کو آؤں گا کسی وقت۔ امین سکول سے کب لوٹتا ہے؟

خالہ — چار بجے۔ لیکن اس سے کیا کہنا ہے، وہ تو

ننھے — او ہوا تو کیا اپنے گھر آنے کو بھی منع کرتی ہو خالہ؟

خالہ — ارے نہیں بھیا۔ تمہارا گھر ہے جب جی چاہے شوق سے آؤ۔ میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ ـــ

ننھے — بس بس کچھ نہیں کہہ رہی تھیں تم۔ یہ لو میں چلا اب ـــ

تیسرا منظر

(وہی مکان، وہی کمرہ اور وہی لوگ)

امین — مجھ سے کیا پوچھتا ہے بھائی ننھے۔ جو بوا کہدیں وہی میری رائے ہے۔

ننھے — ارے ارے امین میاں! میرا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ تم خالہ کے خلاف جاؤ۔ میں نے تو یونہیں اک بات کہی میں بھی کوئی تمہارا برا تھوڑا ہی چاہتا ہوں خدانخواستہ! سوچو نا کہ یوں مکان رکھنے سے کیا فائدہ۔ اگر اس روپے سے کوئی کاروبار کیا جائے۔ تو وارے نیارے ہوسکتے ہیں

امین — ہے تو ٹھیک لیکن جب بوا کی رائے نہیں ہے تو پھر..

خالہ — اے تم تو ہاتھ دھو کے ہی پیچھے پڑ گئے بھائی ننھے

ننھے — مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ ایک نفع کی بات سمجھ میں آئی تھی سو کہدی۔ آگے تمہاری مرضی۔ مجھے تو اس لئے اور خیال تھا کہ ہمارے گاؤں کے ایک زمیندار آئے ہوئے ہیں۔ بیچارے بہت ہی پریشان ہیں مکان کے لئے۔ آدمی رئیس ہے اور ضرورت مند بھی ہے۔ شاید زیادہ پیسہ لگا دے۔

امین — بات تو ٹھیک ہے۔ اگر واقعی اٹھارہ ہزار میں فروخت ہو جائے مکان تو ہم چھ سات ہزار سے کوئی کاروبار کریں اور دس گیارہ ہزار میں چھوٹا سا مکان بھی لے سکتے ہیں۔

ننھے — یہی تو میں کہتا تھا۔

خالہ — ہا۔ پر دیکھو تو امین تیرے ابا نے کس محنت سے بنوایا تھا یہ مکان۔

ننھے — اور ایک بات اور کہوں خالہ! مجھے تو یہ بھی وہم ہے کہ یہ مکان کچھ راس نہیں آیا تمہیں جس دن بن کر تیار ہوا اسی دن چوری ہوئی تمہارے یہاں۔ پھر یہاں آنے کے ایک مہینے کے اندر ہی اندر انجینیر صاحب چل بسے۔ بعض بعض مکان ہوتے ہی ایسے ہیں کہ جو بھینٹ لیتے ہیں۔

خالہ — اچھا تو بھائی ننھے! پھر تم کرکے دیکھو بات، زمیندار صاحب سے، مگر میں یہ بتائے دوں ہوں کہ اٹھارہ ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گی۔

ننھے — میں خود ہی نہیں دینے دوں تمہیں اٹھارہ ہزار سے کم میں تم تمہارا نقصان تھوڑا ہی چاہتا ہوں کوئی۔ اچھا لو اب میں چلا۔ دیکھو اگر ملک صاحب مان گئے تو کل شام کو لے کر آؤں گا انہیں۔

(چلا جاتا ہے)

خالہ — یہ لو ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہے کہ ناک میں دم کر دیا

امین — لیکن بوا بات تو ٹھیک ہے، اگر واقعی کاروبار میں منافع ہو جائے تو.....

خالہ — ہاں اور یہ وسوسہ تو میرے دل میں بھی ہے کہ گھر ہے منحوس۔

امین — ارے چھوڑو بوا، یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں۔ پر اگر اٹھارہ ہزار میں بک جائے تو برا نہیں۔

خالہ — دیکھو اب۔ کہہ تو گیا ہے کل شام کو آنے کے لئے۔

چوتھا منظر

(وہی مکان۔ ننھے خاں اور ملک صاحب مکان دیکھنے میں مشغول ہیں)

ننھے — اور یہ دیکھئے ملک صاحب جی۔ یہ دو بڑے کمرے۔ فرش کی ٹائلیں دیکھئے! کیا فینسی ہیں! ایک دم پکا کام

ہے۔ اور جتنیں تو شہر بھر میں کسی مکان کی نہ ہوں گی ایسی۔ ارے کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے ایک نمبر کا بنوایا ہوا مکان ہے بنیاد آٹھ آٹھ فٹ گہری رکھوائی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ دراصل انجینیر صاحب کا خیال ایک منزل اور بنوانے کا تھا، پر موت نے مہلت ہی نہ دی مرحوم کو۔ اور دیکھئے ملک جی ایک کمرہ وہ اور ہے۔ اس کے آگے برآمدہ۔ اور یہ صحن کا دروازہ ہے جو دوسری طرف نکلتا ہے

(دروازہ کھولتا ہے) اسے یہ ......

ملک   او۔ اور وہ کیا سامنے قبرستان ہے اس طرف!

ننھے   ہاں جی (دروازہ بند کر دیتا ہے) اور یہ زینہ ہے ادھر جانے کا۔ آئیے ادھر آئیے۔ بیٹھک میں چلیں۔

(وقفہ۔ قدموں کی چاپ)

تو یہ ہے صاحب مکان۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔

ملک   ہوں بس یہی موقع و وقوع تو کوئی ایسا خاص اچھا نہیں ہے۔ اب تم دیکھو نا سامنے قبرستان ہے۔ میری بیوی کو تم جانتے ہی ہو کس قدر وہمی ہے۔

ننھے   ارے اس سے کونسا فرق پڑتا ہے ملک صاحب۔ وہ تو صحن کا عقبی دروازہ ہے بھنگن بہشتی کے لئے۔ آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے اسے کھولنے کی۔ اور ایک بات میں بتا دوں ملک جی۔ مضبوطی اور پائیداری میں کوئی مکان اس شہر میں نہیں ہے اس کی ٹکر کا اور موقعہ کی بات تو یہ ہے ملک جی کہ وہ سامنے ہسپتال ہے۔ اور یہ اس طرف بالکل لگا ہوا ریل کا اسٹیشن ہے۔ اور کیا نہیں ہے بھلا! بس اب تو آپ یہ بتا دیں مجھے کہ کتنے تک کا خیال ہے اس کا۔

ملک   بھئی خیال ویال کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا، اس وقت تو سولہ ہزار روپیہ ہے میرے پاس بس۔

ننھے   اسے روپیہ ہونے نہ ہونے کی بات چھوڑیں۔ اب اتنے ہم بھی گرے پڑے نہیں ہیں اللہ کے فضل سے، ہزار دو ہزار تو آپ کا یہ خادم بھی دے سکتا ہے، اگر ضرورت پڑی تو۔

ملک   ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مگر دیکھو نا میرا کوئی خیال ہی نہیں تھا۔ یہ تو تم نے چونکہ کہا تھا۔ اس لئے میں نے حامی بھر لی سولہ ہزار کی۔

ننھے   ہاں وہ تو میں نے کہا تھا پر دیکھئے نا ملک صاحب آخر کو مکان ہے، کوئی سگریٹ کی ڈبی تو ہے نہیں کہ چھ آنے میں خرید لو ایک قیمت پر۔ اب اس میں تو یہی ہوتا ہے۔ سولہ ہزار آپ نے کہے، بیس ہزار انہوں نے کچھ آپ بڑھیں کچھ وہ گھٹیں۔

بس تو بھائی ننھے پھر جانے دو۔ میں تو یہ کہتا تھا کہ آپ مجھے تو بتا دیں کتنا نقد دے سکتے ہیں۔ ان سے تو میں یہی کہوں گا کہ سولہ ہزار سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں ملے گا۔

—— (وقفہ) بولئے۔

ملک   کیا بولوں۔

ننھے   آخر مجھ سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔

ملک   بھائی میں نے تو بتا دیا۔ اب آگے جو تم مناسب سمجھو۔ سو دو سو اپنی مرضی سے اور بڑھا دو۔

ننھے   ہاں اب بھی تو ہوئی نہ بات۔ یعنی کہ میں ساڑھے سولہ ہزار تک کر لوں سودا۔ اچھا تو میں ابھی آیا۔ ذرا خالہ سے بات کر لوں۔

(قدموں کی چاپ)

ننھے   (زبیدان) دیکھا وہی ہوا نا جس کا مجھے ڈر تھا۔

خالہ   کیا ہوا؟

ننھے   میں پہلے ہی کہا کرتا تھا انجینیر صاحب سے کہ مکان ہی بنوانا ہے تو کسی اچھی سی جگہ بنواؤ۔ یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ ملک صاحب نے وہی کہا کہ چوبیس گھنٹے ریلوں کا شور، انجنوں کی سیٹیاں، گھر کیا ہے ریلوے اسٹیشن کا کوئی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر سامنے قبرستان میں ہمیشہ کہا کرتا تھا انجینیر صاحب سے۔

خالہ   لیکن قبرستان تو دوسری طرف ہے بھائی ننھے۔ وہ تو عقبی دروازہ ہے کھولنے کی ضرورت ہی کیسے پڑتی ہے؟

ننھے   یہ تو کوئی بات نہ ہوئی خالہ۔ جب انسان رہتا ہے گھر میں

تو ہر طرف جاتا ہی پڑتا ہے۔ پھر بچے جانے۔ کس کس کو روکا جاسکتا ہے۔ (آہستہ سے) اور یوں بھی قبرستان کے قریب جو مکان ہوتے ہیں نا وہاں لوگ رہنا پسند نہیں کرتے۔ کبھی اگر ہو کچھ۔

خالہ (افسردہ لہجے میں) ہاں اب تو جیسا ہے یہی ہے۔ بدلا تو جا نہیں سکتا۔ کیا کہتے ہیں تمہارے ملک صاحب؟

ننھے دیکھو کر تو رہا ہوں بات۔ اب تم مجھے بس یہ بتلا دو کہ کتنے تک کر لوں سودا۔

خالہ سودا کیسا میں نے بتا تو دیا تھا تمہیں کہ اٹھارہ ہزار سے ایک کوڑی کم نہ لوں گی

ننھے ہاں ہاں۔ تم نے کیا بتایا، یہ تو میں نے ہی کہا تھا تم سے لیکن آخر کچھ رعایت تو رکھی ہی ہوگی نہ تم نے

خالہ پھر کر دیں نا تم نے شروع کاروبار والی باتیں۔ مجھ سے پوچھو گے تو بس یہی کہوں گی۔ اٹھارہ ہزار آگے تمہاری مرضی، چاہے سیاہ کرو چاہے سفید۔

ننھے میں کیوں سیاہ کرنے لگا۔ میرا بس چلے تو پچیس ہزار میں فروخت کر دوں۔ پر سوچ کر ہی کرنا پڑتی ہے نا بات — مجھے تو بس اب یہی فکر ہے کہ کسی طرح امین کو یہ کپڑے کا کاروبار کرا دوں۔ تم ہی کہو اب اگر سو دو سو کم ہی رہیں اٹھارہ ہزار سے تو ہرج کیا ہے؟

خالہ لیکن میں نے کہا نا بھائی ننھے۔

ننھے تو بھائی۔ ننھے کب کہتا ہے تم نے نہیں کہا۔ اور میں کروں گا بھی وہی جو تم نے کہا ہے۔ پر کچھ تو کمی زیادتی ہوتی ہی ہے۔ میرے خیال میں تو ساڑھے سترہ تک اگر ہو جائے طے تو کر ہی لوں۔

خالہ ٹھہرو، میں امین سے پوچھ لوں۔

ننھے ارے اب امین کوئی تمہارے خلاف جا سکتا ہے۔ اس سے کیا پوچھنا۔ اور خالہ یہ رخ بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے تمہارے مکان کا۔ دھوپ کتنی آتی ہے۔ گرمی میں تو پاگل ہو جائے انسان۔

خالہ ابھی دکھا لو ملک صاحب کو اچھی طرح، کبھی پھر بعد میں کہتے پھریں۔

ننھے ہاں ہاں تو ایسے تھوڑا ہی۔ وہ تو میں ساری بات صاف صاف کر لوں گا۔ اچھا تو پھر میں پوچھتا ہوں ملک صاحب سے ساڑھے سترہ تک۔

(قدموں کی چاپ)

ننھے بس ملک جی کچھ ستارہ ہی چمک رہا ہے آپ کی قسمت کا ورنہ مجھے تو امید ہی نہیں تھی کہ سودا ہو سکے گا اتنے تک۔

ملک تو ہو گیا طے؟

ننھے بس طے ہی سمجھیں۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ بھائی ننھے نے کوئی کام کیا تھا۔ بس سو دو سو کا پھیرا اور رہ گیا ہے۔

ملک لیکن ساڑھے سولہ ہزار سے میں اب ایک پائی بھی زیادہ نہیں دے سکتا سمجھ گئے نا۔

ننھے ساڑھے سولہ آنے سمجھ گیا۔

ملک دیکھو نا صرف تمہاری وجہ سے خرید رہا ہوں مکان۔ میں نے اب غور کیا، اس کا رخ تک ٹھیک نہیں ہے۔ گرمیوں میں تو بہت ہی دھوپ آتی ہوگی۔

ننھے وہ تو میں نے بتایا تھا نا ملک جی کہ انجینیر صاحب کا خیال دو منزلیں بنوانے کا تھا۔ جب اوپر کے کمرے بن جائیں گے تو نام کو بھی دھوپ نہ آئے گی۔ ایسا کوئی عیب آپ نہیں نکال سکتے ملک جی۔ (ہنستا ہے) انجینیر کا مکان ہے، انجینیر کا بولیئے اب آپ۔ فقط تین سو روپے کی بات ہے۔

ملک نہیں جی، اب میں بڑھاؤں گا کچھ نہیں۔

ننھے حد ہو گئی بھئی۔ ملک صاحب جہاں میری خاطر پورا مکان خرید رہے ہیں۔ وہاں تین سو اور سہی۔

ملک نا بھیا نہ

ننھے ایسے بات نہ بنے گی اب مکان تو لینا ہی ہوگا۔ چاہے میرا کمیشن نہ دیں۔

ملک مگر —

ننھے اب نہ نہ کیجئے گا ملک صاحب جی۔ ہو گئی بات پکی۔ میں کہے دیتا ہوں خالہ سے جا کر۔ (قدموں کی چاپ)

ننھے تو لو خالہ بیانے کے روپے

خالہ دکھلا تو دیا ہے نا تم نے ملک صاحب کو مکان اچھی طرح۔ کبھی پھر بعد میں شکایت ہو۔

ون کی سرزمین (بلوچستان)

ننو مند، جفا کش بگٹیوں کا وطن مدتوں بے توجہی
رھا ۔ قیام پاکستان کے ساتھ اس میں بھی ایک
ترقی کا آغاز ھوا اور اس کے جری باشندے اب اپنی
لاحیتوں کے ساتھ خدمت وطن میں پیش پیش ھیں
(مضمون ص : ۵۳)

دور انقلاب
پاکستان کی وضع نو

تیز رفتار صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کو غذا میں خود کفیل بنانے کے لئے کاشتکاری کے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر اب مشینی آلات کو کام میں لایا جا رہا ہے

ملک (باہر سے) جی دیکھ لیا ہے میں نے

ننھے اب منہ تو میٹھا کرا دو خالہ۔ سترہ ہزار کو اٹھا ہے مکان تمہارا۔

خالہ سترہ ہزار۔ مگر میں نے تو تم سے کہہ دیا تھا کہ ——

ننھے بس بس اب کچھ نہ کہنا خالہ۔ بدشگونی ہوتی ہے۔

خالہ نہ بھیا نہ، ایسے تو میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔ میں تو سات سترہ پر بھی تمہارے کہنے سے راضی ہو گئی تھی ورنہ اٹھارہ ہزار سے ——

ننھے ہاں ہاں تو جہاں اتنا میرے کہنے سے کیا وہاں پانچ سو اور سہی۔ اب بیانے کے روپے لے کر واپس تو میں ہرگز نہ کرنے دوں گا، چاہے کمیشن نہ دو میرا۔

خالہ نہیں خیر، تمہارا حصہ تو تمہارا ہی ہے لیکن یہ بات تم نے ٹھیک نہیں کی بھائی ننھے!

ننھے (ہنستا ہے) ایسا ہی ہوتا ہے سودا کرنے میں خالہ۔ اچھا تو یہ رہے بیانے کے دو سو۔ باقی پیسے ملک صاحب آ کر دے جائیں گے۔

خالہ لیکن دو چار دن ہم خالی نہیں کریں گے مکان۔ کرایہ کا مکان تلاش کرنے میں ذرا دیر ہو ہی جاتی ہے۔

ملک (باہر سے) آپ جتنے دن جی چاہے رہیئے۔ آپ کا گھر ہے۔ مجھے توفی الحال ضرورت بھی نہیں تھی۔ اچھا تو اب چلو بھائی ننھے۔

ننھے اچھا تو اب چلے خالہ۔

(دونوں جاتے ہیں)

بی بی خوب ہو تم بھی بھائی ننھے! میرا تو خیال تک نہ تھا مکان خریدنے کا مگر تم نے خیر دلا کر ہی دم لیا۔ اور پھر وہ بیچارہ ہی فروخت بھی تو نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

ننھے ارے ایسا نہ کریں تو پھر کھائیں کیا ملک صاحب جی؟ کاروبار تمام ہی اس کا ہے۔ ویسے اگر سچ مچ آپ کو ناپسند ہو مکان تو فکر نہ کیجئے گا۔ میں رکھوں گا نظر میں۔ اگر کوئی اچھا گاہک ملا تو بیچ دیں گے اسے۔ اور آپ کو نیا گھر دلا دوں گا ہی ہی ہی! ٹھیک ہے نا؟

(پردہ)

نغمہ کجا و من کجا (بقیہ صفحہ ۲۴)

اقبالؔ کی شاعری میں بلاغت اور ایجاز بھی بدرجۂ اتم کارفرما ہیں یہ دونوں بیان و فن کی روح رواں ہیں۔ بلاغت ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے ایسے الفاظ میں کہتا ہے کہ سننے والے فوراً اسکے مقصد کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ جوہر قبول اور لطفِ سخن کی طرح خداداد ہے لیکن غور و فکر اور مشق سے اور بھی نکھرتا ہے۔ اقبالؔ جس طرح اپنے مافی الضمیر کو براہِ راست قارئین تک پہنچا دیتے ہیں وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہے۔

ایجاز کے معنی ہیں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب کا اظہار۔ الفاظ وہی ہوتے ہیں جو ہر شاعر استعمال کرتا ہے لیکن ایک باکمال شاعر انہیں اس طرح کام میں لاتا ہے کہ اُن کے معنی میں بے پناہ وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس کا اندازِ بیان ایسا ہوتا ہے کہ بہت کچھ کہے بغیر قاری کے ذہن تک پہنچا دیتا ہے۔ یعنی "تیرے کہ نا فگندہ فتد کارگر" والا معاملہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

بینی جہاں را خود را نہ بینی   تا چند ناداں غافل نشینی
نورِ قدیمی! شب را برافروز   دستِ کلیمی! در آستینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند   آدم بمیرد از بے یقینی

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قُم باذنِ اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قُم باذنِ اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قُم باذنِ اللہ

آخر میں میں ایک بار پھر اسی شعر کی طرف رجوع کرتا ہوں جس سے اس مقالہ کا آغاز کیا گیا تھا ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اس شعر میں نغمہ گری سے یک گونہ لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ سازِ سخن محض بہانہ ہے، مقصد تو صرف یہ ہے کہ ناقۂ بے زمام کو قطار میں لایا جائے۔ نکیل کھینچ کر نہیں بلکہ محض سخن کے جادو سے اُسے زندگی کو صحیح رستہ پر ڈال دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب تک سخن انتہا درجہ پر تاثیر نہ ہوگا شاعر اس سے اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے گا۔

ارمان

یوسف ظفر

یہ میں نے دیکھا ہے چاندنی سے دلوں کے ارمان جاگتے ہیں۔
سمندر اپنی تمام چاندی اُچھالتا ہے
کہ جیسے کہسار ڈھالتا ہے
زمین اپنی رگوں کی ساری نمی ہواؤں میں گھولتی ہے
اور اپنے سازِ نمو پہ کھیتوں میں بولتی ہے
چمن میں شاخیں نئی زبانیں نکالتی ہیں
اور اپنی آغوش میں شگوفوں کو پالتی ہیں
زمانہ لمحوں کے جسم پر چسپت کرتا ہے چاندنی کی زرہیں
کہ جن سے پھوٹیں خوشی کی کرنیں ـــــ
یہ میں نے دیکھا ہے، چاندنی سے دلوں کے ارمان جاگتے ہیں ـــــ

دلوں کے ارماں میں نے دیکھے ہیں سرد سنگوں کی روشنی میں
لبوں پہ جن سے کھنکنے لگتی ہے مسکراہٹ
رخوں پہ آتی ہے جن سے آسودگی کی آہٹ ـــــ
دلوں کے ارمان میں نے دیکھے ہیں تپتے جسموں کی قربتوں میں
کہ جن کو کل کائنات اِک خوابِ کالعدم بن کے دیکھتی ہے
حیات دھڑکن کی تال پر ناچ چھن چھنا چھن، کے دیکھتی ہے
یہ کھیل تو چاندنی بھی پتوں سے آپ چھن چھن کے دیکھتی ہے
دلوں کے ارمان میں نے دیکھے ہیں مسندوں کے مجاوروں میں
کہ جن کے سینے کے سارے ارمان دل میں رہتے ہیں خار بن کر
کہ جن کو یہ زندگی ملی ہے شکایتِ روزگار بن کر
کہ جن کی اندھی لگن کو یہ چاندنی بھی ڈستی ہے مار بن کر

میں کب سے اس چاندنی میں بیٹھا ہوں جیسے پتھر کا کوئی بُت ہو

مرے خدا! جیسے میرے سینے میں دل نہیں ہے
مرے لئے جیسے کوئی غم مستقل نہیں ہے
نہ میرے سینے میں کوئی ارماں ہی جاگتا ہے
کہ جس سے میں سُن سکوں کوئی نَے
کوئی ترانہ ـــــ طلب کے اُس سازِ بے کلی کا
کہ جس سے کہسار ڈولتے ہیں
کہ جس سے گلزار بولتے ہیں
میں کب سے اس چاندنی میں بیٹھا ہوں، جیسے پتھر کا کوئی

مرے لبوں، میری سرد آنکھوں، مرے بدن، میرے بازوؤں پر
چھپے چلی جا رہی ہیں کرنیں
کہ جیسے مجھ کو ٹٹولتی ہوں
کہ جیسے غصّے سے بولتی ہوں ـــــ

مرے خدا! میرے دل کا ارماں، نہ سرد سنگوں کی روشنی ہے
نہ گرم جسموں کی چاندنی ہے
نہ میں کسی مسندِ معلّے کا خانقاہی
کہ جس سے حاصل ہو کج کلاہی
مرے لئے جیسے تیری دنیا میں کچھ نہیں ہے
بس ایک یہ چاندنی ہے جس کی ادائے بیگانہ بھا گئی ہے
جو میرے دل پر، مری نگاہوں، مری تمنا پہ چھا گئی ہے
مرے خدا! تو ہر ایک دل کی پکار سنتا ہے، میری سُن لے
مرے بھی دامن کو اپنی اس چاندنی سے بھر دے
یہ چاندنی لازوال کر دے ـــــ

آخری شکست

طاہرہ کاظمی

چند بھولی ہوئی یادوں کا وہ رنگین طلسم
جس نے پہروں مرے احساس کو بہلایا ہے
وہی پُرکیف تصور، وہی نازک سا خیال
آج پھر میری تسلّی کے لئے آیا ہے!

اس کو کیا علم کہ پیمانۂ دل ٹوٹ گیا
اب نہ غم ہے نہ ستم، یادِ ستم تک بھی نہیں
اب کوئی پرسشِ احوال کرے یا نہ کرے
اپنی بربادئ آخر کا الم تک بھی نہیں

کب سے آمادۂ پیکار تھے یہ دیدہ و دل
شورشِ قلب و نظر کھو گئی خاموشی میں
جل بجھے اپنی ہی خاموش تمازت میں نجوم
روشنی ڈوب گئی رات کی تاریکی میں

ایک خاموش سیاہی ہے مسلط دل پر
اب تڑپنے کی خلش ہے، نہ دھڑکنے کی صدا
اب نہ افسردگئ غم، نہ امیدوں کی شفق
دل کو جینے کی ادا آئی نہ مرنے کی ادا!

گیت

(پنجابی لوک گیت کی بحر میں)

باقی صدیقی

(سانوں تاڑ تاڑ جھکاں نہ ماریں وے
زور جوانی دا کریں نہ
سانوں تاڑ تاڑ .....)

چلے جھوم جھوم قافلہ بہار کا
دنیا پہ رنگ چھا گیا ہے
چلے جھوم جھوم ....

زندگی نے راگ چھیڑا کلیوں کے روپ میں
نکہتیں بکھیرتی ہے میٹھی میٹھی دھوپ میں
ذرہ ذرہ جاگ اٹھا ہے خواب سے
راستوں کو ہوش آ گیا ہے
چلے جھوم جھوم ...

نور کی پھوار کھیلتی ہے پھول پھول سے
منزلیں ابھر رہی ہیں راستوں کی دھول سے
آرزوئیں لے رہی ہیں کروٹیں
کونسا مقام آ گیا ہے
چلے جھوم جھوم ....

ڈالی ڈالی جھومتی ہے پتیاں سنوار کے
کنج کنج کہہ رہا ہیں کوئلیں پکار کے
اٹھو اٹھو غمزدہ مسافرو
موسمِ بہار آ گیا ہے
چلے جھوم جھوم ...

غزل

اختر احسن

یشانیٔ سحر پہ ہوائیں جھکی سی ہیں
کچھ انگلیاں صبا کی افق پر اٹھی سی ہیں

باہو گیا جو پھوٹ کے نکلی ہے اک کلی
موجیں ہیں درد کی کہ ہوائیں گھلی سی ہیں

پچھ مسکراہٹیں کہ رواں زخمِ لب سے ہیں
کیا نگہتیں کہ سایۂ گل میں جلی سی ہیں

شاخِ چمن پہ آکے بنیں رنگِ سوختہ
اتریں فضائے دل میں تو جیسے ڈھلی سی ہیں

دل میں رہیں تو بن کے رہیں رشکِ گلستاں
ہونٹوں پہ آکے خندۂ زیرِ لبی سی ہیں

وہ شوخیاں کہ شاخ پہ وقتِ سحر کھلیں
شبنم سے غم کی بے طرح سہمی ہوئی سی ہیں

کیا کیا دھندلکے بن کے اڑا آرزو کا رنگ
کیا خاک ہو کے حسرتیں گل پر جمی سی ہیں

ڈرتا ہے دل جو دیکھتا ہوں برگ و شاخ کو
کیا کیا کہانیاں ہیں کہ گل پر لکھی سی ہیں

رنجِ خزاں نے آکے جو کھولا ہے رخت آج
صحنِ چمن کی ساری ہوائیں رکی سی ہیں

وہ نخلِ یاد آج بھی بے برگ و بار ہے
شاخوں پہ سب صباحتیں جیسے جلی سی ہیں

کچھ اشک بن کے پاؤں میں گل سی بکھر گئیں
کچھ شوخیاں کہ شاخ کے اندر دبی سی ہیں

کیوں کھینچتا ہے دل مرا یہ اجنبی دیار
یادیں سی جیسے ذہن میں آکر رکی سی ہیں

سرخی میں ڈوب ڈوب کے ابھری ہیں بیطرح
شامیں فراقِ یار میں بھیگی ہوئی سی ہیں

تنہائیوں میں اشک کی اپنے سے گم رہا
راتیں سحر کے نور میں کچھ کچھ ڈھلی سی ہیں

برسوں ہی اس کی یاد میں جو چپ سا ہو رہا
صبحیں فراقِ یار میں ڈوبی ہوئی سی ہیں

کیا آرزوئیں بن گئیں پھولوں کے پیرہن
یہ دیکھی بھالی صورتیں جیسے ملی سی ہیں

رنجِ فراقِ یار کی کچھ کم تپش ہے آج
صبحِ بہارِ دل کی ہوائیں جلی سی ہیں

اٹھو کہ اپنے خون کا ملبوس اوڑھ لیں
اس لغمۂ فراق کی شاخیں ہلی سی ہیں

حشمت فضلی

اشکوں کے رنگیں پھولوں کی سیج سجائے بیٹھا ہوں میں
امیدوں سے دل کا اجڑا دیس بسائے بیٹھا ہوں میں

کس کو یہ معلوم کہ میرے دل پر کیا کیا بیت رہی ہے
ہنس بھی رہا ہوں راز بھی غم کا دل میں چھپائے بیٹھا ہوں میں

ترکِ تعلق کہنے کو تو ایک زمانہ بیت چکا ہے
آج بھی تیرے پیار کی لیکن جوت جگائے بیٹھا ہوں میں

پتھر بن کر دیکھ رہا ہوں ہر آتے جاتے راہی کو
سوچ رہا ہوں جان کو کیسا روگ لگائے بیٹھا ہوں میں

جب سے تیرا غم اپنایا دل کو ڈھارس ہے کچھ ایسے
دونوں دنیاؤں کی جیسے دولت پائے بیٹھا ہوں میں

آس کے جتنے سورج ابھرے اک اک کر کے ڈوب گئے ہیں
پھر بھی کس امید پہ جانے آس لگائے بیٹھا ہوں میں

آتشِ غم کے طوفانوں میں نیند بھی جل کر راکھ ہوئی ہے
اب تیری یادوں کے میلے دل میں لگائے بیٹھا ہوں میں

فن:

سجادؔ — ایک نیا ستارۂ فن

امیرحسن سیال

پچھلے دنوں جب نامور مستشرق، پروفیسر الیساندرو بوزانی کا وہ مضمون نظر سے گزرا جس میں اس نے ایک پاکستانی فن کار سجاد کو خراج تحسین ادا کیا ہے تو مجھے قدرتی طور پر یہ دلچسپی پیدا ہوئی کہ پاکستان کا یہ مایۂ ناز فن کار کون ہے اور اس کا فن کن کن منزلوں سے گزر کر اس مرتبہ تک پہنچا کہ ایک دور دیس کے فن شناسوں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا" اور غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں" کے مصداق اس کا ستارہ پہلے روم میں چمکا اور ہوتے ہوتے اس کی روشنی اپنے وطن میں بھی پہنچی۔ وہ دونوں ملکوں کے افق پر یوں جلوہ گر ہوا جیسے وہ کوئی نیا ستارہ ہو۔ اور میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ "آوارۂ غربت نہ تواں دید صنم را" اس نئے ستارے کی لَو کچھ اور بھی اِدھر پہنچنی چاہئے۔

اس میں زیادہ فرحت انگیز بات یہ تھی کہ ہمارے وطن کے ایک جوہر قابل کی قدر و منزلت اٹلی جیسی سرزمین میں کی جائے جو ہنر و فن کے لئے افسانہ ہو چکی ہے۔ اور جس کا نام لیتے ہی لیونارڈو ڈا ونچی، رافیل، مائیکل آنجلو اور بوتی چیلی جیسے بڑے بڑے شہرۂ آفاق فن کار یاد آتے ہیں۔ یہ وہ سرزمین ہے جو ہزارہا برس سے فنون لطیفہ کا گہوارہ ہے اور آج بھی اس میں گھر گھر ہنر و فن ہی کا چرچا نظر آتا ہے۔ یہاں فن کے جوہر اس قدر عام ہیں کہ بلا مبالغہ ہر فرد فن کار ہے۔ اور اسے بجا طور پر موسیقاروں، سازکاروں، مصوروں، سنگ تراشوں، معماروں اور اداکاروں کی سرزمین کہا جا سکتا ہے۔ اس تاریخی سرزمین کی دنیا رنگ و روغن، موقلم، سنگِ مرمر، چنگ و رباب اور نغمہ و سرود ہی کی دنیا ہے۔ اور اس کے دارالحکومت روم کا ذکر ہی کیا جس کا چپہ چپہ حسن ہی کی سحرکاریوں کا آئینہ دار ہے۔ اور قدم قدم پہ ماہر فن صناعوں کی ندرت کاریوں کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

ایسی سرزمین میں کسی دوسرے ملک، خصوصاً پاکستان جیسے ملک کے فن کار کا فن کی جوت جگانا جو ابھی صغر ایام سے ابھرا ہی ہے اور بڑے بڑے ماہران فن پر اپنی صناعانہ قدرت کا نقش جمانا کارے دارد کا مصداق ہے۔ اس کے لئے ذوق خداداد اور غیر معمولی فنی صلاحیت ہی ضروری نہیں بلکہ سال ہا سال کا ریاض بھی درکار ہے۔ بادی النظر میں اس قسم کی کامیابی تقریباً محال معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ایک جواں سال فن کار سجاد نے یہ کامیابی حاصل کر کے صرف اپنا نام ہی بلند نہیں کیا بلکہ اپنے ملک، پاکستان کو بھی چار چاند لگائے ہیں۔

اگر کسی فن کار کو اپنے ہم وطنوں کی بجائے دوسرے لوگ سراہیں تو یہ حقیقی معنوں میں داد و تحسین ہے۔ اور پھر روم جیسے گہوارۂ فن کے پختہ کار فن شناس! سجاد، جس کا پورا نام سجاد علی خاں ہے، وہ فن کار ہے جس نے یہ بڑی ہی مشکل مہم سر کی ہے۔ اس نے اپنے فن کے جوہر ایسے ملک میں آزمائے جو تمام تر ہنر و فن کا دیس ہے۔ جیسے کوئی ساحر دانستہ ایسے مقام پر سحر آزمائی کرے جو اپنی جادوگری کے لئے مشہور ہو۔

ظاہر ہے کہ جس طرح اٹلی کا مہتم بالشان تاریخی شہر روم ایک ہی دن میں تیار نہیں ہو گیا تھا، اسی طرح اس پاکستانی فن کار کو بھی اس دیار فن میں آناً فاناً شہرت نصیب نہیں ہوئی، اور اسی کے نامور فاتح جولیس سیزر کی طرح وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ "میں آیا۔ میں نے دیکھا۔ میں نے سر کیا"۔ ظاہر ہے کہ اسے زندگی کے کتنے ہی دن، کتنی ہی راتیں فن کے گر سیکھنے اور فن پر قدرت حاصل کرنے میں صرف کرنے پڑے۔ جوہر خداداد

ہی سہی لیکن ان کی جِلا تو بہرحال مشق و مہارت ہی سے ہوتی ہے اور سجاد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فنی صلاحیت ہمیشہ خداداد ہی ہوتی ہے صرف بعض مواقع جنہیں خبر نہیں ہم کیوں اتفاقات قرار دینے پہ اصرار کرتے ہیں، فن کے خوابیدہ احساس کو ابھارنے کا بہانہ بن جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک موقع سجاد کو بھی حاصل ہوا۔ بڑا ہونے پر اسے علی گڑھ کے مشہور دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کا ایک نگارخانہ بھی تھا جو اٹلی کے بڑے بڑے مسلم الثبوت استادانِ فن کی مشہور تصاویر کے نقوشِ ثانی سے آراستہ تھا۔ سجاد نے ان کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسے کہ اس کے لئے جنبشِ مژگاں بھی بار تھی! دفعتہً اس کے دل کی گہرائیوں میں سویا ہوا فن کار جاگ اٹھا۔ اور اسے یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ بھی ایسے ہی زندۂ جاوید شہ پارے تخلیق کرے۔ اس کا ذہن موقلم کی جنبشوں اور رنگ و روغن کے کرشموں میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے لگا۔ جو بدقسمتی سے اس کے ان عزیزوں کے خوابوں کے خلاف تھا جنہوں اسے یونہی فضول لکیریں کھینچنے کے لئے نہیں بلکہ پڑھنے لکھنے کے لئے علی گڑھ بھیجا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں ہوا کرتا ہے۔ جب وہ چیز جو قاضی الحاجات ہے۔ یعنی زر ہی نہ رہا تو تعلیم کیسی؟ چنانچہ اس دُھن کے پکے نے مادرِ علم کا دامن چھوڑ کر ۱۹۴۳ء میں بمبئی کا رخ کیا جہاں کی فضا فن کے لئے زیادہ سازگار تھی۔ چنانچہ وہ وہاں مصوری کی مشہور درسگاہ جے جے سکول آف آرٹس میں داخل ہو گیا۔

رفتہ رفتہ سلسلہ اور بھی آگے بڑھا اور اسے بمبئی ہی کے عجائب گھر میں مغلیہ مصوری کے بعض شاہکار دیکھنے کا موقع ملا۔ اس نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ لیکن اس کی پہلی محبت تو وہی اطالیہ کے شاہکار رہتے۔ جنہوں نے اس کے دل و دماغ کو اسیر جاوداں کر لیا تھا۔ اور جن کے ساتھ اس نے ایسا پیمانِ وفا باندھا تھا جس کو وہ کبھی توڑ نہ سکا چنانچہ اس کا روحانی گھر تو روم ہی رہا۔ جہاں پہنچنے کی تمنا اس کے دل کو روز و شب تڑپاتی رہی۔ اس کے ذہن پر یہ احساس چھا گیا کہ جب تک وہ اس گہوارۂ فن تک نہیں پہنچے گا اس کی زندگی کبھی روشناسِ تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہیں گے۔

لیکن اس کے ذاتی حالات اس خواب کے پورا ہونے میں سدِ راہ تھے۔ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ جو لوگ اس کے اخراجات کے کفیل تھے، انہوں نے اس کے علی گڑھ میں قیام کا رشتہ ہی کاٹ دیا تھا۔ لیکن شوق کے لئے تو رکاوٹیں بھی تازیانہ ثابت ہوتی ہیں ؎

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

سجاد اس افتاد سے گھبرایا تو سہی لیکن اس نے جلد ہی وجہ معاش کی صورت پیدا کر لی اور شملہ میں کلرکی کو غنیمت سمجھا۔ برسوں اس کوشش میں گزر گئے کہ کس طرح روم جانے کی سبیل پیدا کی جائے۔ مگر اس کے پاس دعاؤں، وظیفوں اور مناجاتوں کے علاوہ اور تھا ہی کیا۔

آخر پاکستان نے ہی اس کی مشکل حل کی۔ آزادی آئی اور اپنے ساتھ ایک وطن سے دوسرے وطن کو ہجرت لائی۔ اب اس کا قیام کراچی میں تھا۔ چندے یہاں بھی اسی طور گزر ہوئی اور جب کبھی فرصت کے چند لمحات مل جاتے وہ تھوڑے بہت خاکے کھینچ کر اپنا شوق پورا کر لیتا۔ آخر ۱۹۵۰ء میں اس کی امید بر آئی۔ کسی نے اس کا بے اندازہ ذوق و شوق دیکھ کر اسے سفیرِ پاکستان متعینہ روم کے دفتر میں حساب کتاب لکھنے کی نوکری دلوا دی۔

روم پہنچ کر سجاد نے جز وقتیہ کلاسوں میں ڈرائنگ اور مصوری سیکھنا شروع کر دی۔ اور اس کی نظر رنگ و روغن اور موقلم کے اسرار کی محرم ہوتی گئی۔ اس نے آرٹ اکادمی میں دو سال کا کورس ایک ہی سال میں ختم کر دیا اور اپنی جماعت میں پہلا انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ نقاشی کے ایک مقابلے میں کامیاب ثابت ہوا جس میں اطالوی اور غیر ملکی امیدوار بھی شامل تھے۔ اور اس طرح ولامیڈیچی (روم) کی اکادمی میں داخل ہوا۔ جو ہر سال ستر امیدواروں میں سے

پچیس بہترین امیدوار چنتی ہے۔ اس کے ساتھ اس نے انٹرنیشنل
آرٹ ایسوایشن جیسے مشہور ادارے کی رکنیت بھی اختیار کی۔

۱۹۵۵ء سجاد کے لئے ایک بڑا اہم اور مبارک سال
تھا۔ کیونکہ اس سال اطالوی منظر کشی کی ایک بین الاقوامی نمائش
منعقد ہوئی جس میں ۴۲ ممالک کے مصوروں نے حصہ لیا۔ اس
میں سجاد کی بھی دو تصاویر شامل تھیں اور پہلا انعام اسی کو حاصل
ہوا۔ چنانچہ اسے چاندی کے ایک کپ کے علاوہ، ڈپلوما آف آنر
بھی عطا کیا گیا۔ اگلے سال ایک اور مقابلہ میں دوم رہنے کے
لئے دو تمغے اور اس کے بعد ایک اور تمغہ حاصل ہوا پھر تو نمائشوں
میں شرکت ایک عام بات ہوگئی۔ اس نے پوری چالیس نمائشوں
میں حصہ لیا اور متعدد انعامات حاصل کئے۔ ان کامیابیوں
نے قدرتی طور پر روم کے فنی حلقوں پر اس کی دھاک بٹھادی
اور اسے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ اسے
حال ہی میں روم کی انٹرنیشنل آرٹ ایسوسی ایشن کے بارہ
اراکین میں سے ایک منتخب کیا گیا۔ یہ وہ مشہور ادارہ ہے جس
کے تین ہزار سے زیادہ اراکین ہیں اور جو شاعروں، معماروں
موسیقاروں وغیرہ ہر قسم کے ارباب فن پر مشتمل ہے۔

وہ کیا بات تھی جس نے سجاد کو یہ قابل رشک امتیاز عطا
کیا؟ ذوق وشوق اور جد وجہد سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس میں اُن ذاتی
جوہروں کو دخل ہے جنہوں نے ایک مخصوص انداز میں نمو پائی۔
اس سلسلہ میں ہماری نظر دو باتوں پر پڑتی ہے۔ اول وہ 'پہلی محبت'
جس نے مغلیہ نقاشی کے حسن لازوال کی شکل میں اسے اپنا پرستار
بنالیا۔ اس کے لئے مغلیہ روایت ایک زندہ روایت تھی اور
اس کی نستعلیق وضع، اس کا توازن، اس کے ذہن میں ایک
مستقل قدر بن کر سما گیا۔ اس لئے وہ وطن سے باہر بھی گیا تو
اس احساس کو اپنے ساتھ لے کر گیا۔ اور اسے مغرب کی ہوا نہ
لگ سکی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ میں نت نئی تحریکیں
ابھر رہی تھیں اور فن کار انہی کے خبط میں مبتلا نظر آتا تھا۔
اور مغرب میں جو چیز مقبول ہو وہ ہمارے یہاں فیشن میں داخل
ہوجاتی ہے۔ چنانچہ مکعبیت، تجرید اور سرریلزم کا مغرب میں
کیا کچھ چرچا نہیں ہوا اور ان کی پیروی میں آج ہمارے یہاں
بھی کم از کم تجریدی فن کو کیا کچھ فروغ حاصل نہیں۔ لیکن سجاد
کے دل پر پہلے ہی ایک نقش جم چکا تھا۔ اس لئے فن کے ان
اسالیب ومظاہر کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونے کے
باوجود وہ کبھی ان کی طرف مائل نہیں ہوا۔ اس کے وجدان
نے یہی محسوس کیا کہ مغرب کے قدیم استادان فن میں اس کی
رہنمائی کے لئے بہتر سامان موجود ہے۔ اس کے فن کارانہ
شعور نے یہ حقیقت بھانپ لی کہ ان کے مرقعات میں نقاشی
کے بنیادی عناصر زیادہ خوش اسلوبی سے جلوہ گر ہیں۔ یعنی
رنگوں کا آپس میں گھل مل کر نفیس اثر پیدا کرنا، ہیئت کا تجمل
اور اعضاء واشکال کا سڈول پن۔ لہذا اگر آج بھی ان عناصر
کو بطریق احسن شیر وشکر کیا جائے تو بہت عمدہ نتائج پیدا ہوسکتے
ہیں۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اساتذہ شرق وغرب کے نقش قدم
پر چل کر وہ کوئی ایسا انداز پیدا کرے جو اس کے ہم وطنوں
کے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی پسندیدہ
فضا دور کہن ہی کی فضا ہے اور اس نے ایک طرف مغلیہ
روایات سے فن کی جوت جگائی ہے تو دوسری طرف بالکل
اسی طرح صدیوں کے فاصلے پھلانگ کر مغرب کے استادان
فن کے منجھے ہوئے فن کے گر آزمائے ہیں، اور اپنے نقوش
میں اُن ہی کا رچاؤ پیدا کر کے اسے دو آتشہ بنا دیا ہے۔

ایسی مصوری کی امتیازی خصوصیت ایک ہی ہے۔
اصلیت سے لگاؤ جس میں ہم آنکھوں دیکھی چیز کی واقعیت
سے دور نہیں جاتے اور پھر ان کو بڑے مانوس پیرایہ میں
بڑے سبھاؤ سے پیش کردیتے ہیں۔ ایسی نقاشی کی اساس
ظاہر ہے۔ صحیح خدوخال، صحیح وضع قطع، صحیح شکل وصورت
ہی ہوسکتی ہے۔ جس کو ہم خاکہ کشی کے نام سے یاد کرتے
ہیں۔ فطرت یا زندگی کو بگاڑ کر ٹیڑھا میڑھا پیش کرنا نہیں
بلکہ ایسے رنگ روپ میں پیش کرنا جس سے اس کے
تیور صاف صاف پہچانے جاسکیں۔ لیکن عکس خارجی کے
ساتھ فن کار کی بصیرت اور تصور کا عکس باطنی بھی نظر
آئے۔ اس طرح صاحب فن کے دل کی بات بڑے صاف
اور ستھرے پیرائے میں سامنے آجاتی ہے۔ بناوٹ سے

کوسوں دور۔ یہی وجہ ہے کہ سجاد کا فن ایک صاف وشفاف آئینہ معلوم ہوتا ہے جس میں قدرت کے مناظر، چرند پرند انسان سبھی بڑے ہی نکھرے سنورے روپ میں سامنے آجاتے ہیں۔

خاکہ کشی اس قسم کی مصوری کا سنگ بنیاد ہے۔ اور سجاد میں اس کی خوبی اور سب باتوں سے پہلے اور سب سے زیادہ ابھرتی ہے۔ لیکن وہ آخر ایک جدید فن کار ہے جس کا وقت اٹلی کے سراپا فن ماحول میں بسر ہوا ہے اور آرٹ کے کیا کیا مظاہر، دبستان، اسالیب اور تجربات ہیں جو اس کی نظر سے نہیں گزرے ہوں گے۔ اس لئے اس نے خاکہ کشی سے آگے بڑھ کر مصوری کے دوسرے طریقوں کو بھی اپنایا ہے۔ روغن، آب رنگی، جدری اور ٹمپرا۔ روغنی مصوری اس کی رائے میں کچھ ایسی مشکل نہیں۔ یہاں بھی اس کا ذہن مسلم الثبوت استادوں سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اور ان کی آرا پر اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد نتائج پر پہنچتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مائیکل آنجلو جیسے بالغ نظر فن کار نے یونہی یہ نہیں کہا تھا کہ روغنی نقاشی ایک بڑے فن کار کے لئے چنداں درخور اعتنا نہیں ہے۔ جدری نقاشی کے ساتھ سجاد کو گہرا لگاؤ ہے۔ اس کے لئے وہ اپنے ہی رنگ تیار کرتا ہے اور اپنے موقلم سے رنگوں کے نت نئے کھیل کھیلتے ہوئے وہ رنگ آمیزی کے اسرار تک رسائی حاصل کرتا ہے اور پھر یہ رنگوں کی بہار رنگوں ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ چہکنے بولنے اور چمکنے بھی لگ جاتی ہے۔ اور اس سے خود بخود نور کے کوندے سے لپکنے لگتے ہیں۔

سجاد بلاوجہ مغل استادوں کا دلدادہ نہیں۔ اس نے اپنی فنی صلاحیتوں کو اس میدان میں بہت خوش اسلوبی سے آزمایا ہے۔ استاد منصور نے جو ایک سارس کی تصویر بنائی ہے وہ فن کا معجزہ خیال کی جاتی ہے۔ اور وہ بلاشبہ قلم کاری کا اعجاز ہے۔ لیکن سجاد نے ایسے ہی استادوں کے ہنر کو اپنے طور پر پیش کرتے ہوئے بگلوں کے ایک جھرمٹ کا نقشہ پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ منصور کے تنہا سارس کے بعد رنگین پرندوں کا یہ جھرمٹ — "میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد"

کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے مصور نے بڑی ہی روا روی لیکن بڑی استادی سے چند لطیف نقوش کھینچ کر رکھ دیئے ہوں اور انہیں بڑی بے تکلفی اور صفائی سے رنگوں کا جامہ پہنایا ہو۔ پروں کی رنگ برنگی کیفیت اور پھر لانبی لانبی بل کھاتی گردنیں مشرقی محبوبوں کی صراحی دار گردن سے کچھ کم لوچدار نہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پرندوں کی وضع قطع، رنگ روپ، گرد و پیش کی فضا۔ ہلکے ہلکے اودے اودے بادلوں، جامنی ٹیڑھے میڑھے روکھ اور دور دور بے جو پس منظر دکھائی دیتا ہے۔ ان سب میں کیسا سہانا سنجوگ پیدا کیا ہے۔

اس فن میں ظاہر ہے سجاد کو خاص ملکہ ہے۔ اس کے مشاق قلم نے فطرت کے ایک نہیں کتنے ہی شاہکارانہ نقوش پیش کئے ہیں، مثلاً ایک تصویر میں طائران خوش الحان کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ سفید پھولوں سے لدا پھندا ٹیڑھا میڑھا پیڑ۔ ایسے ہی سفید پھولوں سے آراستہ جھاڑی۔ اور اس پُرکیف، پُرسکوں سمے میں گاتک پرندے اپنے اپنے انداز میں۔ ایک نغمۂ خاموش کے امیں۔ سیاہیوں اور سفیدیوں کا یہ مطالعہ جو پتوں، پھولوں، پرندوں، درخت، جھاڑی اور پس منظر سب میں جھلکتا ہے، اجلے اندھیرے کا ایک عجیب طلسم ہے۔ ایک بے نظیر سنگت۔ اور پھر پرندے یوں لگتے ہیں جیسے وہ ایک ہی گھرانے کے گھلے ملے افراد ہوں۔

ایسا ہی ایک دلکش گھرانا تین ہرنوں کا ہے۔ جن کو پیش کرنے میں کندہ کاری سے کام لیا گیا ہے۔ ہرنی اور بچہ پاس پاس، اور تھوڑی دور پر ہرن، سب اپنے اپنے انداز میں۔ پیار، سوچ، بچانے کیا۔ اردگرد بن کا ویران سماں، بکھری بکھری جھاڑیاں، پرے پرے دھندلکا۔ درمیان میں نکھار، ایک اجالا سا پھوٹتا ہوا۔ سایوں اور اجالوں کا نفیس سنجوگ۔ اور ساتھ ہی تضاد بھی! اس سے ظاہر ہے کہ فن کار وجدانی طور پر پرندوں کی طرح ان جانداروں کے بھی کتنے قریب ہے۔

(باقی ص ۳۴ پر)

جی نہیں۔
لکس میں
دھلی ہوئی!

اعلیٰ درجہ کی نفیس ساڑھیاں، نرم و نازک شیفون اور نائیلون حسین جارجٹ اور سلک نفیس اور دیدہ زیب کپڑے جنہیں پہن کر آپ فخر محسوس کرتی ہیں۔ ان سب کو ہمیشہ گھر پر ہی لکس فلیکس میں دھوئیے۔ تاکہ ان کی آب و تاب برقرار رہے۔

لکس فلیکس کے مُلائم جھاگ آپ کے نفیس کپڑوں سے میل کو اس خوبی سے بحال دیتے ہیں کہ ان کی اصل خوبصورتی اور چمک دمک برقرار رہتی ہے۔ لکس فلیکس میں اپنے تمام نفیس و نازک کپڑے مطمئن ہو کر دھوئیے۔

لکس فلیکس میں آپ کے نفیس کپڑے محفوظ رہتے ہیں!

ماہِ نو، کراچی، اپریل ۱۹۹۰ء

بلوچی رزمیہ شاعری

سلیم خان گمی

رزمیہ شاعری سے کیا مراد ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر ہر دور کے صاحبِ نظر لوگ مختلف رائیں ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ارسطو کے نزدیک "رزمیہ نظم وہ نظم ہے جس کا ایک آغاز ہو، وسط ہو اور انجام ہو اس نظم میں کوئی غیر ضروری بات آنے نہ پائے اور ضروری بات رہ نہ جائے۔"

ایبر کرومبی رزمیہ کے بارے میں کہتا ہے کہ رزمیہ نظم میں ایک تو کہانی ہونی چاہیئے اور دوسرے اس کہانی کو فنی طور پر بیان کیا جائے یعنی کہانی میں حسنِ بیان ہو۔ یونان کے عظیم شاعر ہومر رزمیہ شاعری کا مفہوم ایک فقرے میں یوں ادا کرتے ہیں۔ "کسی نسل کے بہادروں اور سورماؤں کے کارناموں کا بیان رزمیہ شاعری کہلاتا ہے"۔ رزمیہ شاعری کی یہ تعریف بلیغ بھی ہے اور قرین حقیقت بھی۔" شاہنامہ فردوسی" ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس میں قدیم ایران کے بہادروں اور سورماؤں کے کارہائے نمایاں فنی طور پر بیان کیئے گئے ہیں۔ "مہابھارت" بھی خیر و شر کی نمائندہ شخصیتوں کی باہمی آویزشوں کا بیان ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب "جدید اُردو شاعری" میں رزمیہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: "شعری پیداوار میں رزمیہ شاعری سب سے بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ موضوع کی رفعت، اسلوب کی سنجیدگی، بلاغت، رعب اور شکوہ کے اعتبار سے نقاد ہمیشہ اس سے مرعوب رہے ہیں۔ رزمیہ شاعری کے موضوع مہتم بالشان واقعات اور افعال ہوتے ہیں۔ اشخاصِ نظم ہمیشہ سر برآوردہ ہستیاں ہونی چاہئیں۔"

مولانا شبلی رزمیہ شاعری کی شوکت اور کمال میں جن امور کو شامل کرتے ہیں اُن میں لڑائی کی تیاری، معرکہ کا زور و شور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہلچل، شور و غل، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک دمک، نیزوں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا وغیرہ شامل ہے۔ مولانا شبلی کے یہ الفاظ اصل میں رزمیہ شاعری کے ایک عام موضوع جنگ کے بارے میں ہیں۔ جب لڑائی ہو رہی ہو تو حرکت، عمل اور وسعت کا خیال ہمارے ذہن میں آنا عام سی بات ہے۔ جو رزمیہ نگار جنگ کی منظر کشی درست طور پر نہیں کر سکتا وہ رزمیہ تحریر کر ہی نہیں سکتا۔ اگر جنگ و جدل کی منظر کشی کمزور اور پھیکی ہوگی تو رزمیہ کی اولیں شرط ـــ واقعات اور افعال کا مہتم بالشان ہونا ـــ پوری نہ ہو سکے گی۔

رزمیہ شاعری جنگ و جدل اور سنجیدہ مقاصد کی کشاکش کی شاعری ہے۔ اس صنف شعر نے ہمیشہ جنگ و جدل اور سنجیدہ مقاصد کے تاریخی عہد میں پرورش پائی۔ جب کسی قوم نے اجتماعی طور پر مادی، روحانی اور فنی رکاوٹوں اور دقتوں کے خلاف جد و جہد اور کشاکش سے کام لیا تو رزمیہ شاعری نے جنم پایا۔ جب کبھی کوئی قوم لہو و لعب اور عیش و طرب میں گم ہوگئی طربیہ اور غنائی شاعری کو فروغ ہوا جب کسی قوم کی روایات، معاشرت اور اعتقادات توانا، شائستہ اور ترقی پذیر ہوں تو اعلیٰ پایہ کی شاعری تخلیق ہوتی ہے اور جب زندگی کی بنیادی قدریں کمزور اور فراری نوعیت اختیار کر جائیں تو کمتر درجہ کی پھیکی شاعری معرضِ وجود میں آتی ہے۔ چنگ و رباب کا زمانہ غنائی اور طربیہ شاعری کی تخلیق کے لئے ہمیشہ ساز گار رہا ہے اور شمشیر و سناں کے عہد میں ہمیشہ رزمیہ شاعری پھلی پھولی ہے۔ "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کی تحریر کا عہد یونان کی علمی، فنی اور مادی ترقی کا عہد ہے یہی بات فردوسی کے "شاہنامہ" کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ حصولِ آزادی سے پیشتر، یوں تو ہندوستان کی تاریخ میں کئی ایک انقلاب آئے لیکن وہ سلبی نوعیت کے تھے اس لئے شاعروں کا رویہ ہمیشہ مجہول سا رہا اور رزمیہ شاعری کی طرف کوئی توجہ نہ دی جا سکی۔ اگر قدیم اردو میں چند رزمیہ نظمیں (غلام علی کا "جنگ نامہ"۔ رستمی کا "خاور نامہ" اور نصرتی کا "علی نامہ") بھی ہیں تو وہ طبع زاد کم اور فارسی کا ترجمہ زیادہ ہیں۔ انیس اور دبیر کے مراثی میں بعض مقامات پر جنگ و جدل کے عمدہ مرقعے ضرور ملتے ہیں لیکن یہ مرثیے رزمیہ تحریر کرنے کے قصد سے نہیں لکھے گئے اور یہ ہیں بھی نا تمام اور نامکمل۔ اس کے علاوہ یہ مرثیے رزمیہ شاعری کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا نہیں کرتے۔

بلوچی رزمیہ شاعری کا عہد پندرھویں صدی عیسوی کا نصف آخر اور سولھویں کا نصف اوّل ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچوں کے دشت پیما اور صحرا نورد قبائل نے مدنی زندگی اختیار کرلی تھی اور باقاعدہ حکومت کی طرح بھی پڑ چکی تھی۔

بلوچوں کا اصل مسکن دجلہ و فرات کی سرزمین ہے۔ جب یزیدی فوجوں نے حضرت امام حسینؓ پر ظلم و ستم روا رکھا تو بلوچوں نے شاہ مظلوم کا ساتھ دیا اور یوں اپنے آپ کو یزید کی دست درازیوں کا شکار بنایا۔ یزید کے ظلم سے پناہ لینے کی خاطر بلوچ ایران چلے آئے اور کرمان اور سیستان میں گھومتے پھرے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں ایران میں سیاسی انتشار بڑھ گیا اور بلوچوں پر ایک بار پھر دست درازیاں روا رکھی گئیں۔ بلوچ سردار میر جلال خاں جو ایک بہادر اور مہم جو انسان تھا اپنے قبیلے کو لے کر اس سرزمین کی طرف نکل آیا جسے بعد میں "بلوچستان" کا نام دیا گیا۔ سردار میر جلال خاں نے مدنی زندگی اختیار نہ کی۔ اور جنگلوں۔ دریاؤں، پہاڑوں، صحراؤں اور وادیوں میں گھومتا رہا۔ میر جلال خاں کے چار بیٹے تھے۔ رند لاشار، کرائی اور ہوت۔ میر جلال خاں کے یہ چاروں بیٹے اپنے اپنے قبیلے کے سردار مقرر ہوئے اور انھوں نے علٰحدہ اپنے اپنے قبیلے کی بنیاد رکھی۔

پندرھویں صدی عیسوی میں میر شہک اپنے قبیلے، رند کا سردار مقرر ہوا، میر شہک ایک مدبر اور بہادر انسان تھا۔ اُس نے ناخنِ تدبیر اور قوتِ بازو دونوں سے کام لے کر اپنے ہم عصر دوسرے قبیلوں کو زیر نگیں کیا اور مکران پر قابض ہو گیا۔ میر شہک وہ پہلا بلوچ ہے جس نے خانہ بدوشی ترک کی اور باقاعدہ حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ میر شہک سے پہلے، بلوچ کوہساروں اور وادیوں، صحراؤں اور جنگلوں میں گھومتے رہتے تھے۔ پانی اور خوراک کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے تھے۔ اُن کی زندگی خانہ بدوشوں کی زندگی تھی اور اُن کی طرزِ معاشرت بدوی تھی۔ زمین کی ملکیت کا احساس اُن کے ذہن میں ابھی ابھرا نہ تھا۔

عام تاریخی روایات کے مطابق ۱۴۶۸ء میں میر شہک کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام چاکر خاں رکھا گیا۔ چاکر خاں تیس سال کی عمر میں ۱۴۹۸ء میں اپنے قبیلے رند کا سردار بن گیا اور "بلوچ اعظم میر چاکر خاں رند" کہلایا۔ یہی وہ میر چاکر خاں رند ہے جس کا عہد بلوچ تاریخ کا زریں عہد کہلاتا ہے اور اسی عہد میں بلوچی رزمیہ شاعری کے شاہکار تخلیق ہوئے۔

میر چاکر خاں رند بہادر تھا، دلیر تھا، اور مہم جو تھا۔ تیر اندازی، شہ سواری اور تیغ زنی میں اُس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ مکران کو سیاسی استحکام بخشنے کے بعد میر چاکر خاں رند نے خاران اور لس بیلہ پر قبضہ کیا، قلات پر حملہ کر کے میروانیوں کو شکست دی، قلات کے بعد کچھی کی طرف بڑھا۔ جام ننده کو شکست دے کر کچھی پر قابض ہوا۔ کچھی کے بعد سبّی کو زیرِ نگیں کیا ۱۵۵۵ء میں ہمایوں کو دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے میں امداد دی۔

میر چاکر خاں رند کا عہد نہ صرف رزمیہ شاعری کی تخلیق کا عہد تھا بلکہ بلوچ تاریخ کے اس عہد میں بہترین رومان بھی تخلیق ہوئے۔ مثال کے طور پر "بی برگ و گراناز"، "حانی وشہ مرید" اور "شاہ داد و ماہناز"۔

اگر میر چاکر خاں رند بلا شرکت غیرے بلوچستان کا حکمراں ہوتا تو شاید آج رزمیہ شاعری کا کوئی نشان نہ ملتا لیکن ایسا نہ ہوا۔ میر چاکر خاں رند کا حریف لاشاری قبیلے کا جواں ہمت سردار میر گواہرام لاشاری تھا۔ میر گواہرام لاشاری بہادر اور صاحب تدبر سردار تھا۔ اُس نے تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر میر چاکر خاں رند کی سرداری تسلیم نہیں کی۔ میر چاکر خاں رند اور میر گواہرام لاشاری کا اختلاف نہ صرف سیاسی تھا بلکہ رومان اور محبت بھی اس کے پس منظر میں تھے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ میر گواہرام لاشاری کی ایک محبوبہ تھی جس کا نام گوہر تھا۔ میر گواہرام لاشاری اس سے شادی کرنے کا خواہاں ہوا۔ گوہر نے انکار کر دیا۔ گواہرام نے زور سے کام لینا چاہا۔ گوہر میر چاکر خاں رند کی پناہ میں آگئی۔ گواہرام کے قبیلے کے نوجوانوں نے گوہر کے اونٹ ذبح کر دیئے اور دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو تیس سال تک جاری رہی اور آخر میر چاکر خاں رند کی شکست پر ختم ہوئی۔ بلوچوں کی یہ تیس سالہ جنگ قتل و خوں ریزی، بہادری، دلیری اور شجاعت و شہامت کی ایک المناک اور ولولہ انگیز داستان ہے۔ اسی طویل جنگ کے دوران بلوچی رزمیہ شاعری کے عہد آفریں فن پاروں کی تخلیق ہوئی۔ یہ رزمیہ شاعری نہ صرف اعلیٰ پایہ کی شاعری ہے۔ بلکہ بلوچوں کی منظوم تاریخ بھی ہے۔

قدیم بلوچ معاشرے میں ہر قبیلے کا اپنا ایک شاعر ہوتا تھا جسے وہ "ریزوار شاعر" کہتے۔ ریزوار شاعر کے تمام اخراجات قبیلے کے لوگ برداشت کرتے اور وہ پورے خلوص اور فراغت سے اپنے قبیلے کی سرگرمیوں کو رزمیہ شاعری کے قالب میں ڈھالتا رہتا۔ ایسا نہیں تھا کہ رزمیہ نگار گھر میں

بیٹھا رہتا اور فکرِ شعر میں غرق رہتا۔ وہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدانِ جنگ میں جاتا اور اگر ضرورت پڑتی تو مردانگی کے جوہر بھی دکھاتا۔ عام طور پر وہ جوانوں کو قبیلے کی شاندار روایات۔ بہادری اور دلیری کے قصے سنا کر گرماتا اور اگر عین جنگ میں بعض نوجوان حوصلے ہار دیتے تو وہ اپنے طنزیہ اشعار سے انہیں بےغیرت بننے اور رسوا ہونے سے بچاتا۔ رزمیہ شاعری کے لئے اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہے کہ بلوچی رزمیہ نظمیں مبالغہ آرائی اور دروغ بافی کے عیبوں سے قطعاً پاک ہیں۔ جو بات کہی جاتی ہے سیدھے سادے انداز میں کہی جاتی ہے۔ خلوص اور صداقت کا جذبہ ان رزمیہ نظموں کا امتیاز ہے۔

رند اور لاشاری قبیلوں کی جو جنگ میر چاکر خاں رند اور میر گواہرام لاشاری کی سرکردگی میں لڑی گئی تیس سال جاری رہی اور بلوچ تاریخ میں "سی سالہ جنگ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

اس سی سالہ جنگ میں رجز کے بعض بڑے نادر مرقع بھی تخلیق ہوئے۔ رجزیہ کلام میں جوش بھی ہے اور ولولہ بھی۔ جنگ کے ایک مرحلہ پر میر گواہرام لاشاری اور میر چاکر خاں رند اپنے جوانوں کو لڑنے مرنے کے لئے ابھارتے ہیں۔ میر گواہرام کہتا ہے ؎

شیر دل جان نثارو۔ اپنی مصری فولاد کی بنی ہوئی تلواریں سنہری میانوں سے باہر نکال لو۔
میر چاکر خاں کا نڈی دل لشکر۔ دشمن کے کمزور دل جوانوں پر یوں لپکو جیسے خونخوار بھیڑیا۔
ہمیں فنا کی نیند سلانے ہماری طرف بڑھ رہا ہے، بھیڑ کے بچے پر لپکتا ہے ـــــ خدا تمہارا مددگار ہے۔ پیش قدمی ہو۔

بلوچی رزمیہ شاعری کے بلند پایہ شہپارے کسی نہ کسی کہانی کے تار و پود ہیں۔ کوئی بھی رزمیہ نظم اپنی الگ حیثیت نہیں رکھتی۔ کہانی بلند مرتبہ شخصیتوں اور سربرآوردہ ہستیوں کے گرد گھومتی ہے۔ اُس کا ایک آغاز ہے۔ ایک وسط ہے اور ایک انجام ہے۔

"سی سالہ جنگ" کی کہانی ایک مربوط کہانی ہے۔ ایک ایسی کہانی جو زندگی کی کہانی ہے، کسی خیالی دنیا اور اس خیالی دنیا کے انسانوں کی کہانی نہیں۔ ہم جیسے انسان اس کہانی کے کردار ہیں جو ہماری طرح عقل و دانش اور کمزوریوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ نہ تو فرشتے ہیں اور نہ شیطان کے بھائی ـــ وہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں۔

تیس سالہ جنگ کے علاوہ سمّی کی کہانی ہے۔ سمّی بیوہ ہے اور بلیدی قبیلہ کے سردار "بی برگ پُڑ" کی زمینوں کے پاس رہتی ہے۔ بی برگ پُڑ اُسے اذیت پہنچاتا ہے تو وہ گورگیج قبیلے کے سردار، دودہ کی پناہ میں آجاتی ہے۔ دودہ اُسے باہوٹ یعنی مہمان بنالیتا ہے، ایک دن موقع پاکر بلیدی سردار بی برگ پُڑ حملہ کرتا ہے اور سمّی کی گائیں ہانک کرلے جاتا ہے۔ سمّی روتی پیٹتی سارا ماجرا دودہ کی ماں کو بتاتی ہے۔

دودہ کی ماں اپنے بیٹے کے پاس جاتی ہے۔ دودہ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے ۔ اور دوپہر کو وہ اور اس کی دلھن آرام کر رہے ہیں مگر ماں آکر اُسے کہتی ہے: "جو بہادر اپنے مہمانوں کو پناہ دیتے ہیں وہ دوپہر کو بے خبر نہیں سوتے"

بلوچ بے حد مہمان نواز ہوتے ہیں۔ وہ مہمان کی عزت اپنی عزت اور مہمان کی توہین اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ مہمان کی خاطر جان لینا یا دینا ایک عام سی بات ہے۔

دودہ ماں سے تمام ماجرا سنتا ہے۔ ماں اُسے حکم دیتی ہے:

یا تو تمام گائیں صحیح سلامت لاؤ یا بہادری اور شجاعت سے لڑتے ہوئے اپنی جان گنوادو۔

ماں کے حکم کی تعمیل ضروری ہے وہ اپنی خوبرو بیوی کے پاس سے اٹھتا ہے اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر بی برگ کے مقابلے کے لئے نکل جاتا ہے، شام ہونے سے پہلے بی برگ پُڑ اور اُس کے ساتھی بہادر دودہ کو قتل کر دیتے ہیں۔ بہادر ماں اپنے چھوٹے بیٹے بالاچ کو انتقام کے لئے روانہ کرتی ہے۔ مگر بالاچ طوفان بادوباراں میں گھر کر کسی دوسری جگہ جا نکلتا ہے۔ بالاچ مسلسل چودہ سال تک انتقام کی آتشِ فروزاں سینے میں لئے خانقاہوں اور مزاروں پر حاضری دیتا ہے۔ میلوں میں شرکت کرتا، تیراندازی، شہسواری اور تیغ زنی سیکھتا ہے اور آخر چودہ سال بعد بلیدی سردار بی برگ پُڑ سے بدلہ لینے کے لئے آتا ہے۔ ایک رات بالاچ اپنے دوست نکیبو کے ساتھ بی برگ کے گاؤں پر حملہ کرتا ہے۔ بی برگ پُڑ بچ جاتا ہے البتہ اُس کا بہنوئی یوسف مارا جاتا ہے۔ بی برگ دن کو بالاچ کو پیغام پہنچاتا

ہے کہ وہ گیدڑ کی طرح حملہ کیوں کرتا ہے شیر کی طرح مقابلہ کیوں نہیں کرتا۔
بالاچ حملہ کرتا ہے اور برگ پُژ کو ہلاک کر دیتا ہے بالاچ کی زندگی کی کہانی ایک باعزت اور صاحب عزم کی کہانی ہے۔ یہ کہانی آج بھی ہر بلوچ مرد اور عورت کے سینے میں شمع فروزاں کی طرح تابندہ ہے۔

بلوچی رزمیہ شاعری کے کردار افسانوی نہیں ہیں۔ یہ کردار وہ ہیں جن سے بلوچ تاریخ ترتیب پاتی ہے۔ وہ گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان میں سے کسی کے پاس الہ دین کا چراغ بھی نہیں۔ وہ دشمن پر جادو کے اثر سے فتح نہیں پاتے۔ اُن کے قبضے میں جن نہیں ہیں۔ وہ جیتی جاگتی دنیا کے کردار ہیں۔ وہ ایک عام انسان کی طرح محبت اور نفرت کرتے ہیں۔ اُن سے بہادری اور بزدلی کے مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔ اُن کی عادات اور اطوار عام چلتے پھرتے انسانوں کے سے ہیں۔

میر چاکر خاں رند اور میر گواہرام لاشاری کے درمیان تیس سالہ جنگ کے آغاز میں میر چاکر خاں کا ایک مدبر ساتھی بی برگ میر چاکر کو جنگ کا آغاز کرنے سے روکتا ہے اور اُس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لیتا ہے۔ بی برگ، میر چاکر رند کے کہنے کے باوجود اُس کے گھوڑے کو آگے بڑھنے سے روکے رکھتا ہے۔ آخر ایک تند خُو رند جوان، میر حان آگے بڑھتا ہے اور بی برگ کی غیرت کو للکارتا ہے۔

میر حان کا بی برگ پر یہ ایک نفسیاتی حملہ ہے۔ وہ حان کے طنزیہ کلام کو سن کر چاکر کے گھوڑے کی لگام چھوڑ دیتا ہے اور لڑائی شروع ہو جاتی ہے یہاں بی برگ کا ذہنی ردِ عمل ایک عام انسان کا ہے۔ اُسے طعنہ دیا جاتا ہے کہ وہ بزدل ہے۔ وہ یقیناً بزدل نہیں اس لئے گھوڑے کی لگام چھوڑ دیتا ہے اور خود بھی جنگ میں شریک ہو کر دادِ شجاعت دیتا ہوا مارا جاتا ہے۔

بلوچی رزمیہ شاعری کے کردار ہمیشہ استوار رہتے ہیں۔ اگر میر چاکر خاں رند نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے تو وہ آخر دم تک لڑتا ہی رہے گا۔ اگر میر گواہرام لاشاری کا باپ فیاض ہے تو وہ اپنی فیاضی اور بلند نگاہی کا مظاہرہ عین جنگ کے دوران بھی کرتا رہے گا اور زخمی اور نیم مردہ چاکر کو اپنی گھوڑی "پُھل" پیش کرے گا۔ اگر میر حان نے بہادروں کی طرح لڑنے مرنے کا اعلان کیا ہے تو سینے پر تیر کھا کر ہی مرے گا، یوں نہیں ہو گا کہ وہ پشت پر تیر کھائے۔ اگر بی برگ رند نے میر چاکر خاں کو جنگ نہ کرنے کی درخواست کی ہے تو وہ جنگ بند کرانے کے لئے التجا کرتا رہے گا تا آنکہ اس کے سب ساتھی لقمۂ اجل ہو جائیں وہ دیوانہ وار جنگ میں کود پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچی رزمیہ شاعری میں کرداروں کی یہ استواری ڈراما پیدا کرتی ہے اگر ان کرداروں میں لچک اور جھول پیدا ہو جاتا تو جو توانائی اور زندگی آج بلوچی رزمیہ شاعری میں ملتی ہے وہ نظر نہ آتی۔

تمام رزمیہ نظمیں صداقت شعاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ صداقت شعاری کے یہ مظاہرے رزمیہ کہنے والوں کے ہیں۔ عام طور پر دوسری زبانوں کی رزمیہ شاعری میں تخیل زیادہ اور حقیقت کم ہوتی ہے۔ جنگ کے مناظر کھینچتے وقت دوسری زبانوں کے رزمیہ نگار اُن بہادروں اور جوانوں کی سرگرمیاں بڑھ چڑھ کر بیان کرتے جن سے وہ ذہنی طور پر وابستہ ہیں۔ اس کے برعکس اُن سورماؤں کی جرأت اور دلیری کو بڑے پھیکے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ جن سے انھیں ہمدردی نہیں۔ لیکن بلوچی رزمیہ شاعری میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں صداقت اور خلوص سے کام لیا جاتا ہے اور دیانت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا جاتا۔

دشمن کے جوانوں کی بہادری اور جرأت کا اعتراف بڑے حوصلے کا کام ہے لیکن اس سے بڑے حوصلے کا کام یہ ہے کہ اپنے جوانوں کی بزدلی کا اعتراف کیا جائے۔ صداقت شعاری کا تقاضہ ہے کہ وہی بات کہی جائے جو وقوع پذیر ہوا اگر اپنے قبیلے کے بہادر بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اُس کا اعتراف ہونا چاہیئے اگر دشمن کے جوان ہمّت اور دلیری سے کام لے رہے ہیں تو انصاف کا تقاضہ ہے کہ اُن کی ہمت اور دلیری کو تسلیم کیا جائے۔ صحیح "سپورٹسمین شپ" یہی ہے۔ بلوچی رزمیہ شاعری میں کبھی اور کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے بزدل جوانوں کی تعریف کی جائے اور یوں ان کے حوصلے بڑھ جائیں۔ اس کے برعکس بلوچی رزمیہ شاعری نے ہمیشہ اپنے کمزور دل جوانوں کا مذاق اڑایا ہے اور اُن پر طنز کے تیر برسائے ہیں تاکہ وہ غیرت اور حمیت کے پیشِ نظر دلیرانہ طور پر لڑتے ہوئے مر جائیں۔

مولانا شبلی رزمیہ شاعری کا ایک کمال یہ بھی بتاتے ہیں کہ لڑائی کی تیاری مکمل طور پر دکھائی جائے۔ بلوچی رزمیہ شاعری کی

معیار پر پوری اترتی ہے۔ جنگ سے پہلے جوانوں کی ہر حرکت اور سرگرمی کو واضح کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ ہونے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ دشمن کی تعداد کتنی ہے، وہ کس جگہ پر قابض ہے، اُس کی مورچہ بندی یا صف آرائی کا انداز کیا ہے۔ اگر دشمن پر حملہ کیا جائے تو کس پہلو سے کیا جائے، تاکہ دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے۔ اگر لشکر یا فوج دشمن پر حملہ کرے تو کونسا راستہ اختیار کرے اور اگر حملے اور پیش قدمی کے دوران کوئی غیر معمولی دقت آجائے تو اُسے کیسے دور کیا جائے۔ یہ تمام تفصیلات وہ جوان فراہم کرتے ہیں جنھیں بلوچی زبان میں "چھاری" کہا جاتا ہے۔ چھاری ایک ہراول دستہ ہوتا ہے جو یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔

چھاری کا فرض اُس قدیم عہد میں وہی تھا جو آج کل (RECONNAISSANCE PATROL) کا ہے۔ دشمن کے بارے میں ضروری معلومات کی فراہمی کے بعد صف بندی کا مرحلہ آتا ہے بہادر جوان ہتھیار سجا کر میدان جنگ میں نکلتے ہیں۔ اُن کا سپہ سالار سب سے آگے ہے، ہر جوان اپنی اپنی جگہ پر رُستم و سہراب سے کسی طور کم نہیں۔

مناظرِ جنگ میں حقیقی فضا قائم کرنا اور درست تاثر پیدا کرنا رزمیہ شاعری کا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اِس غرض کے لئے ایسے جاندار الفاظ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور ایسی تراکیب سے کام لینا پڑتا ہے جو مناسب ہوں اور عمل اور حرکت کی فضا ہماری چشمِ تصوّر میں واضح طور پر آجائے اور قاری یوں محسوس کرے جیسے وہ خود لڑائی میں شریک ہے۔

نہ صرف بلوچی مرد بلکہ بلوچی خواتین بھی شجاعت و شہامت میں مردوں سے پیچھے نہ تھیں۔ وہ خود ہتھیاروں سے سج کر میدان جنگ میں جاتیں اور اپنے بہادر شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کے شانہ بشانہ لڑتیں انکی موجودگی اُن کے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کے حوصلے بڑھانے کا باعث ہوتی۔ وہ اپنی موجودگی سے انھیں دادِ شجاعت دینے پر اُکساتیں۔ جذبۂ زندگی نہ صرف بلوچ مردوں میں ہی تھا بلکہ زندگی کا احساس و جذبہ بلوچ خواتین میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا اور ہے۔ یہی جذبہ آج پاکستان کے تحفظ و بقا کے لئے ہر بلوچ مرد و زن کے سینے میں موجزن رہتا ہے۔

چھاری کی طرح بلوچی رزمیہ شاعری کی ایک اور اصطلاح "کھوڑی" ہے۔ کھوڑی بلوچی میں تعاقب کو کہا جاتا ہے، رزمیہ شاعری میں کھوڑی وہ تعاقب ہے جو ہارتے ہوئے اور پیچھے ہٹتے ہوئے دشمن کا کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ دشمن میدان جنگ میں شکست کھاتا ہے اور پیچھے ہٹ کر کہیں چھپ جاتا ہے۔ اور جنگ چھاپہ وار شروع کر دیتا ہے۔ گوریلا جنگ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اور دشمن کا مکمل طور پر صفایا کرنے کے لئے کھوڑی کی کارروائی کی جاتی تھی، دشمن کا پیچھا کیا جاتا اور اُسے پکڑ کر ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ لیکن یہ کارروائی دشمن کے اُن آدمیوں کے خلاف کی جاتی تھی جو ہتھیاروں سے لیس ہوتے اور گوریلا جنگ اور شبخون کی کارروائیوں کے ذمہ دار ہوتے۔ دشمن کے جو آدمی ہتھیار ڈال دیتے انھیں معاف کر دیا جاتا۔ بلوچی رزمیہ شاعری بقول ملک محمد رمضان بلوچ "کھوڑی کی دلچسپ حکایتوں سے لبریز ہے"۔

کھوڑی کی طرح بلوچی رزمیہ شاعری کی ایک اور اصطلاح "میل" ہے۔ میل وہ پہرہ ہے جو رات کو دشمن کے حملے اور شب خون سے بچنے کے لئے دیا جاتا تھا۔ اسے آج کل غالباً نائٹ گارڈ (NIGHT GUARD) کہا جاتا ہے۔

غرض بلوچی رزمیہ شاعری دنیا کی کسی بھی زبان کی رزمیہ شاعری سے کم تاثر آفریں نہیں۔ یہ آج بھی بلوچ عوام کے سینوں میں حرفِ مقدس کی طرح محفوظ ہے۔ بلوچوں کے پیشہ ور موسیقار "لوڑی" رزمیہ شاعری کے امین ہیں۔ وہ آج بھی میلوں، تہواروں اور محفلوں میں دنبورہ اور سرانیدہ پر طویل رزمیہ نظمیں گاتے ہیں اور منہ مانگا انعام پاتے ہیں۔ بلوچی رزمیہ شاعری جواں ہمت اور محبِ وطن، دلیر اور شجاع۔ قوی اور جفا طلب، دیانتدار اور معصوم پاکستانیوں کی شاعری ہے جس کو محفوظ کرنے اور پاکستان کی دونوں قومی زبانوں میں منتقل کرنے کی بالخصوص ضرورت ہے +

★

سرریلزم بقیہ صفحہ ۳۲

ذہن کو روایتی اخلاق پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسا ذہن جو اخلاقی بندشوں کا غلام ہے۔ نہ صرف بیمار ہے بلکہ پست فن کی بھی تخلیق کرتا ہے۔ اس لئے جے۔ بی پریسٹلی کا یہ خیال کہ سرریلیسٹ فن کار بد اخلاق اور جنسی طور پر بدچلن ہیں، ادب اور زندگی دونوں کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ تنقید ہے۔ فن کار کی آزادی صحت مند ذہن کی آزادی کا مطالبہ ہے نہ کہ جنسی بے راہ روی اور فنی تخریب کی کوشش ان میں فن کی اندرونی لگن پائی جاتی ہے جس میں وہ کسی بھی طرح پسپا ہونے کو تیار نہیں۔

آخر میں سرریلزم کے جدلیاتی طریقہ کار کو پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ خارجی دنیا کی عملی و معاشی زندگی اور داخلی دنیا کے خواب اور تصور پرستی کی زندگی ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تضاد ایک طرح کا روحانی تناؤ پیدا کرتا ہے اور فن کار کا کام اس تضاد کو حل کرنا ہے۔ وہ اس کو ایک نئے امتزاج سے ختم کرتا ہے فنی تخلیق اِن دونوں دنیاؤں کے عناصر کو یکجا کرتی ہے زوال پذیر عناصر کو ختم کر کے نئے تجربہ کو جنم دیتی ہے۔ اور یہ امتزاج ترقی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

سرریلزم بیسویں صدی کے اہم رجحانات میں سے ہے۔ لندن، نیویارک، بروسلز، وارسا، کوپن ہیگن، پراگ بارسلونا، بلگریڈ، سٹاک ہوم، ٹین رِف اور ٹوکیو میں سرریلیسٹ فن کاروں کے کئی گروہ پیدا ہوئے۔ لیکن سیاسی اور ذاتی وجوہ کے باعث بہت سے ادیب اور فن کار اس سے الگ ہو گئے ہیں کچھ اسے خود ہی چھوڑ گئے ہیں اور کچھ کو آندرے بریتوں نے اپنی تحریک سے خارج کر دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرریلزم ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں ختم ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس کے اثرات ابھی تک قائم ہیں اور اس کی روایت نئے ادب اور نئے فن کے لئے اب بھی فیضان کا سرچشمہ ہے +

پاکستان کا سنہری مستقبل

اس کی تعمیر کیلئے زر فراہم کیجئے...

ہمیں اپنے ملک کی تعمیر کے لئے کافی زر کی ضرورت ہے۔ یہ ہیں وہ قومی منصوبے جو ہمارے سامنے ہیں جب ہی مکمل ہو سکیں گے کہ پوری قوم مل کر قومی بچت میں اضافہ کرے۔ دوسرا پانچ سالہ منصوبہ تیار ہو چکا ہے [illegible] قوم کے ہاتھ ہے۔ کفایت اور بچت [illegible] اور ملک کا بھی۔

دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے مقاصد

۱ ملکی آمدنی میں ۲۰٪ اضافہ
۲ صنعتی پیداوار میں ۵۰٪ اضافہ
۳ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی
۴ ۳۰ لاکھ آدمیوں کے لئے روزگار
۵ آبپاشی، بجلی، زراعت، صنعت، رسل و رسائل، تعلیم، صحت اور معاشرتی ترقی۔

... کفایت شعاری میں آپکی اور ملک کی بھلائی ہے

سیونگس سرٹیفکیٹ خریدیے
۶ فیصدی منافع [illegible]
پوسٹ آفس سیونگس بینک میں روپیہ جمع کیجئے
[illegible]
ڈاکخانے کی بیمہ پالیسی لیجئے — شرح کم منافع زیادہ
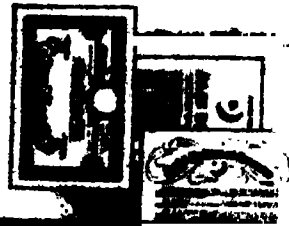
"میں
لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال کرتی ہوں"
جمیلہ رزاق کہتی ہے
فلمی ستاروں کا سفید
اور خوشبودار حسن بخش صابن
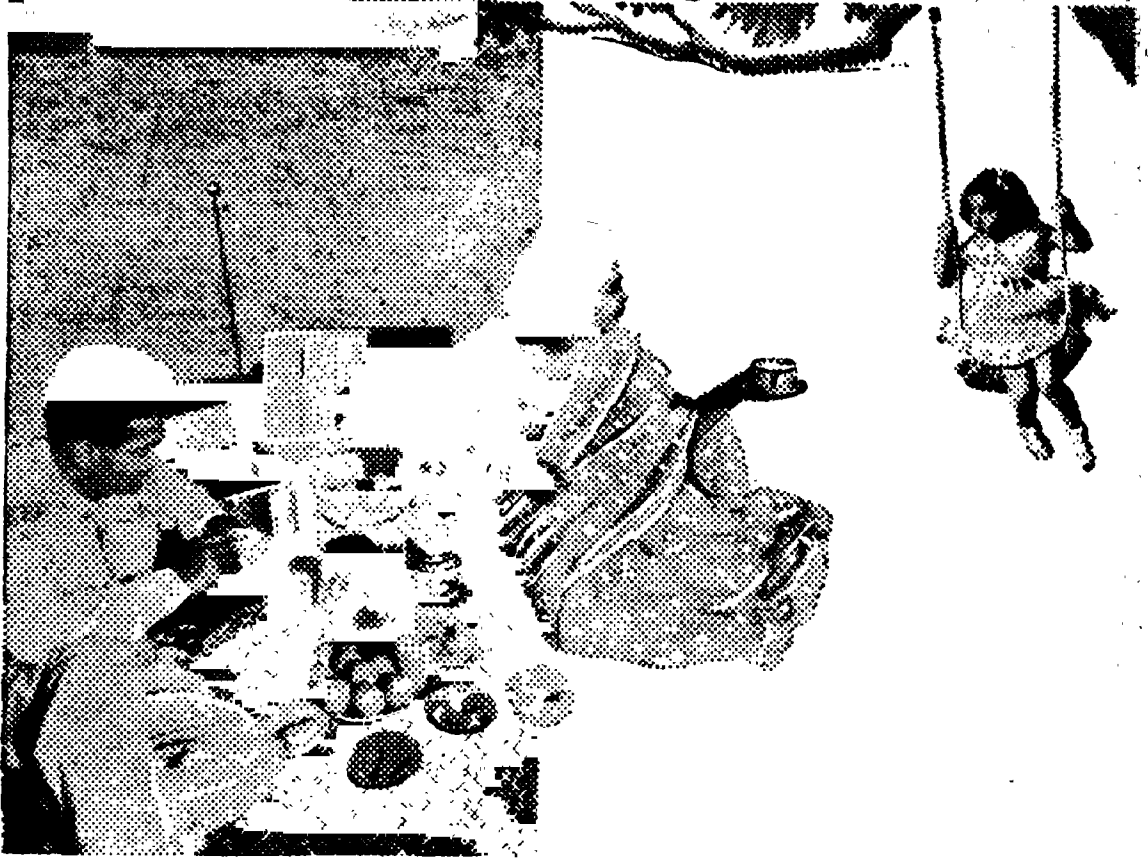
پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر '' ادارۂ مطبوعات پاکستان ،، نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی ان اہم صنعتوں پر مختصر، مگر سیرحاصل، اور مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر سے مزین ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن‌نشیں ہو جاتی ہے۔

ہر کتاب میں جدید ترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں۔ جن سے ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔

استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف ۴ آنے رکھی گئی ہے۔ یہ کتابچے ابتک شائع ہو چکے ہیں :

* پٹ‌سن کی صنعت
* سیمنٹ کی صنعت
* چائے کی کاشت اور صنعت
* کپڑے کی صنعت
* پن بجلی کی صنعت
* ماہی گیری
* اشیائے صرف
* ذرائع آبپاشی کی صنعت
* کاغذ کی صنعت
* غذائی مصنوعات
* شکر سازی : (رنگیں تصاویر، نفیس آرائش : قیمت آٹھ آنے)

اب تو
ہماری پلنگ کی چادریں
گھر پر ہی دھوئی جاتی ہیں

کیا آپ اپنے بریکس کو صحیح نہ رکھنے کے قصوروار ہیں؟

بریکس کو درست کروائیے اور پٹرول کی بچت کیجئے

بریکس اگر صحیح طور پر کام نہ کر رہے ہوں تو آپ کی کار بھاری چلے گی اور اس وجہ سے پٹرول زیادہ خرچ ہوگا۔ اس کا اطمینان کر لیا کیجئے کہ آپ کے بریکس ہمیشہ صحیح طور پر کام کر رہے ہوں۔ اور اس طرح پٹرول کی بچت کیجئے۔

اور ہر میل پر پیسے کی بچت کے لئے

موبل گیس

استعمال کیجئے۔ اس کے ہر ایک گیلن سے آپ کی کار زائد میل چلتی ہے۔

موبل آئل

کے استعمال سے آپ کی کار کا انجن زیادہ عرصہ تک کارآمد رہتا ہے

اسٹینڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی

(محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے میں قائم شدہ)

کراچی۔ ڈھاکہ۔ لاہور۔

لال گھوڑے کے نشان پر رکئے جہاں آپ کی خدمت کے سب خواہاں ہیں

کیا آپ پہلی بار امید سے ہیں ؟

تو پھر اپنی دایہ کے استعمال کے لئے ڈیٹول خرید رکھئے

دایہ کے ہاتھوں اور آلات سے، جو اچھی طرح جراثیم سے پاک نہ کئے گئے ہوں، زچگی کی حالت میں اگر خفیف سی خراش آجائے یا رگڑ لگ جائے تو اس سے آپ کو اور آپ کے بچے کو چھوت لگ جانے کا اندیشہ ہے۔

اسی لئے اس موقع پر ڈیٹول کے استعمال کا مشورہ دیا گیا ہے۔ ڈیٹول اگرچہ طاقتور اور موثر دافع عفونت دوا ہے جو جراثیم کو فوراً ہلاک کر ڈالتی ہے تاہم بے ضرر ہے اور نازک سے نازک جلد کو بھی نقصان نہیں پہنچاتی۔

چھوت اور خون میں زہریلا مادہ پیدا ہو جانے کا خطرہ مول نہ لیجئے ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ گھر میں موجود رکھئے۔ تاکہ آپ کی دایہ اپنے ہاتھوں اور آلات کو ضرورت کے وقت جراثیم سے پاک کرسکے۔

ڈاکٹروں نے اسکے استعمال کی سفارش کی ہے۔
اونس اور
۴ اونس کی بوتلوں میں ملتا ہے
آج ہی ایک بوتل خریدیے

ڈیٹول

ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ
پوسٹ آفس بکس نمبر ۴۶۳۸ - کراچی

چھوت سے حفاظت کیجئے۔ زچگی سے پہلے، زچگی کے دوران میں اور زچگی کے بعد ڈیٹول کا استعمال کیجئے۔

JWT

RC 1129

جلد ۱۳ — شمارہ ۵

ماہِ نو

مئی ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی — فی کاپی: آٹھ آنے

نذرالاسلام — ایک آتشِ خاموش

نسیم احمد

یہ کبھی سنا نہ گیا کہ آتش فشاں پہاڑ کا لاوا اُگلنے والا منہ ایک دم سے خاموش ہو جائے اور پھر اُس کے انگارے ہمیشہ کے لئے سکون کی سانس لینے لگیں۔ نذرل درحقیقت جب آج سے چالیس سال پہلے بنگال کے اُفق پر انقلاب اور بغاوت کے ولولہ آفریں ہنگامہ خیز نعرے بلند کرتا ہوا طلوع ہوا تھا تو وہ سراپا شعلۂ جوالہ تھا۔ اس کے قلم کی ہر جنبش میں آندھیاں چھپی ہوئی تھیں، اس کی نظموں کے ہر بول میں سرکش باغی کے دل کی دھڑکن تھی، اس کے ہونٹوں پر وہی نغمہ پرورش پاتا تھا جس میں زندگی کی شعلہ افشانیاں ہوتی تھیں۔ وہ اپنے مضطرب اور بے چین دل کے آتش فشاں سے بیس بائیس سال تک غلامی کے آہنی طوق کو پگھلاتا رہا اور پھر یکایک اس کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کی شعلہ بار زبان خاموش ہو گئی۔ اس کا انقلاب آفریں قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اس سانحۂ عظیم کو تقریباً بیس سال ہو گئے۔ جب سے اب تک اس کی فکر کا لاوا منجمد ہے اور اس کے خیالات کا بحرِ ذخار خاموش! بلاشبہ بصارت رکھتے ہوئے بھی وہ اپنے وطن کی اُس آزادی کو نہ دیکھ سکا جس کی آرزو میں اس نے اپنا جگر خون کیا تھا اور جس کے حصول میں اس نے سلاخوں کے پیچھے جوانی کی کتنی بے چین راتیں گذار دی تھیں تاہم اُس کے جذبے کے پیچھے جو مقصد کام کر رہا تھا اس کی تکمیل ہو چکی تھی۔ وہ ان دنوں آتشِ خاموش ضرور ہے مگر اس کے انگارے پھول بن کر ہمیں بہارِ جاوداں سے ہمکنار کر چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی خاموشی کسی دن یکایک تکلم میں بدل جائے اور اس کی زندگی کے ساکت و جامد سمندر میں پھر طوفان آجائے!

نذرل کی شاعری تین خانوں میں بٹی ہوئی ہے — انقلابی، اسلامی اور رومانی۔ لیکن انقلابی شاعری کے دور میں بھی اس نے پان اسلامزم کا خواب دیکھا تھا۔ یہ زمانہ بھی وہی تھا جب پورے مشرقِ وسطیٰ میں انگریز چھا گئے تھے اور عربوں کی زمین پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف یورپ کا "مردِ بیمار" ترکی پہلی جنگِ عظیم میں شکست کھا کر آخری ہچکی لے رہا تھا لیکن اسی اثنا میں ترکی کے مردِ مصطفےٰ کمال نے انگریزوں کو للکارا اور ان کے خلاف صف آرا ہو [illegible]

اسی دور میں نذرل نے اسلامی مجاہدوں کے آہنی عزائم اور بلند حوصلوں کی مدح میں چند نظمیں لکھیں جن میں "مصطفےٰ کمال"، "انور پاشا" [illegible] "زغلول پاشا"[1] بہت مشہور ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر بڑی آسانی سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں اسلامی برادری اور اخوت، محبت و مروت، جوش و ولولہ اور جرأت و ہمت کی مشعلیں روشن تھیں۔ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو متحد و متفق دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر لکھا

نظر نظر میں جل اٹھا چراغِ دینِ مصطفےٰ
کھلی آنکھیں اپنی تو بھی وا، چراغ دل کا پھر جلا
سیاستِ کمال سے جہاں پہ تُرک چھا گئے
وہ عزم ہائے پہلوی چراغِ نو جلا گئے
غلام قلبِ مصر تھا، نہ جوش تھا نہ ولولہ
مگر وہ مردِ حق نما سیاہ داغ دھو گیا
حجاز بھی ہے صف شکن عرب ہے آج نعرہ زن
امان[2] بھی ہے پیش پیش اٹھائے پرچمِ وطن
مراکشی بھی خواب سے سحر کو چوم کر اُٹھے
کریم[3] ہو گئے رہا مراکشی ہوئے

---

[1] زغلول پاشا
[2] امان اللہ خاں (سابق بادشاہ افغانستان)
[3] غازی عبدالکریم (مجاہد مراکش)

عراق بھی سنبھل گیا، رشیدؔ اک نیا تھا
جواں سے جارحین پاک بھی پرانا شام ہے نیا
مگر دیار ہند کے ہے مسلموں پہ کیوں خزاں
پڑے ہیں بے خبر ابھی نہ یہ خبر کہ ہیں کہاں
غرور ہے کہ کیا ہوا کبھی تھے ہم بھی حکمراں
مگر جو عزم ہو جواں تو جھک پڑے یہ آسماں[2]

اس نظم کے ذریعہ نذرل نے آج سے تقریباً تیس پینتیس سال پہلے غلام ہندوستان کے مسلمانوں کی حمیت کو جھنجھوڑا تھا۔ اس نے اسلامی دنیا کے ان مجاہدین کے ٹھوس ارادوں اور فولادی عزائم کے کارنامے بیان کئے تھے جنہوں نے اپنی گردنوں سے غلامی کے طوق کو پھینک دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے وطن کے مسلمان بھی در زنداں توڑ کر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے باہر نکل آئیں اور تلوار سونت لیں۔ اس کی نگاہ میں غلامی کی زندگی سراسر موت تھی۔

نذرل کی اسلامی نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے اسلامی دنیا کی تحریکوں سے کماحقہٗ آگاہی تھی۔ وہ بار بار اپنے وطن کے مسلمانوں کے سامنے غازی مصطفےٰ کمال، غازی عبدالکریم، انور پاشا اور دیگر مجاہدین کے نام پیش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کے دلوں میں بھی آزادی کا آتش فشاں بھڑکے اور غلامی کا آہنی بندھن ایک ہی جھٹکے کے ساتھ پاش پاش ہو جائے۔ وہ مسلمانوں کے لئے غلامی کو خدا کی سب سے بڑی لعنت سمجھتا تھا۔

نذرل نے اسلامی نظموں کے علاوہ اسلامی گیت بھی لکھے ہیں۔ اور یہ گیت اتنے رسیلے سجیلے ہیں کہ گراموفون کمپنیوں نے ریکارڈ کروائے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ گیت بنگال کے گھروں میں اتنے مشہور اور مقبول تھے کہ بچہ بچہ کو ازبر ہو چکے تھے۔ ان گیتوں کی دھنیں بھی اسی نے بنائی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نذرل عربی موسیقی کا بھی بڑا رسیا تھا۔ چنانچہ اس کی بنائی ہوئی بیشتر دھنیں عربی دھنوں سے ماخوذ ہیں۔ اس نے بنگالی گانوں میں قوالی کو بھی رائج کیا۔ ان گیتوں اور قوالیوں کی زبان بھی بڑی سہل اور آسان ہے خصوصاً ان میں اردو اور فارسی کے الفاظ کے علاوہ ان کی ترکیبیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ زبان کے معاملے میں نذرل کا اجتہاد نزاع کا سبب بنا۔ سنسکرت آمیز زبان لکھنے والے برہمنوں اور خود ٹیگور نے نذرل کی زبان کے خلاف آواز اٹھائی مگر اس نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی جنبش نہ کی۔ مثلاً اس کا یہ اسلامی گیت ملاحظہ ہو:

عید الضحیٰ چاند ہاشے اوئی   ایلو آبار دوسرا عید
قربانی دے قربانی دے   شنو خدا فرمان تاکید
(عید الضحیٰ کا چاند ہنس رہا ہے   لے دوسری عید بھی آگئی
قربانی دے قربانی دے   خدا تاکید سے سُن خدا کا یہ فرمان ہے)

یا پھر اس بند کو پڑھئے:۔

توفیق داؤ خدا اسلامے   مسلم جہاں پُون ہوک آباد
داؤ شئی ہارا نو سلطنت   دائو شئی باہو، شئی دل دراز
(اے خدا اسلام کو اتنی توفیق عطا کر   کہ مسلم جہاں دوبارہ آباد ہو سکے
ہاری ہوئی سلطنت واپس کر دے   وہی کس بل اور وہی کشادہ دل عطا کر)

نذرل نے جو نعتیں لکھی ہیں ان کی زبان بھی تھوڑی سی ردوبدل کے بعد بالکل اردو بن جاتی ہے۔ ان کی ایک نعت ملاحظہ ہو:

محمد مصطفےٰ صلی علیٰ   تومی بادشاہ بادشاہ کملی والا
(کملی والے تم بادشاہوں کے بادشاہ ہو)

قیامتِ پیاس امت لاگی   داترا سے دو بے لوئے طہورا پیالہ
(قیامت کے دن امت کو پیاس لگے گی   تو تم طہور کا پیالہ لئے کھڑے ہوگے)
جو لی بے حشر دینے دادش رد بی   نفسی نفسی کو بے شو کل نبی
(حشر کے دن بارہ آفتاب روشن ہوں گے   تب سارے نبی نفسی نفسی پکاریں گے)
مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی   بادشاہ راؤ بادشاہ نبی دیر راجنی
(تم بادشاہوں کے بادشاہ انبیاء کے راجہ ہو)

نذرل نے جس طرح بنگلہ شاعری میں صنفِ غزل کو رواج دیا اسی طرح اس نے اردو اور فارسی کے الفاظ بھی اس زبان میں بڑی آزادی کے ساتھ رائج کئے۔ اگرچہ اردو اور فارسی کے الفاظ بنگلہ کے متقدمین مسلمان شاعروں نے بھی اپنے کلام میں استعمال کئے تھے لیکن جب برہمنوں کا زور ہوا اور زبان سنسکرت آمیز بنائی جانے لگی تو مسلمان

---

[1] اردو میں رشید (رشید گیلانی عراق کی طرف اشارہ ہے)۔
[2] مترجمہ یونس احمر۔

ادیب و شاعر بھی اسی زبان میں اپنے خیالات قلمبند کرنے پر مجبور ہوگئے حتیٰ کہ کیقباد جیسے کٹر مسلمان شاعر نے بھی سنسکرت آمیز زبان استعمال کی۔ لیکن نذرل نے برہمنوں کی پروا نہ کی۔ یہ نہیں کہ نذرل کو مائیکل مدھوسودن یا ٹیگور جیسی زبان پر عبور حاصل نہ تھا۔ اس سلسلے میں اس کی مشہور نظم بِدروہی (باغی) کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ نذرل تو درحقیقت اس زبان کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا جو مسلم سلاطینِ بنگال کے دور میں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی تھی۔

نذرل کو اردو اور فارسی پر عبور کامل تو نہ تھا لیکن اسے ان زبانوں سے کافی حد تک واقفیت ضرور تھی۔ جب وہ پہلی جنگِ عظیم میں شامل ہوا تو اُسے ان دونوں زبانوں کے جاننے والوں کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع ملا۔ فوج میں شمالی ہند کے سپاہیوں کی کثیر تعداد شامل تھی جو اردو بولتے تھے۔ نذرل کو بھی اردو سیکھنی پڑی۔ اس کے علاوہ وہ فارسی بھی کافی سیکھ چکا تھا جس کا زندہ ثبوت حافظ کی رباعیوں کے منظوم بنگلہ ترجمے ہیں جو اس نے براہ راست فارسی سے کئے۔ اس طرح اس نے دونوں زبانوں کے بہت سے الفاظ بھی سیکھ لئے۔

ایک طرف اردو اور فارسی زبانوں سے والہانہ محبت، دوسری طرف پان اسلامزم کے لئے جوش و خروش۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل میں مسلمانوں کی تنظیم اور احیائے ثانیہ کی آگ بھڑک اٹھی جو اپنے ساتھ اسلامی زبانوں کو اپنانے خصوصاً اردو کو بنگلا کے قریب تر لانے کا ذوق و شوق بھی لئے ہوئے تھی۔

نذرل کی شاعری کا بتدریج مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوجائے گی کہ آخری دور میں یعنی مفلوج ہونے سے پانچ چھ سال پہلے ہی سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ بنگال کے مسلمان بالخصوص اور پورے ہندوستان کے مسلمان بالعموم متحد نہ ہوئے تو سیاسی اور سماجی لحاظ سے ان کی حیثیت من حیث القوم ختم ہوجائے گی۔ اس کے ثبوت میں اس کی وہ نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں جو وقتاً فوقتاً "نوایگ" بنگلہ روزنامہ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان ہی دنوں اس نے "مورو بھاسکر" یعنی "آفتابِ صحرا" نام کی ایک کتاب بھی لکھی جس میں ولادتِ حضرت رسول کریم کی بڑی ہی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ نذرل کا ارادہ رسولِ اکرم کی حیاتِ اقدس پر منظوم کتاب لکھنے کا تھا لیکن کتاب مکمل نہ ہوسکی کیونکہ وہ علیل ہوگیا اور اس کی تمام سرگرمیاں اس علالت کی نذر ہو کر گلدستۂ طاقِ نسیاں بن گئیں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! "آفتابِ صحرا" نذرل کی آخ[ری] تصنیف ہے۔ اس میں اُس کا وہی اسلامی جوش و ولولہ اور اسلام [سے] وہی روحانی لگاؤ ہے جو اس کی دوسری اسلامی نظموں میں نظر آتا ہے کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

صبح کے پنچھی بیدار ہوجا!
دیکھ خون کے دریا میں نہا کر عرب کا آفتاب طلوع ہوا ہے
تو بھی نئی آن اور شان کے ساتھ بیدار ہوجا
اور اپنی بین اٹھا لے!
دیکھ تاریکیوں میں لپٹے ہوئے مینار سے مؤذن کی صدا
ہو رہی ہے
جس کی آواز سن کر سیارے، سورج، چاند اور آسما[ن]
کانپ اٹھتے ہ[یں]

سُن یہ کیسی صدا آ رہی ہے
"خَیْرُ اُمّتِ النَّوْم!"
تو بھی بیدار ہوجا اور دیکھ
مغرب میں بحیرۂ احمر کی موجیں لہو کی طرح سُرخ نظر آ رہی [ہیں]
اور جنوب میں بحیرۂ ہند کی لہروں نے چنگھاڑنا شروع کر دیا ہ[ے]
اور شمال میں ریگ کے ذرّے اڑ اڑ کر ناچ رہے ہیں اور گا[رہے ہیں]
"پیارے جاگو اور راحت کے گھونٹ پیو"

اگر نذرل فالج کا شکار نہ ہوتا تو ممکن تھا اس کی یہ کتا[ب] بنگالی ادب کا شاہکار ہوتی۔ اس میں نہ صرف اس کی شاعری کا [آفتاب] نصف النہار پر ہے بلکہ اس نے رسول کریم کی حیاتِ اقدس کی [جو تصویر] کشی کی ہے وہ دلوں میں اتر جانے والی ہے۔ اس کے اندر اس [کی] رُوح کی آواز ہے، اس کے دل کی پکار ہے۔

درحقیقت مفلوج ہونے سے پہلے نذرل نے جو خوا[ب] دیکھا تھا اس کی تعبیر ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں نے متحد ہو کر [آزادی] حاصل کی اور وہ اُن بندھنوں سے آزاد ہوگئے جن کو توڑنے [کے] لئے وہ بائیس سال تک مسلسل بیباک اور نڈر بن کر انقلاب [کے] نعرے بلند کرتا رہا۔ نذرل پہلے بھی ایک انقلاب پسند اور مرد [مجاہد] تھا اور آخری وقت تک اس کا یہی طرۂ امتیاز رہا۔ وہ داعیانِ [حریت] کی صف میں پیش پیش تھا اور ایک سپاہی کی حیثیت سے برابر

باقی صـ۵۲

سوزِ دروں

قاضی نذرالاسلام
مترجم: یونس احمر

اپنے من کا اُس دن جس کو دے نہ سکی تھی بے بس پیار
آج وہی یاد آتا ہے مجھ کو ہر دم کیوں دیوانہ وار؟
آج مجھے یاد آتی ہیں اس کی بھولی بسری مدبھری باتیں
نیند محل میں جس نے سلایا چوم کے میری کالی آنکھیں
بھور سمے تک اس کے بوسے ان ہونٹوں پہ مچلتے تھے
ان بوسوں کے سوز و تپش سے داغ جگر کے جلتے تھے
بیتی باتیں آج وہی ان نینوں کو چھلکاتی ہیں
آج مرے پندار کی باتیں اپنے سر کو جھکاتی ہیں
جس کی جواں امیدیں میں نے پاؤں سے ٹھکرائی تھیں
آج اسی سے پیار ہے جس کی آشائیں جھٹلائی تھیں
آنکھوں سے نکلے تھے شرارے، پر یہ زباں خاموش رہی
کیا تھا رخصت او پرے دل سے، من کی جوالا پھٹ نہ سکی
اُس کے دل میں دیکھ چکی تھی خار و خس رسوائی کے
کس کس در کی ٹھوکریں کھائیں، سب کچھ تھا معلوم مجھے
ہائے لیکن میں بھی اُس کو اپنے دل میں رکھ نہ سکی
کیسے کہوں معتوب بھکاری، راجہ تھا اور میں داسی!
چاہ میں میری راج بھکاری رستہ کھو کر آیا تھا
کیسے میں پہچانتی اس کو میرے لئے کیا لایا تھا
ٹھٹکی کچھ، پھر دور رہوئی، کشکول میں اُس کا لے نہ سکی!

اس نے مجھ سے پیار کیا تھا، اس نے میری پوجا کی تھی
چار دن اور اندھیارا تھا افسوس! نہ میں پہچان سکی
مجھ سے اس کا پیار تھا انتم، میں بھولی انجان رہی
اب تو اس کی چاہ کی باتیں میرے من کے پار ہوئی!
میری محبت کچھ تو بتا روپوش تھی کون سے مسکن میں
راجہ آیا تھا جب ہولے ہولے اس ٹوٹے من میں
سوچ میں اب بھی اس کی گھنٹی ہولے ہولے جی اٹھتی ہے
اب بھی جس کو سُن کر میرے من میں ہوک سی اٹھتی ہے
پھول کے سنگ وہ کھیلتا آیا، بادل کے سنگ اڑتا جائے
جانے کس کو ڈھونڈ رہا ہے، ہاتھ کبھی آ کر ہاتھ نہ آئے!
اس کو اگر میں پا بھی سکوں تو چاہت کے آثار کہاں
شام کا دیپک کہتا ہے اب اس کے من میں پیار کہاں
میرے من کے بھیڑے پٹ اس کارن شاید کھل نہ سکیں

اور کسی کی چاہ کا طوفاں تب اس من میں پلتا تھا
جبھی تو اپنی کٹیا میں آنے سے اس کو روکا تھا
چاہا تھا مجھ کو بھینچنا اکثر پریم کی شیتل چھاؤں میں
ڈر کر میں چھپ جاتی تھی، کانٹے تھے میری راہوں میں
کالی متوالی وہ آنکھیں دور سے اچھی لگتی تھیں

پاس جو آتیں بھور کی، بے کل اشکوں سے جل تھل آنکھیں — ردھم ردھم کانپ اٹھتا، ہوتیں بے معنی اس کی باتیں
آہ مگر کیوں جاگ اٹھی ہے اس جیسی اب بھوک مری — لمسِ حسیں کی چاہت کیوں ہے، دل میں کیوں ہے آگ لگی!
سر کو رکھ کر گود میں اس کی من چاہے ہے رونا آج — من چاہے ہے رونا یا جیون سے ہاتھ ہی دھونا آج
آج مجھے معلوم ہوا ہے میری خوشی اور میرا سکوں — میرے من مندر کا راجہ گیا ہے پاکر رازِ دروں!
مان گئی میں ہار، خدارا اب بھی آ کر لے جاؤ! — آؤ بسنتی روپ کے راجہ پیارے تم اپنا دے جاؤ
آج مرا من چیخ رہا ہے دکھ کی ٹیسوں کے مارے — دیکھ کبھی جا کوہِ گراں سے پھوٹ کے بہتے ہیں دھارے
تم ہو سچے، پتھر سے بھی خون کے دھارے بہتے ہیں — برفیلے پربت شعلوں سے پگھلے بنا کب رہتے ہیں

من میں اپنے آج اٹھا ہے جوار تمہاری چاہت کا
آج تو بندھن ٹوٹ گیا ہے، کھلا دوار محبت کا

آج آیا وہ میرا راجہ دل کے اس ویرانے میں — آج زباں کو بول ملے ہیں، ہلچل ہے مے خانے میں
اب وہ سرہانے چپکے چپکے صبح سویرے کیوں آئے گا — صبح سویرے کیوں آئے گا، نیند کا دیپ بجھائے گا؟
اب نہ کبھی وہ آئے گا راتوں کو میری کٹیا میں — جھکڑ طوفاں فریاد کریں گے جنگل میں اور صحرا میں
آج اگر وہ مل جاتا بچھ جاتی اس کے قدموں میں — موتی میں لٹاتی اشکوں کے اور پھول بچھاتی راہوں میں
آنکھوں میں بٹھاتی دیوانے کو اور اس کے جل تھل نینوں کو — بہتے کاجل کو پونچھتی میں ان رخساروں، ان ہونٹوں سے
آج نہ جانے ایسی کتنی پیاس ہے من میں آشا کی — پریم کی، دکھ کی، گیتوں کی، سندرتا کی، ابھیلاشا کی
کس کو پتہ کس دیس میں اس نے دھونی آج رمائی ہے — ہائے مگر کیوں اس نے مری آنکھوں سے ندی بہائی ہے
معلوم اگر ہو جائے کبھی میں اس سے محبت کرتی ہوں — مرقد میں بھی مارے خوشیوں کے ہو جائے گا زندہ اسکا جنوں
گرجے گی صدا، ناچے گی ہوا، ساگر میں جوار آ جائے گا — تھرائیں گے کوہ و دشت و دمن، دنیا پہ اندھیرا چھائے گا
ہے مجھ کو یقیں وہ آئے گا اندھیاری کالی راتوں میں — اور میرے لئے وہ روئے گا سب شہروں میں صحراؤں میں

کہنا کھوج میں تیرے وہ قسمت کی ماری بھاگ چلی
اندھیارے میں کچھ ایسی کھوئی پھر لوٹ کے واپس آنہ سکی!

★

بابائے اردو

(جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب)

سیّد فیضی

وقت گزرتا جاتا ہے اور اس کی راہوں میں بچھے ہوئے کچھ انمٹ نقوش ابھرا ابھر کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں، تیز رو آندھیاں ہوں کہ طوفانی ہواؤں کے جھکڑ، کوئی چیز بھی انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ امتدادِ زمانہ کی دستبرد سے بے نیاز وہ اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ اور یوں اُن کے عمل کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو زندگی اُسی کا نام ہے۔ کسی بڑے مقصد سے وابستہ رہ کر دن رات اس کے حصول کی کوشش میں رہنا انسانی عظمت کی دلیل ہی نہیں بلکہ ایک اصول کی تبلیغ ہے جو بیک وقت زندگی پرور بھی ہوا کرتا ہے اور زندگی آفریں بھی۔ اسی سے انسان کی سیرت تشکیل پاتی ہے اور وہ ایک عہد آفریں شخصیت بن کر زندگی کے بکھرے ہوئے گیسوؤں میں شانہ کشی کرتا ہے۔ بابائے اُردو کی شخصیت میں بھی یہی عناصر کار فرما رہے ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سر سیّد اور حالی کے بعد اگر کسی شخص نے زندگی کی صحیح قدروں کو ابھرنے کا اسلوب دیا ہے تو وہ صرف عبدالحق کی ذات تھی۔

کون جانتا تھا کہ ہاپوڑ (میرٹھ) میں پیدا ہونے والا یہ انسان ایک زندہ اصولِ زندگی بن کر صداقت کے شعور کو جگمگائیگا۔ ابھی اس ہونہار بروا نے زندگی کے انیسویں زینے پر ہی قدم رکھا تھا کہ سن ۱۸۸۰ء میں اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کے شوق نے ہاپوڑ کے اس جوہرِ قابل کو "مدرسۃ العلوم" علیگڈھ سے وابستہ کر دیا۔ یہاں سر سیّد کے فیضانِ صحبت اور شبلی و حالی کی نکھری نکھری تربیت سے اس کے جوہر چمک اٹھے۔ عبدالحق جس دامنِ تربیت کا پروردہ تھا، اُسی کے لمبے لمبے سایوں میں آگے بڑھتا گیا۔ وقت کی رفتار کو اُس نے بھی پہچانا، ابنائے زمانہ پر گہری نظریں ڈالیں، اِدھر اُدھر ماحول کا جائزہ لیا اور اپنے پیشروؤں کی طرح قوتِ عمل کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنے واسطے بھی ایک خاص دائرہ متعین کر لیا۔ اس دائرے میں رہتے ہوئے، انفرادی حیثیت سے اُس نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں، آج بڑی بڑی انجمنیں اور اجتماعی ادارے انہیں حیرت و استعجاب سے دیکھ رہے ہیں۔

"بابائے اردو" کا لفظ ہی آج ذہنوں میں وہ پیکر اُبھار دیتا ہے جس نے اپنی عمرِ عزیز تمام اُردو زبان کے بقا و تحفظ میں صرف کر دی، اپنے آپ کو مٹا کر اُردو کو حیاتِ جاوداں بخشی، ذاتی آرام و راحت سے منہ موڑ کر ایک اصولِ زندگی کی تبلیغ کی اور اس طرح "وفاداری بشرطِ استواری" کو اصلِ ایماں بنا کے چھوڑا۔ اُردو کے ساتھ اتنا قریبی رشتہ آج تک شاید ہی کسی کو حاصل ہو سکا ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ اس سے بڑھ کر جذبۂ ایثار اور شانِ استقامت کی کوئی اور مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ عبدالحق کی خدمات ہماری قومی تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان و ادب کبھی اس کے احسانات کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ستّر سال پہلے وہ جس تڑپ کو لے کر اٹھا تھا، آج وہ تڑپ اُس کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے اور اس پیرانہ سالی میں بھی انہماک کا یہ عالم کہ مجال نہیں جبینِ سعی و عمل پر شکن تک نمودار ہو۔

بابائے اُردو کے علمی و ادبی کارناموں سے کون واقف نہیں۔ اُردو کے محاذ پر تنِ تنہا لڑنے والا یہ مجاہد کہاں کہاں نہیں گرجا اور وہ کونسے آلام و شدائد تھے جن کے مقابلے میں سینہ سپر نہیں ہوا۔ پچھلی نصف صدی کے اوراق الٹ کر دیکھئے تو اُردو کے بازار میں آپ کو صرف عبدالحق کی آوازیں گونجتی ہوئی سنائی دیں گی۔ ادبی شعور کا میدان ہو کہ علمی جستجو کا، لسانی مہارت کا اکھاڑہ ہو کہ فنی آگہی کا، اُردو زبان کو ہر کروٹ دلانے میں

س کے بانیوں شامل رہے ہیں۔ اگر وہ ان گذشتہ پچاس سالوں میں
رُدو کو اپنے دامن میں پناہ نہ دیتا تو آج اُردو زبان ختم ہوجاتی اور
اس طرح ملت اسلامیہ کی تہذیب و ثقافت کا وہ نشان بھی کالعدم
ہوجاتا جسے ہمارے اسلاف نے خونِ جگر دے دے کر پروان چڑھایا
تھا۔ اُردو کا یہ عظیم محسن جہاں بھی رہا اور جس حیثیت میں بھی رہا، اُردو
زبان بالواسطہ یا بلاواسطہ اُس کی ذاتِ گرامی سے ضرور متعلق رہی
ہے۔ انجمن ترقیٔ اُردو سے تو اُس کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ ساتھ
آج کا نہیں ـــ پوری نصف صدی کا ساتھ ! ایک ایسے عہد کا ساتھ
جو ایک طرف ایّام سرسیّد کا نغمہ خواں ہے تو دوسری طرف عصرِ حاضر
کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ :

" انجمن ترقیٔ اُردو کی کہانی ـــ عزم و استقلال،
ہمّت و ہمدردی، اخلوص و ایثار کی کہانی ہے "

تو ہمیں اسے تسلیم کر لینے میں چون و چرا کی گنجائش نہیں کیونکہ ان تمام
فضائل کا بہترین آئینہ آج کی دنیا میں اگر کہیں مل سکتا ہے تو وہ
صرف بابائے اُردو کی ذات ہے جو انجمن ترقیٔ اُردو سے علیحدہ کوئی
دوسری چیز نہیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک مستقل ادارے کی حیثیت رکھتا
ہے کیونکہ اُس نے وقت کی آواز کو سمجھا ہے، اُس کے تقاضوں پر
غور کیا ہے اور پھر اپنا ایک مقصد قرار دے کر زندگی کو اُس کے
حصول کی خاطر وقف کر ڈالا ہے۔ آج اُسے طوفانوں سے کھیلتے
ہوئے نوّے سال گذر چکے ہیں لیکن شاہراہِ حیات کا یہ طویل سفر
بھی اس کی ہمتوں میں لچک نہ پیدا کر سکا۔ آج بھی وہ اسی طرح
جواں عزم و جواں کار رہے اور اس کی زندگی و شخصیت کے مختلف
پہلو بھی اسی جواں عزمی و جواں کاری سے ترکیب پائے ہوئے
ہیں۔ ایک طرف اس کا علمی تبحر ہے جس سے انداز و بیان کی
نزاکتیں ٹپکتی ہیں تو دوسری جانب طبعیت کی لطافت ہے
جو مزاح کا رنگ لئے اس کی تحریر و تقریر سے نمایاں ہوتی رہتی
ہے۔ زندگی کے انہی روشن پہلوؤں سے کردار کا پتہ چلتا ہے، نجی
زندگی کا اندازہ ہوتا ہے اور انسان کی اس جبلّت کا راز کھلتا ہے
جو اُسے عظمت کی منزلوں تک لے جاتی ہے۔ بابائے اردو کی زندگی کو
بھی اگر اُس کے علمی و ادبی کارناموں سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے
تو پھر بھی اُس کی ذات میں وہ صفات یکجا دکھائی دیں گی جن کی
وجہ سے وہ عام انسانی سطح سے بلندی پر ہی نظر آئے گا۔ اس کی وجہ
ساز گار ماحول ہے جس میں اس کی نشوونما ہوئی۔ یہ ماحول زندگی
کی قدروں سے شناسا اور انسانیت کے صحیح مفہوم سے واقف ماحول تھا۔

بابائے اُردو کی ذات میں بھی وہی انفرادیت نظر آتی ہے
جو اُس کی علمی خدمات سے مترشح ہے بلند ہمتی اور سعیٔ پیہم سے
خود بخود ایک ایسا کردار تشکیل پا جاتا ہے جس کی خوبیوں کو جھٹلایا نہیں
جا سکتا۔ بابائے اُردو کا کردار اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے کہیں جمالی
صورت میں بزم آرائیاں کرتا دکھائی دیتا ہے اور کہیں جلالی شان
سے ہنگامہ خیزیوں کا مرکز بنا ہوا نظر آتا ہے۔ دوستوں میں ریشم کی
طرح نرم اور مخالفوں کے حق میں سنگِ گراں ! بابائے اُردو کی یہ دو
ایسی خصوصیتیں ہیں جو اس کی ساری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے
ہیں۔ گھریلو صحبتوں میں گفتگو کا یہ بہاریں انداز کہ مُنہ سے پھول جھڑتے
ہوئے محسوس ہوں۔ فطرت اتنی لچکدار کہ شفقتوں کے بوجھ سے ہر سانچے
میں ڈھل جائے۔ بوڑھوں میں بوڑھا ! جوانوں میں جوان ! بچّوں
میں بچّہ ! اور انہی کے فہم و طبیعت کے مطابق گفتگو کر کے اپنا
ہم خیال بنا لینا ـــ بابائے اُردو کا کمال نہیں تو اور کیا ہے۔ انسان
دوستی کا یہ جذبہ تھا جو بہرحال مقدّم رہا اور ظاہر ہے کہ یہ جذبہ اُس وقت
تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک انسان کا اپنا اخلاقی نظریہ معیاری
نہ ہو۔ بابائے اردو کے منجھے ہوئے اخلاق ایک خاص وسعت لئے
ہوئے ہیں اور انہی میں اس کی صاف گوئی اور خودداری کو بھی
بہت دخل ہے۔

بابائے اُردو نے ٹھوکریں کھا کھا کر اپنی زندگی میں جو
تجربات حاصل کئے، وہ آج پوری طرح سے اعتماد و یقین کے سانچے
میں ڈھل چکے ہیں۔ انہیں ٹھیس پہنچانا بابائے اُردو کو ٹھیس
پہنچانے کے مترادف ہے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ان تجربات
کی توہین ہوئی یا اعتماد و یقین پر کوئی حرف آیا تو اس کی بوڑھی
رگوں میں تیزابی جلن اور سیمابی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے، بھویں تن
جاتی ہیں اور قوّتِ جلال کا یہ پیکر شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھتا
ہے۔ لیکن ایسے حادثات اُس کی زندگی میں بہت کم آتے ہیں اور
عام طور پر زندہ دلی اور ظرافت ہی ان کی فطرت کے مظاہر ہیں تحریر
ہو یا تکلم، ان کی زیرِ لب مسکراہٹیں ہر رنگ میں جامہ زیب

بابائے اردو

''وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاع آفتا

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تمام زندگی ارد
زبان و ادب کی گرانمایہ خدمات کے لئے وقف
رہی ہے جس کے اعتراف میں قوم اس سال ان
۹۰ سالہ جوبلی منا رہی ہے
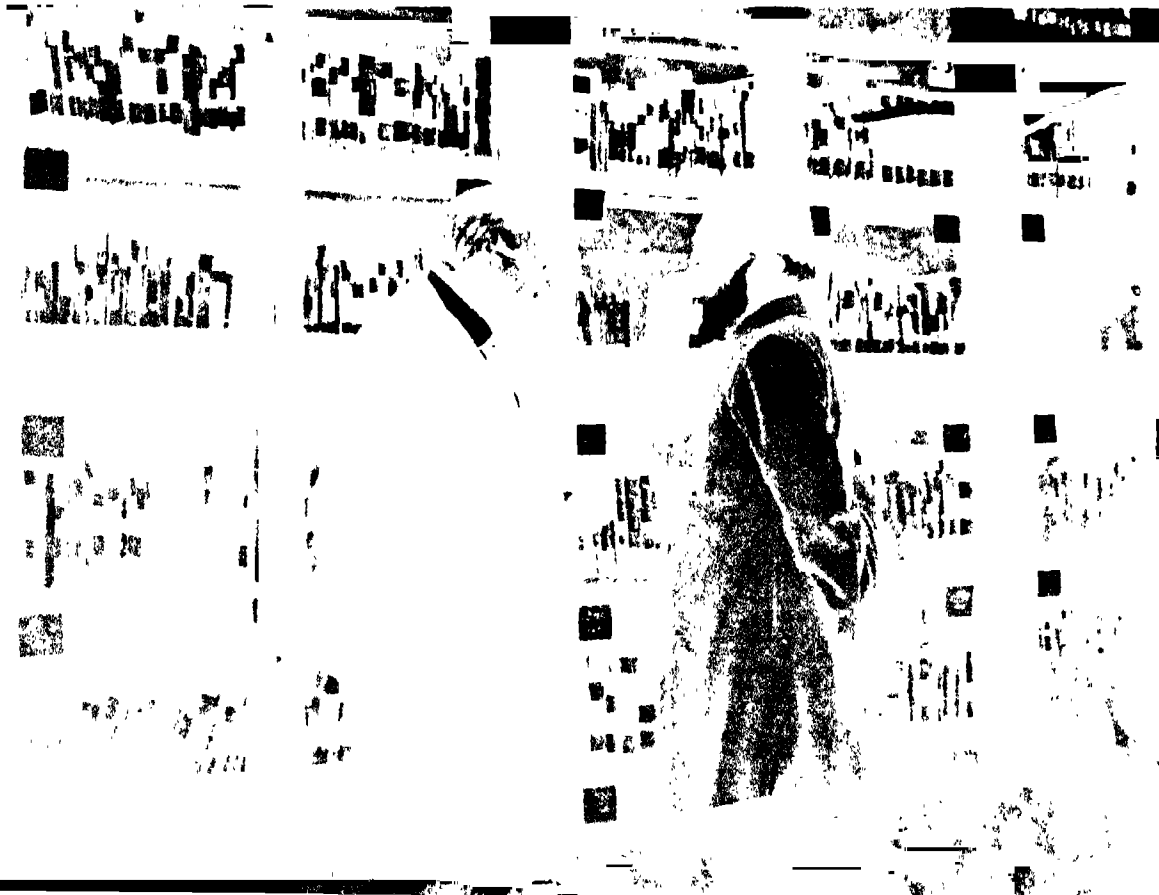
ہ گاہ میں
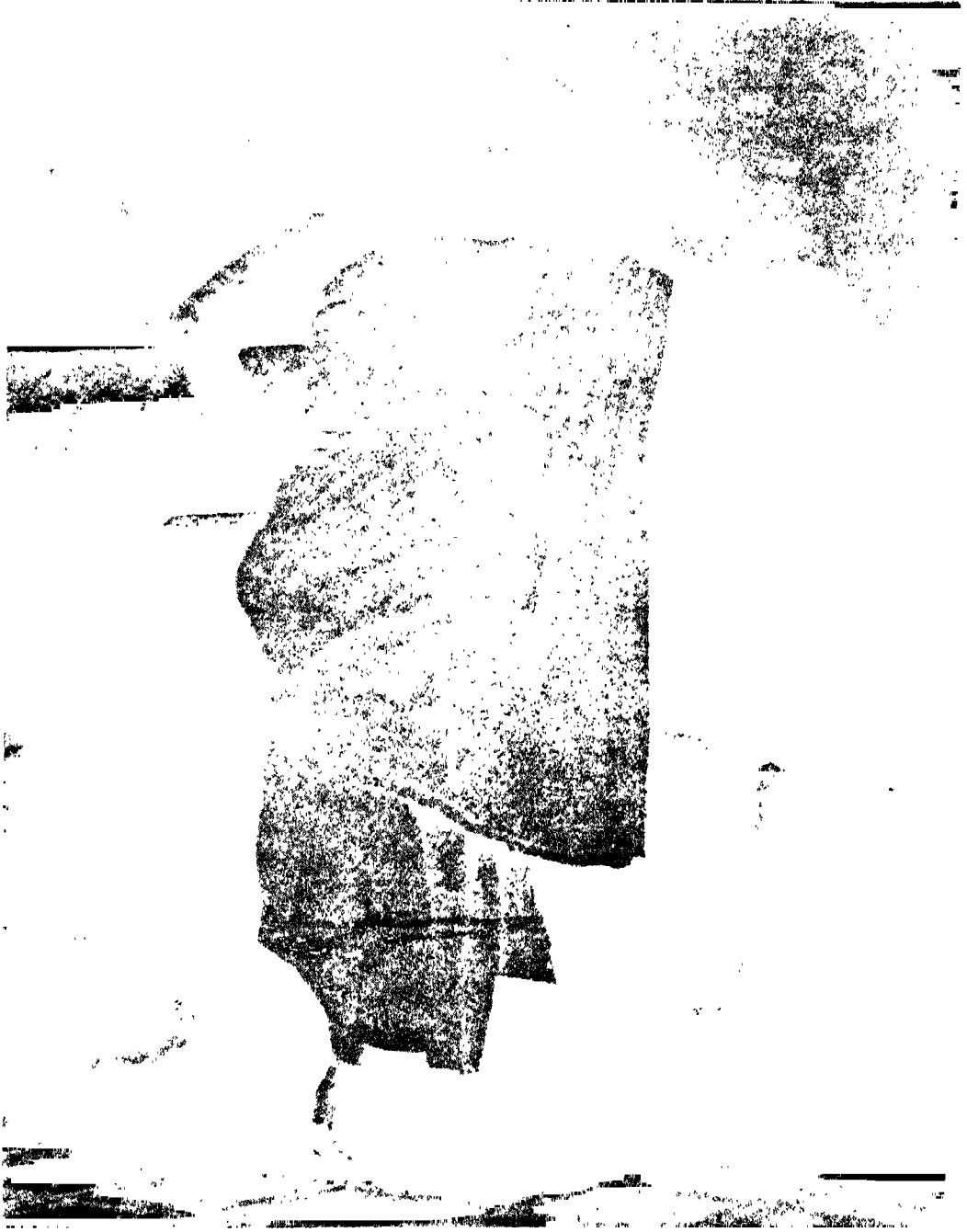
قاضی نذرالاسلام

(جس کی آتشیں شخصیت انقلاب و اخوت اسلامی کی مستقل دعوت ہے)

نظر آتی ہیں۔ الہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں کے دو پروفیسر صاحبان
پاس بیٹھے اپنی اپنی یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اُردو کے گن گا رہے
تھے کہ بابائے اُردو نے مسکراتے ہوئے فیصلہ کر دیا:

"الہ آباد یونیورسٹی اردو کا قبرستان ہے اور
لکھنؤ اس کا امام باڑہ۔"

اسی طرح انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں کسی کو مخاطب کرتے
ہوئے کہتے ہیں:

"میں نے لڑکپن میں حمایتِ اسلام کا بچپن دیکھا
تھا اور اب بڑھاپے میں اس کی جوانی کی بہاریں
دیکھ رہا ہوں۔ میں جوں جوں بڑھتا ہوں بوڑھا
ہوتا جاتا ہوں۔ یہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہے
جوان ہوتی جاتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ ظرافت کا یہ انداز کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ بابائے
اُردو کے لہجے میں رچا بسا ہوا معلوم ہوتا ہے ـــ لیکن یہ سب کچھ
اس بڑے جذبے کے تحت پرورش پاتا ہے جو اس کی زندگی کا
حقیقی نصب العین ہے اور اسی کی لگن اسے عظیم سے عظیم تر بنائے
جا رہی ہے۔ آج بھی اُردو اس کی ذات کا مسئلہ بنا ہوا ہے مقصد
کی یہی دُھن، مستقل مزاجی اور امید کی شمع لئے مایوسی کے
اندھیروں کو دور کرتے رہنا، اُس کے نزدیک زندگی کی دلیل ہے۔
چنانچہ اسی نظریئے کو واضح کرتے ہوئے ایک خطبے میں طلباء سے
یوں مخاطب ہے:

"میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ
جوان رہیں۔ میری طرح بوڑھے نہ ہوں۔ اس دعا
کو کوئی معمولی یا ناممکن بات نہ سمجھیں، ہمیشہ
جوان رہنا ممکن ہے۔ بے شک جوانی لوٹ کر
نہیں آتی لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی قائم رکھنے
کے لئے کوئی بلند مقصد ہونا چاہیئے۔ مقصد سے
زندگی بنتی ہے، بڑھتی ہے اور قائم بھی رہتی ہے۔
ـــ جوانی کوئی چوڑے چکلے سینہ، کسے ہوئے ڈنڈ
اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڑھاپا
سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں آتا۔ جوانی
ہمت و عزم سے ہوتی ہے۔ جوان وہ ہے جس
کا عزم جوان ہو۔ میں اپنی جوانی پھر واپس
لاؤں گا اور اس وقت تک نہ مروں گا جب تک
اردو یونیورسٹی نہ قائم کر لوں گا۔"

یہ ہے بابائے اردو کی وہ مجاہدانہ شان جس نے اُردو
زبان کو علمی و فکری حیثیت سے رواج دے کر ایک نئے دور کا آغاز
کیا۔ اُردو سے محبت اس کے لئے مذہبی عقیدہ بن چکی ہے اور شاید
اسی لئے اس کی آواز میں گونج بھی ہے اور گرج بھی۔ یہ اس کی
راسخ الاعتقادی کا ایک اور ثبوت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ
اپنے عزائم میں کامیابیوں سے دوچار نہ ہو ؎

زمانہ جب بھی لکھے گا زبان کی تاریخ
ترا خلوص، ترا نام جگمگائے گا

شعلہ و شبنم کا امتزاج ایک اتفاق ہے۔ اس لئے یہ
بہت نادر بھی ہے۔ کہاں شبنم کی روایتی خنک سرشتی اور کہاں شعلہ کی آتش
منشی لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شبنم سے شرارے پھوٹ نکلیں
اور پھلجھڑیوں کا سماں پیدا کر دیں۔ بابائے اُردو کو مبدء فیاض
سے کچھ ایسی ہی طبیعت عطا ہوئی ہے جو بیک وقت سرد بھی ہے
اور گرم بھی، سنجیدہ بھی ہے اور شوخ بھی۔ ثقہ بھی ہے اور باغ و
بہار بھی۔ سرسید کا معاصر، ان کا مداح، ان کا پیرو، ان کی یادگار،
ان کا ہم مزاج بھی ہے۔ وہی شان اعتبار، وہی زندہ دلی، وہی
متانت، وہی بذلہ سنجی، وہی سلیم الطبعی، وہی چلبلاپن۔ اس
لئے جونہی کوئی واقعہ اس کی طبیعت کو گرما دیتا ہے تو وہ
اپنی سنجیدگی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے۔ اور اپنی طبیعت کے وہ
جوہر آشکار کرتا ہے۔ جنہیں ہم براقی، چونچال پن اور شوخی
سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے تیور آناً فاناً بدل جاتے ہیں جیسے
وہ کوئی اور ہی انسان ہو۔ نہایت شوخ اور صاحبِ ذوق۔
اس کے دل و دماغ کی ایک ایک رگ تپ اٹھتی ہے، چمک
اٹھتی ہے۔ اور عجیب ہی تیز کو دیتی ہے۔ جذبات کی شدت
جیسے اس کی طبیعت میں شعلے ہی شعلے، بجلیاں ہی بجلیاں
بھر دیتی ہے۔ اور اس سے پے در پے کوندے ہی کوندے
لپکنے لگ جاتے ہیں۔ اور پھر اس تڑپ، اس والہیت، اس

شوریدگی، اس ہیجان، اس تلاطم جذبات سے ان کے الفاظ بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ جیسے ان کے دل و دماغ کے ساتھ ان کے نطق کو بھی آگ لگ گئی ہو۔ اس میں ایک شدید تیکھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ اُس پیغامبر کی طرح جو ویسے تو معتدل اور بردبار ہو۔ لیکن جب کوئی بات اس کے قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے تو پھر اس کا نطق تمام تر نطقِ آتشیں بن جاتا ہے۔ ان کی زبان ایک کٹیلی زبان بن جاتی ہے اور ان کے الفاظ نشتر، ہی نشتر جو خود بخود دل میں فرو ہو جاتے ہیں۔ ایسی بے تاب کیفیت درحقیقت انتہائی شدتِ احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان کے تمام وجود کو شعلہ زن کر دیتی ہے۔ یہیں سے ظرف کی بلندی و پستی کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ اگر طبیعت سلیم ہو تو اس سے ایک صحت مند قسم کا جلال پیدا ہوتا ہے۔ ایک بلند قسم کا غضبناک مگر شگفتہ مزاج۔ طبیعت ذرا بھی سبک ہو تو اس کا نتیجہ تضحیک، تمسخر اور چڑچڑے پن کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

بابائے اردو کی طبع بلند کو ہمیشہ بلند محرکات ہی اشتعال دیتے ہیں۔ اور ان کی حسن ظرافت ہمیشہ اسی مخصوص براقی ہی میں نمود پاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عوالم میں ان کے قوائے فکر و بیان پوری شدت سے کام کرتے ہیں۔ جس سے ان کی تحریر میں بھی غیر معمولی اٹھان پیدا ہو جاتی ہے۔ عام لمحات میں بھی ان کی طبعی شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ ایک ظرافت وہ ہے جو کسی ذکا ہی موضوع کے سلسلہ میں برملا ظاہر ہوتی ہے یا دانستہ ظاہر کی جاتی ہے۔ اور دوسری وہ جو فطری خوش طبعی کے باعث آپ ہی آپ ایک لطیف بذلہ سنجی کی شکل میں جھلکتی ہے۔ وہی جسے جوش نے ایک جگہ "طبیعت کا چہکا" قرار دیا ہے۔ بابائے اردو کے یہاں یہ طبیعت کی لہر اور لطف بیان کی جھلک کہیں نظر آتی ہے۔ اور بہت ہی کم ذوق شخص ہوگا جو اس سے محظوظ نہ ہو۔ اس سے اچھی، دلنشیں اور چہکتی بولتی تحریر کی ایک اچھی روایت ہاتھ آجاتی ہے۔ ایک دو جملے ملاحظہ ہوں:

"میں نے ... اپنے زمانے میں بڑے بڑے سقراط اور افلاطون بھی دیکھے ہیں۔ میٹھی زبان کے افلاطون، ڈنڈے مارنے والے افلاطون"۔

"اس (بنیادی جمہوریتوں کے) سلسلے میں ہمیں انگریزی پارلیمنٹ کی مثال ضرور یاد آئے گی لیکن تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ انگریز قوم ووٹ دیتی ہوئی پیدا نہیں ہوئی تھی"۔

اس بذلہ سنجی کا ایک بہت ہی شگفتہ نمونہ اُس چھوٹے سے مضمون میں نظر آتا ہے جو عرصہ ہوا "ماہِ نو[1]" میں "زعفران، ایک سچی حکایت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ خالص ذوق کی بات ہے۔ دل زندہ کی علامت۔ جو تحریر میں ایک خاص چٹخارہ پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ساری تحریر سپاٹ ہو کر رہ جائے۔ جہاں طبیعت میں سنجیدگی کا غلبہ ہوا تحریر کا مزا کرکرا ہوا۔ کیونکہ سنجیدگی اور کرارے پن میں منافات ہے۔ بابائے اردو کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے سادگی کو کرارے پن سے آمیز کیا ہے اس لئے جب وہ اُن غیر معمولی لمحات میں نہیں ہوتے۔ جو کسی ہیجان کے ساتھ آتے ہیں تو ان کی تحریر ایک منجھی ہوئی صاف ستھری نکھری وضع اختیار کر لیتی ہے جس میں شوخی بیان یا زیب داستان کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بڑی صفائی اور بے تکلفی سے کہتے ہیں۔ زباں آوری کی خواہش کہیں بھی لفاظی کی طرف نہیں لے جاتی۔ جیسے انہیں اس کا نہ علم ہو نہ احساس۔ ان کے اسلوب بیان کی امتیازی خصوصیت انتہائی بے ساختگی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کے فکر اور بیان میں کوئی فاصلہ نہیں، نہ ان میں فاصلہ پیدا ہونا ممکن ہے اور نہ وہ اُس کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ خیال خود بہ خود بے کم و کاست عبارت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ بہت کم ادیب ایسے ہیں جنہیں کبھی یہ شوق نہ ہو کہ وہ نمود، شوخی، طمطراق، مبالغہ یا شاعری سے کام نہ لیں، وہ کوئی عالمانہ یا رعب انگیز لفظ یا ترکیب نہ برتیں جس سے ان کا احساس برتری تسکین پائے لیکن بابائے اردو پر یہ خواہش کبھی غلبہ نہیں پاتی۔ انہیں اپنے آپ پر قابو ہے نہ ان میں گھنڈیں ہیں نہ کسمساہٹیں نہ الجھنیں۔ ان کے لئے جیسے بیان میں افراط و تفریط کا مسئلہ وجود ہی نہیں رکھتا ان کی متوازن طبیعت اور ہمواریٔ بیان میں پہلے ہی سے ایک

---

[1] بابت جولائی ۱۹۶۲ء

باقی صفحہ ۵۶ پر

میں انہیں نہیں جانتا تھا

(پطرس کی یک رخی تصویر)

ابوسعید قریشی

"نیرنگ خیال" یا "کارواں" میں مضمون چھپا اور دھوم مچ گئی! گورنمنٹ کالج میں لطیفہ ہوا۔ اور درسی کتابوں کی طرح چل نکلا!

نیازمندان پنجاب نے زہر خند کیا۔ اور "اہل زبان" کی محفلوں میں کہرام مچ گیا!

براڈکاسٹنگ ہاؤس (دلی) کے "آئیوری ٹاور" میں انگریزی کی ایک نئی کتاب پر تبصرے کا ایک جملہ اور اسمبلی چیمبرز زعفران زار بن گئے!

اقوام متحدہ میں ایک تقریر، اور انگریزی زبان کے بڑے بڑے مقرر دم بخود رہ گئے!

سٹیونسن اور گالزوردی کا ترجمہ، عصمت چغتائی کے فن کا جائزہ، ن۔م راشد کے نام خط.... اور مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ... یہ سب پطرس کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں انہیں نہیں جانتا تھا!

شاید اس لئے کہ میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم نہیں تھا، شاید اس لئے کہ وہ مجھ سے عمر میں بیس برس بڑے تھے، شاید اس لئے کہ آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام اسسٹنٹ اور ڈائرکٹر جنرل میں پہلی اور آخری سیڑھی کا فاصلہ تھا، شاید اس لئے کہ ان سے پہلے انٹرویو کے دوران انہیں اپنا سوال دہرانا پڑا، شاید اس لئے اُن کے چہرے پر کبھی تبحر آمیز تکبر اور کبھی شفقت آمیز تمسخر نظر آتا تھا ــــ اغلباً اس لئے کہ میں بھی خود کو اُن سے کم پائے کا ادیب نہیں سمجھتا تھا۔[1]

پطرس کی شخصیت کے بیسوں رُخ ہیں۔ کبھی شفیق اور ہر دلعزیز اُستاد، شاگرد جس کی پرستش کرتے ہیں۔ کبھی محفل آرا، بذلہ سنج، یادوں کے مضامین کا ہیرو ــــ مدبر، سیاستداں، افسر، فن کار، زباں داں، خوش گفتار.... ایکٹر، پروڈیوسر، ذوقِ سلیم کا مجسمہ، سخن فہم اور سخن گو، بہ یک وقت احباب کا عاشق اور معشوق ع

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ مے!

زندگی کا رسیا اور موت سے متوحش....

پردہ اٹھتا ہے اور پردہ گرتا ہے۔ تالیاں پٹتی ہیں۔ پردہ پھر اٹھتا ہے۔ اور ہر بار وہ ایک نئے میک اپ میں اسٹیج پر آتے ہیں۔ تماشائی اُن کا اصلی چہرہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ لیکن گرین روم میں اُن کا میک اَپ بدستور جاری ہے۔ اُنہیں ہر پارٹ ادا کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ اُن کا آخری پارٹ اقوامِ متحدہ کے اسٹیج پر نظر آتا ہے۔ اور تماشائی حسبِ معمول، تھوڑی دیر کو یہی سمجھ لیتے ہیں۔ کہ ان کا اصل کردار یہی تو تھا۔ یہی ہونا چاہئے! ــــ لیکن اب کے جو تالیاں گونجتی ہیں تو پردہ نہیں اٹھتا! کیا ہوا؟ شاید کسی نئے کردار کی تیاری ہے؟ لیکن فن کار گرین روم میں بے حس و حرکت پڑا ہے اور اُس کے پاس چہروں کا ایک انبار لگا ہے۔ تالیاں پھر گونجتی ہیں کہ یہ بھی کوئی نیا بہروپ ہے۔ لیکن زندگی کا رسیا موت سے ہار چکا ہے۔ اور اس کے کمالات کا اعتراف رسائل کے خاص شماروں، سیاہ حاشیوں، تعزیتی پیغامات، یادوں اور "میں انہیں جانتا تھا" کے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور حسب دستور اُس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے اک ایک حرف، ایک ایک تحریر، ایک ایک خط کو یکجا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔

ان ملفوظات کی بھی وہی کیفیت ہے۔ ہر جملہ ایک نئی اور

---

[1] مگر آپ کو روشناسِ خلق کون کرے، اور یک رخی تصویر یا سلہوٹ کون پیش کرے! ویسے شرفِ تلمذ کی بنا پر مرحوم کی خاکہ کشی کا حق میرا تھا جو آپ نے چھین لیا ہے ــــ خاور

[illegible] شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔ ہر بار ایک نیا چہرہ! لیکن نقاب میں کہیں کہیں کوئی دھاگہ چھوٹ بھی گیا ہے۔ اور اُس کے پیچھے اصل چہرے کی جو جھلک نظر آتی ہے اس کو اس صد رنگ اداکار کی احتیاط بھی نہیں چھپا سکتی۔

دانش گاہِ پنجاب کا پروفیسر، براڈ کاسٹنگ کا اے۔ ایس۔ بی، اور ادب کا پطرس، احباب کے لئے صرف بخاری ہے۔ احمد شاہ بھی نہیں۔ شاید یہ بھی ایک نقاب ہے۔ لیکن نہایت ہی باریک جس کے پیچھے مصنف اور مکتوب نگار کے اصلی خد و خال جھلملا رہے ہیں۔ وضع احتیاط سے جن پر گھٹن کے آثار ہیں، درد و کرب ہے، بے چینی ہے اور تنہائی۔

"وارفتگیٔ جذبات" کے تحت ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جس کو تنہائی اور بڑھا دیتی ہے۔۔۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا مجھے برہم کر دیتا ہے"۔ بظاہر یہ انتشار لطیف ہے۔ اور ۱۹۲۱ء یعنی زمانۂ شباب کی تحریر ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ بخاری صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جو تنہائی ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں، خاص طور پر اُن کے خطوط میں ایک چینی خانہ ٹوٹا ہوا ملتا ہے۔ وہ پشاور کے رہنے والے تھے جہاں چینی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کو جوڑنے کا عام رواج ہے۔ پشاور کے کسی قہوہ خانے میں چلے جایئے۔ ایک ایک چائے دانی میں سو سو پیوند نظر آئیں گے۔ بخاری صاحب کی شخصیت کا یہ خاکہ بھی کچھ ایسے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ وہ ایک ایسا کوزہ ہے جس سے کبھی شراب ٹپکتی ہے اور کبھی آنسو[1]

"میرا نام بخاری ہے" کے عنوان سے بی۔ اے ہاشمی صاحب لکھتے ہیں "۔۔۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی زندگی کو تمثیل کاری بنا لے۔ مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ زندگی کا وہی رُخ پیش کیا جائے جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی کا باعث ہو۔ بخاری صاحب کی زندگی کا فلسفہ اور شیوہ بھی یہی تھا۔ لیکن ان کے نیازمندوں میں دو تین شخص ایسے بھی تھے جن کے سامنے وہ دکھ سے رو دیئے ہوں۔ شاذ و نادر ہی سہی لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ چہکنے والا بخاری اپنے کسی نیازمند کے پاس آدھ آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھا رہا ہے"۔

بخاری صاحب کے خطوط بھی ایسے ہی خاموش آنسو ہیں جو ان کی تمام تر احتیاط کے باوجود پلکوں کے پیچھے چمک رہے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہونٹ اس لئے مسکراتے ہیں کہ دیکھنے والے کی توجہ آنکھوں سے ہٹ جائے۔ بخاری صاحب کی ہنسی بھی کچھ ایسی ہی ہنسی ہے۔ ان کی فن کارانہ صلاحیتوں نے انہیں یہ ملکہ عطا کیا تھا کہ ہنستے ہونٹوں کے ساتھ روتی آنکھیں[1] بھی ہنستی نظر آتیں۔ اور ہنسی اور بھی جاذب توجہ بن جاتی۔ جذبات کا یہ روپ بہروپ کچھ انہیں کا حصہ تھا۔ ان آنسوؤں کے سوتے کہاں تھے؟ بخاری صاحب کے نیازمند اس باب میں کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ وہ لمحے جب بخاری صاحب آدھ آدھ گھنٹہ خاموش نظر آتے ہیں یا رو دیتے ہیں، اُن کی تفصیل ہاشمی صاحب یوں ٹال گئے ہیں

محبت کے فسانے دیدہ و دل کی امانت ہیں
خیانت ہے زباں کو محرم اسرار کر لینا

"ہمیشہ چہکنے والے" بخاری صاحب کی یہ کہانی سننے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اس سے اُن کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ان کے نیازمند اس راز کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ لہٰذا اصرار لاحاصل ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ بخاری صاحب کی تنہائی چھپائے نہیں چھپتی۔

کیمبرج سے ایک خط میں لکھتے ہیں "۔۔۔۔ کیمبرج میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ جیسے کسی گھڑی ساز کی دکان میں سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں۔ اس بھونچال میں مَیں بھی دھیمے دھیمے چلا جا رہا تھا۔۔۔ اور دل پر ایک اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ یہ دنیا ہی نرالی ہے اور میں بے یار و مددگار۔ نہ ہم سخن نہ ہم خیال۔ گھر سے خط آتا ہے تو اپنی تنہائی کو اور بھی محسوس کرنے لگتا ہوں"۔ یہاں بخاری صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

ابھی قائم ہے محفل عاشقانِ محفل آرا کی
کہ اُن کی خانماں بربادیاں رونق ہیں صحرا کی

یہ "محفل آرا" بخاری نہیں تو کون تھے۔ اور یہ اُن کے دوست ہی بتا سکتے ہیں کہ خانماں بربادیوں کا تذکرہ محض روایتی شاعری ہے یا کچھ اور بھی۔ لیکن بات رہی جا رہی ہے۔ یہ ماننے میں نہیں آ سکتا کہ محض کیمبرج کی "نرالی دنیا" یا پھر بخاری صاحب کی "غریبت"

[1] دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے — دعویٰ جمعیت احباب جائے خندہ ہے
غالب

[1] شاید اسی لئے کسی نے فکاہ نگار (HUMOURIST) کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کے ہونٹ مسکراتے ہیں مگر آنکھ روتی ہے! مدیر

اس تنہائی کا باعث تھی۔ بخاری صاحب جیسے باخبر شخص پر اس
بے خبری کا اطلاق کر کیمبرج آنے سے پہلے انہیں کیمبرج کی نرالی دنیا
کا کچھ علم نہیں تھا کہ چھٹی کے دن وہاں ہُو کا عالم ہوتا ہے اور پھر
یکایک زلزلہ آجاتا ہے۔ اس قسم کی بے خبری اُن کی ذات پر بہتان
ہوگا۔ دراصل یہ وہی تنہائی ہے جس کا ہاشمی صاحب نے ذکر کیا ہے
یہ 'اداسی' وہی اداسی ہے۔ جانے وہ کون سے "ہم سخن" اور کس
"ہم زباں" کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ گھر سے خط آنے پر انہیں اپنی
تنہائی کا احساس اور بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ جانے گھر سے
اُن کی کیا مراد ہے؟ اور گھر کے ساتھ ان کی کون سی آرزوئیں، کون سی
حسرتیں وابستہ ہیں؟ اسی خط میں لکھتے ہیں "بعض لیکچروں میں تو یہ
کیفیت تھی کہ ہمہ تن گوش ہوں۔ لیکن وقت گزر جاتا ہے اور دماغ
کسی چیز پر قابو نہیں پاتا۔ خیالات میں ایک گونج سی ہے جس میں کچھ
معنی نہیں ڈال سکتا۔" اُن کی ساری زندگی ایک ایسی گونج تھی جس میں
معنی ڈالنے کی وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ اُن کے دل میں کیا کیا سودے
تھے۔ لیکن ان کی بے چین طبیعت نے اُنہیں کبھی ایک جگہ جم کر نہ
بیٹھنے دیا۔ اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لئے وہ آج ایک کام میں مگن
نظر آتے تو کل دوسرے میں، جیسے زندگی کا کوئی واضح مقصد اُن
کے سامنے نہیں تھا۔ اگر وہ تصنیف و تالیف کے اُن منصوبوں کو
عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوجاتے، جو اُن کے ذہن میں
تھے تو اُردو ادب کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ اور اس "اگر" کے ہزار
اشارے اُن کے خطوں میں ملتے ہیں۔ مگر اُن کی حقیقت محض
جذباتی لمحوں کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور ہر بار وہ نقاب نظروں کے
سامنے آجاتا ہے۔ "چہکنے والا بخاری" جو زندگی کا وہی رخ پیش کرنا
چاہتا ہے (بقول ہاشمی صاحب) جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی
کا باعث ہو۔ اور اس مسلک میں بھی "اپنی بالیدگی" کا مقصد زیادہ
نمایاں نظر آتا ہے۔

لیکن نقاب بہرحال نقاب ہی ہوتا ہے۔ اور اُس کا ابھرا
ہوا تار چھپائے نہیں چھپتا۔ زبان و بیان کے مسئلوں سے انہیں
خاص دلچسپی تھی۔ اور پنجابی لوک شاعری کے خلوص سے وہ بے حد
متاثر تھے۔ اپنے ایک خط میں پنجابی ابیات کا مزہ لے رہے ہیں لیکن
ایک شعر پہ رُک جاتے ہیں۔ ایک لفظ کا مطلب پوچھتے ہیں۔ "نج"
معلوم نہیں کہ سالک صاحب نے اِس کا کیا جواب دیا۔ جہاں
تک میں سمجھتا ہوں "نج" بہانے کو کہتے ہیں۔ شعر یوں ہے:

اَگ بال کے دھوئیں دے نج روواں
لُکاواں دُکھ سجناں دے

("آگ جلا کر دھوئیں کے بہانے روتی ہوں اور یوں اپنے
ساجنوں کے دکھ چھپاتی ہوں۔")

بخاری صاحب آگ جلا کر، بلکہ جلتی آگ کو دیکھ کر روشنی
کے بہانے ہنس رہے ہیں۔ وہ کون سی آگ ہے، وہ کون سجن
ہیں وہ کون سے دکھ ہیں جنہیں وہ چھپانا چاہتے ہیں، یہ اُن
کے احباب ہی بتا سکتے ہیں۔

بخاری صاحب کی سب سے مانوس تصویر "مضامین پطرس"[1]
کے سرورق پر چھپی تھی۔ ایک یک رخی سلہوٹ۔ آج وہ تصویر اُن
چہروں کی طرح نظر آتی ہے جو کاغذ اور گتے کے بنے ہوتے ہیں
اور جنہیں MASQUERADE قسم کی تمثیل کاری یا "چھاکیوں"
(سوانگ) میں پہنا جاتا ہے۔ یہ یک رخی تصویر جہاں اُن کی
انفرادیت اور جدت پسندی کا پتہ دیتی ہے وہاں اُن کی تنہائی کا
بھی احساس دلاتی ہے۔ سفید کاغذ پر ایک سیاہ خاکہ جس کے
نقوش غائب ہیں!۔ اپنے جذبات کو، اپنی تنہائی کو اور اپنے
اصل چہرے کے چھپانے کا انہیں خاص سلیقہ تھا۔ اُن کی گردن
پر آپریشن کا نشان تھا۔ اور اُن کی وہ تصویریں بھی جو "یک رخی"
نہیں ہیں۔ اسی سلیقے کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں اکثر تصویریں
ایسی ہیں کہ ہاتھ گال پر ہے۔ غالباً اُس نشان کو چھپانے کے لئے۔
نہ جانے اپنی ظرافت سے وہ کون سا گھاؤ چھپا رہے تھے!

ظرافت بھی اُن کا ایک چہرہ ہے، تمثیل کاری ہے۔ اس
ضمن میں مار ملیچین نے لکھا ہے کہ "ہمہ دم مسکراتی اور پُر مذاق
شخصیت کے پس پردہ وہ ایک سنجیدہ بخاری بھی تھے۔ وہ مزاح
کی نقاب اتار کر، ضرورت کے وقت انتہائی سنجیدہ بات کرسکتے
تھے اور کرتے تھے۔ مزاح کی نقاب تحفظ کے طور پر اکثر و بیشتر
ڈالے رہتے تھے۔" مار ملیچین نے اگر بخاری صاحب کے خط

---

[1] نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا!

پڑھے ہوتے، بلکہ ان خطوط کی بین السطور تحریر پڑھی ہوتی تو یوں لگتا ہوتا کہ وہ اپنے المیہ چہرے پر ظرافت کا نقاب ڈالے رہتے تھے۔

یوسف ظفر سے روایت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بخاری صاحب کی ایک محفل خاص میں میں بھی شریک تھا۔ محفل رات گئے تک رہی۔ واپسی پر بخاری صاحب نے کہا کہ جن کے پاس سواری کا انتظام نہیں انہیں میں گھر تک چھوڑ آؤں گا۔ آخر میری باری آگئی۔ میں بخاری صاحب کے ساتھ سامنے کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کار بہاولپور روڈ پر جا رہی تھی اور سڑک سنسان تھی۔ معاً میں نے کہا اگر اجازت ہو تو ایک ذاتی بات پوچھوں؟ جواب ملا ہاں! ہاں! میں نے کہا آپ کے دل کی گہرائیوں میں ایسا کونسا گھاؤ ہے۔ جسے آپ مزاح و ظرافت میں چھپانا چاہتے ہیں! یہ سن کر سٹیرنگ وھیل پر ان کا ہاتھ کانپا اور کار ڈول سی گئی۔ جیسے راستے میں کوئی رکاوٹ آگئی تھی۔ حالانکہ سڑک صاف تھی۔ لیکن ایک کہنہ مشق اداکار کی طرح وہ فوراً سنبھل گئے اور کہا تم بہت شریر ہو۔ کسی کے اندر اتنا گھسنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ اُن کی آواز میں درد بھی تھا، گلہ بھی، سرزنش بھی۔

یہ زخم شاید تنہائی کا زخم ہے۔ جس کو دور کرنے کے لئے وہ محفلیں برپا کرتے ہیں، دوستوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، اُن کی بے رخی کی شکایت کرتے ہیں۔ گلے ہیں، شکوے ہیں، حسرتیں ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ قہقہے بھی بلند کر رہے ہیں جیسے کوئی کسی عظیم الشان محل میں جس کے باشندے کب کے رخصت ہو چکے ہوں، اکیلا ہنس رہا ہو۔ اور اپنی تنہائی کے احساس کو دور کرنے کے لئے ہنستا ہی چلا جائے! اِن قہقہوں کی بازگشت سے ویرانی کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔ اور ان مکینوں کی یاد دلاتا ہے جن سے یہ دنیا آباد تھی یا آباد ہونی چاہئے تھی۔ اُن حالات کا، موت کا اور خوف کا احساس ہوتا ہے جو اس ایوان کو سونا کر گئے۔

بخاری صاحب کی تندرستی ہمیشہ ویسی ہی رہی۔ چودھری ظفر اللہ خاں لکھتے ہیں۔ "بخاری صاحب زندگی کے ابتدائی دور ہی سے صحت کی تشویشناک خرابی کا شکار ہو گئے تھے۔ اور عمر بھر یہ روگ پالتے رہے۔ جب وہ مسٹر فیلڈن کے ساتھ کام کر رہے تھے تو حسیاتی لحاظ سے بہت آزردہ اور شکستہ دل رہتے تھے۔ جب وہ مسٹر فیلڈن کی جگہ آل انڈیا ریڈیو کے (شروع میں کنٹرولر) ڈائرکٹر جنرل بنائے گئے تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس بات نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ اپنی تکلیف دہ بیماری کا مقابلہ کسی قدر اطمینان سے کر سکیں۔"

یعنی ایک تو جسمانی عارضہ، دوسرے نفسیاتی۔ اُن کے ایک روگ کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ کمال کی جستجو میں رہے۔ ثانوی یا 'دم کش' کی حیثیت انہیں منظور نہیں تھی۔ اپنی اہمیت، قابلیت اور صلاحیتوں کا انہیں بجا طور پر احساس تھا۔ اور کسی بھی اعلیٰ درجے کے تمثیل کار کی طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ سب کی نظریں مجھ ہی پر ہوں۔ تماشائیوں میں اگر کسی کو اونگھ آگئی تو وہ برہم ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ اُن کا جسمانی عارضہ اور سرطان کا خوف (جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہے) بھی تھا۔ ہاشمی صاحب کا خیال ہے کہ "اُن کی زندگی کے آخری دس پندرہ سال میں اُنہیں (ہمیشہ) اِس جان لیوا مرض کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ضبط نے کبھی انہیں اجازت نہ دی کہ وہ اس کو ظاہر کر سکیں۔ لیکن وہ انجام سے ہمیشہ خائف رہے۔" لیکن اس ضبط کے باوجود اُن کا خوف چھپائے نہیں چھپتا۔

جہاں تک بخاری صاحب کے بعض فاضل شاگردوں کے نظریات سے پتہ چلتا ہے، بخاری صاحب ڈاکٹر رچرڈز کے مکتبۂ تنقید سے بے حد متاثر تھے۔ اس نظریئے کی رو سے کسی مصنف کی تحریر کو اس کی زندگی کے حالات سے علیحدہ رکھ کے پرکھا جاتا ہے، لیکن شاید یہ ممکن نہیں۔ مصنف کی اپنی زندگی جیسے تیسے تحریر میں ضرور عکس پذیر ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور رہنے کی ہوتی ہے جس کی خاطر وہ تخلیق کا تمام درد و کرب برداشت کرتا ہے۔ ۱۹۲۹ء کی ایک تحریر یوں تو انشا پردازی کا نمونہ ہے۔ لیکن اس کا پہلا ہی جملہ اُس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا ذکر چودھری ظفر اللہ خاں اور ہاشمی صاحب نے کیا ہے۔ بخاری صاحب لکھتے ہیں "جب مرض بہت پُرانا ہو جائے۔ اور صحت یابی کی کوئی امید نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ میز پر جو انگور کا خوشہ رکھا ہے۔ اُس کے چند دانے کھالئے" اُن کے لطیفے بھی ایسے ہی چند دانے ہیں۔

خرابی صحت اور موت کا ذکر اُن کے خطوں میں مختلف شکل میں ملتا ہے۔ ۱۳؍ اگست ۱۹۵۸ء کے ایک خط میں (جو مولانا سالک کے نام ہے)

اُن منصوبوں ذکر کرتے ہیں جو اُردو کی بدقسمتی سے مکمل نہ ہو سکے۔ اس ضمن میں کہتے ہیں "جب تک ہم لوگ زندہ ہیں یہ امر محال نہیں۔ موت راستے میں حائل ہو گئی تو کوئی اُسے پھاند نہیں سکتا۔" اور یکم جولائی ۱۹۵۸ء کے خط میں اس خوف کا اظہار کھلے بندوں کیا ہے:

"اپارٹمنٹ میں رہنا ہم تنہا پسندوں کے لیے ناممکن ہو گا۔ ایک پہاڑ سی عمارت، اُس میں درجنوں ڈبے۔ ہر ہمسایہ مقفل اور پُراسرار۔ آٹومیٹک لفٹ میں پندرھویں منزل پر رہتا تھا۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ اگر ۱۵ نمبر کا بٹن دبانے کے بعد روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے تو یہ لفٹ کا مقفس، کمبخت بے حس بلاتامل پندرھویں منزل تک چڑھتا چلا جائے گا۔ اور وہاں پہنچ کر اُس کا دروازہ کھل جائیگا۔ اور اسے اتنی بھی تمیز نہ ہو گی کہ جس نے بٹن دبایا تھا، محض ایک لاش ہے۔ دروازہ کھلنے پر باہر نہیں نکل سکتا۔ اِس خیال سے عجیب وحشت ہوتی ہے۔" اور اُن کے انجام کے پیش نظر ۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء کا خط المیہ پیشگوئی بن جاتا ہے۔ "موت زیست کا علم نہیں۔ اگر آنا نصیب ہوا تو خوب باتیں ہوں گی۔"

تمثیل کار جب تھک جاتا ہے تو پردہ گرنے کی آرزو کرتا ہے۔ غم پنہاں اور غم زمانہ نے بخاری صاحب کو بھی تھکا دیا۔ ملیحؔ تحسین نے لکھا ہے کہ "اگر یہ صورت حال (سیاسی بحث مباحثہ۔ یو این او میں ان کے خلاف محاذ اور ریشہ دوانیاں) پیدا نہ ہوتیں تو شاید وہ چھ ماہ سے دو سال تک زندہ رہ سکتے تھے لیکن جو کچھ ہوا وہ نہ ہوتا تب بھی زیادہ دن دنیا میں نہ رہتے۔ وہ اپنے ڈاکٹر سے اکثر یہ سوال کیا کرتے تھے کہ بتلائیے خدارا بتلائیے کہ موت کب آئے گی؟"

یہ سوال اُن کے ذہن میں کب سے تھا۔ اس کا اندازہ دِلّی کے زمانے کے ایک خط سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے سالکؔ صاحب کو لکھا۔ بخاری صاحب کے کو ایک مَسّا نکل آیا تھا۔ یہ "خرخشہ" آخیر پاک ہوا۔ لیکن وہ لکھتے ہیں کہ "جو مضغۂ گوشت کٹا تھا، اس کا معائنہ کر رہا ہوں۔ شبہ ہے سرطان نہ ہو۔ ڈاکٹر اس شبہے پر ہنستے ہیں۔" جو شخص عمر بھر اوروں پر ہنستا رہا ہو۔ اوروں کا اُس پر ہنسنا کتنا بڑا طنز ہے، المیہ ہے! "لیکن دودھ کا جلا ہوں۔ اس لئے احتیاط کر رہا ہوں۔" ان کی ظرافت بھی احتیاط تھی سان کا چھکنا دیدہ و دل کی اس امانت کو چھپانے کی سعی کے علاوہ، جس کا ہاشمی صاحب نے ذکر کیا ہے سرطان اور موت کے خوف کو بھی چھپانے کی سعی تھی۔ وہ شمع انجمن تھے۔ شمع کا شعلہ تو سب دیکھتے ہیں لیکن شعلے کے اندر جو تاریکی ہوتی ہے، اُس کے سینے کا جو داغ ہے اس کی طرف کم لوگوں کی توجہ جاتی ہے۔ ایک ہاشمی صاحب کو چھوڑ کر جو اپنے مختصر مضمون میں بہت کچھ کہہ گئے ہیں، ان کے باقی مداح روشنی کو دیکھ کر بچوں کی طرح تالیاں پیٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ آتش بازی چھوٹ رہی ہے اور لوگ باگ خوش ہیں۔ آتشباز کا دھیان کسی کو نہیں آتا کہ اس کے سینے کے اندر ایک فلیتہ سلگ رہا ہے۔

اس سے بخاری صاحب کو مظلوم یا شہید ثابت کرنا منظور نہیں۔ جو شخص سرطان کے اندیشے، موت کے خوف اور دل کی ویرانیوں پر قہقہے لگا سکتا ہے اُس کی بہادری سے کون انکار کر سکتا ہے؛ خیال آتا ہے تو صرف اتنا کہ اُن کے چارہ گر کیوں چپ ہیں۔

لیکن بخاری صاحب دوستوں سے ہمیشہ شاکی رہے۔ اُن کے حلقۂ احباب میں ایک سالکؔ صاحب ہی ایسے نظر آتے ہیں جن کی وفاداری کا انہیں یقین ہے۔ مگر اُن کی حسرتیں چھپائے نہیں چھپتیں۔ سالکؔ صاحب لکھتے ہیں کہ "بخاری مرحوم پاکستان آئے تو چند روز کراچی میں فروکش رہے۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے۔ کہئے کوئی نیا دوست بھی بنایا؟" یہ جملہ بظاہر کتنا سادہ لیکن دراصل کتنا پُرپیچ ہے! سالکؔ صاحب کے نام اُن کے خطوط دوستی کا ایک مکمل باب ہیں جس میں احباب کی شکایت ایک مستقل عنوان بن کر ابھرتی ہے۔ "جب کبھی شہر جانا ہو اور دوستوں سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہئے گا۔ چند دن ہوئے میں نے امتیاز کو خط لکھا تھا۔ لیکن جواب سے حسبِ معمول محروم ہوں اور شاید محروم رہوں۔ میری محرومی کا احساس اُن تک پہنچا دیجئے۔" مگر وہ اپنی محرومیوں کو چھپانا بھی جانتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک جملہ ہو جاتا ہے "کہ عشق کے کاروبار میں بسا اوقات اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔" حسرتوں کے باب میں بخاری صاحب کا ایک اور خط بھی قابلِ ذکر ہے۔ اخترؔ شیرانی کی مشہور نظم "او دیس سے آنے والے بتا" یاد آجاتی ہے۔ "کیا اب بھی راوی کے اُس پار کوئل کی صدا سنائی دیتی ہے؟

باب بھی فالودے کا موسم قریب آرہا ہے ؟ جب بیماری کے
لم میں بالکل خالی الذہن تھا تو شباب لاہور اور لاہورِ شباب
ے کئی موقعے تھوڑی دیر کو دماغ میں جاگ اٹھے۔
دارالاشاعت کی بزمِ عشاق، دہلی مسلم ہوٹل میں وارفتگاں
کا ہجوم... تاثیر کی فیل پائی۔ جنگل کی پُراسرار معصیتیں، صوفی
کی پنجابی غزلیں.... اے کاش کوئی از سرِ نو اِن اوراقِ پریشاں کا
شیرازہ باندھ دے"۔ اور حسرتوں کے اِس مزار پر حافظ کا کتبہ:

دوش در یادِ حریفاں بہ خرابات شدم
خم مے دیدم و خوں در دل و پا در گِل بود
بس بگشتم کہ بپرسم سببِ دردِ فراق
مفتیٔ عقل دریں مسئلہ لا یعقل بود

یوں محسوس ہوتا ہے کہ مفتیٔ عقل نے اگر کچھ کہا بھی ہے تو اُس
رومانی ساعت میں مکتوب نگار نے سنی اَن سنی کر دی ہے۔ شاید
وہ اوراقِ پاریہ جن کی جزبندی کی حسرت اُنہیں "خوں در دل و پا در گِل"
بنا دیتی ہے کب سے بکھرے پڑے تھے کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اوراق
بظاہر یکجا ہی نظر آتے ہیں لیکن اُن کو باندھنے والی ڈوری غائب
ہوتی ہے۔ اور خود قاری کا سانس ہی اُنہیں منتشر کر دیتا ہے۔

دوستوں سے اُن کی مایوسی کا یہ عالم ہے کہ ایک کہانی
درکار ہے۔ چنانچہ "پہلے خیال آیا کہ امتیاز سے پوچھوں۔ لیکن
ان سے جواب کی توقع نہیں"۔ توقع اٹھ جانے کے بعد بھی اُن
کے گلے بدستور ہیں۔ "امتیاز کو کیا ہوا کبھی خط لکھنے کا نام نہیں
لیتے۔ کئی مرتبہ میں نے پہل کی لیکن ہر بار تھک کر بیٹھ گیا۔ پھر چند
اور احباب کی وساطت سے انہیں سلام بھیجتا رہا۔ وہ بھی قبول
نہ ہوا تو اسے بھی ترک کر دیا"۔ اور امتیاز صاحب سے اُن کی شکایات
بہت پرانی ہیں۔" نومبر کے تیسرے ہفتے لاہور آنے کا ارادہ ہے۔ سنا
ہے امتیاز لاہور آ گیا۔ نہ خط لکھتا ہے نہ ملتا ہے۔ دہلی سے شمال
جنوب کو گذر جاتا ہے اور ہم سے نہیں ملتا" لیکن دوست کی بے رُخی
کو فوراً ظرافت میں اڑا جاتے ہیں " جیسے عصمت بچائے پھرتا ہو۔
ملے تو ڈانٹیئے گا"۔ آخری جملے میں کتنی حسرت ہے!

دوستوں سے شکوے اُن کے خطوط میں جگہ جگہ نظر آتے!
"یہاں میرے احباب تو بہت ہیں لیکن دہلی شہر نہیں صحرا ہے۔
فاصلے بہت ہیں، کچھ جسمانی کچھ روحانی"۔ سالک صاحب کو لکھتے ہیں
"آپ کے سوا کسی اور صاحب کا خط اب تک نہیں آیا صوفی، ہاشمی
فیض، تاثیر سب نے مجھے دریا برد کر دیا...."۔ "میں کئی دلچسپ
خط لکھتا۔ اگر دوستوں کے خط اس کے محرک ہوتے۔ بس تحریک
ہی کا انتظار طبیعت کو رہا"۔ مگر ایک جگہ اپنی خاموشی کا بھی
اعتراف ہے "جس کی سزا مجھے ملتی رہی۔ دوست بعید تر ہوتے گئے
اور میری تنہائی بڑھتی گئی"۔ "احباب سے محض بے خبر ہوں"۔ آغا
حمید کی شادی پر اُن کو تہنیت کا تار دیا۔ جواب نہ آیا۔ حسرت
صوفی، ہاشمی، عابد کسی نے خط نہیں لکھا"۔ "امتیاز کو میرا بہت
بہت سلام اور پیار۔ کبھی صوفی ملیں تو اُن سے کہیے دو گھونٹ
میری یاد میں بھی پی لیں۔ کمبخت کبھی خط لکھنے کے روادار نہیں۔ اور
ہم ہیں کہ ہر رہگذر سے اُن کا ذکر فخر سے کرتے ہیں"۔

صوفی صاحب کے ذکر سے ان کا مضمون یاد آ گیا۔ پطرس
بخاری مرحوم، جن دنوں قیامِ پاکستان کے بعد بخاری صاحب
گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے، صوفی صاحب کو اردو کی تدریسِ
شبانہ کے بارے میں ایک تجویز سوجھی۔ اور وہ فوراً پرنسپل کے گھر پہنچے۔
لیکن " اُن دنوں پرنسپل کے مکان پر سرکاری کاغذات کا داخلہ ممنوع
تھا۔ ایک آدھ بات کرنے کے بعد میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا تجویزی
کلام سنانا شروع کیا"۔ اِس ایک لفظِ 'جھجکتے' کی تکرار سے صوفی صاحب
کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ پرنسپل لاکھ پرنسپل سہی لیکن
دوست کو دوست سے بات کرنے میں جھجک کیسی؟ یہ بات قابل
غور ہے۔ اس کا جواز خود بخاری صاحب ہی کے ایک خط میں
ملتا ہے۔ خطِ دلّی کے زمانے کا ہے۔ مخاطب سالک صاحب۔
"جانتا ہوں کہ دس سال کا عرصہ اپنی طبیعت میں اور حالات میں
کئی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے"۔ دوستوں کا ان سے گریز کہیں
انہیں تبدیلیوں کا ردِعمل تو نہیں تھا؟ اور کیا یہی وجہ تو نہیں
کہ وہ ایک جگہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ کہ "صراحیٔ مے ناب و سفینۂ
غزل" کے سوا۔ اور کوئی رفیق نہیں جس کا بھروسہ کیا جا سکے۔

فیض صاحب نے بخاری صاحب کی زندگی کے مقصد
کو ایک ہی جملے میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ "کہ گوہر مقصود
گفتگو است"۔ ایک حد تک یہ بہت درست ہے لیکن کسی حد تک

اور کیوں؟ یہ جدا بحث ہے۔ بہرحال وہ بخاری صاحب کے بارے میں اپنی یادوں کا آغاز یوں کرتے ہیں۔ موضوع دوستی ہے۔ اور الفاظ خود بخاری صاحب کے ہیں:

"دوستی، تندہی اور مستعدی کا نام ہے یارو۔ محبت تو یونہی کہنے کی بات ہے۔ دیکھو تو میں تم میں سے ہر پاجی کو ہر روز ٹیلیفون کرتا ہوں! ہر ایک کو گھر پہنچاتا ہوں، اپنے گھر لاتا ہوں، کھلاتا ہوں، پلاتا ہوں، آدھی تنخواہ پٹرول پر اڑ جاتی ہے۔" یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ باتیں کس حد تک جتانے کی باتیں ہیں۔ دوستوں کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا، وصال محبوب کی تدبیریں، چارہ سازی اور چارہ گری ... مگر بخاری صاحب کے شکوے جاری ہیں۔ "مجھے تنخواہ دیتے ہیں آپ؟ یا آپ میری معشوقائیں ہیں؟ یا آپ کے ذہن مبارک سے حکمت و موعظت کے وہ لعل و گہر برستے ہیں کہ اس ہیچمداں کا دامن گنجہائے گراں مایہ سے بھر جائے ..." یہ توفیق صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ باتیں بخاری صاحب نے کب اور کن حالات میں کہی تھیں۔ لیکن روایت فیقی صاحب کی ہے۔ اس لئے ماننا ہی پڑتی ہے۔ لیکن دوستی کے باب میں یہ سب کچھ کہتے وقت وہ اس احتیاط، اس وضع داری، اس نیازمندانہ اور مخلصانہ لہجے کو نظر انداز کر گئے ہیں جو اُن کے "سب سے قریبی دوست" سالک کے نام خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ اور جہاں وہ اپنے نام کے ساتھ "خاکسار" وغیرہ لکھتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مزاح نہیں، مذاق اور دل لگی نہیں بلکہ طنز ہے۔ اپنی برتری اور دوستوں کی بے مائگی کا اعلان ہے۔

ایسے میں دوستوں کا اُن سے دور بھاگنا۔ اور اُن کا دوستوں کا تعاقب کرنا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ بخاری صاحب بڑے پڑھے لکھے، طباع اور غیر معمولی طور پر ذہین بزرگ تھے اور احباب سے بھی اُن کی ایسی ہی توقعات تھیں۔ لیکن اُن کے ایک شاگرد رشید کا کہنا ہے کہ احباب کے تمام علم و فضل کے باوجود اُن کی یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ چنانچہ اُن کی دوستی پر ایک مشفقانہ اور سرپرستانہ رنگ چڑھتا گیا، شاید غیر شعوری طور پر۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اُس تمام قرب کے باوجود جو انہیں دوستوں کی اتنی خاطرداری پر مجبور کرتا تھا، اُن کے درمیان ایک فاصلہ تھا جو بڑھتا ہی گیا۔ حتّیٰ کہ اپنے ایک صاحبزادے کی شادی پر جب وہ دلہن کو لیکر کراچی آئے تو اُن کے پرانے دوستوں میں سے (جن میں سے تین اُس وقت کراچی میں موجود تھے) ایک بھی ریلوے اسٹیشن پر نہ آیا۔ بخاری صاحب نے پلیٹ فارم پر ایک نظر ڈالی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا سوائے ان کے تین چار پرانے ماتحتوں کے۔ جن میں سے اکثر نے انہیں آل انڈیا ریڈیو کے زمانے میں بس دور ہی سے دیکھا تھا۔ بہت دور سے! اور اب محض ان کے چھوٹے بھائی کی خوشنودیٔ خاطر کے لئے ہار لے کر چلے آئے تھے۔ بخاری صاحب مسکرائے۔ وہی مشفقانہ، سرپرستانہ مسکراہٹ جو اُن کی شخصیت کا جزوِ ثانی تھی اور پھر اسباب کی جانچ پڑتال میں مصروف ہو گئے۔ تمثیل کار شاید اپنا وہی چہرہ ڈھونڈ رہا تھا جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی کا باعث ہوا کرتا تھا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ اُن تماشائیوں کو کیا ہوا جو میری اِک ایک ادا پر داد کے ڈونگرے برساتے تھے۔ تماشا گاہ سنسان کیوں پڑی ہے!

ایسے میں جب اُن کی اُداسی اور تنہائی کا خیال آتا ہے۔ اور ان اندیشوں کی طرف دھیان جاتا ہے جن سے وہ عمر بھر دوچار رہے۔ اور ساتھ ہی کانوں میں اُن کے قہقہے گونجتے ہیں تو "مضامین پطرس" کے مصنف کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے جس سے انہوں نے اپنے غم پنہاں کا مقابلہ کیا اور آج کہ دنیائے ادب پطرس سے محروم ہو چکی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی رات کے اندھیرے میں کسی سنسان راستے سے اپنے خوف کو چھپانے کے لئے سیٹی بجاتا ہوا گزر گیا ہے۔

لیکن یہ بھی پطرس کی یک رخی تصویر ہے، محض خاکہ! اس کے خد و خال کو نمایاں کرنے کے لئے اردو ادب کی تاریخ اُن کے "نیازمندوں" کی منتظر ہے ٭

★

میر کی ایک عشقیہ تمثیل: مور نامہ[*]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہوگا کہ شروع میں زبان تفصیل و تشریح کی متحمل نہ تھی اور بات زیادہ تر اشاروں میں کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب حیات و کائنات کے مسائل پر غور و خوض کیا جانے لگا تو مجرد تصورات کو دلنشیں پیرایہ میں بیان کرنے کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے رموز و علامات اور تشبیہ و تمثیل سے مدد لی گئی چنانچہ دنیا کے تقریباً تمام ابتدائی قصے کہانیوں کا رنگ رمزیہ SYMBOLIC یا تمثیلی ALLEGORICAL ہے رمز سے بات میں وسعت آتی ہے اور اس کی اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن تمثیل کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ زیادہ تر معقولات کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مجرد تصورات کا بیان عام طور پر غیر دلچسپ اور خشک ہوتا ہے انہیں تمثیل کے ذریعہ مجسم اور متشخص کر دینے کے بعد عام فہم اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ تمثیل نگاری کے اجزا دنیا کی ہر زبان کے ادب میں کم و بیش ملتے ہیں لیکن اس کی ابتدا مشرق کے ادب سے ہوئی پنچ تنتر میں جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں اس کی اولیں مثال ہیں۔ جاتک، ہتوپدیش اور کتھا سرت ساگر میں بھی تمثیلی کہانیاں ملتی ہیں۔ عہد نامہ عتیق میں بھی بعض مقامات پر تمثیل کا انداز پایا جاتا ہے۔ انجیل میں ارتقائے تاریخ کو ایک خوبصورت بیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یونانی زبان میں تمثیل کی عمدہ مثال افلاطون کی ری پبلک میں غار کی کہانی ہے۔ ہومر اور ہریکلیتس نے بھی اپنی تحریروں میں تمثیل سے مدد لی ہے۔ اطالوی میں پلوٹارک کی LIFE OF CORIOLANUS اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے تمثیل کا سب سے پُر زور شاعرانہ استعمال ڈانٹے نے کیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تصانیف میں بھی تمثیل نگاری خاصی مقبول رہی۔ آرفیس اور یوری ڈائیس کے قصے میں دراصل انسان کے اخلاقی احساس کو اپنے گناہوں کا احتساب کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ عشق کی جستجو کو تیرھویں صدی کی ایک فرانسیسی نظم "رومان ڈی لا روز" میں بڑی خوبی سے پیش کیا گیا۔ اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ انگریزی میں چاسر نے کیا تھا۔ قدیم انگریزی ادب میں مذہبی تمثیل کی قابلِ ذکر مثال ولیم لینگ لینڈ کی "VISION OF PIERS PLOWMAN" ہے۔ ادبی اور مذہبی تمثیل کی تفریق پر سب سے پہلے تھامس ایکویناس نے زور دیا۔ بعد کے زمانے میں سیاسی، سماجی یا ادبی طنز کے لئے بھی تمثیل سے کام لیا جانے لگا جیسے سوفٹ کی "TALE OF A TUB اور GULLIVER'S TRAVELS" یا پوپ کی DUNCIAD اور RAPE OF THE LOCK لیکن یورپی ادب کی بہترین تمثیلیں بنین کی PILGRIM'S PROGRESS اور سپنسر کی FAERIF QUEEN تسلیم کی جاتی ہیں۔

عربی اور فارسی میں جو قصے تصنیف اور ترجمہ ہوئے، ان میں "کلیلہ و دمنہ" اور "الف لیلہ" میں تمثیل کے اجزا ملتے ہیں۔ "انوارِ سہیلی" "منطق الطیر" اور "اخوان الصفا" کا انداز بھی تمثیلی ہے۔

اردو میں تمثیلیں ہندی اور فارسی سے لی گئی ہیں۔ فارسی سے مستعار تمثیلوں میں قصۂ "حسن و دل" سب سے اہم ہے، جسے مشہور دکنی شاعر اور نثر نگار وجہی نے "سب رس" (سن تصنیف ۱۶۳۵ء) کے نام سے لکھا۔ اس میں عشق و عقل کی عالمگیر کشمکش کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ گو وجہی نے اپنے ماخذ کا نام نہیں بتایا لیکن یہ قصہ اس سے بہت پہلے مشرق و مغرب میں مشہور تھا۔

وجہی کے تقریباً ڈھائی سو برس بعد تمثیل نگاری کی روایت اپنے اصلی رنگ میں محمد حسین آزاد کی تصنیف "نیرنگِ خیال" (۱۸۸۰ء) میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح گویا وجہی سے آزاد تک کا درمیانی حصہ اردو تمثیل نگاری کی تاریخ میں ایک خلا سا معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں۔ میر تقی میر کی مثنوی "مور نامہ" کے کرداروں کا عشق

---

[*] یہ مثنوی اسٹیٹ لائبریری رامپور کے مخطوطہ کلیاتِ میر نمبر ۴۸ میں شامل ہے اور عبدالباری آسی کے مرتبہ نول کشور کا ایڈیشن میں نہیں۔ اس کا متن ڈاکٹر گیان چند جین نے رسالہ "اردو ادب" (جون ۱۹۵۷ء) میں پیش کیا تھا جہاں سے اسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کلیاتِ میر کے نئے ایڈیشن مطبوعہ کراچی میں شائع کر دیا ہے۔

تجزیہ کیا جائے اور ان کی تمثیلی معنویت پر توجہ کی جائے تو دونوں ادوار کی گمشدہ درمیانی کڑی بآسانی متعین کی جاسکتی ہے۔

اس مثنوی کا قصہ بظاہر غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک رانی کا مور سے عشق کرنا اور اس پر جان دینا دکھایا گیا ہے۔ قصے کے مرکزی کردار راجا، رانی اور مور، ٹھیٹھ مقامی فضا کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہندستانی قصوں میں اس سے ملتے جلتے واقعات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً "پدماوت" میں سنگھل دیپ کے راجا گندھرو سین کی بیٹی پدماوتی ایک توتا "ہیرامن" پالتی ہے، جو اسے روز عشق و عاشقی کے قصے سناتا ہے۔ راجا اسے ہلاک کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے لیکن شہزادی اس کی جان بچانے کے لئے اسے گھر سے اڑا دیتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رانی اور مور کے عشق کا کوئی عوامی قصہ میر تک کسی مقامی روایت کے ذریعے پہنچا ہو۔ مگر اس کا تحریری ثبوت نہیں۔ ممکن ہے یہ قصہ میر ہی کی تخلیق ہو۔ بہرحال اس میں دو باتیں ایسی ضرور ہیں جنہیں میر کی ذہنی افتاد سے خاص مناسبت ہے۔ ایک تو یہی عشق کی عالم گیر ہنگامہ آرائی یعنی انسان تو کیا چرند و پرند بھی عشق کے سودا زدہ ہیں۔ دوسرے کہانی کا درد انگیز اور الم ناک انجام جس میں عاشق و معشوق دونوں جان سے جاتے دکھلائے گئے ہیں۔

قصے کا خلاصہ یہ ہے: ایک مور جنگل سے بستی میں آیا۔ یہاں کی رانی حسن و خوبی میں لاثانی تھی۔ مور اس کے دیدار کے لئے شاہی محل پہنچا۔ رانی کا سامنا ہوا تو مور حیرت کی تصویر بنا جہاں کھڑا تھا، وہیں کا وہیں رہ گیا۔ رانی نے ایک بے زبان پرندے کو اپنے حسن کا ایسا گرویدہ پایا تو وہ بھی اسے پیار دُلار کرنے سے رہ نہ سکی اور مور وہیں محل میں رانی کے پاس خوش خوش رہنے لگا لیکن

مختلط رہنے سے بعد از چند روز　　شور بدنامی اٹھا اک سینہ سوز
کھل گئی غماز لوگوں کی زباں　　سب پہ ظاہر ہوگیا رازِ نہاں

راجا لوگوں کے لگانے بجھانے سے حسد کے انگاروں پر لوٹنے لگا اور مور کی جان کا لاگو ہوگیا۔ رانی نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو دل پتھر کرکے مور کو چوری چھپے محل سے نکال دیا:

حزن کے ساتھ اک حزیں آواز کی　　گرتے پڑتے دو قدم پرواز کی
دیر سر دیوار سے مارا کیا　　صبر سے ناچار پھر چارا کیا
پاس سے کچھ دور ہی رہنے لگا　　جور ہجرِ یار کے سہنے لگا

لیکن راجا تو اس کی جان کے درپے تھا۔ اس نے جگہ جگہ مور کی تلاش میں جاسوس دوڑائے۔ رانی تاسف سے اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ ادھر مور کا حال بھی درہم تھا۔ اس نے جنگل میں جا کر دانہ پانی ترک کر دیا اور صبا کے ہاتھوں رانی کو پیغام دینے لگا:

جا کے تو رانی سے کہیو وا شگاف　　پہلے خط کے حرف ساٹھتا ہوں صاف
اب تلک جیتا تو ہوں پر زندگی　　دور تجھ سے ہوگئی شرمندگی
آنکھیں رہتی ہیں لگی تیری ہی اور　　کرتا ہوں اندھا سا میں فریاد و شور
اب کوئی اس راہ سے جاتا نہیں　　آ نکلتا ہے تو پھر آتا نہیں
شور کرتے کرتے پھاٹا ہے گلا　　اب جو نالے کرتا ہوں سو تلملا

جاسوس مور کا اتا پتا لے آئے کہ وہ اژدھوں کے ایک تیرہ و تار جنگل میں پناہ گزیں ہے۔ راجا نے فوراً فوج کشی کا حکم دیا اور خود مور کو ہلاک کرنے چلا۔ ادھر اس جگر سوختہ کے سوز دروں سے جنگل میں آگ لگ گئی اور سینکڑوں مار و اژدر اور شیر و کرگدن جل کر راکھ ہوگئے۔ مور بیچارہ بھی اس آگ میں جل مرا اور راجا کو فقط اس کا لاشہ ہاتھ آیا۔ غرض ہ

پھر پڑی جو آگ سب لشکر جلا　　اور راجا کا بھی اودھر گھر جلا
یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر　　آتشِ غم سے جلا اس کا جگر
کیا لگی دل کو کہ رانی جل گئی　　خاک ہو کر خاک ہی میں رل گئی
عشق ہی کی ہیں یہ تازہ کاریاں　　عشق نے پردے میں جانیں ماریاں
عشق سے کیا میر اتنی گفتگو　　خاک اڑا دی عشق نے ہر چار سو
طائر و طاؤس و حیوان اژدہے　　سب کہیں کیا عشق کی کوئی کہے
یہ فسانہ رہ گیا عالم کے بیچ　　بانماندہ ان کے ہیں سب غم کے بیچ

یہ مثنوی میر کے دیوان پنجم میں شامل ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسے انہوں نے اپنی آخری عمر میں لکھنؤ میں لکھا ہوگا۔ بظاہر اس مثنوی کا قصہ غیر عقلی ہے لیکن ہمارے نزدیک میر نے اسے تمثیل کے انداز پر نظم کیا ہے۔ اگر مثنوی کے مرکزی کرداروں کی معنویت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ راجا رانی اور مور محض نام ہی نام ہیں۔ میر نے انہیں حسن و عشق کی بنیادی قوتوں کی رمز بنا کے پیش کیا ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

فتنۂ دور سر عشق کے یہ کام ہیں　　مور اژدر، رانی، راجا نام ہیں
عشق ہے ہنگام سازِ شور و شر　　قصے قضیے عشق سے ہیں مختصر

مور در اصل عشق کی تجسیم ہے۔ رانی حسن اور راجا حسد کی نمائندگی کرتا ہے۔ میر نے حسن و عشق کے سوز و ساز اور حسد و رقابت کی آمیزش و پیکار کے ازلی فسانے کو ایک نئے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے عشق کی اہمیت و عظمت کے اسی مقدمے کو پھر دہرایا ہے جسے وہ اپنی عشقیہ مثنویوں میں اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکے تھے یعنی کائنات کی بنیادی قوت عشق ہے، یہاں زمین سے آسمان تک عشق ہی عشق بھرا ہوا ہے، بوستاں نازکی بہار اور لیل و نہار کی گردش، دنیا میں سبھی کچھ عشق ہی کے دم قدم سے ہے۔ زیر نظر مثنوی کا آغاز بھی حسبِ معمول عشق کی تعریف سے ہوا ہے اور زیر نظر اس پر ۲ اشعار صرف کئے ہیں۔ البتہ ایک لحاظ سے یہ مثنوی میر کی دوسری مثنویوں سے مختلف ہے یعنی اس سے پہلے میر عشق کی شورانگیزی انسانوں میں دکھاتے تھے۔ اب وہ خاص طور سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ذی عقل تو کیا طیور و وحشی بھی اس کی ہنگامہ آرائی سے نہیں بچ سکتے۔ مثنوی کے آغاز میں کہتے ہیں:

وہ حقیقت سب میں یاں ساری ہوئی　　ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی

چارسو ہنگامہ آرا عشق ہے　　عشق کیا کہیے کہ کیا کیا عشق ہے

عشق ندرآور ہے سب میں ہرسناک　　کشتے اس کے ہو گئے عالم سے پاک

کیا درندہ کیا چرندے کیا پرند　　دل ہے جن کے عشق ہے ان کا کشند

ایک جگہ اور، پھر عشق کے اسی پہلو کو پیش کیا ہے:

طائر و طاؤس و حیواں اژدہے　　سب کہے، کیا عشق کی کوئی کہے

پال ہارتے کا بیان ہے کہ تمثیل میں مجازی سطح کے نیچے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور کارفرما رہتا ہے۔ میر نے بھی اپنی اس تمثیلی مثنوی میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ کائنات کی بنیادی قوت عشق ہے۔ یہ فقط انسانوں کی جاگیر نہیں، پرندے بھی اس کے شراروں سے اپنا نشیمن پھونک سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو وہ مور کی شورشِ عشق کا ذکر کن الفاظ میں کرتے ہیں:

دل لگی تو اک خدا کا ہے غضب　　اس کو پھر پایا نہ بے لب پر روز و شب

دل گرفتہ، دل شکستہ، دل زدہ　　اللہ نے مارے مرد کیا کار آمدہ

ہے گی یہ دل بستگی خانہ خراب　　در بدر پھرنے کا کر دیوے ہے باب

کیا اٹھایا ہے تجھے اے مشتِ پر　　خاک سے لے کر گیا افلاک پر

واں سے پٹکے دیکھئے کیوں کر تجھے　　ساتھ آوارہ کرے کیدھر مجھے

راجا کے حسد اور بدگمانی کو بھی میر نے پوری کامیابی سے اجاگر کیا ہے۔ کسی انسان کا پرندے کو اپنے پاس رکھنا یا اسے چاہنا ایسا جرم نہیں کہ گردن زنی کی نوبت آئے۔ لیکن غیرتِ عشق کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ رشک و رقابت اور عشق میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عشق دوسرے کی شرکت کہاں گوارا کرتا ہے، خواہ وہ چرند و پرند ہی کیوں نہ ہوں۔ ملاحظہ ہو بدگمانی کے زور سے راجا کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور معقول بات بھی اسے نامعقول معلوم ہوتی ہے:

کان راجا کے بھرے دشمن ہوا　　بدگمان و بدبر و بدظن ہوا

کار ظنِ بد کھنچا اک طول کو　　سمجھا نامعقول وہ معقول کو

آنا جانا گھر میں اب کا ہو چکا　　پاس ربط و رابطہ سب ہو چکا

گھر میں لاتے ہیں کبھو تو گھیر کر　　بات کہتا ہے تو منھ کو پھیر کر

راہ میں ہے یا کبھو پھر جائے ہے　　پھر گیا تو دیر میں پھر آئے ہے

دشمنی کی بات ہی کچھ اور ہے　　بے ترحم ہے نہ مطلق غور ہے

جانور کا انس کچھ ثابت نہیں　　انس انساں کی سی یہ تہمت نہیں

اب رانی کا کردار ملاحظہ کیجئے۔ میر نے اسے بھی پوری چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ رانی کی خوبی اور خوبصورتی کا ایک عالم میں شور تھا۔ میر اگر کسی انسان کو رانی پر دیوانہ وار قربان ہوتے ہوئے دکھاتے تو کوئی غیر معمولی بات نہ بنتی۔ کیونکہ انسان کا انسان پر فریفتہ ہونا کونسی نئی اور چونکا دینے والی بات ہے۔ چنانچہ میر نے ایک پرندے کو رانی پر والہ و شیدا ہوتے دکھا کر حسنِ انسانی کی غیر معمولی کشش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ چونکہ قصے کا مقامی رنگ برقرار رکھنا چاہتے تھے، انہوں نے پرندوں میں سے بھی مور کا انتخاب کیا تاکہ اس کے بال و پر کی رنگینی و دلآویزی قصے کی رومانیت کا ساتھ دے سکے۔ حسن یوں تو بے مہر اور سنگ دل ہوتا ہے لیکن اگر عشق صادق ہو تو اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو مور کے اضطراب سے رانی کا دل کیسے پسیجتا ہے

اضطرابِ عشق نے تاثیر کی　　دل دہی کرنے اٹھی دلگیر کی

پیار سے کہنے لگی مت ہو اداس　　پاس رہ میرے کروں گی میں بھی پاس

تو ہے وحشی اس قدر مانوس ہے　　منس انساں کو نہ ہو افسوس ہے

پاس رہنے سے ترے ہے دل خوشی　　ہے بلا اس بال و پر میں دلکشی

میر رانی کو عشق میں ثابت قدم جتاتا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی

روایت کے مطابق یہ بھی ممکن تھا کہ رانی کو ستی ہوتے ہوئے دکھایا جائے۔ میر کو اس مرحلے کا شروع ہی سے احساس تھا۔ چنانچہ وہ مثنوی کے ابتدائی حصے میں اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

عاشق و معشوق رفتہ عشق کے   یعنی دونوں سینہ تفتہ عشق کے
بھر کے آتشِ عشق کی دونوں چلے   ڈوبے دریا میں ہوں گو پانی تلے
یا جلا یا ایک ہندوستاں کے طور   جا جلے ہے زن بھی اس بے جاں کے طور
جل چکے کو ہندی کہتے ہیں ستی   ست بمعنی استقامت واقعی
آگ میں جا بیٹھے زن کا ظرف کیا   عشق ہی کا جاذبہ دے ہے جلا

عورت کا خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہو جانا محبت کی انتہا ہے لیکن کسی عورت کا پرندے کے غم میں ستی ہونا انتہائی وابستگی اور وفاشعاری کی غیر معمولی مثال ہے۔ میر رانی کے مور پر قربان ہو جانے کی فضا تو پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ آخر میں اسے خاک سیاہ ہوتے دکھا کر کردار نگاری کے فرائض سے بطریقِ احسن سبک دوش ہو گئے:

یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر   آتشِ غم سے جلا اس کا جگر
کھینچ آہِ سرد یہ کہنے لگی   عشق کی بھی آگ کیا بہنے لگی
بن جلا کر بستیوں میں آ لگی   پھیل کر یاں، دل جگر کو جا لگی
جمع کر خاشاک و خار و خس، شتاب   جل گئی دے آگ، وہ بھی بس شتاب
یا لگی دل کو کہ رانی جل گئی   خاک ہو کر خاک ہی میں رل گئی

غرض قصے میں تمثیلی رنگ کو نبھانے اور عشق کو فتح مند ثابت کرنے میں میر کامیاب رہے ہیں۔

تمثیل نگاری کے جدید نظریہ کی رو سے اس قصے میں ایک کمزوری ہے۔ تمثیل کی جدید تعریف کے مطابق اس میں اندرونی معنویت کے وصف مجازی مطلب بھی منظم و مربوط ہونا چاہیئے۔ "مورنامہ" کا قصہ اس شرط پر پورا نہیں اترتا۔ ایک انسان سے مور کا عشق غیر عقلی بات ہے۔ لیکن یہ خامی مشرقی ادب کی ان تمام تمثیلوں میں ملتی ہے جن میں بعض کردار انسان ہیں اور بعض حیوان۔ مثلاً "شک شب تتی" میں توتا ہی داستانوں کے پیرائے میں عقل کے رموز و نکات بیان کرتا ہے۔ "پدماوت" میں بھی طوطا تو غیر انسانی کردار ہے جو عقلِ سلیم کی تشکیل ہے اور راجا رتن سین (نفس) کو پدمنی یعنی عرفانِ حق کی طرف راغب کرتا ہے۔ اسی طرح "مورنامہ" میں مور حیات و کائنات کے بنیادی جذبۂ عشق کی تجسیم ہے جس کی تائید قصے کے واقعات اور انجام سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

مثنوی کا قصہ مختصر اور دلچسپ ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے تو شاید ہی میر کی کوئی دوسری مثنوی اس کو پہنچتی ہو۔ لیکن میر کا "شور شور انگیز" والا انداز اس مثنوی میں نہیں ملتا۔ حالانکہ کہانی کا المیہ انجام میر کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہے اور اس میں درد انگیز اور پُر تاثیر اشعار نکالنے کے بڑے مواقع تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مثنوی کے اکثر بیانات طویل ہو گئے ہیں اور میر کا لب و لہجہ بجھا بجھا اور افسردہ معلوم ہوتا ہے۔ جسے دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ بڑھاپے اور علالت کے باعث یا کسی دوسری وجہ سے میر اس مثنوی میں اپنی طبیعت کا پورا زور صرف کرنے اور نطق کا اعجاز دکھانے سے قاصر رہے ہیں۔

مضمون کے آخر میں جو کچھ کہا گیا ہے، خصوصاً "مورنامہ" کے بارے میں، اسے دیکھتے ہوئے قدرتی طور پر خیال پیدا ہوتا ہے کہ میر کے کلام کی مجموعی کیفیت کیا ہے۔ اور قارئین کے ذہن میں اس کا جو تصور بالعموم پایا جاتا ہے، وہ اصلیت سے کس قدر مطابقت رکھتا ہے۔

میر کی شخصیت، اس کی شاعری کی لَو جو پہلے ہی کافی تیز تھی۔ اب کچھ عرصہ سے اور بھی تیز ہو گئی ہے، اس کی زار نالی نے ایک دور کے دور کو مسحور کر دیا ہے:

خدا جانے کہا کیا میر نے دل میرا بھر آیا

اس کے بعد وارفتگیٔ شوق کا یہی تقاضا ہے کہ ہر نے پہلے سے بلند تر ہو۔ اس میں اندیشہ صرف اتنا ہے کہ نے بلند ہوتے ہوتے کہیں ضرورت سے زیادہ بلند نہ ہو جائے۔ اور دل اس سے زیادہ نہ بھر آئیں جتنا کہ شاعر کا فن اور اس کی صلاحیتیں اجازت دیتی ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لَے کی تیزی و شدت میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میر کے کلام پر بیش از بیش توجہ، اس کا مطالعہ، اس کی نمود، محاسن کی توضیح و تشریح، کلیات کے ایڈیشنوں کی اشاعت میں اہتمام بلیغ، پے در پے انتخابات، تازہ بہ تازہ نو بہ نو نقد و نظر اور نکتہ آفرینی یہ سب باتیں یا تو انتہائے شوق کی علامت ہیں یا کورانہ عقیدت کی آئینہ دار۔

جہاں تک تصویر کے روشن پہلو کا تعلق ہے یہ فی نفسہ اتنا روشن نہیں جتنا اسے ظاہر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس حد تک سب کو اتفاق ہے کہ میر کا کلام یکساں نہیں اور یہ کہ بلندش نہایت بلند و پستش بغایت پست۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کلام کس قدر غیر یکساں ہے۔ اس میں آمد و آورد کا تناسب کیا ہے۔ آورد یعنی ناقص، پست، پُر تصنع اشعار کی مقدار کتنی ہے اور میر کے کلام نیز ذوق، لب و لہجہ، فکر و فن، اثر، وقار وغیرہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اور ہم اس کے دل و دماغ کے بارے میں مجموعی طور پر کیا تاثر لے کر اٹھتے ہیں۔ جس پیمانے سے ہم اسے جانچتے ہیں وہ بھی یکساں ہونا چاہئے۔ یا ہم تمام شعرا کے صرف چیدہ اشعار کو شمع راہ بنائیں یا سارے کلام اور سالم غزلوں اور نظموں کو پیش نظر رکھیں۔ ہم میر کا اندازہ صرف اس کے منتخب اشعار کی بنا پر کرتے رہے ہیں لیکن ناسخ و آتش کے سلسلہ میں ایسا نہیں کرتے جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مولوی عبدالحق اور محمد حسن عسکری نے میر کے کلام کے جو انتخابات کئے ہیں ان میں چند ہی غزلیں اور اشعار منتخب کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور معیار فن کی رو سے ان کا درجہ بھی زیادہ بلند نہیں۔ مکمل غزلوں سے نہ تو میر کا دوسروں سے اعلیٰ تر فنی شعور اور گہرا تاثر ظاہر ہوتا ہے اور نہ اس کے کلام میں تکلفات کی کم بھرمار نظر آتی ہے۔ مثلاً:

تیر اس کی کمان سے نکلا ۔۔۔ جگرِ مرغ جان سے نکلا

نہ پایا دل ہوا روز سیہ سے جس کا جال لٹ پٹ

کسو کی زلف ڈھونڈی مو بہ مو کاکل کو سب لٹ لٹ

وغیرہ وغیرہ۔

کیا یہ میر ہے — دردمندی اور زار نالی کا بادشاہ یا ناسخ لکھنؤ کی پُر تکلف شاعری کا امام؟ اس کی بہترین غزلوں "الٹی ہو گئیں ......؟"، "جس سر کو غرور" ... اور "پتہ پتہ بوٹا بوٹا"۔ پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو ان میں وہ افسانوی میر بالکل ناپید ہو جاتا ہے جسے ہم خدائے سخن قرار دیتے ہیں۔ میر کے سلسلہ میں "نہایت بلند" پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ہم عقیدت کی رو میں بہت دور نکل گئے تو اس میں ادبی و تنقیدی قدروں کے درہم برہم ہو جانے کا شدید اندیشہ ہے۔ جو ناقدانہ شعور کی نشو و نما میں سدِ گراں ثابت ہوگا۔ میر کے تتبع میں بھی کچھ کم اندیشے پنہاں نہیں۔ (مدیر)

غزل

شاہد عشقی

نقدِ دل و جاں چاہے اس کی خاطر رہن جام کرو

میر کے بادۂ کم خوردہ کو میخواروں میں عام کرو

قشقہ کھینچو، دیر میں بیٹھو، پیرویٔ اصنام کرو

کیشِ برہمن کو اپناؤ، جرمِ وفا کو عام کرو

خواہ کوئی بہتان تراشو، یا عائد الزام کرو

ترکِ تعلق سے پہلے کچھ اور ہمیں بدنام کرو

سازِ شکستِ دل کی قیمت کون چکانے آئیگا

گیتوں کی دکان بڑھاؤ، نغموں کو نیلام کرو

ایک خیالِ خام ہے مانا اس کی تمنا، اس کا شوق

عمرِ خضر میسر ہو تو صرفِ خیالِ خام کرو

نگری نگری پھرے مسافر بستی بستی چھانی خاک

ٹک اس زلف کے سائے میں بھی کوئی گھڑی آرام کرو

جن کے دم سے غربت میں بھی بزمِ تمنا روشن ہے

پیارانِ شہر کی ماہوشوں کو عشقی تام بنام کرو

حمد

قیوم نظر

گھنٹیاں دور کہیں مندروں میں بجتی ہیں
جس طرح تتلیاں اُڑتی ہوں، چلی آتی ہیں
اَن گنت غنچوں کے کھلنے کی حسیں آوازیں
موسمِ گل کے چھلکنے میں کوئی روک نہیں سکتا ہے
میرے گیتوں کو اگر بیڑیاں بھی پہنا دیں

میرے گیتوں کو نکل جانا ہے شہروں شہروں
شہر سے دور بھی کہساروں میں گلزاروں میں
رقص کرتی ہے جہاں ہنستی ہوئی دوشیزہ
جس کا خوشبو میں بسا لہریں بناتا ہوا جسم
سرمدی نغمے کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے

میرے گیتوں کو جو مل جائے وہ دوشیزہ ہوا
جس نے جادو یہ جگایا ہے، تو تھم جانا ہے
اپنی ہستی کو مٹاتے ہوئے باصد آداب
اُس کی چوکھٹ سے لپٹ جانا ہے جس کی ضو سے
گھنٹیاں دور کہیں مندروں میں بجتی ہیں

سیالوں کی بستی

شیر افضل جعفری

یہ چونچال چونچال خوش حال گھوڑے
یہ پھرتیلے پھرتیلے بیلوں کے جوڑے
یہ شرمیلی شرمیلی دودھیل گائیں
کہ جو نور کی پاک نہریں بہائیں
یہ تالاب، یہ سرمئی رنگ مجھیں[1]
جٹوڑے جنہیں اپنی لیلائیں سمجھیں
یہ راہٹ کا سرگم، یہ سورٹھ کی تانیں
کہ جن پر فدا ہوں گویتوں کی جانیں
یہ مرغابیوں کی جواں تاب ڈاریں
یہ جھیلوں کی پریاں، یہ دریا کی ناریں
یہ سرسبز وادی یہ سرمست بیلے
کہ جن میں جوانی بہاروں سے کھیلے
یہ کھیتوں پہ سرشار جوبن کا عالم
یہ سرسوں پہ مٹیار جوگن کا عالم
یہ ہالی، یہ چرواہے، یہ جھنگ والے
یہ البیلے گھبرو، یہ مکھن کے پالے
یہ میدان میں شاہزوروں کے لوٹے
کہ جن کی رگوں میں چنہاں چڑھ کے بولے
یہ گاؤں، یہ بانکے سیالوں کی بستی
یہاں کنگ دیتی ہے کوثر کی مستی

---

[1] بھینسیں

خنک شعلے

عبدالعزیز خالد

زندگی، دنیا، طلسم روز و شب
آخری زینوں پہ جن کے جاں بلب
چڑھ رہا ہوں قصہ خوانِ صبح و شام
السلام، اے مرکزِ جذبِ تمنا السلام
آنکھ حیراں ہے کہ خیمہ نصب تھا پہلے کہاں
ایک سناٹا ہے موسیقی کا مسکن ہے جہاں
راہرو آواز دیتا ہے کہاں ہے کارواں
آگ سی بھڑکا رہی ہے دل میں یادِ رفتگاں

آئے گا پھر نوجوانی کا وہ دورِ شادماں؟
کب یہ آئے گا، نہ آئے گا کہیں!
ان سمن زاروں میں افسونِ بہاراں اب بھی ہے
پھولوں کی بُو باس میں ہے خلدِ رنگینی نہاں
وہ خزاں آئی فسردہ سایوں کو تھامے ہوئے
ہوں مگر گرمِ سفر ظلمات کی آغوش میں
بجھ گئے ہیں سب چراغِ رہگذر میرے لئے
جو کبھی روشن نہیں ہوں گے نہیں! (ماخوذ)

★

روٹھا پیا مناؤں گی

ظہور نظر

(اپنی ملتانی نظم سے)

چنن پیر کے میلے پر میں جاؤں گی
روٹھا پیا مناؤں گی
منت مان کے، ہاتھ باندھ کے، رو کے عرض سناؤں گی
جو مانگوں گی، پاؤں گی
جانے سے پہلے، سکھیوں من بیبوں کو بلواؤں گی
ساری رات جگاؤں گی
جھومر ڈالوں گی، دوہے گاؤں گی، رنگ جماؤں گی
ہار سنگار کراؤں گی
ساتھ چھاچھ کے بال دھوؤں گی، خس کا تیل لگاؤں گی
خوشبو میں بس جاؤں گی
اِک اک زلف کو سو بل دوں گی، الجھا کے سلجھاؤں گی
ایسی مانگ بناؤں گی

بولا[1] بینسر، نتھ پہنوں گی، مہندی لال لگاؤں گی
سارے شوق مٹاؤں گی
پل پل بعد مساگ[2] ملوں گی، گھڑی گھڑی کجل لگاؤں گی
پھولی نہیں سماؤں گی
ڈالوں گی جوپی کے گلے میں دو باہیں لہراؤں گی
چوڑے سے بھرواؤں گی
مست حسیں، بے داغ، جیالا اونٹ تلاش کراؤں گی
اجرک[3] اسے اڑھاؤں گی
یوں پتّوں جیسے پریتم کے درشن کرنے جاؤں گی
روہی[4] سیج بناؤں گی
نام نظر ہے جس شاعر کا ساتھ اسے لے جاؤں گی
اور دوہے سنواؤں گی
چنن پیر کے میلے پر میں جاؤں گی
روٹھا پیا مناؤں گی
منت مان کے، ہاتھ باندھ کے، رو کے عرض سناؤں گی
جو مانگوں گی، پاؤں گی

---

[1] دنداسہ۔ [2] عنابی رنگ کی پھولدار چادر [3] صحرا [4] پنّوں کا شہر

ا

شان الحق حقی

اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین زبان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے — وزارت تعلیم کے زیر نگرانی ترقی اردو بورڈ ایک جامع لغت تالیف کر رہا ہے، جو بڑی آکسفورڈ ڈکشنری کے نمونے پر ہو گی۔ یہاں حقی صاحب نے اپنے طور پر حرف ا کی تشریح نمونتاً پیش کی ہے۔ (مدیر)

ا : (تلفظ اَلِف : فتحِ اول، کسرِ ل، سکونِ ف) مذکر۔

۱- اردو، نیز جملہ عربی الاصل حروفِ تہجی کا پہلا حرف، اُصولِ
ابت میں تین قطع کی کھڑی لکیر، نسخ میں ا یا ا، نستعلیق میں ا، دیگر
ریوں میں اِن شکلوں سے مماثل، طغریٰ میں کبھی مدوّر یا منحنی، اکثر ایک
ڑی لکیر سے شناخت ہوتا ہے؛ پہلے ہندسے "۱" کا مشابہ۔

ترتیب ابجد کا پہلا حرف؛ جمل میں عددِ واحد (۱)۔

م- عدد جوڑ کے دیکھیے ایک "ا" کی کمی ہے۔

مفرد کلمے کے شروع میں ہمیشہ متحرک اور صوتیات کی رو سے
تِ صحیح یا صامت، آخر میں ہمیشہ اور درمیانِ کلمہ اکثر ساکن اور حرفِ
ت یا صائتہ۔ استثنائی صورتیں: مآل، مآثر، لاابالی، وغیرہ (عربی)،
فارسی وار دو مرکب الفاظ جیسے بے ارادہ، دو آتشہ؛

م فاتمام رے تئیں نہ تھا کچھ خیال
کہ آخر کو ہوئیگا مرے جی کا کال (سراج کلیات ص۲)

ا میں الف فتح کے کھینچنے (اِشباع) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بالذات
ن ہے۔ متحرک الف کو ہمزہ کہتے ہیں۔ اس پر جزم اور تشدید نہیں آتی۔

اردو املا میں اِعراب (= زیر، زبر، پیش) و دیگر حروفِ علت
ی) کے ساتھ مل کر درج ذیل دس مختلف علتوں کے لئے مستعمل ہے:

اَ (مفتوح یا مع زبر م اَب)

اِ (مکسور، یا مع زیر م اِس)

اُ (مضموم یا مع پیش م اُن)

آ، ءا (ممدودہ یا مع مد، برابر ہے دو الفوں کے، جیسے کبھی ا
کبھی لکھتے ہیں۔ م امین = آمین؛ نیز آخرِ کلمہ حرف ماقبل سے مل کر یہی
فائدہ رکھتا ہے م اچھا، بُرا)۔

اُو (مضموم مع واوِ مجہول م اوچھا)

اُو (مضموم مع واو معروف م اونچا)

اِی (مکسور مع یائے معروف م ایکھ)

اے (مکسور مع یائے مجہول م ایک)

اَو (مفتوح مع واو ساکن م اَور)

اَے (مفتوح مع یائے ساکن م اَیسا)

(کبھی تنوین کے ساتھ حرفِ صحیح "ن" کی آواز شامل رکھتا ہے؛
(عربی کلمات کے ساتھ مخصوص) م: فوراً، حکماً، قطعاً، (مع دو زبر یا
فتحتین)؛ نسلاً بعد نسلٍ (مع دو زیر یا کسرتین) کبھی اردو کے موضوعہ
کلمات میں: م: اندازاً (شاذ، غلط العام)؛ ضمتین کے ساتھ بشکلِ
ہمزہ م: لِکُلِّ داءٍ دواءٌ (اردو میں شاذ)۔

صوتیات کے لحاظ سے، جدید اردو تلفظ میں بعض حروف
صحیحہ یعنی ح، ع، ل، لا کے شروع میں آ کر تین مزید علل پیدا کرتا
ہے م (۱) اِحاطہ، اِحسان، اِحتیاط، اِعلان، اِعتناء، اِعتذار،
لاالٰہ، اِلی الآن، اِبانت (مکسور، مخفف، راجع بہ یائے مجہول)
(۲) اُحد (مضموم مخفف راجع بہ واوِ مجہول)؛ (۳) اَہل، اَحسن، اَحقر،
(مفتوح، راجع بہ یائے ساکن)۔ یہ املائی مسلمہ و مذکورۂ بالا دس
علتوں سے زائد، مگر عام تلفظ میں موجود ہیں۔

بعض عربی الفاظ کی املا میں ساکت م، بالکل، بالفعل،
بسم اللہ؛ رسم الخط، فوق البشر، علی العموم، علی الحساب کبھی ساقط
مگر مفروض اور تلفظ میں موجود م زکوٰۃ، ھذا، طغریٰ (تلفظ زکات

طاغوا، طغرا) کبھی بعض حروف کے اوپر بشکل قصیر (عام خط سے چھوٹا، یا "نصفِ الف") اورالفِ مفتوحہ کا ہم آواز ہے: اعلیٰ، ادنیٰ، لیلیٰ، عیسیٰ، الٰہی، کبھی تشدید کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے اور حرف مشدّد کے ساتھ مفتوح۔ مر: اللّٰہ، حتّٰی، متقّٰی، کہیں یائے تحتانی یا ہائے ہوّز کے نیچے نصف الف کی صورت میں تحریر ا ور یائے معروف کا ہم آواز مر: اعلیٰ، ملتٖین، ہٰذا ، اِلٰا آخرم۔ کہیں زبر کی آواز کھینچ جانے (یعنی اِشباع) سے پیدا ہوگیا ہے مر: پیرہن سے پیراہن دامن سے دامان (فارسی) ابدالآباد سے ابدالآباد، اجر سے اجار (ع اجر)، اچار سے آچار (اردو)۔ کبھی بعض الفاظ سے برلئے اختصار یا بضرورت شعری ساقط مر: اگر سے گر، امیر سے میر؛ کہیں مرورِ زمانہ سے معدوم ہوگیا ہے مر: اکال سے کال (اردو)، اسوار سے سوار (فارسی)؛ خوانچہ سے خونچہ، پارچہ سے پرچہ (اردو)؛ کہیں وارد ہوگیا مر: جبّہ سے اَجبّہ (ع جبّہ)۔

انگریزی سے آئے ہوئے الفاظ کے شروع میں کبھی رومن حرف (S = ایس) سے پہلے، مخارج وعادات لسانی کے اختلاف کی بناپر، وارد ہوگیا ہے (عموماً بالکسر) مر: اِسکول، اِسٹیشن، اِسٹیٹ (کیونکہ انگریزی وغیرہ کے بخلاف اردو میں کوئی کلمہ حرفِ ساکن سے شروع نہیں ہوتا)۔

اردو کے بہت سے الفاظ کے تلفظ اور املا دونوں میں آخر کلمہ ہ سے بدل گیا ہے مر: پتہ، روپیہ، پلّہ، ہلّہ، مہینہ، مغلپورہ، لالہ جی؛ عوام کے تلفظ میں دو الفاظ کے درمیان کبھی اس کے ساتھ "ی" کی آواز شامل ہو جاتی ہے، مگر غیر فصیح مر: بھول پائے، دیکھیاؤ (بھول آئے، دیکھ آؤ)۔ از روئے تاریخِ لسان، اس حرف کا بدل ہ، و، ی سے ہوتا رہا ہے۔

عربی میں ہمزہ سے موسوم (بعض الفاظ کے درمیان یا آخر حرف ء کی شکل میں تحریر۔ حروفِ علت (ا، و، ی) نیز حروف "اتین" (= ا ت ی ن) میں شامل ہونے کے سبب عربی الاصل کلمات میں بکثرت موجود ہے۔ سہ حرفی مادوں میں گوناگوں تصرفات اور اشتقاق پیدا کرتا اور مختلف کلمات میں مختلف فائدے و معنی رکھتا ہے۔ اردو املا کا کثیر الاستعمال حرف اور بیک وقت حرفِ علت و صحیح ہونے کے سبب اردو الفاظ میں مختلف مقامات پر اس کی معنوی حیثیت، صرف و فوائد کا تمام و کمال احاطہ کرنا قریب المحال ہے منجملہ آن:

کلمے کے شروع میں

(۱) حرف مفتوح (اَ):

ہندی الفاظ میں، بطور سابقہ آکر، نفی کے معنی پیدا کرتا ہے مر: اَمر، اَچھوت، اَٹل، اَلگ، اَکارت، اَمولا۔ اس لحاظ سے نا (از فارسی)، مالا، غیر، عدم (از عربی)، بلا، بے، بن، ان، نہ (ہندی) کا مقابل و مرادف ہے۔

عربی الفاظ میں علامت استفہام مر اَلستُ بِربّکُم (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) عربی کے کلمۂ تخصیصی (ال) کا حرف اوّل اور اکثر اسما میں ل کے ماقبل شامل مر: القرآن، الناظر، الداعی، الجامعہ، اَلسّلامُ علیکم ("حروف شمسی") سے پہلے ل ساقط اور صرف ا کی آواز شامل ہوتی ہے)۔

از علامات جمع مر: انجم، اَنفُس (بروزن اَفعُل)؛ اَنصار، اَحباب، اَغیار، اَسباب (بروزن اَفعال)؛ اَمثِلہ، اَجِنّہ، اَطِبّہ (افعِلہ)؛ از علاماتِ تفضیل مر اَکبر، اَکثر، اَنسب، اَفضل، اَشرف، اَکمل، اَتم، اَشدّ، اَہم۔ (اَفعل)؛ کلمۂ ندا "اے" کا اختصار مر: اَماں، اَجی، اَرے، اَبے۔ (اے میاں، اے جی، اے رے، اے بے)

(۲) حرفِ مکسور (اِ):

بعض عربی اَسما و افعال کی پہچان جو عربی صَرف کے ابواب ثلاثی مزید فیہ و رباعی مزید فیہ (شاذ) سے تعلّق رکھتے ہیں مر: اِنکار، اِقرار، اِظہار، اِنصاف، نیز اِقامت، اِجازت، اِصابت، وغیرہ (از اِفعال)؛ اِہتمام، اِقتدار، اِفتراق، اِحتمال وغیرہ (از اِفتعال اس وزن کے افعال عموماً متعدی ہوں گے)؛ اِنسداد، اِنحصار، اِنقلا (از اِنفعال، اس وزن کے افعال اردو میں لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہیں)؛ اِستیصال، اِستمال وغیرہ، نیز اِستمنا اِستفادہ، اِستعارہ وغیرہ (از اِستِفعال)۔ بعض کلمات میں حاضر یا قریب کی علامت، (خصوصاً غائب یا بعید کے بالمقابل) مر: اِن (اُن) اِس (اُس) اِتنا (اُتنا)۔ اِین (آن)، اِدھر (اُدھر) اِلّل لذی نہ اُلّل لذی؛ کبھی (ک کے ماقبل) علامت ایک مر: اِکّا، اِکائی، اِکہرا۔

وسطِ کلمہ میں:

حرفِ اتصال:

جبکہ کلمے کی تکرار ہو مثلاً سراسر، لبالب، [illegible] (اتفاقی) دیکھا دیکھی، مارا ماری، چلا چل، دناون [illegible]، [illegible] (اردو) بیان، بہتات، تنوع، تکمیل (انحصار و استیعاب) تسلسل و تواتر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، یا کبھی نقلِ صوت مثلاً [illegible]، زنازن، دنادن؛ کبھی بلا تکرار کلمہ مثلاً لگاتار، موسلا دھار، اٹاٹوٹ، دھما مشتی، لپاڈگی، اینچا تانی، اظہارِ شدت، تواتر یا تقابل کے لئے؛ کبھی محض ترکیبِ لفظی کے لئے: جوانامرگ، سوتیا داہ، موتیا بند۔

فعل متعدی کی لازمی علامت۔ کبھی مصدر میں داخل ہو کر لازم کو متعدی کرتا ہے مثلاً: چلنا سے چلانا، اُٹھنا سے اُٹھانا۔ نیز اُن تمام مصادر میں موجود جو بذاتہٖ متعدی ہیں۔ مثلاً: دارنا، دھانا، تاڑنا، پکارنا۔

علامتِ فاعل، عربی الفاظ میں جو فاعل کے ہم وزن ہوں۔ مثلاً عاقل، عادی، خالق، صاحب، قائل، رادی، ماہر وغیرہ۔

آخرِ کلمہ:

علامتِ ندا مثلاً: ناصحا، خداوندا!

مثلاً ظفر کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخش! کرم گارا الہٰا (ظفر)

کبھی حسرت و تاسف کے لئے مثلاً: وادیلا، واحسرتا!

کبھی علامتِ فاعل بقاعدۂ فارسی مثلاً: رسا، دانا، بینا، شنوا؛ نیز ہندی کھوتیا، دُھنیا، اگوا۔

کبھی علامتِ تکبیر (بڑائی کے اظہار میں) مثلاً: مٹھنا، ڈولا، اَدھنا، اَمالا؛

مثلاً: یہ کلغی لگائی ہے کہ کلغا، مکھی کیا تھی کھما تھا۔

کبھی علامتِ تذکیر، نیز واحد مذکر کی عام علامت مثلاً: بیٹا، بھینسا (اسماء میں)؛ چھوٹا، بڑا، کالا، گورا (صفتِ مشبّہ میں)؛ اچھا، خاصا، اینڈا بینڈا، من بھاؤ نا۔ (کلمۂ توصیفی میں)؛ چھپکا، چھالا، پیسا، جھگڑا (تذکیرِ سماعی میں) آیا، گیا، سویا، جاگا۔ (افعال معروف میں)؛ دیکھا بھالا، سمجھا بوجھا (افعال مجہول میں)۔ یہ حرف یں کا نقیض جو تانیث خصوصاً واحد مؤنث کی علامت ہے۔

کبھی علامتِ تانیث (بقاعدۂ سنسکرت) مثلاً: ابلا، رادھا، جمنا، چنپا، سیتا، بہیدا (دوسری علامتِ تانیثِ عربی) مثلاً: لیلیٰ، علیا، نیز کلمۂ توصیفی مع مبالغہ مثلاً: صفرا، سودا۔

کبھی تحقیر و طنز کے لئے مثلاً: صفایا، بگاڑا، کباڑا، دھتہ، سسرا، امیا، بھینا، گھترا (لمبی چوڑی تحریر) دھرنا (اسماء) ٹُچا، چوٹا، اٹھائی گیرا، اکا ڈھمکا۔ (وصف)؛

کبھی علامتِ تصغیر مثلاً: بچیا، ٹکڑا، پھندنا، بالکا، بلا۔

کبھی اظہارِ کثرت کے لئے مثلاً: بسا، خوشا، اصلا (فارسی)

کبھی علامتِ حاصل مصدر۔ جھگڑا، لپکا، کھٹکا، گھِستا۔

بعض اعدادِ ترتیبی میں (ال کا متبادل) پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، چھٹا۔

مخفف اللہ کا (خصوصاً سرناموں، نقشوں، تعویذوں وغیرہ پر تحریر)

وہ لکیر جو صیقل گر آئینے پر نقش کرتے تھے؛ (مجازاً) کوئی کھڑی یا سیدھی لکیر

مثلاً: قیمی اٹھائی اور مٹیہ پر دو چار "ا" بنا دئے۔ (نیز دیکھئے الف، ہمزہ، علت، حروفِ تہجی۔)

(ع ۱: ، از فنیقی "الف" از قدیم مصری "آوا" = بیل (نیز = پیشوا)۔ خطِ مصری میں اصل شکل ✗ بیل کی شبیہ سے ماخوذ فنیقی میں [illegible] رومن حروف A نیز سنسکرت [illegible] و عبرانی [illegible] کا ہم اصل ہے۔ عربی رسم الخط پہلے پہل عربوں کی آمد (۷۱۰ء) کے ساتھ سندھ میں پہنچا۔ قدیم ترین دستیاب کتبہ مورخہ ۱۳۹ھ مارچ ۷۵۶ء میں بھنبھور سے برآمد ہوا۔ فی الوقت یہ رسم الخط اردو، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری، بلوچی کے لئے بعض تصرفات کے ساتھ، مگر عربی بلا تصرف مستعمل ہے۔

مخففات مثلاً: ع = عربی؛ [illegible] = رک (رجوع کرو)۔

اردو اور بنگالی کا مشترکہ ماخذ

ڈاکٹر محمد شہید اللہ

لسانیات کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بنگالی اور اردو دونوں ہی آریائی زبانوں یعنی ہند یورپی یا ہند ایرانی خاندان السنہ کی شاخیں ہیں - فارسی بھی آریائی شاخ کی ایک کونپل ہے - اگر ان تمام شاخوں کی اصل تک پہنچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں در اصل ایک ہی بولی ہیں - مثلاً لفظ ما (بنگالی)، ماں (اردو) پا (بنگالی)، پاؤں (اردو) ہات (بنگالی) ہاتھ (اردو) سات (اردو) اور ان کے فارسی مرادفات مادر، پا، دست اور ہفت -

ان الفاظ میں پا کے علاوہ بظاہر کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی - لیکن اگر ہم اس قدیم آریائی زبان کی طرف رجوع کریں جس کا خاکہ اوستائی قدیم ایرانی اور سنسکرت کے تقابلی مطالعہ سے تیار کیا گیا ہے، تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے ماخذ ایک ہی ہیں اور یہ الفاظ رفتہ رفتہ تلفظ میں تبدیلی سے رونما ہوئے ہیں - ذیل میں قدیم آریائی کے ساتھ ساتھ اوستائی، قدیم ایرانی اور سنسکرت کے مترادف الفاظ کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے ان کی ہم وضعی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا -

قدیم آریائی	اوستا	قدیم ایرانی	سنسکرت
ماتر، ماتا	ماتر، ماتا	ماتر، ماتا	ماتر، ماتا
پدا	پدا	پدا	پدا
زھستا	زستا	دستا	ہستا

ان الفاظ — ماتا، پدا، ہستا، سپتا سے ہیں درمیانی ہند آریائی یعنی پراکرت کے ما - پا - ہتھا - ستا کے ذریعے سے ان کے مترادف اردو، بنگالی الفاظ حاصل ہوئے -

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں نے سہولت کے خیال سے سنسکرت الفاظ ہی دئے ہیں - مگر درحقیقت یہ قدیم پراکرت کے الفاظ ہیں - سنسکرت بہت سے مواقع پر قدیم پراکرت بولی کی نمائندگی کرتی ہے مگر تمام جگہ یہ کیفیت نہیں بعض موقعوں پر سنسکرت کے قدیم پراکرت سے الفاظ ادھار لئے ہیں - لہٰذا یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ بنگالی اور اردو کا سلسلۂ نسب قدیم پراکرت سے ملتا ہے جو درمیانی ہند آریائی زبانوں کے واسطے سے ہم تک پہنچی - یہ وہ زبانیں ہیں جنہیں ہم کتابی پراکرتوں، پالی، پراکرت اور اپ بھرنش میں جلوہ گر پاتے ہیں -

یہ امر کہ بنگالی اور اردو تمام تر سنسکرت سے ماخوذ نہیں ہیں ان کے لغات کا امعان نظر سے مطالعہ کرنے پر بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے - مثلاً یہ الفاظ لیجئے -

بنگالی: تمی - بڑا - بھلا - باپ - دیکھے

اردو: تم - بڑا - بھلا - باپ - دیکھے

صاف ظاہر ہے کہ یہ لغات سنسکرت کے الفاظ توہم - برھت بھدرا - پتا - ڈرسیاتی سے ماخوذ نہیں ہیں - بلکہ یہ محققانہ قیاس کی بنا پر مرتب کی ہوئی قدیم پراکرت کے ان آریائی الفاظ سے ماخوذ ہیں تسمے - وددا - بھدلا - پتا - باپڑا - دکستی - جنہوں نے درمیانی ہند آریائی میں تمہیں - وڈا - بھلا - باپا - دیکھی کی شکل اختیار کر لی -

ایک جملہ لیجئے:

"تمی آمر باپ کے ایک ٹا بھلا گھوڑا دیو"

(تم ہمارے باپ کو ایک (پوربی ہندی میں ایک ٹھو) بھلا گھوڑا دو)
صریحًا یہ جملہ سنسکرت کے اس جملے سے ماخوذ نہیں۔
"یوام اسما سم پِتُرے ایکم بھدرم اسوم داتا"
بلکہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ اس قدیم پراکرت سے ماخوذ ہے، جس کا خاکہ ماہرین نے تیار کیا ہے۔
"تسمے اسماکارے باپراکترے ایکم بھدلم گھوٹاکم دیا تھا"
درمیانی ہند آریائی پراکرت میں اسے اس طرح ادا کیا جاتا:
"تمہی امھاکارے باپا کائے ایکم بھلم گھوڑم دیہا"
بعد کی درمیانی ہند آریائی بولی (اپ بھرنش) میں یہ جملہ یوں بدل جاتا ہے:-

"تمہی امھارا باپا کا ایکا بھلا گھوڑآ دیہا"
پرانی بنگالی میں اس کا ترجمہ یوں ہوگا:
"تمہی امھارا یاپا کا ایکا بھالا گھوڑا دیہا"

پرانی اردو۔ ہندی اس پرانی بنگالی سے زیادہ مختلف نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمتی سے پرانی بنگالی کے نمونے پرانے بودھی گیتوں (۱۰۵۰-۱۶۷۵ء) میں مل جاتے ہیں جو ایک قدیم نیپالی مخطوطہ میں محفوظ ہیں۔ مگر افسوس ہے پرانی اردو۔ ہندی بولی کا ایسا کوئی پرانا محفوظ مخطوطہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لئے پرانی بنگالی کے متعلق ہم جس وثوق سے بات کر سکتے ہیں، پرانی اردو ہندی کے متعلق نہیں کر سکتے۔

اردو اور بنگالی کی صوتیات بہت سی باتوں میں مماثل ہیں۔ ان زبانوں میں سنسکرت کے برعکس کوئی بھی لفظ دو کٹھے ثقیل سے شروع نہیں ہو سکتا۔ یہ خصوصیت ان دونوں نے درمیانی ہند آریائی سے حاصل کی ہے۔ چنانچہ جہاں قدیم پراکرت (سنسکرت) میں لفظ ترِینی نظر آتا ہے وہاں درمیانی ہند آریائی میں تِنّی ہے اور بنگالی و اردو میں تین۔ اس طرح قدیم پراکرت (سنسکرت) میں کسورا (ک سورا) ہے تو درمیانی ہند آریائی اور بنگالی و اردو میں کھُر بمعنی استرا ہے۔ بنگالی اور اردو دونوں اس لحاظ سے آپس میں ملتی جلتی ہیں کہ ان میں ڈھ اور ڈ شروع الفاظ میں آتے ہیں۔ مثلاً ڈر۔ ڈھال وغیرہ۔ لیکن ڈھ اور ڑ الفاظ کے اندر آتے ہیں مثلاً بنگالی برا اردو بڑا۔ بنگالی پرو اردو پڑھو۔ موجودہ بنگالی میں ڑھ بدل کر ڑ ہو گیا ہے۔ مثلاً درمیانی بنگالی بوڑھا۔ بڑھے۔ موجودہ بنگالی بوڑا۔ بڑے۔ سنسکرت میں ڑ اور ڑھ کوئی نہیں۔ بلکہ صرف ڈ اور ڈھ ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک صوتیات کا تعلق ہے بنگالی و اردو سنسکرت سے ماخوذ نہیں ہو سکتیں۔ ویدی، پالی اور کتباتی پراکرتوں میں ڈھ اور ڑ کی آوازیں موجود ہیں لیکن اردو اور بنگالی کی طرح یہ الفاظ کے شروع میں نہیں آتیں۔ اگرچہ اردو قدیم پراکرت کے خاندان سے ہے مگر اس کا تعلق نئی ہند آریائی زبانوں کے مرکزی گروہ سے ہے اور بنگالی کا پوربی گروہ سے۔ اس لئے ان کے ذخیرۂ الفاظ اور صوریات (MORPHOLOGY) میں لازماً فرق ہوگا۔ مثلاً بنگالی لفظ چوکھ قدیم پراکرت اور سنسکرت میں چکسو ہے۔ مگر اردو لفظ آنکھ قدیم پراکرت اور سنسکرت اکسی سے ماخوذ ہے۔ بنگالی ماتھا قدیم پراکرت اور سنسکرت کا مستک ہے۔ اردو میں اس کی جگہ سر مستعمل ہے جو قدیم پراکرت اور سنسکرت کے شیرہ سے ماخوذ ہے لیکن اردو میں ماتھا کے معنی پیشانی ہیں۔ بنگالی چول قدیم پراکرت اور سنسکرت میں چوڈا تھا مگر اردو میں بال ہے جو اصل قدیم پراکرت اور سنسکرت میں بالا تھا۔ صوریات میں اس قسم کے فرق ظاہر

آتے ہیں:

[illegible] گالی گھرے - گھرے - اردو: گھر سے - گھر میں -

مستعار الفاظ میں بھی اکثر بنگالی اردو الفاظ ایک ہی ہیں جیسے

[illegible] بنگالی ہے - بغل - بگل - شہر - بیمار - مرغی - [illegible] بعض

مستعار الفاظ، خاص کر مذہبی مصطلحات، اردو

اور بنگالی دونوں کے مسلمان بولنے والوں میں

مشترک ہیں جیسے خدا - خالہ - نماج (نماز) -

روجہ (روزہ) بہشتا (بہشت) - دوجخ

(دوزخ) -

بنگالی اور اردو کے مشترکہ الفاظ کی

دو شقیں مقرر کی جاسکتی ہیں:

۱ - دیسی الفاظ جو قدیم پراکرت سے مشتق و

ماخوذ ہیں جیسے ما - باپ - تین - دیکھ -

۲ - غیر بولیوں سے مستعار الفاظ جیسے

جامہ - رومال - جہاج (جہاز) - چاکر وغیرہ -

شق نمبر ۲ کی ذیل میں ایسے الفاظ بھی

لائے جاسکتے ہیں جو مسلمانوں میں عام اور

مشترک ہیں جیسے خدا - بہشت - حلال حرام

وغیرہ - اگر ان دونوں زبانوں کے مشترک الفاظ

کی ایک مکمل فہرست مرتب کی جائے تو یہ اردو

اور بنگلہ کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے بڑی

مدد ہو سکتی ہے -

ذیل میں دونوں کے ایسے مشترکہ

الفاظ کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو قدیم

پراکرت سے ماخوذ دیسی الفاظ کی ذیل میں

آتے ہیں - ان کی تین ذیلی قسمیں مقرر کی

جاسکتی ہیں -

(۱) الفاظ جو بعینہٖ ایک ہیں جیسے پانچ -

گھوڑا - چور - چاند - تارہ - پھل - آم - کھا -

چال - جا - دیکھ - مار - مر - کر وغیرہ -

(۲) وہ الفاظ جن میں کچھ کچھ فرق

ہے - اردو میں اکثر الفاظ کی ابتدائی حالت نظر آتی ہے جیسے:

اردو: بہن - ہاتھ - آٹھ - بارہ - آگ - کتا - گدھا -

بول - سونگھ - پڑھ -

بنگالی: بون - ہات - آٹ - بارا - اگن - کُکر - گادھا -

دوئی - بال - شونک - پڑ -

(۳) ایسے الفاظ جو ماخذ میں مختلف

ہیں - جیسے:

اردو: چوہا - جھڑیا - چیونٹا -

پکا - پھینک - کود - گبر -

بنگالی: اِندر - مکھی - پمپرا - راندھ -

پھیل - لیمہ - پڑ -

نہ صرف صوتیات اور ذخیرۂ الفاظ

بلکہ صوریات اور صرف میں بھی اردو اور

بنگالی میں بہت کافی مشابہت پائی جاتی ہے -

فاعلی اور مفعولی حالتوں میں علامات

فاعلی و مفعولی دونوں میں نہیں ہوتیں جیسے

گھوڑا چلے - گھوڑا دیکھ - حالتِ ظرفی کے لئے

جہاں بنگالی میں کے آتا ہے وہاں اردو میں

کو آتا ہے - اور یہ دونوں قدیم پراکرت سے

مشتق ہیں - مثلاً:

بنگالی: تمی بودھ کے دیو -

اردو: تم بدھا کو دو -

قدیم پراکرت: تسمے بدھا کرتے یا تھا -

سنسکرت: یُوام لبودھایا دتّا -

حالتِ اضافی کی کیفیت یہ ہے:

بنگالی	اردو	پراکرت	سنسکرت
امارا	میرا یعنی ہمارا	اسماکاریا	اسماکم
تمار	تمہارا	تسماکاریا	یوسماکم

اردو اور بنگالی میں گردان میں صیغہ غائب واحد

حال میں جو حرفِ علت اے لگاتے ہیں مثلاً

چلے - جاتے 'دہ قدیم پراکرت (نیز سنسکرت)

(باقی صفحہ [illegible] پر)

پہلا قدم

شہزاد احمد

کہاں چلے ہو، یہی روشنی کا جنگل ہے
سمے کے روپ میں لمحہ نہیں ہے مشعل ہے
ہوا کے پاؤں میں موسیقیوں کی چھاگل ہے
اسی نگر کی فضا خوشبوؤں سے بوجھل ہے
بسا ہوا کئی رنگوں میں ایک ہی پل ہے

یہ مرغزار ہمارے ہی خون کا پھل ہے

نئی امید نگاہوں میں مسکراتی رہے
یہ چاندنی اسی دنیا میں جگمگاتی رہے
ہوائے نغمگی اپنی طرف بلاتی رہے
نئے دیار نئے زندگی دکھاتی رہے
ہر ایک گام پہ منزل قریب آتی رہے

یہی امید مرے راستے کی مشعل ہے

جو کل گزر گیا اس کا ہمیں ملال نہیں
زمین کل کی طرح آج پائمال نہیں
وہ وقت آئے گا پھر اس کا احتمال نہیں
نہیں نہیں ہمیں ایسا کوئی خیال نہیں
یہ ایک عمر ہے شہزاد ایک سال نہیں

مگر یہ لمحۂ آخر نہیں ہے اوّل ہے

غزل

مشفق خواجہ

سمجھ رہا ہوں مقامات عظمت آدم
میں آپ اپنا پرستار، آپ اپنا صنم

ترے فراق مسلسل نے لاج رکھ لی ہے
وگرنہ کھل گیا ہوتا یہ زندگی کا بھرم

چلو کہ اس سے ستم ہی کی التجا کر لیں
کہ مرگِ عشق ہے دورِ تغافلِ پیہم

درونِ مے کدہ کیا کیا رہے ہیں ہنگامے
جو گزرے ہیں پسِ دیوارِ میکدہ کبھی ہم

یہ ایک لمحہ جو منسوب تیرے ہجر سے ہے
اس ایک لمحے میں صدیاں گزار بیٹھے ہیں ہم

طلوعِ صبح بھی تیری ہی اک جھلک ہوگی
اسی خیال میں ہم نے گزار دی شبِ غم

وہ اک نگہ جو زمانے سے بے خبر کر دے
وہی نگاہ اگر دے گئی زمانے کا غم؟

یہ کم ہے کیا کہ ترا التفات گرمیٔ بزم
یہ اور بات کہ محرومِ التفات ہیں ہم

حکایتِ غمِ دل مختصر ہی اچھی تھی
وضاحتوں سے تو یہ اور بھی ہوئی مبہم

ن:

صفی الدین احمد ـــ ایک نقاش فطرت

جی۔ ایم بوچر

دو سال ہوئے پانچ نوجوان نقاشوں ـــ صفی الدین احمدؔ مرتضیٰ بشیر، علی امام، احمد پرویز اور انور جلال شمزا نے باہم مل کر لندن میں پاکستانی مصوروں کا ایک حلقہ قائم کیا۔ چنانچہ نومبر ۵۹ء میں ان کی تصاویر کی جو نمائش منعقد ہوئی وہ یورپ میں اپنی قسم کی پہلی نمائش تھی۔

ایک حلقہ کی حیثیت سے ـــ اور جہاں تک کسی گروہ کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اس کے کوئی یکساں رجحانات ہیں ـــ یہ کہنا بجا ہے کہ ان نقاشوں کا مطمح نظر پاکستان کی موجودہ زندگی کا، جیسی کہ وہ حقیقتہً ہے، مربوط مرتب عکس پیش کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہ تو دانستہ روایتی اوضاع و اسالیب کے احیا سے دلچسپی رکھتے ہیں، نہ پرانی یا نئی مغربی تصاویر کے طور و طریق یا مسائل کی نقالی کے قائل ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ چونکہ یہ ایک نوزائیدہ قوم کی حیثیت سے ثقافت کے میدان میں آگے بڑھنے کے لئے ابھی سرحد ہی پہ کھڑے ہیں، اس لئے ان کے سامنے کوئی جچی تلی راہیں یا طور طریق نہیں ہیں۔ لہٰذا ان مصوروں کے کام کی طرف اس انداز سے رجوع کرنے سے ان پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ یہ تو ان فن کاروں کی جرأتِ کردار کی دلیل ہے کہ انہوں نے پٹے ہوئے آسان راستے چھوڑ کر ایک نئی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں زیادہ کاوش کی ضرورت ہے۔ آخر یہ بات بھی تو اپنی جگہ ایک مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کہ جب تک فنکار غیر معمولی جدوجہد اور محنت و مشقت سے کام نہ لے اور تکلیف برداشت نہ کرے، اس کی شخصیت نشوونما نہیں پا سکتی۔

یہ بات لندن میں مقیم پاکستانی نقاشوں میں سے کم از کم ایک ـــ صفی الدین احمدؔ کے بارے میں بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ وہ ۳۸ برس ہوئے کلکتہ میں پیدا ہوا۔ اور کسی انسان کے راستے میں جو زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں اور پریشانیاں ہو سکتی ہیں وہ ان سب سے دوچار ہوا ہے۔ مثلاً اپنوں کی بے مہری کے سبب خاندان سے اخراج، ہم فنوں کی طرف سے بے پروائی، غریبی و محتاجی۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ ہولناک حادثے جن سے لوگ آزادی کے پُرآشوب زمانے میں دوچار ہوئے۔ اسکی زندگی کے موٹے موٹے واقعات یہ ہیں: ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ سکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس، کلکتہ سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۴۷ء میں ڈھاکہ کو ہجرت، ڈھاکہ گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس میں لکچرار اِن گرافک آرٹ کی حیثیت سے تقرر۔ ۵۷ء سے یورپ، اور لندن میں بڑی سرگرمی سے مشق فن اور مطالعہ۔

دو سال قبل پاکستان کو واپس جاتے وقت صفی الدین نے نیو ویژن سنٹر گیلری، لندن میں اپنے سولہ نقوش اور کندہ کاری کے نمونوں کی نمائش کا اہتمام کیا جو بلاشبہ ان کی یورپ میں فن کارانہ زندگی کا منتہائے عروج تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مذکورہ گیلری تجریدی فن کو فروغ دینے ہی کے لئے مخصوص ہے۔ شاید یہ سن کر بعض لوگ خفا ہوں۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمیں مس اشٹین کی یہ تنبیہہ یاد رکھنی چاہیئے کہ جو چیز بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتی ہے" ممکن ہے کچھ دیر بعد عجیب نہ رہے" کیونکہ غور سے دیکھا جائے تو آخر تجریدی فن کار بھی تو اول اول تو روایتی نہج ہی پہ چلتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا خوگر ہو کر ایسا انداز اختیار کرتا ہے جس میں قدرتی وضع و ہیئت کی پابندی برابر کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ صفی الدین کی تصاویر کا فطرت

صفی الدین احمد
(ایک نقاش فطرت)
مضمون صفحہ ۳۶)
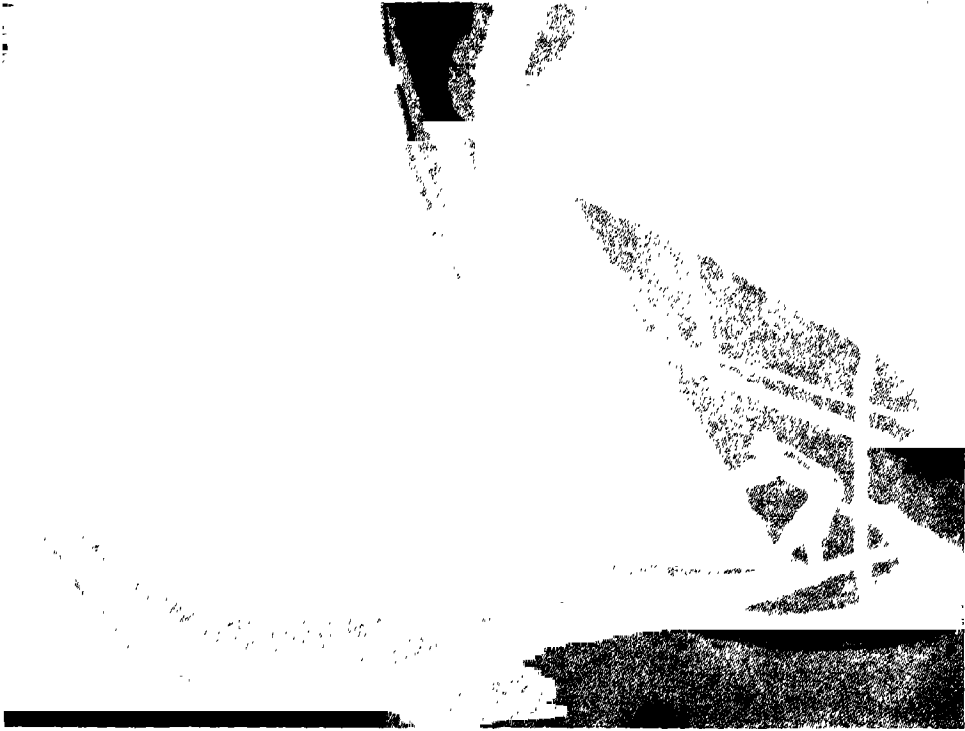
بحدم جال لے کر مچھیرے"
(کھدائی کا کام)

جال اور ناؤ : آفتاب صبح کی آغوش میں (نقاشی)
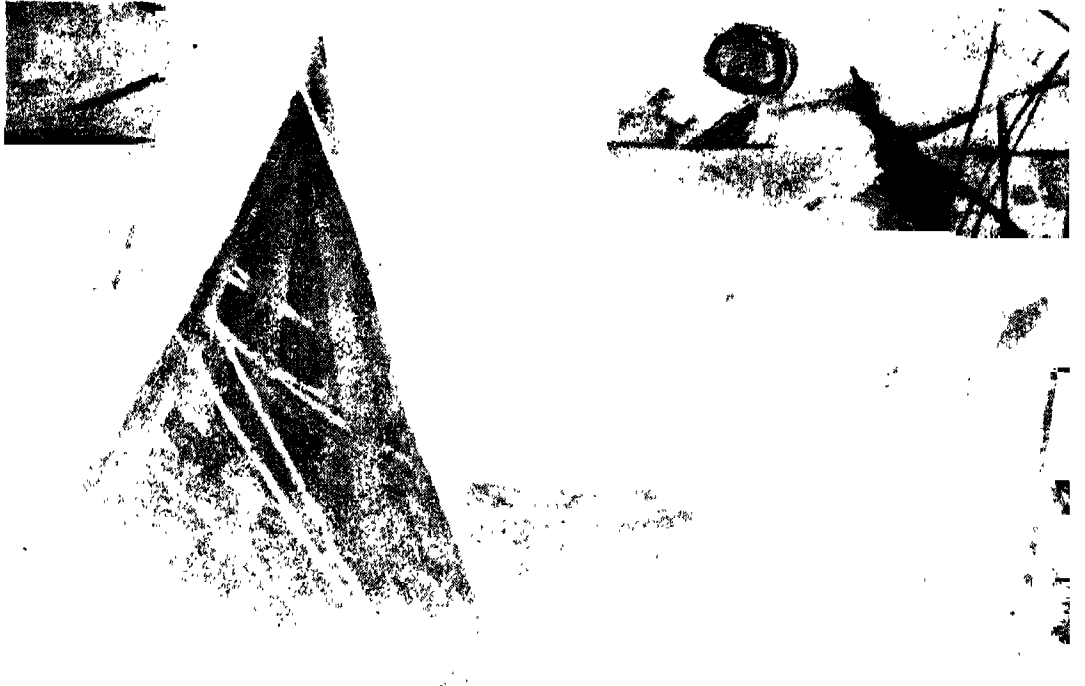
"تصویر خانہ ہے دنیا!"

★
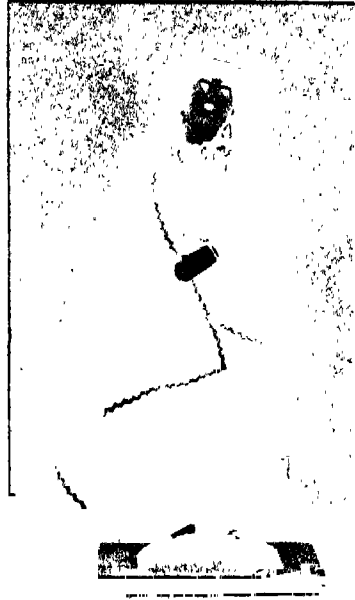
گڑیاں یوں تو بچوں کا کھیل اور دل بہلاوا ہیں مگر ان کے بنانے میں بھی مہارت، ذوق، خوش سلیقگی اور فنون لطیفہ سے مناسبت ضروری ہے ۔ یہ ہماری ثقافت اور علاقائی طرز بود و ماندکی عکاسی و نمائندگی بھی کرتی ہیں ۔

★

(کراچی میں حال ہی میں گڑیوں کی نمائش ہوئی جس کے چند دلکش نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں)

کے ساتھ کوئی واسطہ ہی نہیں۔ بلکہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ جیسا کہ فضل لوہانی نے تصاویر کی فہرست میں بیان کیا ہے۔ صفی الدین کی کندہ کاری اور تصاویر کا موضوع 'سیلاب' ہے۔ وہ قدرتی حادثہ جو دوآبہ گنگا کی زندگی کا تقریباً مستقل عنصر رہا ہے۔ اور جس سے اپنے دیس کے کئی لوگوں کی طرح اس نے بھی بے انتہا نقصان اٹھایا ہے؛ جس بات میں وہ روش عام سے الگ ہو جاتا ہے وہ ہے زناٹے سے چلتے ہوئے پانی، اس کے اتار چڑھاؤ، نیز نیچی سطح پر اڑتے ہوئے بادلوں، امڈتے ہوئے سیلاب اور پانی میں غرق زمین کے ملے جلے، پیچیدہ تیور۔ ایسے نقوش سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے بے اختیار ہنری مور کا یہ قول یاد آتا ہے کہ وہ "جو چیز بھی دیکھے اس میں کوئی صورت "ٹھیک لگائے دیکھ سکتا ہے۔ خواہ یہ چیز دیوار پر دھبہ ہو یا سیاہی کا چھینٹا یا محض ایک کنکر۔" اگرچہ ان دونوں طریقوں کی بنیاد قدرت ہی کے بنیادی اوضاع پر ہے پھر بھی جس طور سے انہیں نبھایا جاتا ہے وہ ایک اور اعتبار سے بالکل جداگانہ ہیں۔ مور پہلے ایک ہیولے کا تصور کرتا ہے اور پھر اسے جس قماش میں بھی چاہے سمو دیتا ہے۔ اس طرح وہ جو محاکات کام میں لاتا ہے اس کی تمثیلی وضع پہلے ہی سے تصور کئے ہوئے ہیولے اور اُس قماش سے جس پر اسے منطبق کیا جاتا ہے، ذووجہین یعنی دوگونہ نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس صفی الدین کی محاکات کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جن قدرتی قوتوں کو پیش کرتا ہے انہیں خارجی منظر سے اخذ کر کے ہموار سطح پر خطوط اور اشکال میں منتقل کر دیتا ہے۔

ابھی میں نے صفی الدین کی تصاویر اور گرافک یعنی ٹھوس قماش کے کام میں امتیاز نہیں کیا۔ اور وہ خود بھی اس کا قائل نہیں۔ اس کے لئے دونوں صورتوں میں معاملہ ایک ہی ہے۔ جو بھی قماش، یعنی مادی ذریعۂ اظہار وہ اختیار کرے اس میں وضع، خطوط اور علاقیت برابر کام آتے ہیں۔ یہاں ممکن ہے کسی کو مجھ سے اختلاف ہو۔ میری رائے میں آج کل جنوبی ایشیا کے فنون نفیسہ مثلاً نقاشی میں جن خطوط، اوضاع اور رنگوں کا غلبہ معلوم ہوتا ہے ان میں اور ٹھوس قماش کے کاموں ... مثلاً کندہ کاری اور کھدائی کے خطوط، اوضاع اور رنگوں کی انواع و اقسام میں خاص مناسبت پائی جاتی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ صفی الدین صرف پاکستان ہی میں ان ذرائع کے استعمال میں ایک اہم پیشرو کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ مغربی معیاروں کے مطابق بھی ایک استاد فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس ضمن میں اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہے کہ اس کا ٹھوس کام دو برس ہوئے سینٹ جارجز گیلری (لندن) رائل سوسائٹی آف پنٹرز، ایچرز، اینڈ انگریورز۔ لندن۔ انٹرنیشنل۔ ٹرائی اینیل آف اُرجنل کلر گرافک آرٹ۔ گرچن (سوئٹزرلینڈ) کے اور رائل اکاڈمی آف لندن جیسے مشہور و معروف ادارے اپنی نمائشوں کے لئے انتخاب کر چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں جو آخری بات میرے خیال میں جمالیاتی اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہے جس کا ذکر میں نے کسی اور موقع پر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

" مغربی آرٹ میں بنیادی تصور یہ ہے کہ کسی تصویر میں اندرونی تعمیری وحدت لازم ہے۔ علامات کی ذومعنی وضع کا ایک اندرونی تانا بانا اور باہمی نظم و ربط ہونا چاہئے۔ اس کے برعکس اسلامی فنون کا روایتی پیرایہ یہ ہے کہ کسی فن پارے کے مختلف اجزا آپس میں بہت قریب تو لائے جاتے ہیں لیکن ان میں صوری وحدت پیدا نہیں کی جاتی۔ یوں لگتا ہے جیسے اجزا میں تقابل اور تنوع پیدا کرنے کی غرض سے ایسی ترکیبیں قصداً استعمال کی جاتی ہیں۔ چنانچہ گنبد ہمیشہ مینارے سے ملحق ہوتا ہے، متحد نہیں ہوتا۔ مغرب میں اندرونی فنی وحدت کا روایتی تصور ناظر کے لئے تخلیقی تشریح کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا — اس کے برعکس اسلامی روایت یہ ہے کہ ناظر کی اس شمولیت پر خاص زور دیا جائے۔ چنانچہ گانے میں آواز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں جیسا کہ مغرب میں ہے۔ بلکہ یہ بات سامع پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ اپنے تخیل سے اس کی کامل ادائگی کا تصور کرے۔

اگر اس استدلال کو تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں اس کے نتیجہ کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ صفی الدین کی تصویر 'جال'۔ کشتی اور سورج کا موازنہ اس کی کندہ کاری،

باقی صفحہ ۵۴ پر

افسانہ:

دل کی گہرائیوں میں

انور

جب دروازہ پر دستک ہوئی میں اپنے افسانے کا یہ ٹکڑا بلند آواز سے دہرا رہا تھا:

"کون میری زندگی کے افق پر چودھویں رات کے چاند کی طرح ابھر آیا ہے؟ کس نے میری کائنات کے تاریک ترین گوشوں کو روشن کر دیا ہے؟ کون میرے خیالات اور احساسات پر چھاتا چلا جا رہا ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟"

دروازہ کھلا آواز آئی۔

"میں ہوں شہناز"

میں نے قلم میز پر رکھ دیا اور مسکراتا ہوا شہناز کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ شہناز نے اپنا ہینڈ بیگ میز پر میرے قلم کے پاس رکھ دیا۔ اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا بڑبڑا رہے تھے آپ۔ دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتی رہی"

"نواز کی کہانی لکھ رہا ہوں۔ آپ بڑے رومانٹک موقع پر پہنچی ہیں"

"کیا رومانٹک موقع؟"

"نواز اپنی محبوبہ کو خط لکھ رہا ہے؛

"۔۔۔ کون میری زندگی کے افق پر چودھویں رات کے چاند کی طرح ابھر آیا ہے۔ کس نے میری کائنات کے تاریک ترین گوشوں کو روشن کر دیا ہے کون میرے خیالات اور احساسات پر چھاتا چلا جا رہا ہے۔ کون ہے؟ کون ہے؟

آپ نے دروازہ کھول کر کہا۔ میں ہوں شہناز"

شہناز ہنسنے لگی اور بولی۔

"آپ کیوں رومانٹک افسانہ نگاری میں وقت ضائع کرتے ہیں؟ ہمیں بہت کام کرنا ہے"

شہناز میں اور مجھ میں جسموں کی جاذبیت کارفرما نہیں۔ جسموں کی جاذبیت تو بڑی خطرناک چیز ہے۔ جسموں کی جاذبیت تو ایک جال ہے جس میں سادہ لوح دل اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اور پھر تمام عمر کے لئے شادی کے پاگل خانے میں پڑے چیختے رہتے ہیں۔ شہناز اور مجھ کو تو صرف سوشل کاموں نے یکجا کر دیا ہے۔ جب کام ختم ہو جاتا ہے شہناز اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ اور میں اکیلا اپنے فلیٹ میں بیٹھا رومانٹک افسانے لکھتا رہتا ہوں۔

میں نسوانی حسن کی جاذبیت سے بےحد ڈرتا ہوں۔ اس لئے جب میں کسی لڑکی کو دور سے اپنی طرف آتے دیکھتا ہوں تو میرے منہ سے بے اختیار دعائیں نکلتی ہیں، یا باری تعالیٰ! یہ لڑکی بدصورت ہو۔ نہیں تو میں آفس سے لیٹ ہو جاؤں گا۔ یا باری تعالیٰ! تو ہی میری عزت اور میری صحت کا رکھوالا ہے۔ اور اگر وہ لڑکی بدصورت ثابت ہو تو مجھے بے تحاشا خوشی ہوتی ہے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں آف ڈیوٹی (OFFDUTY) ہو گیا ہوں۔ جیسے اور بھی غم ہیں زمانہ میں محبت کے سوا۔ مثلاً قطار کو توڑ کر بھاری ہجوم کو چیرتے ہوئے بس پر سوار ہونا۔ یا چاقوؤں یا لاٹھیوں کی مدد سے میونسپلٹی کے نلکے سے پانی کی بالٹی لینا۔ قدرت نے اس دنیا میں خوبصورتی اور بدصورتی کا تناسب بہت چابکدستی سے رکھا ہے۔ حسن کے عالمی مقابلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں ایک سال میں صرف ایک عورت حسین ہوتی ہے باقی سب بدصورت۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور اس دنیا کی ہر عورت حسین ہوتی تو عورتوں اور مردوں کی مخلوط پارٹیوں میں کھانے کی میز پر عورتوں کے سامنے بیٹھے ہوئے مرد چھریوں سے اپنی انگلیاں کاٹ لیتے۔ حسن ایک جادو ہے جو جاگتوں کو سلا دیتا ہے اور زندوں کو مردہ کر دیتا ہے۔

شہناز نے پوچھا۔

"آپ نے وہ مضمون ختم کر دیا جس کا عنوان 'خدا' تھا؟"

میں نے جواب دیا۔

"نہیں۔ نواز کے ٹیلیفون نے ڈسٹرب کر دیا"

"دیکھئے ہم اپنی ذمہ داریوں کو نظرانداز کر رہے ہیں"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن نواز کی باتیں اس قدر دلچسپ تھیں کہ میں یہ مضمون چھوڑ کر اس کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا"

"کونسی ایسی دلچسپ باتیں تھیں وہ؟" شہناز نے مطالبہ کیا

"نواز نے خوشخبری سنائی کہ اس کا دسواں بچہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گیا ہے۔ میں نے حیران ہو کر جواب دیا۔ تم نے پچھلے سال بھی ایک بچہ کے ورود مسعود کا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا ہاں۔ وہ ۱۹۵۹ء کا موڈل تھا۔ یہ ۱۹۶۰ء کا موڈل ہے۔ ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک میرے ہاں ہر سال جنوری میں ایک نیا موڈل وارد ہوتا ہے۔ اب یہ دسواں ۱۹۶۰ء کا موڈل ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ او بیوقوف! کچھ فیملی پلیننگ کا بھی خیال کر۔ خاندان کی صحت اور مسرت کے لئے خاندانی منصوبہ بندی نہایت ضروری ہے۔ وہ بولا۔ یار! میں فیملی پلیننگ کے حق میں نہیں۔ ہماری قوم کے لئے خاندانی منصوبہ بندی بہت نقصان دہ ہے۔ آخر ہمارے پاس یہی تو ایک انڈسٹری ہے جس میں ہمیں ایک بہت بلند مقام حاصل ہے۔ ہم کیوں اپنی یہ بین الاقوامی پوزیشن ضائع کریں۔ جب بڑے پیمانے پر ریزر بلیڈ بنانے کے لئے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں تو بڑے پیمانے پر بچے بنانے کے لئے بھی لائسنس جاری ہونے چاہئیں۔ نہیں تو آنے والی جنگ میں توپوں کو گھاس کون ڈالے گا! میں بڑی بدتمیزی سے ٹیلیفون پر ہنسنے لگا۔ اور چلایا: نواز مجھے آج معلوم ہوا کہ تم ایک عظیم فلسفی ہو۔ تم ایک بہت بڑے دماغ کے مالک ہو۔ میں حیران ہوں کہ اتنے بڑے دماغ کا بوجھ انسان کے کندھے کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ بوجھ تو کسی گدھے کے کندھوں پر ہونا چاہیئے!"

شہناز چپ چاپ سنجیدہ بیٹھی رہی۔ جب شہناز کو کسی بات پر اعتراض ہو تو وہ چپ چاپ سنجیدہ بیٹھی رہتی ہے۔ اور اپنی ناک سکیڑ کر فضا میں تکتی رہتی ہے۔

"اور نواز کی اس محبوبہ کا کیا ہوا جس کو وہ اس قدر رومانٹک خط لکھا کرتا تھا؟"

"نواز کی محبوبہ ایک بہت زرخیز بیوی ثابت ہوئی۔ وہ نواز کی زندگی کے افق کو پھاند کر اس کے گھر میں آگھسی۔ اور اس کی کائنات کے تاریک ترین گوشوں کو ٹورچ لائٹ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان میں بچوں کے بیڈروم بنا دیئے۔ اور اب وہ نواز کے اعصاب پر اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ آج صبح اس نے مجھ سے ٹیلیفون پر وٹمین بی کومپلکس کی ایک درجن بوتلیں منگوائی ہیں"۔

"شہناز نے اپنی ناک سکیڑی اور بولی۔

"میں احتجاج کرتی ہوں۔ آپ صنف نازک کے بارہ میں توہین آمیز لہجہ میں باتیں کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"شہناز! تم ایک سوشل ورکر ہو۔ تمہیں جذبات سے کوئی سروکار نہیں"

"جی ہاں۔ میں سوشل ورکر ہوں لیکن میں دماغ کے ساتھ دل بھی رکھتی ہوں"

یکایک شہناز نے کردار کا ایک نیا زاویہ میرے سامنے رکھ دیا۔ یک بیک اس کے نگینے کا ایک اچھوتا پہلو نظروں کے سامنے آگیا۔ اور میں حیران رہ گیا۔

شہناز نے اپنی زندگی کے اس کمزور گوشے کو بڑے اہتمام سے چھپا رکھا تھا۔

اس کے دل میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی تڑپ تھی۔ اس کے دل میں مزدوروں اور کسانوں اور جھونپڑیوں اور گاؤں میں کام کرنے کی آگ تھی۔ اس لئے اس نے اپنے سینے سے اپنا دل نکال کر اس کی جگہ ایک اینٹ رکھ دی تھی۔ اینٹ تعمیر کا سمبل ہے۔ دل آگ میں پگھل جاتا ہے۔ اینٹ آگ میں پختہ ہوتی ہے۔ اینٹ آگ میں پختہ ہو کر چٹان بن جاتی ہے۔

ایک دن میں نے کہا۔

"شہناز! میں تمہارے سوشل کام کے جذبہ کی قدر کرتا ہوں لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم مردوں کے ساتھ کام کرنے کے بجائے عورتوں کی کسی سوشل ویلفیئر سوسائٹی کی ممبر بن جاؤ۔ غالباً عورتوں کے ماحول میں تم زیادہ آزادی سے کام کر سکو گی"

اس نے جواب دیا:

"مشورے کا شکریہ۔ لیکن ہماری عورتوں کی سوشل ویلفیئر سوسائٹیاں تو بے بی شو اور مینا بازار اور رننگ کی حدود سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اور میری پیاس شبنم سے بجھنے والی نہیں۔ میری پیاس کے لئے بحرِ بے کراں چاہیئے"

"لیکن تمہیں مردوں کے ساتھ کام کرنے کے خطروں کا بھی احساس ہے تمہیں معلوم ہے کہ کبھی کبھی پُراسرار فضاؤں میں سے گھوڑے پہ سوار ایک نوجوان آتا ہے۔ اور لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے"

جی ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ کبھی کبھی پُراسرار فضاؤں میں سے گھوڑے پر سوار ایک نوجوان آتا ہے اور لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ لیکن میں لڑکی نہیں ہوں"

"اور تم کیا ہو؟"

"میں ایک چٹان ہوں"

شہناز خوبصورت ہے لیکن وہ بدصورت نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ دکھتی ہے۔ اس کی خوبصورتی اس کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سوشل کام کرنے والی خاتون کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیئے۔ خوبصورت سوشل ورکر قافلے کو منزل تک پہنچانے کی بجائے خود اس کی منزل بنجاتی ہے۔ قافلے والے اپنی منزل بھول کر اور اپنا رخت سفر رہزنوں کے حوالے کر کے اپنی حسین و جمیل رہنما کے آستانے پر سجدے کرنے لگتے ہیں حسن خود ایک منزل ہے جو انسان کی حقیقی منزل کے راستے میں رکاوٹ بن کے بیٹھ جاتا ہے۔ شہناز خوبصورت ہے لیکن وہ بدصورت نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس دن جب شہناز اور میں پنجاب کے ایک گاؤں میں انجمن ترقی دیہات کے سالانہ جلسہ میں مدعو تھے۔ شہناز کو دیکھ کر میرے حسن کے احساس کو بڑی ٹھیس لگی۔ اور میں نے غصے میں کہا۔

"شہناز مجھے تمہارا گنوار لڑکیوں کی طرح باندھا ہوا بالوں کا جوڑا سخت ناپسند ہے اور تم نے یہ سبز کناری والی نیلی ساڑھی کیا پہنی ہے کتنی بری لگتی ہے"

شہناز نے تنک کر کہا۔

"میں جنگ پہ جا رہی ہوں۔ میں نے زرہ بکتر پہنا ہوا ہے"

"جنگ پر جا رہی ہو؟ زرہ بکتر پہنا ہوا ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا شہناز؟"

"میں جون آف آرک ہوں"

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ شہناز بڑی ظالم ہے۔ بڑی سنگدل ہے۔ اس نے اس لڑکی کو جو اس کے جسم میں رہتی ہے۔ فولادی شکنجوں میں جکڑ کر بڑی بے رحمی سے مار ڈالا ہے۔ اور اب اس کی لاش پر کھڑی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔ میں کوئی معمولی لڑکی ہوں! میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔ میں جون آف آرک ہوں"

مجھے چپ دیکھ کر آخر جون آف آرک نے کہا۔

"اور آپ میرے بالوں اور میرے لباس میں دلچسپی کیوں لینے لگ گئے ہیں؟"

"میں نے اپنی آواز میں سنجیدگی اور وقار پیدا کر کے جواب دیا ——

"میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ مجھے بدصورتی سے نفرت ہے"

"شہناز چپ ہو گئی۔ میں بھی چپ ہو گیا۔

اس واقعہ کے دو ہفتے تک شہناز مجھے نہ ملی اور آج دو ہفتے کے بعد وہ میرے فلیٹ میں آئی تو میں ناول کی کہانی لکھ رہا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ لیکن میں نے اس کی طرف غور سے نہیں دیکھا۔ اور نہ اس کے آنے پر میں نے کسی غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا۔ جب وہ صوفے پر بیٹھ گئی تو میں نے بڑی بے پروائی اور بڑی بے حیائی سے ناول کی باتیں شروع کر دیں جیسے میرے پاس شہناز نہیں بیٹھی ہے۔ جیسے میں ایک چٹان کے پاس بیٹھا تھا جیسے میرے پاس جون آف آرک فولادی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ اور جب شہناز نے کہا۔ میں سوشل ورکر ہوں۔ لیکن میں دماغ کے ساتھ دل بھی رکھتی ہوں۔ تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اور میری نظریں اس پر منجمد ہو گئیں۔ شہناز ایک سنہری جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اور اس کے بالوں میں ایک گلاب کا پھول لگا ہوا تھا۔ اور اس کی دو چوٹیاں، اس کے سینے پر ناگنوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

شہناز نے کہا۔

"ایڈیٹر بڑی شدت سے آپ کے مضمون دعا کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ آپ کا مضمون موصول ہونے کی وجہ سے پرچہ لیٹ ہو گیا ہے۔ آج آپ کو یہ مضمون مکمل کرنا ہے

میں نے جواب دیا۔

"آج یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکے گا۔ میں مشغول ہوں۔"

"آپ نوازکی بیکار کہانی کو چھوڑیئے۔ کوئی بڑا کام کیجئے۔"

"میں نوازکی کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔"

"پھر کونسی اتنی بڑی مشغولیت ہے آپ کی؟"

"مجھے ایک گمشدہ لڑکی کی تلاش ہے۔"

شہناز نے جلدی سے میری طرف دیکھا۔ جیسے وہ گمشدہ لڑکی ے بارہ میں کچھ سوالات کرنا چاہتی ہو۔ لیکن اس نے مجھے گمشدہ لڑکی کے رہ میں کوئی سوال نہ کیا۔ اور نظریں جھکا کر کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

پھر وہ بولی۔

"اچھا آپ گمشدہ لڑکیوں کو تلاش کریں۔ میں وہ مضمون لکھتی ں۔ مجھے چند لفظوں میں اپنا خدا کا نظریہ بتا دیں۔"

میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"خدا ایک غیر معمولی طاقت ہے جو چٹانوں کے سینوں میں دل یدا کر دیتی ہے۔ خدا ایک بے پناہ قوت ہے جو انسانوں کے بالوں میں اب کے پھول اگا دیتی ہے۔"

شہناز چپ ہو گئی اور دیر تک چپ چاپ کچھ سوچتی رہی۔ پھر س نے کہا۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ایک چٹان کے سینے میں ں پیدا کر دیا ہے۔ کیا آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ نے میرے بالوں میں لاب کا پھول اگا دیا ہے۔ کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ خدا ہیں؟"

ں نے جواب دیا:

"میں ایک خدا ہوں۔ میں آرٹ کی تخلیق کرتا ہوں۔ میں افسانوں کا الق ہوں۔ میرے کردار میری مخلوق ہیں۔ میں چٹانوں کے سینوں میں ں پیدا کر سکتا ہوں۔ میں انسانوں کے بالوں میں گلاب کے پھول ا سکتا ہوں۔"

"اور میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے اپنے بالوں میں گلاب کا پھول آپ کے لئے نہیں لگایا۔ میرے صحن میں ایک گلاب کا پودا ہے اور یہ پھول اس گلاب کے پودے کا پہلا پھول ہے۔ آج صبح میں نے اپنے صحن میں گلاب کا پہلا پھول دیکھا تو میں نے اس کو فرط مسرت سے چوم چوم لیا اور توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔"

"اور میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بالوں میں گلاب کے پھول کے ساتھ اور ناگنوں کی طرح چمکتی ہوئی دو چوٹیوں کے ساتھ اور سنہری جارجٹ کی ساڑھی کے ساتھ آپ بے حد حسین لگ رہی ہیں۔"

شہناز نے کسی قدر ترش ہو کر کہا۔

"آپ میرا وقت ضائع مت کیجئے۔ مجھے یہ مضمون مکمل کر کے بھیجنا ہے۔"

میں نے جان کر ترش لہجے میں جواب دیا۔

"آپ اپنا وقت ضائع مت کیجئے۔ اس مضمون کا خیال چھوڑیئے۔ چپ چاپ میرے سامنے بیٹھی رہیئے۔ آرٹ کی تخلیق ہو رہی ہے۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ آپ میرا موڈل ہیں۔ اس دن جب آپ نیلی ساڑھی میں ملبوس میرے ساتھ پنجاب کے ایک گاؤں میں گئی تھیں، اس دن آپ شہناز تھیں۔ آج آپ ناز ہیں۔ صرف ناز۔ سراپا ناز! شہناز تو مجھے روز ملتی ہے۔ ناز کو میں نے آج پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ گلاب کے پہلے پھول کی طرح۔ شہناز تو مجھے ہر روز مل جاتی ہے۔ مجھے ناز کی ضرورت ہے اور جب مجھے ناز کی تلاش ہو گی تو میں پکاروں گا نازی۔ نازی تم کہاں ہو نازی؟ آؤ ہم آرٹ کی تخلیق کریں۔"

شہناز ناراض ہو گئی۔ اس نے گلاب کا پھول بالوں سے نکال کر میرے پیروں کے پاس پھینک دیا۔ دونوں چوٹیوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کندھوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ اور اپنے دائیں بازو سے اپنے چہرے کو چھپا کر صوفے کی بیک پر لیٹ گئی۔

میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"اور جب تم کمسن کم سمجھ بچوں کی طرح روٹھ کر لیٹ جاؤ گی تو میں کہوں گا: نازو۔ نازو! مان بھی جاؤ نازو بے بی۔"

اور پھر غضب ہو گیا۔ شہناز بچوں کی طرح رونے لگی۔ میں گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شہناز بری طرح سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ میں اس کے پاس گیا۔ اس کے بازو کو اس کے چہرے سے اٹھایا۔ اور ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کے چہرے کو اپنے سامنے کر کے بولا۔

"شہناز! شہناز! تم تو ایک چٹان ہو۔ تم تو جون آف آرک ہو۔ کبھی چٹانیں بھی پگھلتی ہیں؟ کبھی زرہ بکتر میں بھی زخم ہوتے ہیں؟ شہناز! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم نازی نہیں ہو۔ تم نازو نہیں ہو۔ تم شہناز ہو صرف شہناز۔"

شہناز نے میرا بازو جھٹک کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر زور زور سے رونے اور کراہنے لگی: "او میرے خدا! او میرے خدا!"

"جیون ندی کو بہنا ہے"

عبدالغفار چودھری
ترجمہ: احمد سعدی

ایک سہانی شام۔ تاریکی کے پردے پر ریلوے کے بعد سگنل کی سرخ روشنی یوں لگتی تھی جیسے کسی دوشیزہ کی پیشانی پر سیاہ بالوں کے سائے میں سرخ ٹیکہ جگمگا رہا ہو۔

نیل کھیت کی ریلوے کراسنگ سے گزرنے کے بعد ٹاؤن سروس بس دو منٹ کے لئے رکی۔ اس کے بائیں طرف اِدھر اُدھر جھکے ہوئے ٹیڑھے کبڑے بہت سے بارقیں اور دائیں طرف چند خوبصورت یک منزلہ مکانات تھے۔

بس کی لیڈیز سیٹ سے جوں ہی ممتا نیچے اتری، اس کی معین سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ معین شرما سا گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا جس میں بہت ساری الم غلم چیزیں بھری ہوئی تھیں اور بائیں میں ایک چھوٹی سی گٹھری تھی، اخبار میں لپٹی ہوئی، جس میں چھوٹے بچے کا ایک جوڑی جوتا تھا۔ پھر بھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے ممتا، تم ڈھاکہ کب آئیں؟"

ممتا بھی قدرے پریشان دکھائی دی۔ اس کے بائیں پیر کے سینڈل کا اسٹراپ یکایک ٹوٹ گیا تھا، اس لئے اُسے لنگڑا کر چلنا پڑ رہا تھا، اس نے کھڑے کھڑے ہی جواب دیا "یہی کوئی ایک مہینہ ہوا، ہمارا یہاں تبادلہ ہوا ہے۔"

"بہت خوب۔ گھر شاید قریب ہی ہے؟"

"ہاں، ہاں۔ اس موڑ کے قریب ہی۔ کوارٹر ابھی نہیں ملا۔ اسلئے فی الحال ایک دوست کے یہاں قیام ہے۔"

"گھر کا نمبر؟"

"ستائیس کا ایک بائی اے ....."

اتنے میں بس اسٹارٹ ہوگئی۔ معین نے کہا "راستہ مجھے معلوم ہے، کسی دن آؤنگا، ریحان سے کہہ دوگی؟"

وہ لپک کر چلتی ہوئی بس پر چڑھ گیا اور ممتا حیران نگاہوں سے تھوڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے چلتی بس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگی۔ اس وقت تک تاریکی کافی بڑھ گئی تھی اور سگنل کی سرخ روشنی اور بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

ممتا کو یاد آیا، معین کبھی کبھی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ تصویریں بنا رہا تھا، اس نے اس سے پوچھا تھا، کہو ممتا، تمہیں کون سا رنگ اچھا لگتا ہے؟"

ممتا کی عمر ان دنوں سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ سرخ ساڑی پہنے ہوئے تھی اور اس کے جوڑے میں سرخ پھول لگا ہوا تھا، اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا تھا "لال"۔

معین قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا "عورتوں کی نظر بھی خوب ہے۔ جانتی ہو سرخی کا انجام سیاہی ہے؟" اس قول کو آزمانے کے لئے ایک دن ممتا نے صبح سویرے اُٹھ کر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا تھا۔ اور تھوڑی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک بڑے سے سیاہ دائرے میں تبدیل ہوگیا ہو۔ جب اس نے اپنی آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ اس کی نظر کا دھوکا تھا اور اس کی نگاہ کو یہ فریب معین نے ہی سکھایا تھا۔

سگنل کی سرخ روشنی کو پیچھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ نہیں، اپنے اس واہمہ کو وہ اب کوئی اہمیت نہیں دے گی۔

دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہی ریحان نے دروازہ کھول دیا۔

"آج اتنی دیر کیوں ہوئی؟" اس نے پوچھا۔

"بس اسٹاپ پر معین سے ملاقات ہوگئی تھی۔"

"معین؟" ریحان نے بھنویں سکیڑ کر کہا "آج کل وہ کیا کرتا ہے؟"

"یہ سب باتیں دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا، اس نے کہا ہے وہ کسی دن یہاں آئے گا۔"

ریحان خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آہستگی سے پوچھا

م نے آج اپنی شاگرد کو کون سا گانا سکھایا؟"

"منذرل گیتی۔"

"کیسا گاتی ہے؟"

"برا نہیں، مگر اُسے کوئی شوق نہیں۔ شادی سے پہلے کسی اچھے
ے کی تلاش کے لئے یہ مشق ہو رہی ہے۔"

ریحان ہنسنے لگا۔ "سچ بتاؤ ممتا! شادی سے پہلے تم نے گانا
ں سیکھا تھا؟"

ممتا نے اپنی گردن کو ذرا سا خم کرتے ہوئے کہا "اس لئے کہ
، اچھا لگتا تھا۔ آج میرا وہی شوق میرے کام آ رہا ہے۔"

ماں کو دیکھتے ہی اس کی چھوٹی بچی دوڑ کر اس کے قریب آگئی اور
"ماں، ماں تم آگئیں۔ بھوک لگی ہے۔"

ممتا نے پیار سے بچی کا گال تھپتھپا کر کہا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی
ا پکاتی ہوں۔"

اس نے اپنے کپڑے تبدیل کئے اور ریحان کے قریب آکر بولی
ب معین آئے گا تو تمہیں تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑے گا۔"

ریحان ہنسنے لگا۔ "کیا بات ہے؟"

"اسے کہہ دینا تم ملازمت کرتے ہو۔ کوارٹر ملتے ہی اپنے دوست
مالی کر دو گے اور۔۔۔ اور۔۔۔۔" کہتے کہتے ممتا رک گئی پھر بولی
جو گانا سکھانے کا ٹیوشن کرتی ہوں، اس کا ذکر مت کرنا۔"

ریحان نے ایک طویل سانس لے کر کہا "بہت اچھا کہہ دوں گا۔"

اور ایک دن پھر بس اسٹاپ پر ہی اس کی معین سے ملاقات
۔ وہ سفید پنجابی پہنے ہوئے تھا اور اس کے ہونٹوں سے سگریٹ
دا تھا۔ وہ بس کا انتظار کر رہا تھا اور ممتا بھی اسی انتظار میں کھڑی
معین کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا "تم تو خوب آئے۔"

معین نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا "کام میں بے حد مصروف
س لئے نہ آسکا۔ روز ہی سوچتا ہوں کہ ایک مرتبہ ہو آؤں۔ مگر اس دقت
جا رہی ہو؟"

"ریڈیو اسٹیشن۔"

"تو گویا تمہارے گانوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے؟"

"درمیان میں تو یہ سلسلہ بالکل ہی بند ہو گیا تھا جب وہ یہاں
ہو کر آئے تو انہوں نے کہا۔۔۔۔"

معین نے کہا "سمجھ گیا۔ ریحان تو گانوں کا شیدائی ہے ہی۔"

ممتا نے سگنل کی طرف دیکھتے ہوئے سرخ روشنی تلاش کی، لیکن
دن کے وقت یہ روشنی کہاں؟

معین نے کھڑے کھڑے سگریٹ ختم کر دیا اور پھر اس کا جلتا ہوا
آخری ٹکڑا دور پھینکتے ہوئے بولا "مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ رکشا میں
ایک ساتھ چلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

ممتا نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر جواب دیا "نہیں، اعتراض کرنے
کی عمر سے کیا میں آگے نہیں بڑھ چکی؟"

معین نے رکشا میں بیٹھتے ہوئے کہا "ابھی تمہاری عمر ہی کتنی
ہے جو تم اس قسم کی باتیں کرتی ہو؟"

"عورت کی تیس سال عمر کیا کم ہوتی ہے؟"

معین نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ کوئی زیادہ نہیں۔ شاید تم نے
بہت دنوں سے آئینہ میں اپنا چہرہ نہیں دیکھا۔"

"آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر عورتیں اپنے انا کی تسکین کرتی ہیں،
یہ بات تم نے کبھی سنی ہے؟" ممتا یکا یک ہنس پڑی۔

"یہ تم کیا کہتی ہو؟" معین نے چونک کر کہا۔ "ریحان اتنے ہی
دنوں میں کیا اتنا بڑا ملحد ہو گیا ہے؟"

ممتا پھر ہنسنے لگی۔ "نہیں، نہیں۔ میں ان کی بات نہیں کر رہی
یونہی مذاق کر رہی تھی اور تم کچھ اور سمجھ بیٹھے۔"

"میری نظروں کو تم دھوکا نہیں دے سکتیں۔" معین نے
مسکراتے ہوئے کہا "آج میں ورائٹی بوٹ پالش کے لیبل کا ڈیزائن
بنا کر پیسہ کماتا ہوں، لیکن ایک دن انہیں ہاتھوں سے۔۔۔۔"

ممتا نے حسرت بھرے لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے
پوچھا "تم بوٹ پالش کے لیبل کا ڈیزائن بناتے ہو؟"

"جب تم نے کسی جھجک کے بغیر اپنی بات مجھے بتا دی ہے تو
مجھے اپنی بات بغیر کسی جھجک کے بتا دینے میں تامل کیوں ہو۔ پہلے دن میں
اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے تمہارے سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا تھا،
لیکن آج مجھے کوئی شرم یا جھجک محسوس نہیں ہو رہی۔"

"اسی لئے تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔"

"میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہا بلکہ تمہارا حجاب ختم کئے دے
رہا ہوں۔" معین کی مسکراہٹ یکایک قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے

کہا یہ یاد کرو، ایک زمانے میں تم ہماؤ سنگار کی کتنی دلدادہ تھیں، مردوں کی آنکھوں کے آئینے میں تم جگمگاتی رہتی تھیں۔ تم کہتی تھیں تمہیں ایک ایسے مرد کی تلاش ہے جو تمہاری آنکھوں کے آئینے میں جگمگاتا رہے۔ اور آج وہی تم ہو...... ؟"

معین یکایک رک گیا۔ پھر اس نے کہا "شاید اب تمہیں کسی کی آنکھوں میں اپنی تصویر دکھائی نہیں دیتی ؟"

یکایک رکشا ایک جھٹکا کھا کر رک گیا۔ اس موڑ کے قریب ہی ریڈیو آفس تھا جب ممتا اتر گئی تو معین نے کہا "میرا مکان لکھی بازار میں ہے پرانے سینٹ گریگوری کالج کے قریب ہی نمبر بارہ۔ کسی دن ریحان کو ساتھ لے کر آؤ۔"

ممتا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اور ممتا آج جب گانے بیٹھی تو نہ جانے اسے کیا ہو گیا، بار بار اس کا گلا بھر آتا اور گلے کی جلن آنسو بن کر آنکھوں تلے اندھیرا کر دیتی بار بار اُسے خوف محسوس ہوتا، جیسے اس نے گانا بند کر دیا ہو، یہ تکلیف دہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا، اس نے ایسے گیت کا انتخاب کیا تھا کہ اس کے بول حلق میں اٹک اٹک جاتے تھے، بلکہ خاموش سر آواز کے دباؤ سے فریاد کرنا چاہتے تھے۔ پھر بھی وہ گیت گائے بغیر نہ رہ سکی" اے حسن والے! تیری دل موہ لینے والی رفاقت سے میرا جسم پاک ہو گیا ہے اور میرا دل خوشی کے خزانہ سے بھر گیا ہے۔"

خیالوں میں کھوئے ہوئے اُسے محسوس ہوا جیسے اس کی آواز کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہو، وہ حسین کہاں ہے، کہاں ہے؟ حسین تو کوئی بھی نہیں۔ نہ معین، نہ ریحان اور نہ وہ خود ہی حسن والوں کی رفاقت کی خواہش ہی نے تو ممتا کو اس طرح محتاج و تہیدست بنا رکھا ہے۔ پھر بھی کوئی حسین نہیں آیا، کسی نے اس کے حسن کی قدر نہیں کی۔ یہ بات وہ بہت دنوں سے بھولی ہوئی تھی اور دنیا کی دوسری دس عورتوں میں اس نے اپنا شمار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں تھا کہ ایک زمانہ میں وہ بھی خوبصورت تھی اور اب بھی کافی حسین ہے۔ معین اپنی نوعمری کے زمانے میں اُسے دیکھ کر تصویریں بنایا کرتا تھا، لاتعداد چہرے، ان گنت آنکھیں، بے شمار ہونٹ اس نے بنا ڈالے تھے، ریحان جیسا خوش پوش اور خوبصورت نوجوان بھی اُسے دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ غیر ارادی طور پر وہ معین سے دور ہوتی چلی گئی۔ معین کی

تصویریں خوبصورت تھیں، مگر وہ خود خوبصورت نہیں تھا، اس کی زندگی خوبصورت نہیں تھی۔ بہت سارے پیچ و خم اور اُلجھاوے تھے اس میں۔ اس کے مقابلے میں ریحان شہزادہ دکھائی دیتا تھا، اسے دیکھ کر اُسے مسرت ہوتی تھی، اس کی آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھ کر اُسے راحت ملتی تھی۔ اس کے گھر کے سبھی لوگ حیران تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ دنیا میں اور بھی تو خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ ممتا جیسے اپنے وجود پر خود عاشق تھی۔ وہ ہر روز سینکڑوں مرتبہ سینکڑوں روپ میں خود کو سجاتی اور آئینے میں بیٹھی اپنی صورت دیکھتی رہتی۔ لوگوں کی باتیں سن کر وہ ہنس دیتی۔ وہ اپنے وجود پر کہاں عاشق تھی، وہ تو اپنی خوبصورتی پر مرتی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں ہر جگہ خوبصورتی کی چھاپ دیکھنا چاہتی تھی۔ شادی کے بعد اس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا۔ اب ریحان کی آنکھیں آئینہ بن گئی تھیں۔ وہ دن بھر میں تین یا تین طرح سے سج کر ریحان کے قریب آ کر بیٹھتی اور گلے سے گلا ملا کر گاتی "اے حسن والے...؟"

ایک سال بعد یہ طلسم ٹوٹ گیا، ممتا نے یکایک ایک دن ایسا محسوس کیا، جیسے ریحان کی آنکھوں میں اب وہ چراغ نہیں تھا، جو اسے دیکھتے ہی جل اُٹھتا تھا۔ اور جب وہ اپنی چمکتی ہوئی آئینہ جیسی آنکھیں اوپر اٹھاتا تو اس میں ممتا ہو بہو اپنا عکس دیکھتی تھی۔ اس نے شوہر کے اور بھی قریب ہو کر پوچھا تھا " تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟"

لیکن اس کی قربت بھی ریحان کے اندر حرارت پیدا نہ کر سکی۔ اس نے جواب دیا "کچھ نہیں"

اور ممتا یہ سوچ کر سخت پریشان ہو گئی کہ وہ ریحان کے سوئے ہوئے جذبات کو کس طرح بیدار کرے۔ اس کی ہر ایک ادا اس کا ہر ایک عمل، اس کا سجا ہوا ہر روپ اس کے جسم کے ہر پہلو کی طرح ریحان کے سامنے عیاں تھا۔ ریحان کے اندر آرزوؤں کا چراغ بجھ رہا تھا۔ ممتا نے سوچا تمام مردوں کو شاید ایک ہی چیز کا نشہ رہتا ہے۔ خوبصورتی کو لوٹ کر اپنی پیاس بجھانا آتا ہے، اس کی حفاظت کرنا نہیں آتا، لیکن ممتا اپنی دنیا میں اپنا شباب، اپنی زندگی، اپنا حسن قائم رکھنا چاہتی تھی۔ وہ ریحان کو دوسرے بیسیوں مردوں کی طرح دنیا کے بیسیوں آدمیوں میں کسی طرح بھی گم ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی، لیکن آخر وہی ریحان ان آدمیوں میں گم ہو کر رہا۔ کسی بات پر اس کی ملازمت جاتی رہی اور اُسے پھر اتنی اچھی نوکری نہیں ملی۔ اسے اپنا سجا سجایا ڈرائنگ روم اور آراستہ کی ہوئی چھوٹی سی خوبصورت دنیا کی تمام خوبصورتی اور سجاوٹ آہستہ آہستہ

ختم کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا بلند معیارِ زندگی صبح کی دھوپ میں نہا کر بستر سے اٹھنا اور شام کو حسین اور معطر بیز سماجی فضا میں روپ کہانی سننا، گانے کی دنیا میں محو رہنا سبھی کچھ چھوڑ دینا پڑا۔ مفلسی اور تنگدستی کی وجہ سے ریحان اور بھی بے حس ہو گیا۔ وہ پھر کبھی خوبصورت نہ بن سکا۔ پہلے چھوٹی موٹی نوکری کر کے وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ اس کے بعد ڈھاکہ چلا آیا اور یہاں ممتا کے ٹیوشن ہی کا سہارا باقی رہ گیا۔

اتنے دنوں میں ایک بچہ کی ماں بن کر ممتا بھی بے حس ہو گئی تھی۔ پہلے پہل کچھ دنوں تک اُسے یہ سب بہت بُرا محسوس ہوا تھا۔ اُسے اپنا شوہر، اپنی بچی، سماج اور یہ دنیا سبھی کچھ بُرا محسوس ہوا۔ اس کے بعد وہ تجربات کے زخم کھا کر رفتہ رفتہ سب کچھ یوں بھول گئی کہ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ یادوں کے درد سے آزاد ہو کر اس نے پھر کبھی کتنی ہی بار گایا تھا "اے حسن والے . . . . ." لیکن اتنے دنوں بعد معین نے پھر اسی درد کو جگا دیا تھا۔ اس کے دل میں آرزوؤں کے بجھتے ہوئے چراغ کی لَو اکسا دی تھی۔ یہ درست ہے کہ ممتا نے بہت دنوں سے دوسروں کی آنکھوں میں اپنا عکس نہیں دیکھا تھا۔ نہیں، ریحان کی آنکھوں میں بھی نہیں اور معین نے جیسے اپنی آنکھوں میں اُسے وہی تصویر دکھا دی تھی۔

گانا ختم ہو گیا۔ گانا ختم نہیں ہوا بلکہ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں لے کر ممتا ماضی کے اندھیرے سے حال کی دنیا میں لوٹ آئی، اجرت کا چیک ملتے ہی اس نے اپنے حواس درست کئے، ابھی وہ گھر نہیں جائیگی۔ آج کے دو پروگراموں کا چیک کسی دوست کو دے کر نقد روپیہ لینا ہوگا۔ اس کے بعد نیو مارکٹ جائے گی۔ ریحان کے جسم پر درست کپڑے بالکل نہیں ہیں، اس کے لئے ایک ریڈی میڈ ہوائی شرٹ اور خود اپنے لئے ایک جوڑا سینڈل اسے ابھی وقت خریدنا تھا، اس کے بعد وہ ریلوے کے سگنل کی سرخ روشنی جلنے کے وقت گھنے اندھیرے میں اس کی روشنی تیز ہونے سے پہلے ہی آج پھر زندگی کی خوبصورت آرزوؤں کے چراغ جلائے گی۔ اس سے بھی زیادہ روشن، اس سے بھی زیادہ جاذبِ نظر۔

خرید و فروخت کے بعد جوں ہی وہ اپنے گھر کے قریب آئی، اس کی بچی دوڑ کر "ماں، ماں" کہتی آئی۔

ممتا نے بچی کو گود میں اُٹھا لیا اور پوچھا "بابا کو تم نے دیکھا بی؟"۔

"بابا؟" چار سال کی بچی چند منٹ تک سوچتی رہی۔ اس کے بعد بولی "بابا گھومنے گئے ہیں۔"

"گھومنے؟" ممتا کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔ ریحان تو گھومنے نہیں جاتا تھا اور گھومنے جاتا بھی تو کہاں جاتا؟ جو دن بھر گھر میں بیٹھا اخبار میں "ضرورت ہے" کے کالم میں اسامی تلاش کرتا اور درخواست لکھا رہتا، وہ کہاں چلا گیا؟ جہاں بھی گیا ہو، اس کے جلد ہی واپس آنے کا امید تھی۔ اس نے اپنے فکر آمیز خیالات کو جھٹک دیا اور اپنے متعلق سوچنے لگی۔

گھر میں ڈریسنگ ٹیبل نہیں تھا۔ نہ سہی۔ بکس سے بڑا سا آئینہ نکال کر ممتا پلنگ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی، معین نے جھوٹ نہیں کہا تھا تیس سال کی عمر ہونے کے باوجود اس کے جسم میں فربہی نہیں آئی تھی۔ عمر سے کوئی شکن نہیں پڑا تھا اور رنگ ذرا بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ اب بھی وہی پیلا رنگ تھا اور مخمور جوانی تھی، اس پر جب اس نے سرخ ٹیکہ لگایا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سگنل کی وہی گہرے سرخ رنگ کی روشنی ٹیکہ کی شکل میں اس کی پیشانی پر جگمگا رہی ہو۔

ریحان گھر میں داخل ہوتے ہی حیران ہو گیا، تھوڑی دیر تک حیرت سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے پوچھا "تم کہیں جاؤ گی کیا؟"

"ہاں، تمہارے ساتھ گھومنے۔" ممتا خوشی سے کھل اٹھی، بچی کو اپنی پیٹھ کی طرف ہٹا کر قریب آئی اور بولی "یہ لو، اس پیکٹ کو کھول کر شرٹ پہن لو، استری کیا ہوا پتلون بکس میں ہے، میں نکال دیتی ہوں، بچی کا فراک میں بدل دیتی ہوں۔"

لیکن ریحان کے چہرے پر مسرت کی کوئی لکیر نہیں اُبھری، بلکہ اس پر ہلکی سی پشیمانی جھلک رہی تھی،

ممتا کو دیکھ کر دکھ ہوا۔ اس نے کہا "تم اس طرح کیوں کھڑے ہو؟ گھومنے نہیں جاؤ گے کیا؟"

ریحان کچھ سہمے سہمے سے انداز میں ہنسا۔ "جاؤں گا، لیکن آج میں نے تمہارے ساتھ ناانصافی کی ہے ممتا۔"

"کیا ناانصافی؟"

"تم نے اس دن معین سے جھوٹ بولنے کو کہا تھا، لیکن میں نہ کہہ سکا۔ سچی بات ہی کہہ آیا ہوں۔"

ممتا سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "معین تمہیں کہاں ملا؟"

"وہ رائٹی بوٹ پالش کے دفتر میں"۔ ریحان نے آہستہ آہستہ ممتا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، بولا "تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا ممتا! کئی دنوں سے

ملازمت کے چکر میں ادھر اُدھر گھوم رہا تھا، اخبار میں اشتہار دیکھ کر آج سویرے وہ رائسن کے دفتر میں گیا تھا، انہیں خط و کتابت کرنے کے لئے ایک انگریزی داں منیجر کی ضرورت ہے، اچھی تنخواہ دیں گے، اچھا خاصا کاروبار ہے ان کا۔ وہاں دیکھا معین بیٹھا ہوا ہے، وہ ان کو ڈیزائن بنا کر دیتا ہے۔ بے چارہ باپ، ان کی بے وقوفی سے آرٹ اسکول میں داخل نہ ہو سکا۔ اب بوٹ پالش، سر کا تیل، خواب میں بشارت دی ہوئی دواؤں کے بکس اور شیشیوں کے لیبل کا ڈیزائن بنا کر پیسے کماتا ہے۔ میں ان دنوں بیکار ہوں۔ یہ جان کر اس نے ملازمت دلانے کے لئے میری بڑی سفارش کر دی ہے۔ ابھی میں وہیں سے تو آ رہا ہوں۔"

نہ جانے کیا سوچ کر ممتا کے سنجیدہ چہرے پر بشاشت آ گئی، اُسے یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی کہ آج صبح کے اسی واقعہ کی وجہ سے شام کے وقت معین اس کے ساتھ اس طرح ملا تھا۔ وہ یقینی طور پر سمجھ چکا ہے کہ وہ نہ ایک سرے سے بہتر اور نہ کمتر بلکہ ایک ہی سطح زندگی پر اتر آئے ہیں۔ اسی لئے ریحان کو اوٹ میں رکھ کر معین نے اس طرح بات کی تھی جیسے وہ حقیقت حال سے واقف ہے۔ اس نے اپنی حالت بھی بلا جھجک ظاہر کر دی تھی، حالانکہ پہلے دن جب معین کے ساتھ اسکی ملاقات ہوئی تھی، اور وہ ہاتھ میں تھیلی اور پیکٹ لئے ہوئے تھا وہ بھی شرمایا ہوا تھا۔

جب ممتا کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، وہ شوہر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی "تم نے سچ سچ بتا دیا، اچھا کیا۔ اس دن میری عقل خراب ہو گئی تھی، اسی لئے کہہ دیا تھا، ورنہ معین سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ریحان نے اطمینان کی سانس لی اور خوش ہو کر ممتا کے گالوں کو تھپتھپا کر پوچھا "ملازمت قبول کر کے میں نے اچھا کیا نا، کیا خیال ہے؟"

ممتا نے ایک چھوٹی بچی کی طرح سر ہلایا "ہاں، چلو، اب گھومنے جائیں۔"

"کہاں جاؤ گی؟"

"معین کے یہاں میں نے اس کے گھر کا پتہ حاصل کر لیا ہے۔"

دو منٹ قبل ممتا کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی لیکن اس وقت اسے ایسا لگا جیسے یہ جواب وہ پہلے سے تیار کر چکی تھی۔

معین گھر پر موجود تھا۔ بیوی، بچے اور بچیوں کے درمیان گھرا ہوا وہ خوش خوش کوئی کہانی سنا رہا تھا۔ ریحان اور ممتا کو دیکھ کر بولا "ارے آؤ، آؤ۔ زہے نصیب! نیلو ان کا استقبال کرو۔"

"مجھے دیکھ کر تو تمہیں استقبال کا خیال نہیں آیا" ممتا نے کہا۔

"ارے نہیں، نہیں۔ ان لوگوں سے پوچھ لو۔ ابھی ابھی تمہارے گانے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں، رکشا سے اترتے ہی ایک اسٹوڈنٹ میں داخل ہو کر میں نے تمہارا گانا سنا۔ تمہاری آواز بھاری بھاری معلوم ہو رہی تھی، شاید تمہیں سردی لگ گئی ہے، دو گولی بیپس کھا لیتیں۔"

ممتا ہنسنے لگی اور معین کی بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "تم اپنی ڈاکٹری رہنے دو۔ میں تمہارے یہاں کیوں آئی ہوں، جانتے ہو؟ گھومنے نہیں۔"

"تو پھر؟"

دو تین بچوں کی ماں ڈھیلے ڈھالے جسم کی نیلوفر کو ممتا نے اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا "اسے دیکھنے آئی ہوں، بہت دنوں سے اسے دیکھنے کی خواہش تھی اور......"

نیلوفر نے شرما کر اس کی بات پر ٹوکتے ہوئے کہا "ٹھہریے میں بتاتی ہوں۔"

ممتا چپ نہیں ہوئی۔ اس نے کہا "اور تمہاری بنائی ہوئی تصویریں دیکھوں گی، لاتعداد تصویریں، جنہیں دیکھ کر یہ احساس ہو کہ زندگی میں کتنے سارے انوکھے رنگ ہیں، زندگی کتنی خوبصورت ہے۔" اتنے دنوں میں یقیناً تم نے بہت ساری تصویریں بنائی ہوں گی۔"

معین نے چونک کر کہا "تصویریں؟"

ممتا نے سر ہلایا "ہاں تصویریں، بچپن میں تم کہا کرتے تھے نا، یاد نہیں، زندہ رہنے کے لئے خواہ میں کوئی کام کیوں نہ کروں، گھر میں بیٹھ کر بہت ساری تصویریں بناؤں گا۔ خوبصورت تصویریں، جنہیں دیکھ کر زندگی کی خوبصورتی کا احساس ہوگا۔"

معین چند لمحے سنجیدہ رہا۔ پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے کہا "ہاں، ہاں، یاد آیا، گھر میں بیٹھ کر میں نے ضرور تصویریں بنائی ہیں، لاتعداد تصویریں۔ واقعی بڑے انوکھے رنگ روپ ہیں ان کے، لیکن ان کا موضوع ذرا تبدیل ہو گیا ہے ممتا، آؤ دیکھو گی؟"

معین دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ممتا، نیلوفر اور ریحان تھے۔ چیل کے گھونسلے کی طرح چھوٹا سا کمرہ

باقی صفحہ ۵۴ پر

فکاہیہ

"ایک ہنگامہ پہ..."!

اشرف صبوحی

بہن جوں توں کر کے ریل کا سفر تمام ہوا اور ہم آگرہ سے خیریت کے ساتھ دہلی میں خالہ جان کے گھر جا اترے۔ خالہ جان منتظر تھیں بھینچ بھینچ کر گلے ملیں، بلائیں لیں: یوسف کو پیار کیا اور دو چار باتیں کرنے کے بعد کہنے لگیں: بیٹی رات بہت آگئی ہے۔ کھانا تو تم رستے میں کھالیا ہوگا۔ بھلا منہ جھٹالنے کا یہ کونسا وقت ہے، اب سو رہو۔ میاں شمن سے بھی میں نے کہہ دیا ہے وہ باہر اپنے خالو کے پاس آرام کریں گے۔ صبح اللہ خیر رکھے کھانا پینا جو چاہے سو کرنا۔ دلہن کو تمہارے دیکھنے کا بڑا چاؤ تھا۔ نیند کی دکھیا ہے۔ عشاء تک تو تمہاری راہ دیکھتی رہی اب یہ سارا دھندا تم ہی دونوں مل جل کر کروگی۔ میں تو گھر کا کوڑا ہوں۔ مجھ سے ہاتھ پاؤں ہلائے جلتے نہیں۔ لو جاؤ جہاں جی چاہے سو رہو۔ آرام تو بیٹی زمین پر ملے گا۔ خوب پیر پسار کر سوؤ گی۔ ننھا بھی تمہارے پاس ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ تو ایک جھلنگے پر لیٹ کر خراٹے لینے لگیں، میں حق حیران۔ پرایا گھر، میں انجان جس طرف دیکھتی ہوں پڑا وڑا ہوا ہے۔ نہ کمر ٹکانے کا ٹھیک نہ بیٹھنے کی جگہ۔ بچہ الگ اونگھنے لگا۔ آخر رات تو کسی نہ کسی طرح بسر کرنی ہی تھی۔ دالان کے آگے بستر ڈال پڑ گئی۔ اور دل میں سوچتی رہی کہ یا اللہ کس عذاب میں آگئی۔ دو چار دن رہنا ہے کیوں کر گزرے گی۔

آدھی رات کے بعد تو پہنچے ہی تھے۔ تین چار گھنٹے کروٹیں لیتے لیتے اور گزر گئے۔ صبح ہوئی تو بڑی پریشانی! بچے کے موت کے رات بھر کے بھرے ہوئے کپڑے۔ نہاؤں تو کپڑے بدلوں۔ حاجتی کی تلاش ہوئی، لوٹا نہیں ملتا۔ بڑی مشکل سے ایک بدھنی ملی۔ پانی بھرنے کے لئے کوئی آبخورہ نہیں۔ مٹکے کھلے ہوئے۔ ضرورت تھی، مٹکے کو الٹا چاہا — بڑی گول تھی سنبھل نہ سکی۔ بھرے گھڑے ونچی پر سے نیچے آرہی۔ آواز جو ہوئی تو خالہ جان کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے دیکھ کر اور تو کچھ کہہ نہ سکیں صرف اتنا کہا "شاباش بیٹی شاباش! اچھا سگھڑاپا کرنے آئی ہو۔ دو پیکے گول ہی توڑ دی"۔

میں چپ، خطاوار تھی کیا کرتی۔ شرمندہ شرمندہ پاخانے گئی اور الٹے پاؤں چلی آئی۔ اول تو ڈیوڑھی میں پاخانہ۔ اندھیرا ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ دوسرے سڑاند ایسی کہ جی متلا گیا۔ اتنے میں خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ بچے عورتیں جاگ گئی تھیں۔ چھوٹے سے صحن میں کوئی بچے کو فراغت کرا رہی ہے تو کوئی منہ دھو رہی ہے۔ ایک طرف بھیڑا بندھا ہوا ہے۔ مرغیاں ہیں کہ یہاں ہگ گئیں وہاں جا کر بیدا۔ غرض کیا بتاؤں کہ گھر کا کیا نقشہ تھا۔ آج ہی شام کو گھوڑی چڑھنی تھی، مہمان آنے شروع ہو گئے۔ ڈولیاں تانگے اترنے لگے۔ ایک غل ایک شور۔ ڈولی والے کرائے کے لئے کواڑ توڑے ڈالتے ہیں۔ تانگے والے چیخ رہے ہیں لیکن کوئی نہیں سنتا۔ خالہ جان اپنے جھلنگے پر بیٹھی ہیں۔ پٹاری کھلی ہوئی ہے۔ پان پر پان بن رہے ہیں۔ گویا ان کے کان میں آواز ہی نہیں جاتی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا "خالہ جان! کہاروں اور تانگے والوں کا کرایہ تو بھجوا دیجئے۔" اس پر انہوں نے جلا کر کہا۔ اِن جوانا مرگوں کو تو بھونکنے کی عادت ہے۔ ذرا چھری کے تلے دم نہیں لیتے۔ آتے دیر نہیں ہوتی کہ سر پر سوار ہیں۔ اے کریمن جا تیری دلہن کو تو دیکھ وہ اٹھی ہوں تو کہہ دے کہ ڈولیوں کا کرایہ دے دیں۔

بھاوج سے ملنے کا مجھے بھی اشتیاق تھا۔ دوسرے یہ سمجھی تھی کہ ہم عمر ہونے کے سبب دل بہل جائے گا۔ کریمن کے ساتھ میں بھی چلی۔ کوٹھے پر جا کر کیا دیکھتی ہوں کہ دس بجنے کو آئے ہیں۔ گرمی کا موسم ہے۔ تمام صحن میں دھوپ بھر گئی ہے اور دلہن بیوی لمبی تانے پڑی سو رہی ہیں۔ رات کو جو پان کھایا تھا وہ منہ میں ہے۔ باچھوں سے رال بہہ کر کلے تک ،تکیئے اور چادر تک آگئی ہے۔ مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں — کریمن پڑوس کے ایک ٹھیلے والے کی بیوی ہے۔ شادی میں ہاتھ بٹانے کے لئے آئی ہوئی ہے اس نے پاس جا کر ہلکے سے کہا:

"بہو اٹھو تا دیکھو تیا دن آگیا"۔

بہو نے ادھر کی اور کروٹ لے کر پھر سو گئیں میں نے کہا لاؤ میں گدگدیاں کر کے اٹھاؤں۔ اسی بہلانے سے جان پہچان بھی ہو جائیگی۔ یہ سوچ کر آگے بڑھی اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر دوپٹہ منہ سے ہٹایا ہی تھا کہ دلہن بھبک کر بولیں۔ "شغفتل تو ہے کون ؟ لوا ور سنو میرے پلنگ پر کس مزے سے بیٹھی ہے۔ ایسی لات ماروں گی نیچے جا پڑے گی"۔ کرمین بولی "ہا بہو! یہ تو کسے شغفتل بنا رہی ہے۔ جانے بھی ہے یہ کون ہے! رات آگرہ سے یہی تو آئی ہے"۔ بہو صاحبہ جھینپی جھینپی اٹھیں اور پاؤں لٹکا کر زمین پر بیٹھ گئیں۔ میں نے کہا "بھابی! پھر رات آئے گی سو رہنا۔ اب تو ہشیار ہو جاؤ۔ نیچے چلو خالہ جان پریشان ہیں۔ مہمانوں کا تانتا لگا ہوا ہے"۔

بہن آپ کہیں گی کہ ان کا کنبہ تو بڑا نامی گرامی ہے۔ یہ خالہ کیسی نکل آئیں جو نہ شریفوں میں نہ رذیلوں میں۔ روپیہ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے مگر ان کے ڈھنگوں پر کیا پھٹکی پڑ گئی۔ بوایات یہ ہے کہ اماں جان اور خالہ اماں دونوں سگی بہنیں دونوں نے ایک ہی پیٹ میں پاؤں پھیلائے دونوں مرزا اسفندیار بیگ بادشاہی میر شکار کی بیٹیاں۔ غدر کی ہلچل میں گھر برباد ہو گیا۔ سارے مردوں کو پھانسیاں مل گئیں۔ کوئی مرد ہرا رہا نہیں۔ شہر میں امی بھی ہوئی تو نانی اماں نے جوان بیٹیوں کا سر ڈھانکنا چاہا۔ عورت ذات پھر مفلسی اور لاوارثی جتنی ان کے اختیار میں تھی چھان بین کی۔ لیکن صرف اوپر کی ٹیپ ٹاپ دیکھی۔ اصل کو دیکھا اور ڈھنگوں کو نہ دیکھا۔ سچ تو یہ ہے قسمت کا کوئی ساتھی نہیں۔ اماں جان کی شادی ان کے والد سے کر دی جو کسی مسجد میں بچے پڑھاتے تھے۔ مگر گھر کا چلن شریفانہ تھا۔ خالہ اماں کا بیاہ علی حسین خاں سے ہوا۔ اس وقت ان کے ہاں خاصی دولت تھی۔ نواب کہلاتے تھے۔ نانی اماں جہاں خوش تھیں کہ ایک بیٹی اگر ملا کو گئی تو دوسری کو تو خدا نے پروان چڑھا دیا۔ وہ بیچاری اگلے وقتوں کی بھولی بھالی بیوی یہ کیا جانتی تھیں کہ نباہ کے لئے چال چلن ہی اچھا ہونا چاہیئے دولت تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے جس طرح آتی ہے اسی طرح اڑ بھی جاتی ہے۔ دوسرے مرد جب تک خود نہیں کماتا اس کو باپ دادا کی کمائی کی قدر نہیں ہوتی۔ تو بہن ہم نے دیکھ لیا کہ ابا جان کا گھر مرتے دم تک بنا رہا آبرو میں آبرو اور روٹی میں روٹی۔ خالو آیا نے پہلے تو خوب گلچھرے اڑائے تین چار برس دن عید اور رات شب برات رہی۔ اس کے بعد جو نوبت آئی ہے تو اللہ دشمن کو نہ دکھائے۔ گھر بکا زیور بکے۔ فاقے ہونے لگے۔ آخر پیٹ کی خاطر ڈھلیئے کا کام سیکھا اور اب میاں ممولیا ڈھلیئے کہلاتے ہیں۔

لیکن بہن یہاں تک بھی کچھ نہیں گیا تھا۔ پیشہ حبیب اللہ۔ اپنی محنت مزدوری کرتے تھے کوئی برا کام تو کرتے نہ تھے۔ غضب تو یہ ہوا کہ پیشے والوں میں رہ کر انہوں نے ساری خو خصلت بھی پیشے والوں ہی کی لے لیں۔ باپ دادا کی کوئی ادا نہ رہی۔ اور رہے کیوں کر دہی نتھو خیرا ان کے ہمجولی تھے۔ اسی قسم کے موئے لنگوٹی بندوں میں بیٹھک اٹھک تھی۔ انہیں کے ساتھ کھانا پینا یہاں تک کہ لڑکے لڑکیوں کے بیج بھی انہیں لوگوں میں ہوئے۔ اور اب انہیں نواب احمد حسین کا بیٹا کوئی نہیں جانتا۔ سب پشتینی ڈھلیا سمجھتے ہیں۔ سمجھیں کیوں نہیں۔ زبان ایسی پھوہڑ ہو گئی ہے کہ بغیر گالی بات نہیں کرتے۔ کپڑوں کی حالت دیکھو تو کھیٹھ ہتو لڑا مار۔ نہ بھلے مانسوں کی صورت رہی نہ سیرت۔ تعجب تو یہ ہے کہ خالہ جان کی بھی ساری عادتیں بدل گئیں۔ صرف ایک ٹھوسا بنی پلنگ پر بیٹھی رہنے اور پان چبا چبا کر در و دیوار پر پیک کی پچکاریاں مارنے کے پوری بہاروں کی چودھرائن معلوم ہوتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ امیر بیگم کی بیٹی ہیں۔ گھر کیا ہے کباڑیئے کی دکان۔ اجڑی ہوئی سرائے۔ غضب خدا کا بچے کو گھوڑی چڑھا رہی ہیں۔ شادی ہو رہی ہے اور دالان میں ایک پھٹی ہوئی دری کے سوا جس پر منوں کوڑا پڑا ہوا ہے چاولوں کے دانے روٹی کے ٹکڑے چپکے ہوئے ہیں۔ نہ فرش ہے نہ فروش۔ دیواریں کتنے چونے کے دھبوں سے مومی چھینٹ بنی ہوئی ہیں۔ رات کے کھانے کا پتیلا انگنائی میں قلابازیاں کھا رہا ہے۔ کتے چاٹ رہے ہیں۔

خیر بہن تھوڑی دیر میں دلہن بیوی لال جوڑا پہن بن سنور کر تشریف لائیں اور آتے ہی پیچھے سے میری کولی بھرلی "بھابی! تو نے سویرے سویرے مجھے کچی نیند سے اٹھا دیا اب بتا میں تیرا کیا درجہ کروں"۔ میں ہک دک کہ سبحان اللہ کیا پاک زبان ہے اور کیسی بے تکلفی۔ غصہ تو بہت آیا مگر جھوٹ موٹ کی ہنستی صورت بنا کر کہا۔ "دلہن تم نے بھی تو مجھے گالیاں دے لیں"۔ وہ بولی "چلو ہم تم برابر ہو گئے"۔

"دلہن رات سے میرے تو منہ میں پھپھوندی لگ گئی — کس سے بات کرتی؟ خالہ جان کو فرصت نہیں اور دوسرا ایسا کون ہے

جو مجھے پوچھے"۔

"اے ہے! یہ موئی رذالیں بھی بولنے کے قابل ہیں۔ میں تو ان کے منہ پر جوتی بھی نہ ماروں"۔

میں نے دل میں کہا کہ غالباً یہ کسی اچھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ یہاں کا ڈھنگ دیکھ کر بدمزاج ہو گئی ہے۔ اس کا ناک نقشہ اور نازک جسم دیکھ کر مجھے یقین تھا کہ جیسی اس کی صورت اچھی ہے ایسی ہی اس کی تربیت بھی اچھی ہو گی۔ ہاں طبیعت میں چبلا پن ذرا ضرورت سے زیادہ ہے۔ بہو کو سسرال میں اتنا منہ پھٹ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ رائے قائم کر کے میں بولی۔" دلہن تم سے مل کر تو میرا جی خوش ہو گیا۔ ورنہ یہ شادی تو مجھے خفقان پیدا کر دیتی"۔

بھابی! یہ کوئی شادی ہے۔ کوڈوں کی برات اتر رہی ہے۔ قطب صاحب کی چھڑیوں کا میلا ہے"۔

میں نے یہ خیال کر کے کہ دلہن کے میکے والے معقول آدمی ہوں گے وہ آجائیں تو دو چار شریف صورتیں تو دکھائی دیں۔ پوچھا "دلہن، تمہارے ہاں سے ابھی تک شاید کوئی نہیں آیا۔ ان گوبر کے چوتھوں کو دیکھتے دیکھتے تو گھن آنے لگی۔ مگر بوا برا نہ مانا وہ آئیں گی تو بیٹھیں گی کہاں؟"

" اب آتی ہی ہوں گی۔ اور بھابی بیٹھنے کا کیا ہے۔ برادری میں بیٹھنے اٹھنے کی شکایت نہیں ہوا کرتی"۔

برادری کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں اسے کھولنا چاہتی تھی کہ اتنے میں "بھابی وہ آگئیں" کہتی ہوئی وہ دھڑ دھڑ کرتی ہوئی کوٹھے سے اتری۔ میں نے جو اوپر سے جھانکا تو دیکھتی کیا ہوں کہ ایک کالی بھینس چلی آتی ہے۔ موٹا موٹا سیتلا سے خراب چہرہ، چپٹی ناک، گردہ سے ہونٹ۔ ٹھوڑی لمبی۔ سر پر لال قند کا دوپٹہ جس میں اودی گوٹ۔ گلے میں بابرلیٹ کا روپہلی ٹھپہ لگا ہوا کرتہ۔ پانچ بچے ساتھ چھٹا پیٹ میں۔ ٹانگوں میں کالی چھینٹ کا پاجامہ۔ اُلٹی نوک کی جوتی۔ بیسوں قسم کے ہاتھ پاؤں بازو گلے میں زیور مگر سب میلے اور گھسے ہوئے۔ ان کے بعد ایک اور بیگم اتریں۔ یہ ماشاءاللہ سے سورج مکھی تھیں۔ گول رفیدہ سا چہرہ۔ تنگ پیشانی سکلے پر ایک بڑا سا مسہ کالے کالے دانت جیسے شریفے کے بیج۔ کرنجی آنکھیں، غدر پہلے کا سبز کاہی بنارسی دوپٹہ۔ بدرنگ چرسیں پڑا سر پہ۔ جاپانی ریشم کا

بڑے بڑے بوٹوں والا کرتہ گلے میں۔ پشت پر چکنی اور میلی چوٹی کا پورا نشان۔ تنگ موری کا چوڑیدار گلبدن کا پاجامہ۔ ایک تین چار برس کی لڑکی نے ان کا پاجامہ اس خوبصورتی سے پکڑ رکھا تھا کہ آگے سے ناف کی ملگجی سلوٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔

ان کے پیچھے اور بھی اسی نمونے کی کئی بیویاں رونق افروز ہوئیں۔ انہیں دالان میں بٹھانے کے بعد دلہن بیگم نے بڑے تھک کر مجھے آواز دی۔" بھابی — اے بھابی کیا سو گئیں۔ ارے بی آؤ۔ میرے میکے والیوں سے تو ملو"۔

میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا کہ اے تیری قدرت یہ تو آوا کا آوا ہی ایسا ہے۔ دلہن بھی اسی دکان کی گجری ہیں مگر اتفاق سے ذرا رنگ روغن اچھا ہو گیا ہے۔ دلہن گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھیں اور میرا نیچے اترتے ہوئے دم فنا ہوا جاتا تھا کہ اس اثنا میں بچوں نے دنگا شروع کر دیا۔ ایک نے محلے میں پتھر پھینکے۔ دوسرے نے مٹکوں میں ہاتھ گھنگول دیئے۔ کسی نے کسی بچے کو مارا کسی نے کسی کو کاٹ کھایا۔ برف والے۔ لونگ چڑے والے، کچالو والے بیٹھے ہیں۔ چاٹ اڑ رہی ہے ایک خنگرا خاصا آٹھ نو برس کا اپنی ماں سے کہہ رہا ہے کہ" لا سری پیسہ دے برف کھاؤں گا"۔ اس نے ایک دو ہتڑ رسید کیا "جا اپنے کا نڑے ہادا سے مانگ"۔ وہ باہر ہو گا میری چھاتی پر کیوں چڑھا آتا ہے" ایک لڑکے نے کسی بیٹھی ہوئی لڑکی پر کلی کر دی۔ اس کی ماں بولی۔" کیوں رے نامراد کیا ماتھے کی پھوٹ گئیں جو لونڈیا کو نہلا دیا" اس نے تن کر جواب دیا۔" چپ رہ کتیا"۔ اور اپنی ماں سے کہا۔" دیکھتی ہے یہ کلی کی ماں مجھے نامراد کہہ رہی ہے"۔ ماں تنک کر کھڑی ہو گئی۔

" کھوکھنی مسل اپنے رہوں سہوں کی"۔

" اری شتا کہیں کی — کچھ اور سنے گی میرے منہ سے! تو اور میرے رہوں سہوں کو پٹنے"!

" چپ بے شرم قطامہ"۔

اب کیا تھا کچھ ایک طرف ہو گئیں اور کچھ دوسری طرف سے بولیں۔ بہن ایسی خرافات بکی گئی کہ میں تو کانوں میں انگلیاں دیکر خدا کو یاد کرنے لگی۔

یہ بم چخ بڑی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ نفیری والوں نے دوا آ

پر آکر شادیانے کی لَے نکالی۔ انگریزی باجے والوں نے باجہ شروع
کیا۔ ادھر کسی نے باہر سے آواز دی کر دولہا کی ماں کو بھیجو۔ خالہ جان
جو گھبرا کر کھڑی ہوئیں تو پٹاری اُلٹ گئی۔ سارا کتھا چونا چھالیہ زردہ
ایک ہو گیا۔ ایک عورت نے دوسری کو دھکا دیا وہ مٹکوں پر گری۔
ایک جو اٹھیں تو سر سے ٹکرا کر طوطے کا پنجرہ گرا۔ کتے نے طوطے پر
جھپٹا مارا۔ پھیسڑا کھل گیا۔ طوطے کی ٹیلیں ہیں اور پھیڑے کی اچھل
کود۔ چھوٹی بچی الگنائی میں کچپڑ۔ اللہ تیری پناہ۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آ
گیا۔ تھوڑی دیر میں غل مچا کر دولہا کا گھوڑا آگیا۔ دولھا میاں چلے۔
دھوپ چھاؤں کی اچکن۔ سرخ مشروع کا پاجامہ۔ لال تار بانی
مُنڈاسا اس پر سہرا بندھا۔ پہلے ایک مردوا اُچک کر گھوڑے پر
بیٹھا پھر دولھا کو چڑھا دیا۔ اس مردوئے کے پیچھے ایک عدد لڑکی
کو بھی چڑھا دیا۔ دُبلا پتلا کسی تانگے کا ٹٹو اور یہ چھوٹے بڑے تین
عدد۔ بیچارے کی کمر دوہری ہوئی جاتی تھی۔ اب گھوڑی چلی۔ آگے
تاشے والوں کی برادری پیچھے ایک ٹھگنے سے قد کا مردوا کھڑکنے لگا
غور سے جو دیکھا تو اس کے ہاتھ میں دو پیتل کے کٹورے تھے۔ انہیں
ڈھول تاشے والوں کی لَے میں بجا رہا تھا۔ اس کے پیچھے انگریزی
باجے والے۔ چھوٹی لال لال وردیاں پہنے اپنے اپنے باجے
بجا رہے تھے۔ سب سے پیچھے دولھا کے گھوڑے کے منہ سے منہ ملائے
نفیری والوں کی ٹولی تھی۔ خدا جانے نفیری بجانے میں کتنا زور لگانا
پڑتا ہے کمبختوں کا چہرہ لال ہوا جاتا تھا۔ ایک جو سب سے آگے
ذرا بنا ٹھنا سا تھا اس نگوڑے کی تو بُری گت تھی۔ گلے پھول کر کُپا
بن گئے تھے۔ آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ مُوا دُہرا ہوا جاتا تھا۔

لوگ جھوم رہے تھے۔ نفیری والے کو بیلیں دے رہے تھے
اور میں کوس رہی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ پھٹا پھٹ۔ ڈھول دھاں
ٹیں ٹیں اور پیں پیں دور ہوئی اور محلے والوں کے کان ٹھنڈے ہوئے
لیکن بہن آوازوں کا یہ طوفان۔ اور قیامت کا یہ ہنگامہ پورا غارت
تھوڑی ہوا تھا۔ ذرا سی دیر کے لئے ٹل گیا تھا۔ کوئی گیارہ بجے جامع مسجد
میں قدم شریف کو سلام کرا کے ٹھہرتے ٹھہراتے گشت لگاتے واپس آئے
تو پھر وہی آفت تھی۔ اب کے تو باجے والوں نے اپنی جانیں ہی توڑ
کر رکھ دیں۔ میں تو حیران تھی کہ نہ ان نگوڑوں کے ہاتھ ٹوٹتے ہیں
نہ کان پھٹتے ہیں نہ ان کے باجوں پر بجلی گرتی ہے۔ نہ موؤں کا منہ
تھکتا ہے۔ خیر یہ مصیبت تو ٹلی۔ اب غل ہوا کہ کھانا کھلاؤ۔ باہر کی تو
مجھے خبر نہیں کہ وہاں کیا ہوا ہوگا۔ اندر کی کیفیت کیا سناؤں۔ نہ دیکھی
تھی نہ سنی۔ آج تک خیال سے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔

دسترخوان کہاں تھا جو بچھایا جاتا۔ اور ہوتا بھی تو بچھتا کن
کے آگے۔ ڈھور ڈانگروں کے آگے۔ بس یکایک خالو جان نے ڈیوڑھی
پر آکر کہا " ارے روٹی بھی کھاؤ گے یا گانے بجانے ہی سے پیٹ
بھرو گے۔ بارہ بجنے کو آئے روٹی ٹکڑے کا ہوش نہیں۔ برادری والے
سمدھیانے والے آخر سب ہی ہیں۔ ان کا بھی خیال نہیں۔"

اور تو سب ڈھولک میں لگے ہوئے تھے دلہن چھپا کے سے
ڈیوڑھی پر پہنچیں اور بولیں " اماں جان تو درد کے مارے اوندھی
پڑی ہیں۔ انہیں تو دین دنیا کی خبر نہیں۔ سارے مہمان بلوں بلوں
کر رہے ہیں۔ بچے بھوکے سو رہے ان کی جوتی کی نوک سے۔ اب تم
اتنی رات گئے پوچھنے آئے ہو تو جلدی بھیجو۔ لال روٹیاں بھی پکوائی
ہیں نا۔ میرے والے تو لال روٹی کے سوا ٹکڑا انہیں توڑتے۔"

" لال روٹیاں نہ پکواتا تو میری ناک بھی منہ پر رہتی۔ ساری عمر
برادری کی جوتیاں کون کھاتا۔"

" اچھا تو اب جلدی بھیجو۔ پھر ہمیں سہاگ گھوڑیاں گانی ہیں۔
ایک ڈھولکی کہیں سے منگا دو۔ جمیا والی اللہ ماری کی آواز کچھ جھرجھری
سی ہے۔"

سالن کی دیگ اور دری میں لپٹی ہوئی روٹیاں آئیں۔
مٹی کے ڈھوبروں میں سالن نکالا گیا۔ ایک ایک سفید اور ایک
ایک لال روٹی آگے رکھی گئی۔ پانچ پانچ اپنا اپنا گروہ بنا کر بیٹھ گئیں
اور لپڑ سپڑ کھانا شروع کیا۔ کوئی کہتی ہے کہ " موئی روٹی تو تانت
ہے۔" کسی نے کہا کہ بہو میرے پیالے میں تو ہڈیاں ہی ہڈیاں بھر دیں۔
نہ تار ہے نہ کوئی بوٹی۔" کوئی بولی " اری ناک پکڑ کر غوطہ لگا۔" کسی بچے
نے ہوگے کے مارے جلتی ہوئی ساری بوٹی منہ میں رکھ لی اور منہ کھول
کر کہا " آں! آں"۔ ماں نے اس کے منہ کے آگے ہاتھ لگا دیا۔ اور
کہا " تھور کیوں گیا تھا۔ تھوک دے۔"

غرض اس ہڑبونگ میں کھانا ختم ہوا۔ پیالے اور روٹیوں
کے ٹکڑے سمیٹے گئے۔ ایک عورت جو پیالے لے کر چلی تو اس کا پاؤں
پھٹی ہوئی دری میں اُلجھا۔ پیالے ہاتھ سے چھوٹے اور برابر والی

عورت کے سر پر گرے۔ سالن کا لبدھڑا بالوں میں، چہرے پر اور
مانگے کے کپڑوں پر لتھڑ گیا اس کی چھینٹیں ایک دو کی آنکھوں میں
جا پڑیں۔ غل مچ گیا وہ کوسم کاٹا ہوا کہ سوئے ہوئے بچے جاگ
اٹھے۔ اب کھانا کھا کر پانوں پر پلیں۔ چھکے بھر بھر کر زردہ تھوکا
اور لپیٹ کر دیواروں پر پیک تھوکنی شروع کی۔ چھوٹا مکان مہمانوں
کی کثرت چاروں طرف پیک ہی پیک نظر آتی تھی۔ بہن وہ تو جب سے
آئے تھے باہر تھے۔ خدا جانے ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ میں نے
تو یہاں کا نہ پانی پیا نہ دانا کھایا۔ صبح کو یوسف سے چار آنے کی
کچوریاں منگا کر دونوں ماں بیٹوں نے کھالی تھیں۔ دوپہر کو
اپنے گھر کے پراٹھے اور کباب کھائے۔ کباب ذرا ذرا بُس تو گئے
تھے مگر یہاں کے کھانے سے پھر بھی اچھے تھے۔ جیتا رہے میرا
یوسف پانی بھی وہ کہیں باہر ہی سے لاکر مجھے پلاتا رہا۔ رات کو
بھی میں نے بازار کے کلیجی کے کبابوں پر گزارہ کیا۔ صبح کو ایک
نے ایک کو جھنجھوڑا۔ پھر غل غپاڑہ ہونے لگا۔ کچھ دیر سب نے
مل کر برا بھلا گایا بجایا۔ گانا ہو چکا تو مہمان رخصت ہونے شروع
ہوئے جو باقی رہے انہیں دوپہر کو رات کی بچی ہوئی روٹیاں اور
سالن گرم کرکے کھلایا۔ چار وقت کے بعد خالہ جان کو ہمارا ہوش آیا۔
انہوں نے مجھ سے کہا۔ "بیٹی دیکھی تو نے ہمارے ہاں کی شادی۔
ہماری کیا اوقات ہے۔ کہنے کو مزدور ہیں۔ لیکن بچے کو ذرا سی گھوڑی
چڑھانے میں سو روپے کے پھیر میں آگئے۔ پھر نام بھی کیسا ہوا ساری
برادری سارا محلہ واہ واہ کر رہا ہے۔"

"خدا رکھے آگے کو کسی بڑی شادی میں آؤ گی تو بہار دیکھو گی۔
لال روٹی اور بیسن باورچی کے ہاتھ کا سالن ایسا جوڑ ہے کہ دوسری جگہ
نصیب نہیں۔ جو کھاتا ہے انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے۔ تو نے
تو بیٹی خوب پیٹ بھر کے کھایا ہوگا۔ سچ کہیو کیسا تھا؟ رات کو بھی یہی
لائیو۔ دلہن سے کہہ دوں گی وہ بچا کر رکھ دے گی۔"

اتنے میں ایک پڑوسن آگئی۔ خالہ جان تو اس سے باتوں میں
لگیں اور میں نے یوسف کو بھیج چپکے سے انہیں بلایا۔ اور ان کے
ان میں کہا کہ اب اگر اپنی اور میری زندگی چاہتے ہو تو آج ہی یہاں
سے روانہ ہو جاؤ۔"

ان کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ بولے
کہ خالہ اور خالہ کے گھر کو سلام میں نے جیسی حماقت کی اور تمہارا کہا
نہ مانا اس کی سزا بھگتی۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ سبق بھی مل گیا کہ
لڑکے لڑکی کا بیاہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ اگر نانی اماں خالو
جان کی دولت کے مقابلے میں ذاتی شرافت اور قابلیت کو مقدم
سمجھتیں تو آج مرزا اسفندیار بیگ کے داماد اور علی حسین خاں
کے بیٹے ڈھلیوں میں نہ ملے ہوئے ہوتے۔ خیر خدا کی مرضی۔ تم خاطر
جمع رکھو۔ ریل کا وقت پوچھ آیا ہوں اور یہ دیکھو ٹکٹ بھی خرید لئے
ہیں بس رات کو ریل میں اور صبح ہوتے اپنے گھر ہوں گے۔ ریل کا
نام آتے ہی جیسے کالے سانپ نے پھنکار ماری۔ میرے پیٹ میں دھوئیں
سے اٹھنے لگے مگر خالہ کے ہاں مہمان بن کر رہنے سے اب مجھے جہنم میں
جانا بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ خالہ جان نے بہتیرا روکا خالو
ابا بگڑ گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہم سے آئندہ ملنے کی قسم
کھالی۔ وہ ملیں نہ یا ملیں۔ ہم تو بہن شام ہوتے ہی تانگے میں
سوار ہو اسٹیشن پہنچ گئے آج آگرہ آئے ہوئے آٹھواں دن ہے
لیکن بہن ابھی تک اوسان درست نہیں!"

نذر الاسلام بقیہ ص۴۳

کی صفوں میں معرکہ آرا۔ اس نے حالات کے دھارے کا رُخ بدلنے کے لئے جان و دل کی بازی لگا دی اور اپنی آواز کی گھن گرج، اپنے بے پناہ جوش و خروش، اپنی بہادرانہ للکار، اپنے نعرۂ ھل من مبارز، اپنی طبعِ آتشیں نے اس تکراؤ عملی جد و جہد کا ثبوت دیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ نذرل کی اہمیت محض یہ نہیں کہ اس نے حالات کا رخ موڑا بلکہ کس طرف موڑا۔ زبان، فکر اور موضوعات میں تبدیلی اور سنسکرت سے اسلامی زبانوں، خصوصاً اردو کی طرف رجوع درحقیقت زندگی کی تہوں میں ایک بنیادی انقلاب کا آئینہ دار تھا۔ یہ شعوری یا غیر شعوری طور پر، جو بھی سمجھ لیجئے، اقبال اور قائد اعظم کی نہج پر دو قومی تصور کی طرف رجوع تھا۔ وہ اسلامی احساس جو ہر فرزند توحید کی طبع ثانیہ بن چکا ہے۔ آخر کار ابھرا اور پورے زور سے ابھرا۔ ایک خوابیدہ کوہ آتش فشاں کا تند و تیز لاوا بن کر اور تمام میدانِ حیات پر چھا گیا۔ یہی احساس تھا جس نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں بھی ایک نیا شعور اور نئی لگن پیدا کر دی اور وہ تاریخ کے میدان میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اور اسے نذرل کی سب سے بڑی کامیابی سمجھنا چاہئے۔

لیکن اس کی کامیابی کی حد محض یہ نہیں۔ اس کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھتا ہے۔ ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ ایک حقیقی انقلابی، جو فکر اور جذبہ و احساس کا جامع ہو، کبھی وقتی ہنگاموں میں گم ہو کر نہیں رہ جاتا۔ اس کا یہ اثر دائمی ہوتا ہے، مسلسل ہوتا ہے وہ ملت کے دل و دماغ میں ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔ آج بھی اس شیدائی انقلاب، اس مردِ مجاہد کی آتشیں روح تمام افرادِ ملت کے سینوں میں شعلہ زن ہے خواہ وہ مشرقی پاکستان میں ہوں یا مغربی پاکستان میں۔ ہمارا موجودہ انقلاب کیا ہے؟ اقبال، نذرل اور قائد اعظم ہی کے جذبہ و جوش کا تازہ ترین مظہر اور قوم اب بھی ان سب کی آتشیں شخصیتوں ہی سے حرارت حاصل کرتے ہوئے میدانِ جہات میں نہایت سرگرمی اور تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نذرل جسمانی حیثیت سے لاکھ آتش خاموش سہی لیکن درحقیقت آتش خاموش نہیں، وہ ایک خوابیدہ کوہِ آتش فشاں ہے جو برابر اپنی بیداری اور بے پایاں حرارت کا ثبوت دے رہا ہے اور دیتا رہے گا۔

غزل

وشوا ناتھ دردؔ

جو نہ گزری تھی وہم و گماں سے
اُن سے کہنی پڑی وہ زباں سے

سُن تو لی ہے مگر کیا بتاؤں
تم نے آواز دی کس جہاں سے

ایسی دوری نہ تھی دو دلوں میں
فاصلے آ گئے یہ کہاں سے

جس کا آغاز و انجام تم ہو
وہ کہانی سُنو درمیاں سے

لاکھ پردوں میں تم تو نہاں تھے
ڈھونڈ لایا تمہیں میں کہاں سے

یہ تعلق نبھے گا کہاں تک
یہ تعلق تو ہے جسم و جاں سے

آنکھ جس کی بھی تم پر پڑی ہے
وہ ستارا گرا آسماں سے

اب تو گھٹنے لگا دم قفس میں
کس نے آواز دی آشیاں سے

ں جگہ زندگی تھک کے بیٹھی
اِعزمِ سفر ہے وہاں سے

وہ جبیں کس جگہ اب جھکے گی
اُٹھ گئی جو ترے آستاں سے

راز اپنا نہ تم رکھ سکے دردؔ
اب شکایت ہی کیا رازداں سے

اردو اور بنگالی کا مشترک ماخذ بقیہ صفحہ ۳۴

کی تی اور پراکرت آ ی سے مشتق ہے۔
مثلاً: صیغۂ امر اردو اور بنگالی میں چل۔ جا وغیرہ (قدیم

قدیم پراکرت اور سنسکرت	پراکرت	اردو
چلتی ۔ یاتی	چلئی۔ جئی	وہ چلتا ہے۔ وہ جاتا ہے

صیغۂ امر میں اردو اور بنگالی چل ۔ جا قدیم پراکرت اور سنسکرت چلا۔ یتی اور پراکرت چلا۔ جا سے ماخوذ ہیں۔ اردو اور بنگالی میں تانیث کے لاحقے ایک ہی ہیں جیسے مرغی ۔ مُرگی ۔ مہترانی ۔ دھوبنی (دھوبن) دونوں زبانوں میں مرکب الفاظ بھی ایک جیسے ہیں مثلاً ماں باپ ۔ رات دن ۔ دوپہر ۔ ریل گاڑی ۔ چوراہا ۔ (بنگالی چورستہ) وغیرہ ۔ تکرار معنوی رکھنے والے الفاظ کا بھی یہی حال ہے جیسے آس پاس ۔ ادلا بدلا (ادل بدل) بھات وات (بھات ٹاٹ) وغیرہ۔

اردو اور بنگالی دونوں میں جملہ کی بناوٹ یا ترکیب اس طرح ہوتی ہے۔ پہلے فاعل پھر مفعول اور آخر میں فعل جیسے تمی آم کھاؤ۔ (تم آم کھاؤ۔)

اس طرح یہ بخوبی واضح کیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف بنگالی اور اردو بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی تمام ہند آریائی بولیاں جیسے ہندی، سندھی، گجراتی، مرہٹی، نیپالی وغیرہ قدیم پراکرت سے ماخوذ ہیں جن میں ہر جگہ علاقائی حالات و ظروف کے مطابق تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ۔ (ترجمہ)

"جیون ندی کو بہنا ہے" بقیہ ص۴۴

تھا اور کمرے میں گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ نیلوفر نے اپنے ہاتھ کے قریب دیوار پر لگے ہوئے سوئچ کو دبا کر روشنی کردی اور اس کے ساتھ ہی نگاہوں کے سامنے بہت سارے رنگ پھیل گئے، سیاہی پتی ہوئی ایک میز تھی، اس کے قریب ہی بغیر بازو کی ایک کرسی رکھی تھی۔ ہر طرف رنگ اور سیاہی اور برش اور کاغذ بکھرے ہوئے تھے اور دیوار سے لگی ہوئی کارڈ بورڈ کی بہت ساری تصویریں رکھی تھیں۔

معین نے بڑے پیار سے ایک تصویر پر ہاتھ رکھ کر کہا "غور سے دیکھو ممتا۔ اس لڑکی کے بال کتنے خوبصورت، لمبے، گھنے اور کالے ہیں۔ یہ مشہور خوشبودار کیش بہار تیل کی شیشی کا لیبل ہے۔ اور اس لڑکی کی طرف دیکھو۔ بنگال میں کتنی لڑکیاں اتنی خوبصورت اور صحت مند ہیں۔ بولو تو۔ تم سوچتی ہوگی۔ یہ میرے فن کا کمال ہے، لیکن نہیں، یہ بغدادی پیر کی خواب میں بشارت دی ہوئی دوا کے استعمال کا اثر ہے۔ یہ اسی کا اشتہار ہے۔ اور اس دوشیزہ کو دیکھ رہی ہو..."

کہتے کہتے یکایک معین کو خیال آیا کہ ممتا کچھ بھی نہیں دیکھ رہی وہ ایک سہ رنگی تصویر کی طرف بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی۔ معین نے پوچھا "کیا دیکھ رہی ہو ممتا؟"

ممتا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی "یہ تم نے کس کی تصویر بنائی ہے؟"

معین نے حیران ہو کر پوچھا "تم اسے نہیں پہچانتیں؟ — جوڑے میں سرخ پھول، سرخ ساڑی پہنے ہوئے سولہ سال کی کسی دوشیزہ کی تصویر میں نے بنائی تھی؟ بہت دنوں سے یہ تصویر گھر میں پڑی ہوئی تھی میں نے سوچا، اسے بھی کام میں لے آؤں۔"

ممتا نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں "لیکن اس کے ہاتھ میں جوتا پالش کا ایک بڑا سا ڈبہ کیوں دے دیا ہے؟ جوتا پالش کا ڈبہ میں نے کبھی پیار سے اپنے گالوں سے لگایا ہے کیا؟"

معین ہنسنے لگا "تم بھی کتنی بے وقوف ہو! اتنی دیر سے تم کیا دیکھ رہی ہو؟ وہ بھی ایک اشتہار ہے۔ ورائٹی بوٹ پالش کا اشتہار۔ اگر یقین نہ آئے تو میرے نئے منیجر صاحب سے پوچھ لو۔ کچھ میں اسے منظور کرا کے لایا ہوں، کچھ روپیہ نقد ایڈوانس بھی لے آیا ہوں۔"

ممتا نے نہ جانے کیا سوچا اور پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی ✦

★

صفی الدین بقیہ ص۳۷

'سیلاب' سے کیا جائے۔ اس موازنہ کو زیادہ واضح بنانے کے لئے 'سیلاب کی گرفت' کو بھی پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے۔ جو ان دونوں کے بین بین ہے۔ فن پارے میں بادبان کے تلے ایک چھوٹی سی کشتی کی لہراتی بل کھاتی اشکال ہیں۔ دوسرے میں یہی اشکال سیلاب سے دبے پچکے ہوئے درختوں کی کیفیت واضح کرنے کے کام آتی ہیں۔ اور تیسرے میں یہی اشکال پھر موجود ہیں لیکن اپنے فطری ممثل سے اور بھی زیادہ ہٹی ہوئی مگر ساتھ ہی ان میں یہ میلان پایا جاتا ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی الگ الگ ہو کر پھیل جائیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ہم اشیاء قدرت کی حقیقی وضع کے ساتھ بدیہی طور پر ملتی جلتی وضع و ہیئت سے جتنا بھی دور ہوتے جائیں گے۔ اتنی ہی تمثیل کو بحیثیت واحد شناخت کرنے میں دشواری ہوگی اور ناظر کو اس کا مفہوم اخذ کرنے کے لئے برابر اس میں حصہ لینا پڑے گا۔ اگر اس بات کو وسیع ترین ضمن میں دیکھا جائے تو کچھ عجیب نہیں کہ یہ ہر عظیم فن کی لازمی خصوصیت ہو۔ لیکن اگر اسے محدود ضمن میں دیکھا جائے تو اس میں غالباً اسلام کے روایتی فن کی مخصوص جوہریت کی ایک مخصوص جھلک یا ادا دکھائی دے گی ✦
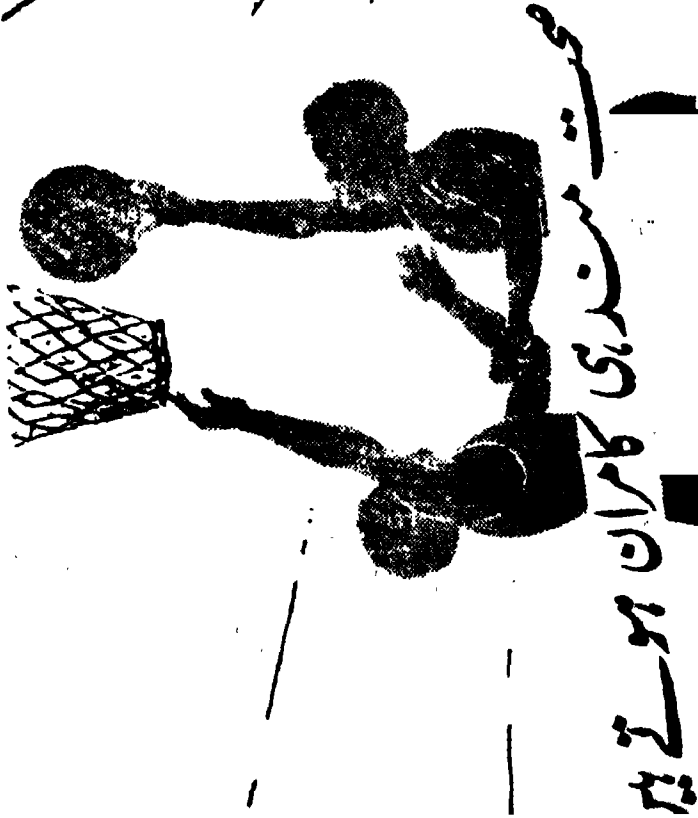
"بابائے اردو" بقیہ صہ ۱۴

رشتہ موجود ہے جو کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اس کے لئے بہت ہی ضبط کی ضرورت ہے۔ اکثر ادیب اس ضبط کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اور جلد ہی کہیں نہ کہیں بہک جاتے ہیں۔ انہیں جو کچھ کہنا ہو اس سے زیادہ کہہ جاتے ہیں اور بہت بڑھا چڑھا کر۔ مولوی صاحب ہمیشہ چچی تلی بات کہتے ہیں مگر بہت ہی سلجھے، نکھرے ہوئے پیرائے میں۔ جس سے مطلب بھی ادا ہو جائے اور بیان کی دلکشی بھی قائم رہے۔ اسلوب کا مسئلہ ان کے لئے بہت ہی صاف اور سیدھا مسئلہ ہے۔ کوئی ٹیپ ٹاپ کوئی ہنگامہ آرائی نہیں۔ جو کچھ ہو آمد ہی آمد ہو۔ اور یہ کفایت شعاری حقیقتہً زیادہ بھرپور اور موثر ثابت ہوتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کی تحریر کتنی نکھری ہوئی، کتنی صاف ستھری اور پاکیزہ ہے۔ جیسے پہاڑ سے خود بخود پھوٹنے والا قدرتی سرچشمہ۔ جس سے دل کے کنول خود بخود کھل جائیں۔ اور ایک سکون

ایک فرحت، ایک ٹھنڈک سی محسوس ہو۔

مولوی صاحب بذاتِ خود ایک ادارہ، ایک دور، بلکہ دوروں کا مجموعہ ہیں۔ ان کی خدمات گونا گوں اور ان کے اسلوب میں کتنی ہی باتیں یاد رکھنے، سینت سینت کر رکھنے اور قدر کرنے کے لائق ہیں۔ ان سب کا احاطہ ایک مختصر مضمون میں بہت دشوار ہے ۔ چیاں در شیشۂ ساعت کنم ریگِ بیاباں را! اس لئے یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ خدا مولوی صاحب کو اور بھی عمرِ دراز عطا کرے تاکہ وہ ملک و قوم اور زبان و ادب کی اور بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اور اپنی زندگی کے سب سے بڑے کام۔ اردو یونیورسٹی کے قیام۔ کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ثابت ہوں

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

ایک اور پانچ

مصباح الحق

”اگلے منصوبہ ترقی میں جو مقاصد رکھے گئے ہیں وہ تب ہی حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم سخت محنت کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس کا تہیہ کرلیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی اس سر زمین پر آباد ہے اس کے مستقبل کو ماضی سے بہتر دیکھنے کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ وہ تیزی سے ترقی کی راہیں طے کرتا ہوا ممالک عالم میں ایک قابل فخر مقام پر پہنچ جائے ۔ ان مقاصد کو صرف تندہی اور انتھک کوششوں ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے،،

(فیلڈ مارشل محمد ایوب خان)

چھ نہیں، صرف پانچ ہوتے ہیں — وہ کیسے؟ آپ تو لکل آلٹی گنگا بہا رہے ہیں — جی نہیں، گنگا بالکل ہیک بہ رہی ہے۔ صرف ایک لفظ کا ہیر پھیر ہے۔ ک پانچ نہیں ۔ ایک اور پانچ ۔

بہت خوب! اب لگے ہاتھوں یہ بھی عقدہ ھل جائے کہ ایک پانچ کونسا ہے اور دوسرا نچ کونسا ۔

میرا مطلب ہے ہمارے پنج سالہ منصوبے ۔ ایک وہ جو گذر چکا ۔ اور دوسرا وہ جس کا اب ہم از کر رہے ہیں ۔ ایک ابتدا تھا دوسرا انتہا ۔ ر ابتدا تو آپ جانیں ابتدا ہی ہوتی ہے۔ ابھی

پاکستان کو ابھرے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور ہر چیز کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی ۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ حالات کا رخ کیا ہونا چاہیئے ۔ سب سے مقدم تو ہمارے یہاں زراعت ہی تھی ۔
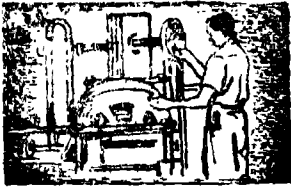
اس پر توجہ نہ دی جاتی تو اور کس بات پر دی جاتی ۔ اور زراعت اور آبپاشی کا چولی دامن کا ساتھ ٹھہرا ۔ ہمارا زمانہ کلوں کا زمانہ، برق اور بھاپ کا زمانہ، طاقت کا زمانہ ۔ پھر صنعتی ترقی، برقابی اور طاقت کے دوسرے ذریعوں پر زور نہ دیا جاتا تو اور کس چیز پر دیا جاتا ۔ کھانے پینے کے ساتھ پہننا بھی لازم ٹھہرا ۔ یعنی ہار چات ۔ جن کا شمار اشیائے صرف میں ہوتا ہے ۔ ان سب روزمرہ کے کام میں آنے والی چیزوں کے لئے ہم کب تک دوسروں کے

دست نگر رہ سکتے ہیں - بے شک اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے - مگر یہ خالی دعوی ہی بن کر نہ رہ جائے - قدرتی وسائل سب موجود سہی مگر ان کو کام میں لانا تو ہمارا کام ٹھہرا - کسی نے یونہی تو نہیں کہا :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہ حکایات لطیف تو آپ نے آگے بھی سنی ہوں گی - بیراج، برقابی طاقت کے منصوبے، کرنافلی میں کاغذ کے کارخانے، سوئی گیس - بندرگاہوں کی گودیاں - غرضیکہ کیا کیا کچھ - اور ان سب کا سرچشمہ — ”پی آئی ڈی سی،، کا شاندار ادارہ - مگر صاحب ابتدا پھر ابتدا ہے - انقلابی حکومت نے آتے ہی ان سب کا نقشہ ہی اور کر دیا - اور اس کا نتیجہ ہے — ایک اور پانچ - یعنی ہمارا دوسرا پنج سالہ منصوبہ - زیادہ وسیع، زیادہ کثیر المقاصد اور زیادہ مہتم بالشان —

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید - ابھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس ہر جہتی منصوبے سے ہمارا ملک کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا - سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس منصوبے میں کوئی خیالی پلاؤ نہیں پکائے گئے - یہ بہت ہی حقیقت پسندانہ منصوبہ ہے - فکر و نظر اور حکمت و تدبیر کا شاہکار - اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس سے کوئی ڈرامائی اثر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی - جو بھی مقاصد ہیں بڑے ہی صاف سیدھے اور سچے تلے پیرائے میں پیش کئے گئے ہیں - یہ مقاصد کچھ آسان نہیں - ہر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کی ضرورت ہے - پہلے تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ترقی کی نہج و روش کیا ہو - ہماری بڑی بڑی ضروریات کیا ہیں - انہیں کس طرح پورا کیا جائے - ہمارے وسائل کیا ہیں - [illegible]

میں ٹھیک ٹھیک تال میل پیدا ہو جائے تو پھر کیا چاہیئے - تب تو ہمارا ملک بڑی دلجمعی اور تیزی کے ساتھ اقتصادی و معاشرتی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکے گا - اس سلسلہ میں یہ دیکھنا بھ لازم ہے کہ ہمارے فوری مقاصد کیا ہوں - ہمی جیسے بھی بن پڑے اپنی زراعتی و صنعتی پیداوار کو بڑھانا چاہئیے تاکہ ہماری ملکی دولت بڑھے ہماری آمدنی میں اضافہ ہو اور ہم سب آسودہ خوش حال ہوں -

یہ کون نہیں جانتا کہ ہمارا ملک ایک زراع ملک ہے - اس لئے ہمارا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہ چاہئیے کہ ہم اپنی غذائی ضرورتوں کو پورا کر کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں اور زمین سے ک مقدار میں غلہ اگائیں - اس کے لئے حضرت نوح زمانے کے آلات اور طریقے قطعاً موزوں نہیں ہو سکت جدید زمانے میں جدید آلات سے کام لئے بغیر چارہ نہیں لہذا ضرورت ہے کہ ہم اپنی زراعتی کو مشینی بنائ جدید ترقی یافتہ طریقوں سے کام لیں اور ا دوسری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے صنعت اس طرح فروغ دیں کہ اس سے زراعت کو فائدہ ہو اور ملکی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں اگر سوتی کپڑوں اور پٹ سن کی صنعتوں کی مق ایک تہائی یا اس سے زیادہ اور شکر سازی کی مقدار نصف کے بقدر بڑھا دی جائے تو کیا کہنے - چھوٹے

پیمانے کی دستکاریاں بڑی کام کی چیز ہیں - ان ملک ترقی بھی کرے گا اور لوگوں کو روزگار ہاتھ آئے گا - صنعتوں کے سلسلہ میں ایسی سہولت پر زور دیا گیا ہے جن سے نجی سرمایہ لگانے وال کو - خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، فائدہ بھی پہن اور ان کی پوری پوری حوصلہ افزائی بھی ہو - غذ حیثیت سے خود کفیل ہونے کے لئے آئندہ پانچ سا میں پیداوار کی مقدار ۲۰ فیصدی یا اس سے ز

صدی اضافہ۔ اخراجات کچھ اندرونی اور کچھ بیرونی ذرائع سے پورے ہوں گے۔

ہر میدان پر ہمہ گیر توجہ دی جائے۔ مگر غذا زیادہ کرنے سے بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ تھوڑا حل ہو جائیگا۔ اس لئے منصوبہ کا ایک اہم پہلو اس کی روک تھام ہے۔

اس منصوبے کا بنیادی پتھر بہت ہی عمدہ اور مضبوط ہے۔ اپنے کام کی چیزیں زیادہ برآمد کی جائیں اور باہر سے آنے والی چیزیں خود بنا کر جلدی جلدی خود کفیل ہو جائیں اور اپنا ذریعہ معاش خود پیدا کریں۔ مزدوروں کو جن کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، کام سے لگایا جائے۔ قوم کی بھلائی اور خوشحالی، تعلیم، صحت اور رہائش کو ہر طرح بہتر بنانے پر موقوف ہے۔ ایسے کہ مدرسوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ جائے۔ اعلیٰ کلیاتی تعلیم خصوصاً سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم خوب ترقی کرے۔ چیدہ چیدہ صنعتوں میں ۵۰ فیصدی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں ۱۵ فیصدی اضافہ متوقع ہے۔ ملک کے کم خوش حال علاقوں کو مدد دینا اور انہیں معاشری خدمات بہم پہنچانا از بس ضروری ہے۔
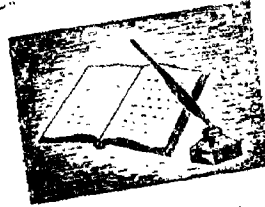
رہا اخراجات کا سوال تو یہ کچھ ایسی دشوار بات نہیں۔ چوں عشق حرم باشد سہل است بیابان ما۔ حکیم ملت رح نے بھی یہ نکتہ سمجھا دیا ہے کہ علم معیشت بھی زندگی ہی کا ایک جزو ہے۔ قوم کے دل میں لگن ہو تو وہ ہر بات کے لئے سروسامان پیدا کرسکتی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس منصوبے پر ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک کوئی ۱۹۰۰ کروڑ روپے لاگت آئے گی۔ اس کے معنی ہیں پہلے منصوبے کے انتہائی اخراجات کے بالمقابل ترقیاتی اخراجات میں ۵۰ فی

منصوبے کا مطمح نظر ۱۹۶۵ء تک قومی آمدنی میں ۲۰ فیصدی اضافہ ہے۔ یہ ترقی پذیر اور خود کفیل معنیت کی طرف بہت بڑا قدم ہوگا۔ ایسے کہ ۵۵ء کے مقابلے میں ۷۵ء تک آمدنی دوگنی اور ۸۰ء تک چارگنی ہو جائے گی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آبادی میں ۹ فیصدی ترقی ہوگی تو فی کس آمدنی میں کوئی ۱۰ فیصدی اضافہ ہوگا۔ حالانکہ پچھلے منصوبے میں تقریباً کوئی بھی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ لیجئے اس عظیم منصوبے کے مقاصد ایک ہی نظر میں دیکھئے:-

۱ - قومی آمدنی میں ۲۰ فیصدی اضافہ۔

۲ - غلے کی پیداوار میں ۲۰ فیصدی سے زائد اضافہ۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ سیراب رقبہ میں ۱۵ لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہو اور ۷۰ لاکھ ایکڑ زمین کو ترقی دی جائے۔
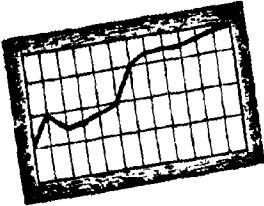
۳ - بیرونی زر مبادلہ کی آمدنی کو ۲۰ فیصدی بڑھا کر فاضل ادائگیوں کے توازن کو پاکستان کے لئے بہتر بنایا جائے۔

۴ - بڑے پیمانے کی صنعتی پیداوار کو ۵۰ فیصدی سے زیادہ بڑھایا جائے۔

۵ - ۷۵ کروڑ روپے کے صرف سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔

۶ - مشرق و مغربی پاکستان کے کم ترقی یافتہ

کیا جائے - مشرق پاکستان میں ترقیاتی کوششوں کو تقریباً ۱۴۰ فیصدی اور مغربی پاکستان میں اندازاً ۷۰ فیصدی بڑھایا جائے ۔

۷ - ملک بھر میں دیہاتی ترقیاتی ادارہ کا جال بچھا دیا جائے ۔

۸ - نظام تعلیم کی از سر نو تنظیم اور توسیع ۔

۹ - صحت کی مزید سہولتیں اور بیماریوں کا انسداد ۔

۱۰ - رہائشی سہولتیں اور بہم رسانی آب کو ترقی دی جائے ۔

۱۱ - روزگار کے مواقع مہیا کئے جائیں ۔

۱۲ - مزدوروں کے حالات بہتر بنائے جائیں ۔

۱۳ - خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام عمل میں لایا جائے ۔

اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کرلینی چاہئیے کہ محض لمبے چوڑے منصوبے باندھ لینا کوئی بڑی بات نہیں - اصل چیز تو ان منصوبوں کو کامیاب کرکے دکھانا ہے ۔ اور یہ مصمم ارادہ کہ ہم نے جس کام کا تہیہ کیا ہے اسے پورا کرکے رہیں گے - یہ تمام تر ہماری ذاتی سعی و کوشش پر موقوف ہے ۔ صدر پاکستان نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ

''اتنا واضح کر دینے سے کہ اس منصوبہ سے کس طرح قومی دولت و خوش حالی کو بہتر بنایا جائے ۔ میں نے آپ کو صرف آدھی کہانی ہی سنائی ہے ۔ اگر آپ واقعی یہ تمام فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے زور بازو اور جد و جہد ہی سے کام لینا پڑے گا ۔ یہ ممکن نہیں کہ ہمیں یہ فوائد یونہی ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ہاتھ آجائیں ۔''

لہذا اس عظیم تجربہ کو کامیاب بنانے اور عروج و ترقی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہمیں اپنی بہترین کوشش وقف کر دینی چاہئیے تاکہ ہمارا حال بھی بدرجہا بہتر ہو جائے اور مستقبل بھی کہیں زیادہ تابناک ہو ۔

★ ★ ★

بچّے کے اس سوال کا جواب بیچارے ابا کی سمجھ میں بھی فوراً نہ آیا چونکہ وہ بھی نظریۂ اضافیت سے بالکل بےخبر تھے، لیکن آخر کار اپنا بھرم قائم رکھنے کی صورت نکال ہی لی اور یہ جواب دیا "اس کے معنی ہیں کہ..... جب فضا سمٹتی ہے تو وقت پھیل جاتا ہے!"

"اباجان - زمان و مکان میں کیا تعلق ہے؟"

گو کہ اس علمی اصطلاح سے آئینسٹائن کی یہ مراد نہ رہی ہو گی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جیٹ طیاروں کے استعمال سے مسافتیں بہت کم ہو گئی ہیں اور چند ہفتے کی مدّت بھی دور دراز مقامات پر جا کر تعطیل گذارنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ خواہ بغرض تفریح یا بغرض کاروبار جیٹ طیارے سے سفر کا تمامتر مدار سیّال ایندھن اور مزلقات پر ہوتا ہے جن کے بغیر جیٹ طیارے پرواز ہی نہیں کر سکتے۔ اور یہ ملحوظ رہے کہ جو سیّال ایندھن اور مزلقات جیٹ طیاروں میں استعمال ہوتے ہیں ان کی بہترین قسم برماشیل فراہم کرتی ہے۔

برماشیل کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے

خیابان پاک

(پاکستان کی علاقائی شاعری کے منظوم تراجم کا انتخاب)

علاقائی شاعری کی روایات ـــــ سہانے گیت اور میٹھے بول ـ پاکستان کی نغمہ ریز سرزمین کی خاص پیداوار ہیں ـ ان کے منظوم اردو تراجم کا یہ انتخاب چھ زبانوں کے اصل نغمات کی صدائے بازگشت ہے ـ ساٹھ سے زیادہ مقبول شعرا کا کلام ـ

کتاب نفیس اردو ٹائپ میں بڑے سائز پر نہایت وضعداری کے ساتھ طبع کی گئی ہے ـ
اس کا گردپوش بھی مصور اور دیدہ زیب ہے ـ ضخامت تین سو صفحات

قیمت چار روپے ـ علاوہ محصول ڈاک

ادارۂ مطبوعات پاکستان ـ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

ایک پھول کی طرح...
آپ کا رنگ روپ
روز بروز نِکھرنے لگے گا!
اَصل خوبصورتی کا انحصار صحت مند جلد پر ہے۔ رِکسونا صابن سے اپنی جلد
کی حفاظت کیجئے۔ رِکسونا میں قدرتی تیلوں کا ایک خاص مرکب کیڈِل
شامل ہے جو آپ کی جلد کے لئے بھی صحت بخش ہے۔ اور چہرے پر لطافت و
جاذبیت بھی پیدا کرتا ہے۔ رِکسونا میں پھولوں کی سی دلفریب خوشبو ہے
جو دیر تک آپ کی جلد پر قائم رہتی ہے اور آپ کو تر و تازہ رکھتی ہے۔
روزانہ رِکسونا صابن استعمال کیجئے۔ آپ کا رنگ رُوپ ایک پھُول کی
طرح روز بروز نکھرنے لگے گا۔
Rexona
BLENDED WITH CADYL
اپنی جلد کی حفاظت
رِکسونا
صابن سے کیجئے
RP. 19-193 UD.

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ ۔ کراچی ۔ مدیر : رفیق خاور

پھوڑے پھنسی کا ایک علاج
مگر بہتر ہے صافی استعمال کریں
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان - کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام
SAFI

ی فرینڈز شو مینو فیکچرنگ کمپنی، کراچی، پاکستان

صحت و مسرّت کی تصویر
یہ باسلیقہ خاتون اپنے حسنِ شعور سے
گھر کو چندن سا رکھتی ہے اور صحت و
توانائی کے لئے کھلی ہوا اور مستند غذا
کی اہمیت کو بھی خوب سمجھتی ہے۔
وہ صحت برقرار رکھنے کے لئے
رسوئی بناسپتی
میں لذیذ کھانے پکاتی ہے اور
اکثر کھیلوں میں حصہ لیتی ہے
رسوئی بناسپتی میں وٹامن
اے اور ڈی شامل ہیں جو
آپ کے لئے ایک گونہ طاقت
کا وسیلہ ہے۔
Rassoi
رسوئی ہاتھ کے مس سے محفوظ
اصول حفظانِ صحت پر تیار کیا ہوا
وٹامن 'اے' اور 'ڈی' سے بھرپور
تیار کردہ:- مقبول کمپنی لمیٹڈ
واحد تقسیم کنندگان:- آدم لمیٹڈ

جلد ۱۳ شمارہ ۶

جون ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

لوک کھیل

وہ کھیل جو محض عوامی ہی نہیں بلکہ عوام کے اپنے برسوں پرانے کھیل ہیں جو مشرقی پاکستان میں بستی بستی گاؤں گاؤں دکھائے جاتے ہیں۔ اور یہاں کے لوگوں کی زندگی میں اس طرح سے بسے ہوئے ہیں کہ ان میں مشرقی پاکستان کی روح بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

جسیم الدین

انیسویں صدی عیسوی میں انگریزوں کے زیر اثر ڈرامائی ادب کچھ ایسا پروان چڑھا جس کی مثال شاید ہی کہیں دکھائی دے۔ چنانچہ گریش چندر سے لے کر رابندر ناتھ ٹیگور تک نہ جانے کتنے ڈرامے لکھے گئے، اور سچ تو یہ ہے کہ بنگلا میں جس کثرت سے جدید وضع کے ڈرامے لکھے گئے ہیں برصغیر ہند و پاکستان کی کسی اور زبان میں شاید ہی لکھے گئے ہوں۔

اس کے باوجود ہمیں ماننا پڑے گا کہ ادب کا یہ بڑا ہی مایۂ ناز سرمایہ ہمارے لوگوں کی سرشت کی اس طرح عکاسی نہیں کرتا جتنا کہ دوسرے ملکوں کا ڈرامائی ادب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سبیر کمار بھادوری اداکاروں کا ایک طائفہ لے کر امریکہ گیا تاکہ وہاں بنگلا ڈراموں کے ترجمے اسٹیج کرے تو دیکھنے والوں نے ان کو سراہا تو ضرور لیکن ان میں اس دھرتی کی رسم ریت کی حقیقی جھلک نہ پا سکے جس میں یہ ڈرامے پیدا ہوئے تھے اور جس کی توقع وہ ان ڈراموں سے کرتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے یہاں جدید مغربی وضع کے جو ڈرامے پیدا ہوئے ہیں ان کی جڑیں ہماری روایات میں پیوست نہیں ہیں، اس لئے وہ کبھی بلند مقام پر نہیں پہنچ سکتے۔

اس کے برعکس ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس ایسی لوک کہانیوں اور ناٹکوں کا ایک وسیع سرمایہ موجود ہے جو ہمارے عوام کی زندگی میں اس طرح رچے بسے ہوئے ہیں کہ وہ اس کا جزو بن گئے ہیں۔ ان میں ایک قدرتی کشش، ایک دلآویزی، ایک نمایاں چٹخارہ اور حقیقی خلوص پایا جاتا ہے۔ اور یہ ایسی خصوصیتیں ہیں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ خوش قسمتی سے بعض جدید لکھنے والے کم از کم اپنے کھیلوں کی بنیاد اس پختہ بنیاد پر رکھ رہے ہیں اور بڑے ہی عمدہ نتائج کے ساتھ چنانچہ

وہ منظوم مطالعے جو ہمارے دیسی گان۔ رکھالی گان اور "چھیلے بھلا نوسورا" یعنی عورتوں اور رکھوالوں کے گیتوں اور بچوں کی لوریوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے ہماری دیہی زندگی کے کتنے ہی پہلو اجاگر ہوتے ہیں یہی وہ چیزیں ہیں جن پر ہمارے بڑے بڑے ڈراموں کی بنیاد استوار رہی۔ مثال کے طور پر یہ چھیلے بھلا نوسورا[1] ملاحظہ ہو:۔

کیسی مزے کی بات بلموا، کیسی مزے کی بات!

کالی چیزیں چار۔

ان کے روپ انوپ دکھا دو

پھر میں آؤں تمہارے سات

بلموا کیسی مزے کی بات!

ایک تو کالا کاگا ٹھہرا دوجی باوری کوئلیا

ہاں اور گم سم کلچڑیا پہنے کالا کالا جوڑا

سب سے کالی، سب سے پیاری۔ تیری کجلی لٹ ہے بلموا

جیسے گھور اندھیری رات کیسی مزے کی بات!

یہ بات تو عام طور پر معلوم ہے کہ ہمارے گاؤں میں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ آزادی سے اٹھتے بیٹھتے ہیں جوان لڑکیاں شاذ و نادر گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتی ہیں۔ پھر بھی شام سمے پانی بھرنے کے لئے پاس ہی دریا کے گھاٹ پر جائے بغیر چارہ کہاں۔ ایسے موقعوں پر چھیل چھبیلے البیلے جوانوں سے ملنے جلنے کی صورت نکل ہی آتی ہے۔ گبھرو جوان، لوگوں کی نگاہوں اور آمد و رفت سے دور سنسان جگہوں اور جھٹپٹے کے برمحل وقت سے فائدہ اٹھا کر محبت کی پینگیں بڑھانے میں بڑے ہی اشتیاق سے کام لیتے ہیں۔ لیجئے، ایسے ہی ایک دلآویز منظر کی تصویر

[1] اس مضمون کے منظوم ترجمے شہاب رفعت کے قلم سے ہیں۔ مدیر

عوام کے صدر

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ دو محبت کے متوالے کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ شاعری کی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ ادھر ایک انوکھا، البیلا جوان نوکا یعنی چھوٹی سی ناؤ کھیتا چلا آ رہا ہے۔ اور ایک نوجوان لڑکی نیلا یا نیلو جو پنگھٹ پر پانی بھرنے آئی ہے، یوں پکار اٹھتی ہے:۔

اے جوان! تری نوکا دور رہے، دور رہے، دور رہے
تری نوکا سے ابھرتی لہریں، اٹھتی لہریں، لپکتی لہریں
میری لٹوں کو الجھا دیں، الجھا دیں، الجھا دیں۔
میری . . . .

جوان جواب دیتا ہے:۔

نیلا! تم اب نہیں جوان — او نیلا!
پہ ہے کہاں گھڑے پر بندیا؟
تم آؤ جو میرے دوارے - میرے من کی مان
میں مکھ پہ لگا دوں پیاری - یہ لال گلال نشان!
او نیلا . . . .

نیلا کہتی ہے:

گر آؤں تمہارے دوارے، اے بلوان!
مرے چچا کی جائے آن
اگر میں آ جاؤں اے پیارے!
مرے بادا کا ٹوٹے مان!

جوان یوں جواب دیتا ہے:۔

تیرے چچا کی آن او نیلا!
میں دھن سے بچا لوں گا
ترے بادا کا مان او نیلا!
جھک جھک کے بڑھا دوں گا

ہمارے لوک گیت دیہی زندگی کے ایسے ہی واقعات کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اور عوامی ناٹکوں میں بھی ان کا تانا بانا بڑے سلیقے اور قرینے سے دہرا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک کھیل "بیدار تماشہ" دیکھئے۔ جس میں ایک ایسا ہی معاملہ ان بولوں سے شروع ہوتا ہے:

او سندر ناری!
اپنا گھڑا بھر لے
ہر لہر اک مستی ہے

پنگھٹ پہ ناچ کرے!

ایسے واقعے بنگلا دیس کے کئی علاقوں کے "رکھالی گان" اور "بارو ماشی گان"[1] میں نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان ضلعوں میں بھی جہاں "بیدار تماشہ" کا رواج نہیں، یہ "جلدھر گیت یعنی" اپنا گھڑا بھر لے" گایا جاتا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "بیدار تماشہ" کے مرتب نے اس ہر دلعزیز اور عام طور پر رائج گیت کو اپنے کھیل میں سمو لیا ہے۔

بنگلا دیس میں "گا یندگان" یعنی گزرتے گزرتے چلتے پھرتے گویّے گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے داستانی گیت گاتے پھرتے ہیں۔ ان داستانوں کے کردار اکثر بڑی ہی دلچسپ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان سب مکالموں کو آپس میں ملا کر ایک لوک ناٹک کی شکل دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں تین قسم کے عوامی ناٹک رائج ہیں۔ مالدہ کا الکاف، رنگپور اور دیناج پور کا تماشہ اور فرید پور، ڈھاکہ، جیسور اور بریسال کا جاترا گان۔

پہلی قسم کے ناٹک بالعموم مزاحیہ ایکانکی کھیل ہوتے ہیں۔ ان میں سنجیدگی اور رونے رلانے سے پرہیز کی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مالدہ کا الکاف اور بردوان کا لیٹو تقریباً ایک ہی جیسی چیزیں ہیں۔ ہاں، برسبیل تذکرہ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشہور بنگلا شاعر، نذر الاسلام، کبھی لیٹو کھیل دکھلانے والے ایک طائفہ میں شریک رہا تھا۔ ضلع مالدہ کے ان حصوں میں جو پاکستان میں شامل ہیں، اس قسم کا کھیل دکھلانے والے کتنے ہی طائفے موجود ہیں۔

الکاف میں کوئی ماورائی قسم کے واقعات جو دیوی دیوتاؤں سے تعلق رکھتے ہوں، پیش نہیں کئے جاتے۔ ان میں تو زیادہ تر دیہی زندگی ہی کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ الکاف وضع کا لوک ناٹک دیہی زندگی کے کسی عام واقعہ ہی پر مبنی ہوتا ہے لیکن اس واقعہ کو کبھی غمناک، سنجیدہ یا المیاتی وضع عطا نہیں کی جاتی۔ مشرقی پاکستان مذہبی لوگوں کی سرزمین ٹھہری۔ اسلئے یہاں کے اکثر لوگ گیتوں میں دیومالا یا مذہبی موضوعات ہی کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ لیکن جس وضع کے ناٹکوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں، ان میں زیادہ تر دیہی علاقوں کی روزمرہ زندگی ہی کا رنگ روپ نمایاں ہوتا ہے۔ آیئے ایک ایسے ناٹک کی ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] شاید یہ مغربی پاکستان کی "بارہ ماہ" (پنجابی) سے ملتے جلتے ہیں (مدیر)

دو بھائی ہیں اور ایک بڑے بھائی کی بیوی۔ ایک کھاتے پیتے خوش حال کنبے کے تین افراد۔ ایک دن دیور نے بھاوج سے کہا "تم لوگ مجھے سارا دن کھیتوں میں لگائے رکھتے ہو۔ کچھ میری شادی کا بھی دھیان ہے؟" بھاوج اس کا تذکرہ اپنے گھر والے سے کرتی ہے جو فی الفور اپنے چھوٹے بھائی کے لئے بیوی تلاش کرنے روانہ ہو جاتا ہے۔ مگر وہ اکیلا کیسے جائے؟ چھوٹا بھائی اسے واپس بلا لیتا ہے اور کئی بار یہ کہنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے لیکن ہچکچاتا ہے۔ آخر بڑا بھائی تنگ آکر اُسے صاف صاف بات کہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور اسے پتہ چلتا ہے کہ چھوٹا بھائی بھی اس کے ہمراہ بیوی کی تلاش میں جانا چاہتا ہے۔ دونوں بھائی کئی جگہ جاتے ہیں اور پھر ایک گاؤں کے منڈل یعنی مکھیا کے گھر جاتے ہیں۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں جن میں سے چھوٹی زیادہ خوبصورت ہے۔ منڈل بڑی لڑکی کا ہاتھ پیش کرتا ہے لیکن لڑکا اس پر راضی نہیں۔ اتفاقاً چھوٹی لڑکی سامنے آجاتی ہے اور لڑکا اسے فوراً بڑے اشتیاق سے پسند کر لیتا ہے۔ اس سے اس اداکار کو جو چھوٹے بھائی کا بھیس بھرتا ہے مزاحیہ حرکات کے لئے بڑا عمدہ موقع ہاتھ آتا ہے۔ اس کے بعد شادی کے بعد کا سین آتا ہے۔ دولہا دلھن اکٹھے بیٹھے ہیں اور دولہا اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر وہ بولتی ہی نہیں۔ اس پر دولہا زور شور سے چیخنا چلانا شروع کرتا ہے کہ بھیلنے گونگی دلھن اس کے پلے ڈال دی۔ اس طرح جو وہ ہنسانے والی کیفیت پیدا کرتا ہے اور جو جو مضحک حرکات کرتا ہے نہ صرف دلھن کو بولنے پر مجبور کر دیتی ہیں بلکہ کھیل کو بھی اتنا دلچسپ بنا دیتی ہیں کہ تماشائی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے جاتے ہیں۔

اس قسم کا مکمل کھیل ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لیتا۔ اور بالعموم ایک رات میں سات آٹھ کھیلوں سے زیادہ پیش نہیں کئے جاتے۔ دیہی علاقوں میں ایسے کھیل رات کو کھانے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ ساری رات جاری رہتا ہے۔ بعض اوقات کھیل دکھانے والی مختلف ٹولیوں میں مقابلہ بھی ٹھن جاتا ہے۔

اگرچہ ان کھیلوں کا مقصد صرف تماشائیوں کو ہنسی کھیل کی باتوں سے محظوظ کرنا ہے، پھر بھی ان کی تہہ میں لوگوں کے اخلاق و عادات کو سنوارنے کا مقصد بھی پنہاں ہوتا ہے۔ چنانچہ جوئے بازی، سود خواری اور فضول خرچی کا خوب خاکہ اڑایا جاتا ہے۔

رنگپور، کوچ بہار اور میمن سنگھ کے "تماشہ" نامی کھیلوں اور فرید پور کے "جاترا گان" میں تھوڑا ہی فرق پایا جاتا ہے لیکن مشرقی بنگال کے عوامی ناٹکوں کی ایک نرالی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے "تماشہ کھیل" جو زیادہ تر نظم ہی میں ہوتے ہیں، ہنسی مذاق سے پُر ہوتے ہیں۔

مجھے ایک دفعہ عوامی کھیل "منسا" (ناگ دیوی) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ کس طرح بے ہولا نامی استری نے اپنے سورگباش پتی کے ساتھ ایک کشتی پر سفر کیا۔ اب فرید پور، کشتیا اور ڈھاکہ کے اداکار اس کھیل کو کس قدر دردناک بنا دیتے ہیں، اس کے کیا کہنے۔ لیکن شمالی بنگال میں ڈھیروں غلہ اُگتا ہے۔ شاید اسی لئے یہاں کے لوگ دکھ کی پکار نہیں جانتے اور اس دردناک کہانی کو مزاحیہ بنا دیتے ہیں۔

وہ عوامی ناٹک جو "مونئی جاترا"۔ "بولئی گان"۔ "بوستام باٹیا"۔ "ہمرا باڑیا"۔ "موہن ماترا گان" وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں، رنگپور میں رائج ہیں۔ میرا اپنا ڈرامہ "پدما پار" "مونئی جاترا" کے انداز میں ہے اور میرے ڈرامہ "بید رمٹی" کا چوہدری "ہمرا باڑیا" کے چوہدری سے ملتا جلتا ہے۔ میں نے "پالاش باڑی" میں خود "ہمرا باڑیا" کو اسٹیج پر پیش ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی کہانی یہ ہے:۔

بیڈیوں (بنجاروں) کی ایک ٹولی نے کسی گاؤں میں پڑاؤ ڈالا۔ گاؤں کا چوہدری ایک بنجارن پر فریفتہ ہو گیا۔ اس قدر کہ وہ اس کے ناچ کے بھاؤ بتانے لگا۔ جنہیں دیکھ دیکھ کر لوگ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اتفاق سے گاؤں میں ایک نوجوان آنکلتا ہے جس کا نام نادر چند ہے۔ وہ بنجارن سے عشق کا اظہار کرتا ہے۔ جو یہ جواب دیتی ہے: "صاحب! مجھے تمہاری باتوں سے لاج آتی ہے"۔ اب وہ جوان جو بیڈنی کا پارٹ ادا کرتا ہے، چند منٹ اس لجانے کے بھاؤ بتاتا ہے اور اس میں ایسا کمال دکھاتا ہے کہ انسان اس کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فرید پور، برسیال اور کشتیا کے ضلعوں میں اس قسم کے ناٹک پائے جاتے ہیں:۔ بھاشن جاترا۔ اشمان سینا۔ کشٹھا اور جال جاترا۔ ان سب عوامی ناٹکوں کی اپنی اپنی دُھن ہوتی ہے جو سارے کھیل کے دوران طبیعت پر جادو بن کر چھائی رہتی ہے۔

لک شروع تو ہنسی کھیل کی فضا میں ہوتے ہیں اور تماشائی خوب
کھول کر تالیاں بجاتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب کہانی ایک دکھ بھری
انی بن کر افسوسناک طور پر ختم ہوتی ہے تو سارے مجمع پر گہرا سکوت
ری ہو جاتا ہے۔

یں نے ناٹک "اشمان سینا" کی کہانی کوئی ۳۵ برس ہوئے
مل کی تھی، لیکن کہیں اب جا کر اس کو مختصر شکل میں شائع کر سکا ہوں۔
نی یہ ہے کہ ایک نوجوان لڑکی، درگا اور ایک نوجوان، اشمان سودو نو
رو، ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو کر شادی کر لیتے ہیں۔ شادی
جلد ہی بعد اشمان سنگھ ملازمت کے سلسلہ میں پردیس جاتا ہے۔
پیچھے اکیلی رہ جاتی ہے، اور ایک نوجوان اس کے پاس جاتا ہے۔
عرصہ درگا اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آتی لیکن آخر کار جوان
بہکا ہی لیتا ہے۔ دونوں اسی طرح پاپ کی زندگی بسر کرتے رہتے
۔ یہاں تک کہ درگا کی بیٹی تراموتی اپنے باپ اشمان کو آگاہ کر دیتی
۔۔ اور وہ واپس آ کر اس نوجوان کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔
پر قتل کا مقدمہ چلایا جاتا ہے اور اسے پھانسی کی سزا دی جاتی ہے
دوبارہ مقدمہ چلائے جانے پر وہ رہا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف
بہت بُری بیماری کا شکار ہو جاتی ہے اور لوگ اسے ایک کوڑھ
ری بھکارن بنی گلیوں میں ماری ماری پھرتی دیکھتے ہیں۔ کہانی کا
یہ ہے کہ سب مجرم اور گنہگار اپنے کئے کی سزا بھگت کر رہتے
خواہ ان کا دین مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس ڈرامے کا مصنّف
مسلمان تھا لیکن اسمیں وہ فرقہ وارانہ تعصب نہ تھا جس نے بنکم چندر چٹرجی
ملنے میں اور اس کے بعد سارے بنگلا ادب کا ناس کر دیا تھا۔

"اشمان سینا" صرف اپنے سبق ہی کے لئے قابل توجہ نہیں۔
تم کے شاندار سین، جیسے مثال کے طور پر اوّل اوّل دونوں پریمیوں
اور درگا کا میل ملاپ، دریا کے کنارے ملاقاتیں، درگا کے
کے ساتھ اس شخص کی گفتگو جسے اشمان سنگھ شادی کا پیغام
کے لئے بھیجتا ہے۔ بیاہ کے موقع پر نائی اور برہمن کے لطیفے، درگا
لیوں کا ہنسی مذاق اور چہلیں، دولہا دلہن کی روانگی، اشمان سنگھ
کا الوداع، نوجوان کے درگا کو بہکانے کے لئے ہتھکنڈے۔
سنگھ کے مقدمہ کی کارروائی وغیرہ وغیرہ دیکھنے والوں کو دم بخود
کھتے ہیں۔ اسی لئے یہ کھیل گاؤں میں کئی کئی بار کھیلا جاتا ہے

اور "اشمان سینا" کے گیت جیسے،

" دور دیس نہ جیئیو، بلما ارے "

دیس بھر میں دیہات کے گوشے گوشے میں سُنے جاتے ہیں۔ درگا کا ماتمی
گیت ہر ہر گاؤں کی کٹیا میں جہاں کوئی میّت ہوتی ہے، سوگ کے
طور پر گایا جاتا ہے۔ اس ناٹک میں "بھا شان جاترا" اور "پالا کرتان"
کے بعض حصّے داخل کر دئے گئے ہیں۔ اسی لئے یہ عوام کی روایات
کے عین مطابق ہے اور ان کے احساسات و جذبات سے قوت
حاصل کرتا ہے۔

"اشمان سینا" کے افراد اس قدر حقیقی ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں
یہ انہی کی طرح گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ یہ کھیل اس قدر کامیاب ہے اور اس کو ہر کہیں قبول عام
حاصل ہے۔

اس ناٹک کے افراد آپس میں جو سیدھی سادی گفتگو کرتے
ہیں وہ انہیں اور بھی جیتے جاگتے انسان بنا دیتی ہے اور پھر واقعات
کے تانے بانے اور ان کے تال میل سے دیکھنے والوں پر ایک بے نظیر کیفیت
طاری کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ بات صرف اشمان سینا ہی
پر صادق نہیں آتی بلکہ ان عوامی ناٹکوں پر بھی صادق آتی ہے جنہیں مجھ کو
دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

علاوہ اور وجہوں کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اداکاروں کو اپنے
الفاظ زبانی یاد نہیں رکھنے پڑتے۔ اگر وہ ڈرامے کو ایک دو دفعہ دیکھ
لیں تو وہ خود اس کو ادا کر سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف
نے صرف ناٹک کا محض ڈھانچہ ہی مرتب کیا ہے۔ اور مختلف کردار
اس ڈھانچے میں خود بخود ٹھیک بیٹھ جاتے ہیں اور اداکار فی البدیہہ
اپنے اپنے مکالمے بولتے جاتے ہیں۔ چونکہ اداکاروں کو الفاظ کے سلسلے
میں کافی آزادی ہوتی ہے، اسلئے ہر کوئی اس کھیل کو اور ہی طرح
پیش کرتی ہے۔ بعض اداکار اپنی لیاقت ظاہر کرنے کے لئے پارٹ
میں کافی تبدیلیاں کرتے ہیں۔ کبھی کوئی حصّہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی مختصر
کر دیا جاتا ہے۔ اسلئے کہ کوئی خاص صلاحیت رکھنے والا اداکار دوسری
ٹولی میں دستیاب نہیں ہوتا۔ یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے اس قسم کی
تصانیف کو عوامی ناٹک قرار دینا بالکل بجا ہے۔ یہ ناٹک کوئی خاص
آدمی نہیں لکھتے۔ بلکہ انہیں ملک کے سارے لوگ مل کر ڈگ زدب

(باقی صفحہ

ناول اور ڈرامہ

(جدید حالات کی روشنی میں)

آغا ناصر

ناول اور ڈرامہ دو جدا جدا اصنافِ ادب ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک ادیب جو ناول لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے ڈرامہ بھی لکھ سکے یا ایک ڈرامہ نگار اسی پائے کا ناول بھی تصنیف کرنے میں کامیاب ہو جائے جتنا کہ ڈرامہ لکھنے میں ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح ڈرامہ نگار اور ناولسٹ کے تقابل کی نہ تو ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے اور نہ یہ تقابل زیادہ مناسب ہی ہوگا۔ لیکن جب ڈرامہ اسٹیج سے نکل کر ہوا کی گود میں آیا تو شاید پہلی بار ناول اور ڈرامہ کے ربط کا علم دنیا کو ہوا۔ ریڈیو ڈرامے کی جدید ابھرتی ہوئی تکنیک اور اس میں نئے نئے تجربہ کرنے کے شوق نے ناول کو ڈرامائی صورت اختیار کرانے کی طرف توجہ دلائی اس طرح یہ دو اصنافِ ادب ریڈیائی ڈرامے کے روپ میں ایک دوسرے سے مل گئیں۔

ریڈیائی ڈرامے لکھنے والوں نے اسٹیج کے ڈراموں کی بھی ریڈیائی تشکیل کی اور مشہور اور مقبولِ عام ناولوں کو بھی ریڈیو ڈرامے کے روپ میں پیش کرنے کی کوششیں کیں۔ تب یہ سوال پیدا ہوا کہ ریڈیو ڈرامے کے لئے ناول زیادہ مناسب ہے یا اسٹیج کا ڈرامہ؟ اس سوال کا جواب کیا ہے، اس مضمون کا اس جواب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اس ایک مسئلہ کے ساتھ اور بھی بے شمار الجھاؤ پیدا ہو گئے۔ مثلاً ناول اور ڈرامہ کی مقبولیت کی بحث۔ ناول نگار اور تمثیل نگار کی فنی صلاحیتوں کا موازنہ۔ ناول کے قارئین اور ڈرامہ کے ناظرین کا تقابل وغیرہ وغیرہ۔ اسی سلسلہ میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ آیا ناول لکھنا زیادہ مشکل ہے یا ڈرامہ؟ یہ مضمون اسی غیر اہم لیکن دلچسپ بحث سے متعلق ہے۔ میں نے کوشش یہ کی ہے کہ ناول نگار اور تمثیل نگار اس بحث میں جو جو الزامات ایک دوسرے پر لگاتے ہیں ان کی روشنی میں اس کا حل تلاش کروں۔ اگرچہ ان الزامات کی فہرست بہت طویل ہے لیکن صرف اہم نکتوں کو چن لینے سے بآسانی کام چلایا جا سکتا ہے اس لئے آئیے اور دیکھئے۔

کہا جاتا ہے کہ ناول نگار کا کام تمثیل نگار کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔ اگر پوچھا جائے کیوں، تو جواب یہ ہے کہ ڈراموں میں اتنا کام اور اس قدر محنت درکار نہیں ہوتی جس قدر ناول میں۔ مثال کے طور پر ایک ناول تقریباً سات آٹھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے، اور ڈرامہ؟۔

ڈرامہ نگار اپنی تحریر کو الفاظ کے پیمانے سے نہیں ناپتا۔ بلکہ وہ پیمائش کے لئے وقت کا پیمانہ استعمال کرتا ہے۔ یوں بھی اگر صرف طوالت کے ہی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ڈراموں کی طوالت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ انیسویں صدی کی پانچ ایکٹ کی المیہ تمثیل کی جگہ اب ایک ایکٹ کے ہلکے پھلکے ڈراموں نے لے لی ہے۔ یہ دوران کتنے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے؟ صحیح اعداد و شمار تو مشکل ہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ ساٹھ ستر ہزار الفاظ سے کہیں کم ہوتا ہے۔

لیکن کیا الفاظ کے کم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ڈرامہ میں ناول کی نسبت کم محنت درکار ہوتی ہے؟ میرے خیال میں نہیں۔ جہاں تک کام کے کم ہونے کا سوال ہے وہ صرف جسمانی محنت کا کام ہے۔ یعنی یہ کہ ڈرامہ نگار کو ناول نگار کی بہ نسبت کم الفاظ لکھنے ہوتے ہیں، کاغذ کم صرف ہوتا ہے اور کم روشنائی درکار ہوتی ہے، لیکن اس سے کام کے "مشکل" اور "آسان" ہونے کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یہ تو مقدار اور کمیت کا مسئلہ ہے۔

اسی بات کو جو اوپر بیان کی گئی دوسرے نقطہ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ذرا زاویہ بدلئے اور پھر دیکھئے کہ اسی تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے، اسی قدر اہم، اسی قدر واضح اور اسی قدر بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ جاذبِ توجہ۔ اگر صرف الفاظ ہی کی کمی بیشی پر نظر رکھی جائے تو پھر یوں کہا جا سکتا ہے کہ تمثیل نگار اس بات کے سبب [illegible]

تین لفظوں میں کہتا ہے فقط ایک ہی لفظ میں ظاہر کر دیتا ہے۔ اور تین کی جگہ ایک لفظ کا انتخاب یقیناً زیادہ دقت طلب ہے۔

ہاں ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ڈرامہ نگار اس ذمہ داری سے آزاد ہے جو ایک ناول نگار پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری وہ تاثر ہے جو ناول نگار کو الفاظ اور زبان کے زور سے پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسے متبادل اور مترادف الفاظ تلاش کرنے ہوتے ہیں اور اپنے طرزِ تحریر سے قارئین کو متاثر کرنے کا دشوار گزار کام کرنا ہوتا ہے۔ ایک تمثیل نگار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ حسن بیان کے فن سے آشنا ہو۔ اسے کبھی ایسے مقامات کی منظر کشی نہیں کرنا ہوتی جہاں وہ کبھی نہ گیا ہو۔ نہ اسے حالات، اوقات اور کرداروں کے متعلق مکمل اور مفصل اطلاعات دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن لفظی تصاویر کھینچنا اور جامع پس منظر پیش کرنا ناولسٹ کے لئے ناگزیر ہے۔ اُسے ہر بات کی تفصیل بتانا ہوتی ہے۔ ناول نگار کو صرف یہی اطلاع اپنے قاری کو نہیں دینی ہوتی کہ یہ "ناظم صاحب" ہیں۔ جو ابھی ابھی اس شہر میں آئے ہیں۔ اسے تفصیل کے ساتھ یہ سب بھی بتانا ہوگا کہ ناظم صاحب ہیں کون، کہاں سے آئے ہیں، کس طرح آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ ناظم صاحب کی عمر کیا ہے؟ ان کے والد اُون کا کاروبار کرتے ہیں یا پنشن یافتہ تحصیلدار ہیں۔ وہ کس وضع قطع کے ہیں؟ عادات و خصائل کیا ہیں، تعلیم کہاں تک پائی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہی اور اس قسم کی بے شمار معلومات ہیں جن کا فراہم کرنا ناول نگار کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ اس پر فنی پابندی ہے۔ اگر کوئی ناولسٹ ان فرائض کو پورا کرنے میں کوتاہی برتتا ہے تو وہ "فنی مجرم" ہے، اسے اپنے قارئین کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کرداروں کو حقیقی بنانا پڑتا ہے اور مقامات، حالات اور کرداروں کو حقیقت سے قریب لانے کے لئے تفصیلی پس منظر پیش کئے بغیر چارہ نہیں۔

اس کے برعکس تمثیل نگار ان تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اسے چند کردار تخلیق کرنے ہوتے ہیں۔ ان کے منہ میں زبان ڈالنی ہوتی ہے تاکہ وہ گفتگو کرتے رہیں۔

سرسری طور پر، بغیر سوچے، بلا سمجھے اگر یہ کہا جائے تو اس دلیل کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یہی وہ منزل ہے جہاں آکر مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ تمثیل نگاری یقیناً ناول نگاری

سے زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ کہہ دینا کہ "ڈرامہ نگار کو صرف کردار تخلیق
ہوتے ہیں تاکہ وہ بولتے رہیں، ہنستے رہیں، روتے رہیں اور بس!"۔
غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ بظاہر بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ڈرامہ نگ
اپنے کرداروں کی زبان سے مکالمے ہی تو ادا کرانے ہوتے ہیں
لیکن یہ سمجھ لینا کہ مکالمے لکھنا آسان کام ہے، سراسر غلط ہے۔
خیال میں تو اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ تمثیل نگاری
فن دوسری اصنافِ ادب سے زیادہ دشوار ہے اور فن کی اس
پر صرف وہی فن کار پہنچ سکتا ہے جو ذہنی طور پر اس کے نشیب و
کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ناتجربہ کار لوگ سمجھتے ہیں کہ ڈرامہ لکھنا بالکل معمولی کام
ایک ایسا کام جسے آدمی فالتو وقت میں بھی کر سکتا ہے۔ یہی سبب
کہ ناتجربہ کار لکھنے والے ڈرامہ ہی سے اپنی تحریروں کا آغاز کرنے
کوشش کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ "محض مکالموں کا کھیل
ہونے کی وجہ سے ڈرامہ لکھنا ناول لکھنے کی بہ نسبت سہل ہوتا ہے" گ
پہلا ہی تجربہ اس خیالی محل کو مسمار کر دیتا ہے۔ جلد ہی انھیں یہ احس
ہو جاتا ہے کہ ناول نگار کے مقابلے میں ڈرامہ نویس پر بے شمار پابند
عائد ہیں۔ وہ سرکس کے اُس لڑکے کی طرح ہے جو تنی ہوئی رسی پر چلتا
یہ صحیح ہے کہ اسے راستہ تلاش کرنے کے لئے جد و جہد نہیں کرنا ہوتی
اس معین راستہ پر چلنا بذاتِ خود اتنا بڑا فن ہے کہ اکثر لوگ درمیان
میں گر پڑتے ہیں۔ سرکس کا پلیئر کا نہ تو راستے میں ٹھہر سکتا ہے اور نہ اپنا ق
اِدھر اُدھر رکھ سکتا ہے۔ اسے ایک معین راستے پر معین رفتار سے
مقررہ اوقات میں اس انداز سے چلنا ہوتا ہے کہ ہر بار کوئی نہ کو
ایسی جدت پیدا ہو جائے جس سے دیکھنے والوں کی دلچسپی قائم رہے
اس کے برخلاف ناول نگار اس سیاح سے مشابہ ہے جو شہر شہر قریہ
قریہ گھومتا ہے۔ کبھی سمندر کے نیلے پانیوں کی ہموار سطح پر کسی دخانی
جہاز میں سوار نظر آتا ہے، کبھی پہاڑ کی سر بفلک چوٹی پر خاموش بیٹھ
فطرت کے حسن کا مشاہدہ کرتا دکھائی دیتا ہے، ہم اسے کبھی کسی بارونق
شہر کے پُرشور ریستوراں میں پہروں باتیں کرتا سنتے ہیں اور کبھی کسی دور
بستی کے باہر سبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے کنارے گنگناتا ہوا پاتے
ہیں۔ اس پر اوقات اور روایات کی کوئی بندش عائد نہیں اسے یہ آزا
حاصل ہے کہ جس کردار، جس منظر، جس موضوع کے متعلق جس قدر چاہے

[illegible]

لئے بھی لکھا جاتا ہے کہ

ان مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ڈرامہ نگار ایک خاص فن کا ماہر ہے۔ اور اس فن کی کسوٹی پر پورا اُترنے کے لئے اسے باقاعدہ مشق کی ضرورت ہے۔ اُسے اپنے فن کے قوانین کا پابند ہونا پڑتا ہے ناظرین کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ ناولسٹ کی طرح نہیں جو دوسروں کی تحریر کا پابند بنتا ہے اور جس وقت جس کردار کو جس مقام پر چاہے لے جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ناول نگار اپنی تحریروں پر چند فرضی پابندیاں عائد کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود یہ آزادی اس کو بہرحال حاصل ہوتی ہے کہ وقت کی تقسیم اپنی مرضی کے مطابق کر سکے۔ ناول نگار مناسب سمجھے تو ہفتوں کو ایک گھنٹہ تک ایک ہی کمرے میں بند رکھے اور اگر اس کا جی چاہے تو ہر تین منٹ بعد انھیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے، ایک مکان سے دوسرے مکان، ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچا دے۔ ڈرامہ نگار کے لئے یہ ممکن نہیں۔ اُسے ایک طے شدہ وقت کے لئے ایک ہی مقام پر ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اسے ان سارے کرداروں کو جن کی موجودگی اس منظر میں ضروری ہو، اسی ایک مقام پر لانا ہوتا ہے۔ ڈرامہ میں منظر کی تبدیلی صرف کاغذ پر چند حروف لکھ دینے کا نام نہیں مصنف کے ذہن میں اسٹیج پر تبدیل ہونے والے "سیٹ" کا پورا خاکہ بھی موجود ہونا ضروری ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ڈرامہ کا مصنف نصف پیشہ ور ہوتا ہے۔ جب تک مصنف کے ذہن میں ہر ایکٹ اور منظر کی مکمل تصویر نہ ہو وہ ڈرامہ نہیں لکھ سکتا۔ ڈرامہ لکھنے کے لئے تخیل اور حقیقت دونوں ہی کا سہارا لینا ہوتا ہے۔ تخیلی کرداروں کو تخلیق کرتے ہوئے لکھنے والے کو اس کا بھی پورا پورا احساس ہونا چاہئے کہ گوشت پوست کے انسان ان کرداروں کے پارٹ ادا بھی کر سکیں گے یا نہیں۔ مقامات، منظر کی تشکیل، ترتیب صرف تخیل تک ہی محدود نہیں رہتی۔ اسٹیج پر مادی طور پر بھی ان کا وجود ہوتا ہے۔ کرداروں کی آمد و رفت، روشنی، رنگ و رنگ۔ اسٹیج پر ان کی حرکات سے ناظرین کو حقیقت کی جھلکیاں دکھانا ہوتی ہیں۔

آخر میں ایک اور غلط فہمی کا ذکر ضروری ہے۔ ڈرامہ نگاری کو ناول نگاری کے مقابلے میں آسان ثابت کرنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ڈرامہ نگار کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو جیتے جاگتے اداکاروں کے سپرد کر دیتا ہے اور اس طرح وہ آپ ہی آپ زندگی اور حقیقت سے قریب ہو جاتے ہیں۔ ناولسٹ کو محض اپنے زورِ بیان سے یہ سب کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

اسی سلسلہ میں تمثیل نگار پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے اور ڈرامہ کو ناول کے مقابلے میں آسان صنفِ ادب قرار دینے کی موافقت میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ ڈرامہ کے کرداروں کو کامیاب بنانے کا نصف کام تو وہ اداکار ہی کر دیتے ہیں جو ان کرداروں کے رول اسٹیج پر ادا کرتے ہیں۔ لیکن عملی کسوٹی پر پرکھئے تو یہ دلیل بالکل بے بنیاد نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اچھے اداکار کسی کردار کو ابھارنے اور کامیاب بنانے میں بڑا اہم حصہ لیتے ہیں مگر غالباً کوئی بھی ڈرامہ نگار ایسا نادان نہ ہوگا جو محض اداکاروں کی صلاحیتوں پر اعتماد کر کے اپنے کرداروں کی تخلیق کرے۔ اس کے برعکس اداکاری اور اداکاروں کا وجود اس کے لئے بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے۔ یہ اس کی ذمہ داریوں کی فہرست میں ایک اور اضافہ ہے۔ اسے کردار نگاری کرتے وقت یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اداکار صحیح طور پر اس کردار کو ادا بھی کر سکیں گے یا نہیں۔ ڈرامہ کے کردار ناولوں کی طرح صرف کاغذ پر لکھے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ انھیں بنفسِ نفیس ناظرین کے سامنے پیش ہونا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اداکاروں کی اداکاری کا سارا دار و مدار مصنف پر ہی ہے۔ کوئی اداکار کسی پھسپھسے کردار کو جاندار نہیں بنا سکتا۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک ناکارہ اداکار کسی ڈرامہ میں کامیاب کردار کا پارٹ ادا کر کے مقبولِ عام بن جائے۔ دراصل اداکاری ادائگی کا فن ہے۔ وہ تو جو کچھ مصنف نے لکھا ہے صرف اسی کا اظہار کرتا ہے۔ اب یہ مصنف پر منحصر ہے کہ وہ اداکاروں کو اپنے فن کے جوہر دکھلانے کے لئے کس قسم کے کردار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ کے مصنف کو کردار تخلیق کرتے ہوئے صرف یہ خیال نہیں رکھنا پڑتا کہ یہ کردار کہانی سے کس حد تک منسلک ہیں بلکہ ساتھ ہی یہ احساس بھی ضروری ہوتا ہے کہ ادائگی کے امکانات ان کرداروں میں کس حد تک ہیں۔

مختصراً یوں سمجھ لینا چاہئے کہ اداکار مصنف کے پابند ہیں مصنف اداکاروں کا پابند نہیں۔ اگر کسی ڈرامہ کا کوئی کردار بہت اچھا ہے تو وہ ہمیشہ اچھا ہی رہے گا۔ وقت گزرتا رہے گا، اداکار مرجائیں گے، نئے اداکار پیدا ہوں گے لیکن اس کردار کی عظمت میں کوئی فرق نہ آ سکے گا چاہے کوئی بھی اداکار اس کردار کا پارٹ ادا کرے۔

ہماری نسلی اور ثقافتی وحدت

(ایک اہم پہلو)

عبدالحلیم اثر افغانی

ایک ہمسایہ اسلامی مملکت کے علی الرغم جو بدقسمتی سے غیر اسلامی تصورات کو فروغ دینے والوں کی جولانگاہ بنی ہوئی ہے اور بڑے شد و مد سے اس خیال کو فروغ دے رہی ہے کہ پٹھان ایرین نسل کے لوگ ہیں، میں ایک نیا نظریہ پیش کر رہا ہوں کہ نسل اور نسب کے اعتبار سے آریا اور ایرین کے نام سے کسی قوم کا وجود نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ بلکہ یہ ایک ثقافتی اور تہذیبی نام ہے۔ لہٰذا افغان۔ پٹھان قوم کا ایرین یا آریہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں پٹھانوں کی نسل اور نسب کے متعلق تحقیق ضروری ہے۔ سردست چند تاریخی، تحقیقی اور لسانیاتی معلومات پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ ہمارے ارباب علم و فضل اور ماہرین تاریخ اس موضوع اور نقطہ نگاہ پر مزید تحقیقی نظر ڈال سکیں۔ اثر

افغان پشتون۔ پٹھان یہ تینوں نام ایک ہی قوم کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو مغربی پاکستان کے شمال مغربی خطہ میں خصوصاً اور دیگر حصوں میں بالعموم پھیلی ہوئی ہے۔ اور ان ناموں کی مناسبت ہی سے ان کی مخصوص علاقائی بولی کو پشتو اور افغانی زبان کہا جاتا ہے جن لوگوں نے افغان، پٹھان اور پشتون ان تینوں مختلف اور مترادف الفاظ سے بحث کی ہے۔ ان کی آراء کا خلاصہ یہ ہے:

افغانوں کو افغان اس لئے کہا جاتا ہے کہ ساؤل جسے قرآن مجید میں طالوت کے نام سے یاد کیا گیا ہے، کے دو لڑکے تھے: (۱) برخیا جن کا لڑکا آصف بعد میں حضرت سلیمانؑ کا وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اور یہی وہ شخص تھا جس کے متعلق قرآن مجید میں ذکر ہے۔ وَقَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ۔ (۲) ارمیا جس کا لڑکا افغنہ بعد میں حضرت سلیمانؑ کا فوجی سپہ سالار بلکہ وزیر جنگ مقرر ہوا۔ اور یہی افغانوں کا مورث اعلیٰ ہے۔ چونکہ ساؤل (ملک طالوت) بن یامین بن یعقوبؑ کی نسل میں سے تھا، اس اعتبار سے افغان قوم کے لوگ نسلاً بنی اسرائیل ہیں۔

افغانوں کو بنی اسرائیل تسلیم کرنے کی یہ روایت افغان قوم کے اپنے مؤرخین مثلاً اخون درویزہؒ (وفات ۱۰۴۸ھ) خوشحال خان خٹک (وفات ۱۱۰۰ھ) افضل خان وغیرہ گزشتہ تین سو سال سے مسلسل بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اس کی وضاحت میں انہوں نے پوری شرح و بسط کے ساتھ تفصیلی دلائل دیئے ہیں۔

افغانوں کو پشتون اس لئے کہا جاتا ہے کہ یونانی جغرافیہ نویسوں مثلاً ہیرو ڈوٹس (۴۸۴ ق م) اور بطلیموس (۱۵۰ ق م) کے سیاحت ناموں میں اس علاقہ کا نام پکت اور رگ وید کے جغرافیہ میں[1] پکھت ضبط کیا گیا ہے۔ حرف ک اور خ ایک دوسرے کی جگہ بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح عربی حرف خ اور پشتو حرف ښ کی ایک آواز ہے جس کا تلفظ پشتو کے قاعدہ کے مطابق حرف ش بھی کیا جاتا ہے۔ اس لئے لفظ پکت رکت، پشت اختلاف لہجہ کے اعتبار سے ایک ہی لفظ کی مختلف صورتیں ہیں۔ پھر اس لفظ پشت کے ساتھ ون حرف نسبت لگایا گیا۔ تو پشتون کہلایا یعنی وہ لوگ جو پشت کے نام سے مخصوص جغرافیائی خطہ میں سکونت رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک جغرافیائی اور محلی نام بن جاتا ہے۔ اور افغان اور پشتون دونوں ناموں میں تطبیق اس طرح کی جاتی ہے کہ افغنہ کی نسل سے ہونے کے اعتبار سے افغان اور بنی اسرائیل ہیں تو مخصوص جغرافیائی خطہ

---

[1] پکھت کا ذکر اسلام سے متقدم قبل سنسکرت لٹریچر میں بھی ملتا ہے۔ لہٰذا سنسکرت کتابوں میں بھی مذکورہ اقوام کو دیکھنا چاہیئے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے مدتوں پہلے بنو اسرائیل اس علاقے میں آباد ہو چکے تھے۔ سفر آخرت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلامی عہد میں عدنانی اور قحطانی عرب بھی آباد ہوئے۔ اور قوم میں مخلوط ہو گئے۔ (ابوالجلال ندوی)

پشت میں سکونت کی وجہ سے پشتون ہیں۔

افغانوں کو پٹھان کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کی دو توجیہیں کی گئی ہیں:

(ا) ایک وجہ تو مختلف ہندو مؤرخین نے بیان کی ہے۔ جس کا ایک حصہ اگرچہ دلچسپ ہے لیکن مجھے اس کا بیان کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ ان کے بیان کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ جب افغان لوگوں نے ہندوستان کے پٹنہ شہر پر بڑی شدت سے حملہ کیا۔ تو آس پاس کے لوگوں نے ان کو پٹنان کہا۔ اور بعد میں یہ لفظ مخفف ہو کر پٹھان بن گیا!

(ب) خود افغان مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ جب موجودہ کوہ سلیمان اور پاکستان کے قبائلی علاقہ کے سلسلۂ کوہ قیسی سے بہتر قبائلی سرداروں کا ایک وفد مدینہ منورہ جا کر حضرت رسول پاک پر ایمان لا کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ تو انھوں نے وہیں قیام کر کے حضرت خالد ابن ولیدؓ کے لشکر زحف میں شامل ہوئے اور بعد میں مختلف غزوات میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور وہ داد شجاعت دی کہ بطان دین کا اعزازی لقب دیا گیا۔ بطان، چپو کو کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی شجاعت و بسالت سے کھیون ہار بن کر دینِ اسلام کی کشتی کو ساحلِ فتحیابی سے جا لگایا تھا، اس لئے دین کی کشتی کے لئے چپو کی مثال ٹھہرائے گئے۔ اور بطان کہلائے۔ حرف ط۔ ت۔ ٹ ایک ہی لفظ کی علاقائی لہجہ کے اختلاف سے مختلف صورتیں ہیں۔

اس لئے بطان - بتان - پٹھان اس قوم کا وہی اعزازی لقب ہے جسے اردو لہجہ کے مخصوص تلفظ کے مطابق پٹھان لکھا جاتا ہے۔

افغان مؤرخین کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان بہتر قبائلی سرداروں کے سرگروہ اور سب سے بڑے سردار کا نام ملک قیس تھا۔ جس کا اسلامی نام عبدالرشید رکھا گیا۔ بعد میں حضرت خالد ابن ولیدؓ کی دامادی کا شرف ان کو حاصل ہوا۔ جس کی بنا پر موجودہ پشتون نسل کے لوگ اپنے آپ کو خالد ابن ولید کی نسل سمجھتے ہیں۔ اور اپنی مجاہدانہ روح کو اپنے نانا حضرت خالد سیف اللہ کی نسبت سے اپنی موروثی ایمانی شجاعت کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی یہ بھی روایت ہے کہ پاکستان کے موجودہ قبائلی علاقہ کے سلسلہ کوہ کسئی کو اُن کے جد امجد قیس کی مناسبت سے کوہستان کسئی کہا جاتا ہے۔

لفظ افغان۔ پشتون۔ پٹھان کی مندرجہ بالا تعریفات سے ظاہر ہے کہ:

(الف) افغان اِن لوگوں کا ایک ایسا نام ہے جو نسل اور نسب کے اعتبار سے ان کو دیا گیا ہے۔

(ب) پشتون ان کا ایک جغرافیائی اور محلی نام ہے۔

(ج) اور پٹھان ایک ایسا لقب ہے۔ جو اُن کی موروثی شجاعت، جوانمردی اور مجاہدانہ کارناموں کے پیش نظر اِن کو دیا گیا ہے۔

اب میرے نظریئے کی طرف آیئے۔ میری رائے میں افغان، پشتون اور پٹھان چاہے کوئی بھی ہوں، آج وہ پاکستانی ملت کی حیثیت سے دنیائے اسلام کی ایک ممتاز اور درخشاں مستقبل کی مالک مسلمان قوم ہے۔ ہمارے لئے بحیثیت ایک آزاد پاکستانی قوم کے تاریخ کے جدید مطالعہ کی ضرورت ہے خود ہمارے اپنے اسلاف اور دوسروں نے ہمارے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیئے۔ اس لئے کہ جو تاریخی روایات اس وقت تک ہمارے سامنے ہیں وہ اگر ہمارے اپنے اسلاف کی ہیں تو ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو محدود مطالعہ کے تحت لکھی گئی ہیں۔ اور جو دوسروں نے لکھی ہیں ان میں تاریخی تحقیق سے زیادہ ان کے سیاسی اغراض کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ہمیں جہاں تاریخی تحقیق کے سلسلہ میں تعصب اور تنگ نظری کو ترک کرنا ہوگا۔ وہاں موجودہ علمی طرز تحقیق اور استدلال کے تحت اس قسم کی تمام تاریخی روایات کے پیش و پس پر نگاہ ڈالنے کی فرصت بھی ہوگی۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، جملہ افغان مؤرخین پٹھان قوم کو بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے قبیلہ بن یامین کی نسل سے جانتے ہیں۔ اس طرح وہ پٹھانوں کی پوری آبادی کو آج سے تیرہ سو سال پہلے روایتی قیس عبدالرشید کی نسل سے ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں نے قیس سے لے کر حضرت آدمؑ تک اور قیس کی نسل میں سے موجودہ جملہ افغان قبائل کے انساب کے شجرے ترتیب دئے ہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرۃ الابرار والاسرار از اخوند درویزہ - ترجمۃ المعانی از حضرت میاں محمد عمر چمکنی، تاریخ مرصع از محمد افضل خان خٹک، تاریخ خورشید جہاں از شیر محمد خان گنڈاپور)۔

حیات افغان از حیات محمد خان ترانہ وغیرہ) یہ مؤرخین جس انداز سے پوری افغان قوم کا بنی اسرائیل نسل میں سے ہونا ظاہر کرتے ہیں، وہ تاریخ کے موجودہ طرز استدلال اور تحقیق و تدقیق کے بموجب محل نظر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انساب کے شجرے تمام کے تمام غلط نہیں ہیں، لیکن کم از کم افغان قوم کے شجرہ نسب میں دو نام ایسے ہیں، جن سے جو مفہوم مراد لیا گیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ نام ہیں قیس اور بتان بن قیس۔

سید سلیمان ندوی مرحوم کے قول کے مطابق عاد۔ ثمود۔ سبا۔ جرہم وغیرہ اکثر شخصی نام سمجھے گئے ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ وہ اصل میں قوموں اور قبیلوں کے نام ہیں (ارض القرآن جلد ۱ ص ۵) ان الفاظ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالکل اسی طرح افغان اور دوسرے غیر ملکی مؤرخین نے قیس اور بتان دونوں کو شخصی نام سمجھا ہے، حالانکہ یہ دونوں قبیلوں اور قوموں کے نام ہیں۔

ان دونوں قوموں، قیسی اور یمنی، کے ذکر سے جزیرہ نمائے عرب، اندلس، عراق اور سندھ کی تاریخی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ شمالی عرب کے کئی قبیلے آغاز اسلام سے پیشتر ملک عراق میں اٹھ آئے تھے اور دجلہ کے کنارے انہوں نے دیار ربیعہ یعنی قبیلۂ ربیعہ کی بستی اور فرات کے کنارے دیار مضر آباد کئے تھے۔ بنی مضر میں سب سے ممتاز شاخ قیسیوں کی مانی جاتی تھی۔ دوسری طرف شام کے علاقے میں جو عربی قبائل آکر بسے وہ اصلاً جنوبی عرب سے آئے، اس لئے وہ یمنی کہلاتے تھے۔ شام کے اس یمنی گروہ کا ایک سر برآوردہ قبیلہ بنی کلب تھا۔ ایران کے شمال مشرق (قدیم خراسان اور موجودہ شمالی اور مغربی افغانستان) میں عرب آباد کار بیشتر بصرے سے آئے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شمالی عرب کے لوگ تھے۔ فرات کے قیسیوں کی طرح ان آباد کاروں میں قبیلہ تمیم سرگروہ تھا۔ خراسان کا یمنی گروہ اپنے نامی قبیلہ کے نام سے ازدی کہلانے لگا تھا۔ دوسرے ممالک میں قیسیوں کو نزاری اور معدی بھی موسوم کرتے تھے۔ (اسی نزاری قبیلہ کی نسبت سے پاکستان و افغانستان کی حد فاصل پر سلسلہ کوہ سفید کے ایک وسیع خطہ کا نام نگرار موسوم[1] ہے) مگران کے نام جو کچھ بھی ہوں ان میں اصلی خط فاصل شمالی اور جنوبی عرب ہی کی بنا پر کھینچا جاتا ہے۔ شمالی عرب والے اپنا نسب حضرت اسماعیل[2] تک لے جاتے اور مجموعی طور پر اپنے آپ کو عدنانی (اتمانی، اتمانزائی، اتمان خیل موجودہ پشتو تلفظ کے مطابق) کہتے تھے۔ جہاں جنوبی عرب والوں کو قحطانی (موجودہ پشتو تلفظ کے مطابق کٹھانی اور کٹھان خیل) جو پاکستان کے قبائلی علاقہ سرحدی ریاستوں اور پشاور کے علاقے میں کوہانی وغیرہ ناموں سے بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں کہا جاتا ہے۔ وہاں یہ قحطانی (اہل جنوب عرب) جس قحطان (کٹھان[3]) تک اپنا سلسلہ نسب پہنچاتے ہیں۔ تورات کی کتاب آفرینش میں وہ "جوکتن" مذکور ہے (باب ۱۰ آیت ۲۵ و مابعد)۔ قحطان پر زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ارض القرآن" جلد ۲ بحث قحطان)۔

غرض شمالی عرب کے قیسی اور جنوب کے یمنی رفتہ رفتہ دو سیاسی گروہوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ اموی خاندان کے بانی امیر معاویہ نے اپنا شاہی تخت یمنی قبائل کے کندھوں پر اٹھوایا تھا۔ ان کے بیٹے اور جانشین یزید کی ماں میسون بنی کلب قبیلہ کی تھی۔ اور یزید نے بھی اپنی شادی اسی قبیلہ میں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قیسیوں نے یزید کے بیٹے معاویہ ثانی کی اطاعت قبول نہ کی۔ بلکہ بنی امیہ کے حجازی حریف ابن زبیر کے ساتھ ہو گئے تھے۔ جب کلبیوں نے ۶۸۴ء میں مرج راہط کے میدان میں قیسیوں کو شکست دی۔ تو حکومت مروان کے حق میں مسلّم ہو گئی جو بنی امیہ کی مروانی شاخ کا مورث ہوا۔ مگر اس کے پوتے ولید اول کے عہد (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) میں قیسیوں کی قوت حجاج کی بدولت نہایت عروج پر پہنچی۔ اور یہی وہ قیسی تھے۔ جو اس سے قبل ۶۹۹ء میں عبدالرحمٰن ابن محمد ابن الاشعث کندی کی قیادت میں سیستان اور کابل کے ترک نژاد بادشاہ زنبیل سے جہاد

---

[1] لفظ نزار ایک بابلی کتبہ (۲۲۳ ق م) میں "نزر" دملو کہم" ضبط کیا گیا ہے۔ آل پشتو قاعدہ کے مطابق حرف نسبت ہے حرف (ر) حرف (ل) سے بدل جاتا ہے۔ لفظ نگار مساوی ہے نگرال مساوی نزرال کے جو نزاری کے ہم معنی ہے

[2] یہ لفظ مسٹر ریونڈ فارشر نے اپنی کتاب تاریخی جغرافیہ عرب میں (کیانی ثانی) (KOFe ni Fai) ضبط کیا ہے۔ اکثر یہ تطبیق۔ ممکن مگر مشکوک ہے۔ قطن ایک نسلی مورث اور علاقہ کا نام ہے۔ اس کو قطین سے معنوی تعلق ہے نسلی نسب ناموں میں قطن بہت ابعد کا نام ہے۔

[3] صحیح عبرانی تلفظ ی ق ط ن ہے۔ بائبلی ترجمہ نام کا (جوکتان)۔ قطین بن عابر (مقیم یا مسافر) ا۔ ح۔ ن

کرنے کے لئے افغانستان اور سیستان آئے ہوئے تھے۔ اور ۸۶ھ میں قتیبہ ابن مسلم کے ساتھ خراسان پہنچے۔ اور اپنے تاجک مجاہدانہ کارناموں سے ۹۰ھ میں انہوں نے طخارستان اور اس کا صدر مقام بلخ (باختر) فتح کیا۔ اور محمد بن قاسم (۹۳ھ تا ۹۶ھ) کے ساتھ سرزمین سندھ میں علم اسلام بلند کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حجاج کے معین و معاون قتیبہ ابن مسلم اور اس کا اپنا چچا زاد بھائی محمد ابن قاسم تھے۔ اور اس کی قوت بازو قیسی قبیلہ کے نامور مجاہد تھے۔ ان دونوں نامور سالاروں کی فوج میں جنہوں نے وسط ایشیا اور ہندوستان فتح کیا، زیادہ تعداد قیسی قبائل کی تھی۔ جو نسلاً بنی اسمٰعیل قبیلہ کے لوگ ہیں۔

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حجۃ الوداع کے موقع پر مُضری (قیسی) اور قحطانی قبائل کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار تھی۔ بعد میں بنی امیہ حکومت کے ابتدائی دنوں تک مختلف چھاؤنیوں میں ان دونوں قبائل کی تعداد دس لاکھ کے قریب تھی۔ "تاریخ تمدن عرب" (ص۱۴۳) کے مطابق اسلام کے ابتدائی پچاس برسوں میں جو عرب قبائل مفتوح ملکوں میں آباد ہوئے ان کی تعداد پچاس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ کم و بیش اتنی ہی تعداد میں دونوں قبائل کے لوگ مفتوح ممالک میں پھیل گئے تھے۔

جہاں تک مغربی پاکستان میں قیسی اور یمنی قبائل کے آکر آباد ہونے کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو پہلی صدی ہجری اور دوسری صدی کے نصف اول میں شمال مشرقی ایران (خراسان اور طخارستان) موجودہ افغانستان اور مغربی پاکستان میں بعد کے مختلف قبائلی ناموں سے پھیل گئے ہیں۔ اور آئے دن کے سیاسی واقعات کے پیش نظر کبھی یمنی اور کبھی قیسی مجاہدین کے گروہ کے گروہ اس سرزمین میں آ آ کر آباد ہوتے چلے گئے ہیں بمثال کے طور پر ولید اول (۸۶ھ تا ۹۶ھ) قیسیوں کا حامی تھا۔ تو اس کے بعد جب سلیمان ابن عبدالملک (۹۶ھ) برسرِ اقتدار آجاتا ہے۔ تو وہ یمنیوں کا حامی بن جاتا ہے۔ اور اسی یمنی اثر کے تحت محمد ابن قاسم اور حجاج ابن یوسف ثقفی پر افتاد آپڑتی ہے تو علاقہ سندھ میں محمد ابن قاسم کے ساتھ آئے ہوئے قیسیوں کی جگہ یمنی قبائل کی نئی فوج بھیجی جاتی ہے۔ اس کے بعد یزید ثانی (۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ) اور ہشام ابن عبدالملک (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) کے عہد حکومت میں پھر قیسیوں کو ابھرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور پھر یزید ثالث (۱۲۶ھ تا ۱۲۶ھ) یمنیوں کا سرپرست بن جاتا ہے۔ اس طرح بنی امیہ حکومت کے مرکز میں قیسی اور یمنی کے آئے دن کے انقلابات کا اثر مغربی پاکستان۔ خراسان۔ افغانستان کے قیسی اور یمنی قبائل پر بھی پڑتا رہا۔ سرزمین سندھ کے مشہور تاریخی شہر الور (اروڑ)۔ موجودہ روہڑی سکھر میں یمنی اور قیسی قبائل کے درمیان تاریخی لڑائی ان دونوں قبائل کے عروج و زوال کے اثرات کا نتیجہ تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ سندھ بحث یمنی و قیسی قبائل کی آویزش) جہاں تاریخ ابوالفداء جلد ۲ ص۱۴۲ کے مطابق ان دونوں قبائل کے درمیان دمشق میں دو سال تک جنگ کا بازار گرم رہا۔ اور ابن عذاری کی تاریخ البیان جلد ۲ ص۴۲ کی تفصیل کے مطابق اندلس کے ضلع مُرسیہ (مرسیا) میں کئی برس خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ اور جیسے کہ پہلے ذکر کیا گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں کبھی یمنی اور کبھی قیسی غالب اور مغلوب ہو کر مغربی پاکستان کے مختلف دور دراز خطوں میں پھیلتے چلے گئے۔

گویا مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں لاتعداد مختلف قبائلی ناموں سے یہی شمالی عرب کے قیسی قبائل کے لوگ آباد ہیں۔ اور آج اسی قیسی قبیلہ کے وہ لوگ جو شمال مغربی پاکستان میں پشتون قوم کے نام سے مشہور ہیں۔ تاریخ کے محدود مطالعہ کے پیش نظر قیس کو ایک قوم اور قبیلہ کی بجائے ایک شخصی نام قرار دے کر اُسے اپنا مورث اعلیٰ قرار دے رہے ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوموں کا یہ بھی مذاق رہا ہے کہ ایک جغرافیائی خطہ سے کسی دوسرے جغرافیائی خطہ میں جا کر بسنے کے بعد اپنے سابقہ ملک اور علاقہ کے دیہات اور قصبات اور شہروں کے نام جوں کے توں اس دوسرے نئے ملک میں بھی برقرار رکھتے ہیں۔ جس کی مثالیں آج بھی ہم یورپ کے ان نوآبادکاروں کے ہاں دیکھتے ہیں۔ جو جرمنی۔ پرتگال۔ سپین اور جزائر برطانیہ سے جا کر امریکہ اور افریقہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے سابقہ ملکوں کے نام اپنی اپنی نوآبادیات میں اپنے نئے آباد کردہ شہروں پر رکھے ہیں۔ ہم ساتھ ہی اُن قیسی قبائل پر نظر ڈالتے ہیں جو تاریخ تمدن عرب (ص۲۶۴) کے مطابق عرب کے بہت سے قبائل اندلس جا کر آباد ہو گئے ان کی ترتیب یہ تھی (بلخ) دمشق کی چھاؤنی کے مُضری جن میں زیادہ تر تعداد قبیلہ قیس کی تھی، البیرہ میں آباد ہوئے۔ سندھ کی طرح قیسی قبائل جو محمد ابن قاسم اور قتیبہ ابن مسلم کے ساتھ وسط ایشیا، سندھ۔ افغانستان اور سیستان میں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہم یہی

دیکھتے ہیں کہ اندلس اور مغربی پاکستان میں ان کے آباد کردہ دیہات اور قصبات کے نام ایک جیسے ہیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ تاریخ کی پوری روشنی میں بنی اسماعیل کے قیسی قبیلہ کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں پورے مغربی پاکستان کے سندھ۔ پنجاب اور شمالی مغربی پاکستان کے علاقوں میں آباد ہیں۔ اور علاقہ پشاور کا قبیلہ جدون اور اندلس کا ال جدون مغربی پاکستان کے قبائلی علاقہ کا ارگون اور اندلس کا ارجون، اندلس کا باجہ علاقہ پشاور کا باجہ، اندلس کا بابرہ اور علاقہ پشاور کا بابڑہ کم ازکم ایسے نام ہیں جن میں الفاظ کی ہیئت ترکیبی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور یہ ہمیں مجبور کرتی ہے۔ کہ ہم تاریخی مطالعہ کے سلسلہ میں اسے نظرانداز نہ کریں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم افغان مورخین کے اس متفقہ قول کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتے کہ افغان قوم کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ مگر اس کے لئے ایک تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔ اور پیش نظر مقالہ کے دامن میں اس کے لئے گنجائش مشکل ہے۔ تاہم مختصراً اتنا کہہ سکتے ہیں کہ افغان مورخین جس قیس عبدالرشید کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اس کی طرف نسبت کے اعتبار سے اپنے آپ کو قیسی کہتے ہیں، یہی ایک ایسی بات ہے جو محل نظر ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک ذیلی شاخ قبیلہ قیس کے نام سے موجود ہے لیکن یہ قیس وہ نہیں ہے۔ جسے قیس عبدالرشید قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی مختصراً وضاحت یہ ہے کہ افغان مورخین جس قیس عبدالرشید کا ذکر کرتے ہیں۔ اُس کے دو لڑکوں کے نام سڑبن اور بتان بتلاتے ہیں۔ (اور علاقہ پشاور اس سے ملحقہ قبائلی علاقوں اور سرحدی ریاستوں کے افغانوں کے بارہ بارہ بڑے بڑے قبائل اپنا اپنا سلسلہ نسب اسی سڑبن سے ملاتے اور اپنے آپ کو سڑبنی کہتے ہیں) اس سڑبن کا شجرہ نسب اس طرح ہے:

سڑبن[1] ولد قیس[2] ولد عبدالرشید[3] ولد قیس[4]" اور پھر اسی سڑبن سے چالیسویں پشت پر آگے (چار پشت کے لئے اصول تاریخ کے مطابق ایک صد سال کے حساب سے ایک ہزار سال پہلے) افغنہ[41] ولد ارمیا[42] ولد ساؤل[43] ولد ملک طالوت[44] ولد قیس[45] ولد عتبہ[46] ولد عیش[47] ولد روئیل[48] ولد یہودا[49] ولد یعقوب[50] کا نام آتا ہے۔ (شجرہ نسب کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو توضیح المعانی "تالیف میاں محمد عمر چمکنی تالیف ۱۲۲۳ھ مطبع ۱۳۳۲ء صفحہ ۹۶)

اس طرح خود افغنہ اور ملک طالوت قیسی قبیلہ کے لوگ شمار میں آتے ہیں۔ جن کا ذکر تورات کی کتاب قاضیون (باب ۱۹ اور صحیفہ گنتی باب ۲۶ آیت ۴۰) میں بنی یہودا کے نام سے کیا گیا ہے۔ اسی کتاب قاضیون اور صحیفہ گنتی کی تفصیل کے مطابق بنی یہودا یا قیسی قبیلہ کے لوگ ملک طالوت اور عمالقہ کے درمیان لڑائی (۱۰۰۰ ق.م) (جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے) سے بھی پہلے ایران کے شمال مشرق (خراسان ۔ موجودہ مغربی اور شمالی افغانستان) میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ (مقالہ کے دامن کو دیکھتے ہوئے اس بحث کی تفصیل کسی دوسرے صحبت پر چھوڑی جاتی ہے)[1]۔

اسی طرح یہ افغان قبائل اپنے مورث اعلیٰ روئیل[2] ابن یہودا ابن یعقوب کے نام کی طرف نسبت کے اعتبار سے اپنے آپ کو روئیلہ روئیلی، روہیلہ، روہیلی کہتے چلے آئے ہیں۔ اور مغربی پاکستان کے شمال مغربی علاقہ خصوصاً علاقہ پشاور کو روہیلہ اور اس کا مخفف لفظ رُوہ کہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے قول کے مطابق (ارض القرآن جلد ۱ صفحہ ۵۲) سامی قوموں کا یہ خاص مذاق ہے کہ وہ مقامات سکونت کے نام بعینہٖ باشندوں کے نام رکھدیتے ہیں۔" اس علاقہ کا نام رُوہ اور روہیلہ رکھنے کی وجہ تسمیہ سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اس بحث کی روشنی میں ہمیں افغان مورخین کی تاریخی روایات میں درج ذیل ترمیم و اضافہ کرنا ہوگا۔

الف: یہ روایت کہ سلسلہ کوہ سلیمان سے ۷۰ قبائلی سرداروں کا ایک گروہ مدینہ منورہ جاکر مشرف بہ اسلام ہوا، ان میں سے ایک سرگروہ قبائلی سردار کا نام قیس تو صحیح ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ قیس اور اس کے ساتھی دوسرے ۱۷ قبائلی سردار بھی سب کے سب بنی اسرائیل کے قیسی قبیلہ کے لوگ تھے۔ اور اس طرح مختلف افغان سب کے سب اسی ایک قیس عبدالرشید کی نسل سے نہیں بلکہ ان

---

[1]: (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ ایران قدیم" از مشیر الدولہ حسن پیرنیا (مختصراً) جس میں لکھتے ہیں کہ تورات کے نزول سے پہلے ایران میں کیسان (کاسیان ۔ قیسیان) کے نام سے ایک قوم آباد تھی۔ لیکن وہ انہیں پہچان نہ سکا کہ یہ کون تھے۔ نیز ملاحظہ ہو "ترک یا مع" بحث وجہ تسمیہ کشمیر۔ [2]: (روائیل ۔ (رؤبن)۔

دوسرے (۱۷) قبائلی سرداروں اور اُن کے مختلف قبیلوں کے لوگوں کی نسل سے ہیں جو بعد میں وقتاً فوقتاً مسلمان ہوتے چلے گئے جیسے تاریخ منہاج السراج کی تصریح کے مطابق غوری اور سوری خاندان کا مورث اعلیٰ شنسب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آپ کے مبارک ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا اور آج اس کی نسل کے لوگ بہت بڑی تعداد میں مغربی پاکستان کے مختلف اضلاع میں نیازی وغیرہ ناموں سے آباد ہیں۔

(ب) یہ کہ بنی اسرائیل کے اس قیسی قبیلہ کے لوگ بن یامین ابن یعقوبؑ کے نہیں بلکہ یہودا ابن یعقوبؑ کی نسل سے ہیں۔

(ج) یہ کہ بنی یہودا میں سے روئیل ابن یہودا کی نسل کے لوگ نہ تو بنی اسرائیل کے گم گشتہ قبائل میں سے ہیں اور نہ ان بنی اسرائیل قبائل کے لوگ ہیں جو بابل میں بخت نصر کی قید میں رہنے کے بعد ان علاقوں میں منتشر ہوئے تھے بلکہ تورات کی کتاب قاضیوں اور صحیفہ گنتی کی تفصیل کے مطابق بخت نصر سے بھی پہلے تقریباً ۱۲۰۰ ق م میں ایران کے شمال مشرق میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

اس لحاظ سے موجودہ افغانوں میں بنی اسماعیل کے قبیلہ قیسی اور بنی اسرائیل کے قبیلہ قیسی دونوں نسلوں کے لوگ موجود ہیں اور افغانوں کے موجودہ انساب کے شجرے جس طریقے سے ترتیب دیئے گئے ہیں اور افغانوں کے تمام قبائل کو اسی روایتی قیس عبدالرشید کی نسل سے بتایا گیا ہے، محل نظر قرار دیا جانا چاہیئے۔

(د) یہ کہ اس روایتی قیس عبدالرشید کے لڑکوں میں سے ایک کا نام بتان بیان کیا گیا ہے، صحیح نہیں ہے۔ دراصل بتان ایک شخصی نام اور ایک مورث اعلیٰ کا نام نہیں بلکہ ایک ثقافتی اور تہذیبی نام ہے۔

پیش نظر مقالہ میں مجھے لفظ بتان ہی کے متعلق چند توضیحات پیش کرنا تھیں۔ لیکن چونکہ بحث کے دوران قبائل بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کا بھی ذکر آجاتا تھا۔ اس لئے اوپر لفظ قیس سے متعلق مختصراً عرض کیا گیا۔

جیسے کہ ذکر کیا گیا افغان مؤرخین مورث اعلیٰ قیس کے ایک لڑکے کا نام بتان بیان کر رہے ہیں۔ اور اسی طرح لفظ بتان کو اس قوم کا ایک لقب بھی جانتے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے افغانوں کو پٹھان بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ بتان دراصل ایک تہذیبی اور ثقافتی نام ہے۔ نہ تو یہ ایک فرد واحد کا شخصی نام ہے۔ اور نہ افغان مؤرخین کی تشریح کے مطابق یہ افغانوں کا لقب ہے۔

یاقوت حموی اپنی کتاب معجم البلدان میں لفظ عربیہ کے تحت لکھتے ہیں: "اَمَّا النَّبطُ فَکُلُّ مَنْ لَمْ یَکُنْ رَاعِیًا اَوْ جُنْدِیًّا عِنْدَ الْعَرَبِ مِنْ سَاکِنِی الْاَرْضَیْنِ یَعْنِی الشَّامِ وَالْعِرَاقِ" (زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: تاریخ سلطنت عربی ص ۱۱۰ تا ص ۱۱۱، اور "ارض القرآن" جلد ۲ ص ۲۹ تا ص ۳۰) (ترجمہ) نبط عرب کے نزدیک ہر وہ شخص ہے جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو۔

نب آیوط (نبیط) عبرانی تلفظ ہے۔ اہل عرب اس کا تلفظ نابت کرتے ہیں ("ارض القرآن" جلد ۲ ص ۱۸ یعنی حرف (ط) کی جگہ (ت) کا تلفظ کرتے ہیں۔

پشتو لٹریچر کے قدیم قلمی نسخوں اور رسم الخط میں لفظ ختک کے حرف (ت = ٹ) کو حرف (ط) سے خطک لکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے عبرانی زبان کا حرف ط عربی کا حرف ت اور پشتو اور اردو زبانوں کا حرف ٹ = ٹ علاقائی لہجے کے اختلاف سے ایک ہی حرف کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح اصول تطبیق اسماء کے تحت (حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو "ارض القرآن جلد ۱ ص ۵۲) ب۔ ق عربی اور پ پشتو اور اردو ایک ہی حرف ہے۔

جس طرح پشتو زبان کے قدیم لہجے کے لفظ خطک کا موجودہ تلفظ ختک (خٹک) ہے (حرف ٹ سے) اسی طرح لفظ نبط کے عبرانی تلفظ کی جگہ جہاں عربی میں نابت تلفظ کیا جاتا ہے۔ پشتو اور اردو میں اس کا تلفظ نپت۔ نپٹ اور ناپٹ بن جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے نبط۔ نبت = نپٹ ایک ہی لفظ کی رو سے بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔

نبط = نابت کے ترجمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں دو فقرے ہیں: "چرواہا یا سپاہی، نہ ہو"۔ اس سے ظاہر ہے کہ

نبط ۔ نابت میں (ن۔ نا) حروف نافیہ ہیں۔ اور اس طرح سے بط ۔ بت ۔ بث ۔ بث کے معنی ہیں "چرواہا ۔ یا سپاہی" اور حرف (ن ۔ نا) کے معنی ہیں (نہ ہو) اور یہ بات کہ حرف (ن ۔ نا) نفی ۔ اور نافیہ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ عربی فارسی ۔ اُردو ۔ پشتو میں یہ حروف نافیہ معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں ۔ جیسے عربی کا فَد ۔ نفد (تہ ۔ ختم ہو گیا ہے ۔ یعنی نہیں رہا) بُد ۔ نبُد (تھا، نہیں تھا) مرد ۔ نامرد ۔ اردو میں تھا، نہ تھا ۔ پشتو میں شتہ ۔ نشتہ (ہے ۔ نہیں ہے) خواہ ۔ ناخواہ (مرضی سے ۔ بغیر مرضی کے)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً سنہ ۹۰۰ ق م میں حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے قبائل میں سے خصوصاً بنی اسماعیل (حضرت اسماعیلؑ کی نسل کے لوگ جو بعد میں مورث اعلیٰ قیدار کی نسبت سے کیداری ۔ کدرَی ۔ سیدری ۔ خدری کہلائے ۔ اور مورث اعلیٰ عدنان کی نسبت سے عدنانی ۔ اور مورث اعلیٰ مضر کی نسبت سے مضری اور مضری کی ذیلی شاخ قیس کی نسبت سے قیسی کہلائے) ـــ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے :

(الف) بطی ۔ بتی ۔ بتی ۔ بیط ۔ بیث جو چرواہے اور سپاہی تھے ۔

(ب) نبط ۔ نہت ۔ نابت ۔ نبایوط ۔ نابث ۔ ناپت ۔ جو غیر چرواہے اور سپاہی یعنے تجارت پیشہ اور صنعت کار تھے ۔ اور یاقوت حموی کے لفظوں میں نبط ہر اس قوم کے لوگ تھے ۔ جو گلہ بان اور سپاہی نہیں تھے اور غیر بدوی زندگی یعنے شہری اور متمدن زندگی بسر کرتے تھے ۔

ہم نے اوپر اندازاً سنہ ۹۰۰ ق م کا زمانہ اس لئے متعین کیا، کہ اسی زمانہ کے قریب جزیرہ نمائے عرب کے شمالی اور وسطی حصہ میں نبطیوں کی پہلی مملکت قائم ہوئی تھی ۔ اور یہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے وہ لوگ جو شام اور عراق میں پھیل گئے تھے اور جنہوں نے بدوی زندگی ترک کر کے متمدن زندگی اختیار کی وہ نبط کہلائے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یاقوت حموی نے لفظ کوثیٰ کے تحت حضرت علیؑ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ "نحن من انباط کوثیٰ" (ہم کوثیٰ کے نبطی ہیں)، کوثیٰ عراق عرب میں ہے ۔ اُدھر قبیلہ بنی ہاشم کے مورث اعلیٰ قیدار (جسے حزقیل نے قیدار اور تورات کی کتاب آفرینش باب ۲۵ آیت ۱۳ میں عبرانی لہجہ میں قے دار ذکر کیا ہے) ۔ کا عراق کے اشوری کتبات میں کدری کے نام سے ذکر آجاتا ہے، اور فلپ حتی کے قول کے مطابق اس شمالی ریاست کی قوت، تجارت پر مبنی تھی ۔ اور وہ اپنی بنا یا نشو و نما میں کسی طرح بھی عسکری نہیں کہی جا سکتی ۔ (تاریخ ملت عربی ص ۱۴۲) ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ جو اپنے آپ کو نبطی کہتے ہیں بنی اسمٰعیل میں سے ہیں ۔ اور آپ کے قبیلہ قریش اور بنی ہاشم کے لوگ تجارت پیشہ تھے ۔ تو ان حقایق کے پیش نظر بنی اسمٰعیل کے لوگوں کی تقسیم نبط اور بط (تجارت پیشہ اور غیر تجارت پیشہ یا چرواہا اور سپاہی ہیں) اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے ۔

حمزۂ اصفہانی کے قول کے مطابق "اَلْاَرْمَانِیُّوْنَ نَبَطُ الشَّامِ وَالْاَرْدَوَانِیُّوْنَ نَبَطُ الْعِرَاقِ" ترجمہ: سرزمین شام میں اُرمانیوں کو نبطی کہا جاتا ہے اور سرزمین عراق میں اردوانی لوگ نبطی کہلاتے ہیں، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نبطی اور بطی دونوں ثقافتی نام ہیں اور یہ نسل کے نام نہیں تھے ۔ اسی کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت اسرائیلؑ کی نسل کے لوگ (بنی اسرائیل) بھی صحرائے سینا ۔ کنعان ۔ فلسطین ۔ عراق ۔ اور ارام (سطح مرتفع شمالی ایران) پر آباد ہوئے ۔ اور بعد میں افغانستان اور مغربی پاکستان کے علاقوں تک پھیل گئے ۔ اُن میں سے وہ لوگ بط ۔ بت ، بث کہلائے جنہوں نے گلہ بانوں کی اور سپاہیانہ زندگی ترک نہیں کی تھی ۔ اسی طرح بنی اسمٰعیل کی بھی یہی حالت تھی یہاں بھی بدد = بتو ۔ بھٹو اور غیر بدد کی تقسیم نظر آتی ہے ۔ اور بنی اسماعیل

---

[1]: عبرانی بت (بیٹی) کی جمع بنوت (بیٹیاں) ظاہر کرتی ہے کہ بت اصل میں بنت تھا ۔ ت ، ط ، ؤ سے پہلے ، ن ساکن عبرانی تعلیل کے قاعدہ سے ساقط ہو جاتا ہے ۔ بت کا مذکر بن ہے ۔ ن ب ی ت (نبایوت) نابت (نبیط ۔ نبط) ۔ نبت (اُگنا) نبط (زمین کھود کر پانی نکالنا) عبرانی اور عربی میں نا (حرف نفی) نہیں ۔ نابث آریائی لفظ ہو جاتا ہے ۔ اِن حرف نفی ہے لیکن سامی زبانوں میں منحوت لفظ کم ملتے ہیں حرف نفی کسی لفظ سے مل کر اسے ایک لفظ نہیں بناتا ۔ (ا ۔ ج ۔ ل)

[2]: ملاحظہ ہو کتاب حزقیل (تورات) باب تجارت ۵۷۳ ق م کے بعد ۔ (ا ۔ ج ۔ ن)

ہی میں سے تجارت پیشہ اور صنعت کار لوگوں کا نبطی کے نام سے ایک حکومت کا قیام اس کی واضح دلیل ہے کہ ان میں نبط اور نبطی کی اصطلاحات رائج ہو گئی تھیں۔

یاقوت حموی کے قول کے مطابق (حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ الادب العربی" طبع مصر ص۱۳) عراق کے لوگ اسماء پر (ان) زیادہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نجر۔ نگر کی جگہ نجران اور رسِند کی جگہ سندان کہیں گے۔ اس لحاظ سے بطان۔ بتان بطان۔ پٹھان۔ ان لوگوں کا ایک ایسا نام ہے۔ جو انہیں ان کے عراق اور شمالی ایران میں سکونت کے دنوں میں عطا کیا گیا ہے[1]۔ پشتو گرامر کی رو سے حرف (ان) علامت جمع ہے۔ بط۔ بت۔ بٹ۔ پھٹ، اسم واحد۔ اور بطان۔ بتان۔ پٹھان اسم جمع بن جاتا ہے۔

بٹ: عربی زبان کے قاعدہ کے مطابق اسم واحد حالت جمعی کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے عاد۔ ثمود وغیرہ اور یہی قاعدہ پشتو زبان میں بھی موجود ہے۔ مہمند۔ خٹک۔ مروت۔ بنگش سے ایک فرد واحد اور پوری قوم دونوں مراد لئے جاتے ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق بط۔ بت۔ اور بٹ سے ایک فرد واحد اور پوری بٹ قوم دونوں مراد لئے جاتے ہیں۔

بھٹی: اسی طرح بط۔ بت۔ بٹ کے ساتھ (ی) حرف نسبت کا اضافہ کر کے بطی۔ بتی۔ بٹی (بھٹی) بنایا گیا ہے۔ جو عربی زبان کے اسمائے نسبتی کے عام قاعدہ کے مطابق ہے۔

بھٹو: جیسے کہ پہلے ذکر کیا گیا۔ بھٹو لفظ بدو کی دوسری صورت ہے حرف (د) اور حرف (ت) ایک دوسرے کی جگہ تبدیل ہوتے ہیں۔ اور پروفیسر فلپ حتی کے قول کے مطابق "بدو کا نمونہ دیکھئے تو آج بھی وہی ہے۔ جو کل تھا۔ اور آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا۔ آج بھی اونٹ۔ بکری کے بالوں کے خیمے میں اسی طرح زندگی گزارتا ہے۔ جس طرح اس کے باپ دادا گزارتے تھے۔ اور انہی چراگاہوں میں اُسی طرح اپنی بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ اونٹ۔ بھیڑ بکری اور کم تر تعداد میں گھوڑوں کی پرورش۔ شکار کھیلنا۔ چھاپے مارنا۔ یہ اس کے خاص مشاغل ہیں۔" آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "بدو کی ذہنی اور جسمانی ساخت میں بھی اس کے صحرائی مسکن کا تسلسل، یکسانی اور یبوست کی بعینہٖ جھلک دکھائی دیتی ہے۔ عضوی اعتبار سے وہ رگ پٹھے اور استخوان کی گٹھی ہوئی پوٹ ہے۔" (تاریخ ملت عربی ص۲۲)۔

اور اس قول کی روشنی میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ مغربی پاکستان کے وہ تمام لوگ جنہیں پٹھان۔ بٹ۔ بھٹی اور بھٹو کہا جاتا ہے ان میں سے وہ تمام افراد جو نبطی نہیں بنے یعنے تجارت پیشہ اور صنعت کار نہیں بنے اور شہری اور متمدن زندگی کے آرام اور آسائش نے اُن سے ان کی دیہاتی زندگی کا تسلسل، یکسانیت اور یبوست کی صفات الگ نہیں کیں اور وہ بدستور چرواہوں کی اور سپاہیانہ زندگی گذار رہے ہیں وہ آج بھی "عضوی اعتبار سے رگ۔ پٹھے اور استخوان کی گٹھی ہوئی پوٹ ہیں" چاہے وہ بھٹو ہوں، چاہے پٹھان۔

بطان عبرانی تلفظ ہے۔ اور بتان اس کا عربی تلفظ ——— جس کا ہندی اور پشتو تلفظ پتان اور پٹھان بن گیا ہے اور اس سے ایک روایتی فرد واحد بٹ یا بیٹ یا بتان مراد نہیں ہے۔ جسے افغان مؤرخین نے مورث اعلیٰ قیس کا لڑکا قرار دیا ہے بلکہ وہ پوری قوم مراد ہے۔ جو پیشے کے اعتبار سے گلہ بان اور چرواہا اور سپاہی تھی چاہے نسل کے اعتبار سے وہ بنی اسمٰعیل تھی۔ یا بنی اسرائیل یا ان کے علاوہ کسی دوسرے قبیلہ سے متعلق تھی۔ البتہ اس مخصوص اصطلاح اور اس کے تاریخی پس منظر کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پٹھان۔ بٹ۔ بھٹی اور بھٹو بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل دونوں قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور آج تک یہ پٹھان قبائل ہزاروں سال پہلے کی طرح گلہ بان۔ چرواہے اور سپاہی ہیں

---

[1] بغداد کے عباسیہ عہد حکومت میں جن مختلف مذاہب کے علماء نے مختلف علوم و فنون کے تراجم میں نام پیدا کیا ان میں صابی مذہب کے علماء میں ثابت ابن قرہ کے بعد سب سے زیادہ نامور ی ال بتانی کو نصیب ہوئی تھی۔ (متوفی ۹۲۹ء) لاطینی مصنف اسے (ال بے ٹن یوس) لکھتے ہیں۔ جس کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد ابن جابر ال بتانی تھا۔ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خاندان مسلمان ہو گیا تھا لیکن بتانی کی شہرت حقیقت میں اس کی علم ہیئت پہ اپنی تصنیفات کی وجہ سے ہوئی۔ وہ منجم تھا۔ (کتاب الفہرست ص۲۷۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بتان کی طرف نسبت سے بتانی اسمائے نسبتی متداول تھے۔

لفظ بت عبرانی۔ ارامی (سُریانی) تدمری زبانوں میں لڑکی کے معنوں میں آیا ہے۔ ایک تدمری کتبہ (۲۵۸ ق۔م) "صلمت صفطیابت ربائی نہیرنا" میں لفظ بت بمعنی لڑکی کے ہے (حوالہ کے لئے دیکھئے "ارض القرآن" جلد ۲ صفحہ ۱۴۱) تورات کے مفسر ربی شلوموا اسحٰق نے کتاب پیدائش باب ۱۶ کی ایک آیت کی تفسیر میں حضرت ہاجرہ کے متعلق لکھا ہے "آبت برعۃ ہا یتا کترا انیتم شبغوا سارہ" یعنے اَبت (وہ لڑکی) (ہاجرہ) فرعون کی بیٹی تھی۔ سنسکرت زبان میں یہ لفظ لڑکی کے معنوں کے لئے پتؔ بولا جاتا ہے۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عربی حرف ثؔ اور سنسکرت اور پشتو حرف ٹ ایک ہی چیز ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ عبرانی۔ ارامی۔ تدمری اور سنسکرت میں لڑکی کو بت اور پت کس مناسبت سے کہا گیا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے ہمیں سید سلیمان ندوی مرحوم کے اس قول پر نظر ڈالنا چاہئے۔ کہ عربی کی ث اور عبرانی کی ت ایک ہی چیز ہے۔ عبرانی میں ث نہیں ہے۔ اس لئے اکثر وہ الفاظ جو عربی میں ث سے ہیں، عبرانی میں ت سے ہیں (ارض القرآن جلد ۱ صفحہ ۱۸۵) اس لئے ہمیں لفظ بت کے لغوی معنی لفظ بث ہی کے لینے ہونگے قرآن مجید میں ہے: وبثّ منہما رجالاً کثیراً ونساءً جس کے معنی ہیں انشقّ یعنے شاخ در شاخ ہو کر پھیل گئیں۔ اور کتاب "القاموس العصری" (طبع مصر) میں لفظ بت کے بھی یہی معنی دیئے گئے ہیں۔ یعنی الانشقاق، پھٹنا (پھیلنا۔ اور شاخ در شاخ ہو کر نکلنا) علامہ دمیری نے کتاب حیوۃ الحیوان میں لفظ بط کے معنی السبح (تیرنا) دیئے ہیں۔ اور مرغابی کی قسم کا یہ پرندہ بھی پانی کی سطح کو چیرتا ہوا تیرتا ہے۔ قرآن کریم میں آیت ووجد من دونہما امرأتین تذودان ۰ قالتا لا نسقی حتی یصدر الرعاء، ط پر غور کرنے۔ اور قدیم سامی اقوام کے تمدن پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ قوم کی لڑکیاں ہی زیادہ تر مویشی پالنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ لڑکی کے لئے یہ لفظ اپنے وسیع لازمی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس طرح بت ہر وہ لڑکا اور لڑکی ہے، جو کاشتکار، چرواہا۔ اور سپاہی پیشہ ہے۔ اور جو زمین کے سینے کو چیرتے ہوئے گویا تیر رہے ہوں۔ اور ان ہی لازمی معنوں میں دریا کی کشتی کے چپو کو بطان کہا گیا ہے۔ کہ وہ دریا کی موجوں کو چیرتا ہوا کشتی کو آگے بڑھاتا ہے۔ اور اسی حرکت کے معنوں میں مکان کے دروازہ کے کواڑ کو "پٹ" کہا جاتا ہے۔

یہ سوال کہ ایک ہی لفظ بت بمعنی لڑکی۔ اور بمعنی سپاہی یا لڑکا سے یہ دونوں مختلف مفہوم کیسے اخذ کئے جا سکتے ہیں، اس سوال کو پشتو زبان کا لہجہ اور تلفظ حل کر دیتا ہے۔ پشتو لہجہ میں پٹ (حرف پ ساکن اور حرف ٹ موقوف) کے تلفظ کے معنی ہیں "پوشیدہ" اور چونکہ عورت کو ستر۔ عصمت۔ اور پردہ سے نسبت ہے۔ اس لئے ہم عبرانی۔ ارامی۔ تدمری۔ سنسکرت لغت بھی لڑکی کے معنوں کے لئے بتؔ حرف ب کے سکون اور حرف ت پر وقف سے پڑھیں گے۔ اسی طرح پشتو میں لفظ پٹ (حرف پ کے زبر اور حرف ٹ کا وقف) کے معنی ہیں۔ درخت کے چھلکے، اور لکڑی کے درمیان ریشوں کو اردو زبان میں پٹھے (اعصاب) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ ٹھیک وہی تعبیر ہے جسے ہدو کی تعبیر میں ہم نے پروفیسر فلپ حتی کے حوالے سے اس سے قبل ذکر کیا ہے۔ اور اس طرح لفظ پٹ (بمعنی اعصاب) سے پٹھان کے معنی بن جاتے ہیں۔ "مضبوط اعصاب اور قوت ارادی والے لوگ" جو آج مغربی پاکستان میں بٹ، پٹھان بھٹی، بھٹو مختلف ناموں سے آباد ہیں۔

(اِس مضمون کی مخصوص نوعیت کے پیش نظر ہم نے اس کا مسودہ مولانا ابو الجلال ندوی تلمیذ رشید علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو دکھایا تھا جو عتیقیات سے بہرۂ خاص رکھتے ہیں۔ تصویر کو اجاگر کرنے کے لئے اِن کے اشارات بھی پاورق (فٹ نوٹ) کے طور پر درج کر دیئے گئے ہیں۔ مدیر)

★

جوئے کہستاں

(کلامِ پیامِ اقبالؒ کا ایک استعارہ)*

سیّد ضمیر جعفری

ایک جوئے کہستاں کی موجِ رواں
نغمہ گر، نغمہ خواں
جاوداں، بے کراں
ایک جوئے کہستاں کی موجِ رواں
کتنی صبحوں کا سونا اٹھا لائی ہے
کتنی شاموں کا جادو جگا لائی ہے
کوہساروں کے سنگیں جگر کاٹ کر
نرم کلیوں کے گجرے بنا لائی ہے
جو ستارے تھے حدِّ نگاہِ بشر
اُن ستاروں کے میلے سجا لائی ہے
جو بہاریں تھیں مقصودِ قلب و نظر
اُن بہاروں کی خوشبو اڑا لائی ہے
ایک سیّال مستی کی دیوانگی
اپنی رو میں چٹانیں بہا لائی ہے
ایک رازِ عیاں، ایک سازِ جواں
نغمہ گر، نغمہ خواں
جاوداں، بے کراں
ایک جوئے کہستاں کی موجِ رواں

★

حسنِ فطرت کی تفسیر کرتی ہوئی
ہر تصور کو تصویر کرتی ہوئی
ریگزاروں کو توقیر دیتی ہوئی
کوہساروں کو تسخیر کرتی ہوئی
کتنی صدیوں کی تقدیر بنتی ہوئی
کتنے خوابوں کو تعبیر کرتی ہوئی
سرد جذبوں میں شعلے سموتی ہوتی
زرد مٹی کو اکسیر کرتی ہوئی
ذہنِ آدم کی تقدیس پڑھتی ہوئی
ظرفِ ہستی کی تطہیر کرتی ہوئی
ہر کنارے سے بڑھ کر چھلکتی ہوئی
ہر ستارے کو نخچیر کرتی ہوئی
آگہی کی نظر، زندگی کی زباں
نغمہ گر، نغمہ خواں
جاوداں، بے کراں
ایک جوئے کہستاں کی موجِ رواں

آسماں سے زمیں پر اُترتی ہوئی
اپنا دامن ستاروں سے بھر لائی ہے

---

* اقبال اکیڈمی کے سالانہ اجتماع (یومِ اقبالؒ) منعقدہ کراچی میں پڑھی گئی (مدیر)

"خسروی آہنگ"

جمیل نقوی

عجب تیور عجب انداز تھے کل شب جہاں میں تھا
بہم سب آشنائے راز تھے کل شب جہاں میں تھا

نظر کے سامنے بکھرے پڑے تھے راز ہستی کے
حریم غیب کے در باز تھے کل شب جہاں میں تھا

فضا گونجی ہوئی تھی نغمہ ہائے لن ترانی سے
فرشتے گوش بر آواز تھے کل شب جہاں میں تھا

مرصّع تاج تھا لولاک کا فرقِ محمدؐ پر
رسالت کے تمام اعزاز تھے کل شب جہاں میں تھا

طنابیں کھنچ گئی تھیں فاصلوں کی عرش و بطحا کے
کہ احمدؐ اور احد ہمراز تھے کل شب جہاں میں تھا

کسی کا روئے انور جلوہ آرا تھا نگاہوں میں
عیاں سب حُسن کے اعجاز تھے کل شب جہاں میں تھا

مقامِ قابَ قوسین آخری منزل تھا انساں کی
وہاں انجام بھی آغاز تھے کل شب جہاں میں تھا

عروجِ آدمِ خاکی پہ حیرت کا مرقع تھے
مَلک با ہمہ گرغماز تھے کل شب جہاں میں تھا

پر پرواز جبریلِ امیں باوصفِ یکتائی
وہاں ناقابلِ پرواز تھے کل شب جہاں میں تھا

کسی کے آستانِ لامکاں پر سجدہ ریزی سے
جبیں کو کیسے کیسے ناز تھے کل شب جہاں میں تھا

جمیلؔ اسرارِ ہستی آگئے تھے ایک مرکز پر
زمانے فرش پا انداز تھے کل شب جہاں میں تھا

امیر خسروؒ کی اس مشہور غزل کی طرف اشارہ ہے—

"محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم"

ساتھ ہی ایران کے مشہور تاجدار خسرو پرویز کی طرف بھی اشارہ ہے جس کا عہد موسیقی کا عہد زریں تھا اور دو نامور مغنیوں، "باربد اور نکیسا" نے اس فن کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ پہلوی دور کی یادگاروں میں سے صرف۔ نوائے باربد اور نکیسا۔ خسرو پرویز کی مناسبت سے اس دور کی موسیقی کو "خسروانی سرود" یا "آہنگِ خسروی" کہا جاتا ہے (مغنّی بزن خسروانی سرود : حافظ)۔ اس زمانے میں موسیقی نے جو غیر معمولی ترقی کی تھی اس کا اندازہ نظامی کی "شیریں خسرو" کے اس حصے سے کیا جا سکتا ہے جس میں شیریں کے انکارِ وصل پر خسرو کے دونوں مغنّی اس کا دل بہلا رہے ہیں۔ ایک بے شمار راگوں اور دوسرا راگنیوں سے مرد و زن کے احساسات، شکوہ اور جواب شکوہ اور راز و نیاز کی ترجمانی کرتا ہوا یہاں تک کہ نوبت ٹیپ تک پہنچ جاتی ہے تو شیریں کے لبوں سے، جو پسِ پردہ چھپی بیٹھی ہے، بے اختیار ایک فریاد کی صدا نکل جاتی ہے اور یہ ایکا کی کھیل اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ "شیریں خسرو" کا یہ حصہ اس قابل ہے کہ اسے اردو کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ (مدیر)

باندھو رے نیا کنارِ دریا

(ایمن کلیان)

عبدالرؤف عروج

پیش منظر:

کشتیاں باندھ چکے لوگ کنارِ دریا

دن ڈھلا، شام ہوئی رات کے جادو جاگے
وہ نگاہوں کے افق، ان پہ مچلتا ہوا چاند
وہ بکھرتے ہوئے پانی میں مچلتا ہوا چاند
جگمگایا کسی برگد کی گھنی شاخوں میں
چاندنی جشنِ چراغاں کی گواہی دے گی
ذوقِ بے تاب کو تابندہ نگاہی دے گی

خواب کی سیج سے جاگی ہے فضا کی دلہن
سینۂ شب میں نہاں عزمِ سحر ہو جیسے
دستِ ناہید میں ہے گونجتے سرگم کا سنگار
جادۂ کاہکشاں گیت نگر ہو جیسے

نغمگی وہ ابدی شعلۂ جولاں جس سے
صاعقہ بار ہوئی سات سروں کی کایا
دل کی پندار پرستی کی طرف لوٹ چلو
اپنے وجدان کی بستی کی طرف لوٹ چلو
گونج اٹھی ہے ستاروں کی نگاریں چھایا
ایک ملاح کو کیا جانئے کیا یاد آیا

منظر:

رات صورت کدۂ نقش و نگارِ دریا

خامشی، قلزمِ آواز کا گہرا پھیلاؤ
جس میں ارمانوں کے عفریت، تمنا کے نہنگ!
ہاں مگر دل کے سفینے کو بچانے کے لئے
ہر قدم میں ہوں پریشاں یونہی ساحل ساحل

نغمہ تلوار کی صورت ہے سنبھالے کوئی
آنکھ ملتا ہے گراں بارِ حوادث کا ہجوم
اپنے خوابوں کے سفینے کو بچا لے کوئی

میری آزاد خرامی پہ عبث طنز نہ کر
گردشِ وقت مرے پاؤں کی زنجیر نہیں
نہیں پابندِ کم و بیش فسانہ میرا
کسی نغمہ کا تعاقب ہے زمانہ میرا
کوئی نغمہ مجھے آواز دئے جاتا ہے
صفِ مژگاں پہ سجائے ہوئے کرنوں کے گہر
روشنی بن کے خلاؤں میں بکھر جاتا ہوں
تہہ بہ تہہ تیرگیٔ شب سے گذر جاتا ہوں

پس منظر:

خوابِ دلدوز ہوئی راہ گذارِ دریا

اس صداخانۂ احساس کی پہنائی میں
کسی ایمن کسی کلیان کے ملنے کا سماں
اپنی آوارگیٔ شوق کی تقدیر کہاں
وہ کہیں ڈوب گئیں زرد چراغوں کی لویں
وہ بجھا چاند وہ اٹھتا ہے ستاروں سے دھواں
اب جو بڑھتا ہے تو بڑھ جائے خمارِ دریا
کشتیاں باندھ چکے لوگ کنارِ دریا

افسانہ:

پھننگ

محمد عمر میمن

بڑے میاں نے حسبِ معمول بڑی احتیاط سے مصنوعی دانتوں کا چوکھٹا پانی سے لبریز پیالے میں سے نکالا۔ پھر بڑی توجہ سے انہیں نرم نرم ہاتھوں سے مل مل کر دھویا۔ یہ ان کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ وہ کھانے سے پہلے اپنے دانتوں کو ضرور دھو لیا کرتے تھے۔ دانت دھو کر انہوں نے چوکھٹے کو بڑے سلیقے سے اپنے پوپلے منہ میں جمایا اور کھانے کے تخت پر آ بیٹھے۔ تخت پر پرانی وضع کی سفید براق چاندنی بچھی تھی، جس کے درمیان سفید دسترخوان نہایت نفاست سے چنا ہوا تھا۔ بڑے میاں پرانی تہذیب کے بڑے دلدادہ تھے۔ اسی لئے ان کا گھر قدیم معاشرے کا ایک مثالی نمونہ تھا۔ باہر کی دنیا نے سینکڑوں کروٹیں لیں، بارہا کینچلی بدلی لیکن بڑے میاں بڑی ثابت قدمی اور سختی سے اپنے اصولوں پر کاربند رہے۔ ان کے یہاں تخت کی بجائے میز پر کھانا کبھی نہ چنا گیا۔ اور زمانے کی کوئی کروٹ بھی انہیں اپنے اصولوں سے منحرف نہ کر سکی۔ چنانچہ آج بھی تخت پر بیٹھتے ہی انہوں نے اطمینان سے ادھر اُدھر اپنی بوڑھی آنکھوں کو گردش دی جس کی سفیدیاں زمانے کی رفتار کے ساتھ دھندلا گئیں تھیں، گدلا گئیں تھیں۔ پھر آہستہ سے کہا "امجد نہیں آیا؟"

بڑی بی نے کٹورے میں سالن نکالتے ہوئے آواز دی "ارے بھئی امجد! چلو، کھانا نکل آیا۔" اور پھر وہیں باورچی خانے میں کھڑے ہو کر بے خیالی میں ڈھلکے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو کو اپنے سفید سفید سر پر استوار کیا، کشتی میں سالن کے کٹوروں کو نفاست سے سجا کر باورچی خانے سے سامنے صحن میں تخت کی جانب آئیں اور سلیقے سے دسترخوان پر کھانا چننے کے بعد دھیرے سے سرگوشی میں بڑے میاں سے بولیں "وہ آج سینما جانے کے لئے کہہ رہا تھا مگر آپ...." اور بڑے میاں بیچ ہی میں بڑی ناگواری سے بولے

"لاحول ولا قوۃ! میں کہتا ہوں ۔۔" جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی امجد تخت پر نظریں جھکا کر بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے بڑے میاں کی بہو زبیدہ دوپٹے کے پلو کو چہرے پر اچھی طرح گرائے، دھیمے دھیمے قدموں سے کشتی میں کھانا لئے آ رہی تھی، تخت پر کشتی رکھ کر وہ چلنے ہی والی تھی کہ بڑی بی نے نہایت شفقت اور محبت سے کہا "دلہن تم بھی کھا لو۔"

"نہیں اماں آپ کھا لیجئے۔ میں اسلم کے ساتھ کھا لوں گی، وہ آئے گا تو اکیلے نہیں کھائے گا۔"

یہ سب زبیدہ نے دھیمے سے کہا اور دبے دبے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے حصہ کی طرف چلی گئی۔ بڑے میاں کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ ان کے پوتے اسلم میاں غائب ہیں۔ انہوں نے پلٹ کر امجد میاں کے حصے کی طرف دیکھا جہاں انہوں نے اپنی کڑیل جوانی کے اولیں دور میں اپنے جوان اور مضبوط ہاتھوں سے نیم کا درخت لگایا تھا، اور جس کو انہوں نے اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے ہاتھوں سے سینچا تھا اور جو آج بھی بڑے میاں کی مانند کتنی ہی گرمیاں، سردیاں اور برساتیں گذار لینے کے بعد بڑے عزم سے کھڑا تھا۔ چاند کی باریک سی پھانک ٹھیک نیم کی سب سے اونچی پھننگ کے گنجان پتوں سے ذرا ذرا سی کہیں کہیں سے جھانک رہی تھی۔ بڑے میاں نے دیکھا اور کہا، "امجد! کیا اسلم باہر گیا ہوا ہے؟" ان کی بوڑھی آواز میں دبدبہ اور رعب کی وہ کیفیت آج بھی موجود تھی جو جوانی میں تھی۔ "لو اب تو آٹھ بھی بج گئے۔ ابھی تک نہیں آیا!"

امجد میاں کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ کیا وہ اپنے باپ سے جھوٹ بولیں؟ ہاں، اولاد کے لئے یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کچھ سوچ کر وہ نیچی نظریں کئے بولے "ابا میاں! وہ اپنے کسی دوست کے یہاں پڑھنے گیا ہے۔" امجد میاں کی آواز کانپ

گئی شدتِ انفعال سے ان کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ آیا۔ اس لئے کہ اسلم ان سے پوچھ کر ہی سینما گیا تھا۔

"لیکن بیٹیا، ہم بھی تو پڑھا کرتے تھے۔ خیر ہمیں چھوڑو ہم تو پرانے زمانے کے لوگ ٹھہرے۔ تم اپنی ہی مثال لے لو۔ کیا تم مغرب کے بعد کبھی گھر سے باہر رہتے ہو؟ اپنے بچپن کو چھوڑو، آج بھی تم اتنا کچھ کمانے کے باوجود، ماشاءاللہ! بیالیس سال کے ہونے کے باوجود گزیٹڈ آفسر ہونے کے باوجود مغرب سے پہلے گھر آجاتے ہو۔ تم اسلم کو سمجھاتے کیوں نہیں؟"

امجد میاں کا دل چاہا کہ کہہ دے "ابا میاں! اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، ہم آپ قدیم زمانے کی بس یادگاریں ہی رہ گئے ہیں" لیکن وہ صرف اسی قدر ہی کہہ سکے "جی اچھا، سمجھا دوں گا"۔ عقیدت کے آگے نئے زمانے کی دیواریں بہت کھوکھلی ثابت ہوئیں۔ اطمینان کی ایک لہر جھریوں سے اَٹے چہرے پر پھیل گئی۔

"ابا میاں آج ..."

"ہاں بھئی، تمہاری ماں نے مجھ سے کہدیا ہے۔ سینما جانا چاہتے ہو؟"

"جی اگر آپ ---" امجد میاں نوالہ منہ ہی رکھتے ہوئے بولے۔

"لیکن بیٹے! تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے اِس سستی تفریح سے نہ صرف تمہارا قیمتی وقت اور روپیہ ضائع ہوتا ہے بلکہ تمہارا اخلاق غیر شعوری طور پر اس سے کس قدر متاثر ہوتا ہے؟"

"ابا میاں! بڑی اخلاقی تصویر ہے، ہمارے آفس کے چند افسر دیکھ آئے ہیں، بڑی تعریف کر رہے تھے"۔

"تم کو جاتا دیکھ کر اسلم پر کیا اثر پڑے گا؟ تم تو خیر پکی عمر کے ہو، خیر و شر کی تمیز رکھتے ہو۔ غیر اخلاقی باتوں کا اثر نہ قبول کرو گے لیکن اسلم تو کچی عمر کا ہے، اس کے قدم نہ ڈگمگا جائیں بیٹے تو کبھی سینما نہیں دیکھا"۔

بڑے میاں لقمہ توڑتے ہوئے بولے "اچھا بھئی، تمہاری مرضی۔ نئے زمانے کے لوگوں کا اندازِ فکر بھی کتنا مختلف ہے"۔

"ابا میاں! ادھر تبیدہ بھی جانے کو کہہ رہی ہے۔ اگر آپ کہیں تو لیتا جاؤں"۔

بڑے میاں نئی تہذیب کی یہ آزادی اپنے لڑکے کے حق میں تو مجبوراً کسی حد تک برداشت کر لیتے لیکن گھر کی بہو بیٹیوں کے سلسلے میں ان کی خواہش تھی کہ وہ پرانی روایتوں کو سینے سے لگائے گھر گرہستی میں الجھی رہیں۔

"نہیں بھئی، تم تنہا چلے جاؤ۔ میں اس کا قائل نہیں کہ شریف عورتیں آزادی سے غیر مردوں کے شانہ بہ شانہ بیٹھیں"۔

اس کے آگے مزید کسی استفسار کی ہمت امجد میاں میں نہ تھی۔ وہ لاکھ آزاد خیال سہی لیکن ان کی پہنچ صرف اسلم میاں تک ہی محدود تھی۔ اپنے بارے میں وہ ابا میاں کے حکم اور مشوروں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے تو ایک اچھے ادارہ میں لگی لگائی نوکری بھی صرف ابا میاں کے کہنے پر چھوڑ دی تھی، ورنہ اس نوکری سے ان کو کتنی ہی مراعات حاصل تھیں۔ لیکن ابا میاں کے نزدیک اس ادارے میں رشوت کے کتنے ہی مواقع تھے۔ اور تو اور جب امجد میاں نے کار خریدنے کے سلسلے میں بڑے میاں سے کہا تھا۔ "ابا میاں! یہ روز روز بس کی لائن میں پہروں کھڑے کھڑے وقت کا کتنا خون ہو جاتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو ایک کار خرید لوں، آپ کو آسانی ہو جائے گی اور اسلم کو بھی۔ اور میرے وقت کا معتدبہ حصہ لائن میں کھڑے رہنے سے بچ جائے گا"۔

امجد میاں کو معاً خیال آیا، ممکن ہے ابا میاں سوچیں کار خریدنے سے کئی ہزار نکل جائیں گے۔ اس لئے انہیں مطمئن کرنے کے لئے مزید بولے "میرا ایک دوست کار ڈیلر ہے، نئی کار مناسب داموں پر مل جائے گی یا اگر آپ کہیں تو پھر سکنڈ ہینڈ"۔ تو بڑے میاں نے کس سنجیدگی سے کہا تھا:

"امجد میاں! یہ بھی تو سوچو، اس سے تم کتنے کاہل اور سست الوجود ہو جاؤ گے۔ نہیں، کار کی ایسی کوئی ضرورت نہیں"۔

اور یوں برسوں سے آنکھوں کی گہرائیوں میں مچلتا ہوا امجد میاں کا کار خریدنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ابا میاں کی مخالفت ان کے بس میں نہ تھی۔ وہ انہیں اپنی زندگی کے آخری ایام میں چوٹ نہ دینا چاہتے تھے۔

بڑے میاں کا گھر ان کے نزدیک لاکھ پُرسکون سہی لیکن اس پر مایوسیوں اور اداسیوں کے گہرے بادل مسلط تھے --- پورے گھر کی فضاء پر ایک عجیب قسم کی بے کیفی اور سستی چھائی رہتی۔

خواہ امجد میاں ہوں یا ان کی بیگم زبیدہ، بظاہر تو وہ بڑے پُرسکون دکھائی دیتے لیکن بڑے میاں کی گہری آنکھیں اُن دلوں تک نہ اتر سکیں جہاں ایک ابدی بے کیفی کا مسکن تھا، نئے دور کی تیز روشنی سے نئی پود ضرور متاثر ہوئی تھی۔ اس روشنی کے لئے اُس کے دل میں احترام تھا۔ اور اس روشنی سے اپنے قدرت کے خاموش چراغوں کو جلا لینے کا جذبہ بھی تھا۔ کیا ہوا اگر یہ آدرش، یہ احترام، یہ جذبہ باپ کی عقیدت کے آگے سرنگوں ہو گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اگر اس نئی پود کو ذرا سا بھی موقع ملا تو وہ فوراً صدیوں پرانے روایتوں کے ان قلعوں سے نئی فضا میں نکل آئے گی۔

ابا میاں کی مخالفت امجد میاں نے کبھی نہ کی، لیکن زبیدہ کئی بار دبی زبان سے اس دار و گیر اور بے جا پابندیوں کی شکایت امجد میاں سے کر چکی تھی۔ گو امجد میاں نے اسے پرسکون تو کر دیا لیکن اپنے دل کی گہرائی میں وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اس دار و گیر سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کا ایک ننھا سا جذبہ ان کے سینہ میں بھی ابھر رہا ہے۔ اور قبل اس کے کہ وہ ننھا منّا سا جذبہ، لپکتا ہوا شعلہ بن جائے۔ انہوں نے یہ کہہ کر اسے اپنے وجود سے علیحدہ کر دیا "اب اور کتنے دن ... نئے چراغ جھلملائیں گے؛ ان کی جوان روشنی میں پرانے چراغ خاموش ہو جائیں گے۔ یہ زمانے کا ازل سے دستور رہا ہے۔ جب نئے چراغ روشن ہوتے ہیں تو پرانے چراغ ان کی روشنی میں آپ ہی آپ دھیمے دھیمے، خاموش ہو جاتے ہیں"! لیکن اس خیال کے ساتھ ہی انہیں اپنی کمزوری پر غصہ آتا۔ اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی۔ ذرا سی انسانی خواہشات نے انہیں کس قدر اندھا کر دیا ہے۔ وہ اس قسم کی باتیں اسی ہستی کے متعلق سوچ رہے ہیں جس نے انہیں جنم دیا ہے اور اپنے خون سے ان کی تشکیل کی ہے۔

اور — یہ روز شام کو ابا میاں کے ہمراہ ایک میل کا چکر لگا کر دور دراز مقام پر اظہار عبودیت اس پر تو وہ اپنی روایتی فرمانبرداری کے سبب کوئی صدائے احتجاج نہ بلند کر سکے حالانکہ بڑے میاں کی سرگرمیاں جو خالص حفظانِ صحت اور حصولِ ثواب کے اصولوں پر استوار تھیں، امجد میاں کے نزدیک بڑھاپے کی سنک، کم فہمی اور کم عقلی سے زیادہ نہ تھیں۔ لیکن اسلم میاں تو ماشاءاللہ نئے زمانے کی ضیاؤں سے سرشار تھے، کالج میں تعلیم پاتے تھے، ان کے نزدیک دادا کے اس ذوق و شوق کا مفہوم بڑھاپے کی شدید ترین سنک کے ماسوا کچھ نہ تھا۔

"اماں! یہ دادا کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا نزدیک کی مسجدوں میں دعائیں قبول نہیں ہوتیں جو دادا ہر شام ڈیڈی کو اور مجھے میل بھر دور کھینچے لے جاتے ہیں؟ واہ دادا جان واہ! یہی ہے آپ کی قدیم تہذیب! باز آئے ہم تو —" وہ بڑی حقارت اور تمسخر سے اپنی ماں سے بولے۔ اور پھر صرف ڈیڈی ہی اس کی بیباک تنقید کی چھینٹ نفرت کا نشانہ بن گئے۔ "اور اماں۔ یہ ڈیڈی بھی خوب ہیں، یوں تو اپنے کو آزاد خیال کہلوانے میں از حد مسرت محسوس کرتے ہیں لیکن دادا کے معاملے میں ان کا انداز کتنا قدیم اور فرسودہ ہوتا ہے! آخر جھکتے نہیں ڈیڈی"۔

اور زبیدہ بیچاری مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے اپنے آزاد خیال لڑکے کو گھورتی ہوئی بولی۔ "ارے چپ! کہیں ابا میاں نے سن لیا تو خیر نہیں"۔

"واہ اچھی پابندی ہے، ہم اپنے گھر میں بھی آزادی سے کچھ بول نہیں سکتے۔ اماں! یہ آزاد خیالی کا دور ہے۔ میرا بس چلے تو تمہارا یہ برقع بھی —"

"شریر کہیں کا! چل ہٹ بڑے بوڑھوں کا مذاق نہیں اڑاتے۔ اپنی تو گذر گئی، اپنی بیوی کا برقع اتروائیو۔ تجھے اپنے دادا کا خیال کرنا چاہیئے، سمجھا"

"واہ! مجھے تو صدیوں پرانے دادا ایک آنکھ نہیں بھاتے"

"چپ کمبخت! وہ گھر ہی میں ہیں۔ اگر سن لیا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔ تو بھی تو ایک روز دادا بنے گا۔ اور جب کہیں تیرے پوتوں نے بھی یہ کہہ دیا "ہمیں تو یہ صدیوں پرانے دادا پسند نہیں، تو ......؟"

لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ اسلم میاں کو اپنے دادا جان سے محبت نہ تھی۔ گذشتہ دنوں جب بڑے میاں کو شدت کا بخار چڑھا تھا تو ڈیڈی اور امی دونوں کے پیہم منع کرنے کے باوجود کالج سے چھٹی لیکر بغیر پلک جھپکائے ان کی پائنتی سے لگے بیٹھے رہے۔ برف کے پانی میں چھڑکے ہوئے یوڈی کلون سے برابر ایک شب کا سر تر کرتے رہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس محبت کے باوجود

نہ جانے کیوں اسلم میاں کو بڑے میاں کو چھیڑنے میں کسی انجانی مسرت اور لطف کا احساس ہوتا تھا۔ اور یوں بڑے میاں کے احساس میں ہلکے ہلکے تو کیلے نشتر چبھو کر اسلم میاں ایک انجانی سی خوشی محسوس کرتے۔ جان بوجھ کر ایسے کام کرتے کہ بڑے میاں، انہیں دیکھ کر چراغ پا ہو جاتے اور دادا کی اس جھلاہٹ اور برافروختگی میں انہیں وہ فرحت محسوس ہوتی جو کسی کی مرضی کے خلاف کام کر کے اور پھر اس کی پریشانی اور جلتے ہوئے احساس کا مظاہرہ دیکھ کر دوسرے کو ہو سکتی ہے۔

شاید اسی لئے جب اسلم میاں نے جان بوجھ کر کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت امجد میاں کی غیر موجودگی میں دیوان خانے میں سے بزرگانِ سلف کی تصویریں اور کتبے آثار کران کی جگہ خوشنما مناظر کی تصاویر آویزاں کر دیں تو امجد میاں اور بی زبیدہ تو کچھ نہ بول سکی لیکن ایک دن جب بڑے میاں اپنے حصے سے نکل کر بہو بیٹے کے حصے کی طرف نکل آئے تو دیوان خانے میں انہیں سماں بالکل ہی الٹا نظر آیا۔ بڑے میاں مبہوت کھڑے، عجیب اضطراری انداز میں کبھی اس منظر کی تصویر دیکھتے کبھی اس کی۔ شدتِ غم اور دفورِ حیرت سے ان کی بوڑھی گدلی آنکھوں کا پانی اور گدلا گیا۔ چند لمحے وہ یونہی کھڑے صامت گردشِ ایام کی تلخی کو کھڑے پیتے رہے اور قرمزی پردوں کے عقب میں کھڑے اسلم میاں بار بار پردہ ذرا سا سرکا سرکا کر بڑے میاں کی بدلتی کیفیات کا جائزہ لیتے رہے۔ بڑے میاں کی بےچینی، اضطراب اور مایوسی کو دیکھ دیکھ کر انہیں ایک عجیب، گمنام، انجانی مسرت کا احساس تھا، جو ایک انسان کو بیچ مجمع کے اپنے حریف کو چاروں خانے چت گرا کر ہو سکتی ہے۔ فتحمندی کی منور لکیریں ان کے جوان چہرے پر ابھر آئیں۔ ادھر بڑے میاں کو بڑی مشکل سے یقین آ رہا تھا کہ ان کے اپنے مکان میں ایک کمرہ ایسا بھی ہے جہاں ان کی اپنی تہذیب، ثقافت اور معاشرت سسکیاں بھر رہی ہے۔ مارے حسرت و یاس کے وہ بغیر کچھ کہے سنے دھیمے قدموں سے اپنے حصہ میں چلے آئے۔ ان کو اپنے بدن میں عجیب تشنجی کیفیت محسوس ہوئی، کسی اندرونی خلفشار سے ان کے ضعیف اعضا کانپے اور وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر اپنی بہو کے حصہ میں نکل آئے۔ زبیدہ سے کہہ کر تمام بزرگان سلف کی تصاویر اور کتبے اپنے حصہ میں اٹھوا لائے۔ ان کے جاتے ہی امجد میاں کے دیوان خانے کے مخملیں قرمزی پردوں میں جنبش ہوئی اور احساسِ فتحمندی سے مسکراتے ہوئے، اپنے جوان لبوں پر زندگی کا حسین ترین تبسم لئے اسلم میاں برآمد ہوئے۔

یہ منظر دیکھ کر زبیدہ کانپ کانپ گئی۔ بڑے میاں کی دھندلی آنکھوں میں اس المیہ سے جو حسرتناک چمک ابھر آئی تھی وہ آج بھی زبیدہ کے ذہن و دل میں موجود تھی۔ شاید اسی لئے اس نے اسلم میاں سے کہا تھا:

"چپ کمبخت! وہ گھر میں ہیں۔ اگر سن لیا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا!"

اور پھر وہ عجیب اضطراری انداز میں صحن کے بیچوں بیچ دیوار والے دروازے کو گھورنے لگی جسے بڑے میاں نے امجد میاں کی شادی کے بعد کھنچوا کر مکان کا بڑا حصہ امجد میاں کے حوالے کر دیا تھا اور خود اپنی بڑی بی کے ہمراہ دو کمروں میں دیوار کے دوسری طرف اٹھ آئے تھے۔ اسے گمان ہوا کہیں بڑے میاں دروازے میں نہ کھڑے سن رہے ہوں۔

رات گئے جب امجد میاں سینما دیکھ کر گھر پہنچے تو زبیدہ جاگ رہی تھی۔ اس کو ویسے ہی شدید غصہ آ رہا تھا کہ بڑے میاں نے آج ان کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ سوچنے لگی "واقعی اسلم ٹھیک ہی کہتا ہے۔ بڑے میاں کا دماغ ......" لمحہ بھر کے لئے بڑے میاں کی ذات سے وابستہ ترحم کے تمام جذبات اس کے دل سے نکل کر برساتی ندی کے گدلے پانیوں کی طرح دور تک بہتے چلے گئے۔ اور اب جو امجد میاں لوٹے تو وہ برس پڑی:

"بس آپ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ میرے لئے بھی ابا میاں سے اجازت حاصل کر لیتے۔ اتنی عمر ہو گئی لیکن ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا مگر آپ ......"

زبیدہ کو اپنے شوہر کی اکڑ دری پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

"ناراض کیوں ہوتی ہو جانم! آج نہ سہی کل سہی۔"

"کل سہی" وہ بپھری "لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ کل ابا بدل جائیں گے؟"

"تو کیا تمہارا مطلب ہے تمہیں ابا میاں کی مرضی کے خلاف سینما لے جاتا! بھئی مجھ میں ابا میاں کا دل دکھانے کی ہمت نہیں بیگم!"

امجد میاں کی سعادت مندی بھلا ابا میاں کے خلاف یہ
سب کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ زبیدہ نے اس دن کو کوسا جب وہ
امجد میاں کے پلے پڑی تھی۔ اسی پر دونوں میں خاصی تو تو میں میں
ہو گئی۔ پہلے آہستہ اور بعد میں آواز خاصی کرخت اور تیز ہو گئی۔
لوں میں محوِ خواب ابا میاں شور سن کر جھٹ پھڑپھڑا کر پھر
گئے۔ نیم کی شفیق باہوں میں لٹکا ہوا کوئی چمگادڑ اڑا اور اپنے
پیچھے صوتی اعتبار سے نہایت بھیانک اور بے ہنگم آواز کا شور
چھوڑ گیا۔ ادھر دالان کی دیوار کے اس پار برآمدے میں محوِ خواب
بڑے میاں کی بڑھاپے کی کچی نیند اس بے وقت، بے ہنگم شور سے
ٹوٹ گئی۔ پہلے تو وہ بڑی خاموشی اور صبر سے امجد میاں اور بہو کے
درخت مکالمے سنتے رہے، لیکن ان کی سمجھ میں ایک لفظ نہ آیا۔ تو
سامنے چوکی پر نماز پڑھ کر تسبیح کے دانے کٹکٹاتی ہوئی اپنی بڑی بی سے
بولے:

"ارے امجد کی اماں سنتی بھی ہو، یہ سب کیا ادھم ہو رہا ہے؟"

"جی سنتی ہوں۔" لمحہ بھر کے لئے بوڑھے ہاتھوں کی جنبش
تسبیح پر رک گئی اور پھر وہی تسبیح کے محدود حلقے کے گرد پھیلے ہوئے
دانوں پر آشنا انگلیاں تیزی سے پھرنے لگیں۔

"اتنی عمر ہو گئی اور بچوں کی طرح شوہر سے لڑ رہی ہے"
وہ بڑی ناگواری سے بولے" ارے سنتی ہو، میں کہتا ہوں شوہر سے
اتنی اونچی آواز میں بات کرنے کی بہو میں اتنی ہمت کیسے ہوئی؟ ہاں
بھئی نئے زمانے کے لوگ ہیں"

"میری تو اتنی عمر ہو گئی لیکن میں تو آپ کے سامنے منہ کھول کے
بھی کبھی نہیں بولی" بڑی بی کو جو موقع ہاتھ لگا تو لگیں اپنے اوصافِ حمیدہ
گنوانے۔ ادھر بڑے میاں جو بڑے امن پسند واقع ہوئے تھے،
اس چھوٹے موٹے جھگڑے اور نیند میں بیجا مداخلت سے خاصے
برہم ہو گئے۔ بھنائے ہوئے تو تھے ہی، کرختگی سے بولے،

"حسرت رہ گئی ہے تو اب پوری کر لو، کون روکتا ہے تمہیں؟"

"اے نوج! تم کیسی باتیں کرنے لگے، اچھے بھلے تو تھے ابھی۔
عمر گزر گئی جب تو سامنے جواب نہیں دیا، اب کیا دوں گی۔"

بڑی بی اپنے بڑے میاں کی اس بیٹھے بٹھائے شوشہ
چھوڑ دینے والی حرکت پر خاصی برہم ہو گئیں۔

"میں کاہے کو تمہارے سامنے جواب دوں۔ اللہ کرے
تمہارے دشمنوں کو بھی تمہارے سامنے جواب دینے کی ہمت نہ پڑے۔
جواب دینے سے پہلے ہی تباہ ہو جائیں۔ ہاں نہیں تو ....."

"اچھا چلو سو جاؤ۔ میں کہتا ہوں پیٹھ پیچھے کسی کی باتیں کرنا
بدعت ہے۔ بدعت!" کہتے ہوئے انہوں نے کروٹ بدل لی۔ ادھر
جانماز تہہ کر کے اپنے بستر میں گھستی ہوئی بڑی بی اپنی چادر تانتے
ہوئے بولیں "یہ بدعت تو تم نے ہی شروع کی تھی۔"

بس جھگڑنے کو یہی کیا کم تھا لیکن تھکے ہوئے بڑے میاں پر
نیند کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ مہابھارت والا رنگ جمانے سے
باز آ گئے۔

کئی دن تک تو امجد میاں اپنی سگریٹ کے چور کی تلاش گھر بھر میں
کرتے رہے۔ پھر بھی جب پتہ نہ چلا تو بڑے جھنجھلائے لیکن ان کی
مشکل ایک روز آپ ہی آپ آسان ہو گئی۔ کسی کام سے اسلم میاں کے
کمرے میں جو گئے تو دیکھا وہاں سگریٹ کے چھوٹے بڑے جلے ادھ جلے
کوئی پانچ سات ٹکڑے رائٹنگ ٹیبل کے نیچے ردی کی ٹوکری میں
پڑے ہیں۔

"اچھا تو یہ صاحبزادے بلند اقبال ہیں۔" بڑے سٹپٹائے
اس لئے نہیں کہ صاحبزادے نے یہ حرکت بھی شروع کر دی تھی
بلکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں اس الھڑ لڑکے نے بھولے سے بھی دادا
کے سامنے پی لی تو ان کی خیر نہیں۔ ساری ذمہ داری انہیں پر آئے گی
اور وہ خود بھی تو بڑی حفاظتی تدابیر اختیار کر کے چھپ چھپا کر سگریٹ
پیتے تھے۔ اسلم میاں جونہی پہنچے تو آپ بھی ان کے پیچھے کمرے تک
چلے آئے۔

"اسلم۔" "جی ڈیڈی۔"

"میں نے تمہیں سگریٹ پینے سے تو منع نہیں کیا تھا لیکن
کم از کم میری سگریٹ تو چرا کر نہ پیا کرو، یہ اخلاقی جرم ہے تم نے
یہ مکروہ عادت ڈال ہی لی تھی تو مجھ سے ذکر کر دیتے۔ چلو خیر، آج
تمہارے جیب خرچ میں دس روپے کا اضافہ کئے دے رہا ہوں،
لیکن خبردار دادا جان کے سامنے کبھی بھولے سے بھی نہ پینا"

پھر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس میں سے ایک
سگریٹ منتخب کی۔ سگریٹ اور لائٹر اسلم میاں کی طرف بڑھاتے

ہوتے ہوئے لو، شرماؤ نہیں۔ میرے سامنے پیو، لیکن میں یہ ہرگز نہیں برداشت کر دوں گا کہ تم ابا میاں کے سامنے بھی اسی آزادی کا مظاہرہ کرو۔"

پہلے تو اسلم میاں جھجکے۔ انہیں خیال ہوا کیا ڈیڈی اتنے آزاد ہیں، یا کسی ڈرامے کا ریہرسل ہو رہا ہے۔ جب یقین کامل ہو گیا تو پی لی۔

اس مہینے بھی تنخواہ کے ساڑھے سات سو روپے لئے جب امجد میاں ابا میاں کے پاس پہنچے تو نوٹوں کی گڈیاں ان کے سامنے پھیلا دیں۔ ابا میاں جیسا خوش نصیب کون ہوگا۔ بیٹا زندگی بھر فرمانبردار تھا، نمازی، پرہیزگار کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف کرنا اپنے نزدیک باعثِ شرمندگی سمجھنے والا، لائق اور سب سے بڑی بات کماؤ۔ اور یہ میاں امجد کی ہمیشہ سے عادت تھی، مہینے کی پہلی کو تنخواہ ابا میاں کے حوالے کر کے بے تعلق ہو جاتے۔ یہی معمول پہلی تنخواہ سے لے کر اب تک رہا۔ اور بڑے میاں ہمیشہ کہا کرتے:

"میں کوئی اپنے لئے تھوڑی رکھوں گا۔ ماشاء اللہ صاحبِ اولاد ہو، میرے بعد تمہارے ہی کام آئے گا۔ خدا مجھے کسی کا محتاج نہ کرے! میری پنشن، زندگی بھر کی محنت کا صلہ، مجھ تک پہنچ ہی جاتا ہے جو ہم دونوں کی ضرورت سے زیادہ ہے، تمہارے ہی کام آئے گا بیٹے!" آج بھی انہوں نے یہی کہا اور امجد میاں بھی حسبِ معمول بولے:

"خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ آپ اپنا ہی کھائیے۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیئے۔ ہم کو تو یہی تمنا ہے آپ ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیں۔"

"نہیں بیٹے" بڑے میاں نے بہو کے حصے میں لگائے ہوئے نیم کے کہن سالہ درخت کو دیکھتے ہوئے کہا "میرا یہ مطلب نہیں۔ مجھے ہمیشہ تھوڑی ہی زندہ رہنا ہے۔ میرے بعد میری اولاد کے کام آ جائے، میری یہی آرزو ہے"

بڑے میاں تھے بڑے غیرت دار۔ امجد میاں کے گھر کے خرچے بہو کو دے کر ان کی ساری تنخواہ صندوق میں رکھ آتے۔ بینک میں رکھنے کے وہ قائل نہ تھے۔ جب جوانی میں روپیہ بینک میں نہ رکھا تو اب بڑھاپے میں سود لے کر عاقبت اور ایمان بگاڑیں۔

"ابا میاں! اسلم میاں کے جیبِ خرچ میں اس ماہ سے دس روپے کا اضافہ کر دوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

امجد میاں جو ہر بات میں بڑے میاں کا مشورہ لینے کے قائل تھے، آج بھی اسی سعادتمندی سے بولے:

"لیکن بیٹے کیا بیس روپے کافی نہیں؟ زیادہ دو گے تو خرمستیاں کرے گا، سگریٹ پیئے گا۔"

یہ سننا تھا کہ امجد میاں کو مارے گھبراہٹ کے پسینہ آ گیا پشت میں سینکڑوں چیونٹیاں رینگتی سی محسوس ہوئیں۔ بڑے میاں کے الفاظ میں کسی قسم کا استفسار شامل نہ تھا، اس لئے میاں امجد کی گلوخلاصی ہو گئی ورنہ بڑے میاں پیچھا چھوڑنے والے تھے۔

اگلی صبح جو امجد میاں آفس جانے کے لئے تیار ہو کر برآمدے میں آئے تو زبیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا: "ارے سنا بھی کچھ آپ نے؟"

"نہیں۔ کیوں کیا بات ہے؟ امجد میاں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"سنا کل آپ کے لاڈلے بلند اقبال فرما رہے تھے یہ دادا جان کو کیا ہو گیا ہے جو ایک میل دور جا کر نماز پڑھتے ہیں کیا نزدیک نماز ادا نہیں ہو سکتی؟ اور یہ کہ آپ ابا میاں کے معاملے میں اتنے سعادتمند کیوں ہیں" وہ مسکراتی ہوئی بولی اور ادھر اسلم میاں اپنی نشست پر کلبلائے۔ جھٹ کرسی چھوڑ چھاڑ برآمدے میں نکل آئے۔

"کیوں بھئی اسلم میاں یہ سب میں کیا سن رہا ہوں؟" وہ پدرانہ شفقت سے استفسار کرتے ہوئے بولے۔

"کچھ بھی تو نہیں ڈیڈی، — ہاں دیکھئے تو سہی، بھلا دادا جان کو بھی کیا سوجھی ہے کہ......!"

اور وہ ابھی جملہ مکمل نہیں کرنے پائے تھے کہ امجد میاں بات کاٹتے ہوئے بولے "ارے چپ کمبخت، آہستہ بول:" پھر جانے انہیں کیا خیال آیا کہ طرزِ تخاطب "تو" سے "تم" پر آ گیا۔

"بیٹے! کم از کم تم سے تو یہ امید نہ تھی کہ تم میں یہ جرأت بھی پیدا ہو جائے گی تم اس آزادی سے بزرگوں کا مذاق اڑاؤ گے۔ مگر آج ابا میاں تختۂ مشق ہیں تو کل پھر میری باری ہے۔"

"واہ! یہ بھی ایک ہی رہی ڈیڈی" اسلم میاں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ منتخب کی، ڈبیہ پہ خوب ٹھونک بجا کر انداز سے لبوں میں دبائی اور دیا سلائی دکھا کر بہت سا دھواں شرارت سے بی زبیدہ کے منہ پر چھوڑ دیا۔

"ہٹ شریر! کیا بیہودگی ہے" زبیدہ نے بظاہر ڈانٹتے ہوئے کہا، مگر اس ڈانٹ میں بھی اس کی ممتا کانپ رہی تھی۔

"ڈیڈی پانچ روپے دیدیجئے۔ پکچر دیکھنی ہے" اسلم نے امجد میاں سے کہا۔

"بیٹا اتنی پکچر ز دیکھنے سے کیا فائدہ ہے۔ ابھی دو ہفتے پہلے ہی تم گئے تھے"۔

"ڈیڈی بڑی اچھی پکچر ہے۔ ہمارے کالج کے بہت سارے لڑکے آج دیکھنے آئیں گے، دے دیجئے نا" اسلم نے بڑی عاجزی سے کہا:

"ارے اب دے کیوں نہیں دیتے۔ اتنی خوشامد کر رہا ہے بیچارہ" زبیدہ اپنے بیٹے کی حمایت میں بولیں "تم بیچ میں کیوں دخل در معقولات کرتی ہو؟ میں پکچر دیکھنے سے منع نہیں کرتا لیکن ہر کام اعتدال سے تو ہونا چاہیئے"۔

"لیکن ڈیڈی میں کب روز روز پکچر ز دیکھتا ہوں۔ اور پھر سینما دیکھنا کوئی بری بات تو نہیں"

"مگر اعتدال میں رہ کر"

"تعجب ہے ڈیڈی" اسلم میاں سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے بولے "ایک ترقی یافتہ آزاد انسان ہوتے ہوئے آپکا انداز فکر اس قدر فرسودہ اور صدیوں پرانا تو نہ ہونا چاہیئے۔ پکچر ہماری ترقی کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔ دادا جان کی فرسودگی کا لبادہ اتار پھینکنے کا اب وقت آگیا ہے"

بڑے میاں کسی ضروری کام سے بہو کے حصہ کی طرف نکل آئے تھے صحن میں جب انہوں نے بہو کو یوں ننگے سر اور اسلم میاں کو اپنے باپ کے سامنے یوں آزادی اور بے باکی سے سگریٹ پیتے دیکھا تو انہیں شدت سے اپنے آگے اندھیرے کی دبیز چادر پھیلتی محسوس ہوئی۔ ان کے کھوکھلے قدم ڈگمگائے۔ اور وہ ستون کا سہارا لے کر اپنی بے ترتیب سانسوں کو سنبھالنے لگے۔ انہیں شدت سے محسوس ہوا وہ بہت دور تک چلے آئے ہیں اور تھکن اب ان کے اعصاب پر کچھ اس طرح سوار ہو گئی ہے کہ ایک قدم چلنے کی سکت بھی ان میں باقی نہیں رہی ہے۔ وہ صدیوں بوڑھے ہو گئے ہیں۔ انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان کی دوسری پشت ہی، ان کی زندگی میں، ان کے احساس کو یوں ضرب کاری لگائے گی۔ انہیں محسوس ہوا۔ سامنے نیم کا درخت جو انہوں نے برسہا برس قبل بڑھاپے میں، سہارے کے لئے، اس لئے کی تمنا میں، لگایا تھا۔ وہ جڑ سے اکھڑ گیا ہے ۔۔۔ اور ادھر امجد میاں اسلم سے کہہ رہے تھے:

"بیٹے صحت مند روایات کا احترام جب تک نہ کیا جائے گا، یہ مادی ارتقاء بے معنی ہے، یہ ترقی بے رنگ و بو ہے۔ ایسے پھول کی مانند جس میں صرف رنگ ہی رنگ ہے لیکن بو ندارد"۔

"مگر ڈیڈی، جسے آپ صحت مند سمجھتے ہیں، ممکن ہے آئندہ آنے والی نسلوں کے نقطۂ نظر سے وہ روایات، وہ اقدار صحت مند نہ ہوں بلکہ رجعت پسندانہ ہوں، کرم خوردہ ہوں۔ آپ کو تو اتنا رجعت پسند نہ ہونا چاہیئے"

"لیکن بیٹے! سماج کی صحت مند اور اخلاقی اقدار کبھی نہیں بدلتیں"

"یہ لیجئے آپ نے تو حکم صادر فرما دیا۔ مگر ثبوت؟ بالکل دادا جان کی طرح ان ہی کی سطح پر آ کر۔ حالانکہ آپ تو ان سے ایک نسل بعد ہیں! ان کے مقابلے میں تو آپ کو ترقی پسند ہونا چاہیئے"۔

برآمدے میں ستون کی آڑ میں، سہارا لئے کھڑے ہوئے پچہتر سالہ بڑے میاں کو اپنے سینہ پر ایک ناقابلِ بیان بوجھ محسوس ہوا۔ انہیں محسوس ہوا کوئی اپنے جوان، طاقتور ہاتھوں سے ان کا دل مسوس رہا ہے ۔ دبیز اندھیرا تیزی سے ان کے آگے بڑھنے لگا۔ کربناکیاں شدت سے ان کے جھری زدہ بوڑھے چہرے پر اپنا گنجان جال بننے لگیں۔ اور ان کے قدم ڈگمگا گئے۔ ان کے کانوں میں شدت سے ایک جملہ صدائے بازگشت بن کر گونجا "یہ لیجئے آپ نے تو حکم صادر فرما دیا، بالکل دادا جان کی طرح ان ہی کی سطح پر آ کر" بڑے میاں سنتے رہے، ان کی بجھی سی آنکھوں کے آگے حسرت و یاس کے دبیز سائے منڈلاتے رہے۔ اب مزید کچھ سننے کی تاب ان میں نہ تھی۔ ستون کی اوٹ سے نکل کر وہ اپنے دل میں حسرت کا طوفان لئے امجد میاں کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کو دیکھتے ہی بے خیالی

(باقی صفحہ [illegible] پر)

غزل

ضمیر اظہر

مہمانِ بزمِ یاس ہو اور میزباں بھی ہو
دل داستاں گو بھی ہو خود داستاں بھی ہو

اے کاش اس جنوں کا کبھی امتحاں بھی ہو
اپنے ہی سر پہ آپ جو سنگِ گراں بھی ہو

مرغوب تر ہے ہم کو بیان و کلام سے
وہ خامشی کہ آپ ہی اپنا بیاں بھی ہو

لگتا ہے تو یہ خیال نہ ہو رازداں کوئی
لگتا ہے یہ غم کہ اپنا کوئی رازداں بھی ہو

اک سمت یہ یقین کہ دنیا سراب ہے
اک سمت یہ طلب کہ سفینہ رواں بھی ہو

آتا نہیں یقیں کہ محبت کا رابطہ
جاں کے لئے وبال ہو تسکینِ جاں بھی ہو

حسرت بھی کانپ اٹھتی ہے اس غم کے حال پر
تنہا بھی جل رہا ہو مگر بے زباں بھی ہو

اظہر بہت طویل ہے گرچہ رہِ حیات
ممکن نہیں قیام کا اس میں گماں بھی ہو

ہفت پیکر

عرفانہ ملک

جلتی بجھتی رات میں کیسے راگ سنائی دیتے ہیں
ساون کی برسات میں کیسے راگ سنائی دیتے ہیں
کلیوں کے آنچل پر سوئی جاگ اٹھی ہیں مہکاریں
کومل کومل پات میں کیسے راگ سنائی دیتے ہیں
نیند کی بہتی ندیاں ہیں یا آوازیں جھرنوں کی
پورن ماشی رات میں کیسے راگ سنائی دیتے ہیں
جلتے دیپ، ابھرتے تارے، چرواہوں کی آوازیں
شام ڈھلے دیہات میں کیسے راگ سنائی دیتے ہیں

— دیمک بن کے ریشم جیسے سپنوں کی ہر ڈور
دھیرے دھیرے ہولے ہولے چاٹ گیا ہے روگ!
— نرگس کی خوابناک نگاہوں کے دیس میں
کہتے ہیں انتظار کی بستی حسین ہے
— لیلیٰ روش، خرام شب انتظار کا
مجنوں صفت، خیال دلِ بے قرار کا
— کن خیالوں میں کھو گیا ہے دل
دھڑکنوں کی صدا نہیں آتی!
— اپنے دل میں پکاریئے جا کے
دیکھئے تو ذرا کہاں ہیں ہم
— اور کچھ کیجئے چمن سے تلاش
پھول تو بے ثبات ہوتے ہیں

بستی بستی ایک نجومی متوالا یہ کہتا ہے
گرتے گوہر پات میں کیسے راگ سنائی دیتے ہیں

ڈرامہ:

رنگ محل میں آگ لگی!

صہبا اختر

(جور و استبداد کی کہانی ایک ہی ہے۔ خواہ وہ کہیں ہو۔ نیل کے دریا سے کر تا بہ خاک کاشغر۔ اور اس کا انجام بھی ایک ہی ہے۔ رنگ محل میں آگ۔ خواہ وہ فرانس کا کاسٹائل ہو یا عوام کو ان کے جائز حق سے محروم کرنے والے مہاراجوں کا راج سنگھاسن۔ یہ ایکانکی ڈرامہ جبر و تشدد کے اسی عبرتناک انجام کا آئینہ دار ہے ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو   از مکافاتِ عمل غافل مشو! - مدیر)

★

(اورنگ اپنے محل میں بستر خواب پر نیند کی خواہش میں بے سود کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی میں ایک کنیز شعلہ رخ اور ایک محافظ ستمن کھڑے ہیں۔ دریا کی موجوں کا شور جو رفتہ رفتہ دھیمی حزنیہ موسیقی کے ساتھ ساتھ کم ہوتا چلا جاتا ہے)

اورنگ: (حسرت اور اضطراب کے لہجے میں):
لوگ فرعون سمجھتے ہیں سب مجھے
کرتے اک عمر سے سجدے ہیں مجھے
میری ہیبت سے لرز جاتے ہیں
میرے جبروت سے تھراتے ہیں
ور میں ..... ہونہہ! .....
(موجوں کا چھپاکا)
(دریا سے اسی لہجہ میں):
درفشاں وادیاں میری ہیں مگر میرے لئے
تند موجوں کا بلا خیز بلاؤں کا نزول
رات جس طرح کوئی سوگ منانے والے
در فضا جیسے صفِ ماتم یارانِ ملول
سے، بہت جھڑ میں بکھرتے ہوئے پتوں کی طرح
گلستاں جیسے کسی قبر پہ رکھے ہوئے پھول
اند جیسے کسی راہب کا عبادت خانہ
اندنی جیسے کلیساؤں میں اڑتی ہوئی دھول
تاک رات ہمیں نیند نہیں آ سکتی
ند مسموم فضاؤں کو نہیں کرتی قبول
(شعلہ رخ سے مخاطب ہوتے ہوئے)

مطربہ ہم کو کوئی کیف بھرا گیت سناؤ
جس کے سننے سے ہمیں گم شدہ راحت مل جائے
مطربہ! اپنے گلے کا وہ حسیں نور پلاؤ
جس کے پینے سے ہمیں خواب کی جنت مل جائے

شعلہ رخ:
آرزو نیند کی ہے کیا سرکار؟
ابھی برسا ہی نہیں ابرِ خمار
کیا ستمن دیکھ رہے ہو بیکار
نغمہ آرا سے کہو لائے ستار

ستمن:
ابھی حاضر کئے دیتا ہے غلام
اور بھی کچھ زر و بادہ و جام؟

اورنگ:
اب نہیں، آج بہت پی ہم نے
پھر بھی چھوڑا نہیں سوزِ غم نے
یہ حسیں دام بہت ٹوٹے ہیں
بادہ و جام بہت چھوٹے ہیں

ستمن:
حکمِ عالی کو بجا لاتا ہوں
نغمہ آرا کو بلا لاتا ہوں

(چند لمحے سکوت۔ شعلہ رخ اور اورنگ دونوں انتظار اور سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ نغمہ آرا کو لے کر ستمن داخل ہوتا ہے۔ گھنگھروؤں کی آواز اس کے آنے کی غماز ہے)

اورنگ:
عشرتِ شب بکھیرنے والی
روح کے تار چھیڑنے والی
چھیڑ وہ ساز جس سے آگ لگے
زندگی جس کا راگ راگ لگے
کب سے بے خواب ہوں خبر بھی نہیں
اور اس رات کی سحر بھی نہیں

(ستار چھڑتا ہے اور اس کے ساتھ مطربہ کی آواز بلند ہوتی ہے)

نیند کی پری!
نیلے ستاروں کے پہلو سے لوٹ بھی آؤ
آؤ آؤ، رنگ اڑاؤ، جام پلاؤ
خواب محل کے پُر افسوں دروازے کھولو
شاہ کی جلتی آنکھوں میں رس ایسا گھولو

اک اک لے کے آنچل میں رنگ بھر دو
دھیرے دھیرے چپکے چپکے رقص کر دو
زندگی بن کر

شعلہ رخ (سرگوشی میں)
چشم و ابرو سے سب شگفتیں چھن گئیں
خواب کی اپسرا چاروں جانب کھو گئیں
ساحرہ خواب کی چھب دکھا ہی گئی
ایک بے خواب کو نیند آ ہی گئی

سمن (طنزاً)
"ایک بے خواب کو نیند آ ہی گئی"!

شعلہ رخ (سمن کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے):
ہو چکا نم بہت ہر خم زلفِ شب
نغمہ آرا! سنو، جاؤ سو جاؤ اب

نغمہ آرا:
اور کیا آپ جاگیں گی، اس رات بھی!
رات خود بستر خواب پر جا چکی

شعلہ رخ:
جاگنا تو مری جاں مرا فرض ہے

سمن (طنزاً):
"جاگنا تو مری جاں مرا فرض ہے"

نغمہ آرا (مسکراتی ہوئی):
الوداع اے سمن!
شب بخیر اے بہن!
(نغمہ آرا چلی جاتی ہے)

سمن: (پھر طنزاً)
"جاگنا تو ...."

شعلہ رخ (چونک کر):
چپ رہو، یہ صدا بے محل تا بکے!

سمن:
چپ رہا، چپ رہا، آج تک چپ رہا
دل کی ہر چوٹ کو مسکرا کر سہا
چاندنی داغ در داغ ہوتی رہی
روشنی قید در قید سوتی رہی
زندگی لاش پر لاش روتی رہی
موت اک بار میں سر پہ ڈھوتی رہی

شعلہ رخ (گھبرا کر):
چپ رہو شاہ کی آنکھ کھل جائے گی
اور پھر اس جگہ موت در آئے گی

سمن (ہنستی ہے):
موت اور زیست میں کوئی پردا نہیں
اب مجھے موت کا کوئی خدشہ نہیں
یہ فضا موت ہے، یہ صبا موت ہے
میرے ماحول کی ہر ادا موت ہے
جاگتے جاگتے عقل پتھرا گئی
تم کو شاید کسی کی نظر کھا گئی
چپ رہو صبر سے ہر ستم کو سہو
جاؤ تم میرے محبوب ہو خوش رہو سو رہو
شام تنہائی یادوں کے میلے سہی
آج کی رات پہرا اکیلے سہی
جب فسوں رات کا ختم ہو جائے گا
چاند واپس چناروں میں کھو جائے گا
میں نسیم سحر کی طرح آؤں گی
تم کو اپنی مہک سے جگا جاؤں گی

سمن:
ہم نسیم سحر کی مہک پا چکے
پیار کے پھول کھلنے کے دن جا چکے
زندگی ایسے کیا آنکھ جھپکائے گی
اب ہمیں موت ہی نیند لوٹائے گی

شعلہ رخ:
ذہن کس سحر میں مبتلا ہو گیا
کون جانے تمہیں آج کیا ہو گیا

سمن:
یہ مرا باپ وہ ایک پیر کہن
وہ مری پاک ماں، وہ کنواری بہن
آج گرد و غبار مہ و سال میں
کون جانے ہیں اس وقت کس حال میں

سمن:
چپ ہو اور جگ گردش بدلنے لگا
چپ رہو میرا سینہ بھی جلنے لگا

سمن:
چپ رہوں، چپ رہوں، تابکے چپ رہوں
خیر میں چپ ہوں لیکن یہ آوازیں!
سیلِ بارانِ برق و بلا روک دو
روک سکتی ہو تو یہ صدا روک دو
(پس منظر میں بادلوں کی گرج بجلی کی کڑک)

ندا:
کوئی ویرانہ کوئی سمن زار یا کوئی صحرا سہی
گر چناروں کا سایہ نہیں تو لہو کا اجالا سہی
بیکراں تیرگی کی قسم بیکراں روشنی چاہیے
یا ہمیں گوشۂ قبر یا وسعتِ زندگی چاہیے
(یہ آواز ڈوبتے ہی دوشیزاؤں کا کورس):
آزادی او آزادی!
رنگ برنگے پھولوں کی او شہزادی
ہیں تیرے دیوانے ہماری ہر وادی
آزادی او آزادی!
ہم نے اس کو اپنے آنسو بخش دیئے
نیلی جھیلیں، اودے چشمے سرخ ہوئے
آخر کب تک بربادی؟
آزادی او آزادی
تیرے نغمے چھیڑ رہے ہیں ساز نئے
ہم تیرے قرباں ہمیں آواز تو دے
ناشادی ہے ناشادی!

کشمیر

ر کا وہ حصہ جو آزادی کی نعمت سے بہرہ‌ور، شاہراہ
ی پر گامزن اور حقیقی معنوں میں جنت نظیر ہے

کشمیری مہاجر، آزاد ماحول میں

وٹ کالج : جسے حکومت آزاد کشمیر نے ترقی تعلیم کے لئے
قائم کیا ہے

مشینی ذرائع سے کاشتکاری کی روزافزوں ترقی

فطرت کی طرح آزاد

آزاد جہلم

نیر کنول کا دیس

هستم اگر میروم ـ گر نه روم نیستم ،،

،، کشتی باندھو رے کنار دریا ،،

علی‌الصباح که مردم به کار و بار روند

سکون

حرکت

آزادی اور آزادی

ندا: (بلند آہنگ میں)

خون میں تر ہوئی سنانِ شفق
رات سورج کو قتل کر آئی
اور پھر اس کے خون سے اپنے
اندھے شیشوں کو جا کے بھر آئی
چاند تاروں میں روشنی کب تھی
ان میں سورج کا خون دہکتا ہے
قطرہ قطرہ دھنویں کی چادر سے
روشنی کا لہو ٹپکتا ہے
(گھن گرج آواز میں مردوں کا کورس)
ہم اندھیروں سے جنگ آرا ہیں

یہ لہو یہ لہو ہمارا ہے
ہم سے روشن ہر اک ستارہ ہے
ہم سے ہر تیرگی پگھلتی ہے
ہم سے سورج کی آگ جلتی ہے

ہم کہ خود آگ ہیں شرارہ ہیں

بن نہیں سکتے اپنی راہ کی آڑ
سنگ در سنگ تیرگی کے پہاڑ
ہم اندھیروں میں کود جائیں گے
اپنے سورج کو ڈھونڈ لائیں گے

پگھلے شعلوں کا تیز دھارا ہیں

غربت و رنج و بیکسی کب تک!
سیلِ طوفانِ تیرگی کب تک؟
موت کی نیند سونے والے ہیں
سب ستم خاک ہونے والے ہیں

موت ہم موت کا اشارا ہیں
ہم اندھیروں سے جنگ آرا ہیں

(پس منظر موسیقی کے ساتھ تیز ہو کر سکوت میں تحلیل ہو جاتی ہے)

ستمن:

یہ کڑک ظلمتِ شب ٹوٹ رہی ہو جیسے
جلوہ در جلوہ سحر پھوٹ رہی ہو جیسے
یہ گرج جیسے گجر موت کا بجتا جائے
سایہ سنگین اندھیروں کا سمٹتا جائے

شعلہ رخ:

چپ رہو ویسے ہی اس شور سے بیزار ہوں میں
ہائے کس کرب و مصیبت میں گرفتار ہوں میں

ستمن:

رنگ محلوں میں کہاں کرب و مصیبت کا گزر
کہ یہاں رات بھی ہے جلوہ بداماںِ سحر
در و دیوار پہ اڑتا ہوا تاروں کا غبار
چاندنی کی کبھی بارش کبھی کرنوں کی پھوار
رقص کرتے ہیں شراروں کی طرح شعلہ شکار
مشعلیں شب کو جلاتے ہیں یہاں شمس عذار
کہکشاں زاد ہے یہ جنتِ افسانہ و خواب
بند ہے شیشے میں سورج تو سبو میں مہتاب
شمع دانوں میں ستاروں کو چنا ہو جیسے
یہ شبستاں کہ کوئی خواب سنا ہو جیسے

(لمحہ بھر توقف)

کتنی کلیوں کی مہک خاک ہوئی، لٹ چکی باس
لبِ عفریتِ ہوس پر ہے ابھی تک وہی پیاس
جب بھی بستر سے شکن کوئی لپٹ جاتی ہے
رنگ ہونٹوں کا، حنا ہاتھوں کی گھٹ جاتی ہے
کتنی شمعوں سے یہ فانوسِ طرب روشن ہے
صبحِ خنداں کی طرح دامنِ شب روشن ہے
تیرگی اور گناہوں کی مجسم روداد
اُف یہ فرعون، یہ شداد، یہ عفریت نژاد

شعلہ رخ

چپ رہو شاہ کی آنکھوں سے اچٹنے لگی نیند
دیکھو پلکوں کے حجابوں کو الٹنے لگی نیند
شاہ کی تیوری پہ بل، چہرے پہ کرب ہے
ایسا لگتا ہے کوئی خواب ابھی دیکھا ہے
یہ سیہ پلکیں جو پہلے سے سوا گہری ہیں
کسی دیوار کے سائے کی طرح ٹھہری ہیں
لیکن ابرو کی کماں میں جو کھنچی جاتی ہیں
ظلمتیں اور بھی کچھ گہری ہوئی جاتی ہیں

(اورنگ بستر خواب پر گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے)

اورنگ:

خواب تھا کس قدر بھیانک خواب
ہر طرف اک صدا "عذاب عذاب"!
پیچ کھاتے ہوئے دھنویں کے ناگ
آن گنت مرگھٹوں کی کالی آگ
ہر طرف اک سنان شعلوں کی
صد جہنم زبان شعلوں کی
بھوت ظلمات کا کفن پہنے
موت شعلوں کا پیرہن پہنے
از زمیں تا بہ آسماں دریا
پگھلے شعلوں کے بیکراں دریا
ایک طوفانِ برق اٹھاتے ہوئے
لاوے، شعلے، شرار اڑاتے ہوئے
گڑگڑاتے ہوئے تڑپتے ہوئے
ہڈیوں کی طرح چٹختے ہوئے
وحشیوں کی طرح اچھلتے ہوئے
جھلسی لاشوں کے ڈھیر اگلتے ہوئے
جن میں کچھ ارتعاش ہے نہ ثبات
جن کا مقسوم موت ہے نہ نجات
جو جلیں، راکھ ہوں بکھر جائیں
اور پھر راکھ سے ابھر آئیں!

(ایک لمحے کے بعد ہوش سنبھال کر)

شعلہ رخ! میرے پاس تو آؤ
مجھ کو میرا یقین لوٹا دو
مشعلیں مشعلیں جلا ڈالو
تیرگی ... تیرگی .... مٹا ڈالو

تاکہ ہر عطر کو دیکھ پاؤں میں
اس جنم سے لوٹ آؤں میں
(محل کی روشنی تیز کر دی جاتی ہے۔ شعلہ رخ
اورنگ کے ماتھے پہ اللہ رکھ دیتی ہے)

کتنی منحوس تھی یہ رات مجھے
تم کو چھو کر ملی حیات مجھے
خواب تھا خواب، یہ حقیقت ہے
یہ مرا قصر، میری جنت ہے

تخت میرا ہے تاج میرا ہے
ساری دھرتی پہ راج میرا ہے
میری تقدیر کی بہاروں کا
شکر ہے خوش نظر ستاروں کا

دوسری رات

اورنگ: سمن! سمن! تم کہاں چھپے ہو!
سمن: (سامنے آکر) غلام حاضر ہے بندہ پرور!
اورنگ: قریب آؤ وہاں پہ چپ چاپ کیوں کھڑے ہو
سنو کہ ہم سارا دن رہے ہیں اسی مسلسل عذاب میں گم
ہمارے قلب و دماغ اب تک ہیں اس جہنم کے خواب میں گم
کہ جس کے شعلوں کی آنچ اب تک ہمارے تن من کو ڈس رہی ہے
یہ کیسی سیال آگ ہے جو ہماری نس نس میں رس گئی ہے
تم ایک اختر شناس کا ذکر مجھ سے کرتے رہے ہو اکثر
کہاں ہے وہ روشنی کا چشمہ، کہاں ہے وہ آنسوؤں کا پیکر!
سمن: وہ جو لشی خوابِ آرزو کی طرح حسیں ہے
وہ شعلہ رخ، برق اندام، مہ جبیں ہے
اڑا ہوا ہو ردائے مہ پر غبار جیسے
سنہرے شانوں پہ بال، چاندی کے تار جیسے
بھنویں کہ جیسے جمی ہوئی برف پر شعاعیں
روپہلی پلکیں کہ ماہ و انجم کی خواب گاہیں
وہ دیپ مالا جو لعل و یاقوت سے بنی ہے
کہ جانے کن احمریں ستاروں کی ست لڑی ہے
سنہرے ہاتھوں میں کہکشاں کے کڑے پڑے ہیں
نگاہ میں مشتری و ناہید چپ کھڑے ہیں
وہ جس کے ہاتھوں سے دامنِ آسماں نہ چھوٹا
وہ ایک ساحر ہے جس کا جادو کبھی نہ ٹوٹا
اگر عطارد کا خون کر دے تو قلبِ مریخ چیر پھینکے
وہ ایک ناوک فگن ہے جو آسماں نژادوں پہ تیر پھینکے
ردائے ثابت، قبائے سیارہ، سب کو پوروں سے کھینچتا ہے
وہ اک شکاری ہے جو کمندیں فرازِ انجم پہ پھینکتا ہے
جو سالہا سال، قرنہا قرن کی فضاؤں سے آشنا ہے
ہر ایک لمحے، ہر ایک ساعت کی اپسراؤں سے آشنا ہے
وہ اپسرائیں جو آشنائے قفس نہیں ہیں
جو صرف پرچھائیاں ہیں آنکھوں کا رس نہیں ہیں
اورنگ: سفینہ راں ہے جو آبجوئے نجوم میں وہ خدا کہاں ہے؟
مجھے بتاؤ ستارہ ایجاد علم کا دیوتا کہاں ہے؟
سمن: افق کی نیلم فروز پہنائیوں سے تھک کر نہ مڑنے والا
وہ گردشِ ماہ و سال کے برق رو کھٹولے پہ اڑنے والا
وہ ہر مہینے کی چودھویں شب کو ماہتاب کو چھوتا ہے
وہ چڑھتے دریا کی مست موجوں کے ہونٹ رہ رہ کے چومتا ہے
ہر ایک ذرے میں اس کے چہرے کا عکس ہوگا
وہ موجوں کے ساتھ ساتھ کل محوِ رقص ہوگا
مہک سے رشتہ تو کچھ تعلق اسے صبا سے
وہ رات کی رات لوٹ جائے گا اس فضا سے
اورنگ (مضطرب ہوکر)
کسی طرح تم بھی کل سمن اس کے پاس جاؤ
اسے خدا کے لئے ہمارے حضور لاؤ
سمن: وہ خواب آسا حسین موجوں کی انجمن میں
گزرتا ہے یوں کہ جیسے لگتی ہو آگ بن میں
میں اس کے نزدیک بن جلے کیسے جا سکوں گا
میں اس ستارہ خرام کو کیسے پا سکوں گا
اورنگ: (انتہائی جذباتی ہوکر)
ہمارے اورنگ کی قسم ہے
وفا کے آہنگ کی قسم ہے
اسے یہاں تک ضرور لاؤ

ہمارے اس تخت کو بچاؤ

سمن: (سر جھکا کر) غلام کوشش کرے گا آقا، مگر...

(تھال بجنے کی آواز)

اورنگ: کون؟

(ایک خادم داخل ہوتا ہے اور اشارہ پاکر زبان کھولتا ہے۔
کچھ پیامی قدمبوس ہونے کی خواہش میں بیتاب ہیں)

اورنگ: (طنزاً) سب کے سب طالع بد کی صورت اندھیروں میں
بے خواب ہیں
خیر ایک ایک کر کے انہیں بھیج دو
اور کچھ اہتمام طرب بھی کرو

(خادم چلا جاتا ہے اور پہلا پیامی اندر داخل ہوتا ہے)

اتنے نا وقت شب میں چلے آئے ہو
خیر تو ہے، کہو کیا خبر لائے ہو؟

پیامبر: سر پہ سایہ ہما کا، تو اقبال رشکِ ثریا رہے!
پرچم قصرِ شاہی بلند آسمانوں کو چھوتا رہے!

اورنگ: سن لیا، ہم قصیدے کے خواہاں نہیں، ہم کو پیغام دو
اور تم مطربہ! ہم کو بھر بھر کے مستی بھرے جام دو

جاں پناہ! آج کل قصرِ شاہی کے چاروں طرف رات ہے
ہر طرف اک دھواں، ہر طرف ایک طوفان ظلمات ہے
ایک طوفان جو مشرق سے مغرب تک
نت نئے درد سے نت نئے کرب تک
ہر فضائے قمر فام پر چھا گیا
سلطنت کے در و بام پر چھا گیا

اورنگ: (جل کر)
جاؤ، ہم سن چکے نحس روداد کو
دوسرے آنے والے کو آواز دو

(پیامی سلام کر کے چلا جاتا ہے اور دوسرا حاضر ہوتا ہے)

تم کہو، تم نوید مسرت کہ پیغامِ غم لائے ہو
تم بھی شاید کسی ڈر، کسی خوفِ باطل سے گھبرائے ہو

پیامبر: اے شکوہِ سلاطینِ صدر و نشیں!
اے جہاں بانِ فردوسِ روئے زمیں!

ہر طرف ناگ بن کر گلِ لالہ کو ڈس رہی ہے خزاں
پھول پتھر بنے، خار نشتر ہوئے، شاخیں شعلہ زباں
ہر طرف اڑ رہا ہے غم و درد کا زہر آگیں دھواں
سرخ تانبے کی صورت دہکنے لگا نیلمیں آسماں
آگ اگلنے لگیں گل بدامن، لہکتی ہوئی وادیاں
کوئی پتی، نہ کونپل، نہ کوئی کلی!
آج جو شاخ تھی سر برہنہ ملی!

اورنگ: تو ہمیں اس سے کیا! گر زمانے کے کل باغ ہو جائیں بن
مسکراتے رہیں اس حسیں قصر کے خوبصورت چمن

پیامبر: جاں پناہ! آگ ویرانیوں کی اگر یونہی بڑھتی رہی
قصرِ شاہی کے رنگیں چمن کی بھی تصویر ہوگی وہی!

اورنگ: (انتہائی غصے میں)
چپ رہو، چپ رہو، کج نوائی کی حد ہو چکی
دور ہو جاؤ دیکھیں نہ اب تم کو نظریں مری

(پیامبر سہم کر چلا جاتا ہے۔ پس منظر میں سازوں کی ہلکی ہلکی
رندھی رندھی آواز)

اورنگ (خود سے، عالم اضطراب میں)
کیسی منحوس و مسموم یہ رات ہے!
زہر سے تلخ تر آج ہر بات ہے
شکریں لب نہیں
جو مجھے شہد سے لب بہ لب جام دیں
ہیں کہاں وہ حسیں
جو مجھے کیفِ تازہ کا پیغام دیں
پردۂ خواب پھر ذہن پر ڈال دو
مطربہ! لاؤ پھر برقِ سیال دو

(وقفہ)

چاند گہنائے سورج سیہ ہو گئے!
زندگی کے اجالے کہاں کھو گئے؟
ہم بھی سورج تھے ہم بھی سیہ ہو چلے
وقت کی گرد اور خاک میں کھو چلے

(وقفہ)

(انتہائی جذباتی اور روحانی آواز میں)

جھوٹ ہے جھوٹ ہے یہ گماں جھوٹ ہے
یہ فضا یہ سماں یہ دھواں جھوٹ ہے
یہ زمیں جھوٹ ہے آسماں جھوٹ ہے
کیا کہا دولتِ خسرواں جھوٹ ہے؟
کون پاگل ہے یہ، اس کا منہ نوچ لو
قید کر لو اسے، آگ میں جھونک دو
قید کر لو اسے .... آگ میں ....

(بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے)

تیسری رات

اورنگ، سحر سے لے کر نزولِ شب تک دبیز پردوں میں گم رہے ہیں
ہم اپنے ادراک کے گرانے ہوئے حجابوں میں گم رہے ہیں
وہ وعدہ تم نے وفا کیا ہے؟
کہو نجومی سے مل کے پیغام ماہ دولت کا دے دیا ہے!

سمن: غلام تعمیل کر چکا ہے
فضا میں جب رقص روشنی کا شروع ہوگا
وہ چاند کے ساتھ ہی محل میں طلوع ہوگا

اورنگ، (خوشی بھرے لہجے میں)
وہ آئے گا، واقعی وہ آئے گا کیا محل میں
جہاں اندھیروں کا رخ بدل دے گا ایک پل میں!

سمن، ورودِ ماہِ نور ہوگا

اورنگ، تمہاری خدمت نے ماہ دولت کو خوش کیا ہے
کہو تمہاری وفا شعاری کا کیا صلہ ہے؟

سمن، جہاں پنہ کا غلام پر یہ کرم بہت ہے
بسیط دریا کے چند چھینٹوں کا غم بہت ہے
مگر لہو جو وطن کی شہ رگ سے بہہ رہا ہے...

اورنگ، (بات کاٹ کر)
لہو، لہو! یہ لہو کہاں ہے
ہماری وادی کا یہ بھی اک چشمۂ رواں ہے
اسی سے تازہ ہیں شہریاری کے باغ اب تک
اسی سے روشن ہیں سلطنت کے چراغ اب تک
جو ہڈیوں سے بنے گا مضبوط تر وہ سنگیں حصار ہوگا
لہو سے بنیاد جس کی اٹھے گی وہ محل پائدار ہوگا
لہو کا طوفان روکنے سے بڑھا تو ہے کم نہیں ہوا ہے
کبھی بغاوت کے سامنے سلطنت کا سر خم نہیں ہوا ہے

(وقفہ)

(انتہائی غیظ میں)
محل کے چاروں طرف کھنچی خندقوں کو لاشوں سے پاٹ دیں گے
جو ہاتھ اٹھیں گے توڑ دیں گے، جو سر نہ خم ہوں گے کاٹ دیں گے
(پس منظر میں بجلی کی دل ہلا دینے والی کڑک اور آنکھوں کو
جھلسا دینے والی روشنی)

صدا: روشنی! روشنی! روشنی!

اورنگ: (کرب آمیز لہجے میں)
یہ کیسی روشنی ہے جس کا طوفان
مری آنکھوں میں آ کر جم گیا ہے
یہ کیسی روشنی ہے جیسے سورج
سوا نیزے پہ آ کر تھم گیا ہے!
یہ کیسی روشنی ہے جس نے پل میں
مری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے
بصارت، او بصارت! تو کہاں ہے
مجھے یہ کس نے اندھا کر دیا ہے!
مجھے مہماں بلا کر بے رخی سے
مری جانب سے آنکھیں پھیر لی ہیں
لو آنکھیں کھول دو، اب روشنی کی
شعاعیں میرے دل میں چھپ چکی ہیں

(برق و باد کا اثر ختم ہوتا ہے۔ اورنگ آنکھیں ملتے ہوئے
ہوشیار ہو کر)

عجیب وحشت ہے، اپنے مہماں سے لڑ رہے تھے
سمن تم اتنے خموش تھے جیسے مر گئے تھے
طلسم و اعجاز و سحر تیری فسوں نگاہی
خوش آمدید اے ستارۂ کہکشاں کے راہی

پسِ خلا رقص کرنے والے شہابِ روشن
بصد نظر دیکھتے ہوئے آفتابِ روشن
ہمیں بتا سیمیائی شمعیں پرکھنے والے
ہمیں بتا رقصِ ماہ و انجم سمجھنے والے
ہماری تقدیر کے سنہرے ستارے کس برج میں پڑے ہیں
ہم ان اندھیروں میں جن کی کرنوں کے منتظر دیر سے کھڑے ہیں
اندھیرے جن کے نکیلے پنجے ہمارے سینے میں جا گڑے ہیں

اخترشناس: سکوں سے بیٹھو، مجھے ہر اک اضطراب دے دو
جو دیکھتا ہوں، مجھے ذرا جامِ آب دے دو

(اورنگ کے اشارے پر تسمن پانی سے لبریز ایک بلوریں ساغر اخترشناس کو پیش کرتا ہے۔ وہ اس ساغر کو ہاتھ میں لے کر کچھ طلسمی الفاظ پڑھتا ہے۔ پانی میں تموج۔ ایک غبار سا اٹھتا ہے اور پانی کا رنگ بدلنے لگتا ہے)

اخترشناس: میں دیکھتا ہوں سنہرے تاروں کے برج تاریک ہو چکے ہیں
میں دیکھتا ہوں کہ قصرِ ذی شاں کے اونچے گنبد کھنڈر پڑے ہیں
رو پہلی کرنوں کی تاج پہیاں چلی گئیں ساز و دف اٹھا کے
سیاہیوں کی ردا گرا کے، دیئے دیئے کی چمک بجھا کے
فضائیں سنگیت کی پریشان ہو چکی ہیں
وہ رنگ پرور سبھائیں ویران ہو چکی ہیں

اورنگ: فضا محل کی غمِ خزاں سے دھواں دھواں تھی
ہمارے ظلمت کدے میں یہ روشنی کہاں تھی
تری نگاہوں میں کہکشاں کے چراغ روشن
فضائے کہسار و دشت و صحرا و باغ روشن
رموز و اسرار، رازِ پنہاں سے آشنا تو
ازل سے اس خاکدانِ گرداں سے آشنا تو
ہماری شامِ حیات بھی روکشِ سحر ہو
ہماری قسمت کے آئینے پر بھی اک نظر ہو

اخترشناس: میں وقت کے بیکراں سمندر کا اک شناور
سمجھتا ہوں خوب تیز موجوں کے تیز تیور
نئی ہوائیں پرانے دھاروں کو موڑ دیں گی
یہ تیز موجیں حصارِ ساحل کو توڑ دیں گی

اگرچہ تقدیر نیلے برجوں میں جھومتی ہے
زمین کے دائرے پہ تاریخ گھومتی ہے
سنہرے تاروں میں سرخ انگارے دیکھتا ہوں
میں گھٹتے بڑھتے عظیم سیارے دیکھتا ہوں
نئے ستارے نئے افق پر چمک رہے ہیں
پرانے براق برج تاریک ہو چکے ہیں
سلجھنے والی حیات کی گتھیاں ہوں جیسے
جفا شعاروں کی آخری ہچکیاں ہوں جیسے
جو دائرہ، ارتقاء کی تکمیل چاہتا ہے
وہ نقطۂ اولیں کی جانب پلٹ رہا ہے
پھر ارتقاء معرضِ ازل سے گزر رہا ہے
افق سے خورشیدِ آفرینش ابھر رہا ہے
فضائے تاج و علم کا ہر رنگ اڑ رہا ہے
کنارِ تاریخ حدِ آخر سے مڑ رہا ہے
کمال، برجِ زوال میں جان کھو رہا ہے
غلام انسان پھر سے آزاد ہو رہا ہے

(لمحہ بھر کا وقفہ اور پھر تیزی و اضطراب کے ساتھ)

عجیب عالم میں بزمِ افلاک دیکھتا ہوں
قبائے سیارگاں کو صد چاک دیکھتا ہوں
اندھیرا مریخ کی جبیں پر
لہو عطارد کی آستیں پر
شررِ غضب ناک مشتری کے مژہ پہ رقصاں
وہ زہرہ سیماب پا، سراسیمہ، شعلہ افشاں
اور اس طرف خاکدانِ ہستی
کہ کوئی آتش فشانِ ہستی
جو اپنے تاؤ میں جل رہا ہے
تہوں میں لاوا ابل رہا ہے
لہو کی جو بوند خاک میں جذب ہو رہی ہے
وہ نت نئی آگ کے لئے ضرب ہو رہی ہے
میں دیکھتا ہوں ملوکیت کا نصیب تاریک ہو رہا ہے
میں دیکھتا ہوں کہ قبر میں تاج، تخت اک غار میں پڑا ہے

اورنگ: (عالمِ خیال میں)

خوش ہو جاؤ، دور ہو جاؤ، بھاگ جاؤ

اخترشناس: (جاتے ہوئے)

میں جا رہا ہوں مگر تم اپنا محل بچاؤ

(اخترشناس غائب ہو جاتا ہے۔ اورنگ پر خوف طاری ہو جاتا ہے اس اضطراب میں وہ شعلہ رخ کو آواز دیتا ہے)

مطربہ! جام دو
اور اک جام دو
اور دو، اور دو
گردشِ وقت سے تیز تر جام دو
یہ نجومی ہمیں جانتا ہی نہیں
عظمتِ جبر کو مانتا ہی نہیں
ہم کہ خود جلوہ سامانِ تقدیر ہیں
ہم کہ خود اپنی عظمت کی تصویر ہیں
زلزلے آندھیاں، کچھ نہیں خاک ہیں
ہاں ہمیں قادرِ خاک و افلاک ہیں
نقش ہیں ہم جبینِ مہ و سال پر
سایۂ صد ہما فرقِ اقبال پر
یہ زمیں ہے قدمبوسیوں کے لئے
آسماں سرنگوں ہیں ہمارے لئے
گھول دو وسوسے بادۂ رنگ میں
وقت کو مات دیں خون کی جنگ میں

(وقفہ)

کوئی ہے، اس پیامی کو آواز دو
جس نے وعدہ کیا تھا ہمیں، آج وہ
اک بتِ مہ جبیں نذر کو لائے گا
جس سے ایوانِ شب جگمگا جائے گا
غنچۂ دل خوشی سے چٹک جائے گا
بسترِ شاہی جس سے مہک جائے گا
جلد حاضر کرو اس حسیں پھول کو
دور! آغوشِ ویراں کی تنہائیو

تلخیوں کو نیا ذائقہ چاہئے
بادۂ چشم و لب کا نشہ چاہئے
گیسوؤں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر
ما بدولت تراشیں گے قصرِ سحر

(حکم ہوتے ہی ایک غلام سر سے پاؤں تک لبادے میں لپٹی ہوئی ایک دوشیزہ کو لے کر حاضر ہوتا ہے)

پیامبر: لیجئے رشکِ شعلہ رخاں آگئی
لیجئے رونقِ کہکشاں آگئی
یہ حسینہ، یہ شہزادیٔ قلب و جاں
آج کی شب کنیزِ شہِ خسرواں
مہر سے روشنی چھین لایا ہوں میں
چاند سے چاندنی چھین لایا ہوں میں
پیکرِ نشہ و خواب لایا ہوں میں
نذر کو بنتِ مہتاب لایا ہوں میں

اورنگ: سرو قد اک بتِ نکہت و نور ہے
ما بدولت کو یہ نذر منظور ہے
طشت انعام دو موتیوں سے بھرے
تخلیہ ....
تخلیہ — کیا سخن تم نہیں جاؤ گے!

(سب چلے جاتے ہیں پیمن پردے کے پیچھے چھپ جاتا ہے)

اورنگ: (دوشیزہ سے مخاطب ہو کر جو بے حس و حرکت کھڑی ہے)

آؤ اے گم شدہ زیست کی عشرتو!
آؤ اے زلف و رخسار کی جنتو!
یہ شبستانِ عشرت پریشان ہے
ما بدولت کی آغوش ویران ہے
رات بھر بادۂ چشم و لب تو پئیں
کون جانے سحر تک مریں یا جئیں
آؤ نزدیک آؤ، حیا چھوڑ دو
— تم نہیں مانتیں، خیر یونہی سہی
چھین لی نارِوا — ہا ہا ہا ہا
اب کہو کیا رہی!

دوشیزہ : میں نہیں — آہ ! میں ...

(فرطِ حیا سے چیخ اٹھتی ہے۔ سمن چیخ سن کر پردے سے باہر آجاتا ہے۔ دوشیزہ کو پہچان کر خود بھی چیخ پڑتا ہے)

سمن : کون تم؟ تم یہاں! میری پیاری بہن

دوشیزہ : ہاں سمن، اے اندھیرے میں روشن کرن

سمن : تم کہاں اور گناہوں کی محفل کہاں؟
تم یہاں، تم یہاں، غیرتِ حوریاں!
کیا مرے باپ کو سانپ نے ڈس لیا؟
کیا مری ماں کو نذرِ اجل کردیا؟
گھر میں کیا کوئی بھی اہلِ غیرت نہ تھا؟
کیا کوئی جاں نثارِ حمیت نہ تھا؟
چھین لے او خدا! روشنی چھین لے
میری آنکھوں سے تابندگی چھین لے

دوشیزہ : (پُر اضطراب حزنیہ لہجے میں)
تم محل میں بسے ہو تمہیں کیا خبر
کس کی غیرت مٹی اور کس کس کا گھر
بستیاں جو کبھی رشکِ فردوس تھیں
سب جفا کار فرعون نے لوٹ لیں
گھر کہاں اب فقط راکھ کے ڈھیر ہیں
موت کی نیند سوئے ہوئے شیر ہیں
خنجروں سے زبانِ وطن سی گئے
بھیڑیئے عصمتوں کا لہو پی گئے
ہاں، تہہِ تیغ ہر ایک گردن ہوئی
ہر وطن دوست کی موت دشمن ہوئی!
لاشیں بے گور تھیں، دھوپ میں جل گئیں
سولیوں پر ٹنگی ہڈیاں گل گئیں
باپ کے سر کا پتھر مجھے یاد ہے
ماں کے سینے کا خنجر مجھے یاد ہے
ایک جلاد نے دار پر کس دیا
ایک صیاد نے سب کا خوں پی لیا
(وقفہ)

میں بھلا بیچتی غیرتِ خانداں!
یہ درندے مجھے کھینچ لائے یہاں
تاکہ مارِ ہوس کی غذا بن سکوں
اور بے غیرتی کی چتا میں جلوں
میں مگر اہلِ غیرت کی اولاد ہوں
میں تمہاری بہن پاک بنیاد ہوں
آؤ تکمیل شانِ برادر کرو
میرے سینے میں پیوست خنجر کرو
— تم نہیں کرسکے! دو یہ خنجر مجھے
دیکھ لو مشکِ خوں سے معطر مجھے
(بجلی کی طرح لپکتی ہے اور سمن کا خنجر چھین کر اپنے سینے میں اتار لیتی ہے)

سمن : (چیخ کر) آہ! یہ کیا کیا؟
میری ہمشیر معصوم یہ کیا کیا؟

دوشیزہ : (نزع کی حالت میں)
امتحاں میری غیرت کا پورا ہوا
(مسکرا کر دم توڑتے ہوئے)
لو شبِ آرزو کی سحر ہوگئی

سمن : (عالمِ غیظ میں)
آہ! میرے گھر کی شمعِ آخری
تیزیٔ بادِ ہوس سے بجھ گئی
یہ لہو، میرا لہو، میرے اب وجد کا لہو
یہ ترے بلور کے ساغر، ترے جام و سبو
ان میں اب خوں کے بجائے زہر گردش کھائے گا

اورنگ : (گرج کر)
ما بدولت سے یہ اندازِ کلام
اے وفا دشمن غلام ابنِ غلام
دور ہو جا اور اپنی موت کو دعوت نہ دے
ما بدولت کے کرم کو جبر کی صورت نہ دے

سمن : آج اے عظمت مقام
جاگ اٹھا ہے غلام

آج سے یہ صبح و شام
خونِ شاہی سے بنیں گے لالہ فام
اے ہمارے خون سے تعمیر ایواں کے مکیں
تو بھی ہو جائے گا میرے ہاتھوں پیوند زمیں
آج کی شب تو نہیں یا میں نہیں

اورنگ: (گھبرا کر) ہے کوئی۔ جلد دوڑو۔ بچاؤ

(سمن خنجر نکال کر حملہ آور ہوتا ہے۔ مگر اس کا وار خالی جاتا ہے۔ ایک خادم اس کی پشت میں تلوار بھونک دیتا ہے۔ ایک کھٹا کا۔ ایک آہ اور سمن کے گرنے کی آواز)

شاباش وفادار محافظ شاباش!
تم اپنے خداوند کے کام آئے ہو

شعلہ رخ: (ناگہاں داخل ہو کر، چیختی ہوئی)
حیف سفاک، ستم گر، ظالم!

(خنجر گھپنے کی آواز جو شعلہ رخ محافظ کی پشت میں اتار دیتی ہے)

اورنگ: مطرب۔ ٹھہرو۔ ارے، آہ. بچارا خادم!
شعلہ: یہ لہو! یہ لہو! آہ یہ کیا کیا؟
سمن: زیست نے ساغرِ آخری پی لیا!
الوداع جانِ من . . .

شعلہ رخ: تم اکیلے نہیں جا سکو گے سمن!
میں بھی ہمراہ ہوں، میں بھی ہمراہ ہوں
یہ جو خنجر تمہیں چھین کر لے چلا
ہاں یہی ہے مرے درد کی بھی دوا

(سمن کے سینے میں پیوست تلوار نکال کر اپنے سینے میں پیوست کر لیتی ہے)

سمن (کراہتے ہوئے) شعلہ رخ! آہ تم! شعلہ رخ!!
رائیگاں تو نہیں جا سکے گا یہ خوں
یہ رگیں کھنچ رہی ہیں کہ بندِ فسوں
دم بہ دم تار ہائے نفس کٹ چلے
سب اجالے نظر سے پرے ہٹ چلے
میرے محبوب اندھیروں کا طوفاں بڑھا
سایۂ مرگ آنکھوں پہ چھانے لگا
میری گردن میں باہیں حمائل کرو
مجھ پہ آساں محبت کی منزل کرو
میرے نزدیک ہو، اور نزدیک ہو
تاکہ روشن یہ دنیائے تاریک ہو
ہے جلائے ہوئے اب بھی بجھتے دیئے
زندگی بوسۂ آخری کے لئے!

(دونوں ہم آغوش ہو کر دم توڑ دیتے ہیں۔ اورنگ پہلے لاشوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ پھر خوف زدہ ہو کر وحشت سے چیخنے لگتا ہے)

محافظو، پہرے دارو آؤ
یہ لاشیں لے جاؤ، دوڑو، آؤ
یہ سر بریدہ، یہ دیو قامت
ہمہ عقوبت، ہمہ قیامت
مجھے کچلنے کو بڑھ رہے ہیں
لہو کے طوفان چڑھ رہے ہیں
میں جل رہا ہوں میں مر رہا ہوں
میں خاک ہو کر بکھر رہا ہوں

(دم توڑ دیتا ہے۔ پس منظر میں رزمیہ نغموں کی آواز ابھرتی چلی جاتی ہے)

ہم اندھیروں سے جنگ آرا ہیں۔

(پردہ)

ثقافت:

بلوچی ظروف پر نقوش

ابو الجلال ندوی

بلوچستان میں بھی کچھ قدیم آثار ملے ہیں جن میں ہمارے موضوعِ بحث کے لحاظ سے بلوچستانی ظروف اہم ہیں کیونکہ ان پر سندھی مہروں سے ملتے جلتے نقوش ہیں۔ ان پر بحث کرنے سے پہلے ان یادگاروں کے ازمنہ کا دھندلا سا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر اسٹوارٹ پگاٹ کی کتاب پری ہسٹارک انڈیا ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

زمانہ	بلوچستان			سندھ اور پنجاب		
[illegible] ق م	رانا گنڈی ۱					
	رانا گنڈی ۲					
	رانا گنڈی ۳ الف	امری				
۳۰۰۰ ق م	رانا گنڈی ۳ ب	نندرا	کوئٹہ		ہڑپا ۱	
	رانا گنڈی ۳ ج	نال				
			کلی	موئن جو دڑو	ہڑپا ۲	چنہودڑو ۱
۲۰۰۰ ق م	تباہی		شاہی ٹمپ	تباہی	تباہی	تباہی
	رانا گنڈی ۴				ہڑپا ۳	چنہودڑو ۲ جھنکر
	تباہی					
	رانا گنڈی ۵					چنہودڑو ۳ جھنکر
					شمشیر راجن پور	
۱۰۰۰ ق م	مدفن مغل گنڈی	جیوزری	زنگیاں			

پروفیسر موصوف نے امری اور نندرا کے پانچ ظروف کے نقش دکھائے ہیں جن میں سے تین کے نقوش تو محض آرائشی ہیں۔ تین ظروف پر جن کی نقل آپ کے سامنے ہے، ااا جیسے نقوش ملتے ہیں۔ یہ نقوش سبائی رسم خط میں قرشت کا حرف سوم ہیں۔ اس کو شجر (درخت) کا حرف اول بھی کہہ لیجئے۔ اس کی اصل کیلئے دیکھئے ڈش ۳۳۳ پر ۳۳۳ یہ دراصل ایک درخت کی ٹہنی ہے۔

والٹرا ے فیرسروس نے اپنی کتاب "اکسکاویشن ایٹ کوئٹہ" میں انتھروپولوجیکل پیپرس امریکن میوزیم نیچرل ہسٹری جلد ۴۵ پلیٹ ۱۴ کا عکس دیا ہے۔ اس کی نقل اس شمارہ کے تصویری صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

اسی مصنف نے اس کتاب میں کوئٹہ کے چند اور ظروف کے بھی نقوش دکھلائے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔
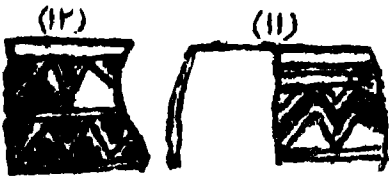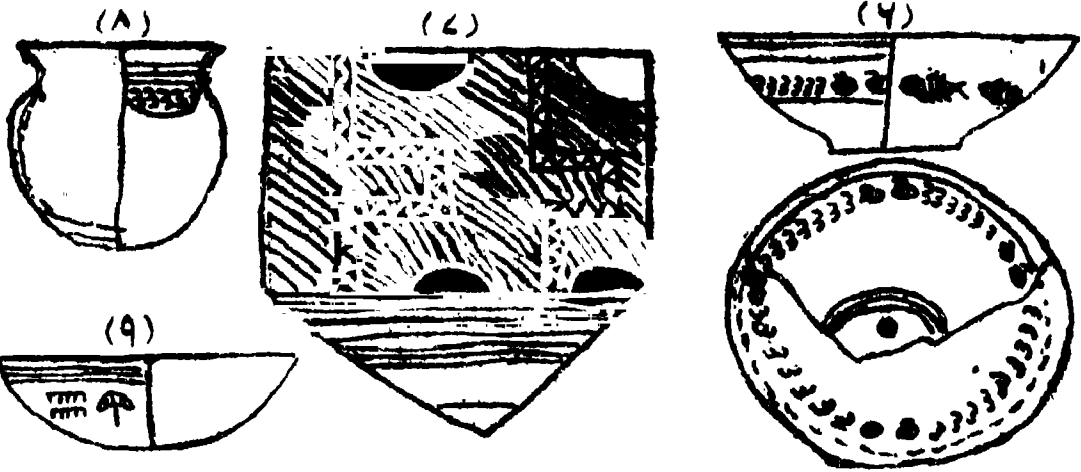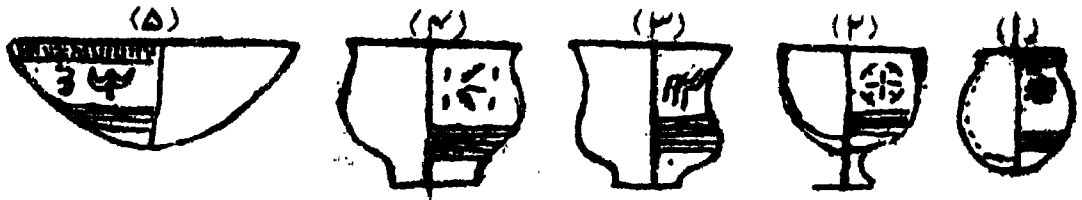
یہ دس ظروف فیرسروس سے نقل کئے گئے ہیں۔ ۱۱ و ۱۲ بھی کوئٹہ کے ظروف ہیں۔ ان کو پگاٹ کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے۔ ان کی قدامت پگاٹ کی تجویز کے مطابق ہڑپا کی ابتدائی آبادی کے زمانے تک پہنچتی ہے۔ ان کے بعد چند ظروف کلی کی نقل دیکھئے جن کو ہم پگاٹ سے نقل کرتے ہیں۔

پگاٹ نے سندھی نوشتوں اور حروف و نقوش پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ نوشتے (۱) ابجدی تو قطعاً نہیں ہیں (۲) ہڑپا اسکرپٹ اجنبی، بے قرابت اور بے نسل ہے (۳) ہڑپا اسکرپٹ کا مغربی ایشیا بلکہ کہیں کے بھی کسی معلوم و قدیم رسم خط سے قریبی ناتا نہیں ہے۔ یہ تو ہم عرصہ بعد معلوم کریں گے کہ کوئی نوشتہ ابجدی ہے یا نہیں لیکن ان ظروف کے نقوش میں تلاش کیجئے۔ مغربی ایشیا کے ابجدی حروف ملتے ہیں یا نہیں:

نمبر شمار	بلوچی نقش	حوالہ	جنوبی عرب کی مسند: نقش	نام	آواز	تبصرہ
۱	◻	ظرف پارہ ۲۳ X	◻	بیت	ب	نیز براہمی ب
۲	∧	ظرف پارہ ۴۴ TT	∧	جیم	ج	دیکھو ابن ندیم کا درفہ بیت الحکمہ، براہمی ga
۳	ᒣ	ظرف ۱۰	ᒣ	؟	؟	(Albert gamme W.F) کے نزدیک سبائی ن رومن n
۴	ᓗ	ظرف ۱۳	ᓗ	؟	؟	״ ״ ״ ״ براہمی آو
۵	Ƶ	ظرف پارہ ۹ ۱	Ƶ	؟	؟	״ ״ ״ ״ ״ ״
۶	D	ظرف پارہ ۴۷ WW				براہمی دھ، رومن ڈ
۷	Y	ظرف پارہ ۴۱ QQ	Y	ھا	ھ	
۸	ᓭ	ظرف پارہ ۳۹ OO				ک کی بدلی ہیئت
۹	⋈	ظرف پارہ ۲۵ Z	⋈		ز	
۱۰	Ψ	ظرف ۵	Ψ		ح	
۱۱	۞	ظرف ۲	.	.	.	فنیقی ط کی شکل ⊕
۱۲	S	ظرف پارہ ۱۷ EE	.	.	.	ظرف پارہ ۲۹ G، غالباً S ۱، رومن س عربی ک
۱۳	ᴧᴧ	ظرف ۱۲	.			مصری نو نو (پانی) ᴧᴧᴧ
۱۴	ᴧᴧ	ظرف پارہ ۱۱،۱۲	M	ماء	م	
۱۵	ᗰ	ظرف ۱۶				۱۱ کی بدلی صورت
۱۶	⋧	ظرف پارہ ۲۶ U				M کی بدلی صورت یا ⋧
۱۷	B	ظرف پارہ ۱۱ V	B	ماء	م	رومن ب
۱۸	B	ظرف پارہ ۱۱ T				
۱۹	N	ظرف پارہ ۹ J	N		ن	

۲۰	ᒥ	ظرف ۳۰	ᒥ		ن	
۲۱	XX	ظرف پارہ ۱۳ N				M سے مشابہ
۲۲	▽	ظرف پارہ ۲۲ V	△			ابن ندیم کے ورقہ بیت الحکمہ میں حمیری ᑐ ۲ البرٹ جم کے نزدیک سبائی عین
۲۳	ʘ	ظرف ۱۳ و ۱۵ و ۱۷	o	عین	ع	براہمی میں تھ کی صورت ʘ غالباً یونانی تھ تھی ۔
۲۴	ᑐ	ظرف پارہ ۲۵ DD				اُلٹ کر دیکھو P عبرانی قاف انگریزی پ
۲۵	w	ظرف ۲۵ ظرف پارہ ۱۲ M	w		ش	
۲۶	^v^	ظرف پارہ ۱۸ S	ᐅ		ش	
۲۷	≷	ظرف پارہ ۶ Q	≷		ش	
۲۸	3	ظرف ۵ و ۶ و ۸	3		ش	
۲۹	+	ظرف پارہ ۸ H	+	توار	ت	
۳۰	✕	ظرف پارہ ۳۰ FF	✖	״	ت	
۳۱	✳	ظرف پارہ ۲۸ CC				نقوش ۳۱ تا ۳۵ عربی اونٹوں پر ملیں گے
۳۲	⋇	ظرف پارہ ۲۷ AA				
۳۳	⋇	ظرف پارہ ۲۶ BB				
۳۴	X	ظرف پارہ ۱۵ P				
۳۵	᙭	ظرف پارہ ۱۴ O				
۳۶	T	ظرف پارہ ۶ F				رومن ت
۳۷	↑	ظرف پارہ ۱۱ K				رومن ن
۳۸	ᗰ	ظرف ۱۴/ ۱۶، ۱۸، ۱۹ P				فنیقی ᛊ
۳۹	⌣	ظرف پارہ ۴۲ RR				۲۵ کی بدلی صورت
۴۰	◢	ظرف ۱۸	◢			البرٹ جم کے نزدیک سبائی ض
۴۱	ᔭ	ظرف ۸	ᔭ		ر	براہمی د جس سے ہندی ढ بنی

اس جدول سے ظاہر ہے کہ جنوبی عرب کے قدما اپنے ابجدی نوشتوں میں جن نقوش سے کام لیتے تھے کوئٹہ میں وہ نقوش اس زمانہ سے صدیوں قبل مستعمل تھے جسے ہم قدیم سے قدیم سبائی نوشتے کا زمانہ قرار دے سکتے ہیں۔ سبائی رسمِ خط کو علمائے مغرب نے فنیقی رسمِ خط سے مستعار خیال کیا ہے اور فنیقی کو مصری سے۔ یہ ان کا خیال ہی خیال ہے۔ خود عرب اپنے قدیم رسمِ خط کو مُسنَد کہتے تھے جو لفظ سَند سے مشتق ہے۔ بلوچستان جنوبی عرب سے بہ نسبت فونیقیہ (سواحل شام) کے زیادہ قریب ہے۔ ہم کو بلوچی ظروف میں مسند کے ہو بہو نقوش ملے ہیں اسلئے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی کہ آنکھ موند کر یورپ کے قیاسی اور تخمینی فیصلہ ہی کو ٹھیک باور کیا جائے۔

ظرف پاروں اور ظروف ۱ تا ۱۳ کے نقوش جو حروف سے مشابہ ہیں ان کا جو بھی مطلب یہاں لیا جائے محض قیاسی ہوگا خود ان ظروف پر کوئی قرینہ کسی مطلب کی توثیق کرنے والا نہیں ہے لیکن ظرف ۱۲ تا ۱۸ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۱۔ ظرف ۱۲ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۷ کے جانوروں کی آنکھ دیکھو۔ ۱۴ میں بیل کی سینگوں کے درمیان اسی جانور کی آنکھ جیسا نقش ʘ

مکتوب ہے ۔ ۱۵ اور ۱۷ میں یہی نقش ایک شوشہ کے اضافہ کے ساتھ، جسے علامت تانیث قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا، ان گائے کے سینگوں کے درمیان مکتوب ہے۔ معلوم ہوا کہ (الف) ٥ کے معنی ہیں بیل (ب) ... کے معنے ہیں گائے ۔

۲۔ ۱۵ میں گائے کے سینگوں کے درمیان ۵ مکتوب ہے۔ قرآن میں ہے "مرد کے لئے دو عورتوں کے حصہ کے برابر" معلوم ہوتا ہے۔ قدیم بلوچی بھی ایک مرد کو دو عورتوں کا ہم وزن مانتے تھے چنانچہ یہی نقش بیل کے سینگوں کے درمیان دُہرا ... مکتوب ہے۔ معلوم ہوا کہ :

(ج) △ کے معنے ہیں گائے۔

(د) ... کے معنے ہیں بیل

۳۔ ۱۶ پر بیل کی کوہان کے پیچھے www مکتوب ہے۔ یہی نقش گائے کی کوہان کے پیچھے بھی ایک مزید نقش کے ساتھ مکتوب ہے اور یہ مزید نقش اس گائے کے تھن جیسا ہے اسے علامت تانیث قرار دیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ :

(ہ) WW کے معنے ہیں بیل

(و) ... ww کے معنے ہیں گائے ۔

(ز) ww ۱۵ پر چارپتوں کے تلے چار بار مکتوب ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اسی موقع پر ہڑپا کی ایک مہر کو بھی دیکھ لیجئے جس پر مکتوب ہے:

وٹس ۴۸ ... "ww" ...

... ایک شخص ہے جو اپنے ہاتھوں میں ایک ظرف لئے ہے، مراد ظرف اور ظرف والا، سندھی نقوش ... ایک ہی نقش کی مختلف القلم املائیں ہیں اور ان نقوش کی اصل ... ایسا ظرف ہے جو سندھ کی کئی مہروں پر جانور کے منہ تلے ملے گا۔ مہر نویس نے "ww" کا مطلب تشکیلی انداز تحریر میں بتایا ہے ... کا ... ۔ معلوم ہوا کہ ... اور ... مرادف نقوش ہیں اور ... اور "ww" دونوں کا مطلب ایک ہے۔ اب چارپتوں کے تلے چار بار ww لکھنے کی وجہ ظاہر ہو گئی۔

ظرف ۱۵ پر بیل کی کمر کے اوپر جو تین نقوش ہیں ان میں سے پہلا نقش ... ایسے سندھی نقش جیسا ہے جو کہ سندھی نقش ... کا عکس ہے۔ سندھی مہروں پر اک سنگھے کی سینگ ایسی دکھائی گئی ہے۔ اس کے بعد اوپر تلے جو نقوش ہیں وہ علامت تانیث ... کی بدلی صورتیں ہیں تکرار علامت جمع ہے۔ مطلب اس کا ہوا سینگ والیاں ۔ ۱۵ کے مکتوب کو ان تشریحات کے مطابق "گائے، گائے، گائیں" کا مرادف خیال کیا جا سکتا ہے۔

۱۶ میں گائے کی پشت ... m اور بیل کی پشت پر mm مکتوب ہے۔ معلوم ہوا کہ گائے اور بیل کا اسم مشترک تو m تھا۔ اس کے پہلے علامت تانیث ... بڑھا کر اسے گائے کو اور علامت تذکیر m بڑھا کر بیل نامزد کرتے تھے۔

یہ بلوچی ظروف اس بات کی شہادتیں ہیں کہ ظروف محض چیزوں کے رکھنے کا مصرف نہیں رہے بلکہ ان سے زمانۂ قدیم میں وہی کتابوں کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ ایک جرمن عالم کے خیال میں سندھی مہریں پرانے زمانے کی سندھی کتاب اقدس کے پراگندہ پرنے ہیں۔ عالم مذکور کی یہ رائے محض ایک تجویز ہے جس کا ثبوت مہروں کے نوشتے ہی دے سکتے ہیں بشرطیکہ دیں، میرے نزدیک بلوچستان کے ظروف اور سندھ کی سنہری مہریں عہد قدیم کی سندھی قاموس کے بکھرے ہوئے ورق پارے ہیں۔

اب آپ چاہیں تو قدیم بلوچی زبان کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔

۲۔ بلوچستان اور جنوبی عرب پڑوسی ممالک ہیں۔ بلوچی نقوش ہم کو جنوبی عرب میں ملے۔ اسلئے حیرت نہ ہونی چاہئیے اگر بلوچستان میں ہم کو عربی الفاظ ملیں۔ بلوچی قدیم میں بیل اور آنکھ کے لئے ملتے جلتے نام تھے۔ عربی میں عین آنکھ عین وحشی گائے کو کہتے تھے۔ ۱۸ پر گائے کے سینگوں کے درمیان جو نقش ہے جنوبی عرب کے مقام قتبان کے نشاق البرٹ جیمے نے اسے سبائی عین بتایا ہے۔

٥ براہمی رسم خط میں حرف تھ ہے۔ یہ بیل کی تصویر پر مکتوب ہے جسے عربی میں ثور کہتے ہیں۔ جنوبی عرب کے کسی ایسے باشندہ سے ملو جس نے باقاعدہ

قرآن مجید کو تجوید کے ساتھ نہیں سیکھا ہے، ثور کو تھوڑ ہی کہے گا۔

۴ مانیں گائے کی پشت پر چار بار ٥ ک مکتوب ہے اور غالباً ان چھوٹے چھوٹے جانوروں کی بابت ہے جو گائے کے پیٹ تلے ہیں۔ چونکہ ک صرف اس نوشتے میں مجھے ملا ہے اس لئے وثوق سے آواز نہیں بتائی جاسکتی مگر ہم ٥ کو ہ سبائی ع خیال کریں اور ک کو س تو غشّ کے معنے ہیں دودھ کا پیالہ۔ امتساس دودھ دُہنا۔ مُساس دودھ۔ ظرف ۵اکو دیکھو شیردان ہے۔

۵ کو سبائی حروف کی مدد سے ہم شش یا سس پڑھ سکتے ہیں۔ بلوچی قدیم میں یہ بیل کا مرادف تھا۔ عربی میں ساس (اس نے جانور کو سدھایا) لیبوئس (سدھاتا ہے) سیاسۃ (جانور کی دیکھ بھال، رکھوالی) عبرانی میں سوس بمعنے سواری یا بمعنے اسپ۔ توراۃ میں ہے:

سُوسْ وَرکبورمہ یَم	اس نے سواری اور اس کے سوار (فرعون)
(خروج ۱۵: ۱)	کو سمندر میں پھینکا

بیل ہندوؤں کی دیومالا میں کئی دیوتاؤں کی واہنا (سواری) ہے۔

۷" کشی پڑھ سکتے ہو۔ شئ (چیز) اب تو مرغوب و نامرغوب چیز ہے مگر یہ لفظ شاء (اس نے چاہا) سے مشتق ہے۔ اصلی مفہوم شی کا ہے ما یشاء (جس چیز کی خواہش کی جائے)۔ پتے چونکہ چوپائے کی خواہش کی چیز ہیں۔ اس لئے قدیم بلوچی اور سندھی پتے کو شی کہتے تھے۔

پھننگ — بقیہ صفحہ ۳۴

میں ڈھلکا ہوا دوپٹہ سینہ پر آگیا اور وہ کمرے کی جانب چل دی۔ ادھر امجد میاں ایسے نازک لمحے میں ابا میاں کو دیکھتے ہی اپنی قدیم روایتی سعادت مندی سے باادب ہو کر کچھ اور جھک گئے لیکن اسلم میاں اسی بے باک نظر سے سامنے منہ کئے کھڑے رہے۔ دادا کا صرف اتنا ہی احترام جائز اور کافی تھا کہ وہ اپنی سگریٹ پشت کی جانب کرلیں۔ سو انہوں نے یہی کیا لیکن سگریٹ کا دودھیا دھواں پیچھے سے سفید پس منظر لئے ہوا کے دوش پر لہرا لہرا کر بڑے میاں کے احساس کو آگ لگائے دے رہا تھا۔ بڑے میاں شاید سوچ رہے تھے: یہ لڑکا کتنا عجیب ہے۔ اپنے باپ کے سامنے یوں آزادی سے سگریٹ پی رہا ہے جبکہ اس کے باپ کی اتنی عمر گذر جانے پر بھی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اپنے باپ کے سامنے نظریں اونچی کرکے تیز لہجہ میں بات کرلے وہ مزید کچھ نہ سوچ سکے۔ اندھیرا شدت سے بڑھنے لگا۔ دبیز گہرا اندھیرا!

اسلم میاں کی آنکھیں برابر شرارت سے لمحہ بھر کے لئے دادا کے چہرے پر رکتیں اور پھر ان کے لگائے ہوئے نیم کے درخت کی سب سے اونچی پھننگ پر جا ٹکتیں جیسے شوخی سے کہہ رہی ہوں،

"ہم نے تو دادا جان بہت ترقی کرلی ہے۔ زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ کبھی تم بھی دادا اپنی کہنہ روایات کے منہ بند قلعے سے نکل کر ہماری دنیا میں آؤ۔ دیکھو انسان نے کتنی ترقی کرلی ہے، لیکن تمہیں کیا خبر! وہ باتیں جو کل خواب تھیں آج حقیقت کا روپ دھار چکی ہیں۔ انسان آج چاند پر بھی کمندیں پھینک سکتا ہے۔ دادا، تم تو ماضی کا مرثیہ ہو۔ ڈیڈی حال کی نظم اور ہم — اور ہم دادا مستقبل کا مدھر گیت ہیں۔ یہ جو درخت کل تم نے لگایا تھا، ہم بتدریج ترقی کرتے کرتے اس کی سب سے اونچی پھننگ تک پہنچ گئے ہیں جب کہ تم ابھی نیچے ہی نیچے، لپٹیوں میں رینگ رہے ہو۔"

اور ان آنکھوں میں، جوان شوخ آنکھوں میں دیکھنے کے بعد بڑے میاں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ لپٹیوں میں تیزی سے گرتے جا رہے ہیں۔ اور ان کا پوتا دراصل درخت کی سب سے اونچی پھننگ پہ بیٹھا ہوا انہیں بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اور نجانے کیوں، اس وقت یکایک ان کا دل چاہا کہ وہ ان رعشہ زدہ ہاتھوں میں کلہاڑی تھام کر ابھی ابھی یہ درخت کاٹ کر رکھ دیں، جو کل سایہ کی تمنا میں انہوں نے لگایا تھا۔ مگر انہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ زمانہ نیم کی یہ کڑوی نبولیاں ان کو زبردستی کھانے پر مجبور کر دے گا!

شہ کوہ

(دُنیا کا سب سے خوبصورت پہاڑ)

ثروت خاں

قدرت کی نیرنگیوں اور مناظر کا انسان کی روحانی مسرّت اور فیضان سے ہمیشہ ایک گہرا تعلق رہا ہے۔ لہلہاتے کھیت ہوں یا دشت وصحرا، پھیلی ہوئی شاداب وادیاں ہوں یا سمٹے ہوئے دامان کوہ، سوچنے اور سمجھنے والے کے لئے ان سب میں ایک پیغام پنہاں ہے۔ ایسے تمام مقامات روحانی مسرّت حاصل کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں ؎

علم کے حیرت کدہ میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتّی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

اردو کا سب سے بڑا طنز گو شاعر، اکبرؔ بھی جب قدرت کو اسکے اصلی روپ میں دیکھتا ہے تو طنز و مزاح کو چھوڑ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

مجھ کو دیوانہ بنا دیتا ہے فطرت کا جمال
عارضِ گل سے خبر ملتی ہے روئے یار کی

قدرت کی ان فیاضیوں سے ویسے تو ہر شخص اپنے شہر کی کال کوٹھری سے باہر نکل کر پچھلے پہر کو، طلوع و غروب آفتاب کے وقت یا تاروں بھری راتوں میں کسب فیض کر سکتا ہے لیکن پاکستان میں قدرت کا یہ حسن اگر پوری بہار پر دیکھنا ہو تو شمال کے فلک بوس اور برف پوش پہاڑوں سے زیادہ موزوں کوئی مقام نہیں۔ ان ہی پہاڑوں میں قدرت کی ایک حسین وجمیل جلوہ گاہ "ننگا پربت" کی برف پوش چوٹی ہے جہاں خالقِ کائنات کی عظمت وجلال، اس کے حسن وجمال کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہاں انسان خود کو قدرت سے قریب ہی نہیں بلکہ قدرت کی گود میں پاتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں خدا کی کبریائی کے سامنے سربسجود ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ شاعر ایسے ہی مقام پر پہنچ کر محسوس کرتا ہے۔ ع

جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھکو

ننگا پربت (۲۶۶۶۰ فٹ) دنیا کی سب سے بلند چوٹی نہیں لیکن دشوار گذار اور خطرناک ہونے کی وجہ سے اس نے کوہ پیماؤں کے خون کی جتنی قربانی لی ہے، دُنیا کی کسی دوسری چوٹی نے نہیں لی۔ یہ برف پوش پہاڑ جتنا خونخوار ہے اس کا منظر اتنا ہی مہیب، پُرجلال اور حسین بھی ہے۔ اس کا حسن لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے اور اس کی ہیبت آگے قدم بڑھانے سے روکتی ہے۔ ننگا پربت کا جلال وجمال اس کی دوامی خصوصیات ہیں جن کا تمام کوہ پیماؤں اور سیّاحوں نے ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے ننگا پربت کو دُنیا کی ساری چوٹیوں میں ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ برف کے اس فلک بوس پہاڑ کو بجا طور پر شہ کوہ اور پہاڑوں کی دیوی کہا گیا ہے۔

ننگا پربت پاکستان میں قدرت کی کاریگری اور نیرنگی کا ایسا ہی نمونہ ہے جیسے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں نیاگرا کا آبشار یا گرانڈ کینین۔

ننگا پربت دنیا کی چھٹی سب سے اونچی چوٹی ہے اور قراقرم اور ہمالیہ کو چھوڑ کر دنیا کے ہر پہاڑی سلسلہ کی چوٹیوں سے بلند، پاکستان کی یہ چوٹی جنوبی امریکہ میں کوہستان انڈیز کی سب سے بلند چوٹی "اکونکاگوا" سے ۳۵۷۹ فٹ، کوہستان راکی کی سب سے اونچی چوٹی "میک کنلے" سے ۶۳۶۰ فٹ، یورپ کے مشہور ایلپس کی سب سے اونچی چوٹی مونٹ بلاں سے ۱۰۸۷۸ فٹ، افریقہ کی سب سے اونچی چوٹی کلیما نجارو سے ۷۳۲۰ فٹ، اور ایران کے افسانوی کوہ دماوند سے ۷۷۲۶ فٹ زیادہ اونچی ہے۔

پامیر اور تبت "بام دنیا" کہلاتے ہیں لیکن وہاں بھی کوئی پہاڑ ننگا پربت سے اونچا نہیں۔ یہ فخر صرف ہمالیہ اور قراقرم کو حاصل ہے کہ یہاں اس مغرور پہاڑ سے بھی اونچی چوٹیاں موجود ہیں۔

پاکستان میں کے ٹو (۲۸۲۵۰) اور نیپال میں ایورسٹ (۲۹۰۲۹)، کنچن چنگا (۲۸۱۴۶) منکالو (۲۷۷۹۰) اور دھول گری (۲۶۷۹۵) وہ چوٹیاں ہیں جو بلاشبہ ننگا پربت سے اونچی ہیں۔

اگر ننگا پربت دنیا کی چھٹی اونچی چوٹی ہے تو اس کو دوسری بلند تر چوٹیوں کے مقابلہ میں کیوں زیادہ پُرشکوہ سمجھا جاتا ہے؟ یہ ایک قدرتی سوال ہے جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ وہ ہے جو "انڈیا اینڈ پاکستان" نامی جغرافیہ میں بتائی گئی ہے:۔

"شاید دنیا کا کوئی پہاڑ ننگا پربت کے برابر پُرشکوہ نہیں ہے۔ ایورسٹ تو یقیناً نہیں ہے اور شاید "کے ٹو" بھی نہیں۔ ننگا پربت کے پُرشکوہ ہونے کی وجہ اس کی شدت کے ساتھ ترشی ہوئی کھڑی چٹانیں اور ڈھلانیں ہیں۔ یہ چٹانیں عمودی شکل میں چلی گئی ہیں۔ یہ چٹانیں شمال میں سطح زمین سے صرف ۱۴½ میل کے اندر ۲۳ ہزار ایک سو فٹ کی بلندی تک پہونچ جاتی ہیں۔ مغرب میں سترہ میل میں بیس ہزار چھ سو فٹ اور مشرق میں چودہ میل میں انیس ہزار چھ سو فٹ کی بلندی تک پہونچ جاتی ہیں۔ جنوب کی طرف بلندی نسبتاً تدریجی ہے یعنی ۶½ سو فٹ فی میل۔"

گویا ننگا پربت کے پُرشکوہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ پہاڑ تدریجی طور پر بلند نہیں ہوا ہے بلکہ ایک قلعہ کی طرح گرد و نواح کی زمین پر استادہ معلوم ہوتا ہے۔

ننگا پربت کے پُرشکوہ ہونے کی دوسری وجہ اس کی وسعت ہے۔ ایک امریکی "جان کلارک" نے اپنی کتاب "ہنزہ" میں لکھا ہے:۔

"ہمارا طیارہ دریائے سندھ کے بڑے موڑ کے ساتھ ساتھ اڑ رہا تھا۔ ننگا پربت ہمارے داہنے طرف تھا اس کی خوفناک چوٹی ہم سے دو میل اونچی تھی۔ یہ چوٹی ایسی دیو پیکر تھی کہ ہمیں اس کے پاس سے گذرنے میں پورے پندرہ منٹ لگ گئے۔"

مشہور امریکی رسالے "نیشنل جیاگرافک" میں ایک مضمون نگار لکھتا ہے:۔

"دریائے سندھ کی وادی کا رخ اب مشرق کی طرف ہو گیا تھا اور گھاٹی کشادہ ہو گئی تھی۔ ہم سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر اکتیس انسانوں کا قاتل برف پوش ننگا پربت ایک قلعہ کی طرح کھڑا تھا۔ چوٹی اگرچہ گھنے بادلوں سے چھپی ہوئی تھی لیکن ہم دریا سے اوپر تک اس کی چار میل کی تمام بلندی دیکھ سکتے تھے۔"

اسی طرح ایک فرانسیسی صحافی اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:۔

"ایک ایسا شخص جو پہلی مرتبہ طیارہ سے سفر کر رہا ہو جب یہ دیکھتا ہے کہ ننگا پربت جس کی چوٹی بادلوں میں چھپی ہوئی ہے اچانک ایک دیوار کی طرح سامنے موجود ہے تو وہ خوف سے کانپ جاتا ہے۔"

ننگا پربت کے پُرشکوہ ہونے کی ایک تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دور دور تک کوئی دوسرا پہاڑ اس کا مدِمقابل نہیں ہے۔ ہراموش کی ۲۴۲۷۰ فٹ بلند چوٹی تقریباً پچاس میل دور ہے۔ بلند چوٹیوں میں سب سے قریب یہی ہے لیکن ننگا پربت اس سے بھی دو ہزار تین سو نوے فٹ بلند ہے۔ اس تنہائی کی وجہ سے ننگا پربت کا جاہ و جلال اور نمایاں ہو جاتا ہے۔

ننگا پربت کی چوٹی اپنی بلندی کی وجہ سے دور دور سے نظر آتی ہے۔ اسے صاف موسم میں مری اور نتھیا گلی سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں سے ننگا پربت تقریباً سو میل دور ہے۔ لیکن زیادہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے یہاں نہ تو اس کے حسن سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے اور نہ اس کی ہیبت ناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ننگا پربت پر ایک اچٹتی نظر ان طیاروں سے بھی ڈالی جا سکتی ہے جو مسافروں کو راولپنڈی سے گلگت لیجاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک حسین چیز کو جب تک جی بھر کر نہ دیکھا جائے طبیعت سیر نہیں ہو سکتی۔ ننگا پربت پر ہوائی جہاز سے طائرانہ نظر ڈالنا یا نتھیا گلی سے اس کی جھلک دیکھ لینا دونوں یکساں ہیں۔ ننگا پربت کی آ[illegible]ان دیکھنے اور اس کی خوبصورتی اور دلکشی سے لطف اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ قریب سے دیکھا جائے اور اس کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالی جائے۔ ننگا پربت کا ایسا نظارہ

بڑی حد تک کوہ باتوسر سے کیا جا سکتا ہے جہاں سے ننگا پربت صرف ۳۵ میل دور ہے۔

باتوسر وادیٔ کاغان کے شمال مشرقی گوشہ میں واقع اور سطحِ سمندر سے تقریباً چودہ ہزار فٹ بلند ہے۔ وادیٔ کاغان میں بالاکوٹ سے ناران کے مقام تک سرکاری جیپ سروس موجود ہے۔ ناران سے باتوسر کا درہ صرف اکتالیس میل دور ہے۔ یہ سفر پیدل یا ٹٹوؤں پر کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر ناران سے پوری جیپ گاڑی کرایہ پر لی جا سکتی ہے۔ درہ سے مغربی سمت کی پہاڑی کی چڑھائی سب سے آسان ہے۔ چار سو یا پانچ سو فٹ کی یہ چڑھائی بیس منٹ میں طے کی جا سکتی ہے۔ چوٹی پر پہنچنے کے بعد:

"ایک پرشکوہ منظر سامنے آئے گا۔ ٹھیک مشرق میں تقریباً ۳۵ میل کے فاصلہ پر ننگا پربت کی دیوپیکر چوٹی آسمان سے باتیں کرتی نظر آئے گی۔ جاہ و جلال کا یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں ننگا پربت کو آپ تنہا اور منفرد پائیں گے۔ کاغان کی بلند سے بلند چوٹیاں اس کی عظمت کے آگے سرنگوں نظر آئیں گی۔"

ننگا پربت کا دلآویز نظارہ کرنے کے لئے کوہ باتوسر اگرچہ مناسب جگہ ہے اور کم از کم اب تک یہی وہ واحد مقام ہے جہاں مسافر اور سیاح آسانی سے پہونچ سکتے ہیں پھر بھی ۳۵ میل کا یہ فاصلہ زیادہ ہے۔ اس فاصلہ سے وہ باریکیاں نہیں دیکھی جا سکتیں جن کو دس اور بیس میل سے دیکھنا ممکن ہے۔ آئیے، اب ہم ان مقاموں کا جائزہ لیں جو اس برف پوش چوٹی سے صرف دس اور بیس میل دور ہیں اور جہاں سے پہاڑوں کی اس دیوی کے ہر پیچ و خم کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

دہلی کے مشہور اخبار "اسٹیٹسمین" کے سابق مدیر "ایان اسٹیفنس" نے ہوائی جہاز سے چار مرتبہ ننگا پربت کو دیکھا ہے اور ایک مرتبہ ۱۹۴۰ء میں صرف ۳½ میل کے فاصلہ سے اس نے اپنی کتاب (HORNED MOON) میں اس کے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ ایان اسٹیفنس نے ننگا پربت کو آخری مرتبہ ۱۹۵۳ء میں گلگت جاتے ہوئے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ننگا پربت شاید دنیا کا سب سے خوبصورت پہاڑ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں کو اس کا قرب نصیب ہوا ہے ان کے نزدیک یہ خوفناک ترین پہاڑ ہے، ایک قاتل ہے۔ یہ چوٹی اپنی عظمت میں تنہا ہے اور گرد و نواح میں کوئی قابلِ ذکر چوٹی اس کی مدِ مقابل نہیں ہے۔"

"...... مجھے ننگا پربت کو قریب سے دیکھنے کا جو واحد موقع ملا تھا وہ میرے لئے ایک قیمتی یاد ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک صحت مند انسان چوٹی سے ۳½ میل کے فاصلہ تک پہونچ سکتا ہے۔ یہ مقام بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک گلیشیر کے کنارہ ہے۔ یہاں پہونچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ننگا پربت سر کے اوپر ہے۔ سامنے کھڑی چٹانوں کا سر چکرا دینے والا ایک سلسلہ ہے۔ جو مسلسل بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ چوٹی کا آخری حصہ اتنا بلند اور اتنا نزدیک ہے کہ اس کی طرف دیکھنے سے گردن اکڑ جاتی ہے۔ یہ مقام مشرقی سمت پر 'استور' کی طرف ہے اور روپال نالہ نامی ایک چشمے کے بالائی حصہ پر ہے۔"

اس کے بعد مصنف نے ۱۹۴۰ء کے واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جب مذکورہ بالا مقام سے اس نے ننگا پربت کو دیکھا تھا وہ صبح ۴½ بجے ہی اپنی قیام گاہ سے روپال نالے کی طرف روانہ ہو گیا اور صبح کے پُرکیف لمحوں میں مقررہ مقام پر پہونچ گیا۔ صبح کا ناشتہ بھی وہیں کیا۔ لیکن ان کو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ننگا پربت کی چوٹی بادلوں کے غلاف میں چھپی ہوئی ہے۔ بالآخر ایک طویل انتظار کے بعد منظر بدلا:

"اچانک ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ مطلع صاف ہونا شروع ہو گیا۔ بادلوں کے پردے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ہٹنے لگے۔ بڑی بڑی چٹانیں جو ناقابلِ یقین حد تک بلند تھیں یکے بعد دیگرے عریاں ہونا شروع ہو گئیں اور چند لمحوں کے اندر

یہ خوبصورت ترین اور مہیب ترین پہاڑ اپنے
پورے شکوہ و جلال کے ساتھ سورج کی روشنی
میں بے نقاب ہو کر جگمگانے لگا۔"

ایان اسٹیفنس جب آخری مرتبہ گلگت سے واپس ہوتے وقت طیارے کے ذریعہ ننگا پربت کے پاس سے گذرا تو پاکستانی ہوا باز نے اس سے کہا:-

"ننگا پربت کس قدر سطوت کا حامل ہے
اور کس قدر عجیب و غریب ہے۔ کبھی وہ چھپ
جاتا ہے اور انتہائی دور معلوم ہونے لگتا ہے۔
کبھی بالکل قریب آجاتا ہے۔ روشنی میں اس کا
حسن قابل دید ہوتا ہے۔ کیا وہ آج پیارا نہیں
معلوم ہو رہا؟"

اسٹیفنس لکھتا ہے کہ یہ ہوا باز اس وقت ایک عاشق کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

ایان اسٹیفنس نے ننگا پربت سے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان کی دوسرے سیاحوں کے بیانوں سے بھی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک انگریز فوجی افسر ای۔ ایف۔ نائٹ نے انیسویں صدی کے اواخر میں اسکردو سے براہ "استور" گلگت جاتے ہوئے ننگا پربت کو کئی مرتبہ دیکھا اور اپنے ان تاثرات کو اپنی کتاب، WHERE THREE EMPIRES MEET. میں تفصیل سے درج کیا ہے۔

اس نے ننگا پربت کو سب سے پہلے درۂ بناک لا کی طرف سے استور کی سمت آنے والے راستہ سے دیکھا وہ لکھتا ہے:-

"آج میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جسے
آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے
اس حسین وادی کے ایک موڑ پر دیکھا کہ میرے
سامنے نیچی پہاڑیوں کے عین اوپر ایک عظیم الشان
سفید تودہ نیلگوں آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے
ہے۔ میں نے ایسا پہاڑ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا برف
کے گنبد ایک کے اوپر ایک نظر آرہے تھے۔ پہلو
میں میلوں لمبے گلیشیر بہہ رہے تھے۔ یہ دیامیر یا
ننگا پربت کا دیو پیکر پہاڑ تھا جو مجھ سے بیس میل کے
فاصلہ پر واقع تھا۔"

ای ایف نائٹ نے ننگا پربت کے منظر کا لطف دن ہی کو نہ بلکہ رات کے وقت بھی اٹھایا۔ چنانچہ آگے چل کر وہ لکھتا ہے:-

"ننگا پربت کا نظارہ دن کے وقت تو ناقابلِ
بیان حد تک تو خوبصورت تھا ہی لیکن رات کے
وقت یہ حسن اور بھی بڑھ گیا مطلع صاف تھا اور
چاند پوری تابانی سے پہاڑ کے اس حصّہ کو روشن
کر رہا تھا جو میرے سامنے تھا جس کی وجہ سے
برف کا ہر حصہ نظر آرہا تھا نیلے نیلے گلیشیر زبردست
کھڑی چٹانیں سب نظر آرہی تھیں۔ تاریک غار
بڑے بھیانک معلوم ہو رہے تھے۔ یہ جگہ نامعلوم[1]
دنیا کی حد ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ پہاڑ کے پیچھے دیواؤں
پریوں کی سرزمین ہے جس کے گرد یہ دیوار کھڑی کر دی
گئی ہے۔ یہ ویرانے، جہاں زندگی کے آثار مفقود
تھے بڑے پر اسرار اور دلکش تھے۔"

"دوسرے دن صبح میں استور کی طرف روانہ
ہوگیا۔ اس خوبصورت وادی میں سفر بڑا خوشگوار
تھا۔ ہر طرف سطح میدانوں میں سرکنڈے لگے ہوئے
تھے جن میں فاختاؤں کی کثرت تھی اور وادی چیڑ کے
جنگلوں PINE WOODS اور سدا بہار مرغزاروں
سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں ہر موڑ پر ننگا پربت کا ایک
نیا منظر سامنے ہوتا تھا۔"

مسٹر نائٹ ننگا پربت کے منظر سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ جب وہ استور پہنچ گیا تو اس نے اس عظیم پہاڑ کو اور زیادہ قریب سے دیکھنا چاہا۔ اس مقصد کے لئے اس نے استور کے جنوبی نالے کی طرف چار روزہ چکر لگایا اور رنگوسر کی خوبصورت جھیل سے ہوتے ہوئے

---

[1] مصنف نے "نامعلوم دنیا" اسلئے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں چلاس اور اس سے ملحقہ علاقہ جو ننگا پربت کے مغرب میں تھا نہ صرف انگریزی اثر سے آزاد تھا بلکہ انگریزوں کو اس سے متعلق کسی قسم کی معلومات نہیں تھیں۔

ایک ایسے مقام پر پہونچ گئے جو سطح سمندر سے سترہ ہزار فٹ بلند تھا اور برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہاں سے اس نے نانگا پربت کا جو منظر دیکھا اس کے متعلق وہ لکھتا ہے:-

"اس مقام پر پہنچ کر میرے سامنے ایک ایسا منظر آگیا جس سے زیادہ پرشکوہ منظر دیکھنا مشکل ہے۔ میرے سامنے نانگا پربت کی چوٹی صرف دس میل کے فاصلہ پر بے نقاب موجود تھی۔"

نانگا پربت سے متعلق ایک انگریز پادری نے بھی، جس نے کشمیر میں تیس سال گذارے اور اسکے چپہ چپہ کی سیر کی، بڑی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ اپنی کتاب "کشمیر میں تیس سال" (انگریزی) میں لکھتا ہے:-

"الم پی درہ کی چڑھائی طویل تھی۔ پہاڑ بہت بلند تھے۔ گرد و نواح کی کئی چوٹیاں وادی سے آٹھ یا نو ہزار فٹ بلند تھیں لیکن جب ہم درہ پر پہنچے تو ایک انتہائی پرشکوہ چوٹی نظروں کے سامنے آگئی جو دوسری چوٹیوں سے کہیں زیادہ بلند تھی بلکہ ان پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے لڑکپن میں ریتیو اگلیشیر دیکھا تھا اور ماؤنٹ بلانک (ایلپس) کے مشرقی رخ کی برفانی چٹانیں اور زبردست برفانی ڈھلانیں دیکھی تھیں لیکن نانگا پربت ان سے کہیں زیادہ ذی شان اور پرشکوہ تھی۔ اس کے بعد میں نے نانگا پربت کو ہر سمت سے دیکھا ہے، لیکن یہ چوٹی جتنی پرشکوہ مشرق سے نظر آتی ہے اتنی پرشکوہ کسی اور سمت سے نظر نہیں آتی۔ مشرقی رخ پر اس میں ایسی کھڑی چٹانیں ہیں جن پر برف ٹھہر بھی نہیں چڑھ سکتا۔ یہاں سے تین بڑے گلیشیر اپنی برف جھرنوں کی شکل میں رُوپال نالے میں ڈالتے ہیں۔ چوٹی پر سے پھسلنے والا برف کا دیو پیکر تودہ اگرچہ گرتے ہی ٹوٹ جاتا ہے لیکن اس کے ٹکڑے پندرہ ہزار فٹ نیچے تک بہتے نظر آتے ہیں۔"

"رُوپال کے پل پر سے نانگا پربت کا منظر زیادہ پرشکوہ نہیں لیکن الم پی درہ سے یہ منظر بڑا باوقار ہے۔"

مصنف نے نانگا پربت کا مذکورہ بالا منظر سترہ ہزار فٹ کی بلندی سے دیکھا تھا اور غالباً استور کے جنوب میں یہ وہی جگہ ہے جہاں سے ای۔ ایف۔ نائٹ نے نانگا پربت کو دیکھا تھا۔ اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نانگا پربت کو قریب سے دیکھنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں مقام الم پی کا درہ ہے، رُوپال نالہ نہیں جیساکہ اسٹیفنس نے لکھا ہے۔

الم پی درہ، رُوپال نالہ اور بنا کسالا سے استور آنے والی وادی کے علاوہ نانگا پربت کا ایک اچھا نظارہ اس مقام سے بھی جا سکتا ہے جہاں ۱۹۵۳ء میں نانگا پربت کو سر کرنیوالی جرمن جماعت نے عارضی بنیادی کیمپ قائم کیا تھا۔ یہ مقام سطح سمندر سے صرف دس ہزار فٹ بلند ہے اور یہاں سے نانگا پربت کے مغربی پہلو کا بڑا مکمل اور دلکش منظر سامنے آتا ہے۔ یہ مقام غالباً چوٹی سے چار یا پانچ میل سے زیادہ دور نہیں۔ مگر بڑی کشادہ اور خوش منظر ہے اور ٹورسٹ، اُدس ہوٹل اور دوسری ضروری عمارتیں بنانے کے لئے یہاں کافی جگہ ہے۔ ہر طرف گھنے جنگل ہیں اور سامنے نانگا پربت کی برف کی دیوار ہے۔ جرمن مہم کے مضمون نگار نے اسے "پریوں کا مرغزار" قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:-

"یہاں ہر چیز سر سبز و شاداب ہے اور اس جگہ پہنچ کر ہمارے دلوں میں مغربی ایلپس کی یاد تازہ ہوگئی۔"

نانگا پربت اور اس کو قریب سے دیکھنے کے مقاموں کی اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نانگا پربت کا برف پوش پہاڑ پاکستان کو قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ نانگا پربت کا حسن اور اس کی دلکشی ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ اسکی مثال نہ کاغان کی حسین وادی پیش کر سکتی ہے اور نہ سوئٹزرلینڈ۔ حقیقت یہ ہے کہ سیر و سیاحت کی ترقی کے منصوبوں میں ہم نانگا پربت کو ایک مستقل حیثیت دے سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی دقت ہے تو وہ صرف راستوں اور آرام دہ قیام گاہوں کی عدم موجودگی۔ جب دن یہ مشکل دور ہو جائے گی نانگا پربت کو بلاشبہ نہ صرف پاکستان بلکہ بین الاقوامی سیر و سیاحت کے مقاموں میں ایک اہم مقام حاصل ہو جائے گا اور سیاح دنیا کے ہر حصہ سے قدرت کے اس عجوبہ کو

دیکھنے کے لئے جوق درجوق پاکستان آنے لگیں گے۔

ننگا پربت کو سر کرنے کے لئے اب تک سات کوششیں کی جاچکی ہیں۔ پہلی کوشش ۱۸۹۵ء، دوسری ۱۹۳۲ء اور تیسری ۱۹۳۴ء میں۔ تیسری مہم میں نو افراد ہلاک ہوئے۔ چوتھی کوشش ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ یہ مہم سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ برف کا ایک تودہ گرنے سے پورے کا پورا کیمپ، جو سات جرمن کوہ پیماؤں اور نو شرپا قلیوں پر مشتمل تھا، موت کی آغوش میں چلا گیا لیکن انسان کی فطرت کب شکست ماننے والی ہے۔

چنانچہ اس تباہ کن حادثہ کے بعد بھی ننگا پربت کے سرِ پُرغرور کو جھکانے کے لئے جدوجہد جاری رہی۔ ۱۹۳۸ء میں پانچویں مہم بھیجی گئی اور ۱۹۵۰ء میں چھٹی۔ اس کے بعد ساتویں اور آخری کوشش ۱۹۵۳ء میں کی گئی۔ اس مہم میں انسان نے بالآخر اپنے مقصود کو پالیا۔ جرمن کوہ پیما "ہرمن بوھل" نے ۳ رجولائی کی شام کو، بجے ننگا پربت کی چوٹی پر پہنچ کر پاکستان کا پرچم نصب کر دیا اور قدرت کے حریف جادو داں انسان کی یہ کامیابی اور اعزاز کچھ کم ہے کہ اس نے اپنی سعیٔ پیہم سے آخر کار ننگا پربت جیسے مدِ مقابل کو پیغامِ شکست دیا ہے اور اس پہاڑوں کی دیوی کو سرنگوں کر لیا جس کا سرِ پُرغرور کسی کے سامنے خم نہیں ہوا تھا۔ اور "اس شہ کوہ" کو خراجِ اطاعت ادا کرنے پر مجبور کر دیا جو اب تک انسانوں سے خراج لینے کا عادی تھا ؛

فن کا روپ نگر

(ڈیزائن سنٹر)

سید آفاق حسین آفاق

اپنے یہاں کی چھوٹی چھوٹی دستکاریوں کے بوقلموں نمونے۔ نفیس، خوبصورت، سجل۔ دیکھ کر کس کے دل میں یہ خواہش نہیں پیدا ہوتی کہ ہمارا ملک حسن و فن کے ان شہ پاروں سے اور بھی مالا مال ہو۔ اور ان کو کسی جگہ اس طرح یکجا طور پر پیش کیا جائے کہ ان دستکاریوں کا جو بیک وقت فن بھی ہیں اور فائدہ مند بھی، ایک ہی نظر میں دیکھا جا سکے اور ان کے حسن و خوبی کی داد بھی دی جا سکے۔

مقام مسرت ہے کہ کراچی کی حد تک فن اور صناعی کے شیدائیوں کی یہ دلی تمنا پوری ہو چکی ہے۔ اور اب ہم ایک نہایت ہی خوبصورتی سے آراستہ کمرے میں جسے ایوان نمائش کہنا زیادہ موزوں ہوگا، ان خوبصورت دستکاریوں کے بہت ہی دلآویز اور طرحدار نمونے دیکھ سکتے ہیں۔ اس ایوان کا نام "ڈیزائن سنٹر" ہے جسے قائم کرنے کا شرف ایک صنعتی ادارہ کو حاصل ہے جو تھوڑا عرصہ ہوا، ستمبر ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا ہے۔ اور "سمال انڈسٹریز کارپوریشن" کے نام سے موسوم ہے۔ وہی جس کا حکومت نے دوسرے پنج سالہ منصوبے میں خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔ ہمارے ملک میں ان چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی دینے اور ان کا ملک بھر میں جال پھیلانے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہ بے حد فائدہ مند بھی ہیں اور کم خرچ بھی۔ نیز ان سے کتنے ہی لوگوں کو منفعت بخش کاروبار بھی ہاتھ آتا ہے اور قومی دولت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ "ڈیزائن سنٹر" کا قیام درحقیقت ایک ابتدائی تجرباتی کوشش ہے۔ تاکہ اگر یہ کراچی جیسے اہم کاروباری اور بڑے شہر میں کامیاب ثابت ہو تو اس قسم کے صنعتی مرکز اور ایوان دوسرے بڑے چھوٹے شہروں میں بھی قائم کئے جائیں۔ اور یوں ان نفیس، دلفریب دستکاری صنعتوں کو فروغ حاصل ہو۔

ایسی صنعتیں صدیوں کی پیداوار ہوتی ہیں اور کتنے ہی زمانوں کے ہزارہا فن کاروں کی صلاحیتیں ان کو جِلا دیتی ہیں۔ اس چیز کو عام طور پر روایت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک سلسلۂ نشوونما ہے جس میں بے شمار افراد حصہ لیتے ہیں اور ان صناعیوں کو اپنے ذوق اور جوہروں سے نئی نئی طرحیں عطا کرتے ہیں۔ اس طرح بیک وقت قدیم و جدید، کلاسیکی و رومانی خاصیتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور پرانے ڈیزائنوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے ڈیزائن بھی حسن کاری اور صناعی کو چار چاند لگاتے رہتے ہیں۔ اور جس ایوان آرائش میں وہ جلوہ گر ہوں اسے "فن کا روپ نگر" کہنا ہی زیبا ہے۔ کراچی کا ڈیزائن سنٹر ایک ایسا ہی ایوان ہے۔ ایسے ہی مرکز لاہور اور ڈھاکہ میں بھی قائم کرنے کا ارادہ ہے جن سے لازماً خاص و عام میں وضع و ہئیت اور طرح و اسلوب کی بوقلمونی کا شعور پیدا ہو جائے گا۔

جن لوگوں کے ذہن میں اس مرکز کا تصور پیدا ہوا، اور وہ عملی طور پر اس کا انصرام کر رہے ہیں، انہوں نے منجملہ دیگر امور کے یہ مقاصد بھی پیش نظر رکھے ہیں کہ ان صنعتوں سے متعلق کاریگری اور فن کے ہر قسم کے نمونے فراہم کئے جائیں تاکہ جو لوگ فن و صنعت کا شعور رکھتے ہیں وہ ان کا امعان نظر سے مطالعہ کر سکیں اور ان میں تحقیق اور جدت طرازی سے کام لیں۔ اور ہمارے یہاں جو ٹکسالی نمونے موجود ہیں ان میں اور بھی نوک پلک پیدا کر کے خوب سے خوب تر بنانے کی تدبیر کریں۔ اس طرح کہ سلف کی فن کاری کے احساس اور اس کی داد و تحسین کا جذبہ تسکین پائے۔ اور جدید ذوق، رجحان اور ـــــ فیشن کے مطابق ان کو نئے نئے دلچسپ و نفیس سانچوں میں بھی ڈھالا جا سکے۔ جس سے وہ اور بھی بنیں سنواریں اور ان کا روپ اور بھی اجاگر ہو۔ ہماری پرانی مایۂ ناز کاریگری بھی سلامت رہے۔ اور حسن کاری کا سلسلہ بھی برابر آگے بڑھتا رہے۔

ان مقاصد کے مطابق سنٹر میں سردست ایسے نمونے جمع کرلئے گئے ہیں جو وضع و ہیئت اور طرح و انداز دونوں حیثیتوں سے بہت ہی بدیع ہوں۔ دستکاریاں آخر دستکاریاں ہی ہیں، محض حسن کاری نہیں ہیں۔ اس لئے ان میں حسن کے ساتھ ساتھ فائدہ مندی بھی ہے۔ جو ویسے بھی اسلامی فنون کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ ان نمونوں میں صناعوں نے اپنی کاریگری عام استعمال میں آنے والی چیزوں پر دکھائی ہے اور اس میں بحد ندرت و نفاست پیدا کی ہے۔ بالفاظ دیگر ان میں اپج اور افادیت کے تقاضوں کو بڑی ہی خوش اسلوبی سے ہم آہنگ کرکے عارضی چیزوں میں حسنِ دوام پیدا کیا ہے۔

سنٹر میں جو چیزیں جمع کرکے لائی گئی ہیں۔ وہ وضع، ہیئت، اسلوب اور رنگ روپ کے گوناگوں جادو جگاتی ہیں۔ ان میں جدت کی شوخی بھی دکھائی دیتی ہے اور ایسے انداز بھی نمایاں ہیں جو لگاتار مشق سے پختہ ہوگئے ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی یہاں موجود ہے اسے بڑی حد تک ایسی کاریگری اور دستکاری کے نمونوں کا ابتدائی مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر یہی ایک نمائندہ ذخیرے کی شکل اختیار کرے گا۔ اور ابتدائی نمونوں کو وسیع پیمانے پر ترقی دی جاسکے گی۔

اس ترقی کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ اہل ہنر میں اس قسم کے نادر فن پارے تیار کرنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ وہ بھی دوسروں کے ساتھ مقابلے پر اتر آئیں۔ اور فن کو چار چاند لگادیں۔ دوسرا اہم اقدام یہ ہے کہ ملک بھر میں ایک مقابلہ کا امسال اہتمام کیا جائے تاکہ جس کسی کو دعوائے کمال ہو وہ سامنے آئے اور اپنی ہنرمندی کا ثبوت دے۔ اس کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ ایسی چیزیں پیش کی جائیں جن میں محض پرانی لکیر ہی نہ پیٹی گئی ہو بلکہ اس میں کچھ بڑھایا بھی جائے۔ اور ڈیزائن میں اپج یا نرالا پن پیدا ہو۔ یہ بیک وقت کام کی چیز بھی ہو اور دوام کی چیز بھی۔

دستکاروں اور چھوٹے کارخانے والوں پر اپنی تیار کی ہوئی چیزیں بھیجنے پر کوئی پابندی نہیں۔ بے شک مقابلہ تو ان چیزوں ہی میں ہوگا جو ملک میں مدتوں سے رائج ہیں۔ پھر بھی نیاپن پیدا کرنے کے لئے یہ اجازت ہوگی کہ آج کل کی خاص خاص اشیاء مثلاً لوہے، فولاد اور دوسری دھاتوں کی چیزیں، کھیلوں کا سامان بجلی اور ربڑ وغیرہ کی چیزیں بھی بھیجی جائیں۔ ان میں سے بہترین ڈیزائن اور کاریگری کے لئے پانچ پانچ سو روپے تک کے انعامات دیئے جائیں گے۔

سنٹر میں جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں ان سے سمجھا ہوا روپ ہی جھلکتا ہے۔ اس لئے کہ ان میں آزمائے ہوئے گر ہی برتے گئے ہیں۔ جیسا کہ ہر کلاسیکی چیز میں ہوتا ہی ہے۔ یہ گر کاریگروں کی گھٹی میں پڑ گئے ہیں اور وہ آنکھ بند کئے ان کے نمونوں پر نمونے گھڑتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے پرانے نمونوں میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کاریگروں کو نیاپن پیدا کرنے کی دعوت سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر وہ پرانی وضع ہی کو دہراتے گئے تو کوئی انوکھی بات نہیں پیدا ہوسکے گی۔ جیسی ایک چیز ویسی ہی دوسری چیز اور سچ پوچھئے تو ان چیزوں کے حسن کا راز اسی میں پنہاں ہوتا ہے کہ وہ کئی پشتوں کے مجموعی ریاض کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جس سے خامیاں چھٹتی جاتی ہے اور روپ نکھرتا جاتا ہے۔ کاریگر اس میں ذرا سا نیا شوشہ پیدا کردے تو خریدار یہی سمجھتا ہے کہ جو بات اس میں ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ آخر فن بھی تو ایک طرح کا فریب نظر ہے۔

فی الحال جو کام چھوٹے پیمانے کی دستکاریوں کو فروغ دینے والوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ ایک تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مقصد اس کے امکانات کی چھان بین ہے۔ اس طرح جو معلومات دستیاب ہوں گی انہیں عملی کام اور تجربات میں استعمال کیا جاسکے گا۔ اندرونی کھپت کے علاوہ ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ ان چیزوں کی باہر مانگ پیدا کی جائے۔ کیونکہ چینیوں کے لئے یہ خاص کشش رکھتی ہیں۔

ان چیزوں کی ترقی دینے کی ایک اور صورت یہ ہے کہ سنٹر مختلف دستکاریوں کی مستقل نمائشوں کا انتظام کرے۔ کارپوریشن کے منصوبوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ نئی دستکاریاں اور ان کچے سامان کو جو ملک میں پایا جاتا ہے، نئی نئی طرح استعمال کرنے اور بیچنے یا بھیجنے کے لئے ضروری لوازمات تیار کئے جائیں۔ مثلاً بنڈل۔ لیبل۔ پیکٹ۔ فہرستیں۔ خط لکھنے کا کاغذ وغیرہ وغیرہ۔

دستکاروں کے لئے تربیت سونے پر سہاگہ ثابت ہوگی۔
اس سے چیزوں کا معیار بھی بہت اعلیٰ رہے گا اور ان کو کھپانے
کا بھی خاطر خواہ بندوبست ہو سکے گا۔ جوں جوں نئے ڈیزائن تیار
ہوتے جائیں گے انہیں ملک کے دوسرے دستکاروں کو مہیا
کیا جائے گا تاکہ انہیں وسیع پیمانے پر باہر بھی بھیجا جا سکے اور
اندرون ملک بھی زیادہ سے زیادہ کھپت ہو سکے۔ بلاشبہ ایک معقول
منصوبے کے تحت اس کام کا آغاز اور اس کو فروغ دینے کی
کوشش ایک بڑی ہی نیک فال ہے۔ اور قوی امید ہے کہ جب
اس کے نتائج پوری طرح بروئے کار آ جائیں گے تو یہ ہر اعتبار سے
بے انتہا مفید ثابت ہوگا۔

گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی دستکاریاں کسی ملک کی معیشت
میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ جاپان میں ان کی غیر معمولی ترقی
اور فائدہ مندی تنظیم ہی کا کرشمہ ہے۔ اور ہمارے ملک میں بھی
کچھ اسی نہج ہی پر کام ہونا چاہئے۔ یہ دستکاریاں دیہات کی
تقریباً ۹۰ فیصد آبادی کے لئے جو غیر تربیت یافتہ یا نیم تربیت
یافتہ ہے، فالتو وقت میں کام مہیا کرتی ہیں۔ کتنے ہی کاریگر ہیں جو
اپنے کنبہ کے دوسرے افراد کے ساتھ شہروں میں جا جا کر کام
کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد غیر مسلم بیوپاریوں کے چلے
جانے پر جو کاریگروں کو پیسہ دیتے اور مال منڈی میں کھپاتے
تھے، ان دستکاریوں کو بہت ہی زک پہنچی۔ اور دستکاروں
کو بھی بہت نقصان ہوا۔

اس صورت حال کو درست کرنے کے لئے مرکزی و صوبائی
حکومتوں کی طرف سے کئی کوششیں عمل میں لائی گئیں۔ لیکن
یہ سب متفرق نوعیت کی تھیں، اس لئے ایک منظم و مربوط
لائحہ عمل کی ضرورت پھر بھی باقی تھی۔ جس کے مطابق دستکاروں
کو ہر مرحلہ پر مدد دی جا سکے۔ یعنی روپے پیسے سے مدد، سستے داموں
کچا مال مہیا کرنا۔ فن کے گروں کے متعلق تحقیق، چیزوں کی بناوٹ
اور رنگ روغن، پالش جلا وغیرہ اور کھپت۔ ان کے لئے ایک
باقاعدہ ادارے کی ضرورت تھی جو کاریگر کے لئے اس کی محنت
کے مناسب عوض کو یقینی بنا سکے۔

یہی احساس "پاکستان سمال انڈسٹریز کارپوریشن" کے
قیام کا باعث ہوا جس نے جنوری ۱۹۵۶ء سے باقاعدہ طور
پر کام شروع کیا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ ادارہ گھریلو اور چھوٹے
پیمانے کی دستکاریاں ساری کی ساری اپنے ہی ہاتھ میں لے لینا
چاہتا ہے۔ اس کا مدعا تو ضرورت مند لوگوں کو مدد دینا ہے
اور بس۔ تاکہ دستکاریاں ٹھیک طرح چل سکیں۔ اور ان کا
کاروبار عمدہ طور پر جاری رہے۔

یہی مقصد تھا جس کے تحت ادارے نے چھوٹی دستکاریوں
کا دوسرا پنج سالہ منصوبہ (۶۵-۱۹۶۰ء) تیار کیا جسے ہماری
موجودہ انقلابی حکومت نے منظوری دے کر اپنے دوسرے
پنج سالہ منصوبے میں شامل کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان
دستکاریوں کی توسیع و ترقی کا سلسلہ حقیقی معنوں میں اب
شروع ہوا ہے اور کراچی میں "ڈیزائن سنٹر" ان کے مستقبل
کی ایک اچھی تمہید بھی ہے اور علامت بھی۔ خدا کرے ہماری
ان نفیس، خوبصورت دستکاریوں کو زیادہ سے زیادہ
فروغ حاصل ہو۔

★

یورپ کے مشہور مغنی، بیتھوون، نے کہا تھا کہ "یہ
ہے وہ موسیقی جس کی ادائیگی کے لئے بولوں کی ضرورت نہیں"۔
یہی قول ہماری دستکاریوں پر بھی صادق آتا ہے۔ ہمارے
ڈیزائن حسن کے ساتھ وہی مناسبت رکھتے ہیں جو منطق، سائنس
اور فلسفہ کے ساتھ رکھتی ہے۔ خواہ یہ ڈیزائن کتنے ہی پیچیدہ کیوں
نہ ہوں، ان کا اثر ہمیشہ فرحت بخش ہوتا ہے۔

صدہا سال کے قدیم تصوروں اور ڈیزائنوں کو زندگی
کے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے نئے نئے
ڈیزائن تیار کئے جا رہے ہیں۔ ہمارے کاریگروں میں قدرتی
طور پر یہ لگن پائی جاتی ہے کہ وہ خوبصورت چیزیں تخلیق
کریں جن کو دیکھ کر طبیعت میں خوشی کی لہر دوڑ جائے۔

(میجر جنرل) سید شاہد حامد
(صدر۔ سمال انڈسٹریز کارپوریشن)

لوک کھیل بقیہ صا

بقیہ صا

عطا کرتے ہیں۔ یہی ناٹک ہیں جن سے ہم اس دیس کے باسیوں کی امیدوں اور تمناؤں کا سراغ پا سکتے ہیں۔ اور یہ بھی جان سکتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے تھے اور انہیں کیا مل نہ سکا۔ اس طرح یہ ناٹک لوگوں کی خوشیوں اور غموں کا آئینہ ہیں۔ جو لوگ اپنے وطن سے محبت رکھتے ہیں یا عوام کے دل تک پہنچنا چاہتے ہیں، انہیں ان ناٹکوں میں بہت ہی کارآمد مسالہ دستیاب ہوگا۔

بعض اوقات وسط میں ایک اونچا چبوترہ بنا دیا جاتا ہے۔ گویّے اور کورس گانے والے چبوترے کے گرد زمین پر اور تماشائی ان کے پیچھے چبوترے کے گرداگرد بیٹھ جاتے ہیں۔ اداکار اپنے اپنے پارٹ کے مطابق اسٹیج پر آتے ہیں۔ اکثر اداکاروں کو پارٹ کے دوران گانا بھی پڑتا ہے۔ زمین پر بیٹھے ہوئے گاتک ٹیپ کا مصرع سنگت میں الاپتے ہیں۔ چونکہ تماشائی ان کے اردگرد بیٹھے ہوتے ہیں اسلئے اداکار حرکات وسکنات کی بجائے الفاظ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اگر وہ حرکات وغیرہ پر زور دیں تو قدرتی طور پر جو تماشائی ان کے دائیں بائیں بیٹھے ہوں اور انہیں دیکھ نہ سکتے ہوں، یہ ان کے لئے بے چینی کا باعث ہوگا۔ ان ناٹکوں میں خاموش اداکاری کوئی نہیں ہوتی۔ اداکار جس لب ولہجہ میں گفتگو کرتے ہیں، اس سے ہر موقع ومحل کے مطابق جذبات واحساسات کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ شیکسپیر کے زمانے میں انگلستان میں ہوا کرتا تھا، عورتوں کا پارٹ خوش رو جوان لڑکے نسوانی لباس پہن کر ادا کرتے ہیں۔ برسوں مشق کرنے کے باعث وہ اپنے اپنے پارٹ کے مطابق عورتوں کی مخصوص حرکات اور اوضاع واطوار بڑی کامیابی سے پیش کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ڈاڑھی مونچھ والا آدمی بھی عورتوں کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی حرکات اور گانے ہی سے تماشائیوں کے ذہن میں حقیقی ہیروئن کا تصور پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اس کی اداکاری واقعی اچھی ہو، تو دیکھنے والے اداکار کی ظاہری وضع قطع صورت کو بہ آسانی نظر انداز کر سکتے ہیں۔

اس قسم کے کھیل یا تو زمینداروں کی باڑیوں میں ہوتے ہیں یا ان سے باہر کھلی چٹیل زمین پر۔ کشتیوں کے بادبان بھلا کس وقت کام آئیں گے۔ انہیں آپس میں جوڑ کر شامیانہ تیار کیا جاتا ہے جسے تماشائیوں اور اداکاروں کے سر پر تان لیا جاتا ہے۔ تماشائیوں کے بیٹھنے کے لئے چٹائیاں یا گھاس پھونس زمین پر بچھا لیا جاتا ہے۔ معزز لوگوں کے لئے اسٹول یا کرسیوں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ جون اور جولائی کے مہینوں میں جب کسانوں کو زیادہ کڑا کام نہیں کرنا پڑتا، اداکار اپنی ٹولی کے سربراہ کے یہاں جمع ہو کر ریہرسل کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ مشق مہینہ مہینہ بھر جاری رہتی ہے۔ دوتارا اور بنسری کو سنگت کے لئے برتا جاتا ہے۔ خزاں کے شروع میں مختلف گاؤں سے فرمائشیں آنے لگتی ہیں۔ چنانچہ ٹولی کے لوگ اپنا سامان اور ساز وغیرہ لے کر جگہ جگہ کھیل دکھلانے جاتے ہیں۔ عام طور پر انہیں ایک بار کھیل دکھانے کے لئے بیس تیس روپے مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ اس سے بالکل مطمئن ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیل کے دوران بعض خوش ادا اداکار ہاتھ میں تھالی لے کر تماشائیوں میں چل پھر کر انعام مانگتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ موقع کے مطابق کوئی نہ کوئی گیت بھی گاتے جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مقررہ رقم سے کہیں زیادہ کما لیتے ہیں۔ اگر کوئی کھیل بہت ہی پسند کیا جائے تو انہیں انعام میں سونا چاندی بھی مل جاتا ہے۔

غرض یہ ہیں مشرقی پاکستان کے سیدھے سادے ناٹک جو سوچنے والوں کے لئے کافی غور وفکر کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

"ماہِ نو" کے لئے
غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم ونثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط وکتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت تصور کئے جائیں۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

MEDIUM
CAPSTAN
Navy Cut
CIGARETTES
W.D. & H.O. WILLS,
BRISTOL & LONDON.
10 CIGARETTES
CAPSTAN
پیجئے اور لطف اٹھائیے
ساڑھے نو آنے میں دس سگریٹ
جہاں کہیں مقامی ٹیکس عائد ہو وہاں قیمتوں میں کچھ فرق ہا ہے
یہ سگریٹ پاکستان میں بنائے گئے ہیں۔
Pakistan Tobacco Co. Ltd., Successors to W.D. & H.O. Wills, Bristol & London
PTC 685

انتخاب کلام

مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مشرقی پاکستان کے مسلمان شعرائے بنگالی ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں ان کا ایک مختصر مگر سیرحاصل انتخاب، عہد قدیم سے لیکر معاصر شعرا تک پیش کیا گیا ہے۔

یہ ترجمے پروفیسر احسن احمد ''اشک'' اور جناب یونس احمر نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں

ضخامت ۲۵۰ صفحات - کتاب مجلد ہے

پارچہ کی نفیس جلد - طلائی لوح سے مزین - قیمت ساڑھے چار روپے

یہی کتاب سادہ جلد میں چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

مسلم بنگالی ادب

(بنگالی سے براہ راست ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم-اے-پی-ایچ-ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیا، اہل قلم، شعرا اور ادبا نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور ادبی تحقیق کا شاہکار ہے۔

پوری کتاب نفیس اوٹائپ میں چھاپی
گئی ہے۔ اور مجلد ہے سرورق دیدہ‌زیب
اور رنگین - ضخامت ۴۰۰ صفحات
قیمت چار روپے علاوہ محصول ڈاک

—o:—

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کر سکے اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس و سرشار کر سکے۔

نوائے پاک میں ملک کے نامور شعرا کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں، گیت اور ترانے درج ہیں۔

کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گرد پوش سے آراستہ - گیٹ اپ، بہت نفیس اور دیدہ زیب۔

قیمت صرف دو روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ کراچی — مدیر : رفیق خاور

فلمی ستاروں کا سفید اور خوشبودار حسن بخش صابن
LTS.57-198-UD.

جلد ۱۳ — ماہِ نو — شمارہ ۷

جولائی ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

"ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں"

نذرِ عقیدت:- صدرِ عالی قدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے لندن تشریف لانے پر

ہم سے آوارگانِ غربت تک
زندگی کا پیام آ ہی گیا
صدر ایوب آج آ پہنچے
"صبر ایوب" کام آ ہی گیا

دیارِ پاک کی عظمت ہے عظمتِ ایوب
خوشا نصیب! وہ جلوہ فگن نظر آیا
ہوئی وطن کی زیارت دیارِ غربت میں
وطن سے دور، وہ نازِ وطن نظر آیا

خدا کا شکر کہ عہدِ خزاں ہوا رخصت
کہ طالبانِ چمن نے چمن کو دیکھ لیا
بس اک وجود میں شانِ وطن نظر آئی
بس ایک شخص میں قوم و وطن کو دیکھ لیا

وطن کو زندگیٔ تازہ بخش دی جس نے
وطن کا صدرِ جلالت مآب زندہ باد!
وہ انقلاب کا سچا نقیب آ پہنچا
برادرانِ وطن! انقلاب زندہ باد!

دیارِ غیر میں ہم سے وقارِ کشورِ پاک
جنابِ صدر! وطن کا وقار ہیں ہم لوگ
جو سوچیئے تو ہیں غربت میں ترجمانِ وطن
جو دیکھیئے تو غریب الدیار ہیں ہم لوگ

گلشنِ پاک! ترے نغمہ سرا غربت میں
کون کہتا ہے کہ شیریں سخنی بھول گئے
صدرِ ذی قدرِ وطن رونقِ محفل ہیں کلیم
آج ہم رنجِ غریب الوطنی بھول گئے

---

[1] یہ گلہائے عقیدت شاعر نے صدرِ پاکستان کے لندن تشریف لے جانے پر گلاسگو سے ارسال کئے۔ از دستِ صبا ہم تک پہنچے ہیں۔
ملامت بداں کہ ہر چہ افشاند ابر — از شاخ رسد بہ سبزۂ پائے نہال — غالب

(مدیر)

شعلۂ مستعجل

(شہزادہ علی خاں مرحوم)

سید فیضی

شہزادہ علی خاں کی بے وقت موت سے ایک دلچسپ زندگی کا
خاتمہ نہیں ہوا بلکہ تنوع اور مہم جو خطر پسندی کے عالم کو بھی ناقابلِ تلافی
ںقصان پہنچا ہے۔ دنیا ایک ایسے ہنس مکھ انسان سے محروم ہو گئی ہے
یہ صفت موصوف تھا۔ اور پاکستان کے لئے تو یہ سانحہ اور بھی جاں گداز
کیونکہ اس کی آرزوؤں کا بہترین ترجمان اس کی محفل سے اٹھ گیا۔ اس کی
اؤں کا لَو دیتا ہوا چراغ آخری سنبھالا لئے بغیر ہی خاموش ہو گیا۔ ماہ مئی
رہ تاریخ تک اس کی وجہ سے زندگی کے ہنگاموں میں کشش تھی، توانائی کا
یہ تھا، زندہ دلی کے عناصر تھے جو ہر مجلس میں رچے بسے رہتے تھے۔ حرارت و
نی نے اس کے اردگرد پُرنور ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ اس کی ذات سے محفلیں متنیر
ں لیکن آج وہ جگمگاتی ہوئی بساط اُلٹ چکی ہے، زندگی کے لبوں پر مچلتے
ئے نغمے سنائی نہیں دیتے۔ آغا خاں مرحوم کی شفقتوں کا بہاریں پیکر آج
۔ پژمردہ غنچے کی طرح شاخ سے ٹوٹ کر زمین دوز ہو چکا ہے۔ ایک طرف زندگی
یکتاں ہے تو دوسری جانب موت کو بھی کفِ افسوس ملے بغیر چارہ نہیں۔
لی فرض کے قوی احساس سے دونوں کا اضطراب یکساں ہے اور اس کی وجہ
ہے کہ خود علی خاں کی زندگی میں بھی عام طور پر یہی احساس کارفرما رہا ہے۔

ہز ہائی نس آغا خاں اور تھریسیا کی آرزوؤں کا یہ مظہر ۱۹۱۳ء میں
باس انسانیت جلوہ گر ہوا۔ ابتدائی زندگی کے ایام فرانس میں گذارے
یہیں ڈنکی اسکول میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد برطانیہ کو اپنا مستقر
ہا۔ ۱۹۳۵ء تک یہاں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور بہترین زیورِ تربیت سے
ہ آپ کو آراستہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علی خاں کا نام محدود حلقوں سے نکل کر
بھر کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا حامل ہو چکا تھا۔ یہ علی خاں کی خوش
اقی، تدبر اور معاملہ فہمی کا اعجاز تھا کہ اسی دوران میں مرحوم آغا خاں
سے اپنا روحانی اور دنیوی وارث بھی قرار دیا تھا۔ یہ صحیح ہے
بعد میں یہ فیصلہ تبدیل ہو گیا اور اس کے چند در چند وجوہ تھے لیکن
تبدیلی سے علی خاں کی ذاتی خوبیوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس کے

برعکس یہ خوبیاں اور زیادہ گہرے رنگوں میں ظاہر ہو کر رہتی ہیں۔ آج
علی خاں نے جیتی جاگتی زندگی سے مُنہ پھیر لیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے
کہ زندگی اپنی روشنی اور حرارت کو دوبالا کرنے کے لئے علی خاں کو اکثر یاد
کرتی رہا کرے گی۔ بچپن ہی سے وہ آغوشِ شہزادگی میں پروان چڑھا تھا
اور اس طرح اپنی عادات و خصائل کے سبب شہزادہ کہلانے کا اُسے
بجا طور پر استحقاق حاصل ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اس نے صرف
ناز و نعم کی زندگی گذاری ہے اور صعوبتوں کے مقابل آنے کا کبھی موقع
ہی نہیں ملا۔ دیکھا جائے تو وہ ریشم کی طرح نرم بھی تھا اور پتھر کی طرح سخت
بھی۔ شعلہ و شبنم اس کی زندگی کے دو ہنگامہ خیز رُخ تھے۔ ایک میں لپک
تھی تو دوسرے میں لچک۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ اور صلح کے زمانے میں اس
نے بین الاقوامی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے اور جس رخ کو بھی اہلِ
عالم کے سامنے پیش کیا ہے اس میں اپنی انفرادیت کے اَنمٹ اور واضح
نقوش چھوڑے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں حکومتِ فرانس کی جانب سے
وہ امورِ خفیہ کے ایک ذمہ دار عہدے پر مامور تھا اور مشرقِ وسطیٰ میں
اس نے فرانس کی بہت بڑی خدمات سرانجام دیں۔

اسے ذاتی ہُنرمندی کہئے یا کسبِ صلاحیت کہ علی خاں کو جس
لباس میں بھی دیکھا جائے وہ اسی میں موزوں قامت اور مجسمۂ رعنائی نظر
آئے گا۔ اسمٰعیلی عقائد کی رو سے اس کی ذاتِ گرامی کو امامِ وقت ہونے کا
شرف حاصل ہے۔ شوقین مزاج اسے اپنا سرخیل سمجھتے رہے۔ سیاستدانوں
میں وہ ایک سلجھا ہوا دماغ متصور ہوتا تھا۔ کھلاڑیوں میں بہترین کھلاڑی،
حکمتِ عملی کا ماہر اور موقع و محل کو جاننے والا۔ اور یہ تمام صفتیں بیک وقت
علی خاں کی ذات میں اس طرح تمام و کمال مجتمع نظر آتی تھیں کہ دیکھنے اور
سننے والوں کو بھی حیرت ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جون سے شادی
ہوئی تھی جس کے بطن سے شہزادہ کریم (موجودہ آغا خاں) اور شہزادہ
امین پیدا ہوئے۔

پرنس علی خاں کے قریبی تعلقین کا بیان ہے کہ پرنس کی عالمگیر شہرت کا راز خود اس کے ذاتی فضائل میں مضمر تھا۔ اسی لئے جس شخص سے بھی اس کو سابقہ پڑتا تھا۔ اس کے دل میں اس کی شخصیت گھر کر جاتی تھی۔ انسان ہوتے ہوئے وہ روحِ اتحادِ انسانی کا مجسمہ تھا جس کے انگ انگ سے محبت اور پیار کے چشمے پھوٹتے تھے۔ انسانیت اس کی نظروں میں ایک ہی برادری تھی، اس کی مثال زنجیر کی ان کڑیوں کی طرح تھی جو خود بخود ایک دوسرے سے مربوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارے میں ابھی دو سال ہوئے پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے اس کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ یہاں اس نے اپنی شعلہ بیانیوں سے جس طرح امن کو برقرار رکھنے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ وقت کی گونجتی ہوئی آواز تھی جو سننے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرکے رہی۔

دنیائے اسلام کو بھی اُس نے ایک متحدہ پلیٹ فارم پر لانے میں جو کوششیں کی ہیں، اُن کی رُو سے علی خاں کو اسلامی دنیا کے اتحاد کا بہترین ترجمان کہا جاسکتا ہے۔ وہ دل سے اسلامی اصول و اقدار کا عقیدت کیش تھا۔ یو۔ این۔ او میں اس کی تقریروں سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اُس کے دل میں اسلامی آئین و ضوابط کی بڑی قدر تھی۔ وہ صرف اسلامی دنیا کے باہمی اتحاد کا ہی مظہر نہیں تھا بلکہ ان ثقافتی اور روحانی قدروں کو بھی اپنی ذات میں سموئے ہوئے تھا جو عالم اسلام میں اس کے خونی اور روحانی رشتوں سے مستحکم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اپنے مختصر سے دوران خدمت میں اُس نے ڈپلومیسی کے عالمی ماہرین کو اپنے خیال کی پختگی اور فرض کی ادائیگی سے بہت متاثر کیا۔ دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں نے اُسے عظمت کی اُن بلندیوں پر جگہ دی ہے جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آسکی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک عظیم انسان تھا۔ اور اس کی عظیم شخصیت کے بہترین نقوش وہیں زیادہ اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں قوم و ملک کی اصلاح و ترقی کے مسائل درپیش ہوں۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علی خاں نے ان سینکڑوں تعلیمی اداروں کی اصلاح اور تعمیر و ترقی پر صرف کیا۔ جو پاکستان، افریقہ، ہندوستان، شام اور دنیا کے دوسرے ممالک میں واقع ہیں۔ ان اداروں میں علمی، سماجی، فنی اور تعلیمی ادارے بھی شامل ہیں۔ اور دیکھا جائے تو تعلیمی اداروں کی ترقی میں آغا خاں کے گھرانے نے جس شوق اور مستعدی سے کام کیا ہے دوسری جگہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہ آغا خاں کے اجداد ہی تھے

جنہوں نے مصر کی مشہور "جامع ازہر" کے لئے شبانہ روز کوشش کی، اور اسے بین الاقوامی یونیورسٹی کا درجہ دلوانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خود آغا خاں مرحوم نے علیگڑھ یونیورسٹی کی تعمیر میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ تاریخ علیگڑھ کا ناقابل فراموش ورق بن چکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ تعلیمی اداروں کی خدمت آغا خانیوں کی خاندانی روایت بن چکی تھی اور غالباً یہ اسی روایت کا تتمہ ہے کہ پرنس علی خاں نے بھی کراچی یونیورسٹی کی نئی عمارت کے لئے چندے کی فراہمی کا کام برضا و رغبت اپنے ذمے لے رکھا تھا اور بین الاقوامی طور پر حتی المقدور وہ اس کے لئے کوشاں رہتا تھا۔

یو۔ این۔ او میں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے جہاں اور عوامل علی خاں کی شہرت و ناموری کا باعث بنے ہیں۔ وہاں اس کی رفاہِ عامہ پالیسی کو بہت دخل رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کے درمیان اسے واسطۃ العقد کی حیثیت حاصل تھی جو انہیں بلادِ مغرب سے ملائے رکھتی تھی۔ بین الاقوامی سیاست کا رُخ بدلنے کے لئے دو سال کا عرصہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود اپنی بصیرت اور بصارت سے دن رات کام لیتے ہوئے پرنس علی خاں نے یہ ثابت کر دیا کہ اصول صداقت کی رہنمائی ہو تو اُلجھے ہوئے مسائل کی گتھیاں خود بخود سُلجھتی جاتی ہیں۔ پاکستان کا مستقل نمائندہ ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے کہ اس کی سیاسی سوجھ بوجھ کی بنا پر علی خاں کو جنرل اسمبلی کا نائب صدر منتخب کر لیا گیا۔ یہ ایسا اعزاز تھا جس سے پاکستان کے وقار میں بھی اضافہ ہوا اور اغیار کی نگاہوں میں اس کی ساکھ بھی بڑھ گئی۔ گزشتہ سال عالمی امن کمیشن کے نائب صدر کا عہدہ بھی حاصل کرکے علی خاں نے پاکستان کے بین الاقوامی وقار کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ حادثے کے دو روز قبل ارجنٹائن کی حکومت نے بھی بوئنس ایرز میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے اُس کے تقرر کی منظوری کا اعلان کر دیا تھا۔ اِدھر علی خاں کے مناصب بڑھ رہے تھے اور اُدھر مشیت کسی اور ہی خیال میں تھی۔ موت کے سرد ہاتھوں کی گرفت کتنی سخت ہوتی ہے۔ کون جانتا تھا کہ یو۔ این۔ او میں پاکستان کا مستقل نمائندہ اور ارجنٹائن میں نامزد سفیر پیرس کے نواحی علاقے کی ایک سڑک پر کار چلاتے ہوئے یوں حادثے کا شکار ہو جائے گا اور اس کی

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

”شعلۂ مستعجل“

ان مرحوم، سابق مستقل نمائندۂ پاکستان برائے اقوام متحدہ)

شب و روز خدمت پاکستان میں مصروف

عالمی مدبروں سے اہم مسائل پر تبادلۂ خیال

خدمت پاکستان کا آغاز: اسناد تقرری کی پیشکش

” مٹنے والے مٹتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں “

مزار شریف : گلبرگہ (دکن)

گہر ہائے آب دار :

تصانیف کے قلمی نسخے

" بندہ نوازے گیسو درازے "

نامور صوفی بزرگ اور اردو کے اولین مصنف، خواجہ بندہ نواز گیسو
(گلبرگہ دکن) کی یاد میں کراچی کا ایک ثقافتی اجتما

مقالہ : مسلم ضیائی

تقریر : ڈاکٹر ایم ۔ ایم ۔ اح

ایک اور خراج عقیدت
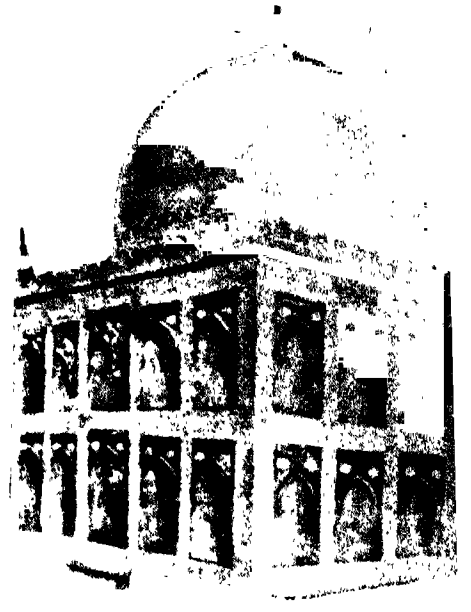
آزاد بہ حیثیت انشا پرداز

ڈاکٹر محمد صادق

یہ مضمون اُس مقالہ کا ایک باب ہے جسے صاحب مضمون نے عرصہ ہوا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔

اس میں، منجملہ دیگر امور کے، یہ بات واضح کی گئی ہے کہ آزاد نے اپنے استاد ذوق کے کلام کے ساتھ ایسی بے تکلفی برتی ہے جسے اصلاح و تصرف ہی قرار دینا بجا ہوگا۔ نیز یہ کہ آزاد کے سفر ایران کا مقصد سیر و سیاحت نہ تھا سیاست تھا۔ اس پر موصوف کا ایک مضمون "ماہ نو" جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ بریں "نیرنگ خیال" کے کتنے ہی مضامین جزداً یا کلاً ایڈیسن، سٹیل اور جانسن سے ماخوذ ہیں۔

بہرکیف آزاد کا یہ مطالعہ اپنی جگہ بہت وقیع اور مزید تحقیق و تبصرہ کا متقاضی ہے اور اگر کوئی صاحب اس باب میں اپنی آرا یا نتائج تفحص پیش کرنا چاہیں تو "ماہ نو" کے صفحات اس کے لئے ہمیشہ حاضر ہیں۔ (مدیر)

آزاد کو بحیثیت نقاد اور مورخ تو ناقدان فن نے یونہی ادپرے دل سے تسلیم کیا ہے، لیکن جہاں تک اس کی انشاپردازی کا تعلق ہے انہوں نے اس کی غیر معمولی حد تک تعریف و ستائش کی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ آیئے ہم اس کے اسلوب تحریر پر نظر ڈال کر اس کا اندازہ لگائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آزاد کا اسلوب بیان اسکی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ تمام خصوصیتیں جن کی ہم آزاد بحیثیت انسان میں نشان دہی کر سکتے ہیں۔ وہ اس کے انداز بیان میں جلوہ گر ہیں خواہ ہم اس کی شخصیت سے اس کے اسلوب بیان کے تیور معلوم کریں یا اس کی تصانیف سے اس کی شخصیت کا سراغ لگائیں، بات ایک ہی ہے۔ آزاد ایک بہت ہی جذباتی اور صاحب تخیل انسان تھا۔ وہ تھا تو جدید لوگوں کے زمرے میں شامل لیکن اس کی طبیعت ماضی میں الجھی ہوئی تھی۔ یہ ساری خصوصیتیں اس کے انداز نگارش میں بھی منعکس ہیں۔

آزاد کے انداز تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے اس کی مصوری نوعیت۔ اس کے ذہن میں جو بھی خیال آتا ہے وہ ہمیشہ سلسلہ وار تصاویر کے روپ ہی میں آتا ہے۔ خیالات اس کے سامنے مجرد شکل میں نہیں آتے بلکہ تصاویر کا جامہ پہن کر آتے ہیں ـ وہ امادۃً واقعات کا نقشہ نہیں کھینچتا۔ بلکہ یہ تو اس کی چشم تصور میں آپ ہی آپ اپنا عکس دکھاتے ہیں گویا وہ اس کی نظروں کے سامنے رونما ہو رہے ہوں۔ اور جو کچھ وہ دیکھتا ہے اسے اپنے صفحات پر مرقع زندگی کے رنگ روپ اور شکل و صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی تحریرات سے مندرجہ ذیل جستہ جستہ پارے دیکھئے جو یونہی سرسری طور پر ورق گردانی کرتے ہوئے چن لئے گئے ہیں اور دیکھئے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ کس طرح اس کی پوری پوری تصدیق کرتے ہیں:۔

اس حالت میں اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور
ہر عہد میں اس کے بانکالوں کی حالتیں نظر آئیں۔ چنانچہ
اس لحاظ سے پانچ جلسے سامنے آئے اور ایک نے دوسرے
کو رخصت کیا اور اپنا رنگ جمایا۔

★

غرض حالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا
جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں .... اس طرح
لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی تصویریں سامنے
آن کھڑی ہوں۔

★

اس سے کا تماشہ ایک عالم ہوگا دیکھنے کے
قابل۔ آزاد اس حالت کا فوٹوگراف الفاظ اور عبارت
کے رنگ و روغن سے کیونکر کھینچ کر دکھلائے۔

حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے اپنے پڑھنے والوں پر جو جادو کا اثر کیا ہے وہ تخیل کی اس براقی اور ذکاوت ہی کا کرشمہ ہے اور ساتھ ہی اس کی پرلطف خامیوں کا باعث بھی یہی ہے۔ بعض موضوعات فی نفسہ ایسے ہیں کہ وہ تخیلی پیرایہ کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کے برعکس کئی ایسے بھی ہیں جن کو سنجیدگی کے ساتھ صاف سیدھے پیرائے میں براہ راست پیش کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ آزاد کو استعارات اور مرقع کشی کا اس قدر شوق تھا کہ اس نے ایک وطیرے کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جو موضوع بھی سامنے آئے اسے اپنے طبعی رجحان کے ماتحت تخیل ہی کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے اسلوب بیان پر ایک گریز لازم ہے۔

نثر اور نظم میں بالعموم جو امتیاز کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض اوقات گمراہ کن ثابت ہوتا ہے، پھر بھی اس میں کافی کچھ صداقت پائی جاتی ہے۔ نثر بحیثیت صنف بیان مبسوط، تشریحی اور تجزیاتی ہوتی ہے۔ اور نثر نگار عموماً تمام غیر متلازم تاثرات اور ایمائیات کو دور ہی رکھتا ہے، اطلاعیہ مقابلوں اور موازنوں سے کام لیتا ہے جن سے اس کی تحریر میں بداہت اور قوت پیدا ہو —— یہ ایسی خصوصیات ہیں جو نمایاں طور پر عقلی ہیں۔ لیکن اگر کوئی تحریر ذہن کو نفسِ موضوع پر مرکوز کرنے کی بجائے اسے اس سے دور لے جائے تو وہ اس حد تک ناقص ہے۔ اس کے برعکس شاعر کا وہ نفسِ انسان کے تخیل سے ہے اور منجملہ دیگر امور کے، جن پر یہاں بحث کرنے کی ضرورت نہیں، وہ جادو کی چھڑی جو اس کے احساسات کو مقامی اسم و عرف عطا کرتی ہے، وہ مجازات یعنی استعارات و تمثیلات وغیرہ ہی ہیں۔ نثر اور نظم میں فرق یہ ہے، نثر کی نوعیت عقلی اور تجزیاتی ہے۔ اس کا کام تشریح یا کیفیت بیان کرنا ہے۔ اس کے برخلاف نظم تخیلی اور ترکیبی ہے یعنی مختلف عناصر میں ربط و تعلق پیدا کرتی ہے یعنی نظم کی ساری زندگی کو شعلہ زن کر کے تمام تجربہ کی ازسرِ نو تخلیق اور شیرازہ بندی کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر جہاں تک نثر کا تعلق ہے مجازات کو ذیلی و اضافی حیثیت حاصل ہے۔ مگر شاعری کی بات اور ہے۔ استعارے اور تشبیہ وغیرہ اس کا نفسِ ناطقہ ہیں۔ اور اس کے لئے روحِ رواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مجازات نثر میں ایک عقلی عنصر کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں۔ مگر عملی حیثیت سے نظم و نثر ایک دوسری کی رقیب نہیں کہ ان میں کوئی مفاہمت نہ پیدا ہو سکے اور جہاں ایک ہو وہاں دوسری کے لئے گنجائش نہ ہو۔ نثر جیسا کہ عموماً دیکھنے میں آتا ہے، ایک سائنسداں یا فلسفی کے سرد اور جچے تلے انداز سے ہوتی ہوئی نثر و نظم کے کم و بیش امتزاج کی بے شمار تدریجی حالتوں سے گزرتی ڈی کوئنسی اور رسکن تک پہنچ سکتی ہے۔ جن کے یہاں یہ بعینہ شاعری کی زبان میں بولتی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس نظم بھی اپنا مخصوص شعری لبادہ اوڑھے ہوئے بالکل خشک و بے کیف نثر میں مستغرق ہو سکتی ہے۔ لہٰذا حقیقی امتیاز نظم و نثر کا نہیں بلکہ نظم اور نفس الامر کا ہے۔ جیسا کہ انگریز نقاد کولرج نے عرصہ ہوا بیان کیا تھا۔

مگر نظم و نثر کا ایک دوسرے پر حاوی ہو جانا نقاد کے لئے کوئی دشواری نہیں پیدا کرتا۔ اسلوب تحریر کا مسئلہ بڑا سیدھا سادا ہے۔ وہ اپنا منصب ٹھیک ادا کرتا ہے یا نہیں؟ کیا یہ خیال کے اظہار میں نکتہ اور قوت پیدا کرتا ہے؟ انداز بیان کا کام بس مختصر الفاظ میں اسی قدر ہے کہ جو بات کہی جائے پوری قوت و قدرت سے کہی جائے یا احساسات و تجربات میں جس قدر وسعت تصور کی جا سکتی ہے، اس کے جس پہلو کو بھی چھوا جائے، وہ نامناسب نہ ہو

اگر کوئی انشا پرداز کوئی استعارہ یا تمثیل برتتا ہے تو وہ زیادہ اثر پیدا کرنے ہی کے لئے عام انداز بیان سے انحراف کرتا ہے۔ اسلوب بیان کا مقصد اظہار ہے اور استعارے تشبیہیں یونہی آرائش یا زیب داستان کے لئے نہیں برتی جاتیں بلکہ اظہار ہی کے لئے برتی جاتی ہیں۔

اس توضیح و تشریح کے بعد ہم آزاد کے اسلوب بیان پر بحث کر سکتے ہیں۔ اور یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ استعاروں کی تمثیلی زبان کا استعمال موزوں ہے یا ناموزوں۔ کیا اس کے استعارے اور تشبیہیں ہمیشہ بیان کو زیادہ واضح و صاف بنانے اور اسے مؤثر بنانے میں مدد دیتے ہیں یا نہیں؟ یا جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس سے توجہ ہٹا دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

یہ کون نہیں جانتا کہ آزاد کا تخیل غیر معمولی حد تک تیز ادر ادراک پر بہت ہی غالب ہے۔ اس کے متعلق بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے ایک چیز دکھلائیے تو اُسے فوراً اس جیسی کوئی اور چیز سوجھنے لگے گی۔ تخیل کی اس تیزی کا ایک ہی نتیجہ ہے۔ خیالات کے طوطے مینا یا پُتلے بنانا۔ دیکھئے وہ "آبحیات" میں ولی کے متعلق کیا کہتا ہے۔

"نظم اردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے۔ نفس ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی۔ مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولی نے آکر ایسی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی کہ اس بچے نے انگڑائی لے کر کروٹ لی۔ اور اخراس کا دفعۃً حرارتِ برقی کی طرح دل دل میں دوڑ گیا"

یا پھر "نیرنگ خیال" میں اردو کی نشو و ارتقا کے بارے میں یہ پارہ ملاحظہ فرمایئے :۔

"زبان اردو ایک لاوارث بچہ تھا کہ اردوئے شاہجہانی میں پھرتا ہوا ملا۔ کسی کو اس غریب کے حال سے پروا نہ ہوئی۔ اتفاقاً شعراء نے اٹھا لیا۔ اور محبت سے پالنا شروع کیا۔ اس نے انہی کے کھانے سے خوراک پائی۔ انہی کے لباس سے پوشاک پہنی۔ انہی سے تعلیم کا سرمایہ لیتا رہا۔ اسی واسطے انہی کی زبان سے بولنا سیکھا۔ انہی کے قدموں پر چلنا سیکھا۔ انہیں کے خیالات اس کے دل و دماغ میں سمائے"

ان دونوں پاروں میں وہ ایسے خیالات کو اسی طرح تمثیلاً پیش کر رہا ہے جس طرح انگریز مصور، واٹس اپنی تصاویر کو۔ ظاہر ہے کہ ان خیالات کو سیدھے سادے سامنے کے پیرائے میں بھی بیان کیا جا سکتا تھا۔ مگر جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، آزاد کا تخیل اس کے ادراک سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ اس لئے وہ نفس الامر نہیں تصویر پیش کرتا ہے۔ اس تخیلی مرادف سے خیالات کی ادائگی میں مدد ملتی ہے یا نہیں، ایک اور بات ہے جس پر ہم پھر کبھی بحث کر سکتے ہیں۔

سر دست ہمیں جس معاملہ سے سروکار ہے وہ یہ ہے کہ آزاد اپنے قارئین کو اتنی معلومات بہم نہیں پہنچا رہا جتنا بالواسطہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ وہ خود ان سے کس طرح متأثر ہوا ہے۔ آزاد کی تمام تحریروں میں یہی بڑا گھلا ملا ذاتی انداز پایا جاتا ہے نفس الامر نہیں بلکہ کوائف کو تأثراتی بنا کر پیش کرنا اور مصنف کا اپنی طبیعت اور شخصیت کو اجاگر کرنا۔ یہ چیز ہے جو ہمیں آزاد کے یہاں ملتی ہے۔ ذیل کی چھوٹی چھوٹی قلمکاریاں اس رجحان کو اور بھی نمایاں کرتی ہیں :۔

"چنانچہ، ماگدی (پالی)، سورسینی، مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتہ بتاتی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سینکڑوں الفاظ سنسکرت کے چھپے نظر آتے ہیں مگر بگڑے ہوئے ہیں۔

★

ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا۔ اس کا نام دیوان زادہ رکھا کیونکہ پہلے دیوان سے پیدا ہوا تھا۔ وہ صاحب زادہ بھی پلنگ ہزارے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے۔

ان پاروں سے آپ کو معلومات کے علاوہ کچھ اور بھی ملتا ہے۔ یہ کہ آزاد نے ان سے کیا اثر لیا ہے۔ یہی تأثراتی یا ذاتی عنصر ہی ہے جو مصنف کو شاعر سے اسقدر قریب لے آتا ہے کیونکہ شاعری کا سروکار اتنا کوائف و حقائق سے نہیں جتنا ان احساسات اور کیفیات سے جو وہ بطون مصنف میں پیدا کرتے ہیں۔ آزاد خیالات کو کس طرح سانچے میں ڈھالتا ہے، "آبحیات" کے اس پارے میں ملاحظہ فرمایئے

"قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہل مشاعرہ آ پہنچے۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں۔" ان کا تو غضب کا آنا ہے: ہائے

نئے دل اور خوش طبع ہوں گے۔ کہ جن کی شوخی اور
طراری طبع یا رستانت سے ذرا نہ دبیگی اتنا ہنسیں
اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے۔ مگر نہ ترقی کا
قدم آگے بڑھائیں گے۔ نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔
انہیں کھنڈروں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان کو
دوسرے مکان سے سجائیں گے۔ اور ہر شے کو رنگ
بدل کر دکھائیں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ آزاد کا تخیل کس قدر شوخ ہے۔ اور یہ کس طرح بہ آسانی محسوس پیرایوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ چنانچہ آبحیات میں دبستان لکھنؤ کے آزاد اور کھلے طور طریق اور شاہ نصیر، مومن، غالب، وغیرہ کی پیچیدہ، دور از کار تشبیہات کو بڑے ہی چلبلے اور محاکاتی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے ہم ان میں سے بعض پاروں کو پڑھ کر بے اختیار واہ تو کہہ اٹھتے ہیں مگر سچ پوچھئے تو ہم یہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ اچھی، بکار آمد نثر کبھی ایسا پیرایہ اختیار نہیں کرتی اور اسے کبھی اس انداز سے اپنا منصب ادا نہیں کرنا چاہیئے۔

آزاد کے اسلوب نگارش پر سب سے بڑا اعتراض یہی وارد ہوتا ہے کہ وہ قوت مدرکہ کی تسکین نہیں کر پاتا۔ وہ ہمیں اپنے تخیل کی طرفہ کاریوں سے متاثر اور محظوظ تو ضرور کرتا ہے۔ لیکن اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ذہن نشین نہیں کر سکتا۔ اس کا تخیل مطلوبہ مضمون سے توجہ کو پھیرے ہٹا کر کسی اور طرف لے جاتا ہے۔ جب ہم اس پر لطف چٹکلے یا چنبھے کے پہلے اثر کو بھول جاتے ہیں تو ہم بالعموم اس مرقع کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو دور کر کے اصل مطلب تک پہنچنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر آزاد خیالات کو احساسات کا رنگ عطا کر دیتا ہے۔ وہ مبہم اشاروں میں بات چیت کرتا ہے۔ اسلئے ذہن غیر مطمئن رہتا ہے۔

آزاد کے اسلوب کے جواز میں یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ نفس مضمون ٹھیک طرح اجاگر ہو نہ ہو اس کے حسن و خوبی کو تو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ حسن جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے ظاہری سامان آرائش لا دینے سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ کسی خاص مقصد کیلئے مناسب ذرائع اختیار کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ خیالات اور تجربات کو بالکل اسی پیرایہ میں پیش کیا جائے جو اُن کے لئے فطرتاً موزوں و مناسب ہے۔

آیئے ہم ان مختلف پیرایوں کا مطالعہ کریں جن میں متخیلہ کام کرتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ محض ایک لفظ، فقرے یا تخیل سے ذہن میں کوئی لمبی چوڑی تصویر جاگ اٹھتی ہے جیسا کہ مثال کے طور پر اس پارے میں ہے:۔

> اس عہد کی حالت اور بھاشا زبان کو خیال
> کرتا ہوں تو سوچا رہ جاتا ہوں کہ یہ صاحب کمال زبان
> اردو اور انشائے ہندی میں کیونکر ایک نئی صنعت کا
> نمونہ دے گیا اور اپنے پیچھے آنے والوں کے
> واسطے ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالتا گیا۔ کیا اسے
> معلوم تھا کہ اس طرح یہ سڑک ہموار ہو گی۔ اس پر دکانیں
> تعمیر ہوں گی۔ لالٹینوں کی روشنی ہو گی۔ اہل سلیقہ دکاندار
> جواہر فروشی کریں گے اور اُردوئے معلیٰ اس کا خطاب ہو گا۔

یہ رہا ایک سڑک کا نقشہ اپنے تمام تلازمات، مناسبات اور سرگرمیوں کے ساتھ: دکانیں، لالٹینیں، خریدار اور خرید و فروخت کی گرم بازاری۔ اور یہ ساری جیتی جاگتی تصویر صرف ایک ہی لفظ کا کرشمہ ہے "اردوئے معلیٰ"! اس سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ آپ آزاد کو کوئی لفظ دے دیجئے۔ اور وہ اس کو کبھی نہیں چھوڑے گا تاوقتیکہ اسکے تلازمات کے سارے سلسلے ختم نہ ہو جائیں۔ ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے:۔

> میر خلیق نازک خیالیوں میں ذہن لڑا رہے تھے کہ
> باپ کی موت نے شیشے پر پتھر مارا۔ عیال کا بوجھ پہاڑ ہو کر
> سر پر گرا جس نے آمد کے چشمے خاک ریز کر دیئے مگر ہمت
> کی پیشانی پر ذرا بل نہ آیا۔

یہ کیا ہے؟ استعاروں کا طومار۔ یہ ایک ایسا ذخیرہ ہے جہاں پچھلے استعارہ کے ہر لفظ یا الفاظ نے کوئی نیا استعارہ سجھایا ہے۔ اور یہی اس پارے کی کمزوری کا باعث ہے پچھلے پارے میں صرف ایک تصویر تھی جس کو پوری طرح اجاگر کیا گیا تھا اور جیسے جیسے ہر ہر تفصیل آتی جاتی ہے وہ تصویر کو اور بھی ذہن پر نقش کرتی جاتی ہے۔ مگر دوسرے پارے میں جزئیات بالکل اَنمل بے جوڑ ہیں۔ اور

ایک تفصیل کے بعد دوسری تفصیل سے مٹھوکریں کھاتا ہوا چلتا ہے جیسے انسان گرتا پڑتا اندھا دھند کسی چھلاوے کے پیچھے دوڑ رہا ہو۔ تصویر کو ذہن میں مرتسم کرنے کا کیا ذکر، نہ جانے تمام نقوش ایک دوسرے کا اثر کاٹتے چلے جاتے ہیں۔

یہ تحرک و چمک کا شوق بعض اوقات اس قسم کی بے ہنگم بوالعجبی پر منتج ہوتا ہے:

خلوت کے چمن میں حکم ہوا مشورت کی بلبلیں آئیں کہ ہنگامے کے لئے کیا صلاح ہے۔ بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بندوبست ہو۔ جاڑے کی آمد میں ہنگامے پھولوں رنگینی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی غنیم کو دم نہ لینے دو۔ اڑ جائیں اور چھری کٹاری ہو جائیں۔ کہ یہی بہار ہے۔ فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی ہانک رہی ہے۔

اندر پہونچ تو اس سے بھی گیا گزرا ہے:

۹۶۴ میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیموں کی فہم عالی تھی۔ اکبر شکار کھیلنے لاہور کو چلے آتے تھے۔ جو نغمہ بلبل کے سروں میں کسی نے آواز دی کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔

یہاں آزاد نے ایک ایسی تصویر کھینچی ہے جس کے مضحک تلازمے ذہن کو نفس موضوع سپہ سالار کی شجاعت سے دور لے جاتے ہیں۔ اس قسم کی خامیاں ناموزوں عبارت کے تحت آتی ہیں۔

یہی اعتراض ان مقامات پر بھی وارد ہوتا ہے جن میں تجسیم یا تشخص سے کام لیا گیا ہے۔ ان سے متبادر ہوتا ہے کہ بے جان چیزوں کی اشکالِ انسانی سے تطبیق کی گئی ہے جو پرانے زمانوں میں قدرت کی ہر چیز کو جاندار خیال کرنے کی یادگار ہے۔ جب کہ جاندار اور بے جان چیزوں میں کوئی حدِ فاصل نہ تھی۔ اور بے جان مادے کو بھی جاندار خیال کیا جاتا تھا۔ جہاں تک شاعروں کا تعلق ہے یہ تو ان کا قدرتی ہتھیار ہے اور آزاد اس کو شاذ و نادر ہی بے تکلف، وغیر دستی پیرائے میں استعمال کرتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہ نظم و دھوکی بندش کا آدم جب ملک عدم سے چلا

تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا۔ جس میں وقت کے محاورہ نے اپنے جواہرات خرچ کئے اور مضامین کی علیٰ الوقت دستکاری سے مینا کاری کی...

غرض جب ان کا دیوان دلّی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔ قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبانوں سے پڑھا۔

اس قسم کی عبارت آرائی میری دانست میں پرانے منشیانہ طرزِ انشا کی یادگار ہے جو ایک حد تک اس عبوری دور میں بھی برقرار رہی جس سے آزاد تعلق رکھتا ہے۔ ان خصوصیات کی موجودگی آزاد کی دوگونہ وفاداری کی ایک اور علامت ہے جو اس دور کی ایک خصوصیت خاصہ ہے۔ آزاد جس قسم کی تجسیم سے کام لیتا ہے اس کی نوعیت کچھ ایسی جامد سی ہوتی ہے۔ لیکن عظیم لمحات میں جب کہ اس کی متخیلہ موضوع کی عظمت سے برانگیختہ ہو جاتی ہے، اس میں ایک نادر حسن اور موثر کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ درج ذیل پارے میں سناٹا، اندھیرا اور رات واقعی ایسے پُراسرار کردار معلوم ہوتے ہیں جو جنگ کے سنگین ڈرامہ میں ایک فیصلہ کن حصہ لیتے ہوئے معلوم دیتے ہیں:

تکبیر کی آواز سے برہمنوں اور راجپوتوں کے دلوں کا گیان دھرم کی آگ سے ایک دھواں اٹھا اور راجپوتوں کے دلوں میں خون غیرت نے جوش مارا۔ دفعتہً آگ بگولا ہو کر دوڑے جو تیر انداز فصیل پر کھڑے تھے ان سے آتے ہی چھری کٹاری ہو گئے۔ اور سب کو کاٹ کر نیچے گرا دیا۔ پھر تو ادھر سے آتشبازی کے بان اور رال کی ہنڈیاں تھیں اور ادھر سے تیر کی بوچھاڑ اور برچھیوں کی بجلیاں، عالم گرد و غبار سے اندھیرا ہو گیا اور لڑائی برابر ترازو کے تول تلی ہوئی تھی۔ مگر قلعہ کا پلہ بھاری تھا کہ اتنے میں شام نے آ کر اندھیرے کی سپر بیچ میں رکھ دی، دونوں لشکر اپنے اپنے مقام پر آئے۔ شب خون کی روک تھام کا بندوبست ہوا..........

غرض ہر طرف سناٹے کا عالم تھا۔ اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کرتا تھا۔ اور گھوڑے سے

سے کر اونٹ تک ساتھ دیتا تھا۔

غرض ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ ایک ہی ہے۔ استعارات و تمثیلات شدید جذبات کی زبان ہیں اور وہ شعر و شاعری کے محل ہی پر موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ حقائق کی ترجمانی براہ راست ہی ہونی چاہئے اور استعارے تمثیلیں ان کے ساتھ کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ آزاد نے جو استعارے اور تمثیلیں برتی ہیں وہ ایسے ہی محل پر کامیاب ثابت ہوئی ہیں جن میں جذبات کی شدت نمایاں تھی۔

آزاد صرف اشیا کی باہمی مشابہت ہی پر نظر نہیں رکھتے بلکہ وہ لفظی مناسبتوں کا بھی احساس رکھتے ہیں۔ یہ باریکیاں یا رعایات لفظی، جیساکہ انہیں پہلے کہا جاتا تھا ہمارے تنزل پذیر انشا پردازوں کا مشترک سرمایہ تھے۔ اور وہ ان کے ساتھ اس طرح کھیلتے تھے جس طرح مداری گولوں سے۔ ان کی تحریر میں موارد استعمال کے متعلق کوئی خاص بندھے ٹکے اصول قاعدے نہیں ہیں۔ بالعموم وہ مصنف جو مناسبات لفظی پر ادھار کھائے بیٹھا رہتا ہے، اسے کچھ نہ کچھ تلے بیان اور قدرتی وضع سے دستبردار ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ایک قاعدہ کلیہ قرار دی جاسکتی ہے کہ اگر مناسبات لفظی قاری کی توجہ میں خلل پیدا کریں یا خیال کی سیدھی سادی ترجمانی میں سدراہ ثابت ہوں تو وہ معیوب ہیں اور ان کو سنجیدہ ادب میں کوئی جگہ نہیں دی جاسکتی۔ اس کے برعکس ـ اور ایسا شاذ ہی ہوتا ہے ـ اگر وہ قدرتی اور بے ساختہ محسوس ہوں تو وہ ایک قدرتی تعجب کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ "آبحیات" سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

> ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا۔

> تمام دربار چمک اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے۔ اصل پیشہ سپاہ گری تھا۔ تباہی سلطنت سے ہتھیار کھول کر مضمون باندھنے پر قناعت کی۔ اور بیت المساجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔

ان سب پاروں میں آزاد دانستہ ایک خاص اثر پیدا کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اور قصداً شاعری کررہا ہے۔ ایسی ہی سیکڑوں اور مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ آزاد کبھی اپنے فارسی طرز تحریر کا جوا اپنے گلے سے اتار کر نہ پھینک سکا۔ نہ صرف ایک انسان بلکہ انشا پرداز کی حیثیت سے بھی وہ جتنا حال سے تعلق رکھتا تھا اتنا ہی ماضی میں گم شدہ ہوا تھا۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ان میں سے اکثر لغزشیں استعارہ ہی کے ضمن میں ہیں۔ کیونکہ استعارہ کہا ہے تخیل کی زبان۔ اور یہ بالعموم نثر کے ساتھ میل رکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس تشبیہ زیادہ منطقی واقع ہوئی ہے اور جب تک اس میں زیادہ غلو نہ کیا جائے، یہ بیان میں بہت وضاحت پیدا کر دیتی ہے قصص ہند کے چند پارے اس کے شاہد ہیں:-

> پیادے پیادوں سے لپٹ گئے۔ سوار گھوڑوں سے کود پڑے۔ ہاتھیوں نے اپنا پرایا کچھ نہ دیکھا سب کو چکی کی طرح دل ڈالا۔

★

> شاہ باتدبیر... فوراً اپنی رکاب کی فوج لے کر برق باد کی طرح لپکا اور اس کالی آندھی کے سامنے جا کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گیا۔

> جنگل اور پہاڑ میں برابر تین دن تک بجلی کی طرح کڑکتا اور بادل کی طرح برستا چلا گیا۔

آزاد کی بعض تشبیہیں ناکام بھی ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ بے حد شاعرانہ ہوتی ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ بے ہنگم ہوتی ہیں۔ وہ متلازم تصورات کا ایسا سلسلہ پیدا کرتی ہیں جو ذہن کو بھٹکا کر اصل موضوع سے دور لیجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر "دربار اکبری" کا یہ پارہ ملاحظہ ہو:

> بدگویوں کی زبانیں قلم ہوگئیں اور حاسدوں کے منہ دوات کی طرح کھلے رہ گئے۔

ایسے ہی بے شمار نمونے اور بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ جن میں سے بعض پر تکلف اور مصنوعی اثر کے شائبہ سے خالی نہیں مگر میں اس معاملہ میں اپنی قوت فیصلہ پر کاملاً انحصار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ذوق درحقیقت ابتدائی تربیت روابط اور ماحول پر موقوف ہوتا ہے۔ اور جو بات ایک کو اچھی معلوم ہو ضروری نہیں دوسروں کو بھی اچھی معلوم ہو۔ مجھے ان میں سے بعض واقعی پسند ہیں۔ مگر اکثر

ایسے ہیں جو ایک سنجیدہ تاریخ کے ذوق سے ہم آہنگ نہیں۔

ایک دو جگہ آزاد نے ان صنعتوں سے بڑا ہی عمدہ مزاحیہ اثر پیدا کیا ہے جیسا کہ مثال کے طور پر ہُدہُد وغیرہ کے سلسلے میں ہے۔ ممکن ہے یہ سب چٹکلے اور موشگافیاں حسین نثر میں ناگوار گزریں لیکن ہلکی پھلکی تحریر میں یہ بہت چٹخارہ دیتی ہیں اگر یہ معتدل حد تک ہوں تو شاید اچھی لگیں یا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ان سے کام لینے میں چنداں مضائقہ نہ ہو لیکن اگر ان کو بے اعتدالی کی حد تک پہنچا دیا جائے تو یہ بدمذاقی کی علامت ہے۔ جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے:۔

> کم بخت برج بھی جب حضور میں نہیں پہنچا تو مجھے ملاّ پیر محمد سے ملنا واجب تھا۔ ملاّ قلعہ کے برج پر اترے ہوئے تھے۔ برج بھی سیدھا برج پر چڑھ گیا......
>
> ان کا دماغ برج آتشبازی کی طرح اڑا جاتا تھا۔ بڑے خفا ہوئے۔ وہ بھی آخر جاں نثار و نمک حلال کا وکیل تھا۔ شاید کچھ جواب دیا ہو۔ یہ ایسے جامہ سے باہر ہوئے کہ حکم دیا باندھ کر گرا دو۔ اور مار کر تھیلا کر دو۔ اس پر بھی دل کا بخار نہ نکلا۔ کہا برج سے گرا دو۔ اسی وقت گرا دیا گیا۔ اور دم کے دم میں جسم کی عمارت زمین سے ہموار ہو گئی۔

مگر حق یہ ہے کہ آزاد کی تحریر میں صرف استعاروں اور تمثیلوں کی حیثیت واضح کر دینے سے اس کی تخلیقات کا تخیلی عنصر پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ اس کی تخیل اس کی عبارت میں اور بھی زیادہ آزادی اور بہت بہتر تناسب کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے۔ جہاں تک بیانِ واقعہ کا تعلق ہے یعنی یہ کہ اشیا یا واقعات کو کس طرح اصلیت کا روپ عطا کر کے چلتا پھرتا، جیتا جاگتا پیش کیا جائے، اس کا تمام اردو ادب میں کوئی جواب نہیں۔ اس قسم کی تحریر کے اعلیٰ ترین مقامات میں سے ایک سخندانِ پارس کا درج ذیل شہ پارہ ہے۔ یا آخری مثال کے طور پر للا دیوی اور اس کی مدت سے گم شدہ بیٹی دیول دیوی کے ملاپ کا وہ سین ملاحظہ ہو جس میں ایمائی قوت اور ایجاز کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ آزاد ایسا لکھنے والا خوب جانتا تھا کہ ایسے شدید جذباتی موقعوں پر جب دل احساسات سے لبریز ہوتا ہے، گفتگو سراسر بے محل ہوتی ہے۔ اور چند ٹوٹے پھوٹے اشارے وہ کام کر جاتے ہیں جو غیر ضروری

انشا پردازی کے دفتر کے دفتر نہیں کر سکتے۔

> دفعتاً ہوا بند ہوئی۔ ابر سا گھِر آیا۔ دنیا دھواں دھار ہو گئی۔ پھر سفید غبار سا برستا ہوا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر کوٹھوں پر دیوار و در پا اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا۔ رات گزری۔ صبح کو دیکھا تو تمام درختوں کو برگ ریزی کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درختوں پر پتے کا نام نہیں۔ جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتوں سے بھرے تھے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں۔ جیسے کسی نے کپڑے اتار لیے۔ وہ بھی سیاہ رنگ جیسے بجلی مارا لوہا۔ ایک دو دن بعد برف برسنی شروع ہوئی مگر کس طرح۔ جیسے کوئی آسمان پر روئی دھنک رہا ہو۔ ایک دن رات جو برف کا تار لگا تو در و دیوار زمین آسمان تمام سفید ہو سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشے کی شاخیں ہو گئیں۔

یہ پارہ جذبات سے مملو ہے اور میرے خیال میں بالکل برمحل ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، ان کی ترتیب پھرتی اور تخیل کی اس لپک کو دیکھئے جو ایک ہی جھپٹ میں ایران کے موسمِ سرما کی ساری شاعری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور اسے ہماری نظروں کے سامنے پوری طرح اُجاگر کر دیتی ہے۔

بیان کی دوسری انتہا، جو کسی ادیب کی معراجِ کمال تصور کی جا سکتی ہے، "قصص ہند" کے مندرجہ ذیل اقتباس میں نظر آتی ہے۔ پہلے اقتباس کی طرح یہ بھی تخیل تو جوآرائش سے بالکل معرا ہے۔ اس پارے کا آہنگ شدید، کلاسکی ضبط، اختصار اور وسعتِ معنی اردو کے انتہائی بلند مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

> راجہ نے بھی باہر نکل نکل کر خوب مقابلے کئے۔ جان بازوں نے ملک کے نام پر جانیں قربان کیں مگر کہاں تمام ہندوستان کا تاجدار کہاں چتوڑ کا راجگنار جوان جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے مارے گئے، بڑے بڑے سردار کٹ گئے۔ جب سب طرف سے آس ٹوٹ گئی تو

آزاد: تہذیبِ کہن کا عکّاس

سیّد محمد تقی

اُنیسویں صدی کے آخری پچاس سال اُردو ادب کے نئے رجحانات کے ابھرنے کا عہد ہے۔ اُردو زبان تاریخی طور پر اس تہذیبی ورثہ کا جزو ہے جو ہندوستان میں اسلامی ثقافت اور مقامی ہند آریائی آمیزش سے وجود میں آیا تھا۔ دہلی اس تہذیب کا مرکزی نقطہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں دہلی کی مرکزیت ٹوٹنے کے ساتھ وہ تہذیب دم توڑنے لگی جسے مغل عہد کے طبقۂ وسطیٰ نے بڑے چاؤ سے پروان چڑھایا تھا اور اس کے بعد آنے والی تقریباً ایک صدی اس شدید جدوجہد کی داستان ہے جو مٹتی ہوئی مقامی تہذیب نے اپنا اقتدار بچانے کے لئے کی تھی۔ تہذیبیں زندہ رہنے کے لئے زبانوں کو سپر بناتی ہیں۔ ہند آریائی تہذیب کی سپر اُردو تھی جس کی آڑ لے کر ماضی کے تہذیبی ورثوں کو بچانا تھا۔ اُنیسویں صدی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی جسے ۱۸۵۷ء کی آخری شکست نے فیصلہ کن طور پر ظاہر کر دیا کہ اقتدار کی جنگ کامیابی ختم ہو گئی ہے۔ اس تلخ احساس نے مسلم تہذیب کی تخلیقی صلاحیتوں کو پوری طرح آزاد کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ انیسویں صدی میں اُردو کے وہ شاہکار تخلیق کئے گئے جن کی وجہ سے یہ صدی اُردو کا کلاسیکی دور کہلانے کی مستحق بن گئی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا ادب اُردو کے اسی کلاسیکی دور کے ادب میں شامل ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخری حصہ کے بیشتر بڑے ادبا سرسید کے اسکول سے وابستہ رہے ہیں لیکن مولانا محمد حسین آزاد اُن چند اکابر میں شامل ہیں جنہیں سرسید اسکول سے الگ رہ کر بھی اُردو کے جدید ادبی رجحانات کے ایک ایسے بلند مینارہ کی حیثیت حاصل ہے جو ایک راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ آزاد کا ادب تہذیبی رجحانات کے اعتبار سے مغل عہد کے ماضی میں زندہ رہتا، ابھرتا اور سرسید تحریک ... کے اعتبار سے جدید اُردو کے شاہکاروں میں شامل ہے۔ آزاد اُردو کے پہلے ادیب

ہیں جنہوں نے غیر مذہبی انداز میں ماضی کی تہذیبی تاریخ یعنی ستھرویں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شمالی ہند کی تہذیب کے جائزے پیش کئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ "آبِ حیات" اور "دربارِ اکبری" شمالی ہند کی مسلمان تہذیب کے متعلق اردو میں اولین جائزے ہیں۔ ان سے پہلے اُردو میں تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو اس انداز سے زیرِ بحث لانے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ ان کتابوں کا تاریخی درجہ کیا ہے؟ یہ سوال چنداں بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ ان میں ماضی کے ادبی و سیاسی کرداروں کو کس انداز سے متعارف کرایا گیا ہے اور اُردو ادب کو جو لسانی ماحول اور تحریری فضا دی گئی ہے وہ اسلوب کے ارتقائی عمل میں کس درجہ پر آتی ہے۔ ادب کے تمام بڑے شاہکار ہمیشہ اُس عہد میں لکھے گئے ہیں جن میں تاریخ کسی بہت بڑے موڑ پر پہنچی ہے۔ دائمی اہمیت کے علمی کارنامے اُس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچے ہیں جب تاریخ پُرسکون دور سے گزری ہے۔ انیسویں صدی میں برصغیر کی تاریخ بڑے عظیم تہذیبی موڑ سے گزر رہی تھی۔ اس عہد میں اُردو کے جن شاہکاروں نے جنم لیا اُن میں آزاد کے کئی ادب پارے بھی شامل ہیں۔ ایسے شاہکاروں کے خالق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اُس فرض اور ذمہ داری کو بھی جانتا ہو جس کا تاریخ تقاضا کرتی ہے یا اس کے سپرد کرتی ہے۔ تہذیب اپنے بہاؤ میں اُن ذہنوں کو استعمال کرتی ہے جو متعلقہ معاشرہ کی عام سطح سے ابھر کر سامنے آتے ہیں، گو خود اُن ذہنوں کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ تاریخ کے کس فرض کو انجام دے رہے ہیں اور وہ کیا ذمہ داری ہے جو تاریخ اُن سے پورا کرنا چاہتی ہے۔ ایسے ذہن انسانی تاریخ نے بہت کم پیدا کئے ہیں جنہیں اس کام کا بھی اندیشہ ہو جو تہذیب کے بہاؤ میں ان سے انجام دیا ہوتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد سے شمالی ہند کا تمدن اپنے تہذیبی ورثوں کو بچانے کا کام لینا چاہتا تھا۔ ان کے تخلیقی ادب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فرض کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ ہومر ایک شخص کا نام ہو یا اس نام کے کئی اشخاص گزرے ہوں، بہرحال "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" ایسے شاہکار ہیں جنھوں نے یونان کے قبائلی کلچر کی دم توڑتی ہوئی روایتوں کو بچا کر یونان کے قدیم خانہ بدوش تمدن کو بالکل ہی نابود ہو جانے سے بچا لیا۔ دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" بھی قرون وسطیٰ کے مرتے ہوئے تمدن کو بچانے کی کامیاب کوشش ہے۔ اسی طرح فردوسی کا "شاہنامہ" اس بات کا اعتراف تھا کہ ساسانی کلچر عرب تمدن سے شکست پا چکا ہے اور اب اُسے تحریری زندگی کے ذریعہ عدمِ محض میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے۔ تورات سُمیری کلچر کی موت کا اعتراف اور رِگ وید وسط ایشیا کی خانہ بدوشانہ تمدنی یادوں کو بچانے کی شاندار کوششیں تھیں۔ اس طرح انیسویں صدی کے اُردو ادبی شہ پارے بھی ٹوٹتے ہوئے مغل تمدن کو تحریری زندگی عطا کرنے کی کامیاب کوشش تھے۔ اس کوشش میں آزاد کا مقام مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اُردو ادب کو جو نئی راہیں دکھائی ہیں اُن کی اہمیت مستقبل کے ادبی رجحانوں کو دیکھنے کے بعد نمایاں ہوئی لیکن اُن کے ادب کے مفاہیم جن تجربوں سے حاصل ہوئے تھے وہ یا تو ماضی میں گم ہو چکے تھے یا آہستہ آہستہ گم ہو رہے تھے۔ خود ان کا اسلوب نگارش اور طرزِ بیان، جس کے بہترین نمونے "آبحیات" اور "دربار اکبری" میں ملتے ہیں۔ اپنی اساس میں عرب ایرانی لسانی روایات سے ماخوذ ہے جنہیں ان کے قوی ذہن نے شمالی ہند کے ان معزز مسلم گھرانوں کے مزاج سے ہم آہنگ بنا دیا تھا جو منتصف ثانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزاد کے اسلوب نگارش کی خوبی، پختگی اور امتیاز یہی ہے کہ اس میں قدیم ادبی روایات کو زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے میں کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ قدیم طرز بیان تو سب ہی کو ورثہ میں ملا تھا جسے جوں کا توں استعمال کر لینا کسی ذہنی کاوش کا متقاضی نہ تھا۔ اسی نوع کے لسانیاتی موڑ پر ادیب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ماضی کی بہترین ادبی روایتوں کو حیاتِ نو کے ادبی تقاضوں سے ہم آہنگ بنا دے۔ آزاد کے یہاں یہ امتزاج پورے کمال کے ساتھ ملتا ہے۔ اس لئے اُن کا ادبی ورثہ اُردو کے کلاسیکی سرمایہ میں شامل ہو چکا ہے۔ آزاد کے لئے یہ ممکن نہ تھا، اور نہ کسی فرد کے لئے ممکن ہی ہے کہ اپنے سارے ماضی کو محو کر دے اور مستقبل کی ایسی گنگا بہانی شروع کر دے جس کی موجیں صرف حال کی زندگی پر مشتمل ہوں اور اس میں ماضی کا کوئی عنصر شامل نہ ہو۔ ہر جوہرِ قابل ماضی کے دھارے کا رُخ موڑتا ہے، پیدا نہیں کیا کرتا۔ اسی کی اہمیت اس بات میں مضمر ہوتی ہے کہ وہ ماضی کے بہاؤ کو کتنے شعوری انداز میں، کس حد تک بدلتا ہے۔ آزاد کی ادبی عظمت یہی ہے کہ انہوں نے اُردو ادب کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا جس نے اُردو کے ادبی انقلاب میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح انہوں نے وہ دونوں کام کئے جو ایک بڑے ادیب کو کرنے چاہئیں یعنی کے تہذیبی و ثقافتی ورثے اور ادبی روایتوں کو بچانے کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کے ادبی رجحانات کو زندگی کے متغیر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا۔ ان کے ادب کی یہی خوبی ہے جو اُن کی تخلیقات کو زندہ رکھنے اور انہیں نئے عہد کا پیغامبر بنانے کا سبب بنی ہے اور یہی خصوصیت انہیں اور اُن کے ادب کو "بقائے دوام" کے دربار میں ایک ممیز حیثیت عطا کئے رکھے گی۔

★

شمعِ شبِ دوشینہ:

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ

شاہد جمیل

اس دور میں جب کہ مادیت کی بڑھتی ہوئی لہروں نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اگر ہم تھوڑی دیر ان صوفیائے کرام کی طرف رجوع کریں جنہوں نے صدہا سال دنیائے اسلام میں مادی قدروں کے بخلاف روحانی قدروں کی علمبرداری کی اور عقل کے شور و شر کی بجائے عشق کے سرور سرمدی میں سکونِ خاطر اور مجاز کے مقابلے میں حقیقت کا لطف دوام حاصل کیا، تو یہ ہمیں وہ راحت، وہ اطمینان عطا کر سکتا ہے جو ہم گردشِ ایام کی دنیا میں بے کار تلاش کرتے ہیں۔ صوفیائے کرام اپنے ساتھ کچھ ایسی ہی روحانی مسرت کی نوید لے کر آئے تھے۔ ان کا مقصد دنیاوی خرخشوں اور مادی کشمکشوں سے توجہ پرے ہٹا کر زیادہ پائیدار قدروں اور حقیقتوں پہ مرتکز کرنا تھا۔ اس لئے کہ:

عوام الناس باہم جنگ کرتے ہیں زدا ید پر

یہ بلند نظر انسان اپنے ساتھ جو مطمحِ نظر لے کر آئے تھے وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ شورشِ اقوام را خاموش کن۔ وہ مہر و محبت، اخوت، صلحِ کل اور امن و آشتی کے پیغام سے اس خود پرستی، نفسا نفسی، افراتفری، امتیازِ ملت و آئین۔ جبر و تشدد اور کشت و خون کا سدباب کرتے تھے جو ہمیشہ انسانوں کے سر پہ ایک کابوس کی طرح سوار رہا ہے۔

آج جب حکومتوں پر حکومتیں آتی ہیں، طاقتور کمزوروں کو کچل کر رکھ دیتے ہیں، امیر غریبوں کو پائمال کرنے پر تلے ہیں اور ہر کہ و مہ خود غرضی کا شکار ہے، ہم صلحا و عارفین کی تعلیم سے دکھ میں سکھ کا سراغ پا سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ برگزیدہ ہستیاں جو تصوف کی علمبردار رہی ہیں فیضان کا ایک دائمی سرچشمہ ہیں۔ اور کوئی مختار ہو یا مجبور، صاحبِ اقتدار ہو یا محکوم، بالادست ہو یا زیردست، ان سب کو اس سرچشمہ کے حیات افروز جرعوں کی ضرورت ہے۔ بنابریں امیر خسرو، خواجہ بندہ نواز اور دوسرے اولیائے حق کا ذکرِ جمیل، ان کی تعلیمات کی طرف رجوع، ان کے ارشادات کا احیا ہمارے لئے خاص معنی رکھتا ہے:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

یہی وجہ ہے کہ گو کراچی اور گلبرگہ میں صدہا میل کا فاصلہ ہے۔ پھر بھی پچھلے دنوں اہلِ عقیدت نے کراچی میں دکن کے مشہور بزرگ اور صوفی، سید محمد ابن سید یوسف الحسنی المعروف بہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی یاد تازہ کی۔ جنہیں فیض روحانی کے علاوہ ایک اہم ادبی شخصیت ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اور آثار و شواہد کی بنا پر انہیں اردو کا اولین مصنف بھی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں وجوہ صدہا سال بعد ان کے ذکرِ خیر کا جواز پیش کرتے ہیں اور ان کے ادبی کارناموں کے سلسلے میں ترغیب دلاتے ہیں کہ:

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

حضرات صوفیہ اور ان کی سرگرمیوں کا ایک اور نہایت اہم پہلو بھی ہے۔ یہ درویش لوگ اسلام کے مبلغ تھے اور یہ انہی کی ان تھک اور بے لوث جد و جہد کی بدولت برصغیر کے گوشے گوشے میں پھیلا۔ یہی وجہ ہے کہ طریقت کے تمام سلسلے ہر کہیں مرجعِ عقیدت ہیں۔ ان سلسلوں کے بزرگ ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا دربار عام تھا جس میں ہندو مسلم، چھوٹے بڑے، امیر غریب، عالم جاہل ہر کسی کو بار تھا۔ ان کا میل جول عوام سے تھا۔ اس لئے وہ انہی کی زبان میں بات چیت کرتے، جس سے ہوتے ہوتے ایک مخلوط زبان پیدا ہوئی —— اردو جو آج بھی ملکی و سیاسی اختلافات کے باوجود تمام برصغیر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح مذاہب اور زبان کو عام کرنے کا فیضان ایسا ہے جس سے ہم آج بھی مستفیض ہیں اور اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس ضمن میں شیخ نظام الدینؒ کی حیثیت ان کے لقب سلطان الاولیاؒ ہی سے ظاہر ہے۔ یعنی سلسلۂ چشتیہ کے رکنِ رکین جن کے خلفا تمام ملک میں دور دور پہنچے اور وہ روحانی فتح

حاصل کی جو ملکی فتح اور اقتدار کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ سلطان الاولیاء کے ایک بہت بڑے خلیفہ اور جانشین شیخ نصیر الدین چراغ دہلی الملقب بہ "گنج معانی" تھے۔ اور ان کے خلیفہ و مرید سید محمد ابن سید یوسف الحسینی الدہلوی جو حضرت گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہیں۔ اپنے پیر و مرشد کی وفات کے بعد سنہ ۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۸ء میں براہ گجرات مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں دکن پہنچے اور نواح حسن آباد گلبرگہ میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں انہوں نے خاص و عام کی رشد و ہدایت فرمائی اور یہیں ۸۲۵ھ میں وفات پا کر مدفون ہوئے۔ اس طرح سلطان الاولیاء کا فیض دکن تک پہنچا۔ اور وہ نعمت جو دار الحکومت دہلی تک محدود تھی، عام ہو گئی۔

ظاہر ہے ایسے مرد عارف کی دلچسپی تمام تر سلوک و تصوف اور حدیث، فقہ، و کلام ہی میں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ یہی ان کی زبانی رشد و ہدایت اور تحریری فیضان کا موضوع رہے جس کا عملی ذریعہ فارسی عربی تھیں یا ہندی جو انہی بزرگوں کی سرگرمیوں اور دوسرے وسیلوں سے رفتہ رفتہ ریختہ یا اردو کی شکل اختیار کرتی گئی جس کی مثال خود امیر خسروؒ جیسے سرمست تصوف اور شاعر و ادیب میں نظر آتی ہے۔ اگر بعد میں آنے والے صوفی بزرگوں اور ادیبوں کو بھی انہی کا مثیل یا بدلا ہوا روپ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہی میں سے ایک حضرت بندہ نواز گیسو دراز بھی ہیں۔ لہذا ان کی شخصیت اور افادات پر بھی دو پہلوؤں ہی سے نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ سلوک و عرفان اور تحریر و انشا۔

سلوک و عرفان میں ان کا مسلک اپنے اکثر پیشروؤں سے الگ نہیں۔ یہ مسلک دین و مذہب اور درویشانہ تصوف کا ایک معتدل آمیزہ معلوم ہوتا ہے جس میں زیادہ دخل حق پرستی، دینداری، فقر، صلح کل اور سلامت روی کو ہے۔ تصوف کی شراب دو آتشہ نہیں بنی۔ نہ اس میں زیادہ جاہلیت ہے نہ وجدان کی شدت اور نہ حکمت و بصیرت۔ جو کچھ ہے وہ زیادہ تر تلقین و ہدایت کے رنگ میں ہے جس میں ظاہر کی بجائے باطن پسندی ہے اور جلال کی بجائے جمال کا پہلو نمایاں ہے۔ سلوک و عرفان کی دنیا میں بھی تو جو ستائی و عطار سے زیادہ دور نہیں۔

اپنے دور کے مخصوص رجحان کی بنا پر ——— اور مقامی لوگوں کی تالیف قلوب اور جذب و کشش کے لئے اس کی اشد ضرورت بھی تھی۔ اہل تصوف کی تعلیمات "ہمہ اوستی" زاویۂ نظر کی حامل تھیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے اس جمال ازلی و ابدی حسن و جمال کا نقش، کرشمہ یا پرتو ہے اور اسے جو جس زاویے سے دیکھتا ہے اپنے احوال و ظروف کے مطابق محسوس کرتا ہے۔ صوفی صافی کا کام یہ ہے کہ وہ آلائش دنیا سے خود کو ملوث نہ ہونے دے۔ تزکیۂ نفس کرے۔ نفرت، حقارت، تعصب سے دنیا کو پاک کرے کیونکہ یہ انسان کو انسانوں کے باہم ملنے سے روکتے ہیں اور انہیں شرف انسانیت سے محروم کر دیتے ہیں۔ حضرت خواجہ گیسو دراز عشق کے ساتھ دل دردمند کے بھی طالب تھے کیونکہ جب تک دل میں سب کے لئے محبت نہ ہو نہ شیخ سے محبت کامل ہو سکتی ہے نہ انسان سے نہ احد سے۔ عشق کی لذت میں چاشنی دل دردمند یا سوز جگر ہی پیدا کر سکتا ہے۔

آج جب کہ ہم خود کو بہت ترقی یافتہ خیال کرتے ہیں، پانچ چھ سو سال پہلے کے ایک درویش منش بزرگ کے ارشادات غیر معمولی تازگی و جدیدیت لئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی تعلیمات موجودہ احوال و ظروف میں بھی حیرت انگیز اہمیت و افادیت کی حامل ہیں۔ وہ تقدیر پرست لوگوں کی طرح اس امر کے قائل نہ تھے کہ:

بندہ در افعال جز مجبور نیست

بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تدبیر کو جو تقدیر کے ساتھ ہم رشتہ ہے، کبھی ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ وہی بات جس پر رومی بار بار زور دیتے ہیں ؎

گفت پیغمبر بہ آواز بلند
بر توکل زانوئے اشتر ببند

اور یہ کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ یہ عقیدہ ظاہر ہے آج کل کی جد و جہد اور کشمکش سے بھرپور زندگی میں کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ یہی زندگی اور اس کے تقاضوں کا احساس ان کے دیگر افکار میں بھی کارفرما ہے۔ وہ کس بیباکی سے فرماتے ہیں کہ زندگی کو زندوں کی طرح بسر کرو۔ اور علائق دنیا سے مردانہ وار جنگ کرو۔ رہبانیت ہرگز صحیح نہج زندگی نہیں۔ پھر اس سے زیادہ عبادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہر سانس غرض کو پورا کرو اور ہر نفس کو غنیمت جانو۔ وہ دین و دنیا میں کوئی تضاد نہیں پاتے اور صاف کہتے ہیں کہ ملک، بادشاہ، والدین اور متعلقین کے حقوق کی رعایت، زن و فرزند کی خبر گیری وغیرہ خدا کی راہ میں حائل نہیں بلکہ

یہ باتیں بظاہر بہت ہی سادی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کے مضمرات پر غور کیا جائے تو وہ بے حد اہم ہیں اور ان سے ہماری زندگی کا عالم ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ ایک بہت ہی بڑی بات جس پر یہ بزرگ زور دیتے تھے، یہ تھی کہ کمزوروں کو طاقتوروں کے جبر و ظلم سے بچایا جائے۔ تاریخ اپنے آپ کو سب سے زیادہ جبر و ظلم کے نت نئے طریقوں ہی میں دہراتی رہی ہے۔ قاہر، جابر اور غاصب نت نئے روپ بدل بدل کر آتے ہیں اور دوسروں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اپنے ہی زمانے میں دیکھ لیجئے کیا کچھ نہیں ہوا۔ یورپ، افریقہ، ایشیا، عراق، کشمیر سب میں ہر پھر کر ایک ہی داستان۔

چنگِ تیموری شکست، آہنگِ تیموری بجاست
سر بروں می آرد از سازِ سمرقندے دگر

دور کیوں جایئے۔ اپنے ہی ملک پر نظر ڈالئے کہ یہاں بدنصیب عوام سے کیا کیا سلوک روا نہیں رکھے گئے۔ ان کے حقوق کس کس طرح غصب کئے گئے ہیں کن کن طریقوں سے کوشش کی گئی ہے کہ ان کی مرضی و خواہش کے مطابق حکومت قائم نہ ہو اور جو بھی موقع پرست برسرِ اقتدار آجائیں اپنی حکومت کو عوام کی ہی حکومت قرار دیں! بددیانت سیاست دانوں نے عوامی حقوق کا کیا کچھ خون نہیں کیا اور ملکی دولت میں کس کس طرح ہاتھ نہیں رنگے۔ ان حالات میں کمزوروں کو طاقتوروں کے جبر و ظلم سے بچانے کی تعلیم کیا کچھ معنی نہیں رکھتی؟ یہ تو ایک مستقل دعوت ہے کہ جب حکومت صحیح معنوں میں عوامی نہ ہو، تو اس کو بروئے کار لانے اور ناساز عناصر کو دور کرنے کی جدوجہد جاری رہے۔ لہٰذا خواجہ گیسو دراز کا پیغام آج بھی ایک زندہ پیغام ہے۔ ان کا خاص و عام کو یہی مشورہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، نامرضیات سے پاک رکھیں۔ یعنی وہ تطہیرِ نفس پر زور دیں۔ خواجہ بندہ نواز عوام کے حقوق کے حامی ہوتے ہوئے اُن کی ذمہ داریوں سے بھی غافل نہیں اور برابر تلقین کرتے ہیں کہ کوئی بات شرع یا قانون کے خلاف نہ کی جائے بشرطیکہ حکومت واقعی شرعی، قانونی اور برحق ہو۔

حضرت نظام المشائخؒ کے فیض یافتہ سلسلے کے اکثر بزرگ زیورِ علم سے آراستہ اور باکمال معروف مصنف و شاعر ہوئے ہیں اور علم و عمل کی اشاعت میں ان کی زندگی اور تصنیفی کاموں کا بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب صرف سجادۂ طریقت پر متمکن تھے بلکہ اپنے ارادت مندوں کو علومِ ظاہری کی بھی دولت بانٹتے رہے۔ ایک سو سال، اور ایک بیان کے مطابق ایک سو پانچ سال، کی عمر دراز اور پھر اس کے بیشتر حصے میں مسلسل شغل تصنیف و تالیف۔ لہٰذا ان کی تصنیفات کی تعداد کی پچاس سے کچھ زائد ہے۔ جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، شریعت، طریقت، تصوف، اوراد، اور ذکر و مراقبہ پر متعدد کتابوں کے علاوہ مکتوبات ملفوظات، شروح اور شجرۂ نسب پر کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر فارسی میں ہیں اور کچھ عربی میں بعض کتابوں کے متعلق حتمی طور پر کہنا مشکل ہے کہ وہ انہی کی تصنیف ہیں یا نہیں۔ "معراج العاشقین" "جواہر الکلم" اور "چکی نامہ" قدیم دکنی اردو میں ہیں اور طبع ہو چکی ہیں۔

سلسلۂ نظام المشائخؒ کو موسیقی کے ساتھ جو انس تھا اس میں خواجہ بندہ نواز بھی شریک تھے۔ کیونکہ وجد آمیز موسیقی کو بھی عارفانہ والہیت کے ساتھ ایک رابطۂ خاص ہے۔ چنانچہ ان سے بعض راگ راگنیاں بھی منسوب ہیں۔ ایک راگ "رام کلی" کے بول یہ ہیں؎

مخفی نانوں معشوق کے ظاہر شہباز کہلائے
عشق کی جیبی چند بند اپنی آپ دکھلائے

یہ تو تھا عارفانہ پہلو۔ اب لسانی و ادبی پہلو کی طرف آیئے جو کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں۔ خواجہ صاحب بندہ نواز ہوتے ہوئے ادب نواز بھی تھے۔ اور اردو زبان کے ارتقا کی کہانی میں ان کا نام اور کام بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ انہیں اردو کا سب سے قدیم صاحبِ تصنیف بزرگ کہا جاتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ان کا ادبی نقش بہت واضح، دیرپا اور مستند ہے۔ ان کی مذکورہ بالا کتابوں میں جو دکنی اردو میں لکھی گئی ہیں، اردو کی ابتدائی جھلکیاں اور "زبان دہلوی" کا پرتو صاف دکھائی دیتا ہے۔ قدامت کی تہہ میں یہ جھلکیاں بہت لطف دیتی ہیں اور "زبان دہلوی" کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کی بڑی واضح علامت ہیں۔ مثلاً:

کاڑا (جوشاندہ) نرگن۔ مائی۔ ہور (اور، جو پنجابی اور کھڑی بولی تک میں ملتا ہے)۔ نک (ناک) پیلا آنا (پلانا)۔ تک (تک) بوتی (بو) سوں (سے)، کوں (کو)۔ اگے (آگے) دُسرا (دوسرا) اندھارا (اندھیرا) وغیرہ وغیرہ

بعض کا خیال ہے کہ یہ قدیم دکنی کا نمونہ نہیں بلکہ "زبانِ برج" "کھڑی بولی" یا "ہندوستانی" کی اولین شکل ہے۔

خواجہ بندہ نوازؒ کی زبان اپنے دور کے دوسرے دکنی شاعروں سے زیادہ نکھری ہوئی ہے چنانچہ نظامی (تقریباً ۱۴۶۰ء) کی مثنوی "کدم راؤ اور پدم" کی زبان کی قدامت بالکل عیاں ہے۔ جس میں نہ صرف راجستھانی اور پنجابی کی اکثر شکلیں پائی جاتی ہیں بلکہ اپ بھرنشی روایات کی چھاپ بھی ہے۔ بہرحال صوفیائے کرام نے لشکریوں اور اہلِ تجارت کی طرح اردو کی نمود، اس کی نشوونما اور ترویج میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس میں سلسلۂ نظام المشائخؒ کو خاص دخل ہے۔ کیونکہ صوفیہ کے دربار میں اُردو نے سماع کی شکل میں بھی بار پایا۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی نے "سیرالاولیاء اور خیرالمجالس" میں صاف صاف بیان کیا ہے کہ سلطان الاولیاء (۱۲۳۶ء - ۱۳۲۴ء) کے زمانے میں فارسی کے ساتھ "ہندوی" زبان میں بھی قوالیاں گائی جاتی تھیں۔ اور قوالی کو جو قبول عام حاصل ہے، محتاج بیان نہیں، یہ اپنے ساتھ کئی بولیوں کو بھی لے اڑی۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کیونکہ صوفیا خصوصاً صوفیائے "چشت اہل بہشت" عوام سے قریب آنے کے ایک واضح مشن پر لگے ہوئے تھے۔ انہیں دربار کی ترکی و فارسی سے صرف علمی و ادبی حد تک شغف تھا۔ مگر عوام میں رشد و ہدایت کا کام انہی کی بولی میں کرتے تھے وہ اپنے رسائل اور ملفوظات میں بھی اس آمیزش کو قرب عوام کا ذریعہ سمجھتے تھے جس طرح انہوں نے اپنی "ہمہ اوستی" تعلیم اور مہر و محبت، عالمگیر اخوت، مساوات، انسانیت اور صلح کل کے درس سے تعصب اور غیریت کی دیواریں منہدم کردیں۔ اسی طرح زبان و ادب میں بھی یکجہتی پیدا کی جس کا نتیجہ اُردو تھی۔

خواجہ گیسو درازؒ کا شمار انہی بزرگوں میں ہے جنہوں نے اُردو کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا کام کیا۔ سلطان الاولیاء نے امیر خسروؒ کی مدد سے اس کام کی شروعات کی۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی نے اس اس کو آگے بڑھایا۔ ان کا ایک سلسلہ حضرت اخی سراجؒ کے ذریعہ بنگال پہنچا۔ (مزار مبارک مالدہ، بنگال) اور دوسرا حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے ذریعہ دکن۔ جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

حضرت خواجہ سید محمد حسنی المعروف بہ خواجہ بندہ نواز کی عمر کا بڑا حصہ دہلی میں گزرا اور باقی دکن میں، اس لئے اُن کی زبان پر دہلی کی زبان کا اثر ہونا فطری بات تھی اور یہ وہ وقت تھا جب کہ دہلی میں سلاطینِ تغلق اور دکن میں بہمنی سلاطین کے عہد میں لسانی، علمی اور تہذیبی پخت و پز سے نئے نئے رجحانات بروئے کار آرہے تھے۔ خواجہ بندہ نواز کی شخصیت اور تصنیفات انہی رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ حضرت گیسو دراز کا مزار مبارک گلبرگہ (دکن) میں ہے اور پورے جنوبی ہند میں عقیدت مندوں کا مرجع۔ حکومت آصفیہ نے نواب نصرت یار جنگ، صوبیدار گلبرگہ کے ذریعہ بہت اچھا انتظام کردیا تھا، جنہوں نے ان کی بہت سی تصانیف شائع کر کے ادبی خدمت بھی کی تھی۔

یہ آثار، جواب علائم کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اور ہم جب چاہیں اپنے گرد و پیش کی پُرآشوب، غبار آلود فضا سے آزاد ہوکر ان میں ایک شفابخش اور حیات افروز اثر کا سراغ پا سکتے ہیں۔ کیا اچھا ہوا اگر ہمیں ایسے بزرگوں سے قریب آنے کے مواقع اور بھی کثرت سے میسر آئیں جو ہمیں اعلیٰ ترین قدروں سے روشناس کر کے ہماری زندگی کو بدرجہا بہتر بنا سکتے ہیں۔

شعلۂ مستعجل: —— بقیہ صفحہ ۸

موت سے ایک ایسی رنگ برنگ زندگی گھٹ کے رہ جائے گی جس کی مثال موجودہ زمانے میں عنقا نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ آخر ہوکر وہی رہا جو مشیت کو منظور تھا۔ برطانیہ اور اٹلی کی مشہور موٹر کار کی دوڑوں میں حصہ لینے والا زندگی کی دوڑ میں زیادہ حصہ نہ لے سکا۔ شدت آزمائی اور تہور اس کی زندگی کے خاص جوہر تھے اور کلبوں وغیرہ میں تو اس کی شمولیت محض تفریح کا ایک بہانہ ہوا کرتی تھی جس سے وہ اپنی بوقلموں اور مہم جویانہ طبیعت کو تسکین دے لیا کرتا تھا۔ فرض کی اہمیت کا احساس ان سب پر غالب تھا جسے پورا کرنے کے لئے وہ خطروں سے بے نیاز ہو کر ہر آزمائش میں کود پڑتا تھا۔ کہنے والوں کے لئے تو یہ اس کی موت کا بہانہ ہو گیا لیکن وہ اپنے نظریۂ حیات کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں!
وہ گلستاں کہ نہ ہو جس کی گھات میں صیاد

"اندیشہ ہائے گوناگوں"

(مبحث: پاکستانی ادب کی تشکیل)

جمیل الدین عالی

پچھلے دنوں لاہور میں ادیبوں کا ایک زبردست اجتماع ہوا۔ اس میں سولہ بنگلہ ادیب اور پچیس اردو ادیب شریک تھے۔ ان کے علاوہ سندھی، پشتو، پنجابی اور گجراتی کے ادیب بھی آئے تھے۔ انہوں نے کافی وقت اچھے خاصے اہم مسائل پر تبادلِ خیال میں صرف کیا۔ ایک مسئلہ یہ چھڑا کہ بہت سے پڑھنے والوں کی نظر میں ہمارا ادب لامقصدیت کا شکار کیوں ہے۔ اور واقعی وہ لامقصدیت کا شکار ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس قسم کی مقصدیت کی ضرورت ہے۔ اور کیا مقصدی ادب، ادب عالیہ بھی ہو سکتا ہے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس بار مختلف زبانوں کے ادیب ایک ہی مسئلے پر ایک ہی وقت میں، سوچ رہے تھے۔ ورنہ ایک زبان کے ادیبوں میں بحثیں چھڑ کر انہی تک ختم ہو جاتی تھیں۔ اور دوسری زبان والے ان کے افکار سے محروم رہتے تھے۔ اس گفتگو میں، جو دو دن تک چلی، اس مسئلے کے چند پہلو ابھرے۔

ایک طبقہ کہتا تھا کہ قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے میں تو بے شک اچھا اور اعلیٰ مقصدی ادب آپ ہی آپ پیدا ہوا، لیکن اس کے بعد لکھنے والے یا تھک گئے یا بھٹک گئے۔ اس پہلو پر اردو ادیب پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بلکہ ایک مدت ادب میں جمود کی بحث بھی چلی ہے۔ لیکن بنگلہ ادیبوں کی شرکت سے اس بحث کو بڑی تقویت پہنچی۔ بنگلہ ادیبوں کا موقف کچھ یوں تھا کہ شروع کے جوش و خروش اور ردِ عمل میں ہم بھی اسی طرح سرشار تھے جیسے اردو ادیب۔ مگر بعد میں ہم بھی سماجی اور سیاسی ابتری کے ساتھ ایک طرح کے انتشار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اب گویا پھر جاگے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادیب سیاسی نعرہ باز نہیں ہیں، نہ یہ سب کے سب خوشامدی درباری ہیں۔ یہ بڑے پیچیدہ مزاج، حساس، خوددار اور اپنے اپنے ملک کے بادشاہ لوگ ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں، جن کو ایک ملکی انقلاب کیا عالمی انقلابات بھی ان کی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ اور وہ بھی جو اپنے اندر کی دنیا میں ہی ایسے مست رہتے ہیں کہ باہر کی دنیا انہیں زیادہ سے زیادہ ایک معمولی نقطہ کی طرح نظر آتی ہے۔ اور ایسے بھی جو پتہ کے کھڑکنے پر چونک اٹھتے ہیں۔ ان میں اعلیٰ ادبی اقدار کو سمجھنے، پرکھنے اور برتنے والے تھے، عامل تھے، ادب عالیہ کے خالق تھے، لیکن اس بار ان سب نے مل کر بہت سی اختلافی باتوں کے باوجود ایک معاملہ پر اتفاق کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ انہیں، بہت جلد دانستہ یا نادانستہ طور پر پاکستانی ادب کی تشخیص کرنی ہے۔ کیونکہ ابھی تک پاکستانی ادب اپنی ایک الگ حیثیت میں مانا نہیں گیا ہے۔ ویسے یہ اصطلاح بے حد نازک ہے اور بڑا اول فوری غلط فہمیوں کی گنجائش رکھتی ہے۔ مثلاً کھٹ سے یہ الزام لگ سکتا ہے کہ ایسے ادب سے مراد صحافیانہ مضمون نویسی ہے کہ بس قلم اٹھایا اور پاکستان زندہ باد! قسم کی چیز لکھ دی۔ اسی طرح حصۂ نظم کے متعلق بھی سوال اٹھ سکتا ہے کہ چلیے مقصدی نظم تو ہو گئی، پھر غزل اور گیت کا کیا بنے گا! غزل میں تو کسی قسم کی واضح قومیت یا وطنیت کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ مگر مسئلے کے ان پہلوؤں پر بھی کھل کر بات چیت ہوئی اور کہنے والوں نے کہا کہ ہم تو ادب کے مزاج کی بات کر رہے ہیں، جزئیات کی نہیں اور خود ان اعتراضات کی حیثیت بہت سطحی اور غیر ادبی ہے کیونکہ کھلی نعرہ بازی یا درس و تلقین یا اخلاقی تعلیم ادب کی ذیل میں آتی ہی نہیں۔

ادب کو پہلے تو ادب ہونا ہے، جس کے اجزا اور عناصر بالکل الگ ہیں۔ پھر پاکستانیت کی تشخیص بھی کرنی پڑے گی۔

انھوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ پاکستانیت سے مراد پاکستان کے سیاسی نظریے کی تبلیغ ہی نہیں ہے۔ بلکہ عملاً وہی ہے جو روسیت یا انگریزیت یا امریکیت یا ہندوستانیت سے ہوتی ہے۔ یعنی ادب بنیادی طور پر ادب بھی رہے۔ اور جس ملک، جس قوم میں پیدا ہوا ہو۔ اس کے منفرد مزاج اور اطوار اور ماضی و حال اور قومی نصب العین کی عکاسی بھی کرے۔ مثال کے طور پر وہ یہ کہتے تھے کہ اعلیٰ انگریزی ادب ہمارے لئے ایک بیش قیمت سرمایہ ہونے کے باوجود خارجی مزاج رکھتا ہے۔ اور یہی اس کے منفرد ہونے کی پہچان ہے۔ اسی طرح روسی کلاسیکی اور حالیہ ادب عام انسانی کرداروں کے گرد گھومنے کے باوجود مزاجاً روسی رہا ہے اور اسی طرح ایک اچھے پڑھنے والے کے سامنے مصنف کا نام لئے بغیر ایک اعلیٰ تصنیف خواہ کسی زبان میں بھی ترجمہ کر کے پیش کی جائے۔ وہ بتا دیگا کہ یہ فلاں ملک کی تصنیف ہے۔

قومی یا ملکی مزاج اکثر اوقات بین الاقوامی نصب العین کی زبان میں بھی بولتا ہے اور ایک بڑا مصنف خواہ کسی آدرش کی تبلیغ کرے، اپنی قومیت کے بنیادی عناصر ضرور ظاہر کر دیگا۔ اب یہ قصہ اور بہت سے نازک مراحل سے گزرا۔ بات چونکہ ادیبوں میں ہی ہو رہی تھی، اور آس پاس ایسے ہر قسم کے لوگ نہ تھے، جو ادب کے دھاروں کو موڑ دینا بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے ہیں۔ اس لئے گفتگو اور بھی کھل کر ہوئی۔ اب لوگوں نے ایک دوسرے سے یہ پوچھا کہ کیا کسی قسم کے مشترک فیصلوں اور ارادی کوششوں سے اس قسم کا اعلیٰ ادب ظہور میں آسکتا ہے جو پاکستانی کہلایا جاسکے؟ اس پر خاصا اختلاف رائے پیدا ہوا۔ ایک طبقہ کی رائے تھی کہ اگر ایک ایسا فیصلہ ایماندارانہ طور پر قبول کر کے ذہن میں رچایا جائے تو کچھ عرصے میں طبیعت ادھر ہی آنے لگی۔ اور ذہن کے سوتے اور ہی طرح پھوٹیں گے۔ مگر پاکستانیت کی تعریف اور تشخیص مقدم ہے۔ دوسرا طبقہ اس خیال کا تھا کہ ارادی کوشش بجائے خود قاتلِ ادب ہے۔ کیونکہ ادب کے عوامل و عناصر تو لہو کی طرح دل و دماغ میں گردش کرتے ہیں۔ اور اگر باہر سے انجکشن کے طور پر داخل بھی کر دیئے جائیں تو پھوڑے پھنسیوں کی طرح نمودار ہو جائیں گے، اگل ولا لکی طرح کھلنے نہ پائیں گے۔ ایک تیسرا طبقہ ان دونوں کے بابین کا تھا۔ وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ دونوں گروہ ایک طرح ٹھیک کہتے ہیں لیکن سچائی دونوں خیالوں کے امتزاج سے نکلتی ہے یعنی یہ کہ نہ تو کوئی فیصلہ کسی پر ٹھونسا جاسکتا ہے اور نہ ادیب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کئے رہنے پر اصرار ہی کئے جائے۔ اگر وہ اس ہٹ پر قائم ہی رہا تو اس کی تخلیقی قوتیں خود ہی گھٹ کر مر جائیں گی۔ اُن کا کہنا تھا کہ ادب خارج اور باطن دونوں سے مرکب اور دونوں کا مظہر ہوتا ہے۔ اور دونوں کے بل پر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اپنے ملک اور اپنی قوم کا شعور نہ صرف ایک خارجی عنصر ہے بلکہ بالکل داخلی بھی ہے۔ کیونکہ سوچنے والا بہرحال اصطلاحوں اور حدوں میں سوچتا ہے، بالکل خلا میں قلابازیاں نہیں کھاتا اور جونہی وہ صاف طور پر سوچنے لگتا ہے اس کے ذہن کو پہلے ملکی لعد پھر بین الاقوامی حدود کو چھونا پڑے گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ ایک ننگے بھوکے مصیبت زدہ ملک میں بیٹھ کر مفروضہ یا کسی غیر ملک کی بہاروں کا قصیدہ ایمانداری سے لکھ سکیں، وہ قصیدہ لکھا ہی نہیں جاسکتا، وہ پارۂ ادب طنز ہوسکتا ہے، تمسخر ہوسکتا ہے، قصیدۂ بہار نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آپ اپنے گرد و پیش سے آزاد نہیں ہوسکتے۔ اور جب بھی ایکدم لمبی لمبی سرحدیں پھاندنے کی کوششیں کی گئی ہیں اُن سے پھسپھسا اور بے جان ادب پیدا ہوا ہے۔

میں نے اس سب گفتگو سے ایک مشترک نتیجہ نکالا۔ میں یہ سمجھا ہوں کہ ان معاملات پر بحث تو فضول نہیں ہے۔ مگر ادیب کو کوئی بات سکول کے بچوں کی طرح سمجھائی نہیں جاسکتی۔ اور اگر زبردستی سمجھائی جائے تو وہ چڑ کر یا زہر اگلنے لگتا ہے یا خاموش ہو جاتا ہے۔ ادیب تو خود ہی ایک حساس پیمانہ ہے، جس پر دور دراز زلزلوں کی گردشیں تک ریکارڈ ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے گھر سے بے خبر رہ سکے؟ ہاں سارے قصے جنہیں ہم ادب کی تخلیق سے متعلق سمجھتے ہیں، اصل میں ادب کی پرکھ سے پیوستہ ہیں۔ گنجلک پیدا یوں ہوئی ہے کہ ادب اور صحافت، ادب اور

میں ادب، تعلیمِ ادب، ادب عامہ، خوشامدی ادب اور سیاسی شعبدے بازی میں فرق نہیں کیا جا سکتا بلکہ سب کچھ گھپلے میں پڑ جاتا ہے جس سے یہ ایک روایت پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ کیا اچھا ہو اگر ہم نئی بحثوں کے ساتھ ساتھ چند قاعدے کلیے اور مسلمات بھی یاد کر لیا کریں۔ تاکہ بزرگوں نے جو کچھ سوچ سمجھ رکھا ہے، اس سے کچھ فائدہ ہی اٹھایا جا سکے۔

بزرگوں سے مراد انیسویں صدی تک کی نسل نہیں بلکہ وہ لوگ بھی ہیں جن کی ادبی عمر ہم سے ایک دن بھی زیادہ ہے۔ ان لوگوں نے بہت سے بحث مباحثوں کے بعد ایک بات مان لی ہے اور وہ یہ کہ اچھا ادب لازماً مقصدی ادب ہوتا ہے اور مقصدیت ایک غرض، ایک اسکیم، ایک تحریک، ایک آدرش یا کسی بھی اکائی کا نام نہیں بلکہ مقصدیت سے مراد ہے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی مسرت۔ مسرت کا لفظ ایک سو تعریفوں کا حامل ہے لیکن اس وقت اس کا موقعہ نہیں۔ فی الحال ایک لفظ پر ہی قناعت مناسب ہے۔ تو مقصدیت سے مراد ہے انسانی مسرت۔ انسانی مسرت ایک ہمہ گیر آدرش ہے۔ اس میں جنگوں کا اختتام، صلح کا قیام، معاشرتی ہمواری، جذباتی آسودگی، اخلاقی بلندی، حب الوطنی قسم کے ہزاروں مقاصد اور عناصر شامل ہیں۔ جدید اصطلاح میں یوں کہنا چاہیئے کہ ادب جو ہے وہ اقوامِ متحدہ کا منشور ہے، اور اتنا ہی عظیم اور اتنا ہی کھلا اور اتنا ہی پیچیدہ، اتنا ہی بے اثر اور اتنا ہی طاقتور ہے۔ جتنا خود اقوامِ متحدہ کا ادارہ اور اسی طرح ملکی پیمانے پر یہ اپنے ملک اور بین الاقوامی سطح پر عالمی عوامل کا آئینہ ہوتا ہے۔

اور پاکستان کی بات کیجئے تو آج بھی پاکستانی ادب کی تخصیص غیر پاکستانی ادب سے ممکن ہے۔ منٹو کی کہانیوں کے کردار جہاں ہندوستانی ہیں اور جہاں پاکستانی ہیں خود بول دیتے ہیں۔ جسیم الدین کی شاعری میں پدما اور میگھنا کی طغیانیاں اور مانجھیوں کی آوازیں مغربی بنگال کے عناصر سے بالکل الگ جھلکتی ہیں۔ لیکن یہ پاکستانی ادب کی ہزاروں توضیحات میں سے ایک توضیح ہے۔ ایک اور توضیح قدرت اللہ شہاب کا ناول "یاخدا" ہے جو اگر محمد جلیسوں کے سپلے پڑ جائے تو منافیٔ پاکستان قرار پائے۔ ایک اور توضیح ایم اسلم کے افسانے ہیں جن میں فسادات کے غم کے سارے شیطانی کردار صرف ہندو اور سکھ ہوتے تھے۔ ایک توضیح نسیم حجازی کے ناول ہیں اور ایک توضیح خود میری کتاب "نئی کرن" ہے جس پر خود مجھے پمفلٹ کا شبہ بھی ہوتا ہے اور اعلیٰ ادب کا گمان بھی۔ ایک اور توضیح قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ہے۔ کئی ہزار برس کا شاندار ہندو فلسفہ اسلامی اقدار کو ہندوستانی بنانے کی کوشش میں ناکام ہو کر قیامِ پاکستان کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ ایک اور توضیح شیر افضل جعفری کی غزل ہے۔ اور ایک اور توضیح چند بڑے ادیبوں کی خاموشی بھی ہے۔ جو مدتوں سے چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ یہ سب پاکستان کی منفرد شخصیت ہے جو ادب میں واضح طور پر نظر آتی ہے حالانکہ اردو ادب ہندوستان میں بھی پیدا ہو رہا ہے۔ مگر ہندوستانی اردو ادب سے ممیز ہونے کے قابل برسوں سے ہو چکا ہے۔ ایک نئی قوم ابھرتی ہے، ایک نیا ملک بنتا ہے تو اپنی تخلیقات کا خمیر بھی پیدا کرتا ہے۔ ہاں وہ خمیر صنعتوں کی اسکیم پر جلد اور ادب کی سطح پر دیر میں اٹھتا ہے۔ جیسے فردوسی کو ایرانی بننے میں چار سو برس لگے تھے، حافظ کو اس سے بھی زیادہ، انگلستان نے شیکسپیر کو کئی صدیوں کی کاوش کے بعد پیدا کیا تھا۔ اور ٹیگور کو جنم دینے میں تو ہندوستانیت نے کالیداس کے بعد شاید ڈھائی ہزار برس گزارے۔ خود ہمارے ہاں اقبال کی تعمیر میں پورے مسلم کمال اور زوال کا خمیر لگا ہے۔ ہم قومیت اور ملکیت کے شاندار اور بھرپور مظاہر چند برسوں میں پیدا نہیں کر سکتے پمفلٹ بازضرور گھنٹے دو گھنٹے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ قومیت تو آہستہ آہستہ اپنا عمل کرتی ہے۔ پرانی پرانی قومیں صدیوں میں جا کر قومی حیثیتیں پیدا کرتی ہیں۔ ہم بارہ برس کی قوم کونسی چھت پھاڑ کر سو رجوں پر کمند ڈال سکتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم خود بنتے جائیں گے ہمارا ادب بھی بنتا جائے گا۔ اور پچھلے بارہ برس کی طرف نظر ڈالئے تو ہمیں نادم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری کشمکش، بے یقینیاں، بے چینیاں، ناامیدیاں جتنی کچھ تھیں وہی ہماری غزلوں، نظموں، افسانوں میں اجاگر رہی ہیں۔ ہمیں بار بار اپنا ماضی یاد آیا ہے۔ جو تلخ بھی تھا مگر شاندار بھی تھا۔ ہم اپنے نئے ملک بنانے پر بار بار خوف اور بے یقینی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ ہمیں بار بار مستقبل نے امیدیں

حالات میں ادب نے پھر اسے از سر نو دوبارہ ترتیب دیا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے ادب میں جھلکتا ہے اور جب سے پاکستان میں انقلاب آیا ہے، ادب نے جو کروٹ لی ہے وہ بھی آج سب کو محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہم بہت سی باتیں بے پڑھے طے کرنا جانتے ہیں۔ ہم میں جو آدمیوں اور عہدوں اور کیفیتوں میں مست ہیں وہ اپنی آسودگیوں کے سہارے، اور جو بہت مالی پریشانیوں میں مبتلا ہیں وہ اپنی ناآسودگی کے سہارے بڑے بڑے محاکمے اور بڑے بڑے فیصلے کرنے پر تل جائیں تو سب کچھ گڈمڈ ہو جائے گا۔ ادب پڑھنے کی تعلیم میں نخوت یا نفرت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ادب پڑھنے کی اہلیت ادب پڑھنے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

ان دانشور بزرگوں اور دوستوں کی گفتگو سے ایک اور سبق حاصل ہوا، میں نے دیکھا کہ آج پورے ملک میں دوبارہ پیاسے ہونے کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ جو ایک نئی حوصلہ مندی کو جنم دے رہا ہے۔ اگر اتنا کچھ لکھنے کے باوجود لوگ خالی خالی سا محسوس کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بہت بڑے بڑے کام جلد جلد ہونے لگیں تو یہ بڑی مبارک فال ہے۔ لیکن ہماری حوصلہ مندیاں وقت کا سہارا چھوڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اقتصادی خوشحالی کے لئے طویل منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے ادبی عظمتیں بھی ایک طرح سے منصوبہ کی پابند ہیں۔ عظیم قومی کارناموں کے لئے صرف ہیجان کافی نہیں، صرف ولولے اور آرزوئیں بھی کافی نہیں۔ ایک عظیم ادبی تخلیق صرف ایک حسین جلوے، ایک اکیلے احساس سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ہزاروں عوامل کے آپس میں گتھ جانے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں منفی بھی اور مثبت بھی اور ملی جلی بھی۔ وہ "مادام بواری" بھی ہوتی ہے اور "پلاوزکراموزوف" بھی۔ "دیوان غالب" بھی ہوتی ہے اور "بال جبریل" بھی۔ اور اب کہ ادیبوں کی پیاس بڑھ گئی ہے، وہ اپنے مسائل کے ساتھ ساتھ چل پڑے ہیں ان کے پاس ماضی کے ذخیرے ہیں۔ اور حال کے میدان بھی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت جلد اپنے وسیع مستقبل کی سرحدیں چھو لیں گے جو انہیں تمام پیچیدگیوں کے باوجود بہت پیارا اور شاندار لگتا ہے۔ پاکستانی ادیب پاکستانی قومیت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے ہیں اور اب ان کا راستہ اجاگر ہوتا جاتا ہے۔ پاکستانی ادیب پڑھنے والوں کو مایوس نہیں کریں گے۔ مگر پڑھنے والے بھی ادب پڑھنے کی عادت ڈال لیں تو دونوں کے لئے منزل تک پہنچنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

اس بارہ میں آپ کا خیال کیا ہے؟ ہم نے صحافت کی آزاد روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ خیال افروز مقالہ جو خود پاکستان کے مسائل حاضرہ کی طرف اعتنا کی بین علامت ہے، کسی قطع و برید کے بغیر بجنسہٖ پیش کر دیا ہے۔ کیونکہ ایک آزاد قوم کا آزاد شعور ہر قسم کے خیالات کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اور ان سے قوت نمو حاصل کرتا ہے۔ امید ہے قارئین بھی اسی آزادی اور بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے اس قومی مسئلہ پر اظہار خیال کریں گے۔ (مدیر)

غزل

شاہد عشقی

اور خود کو خراب و خوار کرو
پاسِ ایمائے چشم یار کرو

اپنے دامن کی چند کلیوں سے
تم نہ اندازۂ بہار کرو

ہر جنم پر بیادِ سرو قداں
جاں سپردِ فرازِ دار کرو

گل کے مانند چاک چاک ہو دل
اتنا شائستۂ بہار کرو

زندگی ہو کرے کہ سچائی
تلخ جو شے ہو اس سے پیار کرو

ہم سفر جب بھی ہو نگارِ غزل
روشِ خاص اختیار کرو

منظوم تمثیلچہ:

خیاباں خیاباں

طاہرہ کاظمی

مقام: دیارِ لالہ و گل

کون کون: سنبل۔ نرگسیں۔ سوسنہ۔ جوہیر۔ رین رانی۔ آبِ گل۔ گلالہ۔
مہرپیچاں۔ بیادِ مجنون۔ ہمہ سوز۔ چمن طراز۔

سنبل

یہ خموشی یہ مہکتی ہوئی زلفوں کا فسوں
سانس روکے ہے تصور کہ کوئی آتا ہے
پئے آرائشِ گیسو، پئے تکمیلِ جنوں
جاگ اے ذوقِ جنوں
جاگ اے ذوقِ جنوں

نرگسیں:

صبحدم دامنِ مژگاں پہ یہ کیسے آنسو
راہ تکتے تکتے ہوئی جاتی ہیں آنکھیں بے نور
کہیں شبنم ہی مرے خواب کی تعبیر نہ ہو
ماہ و انجم کی سفیر
ماہ و انجم کی سفیر

سوسنہ:

کوئی محبوب نہیں ہے جو قریب آئیگا
کوئی امروز نہ فردا کا نقیب آئیگا
خوبصورت ہے بہت یوں تو یہ ہستی کا فریب
خود پرستی کا فریب
خود پرستی کا فریب

جوہیر

آج پھر میں نے سنی قدموں کی مدہوش سی چاپ
گر وہ آئیگا دھندلکے میں چھپا آئے گا
سوسنہ، نرگسیں مدہوش پڑی سوئیں گی
میری خوشبو پہ کھنچا آئیگا
میری خوشبو پہ کھنچا آئیگا

رین رانی:

میں نے خوشبو کو ہر اک گوشے میں روپوش کیا
اپنے انفاس کے جادو کو لئے شب ہمہ شب
باغ کے کتنے ہی اشجار کو مدہوش کیا
ہر خس و خار کو مدہوش کیا
ہر خس و خار کو مدہوش کیا

خلش: (زیرلب)

گر کوئی میرے قریب آئیگا
میرے نشتر سے اماں پائیگا؟

آبِ گل

حسن میں رنگ و حرارت ہی سے جاں آتی ہے
کتنے پُرکیف ہیں یہ نرم گلابی آنچل
جذبۂ شوق لئے روحِ تپاں آتی ہے
عندلیب آئے گی کب؟
عندلیب آئے گی کب؟

گلالہ:

تجھ میں وہ رنگ کہاں حسن نظر جس کو کہیں
دردِ دل جس کو کہیں خونِ جگر جس کو کہیں

داغِ غمِ جاں کو کہیں دیدۂ تر جس کو کہیں
تجھ میں وہ رنگ کہاں !
تجھ میں وہ رنگ کہاں!

مہر پیچاں:
کتنے فتنے ہیں مری ذات سے وابستہ نہ پوچھ
کتنی پر پیچ مسافت ہے کٹھے کوسوں کی
کتنا دور اور دراز عشق کا یہ رستہ نہ پوچھ
کتنا مشکل ہے سفر
کتنا مشکل ہے سفر

بیاد مجنوں:
شب کو ہے نیند نہ آنکھوں کو کوئی میٹھا خواب
یوں جلاتا ہے مرا سوزِ دروں روز مجھے
شدتِ کرب سے بوجھل ہوئے میرے اعصاب
یوں جلاتا ہے مرا سوزِ دروں
یوں جلاتا ہے مرا سوزِ دروں

(ایک طرف سے تتلی داخل ہوتی ہے،
دوسری طرف سے بھونرا۔ دونوں
پھولوں کو چومتے ہیں)

سوسنہ:
بھونرے ! پھولوں کو پریشاں نہ کرو
کسی تتلی سے محبت کر لو

ہمہ سوز:
یہ چمن زار بہت خوب نظر آتا ہے
مجھ کو ہر طرح سے مرغوب نظر آتا ہے
(برق)
میں نے اک پل میں جلا ڈالے ہیں تو خیز نہال
چشمک تیز سے اشجار کو ناشاد کیا

باغ تا حدِ نظر اب تو ہوا ہے پامال
کتنے مغرور حسیں پھولوں کو برباد کیا
پھر بھی باقی ہے مرے دل کی لگن
پھر بھی باقی ہے مرے دل کی لگن
اب لہکیلے ہیں فقط ایک خزاں دیدہ چمن!

چمن طراز:
جانتا ہوں کہ وہ لمحات پلٹ آئیں گے
خوب پھر مہکیں گی سنبل کی گھنیری زلفیں
خوب مہکیں گے گلاب
خوب مہکیں گے گلاب
انتظارِ مۓ فردا میں بہت دور کہیں
سو گئی نرگسِ مخمور کہیں
ذرّے ذرّے میں میرے قلب کی آوازیں ہیں
میرے ہاتھوں نے یہاں رات کا دل چیرا ہے
نور ہی نور یہاں اس میں چھپا دیکھا ہے
ہے یہ گلشن کا بدلتا ہوا خاموش نظام
اس کی ہر روشن و تاریک گھڑی مجھ کو عزیز
خار بھی مجھ کو عزیز
خار بھی مجھ کو عزیز
یوں تو آنے کو خزاں آئی ہے لیکن پھر بھی
سن رہا ہوں میں تصوّر کی حسیں موسیقی
قربِ محبوب میں چھیڑے ہوئے رنگیں نغمات
بھونرے مضراب کا آہنگ لئے پھرتے ہیں
اپنے کاندھوں پہ دف و چنگ لئے پھرتے ہیں
ہیں فروزاں وہ تصوّر کے سُبک رَو لمحات
عشرت و لذّتِ تکمیل کے پرتو لمحات

"برس محیطِ کرم، ایک بار اور برس ... تڑپ رہا ہے ابھی مجھ میں سا اند بھگ نمو
بس ایک بار مجھے اور پھول لانے دے ... آ تمنا تر، مرے دامن پہ پھول برسا دے"
(ڈاکٹر [illegible])

"... ادائے رقص ہے"

پاکستان نے بھی اس فن جمیل کو نئے نئے روپ عطا کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور ہر ہر خطے کے رقص میں وہاں کی مقامی روح اور روایات نے اپنی جھلک پیدا کرکے اس میں روح میخانہ بھر دی ہے

(مضمون : صفحہ ۴۰)

جدید : رومان ہی رومان

، سجیلا)

سندھی :
روپ، رنگ رس

گھنگروؤں کے چھناکوں میں
مچھیروں کی زندگی کی ترنگ
(مشرق پاکستان)

رزم ! رزم !
(خٹک رقص)

" جانب منزل رواں "،
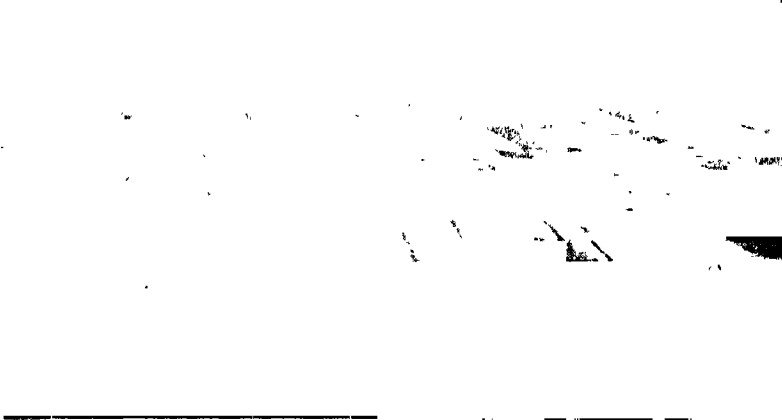
قدرت کے آغوش میں نشمین

مری کا حریف : فورٹ منرو

(مضمون : صفحہ

برف کا سیمیں پیرہن

" آب شکن شکن نگرا "،

دامن کہسار

باغ و بہار

بنگلا افسانہ:

کیا سمجھا تھا میں؟

عبدالغفار چودھری
مترجمہ: احمد سعدی

ملازمت ترک کرکے تجارت کرنے کی حماقت کرنے پر آج رزاق کو اپنے آپ پر غصّہ آرہا تھا۔ آدمی جو کچھ سوچتا ہے ہمیشہ اس کے برعکس ہی ہوا کرتا ہے۔ یوں تو بھیک مانگ کر بھی کتنے ہی لوگ بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ اس کی کتنی ہی مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن قسمت کی بند مٹھی میں رزاق کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے بڑھ کر حیرت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسے تجارت کرنے کی ترغیب دینے کے سلسلے میں اس کے سسر پر بھی تھوڑی سی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا تھا کہ ان کے داماد نے بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد کلرکی کر لی ہے۔ تو انہوں نے خفگی سے کہا تھا۔

"بابا ہمارے محلے کے احمد اور میں نے ایک ہی ساتھ ملازمت لی تھی، لیکن میں نے ملازمت چھوڑ دی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں بیچنے کا کاروبار کرنے لگا۔ وہ ملازمت ہی کرتا رہا۔ اب تم اس کی حالت دیکھو۔ بغل میں پھٹی ہوئی چھتری دبائے وہ آج بھی دفتر جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر کبھی کبھی آکر دستِ سوال بھی پھیلاتا ہے۔ مگر تمہاری اور دوسرے بہی خواہوں کی دعا سے ....."

اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ کر انہوں نے حقّہ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے دھوئیں کی خوشبو فضا میں بکھیر دی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اشارتاً یہ بھی کہا تھا کہ ان کی دس پانچ لڑکیاں نہیں ہیں۔ صرف ایک لڑکی ہے۔ اس لئے وہ اپنی لڑکی اور داماد کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے ضرورت پڑی تو تجارت کے لئے تھوڑا سا سرمایہ بھی فراہم کر دیں گے۔

روپیے کے حصول کا خیال ہمیشہ بڑا دلکش رہا ہے۔ اس لئے رزاق کو اس سے بڑی مسرت ہوئی تھی، لیکن کاروبار کا خیال آتے ہی اس کی ساری خوشی مفقود ہو گئی تھی۔ کیا پڑھنے لکھنے کے بعد بھی آخر اسے اس قسم کی تجارت کرنی ہوگی؟

اس کے سسر نے کہا تھا "یہ کاروبار بُرا تو نہیں۔ دو گوداموں سے ہی کام چل جائے گا۔"

"لیکن اسٹاک کن چیزوں کا کرنا ہوگا؟ وہی چاول، دال، آلو، مرچ اور پٹ سن نا۔ یہ تو ایک ہی بات ہوئی۔"

"تو پھر تم کوئی ایسا کاروبار کرو، جس سے تمہارا وقار قائم رہے۔" سسر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"میرا کیا ہے؟ تم لوگوں کے آرام اور سکھ میں میرا سکھ اور آرام ہے۔"

اس کے بعد یہ طے پایا کہ اسٹیشنری کی دکان کھولی جائے۔ لیکن اس کی بیوی شریفہ نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ رات کو سوتے وقت اس نے کہا: "آخر اس جھنجھٹ کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو کیا میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ کی نوکری کرتا رہوں؟"

"اس میں نقصان ہی کیا ہے؟"

رزاق کو غصّہ آگیا "نقصان ہی کیا ہے کہنے سے تمہارا مطلب؟ کیا تم چاہتی ہو کہ بڑھاپے میں احمد صاحب کی طرح بغل میں پھٹی ہوئی چھتری دبائے دفتر جاؤں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھروں؟ کیا زندگی کی تمام ضروریات اس کلرکی سے پوری ہو جائیں گی؟ ہم دو سے دس نہیں ہو جائیں گے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے؟"

شریفہ شرم سے تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر بولی "ٹھیک ہے، جو تمہاری مرضی ہو کرو۔"

یہ چھ ماہ قبل کی باتیں تھیں۔ اس کے بعد دچیرا اسٹورس کا کام بہت اچھی طرح چلنے لگا تھا۔ تیل، صابن، کنگھی کا فیتہ، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش، پاؤڈر، اوولٹین، پتنگ کا کاغذ، چاکلیٹ، ہر قسم کی چیزوں سے دکان بھری ہوئی تھی۔ رزاق دو اخبار خریدتا تھا، ایک انگریزی کا اور دوسرا بنگالی۔ جب خریدار آتے تو وہ ان سے ہم کلام ہوتا۔ ورنہ دن بھر

بیٹھا بیٹھا ان اخباروں کے ہیڈلائن سے لے کر "ضرورت ہے" کے کالم تک پڑھتا رہتا۔ وقت گزرتا رہتا۔ اس طرح وہ بہت خوش تھا۔ ملازمت کی زندگی سے یہ زندگی کہیں زیادہ پُرمسرت اور تسلی بخش تھی۔ رات کے وقت حساب ملانے کے بعد وہ ایک سگریٹ سلگا لیتا اور گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ شریفہ اس وقت تک اس کا کھانا لئے انتظار کر رہی ہوتی۔

لیکن چھ ماہ بعد اس نے محسوس کیا جیسے اب بھی اس کا مستقبل تاریک ہی ہے۔ کم از کم محمد بھائی اینڈ برادرس کے مقابلے میں اس کی دکان کا مستقبل روشن نہیں تھا۔ ایک دن جگمگاتی ہوئی دکان، خوبصورت سائن بورڈ اور گیس لائٹ کی تیز روشنی میں وہ یکایک چونک اٹھا۔ محمد بھائی اینڈ برادرس کی دکان میں ایک بے حد خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی گردن ذرا سا خم تھی اور اس کے چاندنی میں ڈھلے ہوئے جسم پر ایک ریشمی ساڑی لپٹی تھی، جس کا کنارا سفید روشنی میں ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ گم سم، سحر زدہ سا کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے یکایک یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ گوشت اور خون سے بنی ہوئی کوئی لڑکی نہیں تھی، مصور کی بنائی ہوئی ایک تصویر تھی جسے کارڈ بورڈ کے سہارے دکان میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔

تجارت کرنے کا طریقہ تو کچھ محمد بھائی ہی جانتے تھے۔ ورنہ ایک سال میں اتنی بڑی تبدیلی اور اتنی سجاوٹ کیا معنی رکھتی ہے؟ دونوں نے ایک ہی ساتھ تجارت شروع کی تھی، لیکن وہ جو کچھ کل تھا، وہی آج بھی تھا۔ محمد بھائی اس سے کہیں زیادہ ترقی کر چکے تھے۔ انہوں نے سائن بورڈ تبدیل کر لیا تھا۔ نئے ڈیزائن کا شوکیس لے آئے تھے اور بہت ساری چیزوں سے دکان سجا رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گیس لائٹ کی روشنی میں رزاق جنرل اسٹورس کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا۔ ان کی دکان کے سامنے چمکیلی کاریں آ کر کھڑی ہوتیں اور فیشن پرست خواتین کی ساڑیوں کے آنچل ڈھلک کر فرش پر لہراتے رہتے۔ وہ سب آہستہ خرامی کے ساتھ محمد بھائی کی دکان میں داخل ہو جاتیں اور رزاق اپنی دکان میں بیٹھا انہیں حسرت سے دیکھتا رہتا۔ محمد بھائی کے ساتھ مقابلہ کرنا کتنا مشکل تھا۔ اس کے ذہن پر ہر وقت یہی خیال چھایا رہتا۔

اس وقت اگربتی کی خوشبو دکان میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دکان میں گرمی کا ماحول ... کے روز کے معمول میں شامل تھا۔ رزاق کو دیکھتے ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے "کہو، پارٹنر، بزنس کیسا چل رہا ہے؟"

ان کی باتوں میں طنز تھا یا نہیں، اس کا وہ کوئی فیصلہ ... رزاق "بزنس تو کسی طرح چل رہا ہے، آپ کا کیا حال ہے؟"

"میرا حال؟" محمد بھائی نے سر سے دوپلی ٹوپی اتارتے کہا "بہت خراب، تمام مال پڑا ہوا ہے، کوئی خریدتا ہی نہیں۔"

دس سال تک بنگال میں رہنے کی وجہ سے محمد بھائی تھوڑی بنگلہ زبان سیکھ گئے تھے۔ رزاق کو ان کے بنگلہ بولنے پر ہنسی نہیں آتی تھی بلکہ ان کی باتوں کے بیچ درمیان پر ہنسی آتی تھی۔ وہ پکے کاروباری لہجے میں اس سے گفتگو کرتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے دکان میں لگی ہوئی لڑکی کی تصویر ... ہوئے پوچھا "اس تصویر کی کیا قیمت ہے بھائی؟"

"پچاس روپیہ۔"

"پونچاس ٹاکا!"

محمد بھائی نے اثبات میں سر ہلایا "لیکن میری باتوں پر یقین کرے گا؟ گھر کا روپیہ برباد کر رہا ہوں، بزنس چلتا کہاں ہے۔ یہ تصویر بنوائی ہے، خریداروں کا خیال تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بہت ... تصویر ہے نا؟"

رزاق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رات کے وقت بستر پر لیٹتے ہی رزاق کے ذہن میں ... سارے خیالات گردش کرنے لگے۔ شریفہ نے اُسے اپنی طرف ... کرتے ہوئے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"

"دکان کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ مزید سرمایہ کی ضرورت پڑے گی۔"

"کیوں؟"

"مقابلے کی بات ہے۔ دس ہزار کے سرمایہ سے پچاس ہزار کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

یہ بات شریفہ بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ خود بھی محمد بھائی کی دکان دیکھ چکی تھی۔ سجی سجائی خوبصورت دکان تھی جس میں ہر قسم کا مال موجود تھا۔ کتنی انوکھی تھی اس کی سجاوٹ! اور اس کے مقابلے میں رزاق جنرل اسٹورس کا رنگ کتنا پھیکا تھا۔ پھر بھلا خریدار اس طرف کیسے آتے؟ اس دکان سے اب تک کوئی خاص آمدنی بھی نہیں ہوتی تھی جس سے گھر کا خرچ ...

ںد دکان کی سجاوٹ بھی بڑھائی جاسکے۔ اس کے برعکس محمد بھائی اپنی دکان پہ
دونوں ہات سے روپیہ لٹا رہے تھے۔ جیسے وہ کسی بھی قیمت پر اپنے مقابل
ان کے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، جیسے وہ ہر طرح
سے مجبور کر دینا چاہتے ہوں۔

کھلے ہوئے جنگلے سے چودھویں کا چاند نظر آرہا تھا۔ شریفہ بڑی دیر
تک اسی طرف دیکھتی رہی۔ کہیں رات کی رانی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔
ں کی تیز خوشبو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ شوہر کی طرف منہ کرکے اس نے
سکوت توڑتے ہوئے کہا،

"تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ روپوں کا انتظام
کر دوں گی تاکہ تمہاری دکان بھی محمد بھائی کی دکان کی طرح خوبصورت
بائے اور اس میں گیس لائٹ جل سکے۔"

رزاق نے کہا: "تم پھر اپنے بابا کے سامنے ہات پھیلاؤ گی شاید؟"
شریفہ نے معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "نا گونا۔"

"تو پھر؟"

"کیوں، شادی میں جو چیزیں مجھے جہیز میں ملی تھیں، وہ نہیں ہیں
؟" شریفہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

رزاق نے حیرت سے پوچھا، "جہیز میں ملی ہوئی چیزوں کو تم فروخت
دو گی؟"

شریفہ پھر ہنس پڑی۔ "کیوں نہیں کر دوں گی۔ تمہاری دکان جب
لگے گی تو سبھی چیزیں مجھے واپس مل جائیں گی۔"

رزاق نے ہچکچاتے ہوئے کہا "پھر بھی تمہارے جہیز کی چیزیں ہیں۔"
اس کے جواب میں شریفہ کہنا چاہتی تھی کہ اس وقت میں بھی
ں گی تمہارے ساتھ میری پھر سے شادی ہوئی ہے مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔
ں نے اسے اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور اس کے لمبے گھنے
وں میں انگلیوں سے شانہ کرتے ہوئے بولا "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا
۔ اس سے بہتر ہے کہ کچھ روپیہ قرض ہی لے لیا جائے۔"

اس کے بعد روچیرا اسٹورس کا رنگ روپ بدل گیا۔ کبوتر
جیسی سفید اور صاف روشنی والا گیس لائٹ خرید اگیا، شوکیس
تھا اور سائن بورڈ کا رنگ بدل کر اسے پھر سے لکھوایا گیا۔

اس دن محمد بھائی خود اس کی دکان میں آئے۔ "سلام پارٹنر"
"ارے محمد بھائی ہیں۔ سلام، سلام" "بیٹھئے۔"

محمد بھائی نے پوری دکان کا بھرپور جائزہ لیا، لیکن اس تبدیلی
پر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ کہنے لگے: "آج کا اخبار دیکھا ہے، کتنی عجیب
خبر ہے!"

"کیا ہوا ہے؟"

سمندر کے کنارے ایک عورت کے لئے دو آدمیوں میں جھگڑا
ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کر دیا!"

ان کے پاس دوسری کوئی خبر نہیں تھی۔ بس یہی ایک خبر تھی جسے
سنانے کے لئے محمد بھائی روچیرا اسٹورس میں آئے تھے۔ لیکن ان کے
آنے کی اصل وجہ رزاق سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا
رہا تھا۔ اس نے کہا "ایسے واقعات تو ہمیشہ ہی ہوتے رہتے ہیں پارٹنر۔"

"ایسے واقعات ہمیشہ ہی ہوتے رہتے ہیں؟" محمد بھائی نے
حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا "آخری زمانہ ہے، آخری زمانہ!" انہوں نے
ایک بار پھر دکان کا جائزہ لیا اور رات، اوپر اُٹھا کر بولے "اچھا پارٹنر سلام"

محمد بھائی کی تعلیم برائے نام ہی تھی۔ پھر بھی معلوم نہیں ہوتا تھا
کہ انہیں کسی چیز کی محتاجی ہے۔

ایک ماہ بعد ایک نیا واقعہ پیش آیا۔

رات کے وقت دکان کو روشنی سے مزین کرکے رزاق اس کی
جگمگاہٹ دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ یکایک اس کی
نظر محمد بھائی اینڈ برادرس کی طرف چلی گئی، اور وہ دنگ رہ گیا۔ اس روز
عورت کی تصویر نے ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔ اب وہ زری کے کام والی
ساڑی پہنے ہوئے نہیں تھی بلکہ گھٹنے تک اسکرٹ پہنے ہوئی تھی۔ اس کے
اُجلے نرم و گداز بازو کھلے ہوئے تھے، چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی
اور نازک ہونٹ بولتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

جب وہ اپنی محویت سے چونکا تو اس نے دیکھا وہ تصویر نہیں
تھی، ایک نیم ولایتی سیلز گرل تھی۔ محمد بھائی نے سیلز گرل رکھ لی تھی اور وہ
انداز دلربائی کے ساتھ ایک خریدار کی کلائی پر گھڑی کا فیتہ باندھ رہی تھی۔

دکان سے باہر نکلتے ہی اس نے خریدار کو پہچان لیا۔ وہ ادریس میاں
تھے جو رزاق کے ساتھ ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ اور اب بھی اسی دفتر
میں تھے۔ ملازمت کرتے کرتے بوڑھے ہو چکے تھے۔ رزاق کو دیکھ کر شرما سے گئے۔
انہوں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے
ہوئے کہا "ہیں، ہیں، ہیں، گھڑی کا ایک فیتہ خریدا ہے۔"

"میری دکان بھی تو یہیں قریب ہی تھی" رزاق نے ملائمت سے کہا۔

ادریس میاں نے اپنی شرمندگی چھپاتے ہوئے کہا "ہیں ہیں! تمام باتیں ہر وقت تھوڑا ہی یاد رہتی ہیں بھائی۔ اب یہی دیکھو کہ تمہاری دکان بھی سامنے ہی ہے، لیکن اس کا خیال ہی نہ رہا"

وہ اس کی دکان بھولے نہیں تھے۔ بھولنے کی وجہ اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ادریس میاں بوڑھے ہو چکے تھے، پھر بھی اس میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ انھیں شرمندہ کرتے ہوئے خود رزاق کو شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

رات کے وقت بستر پر لیٹنے کے بعد اس نے شریفہ سے پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا "اب مزید سرمایہ کی ضرورت پڑے گی شو نی"

شریفہ ہنسی "میں نے پہلے ہی کہا تھا، میری جہیز میں ملی ہوئی چیزیں لے لو"

"لیکن اس بار ایک نئے سرمایہ کی ضرورت ہے" رزاق نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"ایک ایسی تعلیم یافتہ دوشیزہ، جس کے جسم کی رنگت دودھ اور آلتا کی آمیزش سے پیدا ہونے والے رنگ کی طرح ہو، جس کی ہنسی جھرنے کی روانی سے مشابہ ہو اور جو ضرورت پڑنے پر خریدار کی کلائی پر گھڑی کا فیتہ باندھ سکتی ہو۔ ان سے مسکرا مسکرا کر میٹھی میٹھی باتیں کر سکتی ہو سمجھیں؟"

شریفہ حیرت زدہ، خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ رزاق نے ہنستے ہوئے کہا "محمد بھائی نے سیلز گرل رکھ لی ہے!"

شریفہ نے اطمینان کی سانس لے کر کہا "او، تو ایسا کہو نا، اس کی تنخواہ کیا ہوگی؟"

"سو روپے سے کم تو کسی حال میں نہ ہوگی۔ روچیرا کی استطاعت سے کہیں زیادہ ہے"

شریفہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ کمرے میں صرف ٹیبل کلاک کی ٹک ٹک ٹک ٹک سنائی دیتی رہی۔ وہ تھوڑی دیر ٹک ٹک ٹک ٹک کی مسلسل آواز کے درمیان سوچتی رہی۔ پھر اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "سو گئے کیا؟"

"نہیں" رزاق نے جواب دیا۔ وہ ابھی تک نہیں سویا تھا۔

"اچھا، مجھے تو گھر میں کوئی زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ ان دنوں تو میرا بہت وقت بچ جاتا ہے"

رزاق نے کہا "ہاں، تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

شریفہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی "فرض کرو، اگر چند دنوں تک میں اس کام میں تمہارا ہاتھ بٹا دوں۔ سویرے اٹھ کر تمام کام ملازمہ کو سمجھا کر دکان چلی جاؤں؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" رزاق نے حیرت سے کہا "تم دکان میں بیٹھو گی۔ خریداروں سے باتیں کرو گی؟"

"کیوں نہیں؟" شریفہ نے جواب دیا "کیا میں نے تعلیم حاصل نہیں کی ہے؟ مسٹر کے زیر اہتمام چلنے والے اسکول میں میٹرک تک نہیں پڑھا ہے؟ بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہوں تو کیا ہوا؟"

رزاق اُسے خاموش کراتے ہوئے بولا "ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن بیوی کے ذریعہ دکان چلاؤں گا تو دس آدمی کیا کہیں گے۔ محمد بھائی ہنسیں گے۔ کہیں گے۔ بیٹے کی حیثیت معمولی ہے"

شریفہ نے جواز پیش کرتے ہوئے کہا "اتنے بڑے شہر میں کون جانتا ہے کہ تمہاری بیوی کون ہے۔ لوگوں کو معلوم ہی کیسے ہوگا؟ وہ کیسے پہچان بھی سکیں گے؟"

"ٹھیک ہے" رزاق ہنس پڑا "لیکن اگر کسی نے تمہارے بارے میں پوچھا تو کیا کہوں گا؟"

"کہہ دینا تمہاری دکان کی سیلز گرل ہوں" اتنا کہہ کر شریفہ نے اپنا چہرہ تکیہ میں چھپا لیا۔

رزاق خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک رزاق سخت پریشان رہا۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکلتا اور رات دیر گئے واپس آتا۔ شریفہ کو اس سے باتیں کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ اگر کسی دن وہ اس سے کچھ پوچھتی تو رزاق کہتا "دو دن اور صبر کرو، پھر باتیں کروں گا" شریفہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس دن شام ہوتے ہی رزاق گھر کی طرف چل پڑا کئی دن تک بھاگتے دوڑتے رہنے کی وجہ سے وہ بڑی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ روچیرا اسٹورس کے قریب آتے ہی اس کی نظر محمد بھائی اینڈ برادرس کے اندر چلی گئی۔ اس روز یہ نیم ولایتی سیلز گرل ساڑی پہن کر آئی تھی ہے دیکھ کر رزاق کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ساڑی پہنے ہوئے شریفہ کھڑی ہو۔ اس کے سامنے ادریس میاں ہیں اور وہ بڑے

(باقی صفحہ ... پر)

ڈرامہ:

کس کی جیت؟

انور عنایت اللہ

افراد

امیر احمد: عمر تقریباً چالیس سال۔
نزہت: امیر کی بیوی۔ عمر تقریباً تیس سال
آمنہ: امیر کی جوان بہن۔
اماں: امیر کی ماں
پپّو: امیر کا بڑا بیٹا۔ عمر تقریباً دس گیارہ سال۔ اور چار اور چھوٹے چھوٹے بیٹے۔ عمریں چار اور دس کے درمیان
ڈاکٹر شمسہ: ادھیڑ عمر۔

دور: دورِ رواں

(پردہ امیر کے ڈرائینگ روم میں اٹھتا ہے۔ متوسط گھرانے کے ایک چھوٹے سرکاری افسر کا ڈرائینگ روم۔ سستے قسم کے فرنیچر سے آراستہ۔ دائیں طرف ایک بڑی کھڑکی جو غالباً گلی میں کھلتی ہے۔ بائیں طرف ایک دروازہ جو اس کمرہ کو گھر کے بقیہ حصے سے ملاتا ہے۔ دائیں طرف ونگ میں ایک اور دروازہ جو اندر سے بند ہے۔ اسے فلیٹ کا صدر دروازہ سمجھئے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کا رنگ کثرتِ استعمال سے اتر چکا ہے۔ مغرب کا وقت۔ بائیں طرف لائٹر سے کچھ قریب ایک چوکی جس پر جانماز بچھائے امیر کی بوڑھی ماں بیٹھی ہیں۔ ان کی نماز ختم ہو چکی ہے اور وہ دعا مانگ رہی ہیں۔ یکایک امیر کا منجھلا بیٹا تیزی سے ایک کتاب لے اسٹیج پر آتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چیختے ہوئے تین اور بچے آتے ہیں۔ سب پہلے بچے پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ بڑھیا کے عین پیچھے چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی ہے۔ سب ایک ساتھ چیخ رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے منجھلا بیٹا اپنے آپ کو چھڑا لیتا ہے اور بائیں دروازے سے بھاگ نکلتا ہے۔ تینوں بھائی اس کے پیچھے چیختے ہوئے بھاگتے ہیں۔ بڑی بی دعا ختم کر کے منہ پر ہاتھ پھیرتی ہیں)

اماں (اللہ کرے ان شریروں سے خدا ہی سمجھے (آمنہ صدر دروازہ آہستہ سے کھول کر اسٹیج پر آتی ہے) نماز پڑھنی مشکل کر دی ـــــ اس گھر میں عبادت بھی چین سے نہیں ہو سکتی۔ (آمنہ بے حد تھکی ہوئی لگتی ہے حسین صورت، صحت مند جسم۔ اس وقت شلوار قمیص میں ہے۔ اسکول سے آئی ہے اور تپائی پر اپنا پرس اور کاپیوں کا ایک بڑا بنڈل رکھ دیتی ہے)

اماں (بیٹی کو دیکھ کر) آج بڑی دیر کر دی آمنہ!

آمنہ گھنٹہ بھر بس کا انتظار کرنا پڑا امی۔ بھائی جان آئے؟

اماں نہیں۔ چپراسی کھانا لینے آیا تھا تو کہہ گیا تھا شام کو دیر سے آئیں گے۔ (آمنہ ایک طرف بیٹھ جاتی ہے۔ بڑی بی بیٹھ چکی ہیں)

آمنہ بھابی کی طبیعت کیسی ہے؟ ڈاکٹر کو بلوایا تھا؟

اماں نہیں حکیم صاحب والا نسخہ بھیج کر دوا منگوا لی تھی۔

آمنہ لیکن امی! دوپہر کو انہیں خاصا تیز بخار تھا۔ اس قدر چکر آ رہے تھے کہ تکیہ سے سر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔

اماں (کچھ سوچ کر) طبیعت تو مالش نہیں کرتی دلہن کی؟

آمنہ (فوراً) نہیں (پھر ماں کا مطلب سمجھ کر) وہ بے حد کمزور ہو رہی ہیں امی۔

اماں اب کے اسے آرام بھی تو نہیں ملا۔ منّو کا دودھ بھی چھڑا دیا پھر بھی چہرہ پر رونق نہیں آئی۔ (مایوسی سے) یوں لگتا ہے میری پوتی کی آرزو کبھی پوری نہ ہوگی۔

آمنہ (پریشان کن چپ چپ کے کھلا کر آپ کا جی نہیں بھرا امی؟ آپ کو اندازہ نہیں بھابی کس قدر کمزور ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر نے تو

صاف صاف کہہ رکھا ہے کہ اب کے اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو یہ نکا دیکھیں گی۔ جسم میں خون بالکل نہیں رہا۔

اماں — اے واہ! جو جی میں آتا ہے یہ ڈاکٹرنی بک کر چلی جاتی ہے۔ چھ بچوں ہی میں جسم کا خون غائب ہو گیا؟ خالہ چھنگو یا دہیں نا! ماشاءاللہ سولہ بچوں کی ماں تھیں۔ پھر بھی چھوٹے بچے کو گود میں کھلانے کی آرزو لئے مریں۔

آمنہ — وہ زمانہ گیا امی! آجکل ایک بچہ کی پرورش اور تعلیم پر جو خرچ آتا ہے اس میں پہلے چھ بچے پلتے تھے۔ جب ان کی ٹھیک طرح دیکھ بھال نہیں ہو سکتی تو پھر ایک سے زیادہ بچے کی خواہش ہی کیوں کی جائے؟ اور پھر منو تو صرف پانچ ہی مہینے کا ہے۔

اماں — (غصے سے) توبہ لڑکی! تیری زبان تو اب خوب چلنے لگی ہے۔ خبردار! جو اس طرح کسی اور کے سامنے بات کی۔ کنواری لڑکی اور یہ باتیں! جا، منہ ہاتھ دھو اور چائے بنا۔ شاید امیر بھی آ ہی رہا ہو گا۔

آمنہ — جاتی ہوں امی! لیکن میری مانئے۔ ڈاکٹر شمسہ کو بلوا لیجئے۔ مجھے بھابی بہت بیمار نظر آتی ہیں۔

اماں — (آہستہ سے) ڈاکٹر کے لئے فیس کہاں سے آئے گی آمنہ! مہینے کا آخر ہے اور دلہن کی طبیعت ہے کہ سنبھلتی ہی نہیں۔ سوچ رہی ہوں کل تک بخار نہ اترا تو اسے سول ہسپتال لے جاؤں۔

آمنہ — (اٹھ کر) آپ فیس کی فکر نہ کیجئے۔ میرے پاس پانچ روپے ہیں۔ آپ کہیں تو پڑوسن کے یہاں سے فون کر دوں۔

اماں — (ٹھنڈی سانس بھر کر) اپنے پیسے یوں خرچ نہ کر بیٹی! میں نے نوکری کی بھی صرف اسی لئے اجازت دی کہ تیرا جہیز تیار ہو سکے۔ تیرے بھائی کی بندھی تنخواہ میں گھر کا خرچ ہی مشکل سے نکلتا ہے۔ اس کے پاس کچھ ہوتا تو اب تک میں تیرے ہاتھ پیلے کر چکی ہوتی۔ (شادی کے ذکر پر فوراً آمنہ کہیں کھو جاتی ہے۔ آنکھوں میں ایک عجیب اداسی ابھر آتی ہے۔ یکایک بچوں کا شور۔ یوں لگتا ہے ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ ایک بچے کی آواز)

بچہ — (چیخ کر) دیکھئے دادی اماں! پپّو بھیا بلی کا بچہ اٹھا لائے۔

دوسرا بچہ — (چیخ کر) میں نہیں لایا دادی اماں۔ پپّو بھائی جان لائے تھے یہ بھوکا ہے۔ اسے دودھ پلا رہا ہوں۔

اماں — ان بچوں سے تو خدا ہی سمجھے! صبح سے بلی کے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں (چیخ کر) پپّو بیٹے! جاؤ، بچہ کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آؤ۔

پہلا بچہ — (چیخ کر) یہ دیکھئے دادی اماں اب کے شدو دبوچے آیا۔ (یکایک چیخ پکار شروع ہو جاتی ہے۔ ایک بچہ کے رونے کی آواز بھی آتی ہے جیسے اس کو پیٹا جا رہا ہو۔ شور سن کر اماں جھنجلا کر بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ آمنہ صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے اور تھکے تھکے سے انداز میں آنکھیں بند کر لیتی ہے چند لمحے بعد زاہدہ اسٹیج پر آتی ہے۔ وہ کبھی بے حد حسین ہو گی۔ لیکن اب تو برسوں کی بیمار لگتی ہے۔ وہ ساری باندھے ہوئے ہے اوپر ایک گرم شال لپیٹ رکھا ہے۔ سامنے آتی ہے تو آمنہ چونک کر آنکھیں کھول دیتی ہے)

آمنہ — (حیرت سے) بھابی آپ! آپ یہاں کیوں آئیں —— کیسی طبیعت ہے؟ (زاہدہ بیٹھ جاتی ہے)

زاہدہ — (آہستہ سے) کچھ بہتر ہے اندر لیٹے لیٹے جی بولا گیا۔ سارا دن بچے شور مچاتے رہے، منو نے الگ ستایا۔ بوتل کا دودھ پیتا ہی نہیں۔ عجیب پریشانی ہے اسے اب نوکر کے ہاتھ باہر بھیجا ہے تو کچھ چین ملا (یکایک رک کر) تم اسکول سے اب لوٹی ہو؟ جاؤ منہ ہاتھ دھو لو۔ چائے بناؤ تو مجھے بھی ایک پیالی دے دینا۔

آمنہ — آپ نے ٹمپریچر لیا تھا؟

زاہدہ — ہاں کچھ کم ہے آج نعیم نے تمہیں فون کیا تھا؟ (آمنہ جواب نہیں دیتی۔ نظریں نیچی کر لیتی ہے) آج آنے کو کہہ گیا تھا۔ آیا نہیں۔ نہ جانے اباکی طبیعت کیسی ہے۔

آمنہ — (آہستہ سے) ان کی طبیعت ٹھیک ہے۔

زاہدہ — (فوراً) تو نعیم نے فون کیا تھا؟

آمنہ — نہیں، وہ خود اسکول آئے تھے۔ رات کھانے کے بعد یہاں آئیں گے۔ کہہ رہے تھے آپ سے کچھ ضروری

باتیں کرنی ہیں۔

زاہدہ: مجھے بھی ضروری باتیں کرنی ہیں۔ عجیب پاگل لڑکا ہے ــــ کہہ دیا تھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر بھی اسے چین نہیں۔ ابا کا غصہ ایک آدھ ہفتے میں کم ہو جائے اور میری طبیعت بھی کچھ سنبھل جائے تو میں خود ابا سے بات کروں۔

آمنہ: (آہستہ سے) لیکن بھابی! وہ میری ملازمت!

زاہدہ: (پیار سے) مجھ پہ بھروسہ رکھو آمنہ! انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابا ٹھہرے پرانے خیال کے۔ انہیں یہ پسند نہیں کہ جوان لڑکیاں گھر سے نکل کر ملازمت کریں۔ میں انہیں راضی کر لوں گی۔ میری بات انہوں نے کبھی نہیں ٹالی (وہ آمنہ کے قریب آجاتی ہے اور پیار سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اوپر اٹھاتی ہے آمنہ شرما کر منہ دوسری طرف کر لیتی ہے) میں جانتی ہوں تم دونوں ایک دوسرے کو کتنا پسند کرتے ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے بھائی جان کے پاس تمہارے جہیز کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ لیکن نعیم بہت روشن خیال ہے۔ اسے جہیز وہیز سے کوئی دلچسپی نہیں (جھکے ہوئے انداز میں) اب یہ شادی جلد ہونی چاہیئے۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے اب کے میں اس بیماری سے اٹھ نہ سکوں گی۔

آمنہ: (فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) خدا کے لئے بھابی! بدشگونی نہ کیجئے (اچانک ایک بلی تیزی سے میاؤں میاؤں کرتی ہوئی اسٹیج پر آتی ہے۔ زاہدہ کے تینوں بچے اس کے پیچھے لگے ہیں۔ بلی بائیں دروازے سے نکل بھاگتی ہے بچے چیختے ہوئے چلے جاتے ہیں)

آمنہ: (ڈانٹتے ہوئے) یہ کیا بدتمیزی ہے گپتو! اب خدا کے لئے بلی کا پیچھا چھوڑو (اس دوران میں بچے جا چکے ہیں۔ اس لئے وہ چیختی ہے) اتنا زیادہ ستاؤ گے تو یہ لپنے بچے لے کر بھاگ کھڑی ہوگی۔ (اب کے پپو اسٹیج پر آتا ہے دس گیارہ سال کا سن سر پر دلیپ کمار جیسے بال۔ تنگ موہری کی امریکن پتلون پہن رکھی ہے۔ کمر پہ خاصی چوڑی بیلٹ۔ آدھی آستینوں کی قمیص آستینیں اوپر چڑھی ہوئی۔ منہ میں غالباً چیونگم ہے۔ کسی کام کیلئے تیزی سے نکلتا ہے لیکن پھوپی اور امی کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے)

زاہدہ: تم صبح سے کہاں تھے پپو؟

پپو: (قریب آکر) اسکول کے بعد اعجاز کے یہاں چلا گیا تھا۔ امتحان کی تیاری کر رہے تھے ہم۔

زاہدہ: (غصے سے) پھر جھوٹ؟ اسکول سے رپورٹ آئی ہے کہ تم ہفتہ بھر سے اسکول گئے ہی نہیں!

پپو: (بڑے اطمینان سے) ظہیر ماسٹر نے بھیجی ہوگی۔ وہ تو میری جان کے دشمن ہیں۔ ٹھہریئے، اعجاز سے پوچھ لیجئے۔ وہ باہر ہے۔

آمنہ: (فوراً) اس سے کیا پوچھیں؟ مجھے معلوم ہے، آج میں خود تمہارے اسکول گئی تھی۔

پپو: تو آپ نے ہم سب کی فیس ادا کر دی؟

آمنہ: نہیں۔ میں تمہارے پرنسپل سے یہ کہنے گئی تھی کہ آئندہ ہر پہلی کو میں تم چاروں کی فیس ادا کر دیا کروں گی۔

پپو: (حقارت سے) چاروں کی فیس! ہونہہ! صرف میری فیس ادا کر دیجئے تو جانوں (ماں سے) سب بچے میرا مذاق اڑاتے ہیں امی! کہتے ہیں وہ آیا نواب زادہ جس کے پاس صرف ایک قمیص اور ایک پتلون ہے۔ ماسٹروں کی ڈانٹ الگ سننی پڑتی ہے کبھی کاپیاں نہیں تو کبھی کتابیں نہیں۔ اگر دونوں ہوں تو پھر وقت پر فیس ادا نہیں ہوتی۔ میں سب سے بڑا ہوں اس لئے ٹیپو، گپتو اور رشید کی فیس کے لئے بھی مجھے ہی ڈانٹ سننی پڑتی ہے۔ بتایئے، میرا جی اسکول میں کیسے لگے؟

زاہدہ: (پیار سے) یہاں آؤ بیٹے! (وہ ہچکچاتا ہے۔ پھر غالباً ماں کے اداس چہرے کو دیکھ کر آگے بڑھتا ہے)

زاہدہ: (اپنے پاس بٹھا کر) ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹے تیرے ابا سنیں تو انہیں بڑا دکھ ہوگا۔ اب آئندہ تم سب کی فیس وقت پر پہنچ جایا کرے گی۔ میں اس کا ذمہ لیتی ہوں۔ (پیار سے اس کے بال پیشانی سے ہٹا کر) تم اس گھر کے بڑے بیٹے ہو پپو! اگر تم ہی اسکول سے غائب رہنے لگے تو بتاؤ تمہارے تینوں چھوٹے بھائی تم سے کیا سبق لیں گے؟ ماشاءاللہ اگلے سال سے جنو بھی اسکول جانے لگے گا۔ ان چاروں کا

تمہیں بھی خیال رکھنا ہوگا۔ اس لیے جی لگا کر پڑھا کرو بیٹے!

آمنہ: مجھے تنخواہ مل جائے تو میں تمہارے لیے نئے کپڑے سلوا دوں گی۔ تمہیں وہ بش شرٹ پسند ہے نا جس پر شیر بنا ہوا ہے؟

پپو: (خوشی سے) جی ہاں، صدر میں صرف چھ روپے میں مل جاتی ہے پھوپی جان! اس کے ساتھ نیلے رنگ کی جین سلوا دیجیے گا جین پہن کر سائیکل چلانے میں بڑا لطف آتا ہے۔

آمنہ: اچھا ضرور سلوا دوں گی۔ اب جاؤ کچھ دیر پڑھ لو۔ اندر بھائیوں سے کہنا امی کی طبیعت خراب ہے۔ بلی کے بچوں کی جان چھوڑیں۔ اب بھائی جان بھی آ ہی رہے ہوں گے۔

(معاً صدر دروازہ کھلتا ہے اور امیر داخل ہوتا ہے)

یہ لو بھائی جان آ گئے (وہ اٹھتی ہے۔ امیر کی عمر یوں تو چالیس کے لگ بھگ ہے۔ لیکن وہ قبل از وقت بوڑھا لگ رہا ہے ایک ہاتھ میں فائلوں کا پلندہ ہے)

امیر: امی کیسی طبیعت ہے؟ (آمنہ اپنا پرس اور کاپیاں لے کر چلی جاتی ہے۔ پپو بھی چلا جاتا ہے)

زاہدہ: بہتر ہے۔ آج تمہیں بڑی دیر ہو گئی۔ (امیر فائلوں کا پلندہ تپائی پر رکھ کر اس کے قریب بیٹھ جاتا ہے)

امیر: ہاں، دو چار دن اور یہی حال رہے گا۔

زاہدہ: چلئے تو تم ہو گئے ہری (ملازم کو آواز دیتی ہے) صاحب کیلئے چائے لے آؤ۔

(نوکر نہیں آتا لیکن اماں بڑبڑاتی ہوئی آتی ہیں)

اماں: خدا غارت کرے اس موئی بلی کو! ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جانے کہاں سے آ کے کمبخت سارا دودھ چٹ کر گئی۔ ہری نوکر کو بوتل بھیجا ہے دودھ مل جائے تو چائے بھیج دوں گی پانی تو کب سے کھول رہا ہے۔

امیر: (بیزاری سے) اس بلی کو کسی کے حوالے کیوں نہیں کر دیتیں؟ ناک میں دم کر رکھا ہے کمبخت نے

زاہدہ: ہاں کرینگے دو دن ذرا بچے بڑے ہو جائیں۔ ورنہ ننھی سی جانیں بھوکی مر جائیں گی۔

امیر: بچے! پھر اس کمبخت نے بچے دے دئے؟ زاہدہ! یہ سال میں کتنی بار بچے دیتی ہے؟ میری مانئے میں ان سب کو زہر دے دو۔

اماں: اے نہیں میاں! بلی کو مارنا بڑا گناہ ہے۔ تم پچھلے مہینے گھر سے اتنا باہر رہے کہ تم کو پتہ ہی نہیں چلا بلی نے کب بچے دئے۔ میں کہتی ہوں یہ نوکری ہوئی عذاب ہوئی اچھی افسری ملی۔ بچے باوا کی شکل کو ترس گئے۔

امیر: بس ہفتے بھر کی اور بات ہے امی! (یکایک کچھ یاد کر کے) ارے میں تو بھول ہی گیا۔ دفتر سے اٹھتے ہوئے میں نے ڈاکٹر شمسہ کو فون کیا تھا۔ وہ اب آ ہی رہی ہوں گی۔

زاہدہ: تم خواہ مخواہ گئے۔ حکیم صاحب کی دوا سے فائدہ تو ہو ہی رہا تھا۔

امیر: خاک ہو رہا تھا۔ میرے خیال میں اب تم چل کر لیٹو زاہدہ۔ ورنہ ڈاکٹر مجھے ہی ڈانٹے گی۔ بڑی منہ پھٹ ہے۔ پچھلی بار تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں تمہاری جان کا دشمن ہوں۔

اماں: اس کی ایسی ہی باتوں سے تو مجھے چڑ ہے۔ نہ موقع دیکھتی ہے نہ محل۔ جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔

(غالباً زاہدہ بھی تھک سی گئی ہے۔ وہ اٹھتی ہے تو یکایک اسے چکر آ جاتا ہے۔ لڑکھڑا کر صوفے کا سہارا لیتی ہے۔ امیر اس کا بازو تھام کر لے جاتا ہے۔ اماں فائلوں کا پلندہ تپائی سے اٹھا کر میز پر قرینے سے دھر دیتی ہیں۔ یکایک پپو اسٹیج پر آتا ہے اور بڑی کھڑکی تک جا کر باہر کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

اماں: کیا دیکھ رہے ہو پپو؟ کیا اعجاز اب تک باہر بیٹھا ہے؟

پپو: نہیں، ڈاکٹرنی آ گئیں دادی اماں، کار سے اتر رہی ہیں۔ (وہ یہ کہہ کر تیزی سے صدر دروازہ کھول کر باہر چلا جاتا ہے۔ بائیں دروازہ سے امیر آتا ہے)

اماں: ڈاکٹر آ گئی بیٹے! پپو انہیں لینے گیا ہے (امیر بھی باہر چلا جاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد لیڈی ڈاکٹر صدر دروازہ سے اسٹیج پر آتی ہے اس کے پیچھے دواؤں کا بکس لئے امیر، پپو بھی ساتھ ہے۔ ڈاکٹر اماں کو سلام کرتی ہے اور پھر امیر کے ساتھ بائیں دروازے سے اندر چلی جاتی ہے۔ پپو ایک طرف

بیٹھ کر جوتے کے فیتے باندھنے لگتا ہے)

ماں جاؤ پپو! بھائیوں سے کہنا شور نہ کریں۔

پپو (بیزاری سے) میری سنتا کون ہے؟ سب من مانی کرتے ہیں۔ ٹیپو صاحب موقع پاکر پیچھے کے دروازے سے نکل گئے۔ میرا خیال ہے باہر سائیکل چلا رہے ہوں گے۔

ماں رات کو سائیکل چلا رہا ہے؟ اے ہے بیٹا، جا اسے بلا لا۔ امیر کو پتہ چل گیا تو اس کی شامت آجائے گی۔ باقی تینوں کہاں ہیں؟ کہیں بلی کے بچوں میں تو نہیں ہیں؟

پپو نہیں، بلی تو بچوں کو نئے گودام میں بیٹھی ہے۔ یہ تینوں تو پھوپی کے ساتھ ہیں! دیکھ رک کر یہ بتائیے دادی اماں! فلموں میں ہیرو کو تنخواہ تو بہت ملتی ہوگی۔ سنا ہے سنتوش کمار ایک بچے کے کئی ہزار لیتا ہے۔

ماں اے بیٹا! کیا بحث لے کر بیٹھ گئے۔ گھر میں ماں بیمار ہے سب پریشان ہیں اور تم اپنی ہی ہانکے جارہے ہو۔

(بائیں دروازہ سے ڈاکٹر آتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے امیر ہے۔ ڈاکٹر بے حد سنجیدہ نظر آرہی ہے۔ وہ ایک طرف بیٹھ جاتی ہے اور پیڈ نکال کر نسخہ لکھنے لگتی ہے۔ اماں سے صبر نہیں ہوتا)

ماں کیسی طبیعت ہے دلہن کی؟

ڈاکٹر (خشک لہجے میں) بہت خراب ہے بیگم صاحبہ! اس بیچاری میں خون اب بالکل ہی نہیں رہا۔

امیر (بے چینی سے) دو چار انجکشن کے بعد ٹھیک ہو جائیں گی نا ڈاکٹر؟

ڈاکٹر دو چار انجکشن کے بعد؟ (جھنجھلا کر) کیا کہہ رہے ہیں آپ! کم از کم بیس انجکشن لگیں گے۔ بہت سارا خون دینا ہوگا تب جاکر وہ خطرہ سے باہر ہوں گی۔ میں آپ کو مبارکباد تو نہیں دے سکتی لیکن ہاں اطلاع ضرور دینا چاہتی ہوں کہ چھ مہینے کے بعد آپ ساتویں بار باپ بن جائیں گے!

امیر (فوراً حیرت سے) جی؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ (عین اس وقت بلی میاؤں میاؤں کرتی اسٹیج پر آتی ہے۔ اب اس کے ساتھ تین بچے بھی ہیں)

ڈاکٹر جی ہاں۔ کیا کہوں۔ سوچ رہی ہوں اس مقابلے میں جیت کا سہرا کس کے سر رہے گا۔ آپ کے سر یا ــ

(عین اس وقت پپو، ٹیپو اور گپو اسٹیج پر آتے ہیں۔ وہ بلی اور اس کے بچوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو بلی کے بچے ادھر ادھر اچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ پردہ اچانک گرتا ہے) *

کیا سمجھا تھا میں؟ بقیہ صـ ۳۲

پیار سے ان کی کلائی پر گھڑی کا فیتہ باندھ رہی ہے اور ادریس میاں بڑے غور سے اس کے چہرے کو تک رہے ہیں۔

رزاق کے پاؤں اور بھی تیزی سے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔

شریفہ اس وقت ساڑی پہنے، جوڑا باندھ کر آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ رزاق کے آتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور پوچھا "آج اتنے سویرے ہی چلے آئے؟"

رزاق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ جوڑے کو خوبصورتی سے پشت پر لاکر باندھتے ہوئے شریفہ دلفریب انداز سے مسکرائی "میں دیکھ رہی تھی کہ تمہاری دکان میں سیلز گرل بن سکتی ہوں یا نہیں۔"

بیوی کے اس مذاق کا رزاق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آہستہ سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا "میں نے دکان بیچ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے شوری۔ کم از کم اس سے قرض تو ادا ہو ہی جائیگا"

شریفہ کو اس کی باتوں کا یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے حیرت سے قدرے چیخ کر کہا "کیا کہہ رہے ہو؟ دکان بیچ دو گے؟"

رزاق نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں، بیچ دوں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے، اب نوکری ہی کروں گا۔ فی الحال ایک پیشکش بھی مل گئی ہے۔ پریس منیجر کی، دو سو روپیہ تنخواہ ہے"

اور پھر اس نے شریفہ کے بالوں کا جوڑا کھول کر بالوں کی لٹ کو اس کی پشت پر پھیلا دیا *

مغنّی ہو تم

اختر احسن

ہوا ——
جو کہ ہر دانگِ عالم میں آوارہ ہے
اور گرجتی ہے دامانِ کُہسار میں
گھنے جنگلوں کے درختوں کو جڑ سے اٹھا کر پٹکتی ہے اور چیختی ہے
سمندر کی پُرجوش موجوں سے ٹکرا کے
گوشِ جہاں کو بناتی ہے بے حِس
اٹھاتی ہے اک شورِ وحشت فضا میں

تم
اک لمسِ انگشت، اک جُنبشِ نیم والب سے
اُس میں جگاتے ہو لرزش
وہ لرزش کہ جس سے ملائک کی ہستی ہے قائم فلک پر
کہ جس سے خدائے زمان و مکاں کے
لبوں کو ہے طاقت
تم انساں ہو
لیکن تمہارے دلوں میں گزر ہے ملائک کی آوازِ پا کا
یہ دل اور یہ بازو تمہارے
یہ ہاتھ اور یہ پنج انگلیاں
گرچہ مٹی کے ہیں
پر انہی میں مقدس خدایانِ افلاک کا ہے بسیرا
انہی میں مکیں ہے وہ سب سے بڑا دیوتا جو خدا ہے زماں و مکاں کا،
مغنّی ہو تم
اور تمہارے لبوں کی جواں لرزشوں میں
اک آواز کا نورِ بیہم مچلتا ہے چھوتا ہوا سرمدی سرحدوں کو
اشارے میں انگلی کے پنہاں ہے
وہ حرفِ پُرنور
جس کے اثر سے
بلندی سے افلاک کی تم بلاتے ہو فرشِ زمیں پر
خدا نغمگی کے
—— یہاں چار سُو تیرہ و تار ہیں
ماہ تاریک قندیل ہے
اور تمہارا نفس
زینۂ نور ہے۔
کہیں سے بلاؤ
خدایانِ افلاک کو عرش سے کھینچ لاؤ
کہ وہ بانسری کے اندھیرے شگافوں میں
آ کر رہیں، روشنی اسکو بخشیں
اور اپنے خدائی نفس سے کہ جو فطرتِ زر کا حامل ہے
ہماری زمیں کو
کہ جو ریگ آسا ہے
سنگیت کے بندِ محکم سے باندھیں۔
وقت کی سونی لڑیوں
کی اک اک گھڑی کو
مبدّل کریں
لمحۂ جاوداں سے!

سانول یار کے سانول

شیر افضل جعفری

لاڈے طرحدار سانول کے — مسکرائیں سہاگ مل مل کے
شہد کے تار تیلے تیلے ہونٹ — دانت محبوب ہیں جھلا جھل کے
چال[1] معصوم، حال پاکیزہ — مست آنکھوں سے بھول پن چھلکے
گھور زلفوں کے سرہانے سے — جاگ اٹھتے ہیں بھاگ بادل کے
چاند مرتا ہے مسکراہٹ پر — رات سہتی ہے وار کاجل کے
وقت کی سیج پر سدا ان کو — رُت سلاتی ہے پنکھیاں جھل کے
صبح سورج انہیں جگاتا ہے — نرم تلوؤں سے دھوپ مل مل کے
ان کے کانوں میں بالیوں کا سماں — عید کا چاند جس طرح جھلکے
نور ان کی نسیم کا لہرا — جیسے پُروا بسنت میں رل کے
پٹڑیاں رنگ رنگ شیشم کی — اور چہرے بلار صندل کے
یہ چھلر واسے دلربا چہرے — یہ مہکتے گلاب جنگل کے
راجا ہے سر در لیتے ہیں — ان کی مہندی کی آگ میں جل کے
ان کی گلیوں میں گیت اور غزل — پاؤں دھوئیں ہر ایک پاگل کے
یہ گنگتے ہوئے جواں سانول — یہ مرے غمگسار پل پل کے
موہ لیتے ہیں تان سینوں کو — گنگناتے ہیں سوز میں ڈھل کے
یہ چنہاں کے حسین حسیں دلبر — "بودلے"[2] یار مست راول کے

ان پہ قربان جائیں پانچوں وقت
دین و ایمان شیر افضل کے

---

[1] چال [2] بھولے بھالے

غزل

ضمیر اظہر

محشرِ غم دل ہی تک ہے، دل سے باہر کچھ نہیں
یورشِ موجِ بلا ساحل سے باہر کچھ نہیں

اشتیاق افزا ہیں سو جلوے حجاب اندر حجاب
حُسنِ کامل دیدۂ کامل سے باہر کچھ نہیں

دور تک صحرائے یاس انگیز ہے پھیلا ہوا
چشمِ مجنوں کیلئے محمل سے باہر کچھ نہیں

مشکلوں نے گھیر رکھا ہے ہمیں کچھ اس طرح
جیسے اپنے واسطے مشکل سے باہر کچھ نہیں

فرحت و غم کے فسانے، سازِ مطرب کا فسوں
زندگی ہنگامۂ محفل سے باہر کچھ نہیں

کاروانِ شوق رُک جاتا ہے اظہر خود بخود
منزلِ دل اس حسیں منزل سے باہر کچھ نہیں

پاکستانی رقص

(دوسروں کی نظر میں)

شیگے کو ساسادا

جاپان کی سب سے بڑی رقص اکاڈمی "ہنودی شامادا" کی ممتاز ترین رقاصہ، شیگے کو ساسادا، کا یہ مضمون امید ہے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ یہ رقاصہ پاکستانی رقص سیکھنے کی غرض سے تین سال تک ہمارے ملک میں رہی اور کئی مظاہرے بھی پیش کئے۔ اس مضمون میں اس نے پاکستانی رقص پر ایک ایسے مبصر کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے جس نے مشرقی ہوتے ہوئے حسن کاری کے ایک مشرقی مظہر کی طرف رجوع کیا ہے اور اس کا نہایت وسیع اور گرانقدر تجربہ رکھتے ہوئے اپنے نقوش تاثر پیش کئے ہیں۔ (مدیر)

غالباً ۱۹۳۶ء کا موسم خزاں تھا، جبکہ میری عمر شاید گیارہ سال ہو گی کہ پہلی بار اس برصغیر کے چند رقص دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں رام گوپال، رقاص ہند، جاپان میں آیا ہوا تھا۔ میں بھی مغربی رقص کے فن کی تعلیم لے رہی تھی اور قدرتی بات تھی کہ مجھے اس ہندی رقص کے دیکھنے کے لئے بھی لیجایا گیا تاکہ اسے بھی سمجھ سکوں۔ اس رقص نے میرے دل پر جو نقش چھوڑا اسے میں غالباً کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ قدموں کی پیچ در پیچ پھرت، جسم کا توڑنا، جیسے کسی مجسمے کی نئی تراش، نرت بھاؤ بتانا اور انگوں کا بانکپن بعض ایسی چیزیں ہیں کہ اس برصغیر میں ان پر صدیوں سے ریاض ہو رہا ہے اور اب وہ ایسی اوضاع ہیں کہ بالکل منجھ گئی ہیں اور اپنا روپ رکھتی ہیں۔ یہ پہلی بار تھی کہ مجھے اس رقص سے شناسائی کا موقع ملا۔

لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں مغربی فن رقص کے سیکھنے میں ایسی لگی تھی کہ اس طرف متوجہ نہ ہو سکی۔ مگر دل کچھ نا آسودہ سا تھا اور اُمنگ یہ تھی کہ رقص کی جس قدر کلاسکی اوضاع بھی میں سیکھ سکوں، سیکھ لوں۔ برصغیر کے رقص اور اس کے سرود اور سازوں کا البیلا پن جاذب توجہ تھا، ان کو برتنے کے گُر اور سازینوں میں سنگت کے بھید بھاؤ اور مضمر امکانات ——— یہ سب چیزیں مجھے اپنی طرف بلاتی تھیں۔ دل ان سے بڑا لگاؤ محسوس کرتا تھا۔ میرا خیال کچھ ایسا تھا کہ ہم ایشیائیوں کے جذبات اور احساسات کی اگر کوئی فطری ترجمانی ہو سکتی ہے تو انہی رقصوں کے روپ میں۔ میں نے جس رقص کا ذکر کیا، واقعی وہ ایک نادر چیز تھا۔ خیر جب مجھے یہ علم ہوا کہ برصغیر کے ناچ سیکھنے کے سلسلے میں مجھے کچھ سال

پاکستان میں بھی بسر کرنے پڑیں گے، تو میرا دل مسرت کی لہروں سے لب[ریز] ہو گیا، ایک پُرانے خواب کی تعبیر نظر آئی۔

ایک غیر پاکستانی کو اس باب میں جس قدر بھی ابتدائی تربیت حاصل ہو سکتی تھی، وہ مجھے مل چکی تھی۔ میں سالہا سال سے جاپان کی رقص اکاڈمی کی ممتاز ترین رقاصہ مانی جاتی تھی اور اس کے لئے جس مشق و مہارت، تجربہ و صلاحیت کی ضرورت ہو سکتی ہے، اس کا ثبوت دے چکی تھی۔ تندرست و توانا، رقص کے لئے موزوں اور فن سے آشنا۔ غرض ہر [طرح] میں یہ محسوس کرتی تھی کہ پاکستانی رقص سیکھوں۔ میں اس ملک کے [رقص] کو کچھ دل سے پسند کرتی تھی اور اب بھی یہ قدر و منزلت میرے قلب [میں] موجود ہے۔ چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ ان رقصوں کو حاصل کر کے چھ[وڑوں]، یہ نہیں کہ "آتا پادو دا" کی طرح محض ایک تجربہ کر کے چھوڑ دوں یعنی غیر ملکی کی طرح بس نظر ڈال کر اور اپنے رقص میں کوئی چٹکلا سا پیدا کر [کے] یہ سمجھ لوں کہ رقص آگیا۔ اس کے برعکس میرا تو یہ ارادہ تھا کہ اس [کا] بھرپور عملی تجربہ حاصل کروں یعنی ایک مشرقی کے نقطۂ نظر سے اس مظہر فن کا مطالعہ کروں۔

پاکستان میں میرا تعارف رفیع انور سے ہوا۔ یہ استاد فن [اور] خراج تحسین کا سزاوار ہے۔ میں اب بھی اس سے ناچ کا فن سیکھ [رہی] ہوں۔ دوسرے استادوں سے بھی استفادہ کیا ہے مگر رفیع انور [کے] ہنر کے بارہ میں میں نے جو بھی رائے قائم کی تھی، اسے اس بات [سے] کچھ اور بھی تقویت پہنچی ہے۔

گرمی خواہ کیسی ہی پڑ رہی ہو، استاد کا پکا اصول یہ تھا کہ
وئی تین گھنٹے روزانہ ریاض کروں۔ شروع کے تین مہینے تو بڑے کٹھن
لذرے۔ جب یہ رقص سیکھنا شروع کیا تو جوڑ جوڑ درد کرنے لگا، جسم کو
وڑنے اور تکنیکی اصولوں کو برتنے میں بدن کو بڑے شدائد برداشت
رنے پڑتے ہیں او میرا تو یہ حال ہوا کہ چلنے پھرنے تک سے معذور ہو گئی
بلکہ کچھ عرصہ کے لئے خریش ہو گئی! چند سیڑھیاں چڑھ کر استاد کے
سٹوڈیو تک پہنچنا محال ہو گیا۔

بہرحال اس طرح شب و روز گذرتے گئے۔ ہر صبح ہم لوگ
دُئی آٹھ بجے اُٹھ بیٹھتے۔ عابد تھا، مردنگ و طبلہ نواز شفیع، ہارمونیم
اسٹر، رفیع استاد اور میں خود۔ صبح صبح اٹھ کر ایک دوسرے کو
سکرا کر ملتے۔ ہر ایک کا عجیب حلیہ ہوتا۔ عابد اور شفیع تو سجھئے اونگھتے
ہوئے آنکھیں ملتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ان کو ناچنے والیوں کے ہاں
اکر رات رات بھر سنگت کرنی پڑتی، ورنہ چولہا توا اوندھا۔ بچارے
یا کرتے! ۔ ادھر میں تھی، تو مجھے ناچ بھی سیکھنا اور گھر گرہستی کا بھی
ھندا کرنا پڑتا۔ شوہر کی دیکھ بھال بچوں کو سنبھالنا ۔ غرض کافی ہمت
زما کام تھا۔ رفیع استاد کا حال یہ تھا کہ نیا نیا اس شہر میں آیا تھا اور
سے اپنے قدم جمانے تھے۔

بہرطور ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتے چلے
لئے اور غیریت کا احساس آہستہ آہستہ کم ہوتا رہا۔ میں نے کچھ کچھ اردو
لنی شروع کر دی تھی۔ سازندوں سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے کام
لاتی تھی، غرض افہام و تفہیم کا مسئلہ اس طرح حل ہو رہا تھا۔ اس طرح
ات مہینے گذر گئے اور ہم لوگوں نے طے کیا کہ اب ہم اگر چاہیں تو ایک
ہوٹا موٹا تفریحی پروگرام پبلک کے سامنے پیش کر سکتے ہیں بشرطیکہ
ن کو سمجھنے والوں کا مجمع ہو۔ میرا مقصد دراصل یہ جاننا تھا کہ مجھے
ھ آیا بھی یا وقت ضائع کر رہی ہوں۔

مظاہرہ ہوا اور اس سے بہت کچھ پایا۔ پہلی بات تو مجھے یہ حاصل
ئی کہ ابھی میرا رقص بڑا مبتدیانہ اور خام ہے۔ کچھ خوبیاں بھی تھیں،
ر بات کچھ ایسی مایوس کن نہ تھی۔ چنانچہ طے پایا کہ کام جاری رکھا جائے۔
ناتھ کے علاوہ بھی میں نے کئی باتیں محسوس کیں۔

یک بات تو یہ کہ پاکستان میں تفریحات بڑی مہنگی پڑتی ہیں۔
اقعا ایسا احساس ہے کہ قدیمی ناچ گانوں کی ہمت شکنی کے خیال سے
اتنے گراں ٹیکس یہاں لگائے گئے ہیں۔ اگر کوئی دو گھنٹے کا پروگرام ہو تو یہ
بہت مہنگا معاملہ ہوتا ہے، فائدہ ہونا تو درکنار۔ پہلے تو ایسا خیال ہوا
کہ شاید برابر برابر چھوٹ جائیں۔ ٹکٹ بھی خوب بکے۔ تھیٹر چھوٹا سا تھا، مگر
جتنی گنجائش ہو سکتی تھی اس کا ۸۵ فیصد حصّہ بھرا ہوا تھا۔ پوری تین راتیں
مظاہرہ ہوا مگر جب تفریح ٹیکس جمع کرانے کا وقت آیا کوئی دو ہزار روپے
پلّے سے دینے پڑ گئے! آمدنی ہوئی کوئی دس ہزار روپے مگر کوئی ساڑھے
چار ہزار روپیہ ٹیکس دینا آ گیا ـــــ!

میں یہ بات کوئی شکایتاً نہیں کہہ رہی ہوں مگر واقعہ یہ ہوا۔
ہمیں ان باتوں کا پہلے ہی علم تھا۔ میں تو یہ بات یہ دکھانے کے لئے کہہ
رہی ہوں کہ رقص و سرود کا کام کرنے والوں کی مشکلات سامنے آ سکیں۔
اگر ٹیکس معتدل ہوں تو خیر کوئی بات نہیں مگر روپے میں سات آنے!
اس کا صاف مطلب تو بس یہ ہے کہ اس دھندے میں پڑا ہی نہ جائے۔

دوسری بات۔ پاکستانی موسیقی کو جب تک سنگیت نگاری
(NOTATION) کی ہیئت میں نہیں لایا جائے گا مشکلات حائل رہیں گی۔
مجھے اس بات کی بڑی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ پاکستانی موسیقی کا بڑا
حصّہ نہایت دلآویز ہے مگر "سنگیت نگاری" کا یہاں کوئی رواج نہیں ہے،
اس لئے اس فن کا بڑا معقول کام بس تلف ہی ہو جاتا ہے۔ ادھر مغرب
کے بلوان سُرد خیل ہوتے جا رہے ہیں اور راگ و ڈیلکے جوگُر ہیں لوگ
سینوں میں لے کر مر جاتے ہیں اور ان کو محفوظ کر لینے کا کوئی ڈھب نہیں
ہے۔ لوگ انہیں بھول بھال جاتے ہیں یا پھر "راک اینڈ رول" یا
اس سے بھی بدتر بدمذاقیاں اپنا رنگ جمانے لگتی ہیں۔ اب عالم یہ
ہے کہ پاکستانی موسیقی کا کَس گھٹ رہا ہے اور اس کی جگہ عامیانہ کَس
آتا جا رہا ہے جو طبیعت کو جلد بدمزہ کر دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا رقص کار اگر کوئی مظاہرہ پیش
کرتا ہے تو وہ اس بات پر بری طرح زچ ہو کر رہ جاتا ہے کہ یہاں موسیقی کو
علامات کے ذریعے منضبط کرنے کا کوئی طریقہ رائج نہیں۔ اب ہوتا یہ
ہے کہ اگر سازینہ میں بارہ آدمی سنگت کر رہے ہیں تو ہر ہر سازندہ کو
اپنا اپنا ٹکڑا یاد کرنے اور دہرانے کی باقاعدہ مشق کرانی پڑتی ہے تب جا کر
وہ اس پر حاوی ہوتا ہے اور پھر ساری ٹکڑی کسی مربوط سازینہ بجانے
کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس دھندے میں کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ رقص کار
پہ بہت بار پڑتا ہے کیونکہ ہر ہر سازندہ کے ساتھ الگ الگ سنگت

اٹھتی ہے اور جب تک ایسا نہ کیا جائے کوئی بھی نہ تال قائم رکھ سکتا نہ سم پر آسکتا ہے۔ رقاصہ کو جب تک سامنے گھنگھرو بندھوا کر نچوایا جائے اور سنگت پر جب تک صحیح توڑے نہ نکلوائے جائیں تب تک کام ل نہیں ہوتا۔ ادھر یہ خوف بھی دامنگیر رہتا ہے کہ اگر کوئی سازندہ یح موڈ میں نہ آیا تو رقص ناتمام اور عیب دار رہ جائے گا۔ ایک دوسرا تجربہ یہ ہوتا ہے کہ سازندے اکھڑ گئے ہوں تو سارا شیرازہ ہی بکھر جاتا ہے ۔ اگر ٹیپ ریکارڈ بھی کر لیا جائے تو بھی اصل سنگت کو دوبارہ تشکیل و ترتیب دینے کی ادا نہیں پیدا ہوتی، یعنی سارے نظام کو پھر سے مرتب کرنا پڑتا ہے۔

مگر اس مشکل سے ایک فائدہ بھی ہے۔ موسیقی کی تازگی اور نو بہ نو کیفیت برقرار رہتی ہے۔ پاکستانی سنگت خواہ اچھی ہو یا بری، اس میں مغرب کے سُروں کی گڈ مڈ ملاوٹ در آئے، کچھ بھی ہو، پھر بھی اس کی اپنی ایک تازگی اور بے ساختگی موجود رہتی ہے۔ بس اسے علامات کے ذریعے مقید و منضبط کر دیا جائے تو بڑا کام ہو ورنہ ہو سکے یہ دونوں کمال مفقود ہو جائیں گے۔ بہرکیف میں اس بات پر آمادہ تھی کہ خطرہ ضرور مول لیا جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہاں ایسے پیشہ ور سازندے موجود نہیں ہیں جنہیں پروگرام میں ضرورت پڑنے پر ذرا سی دیر میں مہیا کیا جا سکے۔ جن ملکوں میں میرا اس طبقہ سے واسطہ پڑا وہاں کیفیت یہ ہے کہ بس ٹیلیفون کر دیا اور جھٹ اچھے خاصے مشاق سازندے یا ذیلی حیثیت کے رقاص یا رقاصائیں آموجود ہوئیں۔ پاکستان میں ایسی سہولت نایاب ہے۔ چوٹی کے پیشہ ور رقص کاروں، مثلاً افروزہ بلبل، گھنشیام اور اس کی بیوی۔ بلبل اکاڈمی فنون لطیفہ (ڈھاکہ) کے استاد ان فن کو چھوڑ کر کلاسکی رقص کا محض شوقیہ کام کرنے والے ہیں۔ ان میں بعض کافی باکمال ہیں مگر بوجوہ، منظر عام پر آ کر رقص کرنے سے کتراتے ہیں۔ بعض تو خیر تیار ہو گئے کہ وہ ہمارے ساتھ مظاہرہ کریں گے مگر زیادہ تر مذبذب رہے۔ ایک اچھی ہوشیار لڑکی اور ایک نہایت عمدہ نوجوان رقاص جو اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ ہوئے کہ اپنے اصل ناموں کے ساتھ اسٹیج پر آ جائیں کیونکہ اندیشہ تھا کہ عزیز و اقربا انہیں مطعون کریں گے کہ یہ نچنیے ہو گئے ہیں! اب سے کوئی پچیس سال پہلے جاپان میں بھی یہی حال تھا۔

میں اپنی بات کہتی ہوں۔ والد کے جیتے جی رقص کا پیشہ اختیار کروں، میرے بس کی بات نہ تھی مگر جب میرے چند مظاہرے ہوئے اور اخبارات نے انہیں سراہا تو ان کی رائے کچھ متاثر ہوئی اور ایسا سمجھا جانے لگا کہ میں بالکل ہی تباہی کی راہ پر گامزن نہیں ہوں۔

پیشہ ور ماہرین کے بروقت میسر نہ آنے سے یہ تو ہوتا ہی ہے کہ غیر ملکی مظاہرہ کنندگان کو سخت مشکلیں درپیش ہوتی ہیں۔ ایک اور بھی دقت ہے اور بڑی سنگین۔ دراصل ہر فن کے لئے کاملین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ بات نہ میسر ہو تو صاحب نظر اور کمال کے جویا تماشائی کیسے متوجہ ہوں اور قدر و معیار فروغ پائے۔ بہر نوع، فن کی نشو و نما ہمیشہ ایسے لوگوں کی محتاج رہی ہے جو ہمہ تن اس میں ڈوبے رہیں اور اپنا سارا وقت، ساری صلاحیتیں، اس کے حصول و فروغ میں صرف کر دیں۔ اب اگر ایسے دلدادگان فن کی تعداد کم ہوتی چلی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ فن معدوم ہوتا چلا جائے گا۔

چوتھی بات جو مجھے شدت سے محسوس ہوئی وہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ میری مراد تقسیم ملک سے ہے جس نے فن پر بھی گہرا اثر چھوڑا ہے۔ میں سیاسی باتوں سے واقف نہیں تھی اور ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ کسی ملکی تقسیم کا فن پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہئے کیونکہ ان کی حیثیت آفاقی ہوتی ہے اور سیاسی حدود سے آزاد۔ مگر پھر مجھے یہ معلوم ہوا کہ بعض بہت ذمہ دار قسم کے لوگ بالکل معقول وجوہ کی بنا پر اس مفروضے کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر یہ کوئی بات نہیں، کلاسکی رقص کی طرف سے لوگوں کو کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔ ضمناً میں چند باتیں عرض کروں۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ ان رقصوں کی بڑی بڑی قسمیں کون کونسی ہیں۔ ان میں سے منی پوری، کتھا کلی، کتھک اور بھارت نیٹم کا چرچا زیادہ سنا جاتا ہے۔ ان میں سے منی پوری اور کتھا کلی کو زیادہ درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ منی پوری وضع میں بڑی دلکشی ہے، طرحداری ہے۔ ان رقصوں کو عظیم نہیں کہہ سکتے ہیں اور نہ ان کا شمار دنیا کے ان ناچوں میں کیا جا سکتا ہے جن کا اثر اور نظم و ضبط عالمگیر اہمیت کا حامل ہے۔ کتھا کلی کو علاقائی لوک ناچوں سے ذرا اوپر کا درجہ دیا جا سکتا ہے اور بس۔ کیونکہ وہ کتھک ناچوں اور بھارت نیٹم کے درجے تک بلند نظر نہیں آتا۔ اس لئے اب ہمارا زیادہ تر ان دو ہی اوضاع سے سروکار رہا۔ عام طور پر ایسا کہا جاتا ہے کہ کتھک ناچ کا مسلمانوں سے اور بھارت نیٹم کا ہندوؤں

یتعلق ہے۔ مگر میری دانست میں یہ دونوں باتیں کچھ قابل قبول نہیں ہیں۔
حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں اوضاع دونوں تہذیبوں
آمیزش کا نتیجہ ہیں۔ ان دونوں وضعوں کو جو ارتقائی صورت ملی اور
ں دُنیائے آب و گل سے ان کو جو مناسبت دی گئی اس کا سہرا مغلوں
ے سر ہے۔ یہ مغل ہی تھے جنہوں نے بھارت نیٹم کو مندروں کی چہار دیواری
قید سے نکال کر ایک نئی زندگی، ایک نیا روپ بخشا، انہیں اپنے
دالانوں اور کھلے اسٹیجوں پر لا کر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اب بھی ان کی
نع میں مغلوں کی اچھی طبیعت کا نقش بدستور پایا جاتا ہے۔ وہ اس ہی
لم آب و گل سے تعلق و مناسبت رکھنے والے فن پارے نظر آتے ہیں
لانکہ انہیں مندروں کی چہار دیواری اور "الوہیت" کی قیدیں رکھنے
کوشش ہوا کی۔ کتھک کی اصل کو دیکھئے کشمیریوں اور مسلمانوں نے
پنے ذوق کو شامل کر کے اسے دیوداسیوں کے چکر اور گلی گلی میں ہونے
ے والے ناچوں کی سطح سے بلند کر کے بڑی اونچی مسند پر لا بٹھایا
رنہ وہ کبھی اس اعزاز و مقام کا سزاوار نہ ہوتا۔ یہ سب مغلوں کی
تراع پسند طبیعت اور جولانی فکر کا نتیجہ تھا کہ اسے نئی ترتیب و
تشکیل ملی۔ اب اگر ان دونوں رقصوں کو الگ الگ دو تہذیبوں
ے منسوب کر دیا جائے، جیسا کہ عام خیال ہے، تو وہ تاریخی حقائق
نظر انداز کرنا ہے۔ ان کی موجودہ ارتقائی شکل کو دیکھئے اور پھر فیصلہ
یجئے۔ میں ایک غیر ملکی ناظر ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ پورے
صغیر کی مشترکہ تہذیبی و ثقافتی آمیزش کی پیداوار ہیں اور اس پر
ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی کا پورا پورا حق ہے۔

میرے نزدیک پاکستانی رقص میں سب سے دلچسپ اضافہ
وہ ہوا ہے جس کی ابتدا بلبل چودھری نے پچھلے دنوں یہاں کی تھی۔ اس
نکار نے اسے عملی صورت بھی عطا کی اور بلندی بھی۔ اس نے کلاسکی
رقص کی تکنیک کو نئی اوضاع کے سانچے عطا کئے، قید و ضبط کی سختی
اپنے رنگ سے نرم کیا۔ اس رقص کو اس عالم کی چیز بنایا اور اس کی
نئی تعبیرات میں اور کئی اختراعیں کیں، یہاں تک کہ طنز و تمسخر تک
نہایت خلاقانہ طریق پر دخیل کر دیا۔ بڑا افسوس ہے کہ میں اپنی آنکھوں
اس فنکار کے رقص کو نہ دیکھ سکی۔ مگر یہ علامات مجھے صاف دکھائی
یتی ہیں کہ وہ بڑا اہم تجربہ کر رہا تھا اور کلاسکی رقص کو بڑی جرأت کے ساتھ
یا اسلوب دے رہا تھا۔ میں کہتی ہوں کہ اگر جیروم ربنز اور رولینڈ پیٹیٹ
کلاسکی رقصوں کا روپ سنوار کر مغربی رقص کو نئی ہیئت دے سکتے
تھے تو پھر بلبل چودھری کیوں نہیں کر سکتا؟ اب اگر بلبل چودھری کے
نقش قدم پر چلنے والے کتھک اور بھارت نیٹم میں بھی جدت طرازی
اور تازگی سمونے کا عمل جاری رکھیں تو کیا بیجا ہے؟ ایسا ہونا چاہئے۔

اس قسم کی اچھی کیفیت کا پیدا کرنا ہے کٹھن کام کیونکہ پاکستان
اور ہندوستان کے کلاسکی رقصوں کی ایک بنیادی قید یہ ہے کہ وہ
ایکانگی ہوتے ہیں۔ اگر اسٹیج پر ایک سے زیادہ رقص کار ہوں تو دونوں
کی حرکات جسم ایک جیسی ہی رہتی ہیں یعنی ایک دوسرے کا عکس۔
پچھلی گرمیوں میں میں نے پیرس میں ایک مظاہرہ دیکھا جس میں ایک
ہندوستانی طائفہ نے کچھ رقص پیش کئے جن میں کلاسکی اسالیب کو
ایک مصنوعی ہیئت میں لانے کی کوشش کی گئی تھی ـــــ مگر یہ کوشش
سراسر ناکام ثابت ہوئی۔

مجھ جیسے غیر ملکی کے لئے اس بات کو چھیڑ دینا تو بہت آسان
ہے مگر ان مشکلات کا حل نکالنا یا سوالوں کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔
پھر بھی میں یہ عرض کروں گی کہ پاکستانی رقص کے معیار میں بلندی پیدا
کرنے کے لئے تین باتیں ضرور ہونی چاہئیں۔

اوّل۔ یہ تفریحی ٹیکسوں کا معاملہ۔ ثقافتی فنون ہمت افزائی
چاہتے ہیں اور ٹیکسوں کی گرانباری کی تاب نہیں لا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ پیشہ ور فنکار مجبوراً شبینہ کلبوں اور سستے سینما گھروں کی طرف رجوع
کرتے ہیں یا پھر شوقیہ سیکھنے والوں کی ٹیوشن کر کے کچھ کما لیتے ہیں۔ اگر
سازندوں اور رقص کاروں کے لئے یہ کام نفع بخش بنا دیا جائے جیسا کہ
دوسرے ملکوں میں حال ہے، تو پھر صحیح قسم کی صلاحیت رکھنے والے
لوگ اس فن کو سیکھنے کی طرف متوجہ ہو سکیں گے اور اس طرح آپ کا یہ
ثقافتی ورثہ برباد ہونے سے بچ جائے گا۔

میری ایک تجویز یہ بھی ہے کہ آرٹس کاؤنسل یا "قومی کاؤنسل
موسیقی" اور ایسے ہی فنی ادارے مشترکہ کوششوں سے اور اپنے اپنے
دائرۂ اثر میں سنگیت نگاری کا بیڑا اٹھائیں اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ہم سب اس رائے پر متفق ہو جائیں
کہ جہاں تک عملی اور جمالیاتی تقاضوں کا تعلق ہے اس حد تک کلاسکی
رقص مجازی ہیں، اور اسی عالم سے نسبت رکھتے ہیں، اس لئے ان پر
اسی زاویۂ نظر سے ہمیں متوجہ رہنے کی ضرورت ہے۔

لوک ادب :

پوٹھوہار کے لوک گیت

عبدالحمید خاں

دنیا کے ہر علاقے میں لوک گیت، قدیم زمانے سے، سیدھے سادے اور بھولے بھالے عوام کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ عالمِ رنگ و بُو کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں دھڑکتے دلوں کے محسوسات مترنم نغموں اور سُریلے گیتوں میں رچ کر فضا میں رس گھولتے نہ ہوں۔ اگرچہ علاقوں کے اختلاف سے گیتوں کے بول، اُن کی دُھنیں اور بناوٹ بدل جاتی ہے، مگر ان تمام گیتوں میں جذبے کی ہمرنگی اور محسوسات کی ہم وضعی ایک قدرِ مشترک ہے۔ عقیدت، محبت، نفرت، وطن کی الفت، ہجر و فراق اور وصال کے بنیادی جذبے ہر جگہ اور ہر دل میں ایک جیسے موجود ہیں۔ پوٹھوہار کے لوک گیتوں کی ترنم ریزیاں پوٹھوہاری مردوں اور عورتوں میں مجلسی اور ثقافتی قدروں کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں۔

لوک گیت کہیں بھی کسی باقاعدہ شاعر کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ نہ ان میں بحور و قوافی کی باریک بینیاں ہوتی ہیں۔ یہ گیت سادہ دل عوام کے سادہ جذبات کے ترجمان ہونے کے باعث خود انتہائی سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں خیال کی ندرت اور اچھوتاپن ضرور ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں محاوراتی کھینچا تانی اور تشبیہوں، استعاروں کی دور کی کوڑیاں نظر نہیں آتیں۔ جذبہ، مشاہدہ اور دُھن لوک گیتوں کے تین بنیادی محرکات ہیں۔ کہیں جدائی کا غم لئے ہوئے ایک محبوبہ انار کے پتوں کو دیکھ کر کسی من بھاتی دھن میں اپنے محبوب کو یاد کرتی ہے تو کہیں چاندنی رات اور ندی نالے کے پانی کا مشاہدہ کسی محبت بھرے دل کے تار چھیڑ دیتا ہے، اور ایک گرفتارِ محبت کی زبان پر کوئی رسیلا گیت تھرکنے لگتا ہے :

گھوہ وگتا کھل ڈیسی
نکی نکی تخشی آں
کدے بھابھڑ بل ڈیسی

(چلتا ہوا کنواں ٹھہر جائے گا۔ (میرے دل میں) عشق کی آگ ابھی سُلگ رہی ہے۔ ذرا سی دیر میں عشق کے شعلے لپک کر بلند ہونے لگیں گے)۔

اس ٹپے میں پوٹھوہار کے لوک گیتوں کی تینوں صفات۔ مشاہدہ، جذبہ، اور دُھن موجود ہیں۔ ٹپہ یہاں کی قدیم صنف ہے، لیے۔ لیے گون، صد اور بیت بھی ہیں، سی حرفیاں اور ماہیے بھی قدیم سے مروج ہیں مگر یہاں کے لوک گیتوں کی روحِ رواں ٹپہ ہی ہے۔ اکثر گیتوں میں ٹکڑوں کی تکرار سے مختلف ٹپوں کو ہی ایک لڑی میں پرو دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سمی مشاٹکر اور شمس کنول اس بات پر متفق ہیں کہ کلاسیکی موسیقی میں ٹھمری کی ایک نرم و نازک شکل ٹپے کے نام سے پنجاب کے ایک مشہور استادِ فن ماسٹر غلام نبی نے ایجاد کی تھی۔ ماسٹر غلام نبی بعد میں شوری میاں مشہور ہوئے۔ ان محققین کا کہنا ہے کہ "ٹپہ شوری میاں نے پنجاب کے ساربانوں کے گیتوں سے متاثر ہو کر ایجاد کیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ گیت پنجاب کے کونسے حصے میں گائے جاتے تھے۔ ساربان اونٹ چلانے والے کو کہتے ہیں۔ پنجاب میں اونٹ یا تو صحرائی علاقوں، مثلاً راجپوتانہ یا ملتان کی طرف عام تھے، یا شمالی پنجاب میں ساربانی ہوتی تھی۔ راجپوتانے کی بولی ملتان اور شمالی پنجاب کی بولیوں سے قطعاً مختلف ہے۔ اس کے علاوہ شوری کے "ٹپے" کے بول بھی "لہندا" بولی میں مقرر ہیں جو شمالی پنجاب کی بولی ہے، ملتانی سے مختلف۔ (اگرچہ یہ دعویٰ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ملتانی بھی لہندا ہی کی ایک شاخ ہے) کیونکہ قدیم زمانے سے پنجابی بولیوں کے تین دائرے نظر آئیں گے جو اٹک سے شروع ہوتے ہیں۔ بولی کی ایک شاخ دائیں جانب، میانوالی اور ملتان کی طرف نکلتی دکھائی دیتی ہے۔ جو وہاں کے اثرات قبول کر کے ملتانی بنی۔

بائیں طرف کہوٹہ، مری اور گوجر خان کی تحصیلوں میں پہنچ کر بولی نے
پہاڑی اثرات قبول کئے جب لہندا بولی سیدھی آگے بڑھتی ہے تو ٹھیٹھ
پنجابی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ بولیوں کے اسی علاقائی فرق کی
موجودگی ہی میں کلاسیکی ٹپے کے بول باندھے گئے۔ جو خالص لہندا زبان
یعنی پوٹھوہاری میں تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کلاسیکی "ٹپہ" نے
پوٹھوہار کے ساربانوں کے گیتوں سے نشوونما پائی۔

ساربانوں کے گیت نہایت سادہ اور براہ راست ہوتے تھے۔
گیتوں کی صنفیں دھنوں کے اختلاف سے الگ ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ گھومنے
والے ساربان وزن اور قافیے کی قید کیا جانیں؟ اس کے علاوہ فنِ تحریر
سے نابلد ہونے کے باعث یہ گیت لکھے کبھی نہ گئے۔ نوخیز الہڑ لڑکیاں اور
نوجوان عاشق اپنے جذبات کا اظہار مخصوص سازوں کے ساتھ گیت گا کر
کیا کرتے تھے۔ ساربانوں کے یہی گیت سینہ بہ سینہ محفوظ رہ کر آج کے
پوٹھوہار کی ثقافت کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

پنجاب کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں پر بھی زیورات، رسوم،
محبوب اور فصلوں کے بارے میں گیت اکثر ملیں گے۔ یہی موضوعات
ان گیتوں کی سادگی کے ضامن ہیں۔ انگوٹھی یا چھلا ایسا زیور ہے جو
عام طور پر دنیائے رومان میں عاشق و معشوق میں نشانی کے طور
پر منتقل ہوتا رہتا ہے۔ چھلے کی رومانوی حیثیت کے پیشِ نظر پوٹھوہار
میں اکثر گیت چھلے کے محور پر گھومنے لگے۔ یہاں کی بھولی بھالی الہڑ
دوشیزائیں اکثر چھلے کے گیت گاتی ہیں۔ مثلاً :

چھلا بیری بور اے
گھر ماہی نا دور اے
ونجنا لا ضرور اے

اُڈاں بن کے طوطا
جتھے ماہی کھلوتا

(میرا چھلا بیری کے پھول کی طرح خوبصورت ہے محبوب
کا گھر دور ہے پر جانا ضرور ہے۔ کاش میں طوطا ہوتی اور اڑ کر وہاں
پہنچ جاتی جہاں محبوب کھڑا ہے)

(یا)

چھلا مہاڑا کس گھڑیا
مہاڑی انگلی کر یندی پیڑ

(میرا چھلا کس سنار نے بنایا ہے۔ کہ میری انگلی درد
کر رہی ہے)

گیت شادی بیاہ کی گوناگوں رسوم کی روح رواں ہیں۔
مہندی، ابٹن، تیل، رخصتی کے موقعوں پر بے شمار گیت گائے جاتے
ہیں۔ جن میں مہندی لگانے، دلہن کے سر میں تیل ڈالنے اور ڈولی
کے متعلق ہلکے پھلکے اور مؤثر انداز میں تک بندیاں یا ٹپے ترتیب
پا گئے ہیں۔ اکثر فصلیں بھی گیتوں کا محور نظر آتی ہیں مثلاً "ٹکا موٹا باجرا"
اور "دھنی نا باجرہ نی مائے"۔ ان ٹکڑوں کی تکرار کے ساتھ باجرے
کی فصل پر ٹپے موزوں ہوئے۔ اسی طرح گندم کے گیت بھی گائے
جانے لگے۔

پوٹھوہار میں اکثر رومانوی ٹپے محبوب کے القابوں پر بھی
پائے جاتے ہیں۔ پیار سے محبوب کو 'چاند' کہا جاتا ہے۔ اس سے
"چناں" ٹپوں میں ایک منفرد صنف بن گیا۔ اسی طرح ماہیا اور ڈھولے
کا اضافہ ہوا۔ پنجابی میں ماہیا کا مطلب اس سے پہلے بھینسوں
کے رکھوالے سے زیادہ نہ تھا۔ اس کا ثبوت وارث شاہ کی مشہور
تصنیف "ہیر رانجھا" میں کئی جگہ ملتا ہے۔ رانجھا کو ہیر نے اپنے
باپ کے یہاں ایک ماہیئے کی حیثیت سے ملازم رکھوایا تھا۔
اسی طرح "سوہنی" والا "مہینوال" بھی صرف بھینسوں کا رکھوالا تھا۔
ماہیا اور مہینوال کی رومان بھری داستانوں نے ماہیا کے لفظ کو
پنجاب کے لوک گیتوں میں جگہ بخشی۔ اس پرکشش نام سے ہر محبت
کرنے والی لڑکی اپنے محبوب کو پکارنے لگی۔ پنجابی ادب میں ہیر اور
رانجھے کے نام تمثیلی اور محاوراتی حیثیت کے مالک بن گئے۔ چنانچہ
ماہیا سے پنجاب کے لوک گیتوں میں ایک اور صنف کا اضافہ ہوا۔
اور پوٹھوہار نے بھی اس صنف کو اپنایا۔ یہی طرح پوٹھوہاری لوک
گیتوں میں "ڈھولا" کی صنف کا اضافہ ہوا۔ پوٹھوہاری لوک گیتوں
میں جگنی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جگنی کے بولوں میں صوفیانہ
رنگ جھلکتا ہے۔ جگنی ماتھے کا زیور ہے جس کی چمک ماتھے پہ
نورانی پرتو ڈالتی ہے۔ اس کے علاوہ اس صنف کے دو ماخذ
اور نظر آتے ہیں۔ اوّل "جوگن" جو بگڑ کر "جگنی" بنا اور دوسرے "جگنو"
یہ دونوں ماخذ بھی قرینِ قیاس ہیں۔ جوگن پاکیزگی اور صفائی کا
راستہ دکھاتی ہے اور جگنو اپنی ننھی پاشیوں سے صراطِ مستقیم

طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اکثر ٹپوں کی دھنوں میں کلاسیکی موسیقی کی جھلک ملتی ہے۔ ماہیا کہیں بھیروں کہیں پہاڑی کہیں پیلو اور کہیں بھیم پلاسی کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ "ڈھولا" پہاڑی اور ملنگ کے انگ میں گایا جاتا ہے۔ بگی کا روپ بھیرویں ہے۔ "چھلا" اور "چناں" پہاڑی میں ملتے ہیں۔ صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ لوک گیتوں میں کلاسیکی موسیقی کا رنگ کیسے آیا۔ یہ جاننے کے لئے پوٹھوہار میں کلاسیکی موسیقی کی سب سے پرانی شہادت ۳۲۶ ق۔م۔ میں پانینی کی ملتی ہے۔ سکندر کے ہندوستان پر حملے کے وقت یہ شخص ٹیکسلا میں زندہ تھا۔ پانینی کہتا ہے کلاسیکی موسیقی کے بارے میں سالاہن اور کرساس دان نے مبسوط مضمون لکھے۔ دوسری تاریخی شہادتیں بتاتی ہیں کہ خود پانینی نے علمِ موسیقی پر ایک جامع کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ ٹیکسلا میں پائے جانے والے مجسموں (جن میں ایک خوابیدہ رقاص کا مجسمہ بھی ہے) سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے پوٹھوہار میں کلاسیکی موسیقی رائج تھی۔ اس موسیقی کا کیا رنگ تھا، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ صدیوں تک ہر حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کا تختۂ مشق بنا رہا۔ اس لئے سینکڑوں سال تک اس کی تاریخ پر ایک گہرا پردہ پڑا رہا۔ ڈاکٹر سمی متاثر کا بیان ہے کہ تیرھویں صدی کے آخر تک سارے ہندوستان میں ایک ایک رنگ نظامِ موسیقی مستعمل تھا۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آخر یا چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں تمام ہندوستان پر مسلمان حکمران تھے۔ ہر طرف امن و امان تھا، ملک خوشحال تھا۔ ظاہر ہے کہ دوسرے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے میں علمِ موسیقی نے بھی ترقی کی ہوگی۔ مسلم عہد میں موسیقی کے بادشاہ حضرت امیر خسروؒ اور دوسرے مسلمان فن کاروں نے ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ جو دوسرے علاقوں کے علاوہ پوٹھوہار کی موسیقی پر بھی اثر انداز ہوا ہوگا۔ چنانچہ اس علاقے میں کلاسیکی موسیقی ہندوستان کے دوسرے حصوں کے دوش بدوش ترقی پذیر رہی حتیٰ کہ آج سے ڈھائی سو سال پہلے دیوان دنی چند اپنی تصنیف "گوہر نامہ" میں خود اپنے کمالِ فن کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی موسیقی "سمندر سے زیادہ گہری اور بال سے زیادہ باریک تھی۔ جسے سن کر صوفی منش لوگ روحانی طاقت حاصل کرتے تھے"۔ اسی تصنیف سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں پوٹھوہار میں "رباب" اور "طنبورہ" بجائے جاتے تھے۔

اس کے بعد کی تصنیف "سیف الملوک" سے بھی پتہ چلتا ہے کہ پوٹھوہار میں کلاسیکی موسیقی وسیع پیمانے پر رائج تھی۔ آج سے تقریباً سوا سو سال پہلے سیف الملوک میں میاں محمد صاحب نے بے شمار راگوں راگنیوں اور سازوں کے نام گنوائے ہیں جو کلاسیکی موسیقی کی مستند شاخیں ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کلاسیکی موسیقی کے بارے میں کتنا وسیع علم رکھتے تھے۔ پوٹھوہار میں کلاسیکی موسیقی گانے اور سننے والوں کے آثار اب بھی رہتاس اور کلیام میں پائے جاتے ہیں۔ رہتاس کے موسیقاروں کا گھرانہ کلاسیکی موسیقی میں یکتائے روزگار رہا۔ مگر اس علاقے کی طوائف الملوکی کا بُرا ہو کہ ان لوگوں کی سرپرستی نہ ہوئی۔ کلاسیکی موسیقی قریب قریب یہاں سے ختم ہوگئی اور اس کے پرستاروں نے ان نغموں کو لوک گیتوں میں سمویا۔ غالباً یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے کرسی نامے پڑھنے شروع کئے، انہی کی بدولت لوک گیتوں کے مکھڑے رسیلے اور چکیلے بنے۔ ان میں سے ایک میر گل میراثی بھی تھا۔ جو دیوان دنی چند کا شاگرد تھا۔ اس نے گکھڑوں کا مشہور کرسی نامہ پڑھا تھا:

گکھڑ شاہ بدا جس وائی
جس نے سُنت رب ودھائی

(گکھڑ شاہ جس نے ہوا کو قید کیا جس نے خدا کے قانون کو بڑھایا)

میر گل ایسے سینکڑوں پیشہ ور میراثی اور قوال میلوں اور عرسوں پر لوک گیت سنا کر داد لیتے اور روزی کماتے تھے۔ انہی نے پوٹھوہار کے لوک گیتوں کو نئے سرے سے ترتیب دیا، ان کی دھنوں کو سنوارا اور ان میں کلاسیکی رنگ جھلکایا۔

عشق ایک فطری جذبہ ہے۔ نوخیز اور الھڑ دوشیزاؤں[1] اور جواں سال نوجوانوں کی نظریں ملتے ہی دلوں کے چقماق لودے اٹھتے ہیں۔ محبت ذات اور برادری کی قید سے بالکل آزاد ہے۔ یہی سچی محبت آپ کو پوٹھوہار کے لوک گیتوں میں ملے گی۔

---

[1] یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اکثر گیت عورتوں کی زبانی ہیں لیکن ان کے لکھنے والے مرد ہیں! مدیر

ولاں مناں نے سودے ہوئے
عشق نہ پوچھنا ذاتی

(محبت میں دلوں کے درمیان سودا ہوا ہے اور عشق ذات نہیں پوچھتا)

پوٹھوہار کے رومان کنوؤں اور بیلوں میں بڑھتے اور پھلتے رہتے ہیں جہاں نوجوان لڑکیاں پانی کا گھڑا بھر کر کسی خوبرو جوان کی راہ دیکھتی ہیں کہ وہ آکر گھڑا اٹھائے اور اس کے دل کی بات بھی سن جائے۔ بیلوں میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے اپنے جانور چراتے ہوتے ایک دوسرے کے دلوں میں جگہ بنا لیتے ہیں:

کھوئے تے آ ماہیا
نالے میںڈھی گل سن جا
نالے گھڑا چکا ماہیا

(اے محبوب کنوئیں پر آ۔ میرے دل کی بات بھی سن جا اور میرا گھڑا بھی اٹھوا دے)

پوٹھوہار کے لوک گیتوں میں فراق کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے:

سم وجنا ای گھوڑے ناں
ڈاھڈا ارمان لگا، تینڈے وچھوڑے ناں

(گھوڑے کے سموں کی آواز آرہی ہے۔ مجھے تیری جدائی کا بڑا دکھ ہے)

پوٹھوہار کی محبوبہ ایک تو اپنے عاشق کے فراق میں جلتی ہے، دوسرے اس کی سہیلیاں اس کو طعنے دینے سے باز نہیں آتیں:

بنجلی کہواڑی گھنی کے ماہی
ڈھکیوں لی کے ہوگیا راہی
ماہی کیہنے نوکری بھانڑاں
لوگ تاں دینے تانڑاں

(بانسری اور کلہاڑی لے کر ماہی نے راستہ لیا یہاں ماہی نوکری کو بہانہ بناتا ہے مگر لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں)

پوٹھوہار میں اکثر بزرگوں کا روائتی سماج اور ذات برادریوں کا فرق، دو محبت کرنے والوں کے درمیان ایک مضبوط دیوار کی طرح حائل رہتا ہے، مگر ان تمام قیود سے بے نیاز اور پابندیوں سے بے پروا عاشق موت تک سے لڑ جانے کے لئے تیار رہتا ہے:

تینڈی گل نہ چھوڑساں جندڑیے نی
جندڑی نی نئیں اسے پروا

(اے جان تیری گلی نہ چھوڑوں گا، خواہ جان چلی جائے)

محبوبہ اس محبت کا جواب اس طرح دیتی ہے:

پھلے نی مثال تیرے نال گئی آں رل
عشقے بوٹی دتی گال
اگی باہجوں گئی آں بل

(پھول کی مانند میں تیرے دل میں بس گئی ہوں، عشق نے میرا گوشت گلا ڈالا ہے اور میں آگ کے بغیر ہی جل کر راکھ ہوگئی ہوں)

محبت کے اس حسین اعتراف پر عاشق یوں گویا ہے:

چنے نیاں چاننی آں
چن اَکسی پتہ دسو
دیکھو اساں نیاں آو بیتیاں

(چاند کی چاندنی! اے چاند (محبوب) تم ملنے کی جگہ بتاؤ پھر دیکھو میں وہاں کیسے پہنچتا ہوں)

غرض سماج کی پابندیوں کو توڑ کر ایک دوسرے کے متوالے یونہی عہد و پیمان باندھتے رہتے ہیں اور محبت کی پینگیں اسی طرح بڑھتی رہتی ہیں۔

پوٹھوہار کے لوک گیتوں میں زندگی اپنی پوری آب تاب کے ساتھ جھلکتی ہے۔ ان میں عشق و محبت، سماج، مذہب، عقیدت، دنیاوی خوشیاں اور غم، سب ہی موجود ہیں۔

فصلوں کی بوائی کے موقع پر دوشیزاؤں کے ہونٹوں پر کچھ اس قسم کے گیت لرزاں رہتے ہیں:

کنکاں نی راہی ہوسی
ٹھنڈی ٹھنڈی وا چلنی
سجناں داروں آئی ہوسی

(گندم بوئی جارہی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے یقیناً محبوب کی طرف سے آئی ہوگی)

سماج کی نظروں میں اپنی بیگناہی ثابت کرنے کی

ایک معصوم کوشش کچھ اس طرح ہوتی ہے:

میں پانڑی بھریندی ہاں ڈولیاں
میں کدوں ڈھولے نال بولی آں
بھیڑا لوک مریندا بولیاں

(میں تو پانی بھر رہی تھی۔ میں نے کب ڈھولا (ساجن) سے بات کی۔ بُرے لوگ تو یونہی طعنے دے رہے ہیں)

شادی بیاہ کے موقع پہ بے شمار گیت گائے جاتے ہیں۔ جن میں ہر رسم کے گیت الگ الگ ہیں۔ تیل، مہندی، رخصتی اور ڈولی کے استقبال کے گیت بہت پُرسوز، سُریلے اور سادے ہوتے ہیں۔ تیل کا ایک گیت ملاحظہ ہو:۔

میری مینڈی نہ کھولو سہیلڑیو
میرے بابل توں پچھو سہیلڑیو
میری مینڈی نہ کھولو سہیلڑیو
میرے چاچے توں پچھو سہیلڑیو
میری مینڈی نہ کھولو سہیلڑیو
میرے ماے توں پچھو سہیلڑیو
میری مینڈی نہ کھولو سہیلڑیو

(میری سہیلیو! میری مینڈھیاں صرف میرے ابا، میرے چچا، میرے ماموں کی اجازت سے کھولو)

دیکھئے لڑکی اپنے رشتہ ناطے کے بارے میں اپنے بزرگوں کے دخل کی کس وجہ پابند ہے۔ یہی بات یہاں کی سادگی اور پاکیزگی کی گواہ ہے۔

پوٹھوہار کے سیدھے سادے عوام مذہبی لحاظ سے نہایت جوشیلے ہوتے ہیں اور اولیا اللہ کے حد درجہ عقیدت مند۔ پوٹھوہار میں بزرگوں کے مزاروں پر عُرس اور میلے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں چکوالی، دوکالی اور برّی کے میلے اور شاہ چن چراغ کا عُرس قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ چن چراغ کے دربار کا ذکر دیوان دنی چند نے اپنی تصنیف "گوہر نامہ" میں بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ ان مزاروں پر قوالیاں اور مجرے ہوتے ہیں۔ بیت بازی کے مقابلے، کھیل کے مقابلے جن میں کوڈی کھتے "(کبڈی)" "بینی" (بازو) پکڑنا، وزنی پتھر اٹھانا بہت عام ہیں۔ ناچ، بھنگڑے، اور لوک گیت میلوں ٹھیلوں کی جان ہیں۔ ایک عقیدت کا گیت ملاحظہ ہو:

نت پئی دے نت پئی جھاڑو دیواں برّی نے روضے تے
ٹکی ٹکی دے، ٹکی ٹکی جھاڑو دے برّی دے روضے تے
پیراں ساڈے کھوہ کھنڈایا۔ سروں والے کھوہ کھنڈوایا
نوسو دے نوسو بوٹا لگا، برّی دے روضے تے
پیراں ساڈے میلہ لایا، سروں والے میلہ لایا
نوسو دے نوسو دے آدم آیا برّی دے روضے تے

(برّی کے روضے پر میں جھاڑو دے رہی ہوں۔ روضے پر ذرا پھوار پڑ رہی ہے۔ ہمارے پیر نے کنواں لگوایا، جس پر پورے نوسو درخت لگے ہیں۔ برّی کے میلے پر نوسو (سینکڑوں) آدمی آئے)

میلے پر جاتے وقت بیوی اپنے شوہر سے اپنے ننھے اور ننھی کے لئے تحفوں کی فرمائش کرتی ہے:۔

میرے سوہنڑے نا گھوڑا لے آویں
میری کُڑی نا جوڑا لے آویں

اور ادھر ایک دلنواز اپنے بالم سے کیا مانگتی ہے:

ساڈا ماہی میلے تے چلیا اے
اساں پیلا ڈوپٹہ سلیا اے

ادھر دوسری کہتی ہے:

ساڈا ماہی کولوں لنگھیا اے
اساں چاندی نا چھلا منگیا اے

(پیلے دوپٹے اور چاندی کے چھلے کی فرمائش)

مذہب کی الفت اور بے ثبات دنیا میں خدا کی بادشاہت کا تصور دیکھنا ہو تو "جگنی" کے یہ بند سنیئے:۔

جگنی نا حال نمانا — بیا
ایہہ دنیا جھوٹھ ٹھکانا
سائیں مہاڑیا جگنی اڑے پئی
دیہوں چڑھے تے کلمہ پڑھے پئی — دن

ماں اپنے نوجوان لڑکے کو بہادری کا سبق ان الفاظ میں دیتی ہے:

جن چوکاں تو نئیں چڑھدے
تیرے جئے گھبرو بندوقاں تونہیں ڈردے

(چاند کبھی کونے سے نہیں نکلتا۔ تجھ جیسے جوان بندوقوں سے نہیں ڈرا کرتے)

ان مثالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ پوٹھوہار کے
ـ گیتوں میں انسانی زندگی کی ایک مکمل تصویر ہر پہلو سے نمایاں ہے۔
موجودہ دور کی ترقی نے پوٹھوہار کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا ہے۔
ںوفون، ریڈیو، اور فلموں کی بدولت لوگ زیادہ وسیع النظر ہو گئے
ں۔ پوٹھوہار کے شعرا جدید تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے چھوٹی مثنوی،
ت، بیت، سی حرفی وغیرہ میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ گیتوں کی
ںرش اور تراکیب کے نئے نئے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ مگر اکثر کو شعرا
فارسی تراکیب کے استعمال نے بوجھل کر دیا ہے۔ لوک گیتوں
ں سادگی، بے ساختگی اور زبان کی سلاست نئی شاعری کے استعاروں
تشبیہوں سے زیادہ دلکش اور خوبصورت ہیں۔ مثلاً:

م مہرِ درخشاں یا مشتری ایں یا کر چودھویں رات دا چن ایں توں
کددوں الف آزاد مثال ہیں ایں یا شمشاد یا سرو نا چنار ایں توں

ں کے برعکس:

"چن میرا بانکا ڈھول سپاہی" اور "ماہی سرونا بوٹا"
ہیں زیادہ لوچدار اور دلکش ہیں۔ امید ہے پوٹھوہار کے نئے شعرا
ں گیتوں کے سرمائے کو اور زیادہ تابناک اور شاندار بنائیں گے۔

(پوٹھوہار کے عین دل میں پاکستان کے نئے دارالحکومت
اسلام آباد کا قیام لازماً بہت ہی دور رس نتائج کا باعث ہوگا۔
پنجابی اور اس سے ملتی جلتی تمام بولیوں۔ ملتانی، پوٹھوہاری، پہاڑی
اور ہندکو کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ہر بدلتے رنگ، ہر نئی نویلی بات
کو فوراً اپنے اندر سمو لینا چنانچہ یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ کس
طرح ریل، ہوائی جہاز، سائیکل ایسی نئی نئی ایجادیں، لام کی باتیں،
تاریخی واقعات جو دنیا کے کسی دور دراز گوشے سے تعلق رکھتے ہوں،
دوسرے ہی دن یہاں کے لوک گیتوں میں جگہ پا لیتے ہیں۔ اثر پذیری
اور اخذ و استفادہ کی یہ صلاحیت حیرت انگیز ہے اور پھر ان الفاظ اور
واقعات وغیرہ کو کس بے تکلفی سے سمویا جاتا ہے کہ ان سے ذرا بھی غرابت
یا اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ لہذا کچھ عجب نہیں کہ پوٹھوہار کے
لوک گیتوں میں حالیہ انقلاب، اس کی شخصیتوں اور کارناموں نے بھی
بڑے ہی دلچسپ پیرائے میں راہ پائی ہو اور اسلام آباد کے قیام سے تو
معلوم نہیں پوٹھوہاری، پہاڑی اور ہندکو کے تمام تاریخی علاقوں میں کیا کیا
دلکش ہیجان پیدا ہوں، کیا کیا ولولے ابھریں جو گیتوں کی شکل میں گونج اٹھیں۔)
(مدیر)

"ماہِ نو" کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت تصور کئے جائیں۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

مقالات :

مری کا حریف — فورٹ منرو

ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن عزیز

اگر مغربی پاکستان کے شمال مغربی حصہ کو سیاحوں کی جنت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ قدرت نے اس قطعہ کو ہر طرح کی دلکشیوں سے آراستہ کرنے میں بڑی ہی فیاضی اور فراخدلی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ حدِ نظر تک میل ہا میل پھیلا ہوا اونچے اونچے پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ جس کے آغوش میں اَن گنت باغ و بہار وادیاں بکھری پڑی ہیں۔ اور انسان کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ سوات، ہزارہ، کاغان، غرض اس کوہستانی علاقہ میں کیا کچھ نہیں۔

انہی پہاڑی سلسلوں میں سے ایک کوہِ سلیمان کا عظیم الشان سلسلہ بھی ہے۔ جو اپنے نام ہی میں ساحرانہ کیف لئے ہوئے ہے۔ اس سلسلۂ کوہ پر جو حضرت سلیمان جیسی طلسم آفریں، مہتم بالشان شخصیت سے مناسبت لئے ہوئے ہے، قدرت اور انسان کی جادوگری وہ کرشمہ دکھاتی ہے جسے فورٹ منرو کہتے ہیں۔ ڈیرہ غازی خاں سے ۴۵ میل دور مغرب کی طرف سطح سمندر سے ۶۳۰۰ فٹ بلند۔ اس رومانوی اور طلسمی فضا میں اس شاندار مقام کا چشم تصور ہی میں نظارہ کیا جائے تو از بس کیف آفریں ہے اور حقیقت تو پھر حقیقت ہے۔

فورٹ منرو بہاولپور ڈویژن کا صحت افزا مقام ہے محکمہ جنگلات اسے خوبصورت سے خوبصورت تر بنانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ ہزارہا درخت لگائے جا چکے ہیں۔ تاکہ دور دراز مقامات کے سیاح یہاں کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو سکیں۔ تاریخ کے اوراق الٹنے سے پتہ چلتا ہے کہ فورٹ منرو ملتان ڈویژن کے کمشنر مسٹر منرو کے نام پہ آباد کیا گیا تھا۔ موجودہ فورٹ منرو کی بنیاد ۱۸۸۳ء میں ڈالی گئی۔ شروع میں صحت افزا مقام بنانے کے لئے مارٓی کو منتخب کیا گیا تھا۔ جو ایک پہاڑی جگہ ہے اور گورچانی تمن کے علاقہ میں پڑند کے مغرب کی طرف بیس پچیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور سلسلۂ کوہِ سلیمان کا درّہ ہے۔ التمش، جہانگیر اور عالمگیر اور دوسرے بڑے بڑے فاتح اس راستے سے گذر چکے ہیں۔ یہاں پر اب تک سرکاری عمارات کی بنیادوں کے نشا موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تعمیری کام شروع ہو چکا تھا بعد میں پشین روڈ کی وجہ سے موجودہ نواب لغاری کے دادا، نوا محمد جمال خاں نے حکومت پر زور ڈالا کہ پشین روڈ کے موقع پر ایک گرمائی صدر مقام بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے علا بغیر کسی معاوضہ کے کھر کا صحت افزا مقام تجویز کیا۔ بعد میں مسٹ نے زر کثیر خرچ کر کے بند باندھے، تالاب اور بنگلے بنائے او تعمیر کئے صحت افزا مقام بننے کی وجہ سے یہاں کے بلوچ دیگر ق علاقوں کے باشندوں کی بہ نسبت تہذیب و تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

دولت خداداد پاکستان کے وجود میں آنے پر حکومت نے بے اندازہ خرچ کر کے پختہ سڑکیں تعمیر کیں، آب رسانی کے لئے ایک جس کا نام "ڈیمز" ہے، کی بھی بہت کچھ توسیع کی۔ مڈل اسکول ایک نئی وسیع اور عالی شان عمارت مکمل کی گئی۔ فورٹ منرو کے علاقہ میں ہی افسران ضلع کی توجہ اور اَن تھک کوششوں سے محکم بھی قائم ہوا ہے۔ ۱۸۷۵ء میں ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خاں اد سنڈیمین نے یہاں کے قبائلی سرداروں کی امداد سے بلوچستا ساتھ ایک معاہدہ بھی کیا اور انہی خدمات کے اعتراف میں ملحق میں اسی نام پر ایک ضلع "فورٹ سنڈیمین" کے نام پر آباد ہوا۔

اسی پہاڑی علاقے میں اسلامی دور سے پہلے کے تین اب بھی موجود ہیں۔ جن کے نام آبائی دور کی یاد دلاتے ہیں۔ "مم نامی تالاب علاقہ گورچانی میں واقع ہے۔ جو فورٹ منرو کے ج مشرق میں تقریباً بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اسی طرح کھرآن میں بہت سے تالاب کنڈ کے نام سے موسوم ہیں۔

یہ علاقہ تاریخی حیثیت سے بھی بڑا اہم ہے۔ کیونکہ

مشہور لڑائی لڑی گئی جو "مری وار" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس میں مجاہدین نے آزادیٔ وطن کی تڑپ لئے ہوئے اپنی جانیں قربان کیں ۱۹۱۸ء میں بلوچی قبائل نے متحد ہو کر بلوچستان کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر فورٹ منرو پر حملہ کیا۔ یہاں پر ان کا مقابلہ انگریزی توپ خانہ سے ہوا۔ قبائلیوں کے پاس صرف تلوار اور توڑے دار بندوقیں تھیں مجاہدین نے شکست کھائی۔ گو یہ مہم ناکام رہی تاہم حکومتِ غیر سے نفرت اور آزادی سے محبت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔

انسان نے بھی قدرت کے آغوش میں نشیمن تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے جو کئی عمارات کی شکل میں دکھائی دیتی ہے چنانچہ ساٹھ ستر فٹ بلند ایک خوبصورت پہاڑی پر ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خاں، کمشنر بہاولپور ڈویژن اور پولیٹیکل اسسٹنٹ کے بنگلے اور دفاتر بنے ہوئے ہیں۔ بنگلوں کے جنوبی رخ پر ایک بنگلہ میں محکمہ جنگلات کا دفتر ہے۔ دو سال ہوئے ایک نئی سڑک بنائی گئی جو ان بنگلوں تک پہنچتی ہے۔ اور جس کا نام نوابزادہ افتخار احمد خاں، ڈپٹی کمشنر کے نام پر افتخار روڈ رکھا گیا ہے۔

فورٹ منرو میں کرایہ کے لئے تین بنگلے موجود ہیں۔ بارعے لاج، لیک ویو اور کیمر ڈیلو۔ جو خوبصورت مناظر کے لحاظ سے بہترین مقام پر واقع ہیں۔ تمام جنگلات اور مکانوں کی دیواریں پختہ ہیں اور بنگلوں تک موٹر کی آمد و رفت کے لئے سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ خوشنما پلاٹوں میں باغیچے بنائے گئے ہیں۔ پانی کی قلت کے باوجود جرگہ ہال کے ارد گرد خوشنما پھلواری بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے۔ اس قبائلی پہاڑی علاقہ میں مدت سے پانی کی قلت کا شدید احساس کیا جا رہا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے تجویز تھی کہ قدرتی چشموں کا پانی نلوں کے ذریعہ فورٹ منرو تک پہنچایا جائے۔ جس پر کئی لاکھ روپے خرچ آتا تھا۔ لیکن یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر بھی سنگلاخ علاقہ میں کئی ایک نئے تالاب زیر تعمیر ہیں۔ دفتر جنگلات کے قریب ایک سرائے کی تعمیر شروع ہونے والی ہے۔ بجلی کی سپلائی کے لئے بجلی گھر کا انتظام پچھلے تین چار سالوں سے ہو چکا ہے۔ اور بجلی کی سپلائی تسلی بخش طور پر جاری ہے پولیٹیکل اسسٹنٹ کے دفتر کے سامنے بلوچی قبائلی علاقہ ڈیرہ غازی خاں اور پنجاب کے الحاق کا خوبصورت سا سفید نشان نصب ہے جس کے مشرقی طرف الحاق میں شامل ہونے والے سرداروں کے نام درج ہیں۔

اس علاقے کی آب و ہوا سرد خشک ہے۔ بارش بہت کم ہوتی ہے اور باشندے فطرت کی آزاد فضا میں بھیڑیں، بکریاں پالتے ہیں۔ یہی ان کی گزر اوقات کا ذریعہ ہیں کیونکہ یہاں کی عمدہ پرورش کی ہوئی بھیڑیں بکریاں سابق پنجاب بھر میں بھیجی جاتی ہیں اور ملکی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ بھیڑوں ہی سے اُون کی انمول دولت بھی ہاتھ آتی ہے جو ہرنائی (بلوچستان) میں اون کا ایک شاندار کارخانہ بھی قائم ہے۔

اس خشک پیداوار کے مقابلے میں تر پیداوار بھی ہے جو غذا کی اہم ضرورت پوری کرتی ہے۔ یہاں کے دو سرکاری باغات کھوا اور ڈیمز کے نام سے مشہور ہیں جن میں سیب خوبانی، آلوچہ آڑو، بگوگوشہ، لوکاٹ بادام، انار، انگور، بہی، ناشپاتی اور اخروٹ بکثرت پائے جاتے ہیں پرندوں میں چکور، تیتر، خرگوش اور سسی عام ہیں۔ پہاڑوں کے اندر مارخور اور گڈ یعنی پہاڑی بکری اور دنبہ بھی مل جاتے ہیں۔

پچھلے دو تین سالوں میں مکانات، ہوٹل اور دکانیں وغیرہ تعمیر کرنے کے لئے ایک اسکیم مرتب کی گئی تھی۔ اور پلاٹوں کے نقشہ جات تیار کر لئے گئے تھے مگر ایک خاص معاوضہ کی وجہ سے یہ اسکیم ملتوی رہی اب اگر کوئی مشکل سدِ راہ نہ ہوئی تو پلاٹوں کی تقسیم روبہ عمل آجائے گی۔ اور چند سالوں کے اندر اندر فورٹ منرو خوبصورتی کے لحاظ سے مری کے مشہور صحت افزا مقام کو بھی مات کر دے گا۔

اس مقام کو سرسبز و شاداب اور مری کا حریف بنانے کے لئے محکمہ جنگلات نے ایک اسکیم تیار کی تھی جس پر کچھ کام ہو چکا ہے۔ پودے اور درخت لگانے میں سعیٔ بلیغ کی گئی۔ اور ایک مستعد افسر نے تو سرو، آلوزہ، دیودار، ساگوان، چلغوزہ، چنار، سفیدہ اور بڑتل کی اچھی خاصی نرسری تیار کر کے مقامی پہاڑیوں کے چاروں طرف پودے بھی لگا دیئے جس سے یہاں کا حسن بڑی تیزی سے نکھرنے لگ گیا ہے۔

سیاحوں کی دلچسپی کے لئے ایک خاص اسکیم مرتب کی گئی جس کے مطابق فورٹ منرو کی پہاڑی کے چاروں کونوں میں پوائنٹ بنائے جائیں گے۔ جہاں بیٹھنے کے لئے سیمنٹ کے بنچ تیار کئے جائیں گے ساتھ ہی دلکشی کو بڑھانے کے لئے آلوچہ، بادام، خوبانی، لیچی، سیب، آڑو، انار، ناشپاتی، بگوگوشہ، سیب اور لوکاٹ کے خوشنما اور سدا بہار درخت بھی لگائے جائیں گے۔ جو اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیں گے۔

کوہِ سلیمان یونہی برائے نام کوہِ سلیمان نہیں بلکہ ایسے معدنی خزانوں سے مالا مال ہے جنہیں کچھ افسانہ و افسوں ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان خزانوں کو پہاڑوں کا جگر کھود کر سامنے لایا جائے تو دنیا

ان افسانوی دولت سے فیض یاب ہو جائے گی۔ دو سال ہوئے "اٹک آئل کمپنی" نے تیل کی تلاش کا کام شروع کیا تھا چنانچہ سخی سرور کے نزدیک تیل کا ایسا ذخیرہ نکلا جسے کافی تسلی بخش خیال کیا جاتا ہے۔

ڈیرہ غازی خاں کے قریب جو پہاڑیاں واقع ہیں ان پر چونا اور پلاسٹر آف پیرس وسیع مقدار میں موجود ہیں۔ احمدانی، تونسہ شریف اور رتیڑہ کے اوپر جو پہاڑیاں ہیں ان میں موہی، تلہ تونخ (دواچی) اور کرتل کے مقامات پر لوگ تھوڑی سی آگ جلا کر اس میں پتھر ڈال دیتے ہیں اور وہ یوں جلنے لگتے ہیں جیسے ان کو تیل یا پٹرول میں ڈبو کر نکالا گیا ہو۔ علاوہ بریں یہاں ایسے پتھروں کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے جو ابرک سے ملتے جلتے ہیں اور اسی کی طرح چمکتے دمکتے بھی ہیں۔ کا نیاتک میں زرد مٹی ملا پتھر بکثرت ہے جس کو مقامی لوگ پانی میں حل کر کے خشک کر لیتے ہیں۔ یہ خالص گندھک ہوتی ہے۔ "گلگی کے نزدیک سفید سنگ مرمر سے ملتا جلتا پتھر عام ہے۔ ممکن ہے پہاڑ کی کھدائی پر سنگ مرمر مل جائے۔" بابیا تونخ" میں زنگ آلود پتھروں کا پہاڑ ہے جہاں تھوڑی سی بارش کے بعد پتھروں پر اور زیادہ زنگ چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ پتھریاں بھی بہت بھاری ہیں۔ اس لئے گمان ہے کہ ان میں لوہا موجود ہے۔ اسی طرح خیال کیا جاتا ہے کہ "ڈوم کنڈ" نزد مرغی علاقہ نہروار میں شکر موجود ہے کیونکہ وہاں کے لوگ پتھروں میں ایک خاص قسم کا پتھر ڈھونڈ کر نمک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ "زندہ پیر" کے مقام پر ایک گندھک کا چشمہ ہے جس میں سے ہر موسم میں ابلتا ہوا گرم پانی نکلتا ہے۔ یہ جلدی امراض کے لئے بے حد مفید ہے اور لوگ اس میں جوق در جوق نہانے کے لئے جاتے ہیں۔

ان نعمتوں اور خوبیوں کے ہوتے ہوئے یہ مقام بجا طور پر اُن لوگوں کی راہ دیکھ رہا ہے جو اس کے چھپے ہوئے خزانوں کو منظر عام پر لائیں۔ اور اس طرح کوہِ سلیمان واقعی کوہِ سلیمان ثابت ہو۔ ایک ایسا سلسلۂ کہسار جس کا دامن الف لیلوی خزانوں سے لبریز ہے ۔

احسان ملک

آپ نے ان جگ مگ کرتے موتیوں کو دیکھا
، یہ چمکتے ہوئے نگینے جن کی آب و تاب آنکھوں
و چکا چوند کردے؟ مدتیں گذر جائیں لیکن کیا
ال جو ان کی چمک دمک ماند پڑ جائے۔ اس
، کہ قدرت نے انکو بنایا ھی اس انداز سے ہے۔
ندر کی سیال لہروں نے اپنی نرم و نازک کونچیوں
برسوں ان کا روپ سنوارا، پھر کہیں ایسے سچے
تی تیار ہوئے۔ ایسی ھی استادی نگینوں کے
شنے پر بھی برتی گئی پھر کہیں ان کے خوبصورتی
تراشے ہوئے پہلو نمودار ہوئے۔ ہماری زبانی
ںہی کسی اور کی زبانی ھی سن لیجئے۔ جس نے
تراشنے کا سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں
فیروزہ ہووے مردہ تو دیتا ہے یہ جلا

سیحائی کچھ ہیرے موتیوں تک ھی محدود
ں۔ انسانوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ ہیرے موتی۔

ہمارے بچے، ان کی جوت جگانے کے لئے بھی تو ایسی ھی کاوش درکار ہے۔ تعلیم سے ان کے جوہر چمک اٹھتے ھیں۔ یا کوئی استاد ان نگینوں کو ایسے تراشتا ہے کہ ان کا ھر پہلو ایک نئی لو دے اٹھتا ہے۔ اور ھر طرف شعاعیں ھی شعاعیں چھوٹتی نظر آتی ھیں۔ جیسے شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں کوئی پھلجھڑی روشن ھو جائے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ وہ اعجاز مسیحائی جو مردہ فیروزوں کو بھی جلا دیتا ہے، ان کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے، ہمارے یہاں مدتوں سے نایاب رہا ہے۔ موتیوں کو جلا دینے اور نگینوں کو تراش خراش کر صد پہلو بنانے کی بجائے ان پر گرد و غبار کی تہیں کی تہیں چڑھائی جاتی رھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے لو دینا بند کر دیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب گردش ایام نے برصغیر ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کو آزادی کی نعمت سے محروم کرد یا تھا۔ اور ان کے سروں پر انگریزوں کا سایہ مسلط تھا۔ جس نے ان کے حقیقی جوھر مسخ کردیئے۔ ایک حکمراں قوم کی حیثیت سے انگریزوں کا منشا بھی یہی تھا کہ تعلیم دل و دماغ کو روشن کرنے اور فکر و بصیرت عطا کرنے کی بجائے محض دفتروں کے لئے اہلکار بنانے کے کام آئے۔ چنانچہ سارا نظام تعلیم لارڈ میکالے کی نہج پر قائم کیا گیا۔ مکتبوں اور مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انگریزی کا بول بالا ھوا۔ ھر طرف اسی کا طوطی بولتا ھوا سنائی دیا۔ ساری قوم کی صلاحیتیں ایک اجنبی زبان کے سیکھنے پر صرف ہونے لگیں۔ اور مشرقی زبانیں اور علوم و فنون گلدستۂ طاق نسیاں بن کر رہ گئے! ایسے میں دل و دماغ روشن کیا ہوتے، وہ تو الٹے ماؤف ھوکر رہ گئے۔ لے دے کر ایک ھی مطمح نظر رہ گیا۔ یہ کہ کالج سے "پاس پاس" کی صدا

آئے ۔ قوم کے نونہال ڈگریاں لے لے کر سیدھے دفتروں میں پہنچ جائیں اور حکومت کے کل پرزوں کے طور پر کام آئیں ۔ طلباء کا کام صرف اتنا ہی رہ گیا کہ وہ طوطوں کی طرح نصاب رٹتے جائیں، امتحان پاس کریں اور جب ان کی قسمت، بلکہ حافظہ یاور ہوجائے تو وہ چھوٹتے ہی اپنا پراونۂ راہداری یعنی سند لئے ہوئے حکومت کے در و دولت پر حاضر ہوجائیں ۔

غرض جب تک انگریزوں کا دور دورہ رہا یہی کیفیت رہی ۔ دن رات انگریزوں ہی کا ناقوس پھنکتا رہا ۔ یہی سلسلہ جاری تھا جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی اور آنکھوں نے ایک نئی روشنی پائی، مگر برسوں کے چھائے ہوئے اندھیرے پل جھپکنے میں کیسے دور ہو جاتے؟ اور اندھیرے بھی وہ جو دل و دماغ کے گوشے گوشے میں سرایت کر گئے ہوں ۔ وہ گھٹے گھٹے قبرنما خانے جن میں نہ روشنی کا گذر ہو نہ ہوا کا بلکہ ٹھوس اندھیروں کی سنگین چادریں ہی چادریں چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہوں ۔ چنانچہ آزادی کے تیرہ برس بھی اندھیروں کی ان تہ در تہ دبیز تہوں کو دور نہ کر سکے ۔ نظام تعلیم بڑی حد تک وہی رہا جو مدتوں سے چلا آتا تھا ۔

کہیں ادھر ادھر سے مرقد کی سلیں اکھیڑ کر تعویذ اتار کر تھوڑی سی روشنی کو مردے تک پہنچا دیا ہو تو پہنچا دیا ہو ورنہ اوپر سے نیچے تک وہی بلائے جاں گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا رہا اس طرح علمی مردے مدتوں لمبی تان کر سوئے رہے اور کسی بندۂ خدا نے ان کی خبر نہ لی تاآنکہ آزادی کے اجالے کے بعد ایک اور اجالا طلوع ہوا، ایک اور صبح نمودار ہوئی جو ہمارے عسکری انقلاب کے ساتھ منظر عام پر آئی ۔ اس نے آتے ہی زندگی کے تمام شعبوں میں ایک زبردست ہلچل پیدا کردی اور آناً فاناً اصلاحات کا ایک سیل بےکراں جاری ہوگیا ۔ زرعی اصلاحات، اقتصادی اصلاحات، معاشری اصلاحات، قانونی اصلاحات وغیرہ وغیرہ حقیقتاً حد شمار سے باہر ہیں ۔ یہ سب اس لئے کہ نئی حکومت کوئی محدود نقطۂ نظر یا مقصد لے کر نہیں آئی تھی ۔ اس کا مقصد تمام تر ملک و قوم کی تعمیر نو تھا ۔ ایک زبردست، ہمہ گیر نشاۃ الثانیہ جو زندگی کی گہرائیوں میں تہلکہ برپا کردے اور انتہائی بلندیوں تک رسا ہو جائے ۔ حقیقی معنوں میں انقلاب ثابت ہو نہ کہ سراب، اسی قسم کا سراب، اسی قسم کا فریب، جس سے عوام کو قبل ازیں بار بار بہکایا گیا تھا ۔ ان کے جائز حقوق سے محروم کیا گیا تھا ۔

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب میں تعلیم کو کس قدر دخل ہے ۔ یہ تو اس کا جزو لاینفک ہے ۔

اصلاحات کی ایک نہایت اہم کڑی تعلیمی اصلاحات تھیں - ہمارے مدرسوں، ہماری یونیورسٹیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی - من مانی فیس، درسی کتابوں کی گراں فروشی، فضول نصاب، بیہودہ درسی کتابیں، ناقص معیار تعلیم، اساتذہ کی پست معاشی حالت، شرمناک حد تک معمولی تنخواہیں، تعلیم کی لمبی مدت، جان‌لیوا امتحانات، زبانی رٹنے پر زور، ٹکنیکل تعلیم کا فقدان، نونہالان ملت کی عمر عزیز کے بے شمار گراں مایہ سالوں کا نقصان، موزونیت اور مستقبل کا لحاظ کئے بغیر اندھادھند تعلیم اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ قومی کردار اور سیرت پر ذرا بھی توجہ نہ تھی -

حالات کو سدھارنے کا پہلا زینہ تھا : کوائف اور حقائق کی دریافت، جو قدرتی طور پر ایک کمیشن کے سپرد کی گئی - اس تعلیمی کمیشن نے کم از کم وقت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا - اور تمام حالات کی پوری پوری چھان بین کر کے بڑی معقول سفارشات پیش کیں - پرانے سیاست‌دانوں کا دور تو تھا نہیں جو برسوں سوچ بچار ہی میں گذر جاتے، ڈھنڈورا بہت پیٹا جاتا مگر ہوتا کچھ بھی نہ تھا - یہاں تو انقلابی حکومت تھی - اور عوام کا اپنا چنا ہوا صدر، سرگرم و مستعد بہی خواہ قوم و ملت، فوجی روح سے سرشار جو" درهرچه باشی زود باش،، کا قائل تھا اور ہے - ادھر سفارشات ہوئیں اور ادھر انہیں قبول کر کے عملی جامہ پہنانے کی تدبیر شروع ہو گئی - چنانچہ نئے تعلیمی سلسلے کو ہماری تاریخ میں ایک نئے سنہری دور کا پیش خیمہ قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا -

نئے نظام میں اعلیٰ تعلیم ایسے طلباء کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے جو اس کے اہل ہوں - اور یہ بہت اچھا ہوا - کیونکہ اس طرح ہزارہا طلباء کا وقت بچ گیا ہے جو وہ خوامخواہ اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے میں صرف کرتے تھے - اور ساتھ ہی والدین کا بےاندازہ روپیہ بھی بچ گیا ہے - جو وہ ان کی لمبی چوڑی تعلیم پر ضائع کرتے تھے - انکی تعلیم کو علحدہ اور مختصر کرنے سے بھی بہی فائدہ متصور ہے - سیدھی بات یہ ہے کہ

جو طلباء اعلیٰ تعلیم کے لائق ہوں وہ ضرور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں - باقی دوسرے کاموں کی طرف رجوع ہوں، وہ کچھ کماکھائیں - وہ اپنا پیٹ بھی پالیں اور کنبوں کا بھی - اور اس طرح جلد ہی اپنے خاندان اور ملک و قوم کے کام آئیں -

ایک بہت بڑی بات جس کی سابقہ حکومتوں کو کبھی توفیق نہ ہوئی یہ ہے کہ بچوں کو لکھانے پڑھانے کی ذمہ‌داری جتنی ماں باپ پر عاید ہوتی اتنی ہی حکومت پر بھی ہو - انقلابی حکومت اس کا بیڑا بھی اٹھا لیا ہے - اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ کوئی انسان جیسے اپنی زبان میں پڑھ لکھ سکتا ہے - اور اس پر جلد از جلد قدرت پاکر بہترین مصرف بھی پیدا کر سکتا ہے دوسری زبانوں میں نہیں کرسکتا - ایک اجنبی زبان اس کے ذہن میں رس بس نہیں سکتی - ہماری تاریخ میں پہلی مرتبہ تعلیمی کمیشن نے یہ کہنے کی ہمت کی اور تعلیم و تدریس کے سلسلے میں علاقائی زبانوں کو ان کی صحیح اہمیت اور حیثیت دی ہے - چنانچہ اپنے اپنے علاقوں میں بچے پہلے تو اپنی مادری زبانوں ہی میں تعلیم حاصل کریں گے اور اس بعد اردو یا بنگلہ میں تعلیم پائیں گے - جن کی حیثیت

لازمی ہے۔ بہر حال تعلیم کو صحیح شکل عطا کرنے کے لئے سنگِ بنیاد رکھدیا گیا ہے۔ اب اس پر ایک مضبوط اور پائیدار عمارت تعمیر کرنا کوئی دن ھی کی بات ہے۔

تعلیمی اصلاحات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قومی امنگوں اور مقاصد سے ہم آہنگ ھیں ۔ ان میں تعلیمی کوششیں، تعلیمی پروگرام اور تحقیق سب مل کر گاڑی کو آگے بڑھاتے ھیں ۔ سب سے بڑا مقصد بہتر انسان پیدا کرنا ہے۔ ھمارے قومی وسائل کا سب سے ممتاز عنصر ۔ لازمی تعلیم اور تعلیم بالغان کا مدعا ھی یہ ہے کہ شہریوں کو باشعور بنایا جائے۔ تاکہ ان کا اخلاق و کردار بلند ھو۔ وہ سیاسی جمہوریت کو اچھی طرح سمجھ سکیں ۔ وہ صرف اچھے شہری ھی نہ ھوں بلکہ اپنوں اور دوسروں کے لئے کارآمد بھی ھوں۔ چنانچہ اصلاحات میں تمام سطحوں پر سائنسی اور فنی تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس سے تعلیم نے ایک جامع، مربوط سروس کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جو تمام سطحوں پر پیشہ ورانہ تربیت کی سہولتیں مہیا کرتی ہے ۔ اور شروع سے لے کر آخر تک دستی محنت اور ٹکنیکل، تجارتی، کاروباری ٹریننگ پر زور دیتی ہے، ھنرمندوں فنی ماھروں اور مزدوروں کو باعزت مقام دے چھوٹے بڑے طبقوں کا امتیاز مٹا دیتی ہے۔ اور طا اور طالبات کو ایسے کاموں کی رغبت دلاتی ہے سوسائٹی کے لئے فائدہ مند ھوں ۔

تعلیم فنی ھو یا غیر فنی، اس کا معیار بل ھونا چاھیئے ۔ تاکہ یہ برطانیہ، امریکہ اور رو وغیرہ کے تعلیمی نظاموں کا مقابلہ کر سکے ۔ تعل ایسی بصیرت افروز ھونی چاھئے کہ یہ طلبا م تجسس اور تنقید کا جذبہ پیدا کرے۔ اور حب الوط اور کردار پر زور دے۔ قومی تقاضوں کے پیش نظ پرائمری تعلیم کو مفت اور لازمی بنا دیا گیا ہے اور ذھین افراد کی حوصلہ افزائی کے لئے وظائف مقرر ک گئے ھیں ۔ ظاھر ہے کہ اس سلسلے میں کتابوں ا نصابوں پر نظر ثانی بنیادی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ عمرانیات، ھوم اکنامکس، پبلک اور بز ایڈمنسٹریشن، جرنلزم اور جدید زبانوں وغیرہ کو خا اھمیت دی گئی ہے ۔ اس کے بعد صرف ایک عنصر جاتا ہے جو اس سلسلہ کی نہایت اھم کڑی ہے اساتذہ۔ وہ جو موتیوں کو جلا دیتے ھیں، وہ جو ا روشنی طبع سے ھر جوھر قابل کو آب و تاب عطا کر ھیں ۔ اصلاح کے بے پناہ ذوق و شوق نے ان مس کو کیمیا بنانے والوں پر بھی پوری توجہ دی۔

ایک فرنگی ماھر تعلیم نے کبھی ایک بڑ پتہ کی بات کہی تھی ۔ وہ یہ کہ ھم پہلے آقاؤں کو تیار کریں جو آگے چل کر ھماری قیا کریں گے۔ کیونکہ آخر بچے ھی انسان کے ھوتے ھیں ۔ اور قوم کا مستقبل اس کے نونہالوں ھی موقوف ھوتا ہے۔ حکومت نے نئے نظام تع کو روبہ عمل لانے کا بیڑا اٹھاکر ان آقاؤں نونہالوں کی تربیت کی بہترین نہج مقرر کر دی۔ اور ھم مستقبل میں روشن ترین امکانات ھی جھلکیاں تا حد نظر پھیلی ھوئی مشاھدہ کرسکتے

(کارٹون : ریحا

یہ در و دیوار
کیا کہتے ہیں؟
ہمارے گھروں، محلوں اور شہر کے در و دیوار ہماری ہنرمندی کے علاوہ ہماری عادات اور تہذیب کا بھی نمونہ ہوتے ہیں۔
اب ذرا ان در و دیوار کو دیکھئے جو آپ کے سامنے ہیں۔ یہ زبانِ حال سے ہماری بے توجہی اور بدسلوکی کے خلاف فریاد کر رہے ہیں۔ ان کی مرمت پر ذرا توجہ دی جاتی تو یہ اتنے خستہ حال نہ ہوتے اور ان کو تہذیب سے برتا جاتا تو ان پر یہ بدنما داغ دھبے نہ ہوتے۔
چھوٹی موٹی مرمت پر زیادہ صرف نہیں ہوتا لیکن ذرا سی غفلت بہت سے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ اسی طرح صفائی تہذیب اور شائستگی بہت آسان۔ تیں ایسا جو صرف ذرا سی توجہ چاہتی ہیں۔
غفلت سے نقصان نہ اٹھایئے
ذاتی اور قومی املاک کو صاف اور سلامت رکھئے
جاری کردہ ادارۂ تعمیرِ نو

پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر '' ادارۂ مطبوعات پاکستان ،، نے متعدد کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے - جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی ان اہم صنعتوں پر مختصر، مگر سیر حاصل اور مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں -

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر سے مزین ہے - ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے -

ہر کتاب میں جدیدترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں جن سے ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف چار آنے رکھی گئی ہے - یہ کتابچے ابتک شائع ہو چکے ہیں :

★ پٹ سن کی صنعت
★ سیمنٹ کی صنعت
★ چائے کی کاشت اور صنعت
★ کپڑے کی صنعت
★ پن بجلی کی صنعت
★ ماہی گیری
★ اشیائے صرف
★ ذرائع آب پاشی کی صنعت
★ کاغذ کی صنعت
★ غذائی مصنوعات
★ شکر سازی (رنگین تصاویر - نفیس طباعت قیمت ۸ آنے)

ملنے کا پتہ :- ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

عمدہ صفائی کے لئے
آپ کے گھر میں وِم ضروری ہے!
VIM
"وِم" ہر قسم کی گھریلو صفائی کیلئے نہایت پُر اثر چیز
ہے۔ چاہے کھانے پکانے کے برتن ہوں یا شیشے اور تام چینی
کا سامان چاہے فرش ہو یا بیسن "وِم" سب کیلئے یکساں کارآمد ہے۔ "وِم" سے اپنا گھر آئینہ کی طرح صاف رکھئے۔
بہترین نتائج کے لئے "وِم" کو گیلے کپڑے کے ساتھ استعمال کیجئے یا ڈبہ ہی سے اسے گیلی سطح پر چھڑک کر
مَل دیجئے۔ تھوڑی دیر بعد اس سطح کو پانی سے دھو دیجئے اور خشک ہونے دیجئے۔
لیور برادرس کی عمدہ مصنوعات میں سے ایک
KS-193 UD

جلد ۱۳ — شمارہ ۸

ماہِ نو

اگست ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی

آٹھ آنے

"انقلاب - اے انقلاب"

آفاق حسین آفاق

چودھواں اگست چودھویں بار! مگر اب کی چودھواں اگست اس شکل میں نہیں آیا جس میں یہ مسلسل بارہ سال آتا رہا ہے۔ اپنی تردید اور جمہور کے ذوقِ آزادی کی تضحیک کرتا ہوا، ان بنیادی مقاصد کی نفی کرتا ہوا جن کے لئے ہم نے سالہا سال جدوجہد کی تھی اور ہمارا وطن پاکستان عمل میں آیا تھا۔ اب کی یہ ۲۷ اکتوبر کے روپ میں آیا جس نے ہماری قومی زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ وہ حقیقی روپ جس میں اِسے اُس وقت آنا چاہئے تھا جب کہ آزادی کی سحر طلوع ہوئی۔ مگر قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ ابھی کچھ دیر اور تاریکیٔ شب کا دور دورہ رہے اور یہ سحر ایک مدت بعد طلوع ہو تاکہ یہ اور بھی تابناک ثابت ہو۔ اور جب ظلمات کے بادل چھٹ جائیں تو اس کی تند و تیز روشنی ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جائے۔

۱۴ اگست کے ۲۷ اکتوبر کے روپ میں آنے کے معنی کیا تھے؟ یہ کہ آزادی حقیقی معنوں میں آزادی ہو، استقلال صحیح معنوں میں استقلال ہو، حکومت صحیح معنوں میں عوام کی حکومت ہو، قوم صحیح نہج پر اقدام کرے، عروج و ترقی کی راہیں وا ہو جائیں، کاروبارِ ملک درست طور پر انجام پائے، مایوسیاں امیدوں، ناکامیاں کامیابیوں اور تاریکیاں تابناکیوں میں تبدیل ہو جائیں، زندگی مکروہات سے پاک ہو کر تندرست، ہشاش بشاش اور باوقار بنے اور ہر اعتبار سے پاکستان جیسے آزاد اسلامی ملک کے شایانِ شان ہو، وہ حیات جو بندگی میں گھٹ کر جوئے کم آب بن گئی تھی آزادی سے ہم کنار ہو کر بحرِ بیکراں بن جائے۔ ۲۷ اکتوبر کے بعد جو کچھ ہوا وہ درحقیقت اس ۱۴ اگست سے گم شدہ مفہوم و مقصود کی بازیافت، اُس کو روبہ عمل لانے اور اُس کی بیش از بیش توسیع و ترقی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب ۱۴ اگست اور ۲۷ اکتوبر ہمیشہ کے لئے مدغم ہو گئے ہیں۔ اور ہماری تمام قومی تاریخوں کے دھارے ایک ساتھ موجزن ہیں۔ اس لئے آج آزادی کے دن دورِ انقلاب کے تابندہ مقامات پر نظرِ بازگشت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے انقلاب نے اِس تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں کہ جو بات کل اتنی بڑی معلوم ہوتی تھی آج اتنی ہی چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، ناجائز درآمد برآمد، نفع اندوزی، سیاسی بددیانتی، بدعنوانی، دفتری بدنظمی و نااہلی، اقتصادی افراتفری، مہاجرین کی زبوں حالی، معاشرتی بے راہ روی، زرعی نظام کی خرابیاں یہ اور بے شمار اور باتیں زندگی کی پیشانی پر بدنما داغ تھیں۔ اور انہیں جلد از جلد مٹانے کی سر توڑ کوشش کی گئی۔ یہ غیر معمولی باتیں آج کتنی معمولی معلوم ہوتی ہیں! اس لئے کہ انقلاب کی تیز رفتاری اب ان سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ اور یہ افق پر نہایت آب و تاب سے جگ مگ کرتے ہوئے ستارے اب دھندلے دھندلے نقطے بن کر نظروں سے اوجھل ہوئے جاتے ہیں۔ ایک حقیقی معنوں میں ترقی پذیر ملک و قوم میں ایسا ہی ہونا چاہئے ؎

پلٹ کر یہ سرمستِ کیفِ خودی
کہیں اپنا رستہ نہیں دیکھتی

لہٰذا اب ہمیں ان کارہائے نمایاں کو دُہرانے کی ضرورت نہیں جو اب سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اگرچہ یہ پاکستان اور انقلابی حکومت کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ روشن رہیں گے۔ اب تو ہم ابتدائی مرحلوں سے گزر چکے ہیں اور شاید اِن قصہ ہائے پارینہ کا ذکر ہمارے لبوں پر تبسم لائے بغیر نہ رہ سکے۔ اب ہم زیادہ بنیادی، زیادہ تعمیری، زیادہ ترقیاتی امور کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ہماری توجہ ایسے امور، ایسے مقاصد کی تحصیل پر مرکوز ہے جو ہمیں اور ہمارے محبوب وطن کو زندہ تر اور پائندہ تر بننے میں مدد دیں۔ یہی بات کہ ہم

اب حکومت کے گذشتہ کارناموں کو دُھرانا چنداں ضروری خیال نہیں کرتے، اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری نظر اب اس کی زیادہ اہم موجودہ سرگرمیوں اور آئندہ مقاصد پر ہے۔ اور وہ نہ اتنے کم ہیں نہ اتنے کم شاندار کہ ہم اُن کو مرکزِ توجہ نہ بنائیں۔ اس وقت جن معاملات پر حکومت اور عوام کی توجہ یکساں طور پر مرکوز ہے، وہ معاشرہ کی اصلاح، تعلیم و قانون کی اصلاح، دستورِ اساسی کی تشکیلِ نو، غذائی خود کفالت، ملک کی ہر جہتی صنعتی، زرعی اور اقتصادی ترقی، بنیادی جمہوریتوں اور ترقی دیہات کو بطریقِ احسن معرضِ عمل میں لانا، زرمبادلہ میں مسلسل اضافہ، افراطِ زر سے بچاؤ، معاشری فلاح و بہبود، صحت و صفائی اور خاندانی منصوبہ بندی ہیں۔ جہاں تک رفاہی اور ترقیاتی کوششوں کا تعلق ہے ان سب سے نمایاں اور بہترین مظہر ایک اور صرف ایک ہے: دوسرا پنجسالہ منصوبہ جو ہر اعتبار سے ایک نہایت اہم اور معرکہ آرا سنگِ میل ہے۔ اور اس سے جو نتائج متصور ہیں ان کی علامات ابھی سے صاف صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ اس لئے کہ اس مہتم بالشان منصوبے کے مقاصد ہیں۔ قومی آمدنی میں ۲۰ فیصدی اور صنعتی پیداوار میں ۵۰ فیصدی اضافہ اور ۳۰ لاکھ افراد کو ملازمت کے مواقع بہم پہنچانا۔ ظاہر ہے کہ یہ نتائج کس قدر دوررس ہیں اور جس لگن، جس والہانہ جذبہ کے ساتھ حکومت اس کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کے درپے ہے، اس کا کوئی جواب نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور حوصلہ افزا بات خود قائدینِ قوم کا ذہنی رجحان ہے جو کسی بے روح قدامت اور روایت پرستی کے قائل نہیں۔ ان کا نظریہ زندہ، ذی فہم، معاملہ شناس اور زمانے کی رفتار اور تقاضوں کو جاننے والے انسانوں کا رویّہ ہے۔ جو کچھ ہے۔۔ مذہب، سیاست، قانون، تعلیم ــــ انسان کے لئے، زندگی کے لئے ہے۔ کورانہ تقلید اور پرستاری کے لئے نہیں۔ ہمارے رہنما نظریاتی بھول بھلیوں میں اُلجھنے کی بجائے زندگی کے مسائل اور معاملات سے نبٹنے کی پرخلوص کوشش کرتے ہیں اور قوم میں بھی یہی روح پھونک دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر ہمارا مطمعِ نظر زندگی بسر کرنا ہے اور بطریقِ احسن بسر کرنا ہے، تو اُس کا واحد راستہ وہی ہے جو ہمارے بیدار مغز قائدین اختیار کر رہے ہیں۔ آخر خالی خولی نظریوں اور کتابی باتوں سے کیا حاصل؟

تو شمشیری زکامِ خود بروں آ
بروں آ از نیامِ خود بروں آ

فوجی روحِ عمل، توانائی اور اثبات کی روح ہے۔ اور اس کی جولاں گاہ زندگی کا میدانِ بے پایاں۔ اس لئے قائدین قوم خود بھی اس میدان میں سرگرمِ کار ہونا چاہتے ہیں اور ہمیں بھی اسی طرح سرگرمِ عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مسلک تجرباتی ہے۔ کوئی بات طے شدہ نہیں۔ ناقابلِ تبدیل نہیں۔ تجربہ ہمارا سب سے بڑا ممد و معاون اور مشیر ہے۔ اگر اس سے یہ ظاہر ہو کہ کوئی بات ہمارے لئے موزوں نہیں تو اسے بلا تامل مسترد کر دینا چاہئے۔ اگر ہماری ہم مذہب اقوام ہماری طرف دستِ تعاون نہیں بڑھاتیں یا ہمارے مقاصد اور ہماری قومیت کے خلاف ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم محض ایک آدرش کے پورے ہونے کے خواب دیکھتے رہیں اور خود کو کمزور سے کمزور تر کرتے چلے جائیں۔ ہم کیوں نہ پہلے اپنی قومیت کو مستحکم کریں تاکہ دوسری قومیں ہمارے تعاون کی خواہاں ہوں۔ آج جب پیکارِ حیات شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے، ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اور بھی ضرورت ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنی خودی کو مستحکم کریں اور وہ اثباتی مشرب اختیار کریں جس کی ہمارے بیدار مغز قائدین، خصوصاً صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نشاندہی کر رہے ہیں۔

●

★

"کرنوں کی راہ"

سید ضمیر جعفری

یہ نظم ان شمعوں میں سے ہے جو شوق و شعور کی مدد سے وقت کے ہاتھ پہ کبھی کبھی جلتی ہیں۔ اور وہ بھی ایک ہی مات میں! یہ کیفیت لئے ہوئے کہ: جلتی ہیں تو ان کی لَو پر صدیاں آگے چلتی ہیں۔ یعنی ایں طفلِ یک شبہ رہِ صد سالہ می رود۔ ہمیں مسرت ہے کہ یہ نئی شمع ایک نئے علائی نے نئے غالب سے روشن کروائی ہے جس نے "دورِ نو" کی ننھی معصوم کرن کی طرح ایما و اشارہ کی تابانیوں سے کتنے ہی شمس و قمر ایجاد کئے ہیں۔ یہ تابانیاں ایسی ہیں جنہیں شوق و شعور کی نظر ہی سے دیکھنا موزوں ہے۔ مدیر

خوابوں نے جو پھول چُنے تھے اُن پھولوں کو رنگ ملا
جذبے گُھل کر گیت بنے، گیتوں کو سچل آہنگ ملا
من کے چُپ چُپ رستے سندر چاپوں سے آباد ہوئے
اک معصوم کرن سے کتنے شمس و قمر ایجاد ہوئے
ریشم سی گلرنگ امیدیں جاگ اٹھیں ارمانوں میں
چاہت کا رس لے کر خوشبو پھیل گئی ویرانوں میں
شامیں اپنی نرم ملاحت میں یکسر رعنائی ہیں
صبحیں اپنا سارا سونا چوٹی پر لے آئی ہیں
ذہن چمکتا پانی ہے اَن دیکھی روشن جھیلوں کا
فکر نکھرتا جوبن ہے شاداب سنہرے ٹیلوں کا
چمکے چمکے موتی لمحے رنگ افروز خیالوں کے
دمکے دمکے کندن چہرے خوش خوش جینے والوں کے
وقت کے ہاتھ پہ شوق و شعور کی شمعیں کب کب جلتی ہیں
جلتی ہیں تو ان کی لَو پر صدیاں آگے چلتی ہیں

"سنتے ہیں کہ بہاراں ہے"

جمیل نقوی

ابر آتا تھا، برستا تھا گذر جاتا تھا
لذتِ درد سے احساس کو بھر جاتا تھا
بیٹھ جاتا تھا جو نم ہو کے فضاؤں کا غبار
چہرۂ گردشِ حالات نکھر جاتا تھا
پھر وہی تند بگولے تھے، وہی بادِ سموم
پھر سے شیرازۂ گلزار بکھر جاتا تھا

اس سے پہلے بھی کئی بار ہوا ہے ایسا
ابر آیا تھا برستا ہوا بے تابی سے
وائے بر حسنِ نظارا کہ خلافِ فطرت
باغ محروم رہا رنگ سے، شادابی سے
گدگدایا تو بہت بادِ صبا نے لیکن
لالہ و گل کبھی جاگے نہ گراں خوابی سے

اور بڑھ جاتا تھا سہمے ہوئے سبزہ کا جمود
ہو کے رہ جاتا تھا معدوم بہاروں کا وجود
سادگی روپ دکھاتی نہ تھی تا حدِ نظر
اور ہو جاتی تھی دھندلی رخِ گلشن کی نمود
کچھ اس انداز سے آتی تھیں صدائیں پیہم
جیسے دم توڑنے لگتا ہو ہواؤں کا سرود

لیکن اس بار کچھ اس شان سے برسی ہے گھٹا
جس طرح فرطِ مسرت سے کوئی رونے لگے
روبرو دیکھ کے سلمائے تصور کا جمال
گردِ غم آئینۂ دل سے کوئی دھونے لگے
جس طرح مل کے برسنے لگیں ساون بھادوں
خس و خاشاک کی تقدیر چمن ہونے لگے

یک بیک سارے گلستاں کی فضا جاگ اٹھی
شاخِ گل جاگ اٹھی، سرو و سمن جاگ اٹھے
یوں چلی بادِ صبا ٹوٹ گئی مہرِ سکوت
دشت و در جاگ اٹھے، کوہ و دمن جاگ اٹھے
مژدہ اے اہلِ جنوں فصلِ بہار آپہنچی
لے کے انگڑائی جوانانِ چمن جاگ اٹھے

ہماری قومی شاعری کے نئے تیور

رفعت جاوید

زندگی کے مد وجزر کے ساتھ شعر وادب میں بھی اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور شاعری تو خاص جذبات کی زبان ہے۔ پھر زندگی میں جو ہیجان پیدا ہوں وہ شاعری پر کیسے اپنا اثر نہیں چھوڑیں گے۔ کبھی ہنگامی، کبھی دیرپا۔ یہ ضروری نہیں کہ سیاسی شاعری بالعموم سطحی یا ہنگامی ثابت ہو۔ اس میں شاعروں کی صلاحیتوں کو بھی کافی دخل ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی معمولی واقعہ کسی شاعر کی شعلہ نوائی سے اس طرح چمک اٹھے کہ ہم اس میں ایک نئی شان محسوس کریں۔ یا بڑے سے بڑا واقعہ بھی بالکل معمولی معلوم ہو۔ شبلی کی شاعری زیادہ تر سیاسیات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ خواہ وہ ملکی ہوں یا بین الاقوامی۔ لیکن اس کی دلچسپی آج بھی برقرار ہے۔ کیونکہ اس میں شبلی کے دلِ زندہ کی حرارت اور ہنگامہ آرائی کارفرما ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ "اے ترک اے مجسمۂ کبریائے حق" یا حادثۂ کانپور پر ولولہ انگیز نظمیں آج بھی ہمارے دلوں کو تڑپاتی اور روحوں کو گرماتی نہیں؟ اقبال نے کتنے ہی ہنگامی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ کشمیر، وطن، قومی ترانے، حادثۂ شہید گنج، طرابلس، ہنگامۂ بلقان، فاطمہ، شفاخانۂ حجاز وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ آج بھی اسی طرح مقبول اور تر و تازہ ہیں جس طرح وہ پہلے تھے۔ اور ایسے شاہکاروں کی حیثیت رکھتے ہیں جو شاعری کے لئے ہمیشہ سامان ناز رہیں گے۔ مغربی شعرا میں شیلے اور بائرن کی آتشیں روحوں نے عام سیاسی واقعات کو حسن جاوداں عطا کر دیا۔ ٹنی سن نے ایک معمولی جنگی حادثے کو اس گرم جوشی کے ساتھ پیش کیا کہ اس کی نظم آج تک ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہماری زندگی بھی غیر معمولی واقعات اور ہنگاموں سے خالی نہیں رہی۔ فسادات، المیۂ کشمیر، سقوط حیدرآباد، قیام جمہوریہ اور ان سب سے بڑھ کر موجودہ انقلاب۔ یہ سب ایسے موضوعات میں جن سے دل و دماغ گوناگوں جذبات و احساسات کی جولانگاہ بن جاتے ہیں اور اُن میں شعر و فن کی نمود کے بڑے وسیع امکانات ہیں۔ ہمارے شاعروں نے ان حالات و واقعات سے اثر پذیری کا کافی ثبوت دیا ہے۔ مگر شاید شعری صلاحیتوں کا زیادہ وسیع اور بلند تر اظہار کسی ایسے دور کا منتظر تھا جس میں وہ آشوب و پریشاں حالی، وہ خلفشار نہ ہو جو سالہا سال علمی و ادبی جوہروں کے پنپنے اور شعر و ادب کے پروان چڑھنے میں سدِ راہ رہا۔ ہمارے موجودہ انقلاب سے یکایک ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی جمود اور مایوسیوں کے دَل بادل دور ہو گئے، گھٹاٹوپ فضا نکھر گئی اور حقیقی آزادی و استقلال کی پُرکیف روشنی سے نگاہیں ایک نئی تازگی فرحت اور جلا محسوس کرنے لگیں۔ اس روشن فضا کا اثر لازم تھا چنانچہ اس دور کے طلوع ہوتے ہی شاعری میں بھی ایک نئی آب و تاب پیدا ہوئی۔ اپنے اردگرد ایک نیا ماحول پاکر شاعروں نے اپنے دل میں ایک چمک، ایک نیا ولولہ، ایک نئی ترنگ محسوس کی ان کا حسنِ طبع یک بیک پوری شدت سے نمایاں ہوا۔ دل کی تپش کے ساتھ طبیعت کے جوہر بھی چمک اٹھے جن کی جھلک بعض نہایت عمدہ پاروں میں نظر آتی ہے۔ یہ پارے ہماری قومی شاعری میں ایک طرح ممیز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں جس طرح خود دورِ انقلاب رکھتا ہے اور ان کا فن میں بھی خاصہ بلند مقام ہے جو ان کو خصوصی مطالعہ کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

ان شہ پاروں کا موضوع ہماری قومی زندگی اور دورِ انقلاب کے چند اہم پہلو ہیں۔ مثلاً خود ۲۷ر اکتوبر کا انقلاب جس نے ساری زندگی کی کایا پلٹ دی، صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب کی مہتم بالشان شخصیت، انقلابی حکومت کے حیرت انگیز کارنامے، بنیادی جمہوریتیں اور قرب عوام کے سلسلہ میں صدر پاکستان کا شاندار دورہ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں مشرقی و مغربی پاکستان کا برق رفتار د

خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اپنی قسم کی پہلی مقصدی ریل گاڑی اور ہوائی جہاز میں دورہ کا تصور ہی تخیل کو برانگیختہ کرنے اور اسے پر پرواز عطا کرنے کے لئے ایک زبردست تازیانہ ہے۔ یہ ایک ایسا نامانوس اور حرکی قسم کا موضوع ہے جس کے تصور ہی سے روح اہتزاز کرتی ہے۔ اس لئے شعرا کی ذکی الحس طبیعت اس سے شعلہ زن ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور ایک نہیں متعدد شعرا نے اس نرالی گاڑی اور تاریخی سفر پر اپنے اپنے انداز میں بڑے ہی انوکھے نقوش پیش کئے جن میں شعرا کا جوش و خروش اور والہانہ ذوق وشوق قومی شاعری کے ہنگامی حدود سے باہر نکل کر خالص فن کی دنیا میں داخل ہوگیا ہے۔

جمیل نقوی کی "سیارۂ گیتی خرام"۔ صہبا اختر کی "صبح در صبح" اور رئیس امروہوی کی "رہ نوردِ شوق" اس موضوع پر وہ نظمیں ہیں جن میں یہ تمام شاعر ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوئے ہیں اور شاعری کے کیف و آہنگ، اس کی سطوت میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔

ان میں جمیل نقوی کی نظم "سیارۂ گیتی خرام" اپنے طمطراق آمیز عنوان ہی سے ممیز نظر آتی ہے اور

خیز و صوتِ خود بہ آہنگِ رجز تبدیل کن
آتشے در سینہ داری در نوا تحلیل کن

کی مصداق۔ اس کے ہر ہر مصرع پر سے شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جیسے کا گمان ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی جذبہ و جوش جس سے شاعر کا ذہن دورِ انقلاب کی ہنگامہ آفرینی اور صدر پاکستان کی شانِ جلال سے شعلہ بداماں ہوا، اس نے اس کلام میں شعلے ہی شعلے اور کوندے ہی کوندے بھر دیئے ہیں۔ ایک مرد جری کی جید، صاعقہ بار شخصیت نے اس کی طبیعت میں اس قدر ولولہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ جوش و خروش اور فخر و مباہات سے بے قابو ہوا جاتا ہے۔ اور اس کی آواز بلند اور رپاٹ دار ہوتے ہوئے اس للکار، اس نعرۂ پرجوش تک پہنچ جاتی ہے کہ

جب قسم کھاتے ہیں مردانِ جری کے سامنے
ہاتھ اپنا قبضۂ شمشیر پر رکھتے ہیں ہم

اور یہ ایسی آواز ہے جو دیر تک ہمارے دل و دماغ کی پہنائیوں میں گونجتی رہتی ہے۔ جہاں تک ہیئت و بیان اور فکر و انداز کا تعلق ہے، یہ سب طلوعِ اسلام، "خضر راہ" اور "شمع و شاعر" ہی سے ابھرے ہیں۔ اور ان سے بے نیاز بھی کیسے رہا جا سکتا ہے! اس لئے نظم کی دو تہیں ہیں ــــ زیریں اور بالائی۔ زیریں رَو اقبال کی دین ہے اور بالائی شاعر کی اپنی ترنگ اور اپج کا نتیجہ۔ یہ زیریں رَو ہی ہے جس کی جھلکیاں ان اشعار میں دکھائی دیتی ہیں:۔

زمزمے سلطانیِ جمہور کے گاتی ہوئی
یوں چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی

اقبال! آ رہی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آؤ مل کر اک جہانِ تازہ تر پیدا کریں
بطنِ شب سے ایک تابندہ سحر پیدا کریں

اقبال۔ ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

آج پھر بیدار ہے چشمِ تقاضائے حیات
آج پھر حاصل ہے احساسِ غمِ دل کو ثبات

اقبال بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیامِ کائنات

منزلِ صبحِ بہاراں پر نظر رکھتے ہیں ہم
ہر قدم پہلے قدم سے تیز تر رکھتے ہیں ہم

اقبال عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں

مگر جب شاعر جذبہ و جوش کے عالم میں اس سطح سے اٹھ جاتا ہے تو اس کا لب و لہجہ، اس کی آن بان، گویا تمام اس کا اپنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی نوائے شعلہ تاب سے وہ تیور جھلکتے ہیں جو اس میں انفرادی شان پیدا کر دیتے ہیں اور وہ خالص تخلیق کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں ایک نیا اقبال نوا پیرا معلوم ہوتا ہے جس نے دو مابعد کے اثرات و رجحانات سے نئی جوت جگائی ہے۔ اور ان پر اپنی طرف سے بھی نمایاں اضافہ کیا ہے۔ نئے وطن کے نئے ماحول اور اس کا رچا ہوا احساس قدم قدم پر دامنگیرِ نظر ہے

جس سے خالص پاکستانی ادب کی وضع صاف نمایاں ہے

لہلہاتی کھیتیوں کو بخشتی حسنِ دوام
وادیٔ مہران کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
پنجند کی نقرئی لہروں سے موتی رولتی
راوی و جہلم کی موجیں رقص میں لاتی ہوئی
سینۂ آبِ رواں پر ڈولتی مستانہ وار
سرزمینِ ریشۂ زرّیں کو لہکاتی ہوئی
چائے کے باغوں کے ڈھلوانوں کے زیر و کم کی
بھینی بھینی خوشبوؤں کو اور پھیلاتی ہوئی
دہقاں کے کھیتوں کی ہریالی پہ نظریں ڈالتی
سبز پرچم کے تقدس کی قسم کھاتی ہوئی

خط کشیدہ حصوں کی نفاست و نزاکت اور ان کے ساتھ ہی ساتھ اصلیت کا بھرپور رچاؤ پوری طرح نمایاں ہے۔ اور پھر دہقان کے کھیتوں اور سبز پرچم کی مناسبت تو کتنی ہی رعنائیاں اور باریکیاں اپنے دامن میں لئے ہوئے۔ ساکن اور متحرک تشبیہوں دونوں کی پُرکاریوں سے مالامال۔ شاعر کا جذب اس کی والہیت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔

اے نقیبِ حریت، اے داعیٔ امن و سلام
اے نفیرِ انقلاب، اے دشمنِ کہنہ نظام
اے نسیمِ جانفزا، اے کاشفِ رازِ چمن
اے صبا رفتار قاصد، اے سفیرِ تیز گام
اے سریع السیر پیکر، اے نشانِ اتحاد
اے امیدِ قوم، اے سیارۂ گیتی خرام

ایک بار پھر خط کشیدہ حصوں کی دوہری معنویت کس قدر لطف دیتی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ

تیرے پرتو سے چراغاں اتحادِ شرق و غرب
تیرے جلووں سے فروزاں اعتبارِ صبح و شام

بددیانت سیاست دانوں اور رہزنانِ قوم کا پردہ کس خوش اسلوبی سے چاک کیا گیا ہے:

بے کسی کی دھند میں لپٹے ہوئے ماہ و نجوم
بے لبسی کی ظلمتوں میں بجھ رہا تھا آفتاب

سازشوں پر ناز تھا اربابِ حل و عقد کو
شاطری تھی مدرسوں میں جزوِ تعلیمی نصاب
"ثانیٔ آئینۂ دانش" تھا ہر عزت مآب

سابقہ تاریخ کے حوالے اور عہدِ رفتہ کی طرف پُرمعنی اشارے شاعر کے وسیع علمی پس منظر اور ظرف و آگہی کی خبر دیتے ہیں جیساکہ "ثانیٔ آئینۂ دانش" اور "آج پھر ہشیار ہیں کہنہ مریضانِ سُبات" سے ظاہر ہے۔

یہی جذبہ شروع سے آخر تک ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو دورِ انقلاب اور اس کے آتش بہادموسس و سربراہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے آج پاکستان کے ہر ہر فرد کے دل میں بے اندازہ ولولہ و جوش اور احساسِ فخر پیدا کر رہا ہے اور ہماری قومیت — ہماری بازیافتہ قومیت — کو شعلہ جوالہ بنا دیتا ہے۔

دوسرے حدی خوانِ انقلاب، رئیسؔ امروہوی کا فکر بھی روایت ہی سے ابھرتا ہے۔ وہی "ساقی نامہ" کا ماڈل پیرایہ جو اس کی طبیعت میں اس طرح رچا ہوا ہے کہ اس کے بغیر اس کی طباعی اور کسی شکل میں راہ نہیں پاتی۔ تاہم وہ ایک امتیازی رنگ ضرور پیدا کر لیتی ہے۔ وہ محض شاعر نہیں کرتا۔ اس کی نظر آسمان سے زیادہ زمین پر رہتی ہے یہی ہرے بھرے کھیت، یہی ریت کے تودے، یہی سنگلاخ چٹانیں، یہی لوگ باگ اور دنیا کی عام چہل پہل۔ وہ زندگی ہی کے سینے سے رنگ لے کر اس کی ہو بہو تصویر کھینچتا ہے اور ہمیں اس کے قدرتی حسن سے متاثر کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی، اس کا قلم ان ہی کا سچا نقشہ پیش کرنے میں پُر لیتا ہے۔ اور حقیقی سفر کو بھی رومانوی بنا دیتا ہے۔ لیکن کہ سفر کی اہمیت اور دلآویزی بھی نمایاں ہو جائے الا نورِ دشوق، صدرِ پاکستان کی اولوالعزمی اور حسنِ مقصد بھی آشکار ہو جائے

یہ سلمائے بنگال و پنجاب و سندھ
یہ دنیائے بنگال و پنجاب و سندھ
وہ بنگال، وہ مشرقی ارضِ پاک
وہ رنگین خطہ، وہ گلپوش خاک

ندی پر کنول جیسے پانی میں آگ!
مچھیروں کے گیت اور لہروں کے راگ
کناروں پہ گھر، کشتیوں پر جماؤ
وہ مانجھی، وہ موجیں، وہ چپو، وہ ناؤ
وہ پانی میں بجتے ہوئے جل ترنگ
فضاؤں میں وہ بدلیاں رنگ رنگ
نظر کا فروغ اور دل کا فراغ
وہ دھانوں کے کھیت اور چائے کے باغ
وہ نازک سے بوٹے وہ سندر سے بن
خداداد گل زار، خودرو چمن
سماں ایسا پیارا کہ جی لوٹ پوٹ
وہ دریا کی چادر وہ سبزے کی گوٹ

ادھر ارضِ بنگالۂ دل نشیں
ادھر سندھ و جہلم کی یہ سرزمیں

یہ خطہ کراچی سے کاغان تک
یہ دنیا کہ خیبر سے بولان تک
کہیں دشت و کہسار، بنجر اجاڑ
کہیں سبز و شاداب، جنگل پہاڑ
مناظر کی جنت کی شہزادیاں
وہ کشمیر کی لالہ رخ وادیاں
روش قسم قسم اور مفہوم ایک
زبانیں کئی اور مفہوم ایک

جو مشرق سے مغرب ہم احساس ہے
بہت دور، تاہم بہت پاس ہے

دیکھئے مشرق و مغرب کی دوری کے باوجود قرب اور کثرت کے باوجود وحدت کس خوش اسلوبی سے واضح کی گئی ہے پرانے اور نئے حالات کا موازنہ، ان کی ہو بہو کیفیت اس سے بہتر اور کیا ہوگی۔

اندھیرے دبے پاؤں جانے لگے
اُجالے وہ آنے، وہ آنے لگے

اور نئے دور اور اس کے سربراہ کا حیرت انگیز معجزہ۔

بھلا کنجِ عزلت میں رکھا ہے خاک
خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک
ترقی کا پردہ کشا دورِ نو
خوشا دورۂ نو، خوشا دورِ نو

ایک بار پھر چشمِ نظارہ بیں گھومتی گھومتی اپنا رخ بدلتی ہے اور ہم ایک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب — صہبا اختر سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کی دنیا ہی اور ہے، ذوق ہی اور ہے۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ روایت کیا ہے۔ اس نے اپنی ہی راہ تراشی ہے، اپنے ہی نئے نئے پیچ و خم کھاتے ہوئے افق ہی افق بنائے ہیں، اپنی ہی دھنک پیدا کر کے اس کی لہردار قوسوں کو نئے نئے رنگوں سے آراستہ کیا ہے۔ وہ الفاظ، بیان، ہئیت، ہر چیز کو حسن کے رنگ میں دیکھتا ہے۔ اور ایک جبلی، ایک موروثی اداکار — وہ مشہور اداکار ماسٹر رحمت کا فرزند ہے۔ کے مخصوص ڈرامائی لب و لہجہ، حرکات و سکنات کے ساتھ شاعری میں بھی طمطراق پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وجدانی احساس کی لہر یا اُپج اُسے لانبی لانبی بحروں کی طرف لے جاتی ہے۔ اور نظم بہ عنوان "صبح در صبح" میں تو بحر چلتی نہیں رستی ہے، جیسے بحر نہیں ریل ہو۔ بل پیچ کھاتی، بڑھتی، لپکتی۔ اس کی رفتار والہانہ ہے، مجذوبانہ ہے۔ شاعر ایک خالص ندرت پسند جدید شاعر کی طرح عنوان سے لے کر انداز اسلوب، تصور، پیرایہ اور تکنیک تک اپج ہی اپج کا قائل ہے۔ اس لئے اس کا تعلق خاصانِ فن کے اس زمرے سے ہے جس میں ڈاکٹر خالد، جعفر طاہر، عبدالعزیز خالد اور — اگر ان کا تذکرہ بے محل نہ ہو — رفیق[1] خاور شامل ہیں۔ اس نئے مکتبۂ شعر کا مابہ الامتیاز کیا ہے؟ — ایسا نرالا پن جو شاعری کا پیرایہ ہی بدل دے اور ذوق و فن میں اور ہی ادا پیدا کر دے۔ چنانچہ دیکھئے اسی موضوع پر دوسری دو نظموں کے برعکس صہبا اختر نے اس کو کس طرح نبھایا ہے۔ اس نے خلافِ توقع

۱۔ ذوقِ فکرِ غالب را بردہ ز انجمن بیروں
با ظہوری و صائب محوِ ہم زبانی ہاست
(ادیب)

...رات سے بات شروع کی ہے۔ خالص جدید انداز — اور یوں قاری کو فریب دیتے ہوئے اپنے موضوع۔ صدر پاکستان کے دورۂ شرق و غرب — کی طرف آیا ہے — اس طرح ساری نظم میں براعت ہی براعت ہے۔ اس تاریخی سفر کا آغاز رات ہی کو ہوا تھا۔ اس لئے شاعر کو بہانہ ہاتھ آیا کہ وہ یہ اچھوتا پیرایہ اختیار کرے۔ اور سیدھے سپاٹ پیرائے کی بے لطفی سے بچے۔ قبل ازیں بھی اس شاعر نے جو قومی اور دوسری نظمیں لکھی ہیں ان میں یہی بانکپن اور خوش وضعی نمایاں ہے۔ رات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کا مدھر روپ ملاحظہ ہو جس سے "صبح در صبح" کا شاید ہی گمان ہو اور یہی پہلے نہاں پھر عیاں تضاد اور مناسبت اس میں بڑے تیکھے تیور پیدا کر دیتی ہے پہلا ہی لفظ روایت پر ضرب کاری ہے — آبشارانہ — اور یہ آبشار یوں جھرتا ہے:

آبشارانہ ستاروں کے شرر کار ضیا بار جزیروں سے گزرتی ہوئی رات
کبھی کرنوں کے سمندر میں رواں اور کبھی چاند کے ساحل پہ ٹھہرتی ہوئی رات
ہر نفس نیلمیں آفاق کے ہر طاق میں اک شمع کی مانند پگھلتی ہوئی رات
کبھی اک پھول کی پلکوں میں سمٹتی کبھی اک شاخ کی باہوں میں لچکتی ہوئی رات
چوڑیوں کی طرح بجتی کبھی اک شوخ کی پازیب کی مانند چھنکتی ہوئی رات

اب دیکھئے آبشار کس طرح گریز کرتا ہے:

کوئی دیکھے تو ذرا انجم و مہتاب کے زینوں سے سوئے خاک اترتی ہوئی رات
ہالۂ نور کبھی دائرۂ رقص کبھی سلسلۂ رنگ بدلتی ہوئی رات
نو عروسانہ نئی صبح کی آغوش میں خود گرمیِ انفاس سے ڈھلتی ہوئی رات

ہالہ، دائرہ، سلسلہ — جیسے لچھوں اور مرغولوں کا سلسلہ آپ ہی آپ بڑھتا ہی چلا جائے۔ رات کے دن میں ڈھلنے کی توجیہ کتنی خوب ہے! رات کے طلسمی اندھیرے کے بعد صبح کا افسوں:

صبح افسانہ و افسوں کا بکھرنے لگا ہر شہر سبا زاد پہ جادو جیسے
پاک جمہوریہ، مصروفِ سفر صندلی رستوں میں خراماں کوئی آہو جیسے
دور تک پھیلے ہوئے سرد گھنے سبز درختوں کی ترنگ و تار کا پُرکیف سماں
صورتِ بادِ پریشاں کسی ساحرۂ خواب کے بکھرے ہوئے گیسو جیسے
ناوک انداز شعاعوں کا ہر اک ناوکِ زرکار رہا دل میں ترازو جیسے
گاؤں گاؤں میں نئی دھوپ نئی چھاؤں نئے روپ کے ہنستے ہوئے سنگم بوٹے
قریۂ شہد لباں کوئے نگاراں میں بیک وقت امڈی ایک سی خوشبو جیسے

دم بہ دم غرفۂ آلام سے صد ماہ و خورشید کے نقاش اجالوں کا طلوع

اور اس کے بعد:

یہ ہمہ رنگ زمیں جیسے کسی خواب کے ارژنگ کے بکھرے ہوئے رنگین اوراق
یہ طلسم زاد فضا جس کے فسوں کار تبسم کے اثر سے دلِ آذر دھڑکے
شاخ بر شاخ بہ ہر لغزشِ امواجِ صبا بادۂ شبنم کے کٹورے چھلکے
دیکھ کر قافلۂ عزم کی آغوش میں صد حلقہ بگوشانِ محبت کا ہجوم
خیر مقدم کے لئے وادیِ مہران کے ذرات میں سمٹے ہوئے سورج چمکے

آخری بند اُن اترے چڑھے سروں، ان گھلی ملی دھنوں، ان البیلی لے کاریوں اور ان کے ساتھ موضوع کے چند در چند پہلوؤں کو کس طرح سمیٹ لیتا ہے جیسے یہ سب ایک طلسمی سازینہ ہو:

راوی راوی مرے احساس کے طوفان بہ ہر دشتِ مغیلاں مری آہو کے خرام
اس مسافت میں ترے ساتھ رہیں مجھ سے وطن دوست فقیروں کی دعائیں [illegible]
صبح در صبح شعاعوں کے حنا رنگ شرارے تو ستاروں کے دیئے شام بہ شام
ارضِ مہران سے تا وادیِ کاغان فروزاں ہیں ہر اک دست حنائی پہ چراغ
صورتِ برق سجانے لگی بنگال کی ہر زلف کو مشاطۂ خورشید خرام
تیرے ہونٹوں پہ ہمہ وقت محبت کے تر و تازہ کنول گلشنِ جمہور کے نام
حرفِ آغاز ہے یہ پاک سفر اور ابھی دور بہت دور ہے اس کا انجام
اے مسافر ترا مقسوم نہ راحت نہ کسی سایۂ دیوارِ چمن میں آرام

دیکھئے شاعر نے کس چابکدستی سے مغربی پاکستان کا دامن مشرقی پاکستان سے ملایا ہے۔ اور "محبت کے تر و تازہ کنول" میں سب "سرِ دلبراں" بیان کر دیا ہے۔

ان تین پُرکار نظموں کے باوجود اس موضوع کی گنجائشیں ختم نہیں ہوئیں۔ کوئی اور شاعر اس لے کو بڑھا کر مشرقی و مغربی پاکستان کی ساری زندگی اور صحرا و کوہسار، دریا و سبزہ زار کی رنگا رنگ، نظر نواز رعنائیوں کو اس میں سمو کر ایک "شاندار" نقشی کانتھا[1] (زرکار لحاف) تیار کر سکتا تھا۔ ہمارے شاعروں نے اس لحاظ سے ایک زریں موقع کھو دیا ہے۔

مگر خوش قسمتی سے ایک اور زریں موقع ہے جہاں وضاحت

---

[1]: جسیم الدین کی مشہور داستانی نظم۔
FIELD OF THE EMBROIDERED QUILT

ے ساتھ موجود تھا لیکن شاعرانہ فکر نے اسے از خود پیدا کر لیا، ضرور
نامہ اٹھا لیا گیا اور بہت خوش اسلوبی سے۔ دیارِ پاک کی ایک
شاعرہ، عاصمہ حسین نے جس کی نظم "پاک سی حرفی" ہماری قومی
شاعری ہی نہیں، تمام اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی
ہے۔ ایک ایسا غیر فانی شاہکار جو "عاصمہ شاعرہ برق نفس" کو
شاعرات میں بلند ترین مقام پر فائز کرتا ہے۔ "پاک سی حرفی" نہ صرف
اردو میں ایک نہایت عمدہ صنف کا اضافہ کرتی ہے بلکہ اس کا نہایت
کامیابی اور خوش اسلوبی سے حق بھی ادا کرتی ہے۔ اس کا ٹھاٹھ،
اس کا تجمل، اس کی گھن گرج اور لفظ لفظ، مصرع مصرع سے چھلکتی
ہوئی، امڈتی ہوئی شعریت اس کو دورِ انقلاب، اس کی فتوحات،
اور جلیل القدر سربراہ ملت، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی عظمت و
جلال کا مجلّی آئینہ بنا دیتی ہے۔ اور شعری عظمت حقیقتہً ظاہری
عظمت کی حریف بن جاتی ہے۔ وہی بات۔ عجم زندہ کردم بدیں پارسی!

اس صنف کو حال ہی میں ایک شاعر، مختار صدیقی نے بھی
اپنایا ہے۔ لیکن دونوں نقوش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔
عاصمہ کی نظم شاعری کا ایک بھرپور چھلکتا ہوا پیمانہ ہی نہیں —
چھلکتا ہوا میخانہ" ہے۔ ہر لفظ دو آتشہ سہ آتشہ۔ حسن اتفاق
سے جو صنف اختیار کی گئی ہے وہ اس قدر لچکدار ہے کہ کسی
وقت بھی متلاشی روشنی کا رخ کسی طرف بھی موڑا جا سکتا ہے اور
اسے کسی بھی لفظ یا موضوع پر مرکوز کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک ہی
نقشہ میں بھرپور کیفیت سامنے آجاتی ہے۔ اس طرح شاعرہ دورِ
انقلاب کے ہر ہر پہلو کو اس طرح اجاگر کر سکتی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ
شاعری کا بھی پورا پورا حق ادا ہو جائے۔ معاصر واقعات کی طرف
لطیف اشاروں کے ساتھ جن سے شاعرہ کی اپنے ماحول اور
زندگی سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ فن کی باریکیوں پر بھی گہری نظر ہے۔

یہ دھرتی اجلی اجلی سی، یہ دھرتی سبز نشان اپنی

اجلی اجلی" اور "سبز نشان" ہمارے سفید و سبز پرچم کی ہو بہو تصویر۔
اندازِ اتنی لطیف و برجستہ، بغیر اس کا ذکر کیے، اشارۃً۔ اس بند میں:
قوم و ملت اور شاعری کی فصلِ بہاراں کا اہتمام دیکھئے:

ف۔ فصلِ بہاراں آبھی چکی اور مہکی ہر ہر پھلواری
ہر یاول ہی ہریاول سے لہکی جہکی کیاری کیاری

کیا کانی کانی ہر شے ہے، کیا ہر صورت پیاری پیاری
ہر بوٹا قوسِ قزح دھنک کی طرح، ہر ڈالی ہے ناری ناری

اس پر لطف یہ ہے کہ قوسِ قزح دھنک کا نام اسی بند میں آیا ہے جو ق
سے شروع ہوتا ہے۔ اس طرح شاعرہ کی اچھوتی کاریگری نے سارے
بند کو حرفِ اظہار بنا دیا ہے۔

صرف یہی نہیں، کئی اور بند ایسے ہیں جن پر شاعری کی
بے پناہ چھوٹ پڑتی ہے۔ اور ایک چکا چوند کا عالم پیدا کرتی ہے:

ث۔ ثابت اور سیار سبھی تاثیر میں ہم آہنگ ہوئے
اور قدر و قضا کے ہاتھوں میں طاؤس و مربوط و چنگ ہوئے
یوں قوسِ قزح در قوسِ قزح آکاش پہ رنگ ہی رنگ ہوئے
نظارگیانِ ارض و سما اس رنگِ فسوں سے دنگ ہوئے

ش۔ شوق ہے اس کا بے پایاں، ہر گام پہ اور ہی منزل ہے
جہاں نیل گگن ساگر سے ملے کب اس کی نظر میں ساحل ہے
جس میں ہے نہ منزل نے ساحل، وہ نگری اس ہی کا دل ہے
بجلی ہے کہ بادل بادل ہے، دیپک ہے کہ محفل محفل ہے

ذیل کے بند سے یوں لگتا ہے جیسے کوئی تیز رو پہاڑی ندی قدم
قدم پر بڑی خوبصورتی سے آبشار ہی آبشار بناتا چلا آرہا ہو:

ط: طریق نئے، افکار نئے، انداز نئے، اشغال نئے
سانچے میں خلوص کے ڈھالے ہوئے اقوال نئے اعمال نئے
اوصاف نئے، اطوار نئے، اذکار نئے، احوال نئے
آفاق نئے، اعماق نئے، آکاش نئے، پاتال نئے

ف کے بند کی طلسم کاریاں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ق، گ کے بند اس سے
بھی زیادہ شعریت میں رسے بسے ہیں:

ق: قمقمے نور کے روشن ہیں، یہ روشنیاں ہی روشنیاں
بادل کی قبا میں جھومتی ہیں کیا جل پریاں ہی جل پریاں
یہ نور کی مینائیں ہیں یا ہیں رس بھریاں ہی رس بھریاں
اور ترچھی ٹیڑھی کرنوں سے یہ گل بیاں ہی گل بیاں

گ: گلوں کی موہنی رت آئی، کلیاں ابھریں کنواری کنواری
اس پیاری رت میں ہوتی من کو لاگے پیاری پیاری
کیا کانی کانی بوٹیاں ہیں کھیتوں سے اٹھی ناری ناری
وہ پیراہن لاچہ لاچہ، شیشہ آنچل ساری ساری

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

ستارے[1] افشاں افشاں

احمد ندیم قاسمی

عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

آج کے دن کا بدل کیا ہو گا
کل ہی سوچیں گے کہ کل کیا ہو گا

تم دیئے ہو جو لرزتے ہو صبا کے ڈر سے
ہم ستارے ہیں جو طوفاں سے گزر جاتے ہیں

اب تجھ سا کوئی کہیں نہیں ہے
اب تیرا فراق بھی حسیں ہے

مجھے قسم ہے مری شانِ آدمیت کی
فریب دے نہ سکوں گا، فریب کھائے تو ہیں

تہذیب کے طاق پر ہمیشہ
جلتے ہیں چراغ مفلسی کے

اہرمن بن کے بھی دیکھا ہے کہ انساں کا ضمیر
نور ہی نور ہے، شعلے کا کہیں نام نہیں

تاریخ کو تقدیر سمجھنے والو
تاریخ تو تخلیق ہے انسانوں کی

یہ گزرتے ہوئے پل ہیں کہ تری آنکھیں ہیں
دن ہے آنسو کی طرح، رات ہے کاجل کی سی

ہر طرف پھوٹتی پَو کو دیکھو
ڈوبتے چاند کا ماتم نہ کرو

آتشِ عشق جلاؤ کہ سفر ہے دشوار
راہ میں کتنے عقیدوں کا گھنا جنگل ہے

تخلیق کے ذوقِ جاوداں سے
انسان خدا کا ترجماں ہے

[1] "رات، ستارے افشاں افشاں" — مدیر

منارِ ساحل

ائے اردو مولوی عبدالحق کی ۹۲ ویں سالگرہ پر اُن کی پرخلوص خدمات سے متاثر ہو کر

سعادت نظیر

جورِ گردشِ دوراں! یہ تلخیِ حالات!
کہاں طلوعِ سحر؟ ہے ابھی اندھیری رات
سہمے سہمے ستارے! یہ سہما سہما جہاں!
ابھی زمیں سے فلک تک ہے ظلمتوں کا سماں
بھی ہے زلف پریشاں نگارِ اردو کی
کہ بزم ہے ابھی ویراں نگارِ اردو کی
بھی سحاب میں ہے آفتاب کی منزل
ابھی ہے دور بہت انقلاب کی منزل
م اے ادب کے پیامی! چراغِ منزل ہو
شبِ سیاہ میں روشن منارِ ساحل ہو
تمہیں تعلقِ خاطر ہے وہ سویروں سے
کہ ہر قدم پہ اُلجھنا پڑا اندھیروں سے
تمہیں سے آج منور فضا ہے اردو کی
نظر فروز جہاں میں ضیا ہے اُردو کی
ادب نواز! تمہیں آبروئے فن بھی ہو
تمہیں خود انجمن آرا بھی، انجمن بھی ہو
خلوصِ دل کو ہے نسبت تمہارے کام کے ساتھ
پیامِ جوشِ عمل ہے تمہارے نام کے ساتھ
اُلٹ دو ہاتھ سے اپنے نقاب اردو کا
دکھا دو اہلِ نظر کو شباب اردو کا

جرسِ گل

احـ

گذر گیا وہ زمانہ کہ ہم زمانے میں
خزاں رسیدہ کبھی غم گزیدہ رہتے تھے
زباں پہ حرفِ تمنا کبھی نہ آتا تھا
گذر رہی تھی جو دل پر نظر سے کہتے تھے
گذر گیا وہ زمانہ کہ جس کے
نظر نظر میں ستارے سلگتے
الاؤ جیسے سلگتا ہو سینہ
سحر سحر کے نظارے سلگتے
گذر گیا وہ زمانہ وہ یاس کی تصویر
اداسیوں کا بسیرا تھا جس کے دامن میں
وہ رات جس سے غمِ زندگی ملا برسوں
وہ رات بھی تھی سویرا تھا جس کے دامن میں
یہی وہ دور ہے جس نے ہمیں
یہی وہ دور ہے جس کو بہار
نگارِ صبحِ طرب بھی یہیں کہ
جو ہم نہیں تو یہ نقش و نگا
نظر نظر میں ستارے سلگ رہے تھے جہاں
نفس نفس میں مسرت کے پھول کھلتے ہیں
یہ کس کے ہاتھ میں ترتیبِ گلستاں آئی
روش روش میں چمن کے اصول ملتے ہیں
چراغ لالہ سے روشن ہیں
بہارِ جشنِ بہاراں کو ساتھ لا
صبا کا راز بھی آخر چمن میں کھلا
کلی کلی کی زباں پہ وہ بات آ

لسانیات،

"الف"

سید قدرت نقوی

ہماری انقلابی حکومت کے کارہائے نمایاں میں سے ایک زبان و ادب پر خصوصی توجہ ہے۔ چنانچہ عرصہ ہوا وزارت تعلیم کی طرف سے "ترقی اردو بورڈ" قائم ہوا تھا وہ حکومت کی تائید و معاونت سے بدستور سرگرم کار ہے اور سب سے پہلے اس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ ایک مبسوط لغت کی ترتیب ہے۔ بورڈ نے اس کام کو جس نہج پر سرانجام دینے کی کوشش کی ہے اس کی کچھ جھلک اس مضمون میں نظر آتی ہے جو "ماہ نو" کی اشاعت مئی ۱۹۶۰ء میں بروئے کار آیا ہے۔ اور جس میں ابجد کے حرف اولین "ا" کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کام بجائے خود مستحسن ہے لیکن اتفاق سے جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ اس قدر متفرق قسم کا ہے کہ عبارت گنجلک ہو گئی ہے۔ اگر اظہار مطالب کے لئے اعداد یا حروف تہجی کے ذریعہ ترتیب قائم کی جاتی تو بہتر ہوتا۔

اردو کا زیادہ تر ذخیرۂ الفاظ عربی، فارسی اور ہندی (سنسکرت) کا ہے۔ اسلئے لغت مرتب کرتے وقت ان تینوں زبانوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ نیز انگریزی اور ان دوسری زبانوں زبانوں کو بھی، جن کے کچھ الفاظ ہماری زبان میں منتقل ہوئے ہیں۔

اردو لغت نویسی کی تاریخ کا سلسلہ "خالق باری" سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی کتابیں دراصل فارسی کی تحصیل میں آسانی پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ البتہ سراج الدین علی خاں آرزو کی "نوادر الالفاظ" اور مولوی عبدالواسع ہانسوی کی "غرائب اللغات" اردو لغت کی اولین کتابیں ہیں۔ ان میں اصول لغت نویسی پر چنداں عمل نہیں کیا گیا۔ سادہ نثر اردو کی طرح لغت نویسی کا کام بھی فورٹ ولیم کالج میں ہوتا رہا۔ جان گلکرسٹ اور فوربس نے لغت مدون کئے جو اگرچہ معمولی ہیں مگر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ شیکسپیئر، ڈی پلیٹ اور فالن نے لغت مرتب کر کے شائع کرائے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے فالن کی طرز پر ایک لغت مرتب کیا جس کا ایک حصہ پہلے "ارمغان دہلی" کے نام سے شائع ہوا، پھر مکمل چار جلدوں میں "فرہنگ آصفیہ" کے نام سے شائع ہوا۔

"فرہنگ آصفیہ" کے بعد "نور اللغات" تیار ہوا اور اس کے بعد "جامع اللغات" مرتب کیا گیا۔ اسی دوران میں متعدد لغات حسب ضرورت مرتب ہوتے رہے۔ ہماری لغت نویسی کی تاریخ کا یہ مجمل سا خاکہ ہے۔ چنانچہ جب کسی سلسلہ میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو زیادہ تر انہی تین لغتوں کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں بھی بعض مقامات محل نظر ہیں۔ جہاں مرتبین نے اپنے قیاس سے کام لیا ہے، لغزش کی ہے۔ مثلاً "جامع اللغات" میں لفظ "اَنّا" کے معنی لکھے ہیں "وہ شخص جس کی رہائی اپنے ہاتھ میں ہو"۔ خیال فرمائیے، یہ کہاں تک درست ہے۔ یا "اِکّا" کے معنی لکھے ہیں "چھوٹی بہلی یا بگھی یا تانگا جس میں ایک گھوڑا جوتا جاتا ہے۔ ایک ہلکی گاڑی جس میں ایک بیل جتا ہوتا ہے"۔ یہ سب حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ اول تو عام طور پر "یکّہ" بولا جاتا ہے کہیں کہیں اکّا بھی کہتے ہیں۔ یکہ یا اکا ایک مخصوص طرز کا بنا ہوا گھوڑا تانگا ہوتا ہے جو زیادہ تر علی گڑھ اور اس کے قرب و جوار میں رائج ہے۔ دیگر مقامات پر اس کا رواج نہیں رہا۔ بہلی میں دو ہی بیل جوتے جاتے ہیں۔ ایک بیل کی گاڑی باربرداری کے کام آتی ہے، سواری کے لئے استعمال نہیں ہوتی اس کو بیل ٹھیلہ کہتے ہیں۔ یکہ اور بگھی کا فرق سب کو معلوم ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ لغت نویسی بڑا دشوار کام ہے۔ ہمارے ادب میں سب سے پہلے لغت نویسی کی صحت کی طرف غالب نے توجہ دلائی تھی اور اس سلسلہ میں بعض باتیں بڑے پتے کی بتائی ہیں۔ "اردوئے معلّیٰ" اور "عود ہندی" میں متعدد خطوط ہیں جن میں لغت نویسی پر اظہار خیال ملتا ہے۔ جس کا مطالعہ ضروری ہے۔

ا کا تلفظ ان تمام زبانوں میں جن کا رسم الخط عربی سے لیا گیا ہے اَلِف (الف پر زبر لام کے نیچے زیر، ف ساکن) ہے۔ اس کی دو حیثیتیں ہیں (۱) حرف (۲) لفظ (اسم)

بحیثیت حرف یہ عربی رسم الخط کے حروف تہجی کا پہلا حرف ہے جس کی مفرد آواز زبان کو درمیان میں معلق رکھنے اور تالو کے اندرونی حصہ سے ہوا کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مکتوبی شکل خط نستعلیق

تین نقطے کے برابر کھڑی لکیر ہے"۔ خط نسخ میں ذرا سا ٹیڑھا پن ہوتا ہے (ا) دیگر خطوط میں بھی سیدھی لکیر سے شناخت کیا جاتا ہے۔ یہ مکتوبی شکل عربی رسم الخط سے اردو میں آئی۔ عربی رسم الخط کا سلسلہ قدیم مصری مصوری رسم الخط سے ملتا ہے۔ مصری خط میں بیل کی تصویر بنائی جاتی تھی اور آدا (بیل) کہتے تھے۔ فنیقی رسم الخط میں مصری رسم الخط سے یہ شکل (﴿) یعنی بیل کے سر کی نشانی بعینہٖ اختیار کی گئی۔ فنیقی میں بیل کو الاف کہتے تھے۔ فنیقی سے عبرانی میں آئی اور آلف کہلائی۔ عربی میں الف نام ہوا۔ عبرانی اور عربی شکلیں بدلتی گئیں اور آخری شکل "ا" رہ گئی۔ اردو اور فارسی میں "ا" کی سیدھی شکل بن گئی۔

بلحاظ آواز دو مستقل حیثیتیں ہیں (ا) متحرک (۲) ساکن۔

متحرک: عربی میں الف متحرک کو ہمزہ کہتے ہیں لیکن اردو میں الف ہی کہلاتا ہے۔ یہ ہمیشہ کسی لفظ کے شروع میں ہوتا ہے جیسے اَب، اِن، اُن وغیرہ۔ درمیان کلمہ میں دو طرح واقع ہوتا ہے (ا) جبکہ دو الف جمع ہو جائیں، پہلا متحرک دوسرا ساکن، جیسے، قرآن، قرأت، مآل، مآثر، مآب، جرأت۔ (۲) جبکہ کسی ایسے کلمہ سے پہلے سابقہ آجائے جو الف سے شروع ہوتا ہو جیسے: بے اثر، لاالہ، خوش ادا، ابن آئی وغیرہ۔

ساکن: عربی، فارسی، اردو میں آخر و وسط کلمہ میں واقع ہوتا ہے، ابتدا میں نہیں آتا۔ حرف ماقبل کے لئے زبر کے علاوہ اور کوئی حرکت قبول نہیں کرتا جیسے صبا، ادا، جواب، سحاب، شتاب، گھوڑا، پڑاؤ، جاڑا وغیرہ۔

شانؔ صاحب نے اردو املا میں اعراب و حروف علت سے مل کر جو دس علتوں کے لئے الف کا استعمال دکھایا ہے، میرے نزدیک وہ غور طلب ہیں کیونکہ یہ بات ان کی اپنی تحقیقی نہیں ہے۔ ابتداً کسی لغت نویس نے ضخامت کو بڑھانے کے لئے بہت سی بے تکی باتیں داخل کر دیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ غالباً "جامع اللغات" میں اس کا ذکر دو جگہ ہے۔ درحقیقت یہ دس علتیں ہندی (سنسکرت) حروف अ، आ، इ، ई، उ، ऊ، ए، ऐ، ओ، औ (اَ، اِ، اُ، اے)۔ ان چار پر علامات کا اضافہ کرکے مزید آٹھ علتیں پیدا کر لیں۔ چونکہ ہماری زبان میں ان علتوں کے لئے الگ الگ کوئی حرف یا علامت نہیں، اس لئے ان کا ذکر بے محل ہے۔ تعجب ہے کہ صاحب "جامع اللغات" نے ہندی کے अं اور अः انگ، (اہ) کو کیوں چھوڑ دیا اور پھر قدیم فارسی (اوستا) میں بھی ان دس علتوں کے علاوہ پانچ علتیں اور ہیں جن میں انگ بھی شامل ہے۔ اگر

سولہ علتیں بن جاتیں۔ اور سنسکرت اور اوستا سے واقفیت کے اظہار کا موقع بھی اچھا تھا۔ اگر ان تمام علتوں کو قبول کر لیا جائے تو ان کے استعمال کے تمام امور زیر بحث آنے چاہئیں جو بے شمار ہیں۔

اردو زبان، عربی، فارسی اور ہندی سے مل کر بنی ہے، اسلئے اب حرف "ا" کی وہ حیثیت جو ان زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی بیان کی جاتی ہے۔

عربی:۔ عربی زبان میں اگرچہ الف ساکن ہوتا ہے اور ہمزہ متحرک مگر اردو میں صرف الف ہے اور اس کی املائی اور معنوی صورتیں یہ ہیں (ا) الف متحرک در اوّل کلمہ جیسے انسان۔ (۲) ساکن در آخر وسط کلمہ جیسے دعا، ثواب۔ (۳) الف ممدودہ (آ) جیسے آلام (شانؔ صاحب نے "ا" جیسے اٰمین لکھا ہے۔ یہ املا صرف عربی سے مخصوص ہے۔ اردو میں اس کا استعمال نہیں۔ نیز آحیا اور آبرا میں الف ممدودہ نہیں) (۴) الف مقصورہ۔ یہ بشکل "ی" لکھا جاتا ہے ی پر الف کی مختصر شکل بنا دی جاتی ہے۔ جیسے، عیسیٰ، موسیٰ، مرتضیٰ (۵) الف بشکل واؤ جیسے، زکوٰۃ، صلوٰۃ (عربی میں حیوٰۃ ہے مگر اردو میں حیات)۔ یہ عربی میں تعلیلی شکل ہے۔ (۶) عربی الفاظ کے آخر میں دو زبر کے ساتھ نون کی آواز پیدا کرتا ہے جسے تنوین کہتے ہیں مثلاً: فوراً، قطعاً، لازماً، نسلاً بعد نسل (شانؔ صاحب نے نسلاً کو نسلاٍ لکھا ہے حالانکہ آخر میں دو زبر کے ساتھ لام بغیر الف لکھا جاتا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اسی طرح دو پیش کے ساتھ جو مثال دی ہے اردو میں اس کا استعمال ہی نہیں۔ (۷) عربی کے الفاظ پر لام کے ساتھ دو طرح استعمال ہوتا ہے (الف) مفرد الفاظ پر استعمال دو طرح ہے (ا) اگر ابتدائی حرف قمری ہوگا تو الف کے ساتھ لام کی آواز بھی نکلے گی جیسے القرآن، الحکیم (۲) اگر ابتدائی حرف شمسی ہوگا تو لام کی آواز نہیں نکلے گی بلکہ اس حرف کو مشدد کر دے گا جیسے التّاریخ، الثّابت، الصّبر وغیرہ تخصیص، تعریف اور حصر وغیرہ کے معنی دیتا ہے (ب) مرکبات میں وصل و اضافت کے لئے استعمال ہوتا ہے، فوق البشر، کتاب اللہ، رسول اللہ، کتاب النحو وغیرہ (۸) عربی الفاظ کے آخر میں بشکل ہمزہ لکھا جاتا ہے مگر اردو میں نہیں لکھا جاتا۔ اب کلیۃً ترک ہے جیسے ابتدا (عربی) ابتداء (۹) ع اور ہ کے ماقبل زبر کے ساتھ ہوتا ہے زبر اور زیر کے بین بین آواز دیتا ہے۔ یہ خاص اردو لہجہ کا تصرف ہے

بلکہ زیر کی آواز واضح ہوتی ہے جیسے: أحمد، أحباب، أہل، الہیہ۔ ان الفاظ پر زبر ہے مگر آواز زیر کی سی نکلتی ہے۔

شان صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کی کوئی سند اور معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ ح، ع، ل، ہ کی مثال میں جتنے الفاظ پیش کئے گئے ہیں ان کے زیر اور پیش اصلی ہیں: احسان، احتیاط، اعلان، لاالہ، امانت، أحد کا تلفظ عربی اور اردو میں یکساں ہے۔ الف کی وجہ سے ان میں سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ ح اور ہ ما قبل مفتوح کے لئے اردو تلفظ میں زیر کی سی آواز نکلتی ہے اور یہ آواز در اصل ح اور ہ کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے جیسے محمود، محبوس، مجہول، محکوم۔ (۱۰) بعض الفاظ پر نصف الف کی صورت میں لکھا جاتا ہے جس کو کھڑا زبر کہتے ہیں جیسے: لہٰذا، الٰہی، اللّٰہ۔ الف کی ہلکی آواز دیتا ہے یعنی زبر سے لمبی اور الف سے کم۔ شان صاحب نے اعلیٰ علیین، بذاتہٖ، الّا آخرہم میں کھڑے زیر کو بھی اسی ضمن میں لکھا ہے اور یائے معروف کا ہم آواز قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ زیر کی ہلکی اشباعی حالت ہے۔ تحریر میں ضرور الف سے مشابہت ہے لیکن اس کو کھڑا زیر ہی کہا جاتا ہے۔ اس کا الف سے کوئی تعلق نہیں۔ (اعلیٰ، ادنیٰ، لیلیٰ، عیسیٰ، منقیٰ، حتّٰی میں بھی الف مقصورہ ہے، کھڑا زبر نہیں کیونکہ یہ شکل ی لکھا جاتا ہے) (۱۱) عربی حروف علت میں شامل ہونے کی وجہ سے زبر کی اشباعی شکل کی نمائندگی کرتا ہے۔ شان صاحب نے اَتین = ا ت ی ن میں شامل ہونے کے سبب عربی بالاصل کلمات میں بکثرت موجود ہونا بتایا ہے لیکن کوئی مثال پیش نہیں کی۔ "اتین" علامات مضارع کے مجموعہ کا نام ہے۔ جن میں الف واحد متکلم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں کوئی لفظ ایسا استعمال نہیں ہوتا جو مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہو۔ فارسی کے ابتدائی دور میں البتہ استعمال ہوتا تھا۔ اب اس میں بھی متروک ہے اور یعنی استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں تو یعنی ہی استعمال ہوتا رہا ہے۔ تلمیحاً اگر کوئی لفظ استعمال کیا جائے تو یہ استثنائی حالت ہے جیسے ع دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور: لفظ ارنی ہماری زبان میں مستقل لفظ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ارنی بھی امر کا صیغہ ہے مضارع کا نہیں۔ لہٰذا "اتین" کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

(۱۲) عربی میں بطور علامت جمع تین طرح استعمال ہوتا ہے۔ (۱) ابتدا میں زبر کے ساتھ جیسے اغذیہ، ادویہ، السنہ (۲) ابتدا میں زبر کے ساتھ وسط میں ساکن جیسے احباب، اخبار، اجناس، ارباب (۳) وسط میں ساکن جیسے براہمہ، برامکہ، مجالس، بستان، بلاد کبھی ت کے ساتھ جیسے حیوانات، جمادات، نباتات، کائنات وغیرہ (اپنے ما قبل کو متحرک مفتوح بنا دیتا ہے)

(۱۳) بطور علامت فاعل وسط کلمہ میں آتا ہے اور اس کے مابعد زیر کی حرکت آتی ہے فاعل، متفاعل کے وزن پر جیسے: شاعر، مقابل، مجاہد، متعارف، متناسب۔

(۱۴) بطور علامت تفضیل ابتدا میں مفتوح جیسے اکبر، اصغر، اشرف

(۱۵) بطور علامت تفضیل آخر میں مونث کے لئے جیسے صغریٰ، کبریٰ (عربی میں) صغرا، کبرا، علیا اردو میں۔

(۱۶) بطور علامت مصدری۔ ابتدا میں زیر کے ساتھ حرف آخر لام سے پہلے ساکن، اِفعال، اِفتعال، اِستفعال کے وزن پر جیسے انکار، اقرار، اقتدار، اختیار، انسداد، انحراف، استفادہ، استعارہ وغیرہ۔

(۱۷) اِمالہ (یائے مجہول سے بدلنا) جیسے حوالی سے حویلی، جہاز سے جہیز وغیرہ۔ شان صاحب نے عربی الفاظ میں بطور علامت استفہام استعمال کیا جانا لکھا ہے اور مثال الست بربکم دی ہے لیکن اردو میں یہ علامت استعمال نہیں ہوتی بلکہ یہ پورا جملہ استعمال ہوتا ہے اور تلمیحاً، لہٰذا یہ بیان خالی از تکلف نہیں۔

(۱۸) بطور علامت صفت مشبہ آخر میں جیسے سودا، صفرا۔

(۱۹) بطور علامت مبالغہ حرف آخر سے پہلے جیسے طیار، علام، جبار، ستار۔

(۲۰) پیشہ وروں کے نام میں بر وزن فعال جیسے بزاز، قصاب، نجار، خطاط، حجام، جراح، فصاد، نساج وغیرہ۔

(۲۱) بطور علامت اسم آلہ حرف آخر سے پہلے بر وزن مفعال جیسے مسواک، میزان، مقراض، مضراب وغیرہ۔

(۲۲) بحساب جمل اس کا عدد ایک ہے۔

(۲۳) ابواب زبور میں پہلے باب کا نام اور نشانی۔

(۲۴) علم نجوم میں زیچ اور اسطرلاب میں ایک کی جگہ اس سے کام لیتے ہیں۔

(۲۵) نجوم و ہیئت کی اصطلاح میں برج حمل کو کہتے ہیں۔

فارسی: قدیم فارسی (اوستا) میں الف سے متعلق اعراب حرکات کے اظہار کے لیے پندرہ حالتیں اور شکلیں تھیں لیکن موجودہ فارسی میں

کا تتبع کیا گیا ہے اور صرف الف ساکن اور متحرک تسلیم کیا گیا ہے۔ حسب ذیل معنی میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) بطور علامت ندا جیسے خداوندا: ولا، زاہدا ؎

کون کرتا ہے بتوں کے آگے سجدہ زاہدا
سر کو دے دے مار کر توڑیں گے بتخانے کو ہم

آج کل بجز "خداوندا" اور الفاظ کے ساتھ استعمال بمنزلہ متروک ہے۔

(۲) برائے دعا قبل از حرف آخر جیسے باد

(۳) برائے توالی و تکرار جیسے پیاپے، دمادم۔

(۴) برائے غایت و انتہا جیسے سراسر، سراپا

(۵) برائے فاعل جیسے دانا، بینا۔

(۶) برائے اظہار کثرت جیسے خوشا، بسیار

(۷) برائے اتصال جیسے، شباشب۔

(۸) برائے عطف جیسے: شبا روز، تگاپو۔

(۹) برائے اسم کیفیت صفت کے بعد جیسے: گرم سے گرما۔

(۱۰) برائے حاصل مصدر جیسے کشاکش

(۱۱) زاید: سوار سے اسوار۔

(۱۲) برائے اشباع جیسے پیرہن سے پیراہن، دامن سے دامان

(۱۳) برائے قسم جیسے: حقا (ع) حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا۔

(۱۴) برائے ندبہ و تاسف جیسے، واحسرتا، دریغا، و امصیبتا ؎

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

(۱۵) صفت نسبتی میں واؤ سے بدل جاتا ہے جیسے مصطفیٰ سے مصطفوی، مرتضیٰ سے مرتضوی۔ عیسیٰ سے عیسوی۔ کبھی درمیان میں اضافہ کیا جاتا ہے جیسے یمن سے یمانی۔

(۱۶) الفاظ کے شروع سے حذف کر دیا جاتا ہے جیسے اسکندر سے سکندر، ابراہیم سے براہیم۔ انوشیرواں سے نوشیرواں

(۱۷) الف ممدودہ "آ" کو بعض دو الف کا مجموعہ خیال کرتے ہیں۔ علامت مد کو ایک الف کا نشان خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک الف اول متحرک اور الف ثانی ساکن ہے چنانچہ قدیم زمانہ میں "اا" دو الف برابر لکھے جاتے تھے بعد کو ایک الف اوپر لگا دیا گیا جس کو مد کہا جانے لگا لیکن قدیم فارسی میں اس کے لئے الگ علامت

(سـ) مقرر تھی۔ اسی طرح ہندی میں بھی اس کی نشانی (आ) اختیار کر رکھی ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، قدیم فارسی اور سنسکر میں بھی یہ دو الف کے برابر ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ قدیم فارسی الف کی شکل (سـ) تھی۔ اس پر ایک دندانہ کا اضافہ کرکے (سـ) شکل اختیار کر کے "آ" کا کام لیا۔ اسی طرح ہندی میں الف کی آواز کے لئے अ شکل ہے۔ اس پر اضافہ کرکے (आ) بنایا اور "آ" کی آواز پید کی، لہٰذا یہ کہنا کہ ان دونوں زبانوں میں "آ" الگ حرف ہے، درست نہیں۔ تاریخ گو حضرات متوسطین کے زمانہ تک اسی بنا پر "آ" کے د عدد شمار کرتے رہے ہیں۔ متاخرین نے اس کو ترک کر دیا۔ لیکن دو حاضر میں بھی اہل فن اس کے حق میں رہے ہیں کہ "آ" کے دو عدد لئے جائیں اور دو الف لکھے جائیں۔ مثلاً صفی لکھنوی ؎

صفی زباں پہ ہے تاریخ آنکھ میں آنسو
"ستارہ ڈوب گیا اُاسمانِ ہمت کا" (۱۳۲۸ھ)

۱۳۲۸

(۱۸) ضرورت شعری کی وجہ سے الف ساقط ہو جاتا ہے جس کا استعمال اردو میں بھی عام ہے جیسے اگر سے گر، امیر سے میر مثلاً غالب ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اقبال۔ ع

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا

شان صاحب نے خونچہ اور پرچہ کی جو مثالیں دی ہیں ان میں خونچہ عوام کا تلفظ ہے، شرفا کا نہیں۔ پرچہ کی اصل ممکن ہے پارچہ ہو لیکن اب پارچہ اور پرچہ میں بین فرق ہے۔ پارچہ کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور پرچہ کاغذ کے لئے جیسے امتحان کا پرچہ۔ البتہ خاموشی سے خموشی کی اس ضمن میں مثال دی جا سکتی ہے۔

ہندی و اردو: اردو میں ہندی سے براہ راست الف دو حیثیتوں سے آیا۔ ایک تخفیف شدہ صورت میں، دوسرے اصلی حالت میں۔ بعض ایسی شکلیں ہیں جن میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ یہاں وہ امور بیان کئے جاتے ہیں جو عربی فارسی سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ان میں ہندی کا عمل ہے یا اردو کا اپنا تصرف ہے۔ الف کے استعمال کی حسب ذیل صورتیں ہیں:

(۱) بطور علامت نفی ابتدا میں جیسے اچھوتا، اَٹل،

(۲) اشباعی حالت یا ہندی (क) ک کا بدل جیسے گھوڑا لتا، بھالا۔

(۳) علامت فاعلی (صفت مشبہ) کے لئے جیسے جھوٹا، بھوکا، لفنگا، لچا، اچکا۔

(۴) برائے حاصل مصدر اسم کے آخر میں جیسے ٹھنڈا، توڑا۔

(۵) اسمائے صوت کے آخر میں جیسے دھما کا۔ جھپاکا۔ کھڑکا۔

(۶) اسمائے صفت کے آخر میں بطور علامت تذکیر جیسے گٹھیلا سجیلا، پتھریلا۔

(۷) اسمائے کیفیت کے بعد جیسے، بچپنا، لڑکپنا، چھٹپنا۔ گنوارپنا۔

(۸) اسمائے ظرف کے آخر سے حذف ہوجاتا ہے۔ جیسے گھوڑ شالا سے گھوڑسال۔ ٹکھنڈ سال وغیرہ

(۹) کبھی ابتدا سے حذف ہو جاتا ہے؛ اکال سے کال۔

(۱۰) اتصال کے لئے جیسے بیچا بیچ، جھڑا جھڑ، دھکا پیل۔

(۱۱) بطور علامت فاعلی بحالت مرکب عددی جیسے ست لڑا، چورانا۔ ترانا۔ دوپٹا۔

(۱۲) برائے علامت فاعلی وصفی جیسے: تھڑولا، بڑبولا۔

(۱۳) برائے علامت مفعولی وصفی جیسے گن کٹا۔ نکٹا۔ دل چلا۔ من چلا۔

(۱۴) برائے علامت تصغیر جیسے ٹٹوا، بٹوا، مٹھوا۔

(۱۵) علامت اسم آلہ بحالت تذکیر جیسے بنسیرا، دومنا۔ ادھیرا۔ ادھ منا جھولا، ہنڈولا۔

(۱۶) برائے اتصال تکرار کلمہ کی حالت میں وسط میں جیسے دیکھا دیکھی چلا چل۔

(۱۷) کثرت مبالغہ کے لئے جیسے مارا مارا، دوڑا دوڑا۔

(۱۸) امر کے بعد بڑھا کر حاصل مصدر کے معنیٰ دیتا ہے جیسے رگڑا، جھگڑا، لپکا۔

(۱۹) بڑاپن ظاہر کرنے کے لئے جیسے گھنٹا، مٹکا، ڈولا، کھمبا، آرا۔

(۲۰) برائے علامت تذکیر جاندار و بے جان جیسے، لڑکا گھسیارا، سونا چولھا، ٹھٹھا۔

(۲۱) برائے تسلسل وسط میں جیسے مرسلا دھار، لگاتار

(۲۲) برائے علامت تانیث (سنسکرت میں) کرشن سے کرشنا، بال سے بالا۔

(۲۳) برائے صفت مشبہ جیسے اچھا، بڑا، اندھا، کالا، گورا گھنا، سوکھا۔

(۲۴) نقل صوت کے تسلسل کے لئے تکرار لفظی میں؛ وسط میں جیسے چھنا چھن، دنادن، چھپا چھپ۔

(۲۵) علامت توصیفی جیسے جوڑا۔

(۲۶) تصغیر کے لئے جیسے بھینا، بٹیا، جوروا، گڑیا، بھیتا۔

(۲۷) تحقیر و طنز کے لئے (بحالت فاعلی) اُچکا، چھوٹا، اٹھائی گیرا۔

(۲۸) تحقیر و طنز کے لئے اسم کے بعد جیسے سسرا، میّا۔

(۲۹) علامت تانیث جیسے چڑیا، کتیا، چوہیا، گدھیا۔ (ہندی پنجابی مؤنث چڑی، کتی، چوہی، گدھی کے بعد الف کا اضافہ کرکے اردو مؤنث بنائی گئی)۔

(۳۰) اسم فاعل کی علامت جیسے راج سے راجا، بے سرا، ایک تارا دوتارا۔

(۳۱) علامت اضافت کے لئے عدد کے ساتھ جیسے پچاسا، ستّرا بہترا۔

(۳۲) زاید بھی آتا ہے جیسے آنگن سے انگنا، کنگن سے کنگنا۔

(۳۳) حذف الف ابتدا سے جیسے ادھیلا سے دھیلا، ادھیلی سے دھیلی۔

(۳۴) الف شعر میں آکر ابتدا سے ساقط ہوجاتا ہے لکھا جاتا ہے، مگر پڑھنے میں الف کی آواز نہیں نکلتی اس کو الف وصلی بھی کہتے ہیں جیسے غالب ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

(۳۵) عدد ترتیبی کی علامت کے لئے، ایک، دو، تین، چار اور چھ کے آخر میں جیسے اکا، پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، چھٹا (ان میں ہندی تصرف کے بعد یہ شکل بنی ہے) (شان صاحب نے کک کے ماقبل علامت

واحد قرار دے کر، اکا، اکائی اکہرا مثالیں لکھی ہیں، ان تینوں میں ابتدائی الف علامتی نہیں اصلی ہے۔ نیز اکا میں آخری الف علامت ترتیب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اکائی ایک سے نو تک کے مفرد اعداد کو کہتے ہیں۔ اس میں الف وسطی کو علامتی کہہ سکتے ہیں۔ اکہرا عدد ضعفی ہے جس میں ہرا علامت لگائی گئی ہے۔ ان تینوں کے اصول پر دیگر امثلہ یہ ہیں۔ اکا، دکا، دوجا، تیجا، چوکا، چھکا، ستا، اٹھا۔ اکائی، دہائی دس سے ننانوے تک کے ہندسے۔ اکہرا، دوہرا، تہرا، چوہرا۔ اسی طرح ان کا یہ بیان" حاضر یا قریب کی علامت (خصوصاً غائب یا بعید کے بالمقابل) کے اِن (اُن) اِس (اُس) اِتنا (اُتنا) ایں (آں) اِدھر (اُدھر) اِلل لذی نہ اُلل لذی" بھی بے معنی سا ہے کیونکہ ان تمام الفاظ میں الف اصلی ہے۔ صرف حرکات کی تبدیلی سے قریب و بعید کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں الف نہ علامتی ہے اور نہ اس کے سبب سے معنی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ لہذا یہ بیان بے محل ہے)۔

(۳۶) مصدر متعدی بالواسطہ اور متعدی المتعدی اور اس سے مشتق اسماء و افعال میں علامت متعدی جیسے اٹھنا سے اٹھانا۔ چلنا سے چلانا۔ کھانا سے کھلانا۔ پڑھنا سے پڑھانا (مصادر) پڑھایا، پڑھانا ہے (افعال) پڑھانے والا، پڑھا ہو (اسما) نیز متعدی بہ دو مفعول و بہ سہ مفعول میں اپنے ماقبل واو چاہتا ہے جیسے پڑھوانا، کھلوانا چلوانا۔ (شان صاحب نے اس کو فعل متعدی کی لازمی علامت قرار دیا ہے لیکن مثال نہیں دی۔ یہ متعدی کی لازمی علامت نہیں ہے کیونکہ بعض متعدی مصادر میں الف آتا ہی نہیں جیسے توڑنا، کھونا کھولنا وغیرہ۔ نیز ان کا یہ قول" نیز ان تمام مصادر میں موجود جو بذاتہ متعدی ہیں"۔ درست نہیں کیونکہ لکھنا، پڑھنا، دیکھنا وغیرہ متعدی بنفسہٖ ہیں جن میں الف کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا)۔

(۳۷) علامت ماضی: جیسے آیا، لکھا مصدر کا نا دور کرنے کے بعد۔ اگر حرف آخر کوئی حرف علت ہو تو یا کا اضافہ ورنہ صرف الف بڑھا کر ماضی بنا لیتے ہیں جیسے سویا، دیا، کھایا، لکھا، پڑھا۔ شان صاحب نے افعال معروف و مجہول کی جو تخصیص کی ہے وہ درست نہیں کیونکہ آیا، گیا، سویا، جاگا کی طرح دیکھا، بھالا، سمجھا، بوجھا بھی معروف ہی ہیں، البتہ پہلے الفاظ افعال لازم ہیں اور دوسرے متعدی۔ معروف و مجہول کی تخصیص کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی طرح اکو اللہ کا مخفف بتایا ہے اور اس کا سرناموں تعویذوں نقشوں وغیرہ پر لکھا جانا بیان کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ اللہ کا مخفف نہیں بلکہ بسم اللہ کی مخفف شکل ال ہے۔ بعض حضرات اس پر ۷۸۶ یعنی بسم اللہ کے اعداد بھی بڑھاتے ہیں اور اس طرح (ال ۷۸۶، للہ ۷۸۶) لکھتے ہیں۔

(۳۸) حروف عامل کے اثر سے یائے مجہول سے بدل جاتا ہے جیسے لڑکے نے کہا۔ کنارے پر رکھو، لڑکے سے کہو۔

(۳۹) جمع کی صورت میں جب کہ لفظ فعل لازم کے فاعل یا مبتدا کی شکل میں ہو جیسے لڑکے آئے، بوڑھے گئے، گدھے سست ہیں کتے تیز ہیں وغیرہ

(۴۰) فعل متعدی کے فاعل و مفعول کے آخر سے ساقط ہو جاتا ہے جبکہ وہ اسم جمع کی حالت میں ہو اور حرف عامل اس کے بعد آئے جیسے لڑکوں نے کہا، بوڑھوں نے سنا۔ میں نے بوڑھوں کو سلام کیا۔

(۴۱) جاندار اسما میں واقع ہو تو حالت تانیث میں یائے معروف وغیرہ سے بدل جاتا ہے جیسے بیٹا سے بیٹی، لڑکا سے لڑکی، گھسیارا سے گھسیارن

(۴۲) افعال یا علامات یا حروف میں اگر علامت مذکر کے طور پر ہو تو تانیث میں یائے معروف سے بدل جاتا ہے جیسے کا سے کی، سویا سے سوئی، میرا سے میری۔

(۴۳) کبھی اپنے ماقبل اظہار آواز کے لئے یائے مفتوح چاہتا ہے جیسے اکیاسی، بیاسی، چھیاسی۔ شان صاحب نے لکھا ہے:

"عوام کے تلفظ میں دو الفاظ کے درمیان کبھی اس کے ساتھ ی کی آواز شامل ہو جاتی ہے مگر غیر فصیح: بھول یائے، دیکھ یاؤ (بھول آئے۔ دیکھ آؤ)"۔ ان مثالوں میں یا اضافہ یقیناً غیر فصیح ہے اور یہ دہلی کے عوام کی بولی ہے۔ نیز نواح دہلی بالخصوص مظفر نگر میں یہ استعمال عام ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ الف اپنے ماقبل اظہار آواز اور روانی کے لئے "ی" چاہتا ہے اور اس کی مثالیں کافی مل سکتی ہیں۔ افعال میں ماضی کے اندر یہ عمل عام ہے جب کہ مصدر کی علامت "نا" کے ماقبل حروف علت (ا و ی) میں سے کوئی حرف بحالت سکون واقع ہو، جس کی آواز حرف ماقبل سے مل کر نکلتی ہو پس الف علامت ماضی داخل کیا جائے تو وہ اپنی آواز بغیر کسی حرف سے ملے ہوئے نہیں دے سکتا۔ اس لئے 'ی' کا اضافہ کر کے ظاہر کرتے ہیں جیسے سونا سے سویا، جگانا سے جگایا، دینا سے دیا وغیرہ۔ اکیاسی، بیاسی، چھیاسی میں بھی یہی عمل جاری ہوا ہے۔ اکیانوے، بیانوے، چھیانوے

(باقی صفحہ ۲۳۶ پر)

مہران[1] جوں موجوں

(سُرِ سسّی کے جستہ جستہ پارے)

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

مترجم: عاصم حسین

ہم اس شمارے میں ایک مبسوط مضمون شائع کر رہے ہیں جس میں شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں سُر کی ماہیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سُر ان کے یہاں نثر بھی ہے اور صنف بھی یعنی بیک وقت موسیقی بھی اور شاعری بھی۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ غنائیہ جسے بے قاعدہ اوڈ (IRREGULAR ODE) کہہ سکتے ہیں اور ڈرامہ کا ایسا منفرد مجموعہ ہے جس میں تنوع اور لچک کی بے حد گنجائش ہے۔ اکثر غنائیے ایک طرح کے "ڈرامائی مونولاگ" ہیں اور کہیں شاعر خود یا سامعین کورس کا کردار ادا کرتے ہیں۔ شاعر کسی وقت کوئی دھن یا موضوع بڑی بے تکلفی سے چھیڑ سکتا ہے، یا داستان کی جھلکیاں پیش کر سکتا ہے لیکن اس طرح کہ داستان پھر بھی نظروں سے اوجھل رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صنف بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ اور اگر ہم اسے اپنائیں تو اسکے امکانات بہت وسیع ہیں۔ (مدیر)

کر آہ و فغاں، کر آہ و فغاں، مت روک زباں، مت روک زباں[2]
اونٹوں کی قطاروں میں کھوئی، کہیں بھول نہ جائیں تجھے سیّاں
بیکار یونہی بیٹھی ہے کیوں؟
کیا تو نے کبھی یہ پوچھا ہے کس اور گئے ہیں پردیسی؟
کس سمت سدھارے یہ سارے، یہ ہوتؔ کے پیارے ہمراہی؟
پھر وصل کا کیوں ہے یہ ارماں؟
بیٹھی ہے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے، کیا طور یہی ہیں پریمی کے؟
جس دل میں لگن ہو پیارے کی بیٹھا رہے اتنی غفلت سے!
ہاں سارے بندھن توڑ بھی دے
ہیں دور وہ تجھ سے، پنّوں سے، وابستہ جو بھنبھور سے ہیں
کیا ان سے تیرا لینا ہے، جو دور ترے چت چور سے ہیں
ہے پی کے ہاتھ ترا درماں
ہمسایوں کو معلوم نہیں دن بن گئی تیری رات حزیں
تو اپنے من میں جانتی ہے، پریتم سے ہے روشن تیری جبیں
تری آن پیا کے دم سے ہے
بلوچوں سے کاری زخم لگا، سینے میں دل صد چاک ہوا
دن رات سلگتے جیون سے سب تیرا تن من خاک ہوا
اک قہر تھا تیرا سوزِ نہاں

سسّی تھی یہاں، سورج وہاں دونوں ہوئے دست بدست رواں
دونوں کے لب تھے گرمِ فغاں
اے کیچ کے باسیو آ جاؤ اس بے چاری کو بہلاؤ
جسکے دل میں کتنے گھاؤ
میں کون تمہاری داسی ہوں میں پی درشن کی پیاسی ہوں
ٹکڑوں پہ پلی اک باسی ہوں
ہاں آؤ دولئے غم لاؤ کچھ چارۂ وحشت فرماؤ
تسکین کا مژدہ پہنچاؤ

★

آنکھیں تمہاری دیکھتیں چھب گر مرے دلدار کی
جس طرح اس کی دلبری دیکھی ہے میری آنکھ نے
تم کہتیں ہاں ہاں جاؤ بھی ڈھونڈو اسے ڈھونڈا کیے
اور خاک لگتیں چھاننے خود بھی ہر اک کہسار کی

گر دیکھ پاتیں ناریاں مکھڑا مرے دلدار کا
جیسے کہ آنکھوں نے مری دیکھا ہے مکھ جادو بھرا
وہ منہ چھپا کر باہوں میں فریاد کرتیں برملا
تھمتا نہ .. سلِ خوں کبھی اُن چشم ہائے زار کا

---

[1] دریائے سندھ [2] محبوب یعنی پنّوں

ہاں لب رہیں محوِ فغاں فریاد کر فریاد کر
تا لذّتِ غم بھول کر آسودہ تیرا دل نہ ہو
اِن اشک ہائے آب پر اے بے خبر مائل نہ ہو
آنکھوں سے اشکِ خوں بہا ہر رہ قدم پہ راہ بھر

ہے یک جہاں تاب و تواں تم میں نہاں صبر و رضا
پہنچا دو ساجن تک مجھے، پہنچا دو پہنچا دو مجھے
جس کو ترستی ہے نگہ وہ روپ دکھلا دو مجھے
روکے زمانہ جس قدر، ہو اتنی ہی ہمت سوا

دنیا تو اپنے عیش میں دن رات ہے کھوئی ہوئی
اس کو مرے من کی لگی، دکھ درد کی پروا ہی کیا
چھوڑا نہیں سوتے ہوئے جو نیند میں سرشار تھا
جلدی بھی چل، جلدی بھی چل پیچھے سجن کے باوری

ہاں ڈھونڈ لے ہاں ڈھونڈ لے آری کو اپنے ڈھونڈ لے
اٹھ پار کر بھنبھور کی ساری حدیں، کیوں کھو گئی؛
جو قافلے کے ساتھ ہیں ان کو نہیں خدشہ کوئی
میری طرح برباد ہو جو کھیلتا ہے پریت سے

کوئی نہیں ساتھن مری جو دکھ میں میرا ساتھ دے
مل مل کے ہم روئیں بہم، مل مل کے فریادیں کریں
کوئی شریکِ غم نہیں، کوئی نہیں جو دم بھرے
لے جا رہے ہیں قبر تک یہ غم مرے، یہ غم مرے!

★

سید: سید کو اگر پوچھو تو کہے، خوش رہنا اس کا لیکھ نہ تھا

سسی: میں غم کے پیڑ کی کونپل تھی شاید تھا یہی مقسوم مرا
غم ہم سب کی تقدیر میں ہے، غم ڈھیر دل غم، انبار دل غم
پر میرے غم کے ہیں طور نئے، مرے ساتھ رہے دن رات یہ غم
مرے سر پہ غموں کا بوجھ لدا، میں اسکو اٹھائے پھرتی ہوں
سب خوشیاں چھوڑ گئیں مجھ کو، یونہی عمر بتائے پھرتی ہوں

مرا میت بیاری، وہ مجھ کو صحراؤں میں دوڑائے پھرے
مرے تن کو تھکن سے چور کرے مری ہڈیوں کو چٹخائے پھرے
وہ دیس سے کر دے بدیس مجھے، نت نئے دیار دکھائے مجھے
مرے کندھے پہ کپڑے پارہ ہوئے او ننگے سر سے پھرائے مجھے
اے بہنو، کہو ہاں تمہیں کہو بھنبھور میں کیا ہے میرے لئے
اے ماں اس نگری کو تج کر مجھے راہ یہ فوراً ڈال بھی دے
جب میں اور وہ سنمکھ ہوں گے مرے دل میں بسے گی ہزار خوشی
ہاں ہاں اے ماں، اے سکھ ساجھی، سن بات مری، سن بات مری!

★

سید: اے پریم کی متواری! تن من ہے بھسم جس کا
پنّوں سے لگا کر دل مرنے کا کیا سودا
وہ محلوں میں خوشیوں سے بھرپور ترا جیون
شعلوں پہ جلا ڈالا اور راکھ ہوا تن من
وہ لوگ عدو تھے جو محبوب کے ساتھ آئے
سر پر ترے جل دے کر طوفانِ بلا لائے
پھر بھی نہ ذرا غم کھا، کب تک وہ رلائیں گے
وہ خوشیوں کے دور اک دن پھر لوٹ کے آئیں گے
بالم ترا آئے گا جوں رن میں سوار آئے
یا فصلِ بہاراں میں سرمست ہزار آئے
ساجن کے بغیر اس کو بھنبھور سے کیا لہنا
پردیس ہے یہ اس کو، بنتا نہیں گھر کہنا
اس راہ چلی جب وہ جس رہ سے گئے ڈاچی
بھنبھور مٹا دل سے، بھنبھور کو وہ بھولی
یہ راہ کٹھن یا رب! یہ حالِ خراب اس کا
اے مونسِ بے یاراں، آ اِس کی مدد کو آ

★

سید: کیسے راجن کا دیکھے وہ مکھڑا
تھا یہی اس برہن کا دکھڑا
پریم سے ہار تھک کر گر ہی وہ
ایسی لاگی کہ بے سدھ ہوئی وہ

★

"ایک نواپرداز یگانہ"

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

وہ حقیقتہً ایک نواپرداز یگانہ تھے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ جنہیں ان کے عقیدت مند "لال لطیف" کے پیار بھرے نام سے یاد کرتے ہیں - ایک مہتم بالشان شاعر، ایک مہتم بالشان مغنی۔ عظیم و زندۂ جاوید! مگر اس میں شبہ نہیں کہ شاعر عظیم کی حیثیت سے انہیں جو غیر معمولی شہرت و قبولیت حاصل ہوئی ہے اس نے لال لطیف، بہ حیثیت مغنی و موسیقار کی عظمت کو گھٹا دیا ہے۔ درحقیقت ان کے فن میں شاعری اور موسیقی دونوں اس طرح یک جان دو قالب بن گئی ہیں کہ ان کی نظمیں محض کلام موزوں نہیں رہیں بلکہ موسیقی کے بول انہیں الفاظ کے پردے میں عین موسیقی بن گئی ہیں۔ شعر و نغمہ کی اس دوگونہ داخلی رو کے علاوہ، جو اُن کے کلام معجز نظام میں مضمر آہنگ کے طور پر کارفرما ہے۔ نہ صرف ان کے نقش شاعری بلکہ موسیقی کے اُس مشرب میں بھی جو انہوں نے یادگار چھوڑا، کافی خارجی شہادت موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ بھٹائیؒ موسیقی کے ایک نئے سلسلۂ ایک نئی روایت کے بانی تھے۔ جب سے امیر خسروؒ نے ہندوستانی موسیقی میں نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے جو انقلاب برپا کیا، شاہ بھٹائیؒ موسیقی کی دنیا میں ایک نئی نشاۃ الثانیہ کے مہتم بالشان تصور میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے شاہ بھٹائیؒ نے موسیقی کو ترقی دینے میں کیا حصہ لیا، ہمیں اس فن میں اس نئی تحریک پر نظر ڈالنی پڑے گی جو اُن کے عظیم پیشرو، امیر خسروؒ (۱۲۵۵-۱۳۵۰ء) نے جاری کی تھی۔

کافی تحریری مواد اور ماہرانہ تحقیق کے فقدان کی وجہ سے امیر خسروؒ نے نئی موسیقی کی روایت کی داغ بیل ڈالنے میں جو کام کیا ہے، اس کا کما حقہٗ مطالعہ نہیں کیا جاسکا اور نہ اس کا صحیح اندازہ ہی کیا جاسکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے عربی و ایرانی موسیقی اور مقامی ہندوستانی موسیقی کو اس طرح آمیز کیا کہ ایک نئی قومی موسیقی ظہور میں آئی۔ محض نظری بحثیں کرنے کی بجائے انہوں نے سروں، تالوں، لے، راگنیوں اور ساز کاری کے نئے طریقوں کے مظاہرے کئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی ہندوستانی موسیقی بہت جلد ایک حقیقی فن بن گئی۔ ایک زندہ فن جو واقعی برتا جاتا تھا نہ کہ مذہبی پاٹھ جو صرف عبادت خانوں کی چار دیواری تک محدود ہو یا خالی خولی علمی نظریوں کی طرح پستکوں میں بند ہو۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ امیر خسروؒ نے جو دونوں قسم کے سنگیت میں سنجوگ پیدا کیا تھا اس کا تعلق زیادہ تر ٹکسالی فن ہی سے تھا۔ انہوں نے دونوں کلاسیکی سنگیتوں کے بنیادی عناصر کی نئے سرے سے تشریح اور تنظیم و ترتیب کی۔ جہاں تک کلاسیکل فن کے دائرہ سے باہر عوامی فن کا تعلق ہے امیر خسروؒ نے صرف قوالی کی صنف ایجاد کی جس کا مقصد نعتیہ اور مذہبی قسم کے گیت گانا تھا۔

امیر خسروؒ سے کوئی چار سو سال بعد شاہ بھٹائی میدان میں آئے۔ انہی کی طرح وہ ایک بہت بڑے شاعر بھی تھے اور صوفی بھی۔ وہ ایک محب وطن تھے جو عوام کی زبان، سندھی میں لکھنا پسند کرتے تھے اگرچہ درباری زبان فارسی تھی۔ امیر خسروؒ زیادہ تر فارسی ہی کے شاعر تھے گو انہوں نے بھاشا بھی استعمال کی۔ جو عوام کی زبان تھی۔ وہ فی الواقع مقامی الفاظ برتنے میں بڑا لطف محسوس کرتے تھے۔ امیر خسرو کی طرح شاہ بھٹائی نے بھی موسیقی میں ایک نئی تحریک کی بنیاد رکھی۔

معلوم ہوتا ہے شاہ لطیف کو موسیقی کی ہندوستانی روایت، اس کی ابتدا اور بعدہٗ نشوونما کا بخوبی علم تھا۔ سندھ کا قدیم پایۂ تخت ٹھٹھہ، مغلیہ عہد حکومت کے شروع ہی سے موسیقی اور مغنیوں کا

س زمانے میں جب مرکزی حکومت کی عنان اکبر کے ہاتھ میں تھی
ر سندھ میں ترخانوں کی حکومت تھی، موسیقی کا ٹھٹھہ میں اس قدر رواج
ھا کہ ایک مستند روایت کے قول کے مطابق "گھر گھر میٹھی دھنیں اور
ھولک کی تھاپیں سنائی دیتی تھیں"۔ یہ سلسلہ شاہ بھٹائی کے زمانے
ک بھی جاری رہا۔ اور نواب ٹھٹھہ کے دربار میں موسیقی کے نئے
وق اور اسالیب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی جن میں دہلی
ی نئی طرحیں بھی شامل تھیں۔ امیر خسروؒ کے عہد سے لے کر مغلوں کے
عہد تک ہندوستانی موسیقی مسلسل نشو و نما کے باعث انتہائے کمال
و پہنچ چکی تھی۔ اور انہی کے زوال کے ساتھ اس کے زوال کا آغاز
بھی ہوا۔ شاہ لطیف نے محمد شاہ (۱۷۱۹ - ۴۸ء) کا عہد دیکھا
ھا جس کے دربار میں شُستہ و رفتہ اور زیادہ پُر تکلف انداز نے
ابتدائی زیادہ توانا اور قوی اسالیب کی جگہ لے لی تھی۔ یہاں تک کہ
قوالی کی صنف میں بھی یکسانیت کا غلبہ نظر آتا تھا کیونکہ اس نے
نئے جوہر اور تیور پیدا کرنے بند کر دیے تھے۔

یہ صورتِ حال تھی جب شاہ لطیف نے موسیقی میں ایک
نئی تحریک کا آغاز کیا جس کے دو بڑے مقصد تھے (۱) عربی و
ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج کی ابتدائی بنیادوں پر
از سرِ نو زور دیا جائے اور ابتدائی راگوں کی طرف رجوع کیا جائے
جو اس کی توانائی اور نشو و نما کا باعث ہوئے تھے۔ نیز بعد کی اس
پُر تصنع حاشیہ آرائی کو ترک کر دیا جائے جس نے اس کی بے ساختگی
اور نشو و نما کا کھوج لگا دیا تھا۔ (۲) کلاسیکی روایت میں جو بالکل
بے جان ہو چکی تھی، نئی روح پھونکی جائے۔ اس طرح نہیں کہ
اس میں باہر سے نئی دُھنیں داخل کی جائیں بلکہ عوامی موسیقی،
لوگوں کی اپنی موسیقی ۔ کے نئے سرچشمہ سے نئی چیزوں کا سراغ لگایا
جائے۔ اس قسم کے احیائے ثانیہ کے لئے شاہ بھٹائی نے بھٹ شاہ
میں ۱۷۴۲ء کے لگ بھگ جب وہ وہاں مستقلاً قیام پذیر ہوئے،
موسیقی کے ایک مستقل ادارے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ایک نیا
ساز ایجاد کیا، نئے انداز میں گانے کے لئے اپنے بعض پیروؤں
کو تربیت دی، اپنی اکثر نظموں کو نئے موضوعات یا ابواب کے
تحت 'سروں' میں ترتیب دیا اور ہر دُھن کو اس راگنی سے
مخصوص کیا جس میں اس کا گایا جانا مقصود تھا۔ موسیقی سے

سکون و آرام کے عالم میں پورا پورا لطف اٹھانے کے لئے رات کا
وقت نئے سنگیت کی مشق و ممارست کے لئے منتخب کیا گیا عشاء
اور فجر کی نمازوں کے درمیان۔ شاہ بھٹائی کی زندگی کے اگلے دس
سالوں میں نئی موسیقی اور اس کے گانے بجانے کا انداز مکمل ہوا
اور ان کے خلیفۂ اول تمر کی زیرِ قیادت موسیقاروں کا ایک تربیت
یافتہ حلقہ تیار ہوا جنہیں آخر کار یہ ادارہ سپرد کر دیا گیا۔ شاہ کی
وفات (۱۷۵۲ء) کے بعد جمعہ سے پہلے کی رات شاہ کے راگ
کی رات مقرر ہوئی۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس
ادارے کا سارے علاقے میں موسیقی کے احیا پر بڑا اثر ہوا۔
چنانچہ علاقائی موسیقی پر اس ادارے کا اثر اور اس کا مسلسل
جاری رہنا، ہمیں اس کے مطالعے و تجزیہ اور مقصد اور مضمرات
کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

سب سے پہلے شاہ نے نئی موسیقی کے لئے ایک نیا ساز
ایجاد کیا اور اس کا نام "طنبور" رکھا۔ اس ساز کا انتخاب موسیقی
کی ہندو مسلم روایت کے تاریخی تسلسل کے ساتھ موافقت رکھتا ہے
کیونکہ یہ ساز پہلے پہل مصر میں ایجاد ہوا تھا اور بعد میں اسے
مشرقِ وسطیٰ اور ایران میں اختیار کیا گیا جہاں سے یہ برصغیر
میں داخل ہوا۔ ابتدائی عرب مغنی جو ساز استعمال کرتے تھے ان کے
چار تار تھے۔ اسی طرح برصغیر کا روایتی ساز بھی "چوتار" کہلایا۔
شاہ نے اپنے نئے ساز کو پنج تار بنایا۔

جہاں تک سروں کی ترتیب کا تعلق ہے، اس کے
پانچ تاروں کو یوں چھیڑا جاتا تھا ــــ ایک طرف کے بیرونی تار
کو مدھ سپتک کی پنچم پر۔ اس تار کو زبان کہتے تھے۔ یعنی نئے
طنبور کی روحِ رواں، اس کی زبان جو دُھنوں کو ادا کرتی ہے۔
اس طرح کھرج کی بجائے پنچم بنیادی سُر قرار پایا۔ یہ اصول
ابتدائی عربی و ایرانی روایت کے مطابق تھا۔ چنانچہ آج بھی
عربی و ایرانی دھنیں زیادہ اونچی ٹیپ پر گائی جاتی ہیں۔ طنبور
کے باقی چار تار دوسری طرف سے چل کر یوں چھیڑے جاتے تھے،
پہلا تار جو بلوچی دنبورہ کے مطابق غور کہلاتا ہے۔ مندر
سپتک کے سا پر، دوسرا اور تیسرا یعنی جوڑیوں مدھ سپتک"
کے سا پر اور چوتھا ٹیپ جو زبان کے ساتھ واقع ہے، تار سپتک کے

تھا پر۔

دوسرے، طنبورہ کا مقصد یہ بھی تھا کہ یہ دف یا ڈھولک کا کام دے۔ جب گانا شروع ہوتا ہے تو نئے سُر یا باب کی دُھن شروع ہی میں الاپی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد جب گایا جانے والا حصہ، وائی شروع ہوتا ہے تو طنبورہ پر دائیں ہاتھ سے ضربیں تال پیدا کرتی ہیں۔ شاہ یہ چاہتے تھے کہ تال کی پیچیدہ تکنیک کو آسان بنایا جائے۔ اس لئے انہوں نے صرف دو بنیادی تالیں اختیار کیں۔ ڈیڑھی اور دو تالی۔ جن کی سنگت سے ساری دھنیں گائی جاتی ہیں۔ شاہ نے طنبورہ پر ایک سادہ قسم کی لَے ایجاد کی جسے چھیڑ کہتے ہیں۔ اس میں سُروں یا ابواب کے تحت لکھی ہوئی وائیاں کسی رسمی تال کی سنگت کے بغیر گائی جاتیں۔ اس طرح کی گائکی میں الاپ کی سنگت کسی تال کی ضربوں سے نہ رہی بلکہ دُھن کی اپنی مخصوص لَے سے وابستہ ہو گئی۔ اس سے ہماری توجہ شاہ کی گائکی کی طرف منعطف ہوتی ہے۔

شاہ کے قائم کردہ ادارے میں موسیقی کا جو اسلوب پیدا ہوا، اس کا جائزہ لینے کے لئے کافی تحقیق کی ضرورت ہے۔ شاہ کے کلیات میں، جو "شاہ جو رسالو" کے نام سے مشہور ہے، جو راگ راگنیاں درج ہیں، یا شاہ جی کے راگ کی حیثیت سے آج بھی گائی جا رہی ہیں، ان سے ذیل کے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:

(۱) موسیقی کے اس نئے ادارے میں کل ۳۶ راگ راگنیاں نئے انداز میں گائے جانے کے لئے منتخب ہوئیں۔ ان میں سے ۳۰ صرف شاہ صاحب کا کلام گانے کے لئے تھیں اور ۶ دوسروں کے کلام کے لئے۔ اس طرح کل ۳۶ راگنیوں کا منتخب کرنا ظاہر کرتا ہے کہ شاہ لطیف کلاسیکی موسیقی کی ۶ راگوں اور ۳۶ راگنیوں کی روایت کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

(۲) ابتدائی عربی و ایرانی روایت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ۲ راگ "یمن" اور "حسینی" بھی ان ۳۶ راگ راگنیوں میں شامل کئے گئے۔ "حسینی" عربی راگ داری کے ۱۲ مقامات یا راگوں میں شامل ہے۔ یہی کیفیت یمن کی بھی ہے۔ یہی دونوں راگ، جزواً یا کلاً امیر خسرو نے بھی دوسرے دیسی راگوں کے ساتھ ملا کر نئی راگنیاں بنانے کے لئے استعمال کئے تھے۔ ایمن اور ایمن کلیان دونوں یمن سے اخذ کئے گئے۔ اسی طرح حسینی راگوں کا میل دیسی راگوں سے ہوا۔ امیر خسرو کی انہی مخلوط راگ راگنیوں کو استعمال کرنے کے بعد استادوں نے حسینی کانڑا اور حسینی ٹوڈی ایجاد کی۔ مگر شاہ بھٹائی پہلے شخص ہیں جنہوں نے دونوں راگوں کے اصلی نام یمن اور حسینی بیان کئے۔ اور انہیں اپنے چیدہ راگ راگنیوں کی فہرست میں شامل کیا۔

(۳) باقی ۳۴ راگنیوں میں سے شاہ نے ۱۷ ہندوستانی کلاسیکی سنگیت سے حاصل کیں۔ اور ۱۷ عوامی سنگیت سے۔ کلاسیکی سنگیت سے چنے ہوئے راگ راگنیاں حسب ذیل تھیں:۔

۱۔ کلیان ۲۔ کھمبات (کھماج یا کھمباوتی) ۳۔ سری راگ ۴۔ سوہنی۔ ۵۔ سارنگ ۶۔ کدارا۔ ۷۔ دیسی ۸۔ سورٹھ۔ ۹۔ بروا ہندی (کلاسیکی) ۱۰۔ بروا سندھی ۱۱۔ رام کلی۔ ۱۲۔ بلاولی ۱۳۔ آسا ۱۴۔ دھناسری ۱۵۔ پوربی ۱۶۔ کامود ۱۷۔ بسنت۔

شاہ کے اسلوب موسیقی میں ان راگ راگنیوں کا شامل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے کلیان۔ بلاول اور کھمبات (کھماج) کو اپنے کلاسیکی یعنی "شدھ" روپ میں برقرار رکھا کیونکہ ان تینوں کا بنیادی ٹھاٹھ ہے اور اس گروہ کی بعض اور راگنیاں بھی انہی میں شامل ہیں۔ لیکن کلاسیکی سنگیت کی باقی ۱۴ راگنیاں اس شکل میں برقرار رکھی گئیں جن میں عوام ان کو برتتے تھے۔ لہٰذا شاہ کے سنگیت میں ان کا جو ڈھنگ ہے وہ ضروری نہیں کلاسیکی سنگیت کے مطابق ہو۔

۴ ذیل کی ۱۷ راگنیاں عوامی موسیقی سے ماخوذ ہیں:

۱۔ سامندی (ملاحوں کا گیت) ۲۔ آبری (جوئے بے آب کا گیت) ۳۔ معذور (معذوروں کا گیت) ۴۔ کوہیاری (پہاڑی علاقوں کا گیت) ۵۔ رانو ۶۔ کھاہوڑی (بنجاروں کا گیت) ۷۔ رِپ (عشق کے بارگراں کا گیت) ۸ لیلا (لیلا [illegible] کے رومان کا گیت) ۹۔ داہر (مناجاتی گیت) ۱۰۔ کپاتی (جولاہہ لڑکی کا گیت) ۱۱۔ پربھاتی (صبح کا گیت) ۱۲۔ کا[illegible] (ماہی گیروں کا گیت) ۱۳۔ سندھ کدارو (شکاری جانور شیر اور عقاب کا گیت) ۱۴۔ مارُوی (عمر ماروی کے رومان کا گیت) ۱۵۔ ڈھول ماروی (ڈھول مارو کے رومان کا گیت

لال لطیف

مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اسقدر
بش مثرگاں سے ہے چشم تماشا کوحذر ،،
(روضہ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح)

شاہ کے چہیتے عوام (عرس کے میلے پر ھجوم)

ی ، جن کی زندگی کے گیت ''لطیف،، گاتا رہا
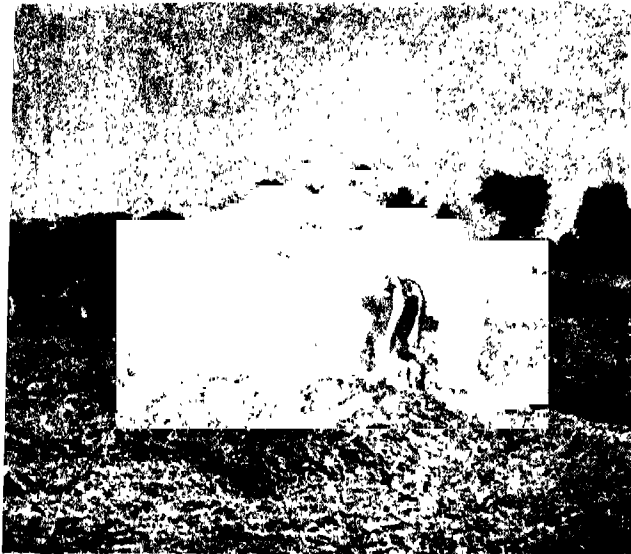
کھیت جاگ اٹھے !

''لطیف،، جی ''لطیف چے تووٹ کمی کانہ،،
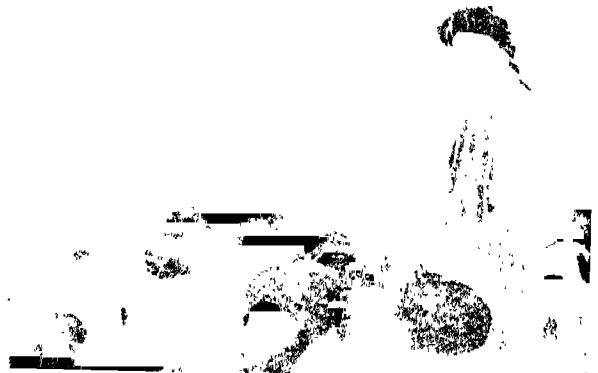
نقش ہائے رنگ رنگ

(زبیدہ آغا)
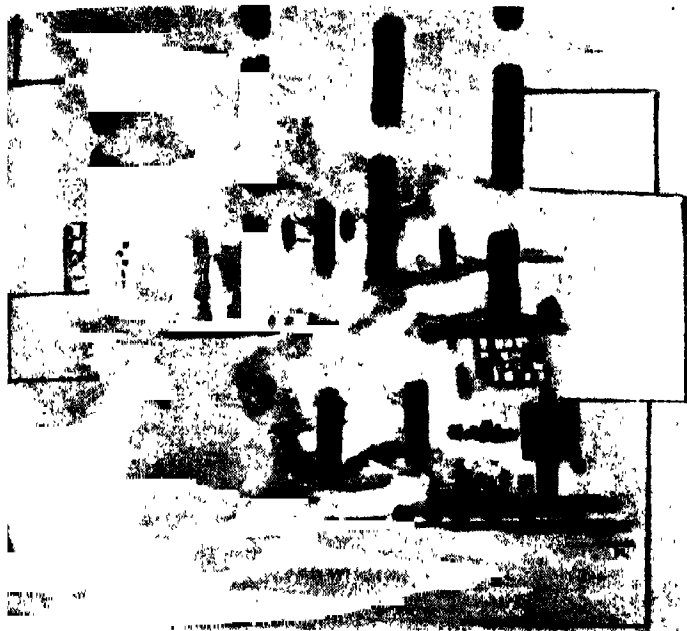
مستکی گھوڑ

گوٹ

اڑان

جاگا ہے سویرا !

۱۶۔ ہیر (ہیر رانجھا کے رومان کا گیت) ۱۷۔ کریال (کالی مرغابی یا سیہ پیرہن شکاری کا گیت ؟)

ان متعدد راگ راگنیوں کے ناموں اور ان کی ترتیب و تالیف کا بسیط جائزہ ابھی باقی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کی اصلی وضع اور اہمیت کیا ہے۔ ان میں سے بعض ضائع ہو چکی ہیں کیونکہ "شاہ جی کے سنگیت" کے تحت پچھلے دیڑھ سو سال میں کسی وقت ان کا رواج نہ رہا۔ شاہ جی کے ادارے سے باہر جس واحد راگنی کا سراغ میں لگا سکا ہوں وہ "معذور" ہے جو علاقہ لس بیلا کی مقامی راگنی ہے اور وہاں آج بھی بے حد مقبول ہے۔

شاہ جی کے سنگیت میں جو چیدہ راگ راگنیاں شامل ہیں ان کا انداز پُر معنی بھی ہے اور خیال افروز بھی۔ عوام کے ہر دلعزیز دیسی سنگیت سے اتنے ہی راگ راگنیاں چننا جتنی کلاسیکی ہندوستانی سنگیت سے، ظاہر کرتا ہے کہ شاہ جی عوامی سنگیت کا درجہ بلند کرنا اور اس کے لامحدود اور تازہ بہ تازہ نو بنو ذرائع کو کلاسیکی روایت میں نئی روح پھونکنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ جو تکنیکی گُرُوں اور ظاہر پرستی کے غلبہ کی وجہ سے بالکل بے جان ہو چکا تھا اور عوام کے لئے اس میں بالعموم کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

شاہ لطیف کے اس نئے سنگیت کی روایت نے قدیم سندھ میں موسیقی کی نشو و نما پر زبردست اثر ڈالا۔ کلاسیکی راگ راگنیوں میں سے کلیان، سارنگ، کدارو، سورٹھ، آسا، بلاول، دھناسری اور بسنت سارے علاقے میں مقبول ہوئے۔ دوسری طرف اس قسم کی عوامی راگنیاں جیسے کوہیاری، رانو، ڈاہر اور پربھاتی، جن کا شروع ہی سے ایک مقامی درجہ اور اہمیت تھی، بہت مقبول ہوئیں اور سارے ملک میں گائی جانے لگیں۔ موجودہ زمانے میں ریڈیو پاکستان کے ذریعہ کوہیاری اور رانو کو ساری قوم میں قبول عام حاصل ہوا ہے۔

آخر میں شاہ جی کے ایک اور اہم اقدام کا ذکر بھی لازم ہے۔ جہاں تک راگ راگنیوں کے گانے کا تعلق ہے شاہ صاحب نے اکیلے گانے کو چھوڑ کر سنگت کو رواج دیا۔ اس سلسلہ میں سنگت کے پانچ چھ آدمیوں کا کام یہ قرار پایا: ایک مُکھی جس کی دوسرے پیروی کریں۔ جوں جوں وائی گاتے

ہماری قومی شاعری کے نئے تیور — بقیہ صفحہ ۱۵

ترچھی ٹیڑھی کرنوں کے آپس میں خلا ملا سے جو نقشہ پیدا ہوتا ہے اس کی شبیہ اسی سے ہو سکتی تھی کہ تا حد نگاہ ہزاروں پریمی ایک دوسرے کے گلے میں گوری گوری باہیں ڈالے نظر آئیں جیسے بعض اوقات پردۂ سیمیں پر ایک ہی خوبصورت چہرے کے ہزاروں عکس دکھائی دیتے ہیں۔ "موہنی رت" سے موہنی صورتوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہی گُر کنواری کنواری میں بھی برتا گیا ہے۔ خود کلیاں بھی کنواری کنواری ہیں اور ان سے مہ پیکر دوشیزاؤں کے جھرمٹ کا بھی تصور پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے کی زبان کتنی پیاری ہے کامنی کامنی میں پھر وہی کائیاں پن جس کا سارے بند میں التزام کیا گیا ہے۔ کامنی کامنی سے ذہن خود بخود البیلی نازنینوں کی طرف جاتا ہے۔ اور کامنی کامنی بوٹیوں کا یہ بڑا حسین تصور پیش کیا گیا ہے کہ ان کے جھنڈ کے جھنڈ یوں کھیتوں سے ابھر رہے ہیں جیسے وہ خوبصورت ناریاں ہوں۔ پھر بعض فلموں میں پیش کیا ہوا وہ دلآویز نقشہ بھی جس میں خوبصورت کھکھلاتی حسیناؤں کے جھرمٹ کے جھرمٹ کھیتوں سے یک بیک اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خود بوٹیوں کے پیراہن بھی لاچہ لاچہ ہیں اور ان نازنینوں کے بھی۔ اور ان کے براق، شفاف آنچلوں کے لئے 'شیشہ' سے بہتر اور کیا لفظ ہو گا — پھر "ساری ساری" کے ساتھ، جن کے "حسن شیشہ ساز" سے کون صاحب ذوق شناسا نہیں! یہ نرالا مشاہدہ ایک عورت ہی کی نگاہ کر سکتی تھی جس کی دنیا ہی لاچے اور شیشہ جارجٹ کی دنیا ہے!

یہ کیفیت، یہ جذبہ، یہ ربودگی، یہ گھن گرج، یہ طنطنہ، یہ سادگی و پرکاری بلاشبہ ہماری شاعری میں ایک سنہری روپہلی باب کا اضافہ ہے۔ جس سے فکر و فن کے لئے نئی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ خبر نہیں ان راہوں پر چل کر آگے کیا کیا جلوے فردوس نگاہ بنیں۔ شاعرہ کی طرح اردو کے پرستاروں کی بھی یہی کیفیت ہے کہ:

یارب! ہزاروں دعائیں مری اور میری ہزاروں امیدیں بھی
مرے دل میں ہزاروں سنہری محل اور ان کی سنہری کلیدیں بھی
مجھے پردۂ غیب سے شام و سحر جاں بخش ہزاروں نویدیں بھی
فیضانِ خدائے پاک سے ہیں ہم کو ہزاروں عیدیں بھی

★

ڈوبتا سورج

عنایت اللہ

سورج غروب ہونے میں ذرا سی دیر باقی تھی۔

اس نے اپنے دومنزلہ مکان کی دوسری منزل کی چوتھی سیڑھی پہ پاؤں رکھا تو اسے شدت سے محسوس ہوا کہ اس کے جسم سے عمر کے کئی سال وقت سے پہلے ہی چوس لئے گئے ہیں۔ کمر میں ہلکا ہلکا درد تو عمر کے پچاسویں برس میں ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں عمر بھر کا ساتھی بن کے آبیٹھا تھا۔ لیکن آج سیڑھیاں چڑھتے اس نے کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس کی۔ دو ہی مہینے گذرے اس نے اپنی تیسری بیوی کو جس کی عمر ابھی بمشکل اکیس برس تھی، کہا تھا کہ ساٹھ برس بھی بھلا کوئی عمر ہوتی ہے، بڑھاپا تو ستر برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ دو مہینے پہلے تک وہ کس قدر مطمئن اور مسرور تھا۔ ساٹھ سالہ پرانا جسم یوں تھا جیسے ابھی ابھی جوانی کا آغاز ختم ہوا ہے۔ ولائتی وسکی نے اس کے دل میں بڑھاپے کا احساس اور خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہونے دیا تھا لیکن گذشتہ دو مہینوں میں ایسی ایسی آندھیاں چلیں کہ اس کی جوانی (یا فریب جوانی) اطمینان، صحت، سکون اور جسم کی رہی سہی توتیں بھی اڑا لے گئیں۔ وہ اسقدر شکست خوردہ تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں اس کا جوان بیٹا دور پردیس میں جنگ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا تو اس نے یہ صدمہ خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا تھا۔ پھر اس کی بیٹی کو اس کے خاوند نے ایسے الزام میں طلاق دے دی تھی جسے سن کر کسی بیٹی کا باپ گاؤں برادری میں سر اونچا کر کے بیٹھ نہیں سکتا لیکن اس کا سر اونچا ہی رہا تھا۔ دو تین برس پہلے وہ الیکشن میں شکست اور چالیس ہزار روپے کے نقصان کو ٹھنڈے پانی کی طرح پی گیا تھا۔ اس نے کیا کیا صدمے برداشت نہیں کئے تھے لیکن اس نئے صدمے نے اسے اس قدر نحیف کر دیا تھا کہ ٹانگیں دو سیڑھیاں چڑھنے سے بھی جواب دے رہی تھیں۔ اس نے دل میں درد کی ٹیس سی محسوس کی اور بمشکل چودہ سیڑھیاں چڑھ کے دوسری منزل کی کھلی چھت پہ پہنچ گیا۔

اینٹوں کا یہ سفید مکان بہت اونچا تھا۔ اس نے چھوٹا ٹے کی طرف فصیل پر ہاتھ رکھ کر نیچے دیکھا۔ اس دومنزلہ قلعہ نما مکان کے سامنے مٹی کے جھونپڑے کچھ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے زلزلے کے جھٹکوں میں ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہوں۔ اس قدر بلندی سے یہ مکان اصلی ہیئت سے کہیں زیادہ چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ مکانوں کی یہ پستی اسے بلندی اور برتری کے نشے سے سرشار کیا کرتی تھی۔ اس بلندی سے ہر گھر کا آنگن صاف دکھائی دیتا تھا۔ اور ان گھروں میں کھیلتے، روتے، ایک دوسرے کو فحش گالیاں دیتے، ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچے اسے امارت اور شہنشاہی کا احساس دلایا کرتے تھے۔ وہ اکثر دوسری منزل کی چھت پر کھڑا ہو کر ان گھروں کو دیکھا کرتا تھا۔ یہ گاؤں اور اس سے آگے ایک اور گاؤں اس کی اپنی رعایا تھی جہاں اس کا اپنا قانون چلا کرتا تھا۔ آج غروب آفتاب سے ذرا پہلے اس نے فصیل سے جھک کر ان گھروں کو اس طرح دیکھنا شروع کر دیا جیسے انہیں اور ان کے نیم فاقہ کش مکینوں کو ذرا قریب سے دیکھنا چاہتا ہو۔

ان گھروں کی ہر شے، بغیر کواڑوں کے دروازے، اپلوں میں ڈھکی چھپی دیواریں اور ان دیواروں میں رہنے والے انسان بزبان خاموشی پکار پکار کر کہہ رہے تھے "ہم بہت غریب ہیں۔ ہم مزارعے ہیں۔ ہمارا پسینہ مٹی میں مل کر خون بن جاتا ہے اور اس اونچے مکان والے کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے کھیتوں کی ہریالی ہمارے چہروں کی زردی سے قائم ہے۔ ہم نیچ ہیں، ہم کمین ہیں، ہم مزارعے ہیں۔"

اس نے بڑھیائے ہوئے رنگ [illegible]

کا احساس سرایت کرتا ہوا محسوس کیا لیکن آج یہ احساس بجھا بجھا سا
تھا، ملول سا، شکست خوردہ سا احساس۔ مظلوم بیوی کی طرح
چوری چھپے آہیں بھرتے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے مکان آج بھی
اسی طرح تھے جس طرح ایک مدت پہلے تھے۔ جہاں سے لیپ
اکھڑا ہوا تھا اکھڑا ہی ہوا تھا۔ جہاں سے کوئی چھت جھکی ہوئی تھی
جھکی ہی ہوئی تھی اور جہاں سے دیوار گر پڑی تھی گری ہی ہوئی تھی۔
ایک عرصہ پہلے بھی اور آج بھی۔ لیکن ان دیواروں کے اندر اور
باہر گلیوں میں ایک ریل پیل اور ہما ہمی تھی جو آج تھی، پہلے نہیں ہوا
کرتی تھی۔ وہ مزارعے جو دو ماہ پہلے تک شام کو ڈھور ڈنگر کے
گوبر پیشاب میں بھیگی ہوئی ڈھیلی چارپائیوں پہ ہارے ہوئے زخمی
سپاہیوں کی طرح آنگرا کرتے تھے آج اسے اکڑے تنے ہوئے
دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی جھکی ہوئی پیٹھیں سیدھی سیدھی سی
نظر آ رہی تھیں۔ دو ہی ماہ پہلے تک وہ گلیوں میں ایک دوسرے
کے قریب سے اس طرح گذر جایا کرتے تھے جیسے ایک دوسرے کو
جانتے پہچانتے ہی نہ ہوں، جیسے انہوں نے سروں پر منوں بوجھ
اٹھایا ہوا ہو لیکن آج وہ ایک دوسرے کو دور سے دیکھ کر مسکرا
رہے تھے۔

وہ فصیل پر اور جھک گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ خلق کے
ان راندے ہوؤں کو یا اس کے پاؤں تلے کچلے ہوؤں کو اور
زیادہ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ کسی انجانے دکھ
یا ایسے اجنبی سے درد نے جس کی ٹیسیں سے وہ کبھی شناسا نہ ہوا تھا
اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بے جان کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے
سینہ فصیل پر رکھ کر جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ اس کے تیزی
سے مرجھاتے ہوئے جسم نے جانے کتنے صدمے برداشت کئے تھے
لیکن حالات اور ماحول کا یہ وار ایسا بھرپور پڑا کہ اس کے جسم کا
جوڑ جوڑ الگ ہو گیا۔ چند ثانئے ہی گذرے ہوں گے کہ وہ
کسی عورت کی ہنسی سے چونک اٹھا۔ اس نے گردن کو ذرا
سیدھا کیا، پھر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر دو نسوانی قہقہے موسیقیت
سے بھرپور جل ترنگ کی طرح مترنم آواز سے قہقہے اس کے قریب
سے ہو کر گذر گئے جیسے زخمی بازو کے اوپر سے دو رنگ رنگیلی
چڑیاں چہچہاتی ہوئی گذر گئی ہوں۔ اس نے دائیں طرف نیچے
دیکھا۔ اس کے مزارعے کی لڑکی بھاد رکنواری بیٹھی اپنے صحن میں
بیٹھی ایک دوسرے کو جانے کیا کیا باتیں سنا سنا کر ہنس رہی تھیں،
اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی ایسی باتیں کر سکتے ہیں جن سے
لبوں پہ ہنسی آ سکتی ہے۔ یہ لوگ بھی قہقہے لگا کر ہنس سکتے ہیں اور
ان لوگوں کے قہقہوں میں بھی مسرت اور رچاؤ ہوتا ہے۔
"لیکن... لیکن...." وہ ایک جھٹکے سے سیدھا کھڑا
ہو گیا۔ اس نے غصے سے بھر کر سوچا "یہ لوگ پہلے تو یوں نہیں
ہنسا کرتے تھے۔ یہ لڑکیاں کس قدر بے حیا ہو گئی ہیں؟ عورتیں؟ اور
وہ بھی مزارعوں کی عورتیں؟ ان کی یہ مجال کہ ان کے قہقہے دور دور تک
سنائی دیں؟....." اس نے چیخ کی حد تک بلند آواز سے پکارا۔
"اجو!" جب اس کی آواز کے جواب میں کسی نے "حضور" نہ کہا
اور اجو نیم خمیدہ ہو کر اس کے سامنے آ کھڑا نہ ہوا تو وہ بجلی کی
سرعت سے اس طرح پیچھے گھوما جیسے اجو کی گردن مروڑ کے
رکھ دے گا جو بلانے پہ اس کے سامنے آ چکا تھا لیکن وہاں اجو
نہیں تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ وسیع چھت پہ اکیلا تھا۔ شعلہ
بھڑک کے بجھ گیا۔ کمر میں درد کی ایک اور ٹیس اٹھی اور اس نے
ہاتھ فصیل پہ رکھ دیا۔

کہاں گیا وہ وقت جب وہ اسی چھت پہ چڑھا کرتا تھا
تو اس کا منظور نظر مزارع اجو سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوا کرتا
تھا۔ دوسرا مزارع حقہ اٹھائے ساتھ رہتا تھا۔ تیسرا آرام کرسی
اور چوتھا دو نرم و گداز سرہانے اٹھائے حکم کا منتظر رہتا تھا۔
جب وہ اپنے دیہات کا دورہ کرنے نکلا کرتا تھا تو یہ چاروں
مزارعے، دونوں سرہانے، حقہ اور آرام کرسی اس کے ساتھ
ساتھ جایا کرتی تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں اور عورتیں گھونگھٹ پیچھے
پھینک کر اسے سلام کیا کرتی تھیں۔ ایک بار وہ گاؤں میں سے
گذر رہا تھا تو ایک مزارع کی نئی نویلی دلہن سامنے سے آ رہی تھی۔
اس نے ایک طرف ہو کر گھونگھٹ نکال لیا تو اس نے آگ بگولا
ہو کر حکم دیا تھا "یہ عورتیں مجھے کیا سمجھتی ہیں؟ کمینوں کی یہ مجال
کہ مجھ سے پردہ کریں؟ کیا میں لوفر لفنگا ہوں؟" اور اجو نے آگے
بڑھ کر اس دلہن کا گھونگھٹ پیچھے پھینک [illegible] دیا تھا۔
"جن کا دیا کھاتی ہے ان سے منہ چھپاتی ہے! ہٹا دے اسے...."

مرد دلہن نظریں جھکائے وضاب سے بھرپور سینے میں جلتے نفرت انتقام اور بے بسی کی کسقدر تیز آگ کو دباتی، دیوار کے ساتھ ساتھ اس طرح گذر گئی تھی جس طرح گلی میں بیٹھے ہوئے کتے کو دیکھ کر ڈرا سہما ہوا بچہ آہستہ آہستہ، دبے پاؤں گذر جاتا ہے۔

"اچھا"

"حضور"

"فضلے نے خوب ہاتھ مارا ہے!" اس نے دلہن کو بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "جی حضور! فضلے نے ....."

اچو جانتا اور کیا کہنے والا تھا کہ اس نے اچو کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جنہیں اچو اچھی طرح نہیں، بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اچو نے زیرلب کہا تھا "حضور کی اپنی کھیتیاں ہیں..... ہی ہی خی خی ہی ہی .... جب حکم ہو مائی باپ!" اور اس کی اور اچو کی نگاہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک بات طے کر لی تھی۔ اچو ان "خاموش احکام" کو خوب سمجھتا تھا۔ تاروں بھری راتوں میں اچو نے جانے ایسے کتنے "احکام" کی تعمیل بلا حیل و حجت کی تھی۔

اس کے آسمان میں جانے کتنے تارے ٹوٹ گئے تھے!

لیکن آج وہ اکیلا تھا۔ اس نے مغرب کی طرف دیکھا۔

دور، حدِ نگاہ سے بھی آگے تک، ہرے بھرے کھیت سمندر کی لہروں کا منظر پیش کر رہے تھے اور جہاں یہ ہریالی آسمان کی نیلاہٹ میں جا ختم ہوتی تھی وہاں سورج غروب ہونے کو اتر رہا تھا۔ دو ہی ماہ پہلے افق سے افق تک پھیلی ہوئی اس ہریالی کا وہ اکیلا مالک تھا۔

اس نے نیچے دیکھا مٹی کے مکانوں میں چہل پہل زیادہ ہو گئی تھی۔ ڈھور ڈنگر واپس آ چکے تھے۔ عورتیں گائیں بھینسیں دوھ رہی تھیں۔ دودھ کی دھاروں کا ترنم بچوں کے قہقہوں اور عورتوں کی باتوں میں گھل مل کر ایسے راگ کا تاثر پیدا کر رہا تھا جو دلکش ہوتے ہوئے بھی اسے بھلا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ان آوازوں سے بھاگ جانے کے لئے غیرارادی طور پر بائیں طرف دیکھا۔ ایک مکان کے صحن میں اسے اچو لیٹا ہوا نظر آیا۔ اس سے رہا نہ گیا اور بلند آواز سے اچو کو بلایا پھر دوسری آواز دی جو پہلی سے زیادہ بلند تھی۔ اچو کی بیوی نے ادھیڑ عمر دیکھا، پھر قلعہ نما دو منزلہ مکان کی چھت کی طرف دیکھا اس [illegible] جسم و صورت کی عورت نے ماتھے پہ ہلکا سا شکن ڈالا

اور نفرت بھری آہنگی سے اچو کو کہا "تمہیں بلا رہے ہیں....." کوٹھے پر۔ اچو نے اٹھنے سے پہلے کروٹ بدلی۔ کوٹھے کی طرف دیکھا آہستہ سے اٹھا اور جوتے پہننے میں شلوار پہننے جتنی دیر لگائی۔ پھر کھڑا ہوا اور انگڑائی لی، پھر اکتاہٹ کی مظہر ایک جماہی لی اور "آگیا حضور" کہہ کے ایسی چال سے دروازے کی طرف چلا جس میں ذرہ بھر ضروری پن اور جی حضوری پن نہ تھا۔

اس نے اچو کی ہر حرکت کو دوسری منزل کی بلندی سے دیکھا، اس نے اچو کی بیوی کے تیور بھی دیکھے۔ اس کے سینے سے آگ کا شعلہ اٹھا لیکن یہ شعلہ، جو چند ہی روز پہلے جب اٹھتا تھا تو کسی نہ کسی مزارع یا نوکر کی ننگی پیٹھ اور کندھوں پر اس کے بید کی سرخی مائل نیلی لکیروں میں جا ٹھنڈا ہوتا تھا، آج اس کی اپنی ہی ذات کو جلانے لگ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دیہات کے تمام مزارع اسے بید کی چھڑیوں سے پیٹ رہے ہیں۔ بادشاہت غلاموں کے ہاتھوں بے بس ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اچو جو کل تک ایک اشارے پر گیند کی طرح اچھل کر اس کے قدموں میں آ گرتا تھا آج اس نے صرف جوتیاں پہننے میں اتنی دیر لگائی تھی اور اس کی جواں سال بیوی جس نے ازدواجیت کی جانے کتنی ہی راتیں اس کے سفید مکان کی تاریکی کی بھینٹ اس طرح چڑھائی تھیں جس طرح کوئی حالات و مصائب کا مارا ہوا، بے بس اور مجبور انسان بت کے قدموں میں اپنے خون کے قطرے قربان کیا کرتا ہے۔ آج اس عورت نے اس کی طرف یوں ماتھا سکیڑ کر دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو "یہ جبیں جو کل تک تیری دہلیز پر جھکی رہتی تھی، اس کے سوا اب کیا انتقام لے سکتی ہے کہ تجھے دیکھ کر نفرت سے سکڑ جائے"!

جب اچو نہایت اطمینان سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا تو غیر ضروری سے لہجے میں بولا "حضور" غصے اور عتاب سے اس کی پسلیاں بھی چرچرا اٹھیں۔ اس نے چاہا کہ اس نمک حرام مزارع کو اس بلندی سے نیچے دے پٹخے یا کم از کم اس کے منہ پر تھپڑ ہی مار دے لیکن اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ زمانہ ان کھیتوں کے سبزہ زار سے پرے، بہت دور جہاں ہر شام سورج غروب ہوتا ہے، جا ڈوبا ہے اور وہ زمانہ اب وہاں سے کبھی نہ ابھر سکے گا جب قانون اور انصاف بھی اس کے [illegible]

اس کے مزارعوں کی طرح بھوکا ننگا اور لاچار تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ نائی ہی اسے ڈانٹ دے لیکن زبان نے بھی ساتھ نہ دیا۔

"حضور نے بلایا تھا؟"

"ہاں!" وہ چونک اٹھا اور آواز میں مخصوص رعب پیدا کرتے ہوئے بولا "اجو! کمالے کی بہو اور لڑکی بہت بے حیا ہو گئی ہیں۔"

"جی حضور!"

"دیکھو کس بے شرمی سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔"

"جی حضور!"

"اجو!"

"جی حضور!"

"میرے کسی گاؤں میں کبھی کوئی عورت یوں نہیں ہنسی تھی۔" اس نے اجو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر اجو کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "میرے مزارعوں میں یہ بے شرمی....." وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا کیونکہ اجو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مزارع کو ایسی جرأت کبھی ہوئی نہ تھی۔ دو گاؤں اور آٹھ ہزار ایکڑ زرخیز زمین کا واحد مالک، مزارعوں کے اڑتالیس خاندانوں کا شاہ ایک مفلس سے مزارع کی نگاہوں کا سامنا نہ کر سکا جیسے زرد پیلی آنکھوں نے اسے کہہ دیا ہو "تمہاری فرعونیت نے عورتوں میں حیا و شرم رہنے ہی کہاں دی ہے۔" لیکن وہ سنبھل گیا۔ بدلے ہوئے لہجے میں بولا "جاؤ، انہیں کہو کہ جوان بہو بیٹیاں نہیں ہنسا کرتیں۔"

"حضور!" اجو نے انکساری سے جواب دیا "کسی کی ہنسی کو کیسے روک دوں! کسی کو خوش ہونے سے روکا ہی کیوں جائے حضور؟"

"اجو!" اس نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"حضور کا غلام ہوں....." اجو نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا "لڑکیاں ہیں، ہنس کھیل رہی ہیں۔ اور مائی باپ! جناب کے مزارعوں کے ہر گھر میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ میں آپ کے پاؤں کی جوتی، کیسے کسے ہنسنے سے روکوں گا۔"

"کیوں خوش ہیں سبھی؟" اس نے آواز میں طنز بھر کے پوچھا۔

"یہ خوشی کیا کم ہے حضور!" اجو نے عاجزی سے کہا۔ "کہ سب کو زمینیں مل گئی ہیں جن کے اب وہ آزاد مالک ہیں۔"

"کیا انہیں معلوم ہے کہ یہ زمینیں کل تک میری تھیں؟"

"جی مائی باپ! معلوم ہے۔ شاید اسی لئے وہ خوش ہیں۔"

یہ وار ایسا پڑا کہ وہ بوکھلا گیا۔ اجو نے اس کا نمک حلال کرتے ہوئے اسے سنبھالا دے ہی دیا۔ بولا "سرکار بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آرام کیجئے۔ شام ہو رہی ہے۔ خدا جناب کا اقبال بلند کرے، پانچ سو ایکڑ زمین بھی تھوڑی نہیں ہوتی۔ اللہ کا دیا بہت ہے۔ شہر میں دو کوٹھیاں کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں، کار ہے، ایک بیٹا کپتان دوسرا لفٹیننٹ ہے۔ لاکھوں بنک میں ہوگا......" اجو کے الفاظ اس کے رگ و ریشے میں اعلیٰ قسم کی شراب کے قطروں کی طرح داخل ہونے لگے۔ اس نے اجو کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں تحسین اور تشکر کی نمایاں جھلک تھی۔ اجو کہہ رہا تھا "آرام کیجئے سرکار! یہ مزارع کسی کے سگے نہیں ہوتے۔ ابھی تک جناب کی اترن پہنے ہوئے ہیں اور آپ کی زمینوں کے مالک بن کر آپ کے ہی سر پر ہنس رہے ہیں۔"

اجو کے بولنے کے انداز اور باتوں نے اسے ایک بار پھر جاگیردار اور زمیندار بنا دیا۔ اس کی گردن جو سکڑ چلی تھی اکڑ کر بائیں طرف گھوم گئی۔ اس کی نگاہیں ایک اور گھر کے صحن میں جا گریں۔ اس نے تیزی سے اجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "سنا ہے اس کمین اشرف نے وہ رشتہ کرنے سے پھر انکار کر دیا ہے؟"

"ہاں حضور!" اجو نے جواب دیا۔ "وہ کہتا ہے کہ لڑکی نقص دار ہے۔"

"حرام خور!" اس نے اپنے مخصوص عتاب آلود لہجے میں کہا۔ "کیا وہ بھول گیا ہے کہ میرے مزارعوں کے رشتے ناطے میری مرضی اور حکم سے طے ہوتے ہیں؟ کیسے

انجم کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

"وہ کہتا ہے میں بے عزتی مول نہیں لونگا..... عزت کا سوال ہے سرکار!"

ایک مزارع کی حکم عدولی پر وہ اسقدر برافروختہ ہوا کہ اپنی موجودہ پوزیشن یکسر بھول گیا۔ بولا "کیا وہ بھول گیا ہے کہ میں نے اسے کہا تھا یہ رشتہ اسے کرنا پڑے گا؟ کیا نقص بتاتا ہے اس لڑکی میں؟ اسقدر خوبصورت لڑکی ہے..... اس کتے کو میرے پاس بلالاؤ۔ کمین اپنی اصلیت بھول گیا ہے۔ شکر کا کلمہ نہیں پڑھتا کہ روٹی مل رہی ہے اور رٹتا ہے عزت کو۔ کمین کو بھلا عزت اور غیرت سے کیا واسطہ؟ دوسروں کی چاکری کرنے والوں کی عزت ہوتی ہی کہاں ہے؟"

"حضور خود سیانے ہیں....." اجو نے اسے کچھ یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "جب کسی انسان کو اس کی چھینی ہوئی طاقت واپس کرکے اسے آزاد کر دیا جاتا ہے تو اس کی سوئی ہوئی رگیں خودبخود جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ کمین شاید اب سرکار کا حکم نہیں مانے گا۔"

"اجو!" اس نے اجو کو حیرت زدہ اور بے چین سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم نے اس طرح کی باتیں پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ اتنے الفاظ کہاں سے لے آئے ہو؟"

"سرکار کے حضور میں بہت کچھ سیکھا ہے جناب!" اجو نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ "ہوں!..... تو وہ آزاد ہو گیا ہے....." اس نے طنز آلود مگر ہارے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ "صرف اسلئے کہ حکومت نے اسے بھی میری زمین سے حصہ دے دیا ہے۔ کس نے بتایا ہے اسے کہ وہ اب کمین نہیں رہا؟ حکومت نے اس کی ذات تو نہیں بدلی؟"

"پٹواری منشی نے حضور!" اجو نے جواب دیا۔ "پٹواری سب کو بتا گیا ہے کہ نیا قانون بن گیا ہے جس کی رو سے ان زمینوں کے اب تم مالک ہو —— اب تم کسی زمیندار جاگیردار کے مزارعے نہیں ہو......"

"پٹواری نے....." اس نے دانت پیس کر کہا۔ "پٹواری! جس کا سارا خاندان کل تک میرے دانوں پر پلتا رہا ہے، جس کے بچے عید پر میرے دئیے ہوئے کپڑے پہنتے رہے ہیں۔" لیکن پٹوالا منشی اب وہ پٹوالا نہیں تھا جو حضور کے آگے جھکا رہتا تھا۔ ہم نے اسے پانچ سیر گڑ دیا تھا۔ اس نے نہیں لیا۔ کہتا تھا اب سب کام مفت کیا کروں گا۔ اس نے سب کے نقشے مفت بنا دئیے ہیں۔ صرف دودھ پیا تھا اس نے..."

وہ فصیل کے سہارے جھک گیا۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہوتی چلی گئیں، ہونٹ کپکپائے لیکن کچھ کہہ نہ سکے۔ اسے یوں لگا جیسے ٹانگیں اس کا بوجھ اٹھا نہ سکیں گی۔ اگر اجو بول نہ پڑتا تو شاید وہ کانپ کر گر پڑتا۔

"وہ لڑکی بہت حسین ہے حضور!" اجو نے کہا "ہے تو غریب مزارع کی بیٹی لیکن شکل و صورت سے شہزادی معلوم ہوتی ہے۔ لوگوں نے اس کے ساتھ ایک قصہ جوڑ دیا ہے۔ اسی لئے عشو مزارع کا بیٹا اشرف اس کے ساتھ شادی نہیں کرتا۔"

"گویا وہ لڑکی بدنام ہے؟"

"جی سرکار! ایک آدمی ہے جس کے ساتھ یہ لڑکی..."

"کون ہے وہ آدمی؟" اس نے شکست خوردہ سے غصے سے پوچھا۔

"حضور! جناب کا نمک کھایا ہے۔ کیسے عرض کروں! معافی چاہتا ہوں۔" اجو نے نظریں اس کے پاؤں پر گاڑ دیں۔

"کون ہے وہ؟" اس نے اب کے پورے غصے سے پوچھا۔

"آپ کا بڑا صاحبزادہ......"

جب اس نے اپنے بیٹے کا نام سنا تو اچھل کر سیدھا ہو گیا۔ غصے سے اس کے بچے کھچے دانت بجنے لگے۔ پُرعتاب آواز میں بولا "کیا یہ قصہ سچ ہے اجو؟"

"کسی قصے کا سچا ہونا ضروری نہیں ہوتا سرکار!" اجو نے جواب دیا۔ "قصہ قصہ ہی ہوتا ہے لیکن بدنامی ہو جاتی ہے۔ اور جب ایک قصہ کسی غریب کی بیٹی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تو بغیر کسی ثبوت کے سچا مان لیا جاتا ہے حضور!"

"اجو! تم جاؤ....." اجو جانے لگا تو اس نے کہا۔

"اور سنو! بڑے صاحبزادے کو ادھر بھیجتے جانا۔"

اس کا بڑا بیٹا اکرم خان ایک مہینے کی چھٹی آیا ہوا تھا

جب اجو جاگا تو اس نے دور پیپل کی شاخوں میں نگاہیں گاڑ دیں، پھر وہ پیپل کے ارد گرد پھیلے ہوئے خلا میں کھو گیا۔ اسے یاد آیا کہ تین ہی برس پہلے یہ لڑکی اپنے بھائی اور باپ کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی۔ اس کا باپ نوکری کی تلاش میں تھا۔ وہ کھیتی باڑی اور ہل سے ناواقف تھا لیکن اسے نوکری مل ہی گئی تھی۔ اس نے اس مزدور کو ایک اچھی قسم کا جھونپڑا اور پیپل کے ساتھ کی چار ایکڑ زمین دے کر کہا تھا کہ "وہاں کام کرو" اور اس کے ساتھ ایک اور مزارع لگا دیا تھا تاکہ وہ ہل چلانا اور کھیتی باڑی کے دیگر کام سیکھ جائے۔ صرف یہی نہیں، اس نے انہیں ایک گائے بھی دی تھی اور لڑکی کے باپ کو کہا تھا "یہ تمہارے بچوں کے لئے ہے۔ بچی کو دودھ پلاتے رہنا اور اسے دھوپ میں باہر نہ نکلنے دینا۔" اس وقت لڑکی کی عمر صرف تیرہ ساڑھے تیرہ برس تھی۔ صنف نازک کا تمام تر حسن اور رعنائیاں جیسے اس تیرہ برس کی لڑکی میں سمو دی گئی تھیں۔ مفلسی اور نیم فاقہ کشی بھی اس کے حسن کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔

جب اس نے اس مختصر سے خاندان کو نوکری دی تھی اس وقت اجو اس کے ساتھ تھا۔ لڑکی کے چلے جانے پر اس نے بائیں آنکھ بند کرکے اجو کو رازداری سے کہا تھا "پنیری اچھی ہے اجو!" اور اجو نے اس کی ٹانگیں دباتے ہوئے کہا تھا "تین برس اور حضور! سرو کا بوٹا بن جائے گی۔" اور اس کے ہونٹوں کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی تھی جس میں جانے کتنے سرو کے بوٹے مرجھا گئے تھے۔

اور آج وہ تین برس گذرنے کا انتظار کر رہا تھا کہ مزارعوں نے اس کے اپنے ہی بیٹے کو اس لڑکی کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ قصہ غلط نہیں ہوگا۔ باپ کے سینے میں بیٹے کے خلاف رقابت کی چنگاری سلگی جسے اس نے اندر ہی اندر بجھا لینے کی سر توڑ کوشش کی۔

"آپ نے بلایا ہے ابا جان؟"

اکرم خان کی پُر شباب آواز نے اسے پیپل کے ارد گرد پھیلے ہوئے خلا میں سے نکال لیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور اپنے آپ میں آتے ہوئے اکرم سے اس قصے کے متعلق پوچھا۔

"ابا جان! یہ بالکل بے بنیاد ہے۔" اکرم نے اسے بتایا۔ "بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ لڑکی میں لڑکیوں والی جھجک نہیں ہے۔ اس روز میں شکار سے لوٹ رہا تھا تو وہ کھیتوں میں میری راہ آ گئی۔ ہنستے ہنستے کہنے لگی۔ سرکار جی! کسی روز غریبوں کو بھی شکار کھلا دیجئے نا! ابا جان! وہ معصوم سی لڑکی ہے۔ میں نے اسے ایک تیتر، ایک فاختہ اور دو کبوتر دے دیئے۔ پرسوں میں پھر شکار سے آ رہا تھا تو وہ پھر رستے میں ملی اور بھکاریوں کے انداز سے مسکرائی۔ میں نے اسے چار پانچ پرندے دے دیئے۔ ہاں، ابا جان! اس سے ایک دو روز پہلے میں شام کو گاؤں سے لوٹ رہا تھا تو وہ راستے میں بیٹھی مل گئی۔ اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی اور اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ میں اسے اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا لایا تھا۔"

"اور جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟"

"جانتا ہوں ابا جان!" اکرم نے کہا "دو لونوں دیہات کے مزارعوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے اور ایک غلیظ سی کہانی ہر طرف پھیل گئی ہے۔ مجھے اپنی رسوائی کا ڈر نہیں۔ افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ اس کا منگیتر اشرف اس سے بدظن ہو گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مزارعوں کی ساری برادری نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس لڑکی کا رشتہ مزارعوں کا کوئی گھر قبول نہیں کرے گا۔ لڑکی کا باپ سو سو آنسو روتا ہے اور میری منتیں کرتا ہے کہ میں لوگوں کو سمجھاؤں۔ میں نے سب کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔ بات کچھ بھی نہیں، لڑکی جس قدر خوبصورت ہے اس سے کہیں زیادہ بھولی بھالی اور پاک ہے، لیکن مزارعے اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔"

"کمینوں کی یہ ہمت؟" باپ نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں سب کو یہاں بلاؤں گا اور......"

"لیکن ابا جان!" اکرم نے خود اعتمادی سے کہا۔ "آپ ایسے وقت کی بات کر رہے ہیں جو گذر گیا ہے۔ اب آپ ان مزارعوں کو اپنے فیصلوں اور خواہشوں کا شکار نہیں بنا سکتے ہیں۔"

"تو جائیں جہنم میں حرام خور!" اس نے یوں اطمینان سے کہا جیسے اس نے فی الواقع تمام مزارعوں کو جہنم میں پھینک دیا ہو اور

ابا جان سے نہیں ہیں کہ پھر اپنے قبضے میں رکھی ہوں، بولا "میں جانتا ہوں وہ کتنی کچھ عزت اور غیرت والے ہیں۔ اکرم! غریب آدمی کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ عزت اور غیرت صرف ہمارے ہاں ہوتی ہے اونچے گھرانوں میں۔ تم اب انہیں کچھ نہ کہو۔ اگر وہ لڑکی تمام عمر کنواری رہتی ہے تو رہنے دو۔ ہمیں کیا؟"

"لیکن ابا جان!" اکرم نے کہا۔ "وہ میری وجہ سے بدنام ہوئی ہے۔ اس کی سزا اس اکیلی کو کیوں ملے؟ اگر اس نے جرم کیا ہے تو میں بھی برابر کا مجرم ہوں۔"

"تم ان نمک حراموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دو اکرم!" اس نے نصیحت کی۔ "ہمارے پاس کل پانچ سو ایکڑ اراضی رہ گئی ہے۔ اس کے لئے دیانتدار سے مزارعے تلاش کر لو اور اس لڑکی کے جھنجھٹ میں مت پڑو۔"

"نہیں ابا جان!" اکرم نے گہرا سانس لیا اور باپ کے سینے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا "میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔"

"کیا کہا تو نے؟" وہ یوں کانپتی ہوئی آواز میں بولا جیسے اسکا قلعہ نما دو منزلہ مکان بنیادوں تک ہل گیا ہو۔

"میں اس کو بیاہ لاؤں گا ابا جان!"

"مزارع کی بیٹی کو بیاہ لاؤ گے؟ کمین کی لڑکی کو میری بہو بناؤ گے؟"

"ہاں، ابا جان!" میری چھٹی کے دس روز باقی ہیں۔ اس کے بھائی اور باپ کے ساتھ میں نے بات طے کر لی ہے۔ لڑکی بھی رضامند ہے۔ میں اسے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"اکرم!......" وہ غصے میں بولا لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔

"ابا جان!" اکرم نے کہا۔ "مجھے اس لڑکی سے محبت ہے۔"

اس نے فصیل پر ہاتھ رکھ دیئے اور سر جھکا لیا۔ اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ ساٹھ برس جی چکا ہے اور اب بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کی تین بیویوں میں سے تیسری کی عمر بمشکل اکیس برس ہے۔ اکرم اسے تنہا چھوڑ کر آگے بڑھنے لگا تو وہ فصیل پر جھک کر دوہرا ہو گیا اور پھر سیدھا نہ ہو سکا!

سورج غروب ہو چکا تھا!! ♦

"الف" ——— بقیہ صفحہ ۲۳

کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔ علاوہ ازیں اگر حروف علت کے علاوہ بھی کہیں ایسے لفظ پر اضافہ کیا جائیگا جہاں حرف آخر الف سے بدل سکتا ہو تو 'ی' کا اضافہ کر دیں گے مثلاً اسم فاعل ہیں دھنیا، کوسیا، جٹیا، بلیا وغیرہ۔

(۴۴) انگریزی سے آتے ہوئے ان تمام الفاظ کے شروع میں الف مکسور زاید آتا ہے جو (S) سے شروع ہوتے ہیں اور S ساکن ہوتا ہے کیونکہ اردو میں کوئی لفظ حرف ساکن سے شروع نہیں آتا۔ اس لئے اظہار آواز کے لئے الف کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے اسکول، اسٹیشن، اسٹیشنری، اسٹیڈیم، اسپرٹ، اسٹیٹ وغیرہ البتہ اہل پنجاب انگریزی کے ایسے الفاظ میں (S) کی آواز "س" ساکن ہی سے ادا کرتے ہیں جو بولنے اور سننے میں کچھ بھلی نہیں لگتی۔

زیر بحث مضمون میں " بعض اعداد ترتیبی میں (آں کا متبادل)" چھپا ہے۔ میرے خیال میں یہ سہواً ایسا لکھا گیا ہے صاحب مضمون نے 'واں' لکھا ہوگا۔ کیونکہ یہ "واں" (جیسے پانچواں ساتواں کا متبادل ہے جس کا ذکر ۳۵ میں ہوا۔

حرف الف کے متعلق امور متذکرہ کے علاوہ اور باتیں بھی بیان کی جا سکتی ہیں متعدد سابقوں اور لاحقوں میں دوسرے حروف کے ساتھ مل کر مختلف معنی پیدا کرتا ہے جنکا بیان بہت طویل ہو جائے گا۔

لفظی حیثیت سے ایک مستقل اسم ہے جس کا ال فی کی ردیف میں لکھنا چاہئے۔ اس کے متعدد معنی ہیں اور اس سے مختلف محاورے وجود میں آئے ہیں ♦

●

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
فتنا تعلیم درس بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پہ

(غالب)

●

لوک کھیل:

اشنان سینا

بنگلا ترجمہ: مسز محمد حسین

اردو ترجمہ: شہاب رفعت

(ایک دن جب اشنان سنگھ سینا پتی نامی گاؤں میں کسی شخص کو گرفتار کرنے جا رہا تھا تو اسے سیتل سنگھ کی بیٹی رام درگا دکھائی دی۔ وہ اس کو دیکھتے ہی اس پر دیوانہ وار عاشق ہو گیا اور بڑی پریشانی کی حالت میں گھر واپس آ کر اپنی داسی سے کہنے لگا)

اشنان: جانتی ہو آج مجھے کیسا اچرج سماں دکھائی دیا۔

چیری: ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ آپ کو چھت سے میٹھا گھیا لٹکتا دکھائی دیا ہوگا۔

اشنان: ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے سچ سچ بتاؤ آج میری آنکھوں نے کس کا جوبن دیکھا؟

چیری: ہاں سمجھ گئی۔ دریاؤں میں گھڑیال بھی تو ہوتے ہیں۔ تم نے اس کا جوبن دیکھا ہوگا۔

اشنان: اری مجھے یوں کس لئے ستاتی ہے۔ سچ سچ بتا میں نے آج کس کا روپ دیکھا؟

چیری: لو میں اب سمجھی۔ سیتل سنگھ کی بیٹی ہے، رام درگا تم نے اسے دیکھا ہوگا۔

اشنان: ہاں ہاں۔ یہ بتاؤ اب اس سے پھر کیسے ملا جائے۔

چیری: بس جھیل کنارے کدم کے خوشبودار درخت کے نیچے چھپ جاؤ۔ سیتل سنگھ کی بیٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہاں اشنان کرنے آئے گی۔ تم اسے وہاں پھر دیکھ سکو گے۔

اشنان: ارے! کیا واقعی؟!

چیری: ہاں ہاں۔ کیوں نہیں!

اشنان: تو پھر لو میں چلا۔ وہ رہی جھیل۔ کدم کی شاخیں بھی تو پڑی لہرا رہی ہیں۔ جب سیتل کی بیٹی وہاں نہلنے آئے گی تو میں پھر اس کے جوبن کی بہار دیکھ سکوں گا۔

(درگا داخل ہوتی ہے)

درگا: اے سکھیو! آؤ چلو، جھیل میں نہائیں۔

ایک سہیلی: نہیں میں تمہارے سنگ نہیں جاؤں گی۔

درگا: تمہیں لے ہی کون جا رہا ہے؟!

سہیلی: جاتا ہی کون ہے؟

درگا: اے تو لے جانا ہی کون چاہتا ہے۔

(دونوں مذاق میں ایک دوسرے کو کوسنے دیتی ہیں۔ پھر درگا ایک ایک کر کے باقی سہیلیوں سے التجا کرتی ہے۔ اکثر کسی نہ کسی بنا پر انکار کر دیتی ہیں۔ آخر ایک مان جاتی ہے) بہن، تو نے خوب کہی۔ مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ چلو ذرا پانی میں ڈبکی لگا آئیں۔

درگا: تو آؤ چلیں۔

سہیلی: چلو (چلنے لگتی ہے) لو میں تمہارے سنگ چل رہی ہوں۔

درگا: جانتی ہو ہم کہاں جا رہے ہیں جھیل میں اشنان کرنے۔

سہیلی: ہاں ہاں یہ تو جانتی ہوں۔ پر کبھی تم نے جھیل کا کنارہ بھی دیکھا ہے؟

درگا: نہیں، آج تک تو دیکھا نہیں۔

سہیلی: کبھی وہاں گئی بھی ہو؟

درگا: نہیں ابھی تک تو نہیں۔

سہیلی: تو پھر سجنی میں تمہارے ساتھ جھیل میں نہانے نہیں جاؤں گی۔

درگا: کیوں سجنی کیوں نہیں جاؤ گی؟

سہیلی: اسلئے کہ جیٹھ اور اساڑھ کے ان مہینوں میں پتہ ہے کیا ہوتا ہے؟ زمینوں اور اُمڈتے دریاؤں میں گھڑیال مل جاتے ہیں۔ اگر کسی گھڑیال نے تمہیں ہڑپ کر لیا تو میں تیری ماں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟

درگا: تو پھر کیا کروں سجنی؟

---

[1] ایک عوامی کھیل جو فریدپور، ڈھاکہ اور باریسال (مشرقی پاکستان) میں عام طور پر کھیلا جاتا ہے۔

سہیلی، پہلے اپنی ماں سے جاکر آگیا لو۔ تب میں تمہارے سنگ جھیل کنارے
جا سکوں گی۔

درگا: سجنی، تو ذرا ٹھہر میں ماں کی اچھا پوچھ لوں۔
اے ماں، اے ماں، مجھے اشیرواد دینا۔ میں نہانے چلی ہوں۔

ماں: بیٹا رام درگا۔ تجھ پر ایشور کی دیا ہو۔

درگا: ماں مجھے بدا کرو، میں چلی جھیل کی اور ـــــ!

ماں: بیٹی تیری تو پانچ چیریاں ہیں۔ انہیں کہو کہ وہ پانی کے گھڑے
بھر لائیں۔

درگا: میں روز پانی کے ان پانچ گھڑوں سے نہاتی ہوں جو میری
پانچ چیریاں بھر کر لاتی ہیں۔
آج کچھ جی ماندا ہے۔ اسلئے میں خود جاکر جھیل میں اشنان کرنا
چاہتی ہوں۔

ماں: اچھا چلی جاؤ۔ پر اپنی پانچوں چیریوں کو تو بلاؤ اور ان کے ساتھ
جھیل میں نہا آؤ۔

درگا: رے ماں، میں اپنی پانچوں چیریوں کو ساتھ لئے جاتی ہوں۔

ماں: ٹھیک ہے، مگر جلدی چلی آنا، بیٹیا۔

درگا: او سجنی!
(تین آدمی، گھٹی ہوئی آواز میں کھلکھلا پڑتے ہیں) ہی ہی ہی!

درگا: ہے رام! یہ ڈھور ڈنگر کچھ بے چین معلوم ہوتے ہیں۔

ایک آدمی: بی بی! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔
(درگا پہلے تو اس کی ہنسی اڑاتی ہے مگر پھر ساتھ چلنے دیتی ہے)

دوسرا آدمی: بی بی، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟
(درگا اسے بھی کچھ چڑاتی ہے مگر اسے بھی ساتھ چلنے دیتی ہے)

تیسرا آدمی: بی بی، میں بھی تمہارے ساتھ چلا چلوں؟

درگا: ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہیں پورا اختیار ہے۔
(درگا گیت گاتی ہے جس میں وہ اپنی چیریوں اور سہیلیوں کو
کو یہ کہتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ گھڑے بھرنے نہ جائیں کیونکہ
انہیں خبر بھی نہ ہوگی اور کالا دیو، کنہائی وہیں کہیں گھات میں
لگا ہوگا۔ آخر میں کہتی ہے:)
جھیل کے کنارے جہاں ہم اپنے گھڑے بھریں گی، انگریزوں
نے وہاں ایک جال بچھا رکھا ہے، پانی کے تل۔ ان پر کالا دیو،

کنہائی، سوار دکھائی دے گا۔

درگا: آؤ سہیلیو واپس چلیں۔ ہم جھیل میں نہیں نہائیں گے۔

چیری: لیکن، کیوں نہیں؟ ذرا ٹھہرنا میں ایک ڈبکی لگا لوں۔
(درگا گاتی ہے)

مرے سارے جتن بے کار گئے
چلو آؤ، سکھی، اب لوٹ چلیں
مرے پگ چلنے سے ہار گئے
اک دکھن سمائی نس نس میں
میں گھاٹ نہانے کیا آئی
من کھو گیا کیسے کیا جانیں
چلو آؤ سکھی اب لوٹ چلیں

درگا: چیری ذرا یہ تو بتا تا پانی میں وہ جادو بھری پرچھائیں کیا دیکھ
رہی ہوں۔

چیری: اے ہے، جھیل کے پانی میں گھڑیال ہوتا ہے۔ کہیں
تجھے اس کی جھلک دکھائی دے گئی ہوگی۔

درگا: اری سچ سچ بتا میں نے یہ ابھی ابھی کس کی جھلک دیکھی؟

چیری: درگا بی بی، آکاش پہ بادل چھائے ہیں۔ میں جانوں تم نے
ان کی چھب دیکھی۔

درگا: اری مجھے کیا بنا رہی ہے؟ مجھے بتا، سچ سچ بتا یہ کس کی پرچھائیں ہے

چیری: بی بی، دیکھ تو وہ رہا چت چور!

درگا: کیا کہا، کیا کہا؟

چیری: (گاتی ہے):

لو وہ آئے ترے چت چور
ترے چت چور۔ ادھر اس اور
سانور یا سامنے تیرے کھڑا
سنگ پیڑ کدم کے دیکھ جرا
اس پریت نے تیرے نینوں پہ
ان مدھ متوالے نینوں پہ
آتے ہی ڈال دیا سایہ
اک کالے جادو کا سایہ
ترے من میں سمو یا اندھیارا

اک بان ترے من پر مارا
لو وہ آئے ترے چت چور
ترے چت چور۔ ادھر اس اور

درگا: اے چیری، ذرا جاکر یہ تو پتہ چلا کہ اس انجانے منش کا گھر کہاں ہے۔

چیری: لو میں چلی (تھوڑی سی دور چل کر) اے پردیسی تیرا گھر کہاں ہے؟

اشمان: میرا گھر ایک انجانے دیس میں ہے۔

چیری: تم کہاں سے آئے ہو؟

اشمان: ایک انجانے دیس سے۔

چیری: کہاں جا رہے ہو؟

اشمان: اسی انجانے دیس کو

چیری: تمہارا نام؟

اشمان: مجھے کہتے ہیں پردیسی

چیری: تو پھر چلتے پھرتے نظر آؤ۔

اشمان: میں یہاں تمہارے بلائے تھوڑا آیا ہوں۔ اور نہ تمہارے کہنے پر چلا جاؤں گا۔ پر وہ میری انمول درگا یوں کہہ دے کہ ہیں چلا جاؤں تو پھر چلا ہی جاؤں گا۔ ورنہ جان بھی چلی جائے تو جانے کا نام نہ لوں۔

چیری: اچھا تو پردیسی ذرا ٹھہر جا۔ میں اس انمول درگا کی طرف جاتی ہوں (درگا کی طرف جاکر کہتی ہے)، سرکار سنتی ہیں؟

درگا: کہو اس انجان کا نام کیا ہے؟

چیری: نام ہے پردیسی۔

درگا: کہاں سے آیا؟

چیری: کسی دیس انجانے سے

درگا: کہاں جا رہا ہے؟

چیری: دیس انجانے کو

درگا: اس سے کہا تھا کہ یہاں سے چلا جائے؟

چیری: کہا تھا۔ کہتا ہے، نہیں جاؤں گا۔ جب تک درگا نہ آئے اور مجھ سے ایک دو باتیں نہ کرلے۔ چاہے جان ہی چلی جائے پر وہ یہاں سے نہیں ٹلے گا۔

درگا: پردیسی تیرا گھر کہاں ہے؟

اشمان: میرا گھر ہے۔ مرا گھر کسی دیس انجانے میں۔

درگا: پھر بھی کہاں سے آئے؟

اشمان: دیس انجانے سے۔

درگا: کدھر چلے؟

اشمان: اسی دیس انجانے کو۔

درگا: نام؟

اشمان: پردیسی!

درگا: تو پھر یہاں سے ٹل جاؤ مگر جانا نہیں۔

اشمان: ہاں ہاں میں بھی تو برابر یہی کہتا چلا آرہا ہوں میں چلا آ مگر جاؤں گا نہیں۔

درگا: (گاتی ہے):

چلے جاؤ۔ چلے جاؤ
یونہی بتیاں ناہیں بناؤ
تم ٹھہرے پردیس کے باسی
تو سے بات کا ناہیں چاؤ

اشمان: (گاتا ہے):

سچ کہیو چھبیلی ناری
میں جاؤں کہاں تو پہ واری؟
کیسے من میں بھریں آشائیں
انہیں لے کے کہاں ہم جائیں

درگا: (گاتی ہے):

گئیں بھاڑ میں سب آشائیں
بس جائیں، خدا را جائیں

اشمان (گاتا ہے):

میں پیڑ اور تو ہے بیل
رہے اپنا سدا یونہی میل

درگا: (غصے میں):

نہیں جھاڑو کی ہو ریل پیل
تیرا اس کا سدا ہو میل
وہ ہے سامنے راہ تمہاری
کیجے چلنے کی اب تیاری

اشمان: تم جل بن جل کی مچھلیا
ایسا میل کہاں بالموا
درگا: ڈنڈا بگڑا دن کا پہرہے سمجھے
چپ کر کے یہ رستہ لیجے
(اشمان چلا جاتا ہے)

درگا: سنو چیری۔ پردیسی نے کوئی سندیسہ بھی دیا تھا یا نہیں؟
چیری: درگا، تم نے تو بیچارے کو دھتکار ہی دیا۔ اسلئے وہ چلا گیا۔
درگا: اگر یہ کٹھور مرد وانہ ہوتا تو کبھی ایسے گفتگو نہ کرتا۔ میں نے
اسے اپنے ہونٹوں سے برا بھلا کہا پر من میں تو پریم ہی کرتی
ہوں۔ بتاؤ بتاؤ میرا شیام کہاں ہے؟
چیری: اے ہے، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟
درگا: (گاتی ہے):

کہاں ہے میرا سانوریا
وہ سندر موہن شیام مرا
میں اک ناری ہوں بلہاری
جیون ہی مرا ہے لاچاری
دھندے دن بھر کے رلائیں مجھے
جیون کے روگ جلائیں مجھے
دکھ جھیلنا سب بیکار مرا
ہے مکھ پہ پسینہ بوجھ بنا
گو شیام مجھے اپنائیں سکھی
یہ بوندیں دور ہٹائیں سکھی
وہ ہونٹ ان کے کندن جیسے
میں پان سے بھر دوں خوش ہو کے
(چلی جاتی ہے)

شادی

(پنڈت اور اس کی دھرم پتنی باتیں کر رہے ہیں)

دھرم پتنی: پتی دیو، تم کہیں سے کٹھل کی دعوت کھا کر آئے ہو میں
اس کی ساری کتھا بتا سکتی ہوں۔
دکٹھل سے کے متعلق ایک سپکر گیت سناتی ہے اور اپنے

پتی سے مذاق کرتی ہے جو اس پھل کا بہت ہی شوقین ہے)
سوامی، تمہارے پلے بندھ کر مجھے کوئی سُکھ نہ ملا۔
پتی: وہ کیوں؟ تمہیں میرے پلے بندھ کر کیوں سُکھ نہ ملا؟ بتاؤ
جب بھی میں "فرید پور" کی پینٹھ میں جاتا ہوں تمہارے
لئے عمدہ سے عمدہ مچھلی نہیں لاتا؟ تم اسے پکاتی ہو اور میں
تمہیں اس کی ہڈیاں کھانے کو دیتا ہوں۔ جب میں سوتا
ہوں تو تمہیں بستر کے نیچے نہیں سونے دیتا؟ پھر تمہیں میرے
پریم کا اور کیا ثبوت چاہیے؟
دھرم پتنی: پتی دیو، جب سے تمہارے پلے بندھی ہوں میں نے
کبھی بھات کے ساتھ مچھلی نہیں کھائی۔
پتی: جانتی نہیں۔ ہم لوگ کھشتری برامن ہیں۔ اگر میں مچھلی پکڑنے
کی بنسی کو چھو بھی لوں تو جات چلی جائے۔ اگر جال کو ہاتھ
لگاؤں تو جات باہر۔ پھر تمہیں مچھلی کیسے کھلاؤں۔
دھرم پتنی: یہ کیا تھا تمہارے کندھوں پر؟
پتی: چھتری۔
دھرم پتنی: تو اسی سے کوئی مچھلی مار لاؤ۔
پتی: مچھلی لاؤں، کیسے ہی لاؤں؟
ایک شخص: دیکھئے صاحب۔ میں بتاؤں ترکیب، تب ہی آپ مچھلی
پکڑ لیں گے۔
پتی: سنو! دیوی جی!
دھرم پتنی: کیا کہا پتی دیو؟
پتی: یہ لو، یہ لو! مچھلیاں ہی مچھلیاں۔ کچھ پڑوسیوں کو دے دو۔
کچھ ملنے جلنے والوں کو کچھ رشتہ داروں کو۔ پورے سات دن
کا سامان اور جی بھر کر کھاؤ۔
دھرم پتنی: ہے پتی دیو، یہ تم نے کتنی مچھلیاں پکڑ لیں۔
پتی: ارے کچھ نہ پوچھو۔ ایک بھی پکڑنا دشوار ہے، تم اتنی مانگتی ہو۔
دھرم پتنی: کونسی مچھلی ہے یہ؟
پتی: بھیڑا مچھلی۔
دھرم پتنی: وہ کیسی مچھلی ہوتی ہے؟
پتی: جو ملی سو لے آیا۔
دھرم پتنی: (سہیلی سے) سنا میرے پتی دیو کیا کہہ رہے ہیں؟

بلی : کیا کہتے ہیں؟
ام پتنی : کہتے ہیں- وہ کچھ پھلی لائے ہیں- کچھ پڑوسیوں کو دیدو۔
کچھ ملنے جلنے والوں کو- کچھ رشتہ داروں کو- پورے سات
دن کے لئے جمع کر لو اور خوب جی بھر کر کھاؤ-
یلی : نہیں تمہارے پتی دیو نے ٹھیک نہیں کہا- تم تو کھشتری
بامن ہو- اگر تم نے پھلی کھائی تو خوب موٹی ہو جاؤ گی- پھر تمہارے
لئے دروازے سے نکلنا مشکل ہو جائے گا- اور تمہارے پتی دیو
بھلا کب تمہاری طرف دیکھیں گے-
ام پتنی : تو تم کو دیکھنا شروع کر دیں گے!
یلی : ناں، ناں، ناں، تم کو پیار سے نہیں دیکھیں گے-
تی : ارے پھر لگیں جھگڑنے- آؤ اس پھلی کو بیچ آئیں- بس ایک دھیلے
میں فرید پور کی منڈی میں بیچ دوں گا- اور اس سے دھان
خرید دوں گا- تم دونوں اسے میرے لئے پکا کر رکھو- پھلی کھانے
اور موٹا بننے کی فکر میں گھلی جا رہی ہیں- لو میں یہ پھلی کیلوں کے
جھنڈ میں چھوڑنے جا رہا ہوں-
رم پتنی : (صلح صفائی کے انداز میں) پتی دیو! لوٹ آؤ، لوٹ آؤ-
تی : تمہیں نے جھگڑا شروع کیا تھا-
رم پتنی : میرے بھائیوں سے پوچھو جنہوں نے پہلے یہ جھگڑا چھیڑا-
تی : بھائیو، کہو یہ جھگڑا کس نے چھیڑا؟
شخص : ہم نے تو پہلے مرد ہی کو بولتے سنا
تی : سبھی عورتوں ہی کی طرفداری کرتے ہیں-
ام پتنی : پتی دیو، آپ تو کس کام کے لئے آئے تھے؟ اب جائیے نا-
بھگتائیے اسے-
تی : کونسا کام؟
ام پتنی : ارے اشمان سنگھ کے بیاہ کی شبھ گھڑی بیتی جا رہی ہے جاؤ نا
منتر پڑھو-
تی : چل چل- کیا مطلب ہے؟ کیا بھالا مار کر رہے گی؟
رم پتنی : نہیں نہیں پتی دیو "سنگھ" نہیں "سینگ"! میں تو سنگھ
کہہ رہی ہوں سنگھ!
تی : بھگوان! تیری کرپا ہے — ! اب میں تیار ہوں- پر ایک چٹائی
لا دو-

دھرم پتنی : یہ لو-
پتی : کتنی ہیں؟
دھرم پتنی : دو-
پتی : ارے یہ نہیں- یہ تو ٹیڑھی میڑھی ہے- اس سے کام نہیں
چلے گا-
دھرم پتنی : تو پھر یہ لو-
پتی : کتنی ہیں؟
دھرم پتنی : بس ایک ہے ایک، مگر ہے بہت بڑھیا-
پتی : بھئی واہ! تو ذرا ناچ ہو جائے — !
(بیوی ناچتی ہے) بہت کچھ ہنسی ٹھٹھول کے بعد پنڈت جی
چٹائی پر براجمان ہو جاتے ہیں-
پتی : دیوی جی، بھوجن تیار ہے؟
دھرم پتنی : چاول کہاں رکھے ہیں-
پتی : ارے جلدی جلدی لاؤ نا- گرما گرم-
دھرم پتنی : گھر میں چاول ہی نہیں- پھر بھی میں گرما گرم کھانا پکا کر لاؤں
کہاں سے- ہوں، بھوبل کھاؤ گے بھوبل؟
ایک شخص : ارے کل تم سودا لینے بازار نہیں گئی تھیں- اور تین روٹیاں
لائی تھیں-
دھرم پتنی : ہاں لائی تو تھی-
پتی : تو پھر وہی اپنے پتی دیو کو کھلا دو-
دھرم پتنی : پتی دیو، کل تم بازار نہیں گئے تھے کیا؟
پتی : ہاں گیا تھا-
دھرم پتنی : تم تین روٹیاں لائے تھے- ڈھائی میں نے کھا لیں، باقی
آدھی پڑی ہے-
پتی : کون چٹ کر گیا انھیں؟
دھرم پتنی : رام رے رام! گھر میں بس دو ہی تو دم ہیں- ایک نر سو تم،
ایک ناری سو میں- آدھی تیری آدھی تیری، لاؤ!
پتی : ارے بھائیو، اپنی بیوی کی بچی ہوئی آدھی روٹی کیوں کھائی
جائے- لاؤ بیوی جی آدھی روٹی ہی لے آؤ-
دھرم پتنی : پتی دیو، میرے ہاتھ شل ہیں-
پتی : ہاتھوں میں بل نہیں تو پھر کیسے ہی دے دو — تو یہاں تک

نوبت پہنچ گئی ہے۔ میں جو تیرے باپ کی برابر ہوں تو مجھے پاؤں سے روندتی دے گی! ٹھہر!

(ڈنڈا لے کر پیچھے دوڑتا ہے)

ایک عورت: ارے صاحب، اتنے غصّے میں کیوں ہو؟

پتی: یہ پتی ورتا نہیں رہی۔ پاپن ہے پاپن۔

عورت: تو پاپ کیسے ٹھیک ہو؟

پتی: میرے پاؤں دھو کر بالوں سے پونچھے، تبھی اس کا پاپ چھوٹ سکتا ہے۔

عورت: بی بی، اپنے پاپ کا پرائشچت کرو۔

دھرم پتنی: پتی دیو، کون کہتا ہے، میں پاپن ہوں؟

پتی: کہتا کون۔ میں کہتا ہوں، تم پاپن ہو۔

دھرم پتنی: اس کا اپائے کیسے کروں؟

پتی: میرے پاؤں اپنے بالوں سے پونچھو۔

دھرم پتنی: اس سے میرا پاپ دور ہو جائے گا؟

پتی: پتہ نہیں ہو، نہ ہو۔ تمہاری جو دو پشتیں نرک میں جلیں گی۔

دھرم پتنی: میری بلا سے، جلنے دو انہیں۔

پتی: یاد رکھو۔ اس سے تمہارا گناہ معاف ہو جائے گا۔

(دھرم پتنی اپنے بالوں سے پتی دیو کے پاؤں پونچھنے لگتی ہے)

پتی: (اچھل کر کھڑا ہو جاتا ہے) واہ واہ خوب چُل دیا!

دھرم پتنی: کیا بات ہے؟

پتی: میرے پاؤں پر مٹی پڑی تھی۔ من کے من بلکہ ٹن کے ٹن۔ آپ سب گواہ رہئے، اس نے اپنے بالوں سے میرے پاؤں پونچھے ہیں۔

دھرم پتنی: ہے رام! تم نے اتنے لوگوں کے سامنے رسوا کیا (گھونسہ تانتی ہے)۔

عورت: ارے رے رے۔ آپ جھگڑ کیوں رہے ہیں۔

پتی: میں تو لگا تھا اپنی بیوی کو مارنے، اُلٹا خود ہی پٹ گیا۔

عورت: ایسی بیوی کو نکال باہر کرو۔

پتی: بے شک پھر میرا کھانا کون پکائے گا؟

عورت: میں۔

پتی: تو لو۔ میں ابھی اسے نکال باہر کرتا ہوں۔ چل، بیوی چل یہاں سے نکل۔

دھرم پتنی: تمہارا کھانا پکانے؟

پتی: یہی تو اتنی دیر سے کہہ رہا ہوں۔ کیا سمجھتی ہو تم مجھے اب اپنا کھانا پکوانے کے لئے تمہاری کوئی ضرورت ہے، جا اپنے چچیا خسر کے پاس نہیں تو چچا کے پاس کسی کے بھی پاس چلی جا میرا آخری فیصلہ ہے۔

دھرم پتنی: اور میں نہیں جاؤں گی۔ میرا بھی فیصلہ اٹل ہے۔

پتی: پر کھاؤ گی کیا؟

دھرم پتنی: کھاتی کیا رس گلّے۔ میٹھے میٹھے۔

پتی: رس گلّے کھائے گی۔ لے رس گلّہ! (ڈنڈا لے کر پیچھے بھاگتا ہے) لوگو، میں نے اپنی بیوی کو نکال باہر کیا۔ اب اپنا جنیو توڑ ڈالا اور گیا یا کاشی چلا جاؤں گا۔ ہائے ہائے یہ بھی میں کیسے کروں اب تو ایک اور بیوی بھی ہاتھ آ رہی ہے۔ مگر بھائیو تم میں سے کوئی اس کا نام بھی جانتا ہے؟

ایک شخص: ہاں ہاں وہ لکشمی کی ماں ہے۔

پتی: تمہارے بہنوئی نے تمہارا ہاتھ مجھے دے دیا لکشمی کی ماں اب آ، میرے ساتھ۔

عورت: چل، چل میں تیرے جیسے کبڑے کے ساتھ کیوں آؤں۔

پتی: تو پھر مجھے میری بیوی ہی لوٹا دو۔ اس نے تو مجھے کبھی کبڑا نہیں کہا تھا۔

لکشمی کی ماں: جو میں کہوں تم وہی کہتے جاؤ تو تمہاری بیوی واپس آ جائے گی۔ بولو "اے بیوی میں پرارتھنا کرتا ہوں.......!"

پتی: نہیں نہیں۔ وہ اس طرح کبھی واپس نہیں آئے گی......

لکشمی کی ماں: بولو "اے بیوی واپس آ جا۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں"۔

پتی: اے بیوی، آ میرے پاؤں پڑ۔

لکشمی کی ماں: اچھا۔ یہی رٹ لگائے رکھیں تو وہ کبھی نہیں آنے لگی۔ لو میں چلی۔

پتی: جاؤ جاؤ۔ وہ میری بیوی ہے اور میرے کہنے پر ضرور آ جائے گی اے بیوی واپس آ جا۔ آ جا۔

دھرم پتنی: نہیں میں تمہارے ساتھ گھر نہیں جاؤں گی۔

پتی، اگر تم میرے گھر میں داخل نہیں ہونا چاہتی تو آنگن ہی میں آ جاؤ۔
میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں تم نہیں آؤ گی تو میں اپنا "پیشا"
توڑ پھوڑ کر گیا، کاشی چلا جاؤں گا۔ لو میں نے جنیؤ توڑ ڈالا
یہ، لو، یہ لو!

(جنیؤ توڑنے کی آواز)

دھرم پتنی: ہے رام، رام، مت توڑو مت توڑو!
پتی: پیاری۔
دھرم پتنی: پتی دیو، اُس کام کا بھی دھیان ہے جس کے لئے تم آئے
تھے؟ آشمان کے بیاہ کی شبھ گھڑی آن لگی ہے۔ منتر پڑھنے ہیں۔
پتی: تو پھر لاؤ نا دولہا دلھن کو۔
دھرم پتنی: یہ رہا دولہا، یہ رہی دلھن۔
پتی: اچھا تو تم یہاں بیٹھو۔ اور تم یہاں۔ اوہو آشمان سنگھ نے
داڑھی بھی نہیں منڈوائی۔ بلاؤ مادھو کو۔ اس کی داڑھی مونڈے۔

(مادھو نائی داخل ہوتا ہے)

مادھو: یہ رہا مادھو کا بیٹا۔ قینچی، موچنا اور ایک کھنڈا استرا لئے۔

(داڑھی مونڈنا شروع کرتا ہے)

(سب گاتے ہیں)

اے بھیا نائی۔ کر دے صفائی
کر دے صفائی
اے بھیا نائی
یہ تیرا استرا۔ ہے رام، مونڈے کیا
کُند اس کی دھار ہے
بڑا ہی پارہ ہے!
آیا کہاں سے یہ۔ سارے جہاں سے یہ
استرے ہی استرے
ٹوکرے کے ٹوکرے
تیری بہن کو جا۔ اک چور لے اُڑا۔۔۔!
ہو گئی صفائی
اے بھیا نائی

نائی: کیا کہہ رہے ہو، کیا کہہ رہے ہو؟ کوئی میری بہن کو لے اُڑا!
تو پھر میں اس مردے کی داڑھی کیوں مونڈ دوں؟

سب: ارے ٹھہر! ٹھہر! مت جا!۔

(نائی پھر مونڈنے بیٹھ جاتا ہے)

اے بھیا نائی، کر دے صفائی
پیچھے کسی نے تیری، جورو اُڑائی

نائی: ارے یہ کیا! کوئی میری جورو کو لے اڑا تو پھر میں صفائی کروں گا!
سب: ارے ٹھہر، ٹھہر، مت جا، بھیا نائی اب تو سنجوگ کی شبھ
گھڑی آن لگی ہے۔

(نائی پھر بیٹھ جاتا ہے)

اے بھیا نائی۔ جب تم یہاں بھئے
اک لنگوٹی اپنے سنگ لے دے کے لائے تھے
اب دیا ہے رام کی جوڑا ملا تجھے
جوڑا یہ ٹھاٹھ کا پہنے آن بان سے
کس دھوم دھام سے تم یہاں سے چل پڑے
اے بھیا نائی

(نائی چلا جاتا ہے)

پتی: مجھے نیا مٹی کا لگن چاہئے۔
دولہا: نیا مٹی کا لگن بیاہ کی ریت کے لئے۔ جاؤ سری رام پال
کمہار کو بلا لاؤ۔ کہاں ہے وہ۔

(پال آتا ہے اور گاتا ہے)

پال: کس نے بلایا۔ سری رام پال کو بھائیو بتاؤ مجھے بھائیو بتاؤ
بیساکھ میں مرا چاک گھومتا ہے کب شاستروں میں ہے لکھا۔
"چیت پوجا" چیت، چیت کے ہی ماس میں ہوا کرے
چاک کے تلے تو ہیں شو جی برا جمان
نرم نرم مٹی کو ہیں ہر دم دبا رہے
سارے بھائی بیوی کے ہیں سرگباش ہو چکے
پھر یہ گیلی مٹی کون گوندھ کر بنائے گا
گیلی مٹی میری ہے، خود ہی گوندھ لاؤں گا
اس میں لاج کچھ نہیں۔ ایک بات اور بھی
مجھ کو یاد آ رہی ہے۔ یہ بھی سن لو بھائیو
ایک دن اندھیرے میں۔ میری بیوی باپ رے!
مجھ کو بھول چوک سے "بابو جی" پکار اٹھی!

دھرم پتنی: پنڈت جی اب اشمان سنگھ کی بہت تراوا کیجیے۔
پنڈت: سے سہے، پیتل راننگ، کیکرم تیر گوم
دھرم پتنی: پنڈت جی یہ کیا۔ ٹھیک ٹھیک منتر گائیے نا۔
پتی: اچھا۔ یونہی سہی۔ کہو:

میں نے آموں کے پیڑ سے ڈنڈا باندھا!
تمہاری دھوم دھام سے سہاگ ریت ادا ہوگئی
آموں کے پیڑ کی چوٹی سے باندھی ہوئی کنڈی سے
میں نے تم دونوں کو جھوٹ یا سچ بیاہ دیا!

دھرم پتنی: پنڈت جی بیاہ سچ جھوٹ پر کیسے ہو سکتا ہے۔
پتی: اے بیوی، اشمان سنگھ رام درگا کو بیاہ کر گھر سے وہاں لے جائیگا
جہاں وہ کام کاج کرتا ہے۔ رام درگا کے ساتھ اس کا بندھن
زیادہ کڑا نہیں ہونا چاہیئے۔ میں نے اس بندھن کو ذرا
ڈھیلا چھوڑ دیا ہے۔ وہ آزادی سے گاؤں کے کھیتوں میں
گھوم پھر سکتی ہے۔
دھرم پتنی: اچھا پنڈت جی اب ذرا سچے منتر بول بھی ہو جائیں۔
پتی: اچھا تو بولو:

کیلوں اور دھانوں کی ڈھیریوں پہ ڈھیریاں
اک پٹاری میں یہاں دھڑا دھڑ بکھیر دو
لاؤ میرے ہاتھوں پہ دھن کی خوب ورشا ہو
ان پہ سونے چاندی کی ٹکیاں دھرے چلو
جلدی جلدی تاکہ میں اپنے گھر چلا چلوں

دھرم پتنی: کیا یہ دھن ابھی چاہیئے؟
پتی: کیا اس دیوی کو اس مردوے کے پاس گروی نہیں رکھا جا سکتا
دھرم پتنی: ارے پتی دیو کہاں بھاگ چلے؟!
پتی: ادھر، کلیش کی ماں کا پھوڑا چیرنے!

(پردہ)

• • گام بہ گام

تعمیراتی سامان میں اضافہ (سیمنٹ

خام پٹ سن سے تیار مال تک

کاغذ کی روز افزوں تیاری

غزل

سراج الدین ظفر

نہیں کہ میں نگہِ جستجو نہیں رکھتا — یہاں جو اصلِ نمو ہے نمو نہیں رکھتا

پلا شراب کہ یہ عالمِ کشادہ محیط — کشادگیٔ محیطِ سبو نہیں رکھتا

قریب آ کہ فرح بخش ہی سہی یہ سماں — تری طرح نفسِ مشک بُو نہیں رکھتا

ہمارے جام سے چھلکا ہے ناگہاں ہر رات — وہ ایک نور جو قیدِ نمو نہیں رکھتا

دبے رہو ابھی اے خاکِ رہ کے خورشیدو — یہاں کوئی نگہِ جستجو نہیں رکھتا

جہانِ راز کی اے پیرِ مدرسہ تجھ کو — خبر ہو کیا کہ قدح رُو برُو نہیں رکھتا

گُل و سبُو بھی مری جستجو کی راہیں ہیں — میں ایک زاویۂ جستجو نہیں رکھتا

کوئی ہزار کرے دعوئے صفا لیکن — صفائے شاہدِ آئینہ رُو نہیں رکھتا

نہ سی لبادۂ رنداں میں چاکِ رسوائی — یہ جامہ ہمتِ ضربِ رفو نہیں رکھتا

سکوتِ خلوتِ شب ایک جنسِ ناطق ہے — یہ اور شے ہے سرِ گفتگو نہیں رکھتا

سبو اٹھا کہ فلک خود شکارِ گردش ہے — حسابِ گردشِ جام و سبو نہیں رکھتا

ترے جمال کو آئینہ کچھ بیاں تو کرے — غریب حوصلۂ گفتگو نہیں رکھتا

غزال اور بھی کچھ ہیں مرے تعاقب میں — دل ایک سُو ہے نظر ایک سُو نہیں رکھتا

تری قبا ہے سلامت کہ کوئی میری طرح — شعورِ تجزیۂ رنگ و بُو نہیں رکھتا

غزالِ شہر کی تسخیر مجھ سے سیکھ اے شیخ! — یہ ہے وہ ایک کرامت جو تُو نہیں رکھتا

وہ سامنے ہوں تو میں اپنے شوقِ بے حد کو — بحدِ دائرۂ گفتگو نہیں رکھتا

یہ کون ہے جو سراپردۂ رگِ جاں سے — پکارتا ہے مجھے اور نمو نہیں رکھتا

ظفر ہنر پہ نہ اِترا کہ اس زمانے میں
گہر بھی ہو تو کوئی آبرو نہیں رکھتا

دگرگوں ہے جہاں......؟

(غزل کی شکل میں دورِ حاضر پر اندیشہ ہائے گوناگوں)

مشتاق مبارک

وداعِ شب ہے، فسونِ ظلمت سحر کے سانچے میں ڈھل رہا ہے
زمانہ خوابِ گراں سے جاگے زمانہ کروٹ بدل رہا ہے

یہ واقعہ ہے کہ آدمی کی مہ و ثریا پہ ہیں نگاہیں
یہ تجربہ ہے نظامِ عالم ترے اشاروں پہ چل رہا ہے

نئے جہاں کے نئے تقاضوں کا ہم کو پیغام دینے والو!
نئے تقاضوں کے زیرِ داماں مہیب طوفان پل رہا ہے

عجب نہیں ہے جو قلب گیتی سے خوں اُبلنے لگے کسی دن
یہ دور وہ ہے کہ ذہنِ انساں عجیب راہوں پہ چل رہا ہے

یہ اضطرابِ سکوں نما بھی کشاکشِ زندگی ہے شاید
وہ سامنے ہیں نظر کے اب تک نہ جانے دل کیوں مچل رہا ہے

طلوعِ مہرِ مبیں سے مطلب، عجیب ہے میکدے کی ہر شب
بہ فیضِ حسن و شبابِ ساقی چراغ محفل میں جل رہا ہے

یہ دورِ برق و شرار و آہن بظاہر اک حشرِ نو ہے لیکن
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے مزاجِ دوراں سنبھل رہا ہے

جو رنگ و نسل و وطن کا کوہِ گراں ہے انسانیت کا دشمن
حرارتِ سعیٔ آدمی سے وہ موم بن کر پگھل رہا ہے

بلندیٔ علم و آگہی نے بدل دئے زاویے نظر کے
کھٹک رہا تھا جو قلب گیتی میں اب وہ کانٹا نکل رہا ہے

ہمارا پیغام ہے محبت زمانے بھر کے لئے مبارکؔ
اسی پہ اپنا عمل رہے گا اسی پہ اپنا عمل رہا ہے

غزل

مشفق خواجہ

کبھی پیغامِ سکوں تیری نظر نے نہ دیا
زندگی چھین لی اس طرح کہ مرنے نہ دیا

تھی بہارِ گلِ جلوہ کہ ہوا کا جھونکا
جس نے دامن نگہِ شوق کا بھرنے نہ دیا

دی جس احساس نے مرنے کی تمنا ہم کو
اسی احساس کی رعنائی نے مرنے نہ دیا

جانے کیا قصۂ غم تھا کہ نظر نے تیری
بھولنے بھی نہ دیا، یاد بھی کرنے نہ دیا

منزلیں اور بھی تھیں کوئے ملامت کے سوا
مگر آشفتہ مزاجی نے ٹھہرنے نہ دیا

وادیٔ عشق میں امید بھی تھی یاس بھی تھی
مژدہ منزل کا کسی راہگذر نے نہ دیا

عمر بھر ایک تمنائے سکوں نے مشفقؔ
دل کی بے تابی کا اندازہ بھی کرنے نہ دیا

فن :

زبیدہ آغا کی مصوّری

(نئے نقوش کی روشنی میں)

الطاف گوہر

زبیدہ آغا کا شمار اُن فن کاروں میں ہے جو پاکستان کی جدید فنی تحریک میں پیش پیش رہے ہیں۔ اُن کی تصاویر سب سے پہلے پاکستانی نقاشی کی اولیں نمائش منعقدہ کراچی (۱۹۴۹ء) میں پیش کی گئیں اور خاصی بحث انگیز ثابت ہوئیں۔ ان کی تصاویر کی تازہ ترین نمائش سال رواں میں ۱۴۔ ۲۳ر جنوری کو منعقد ہوئی جس سے ان کی تخلیقات کا اثر بہ حیثیت ایک فنی پیشرو کے پوری طرح بروئے کار آیا۔ (مدیر)

قدرت نے زبیدہ آغا کو نقاشی کے ایسے شدید جوہر عطا کئے ہیں جو اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے آج سے تین سال پہلے جب سے صرف اس ہی کی تصاویر پر مشتمل ایک نمائش ترتیب دی گئی تھی، وہ برابر بڑی ہی تن دہی سے تصویر کشی میں معروف رہی ہے۔ اور اس کی کاوش نت نئے روپ ڈھالنے اور اصنام خیالی تراشنے میں ہے جس کا نتیجہ خاصے کے چند نقش ہائے رنگ رنگ ہیں۔ اب تک کوئی تیس مرقعات تیار ہو چکے ہیں جن میں موضوع اور اسلوب والوان کا تنوع دیدنی ہے۔ ان میں "تجریدیات" بھی ہیں "ترتیبیں" بھی اور "لوک جھلکیاں" بھی "مناظر فطرت" بھی ہیں اور "اسٹل لائف" بھی۔ پاکستان کی اس آخری قومی نمائش مصوری میں جو ۱۹۵۹ء کے اوائل میں ترتیب دی گئی تھی، زبیدہ کے کئی نقوش پیش کئے گئے تھے۔ اور اس میں ججوں نے فن شناسی کا ایسا ثبوت دیا تھا جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔

فن کی تغیر پذیر دنیا میں روایتی ججوں کا شعار ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی ایسی چیز آئے جس میں انوکھا پن پائی جائے تو وہ اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس نمائش میں بھی ججوں نے حسب عادت ایک بہت ہی اہم تصویر کو گمنام گوشے میں پھینک دیا۔ اس لئے کہ وہ ایک تجریدی نقش تھا۔ اور ان کی نظر میں اس کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ کنواس پر یونہی چند کالی لکیریں کھینچ دی گئی تھیں۔

مگر تجریدی فن کا یہ نمونہ زیادہ دیر اس گوشے میں نہ پڑا رہا۔ کیونکہ جونہی جج صاحبان باہر نکلے کوئی شخص وہاں آنکلا جس نے یہ تصویر خرید لی۔ اس لئے کہ اسے یہ نقش "خوبصورت" معلوم ہوا۔ اور تب سے وہ فن کار سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ اس میں کیا بات پیش کی گئی ہے۔ جواب ملا "کچھ بھی نہیں۔ یہ تو محض ایک تجریدی نقش ہے اور بس"۔ یہ ایسا جواب ہے جو کسی بھی نقاد کو کچھ بھونچکا کر دیگا اسے بوکھلا دے گا۔ مگر فن کار تو ناقدین کو ہمیشہ سٹپٹاتے اور چکراتے ہی رہے ہیں۔ نیٹشے کا یہ قول آپ کو یاد ہو گا:

"رسمیت کے خلاف جدوجہد میں فن کار
عموماً اس عزم بالجزم سے سرشار رہے ہیں کہ۔
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!"

ججوں کی رائے سے کوئی اثر لئے بغیر زبیدہ برابر انتہائی والہانہ سرگرمی شوق کے ساتھ نقش پر نقش بناتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اس انداز میں تجریدی و تعمیراتی وضع کے چند اور نقش بنا ڈالے۔

ان نقوش میں یہ چار بنیادی رنگ برتے گئے ہیں: نیلا، شنگرفی، سیاہ اور کرد می پیلا۔ اور انہیں بڑی ہی چابک دستی سے آمیز کرتے ہوئے ہر ہر نقش کو ایک نمایاں انفرادیت عطا کی گئی ہے۔ اس قسم کا اولین نقش غالباً سب سے سادہ اور کفایت آمیز تھا۔ فن کار نے اس قسم کی بنیادی ہیئت میں جو امکانات مضمر تھے، ان کو بھانپ لیا اور پھر اس میں ردوبدل کرکے ایسے ہی اور نقوش میں اپنے عمیق ترین احساسات کی ترجمانی کی۔

اس قسم کا واحد نقش جس میں دانستہ آرائش سے کام لیا گیا ہے، "سویرا" ہے ایک ایسا نقش جس میں دوسری طرحوں کی سخت گیر سنجیدگی سے ایک خوشگوار اور فرحت افزا گریز نظر آتی ہے۔ خبر نہیں اس نقش میں فن کار کی نگاہیں کیا تلاش کر رہی ہیں یا وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اندھیارے میں افق پر روشنی کی لانبی لانبی اجلی اجلی لکیریں دیکھی ہیں؟ —— بے آواز، خوش خرام۔ پتہ نہیں یہ کہاں سے ابھرتی ہیں، پھوٹتی ہیں۔ آپس میں گھل مل کر ابھرتی ہیں اور اس طرح اجالوں اندھیروں کا ایک عجیب تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو، پچھلی جنگ عظیم میں وہ گھنے گھنیرے غبار آلود آکاش پہ وہ کچھ ڈھونڈتی ڈھونڈتی پُر فسوں روشنی جیسے تاریک فضا پر تاب ناک بازو لہرا رہے ہوں۔ چنانچہ اس نقش میں بھی یہ تیکھی تیکھی روشن لکیریں کس قدر بے پناہ قوت کے ساتھ کنواس پر تاریکی کی سنگین سلوں، بھاری بھرکم کنڈوں اور زنجیروں سے، جو ایک بے روح میکانکی دور کی نحوست آمیز نشانیاں ہیں، رکے بغیر آگے ہی بڑھتے ہی جاتی ہیں۔ جہاں تک مکانات اور اشجار کا تعلق ہے، یوں لگتا ہے جیسے یہ نورانی ہوائیاں سیاہ دھبوں پر بڑی حد تک غالب آچکی ہیں اگرچہ یہ کھڑکیاں ابھی تک بند ہیں اور دروازوں کے کواڑ بڑی سختی سے بھڑے ہوئے ہیں۔ پھر بھی شگوفے صاف کھلے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہی بند کھڑکیاں، یہی اندھیاروں کے دبیز غلاف میں لپٹی ہوئی خالی خولی دیواریں اور مکانات ہی ہیں جو ان تجریدی طرحوں میں گہری تاثراتی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس نقش کی تہہ میں یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ تاریکی کے ہر منظر کو ملیا میٹ کر دو۔ اور یہ نور کی کرنیں ان تمام تاریک گھروں کے گوشے گوشے کو رنگ و کیف کی لہروں سے معمور کر دیں۔ دراصل یہی شدید کشمکش، یہی امید اور طول امل ہے جو ان تمام نقوش میں قوت اور بھرپور معنویت پیدا کر دیتا ہے۔

ان نقوش سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فن کار نے اپنے جیتے جاگتے، لاشعوری تجربہ کو رام کرنے کے لئے کس قدر ضبط سے کام لیا ہے اور اپنی انفعالیت کو اس میں راہ نہیں پانے دیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا یہ تجربہ کس قدر شدید، بے پناہ ہیجان سے لبریز ہوگا کہ اس کے قابو سے باہر نکلتا جائے۔ اس نے محض جذباتیت کی بڑی بے دردی سے بیخ کنی کر دی ہے۔ ٹیپ ٹاپ کو بالکل محو کر دیا ہے اور ایک ایسی چیز پیدا کی ہے جو بڑی سنجیدہ ہے، محض نقش نہیں۔

ان نقوش کے علاوہ نمائش میں "مرکب تصویریں" تین تھیں: دیوار۔ ایک ترتیب اور گائے۔ پہلے دو نقوش میں بھی یہی امید و امل کے احساسات کارفرما ہیں۔ دیوار میں ہرے بھرے درخت کہیں دور ایک گوشے میں ہیں، وسط میں منحوس بلا، بائیں طرف دروازہ۔ اگرچہ یہ ہریالی سے گھرا ہوا ہے۔ پھر بھی اس ایک بھیانک تیرگی چھائی ہوئی ہے۔ کالی سیاہ بھاری بھاری چھت کے سائے میں ایک دیوار کے سرخ کنارے کی بس جھلک سی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح دوسری تصویر "ایک ترتیب" میں غالب عنصر گہری سنگین سیاہی ہی ہے۔ جس کے گرد شاخیں اس بے چارگی سے لہراتی معلوم ہوتی ہیں کہ ان کو دیکھ کر ترس آتا ہے۔ تیسری تصویر "گائے" ایک پرسکون، تسکین بخش ترتیب، ہر رنگ اور رنگ کا ہر روپ جیسے چاندنی میں ڈوبا ہوا۔ ایسے کہ گائے کے نکھرے نکھرے بشرے سے سارا گاؤں بڑا ہی خوش و خرم اور آسودہ معلوم ہوتا ہے۔

چند سال ہوئے زبیدہ نے ایک نقش بنایا تھا "جنگل میں گاؤں" ایک نیا نقش "پیڑوں پر شگوفوں کی بہار" اسی کا بدلا ہوا روپ ہے۔ مگر بہت ہی خوش رنگ، بہت ہی سہانا۔ اسی طرح کے دو نقوش اور بھی ہیں —— "پتہ" اور "میلے کی اور" —— "پتہ" یوں سمجھئے رنگوں کا طلسم ہے۔ جو دیکھتے ہی دل کو لبھا لیتا ہے۔ آپ کے سامنے اندھیرے اجالے کا ایک گھومتا پھرتا چکر ہے اور اس کے بیچ ایک آوارہ پتہ یوں آرام سے بیٹھا ہے جیسے وہ اس تمام ہلچل کا مرکز ہے۔ اچل، انند! ان سب سے خوش نما ہے: "میلہ کی اور" جس میں بہار اور شگوفے اور کھلتے ہوئے رنگ سب مل کر ایک سیل رواں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ سیدھے سادے لوگوں کا تانتا بندھا ہے جو بہار کی مست کن رت میں اپنے اندر ایک ترنگ محسوس کرتے ہوئے اس امڈتے ہوئے سیلاب رنگ میں بہتے ہوئے، بہکے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان ہی کے ساتھ منظر نگاری کے بھی سات نمونے ہیں۔ ۲

ان میں سب سے نمایاں "پانیوں کی تہہ میں" ہے جس میں آتشی نیلے، عنبر، شنگرفی اور کالے رنگوں کو بالکل اور ہی انداز میں سمویا گیا ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے کسی جالی کے تلے نظروں سے اوجھل لہروں کے ساتھ ساتھ ساری چیزیں رِستی چلی جاتی ہیں۔

کچھ نقشے دیہات کے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک "گاؤں کا نظارہ" سے مشرقی پاکستان کی فضا ہماری نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ ان میں جو انسانی پتلے پیش کئے گئے ہیں وہ اپنی جگہ بڑے اداس اداس پس منظر کے سامنے کچھ زیادہ ہی سپاٹ اور کاغذی سے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ نقاش کے ذہن پر ان لوگوں کی کھوکھلی زندگی کا خیال سوار ہے۔ وہ زندگی جسے کونے میں رکھے ہوئے چند پھول رنگ روپ بدلنے میں کوئی مدد نہیں دیتے۔

"اسٹل لائف" کے مرقعات میں "اڑان" سب پر بھاری ہے۔ وہ نرم و ملائم بھوسلا گلدان پھولوں کے ساتھ یوں نظر آتا ہے جیسے کوئی ملائم ملائم بھورا بھورا پرندہ اڑنے کے لئے پر تول رہا ہو۔ نقش اور موضوع کی مناسبت سے تختۂ تصویر کی لمبوتری تراش کا تصور بھی بڑی ہی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اور خیال کو ادا کرنے کے لئے بھی قلم کاری کا بڑی استادی سے حق ادا کیا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ زبیدہ آغا نے اپنے محسوسات کی ترجمانی کے لئے ایک زبان پیدا کرلی ہے۔ جو ممکن ہے اسے غیر فانی بنادے۔ یہ زبان اس کے وجدان کی چھاپ بھی لئے ہوئے ہے اور اس کے احساسات سے گہری مناسبت بھی رکھتی ہے۔ یہ وہ بات ہے جس نے اس کے نقوش میں ایک ایسی خاصیت پیدا کردی ہے جس سے انسانی دلچسپی جھلکتی ہے۔ اس کی تخلیقات کسی الگ تھلگ خیالی دنیا میں نہیں بستیں۔ بلکہ وہ زندگی کا جزو ہیں اور اپنے گردوپیش کی دنیا سے وابستہ ہیں۔ اس کا ہر مرقع زندگی ہی میں رسا بسا ہوا ہے نہ کہ اس سے حاصل کیا گیا ہے۔ خواہ یہ کوئی تجریدی نقش ہو یا ترتیب، گاؤں کا منظر ہو یا اسٹل لائف۔ بند کھڑکیاں، اندھیرا، رواں دواں روشنی یا خالی ڈھنڈار مکان، وہ سب اسی جیتی جاگتی دنیا سے اچک لئے گئے ہیں۔ ہر تصویر میں جو بھی چیز ہے اس کا نقش اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اس کے ربط اور توازن کا رشتہ نہ صرف اس کی اندرونی دنیا۔ یعنی موضوع، اشیا وغیرہ ـــ سے استوار ہے بلکہ گنتوا اس کے ارد گرد اور اس سے باہر جو دنیا واقع ہے، اس کے ساتھ بھی پورا پورا ربط اور مناسبت موجود ہے ۔ (ترجمہ)

★

ایک نواپرداز یگانہ : ـــ بقیہ صفحہ ۲۹

[...]ت نے آگے بڑھتی جاتی، آدھی ٹولی تار سپتک کے سُر لاپتی [...]ور آدھی مندر سپتک کے۔ اس طرح اونچے نیچے سپتکوں کے سُر [...] خلا ملانے سے تالیفی موسیقی کا اثر پیدا ہوا جو برصغیر [...]ک و ہند میں اس وضع کا سنگیت وجود میں آنے کی [...]لی مثال ہے۔

غرض شاہ جی نے ایک نیا ساز اور سنگیت کا نیا [...]لوب ایجاد کیا۔ انہوں نے کلاسیکی اور عوامی موسیقی کے میل [...] سنگیت کی ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ موسیقی میں ایک نئی روح پھونکنے اور ایک خالص پاکستانی موسیقی پیدا کرنے کے لئے ہمیں شاہ جی کے نقش قدم پر چلنا لازم ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی ہند اسلامی روایت کو عوامی سنگیت کے اپنانے اور اس میں جگہ دینے سے ایک نئی زندگی اور قوت پیدا کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک علاقائی عوامی موسیقی کا تعلق ہے پاکستان کا ذخیرہ غالباً تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔ اور یہ ایک ایسا اچھوتا ذخیرہ ہے جو کسی ثقافتی ادارہ کے ذریعہ قومی پیمانے پر بروئے کار لایا جانے کا منتظر ہے ۔

نقد و نظر

س۔خ

سر سید احمد خاں

از : ڈاکٹر مولوی عبدالحق
ناشر : انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی
صفحات (۱۹۶)، قیمت ۴ روپے

جدید تحریک اور قائدین ملت کے سرخیل، سر سید احمد خاں مرحوم کی شخصیت زندہ و باقی ہے۔ اور ان کا فیضان ـــــ قومی، مذہبی، سیاسی، معاشری، فکری، علمی و ادبی۔ ایک فیض جاری ہے۔ کیونکہ ہماری موجودہ زندگی اور ترقی یافتہ رجحان تمام تر ان ہی کا جلوہ اور انہی کے دل زندہ کا کرشمہ ہے۔ "ذہنی انقلاب کے سب سے بڑے داعی اور نقیب" کے حالات و افکار کا تذکرہ کچھ بابائے اُردو ہی کے قلم سے موزوں تھا۔ جنہیں مدتوں ان کی صحبت میں رہنے اور حالات و واقعات کو بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ ہمارا ۲۷ر اکتوبر کا انقلاب "تکملہ ہے اس ذہنی انقلاب کا، جس کے اولین محرک اس برصغیر میں سر سید احمد خاں تھے۔" لہٰذا قومی نشاۃ الثانیہ کے اس بانی مبانی کا تذکرہ پاکستان کے موجودہ تاریخی دور کے ساتھ خاص مناسبت رکھتا ہے۔ اور پھر جس ذوق و شوق سے ان کے حالات بیان کئے گئے ہیں اس سے داستان کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ بے شک "تصویر جس قدر بڑی، شاندار اور نفیس ہوتی ہے، اُسی قدر اُسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے۔" اور اس کتاب میں، جو سر سید کی مبسوط یا باقاعدہ سوانح عمری نہیں اور نہ ان کے کارہائے نمایاں پر مشتمل ہے، تصویر کے خط و خال کو پیچھے ہٹ کر ہی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔

انگاروں کے گیت
ذہن اور انقلاب

از : حسن شہیر
ناشر : کتابستان الٰہ آباد
صفحات : ۱۰۴، ۱۴۴
قیمت : ۲/۸، ۳ روپے

ان دونوں کتابوں کو پڑھ کر جن میں کوئی پانچ سال کا فصل ہے، انسان سوچنے لگ جاتا ہے کہ ان کا منبع و مخرج جنوں ہے یا ہوش۔ ساتھ ہی وہ ایک کشمکش رد و قبول میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے کبھی یہ خیال کہ "انگاروں کے گیت" واقعی دہکتے ہوئے انگارے یا بھڑکتے ہوئے دیپ نہ ہوں۔ اور کبھی اس کے برعکس۔ دوسرے ہی لمحے خوابوں کا یہ محل چکنا چور ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ فریب نظر کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاعر شعور اور لاشعور کے سنگم پر کھڑا نظر آتا ہے جیسے وہ کوئی سرریلیسٹ شاعر ہو۔ بادی النظر میں غالب، ڈاکٹر خالد، راشد اور فیض کا مخلوط پیکر جس میں اپنے بھی تیور جھلکتے ہیں لیکن غور سے دیکھنے پر ایک سیمیائی ہیولیٰ، ایک بکھرا ہوا تاروں کا غبار اگر یہ پریشان جوہر منظم شکل اختیار کر لیں تو! مگر یہ توقع پوری نہیں ہوتی اور معنی فی البطن شاعر کی طرح شاعر فی البطن تصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہر قدم پر ایک بڑی توقع اور پھر ـــ یعنی چہ ـــ 'شعاعِ تیرہ'۔ 'پرِ تُو ناب'۔ 'نور کے دریا خواب کے ہلکے پھیلے ہوئے ندی کے چشمے'۔ 'ہوا کا یہ لپکتا ہے سحاب'؟! ہر کہیں حواس در حواس کا التباس بہت دور پہنچا ہوا۔ ستم ظریفی اور بے تکے پن کی حدیں پار کرتا ہوا۔ مگر سلجھی ہوئی صورت میں یہ انداز لئے :

> کہ ساغر بلب آفتاب آچکا ہے،
> چلتے سانس، دھڑکتی نبضیں، ڈھلتی شام،
> اَن گنت گلابی بات، مسکرائے خوشیوں کے،
> باہنوں کے گُل افشاں محراب،
> ایک طوفان کا فانوس بجھا،
> سبک حیا پوش سرد ایواں

نظموں کے آہنگ اور ترتیب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ احساس کہ شاعر نے آہنگ میں اینچ ہی اینچ پیدا کر دی

جلدا ہی گرگرا اٹھتا:

فانوس کا دل بجھا بجھا سا

صبر و وفا کا ایک کا سا

ہم چاہتے ہیں کاش! شاعر کی یہ جسارت کامیاب ہوتی اور آہنگ میں اجتہاد کا دروازہ کھل جاتا۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ شاعر کا انداز سب سے زیادہ ڈاکٹر خالد سے ملتا جلتا ہے جن کی شاعری اس جسارت آمیز اجتہاد کا بڑا سلجھا ہوا نمونہ ہے۔ مگر 'ابتدائیہ' میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ مزید تعجب یہ ہے کہ الٰہ آباد کی سند بھی اس مجموعہ میں ساقط نظر آتی ہے:

'ٹمٹمائی سی شمع'۔ 'نئے چراغوں کی آبیاری'۔ 'حیاتِ کُن' اُس کے ہونے میں کوئی دریغ نہیں'۔ 'مفید بخش'، 'جذبی کی نظمیں دنیز غزلیں'۔ 'شدید غم ابھر آتے .... اُن کی پرورش نہیں کرتی'۔ 'شنگرف کا ر، رنگ کی آمیزش دیں گے'۔ 'ایسے خطوط کھینچتا ہے جو .... ہو'۔ 'حیات بینی'۔ 'کئی خیال .... اعانت کرتا ہے'۔ بایں ہمہ شاعر کا انداز بیان اس بات کی کھلی تردید ہے کہ شاعری بہر حال روایت ہی سے ابھرتی ہے۔ بعض اوقات یہ اس سے بے نیاز بھی ہو سکتی ہے۔ ایک اور بوالعجبی۔ شاعر پہنچنا عوام تک چاہتا ہے لیکن سو فیصدی خواص کی زبان سے!

یہ عوام کا مسئلہ ہمیں "ترقی پسند" شہیر کی طرف لے آتا ہے۔ جس نے اپنی تازہ تصنیف "ذہن اور انقلاب" میں اپنا نظری و فنی منشور پیش کیا ہے۔ اور "اندیشہ ہائے افلاکی" کو "اندیشہ ہائے خاکی" میں تبدیل کیا ہے۔ یہ اردو میں "سیاسی ہمہ اوست" کے نظریہ کی روشنی میں فکری و ادبی تعبیر کی اولیں کوشش ہے۔ جدید ذہن ماورا سے اس ٹھوس مادی زمین میں شاید زیادہ آسودگی محسوس کرے۔ اور اس سے ممکن ہے کئی ذہنی چکروں سے نجات مل جائے مگر بدقسمتی سے کوئی نظریہ بھی بظاہر نہایت مقبول ہونے کے باوجود کُل حق نہیں ہوتا۔ صرف اس کا نیا پن ہمیں بہکا دیتا ہے۔ شاعری ہو یا کوئی اور فن، اس کی کسی تصور سے وابستگی قطعاً ضروری نہیں۔ اس کی حیثیت تو آلۂ کار کی ہے۔ جس سے کوئی بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ۔ کسی نظریئے سے وابستگی وہ غلطی ہے جس کا افلاطون سے لے کر اب تک اعادہ ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر اس نظم کا "مادّی نقطۂ نگاہ" سے کیا تعلق ہے اور عظیم شاعری کسی نظریئے پر کیسے موقوف ہے:

جھلک، خیال کے بہتے ہوئے درخشاں ساز

خلائے نور میں ڈوبی ہوئی مری آواز

شاعری تاثر اور شعری تصور (CONCEPT) سے حقیقی شاعری بھی بنتی ہے اور بڑی شاعری بھی۔ خواہ یہ تاثر و تصور کچھ ہوں۔ فاسقانہ یا عارفانہ۔ اگر ہمیں شاعری میں اجتہاد کرنا ہے تو زندگی اور نظریات میں انقلاب برپا کرنے کی بجائے اپنے تصور کو بدلنے اور بلند تر کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

چراغِ فکر: از من موہن تلخ

ناشر: مکتبۂ قصرِ اردو۔ دہلی

صفحات ۱۶۰، قیمت ۲ روپے

اس شاعر کے سلسلے میں بھی وہی تصورِ فن کا سوال پیدا ہوتا ہے جسے اس نے اپنے معیار میں شامل نہیں کیا۔ مسئلہ صرف جذبے، مفہوم، الفاظ، لب و لہجہ، بڑائی، غم و خوشی اور وسعت مطالعہ ہی سے حل نہیں ہو جاتا۔ ہمیں شاعری سے یہ سب باتیں یا جذباتی تسکین، فلسفہ، سماجی شعور، نظریۂ حیات اور آفاقی یا ہنگامی قدریں وغیرہ تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ شاعر کا تصور کیا ہے، اس نے کس سطح پر شاعری کی ہے، اس کا اٹھان کیا ہے، اس نے کیا نئے تیور پیدا کئے ہیں، اس کا کلام کتنا تہہ دار ہے، اس میں کتنا رچاؤ ہے، اس کی فنی وسعت کیا ہے۔ اس میں کتنی ندرت ہے وغیرہ وغیرہ۔ آج کل کا ترقی یافتہ نقاد جس کے سامنے عالمی معیارِ فن ہے کسی خاصے کی تخلیق ہی سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ شاعر کی جگہ اپنے ٹھوس معیار کو کام میں لائے تو شاعر کو اس کی کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ کوئی شخص ہمیں زندگی یا شاعری کی دنیا سے باہر نہیں دھکیلتا۔ بلکہ ہم خود ہی دھکیلتے ہیں۔ ناظر کو اس سے کبھی سروکار نہیں کہ شاعر نے زندگی میں ایک بھیانک خلا محسوس کیا اور اس کی عکاسی

[illegible]

کیا مقام ہے "چراغِ فکر" میں ایک حد تک شعری کیف تسلیم، مگر دوسری اہم خصوصیات کا اندازہ تو مجاز، فراق، جذبی، جوش یا شور بلکہ فیض اور راشد سے بھی نہیں ہوگا۔ زیادہ عظیم افراد سے ہو گا جن کا انداز کہیں زیادہ جدید ہو۔ اب نہ وہ تصور مقبول رہا ہے نہ پیمانے جن سے شاعر کا شعور ابھرا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ البتہ شاعر نے جن احساسات کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی شخصیت کا تصور اس کی شاعری سے ضرور ابھرتا ہے ٭

۷ر اکتوبر

ماہنامہ، کراچی

مدیر: واحد پرتاب گڑھی
ملنے کا پتہ: ۴/۲۱۵ مارٹن روڈ کراچی
قیمت فی شمارہ سات آنے

"۷ر اکتوبر" سے مراد ۷ ر اکتوبر ہی ہے جس سے انقلاب کی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں اور جس سے ہماری تاریخ کے سب سے ترقی یافتہ، عہد آفریں دور کا آغاز ہوا ہے۔ جیسا کہ فاضل نگراں نے خود ہی صراحت کی ہے ؎ کیسے نہ ہو دل کش و حسیں اکتوبر

ہے قلعۂ عزم آہنیں اکتوبر
میداں میں جب آئے تھے "محمد ایوب"
راغب ابھی درحقیقت "ساتویں اکتوبر"

یہ رسالہ جو حضرت جوش ملیح آبادی کی سرپرستی اور حکیم راغب مراد آبادی کی نگرانی میں جاری ہوا ہے۔ علمی، ادبی اور قومی ترقی کے بلند مقاصد کے لئے وقف ہے۔ یہ آغاز ہمیں ایک اچھے انجام کی خبر دیتا ہے ٭

شاہِ شہیداں

ناشر: ادارۂ ذہن جدید ۹۸ نیو کلاتھ مارکیٹ۔ کراچی۔
صفحات ۱۳۴

وہ تشنگی جو سید الشہداء حسینؓ ابن علیؓ کے واقعۂ شہادت کے متعلق ہر شخص محسوس کرتا ہے، اس سانحۂ الم کے متعلق برابر تحقیق و تدقیق کی محرک رہی ہے۔ نامور مصری مصنف، عباس محمود العقاد، نے اس موضوع پر ایک مبسوط محققانہ کتاب سپرد قلم کی ہے جس میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اسباب و محرکات کو واضح کیا گیا ہے۔ اور شروع سے لے کر آخر تک واقعات کی تفصیل پیش کرنے کے علاوہ فریقین کے رویہ اور موقف کی توضیح بھی کی گئی ہے۔ خصوصاً شہید کربلا اور یزید کے کرداروں کو پوری طرح اجاگر کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ جناب عطا حسین مدیر "الوعی" نے اس خوش اسلوبی سے کیا ہے گویا یہ ان کی اپنی کاوش فکر کا نتیجہ ہو۔ امید ہے وہ اس سلسلۂ فیض کو اسی ذوق و شوق سے جاری رکھیں گے۔

تحدیدِ نسل

مرتبہ مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواری
ناشر۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور
صفحات ۷۵، قیمت ۱۲؍

اردو میں اپنے موضوع، ضبط ولادت اور خاندانی منصوبہ بندی، پر اس اولیں مجموعۂ مضامین (جسے شاہ محمد جعفر ندوی جیسے روشن خیال ماہر دینیات نے ترتیب دیا ہے) کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دو ممتاز مصری علماء البہی الخولی اور خالد محمد خالد کے نہایت فاضلانہ مضامین بھی شامل ہیں۔ جو صریحاً ان کی آزاد اور بے لاگ تحقیق پر مبنی ہیں۔ اور اسی لئے وقیع اور قابل قبول بھی ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم جیسے وسیع النظر مفکر، پرستار اسلام اور فاضل اجل کے عقلی و نقلی حقائق و بصائر پر مبنی ارشادات بجائے خود اہم ہیں اور سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ فاضل مرتب کے اپنے تمام مضامین اور پیش لفظ بھی ان کی مخصوص بالغ نظری اور ترقی یافتہ رجحان کے آئینہ دار ہیں۔ جس کی روح اعلاء کلمۃ الحق ہے۔

اتنے جلیل القدر ارباب فکر و نظر کا اتفاق رائے یقیناً ہمیں ضبط تولید کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے اور ان کے نتائج تحقیق کو قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کتاب کی توضیحات کی روشنی میں ہمیں خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک پر لبیک کہنے اور اس کو کامیاب بنانے کی جد و جہد میں ذرا بھی تامل نہیں ہونا چاہئے ٭

★

طنز و مزاح:

"بہت نکلے مرے ارماں ....!"

صہبا اختر

کارٹون: ریحان

قلی نے چلتے چلتے ریل کے ایک ڈبے کو اس طرح سونگھا جس طرح سونگھنیے ریگستان میں پانی کا سرچشمہ تلاش کرتے ہیں - ریل کے تمام ڈبوں کے طواف کے بعد بالکل آخری ڈبے میں سر چھپانے کی تو کیا البتہ پیر ٹکانے کی جگہ ضرور مل گئی - قلی سامان پٹک کر جاچکا تھا اور میرا سامان کچھ میرے سر پر اور کچھ پیروں پر ابھی تک موجود تھا - اس ڈبے میں جہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی لوگ منوں کے حساب سے سامان لیکر موجود تھے - ہر شخص ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے صرف وہ اس کے سفر کی مصیبت کا باعث تھا - لیکن اس بے سر و سامانی کی فضا میں بھی صرف ایک مولانا قسم کے صاحب مع اپنی بیگم اور آٹھ بچوں کے پوری دو برتھوں پر قابض تھے اور وہ سارے ڈبے سے بے تعلق ہوکر صرف کھڑکی سے جھانکنے میں مصروف تھے یا اپنی کرکٹ الیون کی ریت میں - کسی بھی بچے کے ہلنے سے ان کا سارا جسم مع لمبی داڑھی کے ہل جاتا تھا - انہیں ہر لمحہ صرف اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں ان کی الاٹ شدہ برتھ پر کوئی دوسرا قابض نہ ہو جائے - ایک ٹیل برقعے میں ان کی بیگم پوری برتھ پر دراز تھیں اور ان کے اوپر، تلے اوپر کے بچے سوار تھے -

خدا خدا کر کے گاڑی کو حرکت ہوئی اور اس حرکت کے ساتھ ہی ایک بزرگ کی زبان کو بھی حرکت ہوئی - "مولانا" مولانا صاحب!" لیکن مولانا اس طرح خاموش تھے جیسے ان سے خطاب کرنے والا یہاں کوئی نہیں ہو سکتا - جیسے وہ ریل کے ڈبے میں نہیں بلکہ اپنی ذاتی لانچ پر سوار تھے -

آخر وہ بزرگ اپنا سا منہ لے کر چپ ہو گئے لیکن ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک پنجابی نما صاحب نے ان بزرگ کی داد رسی کے خیال سے ہانک لگائی: "مولانا! سنو اے کی کہندے نے" - مولانا نے آخر اس گرجدار آواز سے مرعوب ہوتے ہوئے کہا: "فرمائیے" - وہ بزرگ مولانا سے مایوس ہو چکے تھے، اسطرح کھل اٹھے جیسے انہیں کوئی کھویا ہوا خزانہ ہاتھ آگیا ہو - ان بزرگ نے آواز میں مزید شیرینی پیدا کرتے ہوئے پوچھا "آپ کہاں تک تشریف لے جا رہے ہیں"؟

"لاہور" مولانا نے خشک لہجے میں جواب دیا اور خاموش ہوگئے -

"مگر سنیئے" لیکن مولانا اپنی طرف سے معاملہ ختم کر چکے تھے -

وہ بزرگ پھر منمنائے - لیکن مولانا نے پھر سنی ان سنی کردی - آس پاس کے مسافر بھی اس مکالماتی کوشش کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے - لوگوں کی نظروں کی اہمیت بھانپ کر وہ بزرگ جھلا کر بولے "میاں سنتے ہو کہ نہیں؟"

مولانا نے آخر کروٹ لی - "فرمائیے کیا بات ہے؟"

’’بات یہ ہے کہ ذرا اپنی اہلیہ محترمہ کو بستر سے اٹھا کر بٹھائیے ۔ اور اپنے ساتھ بچوں کو بھی اس برتھ پر بٹھا دیجئے ۔ دوسری برتھ پر دوسرے مسافروں کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ پیدا کر دیجئے ۔،، ان بزرگ نے ایک ھی سانس میں حرف مطلب بیان کر ڈالا ۔

مولانا بولے ’’ میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ۔ رہا بچوں کا معاملہ تو وہ میرے پاس بیٹھے ھیں اور بیٹھے رھینگے ۔،،

’’ مگر یہ تو مردانہ ڈبہ ہے ۔ آپ نے اپنی اہلیہ کو زنانہ ڈبے میں کیوں نہیں بٹھایا ؟ ،،

’’ نہیں بٹھایا ۔ آپ سے مطلب ،،؟ مولانا نے برابر کی جھلاہٹ سے جواب دیا ۔
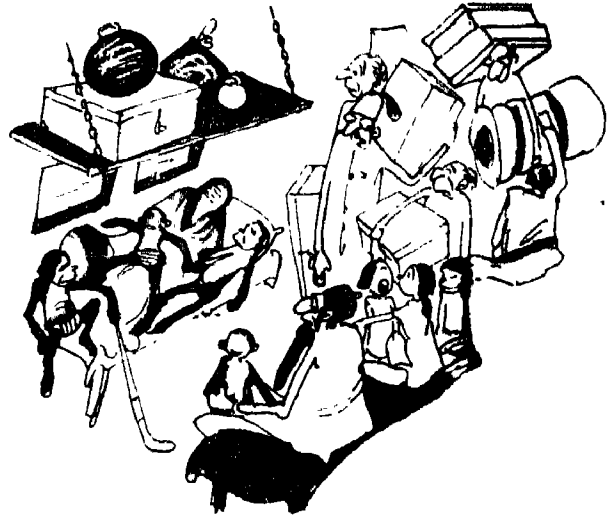
الاٹ بنام . . . .

’’ایک تو درجن بھر بچے ساتھ ھیں ۔ اس پر بیگم صاحبہ کو بھی ھمارے سر پر مسلط کر دیا ہے ۔ آخر آپ کو دوسرے لوگوں کی سہولت کا بھی خیال ہونا چاھئیے ۔،، بزرگ بولے ۔

’’ارے صاحب، انہیں سہولت کا خیال ہوتا تو درجن بھر بچے پیدا ھی کیوں کراتے ،، کسی دل جلے نے لکڑا لگایا ۔

’’ یہ درجن بھر بچے میرے ھیں، آپکے نہیں ۔ ان کا پالنے والا خدا ہے، آپ نہیں ۔ ان سے راحت یا تکلیف مجھے ہوتی ہے ، آپ کو نہیں ۔ آپ کو یہ ناگوار کیوں گذر رہے ھیں ؟،، مولانا نے اپنے مقدس چہرے پر جلال پیدا کرتے ہوئے کہا ۔

’’ ٹھیک ہے ،، دل جلے نے مسکراتے ہوئے کہا ’’ لیکن فی الحال آپ کی اس فوج ظفر موج سے

فوج ظفر موج

تو سارا ڈبہ پریشان ہے ۔ اور آپ کو تو خیر کوئی تکلیف نہیں ۔ مگر آپکی بیگم .... ،،

بیگم نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی اور ان کے اوپر پڑا ہوا چھوٹا بچہ جھٹکے سے نیچے آن پڑا ۔ مولانا گھبراہٹ میں جھکے تو ان کے زانو سے لگا ہوا بچہ بھی گر گیا ۔ دونوں بچوں نے ابھی رونا شروع ھی کیا تھا کہ دوسرے چھوٹے بچے بھی سا ۔ رے ۔ گا ۔ ما کے کورس میں شریک ہوگئے ۔ مولانا نے جلدی سے چھوٹے بچے کو دوبارہ بیوی پر دے پٹخا ۔ دوسرے کو اٹھا کر گود میں لے لیا ۔ اور بقیہ کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا ۔ دوسرے بچے تو سہم کر چپ ہوگئے مگر چھوٹا بچہ اب بھی شدت سے رو رہا تھا اور مولانا اس ننھی سی جان کو بری طرح کوس رہے تھے ۔ ساتھ ھی بیگم کو بھی چند خطابات سے سرفراز فرما رہے تھے ۔ آخر برقع میں لپٹے ہوئے جسم کو خفیف سی حرکت ہوئی ۔ برقعے سے دو سوکھے ہوئے ھاتھ باھر نکلے اور بچہ کو برقعے میں گھسیٹ لے گئے ۔

اس چیخ پکار سے ڈبے کے لوگ خاموش ہو چکے تھے ۔ شاید بچوں کے خیال سے وہ بزرگ سیٹ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور وہ دل جلے صاحب بھی اپنی مسکراھٹوں کو سمیٹ کر کونے میں دبک چکے تھے ۔ مولانا کی ھیئت کذائی پر ترس کھا کر آخر ایک نیم حکیم قسم کے صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے روتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا لیا ۔ مولانا نے پہلے تو ان نئے ھمدرد کو بھی شبہ کی نظروں

سے دیکھا - لیکن ان صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے کسی مزاحمت کا خیال ترک کر دیا -

آخر مولانا کی رگ حمیت بھی پھڑکی - انہوں نے ایک بچہ کو اور اپنی گود میں بٹھا لیا اور ان صاحب کے لئے جگہ خالی کر دی - ''آئیے تشریف رکھئے،، مولانا نے کہا -

'' نہیں نہیں - آپ آرام سے بیٹھے رہیں ،، دوسرے صاحب نے جواب دیا -

رسمی تکلفات کے بعد نئے صاحب سیٹ پر براجمان ہو چکے تھے - اور وہ بزرگ اس مجرب نسخے کے بروقت یاد نہ آنے پر شرمندہ تھے -

'' کب سے علیل ہیں آپکی اہلیہ؟،،

'' جی گذشتہ تین سال سے ،، -

نئے صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا : '' دیکھئے میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں البتہ ڈاکٹروں کے ساتھ بہت رہ چکا ہوں - مجھے آپکی اہلیہ کی طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے، انہیں ایسی حالت میں سفر نہ کرنا چاہئے تھا - اور آپکے بچوں کی صحت بھی کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی -''

'' جی ہاں '' مولانا نے جواب دیا - '' مولا کی مرضی ،، -

'' جی مولا کی مرضی میں تو کوئی شک نہیں لیکن آپ اپنی مرضی کے مالک خود بھی تو ہیں - معاف کیجئےگا آپکی آمدنی کتنی ہے؟'' '' آمدنی کب ہے - جناب! ایک مدرسہ کھول رکھا ہے - چند بچوں کو پڑھاتا ہوں اور بس - دال دلیہ پورا ہو ہی جاتا ہے ،، -

'' خوب! مختصر سی آمدنی میں اتنا بڑا خاندان! آپ کی ہمت قابل داد ہے ،، - یہ جملہ سن کر مولانا اس طرح مسکرائے جیسے انہیں رستم زماں کا خطاب مل گیا ہو - لیکن مولانا نے اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا '' جی یہ تو سب نیلی چھتری والے کی دین ہے - اس میں بشر کیا کر سکتا ہے؟ ،،

'' جی بشر کیا نہیں کر سکتا؟ آخر خاندانی شیرازہ‌بندی بھی تو کوئی چیز ہے - وہی جسے خاندانی منصوبہ‌بندی بھی کہتے ہیں ،، - خاندانی منصوبہ بندی کا نام سن کر مولانا اس طرح اچکے جیسے انہیں کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو - '' لاحول ولاقوۃ! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ خاندانی منصوبہ‌بندی نہ کہئے نسل کشی کہئے - قدرت کے کاموں میں دخل در معقولات! ،، مولانا کے ہونٹوں سے کف جاری تھے -
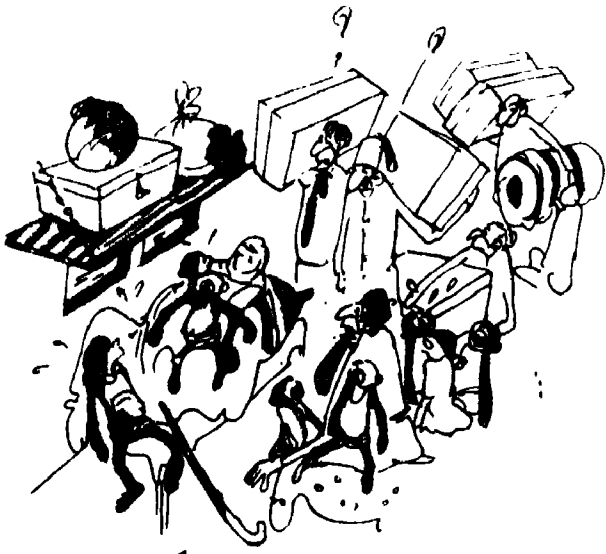
کورس !

'' مگر مولانا - آپکی بیوی کی صحت، آپکی معاشی حالت اور ملکی وسائل کی کمی - یہ تمام باتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ آپ فکر سلیم کے بجائے بے بنیاد جذبات سے کام لے رہے ہیں -''

'' میری بیوی کی صحت اور میرے معاشی حالات سب قسمت کے کھیل ہیں اور ملکی وسائل کی ذمہ‌داری حکومت پر ہے، مجھ پر نہیں - بیوی کی صحت کیلئے میں تبدیلئی آب و ہوا کر رہا ہوں - انشاءاللہ تعالیٰ ٹھیک ہو جائینگی ،، -

'' آپ کو یہ خیال کتنے دن کے بعد آیا ہے؟ میرا مطلب ہے کتنے دن ہو گئے آپکی شادی خانہ‌آبادی کو؟ ،،

'' گیارہ سال ،، مولانا نے دولہا کی طرح شرماتے ہوئے کہا -

'' ہوں! گیارہ سال کے بعد —— آٹھ بچے ساتھ لے کر —— آپ آب و ہوا کے ذریعے تریاق حاصل کرنے چلے ہیں؟ افسوس آپ نے ،،

مولانا نے جیسے یہ بات نہیں سنی ۔ وہ مسکرا کر بولے ۔ ''جی اب بھی بیگم امید سے ہیں —— انشاءاللہ اگلے چاند تک ——''

ابھی یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ کسی نے آواز دی ''ٹی ٹی آگیا'' ۔

مولانا ٹی ٹی کا نام سنکر ایکدم گھبرا کر اٹھے۔ ''کدھر؟'' مولانا نے بے ساختہ کہا ۔

''وہ رہا'' ٹی ٹی ڈبے کے آخری کونے پر چیکنگ میں مصروف تھا ۔ مولانا نے اپنے بچے جلدی جلدی اٹھا کر بیوی پر ڈالنا شروع کردیئے ۔ اور اپنے نیچے سے لحاف اٹھا کر بچوں سیمت بیوی کو ڈھانپ دیا ۔ مولانا کے پاس دو بڑے بچے بیٹھے رہ گئے تھے ۔ باقی چھ بچے بیوی کے ساتھ تلے اوپر لحاف میں دبک چکے تھے ۔ اور وہ اس طرح خوش تھے جیسے مولانا نے پہلے ہی یہ ترکیب انہیں حفظ کرادی تھی ۔ بچوں کے تڑپڑ اوپر گرنے سے بیوی نے ایک زور کی چیخ ماری اور چپ ہوگئی ۔ مولانا کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا ۔ انہوں نے گھبرا کر انہیں بزرگ کو آواز دی کہ ذرا آپ میرے پاس آکر بیٹھ جائیے ۔ خالی جگہ دیکھ کر ٹی ٹی کو شبہ ہوگا اور ساتھ والے صاحب سے بولے کہ ''میں غریب آدمی ہوں، میرے پاس صرف تین ٹکٹ ہیں ۔ آپ حضرات ذرا خیال رکھئیےگا'' ۔

وہ بزرگ آگے بڑھے ۔ انہوں نے نیم ہمدردانہ لہجے میں کہا ''آپ فکر نہ کریں ۔ ہم کچھ نہیں کہینگے'' ۔ غربت کا نام سن کر مسافروں کی قدرتی ہمدردی عود کر آئی تھی اور وہ سب ٹی ٹی کے آنے کے منتظر تھے ۔ دفعتاً گاڑی جھٹکا کھا کر رک گئی ۔ کسی بلا ٹکٹ مسافر نے چھلانگ لگا دی تھی ۔ ٹی ٹی گاڑی سے اتر چکا تھا ۔ بھاگنے والا ھاتھ آیا یا نہیں، اسکا پتہ نہیں ۔ لیکن ڈبے میں ٹی ٹی دوبارہ داخل نہیں ہوا ۔ مولانا نے اطمنان کی سانس لیکر مسکراتے ہوئے بیوی کے اوپر سے لحاف اٹھایا ۔ بچوں کو کہا ''اتر آؤ سالو'' ، چھوٹے بچے کے ھاتھ سے بیوی کی نقاب چہرے سے ہٹ گئی تھی ۔ مولانا نے جھک کر بیوی کو ٹی ٹی کے چلے جانے کا مژدہ سنانا چاھا ۔ وہ ابھی جھکے ہی تھے کہ انہوں نے اسطرح پلٹا کھایا جیسے انہیں بجلی کا کرنٹ لگا ہو ۔ انکے حلق سے خوفناک آواز نکلی : ''میری بیوی! میری بیوی!'' ۔ لوگ ایک دم چھپٹے اور پھر ٹھٹک کر رہ گئے ۔ زرد آم کی طرح ستے ہوئے چہرے کی دو بے رونق آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی تھیں ۔ مولانا کی آنکھ سے دو آنسو گرے ۔ اور پھر خشک ہوگئے ۔

لوگ بےپردگی کے خیال سے مایوسی کے ساتھ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے اور توبہ و استغفار کر رہے تھے ۔ ہر شخص تصویر غم بنا بیٹھا تھا ۔ مولانا کے ھاتھ آہستہ آہستہ شیروانی کی جیب میں گئے ۔ انہوں نے جیب سے ایک خط نکالا اور کھڑکی سے باھر پھینک دیا ۔ لیکن وہ خط ہوا کے دباؤ سے میرے پاس آگرا ۔ میں نے مولانا کی نظر بچا کر وہ خط کھولا ۔ یہ ان کے کسی مرید کا تھا ۔ اس نے لکھا تھا : شادی کی بات پکی ہوگئی ہے مگر شرط یہ ہے کہ شاہ صاحب اپنی پہلی بیوی کو مع بچوں کے میکے چھوڑ آئیں یا اسے طلاق دے دیں ۔ بیوی اور بچوں کی موجودگی میں لڑکی والے شادی کرنے پر تیار نہیں ۔

میں نے خط پڑھ کر مولانا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا ۔ وہ مطمئن بیٹھے تھے ۔ نئی شادی اور شاید نئے بچوں کے خیال سے!

★

سر ورق : میلہ کی طرف

رنگین نقش : زبیدہ آغا

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کیلئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی کی کتابیں، رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہِ راست حسبِ ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جاسکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔

"ادارہ مطبوعات پاکستان" معرفت پاکستان ہائی کمیشن، شیر شاہ میس روڈ، نئی دہلی ہندوستان۔

منجانب

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

"ماہِ نو" کے لئے
غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مطبوعہ مضامین ناقابلِ اشاعت تصور کئے جائیں۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعۂ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کرسکے اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس و سرشار کرسکے۔

نوائے پاک میں ملک کے نامور شعرا کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں، گیت اور ترانے درج ہیں۔

کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گرد پوش سے آراستہ۔ "گیٹ اپ" بہت نفیس اور دیدہ زیب۔ قیمت صرف دو روپے۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

کیا آپ اپنی کار کے پہیوں کو
سیدھا نہ رکھنے کے قصوروار ہیں؟
پٹرول کی بچت کرنے کے لئے پہیوں کا سیدھا ہونا ضروری ہے
اگر پہیئے سیدھے نہ ہوں تو ٹائر ایک جانب سے پھٹ جاتا ہے، پہیئے ڈگمگاتے
ہوئے گھومتے ہیں، ٹائر راستہ پر بہت جلد گھس کر خراب ہو جاتے ہیں اور
پٹرول بھی ضائع ہوتا ہے۔ ہر پانچ ہزار میل کے بعد
اپنے پہیوں کی جانچ کیجئے۔ ساتھ ہی ٹائروں کو
ادل بدل کیجئے تاکہ پٹرول کی بچت ہو۔
اور ہر میل پر پیسے کی بچت کے لئے!
موبل گیس
استعمال کیجئے۔ اس کے ہر ایک گیلن سے آپ کی کار زائد میل چلتی ہے!
موبل آئل
کے استعمال سے آپ کی کار کا انجن زیادہ عرصہ تک کارآمد رہتا ہے
اسٹنڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی
(محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے میں قائم شدہ)
کراچی۔ ڈھاکہ۔ لاہور۔
Mobilgas
Mobiloil
لال گھوڑے کے نشان پر رکئے جہاں آپکی خدمت کے سب خواہاں ہیں
SV 971

جلد ۱۳ — شمارہ ۹

ماہِ نو

ستمبر ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی — فی کاپی: آٹھ آنے

آفتابِ بامِ شرق*

لارڈ پیٹرک سپینس

میں واقعی اسے بہت بڑا اعزاز خیال کرتا ہوں کہ آج قائدِ اعظم محمد علی جناح کے یومِ پیدائش کے موقع پر آپ نے مجھے سرکردہ مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر محمد علی جناح نہ ہوتے اور اُس وضع کے انسان نہ ہوتے جو وہ تھے تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ اسلئے میں خیال کرتا ہوں کہ آپ میں سے جو لوگ پاکستان سے محبت کرتے اور اسی کے لئے جیتے ہیں ان کے لئے، نیز ہم میں سے ان لوگوں کے لئے جو ایک ایسے پُرعظمت انسان کو تعریف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک کا باعث ہوا ہے، مناسب ہے کہ وہ کبھی کبھی آپس میں مل بیٹھیں۔ اور اس کی تعظیم و تکریم کے لئے اس کی سالگرہ یا یومِ پیدائش سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے آپ یہ پوچھیں میں مسٹر جناح کی یاد میں تقریر کرنے کی ذمہ داری کیوں قبول کر رہا ہوں؟ میں ان کے متعلق کیا جانتا ہوں؟ میں ان سے کیسے روشناس ہوا اور کس حد تک تاکہ یہ تقریر محض سیاسی نہ بن کر رہ جائے (کیونکہ ایک ایسے شخص کے لئے جو برصغیر میں اعلیٰ ترین عدالتی عہدے پر فائز رہا ہو، یہ بالکل نامناسب ہوگا) بلکہ ایک ذاتی تقریر ہی رہے۔ اسلئے کہ مجھے نہ صرف مسٹر جناح کو جاننے کا موقع ملا بلکہ میں نے ان کو جاننے پر پسند بھی کیا، انکی تعظیم کی۔ اور آج آپ کے سامنے بعض ان مواقع کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جب میری اُن سے ملاقات ہوئی اور بعض معاملات میں سروکار بھی رہا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں ۱۹۴۵ء میں ہندوستان کے فیڈرل کورٹ میں چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہو کر گیا تھا۔ اس وقت کانگرسی لیڈر اپنے ہی قول کے مطابق "طوعاً و کرہاً بہ کارِ سرکار ماخوذ" ہو گئے تھے۔ یعنی انہیں بہار کے ۱۹۴۲ء میں آشوب و فساد کے بعد یونہی اضطراری طور پر چن لیا گیا تھا اور خود کانگریس کے اندر بھی کافی خلفشار تھا۔ اور یہ خلفشار اس وقت تک ناگزیر رہا جب تک مہاتما گاندھی ۱۹۴۵ء کے اوائل گرما میں جیل سے رہا ہو کر نہیں آ گئے۔ اس دوران میں مسٹر جناح بلا شرکت غیرے مسلمانوں کے نمائندہ تھے۔ اُدھر نواب زادہ لیاقت علی اور ان کی بیگم صاحبہ دہلی میں مقیم تھے اور میری سکونت کے ابتدائی سالوں اور مہینوں میں سیاسی صورت حال کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سیاسی جماعتوں کی لگاتار کشمکش کے باعث بدترین درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ مسٹر جناح اور لیاقت علی بڑی ہی تن دہی سے مسلم لیگ کی تنظیم و استحکام کی کوشش کر رہے تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے آئندہ صورتِ حالات کو اس نظر سے دیکھنے کی سعی کر رہے تھے جس سے وہ خود دیکھتے تھے۔ مگر، جیسا کہ ظاہر ہے مجھے مسٹر جناح کی سیاسی جد و جہد سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ میں ان سے زیادہ واقف ہی تھا۔

اچھا اب ہمارے روابط کی طرف آیئے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں مسٹر جناح بھی میری ہی طرح انگلستان کے سند یافتہ بیرسٹر تھے۔ انہوں نے بھی وہی تربیت پائی تھی اور بیرسٹری کی روایات، نظم و ضبط اور اخلاقی رویّہ کا وہی درس حاصل کیا تھا جو ہم سب کے رگ و ریشہ میں شروع ہی سے رچ بس گیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی زندگی کے ایک دور (۱۹۳۱-۳۵ء) میں ہندوستان سے مایوس ہو کر لندن آئے ہوئے تھے تاکہ وہ پریوی کونسل میں پریکٹس کریں۔ ان دنوں میں نے یقیناً ان کا چرچا سنا تھا۔ اس نوجوان

---

* "آفتابے بختم بر شامِ شرق"

خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے (اقبال)

(غیر منقسم ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے آخری چیف جسٹس لارڈ پیٹرک سپینس نے یہ تقریر لندن میں قائدِ اعظم کے یومِ پیدائش کی اس تقریب میں کی تھی جو پاکستان سوسائٹی لندن اور پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن (برطانیہ) کے زیرِ اہتمام جنوری میں منعقد ہوئی تھی)

دوستانی بیرسٹر کا چرچا جس نے پریوی کونسل میں دفعتہً بڑی تیزی سے
ڑوں کی صفِ اوّل میں نام پیدا کر لیا تھا۔ اور مسٹر جناح نے بھی اظہار
م فرمایا تھا کہ انہوں نے بھی اسی زمانہ میں "چانسری" کے ایک نوجوان بیرسٹر کی
ثیت سے میرا چرچا بھی سنا تھا۔ مگر یہ ایک ہی پیشہ کی مشترکہ دلچسپیاں
قیں جن کے باعث میرا مسٹر جناح سے پہلی بار تعارف ہوا۔ میری اہلیہ
ریں مسٹر اور بیگم لیاقت علی سے بھی ملے تھے۔ ہم نے انھیں پسند کیا تھا اور
ے دوسرے کے یہاں آتے جاتے تھے۔ بلکہ ان دونوں کے ساتھ برج
ی کھیلتے رہے۔

انہی کی وساطت سے ہمیں اپریل ۴۴ء میں چیدہ اصحاب پر
مل ایک چھوٹی سی دعوت میں مدعو کیا گیا جس میں ہمیں مسٹر اور مس جناح
ے ملاقات کرنی تھی۔ ایک بڑی ہی اہم صحبت۔ خیر، میری اہلیہ، میں میرا
یا اور داماد سب لیاقت علی خاں کے ہاں گئے۔ اس موقع پر تین چار
ر بھی مہمان تھے جن میں سے ایک سر کلاڈ آکنلک، کمانڈر انچیف بھی تھے
ب میں نے حال ہی میں اپنی ڈائری پر نظر ڈال کر دیکھا کہ میں نے
پریل ۴۴ء کے اس دن کی دعوت کے سلسلہ میں کیا لکھا تھا تو یہ الفاظ
کھائی دئے کہ سر کلاڈ آکنلک بھی اس صحبت میں شامل تھے اور میں نے
سٹر جناح کے ساتھ کوئی خاص بات چیت نہیں کی تھی بلکہ سارا وقت
آک ہی ان سے گفتگو کرتے رہے تھے۔ آپ میں سے جو اصحاب "آک"
جانتے ہیں، اور میں تو ان کو خوب جانتا ہے — محسوس کریں گے کہ
ردر ایسا ہی ہوا ہوگا۔ یادداشت بالکل صحیح ہے۔ گو مجھے بلاشبہ مسٹر جناح
ے ساتھ اس پہلی ملاقات سے مایوسی ہوئی، پھر بھی ان کی شخصیت نے ہم پر
ڑا اثر چھوڑا۔ جیسا کہ وہ سب ملنے والوں پر پہلی ہی بار، جب وہ خوش طبعی
ے عالم میں ہوں، ایسا اثر چھوڑتے تھے جو دل و دماغ سے کبھی دور نہیں ہو سکتا۔
ن کی دراز قامتی، انتہائی نفیس لباس، خط و خال کی رعنائی اور وہ انتہائی
ش خلقی جس سے وہ دعوت میں سب کے ساتھ پیش آئے۔ ان کی بدولت
نہوں نے جو تاثر پیدا کیا اس سے بہتر تاثر شاید ہی کوئی پیدا کر سکتا۔

واضح رہے کہ میں نے مسٹر جناح کے بارے میں ہمیشہ اچھی باتیں
ی سنی تھیں۔ میں سب سے زیادہ ان کی خوش خلقی کا ذکر کروں گا۔
تقریباً پاسِ ادب کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور میری یادداشت میں
ہمیشہ محفوظ رہی ہے۔ میں ہمیشہ یہی محسوس کرتا رہا ہوں کہ ان کے برتاؤ
ں واقعی خلوص کار فرما تھا۔ اس سے میرے دل میں بہت ہی عزت افزائی
کا احساس پیدا ہوا۔ مگر مجھے ہمیشہ یہی یقین رہا ہے کہ یہ انگلستان کے پیشۂ
بیرسٹری کے آداب شائستگی اور ان لوگوں کے بارے میں ہمارے مشترک احساس
ہی کا نتیجہ ہے جو انگریزی قانون کے تحت اعلیٰ عدالتی مراتب تک رسا ہوئے۔
بہرحال ہماری باہمی شناسائی کے تمام عرصہ میں مسٹر جناح میرے ساتھ بڑے
ہی ممکن پاسِ ادب سے پیش آتے رہے۔ اس بات نے، جیسا کہ میں
عرض کر چکا ہوں، میرے دل میں بہت ہی عزت افزائی کا احساس پیدا
کیا۔ اور یہی غالباً — سچ پوچھئے تو مجھے اس کا بدرجۂ اولیٰ وثوق ہے —
ہماری ایک دوسرے کے لئے بڑھتی ہوئی عزت و توقیر بلکہ دلی محبت کا
باعث ہوا جبکہ ہمیں ایک دوسرے کو قدرے پرشور سیاسی زمانے کے
دوران ذرا بہتر طور پر جاننے کا موقع ملتا رہا۔

بے شک اس پہلی ملاقات کے بعد ہمیں دہلی میں ۴۵-۱۹۴۴ء
کے دوران وقتاً فوقتاً ملنے کا اتفاق ہوتا ہی رہا۔ بلکہ کبھی کبھار ۱۹۴۶ء میں
بھی — ان کی رہائش گاہ پر۔ اب بھی میں اس مکان تک تقریباً آنکھیں
بند کئے ہی پہنچ سکتا ہوں۔ اگرچہ میں یہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ
وہ کن کن سڑکوں کے سنگم پر واقع ہے۔ ہماری اور لوگوں کے یہاں بھی ملاقات
ہوتی رہی میرے اپنے گھر ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ چیف جسٹس کی
حیثیت سے میں بڑی احتیاط برتتا تھا کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں
کے سربراہوں سے نجی طور پر زیادہ کھلے بندوں نہ ملا کروں۔ اگر پریس کو یہ
پتہ چل جاتا کہ چیف جسٹس کسی سیاسی جماعت کے لیڈر کو اپنے گھر دعوت
دے رہا ہے تو یہ اچھا نہ ہوتا۔ مگر ہم دونوں اکثر ملتے ہی رہے۔ اور پھر وہ
یادگار موقع آیا جس کا میں قبل ازیں آپ کے پیشروؤں سے بھی ذکر کر چکا ہوں۔
اس واقعے کی یاد میرے دل میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ یہ ایک اتفاقی ملاقات
تھی۔ میری اہلیہ اور میں دہلی کے ایک سینما میں گئے ہوئے تھے۔ سینما کے
آخر میں دو باکس تھے۔ باقی سب سے الگ۔ ایک تو ہمیں ملا اور دوسرا
مسٹر اور مس جناح کو۔ جونہی مسٹر جناح نے ہمیں آتے دیکھا، انہوں نے تجویز
کیا کہ مس جناح میری اہلیہ کے پاس بیٹھیں اور میں ان کے ساتھ۔ چنانچہ
ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہم دونوں اکٹھے بیٹھے۔ فلم بڑی لمبی تھی۔ اور مسٹر جناح
نے کوئی دو گھنٹہ مجھ پر جرح کی۔ جو موضوعات انہوں نے اس مقصد کیلئے
چنے وہ یہ تھے کہ پاکستان قائم ہونے کی صورت میں دستور، نظم و نسق
اور عدلیہ میں کیا کیا تبدیلیاں ضروری ہوں گی۔ مجھے بعض بہت ہی مشکل
اور ذرا ٹیڑھے سوالات کا جواب دینا پڑا۔ جیسا کہ آپ بخوبی تصور کر سکتے

ہیں۔ تاہم میں نے ان کا جواب دینے کی پوری پوری کوشش کی۔ اور میں مسٹر جناح کے ذہن کی تیراقی اور تیزی سے بے حد متاثر ہوا۔ فرا بھی کسی سوال کا چلتا ہوا جواب دیا اور انہوں نے جھٹ مجھے پکڑا اور سوال در سوال کرتے چلے گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ وہ ہر معاملہ کی تہ تک عملی انداز سے پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا مقصود ایک اور صرف ایک ہی تھا، اگر پاکستان کو قائم ہونا ہے تو اس کے راستے میں کیا رکاوٹیں آسکتی ہیں۔ وہ بس اتنا ہی جاننا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے ظاہر ہے ان کا یہ مفروضہ ہوگا کہ میں ممالک عالم کے دستوروں سے آگاہ ہوں گا۔ نیز یہ کہ عدلیہ اور اس کے عواقب رسمیہ کیا ہیں۔ مجھے ان کا بھی پتہ ہوگا۔ مزید برآں میں اپنی زندگی کے گزشتہ طویل دور میں کئی طرح کے انتظامی مسائل سے دوچار بھی ہوا تھا۔ بہر کیف واقعہ صرف اس قدر ہے کہ صرف یہی اور حقیقی معنوں میں صرف ایک یہی ایسی سنجیدہ گفتگو تھی جس کا مجھے عین تقسیم کے دن تک اتفاق ہوا۔ میری جناح کے ساتھ وکلائے انگلستان میں سے بعض پرانے دوستوں اور حریفوں کے متعلق بھی کافی بے تکلف گفتگو رہی۔ خاص طور پر ان بزرگوں کے بارے میں جو مسٹر جناح کی وکالت کے زمانے میں پریوی کونسل کی عدالتی کمیٹی کے اراکین تھے۔ اور وہ ان کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ مسٹر جناح اس زمانے کا بڑے فخر سے ذکر کرتے تھے۔ اس دور کے قصے بے کم و کاست سنا کر مزے لیا کرتے تھے۔ میں چاہتا ہوں۔ کیونکہ اور سب لوگ سیاست داں وغیرہ تو مسٹر جناح کے متعلق بات چیت کرتے ہی ہیں۔ مگر وکلا شاذ و نادر ہی ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کہ ایک وکیل کی حیثیت سے آپ کو یہ ذہن نشین کرا دوں کہ وہ زمانہ ۳۵ - ۱۹۳۱ء، اس معرکہ آرا انسان کی زندگی کا سب سے مہتم بالشان دور تھا۔ مسٹر جناح نے لندن میں کبھی پریکٹس نہیں کی تھی۔ لیکن جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے کسی نے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ ممکن ہے بعض نے ان کا سیاست دان کی حیثیت سے تذکرہ سنا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پریوی کونسل کے جہاں دیدہ اراکین ان کو کہیں زیادہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ جب وہ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں انگلستان آئے تو انہوں نے ہیمپسٹیڈ میں ایک گھر کرایہ پر لیا۔ "کنگز بینچ واک" میں اپنا دفتر وکالت قائم کر کے پریکٹس شروع کر دی۔ میں نے اسی ہی ہفتہ کے آغاز میں پریوی کونسل کی مسلوں پر نظر ڈالی جن میں مسٹر جناح بحیثیت وکیل پیش ہوئے تھے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، انہوں نے مئی یا جون ۱۹۳۱ء میں گھر کرایہ پر لیا تھا۔ ان کا پہلا رپورٹ شدہ کیس اکتوبر و نومبر ۱۹۳۲ء کا ہے اور ۱۹۳۵ء میں وہ ہندوستان واپس چلے گئے۔ ان دونوں تاریخوں کے درمیان ان کا نام اپیل کے کچھ نہیں تو کوئی سولہ سترہ کیسوں میں نظر آتا ہے جو پریوی کونسل کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ آپ میں سے جو لوگ وکالت پیشہ نہیں وہ نہیں جان سکتے کہ اس بات کی اہمیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بے شک انہیں بمبئی کے پرانے مؤکلوں کی طرف سے بھی کافی تقویت ملی مگر انہوں نے میرا خیال ہے، دنیا کی سب سے کڑی جانچ کرنے والی عدلیہ میں اپنا نام پیدا کر ہی لیا۔ اور اس عدلیہ کا ذکر خیر میں نے اس امریکی نمائندہ کا پورا پورا پاسِ خاطر کرتے ہوئے، جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ امریکہ کی عدالت ہائے عالیہ کا احترام بجا لاتے ہوئے، کیا ہے۔ میرا خیال ہے پریوی کونسل سب سے زیادہ کڑی مبصر واقع ہوئی ہے۔ ویسے یہ عدالت بڑی شفیق اور خلیق ہے لیکن معاملات کی جانچ پرکھ میں بے انتہا سخت ہے اور کوئی شخص بھی، جو اوّل درجہ کی ذہانت کا مالک، حق وکالت ادا کرنے کا غیر معمولی اہل، اور سب سے بڑھ کر بلا کا دقیقہ رس، زیرک اور منجھا ہوا نہ ہو، اتنے تھوڑے عرصہ میں اس قدر شاندار پریکٹس پیدا نہیں کر سکتا، جتنی کہ مسٹر جناح نے پریوی کونسل میں پیدا کر لی تھی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا مجھے قطعی یقین ہو چکا تھا کہ جس دور کو میں اپنا دور کہتا ہوں وہ اس میں ایک نہایت ہی معرکہ آرا شخصیت تھے۔ گو وہ عمر میں مجھ سے دس بارہ سال بڑے ہی تھے۔

۱۹۴۶ء کے بعد مجھے ان سے ملنے کا کم ہی موقع ملا۔ اور ملا بھی تو بس اس وقت جب ہندوستان میں ہمارے قیام کے آخری دن تھے۔ جولائی ۴۷ء میں ایک رائل کمیشن کلکتہ میں انتقالِ اختیارات کی کارروائی مکمل کر رہا تھا۔ میں اس کمیشن کا صدر تھا جو اگست ۱۹۴۶ء کے فسادات کلکتہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اب تقسیم کے باعث اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ۱۳ جولائی ۴۷ء کو ناشتہ کے وقت ہم نے کلکتہ کا ایک مشہور اخبار اٹھا کر دیکھا تو اس میں یہ جلی سرخی نظر پڑی کہ دونوں مملکتوں کے ما بین منقسم صوبوں کے اثاثہ جات اور دیگر کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک ثالثی عدالت قائم ہونے والی ہے جس کا صدر مجھے تجویز کیا گیا ہے۔ اب دیکھئے تو اس خبر نے ہمارے کنبہ کو عجب دبدھا میں ڈال دیا کیونکہ ہم لوگ تو اگست ۴۷ء میں وطن جانے کا انتظام کئے بیٹھے تھے۔

اور یہ اس بارے میں پہلی اطلاع تھی کہ میں مجوزہ عدالت کا صدر ہوں گا۔ بہرحال ہم نے اپنا رختِ سفر تو باندھ لیا اور دہلی واپس چلے گئے جب ہم منگل کی شام کو وہاں پہنچے تو وائسرائے کے ایک میڈی کانگ تشریف لائے اور انہوں نے مجھے اس سرکاری مراسلے کی نقل حوالہ کی جو ایک ہفتہ پہلے مجھے روانہ کیا جا چکا تھا مگر ملا نہیں تھا۔ اخبار وں تک وہ بیشک پہنچ چکا تھا۔ افراتفری کے زمانے میں ایسی باتیں، خبر نہیں کیسے، ہو ہی جاتی ہیں۔ بہرکیف مجھے اگلے دن "تقسیم کونسل" کے اراکین سے ملنے کے لئے وائسرائے کے یہاں جانا تھا۔ وہاں پہنچنے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ چند منٹ گفتگو رہی جنہوں نے مجھے بتایا کہ ماجرا کیا ہے اور ہدایت کی کہ میں مسٹر جناح سے ملوں جو ایک دوسرے کمرے میں تشریف فرما تھے۔ ظاہر تھا کہ میرے صدر ہونے کی تجویز انہوں نے ہی کی ہو گی۔ وہ جانتے تھے کہ جو انتظامات ہو رہے ہیں ان کے ماتحت میں چاہوں تو ہندوستان میں بحیثیت چیف جسٹس رہ سکتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ذاتی طور پر ملنے کی اسلئے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ مجھے ایک خاص بات ذہن نشین کرانا چاہتے تھے، یہ کہ گو وہ مجھے ثالثی عدالت کا صدر دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اگر میرا ہندوستان کی آئندہ عدالتِ عالیہ کے ساتھ کوئی تعلق رہا تو انہیں کسی صورت میں بھی میرا ثالثی عدالت کا صدر ہونا قبول نہ ہوگا۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ میں نے وائسرائے کو تین ہفتے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ سارے ہندوستان کا چیف جسٹس رہنے کے بعد اب مجھے دونوں میں سے کسی ایک مملکت کا بھی چیف جسٹس ہونا معقول نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے ایسی کسی پیشکش کو قبول نہ کر سکوں گا۔ جونہی میں نے ان کو یہ بات بتائی راہ سے ساری مشکلات فوراً دور ہو گئیں۔ پھر ان سنگین مسائل کے بارے میں جن کا ثالثی عدالت کو فیصلہ کرنا ہو گا یا اس کے فیصلہ کی سعی کرنا ہو گی، ہماری دوسری طول طویل گفتگو ہوئی۔ ایک بار پھر ان مسائل کے سلسلہ میں جن کے متعلق وہ جانتے تھے کہ ضرور بالضرور پیدا ہوں گے مجھے اُس عملی فراست کا زبردست احساس ہوا جس سے وہ ان مسائل کی طرف اعتنا کرتے تھے۔ اس وقت کوئی شخص جس کا مسٹر جناح کے ساتھ کسی معاملہ میں بھی سروکار رہا ہو، ان کی شخصیت کے اس پہلو کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ شخص انتہائی زیرک، عملی فراست کا حامل اور حقیقت شناسی کے جوہر سے متصف ہے۔ مسٹر جناح کو پیش آنے والی دشواریوں کے متعلق کبھی کوئی مغالطہ نہیں ہوا، انہیں خوب علم معلوم تھا کہ تقسیم کے باعث دونوں مملکتوں میں کیسے کیسے بے حد دشوار مسائل پیدا ہوں گے۔

یہ میری مسٹر جناح کے ساتھ آخری گفتگو تھی۔ بے شک ۴۷-۱۹۴۸ء کے اواخر میں ثالثی عدالت قائم ہو جانے کے بعد مجھے ان سے مراسلت کرنی پڑی اور میرا آخری خط مارچ ۴۸ء کے تصفیہ کے بعد ہی لکھا گیا۔ سب کو ایک مہینہ کی مہلت دی گئی تھی کہ وہ تصفیہ کے کسی جزو کی دوبارہ سماعت کا مطالبہ کریں۔ اسلئے میں نے مسٹر نہرو اور مسٹر جناح کو لکھا کہ اس ماہ کے دوران جب کہ طرفین تصفیہ کا جائزہ لینے میں منہمک ہوں گے میں اور میری اہلیہ ذرا نارتھ بورنیو ہو آئیں۔ کیونکہ وہاں بھی کچھ مسائل درپیش تھے یعنی یہ کہ میری شادی شدہ بیٹی اور اس کا شوہر اپنے جنجھٹ نبٹا رہے تھے۔ مسٹر جناح نے جواب میں جو خط خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے بھیجا وہ میری بڑی ہی عزیز اشیائے گراں بہا میں شامل ہے۔ ہمارے باہمی تعلقات کا سب سے خوشگوار تکملہ۔ کیونکہ اس وقت میرے دل میں ان کے لئے تکریم ہی نہیں بلکہ ان کی ذات سے قریب قریب انس پیدا ہو چکا تھا۔ بے شک میں جانتا ہوں کہ بہت لوگ ایسے بھی ہیں جن کا تاثر مسٹر جناح کے بارے میں کہیں مختلف ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت سے لئے دئے رہتے تھے، یہ کہ ان سے نبٹنا کار سے دارد تھا، بلکہ بعض تو ان پر کج خلق اور کڑوے ہونے تک کا الزام لگاتے ہیں۔ مگر حضرات! شاید آپ اس بات کو مانیں کہ بعض اوقات جب آپ کسی بڑے درجہ پر پہنچ جائیں تو آپ کو بعض ایسے کڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہی ہے جن سے نبٹنا بہت دشوار ہوتا ہے تا وقتیکہ آپ اُن تجویزوں کو جو آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہوں رد نہ کر دیں۔ اور جب میں ان تمام باتوں پر جو ادھر ادھر سے ۴۷-۱۹۴۶ء کے حالات کے متعلق سننے میں آئیں، پھر نظر ڈالتا ہوں اور یہ پوری طرح محسوس کرتا ہوں کہ اگر مسٹر جناح پاکستان کے سلسلہ میں شخصی طور پر وہ محکم اور اٹل رویہ اختیار نہ کرتے جو انہوں نے ۴۷-۱۹۴۶ء میں اختیار کیا اور جس پر وہ اڑے رہے تو، جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، کوئی پاکستان (کم از کم ۴۷ء میں، یا ممکن ہے آج تک) وجود میں ہی نہ آتا۔ اگر کسی شخص کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے کسی قوم کو ایک خود مختار مملکت سے بہرہ ور کیا تو وہ مسٹر جناح تھے۔ اس جد وجہد نے اُن کی صحت کو گھن لگا دیا۔ ان کی صحت یوں بھی میرے اُن کے ۱۹۴۴ء میں ملنے سے پہلے بھی خراب تھی۔

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

ایک اور سنگِ میل

(قائدِ اعظمؒ کے مزار کی تعمیر)

احسان ملک

★

"آج ہم اس امانت کو پورا کر رہے ہیں جس کا بوجھ بارہ برس سے ساری قوم کے سر پر تھا۔ قائدِ اعظم کا مقبرہ تعمیر کرنے میں تاخیر ایک ایسے رہنما کے ساتھ احسان فراموشی تھی جس نے سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کے اس خواب کو روشناسِ تعبیر کیا جو مادّی وسائل اور روحانی نصب العین کے اعتبار سے سارے عالمِ اسلام میں اپنی مثال آپ ہے۔"

"پاکستان کے علاوہ قائدِ اعظمؒ نے ہمارے لئے جو ورثہ چھوڑا ہے اس میں سب سے زیادہ درجہ ان کے کردار، بصیرت، سیاست اور تدبر کو حاصل ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے بہت کم لیڈر گزرے ہیں جنہوں نے ایک مکمل طور پر منتشر اور پس ماندہ قوم کی تنظیم کر کے اسے اتنے تھوڑے عرصے میں ایک بہت بڑے ملک کا مالک بنا دیا ہو۔ آج ہم جس آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں اور ترقی کی جو نئی نئی شاہراہیں ہمارے سامنے کھل رہی ہیں، یہ اسی مردِ مجاہد کی سرتوڑ کوشش اور محنت کا نتیجہ ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر خدا کے حضور میں دعا کریں کہ وہ ہمیں قائدِ اعظم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اُن کی سی دیانت داری، خلوص اور حب الوطنی کو ہمارے لئے مشعلِ راہ بنائے۔"

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدرِ پاکستان
تقریبِ سنگِ اساس مقبرہ قائدِ اعظم
کراچی: ۳۱ جولائی ۱۹۶۰ء

★

ایک ایسی ہستی جو ہم سب کو یکساں طور پر محبوب ہے، جس کی محبت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، جس کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔ یہ ہمارے بابائے ملت محمد علی جناحؒ کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں؟ وہ جن کی تمام زندگی قوم ہی کی بے لوث خدمت اور رہنمائی کے لئے وقف رہی۔ جنہوں نے "می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند" کے مصداق ہمیں لگ بھگ دو سو سال کی غلامی سے نجات دلائی اور اپنی آن تھک کوشش سے آزادی کے خواب کی بہت ہی دلنشیں تعبیر کی۔ پاکستان۔ یہ ایک ایسا فیضان ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

یہی احساس تھا جس کی بنا پر ہم نے انہیں "قائدِ اعظمؒ" کہا۔ اور جب پاکستان قائم ہو گیا تو "بابائے ملت" کے محبت بھرے نام سے یاد کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمارا چہیتا قائد اور بابائے ملت قیامِ پاکستان کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم سے رخصت ہو گیا تو ہمارے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ ایک ایسی یادگار قائم کریں جو اُن کے شایانِ شان ہو۔ جو بیک وقت ہماری دلی محبت کی آئینہ دار بھی ہو اور بابائے ملت کی مہتم بالشان شخصیت کی علامت بھی۔ مقامِ مسرت ہے کہ یہ خواہش انتہائی ناساز حالات کے باوجود ہمارے دلوں میں برقرار رہی اور کسی موزوں و مناسب پیرایہ میں نمود کے لئے بے تاب۔ جو لوگ بابائے ملت کی محبت اور جذبۂ حبِ وطن سے سرشار ہیں انہیں یہ شکایت ضرور ہو سکتی ہے کہ اس یادگار کی عملی تشکیل اتنا عرصہ منت کشِ انتظار کیوں رہی۔ اور وہ۔ آہ امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی۔ کے گلہ مند رہے۔

یہ ہماری قوم کی سنتِ حسنہ رہی ہے کہ کسی یادگار کی شکل میں ہم اپنے بزرگوں کا نام زندہ رکھیں۔ اور پھر قائدِ اعظم، بابائے ملت جیسی شخصیت ــــ ہمارا محسنِ اعظم، ہمارا ناخدائے قوم، ہمارا پہلا بانئ انقلاب، موجودہ انقلابِ عظیم کا پیشرو اور نقیب۔ اس لئے یہ اور بھی لازم تھا کہ اُن کی ایک نہایت عمدہ یادگار قائم کی جائے اور بہت جلد۔ ہمارا موجودہ دورِ انقلاب و ترقی جس کی روح تمام تر بابائے ملت ہی کی روح ہے، اس کام کے لئے بے حد موزوں تھا۔ اور یہ ایک عجیب خداساز اتفاق ہے کہ اس کی تکمیل کی صورت اسی دور ہی میں پیدا ہوئی۔ یوں تو بابائے ملت کی ستمبر ۴۸ء میں وفات کے فوراً ہی بعد اُن کے مزار پر مقبرہ تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی لیکن بدقسمتی

سے گیارہ سال کا طویل عرصہ بے کار منصوبہ بندی اور بحث و مباحثہ ہی میں گزر گیا۔ اور اس کی عملی تشکیل منت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہی۔

شکر ہے کہ انقلابی حکومت نے عنانِ اختیار سنبھالتے ہی اس ملی فریضہ پر توجہ دی۔ اور اس ذوق و شوق، اس عزم بالجزم، اس تیز رفتاری کے ساتھ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں مقبرہ کا ایک نیا ڈیزائن تیار ہو گیا۔ نہایت اچھوتا، نہایت شاندار ــــ اور اس طرح کم از کم ماڈل کی حد تک ہمارا دیرینہ قومی خواب پورا ہو گیا۔ اور یہ ذوق و شوق کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ اس نے ایسی تیز رفتاری سے ایک اور اہم بنیادی مرحلہ بھی طے کر لیا ہے۔ مقبرہ کی تاسیس۔ چنانچہ صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے ۳۱ جولائی کو اس کا سنگِ بنیاد بھی رکھ دیا اور اس تاریخی عمارت کی باقاعدہ تعمیر شروع ہو گئی۔ یہ کامیابی واقعی باعثِ مسرت ہے اور اس پر جتنا بھی فخر کیا جاسکے کم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری کارروائی کم سے کم وقت میں سرانجام پائی ہے جو بجائے خود کارگزاری کی ایک نادر مثال ہے۔ بلاشبہ اس یادگار مقبرہ کی تعمیر ہماری قومی تعمیرات کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس سے ہماری قابل فخر یادگاروں میں ایک اور مہتم بالشان اضافہ ہوگا۔ عروس البلاد کراچی کے لئے ایک اور سامانِ زینت۔

وہ خوش قسمت شخص جسے مقبرہ کا ڈیزائن تیار کرنے کا شرف حاصل ہے، مسٹر یحییٰ مرچنٹ ہیں۔ ان کا تیار کردہ ڈیزائن متعدد نمونوں میں سے بہترین تصور کیا گیا اور اب ماڈل سے بڑی تیزی کے ساتھ حقیقی صورت اختیار کرلے گا۔ اس ڈیزائن کے سلسلے میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان نے تقریب سنگ اساس کے موقع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"دوسری خوبیوں کے علاوہ مسٹر یحییٰ مرچنٹ کے انتخاب میں دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ مسٹر مرچنٹ بمبئی میں قائد اعظم کی زیر نگرانی کام کرچکے ہیں اور قائد اعظم ان کا کام پسند تھا۔ دوسرے محترمہ مس فاطمہ جناح کو بھی مسٹر یحییٰ مرچنٹ کی قابلیت پر پورا اعتماد ہے اور انہوں نے ان کے ڈیزائن پسند فرمایا ہے"۔

اس ڈیزائن کے تیار کرنے میں کتنی ہی باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جن کو پیش نظر رکھنا لازمی تھا۔ اول یہ کہ ڈیزائن ہماری روایات سے ہم آہنگ ہو۔ یہ اس سلسلے کو جاری رکھے جو ہمارے یہاں سالہا سال سے جاری ہے۔ اور اس میں اضافے کرے تو ایسے جو ہماری وضع میں نئی طرح پیدا کردیں۔ اور پرانے پیالوں میں نئی شراب بھر دیں۔ منظور شدہ ڈیزائن میں یہی خوبی نظر آتی ہے۔ قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج۔ چنانچہ اس میں رعنائی کے ساتھ شان طرحداری، سادگی کے ساتھ پُرکاری اور جمال کے ساتھ جلال کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ نفاست، وہ بلندی، وہ شکوہ، وہ حسن ذوق جو خاص فیضان ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں، سب اس جدت کی خبر دیتے ہیں، جو مقبرہ کو جنت نگاہ بناتے ہوئے زندۂ جاوید بھی بنا دے۔ اور انسان بے اختیار کہہ اٹھے کہ :۔

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

یہی نہیں بلکہ حسن و رعنائی کے ساتھ ناظر کے دل پر عظمت و جلال کا نقش بھی ثبت ہو۔ اس سے صاحبِ مقبرہ کی عظیم الشان ہستی کا جبروت بھی منعکس ہو۔ وہی جسے صدر پاکستان نے مقبرہ کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت "قائد اعظم کی اولوالعزمی اور کردار بلند" قرار دیا ہے۔ بلاشبہ اگر فن اس مقصد اعلیٰ کی برجستہ عکاسی نہیں کرتا تو وہ بے کار ہے۔

عظیم الشان تاریخی شخصیتوں میں قدرتی طور پر رعب و جلال پایا جاتا ہے۔ اگر تیمور کے مقبرے پر یہ رقم نہ بھی ہو۔ "شہنشاہ دوراں سلطان جہاں پناہ صاحب سیف تیمور بادشاہ فاتح عالم" پھر بھی اس کی قہرمانیت سے زائر پر دبدبہ طاری ہو جاتا ہے۔ قائد اعظم کے مقبرے میں بھی کچھ ایسے ہی جلال کے آثار نظر آتے ہیں۔ مگر دبدبے کے ساتھ شان کرم لئے ہوئے۔ کیونکہ وہ ایک مملکت کے بانی و خالق اور قائد اعظم ہی نہیں بلکہ بابائے ملت بھی ہیں۔

مقبرے کی تعمیر میں مسلمانوں کی تعمیری روایات کا ایک اور طرح بھی التزام کیا گیا ہے۔ جس طرح جہانگیر، شاہجہاں اور دیگر سلاطین و امراء کے مقبروں کے گرداگرد نہایت عالی شان اور خوشنما باغات ہوتے ہیں، اسی طرح بابائے ملت کے مقبرہ کے گرد بھی ۳۰ ایکڑ کے رقبہ میں ایک نہایت شاندار باغ لگایا جائے گا جس میں شالامار اور دیگر قدیم مغلیہ باغات کی طرح کئی تختے، پھلواریاں، روشیں، فوارے اور خیابان ہوں گے۔ یہ خوش آئند اور دلفریب

باقی ص۵ پر

حریفِ مہر و ماہ

(صدرِ پاکستان کے حالیہ ارشاد سے متاثر ہو کر کہ ہم قائدِ اعظم کے نقشِ قدم پر چلیں اور ان کے اوصافِ حمیدہ کو شمعِ راہ بنائیں)

مشتاق مبارک

چراغِ راہ تھا روشن نہ راہ بر کوئی
بھٹک رہا تھا اندھیروں میں کارواں اپنا
ہر ایک گام پہ ہمت شکن اندھیرے تھے
یہ واقعہ ہے کہ دشمن تھا اک جہاں اپنا

ہماری راہ میں غیروں کے ساتھ اپنے بھ
بچھا رہے تھے وہ کانٹے کہ الاماں کہ
قلم کو تابِ رقم ہے نہ ہمتِ اظہا
جگر فگار رہے ۔ کیسے یہ داستاں کہ

ترے نثار، تری سعی و رہبری پہ نثار — محمدؐ اور علیؓ ان پہ جان و دل قربان
امینِ مملکتِ نو بنا دیا تو نے — انہیں کے ربط سے روشن ہوا ہے نام ترا
قدم قدم پہ جہاں ہے بہارِ آزادی — انہیں کا فیض انہیں کا ہے التفات کہ آج
نشاطِ دل کا وہ گلشن کھلا دیا تو نے — حریفِ اوجِ مہ و مہر ہے مقام ترا

ترے چمن کا وہ خوش فکر پاسباں ہے آج
بچا لیا ہے تباہی سے یہ چمن جس نے
جسے خیال ہے اک اک گلِ شگفتہ کا
سکھا دیا ہمیں جینے کا بھی چلن جس نے

ہم آج اُس کی قیادت میں بڑھ رہے ہیں
ملا خراجِ قیادت کا اک زمانے
ملی ہے دولتِ فکر و عمل جسے
بہ فیضِ سرورِ دیں غیب کے خزانے

ترے مزارِ مقدس پہ کھا رہے ہیں قسم
رہیں گے تیری امانت کے پاسباں ہم لوگ
ہمیں جہاں میں یونہی سربلند رہنا ہے
جھکیں گے اب نہ کبھی زیرِ آسماں ہم لوگ

لہ صدرِ پاکستان

مزار قائد اعظم رح
کا
سنگ بنیاد
(۳۱ جولائی ۱۹۶۰ء)

صدر پاکستان
فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
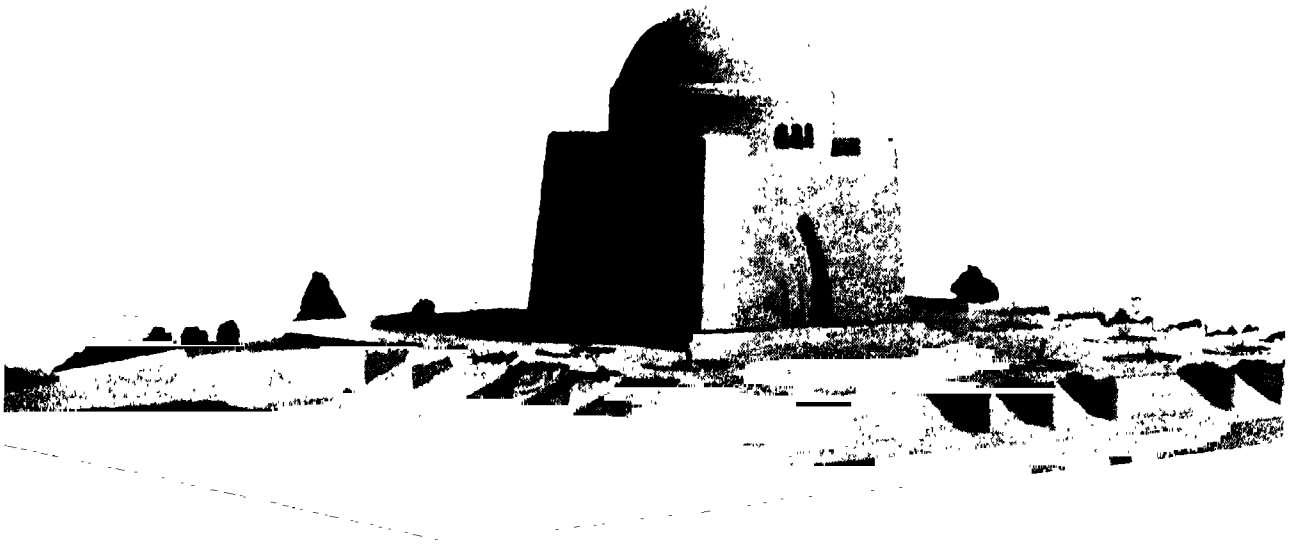
ر (حقیقت منتظر)
ن خیال : یحییٰ مرچنٹ

سنگ بنیاد
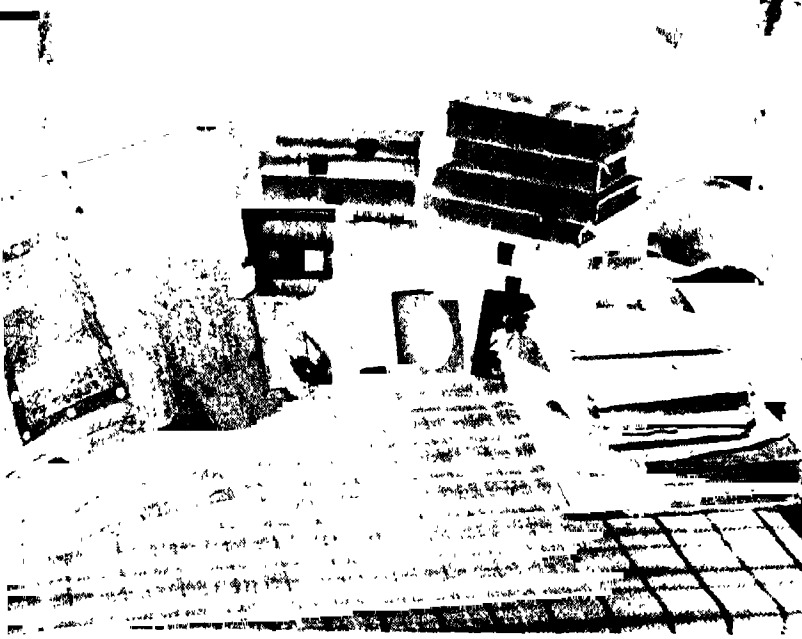
مرحوم کا علمی خزانہ

ر حسن علی آفندی مرحوم بانی سندھ
اسلام کراچی (۷۵ سالہ پلاٹینم جوبلی ستمبر ۱۹۶۰ء)
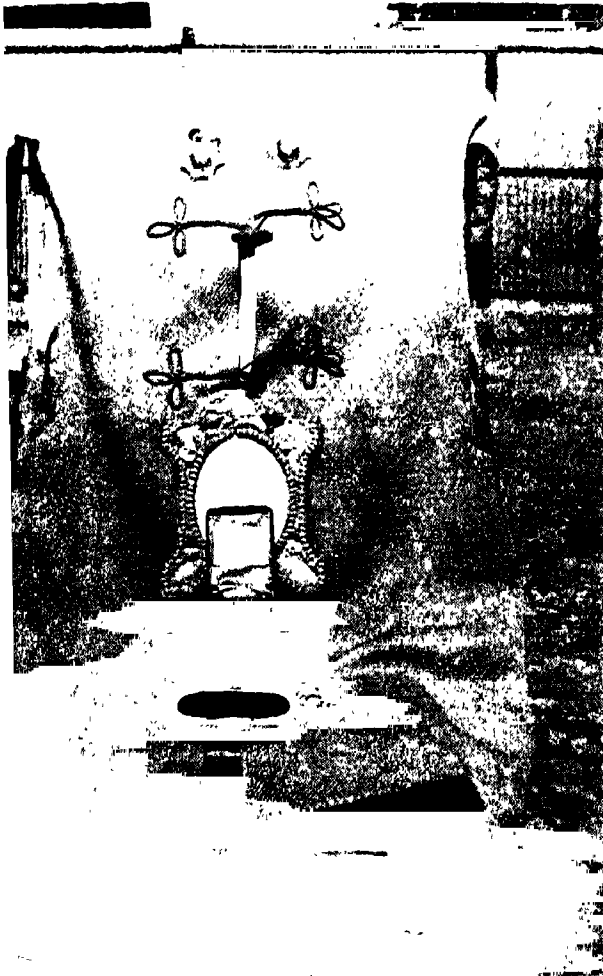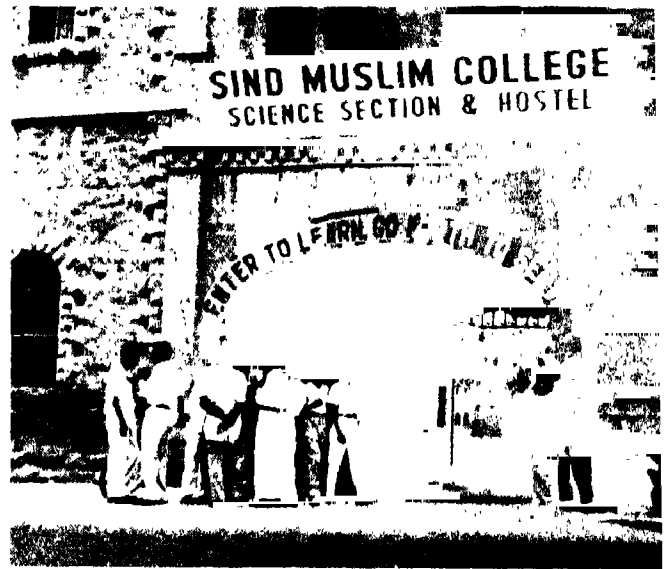
کا گہوارہ : وہ تاریخی مدرسہ جہاں قائداعظم نے تعلیم پائی

خلعت و تمغۂ مجیدی

صہبائے آبگینہ گداز

(قائد اعظم اور حسن علی آفندی بانی سندھ مدرسہ کراچی کی یاد میں)

احسن منیر

نور کے پیکر جہاں اندر جہاں یاد آگئے
جلوہ ہائے کہکشاں در کہکشاں یاد آگئے

گل بداماں روز ہائے دلنشیں یاد آگئے
خلد ساماں دور ہائے دلستاں یاد آگئے

وہ بہاریں جو بہارِ تازہ تر پیدا کریں
اُن بہاروں کے فسوں پروردگاں یاد آگئے

تھے خیاباں در خیاباں جن کے نغمے کیف بار
وہ نوازن آشیاں در آشیاں یاد آگئے

جن کے سینوں میں نہاں تھا اک جہانِ التہاب
وہ حریفِ سوزشِ برق تپاں یاد آگئے

ریت کے ذرات سے بن کر حریف آفتاب
جو ہوئے سارے جہاں میں ضوفشاں یاد آگئے

شرق سے تا غرب یکسر جگمگا اُٹھے اُفق
برقِ بے تابِ جہانِ خاوراں یاد آگئے

اس زمیں کے سینۂ تاریک سے اُبھرے ہوئے
وہ تجلی در تجلی آسماں یاد آگئے

آتشیں جم، آتشیں مے، آتشیں جامِ رحیق
آتشیں مغ، آتشیں پیرِ مغاں یاد آگئے

وادیٔ مہران کے دریائے موج انگیز کو
کر گئے جو ایک بحرِ بیکراں یاد آگئے

مدرسے کی چار دیواری سے ہو کر سربلند
جو نکل آئے تھے وہ سروراں یاد آگئے

جن میں تھے تخلیق ارض پاک کے جوہر نہاں
آج وہ خلد آشیاں جنت مکاں یاد آگئے

قائد اعظمؒ وہ مینار بلند آتشیں
اس کے شعلے آسماں در آسماں یاد آگئے

پیکر جہد و عمل، احیائے ملت کے نقیب
وہ حسن، معمار دورِ پاستاں یاد آگئے

وہ در و دیوار، وہ جلوے چراغ اندر چراغ
وہ مکینانِ دیار جاوداں یاد آگئے

پھونک دی تھی اک نئی جاں پیکرِ یخ بستہ میں
پھر وہی جادو اثر، آتش بیاں یاد آگئے

وہ فسانے جن کی رنگینی ہے سحرِ جاوداں
داستاں در داستاں در داستاں یاد آگئے

وہ دمِ آہنگ پرور وہ نفس آتش فشاں
کارواں در کارواں در کارواں یاد آگئے

"... مگر یہ دریا* کے پار ہوگا"

سید فیضی

جھیل مانسرودر کی چھاتی سے پھوٹنے والا ایک ننھا سا چشمہ اٹھکیلیاں کرتا، پہاڑوں سے ٹکراتا، سنگریزوں سے سر پھوڑتا ہوا میدان کی جانب بڑھتا نظر آتا ہے۔ اسے سندھو ندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حیدرآباد پہنچتے پہنچتے اس کی مضطرب موجیں تند و تیز ہو جاتی ہیں، اس کے پھیلتے سمٹتے ہوئے کنارے کف آلود دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک ابدی سرمستی سے ہمکنار ہو کر اس کے ہنستے ہوئے لبوں پر بہار آفریں زمزمے ناچ اٹھتے ہیں:

"میں سندھ ہوں۔ مہران ہوں۔ اٹک میرا نام ہے۔ مجھے
جہلم کہتے ہیں۔ راوی اور چناب کا خطاب دیتے ہیں۔ لیکن میں
سندھ ہوں ــــ سب سے بڑا سندھ!"

میری ناچتی ہوئی لہریں ماضی کا آئینہ ہیں۔ حال کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور مستقبل کی غوطہ زنی بھی میرے لئے مشکل نہیں ہے۔ میں بھی کاروانِ حیات کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں، ایک تازہ دم مسافر کی طرح چہرے پر عزم کی شگفتگی لئے۔ نشیب و فراز سے واقف، عروج و زوال کا تماشہ ہیں۔ بظاہر ژولیدہ و سن رسیدہ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ طوطی ہزار داستان کی طرح آج بھی میرے ہونٹوں سے جوانی کے نغمے بکھرتے ہیں، میرا شباب شیب آشنا نہیں۔ میں کب سے ہوں اور کب تک رہوں گا، مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ ہاں! میری ان آنکھوں نے زندگی کے تماشے دیکھے ہیں، اپنی اسی وادی میں سمہ اور سومرا کا اقتدار آزمایا ہے۔ کلہوڑوں کا عروج بھی میری نگاہوں میں چھپا ہوا نہیں اور میروں کی تاجداری تو کل کی بات ہے۔

میر مراد علی خاں کی بادشاہی کے دن تھے۔ حیدرآباد سولہ سنگھار کئے دلہن کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ میرے کنارے ابھی تک بدیشیوں کے قدم سے ناآشنا تھے کہ شومئی بخت سے میر نے ۱۸۳۲ء میں حکومت برطانیہ سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی رُو سے انگریزوں کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے مجھے استعمال کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہیں سے میری بدنصیبی کا دور شروع ہوتا ہے۔ میرے چہرے پر افسردگی کے گھنے بادل چھا جاتے ہیں۔ میری آزاد منش طبیعت پر چوٹ پڑتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری اس بدقسمتی کو بھانپ کر ایک سر پھرے مجذوب طی نے کہا تھا:

"افسوس! آج سندھ ہمارے ہاتھوں سے نکل
گیا۔ اب انگریز نے اس کا رستہ دیکھ لیا ہے!"

یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑ چکے تھے۔ میں علیحدہ پریشان تھا۔ اور انگریز کی ریشہ دوانیوں سے میروں کی طاقت علیحدہ زوال آشنا ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے خاندان پریشان حال تھے۔ انقلابِ زمانہ کے شاکی! لیکن وہ وقت ہی ایسا تھا۔ اور جب حالات دگرگوں ہونے لگتے ہیں تو پھر ناخنِ تدبیر بھی گرہ کشائی نہیں کرتا۔ میری آنکھیں گواہ ہیں کہ اسی حیدرآباد کے ایک مقتدر خاندان کا ایک فرد میرے گھاٹ پر لکڑیاں لادنے اور مسافروں کو آر پار لے جانے کا کام کیا کرتا تھا۔ عزم و عمل کے اس مجسمے کو پندرہ روپے ماہانہ مزدوری ملا کرتی تھی جس سے وہ اپنے کنبہ والوں کا پیٹ پالتا تھا۔ علم و دانش کی یہ بیقدری میں نے کاہے کو دیکھی تھی! میاں محمد حسین اخوند کے گھرانے کا یہ چشم و چراغ ـ حسن علی ــ مجبور تھا کہ گردشِ وقت کے ہاتھوں آوارہ و سرگرداں پھرے۔ پندرہ روپے اور اتنے بڑے گھر کی کفالت! میں حیران تھا کہ اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا، لیکن میری نگاہیں اس باہمت نوجوان کے مستقبل کا اندازہ کر چکی تھیں۔ کوٹری تک پھیلا ہوا میرا دامن زیادہ عرصے تک اس آہنیں عزم کے انسان کو اپنی طرف متوجہ نہ رکھ سکا۔ اب وہ نوشہرہ ڈویژن کے ڈپٹی کلکٹر کے دفتر میں ملازمت اختیار کر چکا تھا۔ مجھے افسوس تھا کہ میرا ایک باغیرت فرزند مجھ سے خفا ہو کر چلا گیا ہے۔ میری کوشش اُسے واپس لانے میں لگی رہیں اور وہ اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے تحصیلِ علم کے مدارج طے کرتا رہا۔ میری کوشش غالب تھی، میرے جذبات

---

* - سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا — اقبالؔ

میں خلوص تھا شاید اسی لئے حسن علی کو پھر پھرے ہی کناروں پہ دریائی بیڑے کے منتظم و مہتمم کی حیثیت سے واپس آنا پڑا ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اوّل قدم آن است کہ مجنوں باشی

بدیشی لوگوں میں نیک نفس بھی ہوا کرتے ہیں اور اُس وقت تو قحط الرجال کا زمانہ بھی نہیں تھا۔ ڈلٹن صاحب بھی اسی طرح کے ایک نیک نفس انسان تھے۔ وہ کراچی کے جج مقرر ہو کر آئے تھے۔ کراچی پہنچنے کے لیے انہوں نے دریائی بیڑے کے ذریعے مجھے پار کیا تھا اور اسی دوران میں وہ حسن علی کی اعلیٰ انتظامی قابلیت اور مدبّرانہ صلاحیت سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے اس فرزند کو مجھ سے جدا تو کر دیا لیکن میں خوش ہوں کہ یہ جدائی اُس کی ناموری کا سبب ٹھہری۔ اب وہ کراچی کی ضلع کچہری میں ایک سررشتے دار اور مترجم کی حیثیت سے مامور تھا۔ میری آنکھیں پھر بھی اُس کے تعاقب میں لگی رہیں۔ کیونکہ اس کا عروج میری شہرت کا باعث تھا، اُس کی ناموری میں سندھ کی ناموری پنہاں تھی۔ اسی لئے بحیرۂ عرب میں مدغم ہونے کے لئے جاتے جاتے میں آنکھ بھر کر کراچی کا جائزہ بھی لے لیا کرتا تھا۔ یہی میرے لئے سرمایۂ مسرت تھا۔ اور آج بھی ہے۔

ضلع کچہری کے در و دیوار سے پوچھئے تو آج بھی حسن علی کی کارکردگی ان کے لئے حسین یادوں کا خزانہ بنی ہوئی ہے۔ وکیلوں کی آزادانہ زندگی اور ان کے معزز پیشے کا احترام حسن علی کو مسحور کر چکا تھا اور اُس کے دل میں بھی وکیل بننے کی تمنا انگڑائیاں لے رہی تھی۔ چنانچہ شب و روز کی محنت سے اُس نے اتنی قانونی استعداد بہم پہنچا لی کہ مسٹر ڈلٹن نے امتحان لئے بغیر وکالت کی سند عطا کر دی۔ ایک مسلمان کا اس طرح وکالت پیشہ ہو جانا اغیار کی نگاہوں میں تو کھٹکتا رہا لیکن دیکھا جائے تو سندھی مسلمانوں کی سربلندی کا دور یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ حسن علی کی قانونی قابلیت اور مہارت نے اُسے نہ صرف کراچی بلکہ پورے سندھ سے متعارف کروا دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت بے حد سقیم تھی۔ مذہبی حلقوں کی طرف سے نہ صرف انگریزی عملداری بلکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی بھی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی اعتبار سے سندھی مسلمان پست تر ہوتے گئے اور دوسری قوموں کے افراد آگے بڑھتے گئے۔ حسن علی نے مسلمانوں کی اسی ذہنیت کا بغور جائزہ لیا۔ دکھے ہوئے دل سے ان کی زبوں حالی پر سوچ بچار کیا اور انہیں قعرِ ذلت سے نکالنے کے لئے سندھ میں ایک انجمنِ اسلام کی طرح ڈال دی۔

تاکہ قوم کا یہ بکھرا ہوا شیرازہ ایک متحدہ پلیٹ فارم پہ جمع ہو سکے اور باہمی مشاورت سے اپنی فلاح و بہبود کے ذرائع ڈھونڈ سکے۔ یہی وہ انجمن ہے جس نے آگے چل کر مسلمانانِ سندھ میں تعلیمی، سیاسی اور ثقافتی شعور پیدا کیا اور اسی کے زیرِ اہتمام ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کی بنیاد پڑی۔

حسن علی کی ہمت و کارکردگی کا یہ مظہر جو آج کراچی کی ایک مشہور شاہراہ فریئر روڈ کے پہلو میں روشنی کا مینار بن کر استادہ ہے ساٹھ ستر سال پہلے ایک کارواں سرائے تھی جہاں بلوچستان کے اطراف سے تجارتی قافلے آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ تھکے ہارے مسافروں کو یہاں سکون حاصل ہوتا تھا۔ وہ اپنے مال و متاع کا یہاں جائزہ لیا کرتے تھے اور چند روز ستانے کے بعد پھر ایک نئے عزم اور نئے ولولے کے ساتھ اپنا راستہ اختیار کرتے تھے۔ آج نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی طلبِ سکون و عافیت یہاں کا شعار ہے۔ ہنر و دانش کی مال و متاع کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ شاہراہِ حیات پہ قدم رکھنے والے مسافر علمی تحصیل کے لئے یہاں آتے ہیں۔ اور زیورِ تربیت سے آراستہ ہو کر نکلتے ہیں۔ مدعا وہی ہے لیکن پیرایۂ اظہار مختلف ہے اور یہ اس لئے کہ حسن علی نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس ویران و غیر آباد کارواں سرائے کو سندھی مسلمانوں کی علمی تحصیل کا مرکز بنانے کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ سب سے پہلے یہاں اقامت گاہ اور مسجد تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد ہائی اسکول کی مرکزی عمارت آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچی۔ یوں تو ۱۸۸۵ء میں ہی مدرسۃ الاسلام باقاعدہ طور پر شروع ہو چکا تھا اور مولوی قمر الدین ایم۔اے یہاں کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ لیکن تھوڑا عرصہ گذرنے پر ہی پنجاب گورنمنٹ نے مولوی صاحب موصوف کی خدمات واپس لے لیں اور اس طرح ترقی و تکامل کے وہ مدارج طے حاصل نہ ہو سکے جو مولوی صاحب کے زیرِ ہدایت تجویز ہوئے تھے۔ سندھ مدرسے کی انتظامی باگ ڈور اب مرزا صادق علی کے ہاتھوں میں تھی جنہیں سندھ کے پہلے مسلمان گریجویٹ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کے بعد حسن علی کے بڑے صاحبزادے ولی محمد (جو گورنمنٹ ہائی اسکول شکارپور کے ہیڈ ماسٹر تھے) کی آزمودہ کاری نے عنانِ اختیار سنبھالی۔ وہ ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۶ء تک برابر دس سال سندھی مسلمانوں کی تعلیمی خدمات میں منہمک رہے۔

اسی دوران میں مدرسہ بورڈ کی تجویز کے مطابق ایک انگریز مسٹر پرسی ہائیڈ کو یہاں کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ مدرسۃ العلوم علیگڈھ کی شہرت اُس وقت اندرونِ ملک میں دور دور تک پھیل چکی تھی سندھی مسلمانوں کا بھی یہ تقاضا تھا کہ کراچی میں مدرسۃ الاسلام کی تعلیم علیگڈھ کے طریقوں

بمبئی ہو تاکہ یہاں کے مسلمان طالب علم جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں ہیں یہیں اپنی علمی ضروریات کی تکمیل کرسکیں اور انہیں علیگڈھ جاکر تعلیم حاصل کرنے اور زیادہ مصارف برداشت کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ چنانچہ علیگڈھ کے مشہور استاد مسٹر وِنیس کو سندھ مدرستہ الاسلام کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ مسٹر وِنیس کو سندھی مسلمان طالب علموں کی تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی اور شغف تھا۔ انہی کی رہنمائی میں اس تعلیمی ادارے نے سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کا کام بڑی تندہی سے سرانجام دیا اور سچ پوچھئے تو اس ادارے کے لئے سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے محبوب، بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی اسی چہار دیواری میں اپنی ذات کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔

قائد اعظم کے علاوہ سندھ کے جتنے سر برآوردہ اور پڑھے لکھے مسلمان نظر آتے ہیں اُن سب نے اسی درسگاہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے اور یہیں کی اقامت گاہوں سے تربیت پاکر نکلے ہیں۔ بلکہ کھیل کے میدان میں بھی اس کے بعض افراد حنیف، غلام محمد وغیرہ۔ پیش پیش رہے اور انہوں نے کرکٹ کے بے نظیر کھلاڑیوں کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل کی۔

سرزمین سندھ کا یہ نامور فرزند جسے سندھ کا سر سید کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا، اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس تعلیمی ادارے کو اپنے خونِ جگر سے سینچتا رہا۔ ایک قوی ولولے اور بے پناہ ذوق و شوق کے تحت اُس نے اس چمنستانِ علم کی آبیاری کی، اپنے ہاتھوں سے اس کی روش روش کو نکھارا، اس کی نوک پلک سنوارنے کے لئے گداگری بھی اختیار کی اور مستقل آمدنی کے ذرائع بھی مہیا کئے۔ اندرونِ ملک کا دور دراز سفر برداشت کیا، زمینداروں، اور متمول لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا، اپنوں کے طعنے سہے غیروں کے کچوکے برداشت کئے لیکن کیا مجال کہ پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش آئے۔ عمرِ عزیز کے جو بارہ تیرہ سال بچ رہے تھے وہ بھی اس قومی کام کی نذر ہوئے۔ یہ ان شبانہ روز کی محنتوں ہی کا نتیجہ تھا کہ کراچی کی زمین میں ایک ایسا نقش قائم ہوگیا جو زمانے کی رفتار کے ساتھ روز بروز محکم اور روشن تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ سندھ کے مسلمانوں نے اپنے اس مخلص راہنما کی خدمات کو عزت و تحسین کی نگاہوں سے دیکھا اور بلدیہ کراچی کے لئے بہ اتفاق رائے اسے اپنے ایک معزز رکن کی حیثیت سے نامزد کیا۔ ۱۸۹۱ء میں سندھ کے وڈیروں اور جاگیرداروں کی طرف سے گورنر بمبئی کی کونسل میں رکنیت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ حکومت برطانیہ نے خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ اور ہندوستان میں ترکی کی سفارت کرنے کے عوض سلطان ترکی کی جانب سے ۱۸۹۶ء میں ایک تمغہ اور آفندی کا جلیل القدر خطاب بھی عطا ہوا۔

یہ واقعہ ہے کہ حسن علی آفندی نے مسلمانوں کی صرف تعلیمی خدمات ہی انجام نہیں دیں بلکہ ان کے سیاسی اور معاشرتی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ایک روشن دل و دماغ رکھنے والے مسلمان کی طرح حسن علی آفندی کی یہ دلی آرزو تھی کہ وہ مسلمانوں کو فلاح و ترقی کے راستے پر ڈال دے اور اس ضمن میں جو بھی کارہائے نمایاں اُس نے سرانجام دیئے ہیں، وہ تاریخی صفحات میں اُسے ایک مستقل اور باعزت جگہ دلوانے میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ کراچی کی موجودہ آب رسانی کے پورے نظام اور گندے پانی کی نکاسی کی اسکیم میں حسن علی آفندی کے قیمتی مشوروں اور تجاویز کو بہت دخل تھا اس کے علاوہ کراچی میں بچوں اور بچیوں کے لئے مخصوص قسم کے مدارس کا قیام بلدیہ میں مسلمانوں کی مزید نمائندگی، اور وقف علی الاولاد کے قانون کا رواج یہ سب اقدامات حسن علی کی کوشش و ہمت ہی کے شرمندۂ احسان ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کی خدمت کرنے والا یہ دل و دماغ اب بوڑھا ہوچکا تھا۔ ۶۵ سال کی مسلسل جد وجہد آرام کی متلاشی تھی۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۸۹۵ء کو ابدی طور پر آرام کرنے کا بلاوا آپہنچا جس پر لبیک کہتے ہوئے یہ جواں ہمت بوڑھا حیدرآباد میں اپنے ہی باغ کے ایک گوشے میں آرام کی نیند سو گیا ؎

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

غور کیا جائے تو حسن علی آفندی کی عظمت و ناموری کا راز قوم و وطن کی بے لوث خدمت میں مضمر ہے۔ اور یہی جذبہ تھا جس نے اس کے ایک ہونہار فرزند کو تمام برِ صغیر میں مسلمانوں کی سربلندی و آزادی کا پرچم بلند کرنے کی تحریک دلائی۔ اور یہ پھر اسی جذبہ کی مسلسل کارفرمائی تھی جس نے صدرِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو آمادہ کیا کہ وہ انقلاب کی حقیقی روح کو بروئے کار لائے۔ اور ایک نئے دورِ عروج و ترقی کی بنیاد رکھے جس میں جمہور کا بول بالا ہو۔ اُس کی قائم کردہ یادگار "سندھ مدرستہ الاسلام" کی پیشانی آج بھی ان مقدس حروف سے جگمگا رہی ہے:

"تحصیل علم کے لئے یہاں آؤ اور خدمتِ قوم کا جذبہ لیکر جاؤ"

یہی وہ سنہری الفاظ ہیں جن سے اس مدرسہ کی ساری تاریخ مرتب ہوتی ہے اور نگاہیں ایک ایسے روشن مستقبل سے دوچار ہوتی

(باقی صفحہ ۔ پر)

رپورتاژ

عظمتوں کا گہوارہ

(سندھ مدرستہ الاسلام)

عارف حجازی

کئی دنوں سے جو سرمئی بادل آسمان پر منڈلا رہے تھے آخر ایک روز منہ اندھیرے ہی سے برسنے لگے۔ پھر دن نکلتے نکلتے اچھی خاصی بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کردی مگر بس کے اڈے تک پہنچتے پہنچتے کافی بھیگ چکا تھا پھر بھی مجھے بارش کے چھینٹے بڑے اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ اس پر ہوا کی ہلکی پھلکی لہریں تو مجھ پر اور ہی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ سر سے پاؤں تک ایک تازگی اور شگفتگی عود کر آئی تھی۔ جیسے کسی بے آب درخت کی جڑوں کو پانی ملنے پر ہری ہری نازک کونپلیں نکل آتی ہیں اور رفتہ رفتہ اس پر ہریالی ہی ہریالی چھا جاتی ہے۔ مجھے اس وقت ایسا لگا جیسے میری زندگی میں پھر بہار آگئی ہے اور میں بس کے اڈے پر کھڑا سندھ مدرسہ جانے والی بس کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت میرا ماحول بڑا سہانا تھا جیسے یہ میری ہی خوشگوار دلی کیفیت کا عکس ہو۔ اس لئے کہ میرے ذہن میں عظمتوں کے گہوارے، "سندھ مدرسہ" ہی کا تصور بسا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں بس آگئی اور میں لپک کر اس میں سوار ہوگیا۔ ہاں میں بصد شوق اسی مدرسہ کی طرف جا رہا تھا۔ وادیٔ سندھ کے مسلمانوں کی سیاسی و تعلیمی جدوجہد کا ماحصل، اسلامی تہذیب و تمدن اور عظمتوں کا مرکز، اور علم و ادب کا گہوارہ جس کا مقصد گھر گھر علم کی روشنی پہنچانا تھا۔

یہ کوئی ایک سو سولہ برس پہلے کی بات ہے جب ابھی اہلِ فرنگ نے اس علاقہ پر قبضہ کر کے اسے بمبئی کے صوبے سے ملحق کر دیا تھا۔ اس زمانے میں کراچی ہی کیا سارے صوبہ پر جہالت چھائی ہوئی تھی۔ سندھی زبان کا رسم الخط فارسی تھا اور اکثر آوازوں کے اظہار سے قاصر۔ اس لئے عربی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز ہوئی۔ عدالتوں کی زبان فارسی تھی ۱۸۵۱ء میں سر بارٹل فریئر نے تمام سرکاری عہدیداروں کا ٹھیٹھ سندھی میں امتحان پاس کرنا لازمی قرار دیا۔ اس کے بعد کپتان برٹن نے سندھی کو عربی رسم الخط میں رائج کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اختیار سے منظوری لی۔

اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے دس ہزار روپے کی منظوری دی گئی۔ اور ساتھ ہی سر ایچ ایلیس کی نگرانی میں ماہرین لسانیات کی ایک جماعت نے عربی کے انتیس حروف میں اور اضافہ کر کے باون حروف پر مشتمل سندھی زبان کی تشکیل کی اور ۱۸۵۳ء میں پہلی دفعہ سندھی عربی رسم الخط میں چھاپی گئی۔

جب یہ اہم کام انجام پا چکا تو کپتان رتھ بارن، کلکٹر حیدر آباد نے تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی۔ پھر کپتان پریڈی کلکٹر کراچی نے اپنے نجی خرچ سے "کراچی فری اسکول" کی بنیاد رکھی اور اسے مقامی لوگوں کی ایک کمیٹی کے سپرد اس شرط پر کیا کہ نصابِ تعلیم عیسائی مذہب کی تبلیغ اور بائبل کی نشر و اشاعت پر مبنی ہو۔ چنانچہ اسی شرط کی بنا پر یہ اسکول چرچ مشن سوسائٹی کے حوالے کر دیا گیا جو اب تک "چرچ مشن اسکول کراچی" کے نام سے جاری ہے۔ یہ وادیٔ سندھ کا سب سے پہلا اور قدیم فرنگی اسکول ہے۔ اس کے بعد "نرائن جگن ناتھ ودیا ہائی اسکول کراچی" قائم ہوا۔

یہ وہ دور تھا جب سابقہ سندھ کراچی اور شکارپور کی دو کلکٹریوں میں بٹا ہوا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ حیدر آباد اور شکارپور میں ہائی اسکول جاری کئے گئے جہاں صرف غیر مسلموں ہی کو داخل کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو قصداً تعلیم سے دور رکھا گیا جس کا نتیجہ ہوا کہ وہ مسلمان جو کبھی علم و ہنر میں یکتا تھے۔ اور حکمرانوں کی حیثیت سے صوبے پر چھائے ہوئے تھے، نئے نظامِ حکومت اور دوسرے سرکاری شعبوں میں ان پڑھ اور جاہل رہنے کے سبب اقلیتوں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے۔ سندھی مسلمانوں کے انحطاط کا یہ دور بڑا پُر آشوب تھا لیکن جب ایک صاحبِ فہم و دانش، شیدائے قوم و وطن، روشن دماغ، عالی ہمت اور علم دوست کی نگاہ ہے تھا اٹھی تو تنزل اور جمود کے بادل چھٹنے لگے۔ جہالت کے تیرہ و تار ریگزار سے خان بہادر حسن علی آفندی بے مجیدی، علم و ہنر کی شمع لیکر نکلے، مگر فرسودہ ذہنوں اور آنکھوں کو یہ روش ناگوار معلوم ہوئی۔ ان پر

[illegible] پرست طاؤں کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ انگریزی زبان کا سیکھنا پڑھنا اور مغربی [illegible] کو معیوب ہی نہیں، "گناہ عظیم" تصور کرتے تھے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود [illegible] علی آفندی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انہیں بھی ابتدا میں ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑا جن سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر سرسید احمد خانؒ کو گزرنا پڑا تھا۔ لیکن آخر کار انہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور سرسید احمد خانؒ کے نقش قدم پر چل کر انہوں نے ۱۸۸۴ء میں "سندھ محمڈن ایسوسی ایشن" قائم کی۔ پھر سندھ میں مسلمانوں کو تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کی غرض سے "سندھ مدرسہ بورڈ" کی تشکیل کی جس میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جس میں دینی و دنیاوی دونوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

سندھ مدرسہ بورڈ کا قیام ایک روشن مستقبل کی علامت تھی۔ صوبہ سندھ میں یہ اپنی طرز کا اولین ادارہ تھا۔ جس کے پہلے صدر خود خان بہادر تھے۔ ان کے علاوہ بورڈ کے بارہ اراکین تھے۔ اس طرح یہ بورڈ تیرہ افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے قیام کے بعد خان بہادر علی گڑھ تشریف لے گئے اور واپسی پر مدرسہ قائم کرنے کی اسکیم پر پوری توجہ دینا شروع کردی۔ اس اہم کام کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی۔ مدرسہ کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے، استاد فراہم کرنے کے لئے، ضروری ساز و سامان مہیا کرنے کے لئے۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور حصول مقصد کے لئے برابر انتھک کوشش کرتے تھے۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور لوگوں سے اپیل کرنے کے باوجود ناکامی ہوئی۔ اس نازک موقع پر نظام حیدرآباد اور نواب جوناگڑھ نے فراخدلی سے کام لیا۔ اور دونوں کی فوری امداد نے تھوڑی بہت راہ ہموار کردی۔ نظام دکن نے چار ہزار روپے اور نواب جوناگڑھ نے دس ہزار روپیہ دیئے تو اسکول کے آغاز کی صورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ سندھ مدرسہ بورڈ نے بولٹن مارکیٹ کے مشرق میں میریٹ روڈ پر ایک عمارت، جس میں اب پرنس ہوٹل ہے، کرایہ پر لی۔

اس کے باوجود ان طالب علموں کی رہائش کا انتظام باقی تھا جو صوبے کے دور دراز علاقوں سے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ایک دن جب خان بہادر کچہری سے گھر واپس آرہے تھے تو "سرائے قافلہ" کے سامنے سے ان کا گزر ہوا جو فریئر روڈ پر موجودہ ریلوے اسٹیشن کے شمال میں واقع تھی۔ انہوں نے دیکھا اس کے عالی شان دروازہ کی چوٹی پر چاند تارہ کھدا ہوا ہے۔ چاند تارے کی کشش کچھ ایسی تھی کہ وہ چند لمحے رک گئے اور اس جگہ کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ عمارت طالب علموں کی رہائش کے لئے بہت موزوں ہوگی۔ چنانچہ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد انہوں نے میونسپلٹی کے حکام، مسٹر جیمز گرانٹ اور انجینئر جیمز سٹریچن سے اس سرائے کی عمارت ۷۵ روپے ماہوار کرایہ پر حاصل کرلی۔ "سرائے قافلہ" اس علاقے میں بڑی اہمیت رکھتی تھی جہاں برسوں سے بیرونی تاجر اور مسافر آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ اس کے وسیع اور عریض گوداموں میں انواع و اقسام کا سامان رکھا جاتا تھا اور اندرون ملک میں بیرونی اشیاء کو پھیلایا جاتا تھا۔ ریل نکل آنے پر یہ جگہ بالکل اجڑ گئی تھی۔ اس کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی تھی اور یہ خالی پڑی رہتی تھی۔ جب سندھ مدرسہ بورڈ نے اسے کرایہ پر لیا تو اس کا عالم ہی بدل گیا۔ وہ سرائے کی بجائے طالبعلموں کی جائے رہائش بن گئی۔ اور اس کا ستارہ پوری طرح چمک اٹھا۔

اس کام سے فرصت پانے کے بعد استادوں کا مسئلہ پیش آیا جو سب سے زیادہ کٹھن تھا۔ اچھے اور پڑھے لکھے مسلمان استادوں کا سارے صوبے میں جیسے قحط تھا اور یہ مسئلہ مدرسہ کے بانی کے لئے درد سر بن چکا تھا۔ لیکن اس کی جوہر شناس نگاہوں نے دور دراز سے اچھے استادوں کو تلاش کر کے جمع کیا اور ان جملہ مراحل کو طے کرنے کے بعد ۳۱ اگست ۱۸۸۵ء کو اسکول کی عمارت میں ایک اجتماع ہوا جس میں صرف ۳۶ افراد تھے۔ اس مبارک تقریب پر حسن علی آفندی نے مغربی تعلیم اور جدید سائنسی اور علمی رجحانات پر ایک بصیرت افروز تقریر کی۔ یہ ان کی پہلی تقریر تھی جو تاریخی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی بڑی اہم تھی۔ اس کے بعد جامعۂ پنجاب کے ایک ڈبل گریجویٹ، مسٹر عمر الدین کو مدرسہ کا پرنسپل مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح ملت اسلامیہ کی یہ جدید درسگاہ ریگزار سندھ میں ظہور پذیر ہوئی۔ بانیٔ مدرسہ کے فرزند خان بہادر ولی محمد حسن مرحوم کے دس سالہ عہد میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور اس کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوگئیں۔ ولی محمد حسن کے ہونہار شاگردوں میں قائد اعظم محمد علی جناحؒ بھی تھے جنہیں ان کی وفات پر بے حد صدمہ ہوا۔ اسی درسگاہ سے نہ جانے کتنے طالب علم فیضیاب ہوئے جن میں سرشاہنواز بھٹو، اے۔ کے بروہی اور شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتا مرحوم کے نام سر فہرست ہیں۔ [illegible] اس مدرس گاہ کے آخری سب سے بڑے معمار شمار کئے جاتے ہیں۔ ۱۸۹۷ء کی ابتدا میں خان بہادر قادر داد خاں نے خیرپور دربار سے پانچ ہزار روپے اس شرط پر منظور کرائے کہ مدرسہ کا پرنسپل برطانوی باشندہ ہو۔ اس شرط کے مطابق سر پرسی ہائینڈ، جو آکسفورڈ کے گریجوئیٹ تھے، اس عہدے پر مقرر کئے گئے۔ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے تاپوری خاندان کے

ون کے لئے تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا تالپور ہاؤس، (پرنسپل کا بنگلہ)
کے لئے وقف تھا۔ ان کے بعد پروفیسر وائنز کے عہد میں اور بھی خوشگوار
یاں ہوئیں۔ یعنی سردار ہاؤس" حسن علی ہاؤس" اور خیرپور ہاؤس"
ہوئے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ مدرسہ کا ایک جریدہ
رھ مدرسہ کرانیکل" کے نام سے جاری ہوا علمی مباحثہ کی سوسائٹی
شاپ، حسن علی کلب، تالپور کلب اور وائنز یونین کلب بنائی
نگل اور جمعرات کے دن" بورڈنگ ہاؤس ڈرل" کا انتظام
کمشنر سندھ اور کلکٹر کراچی کے توسط سے مسٹر وائنز نے مدرسے
کرا اتنا بلند کر دیا کہ اس کے فارغ التحصیل طالب علموں کو سرکاری
ون میں ترجیح دی جانے لگی۔

پروفیسر وائنز کے زمانے میں" سندھ مدرسہ" سارے صوبے
ہت مقبول ہو چکا تھا اور بعد آنے والے لوگوں کے لئے راہیں ہموار
تھیں شمس العلماء ڈاکٹر پوتا کے زمانے میں طالب علموں کی تعداد
سے چار سو تک پہنچ گئی تھی سنہ ۱۹۲۹ء میں میٹرک کے ۲۷ طلبا میں
۲۲ کامیاب ہوئے مدرسہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا۔ جب
کامیاب طلباء میں سے ایک کو" فرینک سونڈرز" کا وظیفہ بھی ملا۔
سندھ مدرسہ کی اس تاریخ کو اپنے ذہن میں لئے ہوئے
میں بس سے اترا تو بارش تھم چکی تھی۔ میرے سامنے وہی کمان دار
زہ تھا جس پر آج بھی چاند تارا اسی طرح منقش ہے۔ اور
الفاظ بھی انگریزی میں درج ہیں:

ENTER TO LEARN GO FORTH TO SERV

اسلامیہ کا یہ نشان آج بھی تاریخی عظمتوں کی یاد تازہ کرتا
میں نے دل میں کہا اور اس تاریخی سرائے کے دروازے
اندر داخل ہو کر وسیع و عریض میدان میں قدم رکھا جس کے
مشرق میں پچھلی صدی کی دو منزلہ عمارت (بورڈنگ ہاؤس)
تھی" اور مغربی گوشے کے اس وسیع میدان میں جہاں کبھی
ئے قافلہ" میں ٹھہرنے والے مسافروں کے اونٹ اور گاڑیاں
رہا کرتی تھیں۔ گاڑی بان رات کے سحر آگیں سکوت میں
کہانیاں اور طلباء میں سنایا کرتے تھے۔ یا اپنے سفر کے عجیب
بیان کرتے تھے۔ ملت اسلامی کی شاندار درس گاہ" سندھ
سہ" کی دو منزلہ عمارت گمزدہ عظمت رفتہ کی یاد دلا رہی تھی۔

میں ٹہلتا ہوا اس عمارت کی پشت پر جا پہنچا جہاں نیم کے گھنے
درخت کھڑے ہیں اور عمارت کے دائیں بائیں دو مسجدیں بنی ہیں۔
سرسری نظر سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا پچھلے راستہ سے مدرسہ کے اندر
داخل ہوا جس کے چھوٹے سے مربع صحن میں مخملیں سبزہ بچھا ہوا تھا۔
کیاریوں میں شگفتہ رنگ برنگ پھولوں کے پودے مسکرا رہے تھے۔
بارش سے سبزے اور پھولوں کا حسن زیادہ پرکشش ہو گیا تھا۔ اس
وقت اتنے حصہ میں ایک پرمعنی سکوت طاری تھا۔ نیچے کے بڑے بڑے
وسیع دالانوں میں بھی وہی خاموشی تھی۔ چند کمروں کے دروازے
مقفل تھے۔ اگر کوئی شے اس وقت متحرک تھی تو وہ دلفریب صحن کا
فوارہ تھا جو پانی کے لچھے بنا بنا کے اچھال رہا تھا — یا صحن کے
دونوں مغربی کونوں میں بام کے سربلند درخت جن کی چھتریوں پر پھندنے
ناچ رہے تھے۔ میں اس پرسکوت ماحول میں کھڑا اس یادگار عمارت
کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس کے وسیع و عریض دالانوں کا چکر کاٹ کر
جنوبی دالانوں میں داخل ہوا جو سونا پڑا تھا۔ اس کے نصف حصہ
میں سائنسی آلات میزوں پر رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے حصے
میں آرٹ سیکشن تھا۔ جہاں استاد کی میز اور کرسی رکھی ہوئی تھی۔
اس کے پیچھے دیوار میں ایک کتبہ پر" جوناگڑھ ہال" تحریر تھا۔
نیچے اس حصے کی چاروں سمتوں میں چھ بڑے بڑے کلاس روم
بنے ہوئے ہیں۔ میں ان خاموش کمروں میں جھانکتا ہوا مغرب
کے چوبی زینہ کی طرف نکل آیا جو اوپر کی منزل کو جاتا ہے۔
پہلا زینہ چڑھتے ہی مدرسہ کے بنیادی پتھر پر نظر پڑی۔
جسے ۱۴ نومبر ۱۸۸۶ء میں وائسرائے لارڈ ڈفرن نے نصب کیا
تھا اس عمارت کی تکمیل سنہ ۱۸۹۰ء میں ہوئی تھی۔ اور اس پر ایک
لاکھ نوے ہزار ایک سو اٹھاسی روپے ساڑھے دس آنے خرچ
ہوئے تھے۔ اب میں دوسرا زینہ طے کر کے اوپر کی منزل پر پہنچا۔
وہی ایک ہی طرز کے چھ چھ کمرے، زینہ ختم ہوتے ہی الٹے ہاتھ
پر ریڈنگ روم اور مدرسہ کا دفتر۔ سیدھے ہاتھ پر پرنسپل کا کمرہ۔
میں نے اوپر کی چاروں اطراف کا چکر کاٹا۔ مشرقی سمت کے
کمروں میں کلاسیں جاری تھیں اور وہ لڑکے پڑھ رہے تھے جنہیں
آگے چل کر تقدیر ملت کو سنوارنا ہے — اپنے وقت کے حسن علی
آفندی، داؤد پوتہ وغیرہ۔ دیکھتے ہی پاکستان کے مستقبل کا سہانا

[illegible] میں پھر گیا۔ اسی خوشگوار تصور کو دل میں لئے شمالی زینے سے نیچے اترا اور جنوب میں پرنسپل کے بنگلے کے سامنے سے گزرتا ہوا پھر [illegible] والے میدان میں نکل آیا۔ جہاں اب چار [illegible] ہاؤس ہیں [illegible] ہاؤس' جسے سردار یعقوب خاں نے بنوایا تھا۔ "خیرپور ہاؤس" جو شیخ محمد ابراہیم کی یادگار ہے۔ جنوب میں "تالپور ہاؤس" جہاں کسی زمانے میں تالپور رئیس زادے طالب علمی کے دوران رہا کرتے تھے اور حسن علی ہاؤس ان عمارتوں کے علاوہ سینی ٹوریم کی عمارت بھی نظر آئی جسے اولڈ بوائز نے چندے سے تعمیر کرایا تھا۔ اس فضا میں مجھے چلتے پھرتے یوں لگتا تھا جیسے میں ایک پُر اسرار فضا میں گھوم رہا ہوں اور اِدھر اُدھر چلتے پھرتے طلباء سے وہ منظر نگاہوں میں پھر گیا جب ہمارے قائد اعظمؒ ایک طالب کی حیثیت سے اس درس گاہ میں چلا پھرا کرتے تھے۔ وہ "مادرِ علمی" جسے انہوں نے مرتے دم بھی فراموش نہ کیا اور اپنی وصیت میں اس کے لئے اپنی جائداد کا ایک وسیع حصہ نامزد کیا۔ اور سچ پوچھا جائے تو اب جب کہ جامعہ علی گڑھ ان کے ورثہ کی حقدار نہیں رہی اور پشاور یونیورسٹی نے بھی اپنے حصہ کا مطالبہ نہیں کیا، ان کی جائداد کا [illegible] تمام درس [illegible] کی حقدار ٹھہرتی ہے — ساری کی ساری درس گاہ اپنی [illegible] عمارتوں کے ساتھ عہد رفتہ کی تاریخ کا نقشہ ہی نہیں بلکہ ایک [illegible] منظر بھی پیش کر رہی تھی کھیل کے وسیع و عریض میدان میں [illegible] ہو کر جب میں نے پر وقار عمارات کا نظارہ کیا تو میرے کانوں میں [illegible] کی ہلکی ہلکی لہروں کے ساتھ جیسے کوئی گنگناتا ہوا گزر گیا:

یہ مدرسہ، یہ ثقافت کا کہنہ سال دیار
ہمارے واسطے اب بھی ہے روشنی کا منار
نجوم و ماہ اسی آسماں سے گزرے [illegible]
نہ جانے قافلے کتنے یہاں سے گزرے [illegible]

اس انجمن میں عجب اہتمام ملتا ہے
اسی میں قائد اعظمؒ کا نام ملتا ہے
نیا شعور یہ دیتا رہے دماغوں [illegible]
روش روش پہ جلاتا رہے چراغوں [illegible]

★

قافلۂ شوق

اسد ملتانی (مرحوم)

(یہ نظم ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اسد ملتانی مرحوم نے اسکو راولپنڈی جاتے وقت ٹرین میں لکھا تھا۔
افسوس ہے کہ یہ سفرِ شوق ان کا آخری سفر ثابت ہوا!! — مدیر)

پنڈی کی طرف قافلۂ شوق رواں ہے
اس وقت کشش کاف کراچی کی کہاں ہے
دل اک نئے ماحول کی جانب ہے گریزاں
گو فرقتِ احباب طبیعت پہ گراں ہے
کہسار کے دامن میں ہے اک وادئ سرسبز
فطرت کے مناظر سے سرورِ دل و جاں ہے
گرمی میں عجب کیا ہے جو دلی کی جھلک ہو
کچھ موسمِ سرما میں تو شملے کا سماں ہے
ہر چند کہ یہ شہر رہا فوج کا مسکن
اس شہر سے رنگِ مدنیت بھی عیاں ہے
اغیار کی تقلید پہ نازاں ہیں مسلماں
اور نقل ترقی پہ ترقی کا گماں ہے
مسلم کا جہاں ہم پہ عیاں ہو نہیں سکتا
جبتک کہ نگاہوں میں جہانِ دگراں ہے

موضوعِ زیرِ بحث: پاکستانی ادب کی تشکیل

وحید الحسن ہاشمی

یہ مقالہ محض آپ کے نوٹ کی وجہ سے روانہ کر رہا ہوں۔ عالی صاحب نے اپنے مضمون میں چند خاموش ادیبوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی سے متاثر ہو کر یہ تحریر لکھی گئی ہے۔ آپ کی آزادیٔ فکر سے امید کرتا ہوں کہ اس کی اشاعت میں پس و پیش نہ فرمائیں گے۔

یہ مضمون نامکمل ہے۔ دوسری قسط میں "پاکستانی ادب کے بنیادی تصورات اور اس کے خدوخال" پر بحث ہے۔ (وحید الحسن)

ہماری دعوت خلوص ہی پر مبنی تھی اور ہمیں مسرت ہے کہ آپ اس کو قبول کر کے "خاموش ادیبوں" کے زمرہ میں شامل نہیں رہے۔

"ماہِ نو" ان سب لوگوں کا رسالہ ہے جو علم و ادب اور قومی و آفاقی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور ہر شخص کو سرگرمیٔ عمل کے لئے جولاں گاہ مہیا کرتا ہے۔ تاکہ ہم باہم مل کر اپنے ادب و فن اور فکر و خیال کو ہمدوش ثریا کردیں۔ امید ہے یہ توضیح ہمارے دوسرے "خاموش ادیبوں" کو بھی اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دے گی۔ (مدیر)

یہ بات اب مقولہ کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی ملک کا ارتقا، ں کی سوسائٹی کی حالت، اس کے رہنے سہنے والوں کی زندگی کی نسیات کی جھلک دیکھنی ہو تو اس ملک کے ادب پر ایک سرسری سی نگاہ النی چاہیئے۔ اسی اچٹتی ہوئی نگاہ میں اس ملک کی تمام کیفیتیں، قوم ے تمام احساسات اور ملت کے تمام جذبات سمٹ کر سامنے آجائیں گے۔ ر یہ مقولہ دنیا کے بیشتر ممالک پر صادق آتا ہے تو پاکستان کی ثقافتی، ہبی اور سیاسی قدروں کو اسی ملک کے ادب سے کیوں نہ پرکھا جائے؟

اگر ہم اپنے چند سالہ ادب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ بارہ ال کے عرصہ میں پاکستان کن کن راہوں سے گزرا، اسے کن کن مسائل ے دوچار ہونا پڑا، اس کے داخلی و خارجی حالات کیا تھے اور اس سے بڑھ پاکستانیوں نے کس صبر و تحمل اور با اختیار مجبوری سے یہ دن کاٹے، ہوں نے کن کن مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور ایسے وقت ں جب اپنے پرائے سب بیگانے ہو گئے تھے، بھائیوں بھائیوں کی شکسوٹ، لاز اندوزی، آرام طلبی اور زیادہ نفع کی توقع، ایسے مسائل ہ جن کا صحیح خاکہ ہمارے ادب میں مل سکتا ہے منٹو کے افسانے ہوں یا ایم اسلم کے ناول، شیر افضل کی غزلیں ہوں یا مجید لاہوری کے طنزیہ مضامین، ان سب کا ایک ہی رخ، ایک ہی مقصد تھا۔ معاشرہ کی صحیح عکاسی۔ اور اس میں کلام نہیں کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے وقت کی صحیح عکاسی اور زمانے کی ہو بہو تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی۔ اب جب کوئی نقاد یہ سوال اٹھاتا ہے کہ پاکستانی ادب کیا ہے؟ آیا پاکستانی ادب ہے بھی کچھ یا نہیں؟ کیا ادب مقصدی ہوتا ہے اور اگر پاکستانی ادب مقصدی ہے تو اس کا مقصد کیا ہے؟ تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اور جب ہمیں ان سوالات کا تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو ہم مایوس سے ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے کھرے سکے کو بھی کھوٹا سمجھ کر اپنی ہی قوم اور اپنے ہی ملک کو کوسنے لگتے ہیں سوال یہ ہے کہ جب کوئی اردو شعر پنجابی، بنگالی، اودھی اور دکنی نہیں ہوتا تو آپ ادب پر ہندوستانی اور پاکستانی، مشرقی اور مغربی کی چھاپ کیوں لگانے کے خواہاں ہیں؟ کیا ادب ایسی چیز ہے جس پر چھاپ لگائی جا سکتی ہے؟ کیا ادب اور انسانیت ایک ہی تصویر کے دو رُخ نہیں؟ کیا ادب اور نقاد کی ارتقائی منازل ایک ہی

پھول کے دو نام نہیں؟ کیا ادب اور فطرت ایک ہی ہیرے کے دو تراشے ہوئے پہلو نہیں۔ پھر آپ ادب کو مکان کی حدود میں مقید کیوں کرتے ہیں؟ اگر آپ کا مقصد تہذیبی ارتقا اور مختلف زبانوں کے عروج و زوال سے ہے تو پاکستانی ادب کا تصور بغیر اسلامی حیات کے قابلِ التفات نہیں ہو سکتا۔ اس کی معمولی سی مثال اردو زبان کی ترویج و ترقی ہے۔ اگرچہ اردو ادب ہندوستان ہی میں پھلا پھولا اور اسی کی فضا میں پروان چڑھا۔ لیکن معنوی حیثیت سے یہ ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافت کا آئینہ ہے جس میں ملکی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اسلامی تصورات رچے بسے ہوئے ہیں۔ اردو کی اسی معنوی وقعت کے سبب ایک گروہ مخالف ہوا اور اس نے اب ہندوستان میں جس مقصدی ادب کا پرچار شروع کیا ہے وہ دراصل اردو دشمنی کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلامی تخیلات کا ردِ عمل ہے۔

اگر ہم پاکستانی ادب کی تشکیل چاہتے ہیں تو ہمارے لئے پاکستان کی تشکیل کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تاریخی اعتبار سے پاکستان کا قیام اقلیت ہونے کے سبب مسلمانوں کی زیردستی اور سیاسی و معاشی زبوں حالی کے باعث زیادہ اور مذہبی سبب سے کم عمل میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی اور اسی قسم کے دیگر لکھنے والوں کو چھوڑ کر پاکستانی ادب کا کل سرمایہ سیاسیات اور معاشیات پر مبنی ہے۔ اس عنوان کے تحت فسادات، ہجرت، تجارت، رشوت، غمِ روزگار، اعزہ کا غم اور نتیجہ میں کائنات کا غم، غرض زندگی کی مکمل تصویر ہمارے ادب میں ملتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ہم اسے ادب کم تاثر زیادہ کہیں گے۔ اور پھر پاکستانی ادب کی جدید اصطلاح تو اس ادب کے ساتھ اور مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ ادب اس قدر سستا اور سطحی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی بنیاد مستقل مسائلِ حیات پر ہوتی ہے۔ وہ جذبات و احساسات کے ان پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے جو مستقل اور دیرپا ہوتے ہیں۔ ادب حسن کی جھلک نہیں بلکہ خود حسن ہے۔ وہ پھول کی خوشبو نہیں بلکہ خود پھول ہے۔ ہنگامی حالات اور وقتی سیلاب کے تاثرات کا بیان، ادب کی منزل کی طرف رہنمائی تو ہے لیکن ادب نہیں۔ زندگی کا ایک مکمل نظام، حیات کی ایک جاودانی کیفیت، فط
کی آغوش میں پلا ہوا انسانی ارتقا کا راز، اور زمین و زما
پائدار، جاندار اور باکار تصور، ادب کی روح ہے۔ اس
علاوہ جو کچھ ہے فانی ہے اور ادب غیر فانی ہے۔

پاکستانی ادب کی تشکیل کے سلسلے میں ہم زما
کے ان سوتوں کو فراموش کر دیتے ہیں اور کھوکھلے[1] نعرو
پیدا کردہ تخلیق کو ادب سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ضر
یہ ہے کہ ہم اپنے عمل اور کردار کا محاسبہ کریں۔ اگر ہ
اور علمی دنیا میں سرخرو ہو سکتے ہیں تو وہی عکس ہمارا ادب
کرے گا، وہی پرتو ہمارے شعروں پر پڑے گا۔ او
جمال ہماری طرزِ تحریر سے نمایاں ہوگا۔

اس سلسلے میں ایک مشکل اور بھی ہے۔ ہم نے ا
کی تقلیدی قومیت کا ہیولیٰ اور اس کا خمیر وطنیت سے ت
کیا ہے لیکن اسلامی تصورِ حیات میں وطنیت کو اضافی
دیا گیا ہے اور قوم کی تشکیل مذہب سے کی گئی ہے۔ بعض ا
کا خیال ہے کہ پاکستان کی بقا مذہب سے وابستہ ہے۔
لئے پاکستانی ادب ہی اسلامی اسپرٹ اور ایمانی شعور کا
ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغربی پاکستان میں
ادب اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ ادب ممکن ہے ہندوستا
اور بنگالی ادب سے صورت میں مشابہ نہ ہو لیکن سیرت
دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ نہ
عقائد کے اعتبار سے دونوں مقامات کے لوگ ہم خی
یہی وجہ ہے کہ عباس حسین، کرشن چندر، خواجہ عباس، او
پاکستان میں اتنے ہی معروف ہیں جتنے ممتاز حسن، ندیم
انتظار حسین۔ اسی طرح جگر، شفیق، فراق، منظر،
اور دیگر شعرا پاکستان میں اسی قدر عزت و احترام سے
جاتے ہیں جس قدر عدم، احسان، عابد، تبسم اور فیض
اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مندرجہ بالا تصور ز

---

[1] : اس سلسلے میں انور کا وہ افسانہ ملاحظہ ہو جو اسی
میں شائع ہوا ہے۔ (مدیر)

سے قطع نظر کر لیں اور پاکستانی قوم کی بنیاد وطنیت ہی پر تسلیم کر لیں
تو بھی صورت حالات میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں۔ ادیب ہو یا
شاعر اپنے ماحول سے متاثر ضرور ہوگا۔ کل تک شاعر درباری قصیدے
لکھ کر انعام و اکرام پاتا تھا، آج وہ جنگی ترانے گا گا کر پاکستانی
ادب کا سب سے بڑا خیر خواہ نظر آئے گا۔ لیکن نہ کل کا درباری ادب
ادب تھا نہ آج کا جنگی ادب ادب۔

ہمارے بعض نوجوان نقادوں کا خیال ہے کہ وہ شاعر
یا ادیب جن کا شعور دورِ آزادی سے پہلے ہی پختہ ہو چکا تھا،
اب ان سے پاکستانی ادب کے تشکیل کی امید لاحاصل ہے کیونکہ ان
کی نظر محدود اور خیالات کی دنیا مخصوص ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں
اغیار کی نظر سے اور جو کچھ سوچتے ہیں بیرونی محرکات کے ذریعہ۔
وہ ایک ایسے دریا کی مانند ہیں جس میں روانی تو ہے سیلاب نہیں،
بہاؤ تو ہے تڑپ نہیں، کشادگی تو ہے جذبات کی ہلچل اور تجسس
کا طوفان نہیں۔ وہ گلستان سے بہار کے جانے کا تو ماتم کر لیتے
ہیں لیکن بہار کی تلاش نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس پاکستانی
نوجوان ادیب موسم بہار کی رخصت پر گریاں نہیں ہوتا بلکہ اپنے
عزم و استقلال سے بہار کو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے ؎

فسردہ ہونے سے حاصل چلو تلاش کریں
کہیں تو ہوں گی بہاریں جو گلستاں میں نہیں (شہرت)

لیکن ایک فن کار کا دوسرے فن کاروں کو یوں نام دینا کچھ
اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اگر اس کی مراد اس شعر سے یہ ہے کہ ایسے
خیالات صرف نوجوان پاکستانی شعرا ہی کے ہو سکتے ہیں، تو یہ اس
کی خام خیالی ہے۔

مجھے ۱۹۴۸ء میں ایک ضعیف مہاجر سے کراچی میں ملنے
کا اتفاق ہوا جس کا تمام اثاثہ جل کر خاک ہو گیا تھا۔ جب میں
نے افسوس کرتے ہوئے ان سے کہا کہ قبلہ آپ کا تو بڑا نقصان
ہوا۔ سارا گھر ہی راکھ کا ڈھیر ہو گیا تو وہ نہایت مطمئن اور تیقن
بھرے لہجہ میں بولے ؎

بلا سے جلا آشیانہ ہمارا
چمن میں تو چاروں طرف روشنی ہے

یہ ضبط، یہ اطمینان، یہ اظہارِ خوشی اور یہ ایثار کا جذبہ
مجھے آج تک نہیں بھولتا۔

یہ حقیقت ہے کہ کچھ پاکستانی نوجوانوں نے اس منزل کی
طرف قدم بڑھایا ہے اور ان کا یہ اخلاص حوصلہ افزائی کے لا
ہے۔ ہمیں پختہ یقین ہے کہ ان کے ہاتھوں پاکستانی ادب کی تشکیل
اور پاکستان کا استحکام سرانجام پائے گا۔

ایک مشکل یہ بھی ہے کہ گو پاکستان کی انتظامی مشینری ا
ہے لیکن بعض رہن سہن کے امور میں قدرتی طور پر کچھ فرق
ان حالات میں ایک متجانس اور جامع قسم کے پاکستانی ادب کی تشکیل
میں کچھ رکاوٹیں ہیں۔ لیکن یہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ جب ضمیرِ انسا
بیدار ہو جاتا ہے تو قوم اور قومی ادب کی تشکیل کے راستے خود بخود کھل جا
ہیں۔ ضرورت بحثوں میں الجھنے کی نہیں بلکہ نظریاتی اتحاد اور یکجہتی
ہے۔ چنانچہ اسی کی بدولت ہمارے کتنے ہی فرق دور ہو چکے ہیں
اور دونوں حصوں کی ظاہری و باطنی زندگی قریب سے قریب
ہوتی چلی جا رہی ہے۔

آخر میں حالی صاحب کے اس جملے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ
"اچھا ادب لازماً مقصدی ہوتا ہے اور اس سے مراد انسانوں
کی انفرادی اور اجتماعی مسرت ہے"۔ اول تو مقصدی ادب خو
محتاجِ تعارف ہے کیونکہ مقصدی ادب ناسخ۔ رجب علی۔ اور نسـ
تو پیدا کر سکتا ہے۔ آتش، میر امن اور میر حسن پیدا کرنا اس
بس کی بات نہیں۔

دوسرے زندگی محض مسرت کا نام نہیں۔ مسرت کوشی درحقیقت
زندگی کے حقائق سے گریز اور نفسِ حیات سے فرار ہے۔ اگر زندگی
فقط ہنسی خوشی اور قہقہوں سے عبارت ہوتی تو ملٹن "پیراڈائز
لاسٹ" نہ لکھتا، فردوسی کا شاہنامہ، انیس کے مراثی، اور شیکسپیئر کا
"ہملٹ" نہ مقصدی ادب ہیں نہ انسانی مسرت، اور قہقہوں کی
تصویر، بلکہ ان میں زندگی کا چین اور دل کی دھڑکن دونوں
ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر یا ادیب کسی ایک جذبے سے انسا
کی کتنی خدمت کر سکتا ہے۔ لہٰذا نصب العین خدمت
ہے نہ کہ مسرت۔

آج رنج و ملال فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

(الاپ)

جعفر طاہر

ہفت آہنگ، ہفت کشور، ایک ہی مضمون ہے۔ "چہار درویش" کے بعد ہمارا مغنیِٔ آتش نفس سات اور کشوروں کے نغمے ترتیب دے رہا ہے — صد سرگم، سمپورن۔ یہ نغمہ کشورِ ششم کا ابتدائیہ ہے جس کا روپ انوپ ہم میں سے کس کے ذہن میں رچا بسا ہوا نہیں؟ اس الاپ میں مغربی پاکستان کے البیلے کوی نے سندربن کے سندر دیس کا سماں اسی کی سندر بھاشا میں کھینچا ہے۔ (مدیر)

اف! یہ گمکارتی گھنگھور گھٹائیں کاری
بال بکھرائے ہوئے برہہ کی ماری ساری
آج رنواس کے سب توڑ کے بندھن نکلیں
پدمنی رانیاں بن بن کے بروگن نکلیں
گوپیاں گنگا کنارے یہ دوارے دوارے
ناچتی پائلوں کی دھن پہ بلاتی ہیں کسے؟
ڈھونڈتی پھرتی ہیں کس شیام کو سندربن میں؟
پچپہاتے ہوئے روحوں کے پکھیرو، پنچھی
اپسراؤں کے ٹھکانے کہیں چھتنا روں میں
روپ کی دھوپ، یہ پرکاش، انوکھا پرتاپ
رینگتے ناگ، جواں شیر، یہ وحشی چیتے!
سر جھکائے ہوئے ہاتھی کہیں پانی پیتے
زندگی موت کے سائے میں ہنسے جاتی ہے
سیگوں ندیاں، پھولوں سے مہکتی جھیلیں
نیل سر، قاز، بطیں، ہنس، ہزاروں سرخاب
سندری بن ہے جو دیکھو تو مدھوبن کا جواب
یہ گرجتا، یہ امڈتا، یہ برستا بادل!
دامنی[1] جیسے کوئی چلبلی، الھڑ ناری
تیلیاں توڑ کے چلمن کی ہنسے جاتی ہو
آج تو میگھ پتی اور طرح ہی برسے
نہ کوئی پیت کا مارا ترسے

[1] بجلی دبنگ

ہائے ساؤلی[1] کالا نے آنکھوں میں لگایا کاجل
مد بھرے نینوں کی رہ رہ کے چھلکتی مدرا
قہقہے، گیت، خوشی، رنگ، کبتا، آہا!
ناچتے پیڑ، ہرے کنج، مہکتے رمنے
کھوئی کھوئی ہوئی خوابوں میں یہ سرشار زمیں
کوئی البیلا گوری دیکھ رہا ہو سپنے
میری دھرتی تو بنی بیٹھی ہے دلہن جس کو
بیاہنے آیا ہے ساون کا رنگیلا راجہ
رنگ میں ڈوب کے آئے ہیں براتی سارے
مونگئے صافے لپیٹے ہیں سروں سے بادر[2]
شبز ڈولی[3] کوئی کاندھے[4] پہ لیا جائے دیکھو
پیچھے پیچھے کوئی دیتا چلا جاتا ہے دھنی[5]
"بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن یا نبیؐ، اللہ اکبر
یا رسول اللہ!"
جھومتے جھنڈ، حسیں کنڈ، طلسمی باغات
یہ جزیرے، یہ جھنم[6] زار، کنول پریوں کے
پھول بن ہائے، یہ استھان سجل پریوں کے
سانوری، گوری، سگن روپ، سناری ساری

سبز کیلوں سے مگر اب تو ابھرنے لگا چاند
جاگ جاگ اٹھی ہیں سرگوشیاں ارمانوں کی
کنمنانے لگیں وہ چاہتیں، پل پل، چھن چھن
کھول کر اپنی برس گانٹھ کوئی برہا گی
مغلئی دور کے کھنڈرات میں ہے آ بیٹھی
تھام کر ایک ستوں ٹوٹ کے گانے لاگی:

نشتے جائیو، پھولو بنے ہے بھومرا
نشتے جائیو پھولو بنے
جالائے چندیرو باتی
جگے رور دشارارائی گو

رات کی چپ میں پھول بن ملیو رے بھومرے
رات کی چپ میں پھول بن آئیو رے ....
چندا کا دیپ جلا کے رکھوں
ساری رات رو رو کاٹوں

[1] سالی (بنگلا)
[2] بادل
[3] سبز ڈولی [4] لیا جائے (بنگا)
[5] مشرقی پاکستان میں دھنی یعنی برات؛ ایک نقیب بہ آواز بلند پکارتا جاتا ہے اور باجے گاجے حرام تصور کیے جاتے ہیں۔
[6] میرے نزدیک یہ ترکیب جائز ہے (کوی)
اب یہ روش خاص شاید عام ہو جائے (مدیر)

بھوکتھا شیشر دشتے، ہے بھومرا
[illegible]ی داگھمائے پوڑی
سپنیر دیتھ دھوری گو
نیر ہو چرّنے جائیو — ہے بھومرا
نیشتے جائیو پھولو بنے، ہے بھومرا
تومار گان جنیو بھانگے نا
امار گھوم جنیو بھانگے نا
ڈالیر گھوم جنیو بھانگے نا
نیشتے جائیو پھولو بنے،

ہے بھومرا
نیشتے جائیو پھولو بنے "

گرتی اوس کی بوندیاں — اپنا دکھڑا ان کو سناؤں
یدرے مجھے نیند آجائے اادھیں
سپنوں کے پگ پہ بڑھتی جاؤں
تو دبے پاؤں آکے ملیو رے بھومرے
پھول بن میں چپ چاپ رات میں
تیری تانوں کا تانتا نہ بند ہو
میری نندیا اچاٹ ہو نہ بھومرے
پھولوں کی انکھڑیاں بھی کھلنے نہ پائیں
ٹہنیاں سوکھی سوکھی جاگ ناہیں جائیں
بس ہسی گھات سے سُونی رات میں
پھول بن میں ملنے آئیو رے بھومرے) *

تھم گیا شور مچاتا ہوا بنگ‌پ سا گر[1]
پنکھ پھیلائے ہوئے پریوں کے جی، ڈول گئے
چاند چپ چاپ کھڑا سنتا رہا، روتا رہا
اور ایسے میں کہیں دُور کنارِ دریا
نوجواں مانجھی نے فرقت کا گلہ چھیڑ دیا
یہ لرزتے ہوئے، بڑھتے ہوئے غم کے سائے
ہائے یہ بنسری کی درد میں ڈوبی آواز
گیت کے ساتھ یہ روتی ہوئی جنگل کی ہوا
سانولے سُر میں گلہ: "پیت کرے نہ کوئے"[2]
جانے کے روز ہوئے گھر سے وہ نکلا ہوگا
گیت کی لے میں دھڑکتی ہیں کتھائیں کتنی
اشک بھر آئے، لگا ڈوبنے جی دریا کا

جانے کس باڑی[3] میں رہتی ہے چہیتا اس کی
وہ پدم لوچنی، گج گامنی، نٹ کھٹ پیاری
وہ مسکتی ہوئی چولی، وہ ملائم ساری
ہائے وہ قامتِ موزوں، وہ سلونا مکھڑا
بانکی چتون، وہ کنول نین، مریلے[4] مخمور
داستاں داستاں پھیلے ہوئے لانبے گیسو
رات کا جاگتا انگڑائیاں لیتا جادو

* ترجمہ ادارہ

[1] خلیج بنگالہ

[2] دوہہ:
گر میں ایسا جانتی پیت کئے دکھ ہو
نگر ڈھنڈورا پیٹتی پریت کرے نہ کو

[3] گاؤں

[4] بمعنی قاتل (جھنگ کا مقامی لفظ

پاؤں رکھتی ہے جہاں پھول برس جاتے ہیں
جوت ماتھے پہ جوانی کی جگاتی بیندی
راستہ مانجھی کو رہ رہ کے دکھاتی بیندی
چپکے چپکے یہ بلاتی بیندی،
"نیا باندھو رے کنارِ دریا"

اس طرف پدما کی لہریں، وہی بھیگا ہوا جال
اِلّی سا، تاپلا، روئی، کوئی چنگری کا تل[1]
بھات کس طرح پکائے گی مری حسن آرا
ڈولتے من کی یہ ساتھی، یہ پرانی نوکا[2]

کھو گیا بانسوں کے جنگل میں جواں چاند کہیں
دُور پورب میں وہ لو صبح کا تارا چمکا
ناچتی لہروں سے دو پھول سی باہیں اُبھریں
اک چکا چوند ہوئی چوڑیاں چمکیں، چھنکیں
سطح دریا پہ وہ ہنستا ہوا چہرا اُبھرا
ہاتھ پھیلائے تو پتوار کا پھرتا سایا

ہر طرف اب تو انناس کی خوشبو پھیلی
ناریل نیند سے جاگے کہیں کوکل[3] بولی
آرہی ہے کسی باڑی سے اذاں کی آواز
بیڑی سلگاؤں ذرا کش تو لگالوں دو چار
جانے سوئی بھی ہے شب بھر کہ نہیں حسن آرا
ہو معظّم[4]! ہو معجّم! ارے بھیا بھیا!
ناؤ کا لا رے کنارے کہ پڑھیں مل کے نماز
حسن آرا بھی اٹھی ہوگی عبادت کے لئے
تخت پر بیٹھ گئی ہوگی تلاوت کے لئے
اشک آنکھوں میں تو ہونٹوں پہ وہی ایک دعا
جس کو دُہراتے ہوئے کتنے ہی دن بیت گئے:
"اے خدا خیر سے مانجھی مرا اب گھر آئے
اب جو تالاب پہ جاتی ہوں تو جی ڈر جائے
اے خدا ——

[1] یہاں کی مچھلیوں کی مشہور اقسام
[2] کشتی
[3] مشرقی پاکستان کا مرغِ سحر خیز
[4] اے معظّم

افسانہ :

کوفی ہاؤس میں دو نقاد

- انور

"ڈیر خاور

یہ عجیب سا افسانہ ہے۔ اس میں پہلا پیراگراف سات فولسکیپ صفحوں کا ہے اور ہر پیراگراف ایک کردار کی گفتگو۔

پہلا کردار نون سٹوپ بولنے کا عادی ہے۔اس نے میرے افسانے کو عجیب ہیئت دے دی ہے۔

میرا خیال ہے بڑے نقاد اس افسانے کو افسانہ کہنے سے احتراز کریں گے لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ افسانے کی حدود کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور پھر افسانہ نگار وقت کے مسائل سے متاثر کیوں نہ ہو؟

اچھا!"

"بڑے نقاد!" ——— یہ تو بڑی بات ہوئی۔ تاہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ ضرور ہے اور نئے انداز کا۔ بشرطیکہ آپ بھی اسی طرح کافی ہاؤس میں اکیلے نہ رہ جائیں! "خیالات کی آزادی" بہرحال آپ بھی نہیں چھینیں گے۔ (مدیر)

ایک ثبوت تو ہمارے ادب کے زوال کا یہ ہے کہ اس میں غزل دوبارہ زندہ ہوگئی ہے۔ دوسرا ثبوت شرر کے تاریخی ناول کا احیاء ہے۔ ان دونوں ثبوتوں کو تقویت پہنچانے کے لئے علامہ جبین بجبیں چریاکوٹی کے کلام کے تازہ مجموعے کا ذکر ضروری ہے جس کا نام انہوں نے "دوڑ پیچھے کی طرف" رکھا ہے۔ یہ گرانقدر تصنیف "دوڑ پیچھے کی طرف" ہمارے زمانے کی ایک نمائندہ تخلیق ہے۔ اس سے یہ نظریہ حتمی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ہمارے ادب میں قطعاً جمود نہیں ہے۔ اس میں باقاعدہ حرکت موجود ہے۔ یا شاید یہ بے قاعدہ حرکت ہے۔ یعنی ہمارا ادب آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کو دوڑ رہا ہے۔ اور ہم ادب کی دوڑ میں ایک سو سال کے ہینڈیکیپ کے ساتھ پیچھے کھڑے کر دئے گئے ہیں، لیکن یہ بڑا گمراہ کن جملہ ہے۔ "پیچھے کھڑے کر دئے گئے ہیں" اس پر رجعت پسندی کا الزام لگ سکتا ہے۔ اور اس میں سے جمود کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ حالانکہ علامہ جبین بجبیں چریاکوٹی کی عرفانی تصنیف "دوڑ پیچھے کی طرف" میں جمود کا نام و نشان نہیں۔ اس میں حرکت ہے، بلکہ دوڑ ہے، بلکہ دوڑ دھوپ ہے۔ لیکن آج مجھے ایک اور سطح پر گفتگو کرنی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ادب میں زوال کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں، ہماری غزل کے اشعار اور ہمارے تاریخی ناول ہمارے ادبی زوال کے جراثیم ہیں جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر گئے ہیں۔ غزل کے جراثیم نہایت مہلک ہیں۔ غزل کے جراثیم جب کسی دفتر میں، جس کی چوکھٹ پر "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے" لکھا ہوتا ہے، بغیر اجازت داخل ہو جاتے ہیں تو تمام کلرک اور ان کا انچارج غزل کے الہام کا الیکٹرک شوک محسوس کرتے ہیں۔ اور دفتر میں فائلوں کے پاس مرصع غزلوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ غزل کے جراثیم زیادہ تر دفتروں پر حملہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے اکثر غزل گو شعراء دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ اور غزل گو شاعر جتنا بڑا افسر ہوگا اتنا ہی بڑا وہ غزل گو شاعر ہوگا ——— اب میں ایک بہت اہم بات کہنے والا ہوں۔ میں اپنی اس بات کو اس لئے اہم کہتا ہوں کہ یہ میری برسوں کی ریسرچ کا نتیجہ ہے۔ یہ میری اپنی تحقیق ہے، میری اپنی ڈسکوری ہے میرا نظریہ ہے کہ اس ملک میں غزل کے احیاء کا ذمہ دار لارڈ میکالے ہے۔ پچھلی صدی میں لارڈ میکالے نے ہندوستان کے لئے ایک ایسا طریقۂ تعلیم وضع کیا تھا جس سے وقت کی حکومت کے لئے کلرک مہیا کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ اب ہندوستان اور پاکستان میں انسان پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ اور کلرک ایک ایسا جانور ہے جس کے خیالات میں تسلسل

نہیں ہوتا۔ چڑیا گھر میں موسیقی ہوتی ہے، معنے نہیں ہوتے۔ ہمارا شاعر یک وقت ایک شاعر، ایک کلرک اور ایک مشین ہوتا ہے۔ وہ لغات سے خوبصورت الفاظ نکالکر ردیف اور قافیے کی مشین میں ڈال دیتا ہے ور اس سے ایک خوبصورت شعر برآمد کر لیتا ہے۔ شعر خوبصورت ہونا چاہیئے اس کو معنی خیز ہونے کی ضرورت نہیں۔ غزل کے اشعار مرصع ہونے چاہئیں، ان میں تسلسل کی ضرورت نہیں۔ یہ نکتہ میں نے حال ہی یں ایک پاکستانی پکچر سے اخذ کیا ہے۔ اس پاکستانی پکچر کا مورل یہ تھا کہ بیوی خوبصورت ہونی چاہیئے۔ چاہے وہ اَن پڑھ، غلیظ اور بدتمیز دیہاتن ہو۔ اس فلم میں ایک زمیندار کا اکلوتا لڑکا جو امریکہ سے تعلیم حاصل کر کے واپس آیا ہے، اپنے باپ کی چالیس ہزار ایکڑ زمین کا دورہ کرتے ہوئے یک رات اتفاق سے راستہ بھول کر اپنے مزارعوں کے ایک گاؤں میں جا نکلتا ہے۔ وہاں اُسے ایک ماہی گیر اپنی جھونپڑی میں پناہ دیتا ہے۔ س لئے ماہی گیر کی اکلوتی لڑکی زمیندار کے اکلوتے لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ فلمی محبت میں خوبصورتی کے علاوہ ہیرو اور ہیروئن اکلوتا ہونا بھی بہت ضروری ہے تاکہ وہ گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تنہائی کے احساس سے اسقدر اکتائے ہوئے ہوں کہ ایک دوسرے کو دیکھتے ی محبت کی آگ میں الٹی چھلانگ لگا دیں۔ چنانچہ ماہی گیر کی لڑکی ہیرو کو اؤں کے پاس پرانے آسیب زدہ کھنڈرات میں، جہاں رات کو اُلو بولتے ہیں اور گیدڑ چیختے ہیں، لے جاتی ہے۔ اس رات وہاں نہ کوئی لو تھا اور نہ کوئی گیدڑ، کیونکہ میوزک ڈائرکٹر نے وہاں ایک سو پچاس دمیوں کے آرکسٹرا کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ماہی گیر کی لڑکی کا گانا سن کر ور ناچ دیکھ کر ہیرو نہ صرف اُلوؤں اور گیدڑوں کو بھول گیا بلکہ اپنی منگیتر کو بھی بھول گیا۔ ہیرو کی منگیتر ایک بہت بڑے کارخانے کے مالک لڑکی تھی، انگلستان کی تعلیم یافتہ، مہذب اور موڈرن۔ ماہی گیر کی لڑکی ی جاہل اور بے وقوف تھی۔ وہ زمیندار کو جمعدار اور علی بہشک کہتی ی۔ ہیرو بیچارہ پُرتکلف زندگی کا عادی تھا۔ اس نے ہیروئن کی باتوں حسن کی سادگی اور الہڑ پن سمجھ کے قبول کر لیا۔ میں نے اپنی تحقیق کے سلسلے میں یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ غریب ماہی گیر کی اس سادہ ور الہڑ لڑکی نے شانتی نکیتن سٹینڈرڈ کا ناچ اور گانا کہاں سے سیکھا ور اس نے کالج کی لڑکیوں کی طرح کپڑے پہننے اور بال بنانے کی ٹریننگ ہاں سے لی۔ لیکن میں ناکام رہا۔ غریب ماہی گیر کی اس سادہ اور الہڑ

لڑکی نے اپنی پیشانی پر زلفوں کے گچھے بنائے ہوئے تھے۔ اور اس نے گلاب کے پھولوں والے ڈیزائن کی ریشمیں قمیض پہنی ہوئی تھی جو اس کے جسم پر اس قد چپکی اور کھنسی ہوئی تھی کہ اس نے اس کے تندرست دیہاتی جسم کو چھپانے کی بجائے زیادہ نمایاں اور زیادہ ملائم کر دیا تھا اور اس میں گلاب کے پھول اُگلا دئے تھے جن کی وجہ سے اس کو دیکھے جانے کو ہی جی چاہتا تھا۔

چنانچہ ہیرو نے کھنڈرات سے لوٹتے ہی اپنے باپ کے سامنے جا کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ اپنی امیر منگیتر کو چھوڑ کر اس ماہی گیر کی غریب لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ سن کر باپ فوراً فرش پر گر پڑا اور چلا چلا کر اپنی حرکت قلب کو بند ہونے کی دعوت دینے لگا۔ اس لئے بیچارہ ہیرو ماہی گیر کی غریب لڑکی سے بے وفائی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور یہ سب کچھ ماہی گیر کی لڑکی کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا جو اپنا گاؤں چھوڑ کر زمیندار کے ہاں آ کر ملازم ہو گئی تھی۔ اس کو اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا کیونکہ جب اس کے باپ کو معلوم ہوا کہ اس کی بیٹی زمیندار کے لڑکے کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے تو اس صدمے کی تاب نہ لا کر ہیضے سے انتقال کر گیا۔ اب یہ غریب اور یتیم لڑکی اپنا گاؤں چھوڑ کر اپنے محبوب کی تلاش میں چل پڑی اور اسی کے گھر میں جا کر نوکرانی بن گئی۔ اب قسمت کی یا ڈائرکشن کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ تو ہیرو کو پہچان لیتی ہے۔ لیکن ہیرو اس کو نہیں پہچانتا۔ اس سے اس کے دل کو بڑا صدمہ پہنچا اور جب اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کا محبوب اپنے باپ کی جان بچانے کے لئے اس سے بے وفائی کر کے اپنی منگیتر سے شادی کرنے پر رضامند ہو گیا تو وہ فوراً گانے لگی اور گا گا کر اور رو رو کر خدا کو اپنی مدد کے لئے پکارنے لگی۔ چنانچہ قدرت کو اس مظلوم لڑکی پر رحم آ گیا۔ عین اس وقت ریڈیو پر زرعی اصلاحات کا اعلان ہوتا ہے۔ زمیندار غریب ہو جاتا ہے، ہیرو کی منگیتر ایک مفلس لڑکے کے ساتھ شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ آخر میں ڈائرکٹر نے بڑی چابکدستی سے ہیرو اور ہیروئن کی ازدواجی زندگی کا ایک سین دیا ہے۔ دونوں دن بھر کی مزدوری کے بعد اپنی جھونپڑی میں اپنے تیرہ بچوں کے درمیان بیٹھے خاندانی منصوبہ بندی پر بحث کر رہے ہیں ـــ

میں نے ادب کے زوال کی بحث کے سلسلے میں اس فلمی کہانی کا ذکر ضروری سمجھا کیونکہ یہ فلمی کہانی ایک نامور ادیب نے لکھی ہے۔ جو ایک دفتر میں کلرک ہے اور ایک بلند پایہ غزل گو شاعر ہے۔ مجھے ایک دفعہ کوئی ادُس میں اس بلند پایہ غزل گو شاعر نے کہا تھا، شاعر کا مشن حسن کی تلاش ہے، معنوں کی تلاش نہیں۔ چنانچہ وہ اس فلمی کہانی کے لئے حسن کی تلاش میں

جنگلوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کو عبور کر کے ایک دور دراز گاؤں میں پہنچا اور وہاں ایک جاہل مطلق، اَن پڑھ، نادان لڑکی میرحسن کا جلد [illegible] کر بھاگا ہوا واپس آیا اور ہیرو کو اطلاع کر دی اور اس طرح ایک گولڈن جوبلی کلچر کی بنیاد رکھ دی ـــــ کلرک کی زندگی ایک غزل ہے۔ اُس کی بیوی اس کا مطلع ہے، اس کے بچے اس کے اشعار اور اس کا مقطع وہ خود ہے۔ کبھی کبھی یہ غزل فراق گورکھپوری کے اکتالیس اشعار کی غزل بن جاتی ہے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو مقطع مرقد بن جاتا ہے۔ کلرک کی زندگی کی غزل میں مطلع اور مقطع ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور اشعار ایک دوسرے سے گتھم گتھا نظر آتے ہیں۔ کلرک کے خیالات میں تسلسل نہیں ہو سکتا۔ کلرک صرف اس صنف میں شاعری کر سکتا ہے جس کے اشعار میں تسلسل نہ ہو۔ یہ غزل کے احیاء کا اصل سبب ہے ـــــ یہاں میں کلرک کے مفہوم کی طرف ایک دفعہ پھر توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ کلرک سے مراد وہ تھوڑی تنخواہ والا، جھکی ہوئی ریڑھ کی ہڈی والا، موٹے موٹے شیشوں کی عینک والا اور زرد اور مدقوق جسم والا انسان ہی نہیں ہے بلکہ عرق مار اللحم سے تمتماتے ہوئے چہرے والا اور کار پر بیٹھ کر دفتر آنے والا عہدہ دار بھی ہے۔ ہم سب کلرک ہیں، ہم سب لارڈ میکالے کے فرزند ہیں۔ یہ کلرکوں کی دنیا ہے۔ یہاں سب کے دماغ ماؤف ہیں۔ یہاں ایک شعر کہنے کے بعد شاعر کے دماغ کا سوئچ آف ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے شعر کے الہام تک وہ بالکل بھول جاتا ہے کہ پہلے شعر میں اس نے کیا کہا تھا۔ ہماری شاعری بین الاقوامی ادب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ سیاست دانوں کی حکومت کے دور میں ایک غزل گو منسٹر اپنی چوتھی سترہ سالہ بیوی کے ساتھ گورنمنٹ کے خرچ پر ہنی مون منانے کے لئے لندن گیا۔ اُس کی پہلی بیوی کی عمر پچاس سال، دوسری کی پینتیس سال، تیسری کی اٹھائیس سال اور چوتھی کی سترہ سال تھی۔ چوتھی سترہ سالہ بیوی کے ساتھ شادی ضروری تھی کیونکہ وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کے عشق میں اس نے غزلوں کا ایک دیوان لکھ ڈالا تھا۔ لندن میں گورنمنٹ کے خرچ پر ایک پارٹی کے دوران میں اُس کی ملاقات انگریزی کے ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر سے ہوئی۔ اس کی سترہ سالہ خوبصورت بیوی نے اس ایڈیٹر کو اپنے شوہر کا غزلوں کا دیوان ایک ریشمی ربن میں باندھ کر پیش کیا۔ ایڈیٹر کو منسٹر کی بلند پایہ ادبی حیثیت کا فوراً یقین آ گیا۔ اور جب اچانک نظر منسٹر کی خوبصورت بیوی کی دو چوٹیوں پر پڑی اور اس نے دیکھا بالوں کا رنگ اور غزلوں کے دیوان کا ربن ایک ہی رنگ کا ہے فوراً ایک غزل کا ترجمہ کر کے اپنے ادبی رسالے میں شائع کر د ترجمہ شائع ہوتے ہی سارے انگلستان میں ایڈیٹر کے دماغی آ کے خلاف شور مچ گیا اور بورڈ اوف ڈائرکٹرز نے مجبور ہو کر اپ کو دماغی ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ اصلی مصنف بھی ملک میں موجود ہے۔ تو عوام نے مطالبہ کیا کہ اس مصنف کو بھی ایڈیٹر کے ساتھ دماغی ہسپتال میں داخل کرایا لیکن یہ ممکن نہ تھا کیونکہ مصنف اپنے ملک کا ایک ذمہ دا ـــــ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غزل ہمارے ملک کے دماغی توا پیمانہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ غزل نے ہمارا دماغی توازن بگاڑ ہم نے غزل کا دماغی توازن بگاڑا ہے؟ لیکن یہ اسی قسم کا سوا کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا پہلے پیدا ہوا۔ اس لئے اس سوال کو ہمیں اس سے زیادہ اہم مسئلوں پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر ہم غور نہ تو کم از کم ہمیں رونا چاہیئے۔ یہ واقعی رونے کا مقام ہے کہ ہمار میں غزل کا رواج ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا رونے کا مقا کہ ہمارے ادب میں میر کی شاعری کو مقبولیت حاصل ہو گئی ہے۔ شاعری نے ہماری غزل سے تخیل اور حسن کو ختم کر کے ہماری غز تباہ کر دیا ہے۔ میر کی شاعری میں کوئی خوبی نہیں سوائے اس کے تجریدی آرٹ کی طرح آسان ہے۔ چونکہ غزل نے ہمارے شا دماغی توازن کو متزلزل کر دیا ہے۔ اس لئے وہ بلند معیار کی غز کے اہل نہیں رہے۔ ہمارے شاعروں کے دماغ اعلےٰ درجے کی صلاحیتوں سے خالی ہیں؛ اس لئے وہ میر کے انداز میں شاعر سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے موجودہ شاعر ہمارے ادبی ر ایڈیٹروں کے لئے بڑی مصیبت کا باعث بنے ہوتے ہیں۔ کسی گھٹیا قسم کی غزل کو ردی کی ٹوکری میں پھینکنا ہی چاہتے نظر شاعر کے تخلص پر پڑتی ہے۔ جوگی جی! اس کا مطلب یہ ہے ک میر جی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کو ناقابلِ اشاعت قرار جا سکتا۔ اس وقت ہماری شاعری میں میراجی، مرزاجی، آ جی، آباجی جیسے تخلصوں کی بھرمار ہے۔ کیونکہ اگر میرے سامنے

شعر ہوگا تو شعر کی بلندی اور پستی کا سوال نہیں ہوگا بلکہ آبا جی کے احترام کا سوال ہوگا۔ میں نے میر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر اس کا گہرا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ میں پندرہ روپے خرچ کرکے پندرہ سو صفحے کی ایک کتاب "میر کی شاعری" خرید کر لایا اور پندرہ سال تک اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ مطالعے کے بعد مجھے اپنے پندرہ روپے اور عزیز کے پندرہ سال ضائع ہونے کا بہت افسوس ہوا۔ فاضل نقاد نے لکھا ہے کہ میر نے تمام عمر عشق کیا اور پھر لو عشق کیا یعنی ان کا کوئی مستقل روزگار نہیں تھا۔ ان کا پیشہ عشق تھا اور ان کو تنخواہ درد کی جنس میں ملتی تھی۔ اس لئے ان کی شاعری درد کی چیخ ہے اُن کے اشعار درد کی چیخ اور پکار ہیں جن کے پیچھے ردیف اور قافیے لٹکا کر وہ اُن کو شعر سمجھ لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ میر کو کس قسم کا درد اٹھتا تھا جو اُن کو چیخنے پر مجبور کر دیتا تھا اور وہ ہسپتال میں جانے کی بجائے شعر کہنے بیٹھ جاتے تھے؟ میری ریسرچ کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کو دل کا درد نہیں تھا۔ کیونکہ جب کبھی بھی ان کو دل کا درد اٹھتا تھا تو وہ عطار کے لونڈے سے دوا لینے چلے جاتے تھے جس کی پہلی ہی خوراک سے اُن کو آرام آجاتا تھا۔ وہ عطار کا لونڈا بڑا ستم ظریف تھا۔ وہ انکو ایک خوراک تو ایسی دیتا تھا کہ وہ بیمار ہو جاتے تھے۔ اور دوسری ایسی کہ وہ تندرست ہو جاتے تھے۔ اس اُدھیڑ بُن میں ان کو شعر کہنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ میں نے ریسرچ کی مدد سے یہ دریافت کیا ہے کہ وہ درد جو اُن کو شعر کہنے پر مجبور کرتا تھا، پیٹ کا درد تھا۔ میر کا کوئی مستقل روزگار نہیں تھا۔ وہ اکثر بھوک اور بیکاری کے مسائل سے دوچار رہے ہیں۔ بھوک اور بے کاری کا کٹھن وقت کاٹنے کے لئے انسان کئی قسم کے پاپڑ بیلتا ہے بھوک اور بیکاری میں شاعری پاپڑ بیلنے کے برابر ہے۔ بلکہ بھوک اور بیکاری میں پاپڑ کی قیمت شعر سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ پاپڑ کا تعلق پیٹ سے ہے۔ پیٹ کا درد ایک بہت بڑی حقیقت ہے، دل کا درد ایک معمولی مہلک مرض ہے۔ پیٹ کا درد ایک عالمی اقتصادی مسئلہ ہے۔ یہ دنیا میں بڑے بڑے سیاسی انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ یہ انسان سے پندرہ پندرہ سو صفحے کی ضخیم کتابیں لکھوا لیتا ہے۔ لیکن اس میں ایک بہت بڑا نقص ہے یہ دماغ کو بلند خیالی اور حسن آفرینی سے خالی کر دیتا ہے۔ یہ تھنکر کو فن کے شاہکاروں سے محروم کر دیتا ہے۔

میر نے ہمارے شاعروں سے بلند خیالی، حُسن آفرینی اور فنکاری چھین لی ہے۔ اور غزل نے اُن کو مسلسل اور مربوط سوچ بچار کی صلاحیت سے محروم کر دیا ہے۔ غزل اور میر کی شاعری ہماری قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے اور ہمارے ادب کے زوال کا سب سے بڑا سبب۔

اب میں نثر کی طرف آتا ہوں۔ شرر کے تاریخی ناول کے احیا نے ہمارے ادب کو پچاس سال پیچھے پھینک دیا ہے ہم شاعری میں سو سال پیچھے ہیں اور نثر میں پچاس سال۔ پچھلے چند سالوں میں اردو زبان میں ہزار تاریخی ناول لکھے گئے ہیں لیکن ایک لفظ ادب کا پیدا نہیں کیا گیا۔ تاریخی ناول ادب پیدا کرنے کے لئے نہیں لکھے جاتے، روپیہ پیدا کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ تاریخی ناولوں کے مصنف ادیب نہیں، لفظوں کے تاجر ہیں۔ ان لفظوں کے تاجروں نے ہمارے عوام کے ادبی ذوق کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ انہوں نے اس کی تسکین کی ہے، تربیت نہیں کی۔ تاریخی ناول نگاروں کا یہ جُرم ناقابلِ معافی ہے۔ ادیب کا سب سے بڑا مقصد تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ ہمارے تاریخی ناول نگار ہمارے ملک کے باشندوں کو نہیں جانتے، ہمارے کھیتوں اور ہمارے کارخانوں میں کام کرنے والوں کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے گلی کوچوں، گاؤں اور شہروں سے واقف نہیں۔ ہمارے پہاڑوں اور دریاؤں اور سمندر سے محبت نہیں رکھتے۔ ان کے ناولوں کے ماحول اور کردار عرب، ایران اور مصر سے امپورٹ کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ہیرو کو اپنی دلھن کے ساتھ محبت کی پہلی رات گذارنے کے لئے پھولوں کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی سیج پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کسی کونے میں کھڑے ہو کر انکی راز و نیاز کی باتوں سے لذت اندوز ہوتے رہتے ہیں اور جب محبت عروج کے آخری نقطے پر ہوتی ہے وہ بھاگ کر جنگ کے میدان میں پہنچ جاتے ہیں اور جنگ کا نقارہ بجا دیتے ہیں۔ حجلۂ عروسی میں فرض اور محبت کی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ آخر فرض محبت پر فتح پاتا ہے اور ہیرو تلوار نکال کر جنگ کے میدان کی طرف بھاگ پڑتا ہے، اور جاتے ہی دشمن کے دس ہزار سپاہیوں کو تہِ تیغ کر دیتا ہے۔ نعرۂ تکبیر! اللہ اکبر! تاریخی ناولوں میں جا بجا نعروں کا وافر استعمال ہوتا ہے اور ان کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ان ناولوں کے اجنبی ماحول میں اور ہم میں یہی ایک چیز مشترک ہے۔ ان ناولوں میں مقاموں کے نام اجنبی ہوتے ہیں کرداروں کے نام اجنبی، بعض الفاظ بھی اجنبی (مثلاً چچا کی لڑکی کو بنتِ عم کہا جاتا

ہے) اور واقعات بھی اجنبی ہوتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ یہ ناول کسی ترکی یا مصری ناول کا ترجمہ ہے۔ پھر یکا یک [illegible] ملتا ہے۔ ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ہم اپنے ملک میں واپس آجاتے ہیں اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول غیر ملکی زبانوں کے ترجمے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ہی ادیبوں کی گرانقدر تصنیفیں ہیں۔ کیونکہ عربی، مصری اور ترکی ناولوں میں نعرے نہیں ہوتے۔ ان میں نعرہ بازی سے کام نہیں لیا جاتا۔ نعرہ بازی سے صرف ہمارے ملک میں کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں دو طبقوں نے نعروں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ سیاستدانوں کے طبقے نے اور تاریخی ناول نگاروں کے طبقے نے۔ انقلابی حکومت سے پہلے سیاستدانوں کا طبقہ پبلک جلسوں میں بھوک، بیکاری، افلاس، جہالت، رشوت ستانی، چور بازاری اور سمگلنگ کو نیست و نابود کر دینے کے بلند بانگ وعدے اور دعوے کرتے تھے تو عوام اونچے اونچے نعروں سے فلک میں شگاف کر دیتے تھے۔ اور جب عوام مکمل طور پر فلک میں شگاف کرنے میں لگ جاتے تھے تو سیاستداں اطمینان سے رشوت ستانی، چور بازاری اور سمگلنگ میں مشغول ہو جاتے تھے۔ انقلابی حکومت نے آخر سادہ لوح عوام کو ان کے جذبات کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے سیاستدانوں کے شکنجے سے نکال لیا۔ لیکن سیاستدانوں کا طبقہ تو ایک جرائم پیشہ طبقہ تھا۔ تاریخی ناول نگار جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ وہ تو نعروں سے اپنی آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تو نعروں سے غیر مانوس ماحول کو مانوس بنانا چاہتے ہیں۔ غیر ملکی کرداروں کو ملکی رنگ دینے کے لئے وہ اور بھی طریقے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اٹھارہویں صدی کا ہیرو عربی لباس میں ہوگا، اس کے بال مغربی انداز میں کٹے ہوں گے اور اس نے شیو کیا ہوگا۔ اور جنگ کے میدان میں اس نے برجس پہنی ہوگی اور پاؤں میں پیٹنٹ لیدر کے ویلنگٹن شوز ہوں گے اور پنڈلیوں پر چمکدار گارڈ چڑھائے ہوں گے۔ اس طرح ہیرو بڑی آسانی سے دشمن کے دس ہزار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اور پھر کامیابی کے نشے میں ایک لمبی تان کے ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہے۔ اس کے سپاہی بھی کامیابی کے نشے میں ایک لمبی تان کے ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہے۔ اس کے سپاہی بھی کامیابی کے نشے میں چور اپنے سردار کا جواب فلک شگاف نعروں سے دیتے ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں میں ان تاریخی ناولوں کے ولولہ انگیز نعرے سن کر اداس ہو جاتا ہوں۔ یہ نعرے میرے خون میں ہیجان پیدا کرنے کی بجائے مجھے اپنے ایک بچپن کے واقعے کی یاد دلا دیتے ہیں: میرے ابا مجھے ایک دن اپنے ساتھ شکار پہ لے گئے۔ رات کو تنبو میں جب گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں تو میں ڈر گیا۔ میرے ابا میرا دل بہلانے کے لئے میرے ساتھ باتیں کرنے لگے: جانتے ہو یہ گیدڑ کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ ابا نے بتایا: جب بہت سے گیدڑ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ایک گیدڑ ایک لمبی چیخ مار کر کہتا ہے: پدرم سلطان بود۔ دوسرے گیدڑ اس کے جواب میں چھوٹی چھوٹی چیخوں میں جلدی جلدی کہتے ہیں: تُراچہ! تُراچہ! تُراچہ۔ اور جب مجھے یہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو میں بہت اداس ہو جاتا ہوں ——— میں نے شروع میں کہا تھا کہ تاریخی ناول کے احیاء نے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے ہمارے ملک اور سوسائٹی کو بڑے بڑے ادیبوں سے محروم کر دیا ہے۔ کیونکہ تاریخی ناول نگار بڑی بلند پایہ ادبی صلاحیتوں کے ادیب ہیں جو اتفاقاً ایک زیادہ زرخیز راستے پر چل پڑے ہیں۔ اگر ان کی خیبر شکن نظر ہمارے ملکی مسائل پر مرکوز رہتی تو آج ہماری لائبریریاں ادبِ عالیہ سے بھری ہوتیں۔ اس وقت ہماری لائبریریوں میں آدھی سے زیادہ الماریاں تاریخی ناولوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ہم سب کے لئے بڑا افسوس کا مقام ہے۔ لیکن میرے لئے یہ مقام صرف افسوس کا ہی نہیں بلکہ رونے کا مقام ہے کیونکہ میری لائبریری میں بھی آدھی سے زیادہ کتابیں تاریخی ناول ہیں۔ میری بیگم میری لائبریری کو نامکمل کہہ کر ہمیشہ مجھ سے لڑتی رہتی تھی۔ آج صبح میں نے دیکھا کہ اس نے میری لائبریری میں سے لیو ٹالسٹائی، چارلس ڈکنز اور امیل زولا کے تمام سیٹ نکال کر کباڑیے کی دکان پر پہنچا دیے ہیں اور ان کی جگہ اردو کے تاریخی ناول سجا دئے ہیں ———

آخر ادب کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ ادب ایک بہت بڑی آنکھ ہے جس کا کام ہمارے حال کو خوردبین کے نیچے رکھ کر اس کا مطالعہ کرنا ہے اور ہمیں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے تیار کرنا ہے۔ ادب کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں، ماضی سے تاریخ کا تعلق ہوتا ہے۔ تاریخ ادب نہیں اور ادب تاریخ نہیں۔ وہ زندہ، جاندار متحرک شے جس کو زندگی کہتے ہیں مستقبل کی طرف سفر کر رہی ہے۔ ماضی کی مسحور کن داستانوں سے اس کی رفتار سست مت کرو۔ ماضی کے

بہادرانہ کارناموں نے ہیروشیما میں ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ ماضی
حال کو جنم دے کر مر چکا ہے۔ اس کے مردہ جسم میں جان ڈالنے کی
کوشش مت کرو۔ اس کا مردہ جسم اب کبھی زندہ نہیں ہوگا۔ حال
سے مستقبل پیدا کرو۔ تمہاری منزل مستقبل میں ہے۔

دیکھو! یہ وعظ بند کرو۔ نہیں تو میں اٹھ کر چلا جاؤں گا۔
میں نے سرسری سا سوال کیا تھا۔ تم نے ایک پورا لیکچر پلا دیا۔ آدھے
گھنٹے سے نون سٹوپ بول رہے ہو۔ کوفی پیتے پیتے تنگ آگیا ہوں۔
یہ چوتھی پیالی ہے۔

اور جب تم دو دو گھنٹے نون سٹوپ بولتے ہو اب بغیر کوفی،
بغیر چائے پئے مشورہ دو۔ میں ان باتوں کو ایک مضمون کی شکل میں کسی
ادبی رسالے میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔

اور بت شکن محمود غزنوی کا نامکمل چھوڑا ہوا کام مکمل کرنا چاہتے
ہو۔ لیکن یہ بت بہت مضبوط ہیں۔ یہ بت پرست بڑے سخت جان ہیں۔
میرا خیال ہے تم یہ بت نہیں توڑ سکو گے۔

اور کوئی میرا ناک توڑ دے گا۔

میرا ناک نہیں، میری ناک۔ تم جیسے ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے
والے بڑے بڑے ادبی بتوں کو توڑنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ دیکھو!
ہم نقاد ہیں۔ اگر ہم ہی غلط اردو بولیں گے تو زبان کی اصلاح کون
کرے گا؟

زبان ایک بت ہے جو ٹوٹ چکا ہے۔ اردو زبان کی ٹکسالیں
دلّی اور لکھنؤ میں قائم تھیں بند ہو چکی ہیں۔ ان کے بند ہونے سے
کافی عرصہ پہلے ان میں انحطاط کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ان کی دیسی
دقیانوسی مشینیں صرف ایسے الفاظ مہیا کرتی تھیں جو محض مقامی
ضرورتوں کے لئے کافی تھے۔ وہ دیسی دقیانوسی مشینیں بڑھتے ہوئے
بین الاقوامی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لئے ہماری
زبان کی ایک ٹکسال لاہور میں قائم ہوئی جس میں مغربی ملکوں سے
ماڈرن مشینری منگوا کر نصب کی گئی۔ اس ٹکسال میں بنے ہوئے
الفاظ زیادہ وسیع معنوں سے مزین تھے اور ہمارے نئے مسائل کے
حل میں ہماری زیادہ مدد کر سکتے تھے۔ اس نئے ادبی مرکز نے ہماری

زبان کو بڑی وسعت دی اور ہم کو ہماری پرانی کرم خوردہ کلاسیکل
کتابوں کے بے سود مطالعے سے آزاد کر کے ہماری توجہ مغربی علوم
کے خزانوں پر مرکوز کر دی۔ اس نئے ادبی مرکز نے ہمیں بڑے بڑے
ادیبوں کے علاوہ علامہ اقبال جیسا عظیم شاعر بھی عطا کیا۔ دلّی
اور لکھنؤ نے ایک مدت تک علامہ اقبال کی عظمت اور دوسرے
ادیبوں کی اہمیت سے انکار کیا۔ ان کا اعتراض تھا کہ ماں کے
خالص دودھ سے پروان چڑھی ہوئی زبان کی موجودگی میں یونیورسٹی
کے مصنوعی دودھ سے پلی ہوئی زبان بڑے ادیب کیسے پیدا کر سکتی
ہے۔ لیکن آخر علامہ اقبال کو قومی شاعر اور دوسرے ادیبوں کی
اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا اور زبان کا بت ٹوٹ گیا۔ اب زبان ادیب
کو پیدا نہیں کرتی، ادیب زبان کو پیدا کرتا ہے۔ اب ہم زبان کے
غلام نہیں، زبان ہماری کنیز ہے۔ اب موضوع، اسلوب اور عالمی
مشاہدہ زبان سے زیادہ اہم ہیں۔ اب ہماری نظر زبان کی غلطیوں
کی بجائے موضوع کی جدت، اسلوب کی جاذبیت اور مشاہدے کی
وسعت کی طرف جاتی ہے۔ غلطی سب کرتے ہیں۔ ادیب بھی غلطی
کرتا ہے، زبان بھی غلطی کرتی ہے۔ اگر زبان ادیب سے پوچھ سکتی
ہے کہ ناک کو مذکر کیوں استعمال کیا گیا ہے تو ادیب بھی زبان سے
پوچھ سکتا ہے کہ ناک کو مؤنث کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ کیا زبان
بتا سکتی ہے کہ ماتھا کیوں مذکر ہے اور پیشانی کیوں مؤنث ہے؟
لکھنؤ کیوں مذکر ہے اور دلّی کیوں مؤنث ہے؟ اور رشتہ اور سالن
اور فکر کیوں خواجہ سراؤں کے خاندان میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ناک کو
محض اس بنا پر مؤنث استعمال کرنا کہ یہ اردو زبان کی روایت میں
شامل ہے، کافی نہیں۔ کیونکہ ناک کو مذکر استعمال کرنا پنجابی زبان
کی روایت میں شامل ہے۔ اور ناک میں اس کی پوری صلاحیت
موجود ہے۔ مرد کے ناک کی طرف دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
پہلوان لنگوٹا باندھ کر اکھاڑے میں نکل آیا ہے اور ابھی اپنے دشمن
کو پچھاڑ دے گا۔ عورت کے ناک کو دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
سرمے، غازے اور لپ سٹک کی حفاظت کے لئے چوکیدار دونالی
بندوق لئے کھڑا ہے۔ اور وہ دشمن کو دیکھ کر ابھی آدم بو آدم بو کا شور
مچا دے گا۔ اس طرح ناک مرد کی عزت اور عورت کی عصمت کا محافظ
ہے اور محاورہ ناک کٹ گئی نہیں ہونا چاہئے بلکہ ناک کٹ گیا ہونا

چاہیے۔ اگر آپ دھمکی دینے کے لئے کہتے ہیں: میں تمہاری ناک توڑ دوں گا۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے آپ عورت پر ہاتھ اٹھا رہے ہیں اور اگر کہا جائے میں تمہارا ناک توڑ دوں گا۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مرد سے مقابلہ ہے اور محمود غزنوی بت توڑنے کی مہم پر نکلا ہے۔

بہر کیف میں زبان کے معاملے میں تم سے کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا۔

میں بھی زبان کے معاملے میں تم سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے تو تم سے مشورہ مانگا تھا کہ کیا یہ خیالات میں ایک مضمون کی صورت میں پریس کو دے دوں؟

میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ تمہارے لئے مفید نہ ہوگا۔ میں نے ایک دفعہ غزل اور غزل گو شعرا کے خلاف ایک مضمون شائع کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ابھی تک کہیں ملازمت نہیں ملی۔ ہر انٹرویو بورڈ میں آدھے سے زیادہ غزل گو شعرا ہوتے ہیں اور میرا نام سن کر اور میری شکل دیکھ کر فوراً مجھے کمرے سے باہر نکال دیتے ہیں۔

اس نے تمہیں بزدل بنا دیا ہے۔ تم نے حالات سے شکست کھائی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ میں نے حالات سے شکست کھائی ہے لیکن مجھے بزدل نہیں کہا جا سکتا۔

تم بزدل ہو۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک پرائیویٹ اجتماع میں سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کے خلاف ایک بڑا معرکہ آرا مضمون پڑھا تھا تم نے کہا تھا کہ منٹو کی تحریروں میں ادب کی دلکشی نہیں ہے بلکہ پورنوگرافی کی دلکشی ہے۔ پورنوگرافی ایک عریاں تحریر ہوتی ہے جس کا مقصد پڑھنے والے کے سفلی جنسی جذبات کو اکسانا اور اُن کو تسکین پہنچانا ہوتا ہے۔ پورنوگرافی میں پڑھنے والے کے لئے بے پناہ جاذبیت ہوتی ہے اور وہ پورنوگرافی کے مصنفوں اور ان کی عریاں تحریروں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ پچھلی جنگ کے دوران میں محاذ پر سپاہیوں کی جنسی بھوک کی تسکین کے لئے پن آپ گرلز کے نام سے نیم عریاں عورتوں کی تصویریں اور گندی جنسی تحریریں رواج پا گئی تھیں جس کا ادب پر بھی اثر ہوا منٹو نے اس انسانی کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ جب اس پر جنسی بے ادبی کی بنا پر چند مقدمے قائم ہو گئے اور سزائیں مل گئیں تو وہ جنس کا جینئس بن گیا۔ اور اس نے جنس کو اپنا مستقل موضوع بنا لیا۔ اور اس کے افسانے امراض مخصوصہ زنانہ و مردانہ کے اشتہاروں کی طرح پڑھے جانے لگے۔ یہاں سے اس کی بیمار ذہنیت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں سے اس کا ادب غیر صحت مند ہو جاتا ہے اور وہ ہمارے نوجوانوں کے لئے بہت بھاری خطرہ بن جاتا ہے۔ اس نے ہمارے نوجوان ادیبوں میں ایک گھٹیا جنسی رجحان پیدا کر دیا ہے اور وہ سستی اور فوری شہرت کے لئے کم درجے کا غیر صحت مند ادب پیدا کر رہے ہیں —— اس مضمون کو سننے کے بعد میں تمہارا مداح ہو گیا تھا۔ میں نے تمہیں مبارکباد دی تھی اور کہا تھا تم بہت بڑے نقاد ہو۔ اس مضمون نے واقعی مجھے تمہارا معتقد بنا دیا تھا کیونکہ منٹو کے متعلق میرا بھی یہی نظریہ ہے لیکن پچھلے سال میں نے ایک ادبی اجتماع میں منٹو ڈے پر تمہیں تقریر کرتے سنا۔ میں حیران رہ گیا۔ تم نے کہا منٹو ایک عظیم افسانہ نگار تھا۔ اس سے بڑا افسانہ نگار نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ تم نے ایک گھنٹہ تک تقریر کی۔ سب منٹو کا قصیدہ —— یہ کایا پلٹ بزدلی نہیں تو اور کیا ہے؟

او بیوقوف، اس ادبی اجتماع کی مجلس عاملہ نے مجھے اس تقریر کے لئے ایک سو روپے ادا کئے تھے۔ میں ایک انٹرویو بورڈ کے دفتر سے دھکے کھا کر باہر نکلا تھا کہ یہ مجلس عاملہ ایک سو روپے کا نوٹ لے کر میری خدمت میں حاضر ہوئی۔ میں نے جلدی سے نوٹ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے منٹو پر تقریر کرنی ہے۔ اب اگر میں منٹو ڈے پر منٹو کا قصیدہ نہ کہتا تو کیا کرتا؟

تو تم نے ایک سو روپے میں اپنے آپ کو بیچ دیا۔

اگر میں اپنے آپ کو نہ بیچتا تو کیا اپنی بیوی کو بیچتا؟ اپنے بچوں کو بیچتا؟ میری ایک عدد بیوی ہے اور چار بچے ہیں۔

اور یہ نرگس جمال کون ہے جس کو تم نے ایک مضمون میں ہماری تمام ادیب خواتین سے بڑا ادیب کہا ہے۔

وہ ایک ریسرچ سکالر ہے جو میری مدد سے ڈاکٹریٹ کے لئے تھیسس لکھ رہی ہے۔

کس موضوع پر؟

مجھ پر

تو یہ ہمارے ملک کی سب سے عظیم ادیبہ تم پر ریسرچ کر رہی ہے؟

جی ہاں

پھر تو وہ واقعی عظیم ہے

یقیناً

پچھلے دنوں میں نے تمہارا ایک اور مضمون دیکھا۔ اس میں تم نے ایک معمولی افسانہ نگار کو ہمارے ملک کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہا ہے۔ اس ادیب کا تم نے کبھی نوٹس نہیں لیا تھا اور اس کے تھرڈ ریٹ ہونے کا کئی دفعہ مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔ اب وہ یکبارگی ہمارا سب سے بڑا افسانہ نگار کیسے ہو گیا؟

دردِ گردہ سے!

دردِ گردہ! کیا مطلب؟

مجھے پچھلے سال سے دردِ گردہ کی شکایت ہے۔ اس کو پچھلے چالیس سال سے دردِ گردہ کی شکایت ہے۔ میں اپریشن سے ڈرتا ہوں۔ وہ بھی اپریشن سے ڈرتا ہے۔ اس نے دردِ گردہ کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے پاس دردِ گردہ کے تین ہزار نسخے ہیں۔ وہ مجھے نسخہ نہیں دیتا، دوا دے دیتا ہے۔ یہ مضمون میں نے اس سے دردِ گردہ کا نسخہ حاصل کرنے کے لئے لکھا ہے۔

اس مضمون کے آخر میں تم نے لکھا ہے: اے برصغیر کے نامور نقادو! کیا تم نے اس افسانہ نگار کو پڑھا ہے؟ اگر نہیں پڑھا تو پڑھو!

یہ اس نے خود لکھا ہے۔ میں دردِ گردہ سے چیخ رہا تھا، وہ میرے لئے دوا لایا اور کہنے لگا یہ جملے اپنے مضمون کے آخر میں لکھ کر یہ دوا کھالو۔ اللہ شافی ہے۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔

اور وہ لڑکی کون تھی جو کل تمہارے ساتھ صدر میں گھوم رہی تھی؟

وہ نرگس جمال ہے

جو تم پر ریسرچ کر رہی ہے؟

ہاں

اور تم اس کے بارے میں ریسرچ کر رہے ہو۔

نہیں۔

افواہ گرم ہے کہ نرگس جمال تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

ہاں، وہ شادی کے معاملے میں ایک عام لڑکی ہے۔ اس کا بھی خیال ہے کہ شادی محبت کا آغاز ہے۔ وہ بہت قریب سے میرا مطالعہ کرنا چاہتی ہے تاکہ اس کے تھیسس میں حقیقت کا رنگ پیدا ہو جائے۔

تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟

نہیں۔ میرا خیال ہے شادی محبت کا آغاز نہیں، شادی محبت کا انجام ہے۔ میں ایک تجربہ کار شادی شدہ آدمی ہوں۔ شادی ایک بہت غلطی ہوتی ہے۔ مجھ میں تو ایک شادی کی بھی توفیق نہیں۔ دو شادی کی غلطی مجھ سے کیسے ہو سکتی ہے؟

تمہیں نرگس جمال سے محبت ہے؟

ہاں

تم اس سے محبت بھی کرتے ہو اور شادی کی ذمہ داریوں سے بھی گھبراتے ہو۔ کیا یہ خود غرضی نہیں ہے؟

شادی ایک جسمانی ضرورت ہے۔ محبت ایک دماغی ضرورت ہے۔ جب نرگس جمال دماغی ضرورت کی حدود سے نکل کر جسمانی ضرورت کی شدت محسوس کرے گی تو میں اس کی کسی اچھی سی جگہ شادی کر دوں گا

دیکھو، تمہارا محبت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

محبت ایک آگ ہے جس کا تعلق آرٹ کے مقدس مندر کی آگ سے ہے۔ یہ آگ آرٹ کے مقدس مندر کی آگ کو زندہ رکھتی ہے یہ آگ ڈانٹے، گوئٹے اور عمر خیام سے آرٹ کے بڑے بڑے شاہکار پیدا کرواتی ہے۔ یہ محبت انسان کو بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کرتی ہے

اور گدھے کے سینگ! تو اپنی بیوی کی محبت سے یہ کام کیوں نہیں لیتا؟

بیوی کی محبت انسان کو بڑے کاموں پر آمادہ نہیں کرتی۔ بیوی کی محبت انسان کو چھوٹے کاموں پر آمادہ کرتی ہے۔ مثلاً جھاڑو دینا، پودوں کو پانی دینا، بازار سے سبزی اور گوشت لانا وغیرہ وغیرہ

میں آج سے تم کو ایک نقاد کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ تم بددیانت، بزدل، بے ایمان اور بداخلاق انسان ہو۔

خنجر سرحدی سے ملنے کے بعد تم بھی مجھ جیسے ہو جاؤ گے۔ خنجر سرحدی تمہارے خون کا پیاسا ہے۔ وہ تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔

کیوں؟ میں نے خنجر سرحدی کا کیا بگاڑا ہے؟

وہ کہتا ہے تم نے ایک ریویو میں اس کے کلام کے تازہ مجموعے کا مذاق اڑایا ہے۔

کیا نام ہے اس کے کلام کے مجموعے کا؟

"خواب، اونٹ اور تربوز"

ہاں۔ خنجر سرحدی نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے،

[illegible] انسان کی شعوری اور لاشعوری خیالات کی نمائندگی کرتا ہے
[illegible] انسان کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی کوئی کل
[illegible] نہیں۔ اور تربوز انسان کے دماغ کا سمبل ہے جس میں تربوز کا
گودا ابھرا ہوا ہے۔ اپنے دیباچے کے آخر میں اس نے لکھا ہے: کاش آج
فرائڈ اور میراجی زندہ ہوتے ۔۔۔ ذرا غور کرو زمانہ کتنا آگے بڑھ گیا ہے۔
اس وقت تمام انسانیت یکزبان ہو کر کہہ رہی ہے: کاش آج ہیروشیما
کے شہید زندہ ہوتے اور خنجر سرحدی کہہ رہا ہے، کاش آج فرائڈ اور
میراجی زندہ ہوتے۔

وہ خنجر سرحدی آ رہا ہے۔
کہاں؟

———

———

———

———

آپ نے میری کتاب پر ریویو لکھا ہے؟
ہیلو، خنجر سرحدی صاحب "تشریف رکھئے"
آپ نے میری کتاب پر ریویو لکھا ہے؟
جی ہاں۔
میں تمہارا ناک توڑ دوں گا۔
ناک حاضر ہے،
تم بڑے بددیانت ہو، تم انتہا کے بے ایمان ہو۔
آپ مجھ سے میرے خیالات کی آزادی نہیں چھین سکتے۔
میں تمہارا ناک تو توڑ سکتا ہوں۔

———

———

———

———

کوفی ہاؤس خالی ہو گیا ہے۔ نکسیر کے خون سے نقاد کے
کپڑے بھیگ گئے ہیں۔ وہ اپنے سر کو ہاتھوں میں تھامے
ہوئے میز پر کہنیاں ٹکائے اکیلا بیٹھا ہے۔ کوفی ہاؤس
کے دروازے بند ہو رہے ہیں ☆

انتظار

طاہرہ کاظمی

خرد کی بات گئی دل کی بات باقی ہے
اب انتظار کی بس ایک رات باقی ہے

یہ خوابناک اندھیرے یہ بھیگی بھیگی فضا
یہ سرسراتی ہوئی شوخ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
یہ شب کے پھول چمکتے زمین کے تارے
چمک کے صبح کو بن جائیں گے یہ انگارے
یہ نغمہ ریز خموشی کنار جوئے پُر آب
ہوا کے دوش پہ موجوں کا دھیما دھیما رباب

بہت لطیف تصور، بہت حسین خیال
رُخِ حبیب کی تنویر صُبحِ نو کا جمال
ہر اک نظارے میں جیسے خمار کا جادو
صبا کا رقصِ فراواں ہے یا رمِ آہو
اُلجھ گیا کہیں شاخوں میں پچھلی رات کا چاند
تری جبیں کے اُجالوں سے جیسے ہو کر ماند

حیات راہ کے سب در سنوار آئی
بہت قریب سے بوئے نگار آئی۔

خط میں حسن کاری (۱)

(وضع نو — مضمون : صفحہ ۵۳)

خطاط : عبدالمجید

طغریٰ

قطعہ

”مہر کارواں کے لئے“

پیام اور پیکر

ن حسن کاری :
(۲)

اور نستعلیق

ترتیب

گردش قلم

خط مستقیم

افسانہ
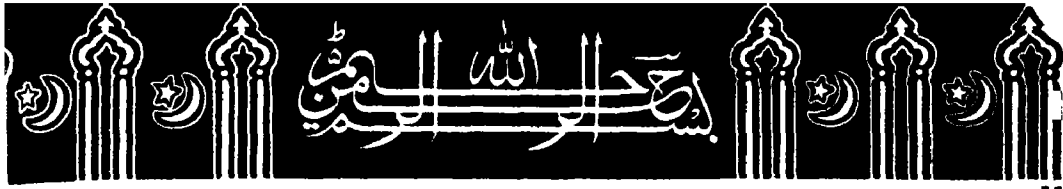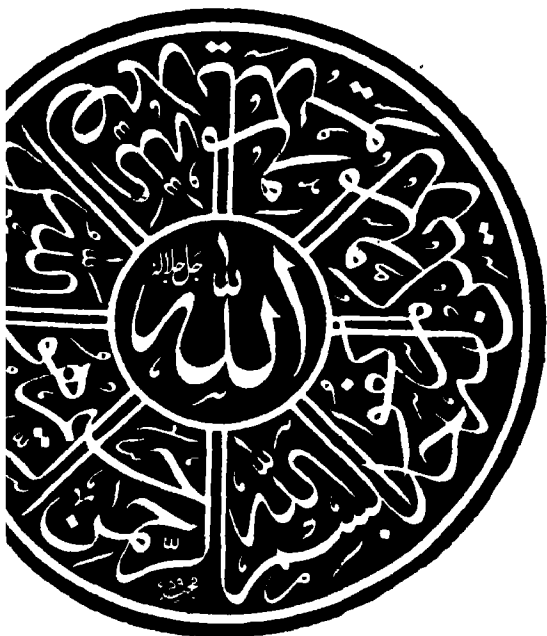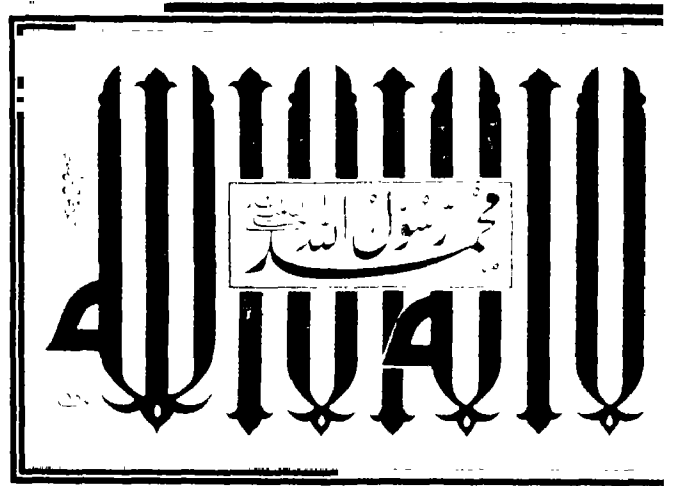
گاؤں کا شاعر

غلام الثقلین نقوی

میرے گاؤں کا نام ڈھوکن ہے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کی زمین چھ چھ سات سات گھماؤں کی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کا ہر آدمی چوہدری ہے۔

میرے گاؤں کی تین چیزیں مشہور ہیں:

میں ... سب سے پہلے اپنا ہی نام کیوں نہ لوں ....

اگرچہ اپنے منہ میاں مٹھو بننا کسی شرع میں جائز نہیں۔ پھر بھی میں گاؤں کی تین مشہور چیزوں میں سے نمبر ایک ضرور ہوں کیونکہ میں نے گل بہار کے پرائمری سکول کے آخری امتحان میں وظیفہ حاصل کیا، دیناپور کے قصبے سے مڈل کا امتحان پاس کیا، رینگ رینگ کر اپنے گاؤں سے بیس میل دور شہر جا پہنچا، دو سال کے بعد میٹرک کے امتحان میں بھی کامیاب ہو گیا۔ ٹائپ سیکھا اور ایک فرم میں' جو بینڈ کا سامان تیار کرتی ہے، ملازم ہو گیا۔ اب میں بیک وقت فرم کا اسٹور کیپر اور سیلزمین ہوں۔ اکثر فرم کے سفری ایجنٹ کی حیثیت سے دورہ بھی کرتا ہوں۔ میں نے بہت سے شہروں کی سیر کر لی ہے۔ گاؤں کو مجھ پر ناز ہے۔ میں نے اپنا نام بھی ڈی۔ ایم ناز رکھ لیا ہے۔

دوسرے نمبر پر گاؤں کے شاعر کا نام لوں یا زینی کا؟

میں مدت سے سوچ رہا ہوں۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا فیصلہ آپ کر لیجئے۔ میں تو گاؤں کے شاعر اور زینی کا نام اکٹھا ہی لوں گا۔ زینی سے پہلے ڈھوکن ایک پُرسکون گاؤں تھا۔ ایک گدلا سا جوہڑ جس کے پانی میں کوئی لہر نہ تھی۔ زینی ایک کنکر بن کر پانیوں میں گری حلقے اور دائرے سے بنے، پانی میں ہلچل ہوئی، لہریں کناروں کے ساتھ ٹکرائیں، سینکڑوں سورج پانی کے ایک ایک حلقے میں زندہ ہو کر چمکے۔ اتنے شرارے پھوٹے کہ آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ بہاروں کے قافلے آئے، پرندے چہچہائے، خوشبوؤں کے طوفان بکھرے، لنگ اور آہنگ گلے مل گئے۔

زینی نے ڈھوکن کی زمین سے جنم لیا تھا، پر اُس کی جوانی آسمانوں سے اتری تھی یا کوئل کی ایک کوک نے جنم اختیار کر لیا تھا۔ بے چین، مضطرب، تڑپتا پھڑکتا جسم، جس میں بجلیوں کی کوندتی ساون کی گھٹاؤں کا بے قرار ترنّم اور چھما چھم برستی ہوئی بوندیوں کا ملہار راگ تھا اور گاؤں کا شاعر تو گویا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ دو ٹوٹے ہوئے تارے جو صدیوں سے ایک دوسرے کی راہ دیکھ رہے تھے نہ جانے کب ملے پر جب گاؤں نے آنکھیں کھولیں تو یہ معجزہ رونما ہو چکا تھا یہ ذکر بھی ذرا قبل از وقت ہے۔ گاؤں کا شاعر چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا! کچھ عجیب بات ہے کہ دھیدو[1] سب بھائیوں سے چھوٹا ہوتا ہے اور وہ بھائیوں کا لاڈلا بھی ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بھابی اُسے اپنا پلیٹھی[2] کا بیٹا سمجھتی ہے لیکن سب سے چھوٹی بھابی نہ جانے کیوں اُس سے خار کھاتی ہے۔ سب سے چھوٹی بھابی، جس کے سہاگ میں ابھی دوشیزگی کی خوشبو ہوتی ہے، ہاتھوں پر ابھی تک حنا کی سرخیاں باقی ہوتی ہیں۔ انگلیوں میں گنے کی پتلی پوروں کا رس ہوتا ہے۔ ابھی برتن مانجھ مانجھ کر اور اُپلے تھاپ تھاپ کر یہ پورے سخت اور کھردرے نہیں ہوتے، ابھی چوڑیوں کی جھنکار میں جوانی کے کچے پکے نغمے ہوتے ہیں۔ چھوٹی بھابیاں اپنے سب سے چھوٹے دیوروں سے شاید اس لئے جلتی ہیں کہ اُن کا بَر سب سے چھوٹا کیوں نہیں کہ رات رات بھر اُسے کنویں پر نہ رہنا پڑے یا گرم دوپہروں کو جب سائے سمٹ کر تنوں سے لپٹ جاتے ہیں، وہ کھیتوں میں کام کرنے کی بجائے اُس کی جوانی کے ٹھنڈے سائے تلے کیوں نہ آ بیٹھے اور بھرات کی خنکیوں میں جب ہوا دو کر ٹھنڈے سانسوں کا خنک مرہم تقسیم کر سکتی ہے وہ کھیتوں میں

۱۔ رانجھے کا اصلی نام۔ ۲۔ سب سے پہلا بیٹا۔

کیوں لگائے اور کیاریوں میں نالیاں کیوں باندھے۔ یہ کام تو
کا ہونا چاہئے۔ اُس لفنگے مسٹنڈے دیور کا جو دن چڑھے
چال میں پھر جا کر بیٹھتا ہے تو گئی رات تک یاروں کی محفل
بانسری بجاتا رہتا ہے، داستانیں کہتا اور سنتا ہے۔ آدھی
ت کو گھر آتا ہے، بے سُدھ ہو کر سوتا ہے تو دن چڑھے اٹھتا
ہے۔ باسی روٹی پر تازہ مکھن رکھ کر کھاتا ہے۔ گاڑھی لسی کے
منڈے میٹھے کٹورے پی کر ڈکار لیتا ہے اور نئی نویلی بھابی سے
نا ہے "بھابی! آج دوپہر کی روٹی میں اتنا گھی ڈالنا کہ بس مزا
جائے۔ ہاں۔"

" تیرے لئے گھی کہاں سے لاؤں اتنا؟ سب سے چھوٹی
بھابی نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ "تھان پر کون سی بھوریاں[1] باندھ رکھی
ہیں تونے؟"

"یہ بات تیری زبان سے پہلی بار سنی اور تیرے منہ سے کچھ
اچھی بھی نہیں لگی بھابی!"

"کیوں بے!" بھابی نے مہین آواز میں چمک کر پوچھا۔

" بھابیاں تو بڑی بہنوں کے آنچل کا ٹھنڈا سایہ ہوتی
ہیں۔ ماں زندہ ہوتی تو اتنی کڑوی بات نہ کہتی۔"

" لو، میں نے اتنی کڑوی بات کہہ دی کہ تجھے اُچھو آگیا۔
تُو تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔" چھوٹی بھابی نے اپنی اوڑھنی
کے رنگین پلو سے آنکھیں پونچھ کر کہا۔

سب سے بڑی بھابی نے آکر کہا "کیوں رہی! جمعہ جمعہ
آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تیرے بیاہ کو اور تو ابھی سے اس گھر
کی مالک بن بیٹھی۔ واہ جی واہ! یہ اِتنا سا تھا جب خدا بخشے، اس
کی ماں فوت ہوگئی۔ بچوں کی طرح پالا ہے اسے آج تک۔ جا
بھیا جا کنوئیں پر۔ تیرے لئے گھی میں گوندھ کر وہ روٹی پکاؤں گی
کہ ہونٹ چاٹتا رہے گا۔" وحیدو نے چھوٹی سی نئی نویلی بھابی
جو اس کی ہم عمر بھی تھی، چھیڑنے کی غرض سے کہا "بھابی! تیری
زبان سے تو دودھ شہد کی نہریں بہنی چاہئے تھیں، تو ابھی سے
زہر ٹپکانے لگ پڑی۔"

اس رات نئے بیاہے ہوئے بھائی کے کان میں نئی نویلی
دُلہن نے کچھ سرگوشی کی۔ کاجل لگی آنکھوں میں نیر چھلکا کر کہا۔
مہندی لگے ہاتھوں سے اوڑھنی کا پلو بار بار آنکھوں کی طرف لپکا۔
سہاگ کی تان اور رنگین چوڑیاں چھنکیں۔ صبح جب بھائی کنوئیں
پر جانے لگا تو وحیدو ابھی تک سویا ہوا تھا۔ اُس نے جھنجوڑ کر
اُسے جگایا۔ "کیوں بے تاجے! تو ہر وقت سوتا ہی رہے گا، یا
کچھ کام بھی کرے گا؟" تاجے نے کروٹ بدلی۔ بھائی جو اُس سے
صرف تین سال بڑا تھا غصے میں آکر چنگھاڑا "اٹھ! سارے جہان
کی نیند کا ٹھیکہ تو نے لے رکھا ہے کیا؟" تاجے نے اٹھ کر
آنکھیں ملیں۔ گھور گھور کر دیکھا۔ ابھی تو صبح کا اندھیرا ابھی
دور نہ ہوا تھا۔ اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اکبر! کیا بات ہے؟"

" بات کیا ہے! کنوئیں پر چل۔ گھی میں گوندھی ہوئی روٹیاں
کھانی ہیں تو کام کرنا پڑے گا۔"

" ہوں!" تاجے نے یکایک جاگ کر کہا۔ "تو بھابی
نے تیرے کانوں میں زہر ٹپکا دیا!"

" زہر!" بھائی نے ہونٹ بھینچ کر کہا "تو دنیا بھر سے
نیارا تو نہیں۔ اِس دنیا کی ریت ہے، جو کرے گا کھائے گا۔"

اُس دن تاجا منہ اندھیرے کنوئیں پر پہنچا تو سب
سے بڑے بھائی نے حیران ہو کر پوچھا "آج تو نے منہ اندھیرے
اٹھنے کی ہمت کیسے کر لی؟"

" اکبر نے کہا تھا جو کرے گا وہ کھائے گا۔"

" اکبر نے؟"

" کوئی بات نہیں بھیا! نئی نویلی بھابی کا سہاگ ابھی
نیا نویلا ہے۔ چار دن کی موج ہے۔ آج سے اکبر کی جگہ
میں کام کیا کروں گا۔"

" اکبر کون ہوتا ہے تجھے کچھ کہنے والا؟ جا، جا کر موج
میلہ کر۔ تیرے دن ابھی کھیلنے کودنے کے ہیں۔"

" نہیں بھیا! میں تو آج سے رات کو بھی کنوئیں پہ
رہا کروں گا۔ اکبر رات کو ہمیشہ گھر سویا کرے گا۔" تاجے نے
تھوڑا سا غرا کر کہا۔ اور بڑا بھائی ہنس پڑا۔ "تیری بات بھی
سچ ہے۔ چل اکبر کو بھی چار دن موج میلہ کر لینے دو۔"

---

[1] بھورے رنگ کی بھینسیں۔

ایک رات جب میں گاؤں آیا تو گاؤں تنہا اور اداس
معلوم ہوا - میرا راستہ چوپال میں سے ہو کر گزرتا تھا - اور چوپال جیسے اُلو
ی طرح سنسان تھا - میں یعنی ڈی - ایم - ناز بھی کچھ اداس اور طول
سا ہو گیا - میں تو گاؤں میں محبت اور گرمی کی تلاش میں آیا کرتا ہوں -
ہیشہ دو مہینے مسلسل شہر میں رہ کر جی بھی اکتا جایا کرتا ہے - یہ
ِعین فطرت ہے - خیر اُس رات میں سیدھا گھر چلا گیا - صبح تاجے
کے کنویں پر جا پہنچا - تاجا میلا سا تہمد باندھے بیلوں کے لئے
پارا کتر رہا تھا - اُس نے مجھے دیکھا تو مسکرانے لگا - میں نے
ہ چھا " اوئے تاجے ! کیا بات ہے ! "

" کیا بات ہے دینے ! چارہ کتر رہا ہوں " تاجے کو کیا پتہ
یں دین محمد سے ڈی - ایم ناز بن چکا ہوں -

" یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے - رات چوپال بھوتوں کا
سکن بنا ہوا تھا "

" اکبر کی نئی نئی شادی ہوئی ہے نا "

" پھر اِس کا چوپال سے کیا تعلق ؟ "

" تیری عقل گھاس چرنے گئی ہے دینے ؟ اکبر کو چند
ن موج میلہ کرنے کی مہلت دے رہا ہوں "

" دیکھ تاجے ! مجھے دِینا مت کہا کر - میرا پورا نام دین محمد
ہے اور آج کل میں ڈی - ایم - ناز کے نام سے مشہور ہوں "
یں نے منہ لٹکا کر کہا -

" جاجا ! " تاجے نے خوب کھل کر قہقہہ لگایا - " ڈی -
یم ناز ... یہ رعب کسی اور پہ ڈالنا - میں تو اُس دینے کو
انتا ہوں جو میرا لنگوٹیا ہے - ڈی - ایم ناز ... " میں نے بات
اٹ لی - اگر میں بات نہ کاٹتا تو شاید تاجا ڈی - ایم ناز کو
یک عدد گالی سے بھی نواز دیتا -

" ذرا بھائی سے پوچھ لے تو چل گاؤں میں - میں بھی تو
و گھڑیاں موج میلہ کر لوں - پھر میں تیرے لئے ایک بڑی
چھی چیز بھی لایا ہوں "

" دیکھوں تو بھلا "

" وہ تو گاؤں میں ہے "

" میں گاؤں نہیں جاؤں گا - میں چار دن اور چار -
راتوں سے گاؤں نہیں گیا "

" آج میرے لئے چل - کہو تو میں خود تیرے بھائی سے
پوچھ لوں " اُس نے نفی میں سر ہلا دیا - وحیدو لاڈلے بھی
ہوتے ہیں اور ضدی بھی - اگر وہ کسی بات پہ اڑ جائیں تو لاکھ
منتیں کر و نہیں مانتے - میں ناراض ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ
اُس نے بڑی محبت سے میرا بازو پکڑ کر پھر مجھے بٹھا لیا - اُس
نے سب سے چھوٹی بھابی کے طعنوں مہنوں کا ذکر کیا اور پھر
اکبر کی خشونت کا جس نے اُس کے دِل پر چھریاں چلا دی تھیں -
اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں - میں باوجود تخلص کے شاعر نہیں ،
لیکن تاجا تخلص نہ ہونے کے باوجود شاعر ہے کیونکہ وہ بہت
حساس ہے - چھوٹی چھوٹی باتوں کا اُس کے دل پر بڑا اثر ہوتا ہے
اور پھر وہ اپنے دل کی کیفیات کو اِس شدت سے پیش کرتا ہے کہ
اس کی ایک ایک بات شعر معلوم ہوتی ہے - اسی لئے تو میں اسے
شاعر کہتا ہوں - گاؤں کا شاعر ، جو وحیدو بھی ہوتا ہے ، اس
رات میری خاطر چوپال میں آ ہی گیا - احمد نے الغوزے بجائے
شرفو نے مرزا صاحباں سنایا - تاجا بانسری کی لے پہ خوب خوب
چہکا - میں نے پنجابی کے ایک نئے شاعر دائم کا کلام سنایا - گانے
بجانے کے بعد داستانوں کا دور چلا - کچھ جگ بیتیاں ، کچھ آپ
بیتیاں - جوان دلوں کی دھڑکنوں کے افسانے - گندم ، باجرے
مکی اور کماد کے کھیتوں میں سے بل کھانے والی پگڈنڈیوں پر
بکھری ہوئی کہانیاں جو آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہوئیں
اور روح میں رچ کر ہونٹوں پہ آ گئیں - جب رات بھیگ گئی تو
میں نے اپنی ڈبے سے وہ تحفہ نکالا جس کا وعدہ تاجے سے کنویں
پر کر آیا تھا - یہ آبنوس کی بنی ہوئی بانسری تھی جو کاریگر نے میری فرمائش
پر بنائی تھی - تاجا اندھیرے میں اسے دیکھتا رہا اور اس پر ہاتھ پھیر
پھیر کر اسے پیار کرتا رہا -

صبح میں شہر جانے کے لئے اٹھا تو سورج ابھی نہیں نکلا
تھا - ماں مجھ سے پہلے اٹھ چکی تھیں - دودھ بلو کر تازہ مکھن
نکال چکی تھیں - مکھن میں تلے ہوئے پراٹھے دہی سے کھائے -
اور تازہ لسی کے دو کٹورے پی کر گھر سے نکل آیا - اندھیرا ابھی

کے سونے سونے دھلے دھلے اُجالے میں بدل چکا تھا۔ اور ہر گھر سے ٹھک ٹھک گھروں دودھ بلونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ گلی کے ایک نکڑ پر میں نے زینی کو دیکھا اور پہچان نہ سکا۔ پہچانتا کیسے؟ زینی کی ایک مدھ ماتی نگاہ پر گلی کا ایک ایک موڑ پھول پھلیاں بن گیا تھا۔ روشن صبح کا چہرہ پھلیوں کے ہالۂ نور میں دمکتا ہوا ہیرا تھا کہ اُس پر نگاہ نہ ٹکتی تھی اور زینی صبح کی رانی تھی کہ شبنم کا شہد پی کر اٹھی تھی، اور یکایک پروان چڑھ گئی تھی۔ کلی کھِل کر پھول ہو چکی تھی اور چنگ کی آواز خاموش فضاؤں میں نغمے کی طرح منتشر تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا اور صدیوں تک گردشِ دوراں میں چکر لگاتا رہا۔

میں، ڈی۔ ایم ناز ڈھولن گاؤں کی زینی کی ایک اُچٹتی ہوئی مست الست نگاہ پر دینا بن چکا تھا۔

کسی نے میرے کانوں میں چیخ کر کہا۔ "دینے او دینے!"

میں نے ذرا سا چڑ کر کہا۔ "میں ڈی۔ ایم ناز ہوں۔"

"ڈھولن گاؤں میں تو صرف دینا ہے۔"

"میں دینا ہوں۔ مجھے دینا ہی کہو۔ میں ڈی۔ ایم ناز بن کر کیا کروں گا! اگر ڈھولن مجھے دینے کی حیثیت سے قبول کرلے تو میں ڈی۔ ایم ناز پر سو لعنت بھیجنے کو تیار ہوں۔"

تب ڈھولن کی گلیوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ پھول پھلیوں کے جالے ٹوٹ گئے۔ میں نے شہر کی طرف قدم بڑھایا۔ ڈھولن درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن زینی ہر سڑک کی ہر موڑ پر مجھے ملی۔ درختوں کے ہر جھنڈ کے پیچھے سے آنکلی۔ کبھی ایک کرن کی تھرکتی ہوئی چلبلاہٹ میں زندہ ہوئی کبھی بلبل کی ایک تان میں چونک کر جاگی، کبھی گھاس کا جنگلی پھول بن کر جھومی، کبھی نسیم صبح کا ایک مست جھونکا بن کر آئی۔ شہر پہنچ کر بھی زینی نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں کئی دنوں تک دینے سے ڈی۔ ایم ناز بننے کی جرأت نہ کرسکا۔

فرم کے اسسٹنٹ منیجر نے ایک دن مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ "مسٹر ڈی۔ ایم ناز۔"

"جناب!" میں نے ادب سے جھک کر جواب دیا۔ "میرا نام۔۔"

"کرسی پر بیٹھیے۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہم آپ کے کام سے بہت خوش ہیں۔" میں شکریہ ادا کرنے کی جرأت بھی نہ کرسکا۔ "ہم منیجر صاحب سے بات کریں گے۔ شاید آپ کو تنخواہ میں کچھ ترقی مل جائے۔" میں نے اسسٹنٹ منیجر صاحب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت کر لی۔ دو ننھی ننھی آنکھیں دور کسی کنویں کی تہہ میں چمک رہی تھیں اور بلڈ آگ کے سے چہرے پر چیچک کے گڑھے تھے۔ پہلوانوں جیسا مضبوط جسم بڑی پاٹ دار آواز۔ اسسٹنٹ منیجر صاحب کا سارے کارخانے پر رعب تھا۔ میں شکریہ کیا ادا کرتا، تھر تھر کانپ رہا تھا۔

جب میں اسسٹنٹ منیجر کے کمرے سے باہر نکلا تو گنجے کلرک نے جو مجھ سے سینیئر تھا بڑے تپاک سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں حیران ہو گیا تو اُس نے مجھے پاس کی کرسی پر بٹھا کر پوچھا۔ "اسسٹنٹ منیجر صاحب سے کیا بات ہوئی؟"

"وہ میرے کام سے بہت خوش ہیں۔"

"بس!"

"نہیں۔ ترقی کے لئے سفارش کرنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں۔"

"مبارک باد! لیکن... کوئی شرط پیش کی انہوں نے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر انتظار کیجیئے۔ ترقی ملنے سے پہلے..." اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے پوچھا۔ "ترقی ملنے سے پہلے کوئی شرط پیش کی جاتی ہے اور وہ شرط کیا ہے؟"

"آپ شادی شدہ تو نہیں؟"

"نہیں"

"مبارک باد! آپ کے پیشرو یعنی جس کی جگہ پر آپ یہاں آئے ہیں، صرف اِسی وجہ سے ترقی سے محروم ہو گئے بلکہ نوکری سے بھی نکالے گئے کہ وہ شادی شدہ تھے۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"بھائی! اسسٹنٹ منیجر صاحب کے ہاں خدا کے فضل سے لڑکیوں کی کھیپ کی کھیپ ہے۔ وہ آپ کو داماد ی

کا فر بخشنا چاہتی ہیں کیا آپ خوش نہیں؟" میں خوش تو کیا ہوتا
البتہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کرسی پنگوڑے کی
طرح گھومی اور مجھے چکر آ گئے۔ زینی نے طنز بھری مسکراہٹ
سے کہا۔" اتنی سی اوقات پر عشق کرنے چلے تھے؟ واہ!"
اور میں دوسرے ہی دن پندرہ روز کے دورے پر نکل گیا۔
قریہ قریہ گھومتا رہا لیکن سفر کے ہر موڑ پر زینی مجھے ملتی رہی اور
اسسٹنٹ منیجر کا بلڈاگ سا چہرہ گھور کر اسے بھگا دیتا۔

دورہ ختم کرنے کے بعد میں گاؤں گیا تو حسبِ معمول رات
کا وقت تھا۔ میرا گاؤں تنہا اور اداس تھا۔ کیونکہ چوپال خالی تھا۔
اور سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں نے تاجے کے دروازے پر آواز دی
تو تاجے کی بڑی بھابی نے کہا۔" دین محمد کیا کام ہے؟"

" تاجا کہاں ہے؟"

" گھر میں تو نہیں ہے۔"

" پھر کنوئیں پر ہو گا۔"

" نجانے۔ کیا پتہ؟ دینے! تاجے کو کچھ کر دیا ہے اس
کلموہی ڈائن نے۔"

" کون کلموہی؟"

" وہی اکبری کُگائی... ڈائن... طعنے مہنے مار کر سینہ
چھلنی کر دیا ہے میرے سوہنے دیر کا۔"

" اب کہاں رہتا ہے وہ؟"

" کیا بتاؤں۔ خود اُسی سے پوچھ لینا۔" میں گھر چلا گیا۔ ماں
سے مل کر اور دو لقمے کھا کر تاجے کی تلاش میں نکل گیا۔ تاجا
کنوئیں پر بھی نہیں تھا۔ میں مایوس ہو کر لوٹا تو مائی کے ٹبے کی
طرف سے بانسری کی آواز آئی۔ اس ٹبے کے تصور ہی سے میرے
رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ارد گرد کیکر اور بیری کے درختوں
کے جھنڈ تھے۔ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ یہ جگہ پکی ہے۔ یہاں
چڑیلوں کا ڈیرا ہے۔ تپتی دوپہر کو اور آدھی رات کو سنسان
خاموشیوں میں اُس طرف کا رُخ کرنا بھی دل گردے کا کام
تھا۔ اب کچھ عرصے سے اس پر ایک سائیں کا ڈیرا تھا اور تاجے
کی بانسری کی آواز اُسی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے رات کے اندھیرے
میں اُس طرف قدم بڑھایا تو جی دہلا۔ جھنڈ سے باہر کھڑے ہو کر
میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پکارا" تاجے!" دوسری تیسری پکار
پر تاجے نے جواب دیا۔" کون؟"

" میں ہوں دین محمد۔"

" دینے!" تاجے نے کہا۔" تم آگے آ جاؤ گے یا میں تمہارے
پاس آ جاؤں؟"

" تمہیں آ جاؤ۔" کچھ عرصے کے بعد تاجا اندھیرے میں یوں
نکلا جیسے کوئی اسرار۔ گھپ اندھیرے میں اُس نے میرے کندھے
پر ہاتھ رکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بولا۔" ڈر گئے کیا؟"

" ہاں تاجے! تو بھوتوں کے ڈیرے میں کیوں آ گیا؟"

" سائیں مستانے سے ملنے آ گیا تھا۔ اس کی فرمائش پر
بانسری بجا رہا تھا۔"

" جھلے! کہیں کان پھڑوا مُندرے پہن کسی بالناتھ کا
چیلہ تو بننے کا خیال نہیں؟"

" کیا پتہ دینے!" تاجے نے آہ بھر کر کہا۔ اُس کی آواز میں بڑی
گمبھیرتا تھی۔ جیسے روح کی پاتال سے نکلی ہو۔

" کیوں چھوٹی بھابی کے طعنوں مہنوں نے..." میں نے بات
ادھوری چھوڑ دی۔ ہوا کا ایک جھونکا بیری اور کیکر کے درختوں
میں سے سرسراتا ہوا گزر گیا۔ میں نے گھپ اندھیرے کو لرزتا ہوا محسوس
کیا۔ ایک انجانی آواز نے بڑی دبی زبان سے میرے کان میں کوئی
سرگوشی کی۔ میں اِس کا مطلب تو نہ پا سکا، پر میرے رونگٹے
کھڑے ہو گئے۔" تاجے! چل گاؤں چلیں۔ چوپال میں بیٹھ کر باتیں
کریں گے۔" پگڈنڈی کا کوئی موڑ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اندھیرا
گہرا تھا۔ اور راستے میں تاجے نے پوچھا۔" دینے! رانجھا تخت
ہزارہ چھوڑ کر جھنگ سیالاں کیوں آیا تھا؟"

" تو مجھ سے پوچھتا ہے! رانجھا ہیر سے ملنے آیا تھا۔"

" نہیں دینے! بھابھیوں نے اُسے طعنے دیئے۔ اگر
بھابیاں اُسے طعنوں کے تیر نہ مارتیں تو وہ ساری عمر تخت ہزارے
میں بانسری بجا بجا کر بتا دیتا۔"

" ڈھولن کے رانجھے!" میں نے ذرا چمک کر کہا" تو چھناں
(چناب) پار کر کے کس جھنگ سیالاں میں جائے گا؟"

" دینے" تاجے نے میرے بازو پر ہاتھ کی گرفت

ت کرتے ہوئے کہا۔ "اوئے! میں نے تو کب کا چھناں پار ہے"

میرے تن بدن میں ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ایک یلا جھونک میرے جسم کو پار کر گیا۔ میں نے جی کڑا کرکے پوچھا۔
"چھناں پار تو نے کسی ہیر کو بھی پایا' یا پھولوں کی سیج ...؟
بات پوری نہ کر سکا۔
"دینے! تیری دی ہوئی بانسری کے ایک نغمے نے ہیر کو م دیا۔ ہیر چھناں کے اُس پار کھڑی تھی۔ ڈھوکن کی ایک گلی میں انجھا تھا، دوسری کے ایک موڑ پر ہیر اُس کے انتظار میں ڑی تھی"
"پھر؟" میں نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔
"رانجھا چھناں پار کر گیا"
"تیری ہیر کون ہے؟" میری آواز لرز رہی تھی۔
"زینی" ایک تیر میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔
یں نے خون کے سمندر میں ڈوب کر ہاتھ پاؤں مارے پر یں لہروں کے جبڑوں سے بچ کر نہ نکل سکا۔ صبح کے اُجالے ور اندھیرے میں مَیں نے گلی کے اُس موڑ پر زینی کو دیکھا۔ زینی کی آنکھوں میں صبح کی روشنی تھی۔ صبح کے تارے کا لرزتا ہوا کیف تھا۔ خنک ہوا کا شہد سے بھرا رَس تھا پَر میں جو ڈھوکن کا دینا ہوں اور ڈھوکن سے باہر ڈی۔ ایم ناز ہوں نجانے پھر دینا کیوں نہ بن سکا۔ زینی کی وہ نظر جو مجھے ڈی ایم ناز سے دینا بنا گئی تھی پھر مجھے وہ کایا کلپ عطا نہ کر سکی۔ میں نے س صبح اِس ایک نظر کے سہارے نیلے آسمانوں کی سیر کر لی تھی، آج یہی نظر مجھے پاتال کی دلدل میں لے گئی تھی۔
دینے سے ڈی۔ ایم ناز بننا کتنا آسان تھا۔
ڈی۔ ایم ناز سے دینا بننے کے لئے تو کسی زینی کی نگاہِ کیمیا گر کی ضرورت تھی۔ اِس ایک نگاہ سے گاؤں کا دھیدو ڈھوکن کا رانجھا بن چکا تھا۔ شاید ڈھوکن کا دینا جو شہر کا ڈی۔ ایم ناز تھا۔ بانسری ہاتھ میں لے کر مائی کے تھڑے پر سائیں مستانے سے جوگ لینے کو تیار نہ ہوتا۔ یہ تو کسی سرپھرے کا کام تھا۔
جب میں گاؤں سے شہر جا رہا تھا تو زینی نے پھر میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی۔ وہ مجھے ہر موڑ پر ملی۔ ہر گھنے درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آموجود ہوئی۔ میرا دل بھر آیا۔ میری آنکھیں روئیں۔ پھر میں نے سوچا، ہیریں قربانی دیئے بغیر نہیں ملا کرتیں۔ ہاں! کھیڑے اپنی دولت اور طاقت کے زور پر انہیں رانجھوں سے چھین لے جایا کرتے ہیں۔ میں اگر ڈھوکن کا رانجھا نہیں بن سکتا تو کھیڑا ضرور بن سکتا ہوں۔ میں میٹرک پاس ہوں اور ایک سو بیس روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ میں اگر ذرا سا اشارہ بھی کر دوں تو زینی کا ڈولا اپنے ہاں لا سکتا ہوں۔ سوچ کے اِس مرحلے پر میں نے ایک ٹنڈ منڈ درخت کے ساتھ ٹیک لگا لی، آنکھیں میچ لیں۔ اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ زینی ایک خشک پتے کی طرح راکھ ہو گئی۔ زندگی ہرے بھرے پتوں کا لباس اُتار کر ٹنڈ منڈ ہو گئی۔ اور ننگ دھڑنگ وحشی بھتنوں کا ناچ ناچنے لگی۔ "دینے! تو اپنے دوست گاؤں کے شاعر تاجے سے، جو کبھی دھیدو تھا اور اب رانجھا بن چکا ہے، کھیڑوں کا خونی کھیل نہیں کھیل سکتا۔" شہر پہنچ کر میں نے اسسٹنٹ منیجر صاحب کے ہاں ایک شام چائے پینے کا وعدہ کر لیا۔ گنجا کلرک مکاری سے مسکرا کر کہنے لگا۔ "لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا"۔ اور چند دنوں کے بعد میں نے دو تین ترقیاں حاصل کر لیں اور اسسٹنٹ منیجر صاحب مجھے ہونے والا داماد سمجھ کر مسٹر ڈی۔ ایم ناز سے صرف "ناز بیٹا" اور "برخوردار" کے القاب سے نوازنے لگے۔

چوپال پھر تنہا، خالی اور اُداس تھا! میرا دل سیسے کا بے جان ٹکڑا بن گیا۔ میں تاجے کے گھر نہ گیا۔ میں نے مائی کے تھڑے کا رخ بھی نہ کیا۔ گلی کے ایک موڑ پر شرفو ملا۔ اس نے کہا "چودہری دین محمد! اب تو زندگی میں مزا نہیں رہا"
"کیوں کیا ہوا؟"
"تاجے نے چوپال میں آنا بالکل چھوڑ دیا ہے"
"تاجے کو کسی باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہے؟"
"چوہدری! تجھے پتہ نہیں وہ تو سائیں مستانے کا چیلا بن گیا ہے۔ دن رات اس کے پاس رہتا ہے۔ رات ہوتے ہی بانسری کو منہ

ہے اور بچھوڑے (فراق) کے گیت گاتا رہتا ہے۔"
"کیوں؟ وچھوڑا کیسا؟"
"چوہدری! تاجے نے رانجھے کا روپ بھر لیا ہے۔"
"اُسے کوئی ہیر بھی ملی؟" میں نے جان بوجھ کر بھولا بنتے ہوئے
پوچھا۔
"بھولے بادشاہو! ہیر کے بغیر بھی کوئی تاجا رانجھا بنتا ہے،
بھلا۔ وہ زینی جو ہے نا...... بند کلی کی باس کی طرح گاؤں کی نظروں سے
چھپی تھی پھر جب بند کلی کھلی تو سب سے پہلے تاجا اس کلی کا بھنورا بنا۔"
"شرفو! کیا پتہ! نظر کا تیر پہلے کس کے سینے میں پیوست ہوا۔" میں
نے آہ روک کر کہا۔
"پر چوہدری! اب تو دنیا جان گئی ہے کہ ہیر کون ہے اور رانجھا کون؟"
"ہاں! ہاں! تاجے کو رانجھے کا سوانگ بھرنے کی کیا ضرورت
تھی۔ زینی کون سی محلوں کی رانی ہے کہ تاجے کی کٹیا میں نہ آسکتی تھی۔"
"کیا بتاؤں چوہدری! تاجا بھی کچھ عجیب بادشاہ بندہ ہے۔ اپنے
عشق کو مشک بنا کر پھیلایا ڈھولن گاؤں میں۔ اب بچے بچے کی زبان پر اس کا
نام ہے۔ زینی کے بھائیوں نے کہا ہے زینی کو کنوئیں میں پھینک دیں گے
اس کا ڈولا تاجے کے گھر نہیں جائے گا۔"
"کیوں؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا
"چوہدری! دنیا والوں کو پیار کرنے والوں سے اللہ واسطے
کا بیر ہوتا ہے اور اب تو تاجے اور زینی کا قصہ چاروں کھونٹ بکھر گیا ہے
اب وارث شاہ اس کو بھی لے اڑے گا۔"
اندھیرا گہرا ہو گیا تو گھر اپنی آمد کی اطلاع دے کر میں تاجے کے
کنوئیں پر چلا گیا۔ تاجے کا بڑا بھائی کنوئیں پر موجود تھا۔ میں نے کہا۔
"بیبیا! تاجے کو کیا ہو گیا ہے؟ مائی کے ٹبے پر سائیں مستانے کے
ساتھ ڈیرا لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ زینی کون سی جھناں پار کی شہزادی تھی کہ
اس کو جوگ لینا پڑا۔ تو زینی کے گھر والوں کے پاس جا اپنی برادری کے
ہی تو ہیں۔"
تاجے کے بھائی نے ایک دو لمحے سوچ کر کہا۔ "دین محمد! لوگ
کہتے ہیں تاجے نے ڈھولن کی خاک اڑائی ہے۔ رانجھے تو باہر سے آتے
تھے۔ کوئی ان کا سنگی ساتھی نہیں ہوتا، پر اپنے گاؤں کو رانجھے کو لوگ
...میں کل زینی کے باپ کے پاس جاؤں گا۔ میرا جی کہتا ہے وہ

نہیں مانیں گے اور زینی کے گھر والے مان گئے تو تاجا نہیں مانے گا۔"
"وہ کیوں بھا؟ تاجا بھلا کیوں نہ مانے گا؟"
"دین محمد! کچھ لوگوں کی رگ دنیا جہان سے نیاری ہوتی ہے۔
تاجے کو زینی جو یوں سستے داموں مل گئی تو اس کا پیار ڈال سے ٹوٹے ہوئے
پھول کی طرح مرجھا جائے گا۔ کچھ لوگ پھول کو ٹہنی سے توڑ لیتے ہیں۔ کوئی
سر پھرا ایسا بھی ہوتا ہے جو شاخ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے کلی چٹکتی
ہے پھول بنتی ہے۔ مرجھاتی ہے اور پھر خاک ہو کر خاک میں مل جاتی ہے پر
یہ لوگ بلبل کی طرح گاتے گاتے خود بھی اس کے ساتھ خاک میں مل جاتے
ہیں۔" تاجے کے بھائی کی آواز میں غم لرز رہا تھا۔ میرے بدن میں جھرجھری
سی آئی۔ میرے کان میں ایک چونکی ہوئی آواز نے کہا۔ "ڈی۔ ایم تاثر!
تجھے کیا پتہ کہ رانجھے کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ تو تو مٹی کا کیڑا ہے، پر
لگا کر نیلی فضاؤں میں اُڑنا کیا جانے؟"
"بھا! تو نے سچ کہا۔" ڈھولن کے دینے نے بڑی دھیمی آواز
میں کہا۔
"میں کل صبح زینی کے باپ کے پاس جاؤں گا۔ دین محمد! تو تاجے
سے مل۔ پھر دیکھ کیا بنتا ہے۔"

میں علی الصبح اُٹھا۔ ابھی مرغ نے اذان بھی نہ دی تھی۔ مائی کے
ٹبے پر سوئی سوئی سنسان خاموشیوں کا راج تھا۔ درخت سہمے ہوئے
تھے۔ درختوں کے جھنڈ کا گہرا سایہ سویا ہوا تھا، مجھے مائی کے ٹبے سے
ڈر لگا۔ میں درختوں کے جھنڈ میں سے گزرا تو نیچی ٹہنیاں میرے سر سے
ٹکرا کر اوس کے ٹھنڈے چھینٹے دے گئیں اور پھر ایک جگہ جہاں گھاس
کا گیلا فرش تھا۔ میں نے تاجے اور زینی کو دیکھا جو ایک دوسرے کے
گلے میں ہاتھ ڈالے ایک درخت سے ٹیک لگا کر سو رہے تھے۔ تاجے
کی بانسری ایک طرف گھاس پر پڑی تھی۔ میں ٹھٹھک کر دو قدم دور
کھڑا ہو گیا۔ دو قدم کے فاصلے پر معصومیت نے ایک پاکیزہ حصار
کھینچ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے دو قدم اور بڑھائے تو
جل جاؤں گا۔ بھسم ہو کر راکھ ہو جاؤں گا۔ میں دبے پاؤں لوٹ آیا۔ میرے
پاؤں کی اگر ذرا سی بھی چاپ آئی تو تقدس کی وادی بھک سے اڑ جائے گی۔
پیار اور سپنوں کے سنہری جال ٹوٹ جائیں گے۔ دھنک تڑخ کر زمین
پر آ رہے گی اور میں جھنڈ سے دور ہٹ کر پگڈنڈی کے ایک موڑ پر بیٹھ گیا

ایک مرغ نے دور کہیں اذان دی۔ چاند ٹوٹ گیا۔ درختوں کی پتیاں بھرائیں۔ مشرق کا اندھیارا زرا اور اجالوں کے مدھم دیئے روشن ہوئے اور پھر زینی ایک سائے کی طرح میرے پاس سے گزر گئی!۔

میں نے کہا "تاجے! یہ تو نے کیا سوانگ بھر لیا؟ رانجھے نے اس وقت جوگ لیا جب ہیر کا ڈولا کھیڑوں کے ہاں پہنچ گیا تھا۔"

"دینے! رانجھے اپنے زمانے کے راکھے ہوتے ہیں۔ جوگ تو اُن کی موج ہے۔ جب چاہا لے لیا۔"

میں نے ذرا غصّے میں آکر کہا "تاجے! تو ہیر رانجھے کا ڈرامہ کھیل رہا ہے یا پیار کی منزلیں طے کر رہا ہے، اس سے کچھ سروکار نہیں لیکن تو نے ڈھولن کی عزّت مٹی میں ملادی ہے۔"

"میں کسی ڈھولن کی مٹّی کا کیڑا نہیں، تو کس ڈھولن کا قصّہ لے بیٹھا ہے؟"

"تو ایک اشارہ کر دیتا تو زینی کا ڈولا تیرے گھر آ پہنچتا۔ زینی کون سے محلوں کی رانی تھی؟"

"محلوں کی رانی! وہ تو دنیا جہان کی رانی ہے۔ میرے دل سے پوچھ دینے! اس میں کس کا راج ہے۔"

"زینی تیرے دل کی رانی ہے پر وہ ڈھولن کی عزت بھی تو ہے۔"

"دینے!" تاجے نے ذرا سختی سے کہا "میں بھی ڈھولن کی عزّت میں تمہارا ساجھی ہوں۔"

"پھر یہ رات کے اندھیرے میں تاجے اور زینی کا درختوں کے جھنڈ میں ملنا اور ایک دوسرے کے۔۔۔۔" ڈی۔ ایم ناز، اپنی بس بھری بات پوری نہ کر سکا۔ تاجے نے اس کے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو میرے سچّے پیار کی ہتک کر رہا ہے کیدو!"

ڈی۔ ایم ناز کی آنکھیں اُبل آئیں۔ تاجے نے اس کے گلے پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ میں نے کہا "تاجے! یہ بات تیرے دینے نے نہیں کہی تھی۔ یہ تو ڈی۔ ایم ناز کے دل کا کیچڑ تھا جو اس کے ہونٹوں پر آگیا۔"

"تیرے ڈی۔ ایم ناز کی۔۔۔۔" تاجے نے ہونٹوں پر آئی ہوئی گالی نگل کر کہا۔ دینے! جب تو ڈھولن میں آیا کرے تو ڈی۔ ایم ناز کو دہیں شہر کی گندی گلیوں میں چھوڑ آیا کر۔"

زینی کے بھائیوں نے تاجے کے جُثے سے بھائی کی سخت بےعزّتی کی۔ تاجے کے بھائی نے سر جھکا کر سب کچھ سہہ لیا۔ زینی کے باپ نے کہا "اوئے! تو اب آیا ہے جب میری اجلی پگڑی خاک میں مل چکی ہے۔ جا! اب زینی کا بیاہ کسی چمارسے ہوگا۔ وہ تیرے گھر نہیں جائے گی۔" پنچایت میں بھی اُسے بری بری باتیں سننا پڑیں۔ میرا جی دُکھا، پر میں کس کھیت کی مولی تھا۔ زینی پر کڑے پہرے بٹھا دیئے گئے اور سائی کے ٹبّے پر تاجا بانسری بجا بجا کر زینی کو بلاتا رہا پر ستاروں کی روشنی میں زینی اپنے آنگن میں پڑی بانسری کی لے پر نیر بہاتی رہی اور آسمان سے شبنم کی بوندیں گرتی رہیں۔ یہ ستاروں کے آنسو!

میں اگلے دن شہر جانے کے لئے صبح سویرے گھر سے نکلا۔ گاؤں حسبِ معمول سویا ہوا تھا اور بیدار بھی۔ گھمک گھوں مدھانیاں دہی سے مکھن جدا کر رہی تھیں۔ گلی کی نکڑ پر مجھے زینی ملی۔ آج اس کی ایک نگاہِ غلط انداز نے مجھے بگولا بن کر نہ اڑایا۔ میں نسیمِ صبح کے اس جھونکے کی طرح بجھ کر رہ گیا جس کے راستہ ریت کے ایک تودے نے روک لیا ہو۔ آج زینی کی نگاہوں میں الھڑ دوشیزگی کا بولتا ہوا جادو نہیں تھا اور پھر یہ نگاہیں کبھی کبھی تو نہ تھیں۔ میں ان نگاہوں کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ یہ زمین پر تھیں لیکن آسمان سے بھی ان کا رشتہ قائم تھا۔ پیار کے اس مرحلے پر زینی کا جسم اس کی روح سے علیحدہ معلوم نہ ہوا۔ زینی کا جسم جس نے پیار کا نغمہ سنا تھا اور اس نغمے کو اپنے اندر رچا لیا تھا اور اب جسم اور روح میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ مجھے تو زینی کا انگ انگ تاجے کی بانسری کا نغمہ محسوس ہوا جسے میرے کان سن رہے تھے اور جو میری روح میں رچ رہا تھا اور کثافتیں دُھل دُھل کر صاف ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے بعد کانپ کر میں نے شہر کی راہ لی۔

ڈھولن جو اندھیرے میں ہمیشہ اداس اور تنہا معلوم ہوتا تھا آج راکھ کی طرح بجھا بجھا لگ رہا تھا۔ کوئی دیا بھی تو روشن نہ تھا۔ چوپال سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں نے شرفو کے گھر جا کر آواز دی۔ شرفو باہر آیا تو میں نے پوچھا "شرفو! آج تو گاؤں مفلس کی دیئے کی طرح سرِ شام ہی سے بجھ کر رہ گیا ہے جیسے اس کی روح نکل گئی ہو۔"

"ہاں چوہدری! گاؤں کی روح نکل گئی ہے۔"
"کیوں؟"
"زینی چلی گئی۔"
"تاجا اسے لے کر......؟"

"نہیں بھولے بادشاہ! تاجے کے ساتھ نہیں.... اپنے سسرال میں.... ڈھول تاشے اور نفیریوں کے ساتھ.....۔"

"اور ڈھولن کا رانجھا بانسری بجاتا رہا۔"

"نہیں چوہدری! رانجھے نے ڈھولن کی عزّت پر اپنے پیار کو بھینٹ چڑھا دیا۔ بیاہ کی رات زینی سہیلیوں کے جھرمٹ سے نکل کر اور سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر مائی کے ٹبّے پر جا پہنچی۔ زینی کے بھائیوں نے چھوی ٹوکے ہاتھ میں لے لئے پر گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے کہا "دیکھو! ڈھولن کی عزّت خاک میں نہ ملاؤ"۔ تاجے کا بڑا بھائی مائی کے ٹبّے پر گیا۔ اس نے اپنی پگڑی تاجے کے پاؤں پر رکھ دی اور کہا "تاجے! یہ پگڑی تیرے بھائی کی نہیں ڈھولن کے سارے گاؤں کی ہے۔ اس کی لاج رکھ لے۔" میں نے شرفو کی پوری بات نہ سُنی، پاگلوں کی طرح بھاگا، ٹھوکریں کھاتا، کانٹوں سے اُلجھتا، گرتا پڑتا مائی کے ٹبّے پر پہنچا۔ میں نے دور ہی سے آواز دے کر تاجے کو بُلایا۔ تاجے نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "کیوں دینے! تو مجھے زہر میں بجھے تیر مارنے آیا ہوگا۔"

"ہاں! رانجھے کے بچے! تو نے ڈھولن کی لاج تو رکھ لی پر ڈھولن کے پھول کو غیروں کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ اُسے مسل کر ہوا میں بکھیر دیں۔"

تاجے نے میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کہا "بس، بس! سانپ کے بچے! جا اپنی گندی نالی میں ڈوب مر۔ تو کیا جانے پیار کی ریت کیا ہوتی ہے؟"

سائیں مستانہ تاجے کی آواز سُن کر اپنی کٹیا سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھنگ گھوٹنے کا ڈنڈا تھا۔ اس نے ڈنڈا ہوا میں لہرا کر کہا۔ "جا جا، دُنیا کے کُتّے! تو میرے ملنگ کو بہلانے پھسلانے آیا ہے۔"

"سائیں بادشاہ! یہ تو میرا دوست دینا ہے۔" تاجے نے کہا لیکن اس کا ہاتھ بدستور میرے منہ پر تھا۔ میں نے غصّے سے بھرّائی ہوئی گھٹی گھٹی آواز میں کہا "زینی کو منجدھار میں دھکا دے کر تو خود کنارے پر کھڑا ہوگیا۔ تاجے! کہ اس کے ڈوبنے کا تماشا دیکھے؟ زینی تو ڈھولن کی روح تھی۔ روح نکل گئی۔ اب ڈھولن اپنی عزّت کا خالی ڈھول پیٹتا رہے۔"

اور پھر میرا غصّہ جلتے پھنکتے آنسوؤں کا دھارا بن گیا۔ شاید ایک قطرہ تاجے کے ہاتھ پر گرا۔ اچانک وہ میرے درد سے واقف ہوگیا۔ اس نے چونک کر اپنا ہاتھ میرے منہ سے ہٹا لیا، پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "دینے! ایسا لگتا ہے جیسے تو بھی پیار کی ریت جانتا ہے.... مجھے معاف کر دے دینے!.... پہلے تو میں نے جوگ کا سوانگ بھرا تھا۔ اب میں کان پھڑوا مندرے پہن سچ مچ جوگ لے لوں گا۔"

اب: ——— بقیہ صفحہ ۵۰

اب کیا تھا (مرا: اب کیا تھا آپے سے باہر ہو گئے)
اب نہ تب۔ وغیرہ

مخففات

فت = فتحہ	سک = سکون	ظ = ظرف
ف = فعل	ح = حرف	ـہ = نظم
ن = فقرہ	کُ = کلیات	د = دیوان
ـہ = صفحہ	م = مثال، بن مرتّب*	

* آکسفورڈ و نیو انگلش ڈکشنری کی طرح ہر لفظ کے ہر مفہوم کی مثال مختلف ادوار سے لی گئی ہے۔ مگر یہاں ترتیب برعکس رکھی گئی ہے تاکہ جدید تر مثال پہلے آئے۔

آب

شان الحق حقی

وزارت تعلیم کا قائم کردہ ترقی اردو بورڈ اردو کی ایک کلاں لغت بڑی آکسفورڈ ڈکشنری کے نمونے اور پیمانے پر تیار کر رہا ہے۔ اس وقت یہ وسیع مہم فراہمیٔ الفاظ و اسناد کی منزل میں ہے۔ یہ ایک جامع تالیف ہوگی جس میں معنی کے ساتھ ادب میں ہر لفظ کے استعمال کی تاریخ وار مثالیں اور اصول و اشتقاق بھی درج ہوں گے۔ ماہ نو کے سابقہ شمارے میں مرزا غالب کی تشریح نمونۃً پیش کی گئی تھی۔ اس بار حقی صاحب نے جو بورڈ کے سیکرٹری ہیں لفظ آب کی تشریح ماہ نو کے لئے مرحمت کی ہے جس سے اس کی مطلوبہ مجوزہ لغت کی نوعیت کا اندازہ ہوگا۔ سابقہ تشریح کی طرح یہ بھی حقی صاحب کی ذاتی کاوش ہے، بورڈ کا تصفیہ شدہ مسودہ نہیں۔ (مدیر)

آب (فت اسک ب) ظرف؛ تابع ف

۱- بطور ظرف مراد عموماً زمانۂ حال (الف) ماضی کے خلاف یا بالمقابل

(۱۹۲۱ء) ؎ نظر لطف و کرم یار کی اب وہ نہ رہی
پہلے اک بات جو تھی پیار کی اب وہ نہ رہی
اکبر ک اول ص۱

(۱۹۱۴) ؎ قوم میں جیسا حال ہے اب
آدمیوں کا کال نہ تھا
حالی د ص ۱۷

(۱۸۶۲) ؎ اب جو لکھتا ہے وہ یہ کلمہ کو لکھتا تھا کبھی
دیکھو تو اس بت مغرور کا پہلا کاغذ
ظفر، ک اول

(۱۷۱۳) ؎ کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ
مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
جعفر زٹلی ک

(۱۶۷۴) ؎ دکن کا کہن شعر اب بے عدد
لگے کہنہ تقویم مانند رد
نصرتی گلشن عشق ص۲۱۹

(ب) یا مستقبل کے برخلاف

(۱۹۰۲) ؎ اب تو بے قدر سمجھتے ہو خفا رہتے ہو
جان جاں یاد کروگے جو گزر جائیں گے
داغ ک ماد

(۱۸۰۱) ف: تجھے صبح نکال لوں گا پر اب اِن کے سامنے گرد
حیدری، آرائش محفل ص۱۲۴

(۱۷۸۶) ؎
یہ کس کو خبر ہے اب کے بچھڑے
کیا جانئے اس سے کب ملیں گے
میر حسن د

(۱۶۴۹) ؎ چمن میں دل کے اب نیناں تھے پانی باندھا نجھواں کا
جو لیا وے پھول ہور پھل بار حاجت کا درخت اپنا
غواصی، ک ص ۳۲

(ج) یا ماضی و مستقبل دونوں کے بالمقابل؛ محض زمانۂ حال۔

(۱۹۱۰) ف: اب تو دنیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آزاد، دربار اکبری ص۴۲۵

(۱۸۶۲) ؎ ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
ظفر ک اول ص۱۲

(۱۹۹۹) ؎ یارا اب سب ہے سو کچھ عجب ہے رے
اب جو سب ہے سو کچھ عجب ہے رے
بحری ک ص ۲۱۶

(۱۶۳۴) ف: اگر گیان ہے تو سمجھ آپ کچھ وجہی "سب رس ص ۲۴

۲- (الف) اس زمانے میں، اس دور میں، ان دنوں، آجکل۔ زمانۂ حال کے ساتھ استمرار و تسلسل کے معنی رکھتا ہے

(۱۹۴۸) ؎ اسے آسند کیسی دنیا الٹ گئی ہے
وہ دوستوں میں اب ہے شیوہ جو تھا عدو کا
فغان آرزو ص ۸۰

(۱۸۰۳) ف: اب اس بستی میں بکیں واقع ہوا ہوں اور تم میرے دین دنیا کے باپ ہو۔ میرامن ص ۲۳۷

(۱۹۸۲) ؎ کہاں آپ منوچہر ہے راج دال
حکومت ہے اس کی بڑی آج داں
فائز د ص ۱۱۴

(ب) فی الوقت، سردست، موجودہ صورت حالت، کیفیت میں۔

(۱۸۷۴) ع: پر اب تو مجھے جان کی اصغر کی پڑی ہے
انیس، مراثی اوّل ص ۱۶

(۱۸۱) ؎ جرأت اب بند ہے تنخواہ تو یوں کہتے ہیں
کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیمان کب دے
جرأت۔ ک

(۱۶۳۱) ؎ کھینچا ہے دل کو عشق نے اب دل کوں کچھ چارا نہیں
عاشق کوں کوئی کیتا رکھے کس تے رہن ہارا نہیں
وجہی سب رس ص ۴

(۱۶۷۱) ؎ رکھن ہار ناموس و عزت کوں تو ہیچ
بڑا سب تے اب عقل و ہمت کون توہیچ
نصرتی گلشن عشق ص ۲۵

(ج) اس نوبت، اس مرحلے پر، یہاں پہنچ کر۔

(کہاوت) اب پچھتائے کیا ہوئے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

(۱۹۳) ؎ ہوش میں آجاؤ منظر ہو چکا خواب شباب
اب تو جاگو صبح پیری کی اذاں ہونے لگی
مضطر خیرآبادی۔ بہارستان ص ۳۵

(۱۸۶۹) ؎ اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
غالب

(۱۷۴۴) ؎ زندگی کی دل کوں اب امید نئیں
جب سے تیرے عشق کی لاگی ہے پھانس
ولی ک۔

(۱۶۷۲) ؎ یو سن بات ہوئی پھر کے رنجیدہ دل
کہی اب کریں آؤ یک شرط مل
نصرتی گ ع ص ۷۰

(د) اس وقت، اس لمحے، اس دم

(۱۸۶۹) ؎ مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
غالب د ص ۱۰۴

(۱۸۳۰) ؎ ہم تو ہو جائیں اُس سے اب گستاخ
ہونے دے گا مگر وہ کب گستاخ نظیر اکبرآبادی ک ص ۲۰۶

(۱۸۱۰) ؎ ایک مدت تھی آج کل پہ بات
اب ہوئی صبح اب ہوئی ہے رات
میر ک اول

(۱۶۱۱) ؎ عشرت منجے دلا اب جوں خضر جم جلا اب
پیالے مدن پلا اب آیا ہنگام ساقی
قلی قطب شاہ ک ص ۱۰۳

(س) (کنایۃً) اس زندگی میں، اس دنیا میں، موت سے پہلے پہلے۔

(۱۸۵۴) ؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
ذوق ص ۸۴

(۱۸۰۳) ؎ عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گذرتی ہے
آفتاب، نادرات

(۱۶۳۴) ف: اگر گیان ہے تو سمجھ آپ کچھ
وجہی سب رس ص ۲۴

۲۔ ظ ۔ بمعنی استقبال (الف) مستقبل قریب میں بہ مطابق وہی دم میں، ذرا سی دیر میں، دیکھتے دیکھتے، فوراً، ترت جھٹ پٹ۔

(۱۹۰۵) ؂ نہ آیا نامہ بر لب تک گیا تھا کہہ کے آب آیا
الہٰی کیا ستم ٹوٹا خدایا کیا غضب آیا
داغ ص ۶

(۱۸۹۶) ؂ مرغان باغ کس لئے گھبرائے جاتے ہیں
اب دیکھیئے بہار کے دن آئے جاتے ہیں
وحید، انتخاب

(۱۸۱۰) ؂ اے عدم ہونے والو تم تو چلو
ہم بھی اب کوئی دم کو آتے ہیں
میر، ک دوم ص ۸۵

(۱۶۱۹) ؂ سوا دو ڈائینی ہے کہ آتی ہے اب
یو دریا میں اندکا راس کا ہے سب
غواصی، سیف الملوک ص ۶۹

(ب) آئندہ، اِس دم سے، اِس وقت کے بعد، لمحۂ موجودہ سے مدت غیر معینہ تک۔

(۱۹۴۸) ؂ دل گیا یوں کہ اب نہ آسے گا
خیر بہتر ہوا ٹھکانے لگا
فغان آرزو ص ۶۴

(۱۸۵۱) ؂ بت خانہ چیں سہی ترا گھر
مومن ہے تو اب نہ آئیں گے ہم
(۱۸۷۴) ؂ اب دھیان مرا شام و سحر کون رکھے گا
پردیس میں اب ماں کی خبر کون رکھے گا
انیس مراثی اول ص ۱۴۱

(۱۸۱۰) ؂ ہولئے میکدہ ہی سے تو فوت وقت ہے ظلم
نماز چھوڑ دیں اب کوئی دن گناہ کریں
میر، ک اول ص ۷۷

(۱۸۵۳) ؂ وفا سے میں نے بھی اب ہاتھ اٹھایا
قسم ہے مجھکو اپنے بے وفا کی
خواجہ وزیر ص ۲۰۳

(۱۹۷۲) ؂ وہ آ رہے تک ... حال اب
کریں گے سبب جو ہے تیرا طلب
نصرتی ک، ع ص ۳۴

(ج) مکرر، دوبارہ، پھر کر، اگلی بار، اس کے بعد
(۱۹۴۸) ؂ عاجزی کی حد ہوئی ڈر سے منا ے دل کا مرے
وہ چھڑا اٹھی اب جو دامن تو گریباں تھا مرے
فغان آرزو ص ۱۸۱

(۱۸۱۳) ؂ معین ہے اب ساعتِ سعد کل
بس اب کل کرو روشن آ کر محل
مرزا جان طپش

(۱۸۶۴) ؂ میری جان رنج گھٹائیے قدم آگے اب نہ بڑھائیے
نسیم دہلوی ص ۳۴

(۱۶۷۲) ؂ سنو اب چندر سین کی بات ہے
کھلے بخت سو تس عجب دھات ہے
نصرتی گلشن ع ص ۲۰۰

۴۔ ظ بمفہوم ماضی قریب؛ تھوڑی دیر، تھوڑے عرصے یا کچھ دن پہلے؛ ذرا دیر ہوئی (مقابلے یا مبالغے کے طور پر)
(۱۹۴۵) ؂ آدم سے بھی پہلے گذرے آدم
یہ آدم بوالبشر تو اب تھا
ناداں دہلوی

(۱۹۱۲) ف: چار مہینے بعد تو تم ماں کے گھر سے اب آٹھ دن ہوئے کہ آئی ہو۔
نذیر احمد، مرآۃ ص ۲۷

(۱۹۴۸) ؂ دیدۂ کم سے نہ دیکھو خود بیں جیسا زمانہ ویسی بات
خوئے نیاز تو اب ڈالی ہے، ورنہ سراپا ناز تھے ہم
فغان آرزو ص ۱۱۷

(۱۸۵۳) ؂ لگا کر اب لہو داخل ہوئے ہیں سب شہیدوں میں
صنم میں ہوں قتیل ابروئے خدا برسوں سے
خواجہ وزیر

۵۔ کسی خاص وقت، موقعے، مرحلے یا صورت میں۔
(۱۹۲۶) ف: اب یہاں انہوں نے نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی۔
شرر، مشرقی تمدن ص ۶۳

(۱۹۱۰) ف: اب یہ عالم ہوگیا کہ امرائے دربار تو بالائے طاق رہے،
وہی صدر مفتی الملک تھے جنہوں نے جشن نوروزی میں
بادۂ گلرنگ کا جام لے کر پیا۔ آزاد۔ دربار اک ص ۱۱۳

(۱۶۸۲) سے وے اب جو تھا ہیں مرے دھیان میں
کہا یو جنا در مرے کان میں
فائز، روح افزا ۹۳

۲۔ اتنی دیر میں، اتنی تاخیر سے، اتنا کچھ ہو جانے، حد
گذر جانے پر، اپنے وقت کے بعد: مر: آپ کو اب خبر ہوئی؟
کیوں جی اب آئے ہو؟

(۱۹۳۲) جو آپ کبھی نہ تکلیف فرمائیے گا
تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا
جگر بش ط ص ۱۶۹

(۱۸۵۳) سے وزیر اب تا کجا یہ بت پرستی
کسی دن تو بھلا یاد خدا کر
خواجہ وزیر دفتر فصاحت ص ۸۰

(۱۶۱۱) سے تم یاد تھے ہوا ہے مو مو رہنے مو تن[1]
اب نا کریں تم ہم پر جور کب کریں رعایت
قلی قطب شاہ ک ص ۲۷۰

۷۔ بطور ظرف مکاں (شاذ) یہاں، یہیں، اس جگہ،
اس سے آگے کا مفہوم رکھتا ہے: ۔ مر: ایک باب ختم ہوا اب
دو صفحے غائب ہیں۔ یہیں ٹھہر جاؤ اب غیر علاقہ ہے۔ یہ دو گز ہوا، یہ
چار گز اب کاٹ دو۔

(۱۸۷۴) سے اب یاں سے رقم کرتا ہے یوں راوئ صادق
انیس، مراثی اول ص ۹۶

(۱۸۱۳) سے کھلنے کو جو ہے طلسم تقدیر
اب خامے نے یوں کیا ہے تحریر
مرزا جان طپش

۸۔ بطور تمیز یا تابع فعل (الف) جب، تب، کب،
نیز، پھر، تو کی ضد، جواب یا جزا۔ مر: اب یہ کہتے ہو جب یہ
کہتے تھے۔ اب اختیار ہے نہ تب تھا یا
اب بولو تو جانیں، اب سے پھر نہ ہوگا۔

(۱۹۱۴) سے اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ گیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
حالی، د ص ۸

(۱۸۳۰) سے جب یار کے ہم یار تھے اب یار سے پنکھا
نظیر ک

(۱۷۴۴) سے زندگی کی دل کوں اب امید نہیں
جب سے تیرے عشق کی لاگی ہے پھانس
ولی

(ب) دلیل یا مشاہدے کا نتیجہ بیان کرنے کے لئے
پس، لہٰذا، اس لئے، اس بنا پر، چنانچہ کا مرادف۔

(۱۹۴۸) سے مرا سجدہ سہو میں پڑ گیا اب اسے قضا کہوں یا ادا
تری یاد نے یہ ستم کیا کہ ستایا آ کے نماز میں
فغان آرزو ص ۔

(۱۹۱۰) ف: اب تم خیال کرو کہ دربار کی طرف سے اُسکے اصل خیال
کیا تھے جو یہ فقرہ قلم سے ٹپکا۔ آزاد، دربار اک ۵۵

(۱۸۷۴) سے پھولوں سے آج بھر گیا دامانِ کربلا
بس اب تو یہ بہشت ہے بستان کربلا
انیس، مراثی اول

(۱۸۵۳) سے اب کرامت کیجئے اب معجزے دکھلائیے
خضر خط، رخسار یوسف، لب مسیحا ہو گیا
خواجہ وزیر دف

(۱۸۵۳) سے باغ سے تشبیہ دیتے ہیں گل رخسار کو
اب عوض طوطی کے بلبل کہتے خط یار کو
ایضاً ص ۱۴۸

(۱۴۹۶) سے کہے تجھ سیر سہاگ الہ کا چھڑ دیا سہارا
اب کیوں سیر سہاوے دوجا تم کو نا ہیں تھارا
شمس العشاق خوش نامہ

۹۔ حرف زائد: (الف) جو خلاصۂ کلام یا بیان میں
تسلسل رکھنے کے لئے بولا یا لکھا جاتا ہے۔ مر: اب دیکھا

[1] میرا تن چیونٹی کی طرح بال برابر رہ گیا ہے۔

ہی دو شے ہوئے تھے : اب ہم ٹھہرے سیلانی۔

ف : اب سلسلہ۔ یہ اگرچہ ے کے لئے بہت ضروری چیز ہے مگر اس قسم کی کسی چیز کا پتہ دیگر ممالک کی پرانی بولیوں میں نہیں چلتا۔ شرر۔ مشرقی تمدن ص ۱۸۹

(۱۹) ۔ اب چاہو استاد گنو
یا ہمیں تم سمجھو یکتا
حالی۔ د ص ۱۸

۱۷۸) ۔ اس اندھیر کو کیا لکھوں اب میں آہ
قلم کے نکلتے ہیں آنسو سیاہ
میرحسن، س ب ص ۱۵۳

۱۸۱) ۔ صاحب جاہ و شوکت و اقبال
اک ازاں جملہ اب سکندر تھا
میر ک اول

(ب) یا قائل کرنے کے لئے (بطور استفہام، مراد : نے یا نہ ملنے ؛ بس چپ ہو جاؤ۔ م : اب بولو تمہارا کیا علاج ؟ اب کہئے ؛ یہ بھی کر دکھایا۔ اب ؟

(ج) یا مفاہمت منانے، قصہ کو تاہ کرنے کے لئے مراد : بس ختم کرو۔ م : اب جانے بھی دو ؛ اب آ بھی جاؤ ؛ اب نہیں ؛ اب ہاں ہو چکا۔

۱۸۷۴) ۔ گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
لو اب اٹھا لو تیغ و سپر، تم پہ ہیں فدا
انیس، اول

۱۸۷) ۔ اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے
جس کو چاہے خدا ذلیل کرے
شوق زہر عشق

(د) یا اکتاہٹ، بے دلی، ناراضگی کے اظہار میں م : اب جھلائے ؛ اب کوئی کیا کرے آخر۔

۱۸۳۹) ۔ کیا لکھئے اور نظیر لگے اب کون سمجھنے والا ہے
نظیر، ک ص ۸۵۹

(س) یا تنبیہ، تہدید، دھمکی کے طور پر

۱۹۱۲) ۔ چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زبان ہے اب
حالی۔ ص ۷۳

(۱۹۲۶) ۔ نہیں ان تلون تیل تمہا بس چلو
خدا کے لئے اب ہٹو اب ٹلو
شوق قدوائی، قاسم و زہرہ ص ۲۲

(۱۸۰۳) ف۔ اب دیکھو تمہارا کیا حال کرتا ہوں۔ میرا امن ص ۲۳۵

(۱۸۳۰) ۔ دیا ہمارا آسے نامہ بر لے جب کاغذ
تو بولا طیش میں آ کر پھر آیا اب کاغذ
نظیر، ک،

[(از برج بھاشا اَب = از اسے ویر (اے = اس + ویر ق)
ق پراکرت آوو، آد [illegible] اپ بھرنش اسے وہیں [illegible]، کمایونی اَب ؛ بہاری اَبَ ؛ سنسکرت ادھ [illegible] دیک [illegible] ... [illegible] ایتا، اِتال ہے جو ولی تک ملتا ہے، مگر اب کے ساتھ ساتھ جو ابتدا ہی سے موجود ہے۔]

مذکورۂ بالا تشریح کے علاوہ حسب ذیل تابعات بھی لائق اندراج و تشریح ہیں :

اب اب کر کے

اب بھی ! (کلمۂ تہدید۔ م : ایک طمانچہ مارا اور کہا کیوں جی اب بھی !)

اب پچھتائے کیا ہوئے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

اب تب ہونا (لب و دم کا معاملہ)

اب تو

اب تو ہوں میں اونی اونی جب ہوں گی سب سے دونی

اب ستونتی ہو کر بیٹھی جگ کو لگا کے آگ

اب سے دور

اب کھائی تو کھائی اب کھاؤں تو رام دہائی

اب کی (رع : کچھ اب کی بوئے کفن دامن بہار میں ہے)

اب کی بات اب کے ساتھ جب کی بات جب کے ساتھ

اب کی بچے تو گھر گھر نچے (گوٹ چوسر کی)

اب کے

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

غزل

حشمت فضلی

پی لو کہ دستِ شعلہ رخاں کی کشیدہ ہے
یہ آتشِ حیات ابھی نو دمیدہ ہے

تا دور یہ شفق کا بکھرتا حسین رنگ
میری نگارِ شعر کا رنگِ پریدہ ہے

ہوگا کسی مسافرِ غم آشنا کا دل
راہوں میں ایک پھول جو دامن دریدہ ہے

سر پر الم کی دھوپ میں سایہ کئے ہوئے
اب اپنی بیکسی کی ردائے پریدہ ہے

تجھ تک نہ جا سکے گی کمندِ تصورات
تیرا خیال جیسے غزالِ رمیدہ ہے

اے خضرِ راہِ شوق کوئی اور تذکرہ
صحرائے آرزو کا فسانہ شنیدہ ہے

دیتے ہیں نام جس کو بہشتِ وفا کا لوگ
اپنے لئے وہ جنتِ ناآفریدہ ہے

فضلی بجھی بجھی ہے حوادث سے شمعِ دل
بزمِ حیات آج کبیدہ ہے

غزل

شبیر گجراتی

یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں تھے کہاں ہیں ہم
بس اتنا یاد ہے کہ ترے نغمہ خواں ہیں ہم

تیرے خیال تیری تمنا سے بے خبر
تو ہی بتا کہ کون سی جانب رواں ہیں ہم

راہِ وفا میں یوسفِ بے کارواں سہی
پھر بھی شریکِ دردِ دلِ دوستاں ہیں ہم

قائم ہیں ہم سے سرو و سمن کی حکایتیں
اے شاہدِ بہار ترے رازداں ہیں ہم

ان مست انکھڑیوں کا فسانہ غزل ہیں ہم
یوں بھی شریکِ حلقۂ پیرِ مغاں ہیں ہم

مدھم سہی چراغِ دل و جاں ترے بغیر
پھر بھی جوابِ مہر و مہ و کہکشاں ہیں ہم

ہم کو یقیں ہے ہم ہیں متاعِ گراں بہا
یہ اور بات ہے کہ ابھی رائیگاں ہیں ہم

فن:

خط میں حُسن کاری

مصباح الحق

ہم خطاطی کے سلسلہ میں نسخ اور نستعلیق کا چرچا تو بہت سنتے ہیں بلکہ نستعلیق تو اپنی نفاست، رعنائی اور سجل پن کے لئے ضرب المثل بن چکا ہے۔ اور نستعلیق وضع، نستعلیق خط و خال، اکثر سننے میں آتے ہیں۔ جیسے یہ خوبصورتی کی انتہا ہو۔ اسی طرح خطاطی کے بڑے بڑے ماہر استادوں، ابن مقلہ، یاقوت، میر علی تبریزی، سلطان علی مشہدی کا نام بھی بہت سننے میں آتا ہے۔ مگر ہم میں سے جو لوگ خطاط یا صاحب ذوق نہیں ہیں انہیں اس دلآویز فن کی خوبیوں اور باریکیوں کو جاننے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ وہ اس کو زیادہ سے زیادہ خوش نویسی ہی تصور کرتے ہیں اور بس۔ جو اس کو فن کے درجہ سے گرا کر ہنر یا کاریگری کی سطح پر لے آتی ہے۔ حالانکہ ہر صاحب ذوق کی نظر میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اور وہ اس کے نقطوں، اس کے خطوں، اس کے دائروں، کرسیوں، نت نئی وضعوں اور ترتیبوں میں حسن و کیف کی ایک دنیا پاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر کسی فن میں حسن کاری ہی حسن کاری ہے، اگر کوئی فن خالص جمال کا مظہر ہے۔ مجرد حسن۔ جس میں کسی دوسرے داخلی و معنوی عنصر کی آمیزش نہ ہو، تو وہ خطاطی ہے۔ وہ متانت وہ پاکیزگی، وہ منزہ حسن کی پُرکاری، وہ جاذبیت جو اپنے ہی مواد یعنی حروف سے اُبھرتی ہے، ایک عنصری قسم کی خوبصورتی، دیکھنے والوں کو اپنی ارفع و اعلیٰ لطافت سے لبھا لیتی ہے۔ جسے آج کل کی اصطلاح میں ارتفاع یا تہذیب کہتے ہیں۔ اس ضمن میں مجرد حسن کا لفظ بے اختیار زبان پر آگیا۔ اور حق یہ ہے کہ یہی تجرید، یہی محض اسلوب، طرح پیشکش پہ مندرہی اس فن کی روح و رواں ہے۔ اور اس کو امتیاز بخشتی ہے۔ اس میں ایک پُرتمکیں، پارسایانہ وضع پیدا کرتی ہے جیسے لطافتیں تمام کثافتوں سے معرا ہو کر ایک بلند، پاکیزہ مقام تک پہنچ گئی ہوں۔

اور سچ پوچھئے تو یہ کچھ عجیب بھی نہیں۔ مانا کہ یہ فن ابتدا ملمع گری بھی نہ تھا۔ اس کی نمود ہم انسانوں کی اس قدرتی خواہش کا نتیجہ ہے کہ ہم ہر بات کو سمجھیں، اس کو تصویر کی شکل میں دیکھیں چنانچہ ہر چیز نے اول اول نقوش کی صورت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ یہ نقش حروف بن گئے۔ محض نشان۔ جن میں اپنی ذاتی وضع کے علاوہ تزئین کا کوئی اور پہلو نہ تھا۔ حسن آفرینی کے جو بھی امکانات تھے سو ان حروف ہی کو دلکش پیرائے میں پیش کرنے تک محدود تھے۔

ایک اور بات۔ ایک دلچسپ افتاد۔ قرآن مجید کو دلکش پیرائے میں پیش کرنے سے زیادہ پُرزور خواہش اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس سے بہتر اور کونسی چیز ہو سکتی تھی۔ جس پر حسن آفرینی کا طبعی ملکہ عمل کرے اور کس شد و مد سے؟ اس کا اندازہ مسلمانوں کے ذوق و شوق سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ انہیں قرآن نویسی کی شکل میں ایسا فن ہاتھ آیا جس پر وہ اپنا بہترین کمال صرف کر سکتے تھے اور یہ ایک دو نسلوں کی بات نہ تھی بلکہ نسلاً بعد نسلٍ اس کا سلسلہ جاری رہا۔ تمام دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان تھے ان کے تخلیقی جوہر اس فن پر مرکوز ہو گئے۔ اور یہ صدہا سال کی مشق و ریاض سے کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ آمیزشے کجا گہر پاک او کجا۔ مقدس عبارت کو پیش کرنے کے لئے یہی مناسب تھا کہ خط بھی نہایت پاکیزہ ہو۔ اور اس میں کسی طرح کی بیجا آرائش یا صورت گری سے کام نہ لیا جائے جس سے نقاشی پر طرحداری کا شائبہ بھی پیدا ہو۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ زور خط میں حسن پیدا کرنے پر ہی دیا گیا۔ تاکہ یہ سحر حلال بن جائے۔ اس کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ تجرید۔ وہ چیز جس کا آج کل مغرب و مشرق میں اس قدر چرچا ہے۔ دنیائے اسلام میں یہ خالص وضعی قسم کا فن صدیوں پہلے وجود میں آ چکا تھا جس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب اہل مغرب نے یورپی ممالک میں تعمیر شدہ اسلامی عمارات پر نہایت خوش خط لکھی ہوئی عربی آیات دیکھیں تو انہوں نے ان کو

طرازی قسم کی گلکاری خیال کیا جسے وہ (ARABESQUE)
عربیک" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمثیل
ور تجرید میں کچھ ایسا فرق نہیں۔ جہاں اصلی توجیہات نظر سے نہاں
ہوئی بامعنی چیز محض تجرید بن کر رہ جاتی ہے جس میں وضع و صورت
کی رعنائی کے علاوہ اور کسی چیز کو دخل نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اگر کسی فن
کو خالص اسلامی فن ہونے کا شرف حاصل ہے تو وہ خطاطی ہے۔

اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ عربی رسم الخط کے حرفِ اول
کو الفِ تجرید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ وحدتِ حق کا
آئینہ دار ہے۔ مگر سچ پوچھیئے تو سارے رسم الخط کی یہی کیفیت ہے۔
اسلامی تصوّر جس میں توحید بنیادی حیثیت رکھتی ہے، قدرتی طور پر
اس خط میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جو اس کی عکاسی کرتا ہے۔
ایک منزہ ہستی، برتر و بالا، مجرد، ماورا، علی الاطلاق غیب غیب
وحدہ محض اور وجوب محض جس میں مجاز کا شائبہ تک نہیں۔ تمام تر
سامی۔ آریائی دیوی دیوتاؤں کے محسوس پیکر سے کوسوں دور جو کلمۂ
توحید میں پوری طرح منعکس ہے۔ وہی سادگی، وہی جلال، وہی بے آمیزی،
وہی بے رنگی و بے صورتی۔ توحید اور قرآن ایک ہی حقیقت کے دو پہلو
ہیں، اس لئے جو خط ان کی نمائندگی کرتا ہے اُسے بھی ایسا ہی اُلوہی
ایسا ہی تجریدی ہونا چاہئیے۔ دونوں کا نادیدہ جلال و جمال رسم الخط
میں پوری طرح رچا ہوا۔ بلاغت کی انتہا۔ حسن حرف حرف میں کوٹ
کوٹ کر بھرا ہوا لیکن ایسے کہ وہ کسی طرح باہر نہ چھلکنے پائے۔

آخر اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ رنگ،
وضع، ہیئت، طرح، ترتیب بجائے خود دلچسپی کا باعث ہیں۔
انسان نے آنکھ کھولتے ہی یہ ساری چیزیں قدرت میں پائیں اور
ان سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کی اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی
بھی یہی کیفیت ہے۔ جن کا معنی یا کسی اور ایسی ہی گہری بات
کے ساتھ کوئی سروکار نہیں۔ یہی چیز فن میں بھی منتقل ہوئے بغیر
نہ رہ سکی جس کے لئے رمز و معنی کی شرط ضروری نہیں۔ بلکہ اس سے تو
یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ کہیں فن کی دلچسپی میں در پردہ انہی عناصر
کو دخل نہ ہو۔ جو جمالیاتی، تخئیلی، صناعانہ قدروں کی حیثیت رکھتے
ہیں۔ اور ہم بھول کر فنی اثر کا سہرا تمام تر مطلب و معنی کے سر باندھ
دیتے ہیں۔ جو لوگ "فن برائے فن" کے قائل ہیں انہیں بظاہر
اسی بنیادی حقیقت کا دھندلا دھندلا سا احساس رہا ہے جیسے
تجریدی فن بالکل سامنے لے آتا ہے۔ روجر فرائی، ایک جدید
نقاد، نے اپنی تصنیف "وژن اینڈ ڈیزائن" میں کچھ ایسی ہی
بات کہی ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ فن ہمارے اعصاب میں توازن،
سکون، خاص خاص حرکات و سکنات اور ایسے ہی دوسرے اثرات
پیدا کرتا ہے۔ اور ان سب کا "خلق و تکمیل جمال معنوی" سے کوئی
تعلق نہیں۔

خیر ہمارے یہاں خطاطی کا رواج ہوا اور خوب ہوا۔ قرآن میں
مستقل و مسلسل دلچسپی لازمی تھی۔ اور اس کو اچھی سے اچھی شکل میں
محفوظ اور پیش کرنے کا شوق اس فن کے لئے زبردست مہمیز
ثابت ہوا۔ یہ محض خوشنویسی ہی نہ تھا بلکہ خطاطی تھا۔ ایک
بلند پایہ، برگزیدہ فن۔ جو خطاط کو بھی قابلِ احترام بنا دیتا تھا۔
چنانچہ ساری کی ساری ملت اجتماعی طور پر اس کی نشوونما میں شریک
ہوئی۔ اہلِ ہنر پر شام و سحر یہی دُھن سوار تھی۔ اور وہ اس میں بیش
از بیش پیشقدمی کرنے لگے۔ اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے رفتہ
رفتہ یہ شوق پھیلتا پھیلتا دوسری کتابوں اور تحریروں تک بھی پہنچ
گیا۔ اور اس کو ایک عام فن کی طرح ترقی دی جانے لگی۔ جدت طبع
نے ایک اسلوب وضع کیا۔ پھر اس پر ترقی ہوئی۔ نوک پلک تراش
خراش، توازن ہر بات کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اسلوب پر اسلوب وضع
ہوئے۔ ایک روایت بنی۔ اس نے سینکڑوں شاخ و برگ پیدا کئے
اور جہاں جہاں یہ روایت یا روایتیں پہنچیں ان میں طرح طرح کے
اضافے اور ترقیاں ہوئیں۔ اور ہر ملک، ہر قوم نے ایک نیا ہی
انداز پیدا کر دیا۔ سالہا سال ان سب کی قلم کاریاں اور حسن آفرینیاں
گلے ملتی رہیں۔ اور ہر باکمال خطاط دوسروں کے ہنر کی جدت طرازیاں
کو اپنے فن میں سمو کر اسے جلا دیتا رہا۔ لہٰذا یہ بات دلچسپی سے خالی
نہیں کہ اگر ہم آج کسی منجھے ہوئے خطاط کے قلم پر نظر ڈالیں تو
اس میں اگلے وقتوں کے نہ جانے کس قدر ماہرانِ فن کی ندرت
کاریوں کی جھلکیاں دکھائی دیں۔

سچ پوچھیئے تو یہ نشوونما زمانوں زمانوں، ملکوں ملکوں
ایک عجیب و غریب سفر ہے جو انسان اور قوم قوم کے
کے ساتھ ایک انوکھی کیفیت پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ جیسے

ایک بڑی ہی پُرلطف روح افزا داستان ہو۔

ایک زمانہ وہ تھا جب چھاپے کا رواج نہ تھا اس لئے قلمی نسخوں کی بڑی حفاظت اور قدر کی جاتی تھی۔ استادانِ فن کی تحریر کردہ وصلیاں بڑی بڑی گراں قدر قیمتوں پر بہت کوشش اور جستجو سے حاصل کی جاتیں۔ اعلیٰ درجہ کے لوگ اس میں کمال حاصل کرنا باعث فخر خیال کرتے تھے۔ اور جہاں ذوق و شوق ہو وہاں اجتہاد کا قدم بھی تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ایسے مجتہدینِ فن پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ مجموعی طور پر دورِ قدیم میں خطاطی ساکن ہی رہی۔ رواں دواں نہیں رہی۔ کیونکہ اس دور کی خصوصیت ہی وہی تھی۔

مغربی قوموں کی آمد پر نقشہ بدل گیا۔ جم کر بیٹھے رہنے کی بجائے دوڑنے بھاگنے پر زور ہوا۔ اس لئے خوبصورتی کی بجائے روانی پر زور دیا جانے لگا۔ وہ مضبوط اور مرکوز قسم کی خوبصورتی کم ہونے لگی جس کے پہلے فنکار دلدادہ تھے۔ مشینی دور کی عجلت پسند مگر سستی، دنیادار روح نے سب کو آن لیا اور جو چیز پہلے ایک شوق، ایک مشغلہ تھی۔ اب ایک کاروبار، ایک پیشہ بن کر رہ گئی جس کو خوش نویسی اور اس سے بھی گر کر، کتابت کا نام دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور، آگرہ، دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد (دکن) جیسے ہنر و فن کے مشہور و معروف مرکزوں میں بھی صفِ اول کے فن کار، صاحبِ طرز اور مجتہدِ فن پیدا ہونے بند ہو گئے۔ الا ماشاء اللہ۔

ساتھ ہی ساتھ نئی فضا کا نیا اثر بھی لازم تھا۔ جو ایک طرف فن کاروں کے تصور اور دوسری طرف خطاطی کے فن کو چپکے ہی چپکے نئی راہوں پر ڈال رہا تھا۔ علمی فضا، ماحول کے نئے نئے تقاضے، دنیا بھر کے علوم و فنون کی یکجائی، مصوری، عکاسی، طباعت، عمارت سازی، سنگ تراشی وغیرہ کی روز افزوں حیرت انگیز ترقی۔ فن کاروں کا احساس شعور ان سے کیسے غیر متاثر رہ سکتا تھا۔ خطاط اپنے فن میں نئی طرح کی خوبصورتی اور نفاست پیدا کرنے کے لئے ذہن دوڑانے لگے۔ پرانی لکیریں چھوڑ کر ایجاد و اختراع کی نئی راہیں تلاش کرنے کی دُھن پیدا ہوئی۔ بلاک، آفسٹ، فائنگ، کندہ کاری، اشتہار بازی، پیکنگ وغیرہ نے معاملات کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ خطاطی نے اپنا چولا بدلا اور نئے لباس میں جلوہ گر ہونے لگی۔ اس کا لازمی نتیجہ ایک ایسے فن کا ظہور اور ترویج تھی جو خطاطی اور آرٹ کا حسین امتزاج ہو۔ ظاہر ہے کہ رسم الخط کے بنیادی اصول و قواعد میں ترمیم و اصلاح تو بڑے غور و فکر کی بات تھی۔ اور اس کے امکانات آئندہ فن کاروں کی شوخیٔ تصور پر موقوف ہیں۔ لیکن اُس آزاد ماحول اور اس کے حیات افروز اثرات کو دیکھتے ہوئے جو قیامِ پاکستان سے پیدا ہوئے، طرزِ نگارش اور معیارِ فن میں نئے تیور پیدا ہونا لازمی ہے۔ خصوصاً موجودہ دورِ انقلاب میں جو ملک و فن کی نشوونما کے لئے مثالی فضا مہیا کرتا ہے۔

دیکھئے، نئے تقاضوں نے کیسے بعض اچھوتے فن پاروں کو جنم دیا ہے جو فن کار میں ایک نئے شعور اور نئے اقدام کی خبر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ طغرا دیکھئے جس کو صدرِ پاکستان سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ یہ نقش اس گرم جوشی ہی سے پیدا ہو سکتا تھا جو ہمارے ہر دلعزیز صدر نے عوام کے دل میں پیدا کی ہے۔ طغرا نویسی کا فن بہت مشکل ہے۔ بیک وقت عبارت کو سمیٹنے اور پھیلانے کی متضاد کوشش، کم سے کم حدود میں فشار، پھر بھی زیادہ سے زیادہ وسعت، پیچ در پیچ پھر بھی سادہ اور واضح پیشکش، تصویر نما ہوتے ہوئے بھی محض نقش، خالص خطاطی، جتنے الفاظ زیادہ اتنی ہی طرح پیدا کرنے میں دشواری، خطوط کا حسنِ ترتیب و ترکیب، تصور اور عمل دونوں روایت میں پوری طرح ڈوبے ہوئے جس کے لئے ہر ہر قلم اور خطاطی میں ہر ہر اضافہ و ترقی یعنی ساری تاریخ پر نظر لازم ہے تاکہ فن کار جس وقت، جو طریقہ چاہے برتے، اور جو اثر چاہے پیدا کرے۔ سب سے بڑھ کر موضوع و مقصد سے پوری پوری مناسبت لازم ہے۔ زیرِ نظر طغرے میں سب سے اہم بات کیا تھی؟ صدرِ پاکستان کی جید اور قدآور شخصیت، اس کا شکوہ۔ طغرے میں یہ دونوں باتیں بڑی خوش اسلوبی سے پیدا کی گئی ہیں۔ نفیس عمودی خطوط نہایت طمطراق سے بلند ہو کر افق کی طرف بڑھتے ہوئے۔ طغرا القاب کی بنیاد سے درجہ بدرجہ نام اور منصب تک پہنچتا ہوا۔ فیلڈ کا ل اور ایوب اور خاں کے دونوں الف تمام حرفوں سے

یاں وہ نمایاں ایک دوسرے کے متوازی، طول میں بتدریج کم ہوتے ہوئے
بر برابر فاصلہ۔ وضع قومی و فوجی مناسبت سے پرچم نما، لہراتے ہوئے
رائش قوسی خطوط پرچم کا تصور دوبالا کرتے اور سربلندی کا احساس
بھارتے۔ "منصب" بیضوی خطوط کے آغوش میں بڑی سادگی سے
غوف۔ عمودی اٹھان کے ساتھ ہی ساتھ افقی پھیلاؤ جیسے کسی
شاہین نے فضا پر اپنے بڑے بڑے مضبوط پر پھیلا رکھے ہوں۔ اور
سارا نقش نیچے انگریزی میں لکھی ہوئی مکمل عبارت کو محیط۔ یہ تمام
صوصیات نقش میں اکملیت بھی پیدا کرتی ہیں اور توازن بھی۔ دوسری
ت متانت میں عظمت بھی عظمت، جلال ہی جلال۔ طغرے میں یوں
دار نگاری کا حق ادا کرنا ایک خالصتاً جدید بات ہے۔ اصل یہ ہے
ہر ایسی تخلیق صاحبِ فن کے لئے ایک داعیہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی
ہترین صلاحیتوں کو کام میں لائے۔ اور ایسی طرح پیدا کرے جو
درجۂ اتم موزوں و مناسب ہو۔ موجودہ آزمائش میں صاحبِ فن بلاشبہ
میاب رہا ہے۔ نظر اور ہاتھ میں نہایت خوشگوار توازن و تعامل اور ذوق
نیل کا دلآویز سنجوگ۔ خطاطی کا کمال یہی تو ہے۔ اور یہ سارے
جزا آپس میں شیر و شکر ہو جائیں تو کیا کچھ نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔

یہ پیشکش اس لحاظ سے نسبتاً سادہ ہے کہ اس میں سفید
مین پر سیاہ حروف میں خطاطی کا حق ادا کیا گیا ہے۔ دوسرے طغروں
ں زمین سیاہ اور تحریر سفید ہے۔ جو ایک دوسرے کو ابھارتے ہیں
صوصاً سفیدی اس شدت سے ابھرتی ہے جیسے اجالا۔ چکا چوند
یدا کرنے والا شوخ اور تیز اجالا نہیں بلکہ متین، جیسے وہ نورِ محض
و۔ یہ خصوصیت مذہبی طغروں میں بدرجۂ غایت نمایاں ہے۔ مثلاً
ہ کوفی نما طغرا جس میں کلمۂ طیبہ مرقوم ہے۔ اونچے اونچے، اجلے
جلے، جلی خطوط نیچے سے اوپر تک تمام سطح پر چھائے ہوئے جیسے
ر ذاتِ باری کائنات پہ۔ جلی خطوط یکساں، متوازی جیسے کسی مسجد
سفید سفید مینار ہواؤں میں بلند، آسمان تک پہنچتے ہوئے۔ ذاتِ
ی کی پاکیزگی و جلال لمبے لمبے نورانی خطوط سے آشکار۔ ڈیزائن
یکسانیت میں تنوع پیدا کرنے کیلئے وسط اور آخیر میں کوفی وضع
ہ کی ہ۔ بعینہٖ وہی بات جو کسی شاعر، شاید سنائی یا کسی نے بہت دلکش
پیرائے میں کہی ہے:۔

در النقش ہائے حویت گرہ

اور ذاتِ باری کی اس تمثیل کے عین قلب میں پیغمبر اسلام کا ایک
مستطیل لوح میں نقش ـــ خطِ نستعلیق میں۔ اس طرح جہاں مستطیل
لوح سے کوفی خط کے ساتھ مناسبت پیدا ہوتی ہے وہاں خطِ نستعلیق
سے موازنہ کا حسن پیدا ہوتا ہے پھر سارے نقش کا انداز تعمیراتی ہے۔
جیسے سنگ مرمر کے ستون ہی ستون یا کوئی مہتم بالشان عمارت سامنے کھڑی
ہو۔ یا پھر عمودی دریچوں میں سے نور کا عالم دکھائی دے۔ یا ان دریچوں سے
اجالا ہی اجالا اندر آتا دکھائی دے۔ خطاطی فی نفسہٖ کوئی چیز ہے جس
سے تعمیراتی وضع پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ تکنیکی اعتبار سے اکثر
طغروں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں قدما کے برعکس قلم
کی بجائے پہلے پنسل سے بنیادی خاکہ بنایا گیا ہے۔ یعنی یہ اولاً ڈرائنگ
ہے اور پھر خطاطی۔ مکمل نقش نفیس دبیز آرٹ پیپر پہ واٹر پروف
انک استعمال کرنے سے تیار ہوتا ہے۔ بہت بڑی بات یہ ہے کہ
اصل نقوش سولہ سولہ گنے بڑے ہونے کے باوجود بلاکوں
میں مختصر ہو کر بعینہٖ برقرار رہتے ہیں جس طغرے میں کلمۂ طیبہ مرقوم ہے
وہ اپنے مضمون کے مطابق نہایت سادہ ہے۔ تقریباً یہی کیفیت
"اھدنا الصراط المستقیم" کی ہے۔ جس میں پھر مضمون کی مناسبت
سے سادگی نمایاں ہے۔ اور نسخ و نستعلیق دونوں کے حسن کو بڑی
کامیابی سے آمیز کیا گیا ہے۔

یہی کیفیت زیادہ وسیع پیمانہ پر "المسلم من سلم" میں دکھائی
دیتی ہے جو زیادہ مرکب واقع ہوا ہے۔ اس میں بھی خطاطی، مینار وش
تعمیر سے ہمکنار معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ ہر منارے کے ساتھ
ساتھ چاند تارا بھی موجود ہے۔ خواہ ہم اسے حقیقی کہیں یا علامتی۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جن نمونوں پہ اوپر روشنی ڈالی
گئی ہے ان میں سے اکثر تاریخی ہیں۔ مزارِ قائدِ اعظم محمد علی جناح
یادگاری حیثیت رکھتا ہے جیسے کہ آج سے ۱۰۔ ۱۱ سال پہلے بابائے
ملت اور دیگر عمائدِ ملت کے مزاروں پہ حجری کتبے۔ یا ایوانِ صدر
پر "ایران و پاکستان زندہ باد"۔ اور مقبروں سے گذر کر کاغذ پہ
پاکستانی نوٹوں کی شکل میں۔ فن ایک ہی ہے صرف اس کے
مظاہر مختلف ہیں۔

"قطعات" خطاطی کے مظاہرہ کی ایک اور دلچسپ شکل
ہے۔ گھر بار اور کوچہ و بازار کی سجاوٹ کے لئے ایک عام غرض

کا جواب۔ علامہ اقبال کا کلام اس کے لئے خاص طور پر موزوں واقع ہوا ہے۔ اور اس نے خطاطوں کو ایک مقبول و مرغوب مواد مہیا کر دیا ہے۔ اُردو زبان کے سلسلہ میں ان کے اس شعر سے زیادہ موزوں چیز اور کیا ہو سکتی تھی کہ ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے ؛ شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

فن کار نے اردو کالج، کراچی کے لئے یہ شعر چوبیس فٹ لمبی لوح پر تحریر کیا ہے پھر بھی عکس تصویر میں اس کی خوبی و نفاست میں سرمو فرق نہیں آیا۔ ڈاکٹر عزام بے جیسے عالم و فاضل شخص کے لئے جو اقبال کے اس قدر دلدادہ تھے، والیٔ مصر کی خدمت میں کچھ اسی قسم کی پیشکش موزوں تھی جسے قدرداں ہاتھوں نے ایوان شاہی کی زینت بنایا۔ پھر ہم اہلِ پاکستان جس طرح ایک "مرد راہداں" اور "میر کارواں" کے لئے ترس گئے تھے اس سے کون واقف نہیں؟ اس لئے خطاط کی نگاہ اور ایک پوری قوم کا احساس اقبال کے اس ارشاد سے بہتر اور کس چیز تک رسا ہو سکتا تھا جو اُبھرے اُبھرے حروف والے قطعہ کی زینت ہے اور ہمارے صدر کی ذات گرامی جس کے ہر ہر لفظ کی مصداق ہے ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز ؛ یہی ہے رختِ سفر "میر کارواں" کے لئے

اس "قطعے" میں ایک خاص ترکیب برتی گئی ہے۔ وہ یہ کہ زمین سبز رکھی گئی ہے اور حروف کے چاروں طرف ائیر وگراف سے نیلا شیڈ دیا گیا ہے۔ حروف کا گروہ سیاہ ہے۔ اس وجہ سے حروف سطح سے ابھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اور بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کسی مجلّیٰ سطح پر دھات سے ابھرواں کام کیا گیا ہو۔ قلم کا انداز نہ پوری طرح عمودی ہے نہ افقی بلکہ دونوں کے بین بین ہے۔ سیدھا بھی اور اُریب بھی۔ پھر بیضوی اور شمسی یا آفتابی دائروں سے بھی فن کو چار چاند لگانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ غرض یہ چند نمونے ایسے ہیں جن کے متعلق اکبر مرحوم کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ

خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی

اقبال نے درست کہا تھا "معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود" — اور ان فن پاروں میں اُس جدید خطاط عبد المجید کا خونِ جگر پوری طرح موجزن ہے جس نے پاکستان کی دل سے خدمت کی ہے۔ اور جس کی بنا پر خود صدر پاکستان نے اس کو اپنی قدر دانی کا شرف بخشا۔ بابائے ملت اور صدر پاکستان دونوں سے بذریعۂ فن وابستگی بہت بڑا امتیاز ہے اگر ان کی عظمت انہیں بھی ہم چشموں کی نظروں میں خطاطِ اعظم کے درجہ تک لے جائے تو کچھ عجب نہیں۔

خدا کرے نئے موجودہ دور انقلاب کی حیات افروز اور نمو پرور فضا دیگر فنون کی طرح خطاطی کے لئے بھی زیادہ سے زیادہ ساز گار ثابت ہو اور یہ مستقبل میں اور بھی بال و پر پیدا کرے۔

بقیہ "ایک اور سنگ میل" صـ ۱۱

بقیہ "ایک اور سنگ میل" صـ ۱۱

فضا مقبرے کو چار چاند لگا دے گی۔ اور کچھ ویسی ہی کیفیت پیدا کرے گی جیسے اسلامی فن تعمیر کا شاہکار "تاج محل" پیدا کرتا ہے۔ شاید چاندنی راتوں میں مقبرے کی شفاف و براق عمارت اور گنبد وہی سماں پیدا کر دیں جس نے حکیم ملت سے یہ کہلوایا تھا کہ :-

تاج را در زیر مہتابے نگر

یا یہ کہ :-

صنعت آزاد مرداں را ببیں

کیونکہ جس دور انقلاب میں یہ مہتم بالشان یادگار تعمیر ہو رہی ہے اس میں بندۂ محکوم نے حقیقی معنوں میں وہ آزادی حاصل کرلی ہے جو اس کا حق تھا اور جس سے ابنائے ملت کو بہرہ ور کرنے کے لئے قائد اعظمؒ نے سر توڑ کوشش کی تھی۔ ایک ایسی کوشش جو ناقابل فراموش ہے۔

ایک اور دلچسپ پہلو بلکہ سابقہ تعمیری روایات پر ایک اہم اضافہ یہ ہے کہ منجملہ دیگر عمارات کے ایک عظیم الشان مسجد بھی تعمیر کی جائے گی جسے عیدین کی نمازوں اور دیگر بڑے بڑے اجتماعات کے لئے کام میں لایا جائے گا۔

بہر حال یہ یادگار تعمیر ہر اعتبار سے ایک نمائندہ حیثیت کی حامل ہوگی۔ وہ ہمارے فن تعمیر اور ذوق جمال کی نمود بھی ہوگی اور قائد اعظم سے ہماری عقیدت اور ان کی خدمات جلیلہ کے اعتراف اور اظہار تشکر کی علامت بھی۔ اور جس طرح خود پاکستان اس کے مؤسس کی دائمی یادگار ہے اسی طرح یہ علامتی مظہر بھی سطح ارض پر ہمیشہ دائم و قائم رہے گا اور دیکھنے والوں کو بانیٔ پاکستان کی عظمت و جلالت کی جھلک پیش کرتا رہے گا۔

گرم جوش خیر مقدم کے لئے ...

ہمارا خواب یہ رہا ہے کہ دنیا کی ہوائی سروسوں میں پی۔ آئی۔ اے سب سے زیادہ آرام دہ اور متواضع سروس ثابت ہو اس بڑے خواب کو حقیقت بنانے کے لئے ہم ہمہ وقت کوشش کرتے رہتے ہیں، بلکہ جن مسافروں نے ہماری سروس سے سفر کیا ہے وہ تو اس کے قائل ہیں کہ ہم نے اس خواب کو پہلے ہی حقیقت سے ہمکنار کر دیا ہے!

پی۔ آئی۔ اے

پاکستان، مشرق وسطیٰ اور یورپ کے مابین پی، آئی، اے کی بوئینگ ۷۰۷ انٹرکانٹی نینٹل اور سوپر کانسٹلیشن سروسیں:-

روانگی کراچی:-

بوئینگ ۷۰۷ انٹرکانٹی نینٹل:- ہر منگل کو سات بجکر ۱۵ منٹ پر

سوپر کانسٹلیشن:- ہر جمعرات کو ۱۰ بجکر ۳۰ منٹ پر

fly PIA

سے

پرواز کیجئے

پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز

اپنے سفری ایجنٹ یا پی آئی اے، کلب روڈ - کراچی سے مزید معلومات حاصل کیجئے۔

ڈ شوز خریدیئے

عوام کے لئے
کفایتی جوتے

Lion
BRAND SHOES
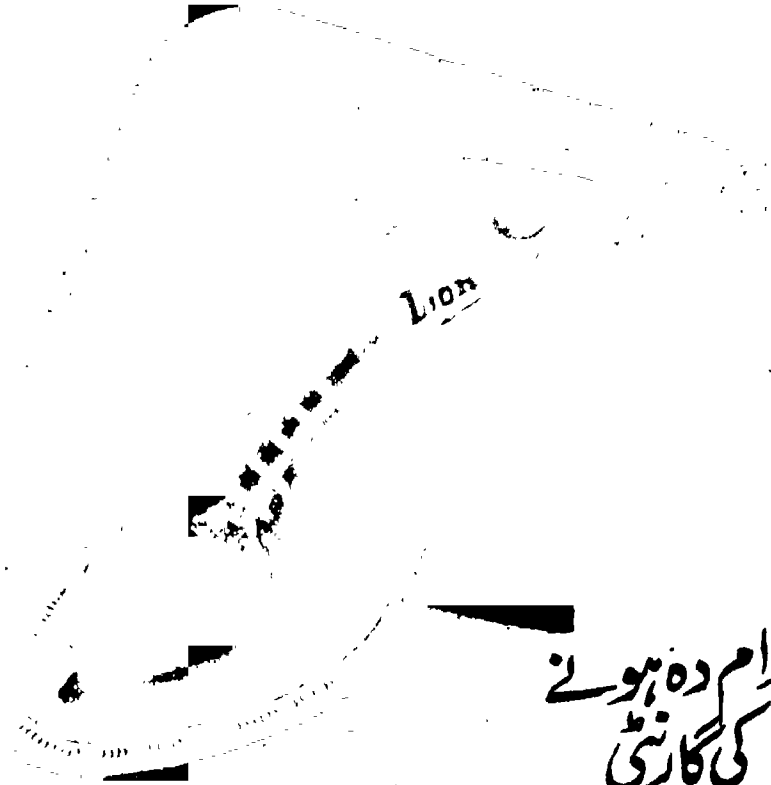
آرام دہ ہونے
کی گارنٹی
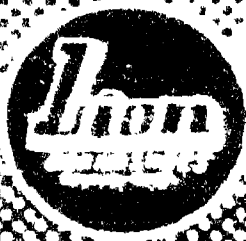
ڈز شو مینو فیکچرنگ کمپنی کراچی۔پاکستان

آفتابِ بامِ شرق :— بقیہ صفحہ ۹

...آخر میں ان کے لئے پیغام مرگ ثابت ہوئی۔ مگر انہوں نے اپنی ...ت کا کبھی خیال نہ کیا اور جہد کاوش سے کبھی منہ نہ موڑا۔ جن معاملات ...سائل سے انہیں نمٹنا تھا، اس ہجوم کا ذرا خیال کیجئے کس قدر مشکل ...نا کشش اور پیچیدہ جانکاہ۔ — مگر انہوں نے نہ کبھی کام سے منہ ...ڑا نہ شدائد سے گھبرائے اور بوجہ احسن جملہ معاملات سے عہدہ برآ ...تے رہے اور پھر اس اہتمام سے کہ شاید ہی کوئی متنفس ہو جن کی ...یانتِ نفس پر حرف گیری کر سکے۔ جن لوگوں سے کبھی میں دو چار رہا ہوں ...ے ان میں سے کسی کو بھی جناح سے زیادہ کھرا نہیں پایا۔ وہ کسی کو ...یک لمحے کے لئے بھی اس دھوکہ میں نہیں رکھتے تھے کہ ان کا منشاء ...ا ہے، وہ چاہتے کیا ہیں اور اس کو پانے کے لئے کیا کریں گے۔ یہ ...ٹھیک ہے کہ لوگ تھے جو ان کو برا سمجھتے تھے، ان کے موقف کو بھی اور ...ریق حصول کو بھی۔ چنانچہ اسی لئے ان کے بہت سے دشمن بھی پیدا ...ہو گئے۔ مگر یہ امر کہ وہ ایک بہت بڑے سیاس اور پاکستان کا ...زم صمیم لئے ہوئے ایک محکم و جید مدبر تھے، لاشک و ریب ہے۔ ...ور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، اگر جناح نہ ہوتے تو پاکستان ہی ...نہ ہوتا۔

لہٰذا ایسے موقع پر جب ہم ان کے یومِ پیدائش کی یاد تازہ ...کرنے کے لئے جمع ہیں، یہ بڑا ضروری ہے کہ اس ہستی کی ان خدماتِ ...جلیلہ کو خراجِ تحسین پیش کریں جو اُس نے پاکستان کے لئے بہر عنوان ...انجام دیں ۔

بقیہ "... مگر یہ دریا کے پار ہوگا" صفحہ ۱۶

ہیں جس میں ایک طرف خلوص و استقامت جلوہ فروز ہے تو دوسری جانب قومی وقار و عظمت کی مسکراتی ہوئی جبینیں عکس انداز ہیں۔ یہ اسی کا فیض ہے کہ آج سندھ مدرسۃ الاسلام کے ٹرسٹ کے تحت دو ہائی اسکول، ایک اقامت گاہ، ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول، ایک ڈگری کالج، اور ایک لا کالج بحسن و خوبی ملک کی تعلیمی ضرورتوں کی کفالت کرنے میں حصہ لے رہے ہیں۔ آزادیٔ وطن کے بعد اب یہ ہمارا اجتماعی فریضہ ہو جاتا ہے کہ حسن علی آفندی کی اس جلائی ہوئی شمع کو نہ صرف روشن ہی رکھیں بلکہ یہ بھی سعی کریں کہ اس کی ضیا افروزیوں سے ہر طرف اُجالے ہی اُجالے نظر آنے لگیں۔ بہر حال اس مادرِ علمی کا فیضان ایک فیضِ جاری ہے، اس پُر شکوہ دریا کی طرح جو صدہا سال سے وادیٔ مہران کی آبیاری کر رہی ہے اور ہر ہر دور میں اُسے تہذیب و تمدن کی دنیا میں نمایاں کرتی رہی ہے ✦

●

تبصرہ:

ماہنامہ "خاتونِ پاکستان" (صحت نمبر)

مدیر: شفیق بریلوی

ملنے کا پتہ: پوسٹ بکس ۱۹۹۰، صدر، کراچی

قیمت خاص نمبر بارہ آنے

یکے بعد دیگرے کتنے ہی خصوصی شمارے — مارشل لا نمبر، انقلاب نمبر، یوم پاکستان نمبر، اور سب سے آخر "صحت نمبر" زیرِ نظر ماہنامہ کے کارہائے نمایاں میں شامل ہیں — ایک مفید، اصلاحی اور معلوماتی سلسلہ کی نہایت اہم کڑیاں جو ہماری قومی زندگی میں مضبوطی و توانائی پیدا کرنے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ خواتین کے باوقار نمائندہ کی حیثیت سے اس رسالہ کی خدمات منفرد ہیں۔ جن کی بنا پر آئندہ ہر جہتی حیات افروز سرگرمیوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور موجودہ زمانے میں صحت — انفرادی و اجتماعی — سے زیادہ اہم مقدم چیز کیا ہوگی جس کے مختلف پہلوؤں کا رسالے کے آخر الذکر شمارۂ خصوصی میں بڑی خوش اسلوبی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ بنا بریں ہم قارئین سے اس کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔ (ر۔ غ)
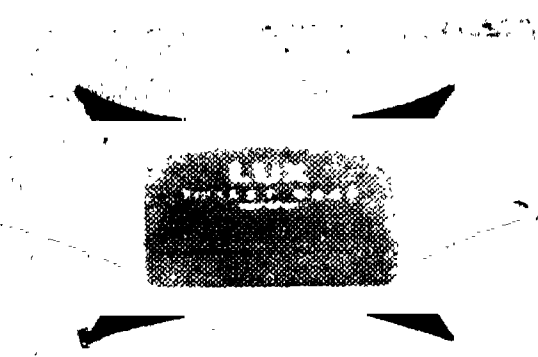
رِنسو پاؤڈر کپڑے سفید بُرّاق دھوتا ہے!
Rinso
جی ہاں! رِنسو آپ کے کپڑوں میں ایک خاص چمک پیدا کر دیتا ہے۔
اس کا استعمال نہایت آسان ہے۔ آپ بے فکر سوتے رہیں
رِنسو اپنا کام کرتا رہے گا!
اپنے کپڑوں کو رِنسو کے کثیر جھاگ میں ڈال کر رات بھر کیلئے چھوڑ دیجئے
اور صبح اچھی طرح نچوڑ لیجئے آپ اپنے کپڑے شاندار طور سے صاف
پائیں گے رات بھر میں رِنسو کے جھاگ خاموشی اور خوبی سے آپ کے
کپڑوں سے تمام میل کچیل نکال دیتے ہیں۔
رِنسو بڑے گھرانوں میں کپڑے دھونے کیلئے نہایت موزوں، اور
کم خرچ ہے یہ سفید و رنگین، سوتی اور اونی ہر قسم کے کپڑوں کیلئے یکساں مفید ہے
یاد رکھئے! رِنسو سے دھلائی آسان دھلائی ہے!
آج ہی ایک پیکٹ خریدیئے
لیور کی عمدہ مصنوعات میں سے ایک
R.B.193.UD.

اب تو میرے بچّوں کے کپڑے
گھر پر ہی دھوئے جاتے ہیں!

عمدہ صفائی کے لئے
آپ کے گھر میں وِم ضروری ہے!
"وِم" ہر قسم کی گھریلو صفائی کیلئے نہایت پُر اثر چیز ہے۔ چاہے کھانے پکانے کے برتن ہوں یا شیشے اور تام چینی کا سامان چاہے فرش ہو یا بیسن "وِم" سب کیلئے یکساں کارآمد ہے "وِم" سے اپنا گھر آئینہ کی طرح صاف رکھئے۔ بہترین نتائج کے لئے "وِم" کو گیلے کپڑے کے ساتھ استعمال کیجئے یا ڈبہ ہی سے اسے گیلی سطح پر چھڑک کر مل دیجئے تھوڑی دیر بعد اس سطح کو پانی سے دھو دیجئے اور خشک ہونے دیجئے۔
smooth cleaning ★ for
VIM
★ for
لیور برادرس کی عمدہ مصنوعات میں سے ایک
V.4-193UD

جی ہاں۔ بہت ہی پیارا اور نہایت تندرست! کیوں نہ ہوتا ماں کی ممتا، اس کی نگہداشت اور آسٹرملک کی خوبیاں کارگر ہیں۔ دانشمند مائیں اسی لئے اپنے بچّوں کی پرورش آسٹرملک سے کرتی ہیں خواہ ماں کا دُودھ چُھٹ جانے پر دیا جائے یا اس کی کمی پُوری کرنے کے لئے آسٹرملک ماں کے دُودھ کا بہترین بدل ہے۔

آسٹرملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دُودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں فولاد ملایا گیا ہے تاکہ بچّوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے۔ اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن 'ڈی' بھی شامل کیا گیا ہے۔

جی ہاں! یہی وجہ ہے کہ مائیں پُورے اعتماد کے ساتھ بچّوں کو آسٹرملک دیتی ہیں۔

ماں کے دُودھ کا بہترین نعم البدل

OM.4-60 UD

بتقریب انقلاب اکتوبر

ماہِ نو

جلد ۱۳ شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے
شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی
فی کا[پی] بارہ آ[نے]

بشیر فاروق

شہیدِ صحنِ چمن

ترے مزارِ مقدس پہ قائدِ ملت — دُرِ نیاز و عقیدت لٹانے آیا ہوں
ہر ایک حرف سے جسکے لہو ٹپکتا ہے — وہ خوں چکیدہ کہانی سنانے آیا ہوں
میں اپنے داغِ دلِ غم زدہ کا سودائی — خود اپنا چاکِ گریباں دکھانے آیا ہوں

شہیدِ قوم و وطن تیری بے گناہی پر — نگاہِ قاتل و تیغِ جفا بھی روتی ہے
چمن میں گریۂ شبنم کا تذکرہ کیا ہے — ترے فراق میں بادِ صبا بھی روتی ہے
شہیدِ صحنِ چمن تیرے خونِ ناحق پر — عروسِ لالۂ رنگیں قبا بھی روتی ہے

کسے خبر تھی کہ اے خضرِ راہ تیرے بعد — دیارِ پاک پہ غالب حریف آئیں گے
جو درس دیتے تھے ملت کو استقامت کا — کسے یقیں تھا قدم اُن کے ڈگمگائیں گے
بہت تھا ناز جنہیں اپنی رہنمائی پر — کسے گماں تھا وہ مستی میں لڑکھڑائیں گے
مرے فسانۂ غم پر لحد کے سینے سے — ندا یہ آئی محبت بھرے قرینے سے

تُلے ہوئے ہیں جو نقشِ وفا مٹانے کو — وہ مثلِ حرفِ غلط خود مٹائے جائیں گے
ضمیر بیچنے والوں کی شان غیرت کے — بڑی خوشی سے جنازے اٹھائے جائیں گے
وہ سر کہ نخوت و دولت سے سربلند ہیں آج — درِ گدائے وفا پر جھکائے جائیں گے

زمانہ آئے گا ٹوٹے گا خواجگی کا فسوں
چراغِ ظلم بالآخر بجھائے جائیں گے

[چر]اغ بالآخر انقلاب اکتوبر نے بجھا ہی دیئے اور اُن کے بعد "آفتاب زرنگار" طلوع ہوا جس کی [ایک] اہم پہلو پارۂ فن میں نظر آتی ہے۔ (مدیر)

آفتابِ زرنگار

ہو گئی رخصت خزاں عہدِ بہار آ ہی گیا
میکشو مژدہ کہ دورِ خوشگوار آ ہی گیا
تشنہ کاموں کے لئے گردش میں جام آ ہی گئے
بادہ خواروں کیلئے ابرِ بہار آ ہی گیا
مشرقِ افکار پر غالب نہ تاریکی رہے
آسماں پر آفتابِ زرنگار آ ہی گیا
رفتہ رفتہ زخم دل کے مندمل ہوتے گئے
آتے آتے بیقراری کو قرار آ ہی گیا
کشتۂ آلام کو حالات راس آ ہی گئے
زادۂ طوفاں کو طوفاں سازگار آ ہی گیا
عظمتِ پارینہ ہاتھ آ ہی گئی کھوئی ہوئی
دستِ ملت میں وہ گم گشتہ وقار آ ہی گیا
ملتفت نظروں سے کیا ساقی نے دیکھا بزم میں
بے پئے میری نگاہوں میں خمار آ ہی گیا
منتظر اک عمر سے جس کا تھا سارا میکدہ
جام لہراتا ہوا وہ بادہ خوار آ ہی گیا
طائرانِ صبح سے کہہ دو کہ نغمے چھیڑ دیں
گلشنِ ہستی میں عہدِ نغمہ بار آ ہی گیا
منزلِ مقصد کو جس کی رہبری پر ناز تھا
لب پہ نام اس خضر کا بے اختیار آ ہی گیا
درد کو جس کی طلب تھی روح کو جسکی تلاش
بے حجابانہ وہ جانِ انتظار آ ہی گیا
عظمتِ فانی پہ جو نازاں تھے آخر انکو بھی
اعتبارِ گردشِ لیل و نہار آ ہی گیا
انقلابِ نو نے چھیڑا اس طرح سازِ غزل
زندگی کو نغمگی کا اعتبار آ ہی گیا

دو سالہ قومی ادب

مغربی پاکستان : رفیق خاور
مشرقی پاکستان : یونس احمر

[illegible] ملیہ اسلامیہ دہلی

رفیق خاور:

۲۷ اکتوبر کو جو آفتاب طلوع ہوا وہ ایک نیا آفتاب تھا۔ انقلاب کے معنی ہی تھے ایک نئے دور کا طلوع جس میں پاکستان حقیقی معنوں میں پاکستان بنے گا اور اس کے ۸ کروڑ باشندے حقیقی معنوں میں آزاد ہوں گے۔ جس طرح ۱۱ سال پہلے وہ بیگانوں سے آزاد ہوئے تھے۔ اسی طرح اب اپنوں کے ہاتھ سے آزاد ہوں گے۔ عوام اور ان کے حقیقی سربراہوں کا دور آئے گا۔ چند خود غرض اور مفاد پرست افراد کی جگہ قوم کا بول بالا ہوگا۔ دبی ہوئی اُمنگیں، دبے ہوئے ارادے، دبے ہوئے مقاصد جاگ اٹھیں گے، حوصلے بلند ہونگے اور رکی ہوئی سرگرمیوں کے سلسلے دوبارہ زور شور سے جاری ہوں گے۔ "تیز قدم بیداریٔ انسان" سے روز افزوں تعمیر و ترقی کے سنہرے دور کا آغاز ہوگا۔ اور وہ خواب جسکی خاطر قیامِ پاکستان کی جدوجہد کی گئی تھی، بے اندازہ قربانیاں دی گئی تھیں، آخر کار شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ غلامی کی گھٹی ہوئی مجبور فضا کی بجائے آزادی کی فضا پیدا ہوگی جس سے شعور پیدا ہوگا۔ فکر و عمل کی صلاحیتیں پھر ابھریں گی اور زندگی ہو یا ادب و فن، فکر و احساس ہو یا تخیل سب اثر پذیر ہوں گے جس سے نہایت وقیع اور دور رس نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہ انقلاب عوامی تھا اور عین وقت پر عوام کی خواہش کے مطابق رونما ہوا تو انہوں نے اس کے بارے میں کیا روش اختیار کی۔ وہ اس سے کس طرح اثر پذیر ہوئے۔ خصوصاً ذی شعور طبقہ جو زیادہ باخبر اور بالغ نظر ہوتا ہے۔ شاعر و ادیب، ظاہر ہے، اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور حساس و ذہین ہونے کی بنا پر نہ صرف اپنے احساسات و خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ دوسروں کے تاثرات کی عکاسی کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ قبل ازیں وہ قومی زندگی اور اس کے ہنگاموں سے بڑی حد تک کنارہ کش ہی رہے۔ کچھ زیادہ روشن خیال ہونے کے باعث اور کچھ اس خیال کے تحت کہ شعر و ادب کا منصب مقامی و ہنگامی معاملات سے بالاتر ہے۔ یا پھر اس بیزاری اور دل برداشتگی کے باعث جس کا ملکی افراتفری اور بدنظمی کے زمانے میں عام دور دورہ ہو چکا تھا۔ جیسے جو کچھ ہو رہا تھا اس سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا سروکار ایسے ارفع و اعلیٰ معاملات سے تھا جو حیات و کائنات اور انسان سے تعلق رکھتے تھے۔ کبھی کبھار جب کوئی بڑی شخصیت اُبھرتی، کوئی بڑا واقعہ رونما ہوتا تو بعض ادیب و شاعر اس کی طرف بصد ذوق و شوق اعتنا کر لیتے اور ان کی تخلیقات خاصی وقیع ہوتیں۔ چنانچہ اس دور کی شعری و ادبی پیداوار کافی متنوع ہے۔ اور قومی شاعری میں بھی اس نے خاصا بلند مقام پیدا کیا لیکن بالعموم شعرا و ادبا ملکی و سیاسی ہنگاموں سے دور ہی رہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ "غمِ دوراں" اور "زہرِ زن" کا مشترک الاپ الاپ کر اپنی تسلی کر لیتے یا کبھی "خزاں میں بہار" کا تصور کر کے خوش ہو لیتے۔ یہ کہنا کہ اس دور میں اچھے لکھنے والے یا اچھا ادب نہیں پیدا ہوا اور ہمارے ادبی سرمایہ میں کوئی اہم اضافہ نہیں ہوا، صحیح نہیں۔

نئے دور کی کیفیت ہی اور ہے۔ ۲۷ اکتوبر کا انقلاب ایسا ڈرامائی انقلاب تھا جس کے آتے ہی ساری قوم کا رجحان بدل گیا۔ جیسے یہ دن اس کا یوم نجات ہو اور اسے مکمل منشور آزادی مل گیا ہو۔ تمام لوگوں کو پہلی بار اپنائیت کا احساس پیدا ہوا۔ یہ کہ نئی حکومت ان کی اپنی حکومت ہے۔ صحیح معنوں میں عوام کی حکومت، یہ ایک ایسا احساس تھا جس میں خاص و عام سب شریک تھے۔ اور وہ اپنے دل میں ایک وقار، ایک امتیاز، ایک نئی شان محسوس کر رہے تھے۔ ان کا شعور یک بیک چمک اٹھا۔ جیسے ایک نئی کرن نے ان سب کے دل و دماغ میں نئی جوت پیدا کر دی ہو۔ پاکستان کی گیارہ سالہ تاریخ میں پہلی بار شدت سے ایک ہمہ گیر قومی و اجتماعی احساس پیدا ہوا۔ اور کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اس احساس سے سرشار نہ ہو۔ اسلئے شعراء و ادبا بھی ایک جذبۂ بے اختیار کے تحت اس رو میں بہہ گئے۔ ایک دو نہیں بلکہ سبھی

جوق درجوق، پوری سنگت کی سنگت۔ جیسے ان کے دل میں والہانہ ذوق و شوق کی ہر موج جذب ہو گئی ہو۔ کچھ عرصہ بعد "پاکستان رائٹرز گلڈ" کا قیام، گلڈ کے سیکرٹری، قدرت اللہ شہاب کی ادیبوں اور ان کی آزادی کے بارے میں تقریر، صدرِ پاکستان کا ادیبوں کو منشورِ آزادی، یہ تمام باتیں ایسی تھیں جنہوں نے احساسِ آزادی اور اس کے ساتھ احساسِ خودی کو بھی دوبالا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار ادیبوں اور شاعروں نے جلد ہی انقلاب سے غیر معمولی حد تک متاثر ہونے کا ثبوت دیا۔ اور وہ تب سے اب تک برابر ایسا ہی کرتے رہے ہیں کیونکہ ۲۷ اکتوبر کا انقلاب کوئی تنہا واقعہ نہ تھا جو ایک بار ہوا اور ختم ہو گیا، بلکہ عوام کو ہر اعتبار سے ان کا مرتبہ اور حقوق عطا کرنے کا منصوبہ تھا جس کے لئے تدابیر کا ایک بے پایاں سلسلہ لازم تھا۔ اسی لئے ادبا و شعرا اور اربابِ فکر و فن کا تاثر بھی ایسے ہی مستقل و مسلسل رہا۔ قومی زندگی اور ادب و فن کے دھارے پہلی بار زور و شور سے ایک ساتھ مل کر بہنے لگے جس کے آثار ہمیں ان کی ہر صنف اور ہر شعبے میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا قطرۂ روشن جو رفتہ رفتہ کہکشاں در کہکشاں بنتا گیا۔ حکومت کی معارف پروری، ادیب نوازی اور سرپرستیٔ فن نے بلاشبہ ادب و فن کو حیاتِ تازہ ہی عطا نہیں بلکہ ان کے لئے مہمیز ثابت ہوئی ہے۔ دو سال کے مختصر عرصہ میں اس قدر وسیع، دوررس اور نتیجہ خیز اقدامات کا شاندار زنجیرہ کسی بھی حکومت اور قوم کے لئے مایۂ ناز ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس زنجیرے کے بالمقابل ایک ایسا ہی وقیع ادبی، فنی اور ثقافتی زنجیرہ، تا حدِ نظر بے شمار سنہری کڑیوں کا سلسلہ، یا اس اجالے کے پیشِ نظر جو نئے دورِ انقلاب میں جلوہ نما ہوا ہے، قطار اندر قطار شمعیں، دلبو، صف بہ صف۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔ اور اسی ہی کے الفاظ میں، ان سے مستقبل کے پیشِ نظر گزرگاہِ خیال بھی چراغاں ہے۔

غرض یہ حقیقت ہے کہ دورِ انقلاب کے ساتھ فضا یکلخت چمک اٹھی۔ اور اس کے ساتھ شعرا و ادبا کا ذہن بھی۔ ادھر حالات میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوئی۔ ادھر شعر و ادب میں بھی ایک متوازی ہلچل رونما ہوئی۔ قومی جذبات میں خوب لہر پیدا ہوئی، اور واقعات کی ڈرامائی نوعیت نے انہیں بھی مہمیز کیا۔ عوام کے صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے زیادہ متحرک اور جاذبِ نظر شخصیت اور کون ہو سکتی تھی جو شعرا و ادبا کو تحریک دلائے؟ پھر جہاں قومی شاعری کے جوہر چمک اٹھے وہاں صحافت اور ادب میں بھی جان پڑ گئی، خصوصاً افسانہ، ناول اور رپورتاژ جیسی اصناف میں

جو حالات و واقعات اور اس قسم کے ڈرامائی حالات و واقعات کی عکاسی کے لئے اسی طرح موزوں اور فی الفور اثر پذیر واقع ہوئے ہیں جس طرح شاعر کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے اکتوبر کا انقلاب۔ عوام کا اپنا انقلاب ۔۔ انہیں اس قدر محبوب تھا کہ یہ ایک دو ہفتوں میں ہی شعرا کا چہیتا موضوع بن گیا۔ جب وہ اپنے نئے ماحول پر نظر ڈالتے تو جہاں پہلے تاریکی ہی تاریکی تھی وہاں روشنی ہی روشنی نظر آتی اور جہاں پہلے محرومی و بے چارگی اور جبر و استبداد کا دور دورہ تھا وہاں آزادی ہی آزادی دکھائی دیتی۔ صہبا اختر کی نظم "طوفانِ نیل" ایک تاریخی مثال کے ضمن میں پاکستان کی غلامی و آزادی کا ماجرا پیش کرتی ہے۔ اور ایسے پیرائے میں جس سے ندرت نمایاں ہے۔

یہ طوفانی لے یہیں نہیں رک گئی بلکہ اور بھی آگے بڑھی۔ یہاں تک کہ یہ ملک کے کتنے ہی نامور شعرا کو اپنی رو میں بہا لے گئی جن میں سے بعض صفِ اوّل کے شعرا ہیں مثلاً ابوالاثر حفیظ، اسد ملتانی، سید ضمیر جعفری، قیوم نظر، قتیل شفائی۔ آغا صادق نے آزادی کو "سازِ صد آہنگ" قرار دیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس نئے دور میں سب نے "آزادی کی سریلی دھن پر ساز بجائے" ہیں۔ ابوالاثر حفیظ انقلاب کے سربراہ، محمد ایوب خاں، کی حرکی روح سے متاثر ہو کر فوجی دھن میں نغمہ سرا ہوئے۔ "شاہنامۂ اسلام" کی مانوس لَے "صبحِ صادق" میں پھر ابھری۔ احسان دانش نے پرانے پیمانوں میں انقلاب کی نئی شراب پیش کی۔ اس کے ہمنواؤں میں شورش کاشمیری، قیوم نظر ۔۔ حمید نسیم اور محشر بدایونی بھی ہیں۔ انہی کے ساتھ فیروز الدین فیروز، فیروز نظر اور رفیق جمال رعنا کی نئی آوازیں بھی ابھریں۔ نظر حیدرآبادی (جس نے قومی نظموں کا ایک پورا مجموعہ ترتیب دیا ہے) نے بعض نظموں میں دورِ استبداد اور دورِ انقلاب کا بڑا خوش اسلوبی سے موازنہ کیا ہے۔

ہمایوں (؟) بخت مجرم تخت آرائے حکومت تھے
لیڈروں کو بھی ملت کا نگہباں ہم نے دیکھا ہے
خدا کا شکر اب وہ رسم انداز کہن بدلی!
نئے ساقی نے بنیادِ بساطِ انجمن بدلی
کچھ اس انداز سے تقدیرِ اہلِ علم و فن بدلی
کہ اخترِ ہر سخنور کا فروزاں ہم نے دیکھا ہے

اسد ملتانی نے ۲۷ اکتوبر کا کس شوق سے خیر مقدم کیا ہے:۔
زمینداروں کی بھی جاتی رہی سب آسمانداری + کھا نشین گئے وارث بڈھیوں چھا آیا

ضمیر جعفری نے ایک مستقل مجموعہ "لہو ترنگ" جس کی صدر پاکستان نے خاص طور پر قدر دانی کی اور متعدد منظومات کے علاوہ اپنے مخصوص فکاہیہ انداز میں بدلتے ہوئے حالات کا نقشہ "زندگی کی جھلکیاں" میں پیش کیا ہے۔

پرانے جادہ پیماؤں کے ساتھ کئی نئے رہ نورد بھی سرگرم سفر نظر آتے ہیں۔ منظر اکبرآبادی، صادق نسیم، حمایت علی شاعر وغیرہ۔ آخر الذکر نے انقلاب پر بکثرت نظمیں لکھی ہیں جن میں خاصی شعریت ہے۔

عاصمہ حسین ایک نئی شاعرہ ہے جو اس سے پہلے بھی اردو شاعری کو متعدد جواہر پارے عطا کر چکی ہے۔ دور انقلاب میں اس کی دو نظمیں "پھر آئی بہار تازہ" اور "پاک سی حرفی" نمایاں وقار کی حامل ہیں۔

حنیف طاہر نے انقلاب کے متعلق دو خاصے کی چیزیں پیش کی ہیں۔ "ستارۂ انقلاب" اور "پیغام کے بعد" جو مشرقی پاکستان کا بہت ہی دلفریب مرقع ہے۔ ان دونوں نظموں کی بھرپور شعریت کا اندازہ بسیط مطالعہ ہی سے ممکن ہے۔

دور انقلاب کی عکاسی میں صہبا اختر کو بھی کافی دخل ہے جس نے متعدد نظموں "تیرگی سے روشنی تک" "مرگ خواجہ" "پرانی حویلی" "صبح دلآویز" اور "صبح در صبح" میں شاعری کو خاصے بلند مقام پر پہنچایا ہے۔

انقلاب کا ہر بڑھتا ہوا قدم شاعروں کے لئے ایک پرزور دعوت ثابت ہوا۔ اور بنیادی جمہوریت کے سلسلہ میں سربراہ قوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا تاریخی دورہ مشرقی و مغربی پاکستان واقعی شاعروں کے لئے ایک قوی محرک ثابت ہوا۔ اس سلسلہ میں "صبح در صبح" (صہبا اختر) "رہ نورد شوق" (رئیس امروہوی) اور "ستارۂ گیتی خرام" (جمیل نقوی) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن کا شمار ہماری بہترین قومی منظومات میں ہے۔ جمیل نقوی، صہبا اختر، سید فیضی اور عبدالرؤف عروج وہ شاعر ہیں جو انقلاب سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے ایسے نقوش پیش کئے ہیں جن کی فنی حیثیت خاصی بلند ہے۔

ان کے علاوہ کئی شاعر اور بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً انقلاب پر قلم اٹھاتے رہے ہیں اور قابل قدر نقوش پیش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً باقی صدیقی، احمد ظفر، بشیر فاروق، اثر جلیلی — محمد صادق شاذ اور مشتاق مبارک۔

اس سے پہلے شاعر و ادیب خصوصاً افسانہ نویس ہمیشہ مقصدی تحریروں سے گریز کرتے تھے۔ انقلاب نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی جس سے وہ خود بخود ایسی تخلیقات کی طرف مائل ہو گئے۔ غالباً یہ انقلاب کی قدرتی نوعیت کا نتیجہ تھا یا اس واقعیت کا جو اس کے باعث پیدا ہوئی۔ چنانچہ آج بھی اس موضوع پر برابر اعلیٰ درجے کی نظمیں اور افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ شعرا کی طرح کئی ممتاز افسانہ نگار بھی اس سے کچھ کم متاثر نہیں ہوئے۔

سب سے پہلا ممتاز افسانہ نگار جس نے نئے حالات پر قلم اٹھایا "انور" تھا۔ اس کے سابقہ مجموعوں "منزل کی طرف" اور "آگ کے آغوش میں" سے صاف ظاہر ہے کہ دور انقلاب نے اس کے افسانوں میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ "کند" "ڈوب ڈوب کے ابھری ناؤ" "کوئی ہاؤس میں دو نقاد" ایسے افسانے ہیں جو انقلاب ہی نہیں فن کے سلسلہ میں بھی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

عنایت اللہ ایک اور افسانہ نگار ہے جس کے ذہن پر انقلاب ہی انقلاب چھایا ہوا ہے۔ اور اس نے افسانہ نویسی کی وہبی صلاحیت اور ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر متعدد افسانے "آئینہ" "ڈوبتا سورج" اور "پسپائی کی آخری رات" لکھے ہیں جن میں انقلاب سے پہلے اور بعد کا زمانہ یوں قریب آ جاتے ہیں جیسے ہم انہیں کسی بڑی طاقتور دوربین سے دیکھ رہے ہوں۔ یہی کیفیت زیادہ وسیع پیمانے پر اس کے دو غیر مطبوعہ ناولوں "طاہرہ بیٹی" اور "ایک شہر ہزار افسانے" میں نظر آتی ہے

واقعیت کے ہمہ گیر اثر سے احمد ندیم قاسمی بھی متاثر ہوا ہے۔ اس نے "اصول کی خاطر" میں کسانوں کی بدلی ہوئی دنیا کا نہایت عمدہ نقشہ پیش کیا ہے ایک اور مشاق افسانہ نویس، ابو سعید قریشی نے بھی یہی اثر قبول کرتے ہوئے چند افسانے لکھے ہیں۔ "چودھری" میں آزادی جمہور کی جھلک بخوبی نمایاں ہے۔

انقلاب سے متعلق افسانے لکھنے کا عام رجحان ایک نئے افسانہ نگار محمد عمر میمن کے متعدد افسانوں میں بھی منعکس ہے۔ جس نے "کالے میگھا پانی د" اور "غنچے چٹکے آدھی رات" میں دو بڑے ہی عمدہ مطالعے پیش کئے ہیں۔

شوکت تھانوی جیسے ممتاز صحافی نے بھی ڈگر سے ہٹ کر ایک دو چیزیں ادبی رنگ میں پیش کی ہیں اور اپنے مخصوص چٹخارے دار پیرائے میں "م... پیارا بھتیجہ" اور "تشخیص مرض"۔

یونس احمر کی بدولت ہمیں مشرقی پاکستان میں زرعی اصلاحات کے انقلاب آفریں اثر کی جھلک "جب دھان کے خوشے لہرائے" میں نظر آتی ہے

جمیل الدین عالی انقلاب سے پہلے محض شاعر تھا۔ انقلاب نے اس میں بھی ایک نئی روح پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" قائم کر کے ادیبوں اور شاعروں کو جگانے کے علاوہ اس نے "نئی کرن" میں انقلاب کا نقشہ بھی کیا ہے۔ جو خاصا دلچسپ ہے اور اس کی داد کچھ اسی پیرائے میں دی جا سکتی ہے ابن انشا نے اپنے پرلطف اسکیٹ "کتے کا کاٹا" میں اختیار کیا ہے۔ ابن انشا خود بھی "بڑے بازخاں سے نیک محمد تک" میں زرعی اصلاحات اور بنیادی جمہوریت پر ایک نہایت شگفتہ مضمون لکھا ہے۔

ایک اور نامور ادیب، شاہد احمد دہلوی بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہا۔ اس نے بنیادی جمہوریتوں کے متعلق اپنے تاثرات ایک دلچسپ مضمون کی شکل میں پیش کئیں۔

ممتاز مفتی جیسا ماہر فن بھی اس معاملہ میں اپنے نامور معاصروں کا ہمنوا رہا ہے۔ اس کے بنیادی جمہوریتوں اور جمہوریہ اسپیشل پر مضمون ادیبوں کے عام تاثر کی عکاسی کرتے ہیں جس کی جھلک رضا ہمدانی کے ایک رپورتاژ میں بھی نظر آتی ہے۔

ان سب سے بڑھ کر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی انقلاب اور اس کے مایۂ ناز سربراہ کا ذکر سنہری الفاظ میں کیا ہے۔ جو کچھ انہی کی زبان سے لطف دیتے ہیں۔

بہار کی ولولہ آفریں روح بعض اور زندہ دل گرم جوش ادیبوں کو بھی گدگدائے بغیر نہیں رہ سکی، مثلاً منظور عارف، تسلیم عارفی، احسان ملک۔ خوشی و خرمی کی جو لہر دورِ انقلاب میں نظر آتی ہے، اس نے ان نوجوانوں کی طبیعتوں میں ایک نئی ترنگ پیدا کر دی ہے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں بھی ایک خاص شگفتگی نظر آتی ہے اور قلم میں ایک نیا انداز خرام۔

اگر ان گوناگوں مظاہر کے ساتھ، جو خالصتاً قومی ہیں، علمی و ادبی مظاہر بھی شامل کئے جائیں جو کمیت و کیفیت کسی اعتبار سے بھی کم وقیع نہیں، مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ کی تنقیدی تصانیف، عبدالعزیز خالد کے متعدد شعری مجموعے، غلام عباس کی "جاڑے کی چاندنی"، غلام الثقلین نقوی کے مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے اچھوتے افسانے، صادق حسین کے تر و تازہ افسانوی نقوش۔ اور متعدد رسائل و جرائد "صحیفہ"، "نقوش"، "نیا دور"، "ادب لطیف"، "افکار" اور "ماہِ نو" کی علمی و ادبی پیشکشیں تو ان سے دورِ انقلاب کی سرگرمیوں کا ایک خاصا بلند درجہ قائم ہوتا ہے۔ اور ابھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر یہی کیفیت رہی تو ہم تھوڑے ہی عرصہ میں شعر و ادب کے ایک زریں دور کی توقع کر سکتے ہیں ✦

یونس احمد

انقلاب جب بھی، جس ملک میں اور جس دور میں بھی آیا اُس کے اثرات انسانی معاشرے کے علاوہ شعر و ادب میں بھی نمودار ہوئے۔ ادب براہ راست انقلاب سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ خواہ یہ انقلاب اپنے دامن میں خوش آیند زندگی کے گلہائے رنگا رنگ لیکر آئے یا تباہی و بربادی کے لاؤ لشکر۔ لیکن چونکہ حیاتِ انسانی اس انقلاب کے لئے چشم براہ رہتی ہے اور اس کے لئے مسلسل جد و جہد کرتی ہے جس کے پاؤں کے گھنگروؤں سے امن، خوش حالی، ترقی اور سلامتی کے نغمے برستے ہیں، اسلئے ادب اس انقلاب کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اردو ادب کی طرح بنگالی ادب بھی تحریک پاکستان سے متاثر ہوا۔ ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۵۲ء تک کے بنگالی ادب کا خصوصاً مطالعہ کیجئے تو اس پانچ سال کے قلیل عرصے میں اچھا خاصا مواد مل جائے گا جس کا تعلق تحریک پاکستان یا تحریک آزادی سے ہے۔ شاعروں نے نظمیں کہیں اور گیت لکھے، افسانہ نگاروں نے کہانیاں لکھیں، مضمون نگاروں نے مضامین قلمبند کئے۔ اور پھر ۱۹۴۷ء کے بعد سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک کا ادب پڑھا جائے تو آپ کے مطالعے میں بیک وقت کئی چیزیں آئیں گی۔ کبھی امیدوں کے دیئے جگمگاتے ہیں پھر ٹمٹمانے لگتے ہیں، کبھی مایوسیاں سر اٹھاتی ہیں اور در و دیوار سے نالہ و شیون سنائی دیتے ہیں۔ کبھی زندگی شبِ تار کا لبادہ اوڑھ کر موت کا رقص پیش کرنے لگتی ہے، کبھی دہقان کے لہلہاتے کھیتوں اور ندیوں کی سیمیں لہروں سے شادمانی و مسرت کے گیت بلند ہوتے ہیں اور آنسوؤں کے مینہہ برساتے ہیں، کبھی کال پڑتا ہے، کبھی ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کی وبائیں نازل کی جاتی ہیں۔ آرام اور چین، سکھ اور امن، مسرت و شادمانی کہیں نہیں۔ ملاحوں کے گیتوں کی اڑان آب رواں کی سبک سبک لہروں کو چھو کر اوپر نہیں اٹھتی ہے۔ کاشتکار نئی فصل کی تقریب دھوم دھام سے نہیں مناتے ہیں — وہ جانتے ہیں کہ ان کی محنتوں کا پھل ان کے لئے نہیں کسی اور کے لئے ہے۔ مسلسل افراط و تفریط اور لوٹ کھسوٹ نے ان کے حوصلوں کو شکست دیدی ہے۔

لیکن اکتوبر ۵۸ء کے انقلاب کے بعد سے جہاں ہمارے معاشرے میں نمایاں اور خوشگوار تبدیلی آئی وہاں ادب کی ہر صنف بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بنگالی ادب پر خصوصاً اس انقلاب کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اس سلسلے میں جسیم الدین کے ایک گیت کا ترجمہ درج ذیل ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ شاعر کے دل میں کیسا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے اور اس کے احساسات کے افق پر کیسی آفتاب کی ضیا پاشی ہو رہی ہے:

وہ لوگ جو میرے اپنے ہیں،
وہ لوگ جو میرے دل اور روح ہیں
وہ لوگ جو میرے وطن کے انسان ہیں
میں ان ہی کو سوچ سمجھ کر ووٹ دوں گا
بازار میں تو انسانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے ہیں
پر دل کو جن سے لگاؤ ہے ان کی تعداد دو ایک سے زیادہ نہیں۔
ان کو بآسانی پہچان نہیں سکتے۔
گھر بنانے کے لئے ایسا مزدور چاہئے جو اپنے ہنر میں پختہ ہو

دریا عبور کرنے کے لئے ایسا مانجھی چاہیئے جو جوار بھاٹا کی خبر رکھتا ہو۔

وطن کی خدمت کے لئے ویسے تو صدہا افراد اپنے آپ کو پیش کریں گے۔

لیکن ان میں صرف دو چار ہی بے لوث اور ایماندار ہوں گے۔

ان ہی کو سوچ سمجھ کر ووٹ دونگا!

جو اپنے قول و فعل میں واقعی پختہ ہیں

وہی ہمارے معاشرے کی ناؤ کے پتوار کو اپنے ہاتھوں میں لیں گے۔

ان ہی کو سوچ سمجھ کر ووٹ دوں گا!

بھائیو، جس کا جو کام ہے وہ اسی کو زیب دیتا ہے،

بڑھئی چھپر نہیں بنا سکتا اور نہ چھپر بنانے والا بڑھئی کا کام کر سکتا ہے۔

جو جس کام کے لئے بنا ہے میں اس کو وہی کام سونپوں گا۔

ایسا ہی انسان طوفان اور آندھی میں دریا پار کر سکتا ہے۔

ایسے ہی لوگوں کو سوچ سمجھ کر ووٹ دونگا!

جسیم الدین کے اس گیت میں مشرقی پاکستان کے تمام افراد کی آواز گونج رہی ہے۔ اب یہ لوگ اُن سیاست دانوں سے دھوکا نہیں کھا سکتے جنہوں نے ان کے کھیتوں کو بارہا ویران کیا ہے اور جو مصنوعی کال پیدا کر کے ان کی زندگیاں برباد کرتے رہے ہیں۔ ان کے ہونٹوں کے وہ راگ جن میں کبھی حیات افروز جذبے پروان چڑھتے تھے مردہ ہو چکے تھے۔ ان کے دلوں کی ترنگیں دھواں بن کر فضا میں بکھر گئی تھیں۔ ان کی دلہنوں کی نازک کلائیاں چوڑیوں سے خالی ہو چکی تھیں۔ ان کے بچے ننگ دھڑنگ رہتے تھے۔ جسیم الدین اس کال کوٹھری سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لیتا ہے اور اپنے ہموطنوں سے مخاطب ہوتا ہے:۔

وہ لوگ جو میرے اپنے ہیں،

وہ لوگ جو میرے دل اور روح ہیں،

میں ان ہی کو ووٹ دوں گا

مشرقی پاکستان کا ایک اور حساس شاعر فرخ احمد بھی اپنے ہموطنوں کو للکارتا ہے:۔

میرے ہموطنو، میرے دوستو، ہشیار!

ایسے رہنما کا ہرگز انتخاب نہ کرو

جس نے قوم کے مستقبل کی پروا نہ کی

جس نے ملک کی قسمت کو روند ڈالا

جس کا کھیل محض خودغرضی رہا ہے

جس نے قوم کی امیدوں کے گلاب مسل ڈالے

جس نے سروں پہ دُکھوں کے بادل لہرائے

جس کی وجہ سے گھر گھر فریادیں گونجنے لگیں

جس نے ملک کو تباہ و برباد کر ڈالا۔

جس نے پاؤں میں موت کی بیڑیاں پہنا دیں

میر جعفر اور میرن کا دوست

جس نے موقع پا کر خنجر سے وار کیا اور کلیجہ نکال دیا!

یہ اس فرخ احمد کا انتباہ ہے جس نے پاکستان بننے سے پہلے بھی "سات سمندر کے مانجھی" جیسی معرکہ آرا نظم لکھ کر قوم کو بیدار کیا تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنی آتش نوائی سے بنگال کے مسلمانوں کی سرد رگوں میں گرم لہو دوڑایا ہے۔ آزادی کے بعد بھی جب تھوڑی مدت کے لئے ترقی و کمال کا آفتاب اپنی کرنیں پھیلا کر گہنا گیا تو اس کے احساسات اُسے برابر جھنجھوڑتے رہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس خونیں تماشہ کو دیکھتا رہا جس نے اس کے ملک کو کنگال بنا دیا تھا۔ وہ ان آوازوں کو سنتا رہا جن میں فریب کاریاں تھیں —— اور وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہا لیکن اب جبکہ انقلاب اکتوبر کی وجہ سے بدلیاں چھٹ گئی ہیں اور ترقی و کمال کا آفتاب ضو افشاں ہے، وہ ببانگ دہل اپنے ہموطنوں کو اُن رہنماؤں سے ہشیار کر رہا ہے جنہوں نے اُن کی ہر تمنا کو روند ڈالا تھا۔

ایک اور شاعر اظہر الاسلام کے ہونٹوں پر یہ گیت لہرا رہا ہے،

آج میں اپنی زندگی کے سارے دکھ درد بھول چکا ہوں۔

آج کائنات کتنی حسین نظر آ رہی ہے،

دکھ کی شبِ تار آ بھی جائے تو میں صبحِ صادق یا نورِ مہتاب کی خواہش کروں گا!

اب چاروں اُور آنسوؤں کی برکھا کیوں ہو؟

دکھوں کی جتنی ندیاں ہیں میں ان سب کو عبور کر جاؤں گا!

میں دھرتی پہ بیٹھ کر ایسے نغمے بکھیروں گا جن میں خوشی و مسرت
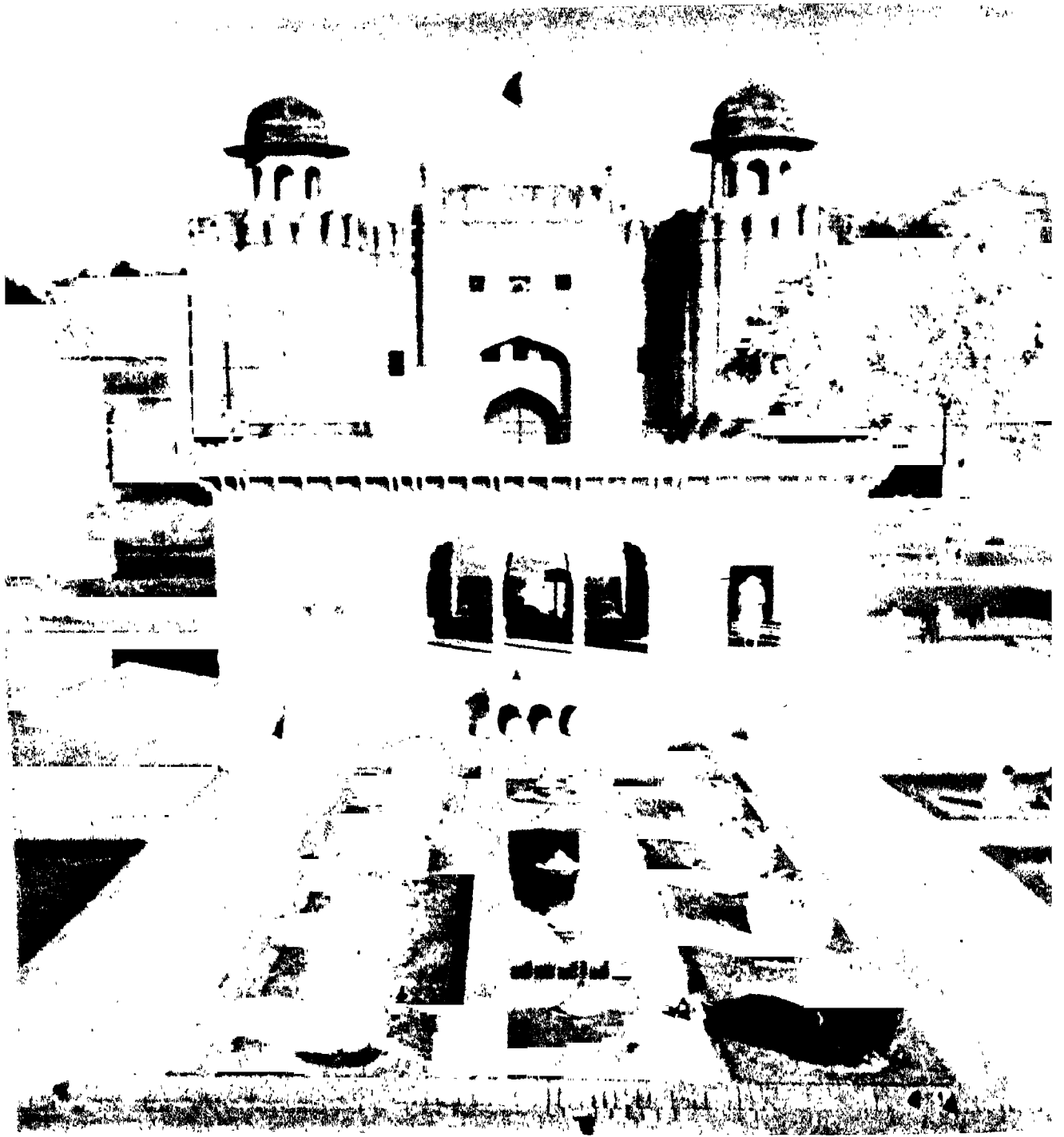
قلعہ (لاہور): ہمارے شاندار ماضی کا آئینہ دار — رنگین عکس: اسماعیل صدیقی

کی چہکار رہوا

آج میرے من کے بن میں خواب کی چت چدریری آئی ہے،
جو لے گئی ہے مجھ کو خواب سے جگا کر خاموش تنہائی میں!
اس نے دکھ درد بھلا کر سکھ کے چراغ جلا ڈالے ہیں
اور اب وہ میرے ساتھ سرمستی و سرخوشی میں رقص کناں ہے!

شاعری کے علاوہ افسانوی ادب پر بھی انقلاب اکتوبر کا خاصہ اثر ہے۔ کمال بن مہتاب کے افسانہ "پیغامِ امن" کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

"حصول آزادی کے بعد بھی چند برسوں تک احمد علی فوج میں ملازمت کرتا رہا اس کے بعد میعاد پوری ہو گئی تو اس نے چائے کی دکان کھول لی۔ دکان چھوٹی سی تھی مگر احمد علی اُسے صاف ستھرا رکھتا تھا۔ ڈائیننگ ٹیبل پر دیس بدیس کے اخبار و رسائل بھی ہوتے۔"

"سڑکوں کی بتیاں جلا دی گئی ہیں۔ لوگوں کی آمد و رفت اب بھی کم نہیں ہوئی ہے لیکن سیاسی جماعتوں کے دفتروں میں تالے پڑ جانے سے عوام کے اندر کچھ خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ بوڑھے سرکاری کلرک امین اور اس کے بیکار گریجویٹ لڑکے اکبر کے دلوں میں امیدوں کے بلبلے بنتے ہیں اور ٹوٹتے جاتے ہیں۔"

"کیا زندگی میں ایک بار پھر عزائم بیدار ہوں گے؟"

"اس سے پہلے بھی اختیارات ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہے ہیں لیکن عوام کی زبوں حالی میں کوئی فرق نہ آیا۔ تبدیلی جتنی بار بھی ہوئی، اندھیرا اور گہرا ہوتا گیا۔ محلوں کے کنگورے بلند ہوتے گئے، کٹیاؤں کی دیواریں گرتی گئیں۔ باپ اپنی کنواری بیٹی کے لئے ساڑی خرید نہ سکا، معصوم نے دو سال پہلے جس کے ساتھ عہد و پیمان کئے تھے وہ ایفا نہ ہو سکے۔"

"ہاشم علی نے گورستاہا کی دکان سے بھنا ہوا چاول خریدا تھا اس کو پھانکتے پھانکتے اس نے دل ہی دل میں سوال کیا — "اس زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے؟"

"مقصد؟" احمد علی کو ہنسی آ گئی تھی — "ہاں اس کا بھی ایک مقصد ہے — بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی زندگی کو گھسیٹتے رہو۔"

"آپ ہنستے ہیں؟"

"اور کیا کروں گا۔ آجکل آنسو جو نہیں آتے۔"

کاؤنٹر سے اٹھا کر احمد علی نے ریڈیو سیٹ کو ٹیبل پر رکھ دیا تاکہ تمام لوگ اطمینان سے سن سکیں۔ یکایک انقلاب کے ایک عظیم رہنما کی آواز گونج اٹھی۔

"بھائیو! اس بار آپ کی فوج آپ کی خدمت کے لئے میدان میں آئی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ملک تباہ ہو چکا تھا بھوک، بدحالی، لوٹ مار......"

"میں آپ کی فوجوں کی طرف سے آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی....."

ہاں عوام یہی چاہتے تھے!

یہ آواز احمد علی کیبن سے لیکر گلی کوچوں، سڑکوں، گاؤں، شہروں میں گونجتی رہی اور رات کے آسمان کی چھاتی چیرتی رہی۔

احمد علی نے امید و یقین کی سانس لی۔ "ہاں فوجی بات کے بھی دھنی ہوتے ہیں۔"

غرض بنگالی ادب کی ہر صنف انقلاب اکتوبر سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ اس کا اثر ڈراموں اور اسٹیج پر بھی پڑا ہے۔ دو سال کے عرصے میں مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں جو ڈرامے اسٹیج کئے گئے ہیں ان کا بنیادی تخیل انقلاب اکتوبر ہی رہا ہے۔

جگر مرحوم

اس شاعرِ عظیم غزل گو کی موت پہ
ہر اک دلِ فگار پہ غم کا نشان ہے
کیسے کہیں نہ مرگِ جگر پر تمام لوگ
(۳۶)
مرگِ جگر ہے مرگِ غزل کا گمان ہے

(۱۹۲۴)

(۱۹۶۰ = ۱۹۲۴ + ۳۶ء) (خاور)

بحث: پاکستانی ادب کی تشکیل

(۲)

خیال مینائی

ادب کا مقصد کیا ہے؟ وہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان ہے یا الحمرا آرٹس کونسل کے حسن و جمال کی تصویر؟ نامور شعرا مثلاً کالی داس، شیکسپیئر، گوئٹے، استفانے ملارمے، امراء القیس، حافظ شیرازی، صباح الدین علی، علامہ اقبال اور قاضی نذر الاسلام میں سے کس کس کے فن میں وطنیت جلوہ گر ہے؟ اور کیا آج کے ایٹم اور میزائیل کے دور میں جبکہ ساری دنیا سمٹ کر ایک بن گئی ہے، ملکی و قومی ادب کی تشکیل ممکن ہے؟

ادب زندگی کا عکاس ہے اور زندگی ادب کو تخلیقی مواد فراہم کرتی ہے لیکن بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے فن کار کا خود سے محبت کرنا لازم ہے۔ اپنے آپ کو غایتِ تخلیق سمجھ کر۔ کامیٹن کے یہ الفاظ ہماری بڑی رہنمائی کرتے ہیں کہ جس چیز کی یہاں ضرورت ہے وہ خلاق تخیل ہے۔

ادب کے متعلق یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس کا مقصد فلاح و عافیت ہے۔ مشیت نے کہا کہ اجالا ہو . . . . اور وہ ہو گیا! عوام حیات کا سرچشمہ ہیں اور ادب اس سرچشمہ کی نرم و نازک سی وہ موج ہے جو زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی۔ افلاطون نے اس کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ شاعر بلا شبہ پرواز کی اہلیت رکھنے والی ایک انتہائی لطیف برگزیدہ ہستی ہے۔ وہ اس وقت تک کسی ایسی چیز کو جسے شاعری کا نام دیا جا سکے معرضِ وجود میں نہیں لا سکتا جب تک کہ اس پر وجد طاری نہ ہو جائے۔ یا یوں کہئے جب تک وہ جذبہ کا شکار نہ ہو جائے۔ استدلال کی موجودگی میں اس کے لئے شعر گوئی ناممکن ہے۔" خونِ جگر کے بغیر شاعرِ مشرق کے الفاظ میں سچا اور تخلیقی ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔

عاکی نے لکھا ہے کہ "پاکستان کے ابتدائی زمانے میں تو بے شک اچھا اور اعلیٰ مقصدی ادب آپ ہی آپ پیدا ہوا لیکن اس کے بعد لکھنے والے یا تھک گئے یا بھٹک گئے۔" مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میری رائے میں پاکستان بننے کے فوراً بعد جن ادیبوں کے فن پارے منظرِ عام پر آئے انہوں نے اچھا اور مقصدی ادب کم اور الیا اہرن برگ کے خوابوں کی تعبیر میں ہنگامی اور اخباری ادب زیادہ پیدا کیا۔ اس دور کے شاعروں میں میراجی، فیض، احمد ندیم قاسمی، حفیظ ہوشیارپوری، شور علیگ، مجید امجد، مختار صدیقی، جعفر طاہر، عدم، قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری، سید فیضی، راشد اور عارف عبدالمتین وہ شاعر ہیں جو پاکستان کے حصے میں آئے یا انہوں نے اس خطۂ زمین کو اپنا وطن بنا[یا]۔ اس دور کے لکھنے والوں نے آزادی کی جو تصویر کھینچی ہے وہ صد درجہ بھیانک ہے۔ یاسیت کے یہ امام آزادی کا خیر مقدم یہ کہہ کر ہی کرتے رہے کہ

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے۔

عارف عبدالمتین نے اس دور میں جو نظمیں لکھی ہیں ان میں نہ جذبہ ہے نہ تا[ثیر] نہ سادگی ہے اور نہ آفاقیت۔ لیکن جس ادب کو اچھا اور تخلیقی کہا گیا ہے اس کی دو[1] مثالیں تحریر کرتا ہوں:

"ہوا کا تیز اور تند جھونکا ہے سخت ناداں
پلٹ کے اک بار بھی نہ دیکھا
افق سے خورشیدِ زندگی سرخ پرچموں کی حسین چھاؤں میں بڑھ رہا ہے
یہ موت کی اژدھا صفت انجمن ابھی جگمگا اٹھے گی،
ذرا نہ سوچا
یہ شمعِ ہستی تو اپنا کارِ عظیم انجام دے چکی ہے
تمام شب جھلملا چکی ہے
اسے بجھانے سے فائدہ کیا - خرامِ خورشیدِ زندگی تو نہ رک سکے گا"

اس کا موضوع ظاہر ہے۔ اس میں اہلِ پاکستان کو یہ مژدہ سنایا گیا ہے کہ ان کا کارواں اشتراکیت کی آغوش میں رواں دواں [ہے] اور صرف اسی پر منحصر نہیں، شاعر نے اپنی ایک اور نظم میں صاف صاف ک[ہا]

---

[1] اس معیار پر بے شمار نظمیں پوری اترتی ہیں بلکہ ان کا درجہ اس سے کہیں زیادہ بلند [ہے۔] دوسرا پارہ خصوصیت سے بہت معمولی ہے۔ (مدیر)

اس دور کا سب سے بڑا قائد اور رہبر کون ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ ہے اور
ملک کے عوام کی برابر رہنمائی کر رہا ہے:۔

"عظیم باپ ترے واسطے ترے فرزند
عقیدتوں کے شفق رنگ پھول لائے ہیں
نجانے کون سا احساس ضوفشاں ہے کہ دل
اُبھرتے چاند کے مانند جگمگائے ہیں"

"عظیم باپ" کا اشارہ بابائے ملت کی طرف نہیں بلکہ ایک غیر ملکی
رنگ کی طرف ہے پھر اس ادب کو سچا، بڑا اور تخلیقی ادب کس طرح قرار دیا
جاسکتا ہے؟ میری رائے میں علامہ اقبالؒ کے بعد اردو شاعری میں آج تک
ہمہ گیر، سچا اور بڑا ادب تخلیق نہیں ہوا ہے۔

رہا یہ سوال کہ پاکستان بننے کے بعد لکھنے والے تھک گئے اور
ادب میں جمود آگیا۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے لیکن اس میں بھی
خلاف کے پہلو مضمر ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ہم جس معاشرہ میں
زندگی گذار رہے تھے وہ ایک نمو پذیر اور ترقی پسند ادارہ تھا۔ آزادی
اور حریت کی جو روح علی برادران نے ملتِ اسلامیہ کے جسدِ مردہ میں
پھونکی تھی، اس میں قائدِ اعظم اور شاعرِ مشرق کی صلاحیتوں نے برگ و بار
پیدا کئے۔ اسی طرح آزادی کی شدید ضرورت کا احساس غیر مسلم عوام کی
روحوں میں اتر چکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب میں ایک طرف آزادی،
مساوات، حریت اور غیر ملکی سامراج سے ٹکرانے کی قوت جڑ پکڑنے لگی
اور دوسری طرف سرسیدؒ، حالیؒ، شبلیؒ اور اقبالؒ کی پیروی میں ادب کی
ہر صنف ترقی کی عظیم شاہراہ پر گامزن ہو گئی۔ اس سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ،
دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوہ، علیگڈھ، لکھنؤ،
اور لاہور کی ادبی درسگاہیں مشعلِ راہ ثابت ہوئیں اور چند سالوں ہی میں
اردو ادب مالا مال ہو گیا۔ یہ زندگی رواں دواں تھی کہ قیامِ پاکستان کا
اعلان ہوا اور ادب تقسیم ہو کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔ ادیبوں کے
تھکنے اور بھٹک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ایک نئے ملک میں
زندگی کے نئے تقاضے تھے لیکن معاشی ابتری نے ادیبوں کی تخلیقی صلاحیت
کو ہی نہیں خود ان کو مع ان کے متعلقین کے بھی نگل لیا۔ اب مستقبل میں
کوئی آثارِ کہن کا متلاشی ان قدیم مقبروں کا کھوج لگائے گا تو اسے اردو
ادیبوں کی گلی سڑی لاشیں فلم کمپنیوں کے ملبے اور نشر گاہوں کے اجڑے
مزاروں کی خاک سے لالہ و گل کی شکل میں نمایاں ہوتی نظر آئیں گی اور

ادبی مؤرخ یہ کہہ کر خاموش ہو جائے گا کہ:

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

علی نے ادب کی مقصدیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اچھا
ادب لازماً مقصدی ادب ہوتا ہے اور مقصدیت ایک غرض، ایک
اسکیم، ایک تحریک، ایک آدرش یا کسی بھی اکائی کا نام نہیں بلکہ مقصدیت
سے مراد ہے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی مسرت ___" یعنی ادب
ایک تحریک بھی ہے اور آدرش بھی۔ اور جب بھی اردو ادب میں کسی تحریک
کی عکاسی اور کسی آدرش کی روشنی نظر آئے گی وہ ادب خاص ملکی ادب
ہوگا۔ اس سے انکار نہیں کہ ادب میں مقصدیت ہونا چاہئے لیکن اس
نظریہ سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ ادب کو اقوامِ متحدہ کا منشور ہونا
چاہئے۔ "ہر اعلیٰ درجے کے فن کار کی نظر میں حقیقت کی بدلتی ہوئی شانیں
ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو کسی ایسے بندھے ٹکے اصول کا پابند نہیں
کیا جاسکتا جو کسی عارضی، سیاسی یا سماجی مصلحت کا نتیجہ ہو۔ اگر ادیب
کے لئے چند مخصوص اصولوں کی پیروی ضروری قرار دیدی جائے تو اعلیٰ
اور مقصدی ادب کبھی تخلیق نہیں ہو سکتا۔ اسٹالن کے روس میں وہ
ادیب جو ایک عرصہ تک سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف جد و جہد
کرتے رہے تھے، احتساب کے دور میں یا خاموش رہے یا پھر ان کی
تحریریں اخباری خاکے بن کر رہ گئے۔ عظیم روس میں پاسترناک کا حسرتناک
انجام دیدۂ بینا کے لئے درسِ عبرت ہے۔ ڈاکٹر ژواگو ایک ناول ہی
نہیں، ایک ادبی محضر ہے جس پر پاسترناک نے اپنے خون سے دستخط کئے
ہیں۔ روس کے ادبی جمود کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلا خوفِ تردید کہی
جاسکتی ہے کہ تخلیق کا کارنامہ صرف آزاد فضاؤں ہی میں انجام پذیر
ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر ہمیں ڈاکٹر یوسف حسین کے یہ الفاظ بھی یاد
رکھنے چاہئیں کہ "ادب کو یقیناً سماج سے بے تعلق نہیں ہونا چاہئے لیکن
اگر کسی سماج میں فن کار کو پوری آزادی میسر نہیں تو وہ جمالیاتی قدروں
کی تخلیق نہیں کر سکتا۔"

پاکستان میں خاص پاکستانی، یا زیادہ موزوں الفاظ میں، ملکی
ادب آج سے سالہا سال قبل تخلیق ہوا ہے جو ہمارا مقدس ورثہ ہے۔ وارث شاہ،
بلھے شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، علامہ اقبال، حسیم الدین اور نذرالاسلام
کا کلام خاص ملکی کلام ہے جس میں چناب اور جہلم کی روانی بھی ہے۔ پدما اور
میگھنا کا ابھار بھی ہے اور مہران کی طغیانیاں بھی ___ اردو ادب

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

فکاھیہ:

"مسدس بدحالی"

(انقلاب ملی اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے کی جھلک۔ ایک طویل نظم کے چند پارے)

سید ضمیر جعفری

سیاست کا ہر پہلواں لڑ رہا تھا — یہاں لڑ رہا تھا، وہاں لڑ رہا تھا
مقاصد کو زیر و زبر کر کے لڑنا — نتائج سے قطعِ نظر کر کے لڑنا
بیاں کے مقابل بیاں لڑ رہا تھا — "حسابِ دلِ دوستاں" لڑ رہا تھا
سنان و تبر تیز کر کر کے لڑنا — "اگر" کر کے لڑنا "مگر" کر کے لڑنا
ستارہ نظر مہ جبیں لڑ رہے تھے
سرِ عام پردہ نشیں لڑ رہے تھے
گماں پر لڑائی، یقیں پر لڑائی
جہاں ٹھن گئی بس وہیں پر لڑائی

مزاجوں میں یوں لیڈری آ گئی تھی — کہ ہر گھر کی اپنی الگ پارٹی تھی
مکیں گم شدہ تھے، مکاں لڑ رہے تھے — زمیں چپ مگر آسماں لڑ رہے تھے
کوئی شیر تھا تو کوئی لومڑی تھی — یہی اپنی لے دے کے انڈسٹری تھی
لڑائی تھی مقصود، ہاں لڑ رہے تھے — کہاں لڑنے والے کہاں لڑ رہے تھے
نہ منزل نہ جادہ نہ کوئی ارادہ
رضاکار کم اور لیڈر زیادہ!
فسادات کی سرخیاں اور بھی ہیں
"مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں"

وہ لیڈر بیانات برسانے والے — مرادیں بھتیجوں کی بر لانے والے
تعصب کا فتنہ ہوا پا رہا تھا — تغلّب کا پرچم کھلا جا رہا تھا
بہر کار بیوپار فرمانے والے — بٹیریں وزارت کی تھمانے والے
اُجالا، اندھیرے سے شرما رہا تھا — کہ سورج نکلتے ہی گہنا رہا تھا
بیاباں کو صحنِ چمن جانتے تھے
قیادت کو خوراکِ تن جانتے تھے
جو روندا کئے خاور و باختر کو
وہ پھر خیر سے لوٹ آئے تھے گھر کو!

مکانوں سے نکلے دکانوں کے جھگڑے — ملوں نے جنے کارخانوں کے جھگڑے
کوئی "نرم ریشے" کے کھلیان میں گم — کوئی "گرم گیہوں" کے گھمسان میں گم
بیانوں، زبانوں، ترانوں کے جھگڑے — فسانوں پہ ہم داستانوں کے جھگڑے
کوئی اپنے شہروں کے رومان میں گم — کوئی اپنی نہروں کے طوفان میں گم
قناتوں پہ اور شامیانے پہ جھگڑا
وہ جھگڑا کہ ہر دانے دانے پہ جھگڑا
یہ احوال اقران و امثال کا تھا
"قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا"

کوئی اپنے کلچر کو شلوار سمجھے — کوئی اپنی ساڑھی کو شہکار سمجھے
کوئی اپنی ٹوپی کو سردار سمجھے — کوئی اپنے طرّے کو طرّا سمجھے
عجب کیا اگر قافلہ کھو گیا تھا
حدی خوان، کوہان پر سو گیا تھا!

ستاروں کا کارواں

شجاع احمد زیبا

کچھ عرصہ پہلے ہمارے سامنے محض ایک شمعوں کی قطار تھی۔ اب
طار ستاروں کا کارواں بن چکی ہے۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے خبر نہیں کہاں
ہاں پہنچ گیا ہے۔ بس روشنیوں کا ایک سلسلہ جو برابر آگے ہی آگے
متا چلا جاتا ہے۔ اور افق پر نئی نئی تابانیوں کی خبر دیتا ہے، اس لئے کہ
ہمارا ستارۂ ملت پوری طرح روشن ہے۔ وہ ظلم نارروا اور مغلوکی و بد
کی تہہ بہ تہہ، تو بہ تو تاریکیاں، وہ سیہ باطن اندھیرے جو بداندیش
ست والوں کی شکل میں مشرق و مغرب پر چھائے ہوئے تھے، دور
گئے اور ان کی جگہ تابناک ستاروں نے لے لی — انقلابی حکومت
کارہائے نمایاں، رفاہی اصلاحات، حیات افروز ہنگاموں اور بے پناہ
میوں کے ستارے جو اپنی روزافزوں آب و تاب کے ساتھ دیار پاک کی پیشانی
مزین کر جگمگا رہے ہیں۔

یہ ہے دوش و امروز کا فرق۔ دوش تاریکیوں کا سیل بے کراں۔ امروز
نی کا بحر بے پایاں۔ کل کا پاکستان حقیقی معنوں میں پاکستان ہی نہ تھا۔
جائیکہ ہم اسے "اپنا" پاکستان کہہ سکتے۔ یہ تو دوسروں کا وطن تھا، غیروں
طن، بیگانوں کا وطن! ان خود غرض، مفاد پرست جونکوں کا وطن جو قوم
ون حیات چوس رہی تھیں، جو اپنے ہوتے ہوئے بھی بیگانوں سے بدتر
چکے تھے۔ اور جن کی قوم دشمن سرگرمیوں نے ملک کو تباہی کے کنارے
ڑا کیا تھا۔

بلاشبہ اگر ہماری خوبی قسمت سے ۲۷ اکتوبر کا معرکہ آرا انقلاب
وقت رونما نہ ہوتا تو وہ دیار پاک جسے قائد اعظم جیسی برگزیدہ ہستی اپنی
تھک جدوجہد سے وجود میں لائی تھی، جس کی خاک کو شہید ملت نے
اپنے خون سے سینچا تھا، جس کے لئے ہزارہا انسانوں نے جان و مال
بے اندازہ قربانیاں دی تھیں، جس کے لئے وہ آفات و مصائب کے
دہکتے ہوئے جہنم میں سے گزرے تھے، خبر نہیں کہاں ناپید ہو جاتا۔
ڈھونڈنے والی نگاہیں صفحۂ روزگار پر اس کا نام و نشان بھی نہ پاتیں۔

یہ انقلاب اکتوبر ہی کا معجزہ تھا کہ ہمارا ملک برقرار رہا۔ اور ہم آج آزاد
قوموں میں اپنے ستارۂ روشن پر نازکناں ہیں۔

پچھلے چند سال تاریخ عالم میں کتنے ہی ملکوں کو آزادی کی فضا میں ابھرتا
دیکھ چکے ہیں۔ ایسے ممالک جو ایشیا، افریقہ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بکھرے
پڑے ہیں۔ ان سب کو ان مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے جو آزادی کے لئے لازم
ہیں مثلاً اپنے آپ کو سنبھالنا، اپنے قدموں پر کھڑے ہونا، اپنی ضروریات کو
پورا کرنا، اپنی اقتصادی حیثیت کو استوار کرنا۔ ایسے ملکوں کو لامحالہ نئے تقاضوں
سے نبٹتے ہوئے اپنے معاملات کو نئے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ رفتار زمانہ
سے ہم آہنگی پیدا کر کے حالات کو سازگار بنانا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر اس
کی سیاسی و اقتصادی زندگی مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔

اس طرح حالات سے بہ برآہ ہونے کے لئے نوزائیدہ مملکتوں کو
وہ تمام تدبیریں کام میں لانا پڑتی ہیں جو نظم و نسق، سرانجام امور اور مضبوطی
و استحکام کے لئے ضروری ہیں۔ غلامی اور آزادی کی زندگی میں بے انتہا فرق ہے،
ایک بُعد المشرقین۔ چونکہ لوگ بالطبع آزادی کے مفہوم و اہمیت سے ناآشنا
اور اس کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اور ان کی پروا نہیں کرتے
اس لئے وہ آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ادنیٰ جذبات ابھر
آتے ہیں اور وہ من مانی کرنے پر تل جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ خود غرضی، نفسانفسی،
شورہ پشتی، لاابالیانہ پن، افراتفری اور فتنہ و فساد کے سوا اور کچھ نہیں۔
ایک طرف شدید جذبۂ حب وطن اور دوسری طرف قوم و ملک کے بل پر
ناجائز نفع میں ہاتھ رنگنے کا جنون۔ ایک طرف افراط دوسری طرف تفریط،
اور جب ان میں ٹکر ہو جائے تو کہیں اندھا دھند دھڑے بندی اور کہیں طرح
طرح کے بگاڑ۔ اور ان کا نتیجہ شور و شر، ہڑبونگ، بحران پہ بحران!

پاکستان بھی مدت تک انہی پُرآشوب حالات سے دوچار رہا۔ اس
کی کشتی طوفان کے تباہ کن تھپیڑوں میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ
اس کا انجام کیا ہوگا۔ حالات خود ہی پکار پکار کر انقلاب کو دعوت دے رہے تھے۔

دعا کررہی تھا۔ اکتوبر ۵۸ء کا انقلاب ان تمام خرابیوں کا جواب بھی تھا ور سدباب بھی، اسے سابقہ دستور کو منسوخ کر کے مارشل لاء کا نفاذ کرتے ی بن پڑی۔ قوم کی آسیں، امیدیں ٹوٹ چکی تھیں نحوست خیز سلسلے پس و یش منڈلا رہے تھے۔ قومی قیادت بالکل بیکار ہوچکی تھی۔ ابھی قیام پاکستان ر دو ہی سال گذرے تھے کہ بانی پاکستان محمد علی جناح جیسا جید قائد رخصت ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد قائد ملت بھی بیک اجل کی چیرہ دستی کا نشانہ بن گئے۔ ور کوئی ایسا پرخلوص ایسا باوقار رہنما میدان میں نہ رہا جو ملک و قوم کی رہنمائی کا حق ادا کرسکے۔ وہ لوگ جن کے سینے حب الوطنی کے نور سے روشن تھے، رخصت ہوگئے اور ان کی جگہ خود غرض، جاہ پرست سیاست دانوں نے لے لی۔ اس لئے ترقی کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ملک ہر اعتبار سے گرتا ہی چلا گیا۔ وزیر پہ وزیر آتا اور یا تو چار دن خوب اونچی ہواؤں میں پرواز کرلیتا یا بالکل لاچار اور بے دست و پا ہو کر ہتھیار ڈال دیتا۔ حکومت پر حکومت آتی اور من مانی کرتی یا وزیروں کی طرح مجبور ہوکر جگہ خالی کر دیتی۔ کوئی کابینہ بھی تو ایسی نہ تھی جسے عوام، مجالس قانون ساز یا کسی اور جماعت کا اعتماد اور تائید حاصل ہوتی۔ قومی نمائندوں کا یہ حال تھا کہ جب جی چاہتا کوئی شرم یا عار محسوس کئے بغیر اسمبلیوں میں ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوجاتے۔ اور محض ذاتی اغراض کی خاطر۔ ادھر صوبائی مناقشات نے خرابیوں کو اور بھی ہوا دی۔ ادھر ایک وزارت قائم ہوتی اور اُدھر اس کا چراغ گل ہوجاتا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جون ۵۸ء میں انقلاب سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے صرف مشرقی پاکستان ہی میں سات دن کے اندر اندر تین وزارتیں آئیں اور چلی گئیں۔ دنیا حیران تھی کہ کیا ہورہا ہے۔ آخر اس بیہودگی کی کوئی حد بھی ہے؟ بظاہر اس کی کوئی حد نہ تھی۔ اس لئے اس صوبہ میں دو ماہ گورنر کا راج رہا۔ جونہی یہ ہٹا اور ستمبر ۵۸ء میں مجلس قانون ساز کا اجلاس منعقد ہوا، ایوان میں لڑائی جھگڑائی تک نوبت پہنچی جس میں نائب اسپیکر جان سے مارا گیا۔

اصل میں بات یہ تھی کہ سیاست دانوں کا اخلاق بالکل گر چکا تھا۔ وہ پرلے درجے کے بددیانت اور خود غرض ہوچکے تھے۔ مرکز ہو یا صوبے ساری سیاسی جماعتوں میں بری طرح نااتفاقی پیدا ہوچکی تھی جس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ مملکت کی بنیاد متزلزل ہوجائے۔ ان روح فرسا حالات کے باوجود کسی کو ہوش نہ آیا اور وہی تباہ کن کھیل جاری رہا سیلاب جنوں بڑھتا ہی چلا گیا اور یہ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر ہواؤں کے تھپیڑوں نے اس لبلبہ کو چھوڑا تو یہ جلد ہی خود بخود پھوٹ جائے گا کیونکہ ملک کے سیاسی

اقتصادی دیوالیہ پن کا لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا تھا۔ اس طوفان بدتمیزی میں جمہور تو مجبور رہے باہر کے لوگ بھی پاکستان کی طرف سے بالکل مایوس ہوچکے تھے وہی بات :

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

خیال کیجیے۔ وہ ملک جو کبھی غذائی حیثیت سے خود کفیل ہی نہیں ایشیا کا اناج گھر مشہور تھا، اب دوسروں کا دست نگر تھا۔ اور اسے سالانہ ۵۴ کروڑ روپے کی بھاری قیمت دوسروں کو ادا کرنی پڑتی تھی ــــ! زراعتی زمینیں سیم اور کلر کی وجہ سے برابر بے کار اور بانجھ ہوتی چلی جارہی تھیں نت نئی حکومتیں نت نئے ترقیاتی منصوبے اور وہ بھی خسارے کے میزانیوں کے بل بوتے پر ! نتیجہ ــــ افراط زر کا جان کاہ مرض اور دن بدن بڑھتی ہوئی قیمتیں، جو عوام کے لئے بلائے جان ثابت ہورہی تھیں۔

ادھر زر مبادلہ کا بھی برا حال تھا پچھلے چند سالوں میں محفوظات خطرناک حد تک گر گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ناجائز درآمد برآمد اور چور بازاری کا بازار بری طرح گرم تھا اور خود خداوندان حکومت جن کا کام یہ تھا کہ وہ ان خرابیوں کا سدباب کریں ناجائز دولت پیدا کرنے کے لئے ہر طرح کی قوم دشمن، تباہ کن سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے اور بے تحاشا نفع میں ہاتھ رنگ رہے تھے۔ ان کی کیفیت بالکل ویسی ہی تھی جیسی انقلاب سے پہلے شہنشاہ فرانس کی۔ ان کے دل جانتے تھے اور ان کے ہونٹوں پر یہی الفاظ آ آ کر رہ جاتے تھے :

" سیلابِ بلا میرے بعد!"

مدعا یہ کہ ملک بھر میں وسیع پیمانے پر جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں ان سے سارا نظام بگڑ چکا تھا۔ ملکی معیشت اور بھی خستہ و خراب ہوگئی۔ اس کے روگ اور بھی بڑھ گئے۔ ادھر تقریباً ایک کروڑ بے خانماں لوگ تھے جن کو بسانے کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے اکثر بری طرح گلی کوچوں، جھگیوں بوسیدہ کیمپوں یہاں تک کہ فٹ پاتھوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی بسر کررہے تھے۔ چند روزہ حکومتیں آتیں اور نت نئے سبز باغ دکھا دکھا کر وقتی سہرا ہوا کی جھولیاں بھر بھر کر چلی جاتیں۔ غرض پورا کی حالت زار راج نیتاؤں کی بے حسی، بے پروائی، بے دردی اور چاروں کھونٹ پھیلے ہوئے تاراج کی جو کہانیاں ہم پچھلے زمانوں میں سنتے آئے ہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور انتہائی یاس اور حرماں نصیبی کے عالم میں گھبر گھبرا کر یہی پکار پکار اٹھے : یاالٰہی! اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا تھا کہ ہم ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں

مانگیں اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھیں کہ شاید مردے از غیب برون آید و کارے بکند ـــــ کے مصداق کوئی فرشتۂ نجات آجائے بالفاظ دیگر ایک بروقت انقلاب کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔ یہ احساس خاص و عام سب کے دل میں جاگزیں تھا۔ اسی لئے جنرل محمد ایوب خاں نے (جواب فیلڈ مارشل کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں) ۸ ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فرمایا تھا کہ "ایک اچھے محکم ملک کو مضحکہ خیز بنا دیا گیا ہے۔ اگر موجودہ بدنظمی و انتشار کو جاری رہنے دیا جاتا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرتی۔"

چنانچہ ہمارے اس عظیم نجات دہندہ نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ ملک میں ایک تندرست اور خوشگوار صورت حالات پیدا کرکے رہیں گے وہ ساری خرابیوں کا قلع قمع کر دیں گے اور دیار پاک کو صحیح معنوں میں دیار پاک بنا کر رہیں گے۔ یہ ایک جری سپاہی کا عزم بالجزم تھا۔ اور اس نے اس شاندار نصب العین کو عملی جامہ پہنا کر چھوڑا۔

ہماری انقلابی حکومت کے کارنامے واقعی حیرت انگیز ہیں، جیسے کسی زبردست ساحر نے بے آب و گیاہ صحرا میں راتوں رات ایک عظیم الشان محل کھڑا کر دیا ہو۔ حکومت نے عنان اختیار سنبھالتے ہی عوام میں اعتماد پیدا کر لیا۔ اور بڑے ہی جرأت مندانہ تعمیری اقدامات سے خوش آیند توقعات کی ایک دنیا پیدا کر دی۔ خاص و عام میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ پہلی بار انہیں ایسی حکومت میسر آئی جو ان کی اپنی حکومت تھی۔ اور آناً فاناً ایسا انقلاب رونما ہوا جس کا دامن دنیا کے دوسرے انقلابوں کی طرح کشت و خون کے ناگوار واقعات سے داغدار نہیں ایک خاموش پُرسکون انقلاب۔ تمام ملک میں زندگی اسی طرح رواں دواں رہی۔ وہی رونق، وہی چہل پہل۔ وہی ہماہمی۔ قومی اصلاح اور تعمیر و ترقی پر کمربستہ ہو کر حکومت نے نظم و نسق کو درست کرنے کی فوری تدابیر اختیار کیں۔ اس کی وضع بڑی حد تک سول ہی رہی۔ اور اس میں فوج کو بہت کم دخل انداز ہونے دیا گیا۔ نااہل اور بددیانت عناصر جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے اور دفتری زندگی کو پوری طرح پاک و صاف کر دیا گیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں وہی ضبط، وہی تحمل، وہی بیداری۔ یہ تھا نئی حکومت کا شیوۂ خاص اس کا طرۂ امتیاز۔ اس کا حقیقی مدعا ایک اور صرف ایک تھا: ملی زندگی کی تطہیر، اس کی اصلاح اور اس کے ساتھ ہی ساتھ روز افزوں تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر ڈال دینا تاکہ بالآخر ایسے جمہوری نظام کے لئے راستہ ہموار ہو جائے جو قومی مزاج، قومی تقاضوں اور ملکی حالات کے سب سے زیادہ موزوں ہو۔

اس جذبہ و شوق کے نتائج کس قدر خوشگوار، کس قدر شاندار ثابت ہوئے، اس کا اندازہ ہم پچھلے دو سالوں میں کر چکے ہیں۔ ایک مستعد اور متحرک حکومت کی حیثیت سے اس کے اقدامات کی رفتار اس قدر تیز رہی ہے کہ ہماری نگاہوں کے لئے ان کا ساتھ دینا ہی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ عام ضرورت کی چیزوں کے نرخ فوراً گر گئے۔ چوربازاری، نفع اندوزی رات بھر ہی میں عنقا ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ بڑے ہی وسیع پیمانے پر ناجائز درآمد برآمد کے باعث پاکستان کو درآمدی اشیاء کے لئے بے انتہا زرمبادلہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ نئی حکومت نے جس مقدار میں ناجائز درآمد شدہ اشیا، غلہ اور سونے کی بازیافت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چنانچہ ہم میں سے کسے یاد نہیں کہ کس طرح انقلاب کے پہلے ہی چند دنوں میں دو ٹن سونا سمندر سے برآمد کیا گیا۔ تاجروں اور بیوپاریوں نے خود ہی ذخیرہ شدہ غلہ اور درآمد شدہ اشیاء کا اعلان کر دیا، برسوں کے واجب الادا ٹیکس اور مخفی آمدنیوں کا سراغ لگا کر خزانہ میں تقریباً ۲۴ کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا۔

یہ تو خیر ابتدائی معرکے تھے۔ مگر سب سے مہتم بالشان معرکہ جو تاریخ میں ایک عہد آفریں واقعہ کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا، زرعی اصلاحات ہیں۔ یہ وہ بنیادی قسم کی اصلاحات ہیں جن کے نتائج بہت ہی وسیع اور دوررس ہیں اور جو ہمارے معاشرے میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیں گی۔ ان کا بنیادی مقصد تو ہے زرعی پیداوار کو بڑھانا۔ اور وہ اسی طرح ممکن ہے کہ سرے سے ملک کی زرعی معیشت ہی کا ڈھانچہ بدل دیا جائے۔ وہ جو بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا راج تھا اسے ختم کر دیا جائے۔ اور کاشت کاروں کو ملکیتی حقوق دے کر زمین اور اس کی پیداوار سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ اس طرح نہ تو زمیندار بیچارے محنت مشقت کرنے والے مزارعوں کو اپنے پاؤں تلے روند سکیں گے اور نہ ان کا خون چوس سکیں گے۔ کسان اپنی زمین، اپنی پیداوار اور اپنی قسمت کا مالک آپ ہوگا۔ ان شاندار اصلاحات کے ساتھ ناجائز درآمد برآمد، ذخیرہ اندوزی، نفع اندوزی، چوربازاری اور بددیانتی کے خلاف ایک بے پناہ جہاد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اب وہ افراط زر کا موذی مرض۔ اس کو دور کرنے کے لئے

بھی نہ نئے منظم طریق سے قدم اٹھایا گیا اور بڑی احتیاط سے منصوبہ بندی کی کیونکہ طلب و رسد میں جو شدید عدم توازن پیدا ہو چلا ہے اس کا ضروری اشیا پر نہایت برا اثر پڑتا ہے۔ نئی حکومت اپنے پیشروؤں کی طرح خسارے کے بیوپاریوں پر تکیہ اور آدھار رکھنے نہیں بیٹھی تھی۔ اس کمزور سہارے کی بجائے اس نے اخراجات کو قابو میں لانے پر زور دیا جس سے فاضل اور انگلیوں کا وہ زبردست بوجھ جو ستمبر ۵۸ء تک ۸۹ کروڑ روپے کی حد تک پہنچ چکا تھا منفی کی بجائے مثبت بن گیا۔ یعنی ۱۹۵۸ء کے آخری ربع میں زرمبادلہ کی بچت ۵ کروڑ ۷ لاکھ روپے کی حد تک پہنچ گئی۔ اسی طرح سونے، ڈالر اور پونڈ کے محفوظات بھی جون ۵۹ء تک ۲۲،۷ کروڑ روپے سے ۱۰۴ کروڑ روپے تک جا پہنچے۔ اس طرح کہاں تو ہم روز بروز لڑھکتے ہوئے نیچے ہی نیچے چلے جا رہے تھے اور کہاں ایک دم اونچا ہی اونچا جانے لگے۔

صنعتی ترقی کی رفتار بھی اسی طرح تیز رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دو سالوں کے مختصر عرصہ میں پاکستان کئی باتوں میں خود کفیل ہو چکا ہے جنوری ۵۹ء کی بات ہے کہ ایک برآمدی بونس اسکیم جاری کی گئی جس سے نہ صرف پاکستانی برآمدات کی مقدار میں اضافہ ہوا۔ بلکہ ان کی فہرست میں بعض اور چیزیں بھی شامل ہو گئیں۔ اس طرح زیر بحث اسکیم میں جو برآمدات شامل ہیں ان کی مالیت جہاں ۱۹۵۸ء میں ۳۱ کروڑ روپے تھی وہاں ۱۹۵۹ء میں ۵۱ کروڑ روپے بن گئی۔ بذریعہ لائسنس درآمد ہونے والی اشیاء کی تعداد بھی کافی بڑھ گئی ہے۔ اور ان کے ساتھ ہی ملک میں چھوٹی دستکاریوں کی ترقی کے لئے بھی زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔

بے خانماں مہاجر۔ ہماری قوم کے لخت جگر۔ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے تب سے گلیوں کوچوں میں مارے مارے پھرتے۔ ان پر توجہ سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور نئی حکومت تو تمام تر عوام کی اپنی ہی حکومت تھی۔ ان ہی کے لئے، انہی کی رفاہ و بہبود کی خاطر۔ اس لئے اس نے اپنا پہلا کام یہی قرار دیا۔ مہاجرین کی آباد کاری چنانچہ ان کو فی الفور بسانے کے لئے دن رات لگا کر چالیس ہزار کوارٹرز تعمیر کرنے کا تہیہ کیا گیا اور پانچ ماہ کے اندر اندر ۱۰ ہزار کوارٹرز تیار بھی ہو گئے۔ اتنے بڑے کام کے لئے اتنی کم مدت تصور ہی میں نہیں آ سکتی۔ لیکن ہماری انقلابی حکومت نے جس کے مرد اہوں کی رگ و پے میں بجلی ہی بجلی بھری تھی، یہ کام کر کے دکھا دیا اور پچھلے اگست تک اس میں ۲۵ ہزار خاندان بھی لا کر آباد کر دیئے۔

ایک بہت بڑی اہم مہم تھی معاشرتی رفاہ و بہبود جس کا قوم کی ترقی و تعمیر سے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس کے پیش نظر معاشرتی مسائل کو حل کرنے اور مناسب تدابیر اختیار کرنے کے لئے وزارت معاشرتی بہبود قائم کی گئی جس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ ملک میں روز بروز بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کی جائے۔ اس سلسلے میں صحت عامہ کی خدمات کو بہتر بنانے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اور ایسے علاقوں میں جہاں آبادی بڑی گنجان ہے، ہزاروں لوگوں کو ٹیکے لگائے گئے۔ ہسپتالوں کے بندوبست، مریضوں کی دیکھ بھال اور دواؤں کی بہم رسی جو قبل ازیں مریضوں کو بالعموم میسر نہیں آتی تھیں۔ یہ سب باتیں ملی زندگی کو بہتر بنانے کی واضح علامات ہیں جنہوں نے بہت عمدہ نتائج پیدا کئے ہیں۔

کوئی ترقی کوئی تعمیری پروگرام کوئی تدبیر چھان بین اور تحقیق کے بغیر ممکن نہیں تعلیم ہو یا صحت، خوراک ہو یا زراعت، محنت ہو یا قانون ان سب کے لئے ضروری معلومات بہم پہنچانا ضروری ہے۔ ملی زندگی کا کوئی شعبہ نہ تھا جو انقلابی حکومت کی تیز بین اور ہمہ بین نگاہوں سے مستور رہا ہو۔ چنانچہ بڑی تیزی سے بے شمار کمیشن قائم کئے گئے۔ اسی تیزی سے ان کی رپورٹیں پیش بھی کی گئیں۔ اور ان کی سفارشات کو جلد از جلد عملی جامہ بھی پہنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک معرکہ آرا اقدام ملک کی آئندہ ترقی کے لئے ۱۹۶۰ - ۶۵ تک دوسرا پنجسالہ منصوبہ جس کا مقصد قومی آمدنی کو ۲۰ فیصدی، اور صنعتی پیداوار کو ۵۰ فیصد بڑھا کر ۳۰ لاکھ لوگوں کو روزگار مہیا کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ حکومت بھی مستعد و کارگزار عمال اور عملے کے بغیر قوم و ملک کی خاطر خواہ خدمت انجام نہیں دے سکتی۔ اس حقیقت کے پیش نظر انقلابی حکومت نے دفتری نظام میں ایک نئی روح پھونکنے کا ارادہ کیا جس کے معنی تھے بیک وقت اصلاح بھی اور یہ بھی کہ مستعدی کارکردگی اور کردار کے معیار کو بلند تر کیا جائے۔ دفتری نظام کو حکومت کے ارادوں اور منصوبوں کو بروئے کار لانے میں جو دخل ہوتا ہے محتاج بیان نہیں۔ اور حق یہ ہے کہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے دفتری ملازمین نے کاروبار ملک کو سرانجام دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن رفتہ رفتہ دفتری نظام بھی کافی مضمحل اور ناقص ہو چکا تھا بعض والوں نے اسے اپنی مذموم خواہشوں اور نا جائز ارادوں کا بنا کر بہت پست، ناکارہ اور بد دیانت بنا دیا تھا۔ اس لئے

قبیلہ " تر دن " کے سردار کی حیثیت سے دستار

پیکر خلوص

معمار انقلاب

" دیدۂ بینائے قوم "

ن اور ڈاکٹر خالد بن سعید ، ایک پاکستانی استاد سیاسیات و نظم و نسق ، برنزوک یونیورسٹی ، کنیڈا

صدر اور عوام

صدر پاکستان، فیلڈ مار
محمد ایوب خان کو عوام ا
ان کی بہبود کے مسائل
ساتھ شروع ہی سے دلچ
رہی ہے۔ اس لئے وہ ب
مقبول و ہر دلعزیز ہیں
جہاں جہاں پہنچتے ہ
لوگ ان کا نہایت گرمجو
سے خیرمقدم کرتے ہیں

تعمیر و ترقی کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس آلۂ کار کو درست کرنے اور اسے تیز تر و مفید تر بنانے کی ضرورت تھی۔ لہذا، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، اس مقصد کے لئے چھان بین کرنے والی کمیٹیاں قائم کی گئیں جنہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں دفتری نظام کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نہایت مستعد اور کارگزار بنا دیا۔ اس سلسلے میں کسی کی رو رعایت نہیں کی گئی۔ اور جو لوگ بد دیانت یا نا اہل تھے خواہ وہ اعلیٰ عہدیدار ہوں یا کوئی اور، ان کے خلاف بڑی سختی سے قدم اٹھایا گیا۔ اس کے برعکس جو لوگ لائق، دیانتدار، مستعد اور کارگزار تھے ان سے کوئی مواخذہ نہیں کیا گیا اور ان کی پوری پوری حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ وہ اور بھی ذوق و شوق اور خلوص کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت سرانجام دینے میں منہمک ہو جائیں۔ ایک عرصہ کی مسلسل کوششوں کے بعد اب دفتری نظام اس قدر سلجھ گیا ہے کہ تاخیر، سستی، کوتاہی اور غفلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

ملی زندگی کو کماحقہٗ صحت و تندرستی سے روشناس کرانے کے لئے سیاسی جماعتوں اور سیاست پیشہ افراد پر بھی توجہ لازم تھی چنانچہ پہلی ضرب فتنہ انگیز اور تفرقہ پرداز سیاسی جماعتوں پر پڑی جنہوں نے ملکی فضا اور قومی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ پھر پیشہ ور سیاسی شعبدہ بازوں کی خبر لی گئی۔ اور ان کے خلاف باقاعدہ قانونی کارروائی کی گئی۔ تاکہ ان کا زہریلا مواد کہیں پھر ہماری ملی زندگی کے رگ و پے میں سرایت نہ کر جائے۔

انقلابی حکومت کا سب سے بڑا مطمح نظر جو اس کی تمام سرگرمیوں اور اقدامات کا منتہا ہے، قوم کو صحیح معنوں میں جمہوری نظام اور اس کی برکات سے روشناس کرانا ہے۔ تاکہ ہر شخص حقیقی معنوں میں آزاد ہو اور ایک آزاد شہری کی حیثیت سے ایک آزاد مملکت میں حصہ لے سکے۔ اسی بنا پر دسمبر ۱۹۵۹ء میں "بنیادی جمہوریتوں" کے عظیم الشان نظام کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو درحقیقت بھرپور اور مکمل قسم کی جمہوریت کو بروئے کار لانے کا پیش خیمہ ہے۔ اس پانچ منزلہ نظام جمہوریت کی وضع ہیئت کچھ یوں ہوگی:

دیہی یونین کونسلیں، تحصیل یا تھانوں کی کونسلیں، ضلع کونسلیں، ڈویژنل کونسلیں اور ان سب کے اوپر مشاورتی کونسلیں۔ ان کونسلوں میں نمائندگی کی صورت یہ ہے کہ ہر یونین کونسل اپنے صدر آپ چنے گی جو خود بخود اگلی کونسل کے اراکین بن جائیں گے۔

اسی کے ساتھ دستور کا معاملہ بھی وابستہ ہے جس کی تدوین ملی زندگی اور نظام کی شیرازہ بندی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور ہمارے اقدامات کو قوم کی متفقہ قبولیت کا جواز حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر انتخاب و الکشن آرڈر ۱۹۶۰ء جاری کیا گیا جس کی تمہید میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ عوام کی مرضی معلوم کرنے کے بعد صدر دستور مرتب کرے گا۔ اس آرڈر کے مطابق الکشن کمیشن کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ خفیہ بیلٹ کے ذریعہ ووٹ دیئے جانے کا بندوبست کرے۔ اس طرح صدر پاکستان نے ۱۴ فروری ۱۹۶۰ء کو بنیادی جمہوریتوں کے نئے منتخب شدہ ۸۰ ہزار اراکین کے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ تقریباً ۹۵٫۶ ووٹ صدر ہی کے حق میں تھے جو چار سال کی مدت کے لئے صدر پاکستان منتخب ہوئے اور ان پر یہ ذمہ داری عاید کی گئی کہ وہ ملک کے لئے ایک دستور ترتیب دیں۔ چنانچہ اس کے فوراً ہی بعد ایک دستور کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا جو اس وقت مصروف کار ہے۔

ملی زندگی میں نئی روح پھونکنے کے لئے ایک اور اقدام بھی اشد ضروری تھا۔ ایک ایسا ادارہ کا قیام جو ایک دیدۂ بینا کا کام دے۔ جو حالات و واقعات کا جائزہ لے حکومت اور قوم دونوں کے دل و دماغ کی حیثیت سے کام کرے۔ اور جو قومی تعمیر و ترقی کے مسائل پر غور و خوض کرے اور ملی زندگی کے ہر پہلو معاشری، اقتصادی، ذہنی، ثقافتی، کو مہمیز کرے۔ ادارہ قومی تعمیر تشکیل نو اسی مقصد کے تحت وجود میں آیا۔ اور ایک عرصہ سے ملت ساز تدابیر اور تعمیری و تخلیقی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور مفید و ساز گار عناصر کی حوصلہ افزائی میں مصروف ہے جس سے ہم نہایت کارآمد نتائج کی توقع کر سکتے ہیں۔

تو یہ ہے دو سال کے مختصر سے عرصہ کی کارگزاری۔ صرف دو سال جو کسی ملک کی زندگی میں کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتے خصوصاً ایک نئے ملک کی زندگی میں جس کے حالات اس قدر بگڑ چکے تھے۔ اتنی بوقلموں کارگزاری، اتنے گوناگوں معرکہ آرا اقدامات جن کا شمار ہی مشکل ہے کسی بھی حکومت کے لئے مایۂ ناز ہو سکتے ہیں۔ ہماری انقلابی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بہت ہی آڑے وقت پر عنان کار سنبھالی اور نہ صرف قوم کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ بلکہ اس کو بڑی تیزی سے تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے میں مدد دی۔ ایسے کہ اس کا راستہ زمینی نہیں آسمانی معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک کہکشاں ہے چمکتے ہوئے ستاروں کا ایک طول طویل سلسلہ تاحد نظر پھیلا ہوا جس سے دیکھنے والی نگاہیں خیرہ ہو جائیں تو کچھ عجب نہیں! اور ابھی پہنائے زمان و مکاں میں ایسے بے شمار ستارے اور بھی ہیں! اور بھی روشن اور بھی پرجلال! اور ان کا نظر افروز سلسلہ دیکھ کر ہم بڑے ناز سے کہہ سکیں گے یہ ہے پاکستان کی قسمت کی شاہراہ جو روز بروز بڑھتی ہی چلی جائے گی — پاکستان پائندہ باد!

صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان زندہ باد!!

قبائلی علاقوں میں تعلیمی سرگرمیاں

علی ناصر زیدی

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ قبائلیوں کو کسی قسم کی تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں تھیں اور ان پر مفت کا یہ الزام تھا کہ وہ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ انگریزی حکومت نے سیاسی وجوہ کی بنا پر اس علاقے کو ہر قسم کی تعلیمی و ثقافتی سہولتوں سے محروم رکھا اور کچھ ایسی فضا قائم رکھی جس میں یہاں کے باشندے محض اپنے ماضی پر فخر کرتے رہے۔ انہوں نے بیسویں صدی میں رہنے کے باوجود اس کی ہمہ گیر سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ غریب، پس ماندہ اور پریشاں حال رہے۔

جب آزادی کا سورج سرحد کی پہاڑیوں پر ابھرا تو اس نے اپنی نذریں کرنوں سے اس تمام علاقے کی تاریکی کو دور کر دیا۔ جن لوگوں کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ دماغی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہیں اور کسی صورت اعلیٰ تعلیم سے مستفید نہیں ہو سکتے، وہی چند ہی سال کے عرصے میں علم و دانش کی راہوں پر کہیں سے کہیں نکل گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب کوئی قبائلی باشندہ پشتو بولتا بولتا یکایک اردو یا انگریزی بولنے لگتا ہے تو یقین نہیں آتا کہ یہ شخص اس علاقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق انگریز نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ اسے تمدن سے کوئی واسطہ نہیں، وہاں تو دن دہاڑے قتل ہو جاتا ہے، آپ ادھر سے گذر نہیں سکتے۔ واقعی مردِ مومن کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔

قبائلی علاقوں میں ریاست دیر، سوات، چترال، مالاکنڈ ایجنسی، جنوبی اور شمالی وزیرستان، کرم ایجنسی، خیبر ایجنسی، مہمند ایجنسی اور کوہستان ہزارہ کے کچھ علاقے شامل ہیں۔ اضلاع پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے جو سرحدی علاقے متعلق ہیں وہ بھی قبائلی علاقوں ہی میں شمار ہوتے ہیں اور ان سب کا مجموعی رقبہ خاصا بڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی آبادی تیس لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد حکومت پاکستان نے قبائلی علاقوں کی ترقی کی طرف توجہ دی۔ ترقی کا پہلا زینہ تعلیم ہے۔ یہاں کے باشندوں کی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان میں تعلیم نہیں تھی۔ سب سے زیادہ مشکل یہی تھی کہ ان لوگوں میں جدید تعلیم کے خلاف ایک قسم کا جذبۂ نفرت پایا جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ فرنگی سے نفرت کرتے تھے اور جدید تعلیم کو اس کی میراث تصور کرتے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ صورت ختم ہوئی اور قبائلیوں کو محسوس ہوا کہ اب وہ صحیح معنوں میں آزاد ہیں، یہ سب ان کا ملک، ان کا وطن ہے اور یہ ان کی اپنی حکومت ہے جسے اسلامی طرز پر چلایا جائے گا۔ انہوں نے تعلیمی سہولتوں کو خوش آمدید کہا اور اپنے دیہاتوں، قصبات اور شہروں میں محکمۂ تعلیم کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ جہاں کہیں ممکن ہو سکا اسکولوں کی تعمیر میں بھی مدد دی اور ضرورت پڑی تو اس مقصد کے لئے زمین وغیرہ مہیا کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اگست ۴۷ء سے پہلے یہاں اسکول نہ ہونے کے برابر تھے، اس لئے سب سے پہلے ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ جہاں پرائمری اسکول نہیں تھے وہاں ایسے اسکول کھولے گئے، جہاں پرائمری تھے انہیں مڈل اسکولوں میں تبدیل کیا گیا اور جہاں مڈل اسکول کام کر رہے تھے انہیں ہائی اسکول کے درجے تک پہنچایا گیا۔ اگست ۴۷ء سے پہلے پورے قبائلی علاقے کی تعلیم پر صرف ایک لاکھ بارہ ہزار روپے سالانہ صرف کئے جاتے تھے لیکن گزشتہ بارہ تیرہ سال کے عرصے میں یہ خرچ پچیس گنا ہو گیا ہے۔ اس سے آپ کو حکومت کی مساعی اور دلچسپی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ موجودہ حکومت یہاں کے باشندوں کو پاکستان کی باقی آبادی کے مقابلے میں کسی صورت پیچھے نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب پورے قبائلی علاقے میں تعلیمی درسگاہوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک قبائلی علاقوں میں اسکولوں کی تعداد قریباً سات گنی ہو گئی ہے۔ اب وانا، گنی کرم اور رزمک میں ہائی اسکول موجود ہیں۔ یہ قصبات جنوبی وزیرستان میں واقع ہیں۔ اسی طرح شمالی وزیرستان کے مقام میران شاہ میں بھی ایک ہائی اسکول ہے۔ کرم ایجنسی میں پاراچنار اور علی زئی نامی مقامات پر ایسے ہی اسکول کام کر رہے ہیں۔ خیبر ایجنسی میں جمرود اور لنڈی کوتل میں ہائی اسکول موجود ہیں۔ چند علاقے میں شب قدر، مالاکنڈ ایجنسی میں درگئی اور تھانہ، کوہاٹ کے سرحدی علاقے میں ہرا آدم خیل اور کوہستانِ ہزارہ میں اگی میٹرک تک ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔

چونکہ اس زمانہ میں علمی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی تربیت نہایت ضروری ہے اس لئے حکومت لنڈی کوتل، تھانہ، پاراچنار اور وانا کے اسکولوں میں ٹیکنیکل تعلیم کے انتظام پر بھی غور کر رہی ہے۔ اس مقصد کے لئے میٹرک کے نصاب میں ضروری ترمیمیں کی جائیں گی۔

مڈل جماعتوں اور میٹرک تک تو تعلیم کے اخراجات کا بار والدین کسی نہ کسی صورت برداشت کر ہی لیتے ہیں کیونکہ بچے گھر پر ہی رہتے ہیں اور اُن کے کھانے پینے اور کپڑے لتے پر کچھ زیادہ خرچ نہیں آتا۔ جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے، محکمۂ تعلیم آٹھویں تک تمام اسکولوں میں کتابیں بھی مفت تقسیم کرتا ہے۔ اس طرح سکول کی تعلیم کسی نہ کسی طرح مکمل ہو جاتی ہے لیکن جب کالج کی تعلیم شروع ہوتی ہے تو بہت سے والدین کو مشکل پیش آتی ہے کیونکہ اس مقصد کے لئے طلبا کو اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے شہروں کا رُخ کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اخراجات میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔

حکومت اس صورتِ حال سے آگاہ تھی لہٰذا اس نے قبائلی طلبا کے لئے ڈھائی لاکھ روپے کے وظائف دینے کا فیصلہ کیا۔ اس رقم میں مزید ایک لاکھ روپے کا اضافہ زیرِ غور ہے۔ یہ وظائف مستحق طلبا کو آٹھ روپے ماہوار سے ایک سو بیس روپے ماہوار تک دئے جاتے ہیں تاکہ وہ ملک کی مختلف درسگاہوں میں اپنی تعلیم مکمل کر سکیں۔ انجینئرنگ، میڈیکل اور ایم اے یا ایم ایس سی میں پڑھنے والے طلبا کو سو روپے ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے۔ کمال ہے کہ جس علاقے کے مرد حصولِ تعلیم کے لئے مشکل سے باہر نکلتے تھے وہاں کی لڑکیاں اب ایم اے اور ایم بی بی ایس وغیرہ میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں!

قبائلی علاقوں کے طلبا زراعت کا مطالعہ بھی کر رہے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے لڑکے بھی شامل ہیں جو زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی زمینوں کو ترقی دیں اور جدید سائنسی ذرائع سے پیداوار میں اضافہ کریں۔ مردان اور چارسدہ کا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ یہاں تمباکو اور نیشکر خوب پیدا ہوتا ہے اور اگر کوشش کی جائے تو ان فصلوں کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

تمام قبائلی باشندے تعلیم کی اہمیت سے آگاہ ہو چکے ہیں اور آئے دن حکومت سے تقاضہ کرتے رہتے ہیں کہ ان کے دیہاتوں اور قصبات میں مزید اسکول اور کالج کھولے جائیں چنانچہ پاراچنار میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج کھول دیا گیا جس میں سائنس بھی پڑھائی جاتی ہے۔ مالاکنڈ ایجنسی میں تھانہ نامی مقام پر بھی ایسا ہی ایک کالج کھولا جائے گا۔ وہاں کے باشندوں کو اس کی ضرورت ہے۔

قبائلیوں میں زنانہ تعلیم بھی مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاراچنار میں لڑکیوں کے لئے صرف ایک پرائمری اسکول تھا لیکن اب تھانہ میں ایک زنانہ مڈل اسکول، پاراچنار، میران شاہ اور شاہ کوٹ میں ایک ایک مڈل اسکول اور دوسری ایجنسیوں میں پندرہ پرائمری اسکول لڑکیوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔

اس پورے علاقے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جمرود اور لنڈی کوتل میں لڑکیوں کے لئے اسکول کھولے گئے ہیں۔ عوام ان کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ ہوتے جا رہے ہیں اور ان میں اپنی بچیوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اب وہاں تقریباً ایک ہزار لڑکیاں حکومت کی فراہم کردہ تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ خوش قسمتی سے ان اسکولوں کے لئے استانیاں بھی مل گئی ہیں۔

تمام قبائلی ریاستوں میں تعلیمی اعتبار سے سوات سب سے زیادہ ترقی کر رہا ہے۔ اس کی حدود میں تقریباً ایک سو اسی تعلیمی درسگاہیں موجود ہیں۔ سیدو شریف میں جدید طرز کا ایک ڈگری کالج ہے جہاں سائنس کی تعلیم کا بھی مکمل انتظام ہے۔ ریاست میں آٹھ ہائی اسکول ہیں جن میں ایک لڑکیوں کے لئے ہے۔ دس مڈل سکول ہیں اور باقی ابتدائی مدارس۔ ان کے علاوہ سوات میں دو دینی درسگاہیں بھی ہیں جن میں فقہ، حدیث اور قرآنِ پاک کی تعلیم دی

جاتی ہے۔

اسی طرح چترال میں بھی تعلیم کو عام کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ دروش اور چترال میں دو ہائی اسکول ہیں جہاں ڈرائنگ اور سائنس کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یہاں لڑکیوں کے لئے بھی پرائمری اسکول موجود ہیں۔ چھوٹے مقامات پر ابتدائی مدارس کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ریاست میں مزید ہائی اسکول اور پرائمری اسکول کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہے کیونکہ طلبا کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، کافرستان میں بھی ایک پرائمری اسکول کھولا جا چکا ہے۔ یہ علاقہ اپنے قدرتی مناظر کے لئے مشہور ہے۔ ریاست امب اور دربند میں بھی کئی ہائی اسکول موجود ہیں۔

قبائلی علاقوں میں تعلیم کی نگرانی کے لئے علیحدہ ایک نائب ناظم تعلیمات مقرر ہے جس کا دفتر پشاور میں ہے۔ اس کی مدد کے لئے چھ نائب انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہیں ان میں ایک خاتون بھی ہیں جو زنانہ درسگاہوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یہ تمام نگراں مالاکنڈ، پشاور، خیبر، پاراچنار، میران شاہ اور وانا میں رہتے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں کے اسکولوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تعلیم کے علاوہ حکومت جسمانی تربیت پر بھی زور دے رہی ہے۔ ہر سال ٹورنامنٹ اور کھیلوں کے مقابلوں پر پانچ ہزار روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ سکاؤٹنگ پر بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ نئے اسکولوں کی تعمیر پر ہزاروں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے — ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں محسود ہوسٹل تعمیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح قبائلی علاقوں کے طلبا کے لئے پشاور یونیورسٹی میں ایک علیحدہ ہوسٹل بنایا گیا ہے۔

ان کاموں پر ہزاروں لاکھوں روپیہ صرف ہوتا ہے۔ ہمارے ذرائع اور وسائل محدود ہیں۔ اس کے باوجود حکومت بڑی فراخدلی سے یہاں تعلیمی سہولتیں عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر پشاور یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں آیا جو ایک جدید طرز کی اعلیٰ درسگاہ ہے اور جداگانہ تذکرہ چاہتی ہے۔

موجودہ حکومت جس طرح عوام کی اپنی حکومت ہوتے ہوئے ان کی رفاہ و بہبود اور ترقی کی خواہاں ہے اور فوجی روح سے سرشار ہونے کی بنا پر سراپا عمل، سراپا حرکت اور سراپا اقدام ہے

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

"از جفائے دہ خدایاں ......!"

آرمان دھلوی

موجودہ انقلاب سے پہلے زبوں حالات نے جو عام بددلی اور یاس و نومیدی کی فضا پیدا کر دی تھی، اس کا عکس ایک شاعر کے درج ذیل تاثرات میں نظر آئے گا مگر ساتھ ہی یہ یقین بھی تھا کہ پاپ کی ناؤ آخرکار ڈوب کے رہے گی۔ اور وہ ۲۷ اکتوبر کے انقلاب کے ساتھ واقعی ڈوب کر رہی۔ (مدیر)

وہ قوم جس نے اُبھرنا چاہا اُبھر چکی ہے، اُبھر رہی ہے

وہ ایک ہم ہیں کہ سوچتے ہیں "گزر رہی ہے، گزر رہی ہے"

خرابیاں ہوں ہزار کیا غم، مٹیں تو مٹ جائیں سوچنا کیا

ہم اپنی اس بےحسی کے صدقے جو اپنی حد سے گزر رہی ہے

عجب سی تصویریں گئے ہیں ہمارے نقش و نگارِ ہستی

ستم ہے پھر اس پہ خود فریبی جو رنگ پہ رنگ بھر رہی ہے

ستم گروں کی جفائیں مظلومیت سے اک دن پناہ لینگی

وہ بالیقیں ڈوب کر رہے گی جو پاپ کی ناؤ بھر رہی ہے

بچا سکو تو بچاؤ اب بھی وگرنہ پھر حشر تک دوبارہ

وہ آدمیت نہ سانس لے گی جو آج بے موت مر رہی ہے

ہزار کوشش میں اہلِ دانش رہے مگر ہم وہی ہیں ارماں

وہ ایک ہم ہیں کہ جو نہ سُدھرے اگرچہ دنیا سُدھر رہی ہے

نقشِ پائے رہرواں

اگر دورِ انقلاب کے ایک شاعر کا یہ قول صحیح ہے کہ "وقت کے ہاتھ پہ شوق و شعور کی شمعیں کب کب جلتی ہیں" تو اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ "جلتی ہیں تو ان کی لَو پر صدیاں آگے چلتی ہیں"۔ اور اس میں صدیوں نے فی الحقیقت بہت تیزی سے آگے چلنا شروع کر دیا ہے۔ اور جس طرح شوق و شعور کی شمعوں نے زندگی کے اور شعبوں میں اپنا اثر دکھایا ہے، اُسی طرح ادب میں بھی ایک نئی حرارت، نئی روشنی پیدا کر دی ہے جس کی کچھ جھلک ہمارے قومی ادب کے غیر معمولی فروغ میں دکھائی دیتی ہے کہ ایک کے بعد دوسری شمع برابر روشن ہوتی چلی جاتی ہے۔ قیسی رامپوری کا ناول "اُجالا"، قدسیہ بانو کا ناولٹ "پہروا"۔ تمنائی کی "تین سو پینسٹھ دن"، سراج رضوی کی "آفتابِ تازہ" اور "نوائے پاک" (طبعِ ثانی) چند اور کتابیں ہیں جن میں دورِ انقلاب کا نمایاں پرتو ہے۔ اب انقلابِ اکتوبر کی دوسری سالگرہ پھر شعرا و ادبا کے دلوں میں ولولۂ تازہ پیدا کر رہی ہے جس سے ہمیں اپنے ملی ادب میں اور بھی ہماہمی اور وقیع تر اضافوں کی توقع ہونی چاہئے۔

شوق و شعور جوں جوں قدم آگے بڑھاتے جاتے ہیں زندگی کے ہر میدان میں کچھ نقوش بھی چھوڑتے جاتے ہیں۔ کچھ ریت پر ہلکے ہلکے نشان جنہیں موج ہوا جلد ہی مٹا دیتی ہے اور کچھ ایسے جو زیادہ پائدار ثابت ہوتے ہیں۔ دورِ انقلاب میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ سب سے بڑی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ادب، فکر، فن کے سلسلے ماند نہیں پڑے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ سازگار فضا پا کر کچھ اور چمک اٹھے ہیں خصوصاً فن کی رَو خاصی تیز ہو گئی ہے اور فکر میں بھی آفاقی روشن خیالی کی طرف میلان بڑھتا جا رہا ہے جیسا کہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ارشادات سے ظاہر ہے۔

ادب ایک زیادہ حساس اور اثرپذیر چیز ہے، اس لئے یہ نئے رجحانات کا بہتر عکس پیش کرتا ہے۔ ممکن ہے دو سال کی مختصر مدت۔ اور وہ ہماری ملی تاریخ کے پچھلے گیارہ سال کی مدت کے مقابلے میں ہی کیا! — رجحانات کے عملی طور پر صورت پذیر ہونے کے لئے ناکافی ہوں۔ پھر بھی اُن سے ہوا کا رُخ ضرور معلوم ہو جاتا ہے۔ گوناگوں، ہمہ جہتی علمی، ادبی، ثقافتی سرگرمیوں، ذہنی بحث و نزاع و نئے تصورات و اقدار کی نمو کی حد تک دورِ انقلاب کسی طرح کمتر نہیں رہا۔ پیداوار کم و بیش اتنی ہی تیز، اتنی ہی کثیر رہی ہے جتنی پہلے تھی اور نمو کا سلسلہ ہی نہیں تخلیقی ادب میں بھی، جو زیادہ وقیع اور پائدار ہوتا ہے ادبیاتِ علمیہ کا حاصل تصور کیا جاتا ہے، بعض کاوشیں خاصی بلند ہیں۔ اور اپنی مخصوص نوعیت سے آئندہ زیادہ جسارت آمیز کوششوں کی خبر دیتی ہیں۔ ہمارے دور کے یہ علمی، لسانی، ادبی اور فکری نقوش درحقیقت "نقشِ پائے رہرواں" ہیں جن سے ہمارے دور کی امتیازی خصوصیات کا سراغ ملتا ہے اور ان کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

اس سلسلے میں ہماری نظر سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ کی "نقدِ میر" پر پڑتی ہے جس پر انقلابی حکومت کی قدرداں و تحسین آمیز نظرِ انتخاب پہلے ہی پڑ چکی ہے۔ اس میں نقاد کا مخصوص عالمانہ محققانہ انداز تنقید اپنی پوری بلندی پر ہے۔ تنقید شواہد پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں محاکماتی ہونے کی کوشش نمایاں ہے۔ یہ بات یقیناً انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے کہ میر کسی زمانہ میں وہ میر نہ تھا جو بعد میں "خدائے سخن" بن گیا۔ اور اپنے حساب کے مطابق شاعری کی مکمل اکائی تھا۔ زیادہ کڑی جانچ پر یہ احساس باقی رہ جاتا ہے کہ شاعر کو تنقید کی کسوٹی پر پوری طرح نہیں کسا گیا۔

"مقاماتِ اقبال" میں اسی کارآزمودہ قلم کی جولانی ایک جدید شاعر پر وقف عمل نظر آتی ہے۔ کتاب میں جہاں نقاد نے اقبال کے افکار و کلام کے بعض نادر گوشے اُجاگر کئے ہیں وہاں اُس برتر سطح سے نظر نہیں ڈال سکا جو پوری طرح "انا" "خود" کی خبر دے۔ اقبال کے فکر و فن میں مستعار عنصر کتنا ہے اور ان پر کتنا اثر ڈالتا ہے، کیا ان کے تصورِ "خود" اور صوفیا کے تصورِ روح میں کوئی فرق تھا؟ کیا فنا کے معنی حقیقۃً و کلیتہً فنائے ذات تھے؟ کیا صوفیا کا نقطۂ نظر واقعی منفیاتی تھا؟ اور پھر اقبال کے کلام و فن کا زیادہ "دقتِ نظر" سے جائزہ۔ ان وجوہ کی بنا پر ناظر اقبال سے قریب و دور کے مرحلے ہی میں رہ جاتا ہے۔

سید عابد علی عابد کی "تلمیحاتِ اقبال" ایک اور انداز سے ہمیں شاعر کے قریب تر لانے کی کوشش ہے۔ فکر و نظر، تحقیق اور وسیع علمی پس منظر اس نقاد کا بھی طرۂ امتیاز ہے۔ اس کی کاوش تلمیحات کی تہیں کھود کھود کر ان کی بنیاد تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔

اصولِ تنقید پر ایک جدید تصنیف کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ حسنِ اتفاق سے یہ ضرورت بھی دورِ انقلاب ہی میں پوری ہوئی ہے۔ سید صاحب نے اپنی ضخیم کتاب "اصولِ انتقادیات" میں اس اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جس سے اُمید ہے فکر و نظر کی راہوں کو روشن تر کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

وہ ادبی جو لاانگلی محمد حسن عسکری ایک عرصہ خاموش رہنے کے بعد پھر چلا
۔ اور ماہنامہ "سات رنگ" کے لئے بالالتزام لکھ رہا ہے یا ماہنامہ "جدید رجحانات
نکاس سب سے عسکری کے ساتھ بعض نئی آوازیں بھی لئے ہوئے ہے۔ عسکری کی
شت اور یہ نئی آوازیں کہیں نئے، بدلتے ہوئے ماحول ہی کا نتیجہ تو نہیں؟

انقلاب کے چند ہی ماہ بعد اصلاح و تجدید کے ناگزیر تقاضے ایک مضمون "ادب
ب کی تشکیل نو" پر منتج ہوئے جسے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ادبی و ذہنی
قلاب کا پیش خیمہ قرار دیا۔ اس مضمون پر انجمن ترقی اردو پاکستان کے رسالہ "قومی زبان"
ں تقریباً اُسی وقت سے تمام برصغیر کے اہل الرائے میں بحث و نظر کا سلسلہ جاری ہے۔
ے سے ظاہر ہے کہ مضمون میں جو سوال اٹھائے گئے تھے وہ بہت ہی بنیادی نوعیت
کے تھے۔ اور وہ اب بھی باقی ہیں۔ ان کا حل تلاش کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ہماری
ئندہ ہر گونہ ترقی کا دارومدار اسی پر ہے خواہ اس کا تعلق زندگی سے ہو یا ادب و فن
ے۔ اس مضمون کی تہہ میں جو بنیادی احساس کارفرما تھا وہ بدقسمتی سے محسوس نہیں کیا گیا۔
صنفِ ادب میں سب سے اہم سوال ہے: اُس کی اٹھان' اس کا تصور۔ ایک ہی بات
ئی سطحوں پر پیش کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا سوال محض ادائیگی کا نہیں' ادائیگی کی سطح کا ہے'
لکھنے والے کے اعلیٰ یا ادنیٰ تصور کا ہے' پیشکش کی معمولی یا غیر معمولی اٹھان کا ہے۔ لہٰذا
جس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ادب اور تنقید کی اٹھان کو بلند کرنے
کے لئے کیا کرنا چاہئے، اس کے لئے کیا تدابیر ضروری ہیں۔ آئندہ ہماری کوششیں اس
بنیادی بات کو توضیح کے لئے وقف ہونی چاہئیں۔

شاعری میں بعض رہرؤوں کے قدم خاصے تیز بھی رہے ہیں اور بھاری بھی۔
"سرو در رفتہ"، "سلومی"، "غزل الغزلات"، "زنجیرِ رمِ آہو"۔ پے در پے نئے نئے قدم' تیز تیز'
سراپا رمِ آہو جسے شاید ہی زنجیر کیا جا سکے۔ اور پھر "زرداغِ دل" جیسی ضخیم تصنیف کے
بعد! اگر کسی دور کی ہماہمی کا اندازہ شعرا و ادبا کی والہانہ سرگرمی سے لگایا جا سکتا ہے تو
عبدالعزیز خالد کی یہ مسلسل کاوشیں اس کا بین ثبوت ہیں۔ شعری و فنی خصوصیات سے قطع نظر
جس نفاست اور خوش سلیقگی سے ان شعری مرقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ طباعت میں
ایک نئے ذوق کی خبر دیتی ہیں۔ اگر قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک مقامی و محلی رو دوں کے
ساتھ ساتھ آفاقی دھارے بھی موجود رہے ہیں جو روز بروز زیادہ گمبھیر ہوتے چلے جاتے
ہیں اور ایک نئے شعور کی خبر دیتے ہیں' تو خالد' جعفر طاہر' عاصمہ حسین' شہاب رفعت
اور اختر حسن جیسے شاعروں میں ان کی خاص جھلک دکھائی دے گی۔ اگرچہ ان کے ساتھ
ساتھ رشید قیصرانی' ڈاکٹر خالد اختر صدیقی' یوسف ظفر' احمد ندیم قاسمی' ابن انشا'
ضیا جالندھری اور سیف الدین سیف جیسے بہت سے شاعر بھی بہ تقاضہ انقلاب کی ادبی
سرگرمیوں میں شریک ہیں۔

کہنہ مشق شاعروں میں حفیظ ہوشیارپوری غزل کی راہ کا منزل نما ہے۔ سیماب کا نام
قابلِ ذکر ہے جن کا مجموعہ کلام "غزل معلیٰ" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کو اردوئے
معلی کے ساتھ کتنی ہی گہری مناسبتیں ہیں۔

جن شاعروں نے غزل ہی کے ساز کو اپنایا ہے اور اس کے ذریعے اپنے تاثرات
کی ترجمانی کی ہے ان میں سے ایک شہرت بخاری ہے جس کا مجموعہ کلام ابھی ابھی منظرِ عام پر
آیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے بے شمار ہمنوا اور بھی ہیں۔ معدوم عابد' قتیل شفائی' عارف
عبدالمتین وغیرہ۔

منیر نیازی چھوٹی چھوٹی نظموں کا شاعر ہے جس نے "تیز ہوا اور تنہا پھول" میں
ایک نہیں کئی پھول پیش کئے ہیں۔ اس مجموعہ کی بعض نظموں میں ایک خاص فضا اور پُراسرار
سی وضع جھلکتی ہے' جو ایک نرالی خصوصیت ہے۔

حبیب جالب کا مجموعہ "برگِ آوارہ" شاعر کے بعینہٖ حسبِ حال ہے۔ اور
شاعری نہیں اپنی دھرتی سے بچھڑے ہوئے کئی بے خانماں انسانوں کی علامت ہے جو
بدقسمتی سے گلیوں گلیوں مارے مارے پھرتے رہے ہیں۔ جالب میں ان ہی لوگوں کا تلخ
احساس نوا پاتا ہے جو کبھی کبھی سنک کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

اختر حسن کا سرمایہ اچھوتا تخیل' اچھوتا بیان' اور رچا ہوا نازک احساس ہے۔
ان سے وہ ایک عجیب انفعالی و تاثراتی دنیا تعمیر کرتا ہے جسے آپ چاہیں تو تحت الشعور
کی بوالعجب دنیا کہہ لیں۔ اس کے ترکش کے تیر ظاہر ہے' ایما و اشارہ' کنایہ و تمثیل
ہی ہو سکتے ہیں جو اس دنیا کی عکاسی کا حق ادا کر سکیں۔

ایسے ہی ایک اور شاعر' مادھو' کا بھی آج کل چرچا ہو رہا ہے۔ گو ابھی ان
میں کوئی ایسے نکھرے ہوئے تیور نظر نہیں آتے۔

"آتش خنداں" کے مصنف لبیب تیموری مرحوم وہ کہن سال نامور ان
میں سے تھے جنہوں نے دیارِ پاک کا خواب دیکھا اور یہاں پہنچ کر اسی کی بہاریں آغوش
میں سو گئے! ان کی ایک پوری نظم پاکستان اور کراچی کے بارے میں پیشگوئی کی حیثیت
رکھتی ہے۔

پیچ و خم کھاتی ہوئی راہوں سے ہوتے ہوئے ہم بالآخر "مینائے غزل"
اور "حرفِ جنوں" تک پہنچ جاتے ہیں۔ "مینائے غزل" نے بعض صحافتی محفلوں میں
ایک عرصہ ہنگامہ برپا کئے رکھا۔ وہ صلاحیتیں جو اس مجموعہ میں ابھر نہیں سکی تھیں
"حرفِ جنوں" میں پوری طرح ابھر کر دو آتشہ بن گئی ہیں۔ دونوں مجموعوں میں دور نگاہ
کی بھرپور قیمت نمایاں ہے۔ شاعر کے نزدیک تصوریت اور قیمت ایک ہی چیز
کے دو نام ہیں۔ اس لئے وہ آسمان کو بھی کھینچ کر زمین پر لے آتا ہے۔ اور سیاسی
و معاشرتی ذوق و شوق کو شاعری میں سمو دیتا ہے مگر اس طرح کہ شاعری کا پیرایہ ...

بشیر فاروقی کے شعر سکا طرح اس کی شاعری بھی دورِ حاضر کے شر خیز ماحول سے ابھرتی ہے اور اپنے دامن میں فکر و احساس کے وہ تمام دفینے لئے ہوئے ہے جو نیرنگی حوادث اور حالات و ظروف کی تہ سے کارواں در کارواں اٹھا اٹھ کر حساس انسانوں کے دل و دماغ پر چھاتے رہے ہیں۔

شوکت صدیقی کے ضخیم واقعاتی ناول "خدا کی بستی" میں معاشرہ کی یک رخہ تصویر کھینچ کر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہی اس کی صحیح تصویر ہے۔ ایسے ناولوں میں زندگی، کردار، واقعات، جزئیات اور پلاٹ قصداً ایسے چنے جاتے ہیں جن سے مطلوبہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔ لیکن یہ کبھی یقین انگیز نہیں ہو سکتے۔ ان حدود کے تحت "خدا کی بستی" خاصا دلچسپ اور کامیاب ناول ہے۔ اس میں ناول نویسی کے وہ سارے گر بڑی چابکدستی سے برتے گئے ہیں جن سے دلچسپی آخری وقت تک برقرار رہتی ہے۔ یہ اس دور کا بہت عبرتناک مرقع ہے جس نے دورِ انقلاب سے پہلے "خدا کی بستی"۔ پاکستان۔ کو جہنم بنا رکھا تھا۔

قرۃ العین حیدر مزاج، ذہنیت، تصور، اسلوب، فن ہر اعتبار سے شوکت صدیقی کی ضد ہے۔ ایک تمام تر ذہنیاتی، دوسرا بالکل واقعاتی۔ شوکت صدیقی زندگی کو عام چلتی پھرتی سطح پر دیکھتا ہے۔ قرۃ العین اس سے بلند رہ کر زمان و مکاں کے پورے گھیر اور اپنے تصور کی روشنی میں دیکھتی ہے۔ ایک بے پایاں پھیلا ہوا سلسلہ۔ ایک آگ کا دریا۔ بناتا بگاڑتا، نت نئے سانچوں میں ڈھالتا۔ اس کی داستان تاریخ یا وقت کے لامتناہی بہاؤ کا دوسرا نام ہے۔ سوال یہی پیدا ہوگا کہ ہم اسے ناول کہیں یا تاریخ یا سیلانِ وقت۔ بہرحال یہ زندگی کا بھرپور مرقع ضرور ہے۔ تمام تر خواص کا ناول۔ اس کا تصور اونچی عالمانہ، آفاقی سطح پر کیا گیا ہے۔ اور اس کے مطابق جدید ترین رجحانات میں رچی ہوئی تکنیک بھی اپنائی گئی ہے۔

ایسے ناول کو اسی سطح ہی سے دیکھنا مناسب ہے جس پر وہ لکھا گیا ہے۔ ایسا ادب اور ادیب ہمیشہ مقامی حدود اور رسوم و قیود سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس بات کا سہرا دورِ انقلاب ہی کے سر رہے گا کہ اس میں ایک ایسا منفرد قسم کا ناول لکھا گیا ہے۔

قدسیہ بانو کا ناولٹ "پروا" ایک پرلطف انقلابی رومان ہے۔ جو دورِ انقلاب کی ساحرانہ کشش کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے دورِ انقلاب ہی میں قلم اٹھایا اور اسی میں اپنے دھرتی میں ڈوبے ہوئے افسانے تحریر کئے ہیں۔ اس کے ناول "تلاش بہاراں" نے کم از کم ضخامت کے اعتبار سے "آگ کے دریا" کو بھی مات کر دیا ہے۔ الطاف فاطمہ کا ناول "نشانِ محفل" دورِ انقلاب کی افسانوی پیداوار میں ایک اہم اضافہ ہے۔

پاکستانی خواتین میں آمنہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز جہانی بانو کا

شفقت دورِ انقلاب میں بھی برابر قائم رہا ہے۔

افسانوں کے مجموعوں میں دو قابلِ ذکر ہیں "نیرنگ حنا" اور "جاڑے کی چاندنی"۔ پہلے مجموعے کے متعلق کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ کیونکہ ہم سب اس کے مصنف، احمد ندیم قاسمی کے جوہروں اور اندازِ افسانہ نگاری سے بخوبی واقف ہیں۔ اس مجموعے میں ایک منجھا ہوا، ہر سو خرام قلم ہر کہیں اپنے مخصوص تیور دکھاتا ہے۔ دو حالیہ افسانوں "ہذا من فضل ربی" اور "گھر سے گھر تک" میں اٹکھیلیاں کرتے جس طرح "قصہ" بیان کیا گیا ہے وہ احمد ندیم قاسمی ہی کا حصہ ہے۔

"جاڑے کی چاندنی" غلام عباس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کا نام مصنف کی افتادِ مزاج کے ساتھ گہری مناسبت رکھتا ہے۔ جاڑے اور چاندنی ــــ خنک، سیمیائی، ٹھہرے ٹھہرے۔ لہذا افسانوں میں ایک حکیمانہ وضع ہے۔ زیادہ تر یہی احساس غالب رہتا ہے کہ افسانے جستہ جستہ مشاہدات ہیں۔ جہاں بعض افسانوں میں اچانک انجام کی تکنیک کامیاب نظر آتی ہے وہاں بہت سے افسانوں میں واقعہ و فسانہ کے امتیاز کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض افسانوں کی تکنیک اس لئے بحث انگیز ثابت ہو سکتی ہے کہ ان میں مقررہ نتیجہ تک پہنچنے کے لئے واقعات التزاماً ترتیب دیئے گئے ہیں۔ بہرحال ان افسانوں میں ایک مشاق، دیدہ ور فن کار کی ذہانت ضرور کارفرما ہے۔

سیر و سیاحت سے متعلق ایک تصنیف "یورپ نامہ" ہے جس میں حکیم محمد سعید دہلوی صاحب، بانی ہمدرد دواخانہ (پاکستان) نے اپنے سیر و سفر کے نقوش اس انداز سے قلمبند کئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہم انہیں بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔ ایسے سفرنامے، جو معلومات کا ذخیرہ ہوتے ہوئے ادبی حیثیت سے بھی وقیع ہوں اور خاص پاکستان کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملی افادہ کی غرض سے ترتیب دیئے گئے ہوں، ذہنی افق کی توسیع کے لئے نہایت اہم اور کارآمد ہیں۔ یہ لفظاً و معناً نقوش ہائے رہرواں ہیں جو دوسروں کے لئے حکمت ہی کی اصطلاح میں، سرمۂ بینش ثابت ہوں گے۔

دورِ انقلاب کی سرگرمیوں کا ایک اہم پہلو سائنس جیسی اہم چیز پر توجہ ہے۔ ایک نوجوان مصنف ایم۔ ایچ۔ مسعود بٹ نے "ایٹم سے ایٹم بم تک" کے عنوان سے ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے جسے بابائے اردو نے بڑی تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔

ایسی ہی ایک اور اہم علمی تصنیف "صحت کی کہانی ایک ڈاکٹر کی زبانی" ہے۔ جس کا مصنف ڈاکٹر ہوتے ہوئے ایک اچھا افسانہ نگار بھی ہے۔ ڈاکٹر محمد نصیر الدین احمد۔ اسی لئے اس کے ہاتھوں میں صحت کی کہانی واقعی ایک دلآویز کہانی معلوم ہوتی ہے۔

اور جہاں تک نظر دوڑائی جائے ایسے نقوش دستیاب ہوتے ہی جاتے ہیں، نئے نئے راہرو پرانے رہروؤں کے ساتھ دل کی پنہائی میں جھنڈے گاڑتے جاتے ہیں۔ ہر نیا سال اپنے ساتھ ایسے کتنے ہی نقوش لائے گا۔ اور یہ سلسلہ مزید طول و عرض میں ہوتا جائے گا۔

آزاد کا سفرِ ترکستان

آغا محمد اشرف

ہم آغا صاحب کے مضمون کو بجنسہٖ پیش کر رہے ہیں۔ "از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم"۔ ڈاکٹر صادق کو اس مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اور وہ آئندہ شمارہ میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمائیں گے۔ (مدیر)

جولائی ۱۹۶۰ء کے "ماہِ نو" میں ڈاکٹر محمد صادق صاحب کا مضمون "آزاد بہ حیثیت انشار پرداز" میری نظر سے گذرا۔ اس کے تعارفی نوٹ میں مدیر ماہِ نو کا یہ عجیب دعویٰ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ:

"آزاد کے سفر ایران کا مقصد سیر و سیاحت نہ تھا، سیاست تھا، اس پر موصوف (ڈاکٹر صادق) کا ایک مضمون ماہِ نو جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔"

جب ماہِ نو کے جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں ڈاکٹر صادق کا مضمون بعنوان "آزاد کا سفر ایران" پڑھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ مضمون کی پہلی ہی سطر میں ڈاکٹر صادق نے ٹھوکر کھائی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مولانا محمد حسین آزاد دو دفعہ ایران گئے۔ پہلی بار غالباً ۱۸۶۵ء اور دوسری دفعہ ۱۸۸۵ء میں۔"

اگر یہ بیان کسی طالب علم کا ہوتا تو قابل اعتنا نہیں تھا لیکن یہ تحریر ایک ایسے شخص کی ہے کہ جسے پنجاب یونیورسٹی سے آزاد کی علمی زندگی پر مقالہ لکھنے کے صلے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند ملی ہے۔ اس لئے میں اس مبحث پر روشنی ڈالنی ضروری سمجھتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ آزاد نے ایران کا سفر اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ کیا تھا۔ اور وہ ۱۸۸۵ء میں صرف علمی اور ادبی مقاصد کے پیش نظر ایران گئے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں ایک پولیٹیکل مشن کے ساتھ آزاد نے وسط ایشیا میں اسلامی ریاستوں کی سیاحت کی تھی۔ لیکن جس علاقے کی آزاد نے ۱۸۶۵ء میں سیاحت کی تھی اسے کوئی شخص ایران نہیں کہتا۔ بلکہ صدیوں سے یہ ترکستان کہلاتا چلا آیا ہے۔ ڈاکٹر صادق نے سعدی کا یہ شعر ضرور پڑھا ہوگا:

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است

آزاد کی وسط ایشیا کی سیاحت کا مفصل حال میں نے انڈیا آفس کی رپورٹوں سے اخذ کرکے حال ہی میں "انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب سے آزاد کے سفر ترکستان کے حالات پہلی مرتبہ اس تفصیل سے شائقین کے سامنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر صادق اور مدیر ماہِ نو نے ایران اور ترکستان کو ایک ہی علاقہ سمجھنے میں ایک بنیادی غلطی کی ہے۔ حالانکہ آج تک مشرق اور مغرب کے جغرافیہ دانوں نے کبھی ترکستان کو ایران نہیں کہا۔ دسویں صدی عیسوی میں فردوسی نے پہلی بار اس علاقے کو 'توران' کا نام دیا تھا۔ اس سے پہلے عرب جغرافیہ داں ہمیشہ اس سرزمین کو ماوراالنہر کا علاقہ کہتے رہے۔ اور ایران اور ماوراالنہر کی سرحد جیحوں کو قرار دیا۔ بابر نے بھی اپنی تزک میں اس علاقے کو ماوراالنہر کے نام سے منسوب کیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ آزاد نے ترکستان کی سیاحت کیوں کی تھی۔ اس کے متعلق اس وقت یہ کہنا کافی ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں زارِ روس کے لشکر روس کی سرحد سے نکل کر جنوب کی جانب حرکت کر رہے تھے۔ اور ترکستان کی اسلامی ریاستیں، بخارا، سمرقند اور خیوہ کو روسیوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ انگریز خوب جانتے تھے کہ اگر روسی سیلاب کو جنوب کی طرف بڑھنے سے نہ روکا گیا تو ایک دن یہ طوفان افغانستان کو روندتا ہوا ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں سے ٹکرانے لگے گا۔ طاقت ور ملک کمزور ہمسایوں

پر حملہ کرنے کا ہمیشہ کوئی عذر تلاش کر لیتے ہیں۔ چنانچہ روس نے بھی ترکستان کی اسلامی ریاستوں کی طرف بڑھنے کا یہ حیلہ تراشا تھا کہ روسی سوداگر جب اس علاقے سے گزرتے ہیں تو اُن کے جان و مال کی حفاظت کوئی نہیں کرتا۔ ترکمان قبیلے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ اور سمرقند اور بخارا کے بازاروں میں روسی باشندوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جاتا ہے۔

انگریزوں نے روسیوں کے اس عذر کی کاٹ کے لئے ترکستان کے امیروں اور حاکموں کو بہتیرا سمجھایا کہ اپنے علاقوں کا بندوبست اور نظم و نسق بہتر بنالیں مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ بلکہ الٹا انگریز ایلچیوں کو پکڑ کر بند کر ڈالا۔ ترکستان کی ریاستوں میں اُس وقت طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اور خانہ جنگی کا بازار اس قدر گرم تھا کہ مقامی امیر کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ روسیوں نے انیسویں صدی کے نصفِ اول میں ترکستان پر قبضہ کر لیا۔ اور خیوہ۔ بخارا۔ سمرقند اور خوقند کے علاقوں پر فوج کشی شروع کر دی۔

۱۸۶۵ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ جان لارنس کے ایما پر پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ نے ترکستان کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک سیاسی مشن بھیجا تھا۔ اس کے لیڈر پنڈت من پھول[1] تھے جو ان دنوں لفٹنٹ گورنر پنجاب کے میر منشی تھے اور قدیم دلّی کالج میں عربی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اُن کے ہمراہ آزاد اور پشاور کے منشی فیض بخش گئے تھے۔ ایک اور شخص کرم چند نند رام، جو غالباً شکار پور سندھ کا رہنے والا اور ذات کا سنار تھا، پنڈت من پھول کے نجی ملازم کی حیثیت سے اس مشن کے ہمرکاب گیا تھا۔

اس مشن کے ممبروں کو چونکہ خفیہ طور پر ترکستان بھیجا جا رہا تھا اس لئے بنظر احتیاط ان کے نام بھی بدل دیئے گئے تھے۔ مثلاً پنڈت من پھول، بھائی دیوان سنگھ مہاجن بن گئے۔ آزاد نے بہاءالدین کا نام اختیار کیا اور ایک طالب علم کی حیثیت سے سفر میں شریک ہوئے منشی فیض بخش کا نام غلام ربانی تجویز ہوا اور یہ ایک افغان تاجر کے لباس میں سفر پر روانہ ہوئے۔ البتہ کرم چند نے اپنا نام نہیں بدلا تھا۔

آزاد نے سفر ترکستان کا ذکر سخندانِ فارس اور دربارِ اکبری میں بار بار کیا ہے۔ اور ان حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ اس سفر کی غایت سیاسی تھی، لیکن آزاد کو جہاں موقعہ ملتا تھا تاریخ، فلالوجی اور ادب کے نکتے جمع کرتے جاتے تھے۔

آزاد نے ایران کا سفر اس کے ۲۰ سال بعد ستمبر ۱۸۸۵ء میں کیا تھا اور تقریباً گیارہ مہینے بعد جولائی ۱۸۸۶ء میں قندھار اور کوئٹے کے راستے لاہور واپس آ گئے تھے۔ ڈاکٹر صادق کا یہ کہنا کہ آزاد کے سفر ایران کا مقصد سیاست تھا، واقعات کے خلاف ہے۔ اور آزاد سے سراسر بے انصافی ہے۔ سیر ایران کے نام سے اس سفر کی روئداد چھپ چکی ہے۔ اس کے شروع میں وہ لیکچر شائع ہوا ہے جو سفر ایران کے بعد آزاد نے لاہور کے ایک جلسے میں دیا تھا۔ اور جسے سننے کے لئے دُور دُور سے آزاد کے پرستار لاہور آئے تھے۔ اس لیکچر سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر ایران آزاد نے ان مقاصد کے لئے کیا تھا۔

لاہور میں کوئی ایسا کتب خانہ موجود نہیں تھا کہ جہاں سے علم کے پیاسے ادبی ذوق کی تسکین کرتے۔ آزاد خود فرماتے ہیں:

"ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی اور یونیورسٹی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی..... بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی، وہ بھی نہ ملتی تھی"۔

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا دلّی کا کتب خانہ ۱۸۵۷ء میں تباہ ہو چکا تھا۔ آزاد کی دلی آرزو تھی کہ لاہور میں بھی ایک ایسا کتب خانہ قائم کریں کہ جہاں نایاب کتابوں کے ذخیرے جمع ہو جائیں۔ اسی لیکچر میں آزاد نے اس تمنا کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ایک کتب خانہ نظر گاہِ خاص و عام میں آراستہ کروں اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں کہ کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے"۔

سفر ایران کی دوسری وجہ یہ تھی کہ آزاد کی چند تصانیف کے مسودے غیر مکمل پڑے تھے۔ اور آزاد ان کی تکمیل کے لئے ایران کے ادیبوں اور فاضلوں سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سخندانِ فارس اور قند پارسی اور آموزگارِ پارسی اسی سفر کی یادگار رہیں۔ آزاد کا ارادہ

(باقی صفحہ ۱۰۰ پر)

---

[1] ڈاکٹر صادق نے اپنے مضمون میں اس مشن کا لیڈر ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر کو لکھا ہے۔ جو گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ مگر یہ بیان درست نہیں۔ انڈیا آفس کی رپورٹ سے اس بیان کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔

رحمتِ عامِ خضر

آفاق حسین آفاق

اس شمارہ کے سرورق پر سکھر بیراج کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ اُس بے بہا چیز کی علامت ہے جسے ہم آزادی کے بعد بٹوارے کے باعث، ایک حد تک کھو چکے تھے۔ پانی جس پر مغربی پاکستان کی شادابی و خوشحالی کا دارومدار ہے۔ اور جو آبادیوں کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ انقلابی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت یہ کھوئی ہوئی نعمت "آب رفتہ بجوئے" کے مصداق ہمیں پھر ہاتھ آگئی ہے۔ کیسے ؟ اس کی کیفیت درج ذیل مضمون میں ملاحظہ فرمائیے۔ (مدیر)

بہت عرصہ کی بات ہے جب آزادی کا دور دورہ ہوا اور اسکے ساتھ ہی قدم سے آبادیوں کی طرح دریا بھی تقسیم ہو گئے۔ کچھ دریا اُدھر ہو گئے اور کچھ اِدھر۔ اور نعمت آب بھی تقسیم ہو گئی تو اس پر ہمارے افسانہ نگار منٹو مرحوم، کو اپنا افسانہ "یزید" لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور اس نے کہا دیکھیں یہ نعمت ہمیں کون واپس دلواتا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر بھی پکار اٹھا تھا کہ

نعمت آب بھی تقسیم ہوئی   رحمتِ عامِ خضر کب ہو گی ؟

اب ہمارے "افسانہ نگار" اور ہمارے شاعر، دونوں کو ان کا جواب مل گیا ہے۔ افلاک سے آخر نالوں کا جواب آ ہی گیا ہے اور وہ چیز جس کی خواب و خیال میں بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ رحمت خضر اب فی الحقیقت عام ہو گئی ہے۔ سننے کو ہم یہی سنا کرتے تھے کہ پیاسا چشمے کی طرف جاتا ہے۔ چشمہ پیاسے کی طرف نہیں آتا۔ لیکن اب کے خود چشمہ ہی ہمارے پاس آ گیا ہے۔ نہریں اور نہروں کا پانی جو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ طاس سندھ کے دریاؤں کے معاہدہ کی صورت میں خود ہی چل کر ہمارے پاس پہنچ گیا ہے۔ نگر نگر، قریہ قریہ گاؤں گاؤں، بستی بستی اور گھر گھر۔ اس سے بڑھ کر ہماری خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔

نہری پانی کا یہ قضیہ کچھ پاکستان کی گھٹی ہی میں پڑ گیا تھا یعنی بصورت خرابی کی اس کی تعمیر ہی میں مضمر تھی، کیونکہ جن حالات کے تحت اور جن ہاتھوں سے تقسیم کی کارروائی عمل میں آئی ہوں انہیں نے اِدھر کی دھرتی اُدھر اور اِدھر کے دریا اُدھر کر دیئے اور اس کے ساتھ اس شاندار نظام آبپاشی کا بہت سا حصہ بھی جو گزشتہ سو سال کی مسلسل جدوجہد سے تیار کیا گیا تھا پاکستان کے کوئی چار کروڑ انسانوں کا سہارا "جو کم و بیش ۲۳ کروڑ ایکڑ زمین کو سیراب کرتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان ان دریاؤں سے محروم ہو گیا جو اس کے ہونے چاہیے تھے جو اس علاقے کے لئے رگ جان کی حیثیت رکھتے تھے اور آبپاشی و زراعت کا دارومدار انہیں پر تھا۔ ان دریاؤں اور ان کے نظام آبپاشی کے بغیر مغربی پاکستان، جو بڑی حد تک بنجر علاقہ ہے اور اس میں بارش بھی کم ہی ہوتی ہے، بالکل صحرا بن جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان اور زمینیں پانی جیسی ضروری اور زندگی بخش چیز سے محروم ہو جائیں دریاؤں کے علاوہ پاکستان ان علاقوں سے بھی محروم ہو گیا جن میں ان کے منبعے واقع تھے ان علاقوں اور دریاؤں پر ہندوستان کا پورا پورا قابو تھا اور وہ جیسے چاہتا ان کو استعمال میں لاتا اور ضرورت پڑے تو دریاؤں پر بند باندھ کر پاکستان پہنچنے سے روک بھی دے جیسا کہ فی الحقیقت ہوا بھی اپریل ۱۹۴۸ء میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہندوستان نے تمام نہروں کا پانی بند کر دیا اور پاکستان کو نہ صرف انسانوں حیوانوں اور فصلوں کے نقصان کا سامنا کرنا پڑا جس کا نتیجہ ایک شدید تنازعہ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا ؟ شومئی قسمت سے

انتقال اختیارات کی عجلت میں نظام آبپاشی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا لہٰذا اہل پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا کہ یا تو غم و غصہ اور غیظ و غضب سے کام لیا جائے یا ان دریاؤں اور علاقوں کی بازیافت کے لئے جنگ برپا کی جائے جس کے خدشے اور مضرات ظاہر ہیں۔ تیرہ سال یہی کشمکش کا عالم رہا۔ جنگ و جدل کے سوا اس سنگین قضیہ کا کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پاکستان ہندوستان کے خلاف شکایات کا دفتر اور غیظ و غضب کا طوفان لئے بیٹھا تھا اور ہندوستان پاکستان کے خلاف، زندگی کا کوئی میدان ایسا نہ تھا، خواہ وہ تعلقات خارجہ ہوں یا دفاع، اقتصادیات ہوں یا تجارت و صنعت جس میں یہ کشیدگی نہ پائی جائے۔ اور اس کے باعث بین الاقوامی سیاست میں بھی گوناگوں پیچیدگیاں دکھائی دیتی تھیں۔ پاکستان کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا تھا کہ وہ اسے بین الاقوامی اہمیت کا معاملہ قرار دے۔ اور یہ کہے کہ اس کا بین الملی قانون و انصاف کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جب براہ راست حکومت ہندوستان سے گفت و شنید بے کار ثابت ہوئی تو پاکستان نے بین الاقوامی عدالت ہی کی طرف رجوع کیا۔ مگر مدتوں اس کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ جب ایک عرصہ اسی طرح سیاسی بنا پر حل تلاش کرنے کی کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں تو ارباب فہم کوئی اور مصالحانہ تلاش کرنے کی تدبیر کرنے لگے ما تفاق سے ایسے معاملات کے ایک ماہر، مسٹر ڈیوڈ ای لیلنتھال نے جو امریکہ کی مشہور ٹینیسی ویلی اتھارٹی کے سابق صدر تھے، ایک بڑی عمدہ تجویز پیش کی یعنی یہ کہ کیوں نہ ہندوستان و پاکستان کے ماہرین مشترکہ بنیاد پر وسائل آب کا ایک عظیم الشان ہمہ گیر تعمیری منصوبہ تیار کریں بشرطیکہ عالمی بنک اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عملی امداد کی حامی بھرے۔ عالمی بنک کے صدر، مسٹر یوجین بی بلیک، نے کہا کہ اس صورت میں دونوں ملک بنک کے توسل سے طاس سندھ کے پانی کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دونوں ملکوں نے مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کی تجاویز قبول کر لیں۔ اور اس باب میں مزید کارروائیوں کا سلسلہ زور و شور سے شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ فریقین کے لئے تسلی بخش معاہدہ کے امکانات اسقدر وسیع ہو گئے کہ پاکستان نے جون ۱۹۵۹ء میں عالمی بنک کی تجاویز کے مطابق واپڈا یعنی واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نامی ادارہ طاس سندھ کے آبی وسائل کی ترقی کے لئے قائم کر دیا۔ یہ اس تبدیلیٔ نظر کا نتیجہ ۔۔ یا گاندھی جی کے الفاظ میں اسے حوصلہ کی تبدیلی تصور کر لیجیے۔ کہ دونوں ملکوں کے سربراہوں نے حال ہی میں ایک مشترکہ اعلامیہ شائع کرنا قرین مصلحت سمجھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اگر ہم کشمکش کو دور کر کے اپنی صلاحیتوں کو ہمسایوں جیسے دوستانہ تعاون و تعامل پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیں تو یہ دونوں ملکوں کو ان کی بنیادی معاشری و اقتصادی ترقی میں بہت مدد دے گا یہی احساس اور بدلا ہوا رویہ تھا جس کے تحت طاس سندھ کے پانی کے پرانے قضیہ پر بھی توجہ مبذول ہوئی جس میں باہمی مفاہمت اور دوستانہ تعاون کے مظاہرے اور ترقی کا خاصا امکان نظر آتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں یہ لائحۂ عمل طے ہوا کہ دونوں ملکوں کے وزرا اور کمیٹیاں وغیرہ مختلف امور، مثلاً سرحدی تنازعوں، جائداد منقولہ، سائینس و ٹکنالوجی، منصوبہ جات اور توسیع تجارت کے لئے وقتاً فوقتاً ملا کریں۔ اس خوشگوار سلسلۂ تعلقات نے طاس سندھ کے پانی کے بارے میں گفت و شنید اور مفاہمت کیلئے زمین ہموار کر دی۔ دولت مشترکہ نیز دونوں ملکوں کے بین الاقوامی خیر خواہوں اور سب سے بڑھ کر خود پاکستان کے دانشمند و معاملہ فہم مدبرین نے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ہندوستان نے بھی حالات کی نزاکت کے پیش نظر صلاح کار اسی میں دیکھی اور اس کا نتیجہ دونوں ملکوں کے مابین نہری پانی سے متعلق تاریخی معاہدہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس معاہدہ میں دونوں ملکوں کی بنیادی رقابت، سیاسی اختلافات اور گوناگوں متنازعہ فیہ امور کے علاوہ کتنی ہی اور دشواریاں سد راہ تھیں۔ اسی لئے گو یہ قضیہ واشنگٹن میں عالمی بنک کے سامنے فیصلہ کے لئے سالہا سال پیش رہا پھر بھی کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو سکا۔ آخر بنک اور خیر خواہ ممالک کی اخلاق و عملی امداد سے ایک ایسے معاہدہ کے لئے زمین تیار ہو ہی گئی جو فریقین کے لئے تسلی بخش بھی ہو اور مفید بھی۔

معاہدہ کے لئے سب سے مقدم ایک سازگار فضا تھی۔ یہ ہمارے یہاں انقلابی حکومت کے برسر اقتدار آنے پر خود بخود پیدا ہو گئی کیونکہ اس سے ملک کا وقار بدرجہا بڑھ گیا اور ہندوستان ہی نہیں تمام ممالک نے محسوس کیا کہ اب ان کا سروکار ایسی حکومت سے ہے جو مضبوط و طاقتور ہی نہیں بلکہ سب سے اپنا لوہا منوا سکتی ہے۔ اور معاہدہ کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ صدر پاکستان کی متحرک نہم باصلاحیت

شخصیت کا رعب ... فوری جواب، شدید واقعیت پسندی، جرأت مندانہ اقدام، انسان دوستی اور ڈنکے کی چوٹ صاف صاف بات کہدینا۔ یہ سب باتیں خوب کارگر ثابت ہوئیں۔

گفت و شنید کے دوران کئی بار پیالہ ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا۔ آخر میں جب معاہدہ تقریباً مکمل ہو گیا تو صرف دو دشواریاں باقی رہ گئیں، ہندوستان مصر تھا کہ مقبوضہ کشمیر کو جہلم اور چناب کے کچھ پانی کے استعمال کا حق دیا جائے۔ مگر وہ پاکستان کی اُس ضرورت کو اس حد تک پورا کرنے کے لئے تیار نہ تھا جو اُسے عبوری دور میں مشرقی دریاؤں سے برابر پانی بہم پہنچائے جانے کے سلسلہ میں پیش آتی تھی۔ جب کہ دوسرا مسئلہ یہ تھا جب کہ ہندوستان کا تو اُن مشرقی دریاؤں کے پانی پر مکمل اختیار ہوگا لیکن پانی حاصل کرنے کے لئے مناسب بندوبست (متبادل تعمیرات) نہ ہونے کے باعث پاکستان کو لازماً شدید نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

پہلی مشکل تو یوں دور ہو گئی کہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کے پاکستان آنے والے پانی کا کچھ حصہ استعمال کرنا منظور کر لیا۔

معاہدہ کی رو سے تین مشرقی دریا۔ راوی، بیاس اور ستلج ہندوستان کے حصے میں آئے ہیں اور سندھ، جہلم اور چناب پاکستان کے حصے میں۔ ان دریاؤں پر دونوں ملکوں کا اپنا اپنا کلی اختیار ہوگا۔ لیکن اس شرط پر کہ دس یا دو تین سال زیادہ کے عبوری دور میں جبکہ پاکستان مشرقی دریاؤں کے لئے متبادل تعمیرات تیار کر رہا ہوگا، ہندوستان اپنے دریاؤں سے پاکستان کو پانی بہم پہنچاتا رہے گا۔ پاکستانی دریاؤں کے سلسلہ میں ہندوستان پابند ہے کہ وہ ان میں پاکستان کے لئے پانی آنے دے تاکہ وہ اسے کسی روک یا بندش کے بغیر کام میں لا سکے۔ ہندوستان کو بھی دریاؤں کا کچھ پانی استعمال کرنے کا حق ہوگا۔

معاہدہ میں پاکستان کے لئے متبادل انتظامات تسلیم کئے گئے ہیں۔ جو ۷ لنک نہروں، ۵ ایراجوں، دو بڑے ذخیرہ بندوں، ٹیوب ویلز اور نکاسی نظام پر مشتمل ہوں گے۔ ان کے بعد ہمیں مشرقی دریاؤں کے پانی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پاکستان ان پر تقریباً ۸۰ کروڑ روپے صرف کرے گا۔ اب تک پانی کو ذخیرہ کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے پانی کی مقدار موسم بموسم گھٹتی بڑھتی تھی نئے انتظامات سے پانی برابر ملتا رہے گا۔ ایک بند دریائے جہلم پر منگلا کے قریب باندھا جائے گا اور پانی نکلنے کی راہ میں مستعد کرنے کیلئے ... دوسرا بند تربیلا کے قریب باندھا جائے گا۔ دونوں بند علی الترتیب ۵۰ لاکھ اور ۴۵ لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہوگی۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ منصوبہ جو نوع انسان کی تاریخ میں اپنی قسم کا سب سے بڑا منصوبہ ہے، کس قدر عظیم الشان ہوگا۔ اس پر ۱۰ ارب روپے لاگت کا اندازہ ہے جن میں سے تقریباً ۴ ارب پاکستان کی متبادل تعمیرات پر صرف ہوں گے۔ اندازہ ہے کہ اس منصوبہ کے مطابق پاکستان کے حصے میں آنے والے دریاؤں کو ۱۳۶ کروڑ ایکڑ فٹ پانی ملے گا۔ جن میں سے ۶۰ لاکھ کو مقبوضہ کشمیر میں صرف کے لئے وضع کرتے ہوئے ۱۳ کروڑ پاکستان کے لئے باقی رہ جائیں گے۔

منصوبے پر اخراجات کے لئے پانی کے معاہدے کے ساتھ ہی "معاہدہ ترقیاتی فنڈ" بھی ہوا جس پر امریکہ، کئی اور ممتاز ممالک اور عالمی بنک کے نمائندوں نے بھی دستخط کئے۔ اور اخراجات کی کفالت کا اقرار کیا۔ منصوبے کی تکمیل کے لئے ماہرین اور کاریگروں کی ضرورت بھی لازم ہے۔ یہ کام واپڈا کے سپرد کیا گیا ہے۔ جو ہر قسم کے بیرونی ماہرین اور کاریگروں کی خدمات حاصل کرے گا۔

اس سلسلہ میں ایک بہت بڑا مسئلہ کشمیر کا ہے۔ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے اور پانی کے تحفظ کے لئے چناب پر مقبوضہ کشمیر میں بند تعمیر کرنا ضروری ہے۔ صدر پاکستان نے بالکل بجا کہا ہے کہ اب جب کہ پاکستان کے پاس صرف تین دریا رہ گئے ہیں کشمیر کو حاصل کرنے کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ معاہدہ میں ایک خصوصی شق یہ ہے کہ اس سے نہ ہندوستان کا کشمیر پر بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ تسلیم کیا جانا لازم آتا ہے نہ یہ کسی طرح تصفیہ کشمیر پر اثر انداز ہوگا۔

معاہدے کے کئی روشن پہلو ہیں۔ متبادل تعمیرات اور لنک نہروں کی تکمیل سے پاکستان کو اتنا پانی مل سکے گا جس سے پانی کی موجودہ قلت ہی دور نہیں ہوگی بلکہ اور نئے نئے علاقوں کو ترقی دینے کے لئے بھی خاصی مقدار میں پانی مہیا کیا جا سکے گا۔ اس معاہدہ سے ہم آبپاشی کے معاملہ میں ہندوستان کے کنٹرول سے پوری طرح آزاد ہو جائیں گے۔ دریاؤں کو آپس میں ملانا یوں بھی پانی کے بہتر اور زیادہ مقدار میں استعمال کے لئے ضروری اور مفید تھا۔ اس طرح پانی کو استعمال کرنے کا ایک مستقل اور معقول ذریعہ ہاتھ آ جائے گا۔ مقبوضہ کشمیر میں ہندوستان کو دریائے چناب پر ...

معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہلے صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، کا ایک اجتماع خاص سے خطاب جس میں امریکہ کنیڈا، برطانیہ، جرمنی، آسٹریلیا او نیوزی لینڈ کے نمائندے بھی شامل تھے

آب سندھ

۱۹۶۰ء)

صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
(وسط میں)
شری جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہندوستان
(بائیں طرف)
مسٹر ڈبلیو اے۔ بی۔ ایلف، نائب صدر عالمی بنک (دائیں طرف)

کراچی کے ہوائی اڈے پر سلامی

صدر پاکستان کے ساتھ ہوائی اڈے سے شہر میں آمد

شری جواہر لال نہرو کی پاکستان میں آمد

کراچی میں ایک استقبالیہ

مزار قائد اعظم پر

کنٹرول ہوگا۔ ایک عام سال میں دونوں ذخیرہ بندوں کا کچھ پانی مجوزہ کاموں کے علاوہ ترقیاتی مقاصد اور کلر علاقوں کی بازیافت کے لئے بھی دستیاب ہو سکے گا جنہیں اس کی اشد ضرورت ہے۔ دونوں بندوں کی تعمیر سے سیلابوں کی بہتر روک تھام ہو سکے گی جو آئے دن اس قدر تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ منصوبے کے پہلے مرحلے میں وادی ستلج کی نہروں کو پہلے سے زیادہ پانی مل سکے گا اور دوسرے میں اتنا پانی کہ شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

منگلا بند سے ۳ لاکھ ۰ ۴ ہزار کلو واٹ بجلی حاصل ہوگی اور تربیلا بند سے اس سے بھی زیادہ، جس سے ملک کو صنعتی و زراعتی ترقی میں بڑی مدد ملے گی۔ پانچ کروڑ ڈالر کے صرف سے جو ٹیوب ویل لگیں گے ان سے کلر زدہ علاقہ دوبارہ قابل کاشت ہو سکے گا۔ دریائے سندھ کے مغربی طاس کے بعض بنجر علاقے چشمہ بیراج سے پانی ملنے پر قابل کاشت بن سکیں گے۔

یہ تو تھے اس تمے کے ہنر ہی ہنر۔ ان کے برخلاف کچھ عیب بھی ہیں اور بہت واضح۔ اب پاکستان کو صرف تین دریاؤں پر قناعت کرنا ہوگی اور تین مشرقی دریاؤں کے پانی سے دستبردار ہونے پر پانی کی مقدار میں کمی کے باعث کافی نقصان ہوگا۔ پانی مغربی دریاؤں سے بڑے لمبے فاصلوں سے لانا پڑے گا جس سے یہ کافی ضائع ہو جائے گا۔ نہروں کو سیلابوں سے نقصان کا خطرہ بھی رہے گا۔ کیونکہ اتنے وسیع پیمانے پر پانی کا رخ بدلنے سے پانی میں کمی واقع ہوگی۔ جن جن علاقوں سے یہ نہریں گزریں گی ان کے سیم زدہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ آبی ذخیرے تیار ہوتے ہی خراب بھی ہونے لگ جاتے ہیں۔ دونوں بندوں پر ریت کی تہہ جم جم کر انکی عمر کم کر دیتی ہے۔

ایسے پیچیدہ عظیم منصوبے کی تکمیل، جس کی کوئی مثال ہی موجود نہیں، ہمارے ملک کے محدود تکنیکی ماہرین، کاریگروں اور سازو سامان کے وسائل پر مسلسل ۱۰ سال بڑا ہی شدید بوجھ ڈالے گی۔ اور ہمیں لازماً بے شمار بیرونی ٹکنیکل ماہرین، مزدوروں اور کاریگروں کی خدمات بھی حاصل کرنی پڑیں گی۔ تھوڑی ہی مدت میں باہر کا تقریباً دو سو اسی لاکھ روپیہ قرض و امداد کی صورت میں پاکستان آئے گا جس سے پاکستانی سکہ کی قوتِ خرید کم ہو جانے کا احتمال ہے۔ ساتھ ہی عام استعمال کی چیزیں

کم ہو جانے کا اندیشہ بھی ہے۔ چیزوں کی مانگ بڑھے گی اور وہ تمام چکر شروع ہو جائیں گے جو افراطِ زر کے ساتھ پیدا ہوا کرتے ہیں۔ یعنے ہوں گے چڑھتی قیمتیں، بڑھتی گرانی اور بڑھتی بے چینی۔ اس صورتِ حال کی پیش بندی کے لئے حکومت نے اس مجبوری دور کے لئے ۲۰ کروڑ ڈالر کی اشیائے صرف درآمد کرنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن ظاہر ہے صرف اس ہی طرح یہ مشکل حل نہیں ہو سکے گی۔ اس میں تمام قوم کی مشترکہ سعی و کوشش کی ضرورت ہے۔

یہ معاہدہ کچھ دینے کچھ لینے کے اصول پر سمجھوتہ ہے۔ جن حالات سے دونوں ملک دوچار تھے، ان کے پیش نظر اتنا ہی ممکن بھی تھا۔ اس عقدۂ دشوار کو حل کرنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ اگر یہ سلسلۂ حالات جاری رہتا تو پاکستان پانی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتا۔ معاہدہ کے مطابق ہماری نہروں میں مغربی و مشرقی دریاؤں سے پانی کی بہم رسانی کی موجودہ مقدار برقرار رہے گی۔ یہ بہت بڑی کامیابی نہ سہی مگر اتنا تو ہے کہ اب ہم حالات اور روز افزوں ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے نظام آبپاشی کو اور بہتر بنانے کی کوشش کر سکیں گے۔ معاہدہ نے ایک بڑا ہی دشوار اور پیچیدہ مسئلہ حل کر دیا ہے۔ جس پر لاکھوں انسانوں کی زندگی اور معیشت کا دارومدار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی اقتصادی بہبود اور باہمی خوشگوار تعلقات کے لئے اس دیرینہ مسئلے کا حل تلاش کرنا لازمی ہو گیا تھا جو بارہ سال سے مسلسل ہمارے اعصاب پر سوار تھا۔ جیسا کہ صدر پاکستان نے ارشاد فرمایا ہے یہ کوئی مثالی حل تو نہیں۔ اور ایسے حل، سچ پوچھئے تو دستیاب بھی کہاں ہوتے ہیں! لیکن حالات کے تحت اس سے بہتر حل ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ بیشتر حالات ہمارے خلاف تھے۔ لہٰذا یہ بات ہمارے لئے یقیناً بڑی دلچسپی کا باعث ہے کہ ایک بڑی ناگوار صورتِ حال سے مفر پیدا ہو گیا ہے۔

اب جب کہ دونوں ملکوں میں سمجھوتہ ہو گیا ہے دیگر امور میں بھی زیادہ خوشگوار تعلقات کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ اس طرح تعاون کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے وہ دونوں کے نزاعی مسئلوں کو نپٹانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی اور ایک نئے خوشگوار دور کا آغاز ہو سکے گا۔

ایک خاتون پیکر تراش — مس نویرہ احمد

رفعت جاوید

تو کبھی بت خانہ آذر کھلا ——— پچھلے دنوں کچھ یہی کیفیت ڈھاکہ کی ایک نمائشِ فن میں دکھائی دی جس میں مشرقی پاکستان کی ایک پیکر تراش مس نویرہ احمد کے کوئی پچیس چیدہ فن پارے پیش کئے گئے اور اس طرح ایک ایسا فنی مظاہرہ ہوا جو صرف فنونِ لطیفہ کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں بھی یادگار رہے گا۔

اور یہ "دورِ انقلاب" کے سلسلۂ واقعات کی بھی ایک اہم کڑی ہے۔ ایک اور سنگ میل جو ہمیں بہت کچھ دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ہمارا ذہن قدرتی طور پر سوچنے لگ جاتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں آج ہم نے اپنی سرزمین کا ایک مدتوں کا کھویا ہوا فن پھر پا لیا ہے۔ جس نے ہمارے یہاں ہزارہا سال پہلے اس قدر ترقی کی تھی کہ "گندھارا آرٹ" صدیاں گذر جانے کے باوجود اتنا ہی شہرۂ آفاق ہے جتنا یونان کا مایۂ ناز فن پیکر تراشی۔ دونوں کی وضع منفرد ہے، دونوں اپنے انداز میں یکتا خیال کئے جاتے ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ صدہا سال کے بعد اس فن کی روح پھر جاگ اٹھے گی۔ پیکر تراشی کا شاندار فن پھر اس خطۂ پاک میں ابھرے گا اور ایک نئے، خالصاً جدید پیرایہ میں، جو فن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تصور کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے تاریخ نے یقیناً اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ مگر ایسے کہ فن کا سلسلہ کچھ اور آگے بڑھا دے۔ مشرق مغرب، قدیم جدید کی روحیں نئے رنگ سے آمیز ہوئی ہیں جس کا نتیجہ اس نوعمر مگر فنی حیثیت سے پختہ کار خاتون کے فنی شہ پارے ہیں۔

ہمیں قدرتی طور پر یہ بھی خیال آتا ہے: کیا یہ کہیں "دورِ انقلاب" ہی کا کرشمہ تو نہیں؟ یہ زندگی، ہلچل، آزادی، بیداری، ذوق و شوق، ہنر و فن کی قدردانی، اربابِ ہنر کی حوصلہ افزائی۔ یہ سب اگر براہِ راست تخلیق کے محرک نہیں تو تخلیقی جوہروں کو ابھرنے، نشو و نما پانے کا موقع تو ضرور مہیا کرتے ہیں۔ اس کام کا آغاز بے شک بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن یہ درجۂ کمال تک پہنچ کر منظرِ عام پر ابھی آیا ہے۔ اور اس کی قدردانی بھی ابھی کی گئی ہے کیونکہ مشرقی پاکستان کے گورنر، جنرل اعظم خاں نے، مس نویرہ احمد کے تراشیدہ پیکروں کی نمائش کا افتتاح سینٹرل پبلک لائبریری ڈھاکہ میں کرتے ہوئے فن کار کو دس ہزار روپے کا انعام دیا اور مرکزی حکومت نے بھی اس جوہرِ قابل کی بحالیٔ صحت کے لئے تین ہزار روپے سے زائد رقم ارزانی کی۔ یہ نمائش دس دن جاری رہی۔ اور اب مغربی پاکستان میں بھی ایک ایسی ہی نمائش کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ جو پھر اپنی نوعیت کی اولیں نمائش ہوگی۔

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا ہے، نویرہ نے ایک سوئے ہوئے فن کو پھر سے جگایا ہے لیکن نئے انداز میں۔ وہ کئی دوسرے پیکر تراشوں کے ساتھ بجا طور پر کہہ سکتی ہے: اک نئے دور کے فن کار رہیں ہم کیونکہ اس نے اپنے فن کے متعلق تمام ذریعوں، روایتوں، طریقوں سے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا، حاصل کیا ہے۔ زندگی بھر کی مسلسل تلاش، تحقیق، تجربہ، مشاہدہ، سب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور اسے اپنے فن میں سمو دیا ہے۔ اس کی بدولت اپنے فن کو ایک مخصوص وضع عطا کی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اپنے گرد و پیش سے اثر ہی نہیں لیا بلکہ اپنے فن کو اس ہی سے ابھارا بھی ہے، اس کے سانچے میں ڈھال کر دیکھا ہے۔ اس طرح کہ وہ گھل مل کر ایک ہو جائیں۔ اس کے فن پارے محض فن پارے ہی نہیں — ارد گرد کی دنیا سے جدا۔ بلکہ اس کا حصہ ہیں۔ جیسے وہ بالکل قدرت یا زندگی کے سینے ہی سے ابھرے ہوں۔ اور ان کے ساتھ اس طرح میل کھاتے ہیں کہ ان سے قطعاً جدا معلوم نہیں ہوتے۔ ہم انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ قدرت یا زندگی کی حدیں کہاں ختم ہو گئیں اور فن کی حد کہاں سے شروع ہوئی۔ وہ تو بس ایک ساتھ موجود ہیں۔ ایک جان دو قالب۔ جیسے فن پارے حیات و ماحول کے ہی برگ و بار ہوں۔

یہ بات یونہی نہیں پیدا ہو گئی۔ یہ تو فن کار کے من کی دھرتی سے ویسے ہی ابھری ہے جیسے بیج سے پودا۔ دیکھئے، نویرہ اس بارے

کیا کہتی ہے:

"ہم پیکر تراشوں کو تو یہ کرنا چاہیے کہ شہروں، ہسپتالوں،
سکولوں، کارخانوں کے خاکے تیار کرنے میں حصہ لیں۔ بلکہ
جہاں کہیں لوگ رہتے سہتے یا کام کاج کرتے ہیں وہاں،
جو بھی جگہ ملے، اس کو آراستہ کریں۔"

یہ محض بات ہی نہیں۔ یونہی نہ دھیانی میں کہی ہوئی یہ بڑی تپے کی بات ہے اور بہت دور جاتی ہے۔ فن کار کا مدعا یہ ہے کہ ان فن پاروں کو محض فن پارے مت سمجھو۔ میکانکی جمالیاتی پیکرانِ خیالی۔ جو خلوت گہ دل سے ابھرے ہوں یا گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر سوچے اور الگ تھلگ بیٹھ کر تراشے گئے ہوں۔ نہیں، ان کی حیثیت مختلف ہے۔ یہ جاندار ہیں۔ نباتیاتی، حیاتیاتی۔ یہ بنائے نہیں گئے، بن گئے ہیں۔ دل کی کسی سرسری اوپری لہر میں بہہ کر نہیں بلکہ ایک تیز ودر رو میں ڈوب کر ابھارے گئے ہیں۔ یہ من میں ڈوب کر خودی کا سراغ پا لینے ہی سے بنے ہیں۔ ساری دنیا پر آنکھیں کھول کر، اس میں گھوم پھر کر، چھان بین کر کے، ڈھونڈ ڈھانڈ کر۔ فن کار کو محض پیکر تراش ہی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ جیتا جاگتا انسان ہونا چاہیئے۔ ایک معمار، جو ایک طرف معاشرہ میں حصہ لے اور دوسری طرف شہروں اور آبادیوں کو موزوں و مناسب پیکروں سے آراستہ کرے۔ بالفاظ دیگر انفس اور آفاق دونوں اس کی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہیں۔ خلوت بھی اور جلوت بھی۔ جماعت بھی اور ماحول بھی۔ یہی وجہ ہے کہ نویرہ۔ اس صنم صنم تراش ــــ جو خود بھی زندہ ہے اور اس کے صنم بھی جیتے جاگتے ہیں۔ کے پیکر جہاں بھی رکھ دیئے گئے ہیں، اپنے ماحول سے بیگانے یا کٹے کٹے محسوس نہیں ہوتے۔ وہ بالکل ایسے ہی لگتے ہیں جیسے پھولوں میں تتلیاں۔

دوسرے یہ بڑے بڑے شہر آباد کرنے، ان کو آراستہ کرنے، نوآبادیاں تعمیر کرنے، ان کو سجانے کا جذبہ بھی تو یونہی نہیں پیدا ہو گیا۔ اس کی تہ میں "عہدِ انقلاب" کا جیات افروز اثر اور کورنگی، محمد نگر جیسی بستیاں بسانے کی حقیقی مثالیں کارفرما نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک مغربی ناظر نے نویرہ کے تراشے ہوئے پیکر دیکھ کر کہا تھا، اور بہت بجا کہا تھا، کہ اس کے فن پاروں کی سب سے اہم خصوصیت ہے: ان کی "عضوی نوعیت"۔ اس پر غور کیا جائے تو کتنے ہی پہلو نکلتے ہیں۔ جہاں تک اس کے ممتاز فن پاروں کا تعلق ہے فن کار کا اپنے اردگرد کی جیتی جاگتی دنیا سے رابطہ ہے۔ اور وہ بعض اوقات ان سے فیضان حاصل کرتی ہے۔ مثلاً وہ پیکر لیجیئے: "ایک گائے، دو آدمی"۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی پیکر نہیں عمارت کھڑی ہے۔ یہ کھلی فضا کے لئے بنایا گیا ہے۔ ڈھاکہ کے ایک صنعت کار کے گھر کے بیرونی حصہ کے لئے۔ اور یہ اس فضا کے ساتھ ایسا گھل مل گیا ہے کہ اس کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ نویرہ جب بھی کوئی پیکر بناتی ہے، اس کے اردگرد کی ساری فضا، سارا نقشہ بھانپ لیتی ہے۔ اور پھر جیسے کوئی معمار ہوا، روشنی، سایہ کا لحاظ کرتے ہوئے عمارت کا نقشہ تیار کرتا ہے، اس طرح نویرہ پیکر بناتی ہے اس میں مناسب جگہوں پر دھوپ چھاؤں کے لئے سوراخ یا خلا رکھتی ہے اور پیکر بالکل ایسا لگتا ہے جیسے خشکی پر گھونگھے ہی گھونگھے یا اسفنج اُگ رہے ہوں "اُگ گئے" کا لفظ ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اور جس طرح گھونگھے اور اسفنج سمندر کی تہہ کا لازمی جز ہوتے ہیں، اسی طرح یہ پیکر بھی فضا کے جگر گوشے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر فطرت کُل ہے تو وہ جز ہیں۔ اور جز و کل میں پورا پورا ربط و ضبط ہے۔

ایسے فن پاروں پر عمارات کا گمان نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ ان میں پیکر تراشی اور عمارت سازی کے فن ایک دوسرے سے گلے مل رہے۔ وہ اس لئے نہیں بنائے گئے کہ انہیں اٹھا کر گھروں کی چار دیواری میں رکھ دیا جائے یا وہ کسی ڈرائنگ روم، نمائش یا عجائب گھر کی زینت بن جائیں۔ محض پتلے ہی پتلے! وہ جاندار ہیں، نمو پذیر ہیں۔ وہ تو جبھی اچھے لگتے ہیں کہ انہیں کھلی جگہ، باغوں یا تفریح گاہوں میں رکھا جائے۔

یہ سنتے ہی آپ کا ذہن کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ موئن جو ڈرو کی طرف جسے بنانے والوں نے کچھ ایسے ہی احساس سے سرشار ہو کر بنایا تھا۔ تاریخ کے سبھی بڑے بڑے دوروں میں یہی ہوتا ہے۔ یہ پیکر کوئی کھلونے نہیں ہوں گے۔ ان کے تصور اور تکنیک میں بہت پھیلاؤ ہے۔ ان سے ذہن ایک ہی جگہ پر مرکوز نہیں ہو جاتا بلکہ پھیل جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے شہروں، خیابانوں، سیرگاہوں کا تصور کرتا ہے۔ جیسے کسی کیمرے کے سوراخ میں سے باہر کی ایک دنیا یکدم کھنچ کر چلی آتی ہے۔ موجودہ زندگی اور دنیا کی پہنائی نے فن کاروں کے ذہن میں بھی بے حد پھیلاؤ پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ پیکر تراشی جیسا جامد، پاگل فن بھی اپنے اندر ایک نئی وسعت محسوس کرتا ہے۔ اور اس میں ایک عالمگیر شان پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ آفاقیت کا احساس ایک نئی بات ہے۔ نویرہ اس احساس کی ایک

بہت بڑی پیشرفت ہے۔ یہ خوبی اس کے فن میں یونہی نہیں پیدا ہوگئی۔ بلکہ اپنے فن سے لگن اسے دور دور لے گئی ہے۔ اس کی زندگی فن کے لئے مخصوص کرنے کی زندگی رہی ہے اور اس کا نتیجہ "باطنی دید"۔ شروع ہی سے نویرہ کی طبیعت کے اشارہ پر کام کرنے کی خواہاں رہی ہے۔ اس نے ایک پیکر تراش بننے کی ٹھان لی۔ چٹ گاؤں کا ایک متوسط کھاتا پیتا گھرانہ نویرہ اسی میں پیدا ہوئی۔ اسے بچپن ہی سے بڑے خوبصورت پیکر تراشنے کا شوق تھا۔ بڑوں کو یہ صنم تراشی پسند نہ تھی۔ وہ ڈھاکہ کے آرٹ اسکول میں داخل ہوکر رہی۔ پھر باہر جانے کی ٹھان لی۔ اور ۱۹۵۰ء میں یورپ چلی گئی اور لندن پہنچتے ہی "پیام سکول آف آرٹس" میں داخلہ لے لیا۔ لندن میں اس نے ڈاکٹر کارل موگل اور مشہور پیکر تراش جیکب ایپسٹین سے فن کے رموز سیکھے اور پیکر تراشی میں "نیشنل ڈپلوما ان ڈیزائن" حاصل کیا۔ لندن سے پیرس، اٹلی وغیرہ چند ہی قدم تھے۔ چنانچہ اس نے اپنا بہت سا وقت انہی مقامات میں گزارا۔

ڈھاکہ واپس آکر اس نے لگاتار مشق شروع کر دی۔ اسی دوران میں وہ چوبیا پیکر تراشی سیکھنے رنگون بھی گئی۔ اور کچھ نئے تصورات لے کر آئی۔ یہ گوناگوں مشاہدہ و تجربہ صرف اس لئے تھا کہ وہ اپنی نظر پیدا کرے، اور اسے فن کے ذریعہ دوسروں تک پہنچائے۔

اس کے فن پاروں کی نمائش جسے اس نے "INNER GAZE" کا نام دیا ہے۔ اور جو "نظر" ہی کے مترادف ہے، اسی عرفان کو فنی سانچے میں ڈھالنے کا نتیجہ ہے۔ اس نے شہرت کا آسان اور سستا طریقہ پسند نہیں کیا۔ بلکہ گہری تلاش، مشاہدہ اور تجربہ کا کٹھن راستہ اختیار کیا۔ اور آخر کار کامیاب ثابت ہوئی۔ اس کے فن پارے اسی نظر کے آئینہ دار ہیں۔ اسی لئے یہ فن پارے زیادہ وقیع اور پائدار بھی ہیں۔

نمائش میں نویرہ نے اپنی آٹھ سالہ سرگرمیوں کا حاصل پیکروں کی شکل میں پیش کیا۔ اس کی نظر ہمیشہ اپنے گرد وپیش کی زندگی پر مرکوز رہی ہے۔ شہر ہوں یا دیہات یا قدرت کی کھلی فضا۔ اس نے ہر کہیں لوگوں کے رہن سہن، دکھ درد اور قدرت کی دھوپ چھاؤں، سب کو بغور دیکھا ہے۔ اور ان سے اپنے خیالات کی دنیا تعمیر کرنے، اپنے تصورات کے پیکر تراشنے کی کوشش کی ہے۔

نویرہ جانتی ہے کہ نظر ہی سب کچھ نہیں۔ "نظر" کو پیش کرنے کی مہم بھی خاص کٹھن ہے۔ چنانچہ وہ فن کے اس پہلو پر بھی برابر توجہ دیتی

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

تاروں پہ کمند

سلمیٰ تصدق حسین

اے وطن، میرے وطن اے میرے خوابوں کے جہاں ۔۔۔ اپنی الفت کا ملیگا ہر کہیں تجھ کو نشاں

تیری طاقت میں ہے پوشیدہ ہماری زندگی ۔۔۔ تیرا استحکام بخشے گا ہمیں پائندگی

اپنا مقصد ہے پرستاری تری شام و سحر ۔۔۔ خونِ دل سے سینچ دیں باغِ وطن کا ہر شجر

منجمد خون قوم کا پھر ہوگیا سرگرم کار ۔۔۔ اے خوشا یہ جاں فزا تبدیلیٔ لیل و نہار

تیرے میدانوں پہ صحراؤں پہ چھائی چاندنی ۔۔۔ تیرے شہروں اور شہراہوں میں آئی زندگی

ہوگئے ہیں اہل پاکستاں جہاں میں سربلند

بے گماں وہ ایک دن تاروں پہ ڈالیں گے کمند

تازہ افق تازہ سحر

ناہید نوا

سورج کی زرّیں کماں سے
تیر ہزاروں لانبے لانبے
پن لچکیلے، پَو چمکیلے
چاروں جانب چھوٹ پڑے ہیں
تیر بھڑکتے جہاں بھی جائیں
غول کے غول ہیں آگے آگے
جگمگ کرتے تیر سنہرے
پر پھیلاتے بڑھتے جائیں
اِدھر اڑان اور اُدھر رسائی
سامنے سیسے کی قدغن ہے
ٹوپ پہ ٹوپ گھٹائیں چھائی
دیو سیہ پیکر دیوانے
تیر پہ تیر آئے بڑھ بڑھ کر
خیمے خیمے آگیں آگیں
تیرہ و تار گپھائیں چمکیں
پل پل روپ پہ روپ اُجاگر
ہنستی دھرتی ہنستا امبر
ہنستی دھوپ اور ہنستے بن بن
تازہ سفر اور تازہ حضر ہے

اندھیارے کے کوہِ گراں سے
تیر کہاں، بھالے ہی بھالے
پتلے پتلے تیز نکیلے
جیسے اُجالے ٹوٹ پڑے ہیں
اوپر نیچے آگ لگائیں
دل بادل جیسے جھڑ لاگے
نیل گگن پر جوت کے لہرے
ہر ہر ڈھال میں گڑتے جائیں
کیا اونچان اور کیا اترائی
اندھیاروں کا کجلی بن ہے
موج پہ چڑھتی موج دھوئیں کی
کالے کالے خیمے تانے
پھیلاتے اک آگ برابر
شعلے کریں آکاش سے باتیں
کالی گھٹائیں لَو دے اُٹھیں
دم دم دھوپ پہ دھوپ اجاگر
ہنستے صحرا ہنستے ساگر
ہنستے روپ اور ہنستا جیون
تازہ جہاں اور تازہ نظر ہے

ایک فصیلِ بے پایاں سے
لال بھبھوکا بان اگن کے
لال گلال اور پیلے پیلے
لاوے کنڈ سے پھوٹ پڑے ہیں
چاروں جانب جوت جگائیں
تیر اُن میں یا اُجلے دھاگے!
چر کے جن کے گہرے گہرے
پربت پربت چڑھتے جائیں
پرے باندھ کے تیز چڑھائی
گھور سیاہی کی چلمن ہے
پیچ پہ پیچ جٹائیں پھیلی
کجلے جن کے تانے بانے
ہر سایہ ہوا نور کا پیکر
لاکھ بجھائیں اور بھی بھڑکیں
ٹوپ بنے فانوس بلوریں
چھن چھن روپ انوپ اجاگر
ہنستے ذرے ہنستے جوہر
ہنستے سروپ اور ہنستے آنگن
تازہ افق ہے تازہ سحر ہے

طنز و مزاح:

طلسم دورِ فلک نے دکھائے ہیں کیا کیا!

اے۔ ڈی اظہر

رازِ محرمانہ!

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا، یہی تو ہے رازِ محرمانہ
جو اسکے پھر ہتھکنڈے چلائیگا اس کا لائے گا پھر زمانہ
یہ اسکی توبہ عقیدتاً کان کی گرب سے مختلف نہیں ہے
وہی ہے انداز اسکے گننے کا اپنی تسبیح دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہے لیکن جدا جدا راہ و رسم اسکی
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ
نہیں جو وہ شاملِ تماشا تو اس میں کوئی عجب نہیں ہے
کہ پتلیوں کے نچانے والے یہ فعل کرتے ہیں غائبانہ
نئے شگوفے کے خبط میں نیند بھی حرام اسکی ہوگئی ہے
ہر اک کو معلوم ہو گیا ہے کہ اسکی چالیں تھیں شاطرانہ
کوئی نہیں اسکی مانتا ہے، یہ بات وہ خوب جانتا ہے
کہ راز اسکا عیاں ہے سب پر کرے تو اب کیا کرے بہانہ
وہ سوچ میں روز و شب ہے اسکی کتاب نیا گل میں کیا کھلائے
کہ آشنا ہو چکا ہے اب تو مرے خم و پیچ سے زمانہ
زمین اسکی، مکان اسکے، بڑے بڑے آستان اسکے
ہیں ان دکھاوؤں کے بل پہ اب بھی نمائشیں اسکی خسروانہ (۱۴ اپریل ۹۵ء)

جہانِ این و آں:

ہیں فعل وزیروں کے جو سب مصلحت آموز
افسر کا رد تیہ ہے یہاں اور وہاں اور
عہدے کے لئے رنگ بدلتا ہے ہزاروں
ہر رنگ میں اس کا ہے عیاں اور نہاں اور
آتے ہیں خوشامد کے بھی ڈھنگ اس کو نرالے
جتنا ہے وہ نااہل بڑھے گا وہ یہاں اور
اُس دل کی ہوس سرحدِ تسکیں سے پرے ہے
جس کی ہوئی دن رات صدا "اور بھی ہاں اور"
ہر بات پہ میری وہ خفا ہونے لگے ہیں
اس عمر میں لاؤں گا کہاں سے میں زباں اور
تھا دل میں کہ تعمیر میں ہے حصہ مرا بھی
وہ کہتے ہیں ورثے میں ملا ہم کو جہاں اور
آزاد ہیں، فریاد کی اب داد کہاں ہے
آزاد کو یہ خوب ملا سازِ فغاں اور
القصہ اگرچہ وہ یہیں رہتے ہیں دونوں
افسر کا جہاں اور ہے اظہر کا جہاں اور (۱۵ اپریل ۹۵ء)

یادِ ماضی!

خود تو دنیا میں چل سکے نہ کبھی — اب ہیں اس سوچ میں کہ نام چلے
ان کا برہم ہے اب نظام تو کیا — چند دن تو انہی کے نام چلے

زورِ بازو:

یوں تن اکڑ کے ہانک رہے ہیں وہ لیگ کو
گویا وہ چل رہی ہو بس اک اُن کے زور سے
جیسے کہ سائیکل سے کوئی چین اُتار کر
پیدل چلا رہا ہو بڑے زور شور سے (۲۸ ستمبر ۹۵ء)

"یاد آتے ہیں!"

مجھے جب وہ سیاست باز رہبر یاد آتے ہیں
تو جھٹ یورپ کے نو سرباز دلبر یاد آتے ہیں
کراچی سے اٹھا دارالخلافہ ہمنشیں لیکن
مجھے اب تک وہاں کے سارے منظر یاد آتے ہیں

تعارف:

ناطق مکرانی

عبدالصمد سربازی

مرزا غالب کا ہمعصر، ان کا دوست اور فارسی میں ان کا ہم شعار، جس کی یاد دونوں کے متعدد خطوط سے تازہ ہے۔ اس کی شخصیت کس کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں ہو گی؟ اس کی زندگی اور کلام کا مطالعہ ــــ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

دیارِ پاک کے ہر علاقے نے اس کے ثقافتی ورثہ کو فروغ دینے میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے۔ مکران کا پہاڑی ریگستانی ساحلی علاقہ جو پاکستان اور ایران دونوں میں شامل ہے علم و فن کی شاہراہوں سے دور ہٹا ہوا اور وادیٔ مہران کے تہذیبی مرکزوں۔ ٹھٹھہ، حیدرآباد، سیوہن ــ سے دور، بادی النظر میں شعر و ادب کے فروغ کے لئے کچھ ایسا موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن ادب و فن کا جو ذوق ہمارے یہاں ہمیشہ عام رہا ہے۔ وہ اس شورہ زار میں بھی شاعری کے پھول کھلائے بغیر نہ رہ سکا۔ آخر وہ علاقہ جو سسی پنوں کی پیار محبت کی داستان سے متعلق ہو، وہ اس رنگین چیز سے کیسے محروم رہ سکتا تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے جواں سال مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم کی فوجوں نے کوچ کیا تھا اور آگے بڑھ کر تمام وادیٔ مہران کو زیرِ نگیں کر کے سارے علاقے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا تھا۔ اس لئے یہ اور بھی ہماری دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی خاک تھی۔ سسی کی بے تاب محبت کے باعث رومان ہی رومان اور محمد بن قاسم کی غیرفانی یادوں سے لبریز، جس سے دیارِ پاک کی دیرینہ ثقافت کا ایک جلیل القدر مظہر اور فارسی کا ایک بڑا خوشنوا شاعر پیدا ہوا۔ وہی جس کے متعلق جہانگیر کے ملک الشعراء طالب آملی جیسے مردِ نکتہ داں نے کہا تھا:

صبا از نکہتِ گلہائے باغِ فکرتِ ناطق ـ بگرداں تازہ بوئے بلبل گلزار آمل را

یہ پیکرِ شعر و سخن جس کا "بلبل گلزار آمل" بھی مشتاق تھا، مکران ہی کا ایک جوہرِ قابل تھا۔ گل محمد خاں ناطق۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہانِ ہند کی فیاضی کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور ایران کے بڑے بڑے نامور شعرا۔ عرفی، نظیری، طالب آملی، مرزا صائب وغیرہم بھی ان مہتم بالشان مسلمان شہنشاہوں کی بے دریغ بخششوں کا حال سن سن کر برِصغیر پاک و ہندوستان میں کھنچے چلے آتے تھے اور اپنے وطنِ مالوف سے رختِ سفر باندھ کر ان کے درباروں میں رسائی حاصل کرنا اپنی تمناؤں کی معراج تصور کرتے تھے اس لئے صائب جیسے شاعر خوشنوا نے کہا تھا کہ ؎

ہمچو عزمِ سفرِ ہند کہ در دل باشد
رقصِ سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

چنانچہ اربابِ کمال جوق در جوق ان شہنشاہانِ "سخنور نواز"[1] کی بارگاہ میں آتے تھے اور اپنے کمالِ فن کی بدولت نہ صرف شاہی انعامات سے دامنِ مراد بھرتے تھے بلکہ گوناگوں اعزاز و اکرام اور جاہ و منصب سے فیضیاب ہوتے تھے۔

انہی شاعرانِ شیریں نوا میں سے ایک ناطق بھی تھا۔ تیرھویں صدی ہجری یعنی سولھویں عیسوی کا بذلہ سنج، نغز گو شاعر جس کا دل بھی "رقصِ سودا" سے بیگانہ نہ رہ سکا۔ بمصداق حافظ شیراز ؎

سخندانی و خوش خوانی نمی ورزند در شیراز
بیا حافظ کہ ما خود را بہ ملکِ دیگر اندازیم

وہ اپنے وطنِ عزیز، مکران کو چھوڑ کر اسی مرجعِ خواص و عوام

---

[1] : "شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را ......" غالب

کی طرف روانہ ہوا۔ ذرائع و اسبابِ سفر کی کمی کے باوجود، دشوار گزار راستوں سے خدا جانے کن مصیبتوں کا سامنا کرتا ہوا پہلے دہلی پہنچا۔ اور پھر لکھنؤ جہاں وہ کئی برس رہا۔ اور اپنے جوہر دکھائے۔

اُن دنوں اودھ میں محمد علی شاہ اور واجد علی شاہ کا دور تھا۔ چنانچہ ناطق نے شاہانِ اودھ اور دیگر اراکین دولت۔ نواب امین الدولہ، قطب الدولہ، شرف الدولہ، مدبر الدولہ وغیرہم کی تعریف میں قصائد لکھے۔ انہیں اپنے عہد کے شعراء میں امتیاز حاصل تھا۔ چنانچہ تمام اراکین دولت اور اعیانِ سلطنت ان کو مسلم الثبوت استادوں میں شمار کرتے تھے۔ اور ان سے فرمائشی قصائد و قطعات لکھوا کر دادِ سخن دیتے تھے۔ انہیں قصائد کے علاوہ دیگر اصناف شعر پر بھی دسترس تھی۔ اس لئے وہ اپنے کلام میں امیر خسرو جیسے نامور شاعر کا تذکرہ بھی اس بے تکلفی سے کرتے ہیں گویا وہ انہی کے زمرہ میں شامل ہوں ؎

ناطق بیا کہ از نئے کلک تو تنگ تنگ
شکرہ بہ کام طوطیٔ ہندوستاں کنم

اور یہی کیفیت غالب کی ہے۔ جن کے وہ معاصر بھی تھے اور ـــ جیسا کہ ان کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے رہبر بھی مگر بڑے ادب اور پاس و لحاظ سے اپنی سخن شناسی اور ان کی مرتبہ شناسی کا حق ادا کرتے ہوئے۔

یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے غالب کی مثنوی "درد و داغ" کے ایک شعر پر بڑی دلچسپ اور پتے کی بات کہی ہے۔ ایسی کہ خود شاعر نے اسے بڑی خوشی سے قبول کیا اور اس شعر میں مناسب تبدیلی کی۔ ورنہ غالب کہاں اور فارسی کے بارے میں کسی کی رائے کی برداشت کہاں۔ غالب نے اس مثنوی میں ایک دلچسپ کہانی بیان کی ہے کہ کس طرح ایک عورت کی یہ دعا قبول ہوئی کہ وہ پھر سے جوان ہو جائے۔ جوان ہوتے ہی اس کے تیور بدل گئے اور اس نے اپنے شوہر کو دھتکار دیا: مہر حق صحبت و الفت شکست   رنگ برخسارہ ہمت شکست

چنانچہ شوہر نے اس کی بیوفائی سے آزردہ ہو کر بددعا کی اور وہ سؤرنی بن گئی:

خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد
با سر و رُو معربدہ آغاز کرد

اس پر ناطق نے مرزا غالب کو دوستانہ طور پر ایک پُرلطف خط لکھا جس میں بڑے دردانگیز پیرائے میں اپنے احوال بیان کرنے کے بعد یہ لکھا تھا کہ:

"کاتب لفظ پنجہ بصورت پنجہ بقلم واداست لیا این چہ لفظ است چہ اگر فی نفس الامر پنجہ باشد پس خوک سم دارد نہ پنجہ۔ واگر مجانست خلقی با پنجہ دارد با آنکہ نزد شعراء اطلاق سم و پنجہ بہ محل ہمدیگر جائز الاستعمال است۔ پس اعلام باید فرمود تا پے بہ حقیقت آں بردہ باشم"۔

غالب کی سلیم الطبعی اور حق پرستی کی داد دینا چاہئے کہ انہوں نے اس تبصرہ کی معقولیت محسوس کی اور پہلا مصرع یوں بدل ڈالا

خوک شد و بدنفسی ساز کرد

بدقسمتی سے ناطق کا زمانہ برصغیر میں مسلمان سلطنتوں کے انتہائی انحطاط و زوال کا زمانہ تھا۔ مغل فرمانرواؤں کا دور گزر چکا تھا۔ اس لئے نہ قندِ فارسی کی وہ گرم بازاری رہی تھی نہ اس کے قدرداں باقی تھے۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

بنابریں لکھنؤ میں ناطق کی غربت سے زنگ آلود تیغ جوہردار کی کوئی قدردانی نہ کی گئی۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

تیغ صد گنج بہائیم ولے بے قدریم
کز ہنر در تہ زنگار بود جوہر ما

جو امیدیں لے کر وہ لکھنؤ کے شاہی دربار میں پہنچے تھے وہ خاک میں مل گئیں۔ کوئی دانۂ امید سرسبز اور پائدار نہ ہوا۔ چنانچہ ان کا یہ قول غالباً اسی ہی کی طرف اشارہ ہے:

صدرہش در گرہ خضر نشاندیم ولے
از سیہ بختیٔ ما سبز نشد دانۂ ما

مرزا ناطق نے فارسی میں مختلف لوگوں کے نام کتنے ہی خطوط لکھے ہیں اور ان میں سے بعض میں اپنی بے قدری اور تنگدستی کی شکایت کی ہے۔ مرزا غالب کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"کہ بیش دہ سال میگذرد کہ زمین گیر این دیار میباشم اما طرفہ گیہائے کہ از وضع این دیار یافتہ ام ہیچ کافر نبیناد از خواص و عوام این مخلوق کمتر کسے بودہ باشد کہ نسبت تعارف اسمی یا جسمی با من درست نکردہ باشد بلکہ از بدلیت و ردد

"تا حال بزعم خود از جرگہ اساتذۂ مسلم الثبوتم لیعذ ابرام از من ربوده بدستانشہا می سرایند۔ ونیز ہیچ نوابے ونلبے دریں سرکار بہ سلسلۂ فیاده کہ سلسلہ جنبانی تا خن بندی و سپاس وستائشم بہ فضل و کمالے کہ ندارم بحضورِ بادشاہِ وقت خود نکرده باشد ولیکن با اینہمہ آشتی کہ در دہلی بہ کاسہ داشتم دارم"۔

کہیں یہ مرزا غالب کو خط لکھتے ہوئے انہی کا مشرب تو اختیار نہیں کیا گیا کیونکہ خطوط میں احباب کو اپنا دکھڑا سنانے کا طریقہ غالب ہی نے اختیار کیا تھا۔ اس خط کے برعکس وہ ایک اور مکتوب میں دہلی اور وہاں کے قدر دانوں کی توصیف فرماتے ہیں:

" دلم از صیاد منشانِ اینجا مانند مرغ آشیاں گم کرده ماند کہ نہ صبح قرارے دارد نہ شام آرامے۔ وحشیانہ دریں خرابہ بسر می برم و بکمال بے لطفی میزیم۔ کلاں ترانِ اینجا با اینہمہ تعارف و مجتہا غیر ازیں کہ بہ واہ واہ نوازند ودر پلۂ اساتذۂ نا مداد سنجند، بہ صلہ درعایتے نمی آیند۔ درمسلک سلوک قدمی نمیگذارند۔ دہلی در حق ما صد درجہ رجحان بر ایں دیار نا پرساں داشت۔ یارانِ قدر شناس با اینہمہ کوتاہ دستی در بارۂ ما ید طولیٰ داشتند و بہ زر قدر دان کالائے کاسدم بودند ...."

میرزا غالب کے "تقاضائے بیہودۂ مے فروش" اور دوسرے قرضخواہوں کے ابرام کو سامنے رکھئے اور ناطق کی اِن سطور پر نظر ڈالئے :۔

"یک طرف تلاش ما یحتاج یومیہ ویک طرف تقاضائے بیہودۂ قرضہ خواہاں خاصہ ابرام گدایانۂ صاحبخانہ کہ چند ماہ کرایہ بذمۂ فقیر دارد"۔

پھر غالب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

ہفت سال است کہ بایکدگر آویختہ ایم
من و غاصب چو سرِ رشتۂ شمع و دمِ گاز

آہ از عربدہ پردازیٔ بختِ سرکش
داد از خانہ برا ندازیٔ چرخِ کجباز

اور پھر ناطق کے یہ الفاظ :۔

"یازده سال میگذرد کہ بغرمائش مربیاں صد ہا نظم و نثر پرداختم و بغیر حرماں چیزے دیگر نیندوختم"۔

صاف ظاہر ہے کہ غالب کی نظم و نثر، خط نویسی کے انداز اور لب و لہجہ کا ناطق پر گہرا اثر ہے۔ اور اُن کے شعر کے شعر اور جملے کے جملے اس یگانۂ روزگار کا پرتو ہیں یہاں تک کہ مماثلت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے : " دیروز دیگ وچچہ وآفتابہ کہ باقیماندۂ دولت لکھنؤ بود، آں ہم بفروختن رفتند"۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں اور بسیط مطالعہ کے لائق ہے۔

ناطق نے اپنی ناقدردانی کو بری طرح محسوس کر کے منفی مگر بڑے بدیع پیرایہ میں اس کی شکایت کی ہے :۔

ناطق از خجلتِ کم قیمتیٔ خویش بدہر
آب شد بار دگر گوہرِ یک دانۂ ما

اپنے ناگفتہ بہ حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

ناطق نشد بجز کفنے حاصلم بدہر
آں ہم بہ مزدِ گورکنی گورکن گرفت

میرزا غالب زیادہ رند مزاج اور زندہ دل تھے، اس لئے انہوں نے اپنی تنگدستی کی داد بڑی خوش طبعی سے یوں دی ہے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

ان ناسازگار حالات کے علاوہ اہل و عیال کی جدائی الگ رلاتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ یارانِ وطن کی یاد ستاتی رہی :

گاه در نالہ ام از دردِ گرفتاریٔ خویش
گاه در گریہ ام از فرقتِ اطفال وعیال

اے عزیزانِ وطن دست بشوئید از من
کشتۂ ہندم و سبزانِ گلابی پوشش

اس عالم میں وطن عزیز کو یاد کر کے بادِ صبا کے ذریعہ خاکِ مکران کو سلام پہنچاتے ہیں :

صبا از جانبِ ناطق سلامے خاکِ مکراں را
کہ من چوں غنچہ دل در گلشنِ ہندوستاں بستم

نیز دل کو خوش رکھنے کو کبھی کبھی اپنی بڑائی سے مکران کا نام بلند کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں :

ہر دِ مشہور کند نام وطن را ناطق
بایزیدایں ہمہ جا گفتہ کہ بسطامی ہست

اس غریب الوطن کو دوبارہ آب و ہوائے دیار نصیب نہ ہوئی۔ اور نہ عیال و اطفال اور عزیزوں کا دیدار۔ اس غم و الم، ہجر و فراق اور سوز و گداز کی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے ۱۲۹۵ھ میں جاں بحق تسلیم کی۔ "ناطق مکرانی گل محمد خاں" تاریخ وفات ہے۔ ان کے شاگرد رشید، جواہر سنگھ جوہر، نے اس سال ان کا جو کچھ کلام دستیاب ہو سکا، اس کو کتاب کی شکل میں ترتیب دے کر اسم تاریخی "جوہر معظم" رکھا۔ یہ مجموعہ نولکشور میں ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوا۔ اس طرح شاگرد نے ان کی جملہ اصناف کلام — قصیدہ، غزل، رباعی، مخمس، مسدس، مثنوی وغیرہ — کو تو جمع کر دیا لیکن افسوس ہے ان کے حالاتِ زندگی پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ یعنی وہ کب پیدا ہوئے، ان کے والد کون تھے، کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، کس سے اور کہاں علوم کی تحصیل کی، مکران کے کس شہر سے تعلق رکھتے تھے، کیونکہ مکران ایک وسیع علاقہ ہے جس میں سیکڑوں شہر اور بستیاں ہیں۔ اور اب اس کا کچھ حصہ پاکستان میں ہے اور کچھ ایران میں۔ وہاں سے کب ہجرت کر کے ہندوستان آئے، دہلی میں کتنا عرصہ رہے، وہاں سے لکھنؤ کب پہنچے، کتنے سال وہاں رہے اور کس حالت میں رہے، ممکن ہے آئندہ کسی اور جگہ اس کمی کی تلافی ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ ہماری دلچسپی زیادہ شاعر کے کلام سے ہے۔ اس نالہ و فریاد کو دیکھتے ہوئے جس کا ذکر اوپر آیا ہے، خیال ہوتا ہے کہ اس شاعر کا سارا کلام اسی سے پُر ہوگا۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسے اشعار کہیں کہیں ہی نظر آتے ہیں۔ جیسے غزلوں میں عموماً ہوتا ہے۔ اور پھر اس کا کلام غالب ہی کے فارسی کلام کی ہلکی کشید ہے۔ جیسے وہ دانستہ یا نادانستہ اسی کے رنگ میں بہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور اس کا نتیجہ کلامِ غالب منفی غالب ہو — اسی سے ملتی جلتی زبان، طرز، اسلوب، پیرائے۔ یہاں تک کہ بہت سی غزلوں کی زمینیں بھی وہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مشابہتیں ملاحظہ کیجئے:۔

غالب : تلخابۂ سرجوشِ گدازِ نفس است ایں
ناطق : یک قطرہ نزہرابِ گدازِ نفس است ایں
غالب : درکشورِ بیدادِ تو فرمانِ قضا نیست
ناطق : درکشورِ بیدادِ تو سودا بہ ضنیست
غالب : بر قند نہ بر شہد نشیند مگسِ ما
ناطق : بر شربت دینار نچسپد مگسِ ما
غالب : واغم از پردۂ دل رو بہ قفا می آید
ناطق : نگہ از چشمِ تو ہم رو بہ قفا می آید

دوسری زمینیں: کُو برد - بسمل افتاد است۔

ان امور کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم غالب کی فارسی شاعری کو آسان اور سلیس شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ جس سے اس کا عظمت تو پیدا نہیں ہوتی لیکن جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ اس بنا پر یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ کہیں پریشانیٔ احوال کا ذکر بھی غالب ہی کے رنگ میں رنگے جانے کا نتیجہ نہ ہو۔ اور یہ بڑی حد تک درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ چند اور مثالیں اس گمان کو یقین کی حد تک لے جاتی ہیں۔

غالب : فرو کند نفسِ سردِ من جہنم را
ناطق : زآہِ ما سرد شود گرمیٔ ہنگامۂ حشر

توالیٔ اضافات: حدیث لذتِ لعلِ حلاوت دستگاہِ او

غالب : دمید دانہ و بالید و آشیاں گر شد
در انتظارِ ہما دام چیدہ ام بنگر

ناطق : گذشت موسم و رفتند ہمرہان و ہنوز
سفینۂ منِ مسکیں بہ ساحل افتاد است

غالب : نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ناطق : گرچہ بلبل کلبۂ از خار و خس باشد مرا
کشتنی باشم اگر گلشن ہوس باشد مرا
کے میسر می شود مرغانِ باغ خلد را
ایں فراغت ہا کہ در کنجِ قفس باشد مرا

تیور : ؏ فارغ از آفتِ ما باش کہ ما خصمِ خودیم

" : رفتم بسوئے کعبہ زکوئے بتاں دلے
حسرت دوید از پے و دامانِ من گرفت

" : تنہا نہ شمع ہر کہ در آید بہ محفلت
روئے تو دید شمع صفت سوختن گرفت

گفتم کہ شد ذوقِ محنت گفت تو بردی
گفتم کہ چہ شد زخمِ دلت گفت عدو برد

کم کن سخن از کوثر و تسنیم کہ نتواں
از دل ہوسِ بادہ بسرچشمہ و جو برد

یاد آنکہ بہ لب خندہ و با چرب زبانی
اُو برد دل از ناطق و ناطق دل او برد

آبحیوان و ہلاہل اگر آری بہ برم
آں بکام تو فرو ریزم و ایں نوش کنم

اور غمِ ہستی کی ترجمانی میں تو وہ تمام فارسی شاعروں سے زیادہ غالب سے قریب ہے اور خود بھی نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں خاصے مضامین بھی پیدا کئے ہیں اور اسالیب بھی:

درکفِ خویش پئے کشتنِ خود شمشیرم
ہیچ و تابے کہ خورد از غمِ اُو جوہر ما

فارغ از آفت ما باش کہ با خصمِ خود یم
ز آہنِ تیشۂ فرہاد بود خنجر ما

تا بکے از سخت جانی نیم بسمل زیستن
می زنم ایں بار بر تیغے کہ بس باشد مرا

ہیں بھی رگ رگ کے نہ مرتا جو جفا کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس) غالب

صوتِ بلبل طرب آرد بہ گلستاں چہ روم
بہ کہ در کلبۂ خود نالۂ خود گوش کنم

جرس بنالہ ندانم مقلدِ دلِ کیست
کہ ناقہ بے خود و لیلیٰ ز محمل افتاد است

غم ز دولتِ بیداد دلبراں ناطق
بہ شادیٔ ہمہ عالم مقابل افتاد است

ان تمام اشعار سے یہ دو رُباعیاں زیادہ پُرسوز ہیں اور ناطق کے اندوہناک تجربۂ زندگی کا حاصل:۔

در لبستہ بخانہ اندروں می گریم
تا پئے نبرد کسے کہ چوں می گریم
دور از لبِ میگونِ تو مانند کباب
می سوزم و نالم و خوں می گریم

عمریست کہ تیرِ چرخ را آماجم
بر تارکِ افلاک فلاکت تاجم
یک شمہ ز مفلسیٔ خود شرح دہم
چندانکہ خدا غنی است من محتاجم

دوسری رباعی کے مصرع ثانی میں پھر غالب ہی کی گونج سنائی دیتی ہے:۔

شاہیم زبانہ افسر، داغ اورنگ

بے کسی کے عوالم میں وہ اپنی یوں تسلی کر لیتا ہے:۔

نیست غم ناطق نباشد گر کسِ من ہیچکس
بے کسی تا ہست کے پروائے کس باشد مرا

ان امور سے قطع نظر ناطق نے بعض بڑے اچھوتے خیالات کی ترجمانی بھی کی ہے:

وا رسیدیم بجائے من و ناطق در عشق
کہ بود بلبل و پروانہ نصیحت گرِ ما

صورت چو معنوی ست بناز ش نیاز نیست
بت بے کرشمہ دل زکفِ برہمن گرفت

یاد آنکہ گر از دل نگہش تیر برآورد
نشتر برگِ جانِ من آں غمزہ فرو برد

اس لحاظ سے وہ غزل جس کی زمین "میاں بستم۔ فغاں بستم" ہے سب سے نمایاں ہے کیونکہ اس میں ایک جسارت آمیز احساس نے مسلسل جذبہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شعر میں سلسلہ اقبال کی "مشکل کشی جفا طلبی" تک جا پہنچا ہے:

نخواہد ہمتم محرومیٔ کس گو بود دشمن
پئے آگاہیٔ رہزن جرس بر کارواں بستم

شبِ وصل ہست ہشب تا نہ انجامد بہ کوتاہی
بخورشیدِ جہاں افروز راہِ کارواں بستم

اور وہ شعر جس سے یہ جرأت آمیز سلسلۂ فکر انتہا تک پہنچ گیا ہے یہ ہے:۔

بشاخِ گل نشیمن ساختن بر بلبل ارزانی
کہ من در چنگلِ شہبازِ خوں ریز آشیاں بستم

اس سے ظاہر ہے کہ ناطق کا شمار ان منفرد شعراء میں ہے جو

باقی صفحہ ۱۰ پر

اردو یونی ورسٹی

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ ابتدا سے جدید تعلیم کا ڈول کچھ ایسا پڑا کہ جو فوائد اس سے مرتب ہو سکتے تھے وہ نہ ہوئے، اور بعض اعتبار سے جو نقصان اس سے پہنچے، ان کی تلافی اب تک نہ ہو سکی۔ غیر زبان کا سیکھنا نہ تو کوئی بری بات ہے، اور نہ کچھ زیادہ مشکل، بلکہ ایک لحاظ سے مستحسن ہے۔ بقول گوئٹے کے کہ جو صرف اپنی ہی زبان جانتا ہے، وہ کوئی زبان نہیں جانتا لیکن جب ہر مضمون اور علم کا سیکھنا کسی ایسی غیر زبان کے ذریعے لازم قرار دیا جائے، جو بالکل اجنبی ہے، تو وہ ایک عذاب ہو جاتا ہے۔ قوائے جسمانی و ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں، اور جدت وجودت مفقود ہو جاتی ہے۔ ایک قوت تو خود زبان سیکھنے کی ہے اور دوسری اس کے ذریعے سے مضمون سمجھنے کی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ مضمون پر، اور وقت دگنا بلکہ کئی گنا زیادہ صرف ہوتا ہے، اور عمر کا سب سے عزیز حصہ اس الجھن میں بے کار جاتا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جو اس گھپلے میں مبتلا ہو۔

دوسرا بڑا عیب یہ ہے کہ انتہائی تعلیم تک ہر مضمون انگریزی زبان اور انگریزی یا دوسرے یورپی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعے پڑھنے سے طلبہ کے طرز فکر و خیال پر بڑا اثر پڑتا ہے اور غیر محسوس طور پر وہ اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں، نقالی اور تقلید غالب آجاتی ہے۔ اس ذہنی غلبت کی وجہ سے وہ بے لاگ غور و فکر سے قاصر رہتے ہیں۔ اور ان میں اور ان کے ماحول میں مغائرت پیدا ہو جاتی ہے، جو قومی ترقی اور نشوونما کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی باطنی کیفیت کا اثر ظاہر پر بھی پڑتا ہے۔ خیالات اور جذبات ادا کرنے کے لئے زبان ایسی ضروری ہے جیسے انسانی زندگی کے لئے آکسیجن۔ زبان کے ہر ہر لفظ اور جملے میں قومی روایات، تہذیب و تمدن کے شعار اور ذہنی، روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں۔ قوم کی ذہنیت میں اور اس کی زبان میں ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق غیر زبان سے پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری جدید تعلیم نے ہمیں اس سے بہت کچھ محروم کر دیا ہے۔ انگریزی طرز بیان اور طرز خیال اور انگریزی لفظوں اور جملوں کی ساخت اور ترکیب ہمارے تعلیم یافتہ گروہ کے دل و دماغ میں ایسی رچ جاتی ہے، کہ جب وہ کسی خیال کو ادا کرتے ہیں تو وہ ہماری زبان اور زبان والوں کے لئے اجنبی ہوتا ہے۔ اس سے لطف حاصل کرنا تو درکنار بعض وقت اس کا سمجھنا بھی دشوار ہے اور حسن بیان جو ادب کی جان ہے، پیدا نہیں ہونے پاتا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک صدی کی تعلیم کے بعد بھی ہم اس قابل نہیں ہوئے کہ ان علوم اور فنون کو جو ہم نے انگریزی زبان کے ذریعے حاصل کئے۔ اس ڈھنگ سے اپنی زبان میں منتقل کر سکیں کہ اہل ملک ان سے مستفید ہو سکیں۔ یہ علم گونگے کا گڑ ہو گیا ہے۔ تعلیم سے جو یہ منشا تھا کہ اس سے علم کی روشنی ملک میں پھیلے گی اور جو لوگ یونی ورسٹیوں اور کالجوں سے پڑھ پڑھ کر نکلیں گے، وہ اپنی معلومات سے اہل وطن کو نہال کر دیں گے، پورا نہیں ہوا۔ ایک ایسے ملک کے لئے جو علم میں پسماندہ بھی ہے اور مفلس بھی، ایک اجنبی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا نہایت مضرت رساں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کی رفتار بہت سست ہے، سالہا سال کی تعلیم کے بعد بھی اب تک پورے ایک فی صدی اشخاص بھی یونی ورسٹیوں کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہوئے۔ اگر یہ تعلیم اپنی زبان کے ذریعے سے دی جاتی، اور اس میں علوم و فنون کی کتابیں تالیف و ترجمہ کی جاتیں تو دوسرے فوائد کے سوا ان افراد کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچتا جو سررشتہ تعلیم کے قواعد یا کسی یونی ورسٹی کے نصاب کے پابند نہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں ان کے نصاب تعلیم میں داخل ہو جاتیں اور وہ بغیر کثیر مصارف کے جو یونی ورسٹیوں کی تعلیم میں برداشت کرنے پڑتے ہیں، متمتع ہوتے۔ علاوہ اس کے وہ اشخاص جو بہ وجہ عدم استطاعت یا دوسری مجبوریوں سے اعلا تعلیم حاصل نہ کر سکے ان علمی کتابوں کو اپنی زبان میں پڑھ کر بہت کچھ فائدہ حاصل کرتے۔ اہل ملک کو ان فوائد سے اس لئے محروم رہنا پڑا کہ تعلیم غیر اور اجنبی زبان میں

دی جاتی ہے۔ اردو کو اعلیٰ درجوں میں ذریعۂ تعلیم بنانے اور اردو
یونی ورسٹی کا خیال سب سے پہلے ہماری قوم کے عالی دماغ مصلح سر سید احمد
کو ہوا۔ جبکہ انہوں نے ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے
جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سکریٹری تھے، اس بارے میں ایک
عرض داشت گورنمنٹ آف انڈیا میں پیش کی۔ اس عرض داشت
میں سرسید نے اس تجویز کی ضرورت اور اہمیت کو صاف اور سادہ
زبان میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے، اور اس امر پر خاص طور پر
زور دیا ہے کہ جب تک جدید علوم ہمیں ہماری زبان میں نہ پڑھائے
جائیں گے ہماری تعلیم ناقص، ناکافی اور غیر موثر رہے گی۔ یہ عرض داشت
ایسوسی ایشن کے ممبروں کے دستخط سے جس میں ہندو مسلمان سب
شریک تھے، ہز ایکسی لنسی وائسرائے و گورنر جنرل آف انڈیا ان کونسل
کی خدمت میں پیش کی گئی اور اس بارے میں گورنمنٹ آف انڈیا سے
مراسلت بھی ہوتی رہی۔ وزیر ہند نے بھی اس خیال کو پسند کیا۔ اخبارو
میں بھی کچھ دنوں تک اس پر بحث رہی لیکن افسوس ہے کہ اس وقت
حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ اہم تجویز جس میں ہندوستان اور خاص کر شمالی
ہند کی علمی اور تہذیبی ترقی کے شاندار اور وسیع امکانات مضمر تھے
عمل میں نہ آسکی۔ اس وقت اس پرانی بحث کا چھیڑنا لاحاصل ہے
کہ اردو میں یہ صلاحیت ہے یا نہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہو سکے،
جب کہ اس نے سوا سو برس قبل بھی اپنی اس صلاحیت کا حیرت انگیز
ثبوت دیا تھا۔ پرنسپل کارگل اپنی سالانہ رپورٹ دہلی کالج بابت ۱۸۵۲ء
میں لکھتے ہیں کہ:

"مشرقی شعبے کے طالب علم اپنے مغربی شعبے والے
حریف سے سائنس میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں..."

آگے چل کر پرنسپل موصوف اسی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"حال ہی میں اس کالج کا معائنہ کرنے کئی اصحاب
تشریف لائے جن میں نہایت ذہین اور طباع
افسرانِ فوج، مشنری اور تعلیمی مسائل کا عملی تجربہ
رکھنے والے اصحاب تھے۔ انہوں نے مشرقی شعبے
کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے علم نجوم، سائنس
اور مذہب اور علم اخلاق کے مسائل پر گفتگو کی، اور
انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ اس شعبے میں یقیناً
ترقی ہوئی ہے اور مختصر یہ کہ اس طرح کا اعلیٰ تعلیم
ہندوستان بھر میں کہیں اور نہیں ہے —!"

کالج کی مجلس ترجمہ نے تقریباً سوا سو کتابیں مختلف علوم و فنون پر تالیف و
ترجمہ کیں، اور علمی اصطلاحات کے ترجمے کے لئے ایسے اچھے قواعد وضع کئے
جو اب بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ کالج قائم رہتا اور حالات زمانہ کے
مطابق اس میں ضروری ترقی ہوتی رہتی تو یہی سب سے پہلی اردو یونی ورسٹی
ہوتی اور یہ ہمارا ہی امتیاز و افتخار ہوتا لیکن ۱۸۵۷ء کی شورش کے
بعد دہلی صوبۂ پنجاب میں داخل کر دی گئی، دہلی کالج توڑ دیا گیا۔ اور آج
سالہا سال کی محنت اور آئندہ امیدوں پر پانی پھر گیا۔

دہلی کالج کے تقریباً اسی سال بعد حیدرآباد دکن میں عثمانیہ
یونی ورسٹی قائم ہوئی جس میں تمام علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ اس
یونی ورسٹی سے متعلق شعبۂ تصنیف، تالیف و ترجمہ کی بدولت علوم و
فنون کی صدہا کتابیں تالیف یا ترجمہ کر کے شائع کی گئیں اور ہزارہا علمی
اصطلاحات وضع کر لی گئیں۔ ایم ایس سی، انجینیری، ڈاکٹری اور جدید
نظری اور تجربی علوم کے سارے شعبے قائم کئے گئے۔ تیس سال تک تعلیم
کامیابی سے جاری رہی۔

سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ڈاکٹری تعلیم کا تھا لیکن عثمانیہ
یونی ورسٹی کے تحت ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے درجوں میں بھی اردو ہی کے
ذریعے سے تعلیم دی جاتی تھی اور لندن کے "رائل کالج آف سرجنس" کے
ایک وفد نے جامعہ عثمانیہ کی ڈاکٹری تعلیم کا معیار جانچنے اور طب
پر اردو کی کتابیں معائنہ کرنے کے بعد اپنے کالج کی مجلس اعلیٰ کو یہ رپورٹ
دی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت ڈاکٹری تعلیم کا معقول اور تسلی بخش انتظام
ہے اور پھر وفد کی اس رپورٹ کی بنا پر انگلستان کے سب سے بڑے طبی
ادارے نے بھی جامعہ عثمانیہ کی ڈاکٹری کی ڈگریوں کے تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا۔

سائنس کی طرح معاشیات کو بھی ایک مشکل مضمون سمجھا جاتا ہے،
اور اس مضمون میں بھی عثمانیہ یونی ورسٹی کے طلبہ کے جوابات کا معیار ملک
کی دوسری یونی ورسٹیوں کے [illegible] کے معیار سے جنہوں نے انگریزی میں
تعلیم حاصل کی تھی بہتر رہا۔ چنانچہ اس کا اعتراف ہندوستان بھر
کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے شعبۂ معاشیات کی [illegible] کانفرنس
منعقدہ [illegible] میں کیا گیا۔

غرض کہ اردو میں سوا سو سال پہلے بھی اعلیٰ درجوں میں ذریعۂ

تعلیم بننے کی صلاحیت تھی، اور عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد میں بھی تیس سال تک ادب، سائنس، معاشیات، قانون، طب اور جملہ نظری و تجربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے سے کامیابی سے دی جاتی رہی۔

عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہندوستانی یونی ورسٹیوں کے اربابِ اختیار نے بعض سیاسی مصلحتوں اور ناگزیر مجبوریوں کی بناء پر اپنی یونی ورسٹیوں میں انگریزی زبان کو بدستور ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے باقی رکھا لیکن چوں کہ عثمانیہ یونی ورسٹی کی تجویز اس کے منصوبے اور پھر اس کے قیام کے ہر ہر مرحلے پر مشورتی اور عملی طور پر میں اس سے وابستہ رہا تھا اس لئے جب انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر اورنگ آباد سے دلّی منتقل ہوا تو میں نے ۱۹۳۸ء میں ایک کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور پھر اس کانفرنس میں اتفاق رائے سے ذیل کی تجویز منظور ہوئی:

> "جامعہ عثمانیہ کے تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کانفرنس کی رائے میں بہت ضروری ہے کہ کم از کم دہلی، پنجاب، لکھنؤ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، الٰہ آباد اور پٹنہ یونی ورسٹی میں جلد سے جلد اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اردو قرار دیا جائے۔"

کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد میں نے مذکورۂ بالا تجویز کے سلسلے میں متعلقہ یونی ورسٹیوں کے اربابِ اختیار سے خط و کتابت شروع کی، لیکن یہ زمانہ سخت سیاسی خلفشار کا تھا، اور دوسری عالم گیر جنگ کی وجہ سے حالات حد درجہ غیر یقینی ہو گئے تھے، اس لئے اس مہم میں کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو سکی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ اصولی طور پر سب اس کا اعتراف کرتے تھے کہ تعلیم کے ہر مرحلے پر ملکی زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم ہونا چاہئے اور یہ بھی مانتے تھے کہ جامعہ عثمانیہ نے اردو ذریعہ تعلیم کو آزما کر بڑی اچھی مثال قائم کر دی ہے، لیکن پہل کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے طے کیا کہ انجمن ترقی اردو ہند کے اہتمام و انتظام میں پہلا قدم یہ ہو کہ کسی موزوں مقام پر ایک اردو یونی ورسٹی قائم کی جائے، چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۱ء کو تیسری کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس ناگپور کے کھلے اجلاس میں اردو یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاقِ رائے سے تجویز پاس ہوئی۔ یہ کوئی وقتی اور ہنگامی تجویز نہ تھی بلکہ بہت پہلے سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور متعلقہ اصحاب کی رائے و مشورے کے بعد مرتب ہوئی اور کانفرنس میں منظوری کے لئے پیش کی گئی تھی...

اردو یونی ورسٹی کے قیام کی اس اہم اور تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ خطوط، مراسلات اور نجی مکتوبات کے ذریعے ہر خیال اور طبقے کے لوگوں نے امداد و اعانت کا یقین دلایا۔ ناگپور کانفرنس کی شرکت سے دلّی واپس آنے پر میں نے ایک روز قائد اعظم محمد علی جناحؒ کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی زحمت دی۔ قائد اعظمؒ نے بکمال مہربانی میری دعوت قبول فرمائی۔ کھانے پر جہاں قومی تعمیر کے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، مجوزہ اردو یونی ورسٹی کا بھی ذکر آیا۔ اور قائد اعظمؒ نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔ اس کے چند دن بعد وہ علی گڑھ تشریف لے گئے۔ وہاں مسلم یونی ورسٹی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے اُن کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سپاس نامہ میں بھی مجوزہ اردو یونی ورسٹی کے بارے میں دلّی کی مذکورہ بالا گفتگو کا حوالہ موجود ہے۔ سپاس نامہ کے آخری الفاظ یہ تھے:

> "ہم جناب کی توجہ وقت اور ملک کی اہم ضرورت کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کی حالیہ ملاقات اردو یونی ورسٹی کی اسکیم سے آپ کی ہمدردی اور دلچسپی کو دیکھنے کے بعد ملتمس خدمت ہیں کہ اگر آپ نے اس یونی ورسٹی کے قیام میں جب کہ جامعہ عثمانیہ کا عملی تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ انجمن ترقی اردو کی مدد فرمائی تو نہ صرف جلد از جلد یونی ورسٹی قائم ہو جائے گی بلکہ ہماری دوسری درسگاہیں بھی ہندوستان کی قومی زبان کے اس حق کو ماننے پر مجبور ہوں گی۔"

اسی سال (۱۹۴۱ء) صوبہ جات متحدہ کے سابق ڈائرکٹر تعلیمات اور مشہور ماہر تعلیم خان بہادر سید اسد اللہ کاظمی نے گورکھپور ایجوکیشنل کانفرنس میں اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہوئے مجوزہ اردو یونی ورسٹی کی اسکیم کو اردو کی تقدیر بدلنے کے نسخے سے تعبیر کیا اور کہا کہ:

.... وقت کی نبض شناسی اور مسائل کی جامعیت کا اظہار و احساس اس تجویز سے زیادہ بہتر نہیں ہو سکتا، جو ڈاکٹر صاحب موصوف (عبدالحق) نے شمالی ہند میں ایک اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے تخیل کی صورت میں پیش کی ہے۔

"اس یونی ورسٹی کا قیام محض اُردو ہی کی ترقی کا باعث نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمارے ذہن کو اُن قیود سے نجات دلانے والا ہوگا جو اس پہ اس وجہ سے مسلط ہو کر رہ گئی ہیں کہ ہم نے اب تک مختلف علوم محض انگریزی زبان ہی میں پڑھے اور سیکھے ہیں۔"

چند دنوں ہی میں اُردو یونی ورسٹی کے قیام کی اس تجویز کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ ملک کے ہر گوشے سے اُس کے قیام کے امکانات اور دوسری تفصیلات پر خیالات ظاہر کئے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض ہمدردوں نے اس سوال پر غور کرنا شروع کر دیا کہ یہ یونی ورسٹی کہاں قائم کی جائے۔ چنانچہ الٰہ آباد کے ایک مراسلہ نگار نے ڈان دہلی (اپریل ۱۹۴۴ء) میں اِس خیال کا اظہار کیا کہ:

"یہ یونی ورسٹی کراچی میں قائم کی جائے،
کیونکہ دہلی اور اُس کے نواح میں کئی یونی ورسٹیاں
پہلے سے موجود ہیں۔"

اس سلسلے میں، میں یہاں سابق سندھ کے ایک سماجی کارکن اور ماہرِ تعلیم مسٹر واسوانی کے ایک خط کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو جون ۱۹۳۹ء کے "سندھ ابزرور" کراچی میں چھپا تھا۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ الٰہ آباد کے مراسلہ نگار نے ۱۹۴۴ء میں کراچی میں جس اردو یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی، اس سے پانچ برس پہلے ایک دور اندیش ہندو نے سندھ اور کراچی میں اُردو کے ذریعے سے تعلیم دینے کے روشن امکان پر کس خوبی اور عمدگی سے نظر ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فارسی کی طرح اِس (اُردو) میں لطافت اور نزاکت ہے، اور اس کے ادب میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔

"حیدر آباد دکن میں جہاں تعلیم اردو کے ذریعے سے ہوتی ہے اس نے ثابت کر دیا کہ سائنس اور ادب کی تعلیم کے لئے دیسی زبان میں کسی طرح کی کوئی [illegible] نہیں۔ اگر یہ صورتِ حالات ہے تو پھر سندھ میں کیوں نہیں حیدر آباد دکن کی طرح اُردو ذریعۂ تعلیم بنایا جاتا ....

میرا خیال ہے کہ اُردو زبان میں ایک قدرتی لوچ اور لطافت ہے اور

اگر یہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں داخل کی گئی تو یہ ہمارے طلبا کی دماغی نشوونما میں مدد کرنے کے ساتھ ہی حُسن و اوبی چیزیں پیدا کرنے میں اُن کی بہت بہت افزائی کرے گی۔"

اُردو یونیورسٹی کی تجویز کی جس طرح تائید و حمایت کی گئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یہ یونی ورسٹی قائم ہو کر رہے گی۔ لیکن اس کے بعد ہی بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے اتنا موقع نہ دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا، یہاں تک کہ نوبت تقسیم ملک تک پہنچ گئی اور سارے ارادے دل کے دل میں رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی اُمید کی ایک کرن ملتی تھی اور بجھی ہوئی راکھ میں ایک چنگاری روشن تھی کہ اگر ہندوستان میں ناگپور کی تجویز عمل میں نہ آسکی تو پاکستان میں تو اُسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے گی۔ کیوں کہ اصولی طور پر یہ حقیقت تسلیم کی جا چکی تھی کہ پاکستان کی قومی، تعلیمی اور سرکاری زبان اُردو ہوگی۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ مجھے تو اُردو کا روگ لگ گیا ہے اور مجھے خواہ موقع ہو یا نہ ہو، ہر جگہ اُردو ہی اُردو نظر آتی ہے۔ آپ کو حق ہے میرے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں۔ کوئی روکنے والا اور ٹوکنے والا نہیں، لیکن اس کو کیا کیجئے گا کہ سات سمندر پار لندن میں ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو مشہور انگریز عالم اور مستشرق پروفیسر اے۔ آر۔ گبیری نے اسی خیال کا اظہار قائدِ اعظم کی موجودگی میں کیا تھا۔ جب کہ انھیں پاکستان ایسوسی ایشن کی طرف سے اسی دن رات کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا اور جس دن لندن میں مقیم تمام مسلم وزرا، سفیر اور دیگر سیاسی نمائندے موجود تھے پروفیسر صاحب نے اُردو زبان و ادب پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

"اُردو اب پاکستان کی سرکاری، تعلیمی
و عدالتی زبان کا درجہ حاصل کر رہی ہے۔"

اپنی تقریر کے آخر میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ:

"اُردو ادب کا شمار اب دنیا کے عظیم ترین
اور اعلیٰ ترین ادبیات میں ہوگا۔"

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ نہ صرف اس برِ عظیم پاک و ہند بلکہ غیر ممالک کے ممتاز اصحابِ فکر و نظر بھی یہ یقین رکھتے تھے کہ اُردو اور صرف اُردو پاکستان کی قومی، تعلیمی اور سرکاری زبان ہوگی، اس لئے اگر میں یہ سوچتا تھا کہ تقسیمِ ملک کی وجہ سے ناگ پور کانفرنس کی

اردو یونیورسٹی کے قیام کی یہ تجویز خواب پریشاں ہو کر رہ گئی۔ وہ یہاں کراچی میں ضرور یاد آئے گی تو اس کے لئے میں کس طرح تلافی کا ذریعہ بنا۔ عربی کی ایک مشہور مثل ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ مجھے اردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنون کی حد تک ہے لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پوری قوم کی تہذیب، ثقافت، تصورات، نظریات اور اس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون ایسا بدبخت ہے، جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہوگی۔

جب میں نے دلی میں قائد اعظم سے اردو یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں گفتگو کی تھی تو انھوں نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور مجھے قوی امید تھی کہ میں ان کی امداد و اعانت سے کراچی میں اردو یونیورسٹی کے قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا لیکن اس وقت خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ قائد اعظم ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اور ان کے بعد ہماری بدنصیبی سے زبان کا طے شدہ مسئلہ ایک نزاعی مسئلہ بن گیا اور پھر خود غرض اور مفاد پرست سیاست کاروں کی بدولت اس نے ایک "فتنہ بیدار" کی شکل اختیار کر لی لیکن میں اس وقت بھی مایوس نہ ہوا اور میں نے اللہ کا نام لے کر اسی کراچی میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام اردو کالج قائم کیا، جو خدا کے فضل و کرم سے اب بھی کامیابی سے چل رہا ہے اور جس میں بی۔ اے، بی۔ ایس سی۔ بی کام اور ایل ایل بی تک اردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اب سے چند سال پہلے ایم۔ اے کی تعلیم بھی اس میں اردو کے ذریعہ دی جاتی تھی۔

موجودہ انقلابی حکومت کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے بھی انجمن کے اردو کالج میں قومی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کے کامیاب تجربے کا اعتراف کیا ہے اور اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ تجربہ جاری رہنا چاہئے۔ پچھلی حکومتوں کے دوران میں پاکستان کی بنیادی قدریں کس طرح پامال کی گئیں اب اس کا ذکر عبث اور لاحاصل ہے۔ اگر کچھ دن اور یہی صورت حال جاری رہتی تو خدا ہی جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ مگر خدا کا کرم ہمارے شامل حال ہوا اور یہی غلط کار اور مفاد پرست سیاست کاروں سے نجات [illegible] ہماری زبان کے بارے میں [illegible] واضح اور معین نقطہ نظر [illegible] گیا اور تعلیمی کمیشن کی بدولت کم سے کم [illegible] پاکستان کی حد تک یہ تسلیم کر لیا گیا کہ آئندہ پانچ سال کے اندر ثانوی درجے تک ذریعہ تعلیم اردو ہو جائے گی اور پھر رفتہ رفتہ پندرہ سال کے اندر اردو ہی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے گا۔

پندرہ سال کی مدت بہت زیادہ ہے۔ کم سے کم میں تو استے دنوں انتظار نہیں کر سکتا جب کہ ایک صدی قبل دلی کالج میں ادب اور سائنس کی تعلیم اردو کے ذریعہ سے دی جاتی تھی اور جب کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی درخشاں مثال ہمارے سامنے ہے اور ضرورت کے مطابق ہر علم و فن میں نصابی کتابوں کا ذخیرہ بھی اردو میں موجود ہے تو پھر ہم پندرہ سال کیوں انتظار کریں اردو میں تعلیم کا جو تجربہ سوا سو سال پہلے دلی کالج میں کیا گیا اور عثمانیہ یونیورسٹی کے ہر شعبے میں ۳۰ سال تک بڑی کامیابی سے جاری رہا، آخر آج اس کی کامیابی میں کیوں شکوک و شبہات ہیں؟

انگریزی ذریعہ تعلیم کی لعنت صرف برعظیم پاک و ہند میں ہے ورنہ فن لینڈ، ڈنمارک وغیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تمام علوم اور سائنس کی تعلیم ملکی زبانوں میں دی جاتی ہے۔

سب سے سبق آموز مثال اسرائیل کی ہے جہاں کی یونیورسٹی کے تمام مدارج میں جملہ علوم و فنون اور سائنس کا ذریعہ تعلیم عبرانی ہے۔ جو صدیوں سے مردہ ہو چکی تھی اور اب دفتر، عدالت کاروبار غرض ہر جگہ رائج کر دی گئی ہے۔ اور کسی کی مجال نہیں کہ وہاں عبرانی کے سوا کوئی دوسری زبان استعمال کرے۔ اور تو اور انڈونیشیا جسے حال میں آزادی ملی، وہاں تعلیم اور دوسرے کاروبار سب اپنی زبان میں ہوتے ہیں، اور سابق آقاؤں کی زبان ولندیزی کو ملک بدر کر دیا گیا۔

میں نے دہلی کالج، سید احمد خاں کی مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کی مثالیں اور ان کے بارے میں برعظیم اور غیر ممالک کے ماہرین تعلیم کی رایوں کے مختصر اقتباسات صرف اس لئے پیش کئے کہ وہ کرم فرما اپنے موقف پر نظر ثانی کریں، جو اب تک بدقسمتی سے انگریزی ذریعہ تعلیم کی افادیت کو ایک عقیدے کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے اس کتابچے میں غیر مسلم ماہرین تعلیم کی رائیں خاص طور پر اس لئے درج کی ہیں کہ ان کے متعلق یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ذریعہ تعلیم کے تجربے کی کامیابی کا اعتراف ان کی اندھی اردو دوستی کا رہین منت ہے۔ اس کے خلاف واقعہ یہ ہے کہ ان میں [illegible] کسی کی مادری زبان اردو نہیں [illegible] عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم کے

بارے میں جو انہیں ظاہر کی ہیں وہ انتہائی بے لاگ اور غیر جانب دارانہ ہیں اس کے بعد بھی اگر اعلا درجوں میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے ہمیں ابھی اور پندرہ سال کی ضرورت ہے تو پھر ہماری یہ "وضع داری" اور "سلامت روی" قابلِ رحم ہے۔ لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا اور ایک مسلمہ حقیقت کو عمل میں لانے کے لئے پندرہ سال اور غیر یقینی اور تذبذب کے عالم میں نہیں رہنا چاہتا — اور اللہ کے نام سے از سرِ نو، اُردو یونی ورسٹی کی زندگی بخش اور روح پرور مہم نئے جوش اور ولولوں سے شروع کرتا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ میں اپنی عمر کی نوّے منزلیں طے کر چکا ہوں لیکن میرے ارادے اب بھی جوان ہیں اور میرا عزم و حوصلہ اب بھی زندگی کی حرارت سے سرشار ہے۔ میرے سامنے ایک مقصد ہے اور اُس مقصد کی تکمیل ہی میری زندگی کا حاصل ہے اور وہ مقصد ہے جلد سے کراچی میں ایک چارٹرڈ اُردو یونی ورسٹی کا قیام، مجھے تو اس مقصد کو لے کر آگے بڑھنا ہے اور اس یقین و اعتماد کے ساتھ کہ میرے اہلِ وطن، بچے، طالب علم، جوان، بوڑھے، شہری، دیہاتی، زمیندار، سرمایہ دار، صنعت کار، کاشت کار، تاجر، دست کار، امیر، غریب اور چھوٹے بڑے سب میرا ساتھ دیں گے۔

اس سوال کے طے ہو جانے کے بعد کہ کراچی میں اُردو یونی ورسٹی کا قیام وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے، ایک دوسرا سوال بھی سامنے آتا ہے کہ یونی ورسٹی کے قیام کے لئے رقم کہاں سے آئے گی اور کس طرح فراہم کی جائے گی! میں نے سید احمد خاں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے اور فیض حاصل کیا۔ لیکن افسوس کہ میں اُن سے چندہ مانگنے کا گُر نہ سیکھ سکا، جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں۔ مجھے مجوزہ اُردو یونی ورسٹی کے لئے سر دست صرف پچاس پچپن لاکھ روپوں کی ضرورت ہے۔ یہ رقم بہت بڑی نہیں۔ صرف کراچی کے دردمند اور مخیر اصحاب اس رقم کو بڑی آسانی سے فراہم کر سکتے ہیں لیکن میری یہ کوتاہی ہے کہ مجھے مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ مگر اس کے باوجود ہاتھ پھیلائے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اس لئے میں اپنے ہم وطنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ میری دست گیری کریں، مجھے سہارا دیں اور اُردو یونی ورسٹی کے قیام میں میری مدد کر کے مجھے ایک نئی زندگی عطا کریں۔ میں اب زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام

(باقی ص ۸۷ پر)

"تا بہ شیشۂ حلبی"

(دفعتاً ایک نئے ترنم میں)

چوھدری فضل حق

تمناؤں کے خوں میں غرق صبحوں سے نہ گھبراؤ
صدا دو ابنِ آدم کے جنوں کے کاروانوں کو
طلسمِ بیدلی نے اس سے پہلے بھی سراب آسا
ہزاروں عافیت کے آسرے لے کر حباب آسا
یہ چاہا ہے کہ طوفاں اس طرح بدنام ہو جائیں
کہ موجیں بازوؤں پر اک کھلا الزام ہو جائیں
مگر روشن رہی ہے آرزوؤں آفتاب آسا
کہ جیسے تیرگی کا قلبِ ویراں جگمگاتا ہو

گلستاں بن کے کھلتا ہے تمناؤں کا خوں اکثر
چمن کو پھونک دیتا ہے، الم دیدہ جنوں اکثر
ہیں املیّے بشر کی داستاں کے سارے شہپارے
گہر پرور صدف، عظمت کے گلشن خیز گہوارے
خوشی ہے نام جس کا، ایک اندازِ تفکر ہے
مٹا سکتے ہیں جس کو حادثے، لمحے، نہ سیارے
فریبِ آگہی سے ہے غمِ دنیا نے دوں اکثر
یہ رازِ غم کشا کشہائے بیتابی کو سمجھا دو

کمالِ آرزو کو ہے شکستِ آرزو لازم
جمالِ گل کو ہے نو خیز کلیوں کا لہو لازم
سبک رفتارِ خواہش سے، حقائق کی گرانی تک
طلوعِ شوقِ منزل سے، فرازِ کامرانی تک
نہ جانے کتنے ارمانوں کا خوں دے کر پہنچتی ہے
جماعت خستۂ غم، اک مقامِ شادمانی تک
نیازِ بندگی کو اشکِ غم سے ہے وضو لازم
مئے غم پی کے اٹھو اور غم کی بدلی پہ چھا جاؤ

پھر چراغِ لالہ سے ....[1]

(شہیدِ ملّتؒ اور انقلابِ اکتوبر)

شہاب رفعت

آج پھر پیکرِ بے جاں میں ہے ہیجانِ نمو
آج پھر دوڑ اٹھا میرے رگ و پے میں لہو
پھر ہوا درد کی لذّت سے شناسا پہلو
آج کہ انجام بھی تھا
آج ہی آغاز بھی ہے
آج ہی تارِ رگِ جاں ٹوٹا
آج ہی غلغلۂ نغمگیٔ ساز بھی ہے
آج پھر پیکرِ آسودۂ خاک
اٹھ کے سرگرمِ خرام اور خود افراز بھی ہے
پھر غزل خواں ہے حیات
پھر لبِ زخم ہوئے زمزمہ خواں
زندگی کے لئے جو بادِ سموم
بڑھ کے عفریتِ صفت خانہ برانداز ہوئی
شش جہت روئے نمو بن کے چمن ساز ہوئی
جاگ اٹھا خواب سے اس طرح بہاراں کا طلسم
رنگ کی وہ کہیں مرونی روئے خزاں
انہیں ایام میں سو یا تھا سرِ خاک کوئی
انہیں ایام میں جاگ اٹھا ہے اک مردِ جری
قُم باذنی کی صدا کیا آئی
جیسے وہ پیکرِ خوابیدہ ہی دھیرے دھیرے
اس طرح اٹھے کہ احساس پہ کیسی مدہوشی کا

قوم کا بختِ جواں

بارہا دیکھے تھے ان آنکھوں نے
خواب جن سے چمنستاں کی فضائیں شاداب
خواب ۔ رویائے فسوں، سحرِ نگاہ
شرق تا غرب ہمہ رنگ ہو معمورۂ پاک
جیسے صحرا و بیاباں میں کہیں "کھل سم سم" سے
ایک پھیلا ہوا جادو کا نگر جاگ اٹھے
لیکن افسوس! یہ خوابوں کے فسوں کا محل
کبھی تخئیل کے پردوں سے نہ باہر آئے
دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں آنکھیں ان کو
خواب تھے، خواب رہے!
بند آنکھوں کے نہاں خانوں میں!!
آج ہیں بستۂ فتراک یہ خوابوں کے غزال
رونقِ چشمِ تماشا ہے تب و تابِ جمال
ڈھل گیا مرمریں سانچے میں یہ افسانۂ سحر
صد جہاں کیف در آغوش فلک تاب محل
ایک پیکر کی شکست ۔ ایک محل کی تعمیر

آج اک غلغلہ پھر گنبدِ افلاک میں ہے
آج پھر اخترِ تقدیر چمک اٹھا ہے

آج پھر کوندتے ہیں حشر بداماں جلوے
آج پھر سینۂ ہستی میں ہے اک تازہ لگن
آج پہلو میں ہے انگارہ صفت قلبِ تپاں
آج رگ رگ میں ہے پھر خونِ شفق رنگ رواں
آج پھر قافلۂ زیست ہوا برق عناں
پھر سوئے چرخ لپک اٹھی ہے شعلوں کی زباں
آج گلنار شراروں سے ہوا نیل گگن
ان گنت تاروں سے آراستہ یہ سقفِ کہن
کہ ہیں تا دور رسا محلوں کے پُر نور کلس
دیپ ہی دیپ ہیں جلوے کے روشن روشن
قطریں ہی قطریں جمی نقطہ بہ نقطہ سرِ طور
ناچتی پھرتی ہو جیسے کوئی تماق کرن
نیلا امبر ہے کہ سیاروں سے بھرپور آنگن
جادو کرتا ہوا ایک شیش محل، قصرِ بلور
قدرتی سحر سے جگمگ کوئی کاشانۂ نور
سرنگوں ہو کے سرافراز ہے جہلک کا حصار
مر کے بھی زندۂ جاوید ہے اک سینہ فگار
وقفِ تعمیرِ شب و روز یگانہ معمار
ایک معمارِ جواں ــ روکشِ تابندہ منار
عقل حیراں ہے کہ یہ معجزۂ بعیائے بہار
عشق شاداں کہ نہیں خونِ شہیداں بیکار

---

[1] شہیدِ چمن لالۂ خونیں کفن (اقبالؒ)

غزل

احمد ندیم قاسمی

کون جگ میں ترا ہمسر دیکھے — کوئی اس دُھند میں کیونکر دیکھے

عمر بھر ایک ترا دھیان رہا — یوں تو مہر و مہ و اختر دیکھے

آنکھ صرف آنکھ ہے، آئینہ نہیں — جو تجھے سامنے پا کر دیکھے

تیرے جاتے ہی یہ محسوس ہوا — عمر گزری تجھے پل بھر دیکھے

دور ہی دور سُلگنے والے — کاش تو پاس بھی آ کر دیکھے

ہم تو تھے حُسن کے تاریخ نگار — ہم نے قیصر نہ سکندر دیکھے

لوگ ماضی کے دھوئیں میں ڈوبے — ہم نے گیسوئے معنبر دیکھے

نظر آئے انہیں سبزے میں بھی سانپ — ہم نے پتھر بھی ثمرور دیکھے

انہیں جسموں سے بتوں نے جھانکا — ہم نے ترشے ہوئے پیکر دیکھے

انہیں دریاؤں نے پیاسا مارا — ہم نے آنکھوں میں سمندر دیکھے

کون غالب سا ہنرور ہے ندیم
سیکڑوں یوں تو سخن ور دیکھے

انقلاباتِ امم

(قرآن اور تاریخ کی روشنی میں)

عطاء اللہ پالوی

قرآن حکیم تاریخ پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ بلاشبہ تاریخ کو سائنس کے درجہ پر فائز کرنے والا قرآن مجید ہی ہے۔ واقعات سے استنباطِ نتائج اسی کی حکمت تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے سب سے پہلے قرآن ہی نے اس بات کو بطور اصول سمجھایا: "ہم ان ہی ایام کو لوگوں کے درمیان الٹتے پلٹتے رہتے ہیں" (قرآن)

قصصِ قرآنی کا ہر ٹکڑا عبرت اور موعظت کا حامل ہے بالخصوص بنی اسرائیل کی کہانی جس سے اقوام و ملل کے عروج و زوال کی پوری کیفیت اور وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔

فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے تین وجوہ متواتر نظر آتی ہیں: ملوکیت کا استبداد، برہمنیت کی فریب کاریاں اور سرمایہ داری کا شکنجہ۔ ان تینوں نے الگ الگ، اور جہاں مصالح متقاضی تھے مشترک طور پر انسانیت کو برابر اپنی چیرہ دستی کا شکار بنایا۔ چنانچہ مصر کی تاریخ میں یہی عناصرِ ثلاثہ کارفرما نظر آتے ہیں۔ فرعون مجسمہ ہے ملوکیت اور استبداد کا، ہامان علامت ہے برہمنیت کی ابلیسی حرکتوں اور روباہ بازیوں کی اور قارون سرمایہ داری کی جملہ لعنتوں کا آئینہ دار ہے۔ یہ نام شخصی نہیں بلکہ لقب ہیں اور قرآن نے ان کو نمائندے بنا کر بات واضح کی ہے۔ اگر قرآن شخصی نام دیتا تو عمومیت کا اعجاز قائم نہ رہتا۔ فرعون، ہامان اور قارون ہر ملک اور دور پیدا کرتا رہیگا اور یہ انسانیت پر مسلط ہو کر ان کے لئے عرصۂ حیات تنگ کرتے رہیں گے۔ جب لوگ ان کی قہرمانیت سے تنگ آجائیں گے تو نجات کی راہیں تلاش کریں گے۔

افراد کا دور ختم ہو چکا۔ اب جماعتیں ان تینوں رُوپوں میں نظر آتی ہیں اور جب ان کی بیجبت انسانیت کو دکھ کے انتہائی درجہ تک پہنچا دیتی ہے تو کسی نجات دہندہ کا منظر پر آجانا اللہ کی سنت ہے اور وہ استبداد [illegible] کر رہتا ہے۔ چنانچہ مصر کے دورِ استبداد میں حضرت موسیٰ مبعوث ہوئے۔

اب چونکہ جماعتیں مسلط ہیں اس لئے تبدیلی بھی جماعتی اور تنظیمی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اسے انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر نوعیت وہی ہے یعنی نجات دہندہ کا آنا مقدر ہے۔

دنیا میں انقلاب ہر وقت آتے رہے ہیں مگر موجودہ صدی کے دو انقلاب ناقابلِ فراموش ہیں:

(۱) انقلابِ روس (۱۹۱۷ء) جس کا بانی لینن تھا۔ یہ انقلاب خونی انقلاب تھا اور اس کی بنا انکارِ ذات یعنی دہریت پر تھی۔ (۲) پاکستان کا پُرامن اور دوررس انقلاب (۱۹۵۸ء) جس کے مؤسس ایوب ہیں اور خداترسی اور خداپرستی جذبۂ انقلاب تھا۔

اشتراکیت کے انقلاب میں تین منفی محرک تھے۔ تاج، سرمایہ اور مذہب کی نفی۔ لیکن اگر ارتقائے انسان کے تاریخی ادوار (شکار، گلہ بانی اور زراعت و سلطنت) پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی آخری دور اس کا سب سے بڑا اور سخت دور تھا جس نے انسانیت کو بری طرح کچل دیا۔ تاج کے گرد امراء، وزراء، طاقت، سرمایہ اور وسیلہ کار جماعتوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو مل جل کر انسانیت کو نرغے میں لے لیتا ہے اور اپنی ہوسِ جاہ و ثروت کو تسکین دیتا ہے۔ سارے ملک کی محنت اکارت جاتی ہے اور اس کے ثمرِ شیریں کسی کام نہیں آتے کیونکہ تاج اور اس کے حواریوں کی طاغوتی قوتیں انہیں عوام تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ اس کا دنیاوی و مادی نقصان ہی نہیں ہوتا بلکہ دین بھی ان ظلوم و جہول کا شکار بننے لگتا ہے۔ اسلام نے تو پہلے ملوکیت اور برہمنیت کے در پہ ضربت کاری سے پاش پاش کر دیئے تھے مگر افسوس! خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں یہ دونوں بت پھر اپنے استھانوں پر لا بٹھائے گئے اور انہوں نے اس کے نتائج بھی خوب بھگتے۔ شکر ہے کہ اب یہ دور ختم ہو رہا ہے۔ سرمایہ داری کے نمونے سنڈیکیٹ، جاگیرداری، زمینداری، طبقۂ امراء، خانقا

جدید پارچات پر قدیم نقش و نگار
(دستی قلمکاری کا ایک اچھوتا نمونہ)

نقاش : دوروتھی حبیب

دام تزویر ـــ سب مکڑی کے گھروندا نے بانے ثابت ہو رہے ہیں اور نئے نظام کی ید اللّٰہی ضربت سے نہیں بچ سکتے۔

عالمی انقلاب کی تاریخ میں جہاں اور باتیں دلچسپ اور غور طلب ہیں وہاں چالیس (۴۰) کا عدد اور اکتوبر کا مہینہ بھی ہے۔ مثلاً روس اور پاکستان کے انقلاب میں صرف چالیس (۴۰) برس کا فصل ہے۔ وہاں بھی اکتوبر میں انقلاب آیا، یہاں بھی اکتوبر ماہِ نجات بنکر آیا۔ ۴۰ کے عدد کی دیگر خصوصیات بھی دلچسپ ہیں۔

۴۰ کے عدد سے قرآن کی ابتدا ہوتی ہے (الٓمٓ = ۴۰) (مقدمہ کو چھوڑ کر) قرآن نے انسان کی جوانی کی عمر چالیس سال بتائی ہے۔ فرمایا گیا: "جبکہ وہ پوری جوانی کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا ہے" (۴۶/۱۵) - قرآن کی اس بات کو اب جدید علمائے اخلاق و نفسیات بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ بلکہ مزاج ملل کے شناسا تو اس کا اطلاق ملتوں اور قوموں کے حق میں بھی کرتے ہیں۔ قوموں کو بھی جوانی پر آتے آتے یعنی قوائے مضمحل کو عزم و عمل کی راہ پر لانے میں چالیس سال لگتے ہیں۔ یاد کرو وہ زمانہ کہ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کی دعوت دی اور کہا چلو فلسطین پر قبضہ کر لو مگر قوم دو دلی کا شکار تھی، افرادِ ملت اضمحلال و انتشار میں مبتلا تھے۔ اس لئے انہوں نے جواب دیا "تو تم جاؤ اور تمہارا خدا بھی جائے۔ تم دونوں ملکر لڑو بھڑو ہم یہیں ٹھہرتے ہیں" (۵/۲۴)۔ مگر ـــ رب جلیل کا فیصلہ ہوا "اب چالیس برس تک وہ ملک ان پر حرام کر دیا گیا۔ یہ اسی بیابان میں پڑے رہیں" (۵/۲۶)۔ چالیس سال کے تعمیری دور کے بعد ان میں وہ جسارت اور علو ہمت پیدا ہو گیا تھا جو ان سے یہ کہلوا سکا "ہم تھوڑے ہیں تو گھبراتا کیا ہے کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہوئی ہیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آئی ہیں۔ اللہ تو صابروں کے ساتھ ہے" (۲/۲۴۹) حضرت موسیٰؑ نے چلّہ کشی بھی چالیس (۴۰) ہی دن کی تھی، "اُنکے پروردگار کے حضور آنے کی میعاد چالیس راتوں کی تھی"۔ (۷/۱۴۲) اسی ضمن میں اگر آپ دیگر تاریخی شواہد و حقائق کی طرف رجوع کریں تو چالیس کے عدد کی تکرار نظر آئے گی اور کسی نہ کسی انقلابی کروٹ یا انقلابی ہستی کے ظہور و عدم کی طرف ذہن کو منتقل کرے گی۔ چند ایک چیدہ حقائق دلچسپی سے خالی نہیں:

۱۔ بقول توراۃ جب نوحؑ کا طوفان آیا تو بارش چالیس روز تک جاری رہی۔ جب چالیس دن گذر گئے تو ان کی نجات دہندہ کشتی چالیس روز کے بعد کوہ ارارات پر پڑی ملی۔

۲۔ ایلیا نبی چالیس دن تک بھوکے رہے۔

۳۔ حضرت یعقوبؑ کی نعش کو مسالہ لگانے میں چالیس روز صرف ہوئے۔

۴۔ حضرت یعقوبؑ نے الیسین کو جو گائیں تحفۃً بھیجی تھیں ان کی تعداد بھی ۴۰ تھی۔

۵۔ گولیات نے اسرائیلی فوجوں کا مقابلہ ۴۰ دن تک کیا۔

۶۔ نینوا کو توبہ کے لئے چالیس دن کی مدت دی گئی تھی۔

۷۔ حضرت موسیٰؑ کو ان کی ولادت کے چالیس دن بعد معبد میں پیش کیا گیا تھا۔

۸۔ حضرت مسیحؑ نے چالیس دن کا روزہ رکھا، صلیب پانے کے بعد ۴۰ گھنٹے تک ان کی نعش لٹکی رہی۔

۹۔ ہندوؤں میں عقیدہ ہے کہ بچے کی نال کاٹ کر چالیس دن اس کی ماں کے سرہانے رکھی جائے۔

۱۰۔ ویدک علاج میں کایا کلپ کا طریقہ چالیس دن کی مہلت چاہتا ہے۔

۱۱۔ زرتشت نے چالیس سال کی ریاضت کے بعد تبلیغ شروع کی۔

۱۲۔ اس صدی کے چالیسویں سال تحریک پاکستان نے لاہور کی سرزمین پر جنم لیا (مارچ ۱۹۴۰ء)

۱۳۔ حضورؐ کو بھی عمر کے چالیسویں سال بعثت سے سرفراز فرمایا گیا۔

اب اکتوبر کے تواتر کی مثالیں لیجئے:

۱۔ انقلاب روس

۲۔ انقلاب پاکستان

۳۔ انقلاب عظیم بغداد (خلیفہ امین الرشید کے قتل کے بعد عرب حکمرانی، عجمی اقتدار میں آگئی (۸۱۳ء)

۴۔ خلجی حکومت کا انقلاب۔ نصیر الدین شجاعت خاں کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا (۱۵۰۰ء)

۵۔ انگریزوں نے بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ کو شکست دی اور حکومت پر قبضہ جا بیٹھے (۱۷۶۴ء)۔

۶۔ مرہٹوں نے بیدار بخت کو بٹھا کر دہلی کے تخت پر تسلط جما لیا۔ (۱۷۸۸ء)

۷- الاسکا میں انقلاب آیا اور امریکہ اس پر قابض ہو گیا (۱۹۹ء)

اکتوبر میں چند بڑی ہستیوں کی پیدائش، اموات اور عروج:

۱- خلیفہ مہدی کا تخت پر آنا (۷۷۵ء)
۲- اکبر کی وفات، جہانگیر کا سریر آرائے سلطنت ہونا (۱۶۰۵ء)
۳- بہادر شاہ قطب الدین اوّل شاہ دہلی کی پیدائش ۱۶۴۳ء
۴- بہادر شاہ ظفر کی پیدائش (۱۷۷۵ء) تخت سے اترنے اور قید ہونے کا بھی یہی مہینہ ہے (۱۸۵۷ء)
۵- سر سید، ولادت (۱۸۱۷ء)
۶- گاندھی جی: ولادت (۱۸۶۹ء)
۷- آئزن ہاور، ولادت (۱۸۹۰ء)
۸- ۱۸ ویں عباسی خلیفہ، المقتدر باللہ کا قتل (۹۳۲ء)
۹- خواجہ حسن بصریؒ: وفات (۷۲۶ء)
۱۰- حضرت بابا فریدؒ گنج شکر، وفات (۱۲۶۵ء)
۱۱- تخت نشینی جہانگیر (۱۶- اکتوبر ۱۶۰۵ء)
۱۲- نواب غازی الدین حیدر، نواب اودھ کا اعلان بادشاہی (۱۹ر اکتوبر ۱۸۱۹ء)
۱۳- تلسی داس (نامور ہندی شاعر): پیدائش (۱۲ر اکتوبر ۱۵۳۲ء) وفات بھی اسی مہینہ میں واقع ہوئی - ۲۴ر اکتوبر ۱۶۲۳ء)
۱۴- لیاقت علی خاں (پیدائش یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء)، وفات (۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء)
۱۵- پاکستان میں اعلان انقلاب نو (۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء)
۱۶- استحکام انقلاب بہ قیادت عظمیٰ) جنرل (اب فیلڈ مارشل) **محمد ایوب خاں** ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء)

انقلاب پاکستان زندہ باد!

اکتوبر پائندہ باد!

★

وہی بر پی جگر کے پار ہے آج،
جس سے قبل ازیں ہمارے دل و جگر بارہا زخمی ہو چکے ہیں۔ آج جگر جیسے یگانۂ روزگار استادِ فن کے سانحۂ ارتحال سے اس کی شدت اور بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ اُس محفل کی یادگار تھے جس نے ہمیں حسرت موہانی، اصغر، فانی، عظمت اللہ جیسے گہر ہائے گراں مایہ عطا کئے تھے۔ جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے۔ آج پھر ایک اور رشکِ عرفی و فخرِ طالب کے راہیٔ عدم ہونے پر بے اختیار یہ الفاظ لبوں پر آتے ہیں:

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا
ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

یہ شمارہ تکمیل کے جملہ مراحل طے کر چکا تھا کہ یہ افسوسناک خبر موصول ہوئی۔ ہم اگلے شمارہ میں مرحوم پر ایک سیر حاصل مضمون شائع کر رہے ہیں۔

●

(مطبوعہ نومبر ۱۹۵۵ء)

●

جگر

کراچی: ۱۴ ستمبر ۵۶ء

(پیدائش مراد آباد: ۱۸۹۰ء
وفات گونڈہ: ۱۹۶۰ء)

افسانہ

"پومپیائی" کی آخری رات

عنایت اللہ

بادشاہ نے درباریوں کو نظر بھر کر دیکھا۔ یوں جیسے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ان جی حضوریوں کو وہ ہر لمحہ دیکھا کرتا تھا اور جانے کب سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ انہیں اپنی بے تکی سی باتوں پہ بھی داد و تحسین سے بھرپور قہقہے لگاتے سنا کرتا تھا اور انہیں اپنے حضور جھکتے بھی دیکھا کرتا تھا۔ بسا اوقات اس نے اپنے آپ کو سرکس کے مسخروں کے نرغے میں گھرا ہوا پایا تھا۔ اور کئی بار محسوس کیا تھا جیسے اُس کا اپنا وجود اسی مسخرے پن کا ایک اہم حصہ ہے۔ لیکن اپنے ہی سینے سے ایک آواز نے ابھر کر اُسے سنبھالا دے دیا۔ "یہی مسخرے تیری قوت ہیں، یہی مسخرہ پن تیری طاقت ہے۔ ان عناصر کو بکھرنے نہ دینا"

مگر آج کی رات اُس نے ان عناصر کو یوں دیکھا جیسے کوئی طاقت، ان عناصر سے زیادہ قوی، انہیں بکھیر رہی ہے۔

اور یہ تھی بھی حقیقت کہ یہ عناصر اُسے آج آخری بار نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنی ہستی میں زلزلے کا ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا۔ اُس نے چونک کر چھت سے لٹکتے ہوئے فانوس کو دیکھا۔ فانوس ساکن تھا، پردے ساکن تھے، کسی دروازے کی زنجیر بھی نہیں ہلی تھی۔ کسی درباری کے چہرے کے تاثر میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے سوچا یہ زلزلہ نہیں تھا۔ زلزلہ آتا بھی تو حیران کن نہ ہوتا۔ کیونکہ پومپیائی زلزلوں کا شہر تھا۔ آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی موت کی اٹل حقیقت کی طرح اس شہر پر جھکی رہتی تھی۔ یہ چوٹی گلی سڑی لاشوں کی بُو، بھوکی ننگی رعایا کی آہیں، مظلوموں کی فریادیں، لوٹی ہوئی دولت پہ لٹی ہوئی عصمتوں کی ہچکیاں اور ملک کے مفلوج قانون کی سسکیاں دھوئیں کی صورت اگلتی رہتی تھی۔ اور یہ دھواں کالے کالے بادل بن کر سارے شہر اور تمام ملک پہ منڈلایا کرتے تھے۔ بادشاہ انہی بادلوں کے سائے میں راج کرتا تھا اور یہ سرکتے رینگتے ہوئے گھنے بادل جب اس کے محلوں کے اوپر سے گزرا کرتے تو اس کے سینے میں شہنشاہی کے احساس کے ساتھ خدائی کا ہلکا ہلکا سا خمار بھی پیدا ہونے لگتا تھا۔

آج رات جب اس نے اپنے آپ میں ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا تو ڈرسا گیا جیسے پہاڑ کی چوٹی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی موج نے پہاڑ کی کوکھ میں رک کر پہاڑ کو ہی ہلا دیا ہے۔ بادشاہ کو احساس تھا کہ یہ غبار کسی بھی لمحہ لاوا بن کر، اُسے، اس کے محلوں، اس کے درباریوں اور اس کی خدائی کو ہمیشہ کے لئے دفن کر سکتا ہے۔

اس نے درباریوں کو پھر دیکھا جیسے انہیں پھر کبھی نہ دیکھ سکے گا، جیسے آتش فشاں پہاڑ کا لال سرخ لاوا انہیں اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا ہے، اور ایک ایک کو دفن کرتا جا رہا ہے۔ بادشاہ کے سامنے درباریوں کی صورتیں دھندلانے لگیں۔ پھر ہر چہرے میں اُسے اپنے خد و خال دکھائی دینے لگے۔ اُس نے نگاہیں کسی اور طرف کر لینا چاہیں۔ اُسے یوں لگا جیسے پہاڑ کا دھواں اس کے سینے میں منتقل ہو گیا ہے اور اُسے نکلنے کی راہ نہیں مل رہی۔ وہ درباریوں سے ہر بات کہہ دیا کرتا تھا۔ لیکن آج کی بات وہ کسی سے بھی نہ کہہ سکا۔ یہ بات وہ اپنے آپ سے بھی چھپا لینا چاہتا تھا۔ شطرنج کا منجھا ہوا کھلاڑی آج خود مہرہ بن گیا تھا، جیسے کسی غیبی قوت نے اُسے اس خانے سے اٹھا کر اُس خانے میں رکھ دیا تھا۔ مہرہ پٹ رہا تھا۔

اس نے درباریوں کو رخصت کیا اور باہر نکل آیا۔ اس کے محل کے باغیچے میں اس کے چند امیر اور وزیر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ وہ ستون کا سہارا لے کے رک گیا اور ان مے نوشوں کے شراب آلود قہقہے سننے لگ گیا۔ یہ امیر وزیر بظاہر انسان تھے، لیکن بادشاہ کے ہاتھ میں ان کی حیثیت شطرنج کے مہروں سے زیادہ نہ تھی۔ گزشتہ چند برسوں سے وہ ان مہروں کو بساط پہ چلا رہا تھا، مار رہا تھا۔ اس خانے سے اُس میں، اُس سے اس میں۔ اور ہر بار جیت اسی کی ہوتی تھی۔ آٹھ کروڑ کھلاڑیوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے مقابلے میں جم نہیں سکا تھا۔ ایک طرف آٹھ کروڑ کھلاڑی دوسری طرف وہ اکیلا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ آگ سے کھیل رہا ہے اور آتش فشاں پہاڑ سے بازی لگائے ہوئے ہے لیکن اس کے مہرے کبھی غلط خانے میں گئے ہی نہیں تھے۔

آج وہ ایسی چال چل گیا تھا کہ مات سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی اور چال واپس نہیں ہو سکتی تھی۔ ستون کے ساتھ کھڑے اس نے باغیچے میں

اپنے پٹتے کھیلتے مہروں کو دیکھا اور اُسے تلخ سا خیال آیا کہ یہ تو پٹے ہوئے مہرے ہیں اب انہیں سینے سے لگا رکھنے سے کیا حاصل۔ پھر بھی وہ کوئی نئی چال سوچنے لگ گیا۔ اُس نے اپنی پٹے ہوئے مہروں پہ نگاہ دوڑائی اور خالی خانوں کو گہری نظر سے دیکھا۔ بساط پہ اُسے دو مہرے ایسے نظر آئے جو اس کی چال میں ذرا سی جان ڈال سکتے تھے۔ اُس نے دماغ پر اس طرح زور دیا جیسے لیموں نچوڑ رہا ہو۔ وہ گرد و پیش سے بے خبر ہو ہی رہا تھا کہ بے ہنگم قہقہوں نے اُسے چونکا دیا۔ وہ ستون کا سہارا چھوڑ کر باغیچے میں جا پہنچا اور شراب میں بدمست وزیروں کو کہا "تم اب جاتے کیوں نہیں؟ چلے جاؤ۔"

وزیر ہنسے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب کی نگاہیں ایک دوسرے سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ انہوں نے بادشاہ کو ہر کیفیت میں دیکھا تھا غصے میں، جلال میں چال چلتے، چال جیتتے، بھوکی ننگی رعایا کی آہ و بکا سنتے، تقریر لکھواتے، تقریر کرتے، رعایا کو وعدے دیتے، وعدوں کو توڑتے، تحفے تحائف قبول کرتے، دوروں پہ جاتے شاہی سواری میں بیٹھے ہوئے۔ لیکن آج اس کے چہرے پر، جو اکثر بے تاثر رہتا تھا، وہ ایسا تاثر دیکھ رہے تھے جو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس نے پھر کہا "تم لوگ چلے جاؤ" اور خود ملکہ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

ملکہ قد آدم آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے بالوں، شکل و صورت اور جسم کا جائزہ لے رہی تھی۔ یوں تو وہ ہر روز اور ہر رات اپنے آپ کو دیکھا کرتی تھی لیکن آج رات اُسے اپنا حُسن کچھ زیادہ ہی نکھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ملکہ اپنا سابق خاوند اور شباب کہیں اور ہی چھوڑ آئی تھی اور حسن اور حسن کی تمام رعنائیاں بھی (قدرتی اور مصنوعی) اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس کی جوانی وہیں رہ گئی تھی جہاں اس کا خاوند کماندار تھا۔ وہ اس وقت بھی کماندار ہی تھا جب وہ پہلے خاوند کو چھوڑ کر پہلے اس کی آغوش اور پھر عقد میں آئی تھی اور آج بھی وہ کماندار ہی تھا جبکہ وہ ایک ملک کی ملکہ بن چکی تھی۔ آج رات وہ آئینے میں اپنی گزری ہوئی اور گزرتی ہوئی زندگی کو دیکھ رہی تھی لمحہ بہ لمحہ، لحظہ بہ لحظہ۔ اُس نے بھرپور انگڑائی لی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں وہ اکڑاؤ اور انگڑائی میں وہ ہڈیاں توڑ دینے والی بات نہیں رہی۔ پھر بھی اُس نے جسم کے چپے تُلے نشیب و فراز اور دراز قد کو دیکھ کر انگڑائی میں وہ بات پیدا کر ہی لی جو اس کی جوانی کی پہلی انگڑائی میں خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے مغرب کے ایک ماہر گیسو آرا کے ہاتھ کے کٹے ہوئے اپنے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا مگر آہستہ آہستہ، مبادا کوئی بال جگہ سے بے جگہ ہو جائے یا کوئی سفید بال جو ماہر کی دستبرد سے بچ گیا تھا، سیاہی مائل بھورے بالوں سے باہر نکل آئے۔ بالوں کی ملائمت نے اُسے محو سا کر دیا اور وہ اپنے آپ پر رشک کرنے لگی۔

"ہے کوئی عورت جو مجھ جیسی خوش نصیب ہو؟" اس نے سوچا جب جی میں آئی شادی کر لی جب جی میں آئی محبت کر لی۔ ایک عہدہ دار سے کماندار اور کماندار سے اُس ملک کے ایسے آدمی سے جس کے سر پہ بال ہما کا سایہ تھا۔ وہ عام عورت سے کس قدر مختلف اور بلند و برتر تھی جو زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ ملکہ نے شادی بھی کی، محبت بھی کی، شادی کسی سے محبت کسی سے۔ امراء و وزراء کی بیگمیں دوسرے ملکوں سے سرخی پوڈر اور لپ سٹک منگوا کر چہرے کو فریب دیا کرتی تھیں اور ملکہ اپنے ملک کی رعایا کے خون سے گالوں اور ہونٹوں کو لال سرخ بنا لیا کرتی تھی۔ دوسری بیگمیں برج، رمی اور رسیں کھیلتی تھیں اور ملکہ رعایا کے جذبات سے کھیلا کرتی تھی۔ روم کے بادشاہ نیرو نے شہر جلا کے رباب بجائی تھی۔ اس ملکہ نے آٹھ کروڑ دل جلا کے مغربی ناچ ناچا تھا۔ وہ صرف آٹھ کروڑ فریب خوردہ انسانوں کی حکمران نہیں تھی بلکہ ان کے حکمراں کی بھی حکمراں تھی۔

آئینے کے سامنے بیٹھے اُسے وہ وقت یاد آیا جب ایک روز ایک اجنبی صورت مرد، سیاہ فام، مریل سا مرد، اس کے حضور میں سر بسجدہ ہوا تھا۔ اور اس کے قدموں میں تیس ہزار روپے کی مالیت کا ہار پیش کیا تھا تو اس نے سونے کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اس قدر دلکش سونا میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ یہ سونا کہاں سے آیا ہے؟"

اجنبی نے دست بستہ عرض کی تھی۔ "جان بخشی ملکہ عالم! تاجدار کا قانون اس سونے کی راہ میں حائل ہے۔ آپ کا غلام ایسے سونے کی کشتیاں بھر بھر کر قدموں میں پیش کر سکتا ہے۔" اور ملکہ نے بادشاہ کو کہا تھا۔ "وہ قانون توڑ دو جو اس سونے کی راہ میں حائل ہے۔" اور تاجدار نے حکم دیا تھا۔ "میرا قانون سمندر میں ڈبو دو اور کھجوروں سے لدی ہوئی اُن کشتیوں کا رستہ صاف کر دو جن میں سونا چھپا ہوا ہے۔" اور سمندر نے قانون کو نگل کر سونے کی ڈلیاں اگلنا شروع کر دی تھیں۔ ملک کی سب سے بڑی بندرگاہ میں دن دہاڑے سونے سے لدے ہوئے جہاز آنے لگے اور چرس اور افیون سے بھر بھر کر جانے لگے۔ پھر ملک میں آٹا مہنگا ہونے لگا۔

تاجدار نے اعلان کیا۔ "میں اناج سستا کر دوں گا۔" اور اناج ناپید ہو گیا۔

تاجدار نے اعلان کیا "میں کپڑا سستا کر دوں گا۔" اور رعایا ننگی ہونے لگی۔

تاجدار نے اعلان کیا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں۔" اور وعدے ٹوٹ گئے۔

تاجدار نے اعلان کیا۔ "میں نے پرانا قانون توڑ کر نیا قانون بنا دیا ہے۔" اور دن دہاڑے ڈاکے پڑنے لگے۔

ملکہ نے تیس ہزار کا ہار پہن کر عورتوں کو کہا۔ "میں تمہاری محافظ ہوں۔" اور شہر میں قحبہ خانے کھل گئے۔

ملکہ کو آئینے میں کیا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ آج کی رات بہت ہی مسرور تھی۔ بانے اُسے کیا یاد آنے لگا تھا کہ اس کے عقب میں تاجدار کے قدموں کی آہٹ یادوں اور خیالوں کا تسلسل توڑ ڈالا۔ اُس نے گھوم کے نہ دیکھا۔ اپنے عکس کے پیچھے ھتے ہوئے عکس کو دیکھنے لگ گئی۔ اُس عکس کے چہرے پر تذبذب اور اضطراب ے آثار دیکھ کر وہ تیزی سے گھومی۔ اٹھی اور حیرت زدہ ہو کے بولی۔ "کیوں؟ آپ پریشان سے دکھائی دے رہے ہیں؟"

"ہاں، ملکہ"! بادشاہ نے کھڑکی کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے میں مات کھا رہا ہوں....." اُس کے لب و لہجے پر اداسی غالب تھی۔ "اپنی چلی ئی چال پہ مجھے شک سا ہو رہا ہے۔ کاش! یہ چال واپس ہو جائے۔"

"آپ تو بلا وجہ پریشان ہو رہے ہیں۔" ملکہ نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔ "میری نظر میں آپ کی یہ چال بہترین چال ہے۔ آپ نے جس مہرے اتھ رکھا ہے وہ....."

لیکن بادشاہ کھڑکی کے پردے ہٹا کر سامنے کھجور کے پتوں میں ، دور سے جھانک رہا تھا۔ جہاں اُسے پومپیائی کا آتش فشاں پہاڑ نظر آ رہا ا۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میرے دل کی ملکہ! سوچا تھا کہ میں نے اُس چوٹی کا منہ بند کر دیا ہے۔ چوٹی جو شب و روز دھواں اگلتی رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اُس کا منہ زیادہ کھل گیا ہے۔ جانے..... جانے کیوں؟" وہ اور زیادہ اداس ہو گیا۔ کا چہرہ بھی سرخی پوڈر کی تہہ کے نیچے مرجھا سا گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جانے کیوں دس ہو رہا ہے کہ آج رات یہ پہاڑ مہیب دھماکے سے پھٹ جائے گا، زلزلہ ے گا، ہمارے محل زمین سے مل جائیں گے اور لاوا ان پر گہری گھنی تہہ دے گا۔"

"نہیں تاجدار! یوں کبھی نہ ہوگا۔"

"خدا کبھی یوں نہ کرے لیکن....." اس کی آواز جو ڈوب چلی تھی ذرا سا ی۔ "لیکن جانے کون مجھے کہہ رہا ہے کہ آج رات یہ پہاڑ پھٹ جائے گا۔ میرے محلات لاوے میں دب جائیں گے۔ ہماری رعایا محفوظ رہے گی اور جب لاوا ٹھنڈا ہو کر جم جائے گا تو رعایا اپنی ہڈیوں پر نئی بستی آباد کرے گی اور کہے گی۔ ا ہم نے بادشاہ اور ملکہ کی لاشوں پر بستی آباد کی ہے۔ میری ملکہ! میری روح بے چین نہ ہو گی کیا؟ اگر....." بادشاہ چپ ہو گیا اور ذرا سے توقف کے بعد انوکھے سے لہجے میں بولا۔ "اگر یہ پہاڑ پھٹ کر ہم پہ آپڑا تو تم جاگ تو نہ جاؤ گی؟ بولو ملکہ! میرا ساتھ دو گی؟ میرے ساتھ مرو گی؟"

ملکہ نے لطیف سی ہنسی ہنس کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا، جیسے ماں ڈرے ہوئے بچے کو سینے سے لگا لیتی ہے۔ تاجدار کا دل بے قاعدگی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے عمر خوردہ گال ملکہ کے بالوں پہ رکھ دیا۔ بالوں کے گداز نے اسے ذرا سا سکون دیا لیکن ملکہ نے اپنا سر ہٹا لیا مبادا کوئی سفید بال باہر نکل آئے یا کوئی بال جگہ سے بے جگہ ہو جائے۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟" ملکہ نے اسے پیار سے کہا۔ "آپ ہمیشہ تاجدار رہے ہیں اور ہمیشہ تاجدار رہیں گے۔ جس مہرے پہ آپ نے ہاتھ رکھا ہے وہ آپ کی بازی کا محافظ ہے۔ چال خوب ہے....." ملکہ نے لپک کر کھڑکی کا پردہ گرا دیا اور کہا۔ "اُس پہاڑ کی طرف نہ دیکھئے تاجدار! وہ بے ضرر سا دھواں ہے۔ آپ کی جاہل رعایا کی آہوں، فریادوں اور بھوکے ننگے انسانوں کی سسکیوں کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن یہ دھواں شام تک سفید تھا، اب سیاہ ہو رہا ہے۔ ذرا دیکھو ملکہ! چاندنی میں دھواں کس قدر سیاہ ہو رہا ہے۔ میری حکمرانی خطرے میں ہے، میری راجدھانی شاید آج رات....." وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ بڑھیایا ہوا چہرہ اور زیادہ مرجھا گیا۔

"آپ کی فوجیں تو آج رات ویسے ہی تیار ہیں....." ملکہ نے اُسے سنبھالا دیا۔ "اگر زلزلہ آ گیا تو وہ سب سے پہلے ہمیں بچائیں گی۔"

"نہیں" تاجدار اور گھبرا کر بولا۔ "فوجوں کا نام نہ لو۔ میں نے انہیں خود بلایا ہے اور انہیں بیدار رہنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن..... لیکن..... ملکہ! جب فوجیں بیدار ہو جاتی ہیں تو بادشاہی ابدی نیند سو جایا کرتی ہے۔ تم ٹھیک کہتی ہو فوج میرے حکم سے راجدھانی کا محاصرہ کئے ہوئے ہے مگر فوج کا کماندار....." تاجدار جیسے اندر ہی اندر لرز گیا ہو۔ بولا۔ "لیکن کماندار شاید وقت پر....."

"کماندار؟" ملکہ نے زیر لب کہا اور ہنس دی۔ اُس نے یوں خلاؤں میں دیکھا جیسے اپنی فوج کے کماندار کو دیکھ رہی ہو۔ اس نے اس طرح انگڑائی لی جس طرح قلوپطرہ نے انطونی کو دیکھ کر انگڑائی لی تھی مگر ملکہ کی انگڑائی ختم ہونے

سے پہلی سرخی اور چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اُسے آج پہلی بار ایک خطرہ محسوس ہوا۔ نہیں سے وہ اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ یہ کا لاوا پوتھیپیائی پہ پکتے ہوئے آتش فشاں پہاڑ سے زیادہ خوفناک در تو ہے۔ اس کی چوٹیوں سے بہتا ہوا لاوا عیش و گناہ کی آغوش میں آباد بستیوں کو چشم زدن میں زمین کی تہوں میں روپوش کر سکتا ہے۔

بادشاہ اداس ہوتا چلا گیا۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا قدآدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے عکس کو دیکھا۔ جانے کس نے عکس کے کپڑے اتار کر اُسے برہنہ کر دیا پھر اس کی کھال بھی اُتر گئی اور اُس کا ننگ دھڑنگ ضمیر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بادشاہ گھبرا اٹھا۔ اپنے ضمیر کا سامنا کرنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ وہ لڑکھڑایا اگر ملکہ اُسے سہارا نہ دیتی تو شاید وہ گر پڑتا۔ اُس نے ملکہ کے لال سرخ ہونٹوں اور لال گلابی رخساروں کو دیکھا تو اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اس لالی، اس سرخی اور گلابی رنگ میں اس کی رعایا کا خون رچا ہوا ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ملکہ اس پر جھک گئی۔ بادشاہ نے بند پلکوں کے دھندلکے میں اپنی رعایا کو دیکھا۔ اُسے بہت کچھ نظر آیا لیکن بہت کچھ نظر نہ آسکا۔

اُسے عذرا نظر نہ آئی۔

عذرا پوتھیپیائی کے ایک کونے میں ایک متوسط درجہ کے مکان کے بند کمرے میں بیٹھی زندگی کا آخری خط لکھ رہی تھی۔ اس کے ماں باپ اور بھائی سو گئے تھے۔ نوجوان اور حسین عذرا کے جسم اور چہرے مہرے میں قدرت نے اپنی تمام تر رعنائیاں سمو دی تھیں اور یہ رعنائیاں آج رات اُسے موت سے ہمکنار کر رہی تھیں۔ وہ رو بھی رہی تھی اور خوش بھی تھی۔ رو وہ اس لئے رہی تھی کہ اُسے اپنے محبوب سے نوچا جا رہا تھا۔ اور خوش اس لئے کہ اُسے ایک پناہ گاہ مل گئی تھی ـــ موت، خودکشی!

وہ لکھ رہی تھی:

"میرے محبوب! اپنے دھڑدوں کی قسم! آج تمہاری محبت پہ قربان ہو رہی ہوں۔ آج وہ پھر آیا تھا۔ سیدھا میرے کمرے میں آیا اور بولا میری دو او کشتیاں سونا لے کے گودی میں پہنچ گئی ہیں۔ کہتا تھا عذرا! آؤ اور اپنا سونا سنبھال لو میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔ میں نے آج پھر اس کے منہ پہ تھوک دیا ہے لیکن میرے والد اور بھائیوں نے اس سے پکا وعدہ کر لیا ہے کہ دو چار روز بعد میری شادی اس کے ساتھ کر دی جائے گی۔ میرے محبوب! تم تو جانتے ہی ہو کہ سونے کا یہ زرد رو سوداگر پانچ نوجوان لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کر چکا ہے۔ میں چھٹی ہوں۔ پانچ والدین اپنی بیٹیوں کو سونے کی اینٹوں پہ قربان کر چکے ہیں۔ وہ بوڑھا ہے اور اس پہ دولت کا نشہ سوار ہے۔

کاش! میں تمہارے ساتھ بھاگ جاتی مگر اب میں قید ہو گئی ہوں۔ مجھ پہ پہرے بیٹھا کر مجھے باہر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ میرے ماں باپ اور بھائیوں کی آنکھوں اور عقل پہ سونے کے پردے پڑ گئے ہیں....

کاش! میں اس قدر حسین نہ ہوتی۔ کاش مجھے تم سے محبت نہ ہوتی میرے محبوب! ایک رات میں تو کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ پوتھیپیائی کا پہاڑ آج رات تو نہیں پھٹے گا۔ ہمارے ملک کا مرا ہوا قانون آج رات تو زندہ نہیں ہو سکے گا۔ انصاف بھی مر گیا ہے۔ گھر والوں نے مجھے سونے کے اس سوداگر کے لئے قید کر لیا ہے لیکن میں بھاگ رہی ہوں۔ میں صرف کل دن کا انتظار کروں گی۔ میری ایک سہیلی نے مجھے بہت تیز زہر لا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ کل صبح وہ زہر لا رہی ہے اور جب یہ خط تم تک پہنچے گا میں خدا کے حضور میں پہنچ چکی ہوں گی۔

رات آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی اور عذرا تیزی سے لکھتی جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اکیلی نہیں۔ جانے اس جیسی کتنی حسین اور کنواری جوانیاں سونے کی بھینٹ چڑھا دی گئی ہیں اور چڑھائی جا رہی ہیں۔ اُس نے آنسو پونچھے اور بے تابی سے دعا کی۔ "اے زلزلوں کے دیوتا! اس پہاڑ کو آج ہی رات پھاڑ دے اور پوتھیپیائی کو غرق کر دے۔ اے آگ کے دیوتا! اس قدر آگ برسا کہ سونا پانی بن کر بہہ جائے"۔

اس کی دعا جلی ہوئی طویل آہ کا دھواں بن کر پہاڑ کی چوٹی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں میں جا ملی اور تحلیل ہو گئی۔

عذرا نے ماں باپ کو کہہ دیا تھا کہ وہ دولت کی دہلیز پہ قربان نہیں ہو گی۔ سونے کا بوڑھا سوداگر اس کے اعلان سے آگاہ تھا۔ آج رات وہ عذرا کے ہاں آیا تو عذرا نے اس کی بے عزتی بھی کی اور سب کے سامنے کہہ دیا تھا۔ "بڑے میاں میری لاش سے ہی بیاہ رچاؤ گے۔ جیتے جی تمہاری بیوی نہ بنوں گی"۔ اور بوڑھے سوداگر نے چیلنج قبول کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ گو ـــ عذرا کے ماں باپ نے ہاں کر دی ہے۔ پھر بھی کیا بھروسہ۔ اس کے علاوہ وہ عذرا کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اسے زندہ اٹھا لے جا سکتا ہے۔

اُس نے اپنے محل نما مکان میں جا کر بشیرے کی طرف پیغام بھیجا۔ بشیرا بادشاہ نہیں تھا، وزیر نہیں تھا، منصف اور قاضی نہیں تھا کوتوال اور تھانیدار بھی نہیں تھا، وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی پوتھیپیائی کا قوی ترین انسان تھا کیونکہ وہ

بادشاہ اعداس کے وزیروں کا گہرا دوست تھا اور ان کی ہر مشکل کے وقت مدد کیا کرتا تھا۔ اس کا لگے ادھر کا سونا اُدھر کی چرس یہاں کی افیون اور وہاں کی لڑکیاں اس کے امیروں وزیروں اور اہل کاروں میں برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ ایک بار بادشاہ اس پر اس قدر خوش ہوا کہ اُسے بے دریغ انعام دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بادشاہ نے سوچا زر و جواہرات اور جاگیروں میں انعام کوئی بات نہیں ہوتی۔ آخر کار بادشاہ نے اپنے قانون کو توڑ کر قانون کے قیمتی ٹکڑے بشیرے کو انعام میں دے دیئے جو اُس نے اپنے گروہ میں تقسیم کر دیئے۔ ٹوٹے ہوئے قانون کے ان ٹکڑوں میں دیو کے بالوں والی طاقت تھی جنہیں ہاتھوں میں لے کے رگڑو تو دیو حاضر ہو جاتا ہے اور ہر حکم بجا لاتا ہے۔ بشیرے اور اس کے گروہ نے ان ٹکڑوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جہاں کہیں ان کے آدمی کسی لڑکی یا بچے کو اغوا کرتے یا ڈاکہ ڈالتے یا جیب کاٹتے یا دنگا فساد کرتے یا سرِ عام کسی کو قتل کرتے یا کسی کے گھر میں گھس کر بہو بیٹیوں کو بے آبرو کرتے یا شمال سے چرس اور جنوب سے لڑکیاں سمگل کرتے یا مغرب سے سونا اور مشرق سے کپڑا لاتے پکڑے جاتے تو وہ انعام میں ملے ہوئے قانون کے ایک ٹکڑے کو ہاتھوں میں لے کے ذرا سا رگڑتے اور قانون کے محافظ اندھے ہو جاتے ہتھکڑیاں ٹوٹ جاتیں۔

عذرا کے امیدوار سونے کے سوداگر نے بشیرے کو بلا کر کہا آج شام کھجوروں میں آئے ہوئے سونے میں سے چوتھائی حصہ اُس کا ہوگا۔ اگر وہ عذرا کو آج ہی رات اٹھا لائے۔ بشیرے نے جواب دیا۔ "سودا منظور ہے لیکن کام کل رات ہوگا کیونکہ آج رات شمال سے میرا اپنا مال آرہا ہے۔ بہت سارے آدمی اُدھر مصروف ہیں۔ اور بہت سے ایک ہارے ہوئے وزیر کے گھر چلے گئے ہیں۔ اس کی پارٹی کا کل جلسہ ہو رہا ہے جس میں یہ وزیر تقریر کر رہا ہے۔ اسے میرے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہاں نعرے لگانے والا کوئی نہیں اور اس وزیر نے چند روز ہوئے ایک حریف پارٹی کے جلسے میں فساد بپا کروایا تھا۔ اب وہ پارٹی اس کے جلسے کو خراب کرنے کا اعلان کر چکی ہے"

"دو آدمی دے دو" سوداگر نے کہا۔ "دو ہی کافی ہیں"

"آج میں اکیلا ہوں" بشیرے نے کہا۔ "چار آدمی ایک سیٹھ کے گھر ڈکیتی کے لئے جا رہے ہیں۔ اس سیٹھ نے انتخابات میں ہمارا آدمی ہرا دیا تھا"

"بشیرے دوست! صرف دو آدمی" سوداگر نے منت کی

"جناب کل پہ چھوڑ دیئے" بشیرے نے تسلی دی۔ "میرے پاس صرف دو آدمی ہیں سو رہے ہیں۔ کل وہ پردہ زنانہ کالج سے ایک لڑکی کو اٹھائیں گے۔ ایک عہدیدار کے ساتھ سودا طے ہو گیا ہے"

"تم خود ہی میرا کام کر دو بشیرے" سوداگر نے التجا کی۔

"میں خود نہیں جا سکتا" بشیرے نے کہا۔ "میں اس وقت چند چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو جیب تراشی اور اٹھائی گیری کی ٹریننگ دیا کرتا ہوں وہ آنے ہی والے ہیں"

عذرا نے خط ختم کر کے لفافے میں بند کیا اور گہری نیند سو گئی۔ موت کی آغوش کے تصور نے اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو سہلا دیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ صبح ہی صبح اس کی سہیلی زہر لے آئے گی اور وہ خودکشی کر کے سونے کے بوڑھے سوداگر سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے گی۔

"تو پھر کل ضرور" سوداگر نے بشیرے سے ہاتھ ملایا۔

"پہلے کبھی وعدہ خلافی ہوئی ہے؟" بشیرے نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "آپ کا گروہ مال سمیت پکڑا گیا تھا تو میں متعلقہ وزیر کے پاس جا کر انہیں چھڑوا نہیں لایا تھا؟ جاپانی روڈ کی بہترین چیز آپ کو کوڑیوں کے دام نہیں دلوائی تھی؟ آپ چوتھی بار حج سے واپس آئے تھے تو میرے آدمیوں نے آپ کا مال صحیح سلامت آپ کے اڈے پر نہیں پہنچا دیا تھا؟ آپ کی تیسری بیوی آپ جیسے ایک حاجی کے ساتھ بھاگ گئی تھی تو میرے آدمی دونوں کو اغوا کر کے نہیں لے آئے تھے؟ بادشاہ تک آپ کا سلام اور تحفہ نہیں پہنچا دیا تھا؟ پھر آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ عذرا کل رات آپ کے قبضہ میں ہوگی۔ اور ہمارا مال ...."

"اپنا مال پیشگی لے لو بشیرے! سمگلر ہوں بے ایمان نہیں ہوں"۔

بشیرا چلا گیا تو سوداگر نے شراب کی ٹھنڈی یخ بوتل نکال کر جام بھرا اور منہ سے لگا لیا۔ شراب کی بو میں اُسے عذرا کے کنوارے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔

جب جام ہونٹوں سے الگ ہوا تو ملکہ نے لپک کر جام تھام لیا۔ بادشاہ نے رومال سے ہونٹ پونچھے۔ اُسے سکون سا محسوس ہوا۔ ملکہ کے گداز جسم اور شراب کی بو نے اُسے سنبھال ہی لیا۔ ملکہ نے ایک اور جام بھر کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بولی۔ "آپ کی یہ چال بہترین چال ہے"

بادشاہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ وہ خوش تھا کہ اُس نے وہ چال چلی ہے کہ اس کی بادشاہی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی ہے۔ اور متفکر اس لئے تھا کہ یہ چال اُسے بساط پر سر کے بل ہی نہ پٹخ دے۔ اس کے سامنے دو حقائق کھڑے تھے جو اس کی شہنشاہیت پر مہیب خطرہ بن کر لٹکتے رہتے تھے۔ ایک آتش فشاں پہاڑ جس کی چوٹی سے ابل ابل کر نکلتا ہوا دھواں کالی رات سیاہ اور گھنا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور دوسرا اس کی فوجوں کا گمنام جو پہاڑ سے زیادہ خوفناک تھا۔

اُس نے ایک سے لطف لینے کے لئے دوسرے کو بیدار کیا تھا مگر خدشہ تھا کہ دونوں ہی بیدار نہ ہو جائیں۔

پچھیانی کے پہاڑ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادل محلوں اور جھونپڑوں کے اوپر سے گزرتے جا رہے تھے۔ آج رات اس دھوئیں میں جو بدبو اور سڑاند تھی وہ پہلے سے کہیں زیادہ تھی جب یہ گلا سڑا دھواں اصغری کے جھونپڑے کے اوپر سے گزرا تو تعفن میں اضافہ ہو گیا کیونکہ اصغری کی بے بس آہ وزاری اور کچلی ہوئی نسائیت کی ہچکیاں اس میں شامل ہو گئی تھیں۔ اصغری کا خاوند اصغری کو دو بچے دے کر خود قیدخانے میں مر گیا تھا مگر اس لئے نہیں گیا تھا کہ وہ اس قدر بزدل اور کم ہمت تھا بلکہ اس لئے کہ اسے کسی ایسے جرم میں پھانس لیا گیا تھا کہ جو ایک درباری کے رشتہ دار نے کیا تھا۔ اور بھوکے ننگے انصاف کے پیٹ میں اصغری کے بےگناہ خاوند کو جھونک دیا گیا تھا۔ وہ رسوائی اور بے انصافی کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے قیدخانے میں ہی مر گیا تھا۔ اصغری کے دونوں بچے بیمار تھے۔ گھر میں روٹی نہ پانی نہ پیسہ! اصغری جوان بھی تھی اور خوش شکل بھی۔ جوان نہ بھی ہوتی تو یہ بدنصیبی کیا کم تھی کہ وہ عورت تھی، بے بس اور مجبور عورت۔ اُس نے بیمار بچوں کے سرہانے بیٹھے اور ان کا سر دباتے تین راتیں گزار دی تھیں۔ آج تیسری رات بڑے بچے کی حالت بگڑ رہی تھی۔

"ماں! کچھ دے دو۔ بھوک لگی ہے" ـــــ بچے کی کراہتی ہوئی آواز اُسے یوں سنائی دی جیسے موت کی وادی میں کوئی دور بہت نیچے بھولا بھٹکا تھکا ہارا مسافر پانی پانی پکار رہا ہو۔

اصغری کے آنسو نکل آئے۔ چولہے پرسوں سے ٹھنڈے پڑے تھے اور اصغری کا دل جل رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں کئی بار آئی ہوئی، ہر بار دھکیلی ہوئی بات ایک بار پھر آگئی۔ "تمہارا کیا جائے گا جسم محنت مشقت کے لئے ہوتا ہے، یہ بھی تو محنت ہی ہے۔ دو چار روپے ہاتھ آجائیں گے۔" اور اصغری جو ہر بار اس گھناؤنے خیال پر جھینپ جایا کرتی تھی آج رات سنجیدگی سے سوچنے لگ گئی۔ اُسے پڑوسن کے خاوند کا خیال آیا جو دائم المریض تھی اور اس کا خاوند اصغری کو بھوکی پیاسی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اصغری نے آج رات بیمار بچوں کے سرہانے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل صبح ہی اُسے کہے گی۔ "مجھے یوں نہ دیکھا کرو۔ میری جھگی میں آجانا اور پانچ سات روپے لیتے آنا۔" ساتھ ہی اُسے پسے ہوئے مرچ مصالحے کے سوداگر کا خیال آگیا جو پسی ہوئی مرچ مرچوں میں ملانے کے لئے غریب اور نادار عورتوں سے اینٹیں پسوایا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اس کے پاس ملازمت کے لئے گئی تھی تو سوداگر نے اُسے مسکرا کر کہا تھا:

"تمہیں کام نہ دیں تو اور کسے دیں گے۔ اُس طرف چلو، میں آتا ہوں۔"

اور وہ گودام کے اُس کونے کی طرف چل پڑی تھی جہاں چار پانچ نادار عورتیں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر کھسیانی سی ہنسی ہنس رہی تھیں اور اینٹیں پیس پیس کر پسی ہوئی لال مرچوں میں ملا رہی تھیں۔ سوداگر نے اُسے ایک اور کونے کی طرف اشارہ کر کے آنکھ مار کر کہا تھا۔

"اری پگلی! پہلے اس طرف چلو نا!" اور وہ وہاں سے بھاگ آئی تھی۔

پھر اُسے پپیتوں کے بیجوں کا بھی خیال آیا۔ اُسے معلوم ہوا تھا کہ کالی مرچوں میں ملانے کے لئے دکاندار پپیتے کے خشک بیج خریدتے ہیں۔ ایک روز وہ دن بھر فٹ پاتھوں پہ بیج چنتی رہی تھی لیکن دکاندار کے پاس گئی تو اُس نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا تھا۔ "تم تو ان بیجوں کے بغیر ہی آجاتیں۔ تمہاری جوانی کی قسم! منہ مانگے دام دیتا۔" اور اصغری ایسی بدحواس ہو کے بھاگی تھی کہ پپیتے کے بیج سڑک پہ بکھر گئے تھے، جنہیں دکاندار کے چھوکروں نے چن کر کالی مرچوں میں ملا لیا تھا۔

اُسے کوے پکڑنے کا بھی خیال آیا۔ وہ جانتی تھی کہ جھونپڑیوں کی اس بستی کے دو آدمی کوے پکڑ کر انہیں ذبح کرتے ہیں اور بال و پر صاف کر کے چار چھ آنے فی پرندہ مقامی ہوٹلوں میں بیچ آتے ہیں اور ہوٹلوں والے انہیں بھونے ہوئے چوزے اور تیتر کے نام پر اڑھائی تین روپے فی پرندہ لوگوں کو کھلا دیتے ہیں۔ مگر اصغری کے لئے کوے پکڑنا آسان نہ تھا۔

جھگیوں کے قریب خوردہ مکینوں سے وہ سنتی رہتی تھی کہ اس ملک کے چھندر کس کس طرح روٹی کما رہے ہیں۔ اُسے کسی نے مشورہ دیا کہ بڑے بڑے ہوٹلوں کی استعمال شدہ چائے پتی چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں اور چائے فروشوں کے ہاں بکتی ہے لیکن اس روزگار کی راہ میں بھی اس کی نسائیت اور ایک بڑے ہوٹل کے بیرے کی پیاسی نگاہیں حائل ہو گئی تھیں۔ آج رات تو وہ اس قدر شکست خوردہ ہو چکی تھی کہ وہ انہی رال ٹپکاتے مردوں کی پناہ میں چلے جانے کے متعلق سوچنے لگ گئی۔

دیا ٹمٹمایا اور بجھ گیا۔ جھونپڑے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اصغری کے ذہن میں وہ اندھی گلیاں آگئیں جن کے قصے سن کر وہ ان لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق سوچا کرتی تھی جو ان گلیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ اُس نے سوچا وہ اسی کی طرح بے بس عورتیں ہوں گی جو کسمپرسی کے عالم میں بھٹکتی ہوئی انہی اندھیری پناہ گاہوں میں جا چھپی ہوں گی۔ آج رات اُس نے اپنے آپ کو ان گلیوں کے اندھیروں میں بھٹکتا ہوا پایا۔ جانے کس نے اس کے سینے سے ہی اٹھ کے کہا، کاش! کوئی مجھے انہی گلیوں کی راہ دکھا دے شاید بچوں کے لئے دواؤں اور روٹیوں کے پیسے مل جائیں۔" وہ انہی گلیوں میں خیالوں ہی خیالوں میں گھوم ہی رہی تھی کہ ایک موڑ پہ اُسے اپنا مرحوم شوہر دکھائی دیا ـــ خاوند کی بھٹکتی ہوئی روح، اس کا مظلوم پیار! اصغری کے سینے میں عورت بیدار ہو گئی وہ یکبارگی اٹھ بیٹھی جیسے کسی عظیم خطرے کے مقابلے میں جم گئی ہو۔ اُس نے جھونپڑی

دورِ انقلاب

(ایک تمثیلی پیشکش   نقش : صادقین)

ن ہر کہیں آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہے!" روسو
ب اکتوبر سے پہلے پاکستان میں بھی جمہور پابہ زنجیر تھے۔

طلوعِ سحر:
تیز تر صنعتی ترقی

بیش از بیش فروغِ تعلیم

ترقیٔ نسواں

دورِ عدل

نئی نسل ۔ نئی روح

پنج گوشہ ستارۂ سحر (بنیادی جمہوریت)
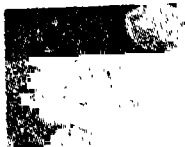
"عالم تمام مطلعِ انوار ہوگیا!"

خاتون پیکر تراش مس نویرہ احمد

پچھلے دنوں ڈھاکہ میں پاکستان کی پہلی خاتون پیکر تراش، مس نویرہ احمد کے تراشے ہوئے متعدد فنی پیکروں کی نمائش منعقد ہوئی جو ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی نمائش تھی

ر اس کا سٹوڈیو

سنگ تراشی کا نفیس کام (مرکزی پبلک لائبریری ڈھاکہ

ھیئت تراشی کی نئی وضع

کے اندھیرے میں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور چلّا کر کہا۔ "یا خدا! آج ہی رات اس آگ اگلتے پہاڑ کو پھاڑ دے۔ جلا کے راکھ کر دے پر یہ پانی کو۔ یہ دکھیاری بچوں سمیت تیرے حضور میں آنا چاہتی ہے۔ یا اللہ! یہ تیرے بچے ہیں۔ انہیں سنبھال لے۔" اور اس کی آواز ہچکیوں میں دب گئی۔

اُس نے خوفناک دھماکہ سنا، پھر دل ہلا دینے والی گرج جیسے پو پھٹتے پہاڑ کا سینہ پھٹ رہا ہو اور چٹانوں کے دزنی پتھر لڑھکتے چلے آ رہے ہوں لیکن یہ دھماکہ اور یہ گرج کراہتی ہوئی ایک نحیف آواز میں سمٹ آئی۔ "ماں! روٹی نہیں تو پانی ہی دے دے، مر رہا ہوں۔"

اصغری نے بھاگ کر گھڑے کو الٹا کیا۔ گھڑا خالی تھا۔ صراحی بھی خالی تھی۔ اُس شام نل پر اُسے ایک میل لمبی قطار میں آخری جگہ ملی تھی اور نل صرف دو گھڑے پانی اگل کر شوں شپ شش فوں اور سُوں سُوں کر کے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ اصغری نے دیکھا تھا (اور یوں ہر صبح اور ہر شام ہوتا تھا) کہ دو گھڑے بیک وقت نل کی طرف بڑھے تھے لیکن بھرا ایک بھی نہ جا سکا تھا کیونکہ دونوں گھڑے والے باری پر لڑ پڑے تھے اور پانی کسی کے بھی حصے میں نہ آیا تھا۔ نل کا پانی بہہ گیا تھا خون کے قطرے بہہ گئے تھے۔ اصغری نے ایک بار پھر گھڑے کو الٹا کیا لیکن پانی کی ایک بوند نہ ملی۔

سونے کے سوداگر نے بوتل کو جام میں الٹا کیا تو جام بھر گیا اور اُس نے منہ سے لگا لیا۔

اصغری نے ایک بار پھر صراحی اٹھائی، ہلائی اور جھنجھوڑی لیکن وہاں بھی نہ تھا۔

بادشاہ نے جام خالی کیا تو ملکہ نے پھر بھر دیا۔

بچے نے پھر ہچکی لی ــــ "ماں! ایک گھونٹ پانی"

بادشاہ کے باغیچے میں شراب کی خالی اور آدھی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں، ... جا چکے تھے۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔

اونچے اونچے محلات اور چوڑی چوڑی سڑکوں کے اس شہر کے سائے میں ... اَن گنت جھونپڑے، خشک گھاس پھونس، مٹی اور ریت کے جھونپڑے ... دوسرے کے سہارے ایستادہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ امیروں، وزیروں ... محلات گہری نیند سو رہے تھے اور ان کے شراب میں نہائے ہوئے خراٹے پانی ... بوند کو ترستے انسانوں کی سسکیوں میں تحلیل ہو رہے تھے۔

"... نہیں تھی؟" مٹی کی ایک جھگی نے دوسرے ... پوچھا۔

"شاید..." دوسری جھگی نے جواب۔ "شاید ہوا کا یہ جھونکا زیادہ تیز تھا۔"

"چپ رہو ذرا..." کچھ پرے گھاس پھونس کا ایک جھونپڑا بولا۔ "یہ آوازیں سنو! جیسے پہاڑ سے پتھر لڑھک رہے ہیں۔"

"نہیں بھائی! یہ سمندر کا شور ہے۔"

"اکتوبر کے مہینے میں سمندر میں اتنا جوش کہاں۔ لہریں سو رہی ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑ پھٹ رہا ہے۔ آگ اگل رہا ہے۔ دیکھنا ذرا۔"

"میں کیسے دیکھوں؟" جھگی نے جواب دیا۔ "میرے آگے اتنا اونچا مکان کھڑا ہے کہ پہاڑ نظر نہیں آ رہا۔"

"یہ کیا ہے؟" ایک اور جھونپڑے نے چونک کر کہا۔ "یہ فوج تو نہیں؟"

"ہاں یہ فوج ہی ہے۔" گدلے پانی میں ایستادہ ایک اور جھونپڑا وثوق سے بولا۔ "یہ فوج ہے۔ شاید بادشاہ نے بلائی ہے۔"

"کیوں بلائی ہوگی بھلا؟"

"بادشاہوں کی مرضی۔ نیند نہیں آتی ہوگی تو دل بہلانے کے لئے فوج بلالی ہوگی۔" جھگی نے کہا۔

"ایک نظر دیکھے گا تو نیند آجائے گی۔"

"کہیں ہمیں اکھاڑ دینے کو تو فوج نہیں آئی؟" ننھی سی جھونپڑی نے تیز ہوا سے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"یہ بھی ممکن ہے۔ شاید کسی امیر نے محل بنانے کے لئے جگہ مانگی ہوگی۔"

"اور بادشاہ نے یہ جگہ دان کر دی ہوگی۔"

"دیکھا نہیں تھا کہ اُس روز اس طرف والے جھونپڑے گرا دیئے گئے ہیں اور اس جگہ امیروں، وزیروں کی بیگموں نے جانے کیا تماشہ یا بازار یا شاید نمائش لگائی ہے؟"

"ہم کب تک اس غلیظ پانی میں کھڑے رہیں گے؟" ایک جھونپڑی نے پوچھا۔

"جب تک ہماری چھتوں تلے سونے والے زندہ ہیں۔" ایک عمر رسیدہ جھونپڑے نے جواب دیا۔

"وہ کب تک زندہ رہیں گے؟"

"جب تک ان میں مشقت اور فاقہ کشی کی تاب ہے۔"

"کیا کوئی ایسا قانون ہے جس کے تحت جھگی جھونپڑوں کو گرا کر ان پر محل کھڑے کر دیئے جاتے ہیں؟"

"تم کیا سمجھتے ہو، ہمارے ارد گرد، ہمارے اندر اور باہر جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی قانون کے تحت ہو رہا ہے!"

"سنا ہے یہاں بھی قانون ہوا کرتا تھا۔"

"وہ بادشاہ اور اس کے وزیروں نے انعام و اکرام میں تقسیم کر دیا ہے۔"

"کون ہیں؟"

"جو ان کے جلسے جلوسوں میں نعرے لگاتے ہیں۔ اور دنگا فساد کرتے ہیں۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟"

"جو راتوں کو چوری چکاری اور ہر طرح کا گناہ کرتے ہیں" معمر جھونپڑے نے کہا اور چونک کر بولا۔ "چپ ہو جاؤ ذرا۔ یہ فوج سڑک پہ رک کیوں گئی ہے! وہ دیکھو فوجی ٹولیوں میں بکھر گئے ہیں۔"

"ہاں! وہ بکھر گئے ہیں" جھگی نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دیکھو چند فوجی بندوقیں سنبھالے چوک میں کھڑے ہو گئے ہیں۔"

"شاید کوئی خطرہ ہے۔"

"شاید رات زلزلہ آنے والا ہے۔ بادشاہ کو ہر خطرے کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے۔"

"دیکھو ملکہ!" بادشاہ نے کھڑکی میں جا کے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ آ گئے ہیں۔ میرا کماندار آ رہا ہے۔ میں اسے باہر ہی ملتا ہوں۔"

"آپ پھر گھبرا گئے ہیں" ملکہ نے بادشاہ کو پیار سے کہا۔ "فوج کو آپ ہی نے تو بلایا ہے۔ کماندار کو حکم دیجئے کہ پومپیائی کو ہر خطرے سے محفوظ کرے۔ پہاڑ پھٹنے کی صورت میں لاوے کو شہر سے باہر ہی روک لے یا کم از کم محل تک نہ آنے دے۔"

بادشاہ نے حکم دینا چاہا لیکن اس کا حکم لرز سا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ عذرا اور اصغری کی جگہ پاش دعائیں ہزاروں لاکھوں عذراؤں اور اصغریوں کی فریادیں بن کر خدا کے حضور میں پہنچ چکی ہیں۔ لکھو کھا بیمار اور پانی کی بوندوں کو ترستے بچوں کی پیاسی سسکیاں عرش کا سینہ چاک کر چکی ہیں۔ سونے کے زمین دوز سوداگر اور لٹیرے کے گروہ کے گناہوں کے بوجھ سے آسمان جھک آیا ہے۔ آج کی رات ابلیس سو گیا ہے۔ پھانسی پہ چڑھنے والے بے گناہوں کی روحیں آج رات پومپیائی پہ منڈلا رہی ہیں اور قید خانوں میں بند ہزاروں بیگناہ محبوسین کا واویلا خدا نے سن لیا ہے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور گڑھوں میں مرتے ہوئے سینکڑوں نوزائیدہ بچوں کی روحیں خدا کے حضور میں کھیل رہی ہیں۔ وہ بچے آج رات سوئے بھی نہیں۔

پومپیائی کی آخری رات کے بطن سے سحر جنم لے رہی تھی کہ آتش فشاں پہاڑ دھماکوں کا تسلسل بن گیا۔ جلتا بھنتا اور جلاتا بھونتا ہوا لاوا شہر کی طرف بہنے لگا جیسے اُبلتے ہوئے سمندر کا رُخ کسی نے شہر کی طرف موڑ دیا ہے۔ تپتی ہوئی چٹانیں اور بڑے بڑے وزنی پتھر بہے چلے آ رہے تھے۔ پتھر چلے آ رہے تھے، لاریوں میں، ٹرکوں میں، جیپوں میں، بکتر بند گاڑیوں میں، ٹینکوں میں، پیدل بھی، موٹر سائیکلوں پر بھی۔ پومپیائی کے محلات بنیادوں سے اکھڑنے لگے، جھونپڑے دبک کے بیٹھ گئے۔ سمندر ساحل کو چھوڑ کے پیچھے ہٹ گیا۔ سونے کے زمین دوز سوداگروں نے اینٹیں اٹھا کر تہہ خانوں کا رُخ کیا لیکن چٹانوں نے سرک کر تہہ خانوں کے منہ بند کر دیئے۔

اونگھتے ہوئے ستاروں نے دیکھا کہ پومپیائی کا وہ شہر جہاں کی راتیں جاگتی تھیں اور دن اونگھتے تھے زمین میں روپوش ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لاوا بہا چلا آ رہا تھا۔ اور شہر یُوں آسمان کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا جیسے کوئی کسی غلط لفظ پر سیاہی پھیر رہا ہو۔ جب سورج نکلا تو اُسے زمین پہ پومپیائی نظر نہ آیا۔ آتش فشاں پہاڑ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ رات اس نے تمام تر دھواں اور سینے کا غبار اُگل دیا تھا اور آج پہلی بار اطمینان کی نیند سو رہا تھا، پومپیائی اور اس کے گناہوں کو ہمیشہ کی نیند سلا کر۔

جب سورج کی کرنیں اس ٹھنڈے لاوے پر بکھرنے لگیں جس کی تہوں میں ایک شہر روپوش ہو گیا تھا تو کرنیں سہم کے ایک طرف ہو گئیں کیونکہ لاوے میں حرکت ہو رہی تھی جیسے ریت میں دبا ہوا کوئی انسان باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو یا جیسے بند تابوت کے اندر لاش باہر نکلنے کو ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔

کرنیں ایک طرف ہو گئیں۔ سورج جہاں تھا وہیں رک گیا۔ معجزہ رونما ہو رہا تھا۔ مٹی کی کوکھ میں سے انسان جنم لے رہا تھا۔

سورج نے دیکھا، فضا میں اڑتے پرندوں نے دیکھا، مغرب کی ہواؤں نے دیکھا اور تمام دنیا نے دیکھا کہ زمین پہ جما ہوا یخ بستہ لاوا جگہ جگہ سے پھٹنے لگا اور اس میں سے ایک بستی سر نکالنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد بستی ابھر کر زمین پہ آ گئی۔ یہ عذرا اور اصغری کی بستی تھی۔ یہ انسانوں کی بستی تھی جن کی مظلوم فریادیں، خاموش آہیں، بہہ بہہ کے خشک ہوتے ہوئے آنسو، لوٹی ہوئی دولت پہ لٹی ہوئی عصمتوں کی پکار، سونے کی سیج پہ قربان ہونے والیوں کے بَین آتش فشاں پہاڑ میں جل جل کر دھواں دھار بن بن کے پومپیائی پہ اڑتے اور پھیلتے رہتے تھے۔ یہ نئی بستی جو لاوے میں سے ابھری تھی پومپیائی کی ہی مانند تھی، وہی گہما گہمی

(باقی صفحہ ۸۶ پر)

بنگلہ افسانہ

آتشِ خاموش!

عبدالغفار چودھری
مترجم: احمد سعدی

وہ عجیب و غریب فطرت کا آدمی تھا۔ کشادہ چہرہ، جوان اور تنومند، ایسا کہ جی چاہتا تو یونہی پانچ سات آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ لیکن وہ بہت کم باتیں کرتا اور کرتا تو اتنے زور سے کہ معلوم ہوتا اس کے لہجے میں ذرا بھی لوچ نہیں اور اس کی باتوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو جس طرح بلی کے نرم پنجے سے جس طرح تیز اور نوکیلے ناخن باہر نکل آتے ہیں اسی طرح اس کی سنجیدگی کے پردے میں سویا ہوا وحشی انسان جاگ اٹھے گا۔ اس کی باتوں میں نغمگی۔ پیار یا محبت کا شائبہ تک نہ تھا۔ بچوں کے ساتھ جس لہجے میں باتیں کرتا بڑوں کے ساتھ بھی اس لہجے میں گفتگو کرتا۔ اس کے لہجے سے نہ تو کوئی خوف ظاہر ہوتا تھا نہ عقیدت۔ اسی لئے اس کی باتوں سے اس کے مزاج کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام لوگ اس سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔

بڑے زمیندار جلیل میاں تو صاف لفظوں میں کہتے "یہ آدمی چنڈال ہے یا کیا ہے لوگوں کے ساتھ ان کے حسب مرتبہ باتیں کرنا تو جانتا ہی نہیں۔ دل چاہتا ہے کسی دن اسے خوب مزہ چکھاؤں پھر سوچتا ہوں رہنے دو غریب نیچ ذات کا آدمی ہی تو ہے۔"

گاؤں کے لوگ بھی حیرانی سے سوچتے اس آدمی کی آواز میں ذرا بھی لوچ لچک نہیں — آواز کے ساتھ تو دل کا براہ راست بڑا گہرا تعلق ہے۔ دکھ کے احساس سے آواز بھرا جاتی ہے خوف سے کانپ اٹھتی ہے اور خوشی میں ولولہ آمیز ہو جاتی ہے۔ لیکن سورج کی آواز اتنی بڑی حقیقت کو جھٹلا رہی تھی۔

وہ جلیبیاں بیچتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بلا کی پھرتی تھی۔ کوئی دکان وکان نہ تھی۔ ہاٹ میں ایک جھونپڑی کے اندر مٹی کے چولہے پر کڑھائی چڑھا کر جلیبیاں تلتا تھا اور وہیں صبح یا شام لگنے والے بازار میں بیچ دیتا تھا۔ لوگ کہتے تھے اتنی اچھی جلیبیاں شہر کے حلوائی بھی تیار نہ کر سکتے تھے۔

مگر اس کی جلیبیوں کی خوبیوں کے معترف خریدار بھی جب آ کر اس سے پوچھتے:

"مٹھائی کا کیا دام ہے بھائی؟" تو وہ کرخت لہجے میں جواب دیتا "دو روپیہ سیر۔"

"کچھ کم نہیں کرو گے؟"

"نہیں" —— اس کے بعد وہ کوئی بات نہ کرتا۔

اور کبھی کبھی جب شہر میں زیادہ داموں پر خرید کر مٹھائی کھانے والا خریدار آ کر اس سے پوچھتا "تمہاری جلیبیاں تو تازہ معلوم ہوتی ہیں خوشبو بھی سوندھی سوندھی ہے۔ ڈھائی روپے سیر کے بھاؤ سے دو تو آدھ سیر دے دو۔" شہر کے نامی حلوائیوں کے مقررہ بھاؤ سے وہ کچھ کم کر کے ہی کہتا۔

سورج سر ہلاتے ہوئے جواب دیتا "نہیں صاحب دو روپیہ کے حساب سے آدھ سیر کا دام ایک روپیہ دیجئے۔"

شہری خریدار حیران ہو کر پوچھتا "کیا کہا، دو روپیہ؟ سیر اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہاری مٹھائی اچھی نہیں۔ چاول کے آٹے اور چتیا باد کے تیل سے تیار کی ہے، کیوں؟"

سورج کڑھائی میں کرچھل ہلاتے ہوئے کہتا "یقین ہو تو لیجئے نہیں تو نہ لیجئے میں ایمان نہیں بیچتا۔"

اس کی کرخت آواز سے خریدار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اسی لئے زبان سے نہ کہنے کے باوجود بہت سے لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ زمیندار جلیل میاں تک اس سے ڈرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا ڈیل ڈول منہا تھ بھی تو ایسا ویسا نہ تھا۔ اگر وہ چاہتا تو کسی کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دیتا۔ اور پھر تھانہ پولیس جو کچھ بھی ہوتا بعد کی بات تھی۔

سورج کا باپ گاؤں کا مشہور مستری تھا لیکن بہت دن ہوئے

...ں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب گھر میں ایک وہ تھا اور ایک اس کی بیوہ ماں
...س کے علاوہ دنیا میں اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کے گھر میں جو ناریل
...ے پیڑ تھے ان سے ڈاب اور ناریل توڑ کر کچھ خود کھاتا اور کچھ بازار میں
...دیتا۔ دھان کا کھیت اس نے بٹائی پر دے دیا تھا اور خود جلیبیاں
...تا تھا۔ اس کے علاوہ نہ تو وہ کوئی اور کام کرتا نہ کسی کے پھٹے میں پیر
...ڑاتا۔ اور نہ کسی کی پروا کرتا اسی لئے کچھ لوگ اس سے مذاق کرتے ہوئے
...سے "گلیوں کا کنہیا" کہتے تھے۔

لیکن کنہیا کی فطرت میں اس صنف کے لئے ناپسندیدگی ہی ناپسندیدگی تھی۔ پسند کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ لڑکیوں کے معاملہ میں وہ بالکل بے نیاز، بے حس اور سرد مہر واقع ہوا تھا۔ اس کی ماں کچھ عرصے تک بہو کا منہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے بکتی جھکتی رہی لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ پتھر میں جونک نہیں لگ سکتی تو وہ تھک ہار کر خاموش بیٹھ رہی تھی۔

لیکن یہی سورج ایک دن خود چراغ میجی کے یہاں پہنچ گیا۔ میجی ظہر کی نماز پڑھ کر بیٹھا اپنا کرتا رفو کر رہا تھا جسے وہ جمعہ کی نماز یا دوسرے کام کاج کے وقت پہنا کرتا تھا۔ سورج کو دیکھ کر اس نے کہا کیا بات ہے کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے۔

"نہیں" سورج نے سر ہلا کر دہلیز کے ایک کونے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں چچا۔"

"باتیں — بیٹھو بیٹھو۔ کہو کیا بات ہے؟"

"تمہیں ایک رشتہ طے کرنا ہوگا۔"

"شادی — کس کی — تمہاری؟"

"ہاں۔"

میجی یکایک زور سے ہنس پڑا۔ "کٹھ بڑھئی بھی جس درخت میں ٹھونگ مار کر کوئی اندازہ نہ لگا سکا کہ اس درخت کی لکڑی کیسی ہے، تو یہ سخت پیڑ کس کو دیکھ کر اتنا نرم ہو گیا ہے بھتیجے؟"

سورج نے آنکھیں جھکائے بغیر جواب دیا "لطیف چاکلادار کی لڑکی زیتون کو تم نے دیکھا ہے۔"

"زیتون! ستیاناس!" میجی دنگ رہ گیا۔

سورج نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا "تم ڈر کیوں گئے؟"

میجی تھوڑی دیر سوئی کی نوک کو تکتا رہا۔ پھر بولا "زیتون کا خیال چھوڑ دو۔ میں اسی گاؤں کا اگوا ہوں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے جلیل میاں خود زیتون سے شادی کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔ لطیف چاکلادار غریب آدمی ہے اسے راضی کر کے لڑکی سے رشتہ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔"

"مگر جلیل میاں تو بوڑھے آدمی ہیں" سورج نے سر جھٹک کر کہا "ان کی تین بیویاں بھی موجود ہیں۔"

"پر بڑے آدمیوں کو تین چار شادیاں کرنے سے کون روک سکتا ہے۔"

"کم از کم تم کہہ کر تو دیکھو۔ انہیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ سب میں پورا کر دوں گا۔"

میجی نے پھر کرتا رفو کرتے ہوئے کہا۔ "اگوا کو کہنے میں کیا ہرج ہے لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ میں تم سے انعام لے لوں گا۔"

اتنی دیر میں سورج وہاں سے جا چکا تھا۔

چاند نکلنے سے پہلے آسمان کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ دکھن کی طرف سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چلتے ہیں اور طلوع ہوتے ہوئے چاند کی خوبصورتی آسمان سے دن بھر کی اداسی کا رنگ پونچھ کر حیرت انگیز خوبصورتی بکھیرتی ہے، ٹھیک اسی طرح ایک دن ہاٹ سے واپس لوٹتے ہوئے راستے میں سپاری کے پتے سے گھرے ہوئے تالاب کے کنارے زیتون کو دیکھ کر سورج کے تمام جسم میں برقی لہر سی دوڑ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک انجانی سی ترنگ جس کی جھلک اس کے چہرے کی سختی پر آہستہ آہستہ موج کی طرح چھا گئی تھی۔ جلیبی تلتے وقت اس دن کھولتے ہوئے تیل میں بار بار وہی چہرہ ابھر آتا تھا۔ لیکن انسان کا دل بھی کتنا عجیب ہے۔ سورج جیسے آدمی نے زیتون سے شادی کرنے کی پیشکش کی۔ یہ سن کر بھی جلیل میاں نے نہ تو پریشانی ظاہر کی نہ خفگی بلکہ بڑے خوبصورت انداز میں دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے۔ اتنے دنوں بعد اس چنڈال کا دل دماغ کچھ بدلا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے کھسیا کر اپنے گماشتہ کو بلایا اور اسے سامنے کھڑا دیکھ کر ہنس کر بولے "تمہیں معلوم ہوا کچھ، امین الدین؟"

امین الدین نے معاملہ کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے کہا "چونٹی کو پر

نکلے حضور" ٹھیک سے ٹھیک ہے۔ تم لوگ نیک کام میں رکاوٹ مت ڈالو۔ صرف لطیف چاکلادار کو بلا لاؤ۔ بےچارا غریب آدمی ہے اس خوشی کے موقع پر اسے دو چار روپے ملنے چاہئیں۔ آہا! اس کی لڑکی کیا ہے پری ہے پری! بغیر پروں کے پری!" جملہ پورا کرنے کے بعد خود کو سنبھال کر وہ اس طرح ہنسے جیسے وہ طنز کر رہے ہوں۔

چراغ میمی خوشی سے ناچتا ہوا اپنے لمبے کرتے کو سمیٹتے سورج کی دہلیز پر چڑھا اور بولا" میٹھی کھلی کھلاؤ بھائی لو بیٹیا چاکلادار ایک ہی بات میں راضی ہو گیا۔ لیکن ایک شرط ہے"۔

سورج کی ماں پان لگا رہی تھی۔ سورج نے داؤ[1] سے سپاری کاٹتے ہوئے پوچھا "کیا؟"

" نقد پانچ سو روپیہ، یکمشت ساس سسر کو نذرانہ دینا ہوگا"۔

نذرانہ! کیا سمجھے؟ چاکلادار نے کہا اس کی دس پانچ نہیں صرف ایک لڑکی ہے۔ وہ بھی خدا کے فضل سے صورت شکل میں کوئی ایسی گئی گذری نہیں۔ اچھا داماد بغیر ڈھونڈے بہت ملتا ہے۔ تم جب اتنا اصرار کرتے ہو تو پانچ سو روپیہ دے کر ساس سسر کا منہ میٹھا کرانا ہوگا"۔

سورج نے اسی طرح دھیمے لہجے میں جواب دیا"بہت اچھا"۔

میمی سے بھی زیادہ حیرت زدہ ہو کر اس کی ماں نے اس کی طرف دیکھا لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ پتھر کے بت کی طرح خاموش رہنے والے لڑکے نے خود ہی شادی کا خیال ظاہر کر دیا۔ اگر اس نے روپے کی بات اٹھائی تو کون جانے وہ پھر پہلے کی طرح پتھر کا بت نہ بن جائے۔

لیکن سورج نے اس بات کو ذرا بھی اہمیت نہ دی چھ مہینے کے وعدہ پر پانچ سو روپیہ قرض لے کر اسے ادا کرنے میں کتنی دیر لگے گی۔ گھر میں جو پیڑ تھے ان کے پھلوں اور بٹائی کی زمین کی پیداوار سے گھر کا خرچ چل جائیگا اور روزانہ جلیبیاں تل کر ان کی آمدنی سے چھ ماہ میں روپیہ ادا کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ٹھیک ہے۔ زیتون کے گھر آنے پر گھر کا خرچ بڑھ جائے گا۔ بڑھنے دو۔ روزی دینے والا خدا ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہی روزی میں بھی ترقی دے گا"۔

وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ کی کبھی پروا نہیں کرتا تھا آج بھی اسکے جسم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کام آ نگن کے پیڑ کے نیچے جہاں روز دوپہر کو پتوں کا سایہ رہتا تھا اور وہ کبھی کبھی جلیبیوں کا بوجھ سر سے اتار کر آرام کرتا تھا آج وہ وہاں بھی نہیں رکا۔ درخت کے پتے یادِ الٰہی میں بے خبر کسی فقیر کی طرح بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ دھوپ کی شدت سے زمین تپ گئی تھی لیکن سورج نے جلیل میاں کی بیٹھک میں پہنچ کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور قمیض کا بٹن کھول کر ہاتھ سے پنکھا کرنے لگا۔

جلیل میاں دھیرے سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آہا! بیٹھو! بیٹھو! ڈاب[1] کاٹ کر دوں"۔

خبر نہیں سورج کو حیرت ہوئی یا نہیں اس نے کہا"جانے دیجئے میں آپ سے پانچ سو روپیہ قرض مانگنے آیا ہوں۔ چھ مہینے میں ادا کر دوں گا"۔

جلیل میاں نے اپنی طنزیہ مسکراہٹ گڑگڑی کے پیچھے چھپالی۔

"پانچ سو روپیہ قرض مگر معاملہ کیا ہے شادی بیاہ کروگے کیا؟"

"جی لطیف چاکلادار کی لڑکی زیتون سے"۔

"الحمدللہ بیاہ شادی کے کام سے خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ آدمی گناہ سے بچتا ہے اس کام کے لئے بھلا میں پانچ سو روپیہ دینے پر راضی نہیں ہوں گا۔ کیا کہتے ہو ۔۔۔۔۔ تم جانتے ہی ہو کہ شادی کرنے سے آدمی کا ایمان سلامت رہتا ہے"۔

اس کے بعد انہوں نے فوراً آواز دی"امین آلدی!"

امین آلدی (امین الدین) کے سامنے آجانے پر وہ بولے"تم نے کچھ سنا۔ سورج کی شادی ہو رہی ہے۔ اسے پانچ سو روپیہ ابھی گن کر دے دو"

امین آلدی نے حیرت سے پوچھا لیکن کچھ بھی تو نظر نہیں آتا کوئی بندھک[2]۔ زمین، جائداد، یا گھر کا گہنا، زیور!"۔

میں نے کیا کہا! نہیں سنا!" جلیل میاں کو یکایک غصہ آگیا۔

"بیاہ شادی کا معاملہ ہے تم جاؤ"۔

امین آلدی کے واپس آتے ہی انہوں نے اپنے سامنے پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے بکس سے ایک موٹا سا کھڑکھڑاتا ہوا کاغذ نکالا اور بولے" تم نے جتنا روپیہ لیا ہے اس جگہ لکھ کر دستخط کر دو۔ روپیہ پیسہ کا معاملہ ہے۔ تم تو سمجھتے ہی ہو اصولی کام کرنا اچھا ہوتا ہے"۔

---

[1] داؤ ـ بڑا چھرا۔

---

[1] ڈاب ـ کچا ناریل جس کا پانی یہاں کا مقبول مشروب ہے جیسے مغربی پاکستان میں لسی۔ (مدیر) [2] بندھک ـ ضامن

سورج نے سر ہلا دیا "یہ۔۔۔۔۔دستخط وستخط مجھے نہیں آتا جو کچھ لکھنا ہو خود ہی لکھ لیں۔"

جلیل میاں پھر دھیرے سے مسکرائے "اچھی بات ہے جب تم خود کہتے ہو تو ایسا ہی سہی۔" کاغذ پر دو تین سطریں لکھ کر انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا،

"ہاتھ ادھر لاؤ" انگوٹھے پر اچھی طرح سیاہی مل کر انہوں نے اس کے انگوٹھے کا نشان کاغذ پر لے لیا۔ پھر بولے "اب جاؤ۔ لیکن شادی میں مجھے ضرور بلانا۔"

اگر سورج کو حیرت کے اظہار کی عادت ہوتی تو شاید اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی لیکن چونکہ اس کی فطرت ہی میں یہ بات نہ تھی اس لئے اس کا اس پر زیادہ اثر نہ ہوا۔ جلیل میاں نے ذرا سا کہنے پر اسے پانچ سو روپے نکال کر دے دئے اس کے متعلق سوچنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا۔ سورج روپیہ دیکھتے ہی سب کچھ بھول گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے انگوٹھے کا نشان لگانے کی اہمیت کا بھی کوئی خیال نہ رہا۔ وہ ناممکن کو ممکن بنانے ہی تو آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا اگر رضامند نہ ہونگے تو اپنی زمین گروی رکھ دے گا۔

سورج کے چلے جانے پر جلیل میاں ہنسے "امین الدی!"

امین الدی کے چہرے پر ہلکی سی جنبش ہوئی۔ جلیل میاں نے انگوٹھے کا نشان لگایا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "معاملہ سمجھ رہے ہو تم تمہارے سوا میں کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ چاول کے بھوسہ میں اس کاغذ کو اچھی طرح دبا کر رکھ دو تاکہ پانچ ہی دن میں پانچ سال کا پرانا معلوم ہو۔ سمجھ گئے تم معاملہ؟"

امین الدی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں۔"

جلیل میاں کو یکایک غصہ آگیا۔ "تمہاری سمجھ میں کیوں آئے گا۔ پھر بھی ہر جگہ کہتے پھروگے کہ میں زمینداری کے کام سے واقف ہوں اور زمیندار کے سررشتہ کا نائب ہوں۔ چھی اچھی[1]! تمہارے بال کیا دھوپ میں سفید ہوئے ہیں؟"

مگر جلیل میاں اپنا لہجہ تبدیل کر کے ہنسے اور کہنے لگے "میں اگر چاہتا تو زیتون سے دھوم دھام سے بھی شادی رچا سکتا تھا مگر اب میں صرف نکاح کی رسم چپ چاپ ادا کرلوں گا۔ کیسے۔۔؟ اسے دیکھنے لئے ذرا ٹھہرے رہو۔ یوں اچھا ہی ہوا کہ اس کی شادی سورج سے ورنہ گاؤں والے لمبی چوڑی باتیں بناتے۔ مجھے پہلی تین بیویوں کا دیتے۔ مگر میں اب جو نکاح کروں گا تو لوگ بس یہ سمجھیں گے کہ میں پر رحم کھا کر اپنے قدموں میں پناہ دی ہے۔ یوں ابھی میری عمر ہی ہے جو خدا کی مرضی ہوتی ہے وہ بات ہو کر رہتی ہے۔ اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟!"

زیتون بھی سورج کے دل کی گہرائی کی تھاہ نہ پا سکی۔ اس بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی۔ لیکن اس کا چہرہ بالکل پتھر کی جذبات سے عاری تھا۔ خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ بستہ ہوئی گدڑی پر چاندنی کرچی کے پیڑ سے چھن چھن کر پڑ رہی تھی۔ رات آخری سمے، شب بھر جاگنے والی چڑیا بول رہی تھی "بو کو تھا، تھا، کو۔"

مگر زیتون کو عجب انسان سے واسطہ پڑا تھا۔ چہرہ مثل ہر جذبہ سے خالی ہر احساس سے ناآشنا۔۔ ایک کرخت بے حس بے پروا چہرہ۔ بازوؤں کی پوری قوت سے وہ اسے اپنے آغوش پناہ دیتا مگر لب و چشم نہ محبت کے پیامی بنتے نہ چہرہ سے پریم رس کی پھوٹتی نہ میٹھے بول منہ سے نکلتے۔ دلنوازی و دل ستانی کیا چیز ہو وہ بے حس تودۂ سنگ اس سے بالکل عاری دکھائی دیتا تھا۔ حیران تھی کہ اس جیسے انسان سے نباہ کیسے ہوگا۔ اس بت سے وہ کس طرح نبھائیگی۔

دھوپ کرچی کے پیڑ سے چھن چھن کر کمرے میں جھانک تھی۔ مرغیاں ٹاپے سے باہر نکل کر کٹ کٹ کٹ کٹ کر رہی تھیں دانے پانی کے لئے چیخ رہی تھیں۔ یہ تالاب میں نہانے کا وقت تھا آج سورج بستر چھوڑ کر اٹھنے کو تیار نہ تھا ہر روز وہ مرغ کی بانگ قبل ہی اٹھ جاتا تھا۔ زیتون کا حجاب اب تک ختم نہیں ہوا تھا مگر وہ بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے اس نے سورج کے قریب اسے جگایا۔ "یہ کیا؟ اٹھوگے نہیں بہت دن چڑھ آیا ہے۔"

"اب سویرے اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" سورج سادا جواب دیا۔ "چینی کا پرمٹ بند ہو گیا ہے۔" زیتون نے پریشان پوچھا۔ "کینو؟" (کیوں؟)۔

---

[1] "چھی اچھی" بطرف تضحیک و تنفر

"جلیل میاں کی مرضی - مجھ سے کہہ رہے تھے ملک میں چینی کی بڑی قلت ہے - اسی لئے حکومت نے ہم لوگوں کا پرمٹ بند کر دینے کا حکم دے دیا ہے۔ اب فی آدمی کے حساب سے راشن کارڈ پر جو کچھ بھی ملے۔"

زیتون کی پریشانی ختم نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا "پھر ہم لوگوں کا کیا ہو گا؟" اس وقت تک اس کا حجاب ختم ہو چکا تھا۔

"اب کیا ہو گا؟" سورج کی سرد آواز سنائی دی۔ "گڑ کی جلیبیاں آج کل کوئی نہیں کھاتا۔ چینی کی کمی کی وجہ سے اب جلیبیاں نہ بنا سکوں گا۔ لیکن میں نے سنا ہے یہ سب زمیندار کی شرارت ہے۔ حکومت کا حکم وکم کچھ نہیں ہے۔ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اس معاملہ کے سچ جھوٹ کا پتہ چل جائے گا۔ پھر میں سالے کے پوت کو دیکھ لوں گا۔"

تمام باتیں وہ بغیر کسی جوش اور غصہ کے یوں کہہ گیا جیسے وہ زیتون کو "بدیع الجمال" کی پوتھی پڑھ کر سنا رہا ہو۔ صرف تھوڑی دیر تک اس کی کرخت آواز گونجتی رہی۔

لیکن وہ جلیل زمیندار کو نہ دیکھ سکا۔ دو ماہ بعد ہی سورج کے نام عدالت سے سمن آ گیا۔ سورج نے دو سال قبل جلیل میاں سے ایک ہزار روپیہ قرض لیا تھا۔ اس کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے جلیل میاں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ روپیہ قسطوں میں ادا کرنے کی شرط تھی۔ لیکن آج تک اس نے ایک قسط بھی ادا نہ کر کے دستاویز کی شرائط کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ بات اتنی حیرت انگیز تھی کہ سورج کے پتھر جیسے سخت چہرے پر بھی اس کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی اور زیتون اس سے بھی زیادہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سورج کی زمین میں نئے دھان کی فصل یوں تیار کھڑی تھی جیسے کہہ رہی ہو فصل کاٹنے کا موسم آ گیا ہے۔ کرنوں کی طرح سنہری، ہوا کی لہروں کی طرح مست اور چاند کی چاندنی کی طرح خوبصورت دھان کے پودے لہرا رہے تھے۔ یہ دھان اوکھلی میں کوٹا جائے گا اس میں سے چاول نکلے گا۔ چاول میں دودھ اور چینی ملا کر میٹھا پکایا جائے گا۔ سب اسے کھائیں گے۔ دھان کے خوشے اور اس کے بھوسے میں مرغیاں چاول کے ٹوٹے دانے تلاش کرتی پھریں گی لیکن نگاہوں کے سامنے یہ سب کچھ بھی نہ ہو گا۔ اگر عدالت کی طرف سے ڈگری ہو گئی تو جلیل میاں قرض کے نام پر تمام فصل کاٹ لے جائیں گے، گھر کی چیزیں قرق ہوں گی۔ اگر اس کے بعد فاقہ کشی کی ایک طویل مدت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جلیبیوں کی دکان ختم ہو ہی چکی ہے۔

دھان کی فصل بھی ہاتھ نہ آئیگی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اور غصہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ سورج جلیل میاں کی بیٹھک کی طرف چل پڑا۔

"آپ نے یہ کیا کیا ــــ اتنی بڑی بے ایمانی!"

"روپیہ لے کر تم انکار کر رہے ہو۔ میرے پاس تمہارے انگوٹھے کا نشان لگا ہوا کاغذ موجود ہے۔ اس کے گواہ بھی ہیں۔ پورا پورا ثبوت موجود ہے۔"

"ثبوت کہاں ہے۔ میں نے تو ہزار روپیہ نہیں لیا ہے۔ صرف پانچ سو روپیہ لیا ہے۔ وہ بھی چھ مہینے کے وعدہ پر۔" جلیل میاں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "آنکھیں لال کرنے سے کچھ نہ ہو گا میاں، اب اگر تم مجھے جان سے بھی مارو تو عدالت تو بند نہ ہو گی۔ جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ بہتر ہے اپنا غصہ ٹھنڈا کر لو۔ سنو۔"

"کہئے۔"

جلیل میاں نے سورج کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچ لیا۔ پھر دھیرے سے مسکرائے "دماغ ٹھنڈا کر لو۔ تم نے زیتون سے شادی کر لی ہے۔ اس لڑکی میں جو بھی خوبی ہے اس کا تم اتنے دنوں میں اندازہ کر چکے ہو گے۔ بہت دنوں سے میں خود اس سے شادی کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تم میری راہ میں آ گئے، خیر۔ تم بھی آدمی ہو۔ تمہارا جی بہلا ہو چکا۔ اب یہ کہہ کر کہ تمہاری بیوی کا چال چلن ٹھیک نہیں یا ایسا ہی کوئی الزام لگا کر اسے طلاق دے دو۔ یہ بات تمہارے اور میرے درمیان ہی رہے گی۔ میں تمہارا معاملہ صاف کر دوں گا۔"

نفرت اور بے پناہ غصہ سے سورج کے پتھر جیسے سخت چہرے پر بھی اساڑھ کے آسمان کا رنگ چھا گیا جسے دیکھ کر جلیل میاں بھی سہم کر رک گئے۔ آہستہ سے بولے "ماتھا ٹھانڈا کورو[1] میری بات پر غور کر کے دیکھو۔ ورنہ دوسرا طریقہ تو موجود ہے ہی۔ اس وقت مجھے کون روکے گا؟"

دوسرے طریقہ کے معنی جیل اور سورج جیل جانے کے بعد...

اپنی حیرانی کو کم کرنے کی کوشش کئے بغیر سورج نے پوچھا "میری بیاہتا بیوی سے آپ نکاح کریں گے؟"

جلیل میاں ہنس پڑے "تمہاری بیاہتا بیوی! سب یہی سمجھیں گے کہ تم جاتے وقت بیوی کے کھانے کپڑے کے خیال سے پریشان ہو کر

---

[1] ماتھا = سر۔ ٹھانڈا = ٹھنڈا۔ کورو = کرو۔ "سر ٹھنڈا کرو" - یعنی غصہ تھوک دو۔

اسے تین طلاق دے گئے ہو۔ اس کے گواہ ہوں گے۔ ثبوت ......"
وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکے۔ ایک زور دار تھپڑ تڑاق سے ان کے گال پر پڑا اور قبل اس کے کہ جلیل میاں سنبھلیں اور آمین الدین چیختا ہوا وہاں تک پہنچے سورج بیٹھک سے باہر جا چکا تھا۔

زندہ رہنا ہوگا جیسے بھی ہو اسے زندہ رہنا ہوگا شیطان کے ساتھ شیطانی کر کے بے ایمانوں کے ساتھ مناسب کارروائی کر کے زندہ رہنا ہی ہوگا۔ سورج جیسے پاگل ہو چکا تھا۔ غم، غصہ، نفرت، حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کا ایک طوفان اس کے سینے میں ابل پڑا۔ اس کے چہرہ کا رنگ ہر لمحہ بدل رہا تھا۔

زیتون گھر کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ شوہر کو دیکھتے ہی وہ بے اختیار رونے لگی۔ بولی میں سب جانتی ہوں۔ مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ تمہاری دہائی ہے۔ میرے لئے اپنا مال، اپنی عزت، گھر، دوار، زمین جائداد کیوں گنوا رہے ہو؟

اس کے ساتھ ہی ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر بھی آ کر پڑا۔

زیتون نے بڑی مشکل سے اپنا چہرہ اٹھایا اور دیکھا کہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں جن میں ناقابلِ برداشت غصہ، پیار، نفرت اور درد و غم کی بے اندازہ پرچھائیاں جھلک رہی تھیں۔

کتنے حیرت کی بات تھی۔ پتھر جیسے بے حس اور بے جان چہرے پر آج یکایک اتنی حرارت کہاں سے آ گئی تھی۔ کیا اس کے چہرے کا سنگین سکوت، وہ ظاہری بے حسی اسی دن کے لئے بیدار ہونے کو مچل رہی تھی؟ اس پتھر کو آج کس احساس نے روح دے دی تھی؟ حیرت کے مارے زیتون کو اپنا رونا تک یاد نہ رہا!

★

بنتِ شیر

شیر افضل جعفری

شیر افضل کی زبان اس کی اپنی زبان ہے۔ ایک آزاد، مست الست ملنگ کی زبان۔ جو کسی بات، کسی اصول کی پروا نہیں کرتا۔ "اردوئے معلیٰ" سے کوسوں دور! ایک نئی زبان، نئی فضا، نئے مزاج، نئے تخیل کی طرف! اگر ہم اسے قبول کریں تو لامحالہ اس کی زبان کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ (مدیر)

یہ نوبہارِ زندگی　　دہی کی روحِ ناب ہے
یہ جامِ جارم انگبیں　　طہور کا جواب ہے
یہ جھانولوں میں نور کا　　ڑکا ڑکا چناب ہے
یہ رشکِ آبِ ناریل　　یہ غیرتِ گلاب ہے
دلوں کے ریگ زار کا　　یہ موتیا سحاب ہے
خمار کی آنچل پری　　جوانیوں کا خواب ہے
کرن کی پور پور کی　　یہ نور نور راب ہے
بدن میں اس کی بوند بھی　　سمندرِ شباب ہے
یہ کیوڑے کی چاندنی　　یہ حسن کی جناب ہے

یہ بنتِ شیر جھنگ کے
ملنگ کی شراب ہے
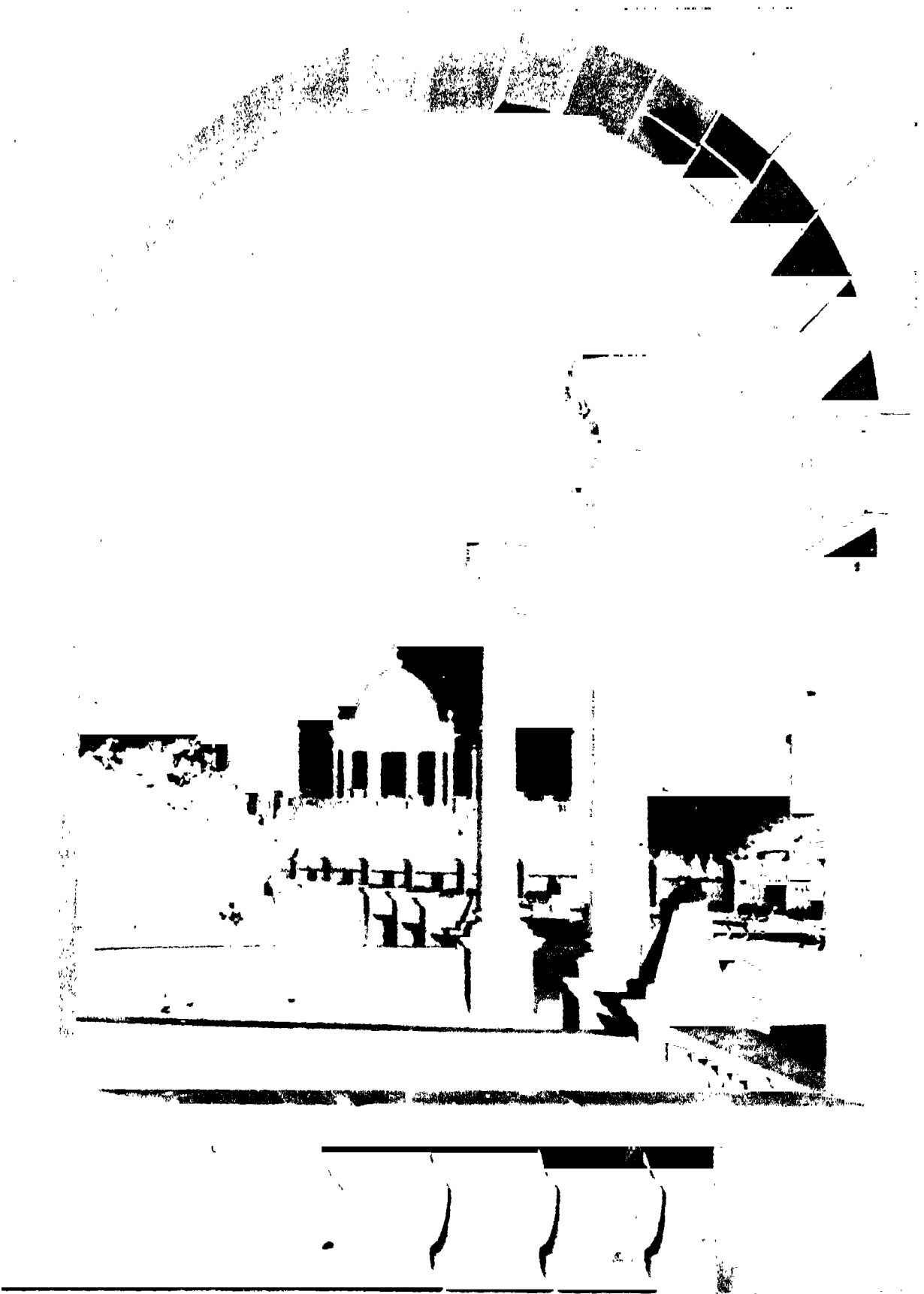
یہ کیسا طلسمی دریچہ کھلا ہے ؟
نیا عالم خلدوش رونما ہے

رنگین عکس : تشبیہہ الحسن

افسانہ:

ماضی کے جزیرے

محمد عمر میمن

آج شام بھی البیلی جوان تھی، کسی عروسِ نو کی مانند لجائی لجائی سی، شرمائی شرمائی سی، زرق برق!

چہل پہل بڑھ چکی تھی۔ اس حسین وقت تمہیں وہاں کتنے ہی شوخ، سرسراتے آنچل مل جائیں گے۔ شنیل، ایوننگ اِن پیرس، مسچیف کی تیز خوشبوؤں میں بسے ہوئے ملبوس۔ اور جب تم ان کے پاس سے گزرو گے تو بے اختیار تمہارے قدم کچھ عجیب اضطراری انداز میں ان کے تعاقب میں چل نکلیں گے۔ اور اس وقت تمہاری حالت لوہے کے اس ذرے سے مشابہ ہوگی جو غیر ارادی طور پر دیوانہ وار مقناطیس کی جانب لپکتا ہے۔

وہ بہت دھیمے قدموں سے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ شام ڈوب گئی۔ ایک موڑ پر اچانک اس کی نظریں اٹھیں اور کسی پر چپک گئیں۔ کیا یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب؟ کیا وہ کسی الف لیلوی کردار کی طرح طویل نیند سے تو آج بیدار نہیں ہوا؟

"نجمہ!" وہ حیرت، مسرت، اور اچنبھے کے ملے جلے احساس سے مغلوب ہو کر دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ تین سال بیت گئے، تین طویل سال۔ تین برساتیں، تین خزائیں۔ اور آج اچانک یوں چلتے چلتے، نجمہ اسے کسی موڑ پر یکلخت مل جائے گی، اسے اس کا گمان بھی نہ تھا۔

اس نے دیکھا وہ اب بھی جوان تھی، خوبصورت تھی، آج بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر ایک فرحت بخش ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔ اور آج بھی اس کے جسم کے حسین اور تیکھے خطوط کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا۔ روئے زمین پر وہ خالقِ کائنات کی مکمل ترین تخلیق ہے۔ جس کے عنبریں آنچل کے سائے میں اس کا فن خود اپنی اس حسین تکمیل کو دیکھ کر حیرت زدہ سا ہے۔ لیکن ان طویل تین سالوں میں وہ خود کس قدر بدل گیا تھا۔ اتنا کہ اگر کوئی اتنی مدت گزرنے کے بعد اسے دیکھتا تو پہچان نہ سکتا!

وہ چلتا رہا، اس کے قدموں کے نیچے زندگی اور شام رنگ اور البیلی سب جوان تھے۔ یکایک اسے محسوس ہوا وہ کہاں چلا آیا ہے۔ اس گم محفل میں وہ اپنے کو انتہائی مضمحل محسوس کرنے لگا۔ وہ ایک نیم روشن سا گوشہ تھا جہاں اس نے اپنی آواز میں مسرت پیدا کرتے ہوئے دھیمے سے پکارا۔ "نجمہ!"

وہ چلتے چلتے یکلخت یوں رک گئی جیسے اس کے اس فعل میں ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ وہ مڑی، ایک طائرانہ سی نظر لوگوں پر ڈالی۔ لیکن آنے والے لوگوں میں اپنا شناسا کوئی بھی نہ مل سکا، کوئی بھی تو نہیں۔ چند لمحات کے لئے وہ وہیں ٹھہر گئی، لیکن بے سود۔

وہ چلنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ کسی مانوس سے لہجے میں اسے سنائی دیا۔ "نجمہ"

وہ پھر بھی نہ پہچان سکی۔ تب اس نے آگے بڑھ کر کچھ مسرت، کچھ حسرت سے کہا، "تو کیا سچ مچ مجھے نہیں پہچان سکیں؟"

"نہیں" وہ مخاطب کی جانب بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "نہیں"

"میں — راہی"

"تم!" کسی قدر بے یقینی سے اس نے کہا۔

"ہاں، میں ہی!"

"لیکن وہ تو ایسا نہ تھا" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ "تم راہی ہو؟"

اس کی آواز میں اس کا تمام تر اضطراب چھلک رہا تھا۔ بھلا یہ شخص کیونکر راہی ہو سکتا ہے! راہی تو بہت خوبصورت تھا، جوان تھا۔ اس کی آنکھیں کتنی گہری اور چمکیلی تھیں۔ لیکن، لیکن یہ تو گدلائی ہوئی آنکھیں ہیں۔ اس نے بڑی بے اطمینانی اور عدم تیقن سے اس کی جانب دیکھا۔ بھلا وہ کیونکر اس انسان کو راہی سمجھ لیتی جس کے کپڑے میلے تھے، اور جس کی صورت ... اسے خواہ مخواہ قحط کا شکار معلوم ہوا وہ چہرہ — پھر اچانک اس کے تصور کے ریشمیں پردوں پر اب سے تین سال قبل کے

راہی کی صورت ابھرنے لگی۔ خد وخال تو وہی تھے۔ لیکن گزرتے ہوئے وقت کی شدت نے انہیں کملا دیا تھا۔ اور آواز، ــــ وہ تو بالکل راہی کی ہی تھی۔ جب اس نے اس چہرے میں اپنے راہی کو تلاش کر لیا تو وہ بولی۔

"لیکن تم یہاں کہاں؟"

"کیوں؟ کیا ہوا؟ یہ ایلگنی ہے نجمہ! یہاں کے آداب کے خلاف ہے، کسی سے یہ پوچھنا۔ اور تم، لیکن یہاں کیسے؟ اور ہاں، تم لاہور سے کب آئیں؟"

"پرسوں" وہ اپنی آنکھوں کے ارغوانی پیمانوں کو ذرا سا چھلکاتے ہوئے بولی۔

"کیا تم محض چند لمحات کے لئے میرے ساتھ کسی پرسکون سے گوشے میں چل سکو گی؟"

"کیوں؟"

"مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے..."

"تمہیں معلوم ہے میں شادی شدہ ہوں۔"

"ہاں، یہ تو مجھے اب سے تین سال پہلے بھی معلوم تھا۔"

وہ بڑی بے پروائی سے بولا۔

"میں تمہارے ساتھ نہ جا سکوں گی"

اس کی آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا اور چہرہ جذبات سے بالکل عاری۔

"شاید تم نہ بھولی ہوگی، اب سے صرف چند سال قبل میری ہر خواہش تمہارے نزدیک نہایت اہم ہوا کرتی تھی۔ آج میں اسی بنا پر تم سے اس بات کا خواہاں ہوں کہ تم میرے ساتھ کسی خاموش سے گوشے میں چلو۔"

"وہ دن!" اس نے ایک آہ بھری۔ "میں تم سے التجا کرتی ہوں انہیں بھول جاؤ۔ یوں سمجھو وہ دن تمہاری زندگی میں کبھی آئے ہی نہ تھے۔ بھول جاؤ کہ ہم کبھی آپس میں ملے بھی تھے۔" وہ کچھ اس طرح بولی جیسے راہی نے ان دنوں کا حوالہ دیکر کوئی بہت ہی اندوہناک کہانی یاد دلا دی ہو۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے جب کہ تم اچھی طرح جانتی ہو ایک زمانے میں ہم ایک دوسرے کو والہانہ چاہتے تھے۔"

"وہ ماضی تھا۔ اب حال اور مستقبل کی باتیں کرو۔ حال بہت ٹھوس حقیقت ہے، اس میں ماضی کی باتوں کا گزر ممکن نہیں۔ اور پھر شادی شدہ ہونے کی حیثیت سے میرے لئے مفید ہوگا کہ میں اپنے ماضی کی تمام یادوں کو اپنے ذہن سے کھرچ دوں۔ ان کاشانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقفل کر دوں جن سے ماضی کے نکل آنے کا امکان ہو۔" اس کی آواز میں اضطراب تھا اور اسے اپنا حلق سوکھتا محسوس ہوا۔

"نجمہ! میں تم سے محبت نہیں مانگنے آیا، جو شادی سے قبل تمہیں مجھ سے تھی۔ میں تو صرف اس کا متمنی ہوں کہ اپنے چند لمحات مجھے دیدو۔"

"چلو یوں ہی سہی" وہ اس کی خواہش کے آگے آخر کار جھک ہی گئی۔ لیکن اس کے جوان چہرے پر جو چند لکیریں ابھر آئی تھیں وہ برابر اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ یہ سب اپنی مرضی کے خلاف کر رہی ہے۔

دھیمے دھیمے وہ چلتے رہے۔ شام جوان تھی لوگ مسرور تھے لیکن وہ مضمحل تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، لوگ جب ایک جوان، خوبصورت عورت کو ایک میلے اور گندے کپڑوں میں ملبوس جوان کے ساتھ دیکھیں گے تو کیا خیال کریں گے، لیکن وہ مجبور تھی۔ اسے یہ بھی تو احساس تھا کہ اب سے چند سال پہلے یہی شخص اس کی امیدوں کا سہارا تھا، اس کی زندگی تھا، وہ اس سے والہانہ محبت کرتی تھی، اس نے اس کے ہمراہ مستقبل کے کتنے ہی سپنے سہانے دیکھے تھے۔ اور اپنی شادی کے بعد وہ زندگی کے کسی لمحے میں بھی اپنے شوہر سے خوش نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اسے اپنی شادی شدہ زندگی میں بھی برابر ہر لمحہ یاد کرتی رہی تھی۔ اور آج جب قسمت کے ان دیکھے راستوں پہ چلتے چلتے اچانک ایک موڑ پر اسے اپنی زندگی مل گئی ہے تو وہ اسے یونہی کیسے چھوڑ دے؟ نہیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ اور وہ اپنی ظاہری حالت سے بے خبر اس کے ہمراہ دنیا سے بیگانہ چلتی رہی، چلتی رہی۔

انہوں نے آہستہ سے اس تنہا پُرسکون فیملی روم کے پردے سرکائے اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ کیفے میں آوازوں کا شور تھا۔ کچھ دھیمے کچھ اونچے لہجہ میں باتیں کر رہے تھے وہاں کتنی ہی آوازیں تھیں۔ نقرئی، مدھم، پیاری پیاری، تیز، نرم!

لیکن وہ ان آوازوں میں بھی، ان سے بے خبر ایک دوسرے کو مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔

"نجمہ"

"ہوں، میں سن رہی ہوں۔ بولو، تم رک کیوں گئے؟ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ تمہیں تو مجھ سے بہت کچھ کہنا ہے نا؟" وہ یوں بولی جیسے اس کی آواز بہت دور سے آ رہی تھی۔ ماضی کے گم گشتہ جزیروں سے۔

اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اور ان تمام خیالات کا سلسلہ ایک واحد شخص پر آکر ختم ہو رہا تھا۔۔۔ راہی!

"نجمہ! مجھے یہ افسوس نہیں کہ تمہیں حاصل نہ کرسکا۔ اس کے باوجود مجھے تم سے اتنا ہی پوچھنا ہے، کہ جب تم مجھ سے محبت کرتی تھیں۔" وہ بہت ہی مدہم لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر بولا، اور نجمہ کا جی چاہا وہ چیخ کر کہدے۔

"راہی! مجھے تو یہی غم، یہی افسوس، یہی دکھ ہے۔ کاش تم مجھے حاصل کر لیتے۔ دیکھو تو، میں آج بھی غم اندوہ کی جیتی جاگتی تصویر ہوں!" لیکن وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ بلکہ بڑے ہی استہزائیہ لہجہ میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا کہا! میں تم سے محبت کرتی تھی؟ دیوانے نہ بنو راہی"۔

"اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش نہ کرو نجمہ! ہاں تمہیں مجھ سے محبت تھی"۔

اس کے چہرے پر ناگواری اور بے چینی کی علامات ابھر آئیں۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا اور کہا۔

"نہیں، ہرگز نہیں"۔

"نہیں، تمہیں مجھ سے محبت تھی۔ مجھ سے صاف کہہ دو نجمہ، تمہیں مجھ سے محبت تھی۔ میں نے کہا نا، مجھے اس کا افسوس نہیں کہ میں تمہیں حاصل نہ کرسکا۔ لیکن اب زندگی کی طویل اور تھکا دینے والی، افسردگیاں اور اداسیاں لق ودق صحراؤں کی مانند میرے آگے مجھے نگل جانے کو منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ اور اگر تم مجھے اس کا یقین دلا دو کہ تمہیں مجھ سے محبت تھی تو شاید اس اعتراف کے سہارے میں اپنی زندگی کو ان مایوسیوں میں بھی بسر کرلوں"۔

وہ کچھ بھی نہ بولی۔ وہ خاموش تھی۔ لیکن اس کے چہرے کے نقوش اس کا ثبوت تھے کہ اندر ہی اندر وہ کسی بات کا فیصلہ کر رہی ہے۔

"نجمہ!" وہ کچھ اس طرح بولا کہ اس کی آواز نجمہ کے دل میں دور تک اترتی ہی چلی گئی، اسے ایک جھرجھری سی آئی۔ اور وہ یکبارگی پھر اپنے خیالات کے طویل سلسلوں میں کھوگئی۔

"تم کچھ بھی نہیں بولتیں"؟

"کیا"۔ وہ ایک دم چونک کر بولی۔ اور پھر بڑی حقارت اور نفرت سے کہا۔

"نہیں، میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی، مجھے تم سے زندگی کے ہر لمحے میں شدید ترین نفرت رہی ہے، نفرت! اور وہ ہمدردی تھی محض ہمدردی جسے تم نے محبت نام دے لیا ہے"۔ لیکن اپنی آواز کا کھوکھلا پن اس سے بھی مخفی نہ رہ سکا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ لیے ساکت وصامت گھورتا ہی رہا مسلسل! یہ سب اس کی امیدوں کے خلاف کیسے ہوگیا؟ کیسے ہوگیا یہ سب؟ اس کا دل بڑی شدت سے اس کے سینے میں دھڑکنے لگا۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے۔

"تو تمہیں مجھ سے محبت نہ تھی؟"

"نہیں، ہرگز نہیں"۔ اس کی آواز بھرا گئی اور اس کے چہرے کی ساری مصنوعی کرختگی بھی اس کے اندرونی جذبات کو نہ چھپا سکی۔ اسے ایک کسک، ایک چبھن سی محسوس ہوئی۔ اور جب اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ اسے دور خلاؤں میں گھورتی معلوم ہوئی۔ کیا اسے راہی سے محبت نہ تھی؟ لیکن کتنی ہی بار اس نے کسی کی خواہش کی تھی۔ وہ کون تھا بارہا وہ باورچی خانے میں چولھے کے قریب بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتی تھی۔ کس کے خیال میں! وہ کون تھا؟ اور کتنی ہی بار یوں بھی ہوا تھا۔ اس کی اس وارفتگی کو دیکھ کر اس کے شوہر نے بے اختیار پوچھا تھا۔ "کیوں! کون یاد آرہا ہے تمہیں؟" اور وہ چونک کر جواب دیتی۔ "کوئی بھی تو نہیں"۔ اور کتنی ہی بار اس کے یوں کھوکھو جانے پر اس کے شوہر نے شدت سے سوچا تھا، شاید اس نے نجمہ سے شادی کرکے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے ایک ایسی لڑکی سے شادی کا کیا فائدہ جو کسی دوسرے کو چاہتی ہے۔ اپنی تمام تر روح کے ساتھ، اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ۔ لیکن وہ کون تھا اور کتنی ہی بار ننھی ڈیزی کے لئے نٹنگ کرتے وقت وہ ایک دم نٹنگ چھوڑ کر سلائیوں اور اون کو انگلیوں میں پھنسائے، گم سم سی، پہروں سامنے کھیلتی ہوئی ننھی ڈیزی کے نرم نرم خد وخال میں کسی گہری آنکھوں، بھرے بھرے چہرے والے اجنبی کا عکس تلاش کرنے لگتی۔ کتنی ہی بار اپنے سامنے اپنے شوہر کو بیٹھے دیکھ کر کتنی شدت سے اس اجنبی کی تمنا کی تھی۔ کاش اس کے شوہر کی جگہ وہ اجنبی ہوتا! اور بعض اوقات جب اس کے شوہر کے تنومند ہاتھوں کا ہالہ اس کے اپنے نازک بدن کے گرد سخت ہو جاتا تو وہ اس لمس اور اس میٹھے میٹھے درد کی لذت، سرور اور نشے میں بے اختیار شدت سے چاہتی کاش یہ ہاتھ، یہ بانہیں، اس اجنبی کی ہوتیں! پھر وہ اجنبی کون تھا، وہ جو اس کی زندگی میں بڑے دبے قدموں سے چپکے سے چلا آیا تھا۔

"تو تم اس کا اقرار نہیں کروگی؟" وہ بڑی مشکل سے صرف اسی قدر کہہ سکا۔

کس طرح ! جبکہ میں نے تم سے کبھی محبت ہی نہیں کی تم سنگ دل ہو۔ بے جان بے حس پتھر ہو، میں ایک پتھر سے کس طرح محبت کر سکتی ہوں؟"
اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایک سرد مسکراہٹ جو اس نے اس اجنبی سے اپنے جذبات کو پوشیدہ رکھنے کے لئے زبردستی اپنے ہونٹوں پہ پھیلائی تھی۔

تب وہ دھیمے سے اٹھا۔ آخری بار بھرپور نظروں سے چند لمحات کے لئے اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر تیزی سے فیملی روم کے مخملیں پردے سرکاتا ہوا باہر نکل گیا۔

بڑی شدت سے اس کا دل دھڑکا، تڑپا۔ لیکن اجنبی تو جا چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا ایک پھانس سی اس کے دل میں کھٹک رہی ہے۔

وہ سوچتی ہی رہی، اس کے چاروں طرف کتنی ہی آوازوں کا ایک جال سا بنا ہوا تھا۔ لیکن اس اجنبی کی آواز ان میں کہاں تھی۔ وہ ان سے بے خبر اپنے خیالات میں غرق رہی۔ اس نے اپنا سر میز پر رکھ دیا اور دل سے کہا: دنیا بہت سونی ہے۔

اس کا ذہن حال کی دبیز ردا کو چوری چوری سرکاتے ہوئے برسوں پہلے ماضی کے جزیروں میں پہنچ گیا جب "وہ" اس کی زندگی کا سب کچھ تھا۔ اور جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ تب بھی وہ اسے نہ بھول سکی تھی۔ جیون کے سفر میں چند راہی ایسے بھی ملتے ہیں جو محض چند لمحات کے قرب کے بعد صرف چند یادیں ہی دے کر چلے جاتے ہیں اور لوگ بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح زندگی کی ان گزرگاہوں پر جانے والے ہمسفروں کے نقوش ہی تلاش کرتے کرتے اپنی زندگی بِتا دیتے ہیں۔ لیکن اس کا راہی اس کا ہمسفر تو لوٹ بھی آیا تھا۔ پھر کیوں اس نے اسے اپنانے سے انکار کر دیا۔ وہ جس کی تلاش میں وہ بہت دور تک نکل آئی تھی ! اور جب ایک شام وہ اچانک اسے ایک موڑ پر مل گیا تو اس نے اسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا ! کیسی محبت تھی؟ لیکن اسے تو اس سے نفرت تھی ! اس نے اب سے چند لمحات پیشتر ہی اس نفرت کا اعتراف کیا تھا۔ نہیں، نہیں۔ وہ تو ان طویل بچھتاؤوں کا اثر تھا، جو زندگی نے اسے اس اجنبی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر کے دیئے تھے، اور اس افسردگی اور ان پچھتاووں نے مل جل کر اس کے احساس میں زہر گھول دیا تھا۔

شاید وہ یونہی ساکت و خاموش تنہا تنہا اس سے محبت کرتی رہی۔ کتنی ہی بار اس نے اپنی گھائل روح کو تسکین دینے کے لئے اُسے بھول جانا چاہا تھا۔ لیکن وہ اسے بھول نہ سکی تھی، وہ گہرا زخم تو اپنی تمام تر کسک اور چبھن کے ساتھ اس کے دل میں موجود تھا۔ سالہا سال یونہی گزر جائیں گے، دھیمے دھیمے، ہولے ہولے۔ لیکن وہ اس اجنبی کو نہ بھول سکے گی۔ وہ آگ جو ہمیشہ اس کے دل میں اپنی پوری تندی کے ساتھ فروزاں رہی تھی اب بھی رہے گی۔ اور بھرے بھرے جسم والے چمکیلی گہری آنکھوں والے اس انسان کی شبیہ اس کے ذہن سے لمحہ بھر بھی جدا نہ ہو سکے گی۔

اس نے اپنا سر میز سے اٹھایا۔ اس امید میں کہ وہ اب بھی اس کے سامنے بیٹھا اسے گہری گہری نظروں سے گھور رہا ہوگا۔ لیکن اسے یاد آیا۔ اب سے چند لمحات پیشتر ہی وہ جا چکا تھا۔ ٹوٹے دل اور زخمی مسکراہٹ کے ساتھ !

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور طشتری میں پڑے بل پر چند نوٹ کانپتے ہاتھوں سے رکھتے ہوئے کیفے سے باہر نکل آئی۔ سڑک پر گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ وہ ایک قدم بھی نہ چل سکی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کا دل بھاری تھا اور اس کی روح شدت سے جل رہی تھی۔

ٹیکسی بڑی تیزی سے اپنے پیچھے جوان شام کے جھرمٹ میں سجی ہوئی جوان اٹھلاتی کو اس کی تمام روشنیوں اور رعنائیوں کے ساتھ چھوڑتی چلی جا رہی تھی۔

اور ــــ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے اس کی روح شدت سے پکار اٹھی " راہی"

مدت کے رکے ہوئے صبر و ضبط کے بند اپنی پوری شدت سے چرچرا کر ٹوٹ گئے۔ اس نے رومال اپنی آنکھوں پہ رکھ لیا، جو اعتراف کے آنسوؤں سے تر تھیں اور سوچا، کاش ! اعتراف کے آنسو "ان" کی موجودگی ہی میں نکل آئے ہوتے !

★

مشرقی پاکستان

دیارِ رنگ

ثروت خاں

گرمی پورے شباب پر تھی۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اُمس کی وجہ سے ایک ایسی بے چینی محسوس ہو رہی تھی کہ کسی کل چین نہیں تھا۔ کچھ دیر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا پھر ریڈیو لگا دیا۔ کان میں میٹھی میٹھی آواز آنا شروع ہوئی۔ مشرقی پاکستان کے ملاح کا گیت ہو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا:

"آخر بنگالی گانوں میں اتنی لطافت کیوں
ہوتی ہے کہ انسان زبان سمجھے بغیر ان سے لطف
اٹھانے لگتا ہے۔ کیا بنگلہ زبان اور موسیقی ایک
ہی چیز کے دو نام ہیں"؟

اس سے پہلے بھی بارہا میرے ذہن میں یہ خیال آیا۔ اور میں اس پر غور کرتا رہا۔ پھر گانے ہی پر کیا موقوف، بنگالی شاعری بھی لطیف ہوتی ہے۔ صرف بنگلہ لب و لہجہ ہی رسیلا نہیں ہوتا۔ بنگلہ شاعر کا تخیل بھی رسیلا ہوتا ہے۔

میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ موسم میں اچانک تبدیلی ہونا شروع ہو گئی۔ فضا گرد آلود ہو گئی، ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے، دور سے بادل امڈتے نظر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور چند لمحوں میں بادل برس پڑے۔ بارش کی رم جھم، ٹھنڈی ہوا، اور فضا کی خنکی نے موسم بالکل بدل دیا۔ اب بے چینی کی جگہ فرحت اور تازگی نے لے لی۔ جسم میں ایک نئی جان آ گئی، خوابیدہ آرزوئیں بیدار ہو گئیں۔ طبیعت کی جولانی اور سرمستی کہہ رہی تھی:

یارو رباب اٹھاؤ کہ بوندوں کی تال پر
مدح شرابِ کہنہ و حسنِ جواں کریں

موسم کی اس تبدیلی نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی طبیعت اور ان کی شاعری اور ادب میں لطافت اور شیرینی کا غلبہ کیوں ہے۔ جس سرزمین میں ہر طرف لہلہاتے کھیت ہوں، باغ ہوں، جنگل ہوں، بل کھاتے دریا ہوں، جہاں گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہوں، دریاؤں میں کشتیاں اور آسمان پر ابر خراماں کے سفینے ہوں، وہاں کے لوگوں کی طبیعت میں رنگینی اور لطافت نہ ہوگی تو اور کن میں ہوگی؟

مشرقی پاکستان کے موسم اور مناظر نے وہاں کے باشندوں کے دل و دماغ کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال دیا ہے۔ دنیا میں ایسے ملک کم ملیں گے جہاں کے باشندوں کی طبیعت پر اپنے ملک کے مناظر اور ماحول کی معجزانہ سحر کاریوں کا اتنا گہرا اثر ہوا ہو۔

مشرقی پاکستان کے متعلق بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پختہ ہو گیا ہے کہ گو اس سرسبز و شاداب خطہ میں قدرت کی رعنائیوں اور مناظر کی کمی نہیں لیکن ان میں تنوع کا فقدان ہے۔ ہر جگہ ایک ہی قسم کا نظارہ دیکھ کر دل جلد ہی سیر ہو جاتا ہے۔

یہ بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہوں نے مشرقی پاکستان کے صرف ان علاقوں کو دیکھا ہے جہاں آمد و رفت کی سہولتیں ہیں۔ اگر وہ عام راستوں سے ہٹ کر "خلوت کوہ و بیاباں" کا رخ کرتے تو معلوم ہوتا کہ پاکستان کے اس دلفریب خطہ میں کس قدر تنوع ہے۔ سندربن کے ساحلی جنگل، چاٹگام کا پہاڑی علاقہ، کوکس بازار کا طویل دلفریب ساحل، سلہٹ کی اونچی نیچی پہاڑیاں اور چائے کے باغات اور میمن سنگھ میں مدھوپور کا جنگل، ایسے مقامات ہیں جہاں تنوع اور دلکشی کا پورا پورا سامان فراہم ہے۔

مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی دلکشی وہاں کے دریا ہیں۔ یہ دریا کہیں وسیع میدانوں اور کھیتوں میں سے ہو کر گزرتے ہیں اور کہیں جنگلات میں سے۔ بعض جگہ دریا پہاڑوں اور تنگ گھاٹیوں سے بھی گزرتے ہیں جہاں ان کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔

عہدِ عباسی میں بصرہ کا علاقہ نہروں کی کثرت کی وجہ سے ضرب المثل بن گیا تھا کہا جاتا ہے کہ "یہاں ہر تیر پرتاب کے فاصلہ پر ایک نہر موجود تھی"۔ ممکن ہے بصرہ کے علاقہ میں نہروں کی اس کثرت کے متعلق مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن مشرقی پاکستان کے ایک بڑے حصے کے متعلق یہ کہنا کہ وہاں قدم قدم پر ندی نالے موجود ہیں قطعی مبالغہ نہیں۔ بصرہ کے علاقہ میں نہروں کا شمار ایک لاکھ بیس ہزار تک کیا گیا تھا۔ اب یہ کام موجودہ جغرافیہ دانوں کا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے ندی نالوں کی صحیح تعداد کا تعین کریں۔

اس صوبہ کے سب سے بڑے دریا برہمپترا اور گنگا ہیں۔ چاٹگام کے دریاؤں کے علاوہ باقی تمام دریا یا تو ان ہی دونوں دریاؤں میں مل جاتے ہیں یا ان ہی کی شاخیں ہیں۔ برہمپترا اور گنگا کے دو بڑے دھارے بھی گوالندو کے مقام پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور اس طرح ایک نیا دریا پدما وجود میں آتا ہے۔ دنیا کے دو عظیم دریاؤں کا پانی یکجا ہو جانے کے بعد "پدما" میں پانی کی مقدار بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور دریا کا پاٹ دو میل تک پھیل جاتا ہے۔ ساٹھ ستر میل بہنے کے بعد چاندپور کے قریب ایک اور بڑا دریا میگھنا، آسام اور سلہٹ کے معاون دریاؤں کا پانی لے کر پدما سے آملتا ہے۔ اس طرح وہ عظیم دھارا ظہور میں آتا ہے جو پانی کی فراوانی کے لحاظ سے شاید دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ میگھنا چاندپور کے قریب دریا سے زیادہ سمندر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اس کا عرض آٹھ میل ہے۔ دریائے سندھ جس قدر پانی سمندر میں لاتا ہے میگھنا کے آخری حصہ میں پانی کی مقدار اس سے چار گنا زیادہ ہوتی ہے۔

چاندپور کے بعد میگھنا کا پانی چھ سات شاخوں میں تقسیم ہو کر ایک سو اکسٹھ میل کے بعد سمندر میں مل جاتا ہے۔ میگھنا کی طرح برہمپترا اور گنگا کا پانی بھی بے شمار شاخوں میں تقسیم ہو کر، دو ڈھائی سو میل، بہنے کے بعد خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ اور اس طرح وہ ڈیلٹا وجود میں آتا ہے جو دنیا کا سب سے بڑا ڈیلٹا ہے۔

برہمپترا اور گنگا جب مشرقی پاکستان کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو ان کا پاٹ معاونوں کی وجہ سے بہت چوڑا ہو جاتا ہے اور جگہ جگہ جزیرے بن گئے ہیں۔ یہ جزیرے آباد ہیں اور ان میں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ ان کی وجہ سے دریاؤں کی دلکشی میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ ان میں سب سے بڑے وہ جزیرے ہیں جو میگھنا کی شاخوں سے وجود میں آگئے ہیں۔ ان میں دکھن شاہباز پور کا جزیرہ تقریباً چھ سو مربع میل اور سندویپ کا جزیرہ ۲۸۰ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔

مشرقی پاکستان کی بیشتر دریاؤں میں پانی کی کثرت کی وجہ سے دن رات کشتیاں اور اسٹیمر چلتے رہتے ہیں۔ ان میں مسافر بھی سفر کرتے رہتے ہیں اور ملک کی ضرورت کا سامان بھی ادھر سے ادھر پہنچایا جاتا ہے۔ صوبہ کے نظام مواصلات میں ریلوں اور سڑکوں سے زیادہ، ان دریاؤں کو اہمیت حاصل ہے۔

معاشی زندگی میں ان دریاؤں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اپنی جگہ ہے لیکن ان کی وجہ سے یہاں کے قدرتی مناظر میں ایک ایسی دلکشی پیدا ہو گئی ہے جو شاید ساری دنیا میں صرف مشرقی پاکستان ہی سے مخصوص ہے۔ تا حدِ نظر پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیت اور جنگل، بل کھاتے ہوئے دریا، سطحِ آب پر کشتیوں کی روانی، مانجھیوں اور ملاحوں کے پُرسوز گیت، اور ٹھنڈی چاندنی راتیں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتی ہیں جس نے غور و فکر کرنے والوں کے لئے ہمیشہ مہمیز کا کام کیا ہے۔ ٹیگور[1] کی شاعری کو اسی ماحول نے جنم دیا اور جسیم الدین بھی اسی قدرتی ماحول کی پیداوار ہے۔ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی طبیعت میں جو رنگینی، ان کے گیتوں میں جو مٹھاس اور ان کی شاعری میں جو دلکشی ہے وہ بڑی حد تک اسی ماحول کی پیداوار ہے۔

مشرقی پاکستان کے قابلِ دید مقامات میں "سندربن" منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ جنگل دریائے گنگا اور پدما کے ڈیلٹے کے جنوبی حصہ میں واقع ہیں اور تقریباً چار ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک تہائی حصہ بھارت میں ہے اور دو تہائی مشرقی پاکستان میں۔ ضلع کھلنا میں دو ہزار مربع میل اور ضلع باقر گنج میں آٹھ سو مربع میل۔ یہاں سندری نام کا درخت کثرت سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان جنگلات کا نام "سندربن" پڑ گیا ہے۔ بعض مقاموں پر جنگل اتنے گھنے ہیں کہ سورج کی شعاعیں بھی زمین تک نہیں پہنچ سکتیں۔ جنگل کی سطح کہیں سمندر کی سطح سے کافی بلند ہے اور کہیں اتنی نیچی کہ جب

---

[1] ٹیگور نے اگرچہ رہائش کلکتہ میں اختیار کر لی تھی لیکن ان کا بچپن مشرقی پاکستان کے ماحول میں گزرا اور ایک جگہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان کو شاعر بنانے میں یہاں کے قدرتی مناظر کو بڑا دخل ہے۔

سمند چڑھتا ہے تو ہر طرف پانی پھیل جاتا ہے اور اترتا ہے تو اپنے ساتھ تمام گھاس وس کو بہالے جاتا ہے۔ اس موقع پر کشتی میں سفر کرنے والے درختوں کے نیچے ے زمین کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ سکتے ہیں۔ زمین پر سبزہ وراس پر درختوں کے تنے ہزاروں ستونوں کی طرح بڑا دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ "سندری" پیڑوں کی جڑوں سے نکلے ہوئے کانٹے اتنے سخت اور گھنے وتے ہیں کہ شکاریوں کے لئے جنگل میں زیادہ دور تک جانا آسان نہیں۔ زد شیر کو بھی ان کانٹوں کی وجہ سے نقل و حرکت میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

سندربن اپنی دلکشی اور انفرادیت کے لحاظ سے مظاہر قدرت الیسا نمونہ ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ایک پاکستانی سیاح نے ن الفاظ میں سندربن کا بڑا جامع نقشہ کھینچا ہے:

"سندربن جنگلی جانوروں کا دلپسند مامن ہے
اور ایک ایسی حسین جگہ ہے جو سیاحوں اور فن کاروں
کے دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ماہر
حیوانات، ماہر نباتات اور فن کاروں کا دار العلوم ہے۔
میں نے دنیا میں جو حسین ترین مقام دیکھے ہیں ان میں
ایک سندربن بھی ہے۔ یورپ کے ڈیر پارکوں
(DEER PARK) سے یہ جگہ زیادہ حسین ہے۔
جنگلوں کی کھاڑیاں اور سانپ کی طرح بل کھاتے
آبی راستے یونان کی آراستہ پیراستہ نہروں سے زیادہ
اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ زمین کے وہ خوبصورت مخروطی
ٹکڑے جو خلیج بنگال میں دور تک چلے گئے ہیں اور
جن کے نام ٹائیگر پوائنٹ، منکی پوائنٹ
(MONKEY POINT) اور ہیرن پوائنٹ
(HERON POINT) ہیں کسی مشہور فن کار
کی ڈرائنگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان مقاموں کو مذکورہ
بالا نام اس لئے دیئے گئے ہیں کہ وہاں شیروں،
اور بندروں وغیرہ کی کثرت ہے۔

سندربن کے جنگلوں کا جب ان میں سے
گذرنے والی کھاڑیوں میں عکس پڑتا ہے تو بڑا ہی
حسین منظر سامنے آجاتا ہے۔ ان جنگلوں میں ہرنیوں کا اپنے
بچوں کو لئے پھرنا، شیر کا شان بے نیازی سے ٹہلنا
اور مگرمچھوں کا ریت پر لوٹنا ایسے مناظر ہیں
جو عام ہیں"

سندربن کے مظاہر قدرت میں وہ آوازیں بھی ہیں جو "باریسال کی توپوں" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ آوازیں بارش کے زمانہ میں دریائی کے پانی اور مدوجزر کی موجوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہیں اور شہر باریسال تک میں سنی جاسکتی ہیں۔

جنگلوں میں اس علاقہ کے قدیم اور اصلی باشندے اب بھی موجود ہیں اور مسافر کشتیوں سے جاتے ہوئے دور فاصلہ پر ان کے گھر اور گاؤں دیکھ سکتے ہیں۔

سندربن جنگلی جانوروں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ بنگال کے مشہور شیر (TIGER) کا وطن یہی سندربن ہے۔ کالے ناگ اور اژدھوں کی کثرت ہے۔ شکار کے عام جانوروں میں چیتل، ہرن، اور سانبھر وغیرہ عام ہیں۔ بندر بھی بہت پائے جاتے ہیں۔ "ٹھکونا" نامی جزیرہ، جو ایک کشادہ دریا کے درمیان واقع ہے، ہر قسم کے جانوروں کا بہترین مامن ہے۔ اس کے قریب ہی جزائر "جاپھا" ہیں جو بنگال کے رائل ٹائیگر کا گھر ہے اور جہاں ہرن اور شیر ساتھ ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔

سندربن کے جنگل پاکستان کی ملکی معیشت میں بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ کھلنا کا اخباری کاغذ ان ہی جنگلوں کی ایک لکڑی گیوا سے تیار کیا جاتا ہے۔ سندری لکڑی مکانوں، کشتیوں اور چھتری کے دستے بنانے میں کام آتی ہے

چند سال قبل تک آمد و رفت کی سہولتیں نہ ہونے سے سندربن ارض ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن جب سے اس کے شمالی کنارہ پر چالنا کا بندرگاہ قائم ہو گیا ہے۔ جہازوں اور کشتیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے اور اگرچہ سیاحوں کے لئے جنگلوں میں ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں پھر بھی وہ مشرقی پاکستان کے دوسرے حصوں سے چالنا آتے جاتے ہوئے ان عظیم جنگلوں کے درمیان سے گزر سکتے ہیں اور یہاں کے مناظر سے بہت کچھ لطف اٹھا سکتے ہیں۔

سندربن کا موسم معتدل ہے۔ اپریل سے ستمبر تک اوسط درجۂ حرارت ۸۳ اور ۸۵ درجہ کے درمیان رہتا ہے۔ سردیوں میں درجۂ حرارت ۶۷ تک گر جاتا ہے۔ بارش کا اوسط ۸۳ انچ سالانہ ہے۔

آیئے، اب ہم ایک اور عظیم الشان جنگل کی سیر کریں یا چوپہ

کا جنگل جو تقریباً چار سو مربع میل پھیلا ہوا ہے۔ یہ ضلع ڈھاکہ کی شمالی
حد سے شروع ہوتا ہے اور شہر میمن سنگھ کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔
جنوب سے شمال کی طرف ۴۵ میل لمبا اور مشرق سے مغرب کی طرف چھ
سے دس میل تک چوڑا ہے جنگل کی سطح گردو نواح کے میدانوں سے ۴۰
فٹ تک بلند ہے۔ اس بلندی کی وجہ سے یہ علاقہ ہر قسم کے سیلابوں سے
محفوظ رہتا ہے۔

مادھو پور کا جنگل اپنی ساخت میں سندر بن سے قطعی مختلف ہے
اور اپنی دلکشی میں منفرد۔ اس جنگل کے وہ حصے خاص طور پر بڑے حسین
ہیں جہاں پانی اور پتلی ندیاں گہری گہری گھاٹیوں میں سے گذرتی ہیں جن
کے دونوں جانب بلندیوں پر گھنے جنگل ہیں۔ یہاں سندر بن کی طرح جھاڑیاں
نہیں بلکہ لمبے لمبے درخت ہیں۔ جن کے نیچے گھاس کی کثرت ہے۔ یہ جنگل ہمالیہ
کی ترائی کے جنگلوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس میں شیر اور تیندوے
پائے جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہرن، چیتل، سانبھر
اور جنگلی سور وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں۔

اگرچہ ضلع میمن سنگھ میں سب سے دلکش مقام یہی جنگل ہے لیکن
شمالی سرحد پر "سوسنگ" کی پہاڑیاں بھی اپنے اندر کچھ کم دلکشی نہیں رکھتیں۔
یہ گھنے خاردار جنگلوں سے پٹی پڑی ہیں۔ شیر اور جنگلی سوروں کے علاوہ
ہاتھیوں کی بھی کثرت ہے۔ اور سلہٹ! اس کی ہری بھری فضا میں بھی
ایک عجیب کیفیت ہے۔ ضلع سلہٹ مشرقی پاکستان کے ان حصوں میں
سے ہے جو قدرتی ساخت کے لحاظ سے دوسرے حصوں سے کسی قدر مختلف
ہیں۔ نیچی نیچی پہاڑیاں جن میں جنوب کی ایک پہاڑی گیارہ سو فٹ بلند ہے
اور جھیلوں کی کثرت اس ضلع کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ جھیلوں
کی کثرت کی وجہ سے اگر ہم سلہٹ کو "جھیلوں کا ضلع" کہیں تو غلط نہ
ہوگا۔ یہ جھیلیں اگرچہ دلدلی نوعیت کی ہیں۔ لیکن ان میں مچھلیوں
اور آبی جانوروں کی کثرت ہے، اور کشتی رانی کی جا سکتی ہے۔ اگر ان جھیلوں
کو سیر و سیاحت کے نقطۂ نظر سے ترقی دی جائے تو ان میں بڑی دلکشی
پیدا کی جا سکتی ہے۔

سلہٹ کو چائے کے باغوں پر ناز ہے۔ جو اس میں انفرادی شان
پیدا کرتے ہیں یہ باغ جو پہاڑوں کی ڈھلانوں پر واقع ہیں اپنے اندر ایسی دلکشی
رکھتے ہیں جو پہاڑوں اور کھیتوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہ باغ سو سے زائد ایکڑ میں
پھیلے ہوئے ہیں۔

پھر سلہٹ کی بے مثل نارنگیاں ہیں کے باغ پہاڑوں کی ڈھلانوں
اور میدانوں پر پھیلے نظر آتے ہیں کیا دلکش ہیں؟ جب نارنگی کے پیڑوں
میں پھول آتا ہے تو ساری فضا بھینی بھینی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے اور
جب نارنگیاں پک جاتی ہیں تو ان کا منظر جنت نگاہ کا کام کرتا ہے۔
سلہٹ کے بعض حصوں میں گرم پانی کے چشمے بھی پائے
جاتے ہیں۔

چاٹگام کا علاقہ مشرقی پاکستان کا کشمیر یا سوئٹزرلینڈ ہے۔
اگر پاکستان کے مشرقی بازو میں چاٹگام کے سوا اور کوئی خوش منظر جگہ
نہ ہوتی تو بھی یہاں کے باشندے اس ضلع کے مناظر پر بجا طور پر
فخر کر سکتے تھے۔

چاٹگام کا علاقہ ضلع چاٹگام اور چاٹگام کے پہاڑی علاقہ
پر مشتمل ہے مجموعی رقبہ ۸½ ہزار مربع میل اور آبادی ۲۶ لاکھ ہے۔
پاکستان کا یہ خطۂ جنت نظیر ویلز کے برابر، شمالی آئرلینڈ سے بڑا اور
مشہور عالم لبنان کے دوگنے سے زیادہ وسیع ہے۔ وادیٔ کشمیر بھی جہاں
سری نگر، بارہ مولا، گلمرگ، پہلگام اور کلگام جیسے خوش منظر مقامات
اور ڈل جیسی حسین جھیل موجود ہے، رقبہ میں چاٹگام ہی کے برابر ہے
سوئٹزرلینڈ کا رقبہ چاٹگام سے صرف دوچند ہے۔ اگرچہ یہاں برف پوش
پہاڑ نہیں ہیں لیکن یہ کمی موجیں مارتے ہوئے سمندر اور حسین ساحل نے
ایک حد تک پوری کر دی ہے۔

سندر بن اور مادھو پور کے جنگل اور سلہٹ اور میمن سنگھ کے
مناظر جن خصوصیات کے حامل ہیں چاٹگام کا پہاڑی علاقہ ان سے قطعی
مختلف خصوصیات رکھتا ہے۔ پورے علاقہ میں ندیوں اور پہاڑوں
کا جال بچھا ہوا ہے۔ پہاڑ گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اور
عمودی ساخت کی وجہ سے ان پر چکردار پگڈنڈیوں کے ذریعہ ہی چڑھا
جا سکتا ہے جو جنگلوں میں سے ہو کر گزرتی ہیں۔ لیکن یہ پہاڑ زیادہ
بلند نہیں۔ ان کی سب سے اونچی چوٹی کیوکرا ڈانگ ہے۔ جس کی
بلندی چار ہزار ۳۴ فٹ ہے۔ یعنی ایبٹ آباد کے برابر۔

فینی، کرنا پھلی، سنگو اور ماتامہوری یہاں کی خاص
خاص ندیاں ہیں۔ پہاڑی علاقہ میں یہ ندیاں قدم قدم پر پیچ و خم
کھاتی ہوئی پہاڑوں کے درمیان سے گذرتی ہیں۔ ان میں کشتی رانی
کرنے والوں کو ایسے ایسے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہیں جو

پورے پاکستان میں کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔

پہاڑوں میں متعدد خوبصورت جھیلیں اور تالاب ہیں۔ ان میں راما کری تانگ پہاڑی کے مشرق میں ایک نہایت حسین پہاڑی جھیل واقع ہے۔ یہ جھیل ایک میل لمبی اور دو فرلانگ چوڑی ہے۔ اس میں مہاشیر قسم کی مچھلیوں کی کثرت ہے۔ جب اس جھیل تک سڑک بن جائے گی اور مسافروں کو سہولتیں میسر آجائیں گی تو یہ جگہ صوبہ میں سیر و سیاحت کے مقبول ترین مرکزوں میں شمار ہونے لگے گی۔

پہاڑی علاقہ میں کئی قسم کے بانس ہوتے ہیں اور طرح طرح کی جڑی بوٹیوں کی کثرت ہے۔ یہاں ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی ہے جو چھپر ڈالنے کے کام آتی ہے۔ کرنافلی کا کارخانہ یہاں کے بانسوں ہی سے کاغذ تیار کرتا ہے۔

پہاڑی علاقے کے جنگلوں میں ہاتھی، شیر، تیندوے اور ریچھوں کی کثرت ہے۔ جنگلی بھینسا بھی پایا جاتا ہے۔ سانبھر اور چیتل بھی عام ہیں۔

پہاڑی علاقے کا موسم ٹھنڈا ہوتا ہے۔ بارش کا اوسط ۹۴ انچ ہے۔ دسمبر اور جنوری میں بارش نہیں ہوتی۔ فروری سے مئی تک ۱۹ انچ بارش ہوتی ہے، پھر جون سے اگست تک ہر ماہ اوسطاً ۱۸ انچ بارش ہوتی ہے۔ ستمبر میں گیارہ انچ اکتوبر میں سات اور نومبر میں دو انچ کا اوسط ہے۔

کرنافلی کا عظیم منصوبہ اسی علاقہ میں زیر تکمیل ہے۔ اس منصوبہ کے تحت اس شہر چاٹگام سے ۵۲ میل دور کپتائی کے مقام پر، جہاں دریائے کرنافلی ایک گھاٹی سے گزرتا ہے۔ اس گھاٹی کی شمالی چوٹی چودہ سو فٹ اور جنوبی ساڑھے آٹھ سو فٹ بلند ہے۔ ایک بند بنایا جا رہا ہے۔ یہ بند ایک ہزار آٹھ فٹ لمبا اور ایک سو تریپن فٹ اونچا ہوگا۔ اس سے ایک عظیم الشان جھیل وجود میں آجائے گی جس سے یہاں کی دلکشی میں اور بھی اضافہ ہوگا۔

چاٹگام کے پہاڑی علاقہ کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل اور آبادی دو لاکھ ۸۰ ہزار ہے۔

پہاڑی علاقہ کے مغرب میں خلیج بنگال کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو پٹی چلی گئی ہے وہ ضلع چاٹگام ہے۔ پہاڑی علاقے اور یہاں کے مناظر میں فرق یہ ہے کہ پہاڑی علاقہ میں ہر طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں ہیں لیکن یہاں وسیع میدان اور لہلہاتے کھیت بھی ہیں اور سمندر کا کنارہ بھی۔

شمال سے جنوب تک ضلع کا طول ایک سو ۴۶ میل ہے عرض شمال میں ۴۶ میل ہے اور جنوب میں صرف چار میل۔

یہاں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ نیچی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ایک دوسرے، اور سمندر کے متوازی چلا گیا ہے۔ یہ پہاڑیاں انتہائی سرسبز اور شاداب ہیں اور ان کے درمیان وسیع شاداب میدان ہیں۔ جن میں جگہ جگہ چھالیا، بانس کے اونچے اونچے پیڑ اور بل کھاتی ہوئی ندیاں بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔ پہاڑیوں پر شیر، ہاتھی، جنگلی بھینسے اور جنگلی بلی وغیرہ کی کثرت ہے۔

ضلع چاٹگام میں پہاڑی علاقہ کے مقابلہ میں زیادہ بارش ہوتی ہے۔ پورے ضلع بارش کا اوسط ایک سو گیارہ انچ سالانہ ہے شہر چاٹگام میں ایک سو پانچ انچ اور کوکس بازار میں ایک سو چالیس انچ۔ مئی سے اکتوبر تک شدید بارش ہوتی ہے۔

ضلع چاٹگام کا سب سے دلکش مقام "کوکس بازار" ہے۔ یہ جگہ شہر چاٹگام سے اسی میل جنوب میں واقع ہے۔ یہاں کا ساحل، جو ۷۵ میل لمبا ہے دنیا کے بہترین ساحلوں میں شمار ہوتا ہے۔

کوکس بازار کے مناظر بڑے ہی دلکش ہیں۔ ساحل پر چھالیا اور تاڑ کے لمبے لمبے نازک پیڑ، سامنے سمندر، پیچھے سرسبز و شاداب پہاڑیوں کا سلسلہ ایسا سماں پیدا کر دیتا ہے جس کی مثال پورے پاکستان میں نہیں ملتی۔ اس کا ساحل اپنے قدرتی مناظر کے لحاظ سے فلوریڈا کے ساحل سے کہیں زیادہ حسین اور فرانس اور اٹلی کے ساحل "رلویرا" سے کسی طرح کم خوب صورت نہیں۔

آج کل کوکس بازار کو مشرقی پاکستان میں سیر و سیاحت کا سب سے بڑا مرکز بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس سلسلہ میں بہت کچھ کام ہو بھی چکا ہے۔ چاٹگام سے کوکس بازار تک پختہ سڑک اور متعدد پل مکمل ہو چکے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس اور متعدد دوسری اقامت گاہیں بن چکی ہیں اور وہ دن دور نہیں، جب مغربی پاکستان تک کے سیاح تفریح کرنے اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں "کوکس بازار" جایا کریں گے +

★

غزل

اختر احسن

یہ دشتِ دل کہ اُسی داغ کا فسوں ہے سب
یہ خواہش و غمِ دل کاسہ نگوں ہے سب

کدھر ہے شورشِ غم اور کہاں ہے وحشتِ درد
یہ آہ و نالہ تہہ گنبدِ جنوں ہے سب

یہ لالہ زارِ تمنّا، یہ ساحلِ غمِ دل
یہ عکس و منظرِ جاں رہنِ جوئے خوں ہے سب

رہا جو آتشِ پنہاں تو رشکِ لالہ رہا
بہا جو سیلِ غمِ دل تو آبگوں ہے سب

مزارِ حسرتِ دل ہے سپیدۂ غمِ صبح
دراز دستیٔ شب سے سحر زبوں ہے سب

بکھری ہے یوں گلِ جاں کے جگر میں تاریکی
نظر کا منظرِ آشفتہ خوں بجوں ہے سب

غزل

شہزاد احمد

جوں جوں قدم بڑھائے ہیں جنگل گھنا ہوا
اب سر پہ تیرگی کا ہے پردہ تنا ہوا

پتھر نہ پھینک، دیکھ ذرا احتیاط کر
ہے سطحِ آب پر کوئی چہرہ بنا ہوا

پھرتے رہے ہیں سایۂ غم کی تلاش میں
مدّت کے بعد اپنی طرف جھانکنا ہوا

یادیں تو کیا ہیں اس میں نہیں خون کی رمق
نکلا ہے میری آنکھ سے پانی چھنا ہوا

پہلے تو تھیں حریفوں سے زور آزمائیاں
اب کے تو اپنے آپ سے ہی سامنا ہوا

گر ہے مسافروں کی یہی پاشکستگی
چلنا بھی آپ اپنے قدم ناپنا ہوا

صحرا نے پاس میں کوئی تصویر بھی نہیں
دیکھیں گے کس کو ہم نے اگر دیکھنا ہوا

کاٹی کسی کی بات تو ٹھہرے گناہگار
رہنا خموش اپنی زباں کاٹنا ہوا

اپنے نصیب میں نہ ہوئی لذّتِ سحر
جب سر پہ دھوپ آئی تو پھر جاگنا ہوا

جب خاک ہی بدن ہے مرا خاک زندگی
پھر خاک چاٹنا تو لہو چاٹنا ہوا

موجود جو بھی ہے وہ مری دسترس میں ہے
تو کون تھا کہ تجھ سے نہ میں آشنا ہوا

دشتِ طلب میں شبنمِ احساس کا خیال
پتھر سے زندگی کی دعا مانگنا ہوا

شہزاد آرزو کے دریچے نہ بند کر
کیسے نکل سکے گا اگر بھاگنا ہوا

مقامات:

کراچی: نیا رُوپ

(دورِ انقلاب میں)

اسلم قریشی

کراچی نے جس طرح ہمارے دیکھتے دیکھتے خوب سے خوب تر کے چند در چند مرحلے طے کئے ہیں وہ ایک طلسم سے کم نہیں۔ جیسے یکلخت الف لیلیٰ کی کوئی بہت ہی رومانی داستان، کوئی بڑا ہی رنگین ورق نظر کے سامنے آموجود ہوا ہو۔ یا جیسے میر کو پردیس میں اپنی دلی کے گلی کوچے اوراقِ مصور نظر آتے تھے اور جو شکل نظر آتی تھی تصویر نظر آتی تھی ——— وہی طمطراق، وہی زیبِ ایوان و در، وہی شانِ دل آویزی جو کسی عروس البلاد کو اسم با مسمیٰ بناتی ہے۔ نفاست و آرائش کا وہی عالم جو شاعر کے تصور کو جمال، مصور کے مُوقلم کو رنگینی آذر کو حسنِ تراش عطا کرتا ہے ——— ایک خیال، ایک خوابِ بیداری، اور صرف یہی نہیں، یہ بننے سنورنے، جمیل سے جمیل تر ہونے اور روپ نکھارنے کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نگار ہندوں کی طرح برابر، روز بروز، لمحہ بہ لمحہ آگے ہی بڑھتا ہوا، فزوں تر، خوب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ روشنیوں کا شہر، رعنائیوں کا شہر، رنگ، رس، روپ کا نگر، ہلچل، عمل، رفتار، سرجوشی اور سرگرمیِ حیات کا گہوارہ، جسے میں نے دلی، لکھنؤ، حیدر آباد دے کر حاصل کیا ہے۔ بابائے ملت ؒ کا جنم بوم، ان کی تعلیم و تربیت کا شہر، ان کی سرگرمیوں کا شہر، ان کی کامرانیوں کا شہر، اُن کی بازگشت کا شہر اور اُن کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ اسی لئے ہم سب کو اس کے ساتھ شروع ہی سے محبت رہی ہے، گویا پاکستان ایک محیط ہے اور وہ اس کا مرکز ——— دیارِ پاک کا پہلا دارالحکومت، خطۂ پاک کا شہرِ اول۔ اب اگر وہ دارالحکومت نہیں رہا تو کیا ہے، اس کی سرتاجی اور زینت میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ بلکہ اس کا روپ اور نکھرتا ہی چلا جائے گا۔ ہم نے اس کے بام و در سجانے کے لئے، اس کے حسن کی آرائش کے لئے، اس کے گیسوؤں کو نئی تب و تاب دینے کے لئے جو کوششیں شروع کر رکھی ہیں وہ اسے واقعی بلادِ پاک کی عروسِ نو بنا رہی ہیں۔

اگر ہم پہلے اُس کراچی کو ——— آج سے تیرہ برس پہلے کے کراچی کو ——— سامنے رکھ کر اس کراچی کو دیکھیں جو نئی شان سے ابھر رہا ہے، ابھر چکا ہے اور ابھرتا رہے گا، تو ہم حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ماضی میں مچھیروں کی بستی۔ پھر اس کی جُون پلٹتی رہی اور سوا سو سال میں ۳ لاکھ کی آبادی ہو پہنچی مگر اب یہ پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ رونق، خوبصورتی، نئی نئی بستیاں، سجے سجے بازار، ہر جگہ دامن کش۔ کلفٹن ہے تو جانفزا۔ آلیفی ہے تو نظر نواز، بندر روڈ، صدر، ناظم آباد، لالہ زار، آگے بڑھیں تو بستیاں ہی بستیاں۔ ویرانے اب گل بداماں روشوں اور بستیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں، گویا رنگینیِ آب و ہوا سے کوئی گلاب کا پھول تو بہ تو اوراق کی شکل میں مسکرا پڑا ہو، کوئی کلی کھل اٹھی ہو۔ لال انگارہ، سراپا رنگ و بو، جیسے سرخ سرخ دیپوں کی چکریاں ہی چکریاں، چنور ہی چنور، جگ مگ جگ مگ کر رہے ہوں!

دورِ انقلاب سے پہلے دیارِ پاک اور اس کا "شہرِ اول" کراچی بھی ہماری قومی بدحالی و ادبار کے بُرے دن دیکھ چکا ہے ——— مگر اب برے دنوں کا اس اچھے سمے ذکر کرنا تحصیلِ حاصل ہے، مفاد پرست اس طرح کھُل کھیلے اور اس طرح من مانی کی کہ قوم بنجاروں کی قوم بن کر رہ گئی۔ شہر کیا تھا جھگیوں، جھونپڑیوں اور عفونت و مزبلہ کا مجموعہ۔ سیاسی بد دیانتوں اور بے عملوں کے جو لچھن تھے وہ چھوٹے پیمانے پر اس دارِ حکومت میں بھی ظاہر ہوتے ——— کارپوریشنوں اور میونسپلٹیوں کی انتظامی مشینری تو ویسے ہی خاص شہرت کی مالک رہی ہے۔ مگر سنا تھا کراچی کارپوریشن پورے برصغیر میں بہترین کارگزار ادارہ تھی اور شہر صفائی، ستھرائی، نک سے سُکھ درست ہونے میں مثال مانا جاتا تھا، مگر برا ہو دھڑے بندی کا، مفاد پرستی، سہل انگاری، اور بے تحاشا بے عملی کا۔ کہ اس نے اس دلہن کا سارا روپ سنگھار نوچ لیا۔ صحت و صفائی کا اہتمام تو کیا کرتے یہ لوگ، شہر کے "منتخب نمائندے" ایک غول تھا مفاد پرست اور موقع پرست لوگوں کا جنہیں نہ شہر سے دلچسپی تھی نہ اہلِ شہر سے۔ معمولی بنیادی احساسِ شہریت تک ان لوگوں میں نہ تھا۔ معقول سے معقول تجویز کو کھٹائی میں ڈال دینا ان کے معمولی ہتھکنڈے تھے ——— کوئی سڑک

ایسی زمین جو چھوٹی چھوٹی حادثوں کا مرکز نہ ہو۔ پارک تھے تو گنجے، بے برگ و بار۔ بیماریوں نے اگر اس شہر کو خاص طور پر تاک رکھا تھا تو خلاف توقع نہ تھا۔ حد یہ کہ جو تفریح گاہیں ہمیں بطور ورثہ ملیں یہ لوگ ایسے کپتے ثابت ہوئے کہ ان کی آرائش میں اضافہ کرنا تو کجا اپنی بے عملی و بد اعمالی سے انہیں بھی خرابوں میں تبدیل کر دیا۔ ایسی کسی جگہ بھی آدمی نکل جاتا اُداسی، بے لطفی اور بے رنگی سے اکتا جاتا۔ مکروہ نظاروں میں اضافہ کرنے کے لئے غلیظ جھگیوں کا سلسلہ۔ ان کے مکینوں سے بے پروائی کا کھلا ثبوت تھیں۔ فٹ پاتھ پہ ہجوم بے ہنگام میلے چیکٹ چیتھڑے لگائے لوگ ٹاٹ کے بوسیدہ پردوں کے پیچھے رہتے تھے۔ جب ان سڑکوں پر سے غیر ملکی سیاح اور مہمانان عزیز گزرتے ہوں گے تو پاکستان کا کیا تصور و تاثر لے کر جاتے ہوں گے؟ حد یہاں تک پہنچی تھی کہ عین ایوانِ قانون ساز کی پشت پر بھینسوں کی گندی بستی، بدبودار نالہ اور غلیظ و مکروہ جھونپڑیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا جسے اس عمارت پر سے دیکھنے والے ضرور دیکھتے ہوں گے اور پاکستان کے دار الحکومت کے متعلق کیا خیال کرتے ہوں گے!

شکیب ہے قائد اعظمؒ کا یہ مولد زیادہ عرصہ تک اس و زگت کا شکار رہتا اور عوام اپنے طور پر بہت کچھ کرتے رہے۔ کراچی پھر بھی ترقی کرتا رہا اور انقلاب کا جیسے منتظر ہی تھا۔ جیسے ہی یہ دورِ جاں بخش طلوع ہوا اس کے چہرے پر پھر رونق کی روشنی چمک اٹھی، پھر خونِ حیات کی لکیریں ابھر آئیں۔

کراچی کے لئے تو مارشل لا خاص طور پر داروئے حیات ثابت ہوا۔ لوگ اپنی ذمہ داریاں پھر جان گئے، احساسِ شہریت پھر بیدار ہو گیا۔ بستیاں صاف ستھری بننے لگیں۔ غلاظت کے ڈھیر جبراً اٹھوا دیئے گئے۔ ہر شخص کے احساس کو نئی توانائی ملی۔ غافلوں کو تنبیہہ ہوئی۔ ادھر دورِ نو نے مہاجرین کو ستھرے ذیلی شہر بنا کر دیئے فٹ پاتھ صاف ستھرے ہونے لگے کارپوریشن کو "منتخب نمائندوں" کے بوجھ سے "سبکدوش" کر دیا گیا۔ گویا خس بھی کم ہوا اور جہان بھی پاک ہوا۔

کارپوریشن پر سے جب یہ کابوس ہٹ گیا تو اس کے کارپردازوں کو بھی کام کرنے کے لئے آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا۔ ممبروں کی تُو تُو مَیں مَیں، خوشامد، بددیانتی کے کرتوتوں سے نجات ملی۔ آرائشِ بلدہ کا کام نئے ولولے سے شروع ہو گیا۔ ادھر ادارۂ ترقیاتِ کراچی نے کام سنبھال لیا۔ — غرض ایک نیا کراچی ابھرنے لگا — جیسے کوئی نکھری ہوا، خوبصورت، شوخ رنگ۔

اب پرانے نظام کا منحوس سایہ چونکہ اٹھ چکا ہے اور بنیادی جمہوریتوں کے نمائندے برسرِ عمل ہیں جنہیں عوام نے اپنی مرضی سے چنا ہے "پارٹی لیبل" کے لوٹ سے اب ان کا ضمیر آزاد و پاک ہے، اس لئے وہ خیر کو خیر اور شر کو شر ہی کہیں گے۔ لہٰذا اس دیار کی بنیادی ضرورتوں صحت، صفائی، روشنی، آرائش کا اہتمام نوِ نئے سانچے میں ڈھلنا شروع ہو چکا ہے۔

اور یہ سب کام دورِ انقلاب کے صرف دو سال میں ہوا ہے۔ اتنی قلیل مدت میں شہر کو بہتر بنانے کی تجویزیں تکمیل کے مراحل بھی طے کر چکی ہیں بلکہ کاروانِ شوق اور ذوقِ عمل ابھی ہمیں آگے ہی لئے جا رہا ہے۔ مث[illegible] طویل المیعاد منصوبوں میں ایک تجویز یہ ہے کہ کلفٹن کی ساحلی تفریح گاہ کو ایک نمونہ کا چمن زار بنا دیں۔ چنانچہ کلفٹن کے پانی کے ساتھ دور تک دیوار بنائی جائے گی اور اس کے ساتھ ایک میرین ڈرائیو یا ساحلی شاہراہ تعمیر کی جائے گی جس کے ساتھ عالیشان خوبصورت عمارتوں کا سلسلہ، باغات، نفیس پارک اور عوامی تفریح گاہیں ہوں گی۔

کلفٹن کی زینت کاری کے علاوہ شہر کے قلب میں "جہانگیر پارک" کو ایک نفیس تفریح گاہ بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ تمام ریتیلے میدان میں جو "جہانگیر پارک" کہا جاتا تھا نرم دُوب اُگ آئی ہے۔ وسط میں ایک حوض تعمیر ہو رہا ہے جس میں بڑا خوبصورت فوارہ رقص کیا کرے گا اور اس حوض میں بطیں تیرتی رہا کریں گی۔ چاروں طرف بلند و بالا اشجار اور خوبصورت روشنیوں والے قمقمے لگے ہوں گے۔ غرض قلبِ شہر میں یہ پارک اب واقعی ایک بڑا نفیس مقامِ راحت بن جائے گا۔

کراچی کی سڑکوں کو چوڑا کرنے اور اسے بڑھتی ہوئی ٹریفک کے بہتر اور محفوظ بنانے کا کام جاری ہے۔ جابجا گھاس کے تکون بنائے ہیں — پرانی نمائش کے سامنے جو خوبصورت مثلثی باغیچہ بنا ہوا ہے وہ بھی بہت عمدہ سیرگاہ بن چکا ہے۔ سڑکوں کے دونوں جانب شجر کاری ہو رہی ہے اور بہت جلد یہاں کی سڑکیں سایہ دار درختوں سے بڑی آراستہ اور نظر فریب ہو جائیں گی۔ اور اب سے چند سال پہلے کراچی کی سڑکوں پر گرد و غبار کے جو مرغولے اڑ اڑ کر ہمارے پھیپھڑوں کو خراب کیا کرتے تھے وہ سب ختم ہو جائیں گے۔

غرض اس وقت کراچی میں ہر طرف تزئین و آرائشِ شہر کا چرچا ہے۔ یعنی گلشن کا بند و بست دوسری ہی طرح ہو رہا ہے مگر اور کئی خوبصورت اضافوں کے جو انقلاب اکتوبر کے بعد نظر آ[illegible]

یہاں دو فواروں کا جو حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں، ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ گرم ممالک میں خنکی، راحت اور آسودگی کا جو بھی شہری بندوبست کیا جائے وہ اس جگہ کے رہنے والوں کے لئے گویا ایک نوید جانفزا ہوتی ہے۔ اس میں پانی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ پانی کو اگر نفاست اور سلیقہ کے ساتھ آبشار یا فوارہ کی مانند حرکت میں لایا جائے تو نظارہ بڑا پُرکیف، ماحول بڑا راحت فزا اور فضا میں بڑی سکون بخش بن جاتی ہیں۔ سردست دو فوارے تعمیر ہو چکے ہیں اور تجویز ہے کہ تقریباً ایک درجن ایسے فوارے اور نصب کئے جائیں گے۔

فوارے ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ ہمارے فنِ تعمیر کے جو نفیس نمونے اس وقت موجود ہیں اُن میں آبی روشیں بنانے اور حوض و فوارے کی آرائش آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ نئے عہد میں فواروں کی تعمیر جدید صناعی اور مُہندسی کے بھی کچھ تقاضے کرتی ہے اور نئے ماحول میں نئے اوضاع کے فواروں سے فرحتِ زندگی اور نفاستِ تعمیر کے اور ہی نقشے ذہن میں آتے ہیں۔

فواروں کی تعمیر میں بھی صناعی ڈیزائین کی اُپج کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ فواروں کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ تعمیراتی اشکال کی خوبصورتی کا نمونہ ہونا اور آبِ رواں کے رقص اور جست و خیز کا بھی ایسا نمونہ ہونا جو حُسن اور تجمل دونوں کا امتزاج ہو۔

آج کل کراچی میں ان دونوں فواروں کی تنصیب و تعمیر کا بڑا چرچا ہے۔ اونچے درجے کے نقادوں کی بات تو چھوڑ دیجئے۔ وہ ان میں عیب جوئی کرتے ہیں مگر ویسے آپ دیکھیں تو یہ فن اور صناعی کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ایک تو ڈرگ روڈ جب شہر کی بونس روڈ سے آکر ملتی ہے، اس کے چوراستے پر واقع ہے یہ بہت ہی نفیس اور خوبصورت فوارہ تو نہیں کہا جا سکتا مگر بناوٹ اور آبِ رواں کی جست و خیز نے اسے جاذبِ توجہ بنا دیا ہے۔ فوارہ مدور تعمیر کیا گیا ہے۔ کنکریٹ کا ایک رُبع دائرہ قائم کر کے چار تنگ گہرے زینے نیچے اتارے گئے ہیں۔ زینوں پر رنگ برنگے شیشوں سے مرصع کاری کی گئی ہے اور پشت پر سے نیون لائٹ کی پھوٹ ڈالنے کا انتظام کیا گیا ہے اور بڑا اچھا نظارہ پیش کرتا ہے کنکریٹ کے مدور تودے سے پانی کی تیز رو پھوار چھوٹتی ہے اور زینوں پر سے بہتی ہوئی گر جاتی ہے۔ پھر نیچے پانی جمع رہنے کا حوض ہے۔ اس میں بیچ بیچ جو حوض ہے اسے بھی مدور وضع کا بنایا گیا ہے۔

فوارے کی نالیاں اوپر عمودی حالت میں ہیں اور پوری تعمیر کو ایک سادہ پُرکار اور خوبصورت و نفیس ڈیزائین کا حامل بنا دیتی ہیں۔

دوسرا فوارہ ایوانِ صدرِ پاکستان کے سامنے وکٹوریہ روڈ اور ہیولاک روڈ کے چوراستے پر بنا ہوا ہے۔ اسے موسیقی کی علامت سے متصف کیا گیا ہے اور "گانے والا فوارہ" کہلاتا ہے۔ اور بربط کی شکل سے اکثر اس میں سے ٹیپ ریکارڈ کئے ہوئے نغمے (جس کی مشین دیں کہیں فوارے میں لگائی گئی ہے) پانی کی بارش کے ساتھ عجب لطف پیدا کرتے ہیں۔ گویا جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش دونوں ناظر کے لئے مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ حوض کا مرمریں کٹہرا بنایا گیا ہے اور ہلال کی شکل کا ہے۔ پھر بربط کی شکل کی وضع نصب کی گئی ہے اور ہلال کے بیچ میں نجم کا تصور ڈیزائین سے بخوبی ہویدا ہے۔ ڈیزائین کی ایک خوبی اقلیدسی اشکال کی صحت و صفائی بھی ہے جس وقت رات کو رنگ برنگی پوشیدہ روشنیاں اس فوارہ کے قلب سے اپنا جلوہ بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہیں تو آدمی خوابناک دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جو اس نور و رنگ، روانیٔ آب اور موسیقی کی مدھم آبشار کے ملنے جلنے سے پیدا ہوتی اور جو اس پر چھا جاتی ہے۔

ان فواروں کی تنصیب کے سلسلے میں بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان کی خوبصورتی اور فرحت افزا کیفیت کو دیکھنے کے لئے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ قدرتی ہے مگر انھیں بہت مصروف سڑکوں کے عین وسط میں لگا دیا گیا ہے۔ اس لئے ٹریفک میں گڑبڑ ہوتی ہے اور حادثات کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان فواروں کو اگر قلبِ شہر میں لگانا ہی ہے تو مصروف سڑکوں سے ہٹا بچا کر ایسی جانب کسی حصے میں بنانا چاہیئے جہاں ٹریفک کی زیادتی کی وجہ سے گڑبڑ نہ ہو اور پبلک کی حفاظت کا اہتمام نظر سے اوجھل نہ رہے۔ آئندہ جو فوارے بنائے جائیں انہیں نصب کرنے وقت اس بات کا خیال رکھنا بہتر ہوگا۔ علاوہ ازیں ڈیزائنوں کے سلسلے میں بھی ہمیں کئی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ مغلوں کی آرائشی جدت طرازی اور نفاست اوضاع کا بھی ہمارے ہاں اثر ہونا چاہیئے تاکہ ہمارے ماضی اور ثقافتی ورثہ کا پرتو اس طرح جلوہ ریز رہے کہ "نشاط باغ" اور "شالامار" کی سکون بخش فضائیں اور تعمیراتی نفاست و اسلوب کی روشن نشانیاں جدت پسندی اور نئے ذوقِ آرائش میں غلو کی نذر نہ ہو جائیں۔ اور جب ہم

... ایک نیا ساز و آہنگ دے رہے ہیں، تو ارباب حل و عقد کا بھی فرض ہے کہ ... چند معروضات کو بھی اپنے فنی مظاہرات کے سامنے رکھیں اور کراچی کے نئے دور میں جو نئے بال و پر پل رہے ہیں وہ اسی کے مشاغل کا جو نیا اسلوب اختیار کیا جا رہا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ہماری آزادہ روی اور ثقافتی رجحان دونوں کا ایک حسین وحدت و امتزاج بن جائے جس سے کراچی کے باشندے بھی اپنے ذوق نظر کا سامان فراہم کریں اور بیرونی سیاح بھی اس کی ایک شگفتہ و دلنشین یاد لیکر یہاں سے جائیں۔

مقام مسرت ہے کہ مزار قائد کے سلسلے میں ایک ماہر فن کے مشورے کے مطابق ایسی مناسب ترمیمات کر کے جو مزار قائد کے شایان شان ہوں، اس جگہ ایک دل کشا باغ عامہ بنا دیا جائے گا جس میں مسجد عیدگاہ کی ایک شاندار مسجد بھی یہاں روحانی تسکین کا موجب و مخزن ہوگی اور خوبصورت باغ اور روشیں بھی آنکھوں کو نور بخشیں گی۔

ادھر ڈرگ روڈ پر "قومی پارک" بنانے کی تجویز مکمل ہو چکی ہے جو قدرتی ماحول میں حیوانات اور نباتات کے نادر نمونوں کا ایک اور طلسم زار ہوگا۔ اب سارے شہر میں نئی آرام دہ بسیں چل پڑی ہیں اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سرکلر ریلوے سارے طول و عرض کراچی کو اپنے آغوش میں لے کر شہر کی خوبصورتی اور صلاحیت کار میں مزید اضافہ کا باعث ہوگی۔ یہ ریلوے بہت جلد تعمیر کی منزلیں شروع کرنے والی ہے۔

یہ ذکر تشنہ رہ جائے گا اگر میں شہر کی ایک بالکل نئی، اچھوتی نفیس الوضع عمارت آپ کو نہ دکھاؤں۔ میرا مطلب ہے آرٹ کونسل کی عمارت سے جو ایوان صدر کے نزدیک ہی بڑی خوبصورت عمارت ہے۔ ہنر و فن کو قوم کی زندگی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ اس کے ذوق کی علامت بھی ہیں اور اس کے احساس جمال کو جلا بھی دیتے ہیں ــــ قمر ہاؤس، محمدی ہاؤس، پولیس کا صدر دفتر، انجمن بین الاقوامی تعلقات وغیرہ کی عمارات بھی صورت گری، صناعی و تعمیراتی ذوق کی بہت اچھی نمود ہیں مگر مصوروں، نقاشوں، رقاصوں اور فنون لطیفہ کے دلدادگان کی تسکین ذہنی کے لئے جو عمارت سطح ارض پر نمودار ہوئی ہے وہ اس ادارہ کی مناسبت اور تلازمہ کی آئینہ کش ہے۔ اس کے نگار در و ایوان کی جدید کیفیت دیدنی ہے اور ہونی بھی چاہئے کیوں کہ یہ عمارت نہ ہو تو گویا دلہن کے ماتھے پہ جھومر نہ ہو۔ یہ گہوارۂ فنون لطیفہ ہے، یونانی پارتھینان کی طرح ان کی پرورشگاہ بھی، سامان نمود بھی اور ایک علامت بھی۔ شاید اس کے بغیر کراچی کا نیا روپ بجھا بجھا سا رہتا، فضا روکھی روکھی سی نظر آتی۔ آرٹس کونسل کی عمارت سے صرف ایک ... پوری نہیں ہوئی بلکہ عروس البلاد کو ایک گوہر آبدار بھی مل گیا اور جب اس کی تجویز کردہ "قومی تھیٹر" کی عظیم و رفیع عمارت بھی بن جائے گی تو کراچی کی شانِ دلآویزی میں اور بھی چار چاند لگ جائیں گے +

●

تبصرہ:

" ارض پاک کے افق پر یوں تو سورج روز ہی چمکتا ہے لیکن ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو چمکنے والے سورج کی آب و تاب اور شان ہی نرالی تھی۔ اس کی پہلی کرن ہم آٹھ کروڑ باشندوں کے لئے اپنے دامن میں بے پناہ خوشیوں کے خزانے لے آئی۔ ہم تباہ حال اور زندہ درگور لاشوں کے لئے حیات نو اور حیات جاوداں کا پیغام لے آئی۔ انقلاب آیا ــــ! انقلاب عظیم ــــ!!

جس قسم کا انقلاب ہمارا مورخ لکھے گا۔ وہ اپنی نوعیت کا واحد اور ڈرامائی انقلاب ہے۔ اس بار ہماری تقدیر کے افق پر ایوب نامی ایک درخشاں ستارہ نمودار ہوا ہے۔ ہماری بگڑی ہوئی تقدیر کو سنوارنے اور بدلنے کے لئے یہ کیا کم ہے کہ جمہوریت کے نام پر جمہور کو لوٹنے والے اور بے وقوف بنانے والے جادوگروں کی سحر کاری کو نیست و نابود کر کے ملک میں ایک نئی طرز کی حکومت حکومت قائم کر دی گئی!"

"مجلۂ قانون" سندھ مسلم لا کالج۔ کراچی کے "گرد و پیش" سے یہ اقتباس اُس تأثر کا آئینہ ہے جو ۲۷ اکتوبر کے انقلاب اور انقلابی حکومت کے متعلق بالعموم محسوس کیا جاتا ہے۔ اور مجلہ مذکور کا زیر نظر سالانہ نمبر جو بڑے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے، اُسی خوشگوار فضا کی عکاسی کرتا ہے جو انقلاب سے پیدا ہوئی۔ اور اس کے ساتھ طلبہ کی زندہ دلی اور والہانہ ذوق شوق کا آئینہ دار بھی ہے۔

●

اقوامِ متحدہ کی فنّی امداد اور پاکستان

فضل حق قریشی دہلوی

پہلی جنگِ عظیم کی طرح دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد بھی بین الاقوامی نوعیت کے بعض مسائل حل کرنے اور بعض قضیوں کو طے کرنے کے لئے ایک عالمی انجمن قائم کرنے کی ضرورت بری طرح محسوس کی گئی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ سیاسی تعلقات میں کشیدگیاں اور الجھنیں پیدا ہو جانے کے علاوہ اقتصادی اور معاشرتی نظام کے شیرازے بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ بری طرح بکھر گئے تھے اور انہیں نئے سرے سے مربوط کرنا اور مستحکم و استوار رکھنا لازمی ہو گیا تھا۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کے نام سے جس کے اراکین کی تعداد شروع میں پچپن تھی اور جو بڑھتے بڑھتے اب بیاسی ہو گئی ہے اور شاید یہ سال ختم ہونے سے پہلے نوے ہو جائے، ایک عالمی انجمن کی بنیاد رکھ دی گئی جو ۱۹۴۵ء سے اب تک قائم ہے اور روز بروز زیادہ مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس کے زیرِ ایوان سیاسی مذاکرات کے علاوہ اقتصادی اور معاشرتی ترقیوں کے موضوعات کو زیادہ اہمیت کے ساتھ مدِ نظر رکھا گیا ہے، کیونکہ سب نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اقتصادی اور معاشرتی بدحالی کی صورت میں جبکہ غربت و افلاس، دکھ بیماری اور جہالت و ناخواندگی کا مذموم چکر چلتا ہی رہتا ہے، سیاسی تعلقات کی فضا بھی کبھی خوشگوار نہیں رہ سکتی۔

اقتصادی اور معاشرتی حالات کو سدھارنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں اور پس ماندہ ملکوں کے درمیان رابطہ قائم کیا جائے اور اول الذکر سے فنی اور مالی امداد لے کر موخر الذکر کو پروان چڑھایا جائے۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی تمہید میں واضح طور پر درج کیا گیا ہے کہ بہتر معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی ہر ممکن صورت پیدا کی جائے گی۔ اسی خیال اور نصب العین کے پیش نظر فنی امداد کا توسیعی پروگرام قائم ہے جس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی یا سلامتی کونسل میں کسی سیاسی مسئلے پر کبھی کبھی اختلافِ رائے ہو جاتا ہے اور کونسل میں تو ویٹو کے استعمال تک کی نوبت آ جاتی ہے لیکن فنی امداد کے موضوع پر بیشتر فیصلے اتفاقِ رائے سے ہوتے ہیں۔

اقوامِ متحدہ اور اس کے مخصوص اداروں کے اصل پروگراموں کے اخراجات ان کے مستقل میزانیوں سے پورے کئے جاتے ہیں لیکن اس کے برعکس فنی امداد کے توسیعی پروگرام کے لئے ایک علیحدہ خاص فنڈ ہے جس میں ہر سال حکومتوں کے رضاکارانہ چندے جمع کئے جاتے ہیں۔ اس پروگرام کی افادیت و اہمیت کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اس کے تحت امداد دینے اور امداد پانے میں وہ حکومتیں بھی شامل ہوتی ہیں جو کسی وجہ سے اب تک اقوامِ متحدہ کی رکن بھی نہیں بن سکی ہیں۔

فنی امداد خود ملکوں کی درخواست پر دی جاتی ہے اور ہر ملک کا الگ الگ لحاظ رکھتے ہوئے امداد کی نوعیت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ فنی امداد کے ادارے کے ذریعہ اقتصادی ترقی، منصوبہ بندی، معاشرتی فلاح و بہبود، حفظانِ صحت، فروغِ تعلیم اور سرکاری نظام کی بہتری سے متعلق مختلف قسم کی امداد دی جاتی ہے۔

فنی امداد کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ سب سے اہم قسم یہ ہے کہ پس ماندہ ملکوں کی حکومتوں کو ماہرین کی خدمات دی جائیں تاکہ وہ اپنے وسائل و ذرائع کو ترقی دینے میں اپنے منصوبوں پر خود عمل کرنے کے لائق ہو جائیں۔ ماہرین تنہا یا جماعتوں کی صورت میں بھیجے جاتے ہیں اور ان کی خاص قابلیت کے لحاظ سے ان کو دنیا کے ہر حصے سے منتخب کیا جاتا ہے۔

امداد کی ایک اور صورت یہ ہے کہ پس ماندہ ملکوں کے باشندوں کو وظیفے دیے جائیں تاکہ انہیں غیر ملکوں میں جا کر تربیت پانے کے موقعے ملیں اور پھر وطن واپس آ کر اپنی صلاحیتوں سے اپنے اپنے ملک کو فائدہ پہنچائیں۔

طبقاتی اعتبار سے پس ماندہ ملکوں میں علمی اجتماعوں، تربیتی مرکزوں اور کارخانوں کی ابتدا کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ فنی امداد کی مد میں کچھ سامان بھی فراہم کرنے کی صورت پیدا کی جاتی ہے لیکن اس کی مقدار قلیل ہوتی ہے کیونکہ وہ سامان زیادہ تر ماہرین کے کام میں سہولت

کام چلانے کے لئے دیا جاتا ہے۔

زرعی ترقی کا توسیعی پروگرام قیام پاکستان سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا اس لئے پاکستان بننے کے بعد بھی اس کا سلسلہ اس نئی مملکت میں شروع ہو گیا اور جس طرح خود حکومت کے ارباب حل وعقد کو ہر کام نئے سرے سے کرنا پڑا تھا، توسیعی پروگرام کے ماتحت بھی ہر منصوبے کی ابتدا پہلی منزل سے کرنی پڑی۔ اسی لئے یہاں کاموں کی نوعیت بالکل مختلف رہی ہے۔ مثلاً آبی وسائل کی ترقی کو لیجئے۔ خاص طور پر کراچی کے علاقے میں چند ماہرین نے سرکاری محکمۂ آب رسانی کے ساتھ مل کر تقریباً دو سال تک تحقیقات کا کام جاری رکھا اور نتائج تحقیقات کو عملی جامہ پہنایا جس کی وجہ سے کراچی میں پانی کی جو بے پناہ قلت تھی بتدریج دور ہو گئی اور اب نئی نئی بستیاں قائم ہوتے رہنے کے باوجود ہر علاقے میں پانی ضرورت کے مطابق پہنچ جاتا ہے۔ ماہرین نے کراچی کے نزدیک زیر زمین پانی کا کھوج لگانے کے بعد کنوئیں کھدوائے، پائپ لائن ڈالنے اور پمپ نصب کرانے میں ہر لحاظ سے تعاون کیا۔ سابق صوبہ سرحد کے علاقے میں ماہرین نے بادلوں سے مصنوعی طور پر بارش برسانے کے کامیاب تجربے کئے لیکن فی الحال ان کو اس لئے عمل میں نہیں لایا جا رہا کہ ان پر لاگت بہت آتی ہے۔ اگر کوئی سستا نسخہ دریافت کر لیا گیا تو شاید اس پر عمل کیا جائے گا۔

پاکستان میں اقوام متحدہ کے ماہرین نے برقی قوت کی ترقی میں بھی مدد دی ہے پنسلین اور ڈی ڈی ٹی کی تیاری کے کارخانے قائم کرائے ہیں، کاغذ، پٹ سن، شکر، جہاز سازی اور پارچہ بافی وغیرہ کے کارخانوں کو ترقی دینے میں مشورے دیتے ہیں۔ لاسلکی مواصلات کے نظام کو فروغ دیا ہے، ٹیلی فون ایکسچینج کے منصوبے تیار کرائے ہیں، ٹیلی فون کے تار بچھائے ہیں۔ پانی کا ذخیرہ جمع کرنے اور سیلاب کی مصیبت سے بچانے کے لئے بند تعمیر کرائے ہیں اور مناسب تدابیر معلوم کی ہیں۔ امداد باہمی کی انجمنیں قائم کی ہیں۔ مزدوروں کے جائزے لئے ہیں۔ نرسنگ اور دوسرے پیشوں کی تربیت کا انتظام کیا ہے۔ زراعتی اور صنعتی پیداوار میں اضافے کے طریقوں پر غور کیا ہے۔ مزدوروں کی حالت سدھارنے میں مدد دی ہے۔ معاشرتی فلاح و بہبود اور جسمانی ترقی کا خیال رکھا ہے۔ زرعی مشینوں کے استعمال کو رواج دیا ہے۔ مویشیوں اور پرندوں کی پرورش اور ان کی بیماریوں کی روک تھام میں مدد دی ہے۔ ملک میں جو صحت عامہ کی بیماریوں خصوصاً دق، ہیضہ، ملیریا، چیچک اور جذام وغیرہ کے استیصال کی کوششوں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ ٹڈی دل سے محفوظ رہنے کی صورتیں پیدا کی ہیں۔ جنگلات کو ترقی اور بنیادی تعلیم کو فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کی ہے۔

دوسرے پسماندہ ملکوں کی طرح پاکستان میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس لئے سرکاری افسر، وزراء کابینہ اور غیر ملکی ماہرین یکساں طور پر اس سوال کا حل تلاش کر رہے ہیں کہ کس کام کو کہاں سے شروع کیا جائے اور کسے کس پر ترجیح دی [illegible] لہٰذا غور و فکر کی الجھنوں میں پڑنے کی بجائے آسان ترکیب یہی نکالی گئی کہ صحت و تندرستی، تعلیم و تربیت اور زراعت و صنعت [illegible] کاموں کو بالکل ابتدائی منزل سے اور بیک وقت شروع کیا [illegible] اور اس لئے نہ ترجیح کا سوال باقی رہا اور نہ منزل کا۔ ضرورت ہے کہ ان میں سے بعض کاموں کو کسی قدر تفصیل کی روشنی میں جانچا جائے۔

عالمی ادارۂ صحت، اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) اور حکومت پاکستان کی مشترکہ امداد سے ڈھاکہ اور کراچی میں تپ دق کی روک تھام اور اس کام کے کرنے والوں کی تربیت کے مرکز اور پھر ان کے ماتحت دونوں بازو [illegible] کے مختلف اضلاع میں ضمنی مرکز قائم کئے گئے۔ شروع میں جو ماہر [illegible] نامزد کئے گئے تھے، اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جا چکے ہیں اور اپنے فرائض مقامی طور پر تربیت پانے والوں کے سپرد کر گئے [illegible] ان مرکزوں میں فنی ضرورت کے عام سامان کے علاوہ ایکس رے کی مشینیں بھی لگائی گئی ہیں جو یونی سیف کی طرف سے پیش ہوئی [illegible] ان مرکزوں اور ضمنی مرکزوں نیز گشتی شفاخانوں کے ذریعے دونوں صوبوں کے ہر چھوٹے بڑے شہر، قصبے اور گاؤں [illegible] مریضوں کا معائنہ ہوا، بی سی جی کے ٹیکے لگائے گئے اور علاج [illegible] مناسب تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ ڈھاکہ میں تپ دق کی روک تھام [illegible] مرکز اس لحاظ سے بھی ایک مفید ادارہ ہے کہ عالمی ادارۂ صحت یونی سیف سے وظیفے پانے والے غیر ملکوں کے ڈاکٹر اور نرسیں یہاں آکر مزید مہارت حاصل کرتے ہیں اور اس طرح اسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

منازل ترقی

(نیا دور)
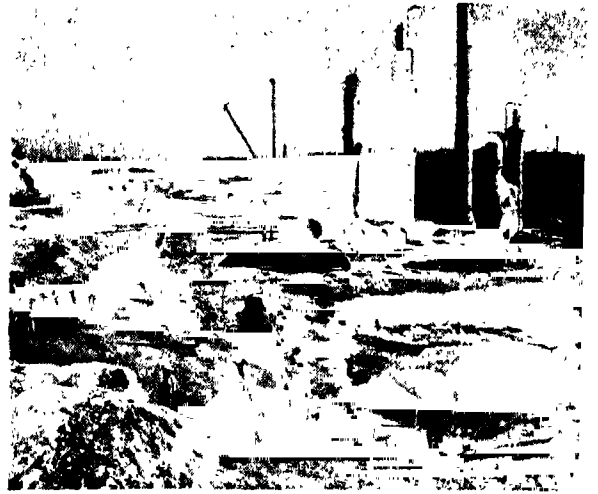
میاوی کهاد (فینچو گنج، مشرقی پاکستان)

منصوبہ ورسک (مغربی پاکستان)
جو نصف سے زیادہ مکمل ہو چکا ہے
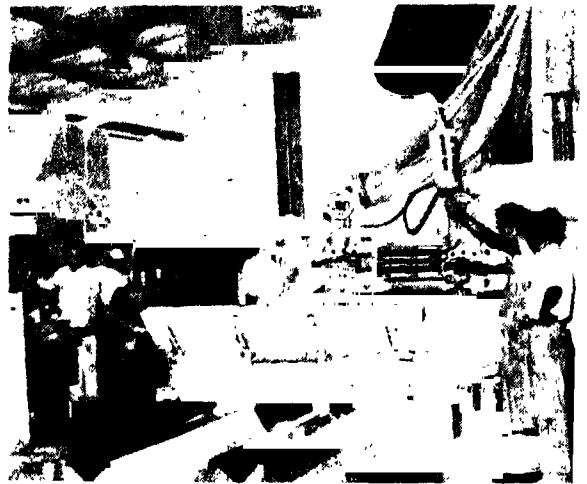
ز سازی کا وسیع پیمانہ پر اهتمام
هلنا شپ یارڈ : مشرقی پاکستان)

و برقابی قوت کا عظیم الشان منصوبہ
ورسک : مغربی پاکستان
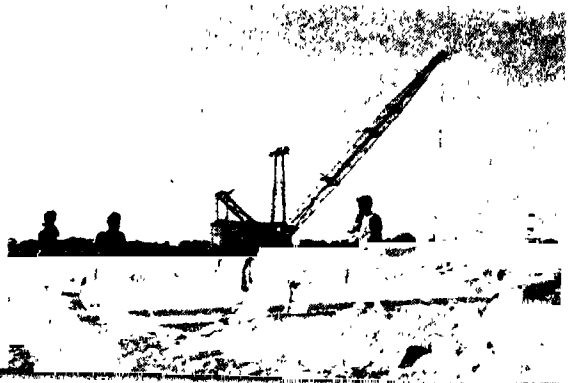
متحدہ اور پاکستان

(فنی امداد)

۲ :

۱ :

۳ :

۴ :
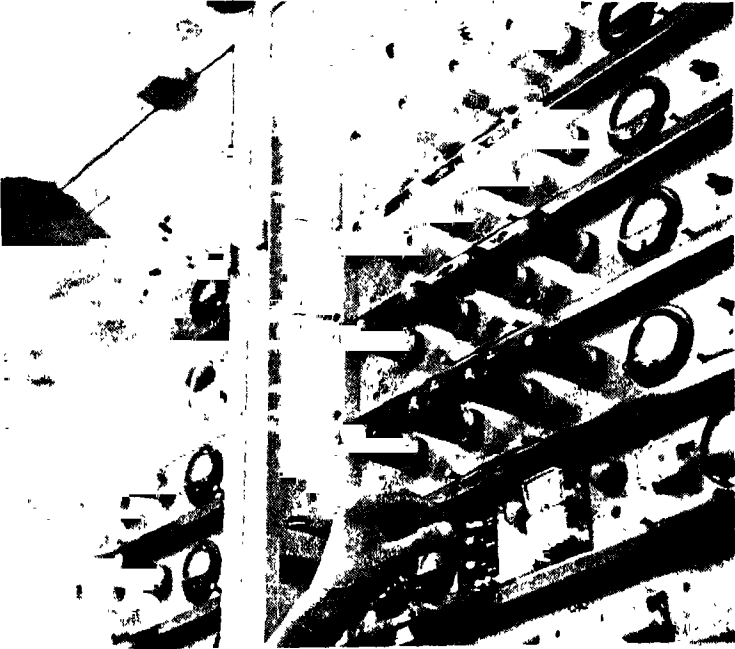
: سیلاب زدگاں کی طبی امداد

: تربیتی مرکز ریلوے (لاھور)

: بین الاقوامی لاسلکی مواصلات

: ڈی-ڈی-ٹی کا کارخانہ (نوشہرہ)

اسی طرح اس ریلوے ٹریننگ سنٹر کو بھی بین الاقوامی حیثیت
مل ہے جو اقوام متحدہ کی فنی امداد کے ادارے نے ۳۔ اپریل ۱۹۵۴ء
اہور کے والٹن کیمپ میں قائم کیا تھا اور اب حکومتِ پاکستان
سپرد کیا جا چکا ہے۔ برطانوی ریلوں کے ایک مشہور سگنل انجنیئر
ٹر فریڈرک گوس کو اس طبقاتی تربیتی مرکز میں پرنسپل لیکچرار کی حیثیت
ہ نامزد کیا گیا تھا جو اب بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس عرصے
ا ریلوں کے کام اور نظام سے متعلق کئی نصاب ختم ہو چکے ہیں۔
ایک کی مدت تین ماہ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں پاکستان
علاوہ بھارت، برما، کمبوڈیا، سیلون، چین (تائیوان) جمہوریہ
یا اور تھائی لینڈ کے ریلوے افسران شامل ہوتے ہیں۔ اس
ز کے لئے ضروری سامان اور آلات برطانیہ، فرانس، جاپان
م اور نیدرلینڈز نے تحفۃً پیش کئے تھے۔ مرکز کے ساز و سامان
آلات کے علاوہ اس موضوع پر تازہ ترین مطبوعات، قواعد
ابط کی کتابیں، رسالے، بڑے سائز کے فوٹو، فلم اور سلائڈ شامل
ں تاکہ طلباء کو ہر بات کے سمجھنے میں پوری سہولت حاصل ہو سکے۔

دنیا کے بہت سے ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی ملیریا کی
عام ہے۔ لاکھوں انسان ہر سال اس موذی مرض میں مبتلا ہوتے
ہزاروں فوت ہو جاتے ہیں اور بچنے والے بھی اتنے کمزور ہو جاتے
کہ عرصے تک کسی کام کاج کے لائق نہیں رہتے۔ اس زمانے میں
ڈی ڈی ٹی کو سب سے زیادہ حیرت انگیز مچھر مار دوا تسلیم کیا گیا ہے۔
چہ کئی مقامات پر ملیریا پھیلانے والے مچھروں میں اس سفوف
، اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے تاہم اس کا
البدل جب تک دریافت نہ ہو، اسی کو غنیمت سمجھا جا سکتا ہے۔
ں ادارۂ صحت اور یونی سیف نے اقوام متحدہ کی ممبر حکومتوں کے
ون سے متعدد ملکوں میں ڈی ڈی ٹی بنانے کے کارخانے قائم
ے ہیں جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ ہمارے ملک میں نوشہرہ کے
ام پر اس کارخانے کا افتتاح ۲ اپریل ۱۹۵۵ء کو ہوا تھا۔
ں وقت سے وہ سو فیصدی تناسب کا تقریباً سات سو ٹن سفوف
سال تیار کر رہا ہے جو مچھر مارنے کی موجودہ مہموں کے لئے فی الحال
ہے۔ آئندہ اس کو وسیع کرنے کا امکان موجود ہے۔ اسی طرح
یین بنانے کا کارخانہ بھی قائم ہو رہا ہے۔ اس دوا کے استعمال
سے کئی فاسد بیماریوں کا انسداد ہو سکتا ہے۔ دونوں کارخانے
پاکستان کی صنعتی ترقی کے ادارے (پی آئی ڈی سی) کے زیرِ اہتمام کام
کر رہے ہیں۔ پنسلین کے انجکشن بھی ملک کی ضروریات کو پورا کرنے
کے لئے کافی مقدار میں تیار ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے اسی ادارے
کے زیرِ اہتمام اب حال ہی میں یونی سیف نے دودھ خشک کرنے
اور اس کا سفوف بنانے والے ایک کارخانے کے قیام کی ذمہ داری
لی ہے تاکہ ملک میں، خصوصاً کراچی شہر میں تازہ دودھ دستیاب
ہونے کی جو دشواری ہے اس کا نعم البدل کسی طرح پیدا کیا جا سکے۔

پاکستان میں یونی سیف کی خدمات کا سلسلہ اتنا وسیع ہے
کہ ایشیا کے امداد پانے والے ملکوں میں اس کا نمبر تیسرا ہے۔
چنانچہ مذکورہ بالا منصوبوں کے علاوہ یہ فنڈ بچوں کے لئے فالتو
غذا کے طور پر دودھ کا سفوف برابر فراہم کرتا رہا ہے جو مدرسوں
اور شفاخانوں کے ذریعہ مستحق بچوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس عالمی
ادارۂ صحت کے تعاون سے پاکستان کے شہروں اور دیہی علاقوں
میں زچگی اور صحتِ اطفال کے کئی سو مرکز قائم کرنے کے لئے ہر قسم کا
ضروری سامان فراہم کیا گیا ہے۔ ان مرکزوں کو ادویہ، سامانِ
خوراک اور صابن بھی دیا جاتا ہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد سے صحتی
عملے میں جو زبردست کمی محسوس کی جا رہی تھی، اس کے پیش نظر
کراچی، لاہور، پشاور اور ڈھاکہ میں تربیتی اسکول قائم کر کے پاکستانی
نرسوں، دائیوں اور ہیلتھ وزیٹروں کو اعلیٰ تربیت دی جا رہی ہے۔
تقسیم کے وقت زچگی کے چار اسپتال کراچی، کوئٹہ، پشاور اور
ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ڈفرن ٹرسٹ کے ماتحت قائم تھے، یونی سیف
نے ان اسپتالوں کو بھی جدید طبی سامان فراہم کیا ہے تاکہ وہ زمانے
کی رفتار کے ساتھ باقاعدہ کام کر سکیں۔ کراچی میں بچوں کے لئے اپنی
قسم کا پہلا اسپتال قائم کیا ہے جس کے لئے پلنگوں سے لے کر
ضروری آلات تک فراہم کئے گئے ہیں۔ اس شفاخانے میں جسمانی
اعتبار سے معذور بچوں کا علاج معالجہ ہوتا ہے۔

آج سے تیرہ سال پہلے پاکستان میں برقی قوت کی کمی تھی۔
بہت سے بڑے بڑے شہروں کے بعض علاقے بھی گھپ اندھیرے
میں تھے اور صنعتی ترقی کے لئے اس کا استعمال تو بہت ہی محدود تھا
اقوام متحدہ نے فوراً اس قوت کے وسائل کو ترقی دینے کے لئے اپنے

ماہرین کی مدد سے منصوبے بنوائے۔ دفناؤں کے تیز دھاڑے اس مقصد کے لئے نعمت ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس وقت ملک کے دونوں حصوں میں برقابی کی پیداوار کو جو ترقی نصیب ہوئی ہے اس میں اقوام متحدہ کا زبردست ہاتھ ہے۔ اگر اس اشد ضرورت کی طرف توجہ نہ دی جاتی تو خود اقوام متحدہ کے قائم کردہ بہت سے کارخانے حرکت میں نہیں آ سکتے تھے۔

ترقی و توسیع کا خواہ کوئی بھی منصوبہ ہو اسے عمل میں لانے کے لئے روپے کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ معقول سرمائے کے بغیر کوئی کام بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس مقصد کے لئے اقوام متحدہ نے ایک طرف پس ماندہ ملکوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بچت میں اضافہ کریں، سرمائے کو بہتر طریقے پر صرف کریں اور ٹیکس وصول کرنے کا نظام سدھار دیں۔ دوسری طرف خود اس نے قرضوں کی صورت میں سرمایہ فراہم کرنے کا انتظام کیا۔ چنانچہ پاکستان کو بھی اب تک عالمی بنک اور بین الاقوامی ایجنسی اداروں سے مختلف کاموں کے لئے متعدد قرضے مل چکے ہیں اور زرِ مبادلہ کی سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے بغیر غیر ملکوں سے ضروری سامان خریدنا ممکن ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ریلوں کی ترقی، زرعی آلات کی خریداری، سوئی گیس کی پائپ لائن کی تنصیب، کراچی میں بجلی کے کارخانے کی تعمیر، کرنافلی پیپر ملز کی توسیع وغیرہ کے لئے قرضے ملے ہیں۔

مذکورہ بالا اور ان جیسے بہت سے کاموں کے پروگرام حکومت نے بڑی احتیاط سے مرتب کرائے تھے اور اس طرح جو کام اب تک ہوئے ہیں، ان کو قابلِ تحسین کہا جا سکتا ہے۔ کچھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں اور باقی کا سلسلہ جاری ہے اور جب تک وہ ختم ہوں، نئے سلسلے شروع ہوتے رہیں گے۔ بعض کاموں کی رفتار بہت کم سست رہی لیکن اس کے سوا چارہ کار نہیں تھا کیونکہ جب غربت ناخواندگی اور بیماری جیسے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہو تو کوئی مہم آسانی سے سر نہیں ہو سکتی۔

بقیہ "پومپیائی کی آخری رات" صد ۶۲

وہی تھا ہمی لیکن اب یہ گھاگھی اور تھا بھی محکوم نہیں تھی، غلام نہیں تھی مظلوم اور سہمی ہوئی نہیں تھی۔ آزاد تھی۔ اس میں زندگی کا رچاؤ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ ٹوٹے ہوئے قانون کے ٹکڑے یکجا ہو گئے تھے۔ ڈوبا ہوا انصاف ابھر آیا تھا۔ قیدخانوں نے منہ کھول دیئے اور بے گناہوں کو اگلنا اور گناہگاروں کو نگلنا شروع کر دیا۔ اس نگلی جانے والی قطار میں سونے کا سوداگر اور لٹیرے کا گروہ پیش پیش تھا۔ ہر طرف انصاف کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

عذراؤں کے خودکشی کے ارادے لاوے میں دب گئے۔ ان میں سے نئی امیدوں اور نئے ولولوں نے جنم لیا۔

اصغریوں کے گھڑے پانی سے بھر گئے۔

کراہتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے گلیوں میں کھیلنے کودنے لگ گئے۔

مرچ مصالحے کی بوریاں جن میں پسی ہوئی اینٹیں زیادہ اور مرچیں کم تھیں بازاروں میں بکھر گئیں۔ گودام سربمہر ہو گئے۔

جھونپڑے گدلے پانی سے باہر نکل آئے اور سپید سپید پختہ مکان بن گئے۔

اندھی گلیاں لاوے سے ابھر نہ سکیں۔

مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔

بادشاہ وہی تھا۔ اس کے محلات کی اونچائی وہی تھی لیکن اس میں جو نیچ پن ہوا کرتا تھا وہ دور زمین کی تہہ میں دب گیا۔

کماندار نے رعایا کو کہا۔ "میں نے ٹوٹا ہوا قانون جوڑ دیا ہے میں نے انصاف کو یکساں تقسیم کر دیا ہے"۔

بادشاہ نے رعایا کو کہا۔ "میں نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ غدار لیڈروں کو چاہئے کہ وہ خود ہی اس ملک سے نکل جائیں"۔

اور تیسری صبح پہلا شخص جو ملک سے نکلا وہ بادشاہ خود تھا!

اُردو یونی ورسٹی" بقیہ ص ۴۹

بقیہ ص ۴۹

رت ہوتی ہے۔ لیکن اُردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا
ے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے میں سب کچھ کرنے
ہوں۔ چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔ کراچی
ردو یونی ورسٹی بن کر رہے گی۔ یہ خود قضا و قدر کا منشا ہے سوال
در سویر کا ہے۔ اگر آپ نے میری مدد کی اور یونی ورسٹی کے
کے وسائل و اسباب مہیا کر دیئے تو یہ جلد بن جائے گی اور میری
ی میں بن جائے گی۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھے مانگنا نہیں آتا لیکن پھر بھی اپنا
سوال آپ کے سامنے پھیلا دیا ہے۔ اب میرے بوڑھے
ں کی لاج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ابھی میرا سوال اپنے
کے عوام سے ہے جن سے ملک کی عزت اور طاقت سب
کچھ ہے۔ جب عوام میری جھولی بھر دیں گے تو یہ دست سوال
حکومت کی طرف بھی بڑھے گا اور مجھے یقین ہے کہ پھر حکومت
بھی اپنا حصہ فیاضی اور فراخ دلی سے ادا کرے گی۔

یہ میرا عہد ہے کہ جب تک قلم میں طاقت اور زبان میں
سکت ہے اردو یونی ورسٹی کی اس پاک مہم کو جاری رکھوں گا۔ ملک
کے چپے چپے کا دورہ کروں گا اور سب سے اپنا درد دل بیان کرونگا
کیونکہ یہ میرا ایمان ہے کہ نونہالانِ قوم کی دماغی و ذہنی نشوونما اس
وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تعلیم کا ذریعہ اُن کی اپنی قومی
زبان نہ ہو گی ؎

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

(ملخص)

* * *

مسلم بنگالی ادب

(بنگلہ سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم اے پی ایچ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی و ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعراء اور ادباء نے کسقدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔ پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور رنگین۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

جسم میں تازگی

ایک پھول کی طرح...
آپ کا رنگ روپ
روز بروز نکھرنے لگے گا!
اصل خوبصورتی کا انحصار صحت مند جلد پر ہے۔ رکسونا صابن سے اپنی جلد
کی حفاظت کیجئے۔ رکسونا میں قدرتی تیلوں کا ایک خاص مرکب کیڈِل
شامل ہے۔ جو آپ کی جلد کے لئے بھی صحت بخش ہے اور چہرے پر لطافت و
جاذبیت بھی پیدا کرتا ہے۔ رکسونا میں پھولوں کی سی دلفریب خوشبو ہے
جو دیر تک آپ کی جلد پر قائم رہتی ہے اور آپ کو تر و تازہ رکھتی ہے۔
روزانہ رکسونا صابن استعمال کیجئے۔ آپ کا رنگ روپ ایک پھول کی
طرح روز بروز نکھرنے لگے گا۔
اپنی جلد کی حفاظت
رکسونا
صابن سے کیجئے
Rexona
RP.19-193UD.

فلمی ستاروں کا سفید اور خوشبودار حسن بخش صابن

پاکستانی ادب کی تشکیل بقیہ صہ ۱۵

میں ابھی ہندوستانیت ہے، دلی اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کی آواز بھی سب کے جدید شعراء کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میر اور غالب عظیم شاعر تھے لیکن ان کی شاعری میں ہندوستانیت جلوہ گر ہے۔ آج کا ہمارا اعلیٰ ادب ہندوستانیت سے جدا ہو کر خاص پاکستانی ہونا چاہئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اردو کے ادیب اور شاعر پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب اور ان کی روایات کے سدا بہار پھولوں کو اردو کے دامن میں ٹانکنا شروع کریں۔ اس طرح جو ادب تخلیق ہو گا وہ پاکستانی ادب ہوگا۔ یہ کام ہفتوں اور مہینوں کا نہیں، اس میں کئی سال لگیں گے۔ "اُدھر نے یہ جگر جمع کن و رنگ بروں آ" کے بعد وہ ادب پیدا ہو گا جس کو ہم اپنا ادب کہہ سکیں۔

تنقیحات برائے بحث:

۱۔ ادب کیا ہے؟ کیا اس کا کوئی خاص مقصد ہے یا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ مقصد فلاح و عافیت یا انفرادی و اجتماعی مسرت ہے؟

۲۔ کیا جدید حیرت انگیز سائنسی ترقیات نے انسانی فطرت اور زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کر دی ہے یا کر سکتی ہے جس سے ادب میں بھی انقلاب لازم آ گئے؟

۳۔ کیا ادب، عوام اور زندگی میں واقعی کوئی بنیادی تعلق ہے؟

۴۔ کیا محدود ملی احساس اور اعلیٰ ادب باہم دست و گریباں ہیں؟ کیا ادب قومی خصائص سے پُر ہوتے ہوئے بلند پایہ اور آفاقی نہیں ہو سکتا؟

۵۔ ادب اور مقصد کہاں تک آپس میں ہم آہنگ ہو سکتے ہیں؟

۶۔ شعر و ادب کے حقیقی معنوں میں تخلیقی اور معیاری ہونے کی علامت کیا ہے؟ کیا ہم نے اس نقطۂ نظر سے پاکستانی ادب کا بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی ہے؟ کیا وہ واقعی جمود کا شکار رہا ہے؟

۷۔ اگر ادب سماج سے لاتعلق رہا ہو تو کیا وہ ادب نہیں ہو گا؟

۸۔ پاکستانی ادب کے نشو و ارتقا کی صحیح نہج کیا ہے؟ کیا ہمارے ادب کو ہندوستانیت سے جدا ہو کر خاص پاکستانی ہونا چاہئے؟ (ادیب)

قبائلی علاقوں میں تعلیمی سرگرمیاں — بقیہ صفحہ ۲۴

اس کی وجہ سے اپنے پیشروؤں سے کہیں زیادہ مستعدی اور ذوق و شوق سے قبائلی علاقہ میں تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھانے میں کوشاں ہے۔ تاکہ قبائلی علاقوں میں زیادہ سے زیادہ ذہنی بیداری پیدا ہو، ترقی کی رفتار اور تیز ہو اور سرحد کے جری لوگ قوم و وطن کی ہر جہتی پیشرفت میں بیش از بیش حصہ لیں۔ حکومت کی اس روز افزوں دلچسپی اور مستعدی کے پیش نظر بجا طور پر بہترین نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے اور قبائلی علاقوں کا مستقبل بہت ہی روشن نظر آتا ہے۔

آزاد کا سفر ترکستان ـــ بقیہ صفحہ ۲۹

فارسی زبان کی ایک لغت تیار کرنے کا بھی تھا۔ مگر یہ منصوبہ پورا نہیں ہو سکا۔ کئی سال بعد لغتِ آزاد کے نام سے جو مختصر سا رسالہ شائع ہوا تھا۔ یہ اسی اسکیم کا غالباً نقشِ اول تھا کہ جسے مکمل کرنے کی انہیں فرصت نہیں ملی۔

سفرِ ایران کے اخراجات اور نایاب کتابوں کی خرید کے لئے آزاد نے اپنی قلیل تنخواہ (گورنمنٹ کالج سے انہیں ڈیڑھ سو ماہوار ملتا تھا) میں سے دس ہزار روپے کی رقم پس انداز کی اور اسے لاہور کے مشہور رئیس نواب نوازش علی خاں قزلباش کو دیکر ان سے ایران کے تجارت خانوں کے نام کی ہنڈیاں لے لیں۔ آزاد کراچی اور بوشہر کے راستے ایران گئے تھے۔ اور شیراز، طہران، اصفہان مشہد اور ہمدان میں جن جن علماء اور فضلاء سے ملے تھے ان کا حال ہمیں سیرِ ایران میں ملتا ہے۔ یہ سفرنامہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں ایران کی علمی اور ادبی زندگی کا نہایت دلچسپ اور پُراز معلومات خاکہ ہے کہ جسے آزاد کے جادو نگار قلم نے تیار کیا ہے۔

ایران کی سیاحت کے بعد آزاد نے لاہور میں دلی دروازے کے باہر درگاہ شاہ محمد غوث صاحب کے عقب میں کتب خانۂ آزاد تعمیر کیا اور جب تک صحت نے ساتھ دیا یہ صبح شام باقاعدگی سے کتب خانے جاتے رہے۔ کتب خانۂ آزاد کے دروازے طالب علموں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اور اس سے طلباء کی ایک کثیر تعداد مستفید ہوتی تھی۔ جب آزاد کی صحت نے جواب دے دیا تو کتب خانہ بند کر دیا گیا۔ اور جنوری ۱۹۱۰ء میں آزاد کی وفات کے بعد ان کے فرزند آغا محمد ابراہیم صاحب نے تمام کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی پبلک لائبریری کے حوالے کر دیا۔ تاکہ جس مقصد کے لئے آزاد نے اسے قائم کیا تھا یہ پورا ہوتا رہے۔ آج بھی یہ بیش قیمت ادبی ذخیرہ "آزاد کولیکشن" کے نام سے پنجاب یونیورسٹی کی زینت ہے۔

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ڈاکٹر صادق کا یہ کہنا کہ آزاد کے سفرِ ایران کی غایت سیاسی تھی، آزاد سے بے حد ناانصافی ہے۔

*

بقیہ "ناطق مکرانی" صفحہ ۴۳

صاحبِ طرز یا مجتہد ہوں۔ اسے مقلد بھی نہیں کہا جا سکتا اگرچہ اس کا سہل اور سادہ انداز ایک طرف مسعود سعد سلمان اور امیر خسروؒ اور دوسری طرف شیخ علی حزیں کی خبر دیتا ہے اور پھر اکبری دور کے رومانوی شعرا کی جھلکیاں لئے ہوئے غالب میں اس طرح ڈھلا ہوا ہے کہ وہ دوسرا غالب معلوم ہوتا ہے۔ نہ وہ بڑا شاعر ہے نہ کچھ ایسا باکمال۔ پھر بھی اس میں کچھ بات ضرور ہے۔ شاید وہ "دستہ دستہ غالب" تو نہیں۔ مگر "جستہ جستہ" ضرور ہے۔ یہیں اس پر ایک چھوٹے غالب کا گمان ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی شاعری اپنی قدامت، رسمیت اور محض غزل گوئی کے باوجود دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ ایسا شاعر نہیں جس پر ہم نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے بے توجہی سے گزر جائیں۔ یہی کیفیت اس کی غالب نما خطوط کی بھی ہے۔ غالباً اس لئے معاصرین ان کو اساتذہ میں شمار کرتے تھے۔ بقائے دوام کے لئے اتنا امتیاز بھی کافی ہے۔

ناطق مکرانی اپنے خیاباں کا واحد پھول نہیں۔ مکران اور بلوچستان کی خاک سے سیکڑوں علمائے کرام ومشائخ عظام شعرائے نکتہ سنج وبذلہ گو، دلیرانِ نبرد آزما وجنگجو، بہادرانِ شمشیر زن وشہ سوارانِ صف شکن، اسخیا رحاتم مثال وکریمانِ نیکو خیال، عاشقانِ پاک باز وعارفانِ محرم راز، زاہدانِ خلوت گزیں ومردانِ خدا پرست وحق بیں پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض آسمانِ مکران و بلوچستان پر ستارہ وار درخشاں ہیں اور بعض گمنامی کی حالت میں دنیا سے چل بسے بقول سعدی۔

بس نامور بزیرِ زمیں دفن کردہ اند
کز ہستیش بزیرِ زمیں یک نشاں نماند

مگر ناطق مکرانی کی حد تک نام بھی باقی ہے۔ اور نشان بھی۔ اس کی پُر لطف شاعری اور دلچسپ مکاتیب سے ہم دیارِ پاک کے اُس قابل قدر ورثہ کا سراغ پاتے ہیں جس نے فارسی ادب کی "بہارِ عجم" کے مقابلہ میں "بہارِ ہند" کو جنم دیا تھا۔ اور جس پر ہمیں آج بھی ناز ہے۔

ایک خاتون پیکر تراش ــــ بقیہ صفحہ ۳۶

بقیہ صفحہ ۳۶

رہی ہے۔ جو بجائے خود تلاش و تجربہ کی ایک طویل مگر دلچسپ داستان ظاہر ہے تاثر کا اظہار مادّی ذریعہ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ جیسے بھی وسیلے اختیار کئے جائیں، ویسے ہی مسئلے اور دشواریاں بھی پیدا ہوں گی۔ یورپ میں وہ پینڈول اور دھاتوں سے زندگی ہی کے نقش پیش کرتی رہی۔ جس قسم کے خیالی تصور تجریدیں کام آتے ہیں وہ ان سے دور ہی رہی۔ وطن واپس آکر اس نے سیمنٹ سے کام لینا شروع کیا۔ یہ ایسا کٹھا ذریعہ ہے جو فن کار کو اپنے تابع کر لیتا ہے۔ نوبرہ نے یکلخت اپنی روش بدل ڈالی۔ اور حقیقت نگاری کی بجائے تجرید کی طرف چلی آئی۔ اس کے ساتھ موضوعات بھی بدل گئے۔ اس سلسلہ میں اپنے دیس کی گڑیوں کھلونوں پر نظر گئی۔ اور اس نے سیمنٹ اور مرمر کی مخلوط، دو بُعد کی چیزیں بنانی شروع کیں۔ موضوع بھی اس کے سامنے ہی تھا۔ مشرقی پاکستان کی دیہی زندگی۔

یہی روش چوبیں پیکر تراشی میں بھی اختیار کی گئی۔ اس میں فن کی کوشش یہ تھی کہ لکڑی میں سنگ تراشی کی سی کیفیت پیدا ہو۔ اس نے روایتی اوضاع و اشکال میں روایت کی بجائے تازگی و جدت ہی پر زور دیا ہے تاکہ ذوق و فن کے تقاضے ہمیشہ بالاتر رہیں۔ اور وہ خود اپنے نقوش میں رنگ دوام پیدا کرے۔ اس کوشش میں وہ بڑی کامیاب رہی ہے جس کا باعث اس کی قدرتی سوجھ بوجھ، سلیقہ، نظم ضبط اور سب سے بڑھ کر وہ "نظر" ہے جو ایک طویل عرصہ کی جہد و ریاضت سے پیدا ہوئی ہے اور وہ زندگی جس کا احساس فن کار کی رگ رگ میں رچا ہوا ہے۔ "سنگی پیرہن" پہننے کے باوجود اس کے پیکر گرم ہیں، جاندار ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر اس خوش گوار فضا کی طرف اشارہ کر دینا بجا نہ ہوگا جس نے "دورِ انقلاب" میں ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فن کاروں کے حوصلے بڑھا دئے ہیں۔ اور وہ اپنے اپنے طور پر ادب و فن کو چار چاند لگانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ نوبرہ نے اپنے ملک میں ایک شاندار نظیر ہی نہیں قائم کی بلکہ ایک نئے فن کی داغ بیل ڈال کر نئی تخلیقی سرگرمیوں کا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔ اور آئندہ بھی امید ہے کہ ان فنی کوششوں کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہو کر نئی نئی ترقیات کی نشاندہی کرے گا۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔
(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔

CAPSTAN
پیجئے اور لطف اٹھائیے
Successors to W.D. & H.O. Wills

سنلائٹ سے یہ کس قدر آسان ہو گیا ہے

سنلائٹ کا نیا جادو اثر جزو کثرت سے جھاگ دیتا ہے جس کی بدولت دھلائی کا کام بہت آسان ہو گیا ہے۔ نہ کبھی مشقت کی ضرورت ہے نہ کوٹنے پیٹنے کی، بس معمولی سا کپڑوں کو ملئے اور دیکھئے کہ سنلائٹ انہیں کتنے ستھرے اور عمدہ دھوتا ہے۔

سنلائٹ سو فیصدی خالص صابن ہے اس لئے اس میں دھلے ہوئے کپڑے زیادہ عرصہ تک چلتے ہیں۔ اس کے بکثرت جھاگ کی بدولت آپ تھوڑے سے سنلائٹ سے بہت سارے کپڑے دھو سکتی ہیں اور اس کا ملائم جھاگ آپ کے ہاتھوں کی جلد کو بھی خراب نہیں کرتا

New SUNLIGHT SOAP

SUNLIGHT SOAP

سنلائٹ صابن

آپ کے بیشتر کپڑوں کو

سفید اور اُجلے

دھوتا ہے!

S.25-103 UD

سب ایک دوسرے
سے پوچھتے ہیں!

"کہیے مزاج کیسا ہے؟"

یہی وہ الفاظ ہیں جو ملاقات کے وقت سب سے پہلے زبان پر
آتے ہیں۔ مگر کیا سچ ہے اس کا جواب ہمیشہ درست اور حسب دلخواہ
ہوتا ہے؟ صحت کی طرف تھوڑی سی توجہ ہماری بہت سی عام
شکایات کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

ماء اللحم کا استعمال خصوصاً اس موسم میں ہماری صحت اور توانائی کی
ضمانت ہے جدید طبی تحقیق کی مدد سے اس کے خواص اور خوبی کو کمال تک پہنچا دیا
گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک بن گیا ہے جو
صحت اور شباب کو قائم رکھتا ہے۔

ماء اللحم دو آتشہ

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

جلد ۱۳ — شمارہ ۱۱

مدیر: رفیق خاور — نومبر ۱۹۶۰ء — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: [illegible] — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی — فی کاپی: [illegible] آنے

[illegible]

"جاڑے کی چاندنی" [illegible]

[illegible]

درس و تدریس [illegible] اور روشن [illegible] کی [illegible]

نوی خاص تصنیفیں [illegible] بھیجے گئے ہیں ہم ان تمام حضرات کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کی مثال دوسرے ادیبوں کو بھی ایسا ہی اچھا عمل کرنے کی ترغیب دلائے گی اور وہ اب اپنے اپنے طور پر علم و ادب ہی نہیں ملک و قوم کو بھی چار چاند لگانے کی کوشش کریں گے جس سے یہ خیال حقیقت ثابت ہوگا کہ:

ع بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

اس حوصلہ افزائی و قدردانی کی بنا پر امید ہے کہ آئندہ جو کتابیں پیش کی جائیں گی، ان کا معیار بلند تر ہوتا چلا جائے گا۔

یہاں یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ "جاڑے کی چاندنی" کے متعدد افسانے "ماہِ نو" ہی میں شائع ہوئے تھے۔

"پاکستان رائٹرز گلڈ" اور اس کی روح رواں، جناب قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی، بھی خصوصیت سے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی جد و جہد سے ایک ایسا مہتم بالشان ادارہ قائم ہوا جس کی بدولت پاکستان اور اس کے شعراء و ادبا کا نام تمام دنیا کی محفلوں میں چمک اٹھا ہے۔ اور جوں جوں وقت گزرتا جائیگا ان کی آب و تاب اور بھی بڑھتی جائے گی کیونکہ یہ طے پایا ہے کہ انعامات ایک شاندار تقریب خصوصی میں پیش کئے جائیں گے جن میں دنیا کے بعض نامور ادیب بھی شریک ہوں گے۔

اربابِ قلم کی بہبود و خوشحالی اور عزت افزائی کی طرف یہ قدم نہایت مستحسن ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس سلسلہ میں اور بھی نہایت مفید قدم اٹھائے جائیں گے۔ ادیبوں کی آسودگی و خوشحالی نہ صرف علم و ادب کی ترقی کی ضامن ہے بلکہ زندگی کے لئے بھی ترقی و توانائی کا باعث ہے۔ کیونکہ یہی لوگ اس کا دل و دماغ ہیں۔

فی الحال صرف ان تصانیف کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو [illegible] تحقیقی و غیر تحقیقی کا [illegible] تصنیف، یا خدمت، [illegible] اور تبصرہ [illegible]

[illegible] کی [illegible] ہیں [illegible] بعض اوقات کوئی [illegible] مثلاً "مقدمہ شعر و شاعری"، "شعر العجم"، "الفاروق" [illegible] زیادہ حسن کی اشاعت کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارا معیار تمام تر کسی تصنیف یا خدمت کی حقیقی قدر و قیمت ہوتا ہے۔ اگر اس کے برعکس روش اختیار کی جائے تو بعض شہ پارے اور قابل جواہر پاروں کے محروم توجہ رہ جانے کا احتمال ہے۔

تبصرہ:

"اردو نامہ"

ترقی اردو بورڈ۔ کراچی کا سہ ماہی رسالہ۔

نگران: جناب ممتاز حسن

ادارۂ تحریر: جوش ملیح آبادی مدیر اعلیٰ و مشیر ادبی۔

شان الحق حقی، رکن معتمد اعزازی

ملنے کا پتہ: ترقی اردو بورڈ، شاہراہ خشتل بیگ [illegible] روڈ۔ کراچی ۔۲۹

کوئی تین سال ادھر ترقی اردو بورڈ۔ کراچی کا قیام اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ اردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی کے لئے ہر ممکن جد و جہد کی جائے۔ چنانچہ ایک متنوع پروگرام مرتب کیا گیا جو اردو لسانیات، تدوین لغت، مسئلہ رسم الخط، تحقیق الفاظ، فراہمی اسناد، اشاعت کتب وغیرہ پر مشتمل ہے۔ سہ ماہی "اردو نامہ" بورڈ کا تازہ ترین علمی اقدام ہے جس کا مقصد اس کی سرگرمیوں اور نتائج تحقیق کو پورے اہتمام کے ساتھ بروئے کار لانا ہے۔ یہ مجلہ اہم معلومات کا نہایت اہم ذخیرہ مہیا کرتا ہے۔ رسالہ کی نسخ میں طباعت ٹائپ کو مقبول بنانے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔

شمس العلماء محمد حسین آزاد مرحوم پر ڈاکٹر محمد صادق صاحب کا مقالہ بوجوہ شائع نہیں ہو سکا۔ اس کو دسمبر کے شمارہ میں شامل کیا جائے گا۔

"بے ساز و صدا"

فاطمہ تبسم فاروقی

اک ستارہ تھا نگاہوں سے جو روپوش ہوا

ایک نغمہ تھا فضاؤں میں جو خاموش ہوا

ایک میں ہی تو فسردہ نہیں اٹھنے سے ترے

تیرے ماتم میں جہاں محوِ غمِ دوش ہوا

تو نے دنیائے تغزّل کو ضیا بخشی تھی

شعلۂ طور سے سو طور ضیا پوش ہوا

نغمہ چھیڑا جو کبھی سازِ فسوں پر تو نے

ہونٹ ہلتے ہی زمانہ ہمہ تن گوش ہوا

"آتشِ گل" سے کبھی رند نے پی لی جو شراب

جام ہونٹوں سے لگاتے ہی وہ مدہوش ہوا

نکہت و مستی بھی ہے باقی تری رنگینی بھی

کون کہتا ہے کہ گلشن سے تو روپوش ہوا

یوں تو دنیا سے چلے جاتے ہیں رندانِ ادب

آج تک ان میں سے کوئی بھی فراموش ہوا!

بیادِ سالک مرحوم!

"سازِ بے صدا"

رشید نثار

عالمِ شوق تجھ سے رنگا رنگ

نغمہ و شعر کی صدا تھا تو

تیرے الفاظ موجِ نکہت و گل

بربطِ خلد کی نوا تھا تو

تجھ سے پائی ادب نے رعنائی

نکہت و نور کی فضا تھا تو

تیرے آدابِ دوستی کے طفیل

شمع میں ہے خلوصِ پروانہ

مصلحت کوشئ سیاست نے

تجھ سے پائی متاعِ رندانہ

تیرے خونِ جگر سے ہے لبریز

جراتِ آرزو کا پیمانہ

تیری آنکھوں کی ضوفشانی سے

جل رہا ہے چراغِ میخانہ

کیسی دشواریوں سے تو گذرا

فاتحانہ قدم بڑھائے ہوئے

منزلِ عشق کے اندھیروں میں

آنسوؤں کے دیئے جلائے ہوئے

تیرے ذراتِ فکر کی لو سے

ماہ و انجم ہیں جگمگائے ہوئے

تیری تحریر کی لفاست سے

کہکشاں ہے نظر چرائے ہوئے

"نغمہ ہے اور صدا نہیں"

(جگر مرحوم : ایک تقریب)

رفیق خاور

"آتش گل بجھی بجھی، شعلۂ طور سرد سرد"۔ ایک محبوب الشان، ایک مقبول شاعر کی وفات پر اس احساس کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ آنسوؤں کی کہر ایسے ہی ہر چیز کو گہنا دیتی ہے۔ اس لئے اگر آتش گل بجھی بجھی دھندلی دھندلی اور شعلۂ طور سرد سرد، کجلایا کجلایا ہوا محسوس ہو تو کچھ عجب نہیں۔ ورنہ درحقیقت شعلۂ طور اسی طرح روشن ہے اور آتش گل اسی طرح شعلہ زن۔ جگر کی زندگی میں ہم ان کی روشنی سے بھی متاثر ہوئے اور حرارت سے بھی۔ اب ان کی وفات پر کیا کیفیت ہے، اس کا اندازہ لگانا ضروری بھی ہے اور اہم بھی۔

عام طور پر جگر کو بھی "تو از قبیلۂ عشقی و ظیفہ ات غزل است" کے تحت لایا جاتا ہے۔ ان کو غزل ہی کے دامن سے وابستہ کیا جاتا ہے جو "حرف زدن بہ زناں" ہونے کی بنا پر حسن و عشق کے لئے مناسبت خاص رکھتی ہے۔ مگر تغزل تو محض ان کی شاعری، ان کی کائنات کا ایک حصہ ہے۔ جو کتنا ہی نمایاں سہی پھر بھی جز ہے، کل نہیں۔ کائناتِ فطرت کے نمونہ پر یہ بھی جہانِ معنی کی ایک ہی جہت ہے۔ اور اگر ہمارا منتہائے مقصود جہانِ بے جہت ہے تو ہمیں لامحالہ اس عالمِ اکبر ہی پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی نہ کہ غزل کے عالمِ اصغر پر۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ جگر کے یہاں غزل کے علاوہ نظم بھی ہے اور ان کی شاعری کا جائزہ اس وقت تک جامع نہیں ہو سکتا جب تک ان دونوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ وقیع اور بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ اس کائنات کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اس کا خمیر کیا ہے اور وہ جوہرِ اصلی کیا ہے جس سے اس کے گوناگوں مظاہر وجود میں آئے ہیں۔ جب تک اس بنیادی حقیقت کا تعین نہ ہو شاعر اور اس کے کلام کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کا تعین بھی ممکن نہیں۔

"معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود"۔ اس کی صداقت میں شبہ نہیں مگر خونِ جگر محض خونِ جگر کیوں ہو۔ محض احساس و تاثر؟ شاعری محض سوز و گداز ہی نہیں۔ جس چیز کو ہم خونِ جگر اور سوز و گداز سے تعبیر کرتے ہیں وہ ایک وسیع تر مفہوم کو محیط ہے۔ "شعر مرا گرچہ سوز از دل گرفت"، بجا مگر اس سوز، اس وجدانی احساس میں شاعر کا دل و دماغ، اس کی پوری شخصیت، ساری کائنات شامل ہوتی ہے۔ وہ تمام دنیا جس سے وہ اور اس کے تصورات، اس کا شعور و ذوق و فن ابھرتے اور اسی میں نمو پذیر بھی ہوتے ہیں۔ اس کی ذات محض ذات ہی نہیں ہوتی، بلکہ حلقہ در حلقہ اور انجمن در انجمن ہوتی ہے۔ ایک کثرت آمیز وحدت، سینکڑوں خارجی و داخلی عناصر کی شیرازہ بند، مفرد نہیں مرکب۔ لہٰذا اس کا وہی جائزہ زیادہ صحیح ہوگا جو زیادہ سے زیادہ جامع ہو۔

اسی طرح معجزۂ فن سے مراد وہ آفریدہ پیکر ہی نہیں جو عملِ تخلیق سے بروئے کار آتا ہے۔ بلکہ وہ سلیقہ ہے جو خونِ جگر کو مظاہرِ فن کی شکل میں جلوہ گر کرتا ہے۔ کوئی معجزۂ فن اس وقت تک معجزہ نہیں بن سکتا جب تک اس میں ہنر و فن کو دخل نہ ہو۔ اور یہ بجائے خود ایک بسیط تجزیہ کے مستحق ہیں۔ ہر مطالعہ جس میں اس اہم پہلو سے تغافل برتا جائے تشنۂ تکمیل رہے گا۔ معنی و فن کے یہ دونوں مقدمات ایسا اصل الاصول مہیا کرتے ہیں جس سے کسی طرح قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک جگر کا تعلق ہے اس اصل الاصول کو معنی و فن دونوں کے اعتبار سے ملحوظ تو رکھا گیا ہے۔ مگر ایسے کہ کا درست طور پر اطلاق نہیں ہو سکا اور اس کی روح کافی حد تک مسخ ہو گئی ہے۔ یہ کہ جگر بنیادی طور پر غزل ہی کا شاعر ہے۔

اس کی روح غزل ہی کی روح ہے، بڑی حد تک درست ہے۔ اس لئے اس کا "رئیس المتغزلین" اور "شہنشاہِ متغزلین" یہاں تک کہ "خاتم المتغزلین" قرار دیا جانا قابلِ فہم ہے لیکن یہ کہ جگر غزل ہے اور غزل جگر۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں، یا یہ کہ جگر تمام تر غزل ہی سے وابستہ ہے، محلِ نظر ہے۔ اس لئے کہ جگر کے یہاں ماورائے غزل بھی ہے کچھ بات۔ اور محض اس حد تک ہی نہیں کہ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ قدرتی، ملی، مذہبی، آفاقی، اور حسن و عشق کے علاوہ دیگر موضوعات سے بھی سروکار رکھا ہے۔ بلکہ شاعر اور اس کا کلام وضع و بیان میں کسی وسیع تر رنگ و کیفیت کا حامل ہے، جس کا غزل اور اس کی زبان و انداز ایک پرتو ہیں۔ اگرچہ یہ پرتو اس قدر نمایاں ہے کہ اس پر تمام تر غزلیہ ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اگر ہم شاعری کی اُس سمت و فضا کو پیش نظر رکھیں جو روایات کی شکل میں برصغیر سے کہیں دور، ایران تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہ دیکھیں کہ برصغیر میں پہنچ کر یہ کن کن سانچوں میں ڈھل گئی، تو ہمیں جگر کی شاعری تک پہنچنے والے سلسلے اور ان کے مخصوص تیور صاف محسوس ہوں گے۔ ہمیں جگر کی شاعری کے رگ ریشے انہی سلسلوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔

کچھ ایسی ہی رنگ آمیز کیفیت معنوی اعتبار سے بھی نظر آتی ہے۔ ایک ذہنی التباس! یہ کہ غزل ایک صنف ہی نہیں، ایک زندگی، ایک تہذیب، ایک روایت، ایک تصور، ایک علامت ہے۔ تہذیب نے غزل کو ابھارا ہے اور غزل تہذیب کو سنوارتی ہے۔ لہٰذا وہ ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ یہ وہ تفاوت رہے ہے جو ہمیں حقیقت سے بہت دور لے جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر اس کی اوپر اس احتیاط سے بیش بندی کی گئی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ غزل ہمارے دیس کی پیداوار نہیں۔ یہ ایک اجنبی صنف ہے۔ اُسی طرح جس طرح آزاد شاعری اجنبی ہے۔ نہ اسے ہماری تہذیب اور زندگی نے جنم دیا اور نہ یہ ان کے سانچے میں ڈھلی ہے۔ اس کا سلسلہ براہِ راست ایران کی طرف جاتا ہے۔ جس سے کئی دیگر اصنافِ سخن کی طرح یہ بھی حاصل ہوئی۔ اور تہذیب یا زندگی بھی جس سے اس کا خمیر اٹھا۔ ایران ہی کی تہذیب و زندگی ہو سکتی ہے۔ مگر بظاہر اس صنف کا ایرانی تہذیب یا زندگی سے کوئی بنیادی تعلق نظر نہیں آتا۔ سوائے یہ کہ اتفاق سے ایک صنف ظہور پذیر ہو گئی جس میں کسی خاص قوم یا ملک کی جھلک خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ خواہ یہ جھلک بھی کچھ ایسی نمایاں نہ ہو۔ یہی کیفیت کم و بیش برصغیر پاک و ہند میں ہے ہم نے غزل کو اپنا لیا ہے۔ اور آج بھی اس کی وضع، اس کے مزاج، اس کے خد و خال بڑی حد تک ایرانی ہی ہیں۔ اگرچہ بہرطور آباد ویاتی شاعری کی طرح اس میں بھی یہاں کی دھرتی اور لوگوں کا عکس پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس سے یہ صنف ہماری تہذیب کا آئینہ نہیں بن جاتی اور نہ ان دونوں میں کوئی روح و قالب کا تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اور غزل کے ذریعہ گفتگو کرنے کا سلیقہ آجانا تو ایسی بات ہے جو یکدم بحث بلکہ خود گفتگو کو بھی بلندی سے پستی پہ لے آتی ہے۔ کیونکہ غزل کی مخصوص زبان سہی اور عاشقانہ ہے۔ لہٰذا اثر کا سوال بھی خاص معنوں میں شہرۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ اگر زبان و اثر ہی کا سوال ہے تو ــــ اپنی دنیا سے پرے اور بھی دنیائیں ہیں۔ ہر اعلیٰ درجہ کی شاعری میں یہ دونوں چیزیں خاصے بلند پیمانے پر نظر آئیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل ایران میں مثنوی، قصیدہ وغیرہ کی طرح ایک صنف ہی تھی۔ اور صنف ہی رہی۔ ابتداً مسلسل غزل گوئی کی طرف میلان رہا۔ اور قافیوں سے زیادہ احساس و معنی پر زور تھا۔ رفتہ رفتہ قافیوں پر توجہ بڑھتی گئی جس سے موجودہ قسم کی متفرق غزل کا رواج ہوا جو بالآخر انتہائی درجہ کی خارجیت اور میکانیت پہ منتج ہوا۔ اور اسی کے خلاف ردِ عمل بھی ہوا۔ چونکہ دورِ کہن میں اور کوئی صنف غزل کی حریف تھی ہی نہیں اس لئے مشرقیت یا مشرقی مزاج سے مطابقت کے نظریئے سے قطع نظر اکثر شعرا نے اس کو ذریعۂ بیان بنایا۔ "ذریعۂ اظہار" ہم نے قصداً نہیں کہا کیونکہ اظہار کے لئے جذبات و افکار کی پہلے ہی سے موجودگی لازم ہے جو بالعموم قافیہ کی مدد سے بعد میں وضع کئے جاتے ہیں۔ اس کثرتِ استعمال کی وجہ سے ہماری زندگی و تہذیب کی کچھ جھلکیاں پیدا ہو گئی ہوں تو کیا بعید ہے۔ بہرحال جب کوئی صنف اس درجہ مقبول ہوا اور اس کا صدہا سال رواج رہے تو اس میں ایک مستقل روایت کی بنیاد پڑ ہی جاتی ہے۔ ہمیں فارسی شاعری کے ابوالآبا، رودکی سے غزل کی یہ روایت برابر بڑھتی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ حافظ میں بہت ہی نمایاں صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اس روایت کے بعض پہلو بالخصوص نمایاں ہیں۔ خواہ انہیں ایرانِ قدیم کا مدفن تصور کیا جائے یا اسلام کے خلاف ردِ عمل کا نتیجہ۔ بادہ و جام کا سلسلہ جمشید تک پہنچتا ہے اور یہ جم کی رگ رگ میں

صدر پاکستان کا دورۂ آزاد کشمیر

ہر کہیں عوام کے ساتھ

عوام کے نمائندوں سے تبادلۂ خیال

کوہالہ میں ہوائی سکاؤٹوں سے بات چیت

سرفروشان آزادی سے خطاب

"بے ساز و صدا"
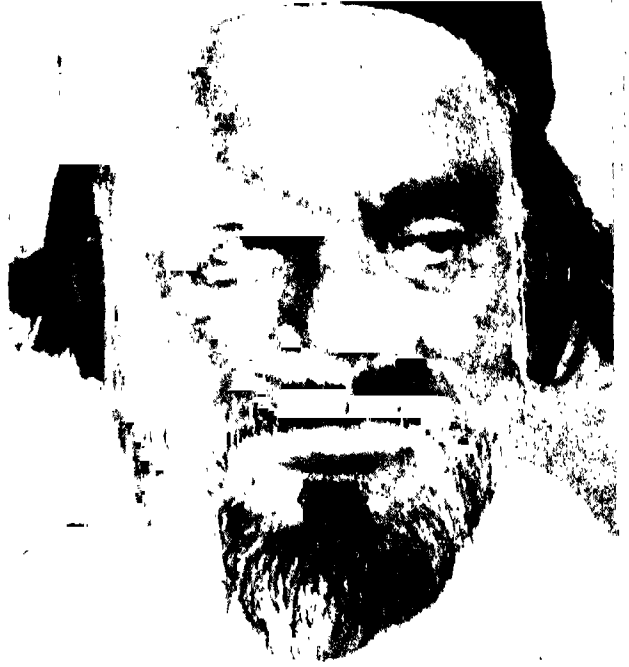
جگر مرادآبادی (مرحوم)

مولانا عبدالمجید سالک (مرحوم)

زبان، تجربات کے اظہار کی صداقت، خلوصِ عقیدت، ذہنی افتاد
[illegible]

یہاں تو عشق کے جلوے ہیں الامان
خاص ہے حضرتِ اصغر سے طبیعت جگر کو

اصغر و جگر دونوں شدت سے "جمالِ بے جہت" کے دلدادہ ہیں۔ ایک حسنِ منزہ کا، دوسرا مجرد۔ دونوں کا منتہائے مقصود ہے۔ اسی لئے اپنے فکر و فن کو بھی منزہ و مجرد دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جگر بار بار حسنِ بے جہت، ساز بے صدا، نغمۂ بے ساز و صدا، رنگِ بے رنگی اور [illegible] کا ذکر کرتے ہیں۔ انہیں رنگ کے بجائے بے رنگی سے انس ہے۔ اس لئے انہیں شاعری میں رنگ آمیزی کی بہ نسبت حسنِ انشا زیادہ پسند ہے۔ اور جوں جوں ان کے فکر و فن میں بالیدگی پیدا ہوتی گئی، وہ اور بھی بے رنگی کے گرویدہ ہوتے گئے جو تجرید اور حقیقت کا دوسرا نام ہے۔ "آتشِ گل" میں جو ان کی زیادہ پختہ عمر کی تصنیف ہے، یہ مجموعی احساس خاصا شدید رہتا ہے۔ بلکہ شاعر نے "شعلۂ طور" میں خود ہی اس کی تصدیق کر دی ہے:

"میں تشبیہات و استعارات کو بالطبع پسند نہیں کرتا اور ان چیزوں کی بہتات کو عجزِ طبع کی دلیل سمجھتا ہوں۔" یہ اتنا عجزِ طبع کا وجدانی احساس نہیں تھا جتنا "جمالِ بے جہت" کو کمالِ بے جہت سے نمایاں کرنے کی تمنا ہے۔ جلوۂ حسن ذاتی کو بے پردہ اور بمراد العین دیکھنے کی تمنا ہی آخر ترک ہے [illegible] ادبی کیف، مجازی شے اس کا باعث ہوئی جو دراصل مجاز کے "ترکِ ترک" اور طلبِ حقیقت کا نتیجہ ہے اور رومان پسندی سے اصلیت اور واقعاتِ عہد کی طرف التفات کی محرک ہوئی۔ جگر کو اپنے ہم چشموں سے زیادہ زمانہ دیکھنا نصیب ہوا اور ان کے مشاہدہ میں کتنی ہی باتیں آئیں جن سے دوسرے محروم رہے۔ اس لئے وہ محض روایت کی حد سے آگے بڑھ گئے۔ اس مضمون آفرینی سے جو حقیقی احساس سے کہیں زیادہ روایتی [illegible] اور عام [illegible] انسانی المیہ کا احساس کیا جس کی حیثیت ذاتی کی بجائے اجتماعی ہے۔ لکھتے ہیں:

چشم کشا جانبِ رزم گہہ وطن نگر
مقتلِ کانپور ہیں لاشۂ بے کفن نگر
نالہ [illegible]
نوحۂ حریت [illegible] لب و دہن نگر

دشمنو! آدم [illegible]
چشم کشا [illegible] اہرمن نگر

یہ لے "آتشِ گل" میں بڑھتے بڑھتے ایک مستقل آہنگ ہو گئی ہے۔ اور آہنگ شدید و والہانہ۔

ہمارے ہاتوں جینے کی ہوس کیا
نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل
ہم سے پوچھو ستم کے احسانات

اے سہاروں کی زندگی والو
کتنے انسان بے سہارے ہیں

یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

منڈلائے ہوئے جب ہر جانب طوفان ہی طوفاں ہوتے ہیں
دیوانے کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دست و گریباں ہوتے ہیں

ان میں کتنا وسیع تجربہ رچا ہوا ہے۔ خالص مشاہدہ، تمام تر چشم دید حالات کا مرقع۔ قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد ہزاروں مظلوموں کی خونریزی، ان قطروں کا بہاراں ہونا۔ "پھر آسودۂ ساحل" ہونے پر بھی طوفان ہی طوفان اور وہ بھی خاموش ہی خاموش اور خود ساحل کا لفظ غمازی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہماری دو ساحلوں کی سرزمین پر کیا کچھ خاموش مگر نہایت خطرناک طوفان نہیں آئے۔ حقیقی طوفان ہی نہیں جیسے کہ ابھی ابھی مشرقی پاکستان میں آئے ہیں بلکہ درپردہ، غیر مرئی طوفان۔ جو کہیں اب آکر دورِ انقلاب اور اسکے اولوالعزم سربراہ سے دور ہوئے ہیں۔ جب یہ طوفان فی الحقیقت چاروں جانب منڈلا رہے تھے تو چند دیوانے ہی آگے بڑھے، الجھے، دست و گریباں ہوئے اور ان پر غالب آ گئے۔ اب یہ مشاہدات پاکستان سے متعلق ہوں یا ہندوستان سے بہرحال شاعر طوفانِ حوادث سے بددل و بدگمان نہیں بلکہ [illegible] فطرت کے باعث اسے یہ توقع رہی کہ:

یہ صحن و روش یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

جگر اس نئی نسل [illegible] آزادی [illegible] داغ داغ اجالا شب گزیدہ سحر پر جو ہیں حاصل ہوئی ہیں چمک زن ہو گئے ہیں

کام ادھورا اور آزادی
نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی
سایہ ہے لیکن روشن روشن

★

ناز جس خاک وطن پر تھا مجھے او جگر
اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے
پھرتے ہیں خون حب وطن سے دھوئیں دھوئیں
سینے جو آتشوں کے سمندر لئے ہوئے
ساز حیات ساز شکستہ ہے ان دنوں
بزم خیال جنت ویراں ہے آجکل
انسانیت کہ جس سے عبادت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آجکل
سرمایہ داریوں کی طرفداریاں ہیں سب
لیکن مفاد عام کا فقدان ہے آجکل

آخری شعر میں شاعر عین جدید مشینی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے خلاف شدت سے رد عمل کرتا ہے۔ اور وہ شاعروں کے تنزل پر بھی آہ و افسوس بھرے نہیں رہ سکتا۔

نسبت اب اس کو شاہد و مشہود سے کہاں
شاعر ہے اور پیکر عریاں ہے آج کل

جگر کی یہ تنبیہ دیکھئے اور پھر وہ انقلاب کی کارفرمائی

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ بے پردہ شہود
فطرت کا انتقام خراماں ہے آجکل

اور پھر یہ ارشاد:

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

جگر کا سب سے اہم [illegible] ہے کہ [illegible] ظلمات میں بھی اپنے خواب جمال کو سمجھتے نہیں اور [illegible] آرزو مند رہتے ہیں:

کہاں جان منتظر، آ بھی اے آفتاب شوق
تیرے بغیر زندگی کب سے ہے شام بے سحر

اسکے علاوہ ان میں غیر معمولی جرأت و ہمت پیدا ہوتی ہے جو انہیں دوسرے شاعروں سے ممیز کرتی ہے۔ وہ اپنے ہی طور پر "خودی کو کر بلند اتنا" کی راہ پر جا نکلتے ہیں اور پھر وہاں بلند اور اسے ہمت مردانہ" کا ترانہ سنانے ہوتے ہیں اقبال کے ہم آواز ہوتے ہیں۔ وہ لیکن اقبال کے انداز میں خدا کے ساتھ ساتھ خود پر بھی زور دیتے ہیں جو ان کی خصوصیت خاصہ بن گیا ہے،

باتیں ہیں جو وہ مقصود ہے ایک
تیری طلب یا اپنی طلب

صحرا ہے نہ بستی ہے دریا ہے نہ ساحل ہے
جو کچھ نظر آتا ہے اک شعبدۂ دل ہے

اسی لئے وہ سراپا عمل اور سراپا جذبہ و جوش بھی ہیں:

زمانے پر قیامت بن کے چھا جا
بنا بیٹھا ہے طوفاں در نفس کیا

اس طرح جگر اس نئی روایت میں بھی بہ نکلے جس کا آغاز دور جدید میں ہوا۔ بلکہ وہ اس میں زبردستی داخل ہو گئے۔ اسلئے جس پرانی روایت سے وہ وابستہ تھے وہ بھی کسی نہ کسی عناصر اور شعرا کو محیط ہوتی جاتی ہے۔ ان کی فکر اور لفظ و بیان، حسرت، جوش، اختر شیرانی، اقبال اور غالب سے ملتے ہیں یا وہ ان سے ملتے ہیں۔
مگر جہاں تک جگر کے غالب رجحان کا تعلق ہے، وہ عموماً نشیب سے فراز کی طرف بڑھتے ہیں، غالب کی طرح فراز سے نشیب کی طرف نہیں آتے۔ ان امور سے قطع نظر جگر کے یہاں گونا گوں نکات دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم ابھرتے ہی چلے آئیں گے۔ سفینہ جگر اس بحر بیکراں کے لئے ہے۔

★

ایک جوئے کہستاں کی موجِ رواں

(اقبال کے چند نایاب پارے)

عابد رضا بیدار

علامہ اقبال کو جو ہمارے فکری و عملی انقلاب کے سب سے بڑے داعی اور قافلۂ ملّت کے حُدی خواں تھے، ایک شاعر نے "جوئے کہستاں" قرار دیا تھا جس کی موجیں ہمیشہ رواں دواں ہیں۔ انہیں میں سے ایک جدید انقلاب بھی ہے اسلئے اقبال کے حالات اور افکار سے ہماری دلچسپی دائمی ہے۔ اسی بنا پر ذیل میں چند پارے تبرکاً پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ "جوئے کہستاں" کے چند اور پہلو اُجاگر ہو جائیں۔ (مدیر)

اقبال کے کچھ غیر مرتب فارسی و اردو اشعار اور اُن کی ترتیب دی ہوئی ایک درسی کتاب کا دیباچہ اگرچہ ایک حقیر سی پیشکش ہیں پھر بھی یہ ایک عظیم ہستی کے فکر و فن کی علامات ہیں جن سے اس پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے اور چند تازہ معلومات بہم پہنچتی ہیں۔ خالق بڑا ہو یا چھوٹا، عارف بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات ہمیشہ مستِ مئے ذات ہوتا ہے۔ اسلئے ان متفرق پاروں میں بھی اربابِ شوق کے لئے کیف و مستی کا ایک عالم پنہاں ہے۔

ان پاروں میں ایک قطعہ کے علاوہ باقی تمام چیزیں ابھی تک غیر مرتب رہی ہیں اور کلام اقبال سے دلچسپی رکھنے والے شاید ہی ان سے واقف ہوں۔ ذیل میں ایک ایک کر کے ان پاروں کا متن درج کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ تشریح طلب باتوں کی وضاحت کر دی جائے گی تاکہ ان کی پوری اہمیت واضح ہو جائے۔ اشعار اور دیباچے کے مطالعے سے جو بعض اہم نکات ذہن میں آتے ہیں ان کی تفصیل کو بے محل سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اقبال کے سنجیدہ طالب علم جو اصل مخاطب ہیں وہ ان میں خود مناسب پہلو پیدا کر لیں گے۔

اس سلسلہ کی پہلی کڑی ایک فارسی غزل ہے جو رسالہ "تمدن" (دہلی) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ رسالہ شیخ محمد اکرام ("مخزن" والے) اور راشد الخیری نے اپریل ۱۹۱۱ء میں جاری کیا تھا۔ یہ "عصمت" کا بھائی تھا جو اس سے پہلے جاری تھا۔ ایک معیاری پرچہ جو اپنے ہمعصروں سے کسی طرح کم نہ تھا۔

"تمدن" کے پہلے پرچے میں مولوی نذیر احمد، محمد علی، شوق قدوائی، سلطان حیدر جوش، شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، ناصر دہلوی، سید احمد دہلوی کی تحریریں شاملِ اشاعت ہیں۔ اسی میں اقبال کے دس فارسی شعروں کی ایک غزل بھی موجود ہے۔ جو "قند پارسی" کے جلی عنوان اور غزل کے ذیلی عنوان کے ساتھ شائع ہوئی (ص ۳۸)۔ غزل سے پہلے پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم۔اے کا ایک نوٹ ہے۔ مرزا صاحب "تمدن" کے ان مخصوص معاونین میں سے ہیں جن کا "اداریہ" میں بنام شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب نے لکھا ہے:

"حضرت اقبال کے اردو کلام سے ایک زمانہ مستفید ہو چکا ہے لیکن بیام نسبتاً کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جناب موصوف فارسی کلام پر بھی کما حقہٗ قدرت رکھتے ہیں۔ اس صنف میں ان کے لطف زبان اور حسن بیان کا ذیل کی غزل سے اندازہ ہو سکتا ہے جسے تیمناً درج کرتے ہیں۔ ان کی طبع فیاض کا یہ ترشح امید دلاتا ہے کہ "تمدن" کی کشت ... آئندہ بھی ان کے ترشحاتِ قلم سے سیراب ہوتی رہے گی۔ اردو اور فارسی کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ فارسی غزلیات کا اردو رسالہ میں شائع ہونا کسی طرح بھی ناموزوں نہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ "تمدن" آئندہ بھی صاحب کمال شعرا کے فارسی کلام کا نمونہ وقتاً فوقتاً پیشکش ناظرین کیا کرے گا۔"

"سعید"

یہ غزل پیامِ مشرق (ص ۸۲-۱۸۳) میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ ملتی

مشرقی پاکستان:

سجل ہار

شیر افضل جعفری

کشمیر کی مٹیار ہے بنگال کی دنیا
فردوس کی دلدار ہے بنگال کی دنیا

نذرُل کا ادب زار ہے بنگال کی دنیا
جولاں گہِ اشعار ہے بنگال کی دنیا

کرنوں کی پھواروں نے دیا اس کو اُجالا
مہتاب کی ملہار ہے بنگال کی دنیا

پانی بھرے کنعان میں وہ دھان کے یوسف
صد مصر کا بازار ہے بنگال کی دنیا

شاداب ڈھلانوں پہ وہ چائے کی بہاریں
کیا خوب سماں کار ہے بنگال کی دنیا

سرسبز خیاباں میں لہکتی ہوئی پٹ سن
ریشوں کا چمن زار ہے بنگال کی دنیا

اشجار سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گنگا
لہراب کی سرکار ہے بنگال کی دنیا

پُروا کے جھکوروں میں دھنیں گھولتے مانجھی
گاتا ہوا پروار ہے بنگال کی دنیا

وہ گھاس کی باہوں میں اچھلتے ہوئے نالے
برسات کا نشہ کار ہے بنگال کی دنیا

چٹگاؤں کی آغوش میں ہنستے ہوئے بیڑے
ملّاحوں کا گلزار ہے بنگال کی دنیا

وہ کرنا فلی، چلبلے کاغذ کی جنم بھوم
قرطاس کا بھنڈار ہے بنگال کی دنیا

جھیلوں کی بہاروں میں اترتے ہوئے سالو
گھنشامیوں کی ڈار ہے بنگال کی دنیا

آنکھوں میں چھلکتے ہیں جوانی کے فسانے
رومان کی منجدھار ہے بنگال کی دنیا

ایام کی طنّازہ کے پھولوں سے گلے میں
گیتوں کا سجل ہار ہے بنگال کی دنیا

بخشی ہے اسے قائدِ اعظمؒ نے کہانی
شہنازِ طرحدار ہے بنگال کی دنیا

فطرت کی جواں عمر جواں رنگ پری کی
مُسکان کا لشکار ہے بنگال کی دنیا

اُس بُلبُلِ تخلیق کی منقارِ ازل سے
پھوٹا ہوا گندھار ہے بنگال کی دنیا

افسانہ:

رہگذر

انور

کل جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اس نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ سارا واقعہ پرانے زمانے کی کہانیوں اور ڈراموں کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ پرانے زمانے کی کہانیوں اور ڈراموں کے تین حصے ہوتے تھے۔ تمہید، واقعہ اور انجام، تمہید اور انجام کا واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا کیونکہ تمہید میں حمد ہوتی تھی اور انجام خوشگوار ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک ڈرامے "شہیدِ وفا" عرف "داغِ جگر" کی تمہید ملاحظہ کیجئے:

> ڈراپ سین اٹھتا ہے۔ سہیلیوں کی قطار زرق برق لباس میں ہاتھ باندھے کھڑی نظر آتی ہے۔ آجکل ایکٹرسیں ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں سہیلیاں ہوتی تھیں۔ سہیلیاں ان ایکٹروں کو کہتے تھے جو سر پر گھوڑے کے بال باندھ کر اور سینے پر کرکٹ کی گیندیں باندھ کر لڑکیوں کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ سہیلیوں کا کورس شروع ہوتا ہے:

آں آں آں پروردگار تو
پالنہار، کھیون ہار، کرتار تو

ڈرامے کا یہ آغاز ہرگز "شہیدِ وفا" عرف "داغِ جگر" کا آغاز معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تو فلم "کرتار سنگھ" کا ٹریلر معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال فلم "کرتار سنگھ" کا ٹریلر دیکھنے کے بعد آپ کو ڈرامہ "شہیدِ وفا" عرف "داغِ جگر" ضرور دیکھنا پڑے گا۔ اور اس دوران میں آپ کئی دفعہ اپنے آپ سے یہ پوچھیں گے کہ اس ڈرامے کا نام "شہیدِ وفا" عرف "داغِ جگر" کیوں ہے۔ عام طور پر دو ناموں کے درمیان عرف ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ دوسرا نام پہلے نام کی توضیح کرتا ہے۔ مثلاً بلند خاں عرف بلّا ڈاکو یعنی بلّا ہونے کی وجہ سے بلند خاں "بلّا ڈاکو" کہلاتا ہے۔ اس منطق کی رُو سے "شہیدِ وفا" اس لئے "شہیدِ وفا" ہو گیا کہ اس کے جگر پر داغ تھا۔ میرا خیال ہے یہ استدلال ڈرامہ نویس کی توہین ہے۔ اور ہمارے کلاسیکی ادب پر حملہ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ہی ڈرامے کے دو نام ہیں پہلا نام ڈرامہ نویس کا تجویز کیا ہوا ہے اور دوسرا نام اس کی بیوی کا۔ یہ امر کہ ڈرامہ نویس نے اپنے ایک ڈرامے کو اپنے اور اپنی بیوی کے تجویز کئے ہوئے دو ناموں سے موسوم کیا ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی۔ اس زمانے میں ایکٹروں، ڈائرکٹروں اور ڈرامہ نویسوں کو اپنی بیویوں سے بہت محبت ہوتی تھی کیونکہ ابھی ایکٹرسیں سٹیج پر نہیں آئی تھیں۔ لیکن ڈراموں کے ناموں کے بارے میں بحث سراسر تضیع اوقات ہے۔ کیونکہ جب یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اس ڈرامے کا نام "شہیدِ وفا" عرف "داغِ جگر" کیوں ہے، تو یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ جگر مرادآبادی کا تخلص جگر کیوں ہے؟ اور اگر میں جگر مرادآبادی کے تخلص سے متاثر ہو کر اپنا تخلص "گردہ" رکھ لوں تو آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔

اس لئے ڈرامے کے نام کو چھوڑیئے۔ ڈرامے کے انجام پر آئیے۔ ہیرو اور ہیروئین محبت میں ناکام ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں لیکن آپ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ آخری پردہ اٹھتا ہے۔ عاشق و معشوق جنت میں ایک دوسرے کی آغوش میں بیٹھے ہیں۔ سرخ اور سبز مہتابیوں کی روشنی میں ان پر کاغذ کے پھول برسائے جا رہے ہیں۔ پبلک تالیاں بجا رہی ہے۔

لیکن میں تو ایک کہانی بیان کر رہا تھا۔ میری مثالیں پرانے
زمانے کی کہانیوں سے متعلق ہونی چاہئیں۔ میں نے کہا تھا وہ سارا واقعہ
میرے سامنے سے پرانے زمانے کی کہانیوں اور ڈراموں کی طرح
گزر گیا۔ دراصل یہ غلط ہے۔ پرانے زمانے کی کہانیوں میں تمہید
ہوتی ہے۔ میری کہانی میں کوئی تمہید نہیں۔ میری کہانی شروع سے شروع
نہیں ہوتی۔ میری کہانی درمیان میں سے شروع ہو جاتی ہے۔ میری
کہانی صرف یہ ہے:

ایک میلے سفید برقعے میں لپٹی ہوئی بوڑھی عورت ایک
بس سٹوپ پر اتری۔ بس پھر چل پڑی۔ وہ عورت اس بس کے پیچھے
بھاگنے لگی۔

پرانے زمانے کی کہانیاں اس طرح شروع ہوتی تھیں:
ایک تھا بادشاہ! ہمارا تمہارا خدا بادشاہ!

نہیں میری کہانی پرانی کہانیوں جیسی نہیں ہے۔ اب بادشاہ
کہاں ہیں؟ اب تو لوگ کھڑے ہو کر اپنے میں سے ہی کسی کو کہہ دیتے
ہیں: چلو! تم ہمارے ملک اور قوم اور تہذیب کی حفاظت کرو۔ ہم
تمہیں تنخواہ دیں گے۔ اور وہ سر جھکا کر خدمت کے لئے کھڑا ہو جاتا
ہے۔ اب بادشاہوں کی کہانیاں کہاں ہیں۔ اب تو اپنی ہی کہانیاں ہیں۔
اب تو سائنسدانوں فلسفیوں، آرٹسٹوں، ڈاکٹروں، انجینروں، پروفیسروں
کسانوں اور مزدوروں کی کہانیاں ہیں۔ اب کہانیاں درباروں
اور محلوں میں مقید نہیں ہیں۔ اب تو کہانیاں سڑکوں پر بکھری
ہوئی ہیں۔

اور وہ عورت سڑک پر بھاگی جا رہی ہے۔ بس چوک کو
عبور کر گئی ہے۔ سگنل سرخ ہو گیا ہے۔ ٹریفک بند ہو گیا ہے۔ لیکن
وہ عورت بھاگی جا رہی ہے۔ لوگ حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ عورتیں
ہنسنے لگی ہیں۔ بچے شور مچا رہے ہیں۔ اور وہ عورت بھاگی جا رہی ہے۔
اب وہ تھک گئی ہے۔ اس کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔
وہ بائیں طرف کے ٹریفک سے بچتی ہوئی چوک عبور کر رہی ہے۔
اس نے اپنے برقعے کا اگلا حصہ اٹھا کر اپنا چہرہ ننگا کر لیا ہے۔
آخر ٹریفک پولیس کے ایک سپاہی نے اس کو روک لیا۔
"بڑی بی! مرنے کا ارادہ ہے؟"
بڑی بی بڑی لجاجت سے بولی:

"بیٹا! مجھے جانے دو۔ اس بس میں میرا تھیلا رہ گیا ہے۔"
تفریح کے بھوکے راہگیر جمع ہو گئے تھے۔ کسی نے کہا:
"اماں، تمہارا خیال ہے تم بھاگ کر اس بس کو پکڑ لو گی؟"
"اور کیا کروں بیٹے۔ میری بہو تو میری چٹیا کا بال بال
کر دے گی۔"

بڑھیا کے چہرے اور الفاظ پر بے بسی کے گہرے سائے
تھے۔ اس نے رحمناک لہجے میں تماشائیوں سے اپیل کی:
"بیٹو، تم میں سے کوئی بھاگ کر میرا تھیلا لے آئے۔ بس وہ
جا رہی ہے۔"
"کہاں کی بس، اماں؟"
"ملیر کی، بیٹے۔"
"اماں، وہ تو ناظم آباد کی بس ہے۔"
ٹریفک پولیس کے سپاہی نے کہا:
"بڑی بی۔ اب صبر کرو۔ اب کیا ملے گا تمہارا تھیلا۔ کتنے کا
نقصان ہوا ہے؟ کیا تھا تھیلے میں؟"
"ایک ایلومینیم کا ڈبہ تھا جس میں میرے بیٹے کا کھانا تھا۔
اکیس بچوں کی قمیضوں اور فراکوں کے لئے کپڑا تھا۔ میری بہو کے لئے
ایک جوڑے کا جاپانی ریشم کا کپڑا تھا۔ میرے بیٹے نے کہا تھا: میرا
کھانا لے کر آؤ تو کپڑے بھی ساتھ لے آنا۔ درزی کو دے دیں گے۔
میرا بیٹا بھوکا مر جائے گا۔ میری بہو میرے بال نوچ ڈالے گی۔"
"اماں!" کسی نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تمہارے بیٹے کے اکیس
بچے ہیں؟"
"نہیں بیٹا،" اس بدنصیب کے تو صرف نو بچے ہیں۔ تیرہ
بچے میرے بڑے بیٹے کے ہیں، جو پچھلے سال فوت ہو گیا تھا۔ پانچ بچے
میری بیٹی کے ہیں جو پاگل ہو گئی ہے اور شوہر نے گھر سے نکال دی ہے۔
ان میں سے اکیس بچے سکول جاتے ہیں۔ ان کے کپڑے بن رہے تھے۔"
"تمہارا بیٹا کیا کام کرتا ہے، مائی؟"
"قسمت کا حال بتاتا ہے۔ وہ ایک آنہ لے کر طوطے کو
کاغذ کا ایک ٹکڑا لانے کو کہتا ہے۔ کاغذ میں قسمت کا حال لکھا
ہوتا ہے۔"
تماشائیوں میں سے کسی نے ہنس کر کہا:

"اماں، تمہارے لڑکے نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ آج تمہاری قسمت میں چوری لکھی ہوئی ہے؟"

"نہیں، بیٹا، وہ کسی کو بھی ایسی بات نہیں کہتا، تم ہی بتاؤ کہ اگر ایک آنہ لے کر وہ کسی کو ایسی بات کہہ دے تو کیا وہ اس کا سر نہ پھاڑ دے گا؟"

ٹریفک پولیس کے سپاہی نے کہا:

"بڑی بی، تمہارا لڑکا بڑا امیر ہے جو اتنے بڑے کنبے کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ اُس کے سامنے یہ نقصان کونسی بڑی بات ہے۔ وہ بچوں کے لئے اور کپڑے بنوا دے گا۔ جاؤ آرام کرو۔"

"نہیں، بیٹا، اُسے معلوم ہوگا تو وہ اپنا سر پیٹ لے گا۔ اور پھر میرا پیٹ دے گا۔ اور میری بہو تو میرا خون پی جائے گی۔ وہ بے چارہ امیر کہاں ہے۔ چار روز ہوئے اُس نے اپنا ٹیرو الا کوارٹر ڈیڑھ ہزار روپے میں بیچا ہے۔ بڑی مشکل سے الاٹ ہوا تھا۔ اب بیچ کر پھر ہم جھونپڑی میں آ بیٹھے ہیں۔ سب قرضہ اتار کر ڈیڑھ ہزار میں سے صرف آدھے کنبے کے لئے کپڑا خریدا تھا۔"

ٹریفک پولیس کے سپاہی نے پوچھا:

"بڑی بی، تمہارا کتنا نقصان ہوا ہے؟"

"معلوم نہیں، بیٹا، یہی کوئی پچیس تیس روپے کے کپڑے ہوں گے۔"

اس کے بعد جو واقعات پیش آئے اُس نے مجھے حیران کر دیا۔

ٹریفک پولیس کے سپاہی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس روپے کے تین نوٹ نکال کر بڑھیا کو پیش کر دیئے۔

"بڑی بی، لو، بچوں کے لئے پھر کپڑے خرید لینا۔"

لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔ وہ پولیس کے اس سپاہی کو غور سے دیکھنے لگے۔ جیسے وہ دیکھ رہے ہوں کہ وہ پولیس کا سپاہی ہے یا کوئی اور ہے۔ لوگ دو قسم کے آدمیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ جیب کترے سے اور پولیس کے سپاہی سے۔ لیکن یہ کیسا پولیس کا سپاہی ہے۔ اس نے تو اپنی سارے مہینے کی تنخواہ ایک مصیبت زدہ عورت کی مدد کے لئے دے دی ہے۔ اب یہ خود کیا کرے گا؟ اس کے بیوی اور بچے کیا کریں گے! اس کی ایک بیوی اور بے شمار بچے ہوں گے، غریبوں کی کوٹھیاں نہیں ہوتیں۔ کاریں نہیں ہوتیں۔ زمینیں نہیں ہوتیں۔ آمدنیاں نہیں ہوتیں۔ غریبوں کے بچے ہوتے ہیں۔ بچے غریبوں کی جائداد ہے۔ بچے غریبوں کی فصل ہے۔ وہ ان کا بینک بیلنس ہیں۔ وہ ان کی غریبی کے دلدر دھونے والی امیدیں ہیں۔ اس سپاہی کے بے شمار بچے ہونگے۔ وہ اس مہینے میں اپنا گذارا کیسے کرے گا۔

میں کچھ فاصلے پر کھڑا چپ چاپ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

میں اپنے بجٹ کی اجازت کے بغیر کسی کی مدد کرنا پسند نہیں کرتا۔ جب میں اپنے بجٹ کی اجازت کے بغیر کار نہیں خرید سکتا۔ جب میں اپنے بجٹ کی اجازت کے بغیر سنیما نہیں دیکھ سکتا۔ جب میں اپنے بجٹ کی اجازت کے بغیر قیمتی لباس نہیں پہن سکتا تو میں اپنے بجٹ کی اجازت کے بغیر کسی کی مدد کیوں کروں۔ امیروں کا وہ طبقہ بھی جو ہسپتالوں، اسکولوں اور یتیم خانوں کو بڑے بڑے چندے دیتا ہے۔ یہ نیک کام اپنے بجٹ کی اجازت کے بغیر نہیں کرتا۔ ملوں اور کارخانوں کے مالک سال کے بعد اپنی آمدنی اور اخراجات کا حساب کتاب کر کے بیلنس شیٹ میں سے وہ رقم چندوں میں دے دیتے ہیں۔ جو انکم ٹیکس کے طور پر گورنمنٹ کو جانے والی ہوتی ہے۔

لیکن پولیس کا یہ سپاہی بڑا سادہ لوح ہے۔ یہ اقتصادیات کے فلسفے کہاں سمجھتا ہے۔ اُس کی زندگی بجٹ اور بیلنس شیٹ میں کہاں تلتی ہے۔ اس نے تو چپ چاپ جذبات کا جام شہادت پی لیا ہے۔

میں اُس کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس کی نزدیکی نے مجھ پر بہت بُرا اثر کیا۔

میں نے دس دس روپے کے چھ نوٹ نکال کر بڑھیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا:

"بڑی بی، لو! شاید ان روپوں سے باقی کنبے کے کپڑے بھی بن جائیں گے۔"

یہ میں نے کیا کیا۔ یہ ساٹھ[1] روپے تو مجھے ایک کنجوس ایڈیٹر نے ایک افسانے کے معاوضے میں بڑی مشکل سے دیئے تھے۔ اور مجھے ان کی سخت ضرورت تھی۔

ایک تماشائی نے آگے بڑھ کر کہا:

"اور، بڑی بی، یہ پانچ روپے میری طرف سے ہیں۔ کھانے کا ڈبہ خرید لینا اور ہوٹل سے اپنے بیٹے کے لئے کھانا لے جانا۔"

ایک میلے کچیلے کپڑوں والے شخص نے اپنی بیڑیوں کی ڈبیہ میں

---

[1] نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز — مدیر

سے آٹھ آنے نکال کر کہا:

"اور، اماں، یہ تیر کے لئے بس کا کرایہ"۔

بڑی بی کے ہاتھوں میں نوٹ تھے اور منہ میں دعائیں۔

یکایک ایک شخص ہجوم میں گھس آیا۔ اور بڑھیا سے مخاطب ہوکر بولا:

"مائی، یہ تھیلا تمہارا ہے"۔

بڑی بی خوشی سے اچھل پڑی۔

"ہاں بیٹا، میرا ہی ہے"!

"اگلے سٹوپ سے بس کنڈکٹر نے بھیجا ہے"۔

ہجوم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

بڑی بی نے ہجوم سے مخاطب ہوکر کہا:

"بیٹو! اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم نے میرے ساتھ بڑی ہمدردی دکھائی۔ اب یہ پیسے واپس لے لو، مجھے اب ان کی ضرورت نہیں"۔

اُس نے دس دس کے تین نوٹ ٹریفک پولیس کے سپاہی کی طرف بڑھائے۔

ٹریفک پولیس کے سپاہی نے کہا:

"بڑی بی، مجھے ان کی ضرورت نہیں"۔

اُس نے پانچ روپے کا نوٹ اُس کی طرف بڑھایا جس نے اُس کو پانچ روپے دیئے تھے۔

اُس نے کہا:

"بڑی بی، مجھے ان کی ضرورت نہیں"

اُس نے آٹھ آنے اُس میلے کچیلے شخص کو واپس کرنے کی کوشش کی جو اُس نے بیڑیوں کی ڈبیہ میں سے نکالے تھے۔

اس میلے کچیلے شخص نے کہا:

"بڑی بی، مجھے ان کی ضرورت نہیں"

اس نے دس دس روپے کے چھ نوٹ میری طرف بڑھائے۔

میں نے کہا:

"بڑی بی! مجھے ان کی ضرورت نہیں"*

* "شاہ نوٹ" کے پچھلے شمارہ بابت اکتوبر ۱۹۶۰ء میں مضمون بعنوان "نقش پائے رہرواں" مدیر کے قلم سے ہے۔

تارے مسکرائے کیوں؟

سیّد فیضی

مضمحل تھی چاندنی
دور کچھ فضاؤں میں جلوے مضطرب ہوئے
وقت کے چراغ کی روشنی میں پھیل کر
تیرگی کی چادریں سیلِ نور بن گئیں
ورنہ کائنات کیا، زندگی کی بات کیا
اک جہانِ درد و غم، اِک فسانۂ الم
جس کے ارتعاش میں۔
قہقہوں کا زیر و بم، قہقہے قدم قدم
اونگھتی فضاؤں میں نغمے جھولتے رہے
زندگی کے گلستاں یوں بھی پھولتے رہے

ہے مذاق دیدہ وریا کرشمۂ نظر
ہر طرف شگفتگی آئنوں کے عکس میں
آرزو کی تھپکیاں آ چکی ہیں رقص میں
پردۂ خیال پر ناچنے لگا کوئی
دل کی دھڑکنیں بڑھیں، سوزِ زندگی ملا
گرمیاں سی بھر گئیں سانس میں، کسے کہوں
اپنی قسمتوں کی میں ہار دیکھتا نہیں
پھول دیکھتا ہوں میں، خار دیکھتا نہیں

چاند کی زباں پہ ہیں سینکڑوں وہ زمزمے
تارِ غم سے مرتعش جن کی نغمگی ہوئی
رات ظلمتوں کا ایک بڑھتا کارواں سہی
بات کارواں کی ہے، کارواں سے پوچھئے
تارے مسکرائے کیوں، آسماں سے پوچھئے

بنگلہ افسانہ :

دریچہ

از : امین الزماں
ترجمہ: یونس احمر

کون جانتا ہے کہ یہ کہانی جسے میں خونِ جگر سے تحریر کر رہا ہوں، کبھی شائع بھی ہو سکے گی۔ شائع ہو بھی گئی تو کیا شانتی نگر کے "رقیہ وِلا" کی تاج آپا اسے پڑھ سکیں گی۔ البتہ میں اتنا جانتا ہوں کہ تیرہ ماہ اور سات دن کے بعد آج کی شام سے "رقیہ وِلا" کی اوپری منزل کے دریچہ کی سلاخیں پکڑ کر تاج آپا سراپا انتظار بنی کھڑی رہیں گی۔ صبح اور شام۔ اور ان کی نگاہیں نیچے سڑک پر آنے جانے والوں کو حسرت سے دیکھتی رہیں گی۔ وہ دیکھیں گی کہ بچے اپنی آیاؤں کے ہاتھ پکڑ کر اسکول جا رہے ہیں ٹاؤن سروس کی بس تھوڑی دیر کے لئے کاکرائیل کے موڑ پر رک کر تیزی سے شانتی نگر کے اسٹاپ پر آگئی ہے۔ اس اثنا میں سورج اونچے اونچے اور گھنے درختوں کی آڑ میں چھپ جاتا ہے۔ اور پھر شانتی نگر میں شام کی تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے۔ اس سے دو منزلہ عمارت کی روشنی سیاہ پیچ والی سڑک پر پڑتی ہے۔ بچے رمنا پارک کی اور جا رہے ہیں۔ ان کی پیاری پیاری بولیوں سے شانتی نگر میں جیسے نغموں کی پھوار پڑنے لگتی ہے۔ دفتروں سے لوگوں کا کارواں چلا آ رہا ہے اور عورتیں مکانوں کے برآمدوں اور چھتوں سے انہیں دیکھ رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں انتظار کا شعلہ دہک رہا ہے اور سینے میں تمناؤں کی آندھیاں چل رہی ہیں۔

آج تیرہ ماہ اور سات دن کے بعد "رقیہ ولا" کے دریچہ سے تاج آپا ایک بار پھر یہ سارے مناظر دیکھ سکیں گی۔ وہ دیدہ و دانستہ دریچہ کے پاس کھڑی رہیں گی۔ ممتاز آرا خانم یہ مناظر دیکھنے کے لئے مجبور رہیں۔ ان کی تو جیسے عادت سی ہو گئی ہے۔ پورے ساڑھے تین سال کی عادت۔ تاج آپا کی اس عادت کو منجھلی ممانی نے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ تھک ہار کر وہ کہتیں — "جوان لڑکی کو آخر کہاں تک منع کروں"!

صبح سویرے ہی تاج آپا کا خط مجھے ملا۔ یہ خط منجھلی ممانی کی چھوٹی لڑکی کی نہا رلے آئی تھی۔ عجیب و غریب تحریر تھی ان کی۔ مختصر سا خط تھا۔ اب بھی سامنے میز پر رکھا ہوا ہے۔ تین بار پڑھ چکا ہوں اور تینوں بار میرے رگ و پے میں کپکپی سی دوڑ گئی ہے۔

"...... ایک سال بعد میں پھر ڈھاکہ واپس آگئی ہوں۔ تم لوگوں نے میری مرضی کے خلاف شادی کر دی تھی اپریل ہی ماہ کی آٹھ تاریخ کو میری کلائیوں کی چوڑیاں توڑ دی گئیں اور میری آرزوؤں کا گلاب مرجھا کر رہ گیا۔ میں بیوہ ہو گئی۔ چاہو تو ایک بار اپنی تاج آپا کو آ کر دیکھ لو....."

تاج آپا کا رنگ سیاہ ہے۔ جب ان کی عمر اکیس سے اوپر ہو گئی تو منجھلی ممانی کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں۔ مگر تاج آپا کو جیسے کوئی فکر نہ تھی۔ ان کے چہرے پر میں نے کبھی بے اطمینانی کی لکیریں نہ دیکھیں۔ وہ رقیہ ولا میں حسب معمول ہنسی خوشی کے دن گزارتی رہیں۔ کبھی کبھی ممانی کو غصہ آ جاتا اور وہ تاج آپا کو صلواتیں سناتیں :

"لڑکی کو جیسے کوئی غم نہیں۔ میں ہوں کہ اس کی فکر میں مری جا رہی ہوں"!

لیکن تاج آپا ممانی کے طعنے کا جواب نہیں دیتیں۔ البتہ کبھی کبھی کمرہ بند کر کے رو پڑتیں اور مجھ سے کہتیں — "میں شاید اپنی ماں کی سوتیلی بیٹی ہوں"! اور میں ان کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کی اور دیکھ کر بھی کوئی جواب نہ دیتا۔

ایک بار تاج آپا کی شادی کی بات مقبول بھائی کے ساتھ پکی ہو گئی تھی۔ مقبول بھائی کراچی میں ملازم ہیں۔ ممانی کا غم ہلکا ہو گیا تھا۔ تاج آپا کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار پائے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے دس بجے

دینے کہ میں سینما کے ٹکٹ اور افسانوں کا ایک مجموعہ خرید کر لا دوں۔ یہ دس روپے انہوں نے بڑی مشکل سے پس انداز کئے تھے۔ پہلے تو وہ دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے ہچکچائیں۔ میں نے کہا۔ "رونمائی کے پیسے تو کافی ملیں گے آپ کو اور پھر شادی کے بعد تو....." اور پھر تاج آپا نے میری گوشمالی کرتے ہوئے بڑی مشکل سے پیسے دیئے تھے۔

لیکن بعد میں میں پریشان سا ہو گیا۔ شادی کے بعد تاج آپا کراچی چلی جائیں گی۔ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ تاج آپا کو جب میری پریشانی کا علم ہوا تو کہنے لگیں۔ "امین فکر نہ کرو۔ میں ایک سال سے زیادہ کراچی میں نہیں رہ سکتی۔"

اس دوران میں مقبول بھائی ڈھاکہ آئے اور جب انہوں نے تاج آپا کو دیکھا تو شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کا رنگ سیاہ ہے۔ اب تو ممانی کو از سر نو فکر لاحق ہو گئی۔ شانتی نگر کے "رقیہ ولا" پر مایوسیوں کے بادل پھر منڈلانے لگے اور تاج آپا کی امیدوں کے چراغ ٹمٹما کر بجھ گئے۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور جب ان کے دل کی آگ کچھ سرد ہوئی تو انہوں نے مجھ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "امین! تیری تاج آپا کی قسمت بھی سیاہ ہے۔"

مقبول بھائی کراچی واپس نہیں گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد انہوں نے کہیں اور شادی رچالی۔ گھر میں حسین بیوی لے کر آئے۔ برات "رقیہ ولا" کے سامنے سے گزری تھی۔

تاج آپا اور مقبول بھائی کے مکان پاس پاس ہیں۔ کون جانتا ہے کہ اس دن تاج آپا اپنے دریچہ سے مقبول بھائی کی حسین دلہن کو دیکھ پائی تھیں یا نہیں۔

شادی کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد مقبول بھائی کے گھر میں حادثہ ہو گیا۔ ان کی دلہن دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور اس خبر کو سن کر ممانی نے تاج آپا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ "تاج سنا تم نے، مقبول کی دلہن چل بسی۔ خدا بڑا کارساز ہے۔"

لیکن تاج آپا کو یہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔ انہوں نے کہا۔ "امی آپ خوش ہیں۔ اگر میری شادی ان سے ہوئی ہوتی تو؟"

ممانی کو غصہ آگیا۔ "تو میری اپنی بچی ہے مگر افسوس کہ اب تک میں تجھ کو سمجھ نہ سکی۔"

تاج آپا رات بھر دریچہ سے لگ کر روتی رہی تھیں۔ انہیں مقبول بھائی کی دلہن کی موت کا بہت افسوس تھا۔ رات اور گہری ہو گئی۔ تارے آہستہ آہستہ بجھتے جا رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی کا راج تھا۔ ہیبتناک خاموشی۔ اور اس ہولناک سناٹے میں تاج آپا خیالوں کے گرداب میں پھنس گئیں۔ وہ بھی ایسی ہی تاریک اور پرسکوت رات تھی۔ مقبول بھائی اور ان کی دلہن کو انہوں نے دریچے کے سامنے دیکھا تھا۔ دونوں چپ چاپ تھے۔ بعد میں تاج آپا نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تھا۔

اس کے بعد تاج آپا شادی کرنے پر کبھی رضامند نہ ہوئیں۔ جب بھی شادی کا ذکر چھڑتا وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی جاتیں۔ انہوں نے ہمیشہ کنواری رہنے کی قسم بھی کھالی تھی، مگر ممانی کا دل کیسے مانتا۔ کچھ دنوں کے بعد آخرکار تاج آپا کی نسبت چاٹگام میں طے پا گئی۔

تیرہ ماہ اور سترہ دن پہلے شانتی نگر کے "رقیہ ولا" میں شادی کا دھوم دھڑکا ہوا تھا۔ خوب خوشیاں منائی گئی تھیں۔ ممانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ تیرہ اکتوبر کو پیر کے دن تاج آپا کے جسم پہ ہلدی مل گئی تھی۔ لڑکیوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور ان میں سے بعض گدگدی کر کے کہتی تھیں۔ "اری ہاں، سسرال جا کر بھول نہ جانا ہمیں۔" اور یہ سن کر تاج آپا کا چہرہ بالکل سرخ ہو گیا تھا۔

۱۵۔ اکتوبر بدھ کے دن ان کی شادی ہو گئی۔

"رقیہ ولا" کی تاج آپا کو دلہن بنایا گیا۔ قیمتی کپڑے اور گہنے پہن کر وہ شرما گئی تھیں۔ آج کے دن وہ حد سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھیں۔ جیسے دنیا کا سارا حسن ان کے چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ ممانی بھی اُن کے حسن کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔ شادی کے روز شانتی نگر سے لے کر کاکرائیل کے موڑ تک گاڑیوں کا سیلاب نظر آ رہا تھا۔ چاٹگام سے تاج آپا کا دولہا آیا۔ اور "رقیہ ولا" کے ٹھیک سامنے جب برات پہنچی تو پٹاخے چھوڑے گئے۔ اور اس طرح آس پاس کے لوگوں کو تاج آپا کی شادی خانہ آبادی کا علم ہوا۔ ممانی کی کوششیں بارآور ہوئیں اور آپا دلہن بن کر چاٹگام چلی گئیں۔

دو ماہ گزرنے کے بعد آپا پندرہ دن کے لئے پھر ڈھاکہ آئیں۔ وہ تنہا آئی تھیں۔ اس عرصہ میں میں اور وہ بہت قریب ہو گئے تھے۔ چاندنی راتوں کو ہم شانتی نگر کے تالاب کے کنارے بیٹھے قصے کہانیاں کہتے۔ اور صبح سویرے میں ان کو ساتھ لے کر رمنا میدان

(باقی صفحہ [illegible] پر)

افسانہ:

خیالوں کے ساتھ ساتھ

شمیم اعجاز

آسمان پر سیاہ گہرے بادل چھائے تھے۔ اور دن کے اُجالے بادلوں سے ہم آغوش ہو رہے تھے۔ جدھر نظر اٹھائی رنج و غم کے اتھاہ سمندر موجیں مار رہے تھے۔ اُس کا معصوم دل غم کے بوجھ سے پھٹا جا رہا تھا۔ شاید اُسے دنیا میں جینے کا حق نہیں! ہر طرف ایک مسلسل سکوت، جان لیوا اُداسی، سہمی سہمی فضا، بھیانک مناظر۔ وہ انہی میں فنا ہو جانا چاہتی تھی۔ جدھر نظر اٹھائی کسی کو اپنا نہ پایا۔ وہ سوچنے لگی۔ آخر وہ کیوں زندہ رہی؟ زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لئے؟ مصیبتیں جھیلنے کے لئے؟ ۔ مصیبت مسلسل مصیبت ہو تو مصیبت نہیں رہتی، لیکن جہاں زندگی، امید اور خوشیوں سے ٹکراتی ہے، وہاں مصیبت کا بوجھ کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ اور مصائب کو پھر اپنانا بڑے ہی دل و جگر کا کام ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا دامن غم کے کانٹوں سے بھرا رہا۔ بے درد زمانے نے ساری مسرتیں چھین کر ہمیشہ کے لئے اسے غم سونپ دئے۔ اس کی مایوسیاں بڑھتی چلی گئیں۔ وہ سمجھی شاید اتنی ہی خوشی اس کے لئے تھی۔ جو اُسے مل چکی۔ وہ کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ اُس کی شفاف آنکھیں بے رونق ہوتی گئیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ اتنی بڑی دنیا میں احساسِ تنہائی اُسے کھائے جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو بے سہارا سمجھ کر اس نے غموں کو اپنا سہارا بنا لیا۔ اور شاید انسان کا یہی وہ باوفا دوست ہے جو کبھی اس سے منہ نہیں موڑتا۔ دُور ہوتا ہے تو چند گھڑیوں کے لئے۔ ملتا ہے تو اس طرح جیسے مدّت کے بچھڑے ہوئے ساتھی ملیں۔

ساری دنیا مسکراتی، پھول کھلتے، غنچے ہنستے، لیکن اسکے لبوں پر خفیف سا تبسم کبھی نہ آتا۔ ہنستے مسکراتے چہروں کو اُسکی نگاہیں اس طرح متعجب ہو کر دیکھتیں جیسے وہ بہت بڑا جرم کر رہے ہوں۔ اُد

وہ منہ پھیر کر کسی طرف چل دیتی۔

لوگ خوشیوں کے گیت گاتے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا۔ گیت وہ نہیں جو خوشیوں میں گائے جائیں۔ گیت تو کسی ٹوٹے دل کی درد بھری آواز ہیں۔ جسے سنکر انسان اپنی ہستی کو بھی بھول جاتا ہے۔ وہ سوچ کر خاموش ہو جاتی۔

اس کی زندگی کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ زمانہ اور زمانے کی ساری دل بستگیوں سے اُسے نفرت تھی۔ وہ ایک پُرسکون اور خاموش زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے تو اُس نے اپنا گھر بار سب، کچھ چھوڑ دیا اور ایسے گوشۂ عافیت میں آ بسی جہاں نہ اس کا کوئی پُرسانِ حال ہو نہ ہمدرد۔ اس کو کبھی کسی نے زرق برق کپڑوں میں نہ دیکھا۔ اس کا سنگھار اس کا مقدس سفید لباس تھا جو چاندنی کو بھی شرما دے۔ دل کے انتہائی کرب سے اس کی آنکھوں میں آنسو آئے بھی تو دامن سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ ضبط اور مسلسل ضبط نے اسے پتھر سے زیادہ مضبوط اور چٹان سے زیادہ قوی کر دیا۔ اس کے ارادوں کو دنیا کی کوئی قوت نہ بدل سکی۔ حوادث موجوں کی طرح ٹکراتے اور واپس چلے جاتے۔ وہ چپ چاپ اپنے غموں کو جھیل جاتی۔ اور غم کے ہر تھپیڑے کو اس طرح سہہ جاتی جیسے وہ اس کے لئے بہت پہلے سے تیار تھی اور اس کے لب صرف شکر ادا کر کے خاموش ہو جاتے۔

دنیا میں بڑی سے بڑی چیز کو حاصل کرنے کے لئے قربانی دینا ہوتی ہے۔ اور یہی زندگیٔ جاوید ہے۔ انسان اپنے لئے تو سبھی کچھ کرتا ہے۔ مگر ایسا بھی کوئی ہے جو دوسروں کے لئے اپنی خوشیاں لٹا دے؟ اس کا دل چاہتا تھا سارے زمانے کے غم اپنے دامن میں سمیٹ لے اور زمانے کی جھولی خوشیوں کے پھولوں سے بھر دے۔ کیوں؟ اسلئے

• آج اے مرے خیال تو کہاں کہاں گیا
میں بھی تیرے ساتھ تھی تو جہاں جہاں گیا (شوق قدوائی)

کہ شاید اس میں غموں کو اپنانے کی صلاحیت تھی۔ اور وہ انہی کو اپنی زندگی کا سہارا بنانا چاہتی تھی۔

جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہوتی تو جب جاپ کسی سوکھے پیڑ کے نیچے بیٹھ جاتی۔ گاؤں کی اس خاموش فضا میں اسے یہ سوکھا سہما پیڑ نہ جانے کیوں اتنا پسند تھا۔ گاؤں کے بچے جب کھیلتے کھیلتے۔ اس پیڑ کے نیچے جمع ہو جاتے تو اپنی شرارت کے نشان اُس کے ناتواں جسم پر چھوڑ جاتے۔ کبھی اپنا نام لکھتے اور کبھی لکیریں کھینچتے۔ اسکو بچوں کی اس حرکت سے بڑی نفرت تھی، لیکن وہ کبھی اس خیال سے کچھ نہ بولی کہ معصوم بچوں کا دل دکھ جائے گا۔

آخر اس سے نہ رہا گیا۔ ایک دن بڑے پیار بھرے انداز میں بچوں سے یوں مخاطب ہوئی "دیکھو۔ دور، دور کتنے ہرے بھرے پیڑ لگے ہیں کسی میں پھول ہیں، کسی میں پتے۔ یہ غریب مصیبتوں کا مارا سوکھا سہما نہ جانے کب سے اپنی قسمت کو رو رہا ہے۔ تم لوگ اس پر کیوں نئے نئے زخم لگا کر اس کا دل دکھاتے ہو؟ بچو! کسی کو دکھ دینا اچھا نہیں ہوتا۔ اگر دل ہی بہلانا چاہتے ہو تو اور بھی تو بہت سے کھیل ہیں"!

بھلا معصوم بچے اس کی اس یاس بھری گفتگو کا مطلب کیا سمجھتے۔ حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگے۔

"کیا تم میرا مطلب نہیں سمجھے؟ اگر تم کو کوئی مارے تو کیا تم کو دُکھ نہیں ہوتا؟"

بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اُس نے سینے سے لگا کر ان کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اس کی بات بچوں کے دل میں گھر کر گئی اور انہوں نے اپنا یہ محبوب مشغلہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

رات کی تاریکی میں جھلملاتے ستارے اُسے تسلیاں دیتے۔ وہ گھنٹوں انہیں دیکھا کرتی۔ اور اس کا دل ڈوبا جاتا۔ یہیں تو اپنی عیش و مسرت کی گھڑیاں نہیں بھولی۔ اس بھیانک سیاہ رات میں بھی ماضی کا ایک ایک لمحہ میرے دل پر چوٹ لگاتا ہے۔ اور میرا دل کانپ کانپ اٹھتا ہے۔ تم کیوں کانپتے ہو؟ تمہارا دل کیوں دھڑکتا ہے؟ کیا تم بھی میری طرح چوٹ کھائے ہوئے ہو؟ جب اس کی نگاہوں کے سامنے کوئی تارا ٹوٹتا۔ تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اسکے ہی دل کا کوئی ٹکڑا افلاک کی بلندیوں سے زمین پر آ رہا ہو۔

اس کا دماغ اور دماغوں کی طرح نہ تھا۔ جو ہوائی قلعہ بناتا رہے۔ وہ جب سوچتی ایک انوکھا تصور اسکے دماغ میں آتا کہ آخر وہ بھی انسان تھی۔ کبھی کبھی ماضی کے حسین تصور سے اس کے لب کھلنے لگتے۔ مگر وہ فوراً ہی اپنے آپ کو دانتوں سے دبا کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتی۔

زمانے کی اتنی ٹھوکریں کھا کر بھی تم اُسی کھوئی ہوئی زندگی کی متلاشی ہو جو تمہیں یہاں بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ گئی۔ یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی۔ وہ چونک پڑتی اور اپنی توجہ دوسری طرف منتقل کر دیتی۔ اس نے ہر شخص کے متعلق ستھرے خیالات رکھے۔ اس کا دل چاند کی طرح روشن تھا مگر زمانے کے گھاؤں سے داغدار۔ ذرا سی ٹھیس، تیکھی نظریں۔ اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتیں۔ اس کے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے۔ اور وہ اس طرح تڑپ جاتی جس طرح جنگل میں چوکڑیاں بھرنے والی ہرنی تیر کھا کر۔ لیکن وہ کس سے گلہ کرتی؟ کس سے شکایت؟ اتنے بڑے جہان میں اسکا اپنا کون تھا؟

غموں کی یہ آگ برسوں سے اس کے من میں سلگتی آ رہی تھی۔ لیکن اس کو بجھانے والا کون تھا؟ کوئی نہیں؛ دل کے شعلے اس کے جسم تک پہنچے اور وہ تپنے لگی۔ پیاس کی شدت سے اسکے حلق میں کانٹے پڑتے جا رہے تھے۔ وہ بار بار اپنی زبان کو خشک لبوں پر پھیرتی۔ اور نگاہیں دور تک خلا میں جا کر لوٹ آتیں۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اٹھ کر اپنی پیاس بجھا سکے۔ اس حالت میں بھی وہ اس سوکھے پیڑ کو یاد کرتی۔ کہ وہ غریب بھی اکیلا ہوگا۔ یہ بھی تو اس کا ساتھی تھا! اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کا دل چاہا کہ فوراً دوڑ کر جائے۔ اور اپنے اس خاموش ساتھی سے مل کر اتنا روئے کہ اسکے سب گلے شکوے دور ہو جائیں۔

رو پہلے چاند کی ضوفشاں کرنیں ہر طرف نور بکھیر رہی تھیں۔ اس نے ہمت کی، ایک بار اٹھی، اور دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ کوئی غیر مرئی قوت تھی جو اسے اس سوکھے پیڑ کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اس ویرانی میں اسے کیا ہو گیا؟ لوگ اسے پاگل تو نہیں سمجھیں گے؟ وہ جا کر اس پیڑ سے اس طرح لپٹ گئی جیسے کوئی اپنے ساتھی سے مدتوں بعد ملے۔ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ زور سے چلا اٹھی "میری قسمت کی طرح تم بھی خاموش

ہو۔ بولئے کیوں نہیں کہ تمہاری محبت بھری باتوں میں میں اپنا غم بھول جاؤں؟ آخر یہ سکوت کب تک؟ کچھ تو بولو!"

ہوا کا ایک سرد جھونکا سنسناتا ہوا آیا۔ اور شاخیں کھڑکھڑانے لگیں۔ دو چار سوکھے پتے گرے۔ وہ چونکی۔ شاید یہ اس کی بات کا جواب تھا! ٹوٹے دل کی درد بھری آواز دھرتی کا سینہ بھی چاک کر دیتی ہے۔

"میں جانتا ہوں تم بہت غمگین رہتی ہو۔ زمانے کی بیداد سے تمہارا دل چور چور ہے مگر تم زندگی کی راہ میں تھک کر کیوں بیٹھ گئیں؟ زندگی کی کٹھن راہوں میں اپنے کو تنہا مت سمجھو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے!"

اور آہستہ آہستہ درخت کے پیچھے سے ایک سایہ نمودار ہوا۔ وہ خوف سے کانپ اٹھی۔ اس کے لبوں پر مہر سکوت ثبت ہو گئی۔ وہ پلٹی اور گھر کا رخ کیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے سایہ اس کا پیچھا کر رہا ہو!

"آپ کی طبیعت تو اچھی ہے نا! آپ خوش تو ہیں نا؟ کئی دن سے آپ کو نہیں دیکھا"

اور چلتے چلتے اس کے قدم رُک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"کون ہو تم؟"

"آپ کی طرح زمانے کا ستایا ہوا"

"زمانے کا ستایا ہوا" تو پھر مجھ سے کیا لینے آئے ہو؟"

"کچھ نہیں، کئی دفعہ آپ کو اسی طرح اداس دیکھا ہے۔ مجھے آپ سے ـــ"

"ہمدردی ہے یہی ہے نا؟ شکریہ!" اسکی گفتگو میں طنز تھا۔

"آپ ناراض نہ ہوں۔ میں کوئی غرض لیکر یہاں نہیں آیا۔ میں بھی اس بھری دنیا میں تنہا ہوں اور شاید آپ بھی۔ آپ کی باتیں سُن کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ سوچا ـــ"

"کچھ تسلی دوں۔ تو میری اندھیری دنیا میں دیا جلانے آئے ہیں آپ؟ مگر؟ معاف فرمائیے مجھے جینے کا ارمان نہیں، خوشی کی تمنا نہیں۔ اپنا وقت خراب نہ کیجئے۔" اور وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میرے خلوص کو نہ ٹھکرائیے۔ اپنی خاطر نہ سہی تو کم از کم میری ہی خاطر سہی۔"

اس کا دماغ الجھنے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ "آج مجھ سے ہمدردی کرنے آئے ہیں۔ نہ جانے کتنوں کی امیدوں کو ملیامیٹ کیا ہوگا؟ کتنی آرزوؤں کا خون کیا ہوگا! اگر آج میں ان کی باتوں میں آگئی تو شاید ـــ" وفا کی دیوی تو صرف عورت ہوتی ہے۔ مردوں نے بھی کبھی آج تک کسی کے ساتھ نبھائی ہے۔ بڑے جوش و خروش سے ہزاروں دلوں کو تسلیاں دیں۔ اپنا بھرم جمانے کے لئے یگانگت اور خلوص کے افسانے تراشے۔ دھن لٹایا، اپنایا، اور جب جی بھر گیا تو منہ موڑ کر اس طرح چل دئے جیسے جان پہچان ہی نہ تھی۔ مَن میں بسایا تو موتی بنا کر تاج میں جڑا۔ نظروں سے گرایا تو آنسو بنا کر خاک میں ملا دیا!"

محبت کے پھول بڑے جوش و خروش سے دامن میں سمیٹے جاتے ہیں مگر جب وہ بار ہو جائیں تو پھر دامن جھٹک کر ان سے چھٹکارا بھی تو حاصل کر لیتے ہیں۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ چکرانے لگا۔

"نادان! اگر آج تو ان باتوں میں آگئی تو شاید اس سے بڑھ کر ٹھوکر کھانا پڑے۔" یہ عقل کا تقاضہ تھا۔ جو اُسے بار بار یاد آرہا تھا مگر دل کچھ ان پُر خلوص جملوں پر تسکین پاتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک بار اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا میں وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کا ساتھ دینے والا، اس کا ہمدرد بھی کوئی ہے۔ اسکی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔

دور افق پر ایک ستارہ چمکا اور اس کی چمک بڑھتی ہی چلی گئی۔

✱

فکاہیہ:

بسیار تخلص صاحب

باقر علیم

آبیل مجھے سینگ مار والے شاعر میرا دوست بن کچھ ایک ہی قسم کے متوالے ہیں۔ ایک دن ہمارے درمیان دوستی کی جزئیات طے ہوئیں، دوسرے دن سورج طلوع ہونے سے پہلے میرے ایک ہی شاعر دوست کا مجموعہ کلام میرے گھر پہنچ گیا۔ مجھے ایک پیش لفظ لکھنے کا حکم ملا ہے۔ جس دن یہ مجموعہ مجھے ملا تھا اس کی ضخامت ایک سو پچاس صفحوں سے کم تھی۔ آج اڑھائی سو صفحات سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ میرے دوست ہر اتوار کی صبح کو آتے ہیں، ان کا چھاپہ اسی دن کامیاب رہتا ہے، اور اپنا ہفتے بھر کا تازہ کلام فائل کر جاتے ہیں۔ پیش لفظ جلدی لکھنا ایک اس وجہ سے بھی ضروری ہو گیا ہے۔

میں نے بہت سر کھپایا ہے کہ اس قابلِ فخر شاعری کے کس پہلو پر کچھ لکھوں۔ مجھے اپنی جدت طبع پر بہت ناز ہے۔ آخرکار میری جدت پسندی ہی میرے کام آئی اور میں نے "ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں" پر عمل کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال شاعر کے بے شمار تخلصوں پر اظہارِ ندامت ہو جائے تو ادب کی بڑی خدمت ہو گی۔ آپ کو بتا دوں نہیں کہ اس مجموعہ کلام میں سے ایک بیت اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس امر کی تفتیش کے لئے ادبی جریدوں کے مدیران سے رجوع مناسب رہے گا۔

میرے دوست نے شاعری اس وقت اختیار کی کہ وہ ابھی متعلم جماعت دہم سیکشن اے ماڈل جی اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی تھے۔ اس وقت تخلص کے انتخاب کا مرحلہ پیش آیا تھا۔ مگر اس مشکل کو بڑی ہوشیاری سے حل کیا گیا۔ اردو کی دسویں کتاب میں پہلی نظم اسمٰعیل میرٹھی کی تھی۔ سو پہلا تخلص اسمٰعیل تجویز ہوا۔ دوسرے ہفتے جو نظم جماعت میں پڑھائی گئی وہ اقبال مرحوم کی تھی۔ اور اسی ہفتے سے شاعر کی اس وقت کی غزلوں میں مستعمل تخلص اقبال ملتا ہے۔ دسویں جماعت کے سالانہ امتحانات ختم ہوتے تک حالی۔ غالب۔ ذوق۔ سودا۔ مومن۔ انشا۔ اور امام دین[1] وغیرہم تخلص اختیار اور ترک کئے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔

کالج کی زندگی کے آغاز سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس دور کے تخلص ان کی ذہنی کیفیات کے عام طور پر آئینہ دار ہیں مثلاً بے چین۔ حرماں۔ شہید۔ منتظر۔ الفت۔ غم۔ یہ تخلص جہاں اور بہت سے معاملات پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں یہ امر بھی قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت بھی گورنمنٹ کالج میں مخلوط تعلیم ضرور تھی۔

کالج کی تعلیم تو دو تین سال سے آگے نہ بڑھ سکی۔ البتہ ایک نوع کی ذہنی پختگی کا شاعر کے کلام میں سراغ ضرور ملتا ہے۔ اپنی شاعری کو ایک نہج پر رکھنے کی محسوس کوششیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اس وقت کے تخلص اب یہ وضع اختیار کرنے لگے: غالبی۔ اقبالی۔ میری۔ سیمابی۔ اصغری۔ بھویں چڑھا کر دماغ پر ذرا سا زور دینے سے یہ بات بالکل سمجھ میں آ جاتی ہے کہ شاعر کا مطالعہ اس وقت کافی وسیع تھا۔ اور جب کسی رسالے میں ایک شاعر کے کلام کی تعریف پڑھتے تھے تو اسی نوع کے اشعار کہنے کی بلیغ کوششیں کارفرما ہو جاتیں۔ یہ دور نسبتاً مختصر تھا۔

انہی دنوں شاعر کے والدین نے اس کی مسلسل بیکاری سے تنگ آ کر اس کا بیاہ رچانے کا پروگرام بنایا کہ شاید اس طرح راہِ راست پر آ جانے کی کوئی صورت نکل آئے۔ یہ عہد تخلصوں کے لئے زریں عہد ہے۔ ان کی ایک خوش شکل عم زاد بچپن سے ہی ان کی منسوبہ تھیں۔ معصوم نام تھا۔ شادی کے سلسلے میں مروجہ قسم کی آمد و رفت شروع ہوئی تو شاعر نے اپنا نیا تخلص معصوم رکھ لیا۔ یہ تخلص بڑی طویل زندگی کا حامل رہا۔ سال بھر کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکی کے ابا پر اس کے والدین نے "بہروپئے" اور "نکمے نک بند" کو اپنی لڑکی کا ہاتھ دینے سے انکار کر دیا۔ شاعر کے والدین نے ضرورت سے زیادہ غصے سے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے شروع کئے۔ اس وقت کی غزلوں میں معصوم تخلص کی جگہ طاہر اس امر کی دلیل ہے کہ جس نئی جگہ شادی کے پیغامات آنے جانے شروع ہوئے وہاں لڑکی کا نام طاہرہ ضرور رہا ہو گا۔ اس تگ و دو کا نتیجہ کیا نکلا یہ بات کلام سے واضح نہیں مگر بعد کی غزلوں میں ادھ کٹے فرخ

[1] استاد امام دین مصنف "بانگِ دہل" کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے "بانگِ درا" کے مقابلے میں یہ کتاب اپنے مخصوص انداز میں لکھی تھی۔ (مدیر)

ساجد اور فرہاد نئے تخلص نظر آتے ہیں۔ اغلب یہی ہے کہ شادی کی کوششوں کے سلسلے میں جو لڑکیاں منظرِ عام پر آئیں ان کے نام علی الحساب فرخندہ ساجدہ۔ اور ظہیرہ ہوں گے۔

جیسا کہ عام طور پر قاعدہ ہے۔ ہمارا شاعر اپنی پیہم شادیانہ اور عاشقانہ ناکامیوں سے ایک ایسی بے دلی کا شکار ہو گیا جس کا اثر مسودے پر پڑنا لازمی تھا۔ اسی لئے تقریباً پانچ چھ مہینے کے عرصے میں کوئی غزل نہیں ہوئی اور نہ کوئی نیا تخلص ہی تولد ہوا۔

چھ مہینے جوں توں گزار کے شاعر نے فرار کی ایک راہ ڈھونڈ لی۔ اب شادی بیاہ گھر گرہستی کے خرخشوں کو تج کر شاعر کی تمام تر توجہ قوم اور ملک پر مرکوز نظر آتی ہے۔ یوں بھی وہ بڑا ہنگامہ پرور زمانہ تھا۔ اس وقت کے تخلص۔ ہندی۔ ایشیائی۔ ترقی۔ وطنی ہیں اور اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ شاعر ضرور فارورڈ بلاک یا کم از کم آل انڈیا نیشنل کانگریس ہی میں شامل ہو چکا تھا۔ یہ تخلص تقریباً ایک ہی قسم کی ذہنیت کے حامل ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے بدلنے کی ایک ہی وجہ ذہن میں آسکتی ہے۔ شاعر نے ایک تخلص سے اپنا کلام طباعت کے لئے رسائل کو بھجوایا ہوگا اور ایڈیٹروں کی ازلی دشمنی کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا ہوگا۔ تو غزلوں کی اگلی قسط ان رسالوں کو نئے تخلص سے بھجوائی جانے لگی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا پھر اچانک بعد کی غزلوں میں مسلم ملت۔ اسلام۔ مجاہد۔ طارق۔ ٹیپو کی نوعیت کے تخلص استعمال ہوتے نظر آتے ہیں۔ قیاس ہے کہ اس وقت تک شاعر وطن پرست تحریکوں، اخباروں اور رسالوں سے تنگ آ کر مسلم لیگ میں شامل ہو چکا تھا۔

پاکستان کے استقلال کے بعد تخلص ایک نیا قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ لاہوری سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر کو پہلا مکان محکمہ بحالیات نے لاہور میں ایلاٹ کیا تھا اور بعد کی غزلوں میں جہلمی۔ سیالکوٹی۔ پشاوری۔ چکوالی اور میانوالی تخلص ظاہر کرتے ہیں کہ شاعر لاہور کی ایلاٹمنٹ سے کسی وجہ سے ناخوش ہو کر دوسرے شہر ہجرت کر گیا پھر نہیں معلوم ۔۔۔۔۔ لاہور کے قیام سے شاعر کی طبیعت میں فیشن، جدت پسندی اور اس قسم کے دوسرے عناصر گھر کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس عہد کی غزلوں میں لاہوری کے ساتھ کچھ اور تخلص بھی نظر آتے ہیں جن کا تذکرہ بےسود سے خالی نہ ہوگا۔ کچھ غزلوں کے نیچے جہاں پتہ لاہور کا لکھا ہے وہاں مقطع میں کوئی تخلص استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ غزل کے نیچے "محمد امین۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ امین۔ امین: امین محمد امین" کے الفاظ درج ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تخلص ہی ہیں مگر اپنی طوالت کے باعث غزلوں کے ایک عام سائز کے مصرعوں میں شامل نہ ہو سکنے کی وجہ سے مقطع میں درج نہیں ہو سکے۔

میرے پاس پہنچ چکے ہوئے کلام میں آخری تخلص انقلابی ہے۔ تب سے شاعر کا عارضی طور پر مستقل مسکن نیا دارالحکومت راولپنڈی ہے مگر چونکہ ہر وقت "آرہی ہے صدائے کن فیکون" پیش لفظ لکھتے لکھتے تخلص کیا اور صورتیں اختیار کر لیں گے میں پیشین گوئی کرنے سے معذور ہوں۔

ان تخلصوں کی دیرائٹی کے متعلق دو چار باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ شاعر کی مملوکہ کتب اور کاپیوں پر پرانے تخلص کاٹ کر نئے تخلصوں کا اندراج بہ اہتمام ہوا ہے۔ جس سے ایک حقیقت ناآشنا قاری صرف یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ کتاب یا کاپی بہت سے مالکوں کے ہاں سے چوری ہو کر بالآخر اس شخص کے پاس اب پہنچی جس کے گھر میں اس وقت ہے۔ مشاعروں میں سیکرٹری مشاعرہ عجیب الجھن میں گرفتار ہو جاتے۔ سیکرٹری نے ان کی باری آنے پر پچھلے تخلص سے اعلان کیا اور آپ نے غزل آکر نئے تخلص سے پڑھ کر سیکرٹری اور حاضرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ گو مشاعرے کے اختتام پر سیکرٹری سے بالالتزام تصحیح کرا لیتے تھے۔ اپنے دوستوں اور مداحوں سے ہمیشہ خفا رہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر احباب ان کے نئے ناموں (تخلصوں) سے بروقت آگاہ نہیں ہوپاتے۔ اپنے والدین کے مرحمت کردہ نام کے متعلق ان کا یہ ریمارک بڑا دلچسپ ہے "ابا جان نے میرا نام محمد امین شاید اس لئے پسند کیا ہے کہ میں بھی بڑا ہو کر ان کی طرح نیشنل بینک میں خزانچی بنوں گا ۔۔۔۔۔" مگر ہماری

میں یہ پیش لفظ لکھ کر اپنے شاعر دوست کو دکھانے کا منتظر تھا کہ اس اثنا میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے میرے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ ایک دن ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر صاحب جو میرے بےتکلف دوست ہیں مجھ سے ملنے آئے ہیں اس وقت اپنے دوست شاعر کی ایک تازہ ترین نظم "انقلاب سے پہلے انقلاب کے بعد" جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا۔ ایڈیٹر صاحب نے نظم سن کر پسند کی اور اپنے اخبار میں شائع کرنے کے لئے مانگ لی۔ شاعر کے نام اور تخلص کے متعلق ان کے استفسار پر میری

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

سیر پانچویں درویش کی

افاق حسین افاق

"... اور صاحبو! میں احوال اس اقلیم کا کیا بیان کروں۔ اگر نقشہ صحیح صحیح کھینچوں تو آپ اسے مبالغہ سمجھیں اور مجھے کاذب و مفتری گردانیں اور اگر اظہار میں خست برتوں تو آپ سے خفت ہو۔ مگر بیان واقعے کے طور پر میں اس طلسم کا کچھ حال یہاں بیان کرتا ہوں۔ میرے پیا تھا اس سیر گذاری کو نکل پڑنے۔ اے صاحبان ذی شان، مسکن میرا بھی وہی ہے جو سند باد جہازی کا تھا۔ اب میری اتنی بساط تو نہیں کہ سات سمندروں کے سات سفر کر ڈالتا۔ مگر ان ہی کی رہتا پر فتوح کا اثر ہے کہ میں بھی اب سند باد بری تو بن چکا ہوں اور خاص اس شہر کا جسے اقلیم پاک کا دل کہا جائے تو بیجا نہیں۔ یعنی اس بندر خوش منظر کا جسے کراچی کے چھوٹے سے پیار بھرے نام سے یاد کرتے ہیں۔

صاحبو! ادب کی زمین چوم کر عرض کرتا ہوں کہ میں نے ایسا شہر اپنی جہاں گشتی کی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ یہ کہ یہ بھی ایک طلسم ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اس کی زندگی رونق، گہما گہمی اور ہما ہمی ایسی پائی کہ میں تو بس اسی کا ہو رہا کیونکہ کیا صبح کیا شام یہاں ہر وقت ایک میلہ ایک رونق، ہجوم، ہنگامہ ہر گھڑی موجود رہتی ہے اور وہ بھی ایسی دل پذیر، ہوش رُبا، کہ آدمی کی طبیعت سیر سے کبھی سیر نہ ہو۔ کیا کوچہ و بازار کیا خیابان و گلستان، کیا آب رواں، کیا بندر خوش منظر، کیا ایوان و در، کیا محلات عالیشان اور کیا دفاتر ذوفرمان ہیں کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جائے اور کراچی سے جانا چاہے تو اس کی طرحداریاں دامنگیر ہو جائیں۔

تو صاحبو! میں اس صحبت کو غنیمت جانتا ہوں اور آج آپ کو اس جگہ کی سیر کراتا ہوں جس کی سجاوٹ کے سامنے نگار خانۂ چین تعنہ کہانی معلوم ہو اور جن عجوبہ و نادر صناعتوں کی جھلکیاں یہاں دکھاؤں گا وہ کوئی خواب و رویا یا طلسم و سراپا کا کام نہیں بلکہ اس اقلیم پاک کے جیتے جاگتے انسانوں کی ہنرمندی کے نمونے اور حسن گری کے ثبوت ہیں۔ یہ سچ مچ کی چیزوں کا حال ہے مبالغہ محال ہے۔

صاحبو! ایک دن کیا غلغلہ سنا کہ شہر میں ایک جلسہ و صحبت بپا ہے جسے دیکھنے کے لئے مشتاقان دید بحر و بر تک عبور کرکے پہنچے ہیں۔ اور اسے نمائش کا نام دیا ہے۔ حضرات! میں نمود و نمائش کو عیب گردانتا تھا مگر یہ نمائش ایسی نہیں تھی، بلکہ ایک نگار خانۂ صناعت تھا یعنی عکاظ و مینا بازار کا نام لیوا کہ اقلیم پاک کے بسنے والے ان دونوں سے نسبت قدیم رکھنے کے باعث ایسی باتوں سے ازبس تعلق خاطر رکھتے ہیں اور جہاں ذوق کشش اور کاریگری کا کام ہو وہاں اس اقلیم کے لوگ اپنے اجداد کے صحیح وارث اور حسن گری میں یکتائے روزگار ہیں۔ اور اس مشینی بھونچال میں بھی ان کی طلسم کاریوں کا گاہک موجود ہے۔ کیونکہ یہ حسن، یہ سجاوٹ یہ ملاحت اور خون جگر کی نمود بھلا ماشینی مصنوعات کے ڈھلے ڈھلائے مال میں کہاں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر عش عش کرتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے تھے۔

صاحبو، میں آپ کا اشتیاق زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا۔ بصارت کی آنکھ بند کیجئے اور بصیرت کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے میری رہنمائی قبول کیجئے۔

یہ مقام جہاں آپ کھڑے ہیں نمائش گاہ ہے اور اس کی سجاوٹ سے ہی آپ صاحبوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہاں جو نگار خانۂ صناعت سجایا گیا ہے وہ دل کو کیسا لبھاتا اور آنکھ کو کتنا بھاتا ہے۔ ادھر حاکمان ذی فہم نے بھی اسے سرمۂ بصر بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ حاشا اسے نخاس نہ سمجھ لیجئے گا کہ جو بھی الم غلم چیزیں بٹور لائے، لاکر رکھ دیں۔ یہ تو بازار ہے یعنی کار گہہ ہنر کا پیکر اظہار۔ نادر سوغاتیں جمع ہیں۔ اے میرے رفیقو، فقیر جب حال میں اپنی جہاں گردی سے واپس آیا تو یہاں ایک اور ہی نقشہ نظر آیا۔

حاکم اس اقلیم کے جو آگئے تھے رعایا کے دلدار اور طرفدار نہ تھے، نہ کارپرداز ہی ان کے غمگسار تھے اور نہ ان کی سود بہبود پر نظر رکھتے تھے۔ اس لئے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا کہ غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور ایک صاحبِ سیف جو شجیع و عدیل اور رعایا پرور تھا اور سرخیلِ جوانانِ تیغ بند تھا اپنے گھر کو لٹتا نہ دیکھ سکا اور بھائیوں کی مدد سے ہاتھ نہ کھینچ سکا۔ اس لئے تدبیر کی تیغ اور تیغ کا تبر سنبھال کر میدان میں آگیا۔ رفیق اس کے ایسے ہی جاں نثار، باوصف اور باتدبیر تھے۔ عوام نے انہیں لبیک کہا۔ ٹھگوں کی صفیں صاف ہونے لگیں۔ بے ایمان اعیانِ سلطنت کافور ہوئے۔ غدار و مکار راج دُلارے ختم ہوئے اور ان پیکرانِ عمل نے حکومت کا انتظام سنبھالا۔ اسے انقلاب کہتے ہیں جس نے ہیئت و حالت ہی بدل دی اور ملک ترقی کی راہ پر چل پڑا۔ اب عدل کی حکومت اور عمل کا سکہ رواں ہے۔

میرے دوستو! اب رعایا یہاں چین سے ہے۔ یہ مردِ کارگر اور اس کے باتدبیر وزیر اب اس مملکت کے بام و در سجانے پر لگے ہیں۔ انہوں نے ایک تدبیر ترقی کی یہ سوچی کہ اس ملک کے ہر ہر شخص کی آمدنی بڑھ جائے، آرام اور انصاف سب کو ملے اور ملک فارغ البال ہو۔ یہ کام آسان نہ تھا، جادو نہ تھا۔ اس کے لئے پانچ سال کی مدت کام کرنے کی رکھی تاکہ سب مل کر اس ملک کو آگے بڑھائیں۔ اسے منصوبہ پنجسالہ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ اور اگر ایسے کام میں پانچ سال لگ بھی جائیں تو کیا دریغ ہے۔ ملک سے تکلیف، بھوک، محتاجی تو ختم ہوگی۔ اے بوریہ نشینانِ بے ریا! جان رکھیئے کہ اس خطۂ پاک کے دو حصے ہیں۔ گویا ایک مرد وضیع کی دو آنکھیں ہیں اور حاکموں کو دونوں آنکھوں کا نور ہی عزیز ہے۔ یہی ان کا ثبوتِ تمیز ہے۔ سنا ہے ایسی نمائشیں جگہ جگہ برپا کریں گے۔ اور ہنرمندوں کی ہنردانی کی داد دیں گے اور ان کے کیسوں کو بھی زرِ کی دولت سے آباد کریں گے۔ یوں سب کا دل شاد کریں گے۔ گویا ہم خرما و ہم ثواب کا انداز پیدا ہوگا۔ اس اقلیم کے کاریگر نت نئی چیزیں بنانے میں کمال رکھتے ہیں اور بنے ہوئے مال کے ایک دانہ کو اپنی بولی میں "نمونہ" کہتے ہیں۔ اب ان کے جو نمونے بکنے شروع ہوئے ہیں وہ باہر کے لوگ بھی لے جائیں گے۔ جو ان چیزوں کے بڑے دلدادہ ہیں اور ہم ڈالر کمائیں گے۔ اے واہ! قربان جایئے! ڈالر کو نہیں جانتے؟ — اے میاں! سنو، یہ اقلیم غرب کی طلائی مہر ہے یا خاتمِ سلیمانی ہے کہ جس کا سکہ ہر جا رواں ہے۔ اور اپنی موہنی صورت و اوصاف کے باعث ہر جگہ مقبول ہے۔ گو مولد اس کا امریکہ نام کی ولایت ہے۔ میں تو اس کا اتنا گرویدہ ہوں کہ ڈالر کو "دلدار" کہتا ہوں۔ تو صاحبو! اگلے وقتوں کی یادگار روش، بزرگوں کی ان میراثوں کو بھلا ہم کیسے بھلا سکتے ہیں جن کی شہرت اب تو دُور دُور ملکوں تک پہنچ چکی ہے اور باہر والے تو ہمارے ڈیزائنوں کی طرفہ کاری کو آج کل اور بھی پسند کر رہے ہیں۔

اے درویشو، معافی کا خواستگار ہوں کہ اتنی دور نکل آیا اور چیزوں کا حال نہ بتایا۔ آیئے یہیں سے بسم اللہ کرتا ہوں۔ ذرا ان ظروف کو دیکھئے۔ یہ ظروف بجی ہیں جن پر فریفتہ سب زنگی و فرنگی ہیں۔ کیوں نہ ہوں! ان کے نقش روئے نگار کی طرح نورانی اور رنگ ان کے دلربائی کی کہانی ہیں۔ یہ طباق دیکھیں۔ رکابیاں دیکھیں، غرض کسی پرزے کو دیکھیں معلوم ہوتا ہے سونے کا ڈلا ہے۔ ان کی صفا دینی ہے اور کاریگروں کی مشاقی و محنت پر دال، گویا کسی کیمیاگر نے مسِ خام کو کندن بنا دیا ہے۔ یہ تب و تاب یوں ہی نہیں آگئی ہے۔ کاریگروں کی حسنِ طبع کی چھوٹ اور محنت و عرق ریزی کی دمک منعکس ہے۔ حضور آپ نے پہچانا یہ کرشمہ کیا ہے کہ نظر رک گئی ہے۔ لو میں سمجھاتا چلوں۔ یہ ہمارے بطلِ عظیم اور محاربِ زعیم، جنرل طارق کی شبیہہ ہے۔ یعنی تاریخ کے قلزم کو اس قاب کے قلب میں سمویا ہے۔ کیا آن ہے ترکانہ، شجاعت و تہور کی تصویر ہے گویا۔ سبز پرچم بلند ہے اور تیغ بے نیام ہے، لشکرِ جرار ساتھ ہے گویا معرکۂ حق و باطل کا بپا کار ہے جیسے سر کرنے یہ نکلے ہیں۔ تیغ بے دریغ ہوا میں ایسی لہرا رہی ہے کہ ایک ہی ضربِ یداللّٰہی سے بیڑا پار ہے۔ اے درویشانِ ذی وقار یہ تو یاد ہی ہوگا کہ اس باہمت نے اپنا سفینہ ساحلِ اندلس پر سوخت کیا تھا کہ واپسی کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔ اس قاب کی زینت میں ان سات آٹھ رنگوں نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ دیکھتے جایئے مگر طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اللہ جمیلٌ و یحب الجمال —!

اور یہ دیکھئے شمعدان ہیں۔ کیسے کیسے روپ، کیسے کیسے نقشے اور وضع داریاں۔ کوئی دو شاخہ ہے کوئی سہ شاخہ، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور ان ظروف کی بہار بھی کیا خوب ہے۔ یہ سب گھریلو استعمال کی چیزیں ہیں، ڈونگے ہیں۔ آفتابے ہیں۔ راکھ دانیاں ہیں۔ سگرٹ کے کیس ہیں۔ کہتے ہیں، اقلیمِ ہند میں مغلوں نے

آکر اپنی ولایت کے عجوبہ کار کاریگر بھی یہاں جمع کر دیئے تھے جن کے سبب اب تک صنعت و حرفت کی یہ شمعیں جلائے ہوئے ہیں۔ ایک مقام مرادبخش، فرزندِ شاہجہاں کے نام نامی پر مرآد آباد معروف ہے، اس صنعت ظروف سازی کا گھر تھا اور کام کرنے والے اس کارگہ کے سب کلہ گو تھے، واقعۂ شق الاقلیم نے جب ہمیں دو نیم کر دیا تو یہ گروہِ صانعین بھی اس اقلیم پاک میں آکر پناہ گیر ہوا اور اب ہی کے ہاتھوں یہ ظروف یہاں بن رہے ہیں۔ اور دُور دُور دساور وں تک جاتے ہیں۔

اے صاحبو! آپ تجلیٔ ذات کے پروانے ہیں مگر انوار قدسی کی ارضی نمود و ضیا سے بھی نظر نہیں چراتے کہ عرفان کی پہلی سیڑھی ہے۔ میں جانتا ہوں جہاں حسن ہے، ترتیب ہے، زینت ہے وہاں آپ کی نظر ضرور ٹھہرتی ہے۔ کچھ یہی وصف اس حقیر کو بھی ملا ہے جبھی تو میں اس حیا کی پتلی کو دیکھے جا رہا ہوں۔ اس کی سیمیں بدنی، رعنائی اور پیکر و پیراہن کی دلربائی کو کوئی چیز نہیں پہنچتی۔ قد صرف بارہ انچ کا ہے یعنی کاریگری کا شمشاد ہے اور دیکھنے والوں کا دل شاد ہے۔ اے یارو! میری اقلیم کی یہ گڑیاں میرے دل میں گڑیاں ہیں۔ میں تو کیا جو دیکھتا ہے آنکھوں میں جگہ دیتا ہے اور خرید کرلے جاتا ہے۔ اس کی آرائش تو دیکھئے حیا کا جواب نہیں، خالِ رخِ یار نے تو نوکِ خار کا کام کیا ہے۔ سر پہ ہرے دوپٹہ کا جو ٹکل مارا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قمر پر ابر نے چھاپا مارا ہے، اب کسے تاب نظارا ہے۔ مانگ کی افشاں کہکشاں کی سطر ہے کہ صحیفۂ دل پر کھنچ گئی ہے۔ ہاں، ٹھیک کہا یہ ہماری حریمانِ حیا پرور کی تمثال ہے اور اہل مغرب ان لُعبتانِ دلستاں کے بہت ہی گرویدہ ہیں۔ ہمارے ہنر کی داد ملتی ہے۔ کاریگروں کو ڈالر کا دلدار میسر آتا ہے۔ آم کے آم اور گٹھلی کے دام ـــ ان دوسرے کھیل کھلونوں کو دلبستگی کا سامان ہی نہ سمجھئے یہ ہمارے ملک کے نقیب ہیں اور دوسرے بیرونی ملکوں تک پہنچ کر ہماری ثقافت کے عکاس بن جاتے ہیں۔

آیئے ذرا آگے چلیں۔ آہا! یہ مقام تو عجب ہے یہ سفال گری و کوزہ سازی کا اہتمام ہے۔ ہم صوفیا اسفل و ارذل کو بھی صفائے قلب کے عمل سے ارفع و ارشد بنا دیتے ہیں۔ اس لئے اس کام کی قدر کریں گے کہ کاریگر کے ہاتھ نے سفلی کو علوی کیسے بنا دیا۔ یہ ہنر اس میری اقلیم کا بہت پرانا ہے، کوئی پانچ ہزار سال سے چلا آتا ہے۔ ایک مقام کہ اسم اس کا کوٹ ڈیجی معروف ہے، ابھی طبقۂ خفا سے برآمد کیا گیا ہے۔ یہ وہاں کے نمونے ہیں واہ کیا نقش بنائے ہیں، کیا رنگ لگائے ہیں۔ اور ایک یہی جگہ کیا بہت جگہیں ہیں۔ جہاں کے سفالیں ظروف مشہور ہیں۔ کہاں کہاں کا ذکر کروں۔ یہ ساغر و مینا، یہ سڈول سڈول برتن، بادامی بادامی رنگ، نقش و نگار خود کہہ رہے ہیں کہ ہم بہاول پور کے ہیں۔ ہم کو ستلج کی خاک سے نسبت ہے کہ نم اور لوچ میں نادر ہے۔ اور یہ فیروزی، سفید، گہرے نیلے اور ہرے ہرے برتن ملتان کا کام ہیں۔ ہاں وہی ملتان یا نافِ عالم جو برگزیدگان تصوف کا شہر اور ہنرمندان کا مرکز ہے۔ یہ دیکھئے گجرات کے روغنی ظروف ہیں جنہیں دیکھو تو سوہنی کا روپ یاد آجائے۔ یہ لیجئے سیوَن کے لوچدار سفید سفید برتن ہیں۔ دیار سندھ کے باسیوں کی طبع پاکیزہ کے آئینہ داران کی ہنروری کے شہکار۔ ہاں میں یہ مانتا ہوں کہ ان بہت سے کاموں میں ایران و توران کی طرحداریاں جھلک رہی ہیں تو وہ کیوں نہ ہو جب ہم مورث ہیں ان ولایتوں کے کمالوں کے، خوب یاد آیا، یہ برتن بس برصغیر میں یہیں بنتے ہیں کیونکہ یہاں کی مٹی سے جادو جگانے والے ساحر سچ مچ "سفلی عمل" کے ساحر ہیں۔ اور اس انقلاب نے تو ان ہنروروں کی ہمت اور بھی بڑھا دی ہے کہ ان کے فن کی قدرداں سرکار کی قدرشناسی کے باعث اب یہ دنیا میں بڑی دور تک لے جائے جاتے ہیں۔

آیئے اب ذرا یہاں ٹھہریں۔ یہ سبزی مائل پلیٹ میں انگور کا خوشہ کیسا رکھا ہے، شادابی تو ایسی ہے کہ منہ میں پانی بھر آیا مگر خیر۔ میں اصلیت پہلے ہی بتا دوں ورنہ آپ نے ان کو کھانے کی کوشش کی تو دانت کھٹے ہو جائیں گے۔ یہ نہیں کہ انگور کھٹے ہیں، بلکہ یہ شئے دیگر ہیں۔ یہ انگور شرمندۂ تاک نہیں، نہ ان کو آتش سیال میں ڈھال سکتے ہیں۔ ہاں مگر صانع حقیقی کی کاریگری دیکھ کر سرشاری ضرور ہوتی ہے۔ اے صاحبو، ذرا غور سے دیکھو یہ نہ کاغذ ہے، نہ لکڑی، نہ مٹی، نہ رنگ ہیں مصنوعی نہ روغن ہے بناوٹی۔ یہ نہ طلسم ہے نہ سحر ہے بلکہ حجر ہے اور صرف حجر ماخذ اس کا ایک مقام ہے نوکنڈی کہ دیار بلوچستان میں مشہور ہے۔ باور کیجئے کہ یہ پہاڑ کے جگر گوشے ہیں۔ یہ چٹانوں کے تحفے ہیں۔ کاریگروں کی صناعت کا شاہکار ہیں۔ یہ پتھر

"اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے"

(روز بروز ترقی پذیر دستکاریاں)
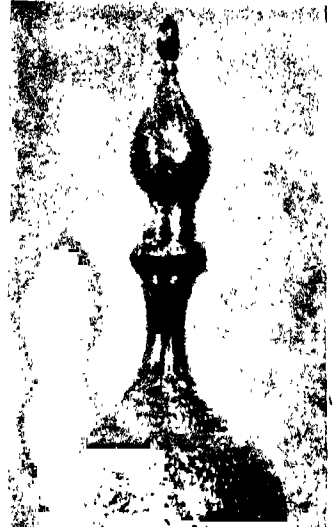
نفیس طرحدار

مرصع ۰ پرکار

خوبصورت، کارآمد

'' دا پوش میں لگادی کرن آفتاب کی ،،!

یہ رنگ یہ روپ!

چاق چوبند

شیشہ کی طرح نازک
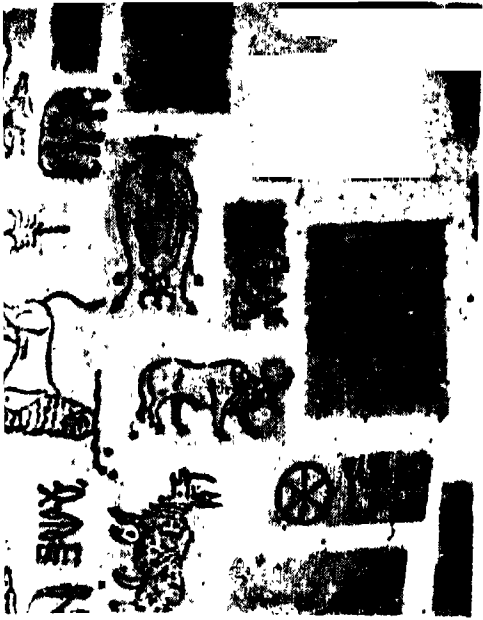
قدیم فن جدید نقوش

→
ملکہ نور جہاں (جدید نقاش کے مو قلم سے) عمل : حاجی محمد شریف جن کے فن کی قدردانی کرتے ہوئے حال ہی میں صدر پاکستان نے انہیں انعام اور وظیفہ عطا فرمایا
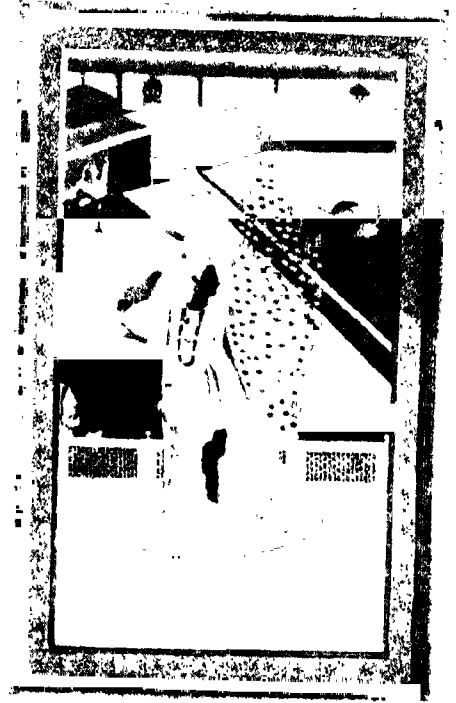
موئن جودڑو کے پانچ ہزار سال پرانے نقوش
آجکل کے ملبوسات پر

ںادٔ. وضع نما روپ
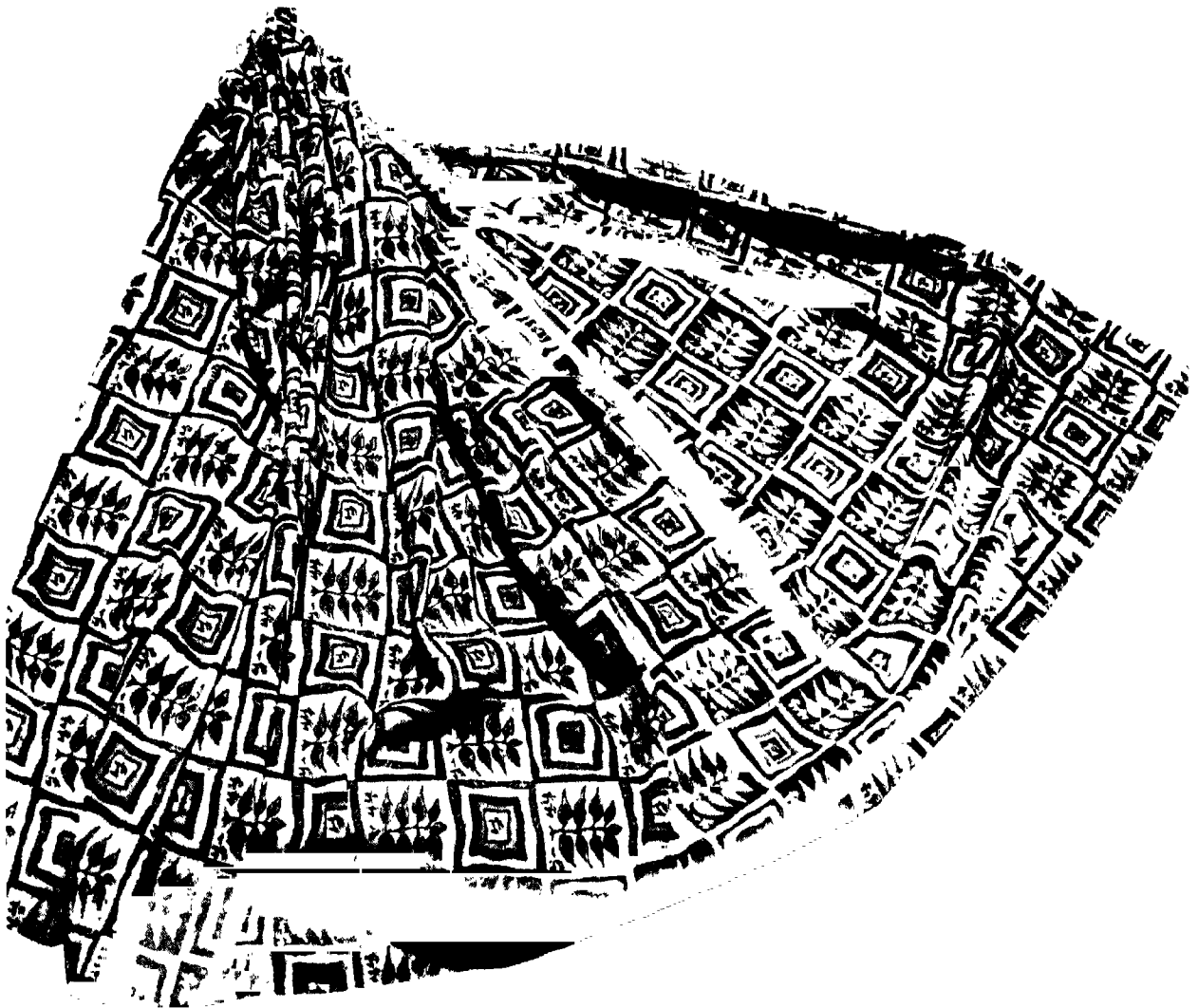
ایسے ہی ہیں جن سے تاج محل ہم نے بنایا تھا اور اتنے بڑے انگور کے خوشے کو ایک ڈال پتھر سے تراشنا کہ ہیرا تراشی بھی مات ہے۔ اقلیم زنگ میں اُلٹی اسم مشہور ہے کہتے ہیں یہ حجری تحفے وہاں بھی دستیاب تھے اور "مرمرِ اخضر" کہلاتے تھے مگر اب ان پتھروں کی کانیں اپنی دکانیں بڑھا چکیں، اور ساری دنیا میں ہمارا یہ علاقہ ہی اب ان کا اجارہ دار ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ انہیں ترشوا کر دیکھو تو عجب عجب قسم کی تحریریں سی نظر پڑتی ہیں۔ واہ قربان جایئے — صناعِ حقیقی کے اور کیا کہنے ہیں اُن حسن طراز کاریگروں کے جن کے ہاتھ ان کھڑوں کو تراش تراش کر یہ "پسزے" بنلتے ہیں۔ ان پتھروں کی کیا چیز نہیں بنتی۔ پلیٹیں۔ رکابیاں۔ راکھ دانیاں۔ چوکور ٹائیل میز کی حجری سطح۔ ذرا اس پلیٹ کو دیکھئے، معلوم ہوتا ہے کہ نیچے سمندر ہے موجیں مارتا ہوا اور اوپر آسمان ہے جس پہ بادل رواں دواں ہیں۔ یہ موجیں کیا ہیں آبی رنگ کی تحریریں ہیں۔ سنا ہے کہ ان پتھروں کو تراشنا بڑا محال ہے اور بڑی عرق ریزی کا طالب، کیونکہ آخری دم تک یہی ڈر رہتا ہے کہ "پرزہ" اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا۔ اسی وجہ سے ان کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہاں کے قدرداں اور دوسری ولایتوں کے لوگ انہیں بہت پسند کرتے ہیں اور بڑے چاؤ سے لیجاتے ہیں اور اس طرح دوسرے ملکوں میں یہ حجری تحفے ہماری ثقافت کے سفیر و ترجمان بن جاتے ہیں۔

اے عزیز رفیقو، اب ذرا ان ملبوسات کو دیکھتے چلیئے۔ یہ بنارسی ساڑیاں ہیں۔ بنارسی گلوبند اور شانہ پوش ہیں۔ یہ زری اور ریشم کی پارچہ سازی ہے اور مسلمان نوربافوں کے کام سے ہی بنارس میں یہ صبح طلوع ہوئی تھی اس لئے اب تک بنارسی کام کے نام سے معروف ہے، اب یہ نوربافت اس اقلیم پاک میں ہی وارد ہیں اور اپنے ہنر کی دامے، درمے، سخنے، ہر طرح داد پا رہے ہیں۔

مگر اے جلیسوں، ریشم اور زرتاری کی باتیں چھوڑتا ہوں کیونکہ ہم درویشوں کو صوفیانہ وضع ہی زیادہ پسند ہے اس لئے صُوف کے کام اور سوتی کام کو بھی ذرا دیکھ لیں کہ اپنے ہنرمندوں کے کمال سے آگاہ ہوں۔

ان سوتی کپڑوں کا احوال کیا بتاؤں یہ تو ہماری سب سے پرانی صنعت ہے اور تارِ نفس پہ یادِ الٰہی کی تسبیح کرنے والے درویشوں تمہیں تو حال سب معلوم ہے کہ آدمی نے تن ڈھانکنے کو جب کپڑا بنانا شروع کیا تو روئی کے تانے بانے نے اس کی مدد کی۔ اور یہاں، جہاں آپ کھڑے ہیں یہ مقام اقلیم دریائے سندھ ہے جس کی وادی نیل کی وادی کی بہن ہے، اب وصف اس سرزمین کا بیان کرنے کے لئے کس کا دہن ہے، یہاں کی روئی ریشم کا جواب تھی اور اس کے بنے ہوئے ململ کے پارچے فراعنۂ مصر کی لاشوں پہ لپٹے ہوئے ملے ہیں۔ ان اہراموں میں سندھی کپڑوں کے ٹکڑے اب تک ملتے ہیں۔ پر اے دوستو زمانہ بدل رہا ہے۔ نئے کارخانوں نے ہماری سوتی پارچہ بافی کو بھی وہ فروغ دیا ہے کہ حیرت کا مقام ہے۔ بیشک، اے مردِ وضیع تو نے سچ کہا کہ ڈھاکہ کی ململ تو چار دانگ عالم میں مشہور تھی اور سچ پوچھو تو فرنگیوں کے قافلے سرزمین ہند و سندھ کی طرف اس صنعت پہ ہی قابو پانے کے لئے وارد ہوئے تھے۔ کوئی تعجب نہیں کہ میرے ملک کی اس ململ کی یورپ کے درباروں میں بڑی کھپت تھی بلکہ قیصر و کسریٰ کے عہد میں بھی یہاں سے جاتی تھی اور لوگ اس کی نفاست اور باریکی کو دیکھ کر عش عش کرتے تھے۔ ڈھاکہ کی ململ کی کئی اقسام معروفِ عالم ہیں، ان میں درجہ اول کی ململوں میں سنگتی، شربتی، آبِ رواں اور شبنم زیادہ مقبول ہیں۔ شبنم نامی ململ کے بارے میں تو شہرت یہ ہے کہ اگر رات کو گھاس پر پھیلا دو، صبح جب تک شبنم خشک نہ ہو جائے وہ ململ نظر سے دکھائی بھی نہ دے گی۔ یہی حال آبِ رواں کا ہے، پانی میں ڈال دو تو لہر کا گمان ہو۔ اور اے صاحبو! جامدانی دکشیدہ نام کی ململوں کو اگر تارِ نگہ اور انوارِ سحر کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہاں، صحیح کہا کہ اب تو جاڑے کا موسم آگیا بارے کچھ اون کا بھی ذکر ہو جائے — آیئے تو پھر ان اُونی کپڑوں کو بھی دیکھ لیں۔ ریشم کی بات پھر بتاؤں گا۔

اے درویشو جان رکھو کہ میری اقلیم کا ایک حصہ کچھ صحرائی اور چراگاہی بھی ہے۔ اور ہم بھیڑ بکریوں کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ ان کے اون کو طرح طرح سے کام میں لاتے ہیں۔ کشمیری شال کی کیا مثال۔ سنا ہے ایک بادشاہِ اقلیم کشمیر شاہ زین العابدین پندرھویں صدی میں اس کے صنعت کار اقلیم اتراک سے کہ عرفاً ترکستان یا توران کہلاتا ہے یعنی ترکستان

سے لے کر آیا اور اس خطہ میں اس کا کارخانہ سجایا۔ لوگ یہاں کے دیدہ وَر حسن کار اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ ہیں۔ اس لئے یہ لباسِ صوف یہاں طرح طرح کے بننے لگے ہیں اور ہم صوفیا کے اسم مشہور کو بھی نمدے کے کپڑوں سے ہی شہرت ہوئی جو ہمارا خرقہ بھی تھا سجادہ بھی۔ کشمیر میں اگر شال دوشالے، نمدے، پشمینے وہاں کی گلپوش وادیوں کے آئینے ہیں تو پورب دیس بنگال کے ریشم کی سجاوٹ دیکھنے دکھانے کی چیز ہے۔ وہ لباسِ زناں، بنام ساڑھی جو تیار ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ لسان ان کی تعریف کس عنوان کرے، پھر حیرانی یہ بھی کہ ان کے سوتی کپڑوں پر انسان جان نچھاور کرے یا ریشمی مال پہ صدقے ہو۔ اور ایک طرفہ تماشہ یہ بھی کہ صرف لباس و پوشش اور خرقہ و قماش ہی اس سرزمین پہ نہیں بنتا، دیگر اشیا و نوادر از قسم پارچہ پوشیدنی و استعمالی بھی کیا کیا خوب بنتے ہیں کہ دل فرشِ راہ ہو۔ احاطہ پنجاب کے لاچے، ملتان کی دریاں، شطرنجیاں، میز پوش، چیک کے ڈیزائن کہ جن کی قطع دار اور وضع کو دیکھ کر دل نیم پارہ ہو، پردوں کے وہ وہ کپڑے کہ معلوم ہو تختۂ گلستاں بام و سقف کے ساتھ آویزاں کر دیا ہے۔ بنگال کی گنجیاں جنہیں میں آپ بنیان کہتے ہیں، سوئیٹر، مفلر، رومال، موزے۔ غرض میں کیا کیا بیان کروں اب تو سوتی مال کی وہ ریل پیل ہو گئی ہے کہ باہر کی منڈیوں تک بھیجا جا رہا ہے اور ان سب مالوں کی پختگی و پائیداری کا حال کیا کہوں 'ساختۂ پاکستان' جس چیز کی چھاپ ہو خریدار بے ساختہ کہے لینے والی چیز تو یہی ہے!

اے درویشانِ عالی نظر آپ کو وہ بات تو یاد ہی ہو گی، ہرچہ قامت کہتر کہ بہ قیمت بہتر۔ یہ نوادر مصنوعات جن میں صناعوں کے دستِ حسن طراز کی جلوہ فرمائی ہے اسی ذیل میں آتی ہیں۔ مگر مجھے اپنی سیاحی و جہاں نوردی میں اور بھی عجائبات دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے اور دیارِ فرنگ کی سیر نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں چاہتا تھا کہ اس اپنی اقلیم پاک میں بھی ویسے ہی طلسمات سامری برپا ہوں۔ اے ندیموں، یہ زمانہ مشینوں اور کلوں کے بھونچال کا ہے۔ یہ دیو ہر جگہ متمکن ہو چکے ہیں اور وہ طلسمات باندھ رہے ہیں کہ اگلوں کے قصے، کہانیاں ہو گئی ہیں۔ ان کلوں کو دیکھو تو ذہن میں لندھور بن سعدان سے زیادہ بوجھل اور ان کے آہنی آلات و اسباب جنات کی برات معلوم ہوں۔ اب جو نمائش نام کی چیز آپ نے دیکھی نفیس نفیس شبک شبک دستی کاموں کے شہکار تھے، تو آزینگے ہاتھوں پھر احوال اس کا بھی سنا دوں کہ جنہیں بھاری، گرانڈیل صناعتیں کہتے ہیں ہمارے میرے درویش دوستو! کیا عجب کہ تم اس سے حیرت میں اور جاننے والے ترقی کی راہ پہ پڑ ہیں۔ جان رکھو کہ یہ اقلیم اب بڑی بڑی دھو نکل مشینیں بھی نصب کر چکی ہے اور کارخانے وہ وہ بھاری بنائے ہیں کہ مقام حیرت کا اور وجہ مسرت کے ہیں سزاوی حق بیان کرتا ہے کہ یہ ملک اب حوصلے کے سمند اور انتظام کے کمند سے لیس کائنات کی تسخیر کو نکل کھڑا ہوا ہے۔

اے صاحبان با تدبیر ہمت وروں نے کیا کام کیا کہ دانش وروں اور ہنرمندوں کا ایک سررشتہ ترتیب دیا اور "ادارۂ ترقی مصنوعات پاکستان" اس کو لقب دیا۔ خزانہ اسے فراہم ہوا اور کارخانوں نے اپنے مبارک سر بلند کئے جن پر چمنیوں کے عمامے سجے تھے اور نہایت بھاری بھرکم لباسِ آلات و ماشینات کے ان کے تن پر زیب تھے۔ اس سررشتہ نے کیا کام کیا کہ کروڑوں کی دولت جو دوسرے ہم سے لے جاتے تھے سب کی سب بچالی اور مال اپنا خود اپنے ہاں بننے لگا، ملک کا نصیب چمکنے لگا۔ اس گروہِ کارگزاراں نے کیا کیا بڑے کارخانے بنائے، کاغذ، پٹ سن، جہاز، دوائیں، شکر، سیمنٹ، کپڑا، قدرتی گاس، کیمیاوی مسالے، کھادیں۔ رنگ اور ابھی نہ جانے کیا کیا بنائیں گے۔ احوال ان کا تفصیل طلب ہے۔ یہ ملک کھیتی باڑی کا تھا اس لئے کیا طرفہ سبیل نکالی کہ نئی قسم کی کھادوں کی داغ بیل ڈالی۔ کھلنا کے مقام پر نیوز پرنٹ بننے لگا ہے۔ دلو گنج اور ٹھاکر گاؤں میں شکر کے کارخانے اُدھر پوربی پاکستان میں بن رہے ہیں تو ادھر خطۂ غرب میں بھی مردان شکر بنا رہا ہے گویا قندِ مکرر کا مزا آ رہا ہے! — اے صاحبان یہ زمانہ تجلّی کا اور یہ کارخانہ بجلی کا ہے، اس لئے بجلی بنانے کے کارخانے گاس کے کارخانے، ملتان کا یہ نیا کارگہ برق کیا کیا جادو جگا رہا ہے داؤد خیل میں پنسلین بن رہی ہے تو کالا باغ میں لوہا تک نکل رہا ہے! کراچی اور کھلنا میں جہاز بن رہے ہیں۔ حیدرآباد میں سیمنٹ بن رہا ہے اور اب کراچی میں ایک اور کارخانہ سیمنٹ بن جائے گا جس کی "رسم بسم اللہ" ادا کرنے کے لئے پھر وہی مردِ کارآگاہ کراچی پہنچا وہی بطلِ جلیل جو اس اقلیم کا زینت دہِ صدارت ہے اور یہ سب انقلابِ ترقی اسی سے عبارت ہے — !

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

غزل

احمد فراز

تو پاس بھی ہو تو دل بےقرار اپنا ہے
کہ ہم کو تیرا نہیں انتظار اپنا ہے

ملے کوئی بھی ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
کہ جیسے سارا جہاں رازدار اپنا ہے

وہ دور ہو تو بجا ترکِ دوستی کا خیال
وہ سامنے ہو تو کب اختیار اپنا ہے

بلا سے جاں کا زیاں ہو اس اعتماد کی خیر
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

زمانہ بھر کے دکھوں کو لگا لیا دل سے
اس آسرے پہ کہ اک غمگسار اپنا ہے

چراغِ بزم بجھا دے کہ ہو نہ رسوائی
تری نگاہ سے حال آشکار اپنا ہے

ادائے حسن کی اس بے تکلفی کے نثار
کہ جو بھی دیکھے وہ سمجھے کہ یار اپنا ہے

وہ خوش ادا بھی سہی جانِ مدّعا بھی سہی
مگر فراز ہمیں اعتبار اپنا ہے

شاہد عشقی

ہیں اس کی یاد سے وابستہ تلخیاں کیا کیا
مگر وہ شخص ہے وجہِ قرارِ جاں کیا کیا

یہ بوئے گل ہے، یہ رنگِ حنا، یہ قامتِ سرو
چمن بنا ہے تمہارا فسانہ خواں کیا کیا

ہوائے گل میں مثالِ صبا ہم آوارہ
پھرے ہیں چاک گریباں کہاں کہاں کیا کیا

لگن ہی اور تھی رقصاں تھے جس کے پروانے
وگرنہ شمعوں پہ رقصاں رہا دھواں کیا کیا

نہیں بسا تو بس اک شہرِ آرزو نہ بسا
اجڑ اجڑ کے بسیں ورنہ بستیاں کیا کیا

نہ کم ہوئی ہے نہ ہوگی گرانیِ شبِ غم
جلا ہے پھر بھی سحر تک شرارِ غم کیا کیا

حکایتِ لب و رخسار تھا مرا موضوع
کلام آ گئے بے لطف درمیاں کیا کیا

★

غزل

عبد اللہ خاور

گریز آشنا بھی اور دلنشیں بھی ہے!
نگاہِ دوست اوّلیں بھی، آخریں بھی ہے!

لرز رہا ہے ہر صدا میں شعلۂ جمال
نوائے نغمہ گر میں ردئے آتشیں بھی ہے

وہ ایک "رمز" بن گئے مرے سوال پر
سکوتِ ناز "ہاں" بھی ہے، "مگر نہیں" بھی ہے!

حضورِ دوست، اشکِ بے نمود ہے جو دل
جہاں ستیز ولولوں کی سرزمیں بھی ہے!

وہ حسن جو نظر کی بے شعوریوں میں تھا
حدودِ ضبط و احتیاط میں کہیں بھی ہے

شبِ فراق میں ترے کرم کی آرزو
بہت سبک قدم سہی، گراں نشیں بھی ہے!

بیانِ شوق میں تلاشِ ربطِ منطقی
ہماری طرح بے شعور نکتہ چیں بھی ہے!

یہی سہی کہ نذرِ انتشار ہو غزل
کہ آج منتشر وہ زلفِ عنبریں بھی ہے

ہوائے شام میں ہے پرفشاں کسی کا لمس
سرور میں کچھ آج خاورِ حزیں بھی ہے

طلعت اشارت

خود اپنی اداؤں کے دھوکے میں چلے آئے
گل فصلِ بہاراں بھی برداشت نہ کر پائے

تسکین بھلا دے بھی کیونکر دلِ مضطر کو
وہ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ ٹپک جائے

میں کیسے یقیں کر لوں یہ بزمِ تمنا ہے
گر حسن کہیں ہے تو ہمکو بھی نظر آئے

شاید کہ چھپے تھے تم میری ہی صداؤں میں
جب تم کو پکارا تو خوابوں میں چلے آئے

جو عزمِ سفر کو بھی منزل کا نشاں سمجھیں
ہم ڈھونڈ رہے ہیں اِن دیوانوں کے اب سائے

سمجھے تھے یہی رہبر منزل کو اُجالے گا
دو چار قدم چل کر ہم آپ ہی پچھتائے

سودائے جنوں اب کے کچھ خام رہا شاید
گو درد اُٹھا لیکن صحرا نہیں تھرائے

جو تیر بھی ترکش کے پہچان گئے ہم کو
وہ اپنے مقدر کی افتاد پہ شرمائے

تعلیم

"منزلیں اور بھی ہیں"

شجاع احمد زیبا

ایک ایسا راستہ جس کی کوئی منزل نہ تھی!

یہ ہے اس نظامِ تعلیم کا لب لباب جو برصغیر ہند و پاک میں دورِ آزادی سے پہلے سالہا سال رائج رہا اور جو اپنے ساتھ صدہا تباہ کن اثرات لایا۔ یہ وہ نظام تھا جس نے ہماری طبعی صلاحیتوں کو مفلوج اور دل و دماغ کو یکسر ماؤف کر دیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قوموں کی زندگی، اس کی استواری اور استحکام کا انحصار بڑی حد تک ان کے فلسفۂ حیات اور تہذیبی قوت پر ہوتا ہے۔ اصل غلامی سیاسی کمزوری کا نتیجہ نہیں بلکہ اساسِ فکر کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے سابق مغز آقا جنہیں "دانایانِ فرنگ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو واقعی حکمت و تدبر میں اپنا جواب آپ تھے، اس حقیقت سے خوب آشنا تھے اس لئے انہوں نے ملک پر اپنی سیاسی گرفت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے یہی حربہ استعمال کیا۔ لارڈ میکالے کے ذہن رسا کی داد دینی چاہئے جس نے مستعمرانِ برطانیہ کے منشاء مقصد کے مطابق ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جس نے اجنبی حکومت کو یہیں کے لوگوں کے شانوں پر استوار رکھا۔ یہ نظام جو ڈیڑھ سو سال سے ہمارے تعلیمی اداروں کا لائحۂ عمل بنا ہوا ہے، اسی نکتے کو نظر میں رکھ کر مرتب ہوا تھا۔ اس کے باوجود ہماری سلامت طبع اور جبلی صلاحیتوں نے ہمارا ساتھ دیا اور اسی ناقص تعلیم ہی سے بڑے بڑے جوہر قابل ظہور میں آئے اور وہ ذہنی بیداری پیدا ہوئی جو تحریکِ آزادی کی زبردست محرک تھی۔ اور آخرکار ہمیں لیلائے آزادی سے ہمکنار کر ہی کے رہی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر اس نظام کی بجائے جو اغیار کے لئے موزوں تھا کوئی ایسا نظام جو ہمارے مقاصد، ہماری ضروریات، ہماری روایات، ہمارے مزاج اور ہمارے حالات و ظروف کے لئے موزوں ہو تو اس کے نتائج کس قدر شاندار ہوں گے۔ اس سے بلاشبہ ہماری زندگی کے رگ و پے میں ایک نئی روح دوڑ جائے گی۔ اور ہم نہ صرف ہر قسم کے مسائل اور معاملات کو نئی نگاہوں سے دیکھنے کے اہل ہو جائیں گے بلکہ جملہ نظری و عملی امور پر محاکمہ کر کے صحیح راہ فکر و عمل بھی متعین کر سکیں گے اور ایسے نتائج پر پہنچیں گے جو ہر اعتبار سے موزوں و مناسب ہوں۔

ایک صحت مند اور باشعور معاشرے کے تعلیمی ڈھانچے کی ترتیب میں زندگی اور اس کے مسائل سے صرفِ نظر ممکن نہیں اس کا تعلق بنیادی طور پر اُن اصول و مقاصد سے ہوتا ہے جو ریاست کے نصب العین کا جزو لازم ہوتے ہیں۔ ریاست اور اس کے شہری بہ حیثیت مجموعی جس سمت میں گام زن ہوتے ہیں تعلیمی ادارے ان کے لئے زادِ سفر بہم پہنچاتے ہیں۔

ایک بے مقصد معاشرے کے نظامِ تعلیم میں اسی لئے عموماً انتشار، بے ترتیبی اور عدمِ تنظیم پائی جاتی ہے۔ ایسے دور میں افراد معاشرے کے مجموعی مفادات کو سامنے رکھ کر اپنی تربیت کے لئے کوشاں نہیں ہوا کرتے بلکہ اُن کی اپنی ذات اور اس کے تقاضے نشانِ راہ بن جاتے ہیں۔ موجودہ تعلیمی نظام جو ہماری مملکت کو انگریزوں سے ورثہ میں ملا ہے اسی انتشار اور بے ترتیبی کا حامل ہے اور اس تعلیمی نظام کے ساختہ و پرداختہ اصحابِ علم انفرادی طور پر کتنے ہی لائق و فائق کیوں نہ بن گئے ہوں، انہوں نے ذاتی مراتب و وجاہت کے کتنے ہی مراتب کیوں نہ طے کر لئے ہوں لیکن وہ معاشرے کے مجموعی مفادات کو آگے بڑھانے اور تقویت پہنچانے والی کسی ہمہ گیر مشینری کے کارآمد پرزے ثابت نہ ہو سکے۔

یہی احساس تھا جو نئی انقلابی حکومت کے لئے تعلیمی نظام کی اصلاح کی طرف توجہ کرنے کا محرک بنا۔ انقلاب کے تین ہی مہینوں کے اندر (۳۰ ردسمبر ۱۹۵۸ء کو) صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے تعلیمی کمیشن کے قیام کا اعلان کیا اور ۵ رجنوری ۱۹۵۹ء کو اس کے کام کا افتتاح کر دیا۔ کمیشن کے سپرد ایک بہت نازک اور اہم خدمت (ای

سکتی ہے، اور مسرت کی بات ہے کہ یہ ذمہ داری ارباب کمیشن نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی۔ کمیشن کے کام کی تیز رفتاری کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ اس نے اگست ۱۹۵۹ء میں اپنی سفارشات مرتب کرکے کام کو تکمیل کی منزل تک پہنچا دیا۔

اس ذمہ داری سے بجا طور پر عہدہ برآ ہونے کے لئے کمیشن نے ملک کے بہترین دماغوں اور اعلیٰ ترین ماہرین تعلیمات سے تبادلۂ خیالات کیا اور ممکنہ تبدیلیوں کے لئے ان کی آرا حاصل کیں۔ اس سلسلہ میں بیرونی ماہرین سے بھی استمداد کی گئی۔ کمیشن کی رپورٹ کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اس کی تیاری میں موجودہ مشکلات اور آئندہ قومی ضروریات دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کمیشن نے سب سے پہلے قومی تعلیم کا مقصد متعین کرنے کی کوشش کی اور اسی کی روشنی میں ایسی تبدیلیوں کی سفارش کی ہے جو ہمارے ملک کی ضرورتوں اور قومی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ موجودہ مدارس، اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بندھے ٹکے طریقہ ہائے کار سے بلند و بالا ہو کر سوچا جائے۔ چنانچہ کمیشن نے اس امر کو نہایت وضاحت کے ساتھ تسلیم کر لیا کہ؛

(۱) قومی تعلیم کا نظام ملی تصورات کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

(۲) قوم جن مقاصد اور نصب العین کو عزیز رکھتی ہے اس کا نظام تعلیم اس کے ساتھ کامل طور پر ہم آہنگ ہو۔

(۳) نظام تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جو قومی مقاصد اور نصب العین کی تکمیل کا ضامن بن سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں کمیشن نے اس تکلیف دہ حقیقت کا انکشاف کیا کہ حصول آزادی کے بعد بھی ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے نے اپنا انداز فکر تبدیل نہیں کیا۔ جمہوریت کا دور کی حکومتوں کے زمانے میں حکومت اور عوام کے درمیان وہ بُعد قائم رہا جو انگریز کے دور حکومت میں پیدا ہوا تھا۔ اجنبی حکومت کے ہر اقدام کو خواہ وہ بھلائی ہی کے لئے کیوں نہ ہو، شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس کی مخالفت لازم سمجھی جاتی تھی۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اس منفی طرز عمل کا اس درجہ عادی ہو چکا ہے کہ وہ ہمیشہ سوچتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ ملک آزاد ہو چکا ہے اور حکومت غیروں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود اپنے ہاتھ میں ہے۔ بڑی حد تک اس طرز فکر کے قائم رہنے کی ذمہ داری سابقہ حکومتوں پر بھی عائد ہوتی ہے کیونکہ اس زمانے میں عوامی مفادات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی لیکن انقلابی حکومت جو قوم کی آرزوؤں اور خواہشات کا مظہر تھی، اس مسئلہ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ عوام کی اس مریضانہ ذہنیت کی نشاندہی کمیشن نے مندرجہ ذیل نکات میں کی؛

(۱) انفعالی ذہنیت کی موجودگی جو تعاون سے گریزاں ہے۔

(۲) تنظیم سے نفور ذہنیتیں جو اپنے سے مافوق کسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرنا چاہتیں۔

(۳) وہ ذہنیت جو ذات کو مفاد عامہ پر ترجیح دیتی ہے۔

(۴) صوبائیت اور طبقہ واریت کا عفریت جو انتشار پھیلانے میں کوشاں رہتا ہے۔ کمیشن نے تسلیم کیا ہے کہ صدیوں کی بگڑی ہوئی عادتوں کو چند لمحوں میں سدھارا نہیں جا سکتا۔ لیکن چونکہ ہماری قوم تعمیری دور سے گزر رہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ حکومت اور عوام سختی کے ساتھ ان تخریبی قوتوں کا مقابلہ کریں اور ان کو ابھرنے کا موقع نہ دیں۔

گزشتہ تیرہ سال کے تجربے نے یہ بتا دیا کہ قومی ضروریات متنوع ہیں اور ہمارے عوام کی قوت عمل کی آزمائش کے لئے ابھی گوناگوں میدان منتظر ہیں۔ سابقہ نظام تعلیم کی ساری خرابی یہ تھی کہ وہ یک رخا تھا۔ آزادی کے بعد زندگی کی بنیادیں بدل گئیں۔ ہمارے دائرۂ عمل بڑی وسعت اور رنگا رنگی پیدا ہو گئی۔ اب تک جدید تعلیم یافتہ گروہ کی منتہائے ترقی سرکاری ملازمتوں کا حصول تھا۔ اب بھی لوگ سرکاری ملازمت کو اس لئے دلکش سمجھتے ہیں کہ یہ ارباب اقتدار کے گروہ میں شامل ہو جانے کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس پر توجہ نہیں کی جاتی کہ سرکاری ملازمت کے علاوہ بھی قومی زندگی کے ایسے رخ موجود ہیں جن میں ترقی کی لامحدود گنجائشیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً تجارت، صنعت وغیرہ وغیرہ اس لئے ہم کو ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو صرف سرکاری ملازموں کی ٹریننگ کا ذریعہ نہ ہو کر رہ جائے بلکہ قومی زندگی کے مختلف میدانوں میں جس قسم کے بلند حوصلہ اور عالی ہمت افراد کی ضرورت ہے، انہیں بھی بروئے کار لا سکے۔

چنانچہ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کمیشن کی رپورٹ میں پہلی دفعہ "ملازمتوں" کے علاوہ قوم کی دوسری ضرورتوں کو تسلیم کیا گیا ہے

فن:

قدیم فن، جدید نقاش

زین العابدین
ڈوروتھی حبیب

مختصر مرقع نگاری، زین العابدین:

عام طور پر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں مختصر مرقع نگاری کی جو روایت تھی ختم ہو چکی ہے اور اس کے استاد تو کجا معمولی کاریگر بھی میسّر نہیں یہی وجہ ہے کہ شاید ہی کسی فنکار کو اس سے اب کوئی عملی دلچسپی باقی رہی ہو۔ یہ سب کو تسلیم ہے کہ آبی رنگوں سے ان نقوش میں جو ملائمت اور نازکی آتی ہے اور رنگ پاشی اور الوان کی آمیزہ کاری سے جو دلنشیں، گہرائی اور دوام ان نقوش کو بہم پہنچتا ہے وہ واقعی بے مثال ہے۔

مگر یہ خیال کہ مختصر مرقع کشی کا ہنر ختم ہو گیا، غلط ہے۔ میں تردید میں چغتائی جیسے معاصر کاملینِ فن کا نام لوں گا۔ مانا کہ چغتائی کے زیادہ ممتاز نقوش کندہ کاری کے مرہونِ منت ہیں مگر اس کے کام کے ان نمونوں کو کیا کہئے گا جو اپنے طویل کینواس، روشن روشن الوان اور بے عیب صناعت کے باعث بجائے خود ایک جہانِ دیگر ہیں۔ انہیں دیکھ کر آدمی اذ بس یہی نتیجہ نکالیگا کہ چغتائی کو مختصر مرقع کشی کی تکنیک پر عبورِ تامہ حاصل ہے اور اس کا قوی احساس اس سے ایک مناسبت فطری لئے ہوئے ہے۔ ان نقوش کو دیکھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ قدیم کاملینِ فن کے اسلوب کو چغتائی نے اپنے شعور سے سنبھالا بھی ہے اور سنوارا بھی اس نے غالب کے کلام کو مصوّر کیا اور جیسا خود غالب نے کہا تھا کہ تنگنائے غزل کو اس نے وسعت و جامعیت بخش کر اوجِ کمال تک پہنچایا ہے اسی طرح چغتائی کے ان مرقعوں سے بھی اس فن کی شوکت اور نقاش کی استادی و مہارت مشہود ہے۔

جن نقادوں اور دیدہ وروں کی نگاہ صرف معاصر پاکستانی فن پاروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس روایت کو سنبھالے رکھنے کی مثال چغتائی کی ہی تو ہے۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یہ حقیقت نہیں جانتے یا جاننے میں تامل کرتے ہیں کہ ایسی گراں مایہ روایت کبھی بھی تہی دامن نہیں ہو سکتی۔

میں مثلاً حاجی محمد شریف کا نام لیتا ہوں۔ ان کے ہنر کو دیکھنے کے لئے لاہور کے نیشنل آرٹس کالج میں چلئے۔ مختصر مرقع نگاری کے اس فنکار کو دیکھ کر آپ کا یہ تامل وثوق میں بدل جائے گا کہ یہ فن زندہ ہے اور روایت کا تسلسل برقرار۔ یعنی قلم میں وہی نفاست و قدرت، وہی دلآویزی و صناعی و خوش الوانی، اس کا کس اور روپ اب بھی استادوں کے ہاتھوں پروان چڑھ رہا ہے۔

مختصر مرقع نگاری کے ان نمونوں کو ہم صرف اس حد تک روایت کا پابند کہہ سکتے ہیں کہ ان میں تکنیک کو روا رکھا گیا ہے مگر موضوع اور مشاہدہ اکثر نئے ہیں۔ حاجی شریف کے ان نقوش کو دیکھنے سے مغلیہ مصوّری کی طرف ذہن منتقل ہونا قدرتی ہے کیونکہ استاد نے برسہا برس ان نمونوں کو دیکھ کر ریاض کیا ہے اور اب یہ روش خاص اسکے لاشعور میں ایسی رس بس چکی ہے کہ اس کا قلم یہی انداز بنائے جا رہا ہے۔

یہ صناعت اپنے موضوع اور وضع کے اعتبار سے کچھ گردوں اور رازوں کی بھی حامل ہے جنہیں حاجی شریف جیسے استادانِ فن ہی خوب برت سکتے ہیں۔ ان کے بہت سے شاگرد ہیں مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی سی بات کسی تک پہنچی ہو۔ استادی اپنے کام میں محویت، مشاقی و ریاض ان کے وجود میں کچھ ایسا رم گیا ہے کہ شاید اسے کسی وہ دینا بھی چاہیں تو نہیں دے سکتے۔ یہ ان کا اپنا ذوق ہے، والہانہ اور کامل جس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔

ان کے وصفِ ہنر کو اچھی طرح جاننے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ انہیں کام کرتا ہوا دیکھیں۔ اس وقت ان کی خود فراموشی اور ہاتھ کی طلسم کاری دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

یہ تھا شخص۔ اب سامان کی بات لیجئے۔ رنگ: یہ بھی راز۔ نہ جانے کیا کیا سفوف۔ کیسی کیسی بوٹیاں۔ کون کونسی دھاتیں مل کر

ان کی یہ کیمیائی رنگ وقدرتیاں ہوتی ہیں ۔ کاغذ: یہ بھی ان کا اپنا ساختہ ہوتا ہے مخصوص نسخے اور بھی تیاری کے لائق۔ اس پر جو سلسلے ملے جاتے ہیں وہ بھی خاص گڑ ہیں۔ تو قلم، اب بھی گلہری کی دم اور پرندوں کے ملائم پروں سے ہی لئے جاتے ہیں لیکن ان میں آرائش و زیب کا عمل لانے کے لئے سونے کے ورق ان پر اب بھی گھوٹے جاتے ہیں۔
مختصر یہ کہ مختصر مرقع نگاری کی روایت اور جلد تلانہ یہ بحالہ موجود ہیں۔

حافظ صاحب نیشنل آرٹس کالج میں ان طلبہ کو فنی تربیت کرتے ہیں جو اس ہنر سے دلچسپی رکھتے ہیں جس ادارہ کو ان جیسا ماہر نصیب ہو اس کی خوش قسمتی میں کیا شک ہے۔ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ جن طلبہ میں اس فن کی لپک اور جو ہر پائے جاتے ہیں حکومت بھی ان کو وظائف دے کر ہمت افزائی کرتی ہے طلبہ کی اس جماعت کو کام کرتے دیکھیں تو واقعی بڑی مسرت ہوتی ہے کہ ان فنکاروں نے اس فن قدیم کی شمع کو روشن رکھا ہے اور وہ اس میں مہارت حاصل کر رہے ہیں۔ اور اس پرانے فن کو محفوظ کر رہے ہیں مگر نئے اسلوب و موضوع سے ۔۔۔ ان کے کام کو دیکھیں تو آجکل کی جیون جھلکیاں بھی نظر آئیں گی مگر طرح اور تیور وہ ہیں جو پرکھوں سے ہوتے ہوئے ان تک پہنچے ہیں۔

ڈیزائن: ڈود و بھی حبیب:

پرانے ڈیزائن بھی اپنی وضع داری اور انوکھے پن کے باعث بڑے دلفریب نظر آتے ہیں۔ پاکستان خوش قسمت ہے کہ اس کے پاس یہ دولت بھی کافی ہے، ایسے پیکروں کی تلاش کے لئے بہت خاک چھاننے کی ضرورت نہیں کسی مقامی عجائب گھر کا رخ کر لیجئے یا دیگر سرچشموں سے مدد لیجئے۔ ہماری جگہ جگہ کی رہت رسمیں، پہناوے اور برتاوے کی دسوں چیزیں ہی ایسی ہیں کہ ان کے ڈیزائن دیکھتے رہ جائیں۔ مراد یہ ہے کہ ڈیزائنوں کی بوقلمونی جابجا بکھری ہوئی نظر آئے گی۔ اگر کوئی باہر والا یہاں آئے اور اس کے ہاں صنعتی ترقی کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہو تو وہ بھی ایک نظر میں یہ دیکھ لے گا کہ جہاں تک ڈیزائنوں کی دولت کا تعلق ہے یہ ملک بڑا مالا مال ہے۔ مگر جیسا کہ ہوا ہی کرتا ہے خود گھر کے لوگ اپنی اس دولت کی اہمیت سے چنداں باخبر نہیں۔

کسی جگہ کے تمدن اور تہذیب و معاشرہ کی داستان سنانے کے لئے دستکاریاں (خصوصاً گھریلو دستکاریاں) سب سے بڑی زبانِ گویا ثابت ہوتی ہیں۔ وہ وقت تھا کہ سفر دشوار اور راستے کٹھن تھے۔ لوگ صعوبات سفر کے باعث اپنی بستیوں سے بہت کم ادھر ادھر جاتے تھے اس لئے ان کی زندگیاں بیرونی چھاپ سے آزاد رہ کر انفرادی خصوصیات کی حامل رہتیں اور اپنی کو بناتی سنوارتی رہتی تھیں۔ چنانچہ اب ہم کسی بھی خطے کی زندگی کی جھلکیاں اس کے ڈیزائنوں سے معلوم کر سکتے ہیں یعنی علاقے، دستکاریاں اور ڈیزائن مختص ہو گئے ہیں اور ان پیکروں نے مقامی اثرات کی نمائندگی کا چولا پہن لیا ہے۔

کسی بھی ڈیزائن کو دیکھیں فوراً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس خطے سے متعلق ہے۔ موجودہ دور سے بھی اس کی مثال ملتی ہے جو دنیا میں کہیں کچھ ہو گیا ہو (اور ہر دم کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے) ہم اس کا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آسان سفر اور مواصلاتی سہولتوں نے انسان کو انسان سے قریب کر دیا ہے اور ہر جگہ کی واضح تصویر اب ہر ایک کے سامنے موجود ہے اور بلا تامل کہا جا سکتا ہے یہ چیز وہاں بنتی ہو گی یا وہاں اس کو ضرور بنایا ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے جیسے یہ رجحان ترقی کرے گا مقامی ڈیزائنوں سے دلچسپی بھی بڑھے گی۔ اور پھر چونکہ آجکل کے کاروباری زمانہ کی ترکتازیاں دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ کر دم لیتی ہیں یہ کوئی تعجب نہ ہو گا کہ ڈیزائن یہاں کے وہاں اور وہاں کے یہاں رل مل جائیں مگر اس سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ہماری مقامی انفرادیت ہی ختم نہ ہو جائے جس سے ذوق اور فن کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تمدنی نشانیوں کو برقرار رکھا جائے۔

ہم اپنے ان روایاتی ڈیزائنوں کو دستکاریوں میں طرح طرح سے برت سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہوں کہ یہ تو اپنے گھر کی دولت ہے جب اور جیسے چاہیں استعمال کر لیں گے، بالکل غلط ہے کیونکہ ان سے کام لینا اور وہ بھی قرینہ اور سگھڑپن سے بڑا مشکل کام ہے۔ دشواری یوں پیدا ہوتی ہے کہ عہد جدید کا اقتصادی ڈھانچہ بڑا پیچیدہ ہو چکا ہے اور ان ڈیزائنوں کو قبول عام بخشنے یا عملاً ان سے مستفید ہونے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

نئی دنیا کی مشینی زندگی میں پہلا تقاضہ عملی سہولت کا ہوتا

ہے۔ ہر وقت کے برتنے میں چیز وہی چلتی ہے جسے اختیار و قبول کرنے میں کوئی جھجک نہ ہو، جھمیلا نہ ہو۔ اس تقاضے نے بڑے بڑے تکنیکی ماہروں اور اس سانڈ برگ کو پیدا کیا جسے اصطلاحاً "ڈیزائن اور صنعتی انجینئری" کہا جاتا ہے۔ اب ایسے ماہر تکنیکی لوگ ہر جگہ ضرورت کے مطابق تو میسر آنے سے رہے، اس لئے یہ بھی لازمی ہوا کہ ایسے مردانِ کار کا طبقہ بھی برابر وجود میں آتا رہے تاکہ صنعتی دنیا کو مہارت یافتہ کارپردازوں کی کوئی کمی نہ رہے۔

اپنے ہاں دیکھیں تو ایک قابل قدر دستی صنعت کو پروان چڑھانے کے سب عوامل موجود ہیں۔ ڈیزائن موجود، کاریگر بھی ہیں اور خام مال بھی میسر ہے۔ اگر کمی ہے تو اس وسیط کی جو اس شیرازہ کو باندھ سکے۔ میرا مطلب ہے ڈیزائن کار انجینئروں کی جو پاکستان کے جدید اقتصادی ڈھانچہ کو تیار کر کے حقیقۃً سامنے پیش کر دیں۔ اس کیلئے یا تو ہم باہر سے ماہرین بلوائیں یا اپنے آدمیوں کو تربیت کے لئے وہاں بھیجیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ سرے سے اس عنصر کو ختم کر دیں کیونکہ ایسا کرنے میں خسارہ ہی خسارہ ہوگا یعنی روپے اور وقت دونوں کا ضیاع۔ اور اس وقت ہم پاکستان میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔

مغرب میں مکانوں کی زینت اور سجاوٹ ایک ہنر جمیل کی حیثیت کو پہنچ چکی ہے۔ اس موضوع پر چھپنے والے رسائل کی ذرا ورق گردانی کر کے دیکھیں تو ایک بات فوراً ذہن میں آجائے گی اور وہ یہ کہ اب جدید دنیا میں اس برصغیر اور مشرق وسطیٰ کے ڈیزائنوں کو بڑا پسند کیا جا رہا ہے۔ یہ مشرقی شائلوں کا دور ہے۔ مگر جان رکھئے کہ شائلوں کے دور آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور بڑے محدود و موقتی ہوتے ہیں۔ پرانے اشائل جلد جلد معدوم ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نئے ڈیزائنوں کی جستجو برابر جاری رہتی ہے، کاروباری مصلحتیں بھی یہ چاہتی ہیں کہ جتنے نئے ڈیزائن نکلتے رہیں۔ پاکستان اس رجحان سے بڑا فائدہ اٹھا سکتا ہے، مگر تعویق مناسب نہیں کیونکہ اشائلوں کا جو دور اب چلا ہے، وہ ہمیشہ نہیں رہے گا۔

سندھ کی پرانی تہذیب کے ڈیزائن بھی بہت عمدہ نمونے ہیں اور جدید عمارات و آرائش، فرنیچر اور زیب بام و در کے آلات و پارچات میں ان طرفہ نمونوں کو برت کر بڑا تنوع، رنگارنگی اور خوبصورتی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہر چند کہ موجودہ عہد کی سجاوٹ اور عمارتی ضرورتیں صفائی، سلیقہ اور ستھرے پن میں کہیں اونچے معیار کو پہنچ چکی ہیں، پھر بھی یہ قدیم نقوش اور مقامی روایات کے عکاس ڈیزائن دلوں کو لبھا سکتے ہیں اور ایک دنیا ان کی گرویدہ ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان ڈیزائنوں کو نئے دور کی ضرورتوں کے مطابق بنا لیا جائے۔ اس میں نہ صرف تجارتی فائدہ ہے بلکہ ثقافتی اعتبار سے بھی بہت اچھا ہے کیونکہ ان نمونوں اور نقوش کے ذریعے ہم پاکستانی (اور اپنے پڑوسیوں کی بھی) تاریخی، تہذیبی و معاشرتی زندگی کی جھلکیاں دیارِ مغرب بلکہ دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا سکتے ہیں۔

یہ تہذیبی تال میل بھی ایک ڈرامہ ہے اور آپ خواہ اس ڈرامہ کے کردار ہوں یا محض تماشائی، اس سے متأثر ہونا لازمی ہے جس نے اس میدان میں رہ کر کبھی کچھ کام کیا ہو وہ اس بات کو محسوس کرے گا کہ اس تہذیبی تبادلے سے سب ہی کا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے فائدے کے جب امکانات نظر آئیں تو وہ ہمیں اس راہ پر چلنے کے لئے مہمیز کا کام دیتے ہیں اور مستقبل کے مضمرات و امکانات ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں نظرانداز کیا بھی نہیں جا سکتا۔ اس سلسلے میں معمولی سی کوشش کا بھی، بہ اعتبار سعی و محنت کہیں زیادہ بہتر صلہ مل سکتا ہے۔

امید رکھنی چاہیئے کہ اس جدید مشینی و صنعتی عہد میں بھی ہماری یہ سنگکاریاں اور پرانے ڈیزائن فنا نہیں ہوں گے اور ہم ان کا قالب اس طرح بدل سکیں گے کہ وہ عصر جدید کا جزو غالب بن جائیں۔

کتب خانوں کا اہتمام

(اسلامی دور میں)

سید ولایت حسین

علم و حکمت کے فروغ اور ان کے خزانوں کی فراہمی کا شوق ترقی یافتہ قوموں کی ایک امتیازی خصوصیت رہی ہے اور جہاں ان جواہر پاروں کی قدر کی جاتی ہو وہاں اُن کا تحفظ بھی لازم ہے۔ ان کی فراہمی، ان کی تنظیم، کتب بینوں تک رسائی، شروع ہی سے علم و حکمت کے پرستاروں کا محبوب مقصد رہا ہے۔ اور قدیم ترین زمانے ہی سے اپنے اپنے حالات کے مطابق ان تینوں باتوں کا اہتمام کرتے آئے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کتب خانوں کا قیام جو برابر ایک اہم ثقافتی سرگرمی رہی ہے۔

جن سگانہ مقاصد کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ سب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ان میں تنظیم و ترتیب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر عمدہ سے عمدہ سرمایۂ کتب بھی علم و فن کے پرستاروں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اور نہ وہ اس سے کما حقہٗ مستفید ہو سکتے تھے۔ آج کتابوں کی حفاظت، ترتیب اور تقسیم کا فن بے حد ترقی کر چکا ہے۔ لیکن اپنے انتہائی عروج تک پہنچنے سے پہلے اس نے جو مدارج طے کئے ہیں ان کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے زمانے میں اس کو جس درجۂ کمال تک پہنچایا تھا وہ اُن کے لئے ہمیشہ سرمایۂ ناز رہے گا۔

اگر ہم ہر قسم کے علمی و ادبی سرمایہ، مخطوطات، کتب اور رسائل و جرائد کو سامانِ مطالعہ قرار دیں تو ظاہر ہے اُن کی تنظیم کس قدر اہم اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور تنظیم کے لئے فہرست سازی اور درجہ بندی مقدم ہیں۔ اگر درجہ بندی یعنی سامان مطالعہ کی ترتیب بہ اعتبار موضوع، نوعیت وغیرہ کو کتب خانوں کے انصرام و اہتمام کا سنگ بنیاد قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سے سامان مطالعہ اس طرح منظم و مدوّن ہو کر بہ سہولت تمام اربابِ نظر تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

دنیا کے دو نہایت قدیم اور اہم کتب خانوں میں ایک تو نینوا کا کتب خانہ تھا جسے آشور بانی پال نے ۷۰۰ ق۔م میں قائم کیا تھا۔ اور جس میں مٹی کی تختیوں پر کندہ عبارتیں درج تھیں، دوسرا ۲۸۳ ق۔م میں بطلیموس نے اسکندریہ میں قائم کیا تھا۔ مطالعہ کے لئے مواد کی فراہمی اور اس کی تنظیم و تدوین کی اس زمانہ میں بھی اتنی ہی شدید ضرورت محسوس کی جاتی تھی جتنی کہ آج۔ ان کتب خانوں میں کتابوں کی مختلف موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دی ہوئی فہرستیں تک موجود تھیں۔

کوئی ایک ہزار سال بعد ظہور اسلام علم کی روشنی اپنے جلو میں لے کر آیا۔ اس نے علم و حکمت پر خصوصیت سے توجہ دی، کیونکہ:

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

بنا بریں اسلامی نظام حیات میں کتابوں کو خاص دخل رہا ہے۔ وہ اسلامی معاشرہ میں ایک نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید کی تفسیر و تشریح اسلام کی تبلیغ اور سیرت نبوی پر ضو فشانی ہر قسم کی علمی، ادبی اور ذہنی سرگرمیوں کی مقتضی تھی۔ اور جب علم و حکمت، تہذیب و تمدن اور تاریخ کے وسیع میدانوں میں غیر معمولی ترقی ہو تو گوناگوں تصنیفات و تالیفات کا بروئے کار آنا ناگزیر ہے۔ اور ان کے تحفظ اور بہم رسانی کے لئے کتب خانوں کا قیام ازبس ضروری ہے۔ اسلام میں کتب خانوں کی تحریک اُن مکاتیب خیال کی نشو و نما کا نتیجہ تھی جو کتاب، احادیث، سیرت، تاریخ وغیرہ کے پُر زور بنیادی محرکات سے وجود میں آئے۔

جیسا کہ لازم تھا سب سے پہلے قرآن حکیم پر کتابیں لکھی گئیں اور انہیں فراہم کیا گیا۔ پھر پیغمبر اسلامؐ کی سیرت، ان کے اسوۂ حسنہ، ان کے ارشادات و فرمودات پر توجہ ہوئی۔ اس کام نے ایک بالکل نئے موضوع سے دنیائے فکر کو متعارف کروایا۔ یہ علم تھا، اسماء الرجال، جس کا تعلق ان افراد کے شجرہ اور حسب و نسب کی تحقیق سے تھا جو حدیث نبوی

ــکے راوی [illegible] جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ اسلام کی روشنی دور تک پھیلتی گئی۔ عراق، شام، فلسطین، ایران، مصر، سارا مشرقِ وسطیٰ، سارا شمالی علاقہ، بحیرۂ روم کی وسعتیں یہاں تک کے جنوبی فرانس کے ساحل تک اس کے اثرات چھا گئے۔ ادھر دنیا کی دیگر اقوام سے اختلاط اور ربط و ضبط نے مسلمانوں کو کئی علوم و فنون سے بھی روشناس کرایا۔ مثلاً جغرافیہ، فلکیات، ریاضی، فلسفہ، علم الحیوانات، نباتات، طب وغیرہ۔ ان پر ہزارہا کتابیں لکھی گئیں اور مسلمانوں نے قدیم مصنفوں کے کام پر بڑے مفید اضافے کئے۔

اسی وجہ سے کتابوں کو یکجا کرنے کی ضرورت بھی لاحق ہوئی اور ان کو ذخیرہ کرنے کا شوق بھی بڑھا۔ حضرت خالد بن یزیدؒ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے عہدِ اسلامی میں سب سے پہلا کتب خانہ قائم کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کی توسیع فرمائی اور عوام کو اس سے استفادہ کی اجازت دی۔ لہٰذا اسی بزرگ کو اسلامی کتب خانوں کا مؤسس سمجھنا چاہیئے۔ بڑی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں بھی موضوعات اور نوعیت کے اعتبار سے کتابوں کی بڑے اہتمام اور خوش اسلوبی سے درجہ بندی کی گئی تھی۔ اور اس فن پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ شوق بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ خلفائے عباسیہ کے دور میں علوم و فنون درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ ہر قسم کے مخطوطے اور کتابیں بڑی محنت اور استادی سے تیار کی جانے لگیں۔ ادھر جلد سازی اور آرائشِ کتب کے فن نے گوناگوں صورتیں اختیار کیں۔ سادہ، پُرکار، مذہب، اسی بنا پر یہ عہدِ اسلامی کا دورِ زرّیں ہوتے ہوئے کتابوں کی تیاری اور کتب خانوں کی تنظیم کے لئے بھی بے حد ممتاز ہے کہتے ہیں کہ وہ "دار الحکمت" یعنی کتب خانہ جو خلیفہ ہارون الرشید نے قائم کیا تھا، چار لاکھ کتابوں پر مشتمل تھا۔ اس میں صدہا کتابیں موضوع کے اعتبار سے ترتیب دی گئی تھیں۔ اور مختلف موضوعات کے لئے مختلف کمرے مخصوص کر دیئے گئے تھے۔

ڈاکٹر پنٹو، مولانا شبلی نعمانی اور دیگر مورخین نے بالاتفاق یہ تسلیم کیا ہے کہ اسلامی کتب خانوں میں دو شعبے ہوا کرتے تھے۔ ایک فراہمیِ کتب کا شعبہ اور دوسرا دار الترجمہ۔ ان کتب خانوں سے کتابیں مطالعہ کے لئے جاری کی جاتی تھیں۔ اس لئے ظاہر ہے ان میں اندراجات وغیرہ کا پورا پورا اہتمام بھی ہوتا ہوگا۔ یاقوت کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اس نے مرو کے دو کتب خانے سے دو سو کتابیں پڑھنے کے لئے عاریتاً حاصل کی تھیں۔

امویوں کے دور میں کتب خانے زیادہ نشو و نما نہ پا سکے۔ دراصل اسلام میں کتب خانوں کی تحریک دورِ عباسیہ ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے بعد کتب بینی اور کتب خانوں کے قیام کا شوق یوماً فیوماً بڑھتا ہی گیا اور شہر شہر اور گھر گھر کتب خانے ہی کتب خانے قائم ہوتے گئے۔ بغداد، بصرہ، مرو، طرابلس، قرطبہ، شیراز، بخارا اور قاہرہ کے کتب خانوں کا غلغلہ صرف اپنے زمانے میں ہی بلند نہیں رہا بلکہ زمان و مکان کی حدوں کو پار کر کے آج بھی سنائی دیتا ہے اور اُن کی چار دانگ عالم میں شہرت ہے۔

افسوس ہے کہ یہ علمی ذخائر یا تو فتنۂ مغول کے باعث برباد ہو گئے۔ یا صلیبی جنگوں کے زمانے میں عیسائیوں کے مذہبی تعصب اور شعلہ زنی کی نذر ہو گئے۔ اس کے باوجود ان کے دستاویزی ثبوت نیست و نابود نہ ہو سکے۔ ان کے حوالے آج بھی المقدسی، المقریزی، ابن خلدون، الیاقوت اور الندیم جیسے معروف مورخین اور جغرافیہ دانوں کی تصانیف میں جا بجا موجود ہیں۔ جن سے مواد حاصل کر کے ہم اس زمانے کے کتب خانوں کی ہیئت، کارکردگی اور حسنِ تنظیم کا واضح خاکہ مرتب کر سکتے ہیں۔ آیئے ہم ان کتب خانوں پر ان تین باتوں کی روشنی میں نظر ڈالیں: "ذخیرہ کتب، عملہ، اور کتب خانہ کی وضع و ہیئت" تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس عہد میں ان کی کیفیت کیا تھی۔

اس عہد کے تقریباً سارے کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ بادشاہ بذاتِ خود علم و فن کے سرپرست ہوتے تھے۔ اور ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ابتدائی زمانے سے لے کر اُن کے اپنے عہد تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہوں، انہیں اپنے کتب خانوں میں محفوظ کر لیں۔ اس مقصد کے لئے ان کے گماشتے اسکندریہ، دمشق، اور بغداد کے کتب فروشوں کی ایک ایک دکان چھان مارتے تھے تاکہ یا تو وہ کتابیں خرید لیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان کی نقلیں ہی حاصل کر لیں۔

عام رجحان یہ تھا کہ کسی کتاب کی تمام نقلیں جو مختلف اوقات میں مختلف کاتبوں نے تیار کی ہوں، کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی جائیں۔ چنانچہ خلیفہ عبدالعزیز کے شاہی کتب خانے میں قرآن مجید کے کوئی ۲۴ سو نسخے اور طرابلس کے کتب خانے میں کوئی ۵۰ ہزار نسخے فراہم کئے۔ ہر ممکن

کوشش کی جاتی تھی کہ کسی کتاب کا اصل قلمی نسخہ حاصل کرکے کتب خانے میں رکھ لیا جائے۔ ابن خلدون بیان کرتے ہیں کہ الحاکم نے "الاغانی" کا اپنا قلمی نسخہ، ہزار روپے میں خریدا تھا۔ خلیفہ عبدالعزیز کے کتاب خانے میں ایک دفعہ "کتاب العین" کے بارے میں استفسار کیا گیا تو مہتمم کتب خانہ نے اس کے ۳۰ مختلف نسخے پیش کئے۔ ان میں سے ایک نسخہ وہ تھا جسے خود مصنف خلیل بن احمد نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اس کتب خانہ میں اقلیدس کا بنایا ہوا ایک کرۂ ارض بھی تھا اور دوسرا ابوالحسن صوفی کا بنایا ہوا جسے ۱۵ ہزار روپے میں خریدا گیا تھا۔ مامون الرشید کے "دارالحکمۃ" میں آنحضرت ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کی چمڑے پر لکھی ہوئی ایک تحریر بھی موجود تھی۔ ابن خلکان کا کہنا یہ ہے کہ بخارا کے شاہ نوح بن منصور سامانی کے پاس تقریباً ہر موضوع پر کتابیں موجود تھیں، بالخصوص علم فلسفہ پر۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ان کتب خانوں میں کتابوں کی درجہ بندی بہ اعتبار موضوع کی جاتی تھی۔ اور ان کی مکمل فہرستیں موجود ہوتی تھیں۔ معلوم نہیں ان دنوں درجہ بندی کا کیا طریقہ مستعمل تھا اور فہرستیں تیار کرتے وقت کس قسم کے اندراجات کئے جاتے تھے۔ اس لئے کتب خانوں کی تنظیم کے بارے میں کوئی واضح تصور قائم کرنا مشکل ہے۔

اس خصوص میں ہماری تحقیقات کا دائرہ دورِ عباسیہ کے اوائل یعنی ۷۸۶ عیسوی سے زوال بغداد (۱۲۵۸ء) تک محدود ہے۔ پھر یہ دائرہ کچھ اور وسیع ہو کر زوال غرناطہ (۱۴۹۲ء) تک جا پہنچتا ہے۔ بغداد، کوفہ، مرو وغیرہ کے شاندار کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے لے کر چار لاکھ تک تھی۔ کتابوں کی فہرست سازی اور درجہ بندی کے متعلق ہماری معلومات کا واحد ذریعہ الندیم کی "الفہرست" ہے۔ جو تقریباً چار صدیوں کی عربی کتابوں کی مبسوط کتابی فہرست ہے۔ اور ۹۸۷ء میں منظر عام پر آئی۔ ابوالفرج محمد بن اسحٰق جو الندیم کے نام سے مشہور ہیں، بغداد کے رہنے والے تھے اور وہیں انہوں نے "دلال الکتب" یعنی کتب فروشی کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان تمام کتابوں کی مکمل فہرست مرتب کرنے کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا جو ظہورِ اسلام سے لے کر ان کے اپنے زمانے تک لکھی گئی تھیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے سفر کی صعوبتیں بھی اٹھائیں۔ اور ہر اس شہر اور مقام تک پہنچے جس کے بارے میں انہوں نے سن رکھا تھا کہ وہاں کوئی کتب خانہ موجود ہے۔ اس طرح انہوں نے بے انتہا عرق ریزی کے بعد دنیا کو ہر شعبۂ علم کی ایک مکمل فہرست کتابیات مہیا کردی۔ "الفہرست" جو قاموس کتب ہے ہے اور ایسی باقاعدہ فہرست جو بہ اعتبار موضوعات مرتب کی گئی تھی۔ اس میں مصنفین کے نام اور کارنامے بھی درج ہیں۔ کتابیات کی رو سے اس فہرست کی خواہ کتنی ہی قدر و منزلت کیوں نہ ہو، جو بہرحال کسی حیثیت سے کم نہیں ہو سکتی، ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ اس کو مرتب کرنے میں الندیم کتب خانوں کے معاصر طریقۂ درجہ بندی سے ہی متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی فہرست میں موضوعاتی تقسیم اور درجہ بندی اسی اثر کا لابدی نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر اسپرینگر نے اپنی "رپورٹ برائے کتب خانہ ہائے اسلامی لکھنؤ" مرتبہ ۱۸۹۶ء میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "الفہرست" اپنے عہد کے کسی کتب خانے کی فہرست ہے۔ لیکن اس پر طائرانہ نظر ڈالنے سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس کو اس زمانے کے مروجہ طریقہ درجہ بندی کے مطابق ہی مرتب کیا گیا تھا۔ تمام کتب خانوں میں کتابوں کی درجہ بندی ہوچکی تھی اور سب کی فہرستیں تیار تھیں۔ الندیم ہو یا کوئی اور ماہر کتابیات کسی دور میں بھی اپنے عہد کے طریقہ درجہ بندی کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ کیونکہ پڑھے لکھے افراد کی معتد بہ تعداد اسی سے مانوس ہوتی ہے۔ اس درجہ بندی کی کیفیت حسب ذیل تھی؛

علم کی ساری بساط دس بنیادی شعبوں میں تقسیم کردی گئی تھی جنہیں الندیم "الفہرست" میں "مقالات" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ ان بنیادی شعبوں کی حسب ضرورت ضمنی طور پر مزید تقسیم کردی گئی تھی۔ بنیادی شعبے یہ ہیں؛

(۱) القرآن (۲) صرف نحو (۳) تاریخ (۴) نظم
(۵) عقائد (۶) فقہ (۷) فلسفہ (۸) علم ادب
(۹) مذہبیات (۱۰) الکیمیا۔

ان میں سے پہلے چھ شعبے اسلامی ادبیات سے متعلق ہیں۔ اور آخری چار غیر اسلامی ادب سے۔

"الفہرست" کی طرح کتب خانوں کی فہرستیں بھی بہ اعتبار موضوع ترتیب دی گئی تھیں۔ اور مصنف کے نام کے تحت اندراجات خصوصی طور پر کئے گئے تھے۔ فہرستیں کتابی شکل میں مرتب ہوئیں مگر ہر موضوع کے لئے جدا جدا حصص میں۔ "کتب خانہ رے" کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں اتنی کتابیں تھیں کہ وہ چار سو اونٹ گاڑیوں پر لادی جاسکتی تھیں۔

ان ساری کتابوں کی فہرست ۱۰ جلدوں پر مشتمل تھی۔ کتب خانہ "خزینۃ الکتب" (شیراز) کے ۳۶۰ کمرے تھے۔ ہر موضوع کے لئے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص تھا۔ اور ہر کمرے کی کتابوں کی علیحدہ فہرست بناکر کتابی شکل میں کمرے کے اندر رکھ دی گئی تھی۔ ہِتّی کے بیان کے مطابق قرطبہ کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن کی فہرست ۴۴ جلدوں میں ترتیب دی گئی تھی۔

کتابیں الماری کے خانوں میں ایک دوسرے پر چلیپائی انداز میں رکھی جاتی تھیں۔ کتابوں کو بنیادی موضوع کے ضمنی درجوں کے تحت اس طرح رکھا جاتا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی سی ڈھیریاں نظر آتی تھیں۔ ان کی ترتیب کا نقشہ ڈاکٹر اولگا پنٹو نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"کتابوں کی پشت پر مصنف کا نام اور عنوان لکھ دیا جاتا تھا۔ کتابوں کو بہ اعتبار موضوع ترتیب دیا گیا تھا اور مطلوبہ کتاب کی تلاش میں سہولت پیدا کرنے کے لئے الماریوں کے باہر ہر خانے پر ایسی پرچی چسپاں کر دی جاتی تھی جس پر خانے میں رکھی ہوئی کتابوں کے مندرجات مختصراً رقم ہوتے تھے۔ ان پرچیوں سے یہ بھی پتہ چل جاتا تھا کہ کونسی کتابیں نامکمل ہیں اور کن کتابوں کے حصے تشنہ ہیں۔"

کتب خانوں کا انتظام ایک مستقل عملے کے سپرد تھا۔ ہر کتب خانہ کا ایک ناظم، ایک مہتمم، ایک منتظم اور ان کے کئی مددگار نائبین ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ محرروں کا بھی عملہ ہوتا تھا۔ کتب خانے دو شعبوں میں منقسم ہوتے تھے۔ (۱) کتابیں مہیا کرنے والا شعبہ جس کے ذمے کتابوں کی خرید، دیکھ بھال اور ترتیب و تنظیم تھی۔ (۲) دارالترجمہ جہاں دوسری زبانوں کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کا کام کیا جاتا تھا اس شعبے کے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ کتابوں کی زیادہ سے زیادہ نقلیں تیار کرے اس میں ۱۰۰ سے کر ۳۰۰ محرروں اور کاتبوں کا عملہ کام کیا کرتا تھا طریقۂ کار یہ تھا کہ ایک آدمی بآواز بلند کتاب پڑھتا اور ۳۰۰ محرر و کاتب بیک وقت لکھتے جاتے تھے۔ چھاپے خانوں کی عدم موجودگی میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں کتابوں کی تیاری کا یہ طریقہ بہت ہی انوکھا اور قابل ستائش تھا۔ کیونکہ اس سے بیک وقت ۳۰۰ کتابیں تیار کی جا سکتی تھیں۔

کتب خانوں کے مہتمم بے حد معزز سمجھے جاتے تھے۔ مختلف علوم و فنون کے ماہرین اور بڑے بڑے حکماء و مفکرین کتب خانوں کے مہتمم مقرر کئے جاتے تھے۔ ہارون الرشید کے ہاں فضل ابن نوبخت مہتمم کتب خانہ تھا۔ جو ایک مشہور و معروف محقق و مفکر تھا۔ "دارالحکمۃ" کے انتظامات سُہیل بن ہارون اور سعید بن ہارون کے سپرد تھے۔ کتب خانہ رَے کی دیکھ بھال مشہور ادیب ابن مسکویہ کیا کرتے تھے۔

نوح بن منصور سامانی کے پاس ایک بہت ہی شاندار کتب خانہ تھا جس میں شہرۂ آفاق مفکر اور طبیب، بو علی سینا بطور مہتمم کارپرداز تھا۔ حلب کے سیف الدولہ کے کتب خانے کے نگران مشہور شاعر محمدؐ بن ہاشم اور اس کے بھائی تھے۔

فیضی جیسا نامور شاعر اکبر اعظم کے کتب خانے کا نگران اور حضرت امیر خسروؒ سلطان علاء الدین خلجی کے منتظم کتب خانہ تھے۔ بقول شُستری ان کتب خانوں میں کام کرنے والے بالعموم مرد ہوتے تھے۔ لیکن عورتوں کو بھی عملے میں رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ "دارالحکمۃ" میں دارالترجمہ کی صدر شعبہ ایک خاتون توفیق نامی تھیں۔ ایک اور خاتون فاطمہ نامی اسی کتب خانہ کے عملے میں بطور کاتب بھی کام کرتی تھیں۔

بیشتر کتب خانے شاہی محلات میں قائم تھے۔ مختلف شہروں کی جامع مسجدوں میں بھی کتب خانوں کے لئے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ مختلف مدرسوں میں بھی کتب خانے ہوتے تھے۔ عمارت بہت بڑے ہال اور اس کے ساتھ کئی ملحقہ کمروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان کمروں میں جانے کا راستہ ہال کی طرف سے ہوتا تھا۔ ان کمروں کو کتابوں کے ذخائر رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ۳ گز چوڑی قد آدم الماریاں کمروں اور برآمدوں کی دیواروں میں نصب ہوتی تھیں۔ اور ان کے اندر تختوں والے کواڑ لگے ہوئے تھے۔ بعض ایسی الماریاں بھی تھیں جن کے پٹ اوپر سے نیچے کھینچ کر بند کئے جاتے تھے۔ بعض کتب خانوں میں کتابیں چوبی صندوقوں میں بند کر کے رکھ دی جاتی تھیں۔ عرب سیاح المقدسی نے "خزینۃ الکتب" (شیراز) کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"بانیٔ کتب خانہ نے ہر قسم کی کتابیں فراہم کر رکھی تھیں۔ بڑا ہال ایک صنعاء یعنی تین طرف سے گھری ہوئی شہ نشین تھی۔ ہال کے چاروں طرف دیواروں میں الماریاں نصب تھیں طول

میں قدِ آدم اور عرض میں ۳ گز۔ ان الماریوں پر سنہرا اور روپہلا کام کیا ہوا تھا۔"
اس کتب خانے کے فرش پر قالین اور دریاں بچھائی جاتی تھیں۔ جہاں مطالعہ کرنے والے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ دریچوں اور دروازوں پر دبیز پردے آویزاں ہوتے تھے۔ تاکہ سرد ہوائیں باہر سے اندر نہ داخل ہو سکیں۔ ڈاکٹر اولگا پنٹو عوامی کتب خانے کی عمارت کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچتے ہیں:

" ان میں سے بعض کتب خانے مختلف قسم کی عمارتوں میں قائم کئے گئے تھے۔ جن کے کمرے مختلف مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ برآمدوں میں الماریوں کے خانے ہوتے تھے۔ جہاں کتابیں رکھی جاتی تھیں۔ کچھ ایسے کمرے بھی ہوتے تھے جہاں کتب خانوں میں آنے والے لوگ بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے تھے۔ قلمی نسخوں کی نقلیں تیار کرنے کے لئے جو لوگ متعین تھے ان کے لئے علیحدہ کمرے مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ یہ تمام کے تمام کمرے مکمل طور پر آرام و آسائش کے سامان سے آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔ فرشوں پر قالین اور دریاں بچھی رہتی تھیں۔ جہاں مطالعہ کرنے والے ٹھیٹ مشرقی انداز میں آلتی پالتی مار کر بیٹھا کرتے تھے۔ دریچے اور دروازے پردے سے ڈھانک دیئے جاتے تھے۔ اندر داخل ہونے کے صدر دروازے پر ایک دبیز پردہ ڈال دیا جاتا تھا تاکہ سرد ہوا سے محفوظ رہا جا سکے۔"

یہ بلاشبہ فنی مہارتوں کا نہایت قابل قدر مظاہرہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ۹ سو برس پہلے کتب خانے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ اور آج کل کے کتب خانے جس ترقی کا دعویٰ کر رہے ہیں، وہ محض ان قدیم کتب خانوں کا ایک پرتو ہے۔ ان کی اپنی ممتاز اور منفرد کوشش نہیں ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک جو بھی اضافہ ہوا ہے وہ محض اس قدر ہے کہ معمولات کو میکانی شکل عطا کر دی گئی ہے جو درحقیقت گزشتہ دو سو سال کی سائنسی اور میکانی ترقیات کا نتیجہ ہے اور بس ٭

"بسیار تخلص صاحب" بقیہ ص ۳۳

بقیہ ص ۳۳

آنکھوں کے سامنے لاتعداد اردو لغت کے الفاظ ناچنے لگے تھے۔ یہ ڈر سب سے زیادہ کہ نظم شائع ہونے تک نہ جانے شاعر کی تغیر پسندی کونسا تخلص اختیار کر لے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایڈیٹر صاحب کے چہرے پر عجیب قسم کے شبہات کے آثار نظر آنے لگے۔ میں نے جان چھڑانے کے لئے جھٹ کہہ دیا... " نام۔ نام میں کیا ہے۔ بہرحال محمد امین ہی ٹھیک رہے گا۔ میرے بہکے بہکے جملے سن کر ایڈیٹر صاحب معنی خیز ہنسی ہنسے اور تشریف لے گئے۔

اتوار کو شاعر مجھے لینے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک اخبار مچوڑا بنا ہوا تھا۔ ان کے چہرے اور اخبار کی حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت غصے میں ہیں۔ میرے خوش آمدید کہنے سے پہلے چیخے "یہ دیکھو۔ کسی ناہنجار نے میری نظم اپنے نام سے شائع کرا دی ہے۔ تم اس کے ذمہ دار ہو۔" میرا ماتھا ٹھنکا کہ شاید ایڈیٹر یا کاتب نے اپنا نام جما دیا ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اخبار ان کے ہاتھ سے لیا۔ تیسرے صفحے پر نظم تھی۔ نام محمد امین لکھا تھا۔ اب میرا غصہ دیکھنے کی چیز تھی: "پاگل ہو گئے ہو تم۔ تمہارا ہی نام تو ہے۔" میں نے دیکھا کہ اس وقت شاعر نے بہت سے رنگ گرگٹ کی متابعت میں بدلے۔ اور بالآخر اس کے چہرے اور مونچھوں پر ایک ایسی اطمینان کی لہر آ کر ٹھہر گئی جو عموماً گوہر مراد پا لینے والوں کے چہروں پر کبھی کبھی دکھائی دیتی ہے۔ تھوڑی دیر خود لطف اٹھا چکنے کے بعد بولے "...... یار محمد امین نام برا تو نہیں... میری غزلوں میں جو مختلف تخلص آتے ہیں ان کو قلم زد کر دینا......" ٭

رپورتاژ:

"شاہیں کا جہاں"

(گذرگاہ خیبر)

عارف حجازی

سورج طلوع ہونے کی دیر تھی کہ فضا منور ہو گئی اور ذرہ ذرہ چمک اٹھا ہم وردی پہنے گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے قطاریں کھڑے تھے۔ اتنے میں کمانڈنگ آفیسر جیپ میں آگئے اور ہماری کمپنی کمانڈر نے "سلوٹ" کا نعرہ بلند کیا سب نے کھٹ سے دونوں ایڑیاں ملا کر انہیں سلامی دی، پھر تھوڑی دیر کے بعد ہمیں جیسے ہی "تھری ٹن" لاریوں میں سوار ہونے کا حکم ملا تو ہماری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس وقت میرے دل میں طرح طرح کے پُرمسرت خیالات آتے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خیبر دیکھنے نہیں بلکہ کسی فردوس کی طرف جا رہا ہوں۔

ہم رسالپور چھاؤنی سے درۂ خیبر دیکھنے جا رہے تھے۔ دنیا کی اہم ترین شاہراہ جس کی تاریخی اہمیت کی کوئی حد نہیں جس نے برصغیر پاک وہند کی قومی، تمدنی اور معاشرتی زندگی میں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس درے سے اسکندر اعظم برصغیر میں داخل ہوا تھا۔ کبھی محمود غزنوی کے لشکر جرار کے نعروں سے اس کی چٹانیں لرز اٹھی تھیں۔ اسی راستے سے اردوئے بابری وارد ہند ہوا تھا۔ اسی رہگذر سے نادر شاہ ہندوستان آیا تھا اور ابدالی لشکر بھی اسی راہ سے گذرا تھا۔ اور نجانے ایسے کتنے ہی کارواں، قافلے اور مسافر ہوں گے جو گذرگاہ خیبر سے سینکڑوں بار آئے اور چلے گئے۔ اور آج بھی اسی راستے سے سینکڑوں مسافر، اجنبی اور دنیا کے بڑے بڑے سیاح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

میں لاری کے ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا اور ذہن میں شاہراہ خیبر کی عظمت، جاہ و شہرت اور زمانہ ماقبل تاریخ کے ادوار سے لیکر دور حاضر تک کے تاریخی واقعات کا دفتر کھلا ہوا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی بڑے ہشاش بشاش بیٹھے قہقہے لگا کے ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول تھے لیکن جب لاری کی رفتار تیز ہو گئی تو ان کی باتوں کی آواز بھی اس کے شور میں ڈوب گئی۔ نوشہرہ سے گزر کے اب ہم سیدھی سپاٹ صدیوں پوڑھی جرنیلی سڑک پر نکل آئے تھے جس کے ایک طرف دریائے کابل بہہ رہا تھا تھوڑی دیر میں دریا بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب چاروں طرف رومان انگیز نظارے تھے، حسین سبزہ زار اور چراگاہیں تھیں۔ اور چٹیل ٹیلے تھے۔ گیہوں، جوار اور چنے کی فصلیں کھڑی جھوم رہی تھیں جہاں پٹھان کسانوں کی ٹولیاں کام کر رہی تھیں۔ ان کے مویشی ہری ہری گھاس پر چوکڑیاں بھر رہے تھے۔ ان پٹھانوں کو اس طرح کام کرتے دیکھ کر پشتو لوک گیتوں کی دلکش تانیں ذہن میں ابھر آئیں جن کے زیر و بم میں زندگی کی جست و خیز محسوس ہوتی ہے

دل فریب مناظر کو دیکھتے ہوئے ہم پشاور پہنچے پھر تھوڑی دیر میں پشاور چھاؤنی آگئی جہاں ہماری لاریاں دم بھر کے لئے ٹھہر گئیں لیکن ہم میں سے کسی کو بھی اترنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس لئے ہم سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بس گھڑی دو گھڑی سانس لینے کی دیر تھی کہ ہمارا چھوٹا سا یہ کارواں جمرود کی طرف روانہ ہو گیا اور لاریاں شمال مغرب کی جانب مڑ گئیں۔ گیارہ میل کا سفر منٹوں میں طے ہو گیا اور ہم وادی خیبر کی پہلی چوکی، جمرود پہنچ گئے جہاں سیاحوں اور مسافروں کے اجازت نامے دیکھے جاتے ہیں۔ یہیں ہمیں ایک چھوٹی سی ٹیکری پر ایک قلعہ نظر آیا جس کا بیشتر حصہ مٹی کا بنا ہوا تھا۔

جمرود سے تین میل دور نکل آنے کے بعد کوہستانی سلسلے شروع ہو گئے تھے۔ ان پیچ در پیچ پہاڑوں کو غور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا جیسے دو کنگھوں کو آپس میں جوڑ دیا گیا ہو۔ ان کا دشوار گزار پیچ و خم کچھ ایسا ہی تھا اور ہماری لاریاں ان کی تنگ راہوں میں چکر کھاتی چڑھ رہی تھیں۔ اب ہمارے دائیں بائیں تمازت آفتاب سے جھلسی ہوئی چٹانیں نظر پڑیں دور دور آبادی کا نام و نشان نہ تھا کہیں کہیں میلوں گزرنے کے بعد کوئی چھوٹی سی وادی آجاتی تو چند بھیڑیں بھی چرتی ہوئی نظر آجاتیں اور

ایک آدھ آدمی کی صورت بھی دکھائی دیتی۔ اس کے بعد پھر وہی ہمارا قافلہ تھا، کوتل کی سڑک تھی یا پھر ریلوے لائن جو کبھی سڑک کے متوازی آجاتی اور کبھی تاریک سرنگوں میں لاپتہ ہوجاتی اور پھر کہیں اچانک ہماری سڑک کے اوپر سے یا کبھی سڑک کے نیچے سے گزر جاتی۔ ہم بڑی دیر تک ان پہاڑوں کی پُر پیچ بھول بھلیوں میں چکر لگاتے بلندی پر جا رہے تھے اور ہمارا ساتھی نواز خاں جو الائی جو مردان کا رہنے والا تھا، بڑے مزے سے اپنی بانسری بجا رہا تھا۔ اس سنّے سکوت دینے والی خاموشی میں زندگی کی لہریں پیدا کر دی تھیں۔ اسکی بانسری کے میٹھے بول جیپ لاری کے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر خیبر کی متوازی چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے کھلی فضاؤں میں منتشر ہوتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ذرے ذرے سے نغمے پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر وہی نغمے دور آسمانوں میں گم ہوجاتے اور نواز خاں لمحہ بھر سانس لیکر پھر کوئی دوسری دھن چھیڑ دیتا۔ دوسرے ساتھی تالیاں اور چٹکیاں بجا بجا کے جھومنے لگتے اور "واہ" اور "آہ" کہتے ہوئے خود بھی گنگنانے لگتے۔ اس پر میرے ہمسفر، گل بگیاڑ کے گھنگرو بندھے ہاتھوں کی دلکش تالیں کچھ اور ہی کیفیت پیدا کر دیتیں۔ اور مجھے یوں لگتا۔ جیسے میں کسی سرحدی گاؤں کے چھوٹے سے حجرے میں بیٹھا "مہ پارہ" کا رقص دیکھ رہا ہوں!

یونہی گاتے بجاتے ہمارا سفر بڑے مزے سے کٹ رہا تھا اور ہم تنگ اور عمیق گھاٹیوں، چھوٹی چھوٹی شاداب وادیوں، تیز رفتار ندیوں، نالوں اور چشموں اور کبھی کسی حصار بند[1] گاؤں کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کبھی کوئی سبز پوش وادی سامنے آجاتی تو پھر مجھے "الف لیلے" کے کسی حسین منظر کا تصور جاگ اٹھتا۔ اس چھوٹے سے حسین گوشے کو دیکھ کر میرا دل چاہتا کہ میں اپنی لاری سے اتر کر خیبر کے ان نوعمر چرواہوں میں جا ملوں جو اپنی بھیڑوں کو چراتے چراتے ہماری لاریوں کی طرف متوجہ ہوجاتے اور خوشی سے شور مچاتے ہوئے دوڑنے لگتے۔ ان آزاد مجاہدوں کے مسکراتے ہوئے چہرے، تیکھے نقشے، کڑے تیور اور دلنشیں جرأت آموز انداز دیکھ کر اقبال کے شاہین بچوں کا تصور مجسم ہو کر سامنے آگیا۔ مجھے اس وقت ان کی شفیق و جری ماؤں کی تھوڑا آفریں لوریاں یاد آگئیں۔ مجھے یاد آیا کہ سرشام ہی سے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بیٹوں کو بہادری اور وطن کی محبت کا سبق دیتے ہوئے بڑی پُر سوز آواز میں یوں لوریاں دینے لگتی ہیں۔

"آج تیری میٹھی نیند سونے کی گھڑی ہے
کل تیرے سامنے میدان سر کرنے کی گھڑی ہوگی۔"

اور ان جری ماؤں کی لوریاں بھی جب شام کے اندھیروں میں گونجتی ہیں تو جیسے ہر چیز میں جرأت کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ اور بچے ان میٹھی لوریوں کو غور سے سنتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں مگر ماں کی محبت بھری لوری تو کچھ اور ہی سماں کھینچ دیتی ہے۔ وہ اپنے لختِ جگر کو جب لوری دیتی ہوئی یوں خطاب کرتی ہے!

"تیری دو موٹی آنکھیں آسمان کے ستاروں جیسی ہیں
تیرا گورا مکھڑا شاہجہاں کے تخت کی مانند ہے
دونوں پتلی پتلی باہیں ایرانی تلواریں ہیں۔
میں صدقے تیرے بیٹا!"

اور نجانے ایسی کتنی لوریاں اور گیت ہیں جن میں جادو بھرا ہوتا ہے وہ جادو جو بزدل سے بزدل میں بھی جرأت، ہمت اور حب الوطنی کی روح پھونک دیتا ہے۔

میں ابھی انہیں شیریں لوریوں کی فضاؤں میں گم تھا کہ نواز خاں کی بانسری کے بول جیسے کسی گہری گھاٹی میں ڈوب گئے۔ میں نے انگڑائی لی اور باہر جھانک کے دیکھا تو دور دور تک کے مناظر صاف دکھائی دینے لگے۔ خنک ہوا کے جھونکوں سے تازگی محسوس ہونے لگی۔ تین ہزار فٹ بلندی پر چڑھنے کے بعد ہماری لاریاں "شاگئی" کی چوکی پر پہنچیں۔ پھر یہاں سے سڑک ڈھال کی طرف اترنے لگی اور "تورخم" تک پہاڑوں کی ڈھلانوں پر چکر لگاتی ہوئی چلی گئی۔

جیسے جیسے ہماری لاریاں "تورخم" کی طرف اتر رہی تھیں سربلند پہاڑی چٹانیں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ اور دور سے یوں معلوم ہونے لگا جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے انہیں مختلف شکلوں میں تراش کے کھڑا کر دیا ہے۔ ان میں سے دو چار چٹانیں ایسی بھی نظر آئیں جنہیں

---

[1] اس وادی میں عموماً ایسے ہی گاؤں دیکھنے میں آتے ہیں جن کے اردگرد حصار کھنچا ہوتا ہے اور دور سے چھوٹے سے قلعہ کا گمان ہوتا ہے۔

دیکھ کر مجھے "ہانگ کانگ" کی شتین کی چٹانیں یاد آگئیں۔ اماہ کی چٹان اور شادی کی چٹان [illegible] واقعی پس منظر تو بڑا ہی رومان انگیز اور ایک بڑا المیہ پیش کرتا ہے۔ ہانگ کانگ کیا سارے چین میں ان سے متعلق بڑے دلچسپ افسانے مشہور ہیں۔ "اماہ" کی محبت اور شوہر پرستی کی مثال ایسی ہے جسے چین کی عورت کبھی نہیں بھلا سکتی۔ اس بیاہی لڑکی نے اپنے پیارے شوہر کے انتظار میں (جو لڑائی پر گیا ہوا تھا) بلا مبالغہ تکتے اپنے بچے سمیت پتھر کا روپ دھار لیا تھا۔ اور آج بھی آندھیوں، طوفانِ باد و باراں کے باوجود وہ اسی چٹان پر خاموش، تصویرِ غم بنی کھڑی ہے اور اپنے پیارے شوہر کا انتظار کر رہی ہے!۔ دنیا کے بڑے بڑے المیوں میں "اماہ"[1] ایک ایسا کردار چھوڑ گئی ہے جسے کوئی نہیں بھلا سکتا۔ اور دنیا میں ایسی نجانے اور کتنی پہاڑی چٹانیں، درے اور رہگزر گاہیں ہیں جن سے بیسیوں افسانے اور تاریخیں وابستہ ہیں۔ پھر گزرگاہ "خیبر" تو ہمارے سامنے ایک بڑی زندہ مثال ہے۔ وہ تو "تاریخ گر" بھی ہے جس کے بغیر شاید برصغیر کی تاریخ نامکمل ہی رہ جاتی!

یہ سوچ کر میں پھر وادیٔ خیبر کی کوہستانی بھول بھلیوں میں واپس آگیا۔ میرے ساتھی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ نواز خاں، گل بگیا رنسوار کی ایک چٹکی بھر کے آنکھیں بند کئے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اب ہمارے سفر کی آخری منزلیں طے ہو چکی تھیں۔ بس تھوڑی دیر کا سفر اور باقی تھا۔ میں نے پھر ایک بار وادی کو غور سے دیکھا تو مجھے خیال آیا "قدرت تو خود اپنی مؤرخ ہے اور اس نے اپنی تاریخ کے بیش بہا خزانے خیبر جیسی رہگذاروں، دروں اور پہاڑوں کی بے ہنگم چٹانوں میں چھپا رکھے ہیں جنہیں بڑی آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔"

میں انہیں خیالوں میں محو تھا کہ ایک قلعہ نظر آیا۔ میں نے نواز خاں کا شانہ ہلا کے پوچھا "کیوں بھئی خان، یہ کونسا قلعہ ہے؟"

"علی مسجد" نواز خاں نے ہوشیار ہو کے جواب دیا۔

"ارے علی مسجد کیا، یہ تو قلعہ ہے"

یہ سنکر نواز خاں مسکرا کے بولا "خو یارا، علی مسجد قلعہ کا نام ہے۔ مسجد کا نہیں۔"

منسوب نام ہے!"

نواز خاں پھر اونگھنے لگا اب۔ میں نے لاری سے جھانک کر دیکھا تو ہماری سڑک سے کئی سو فٹ نیچے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ قریب ہی ایک آب کش لگا ہوا تھا جو قریب کی چوکیوں میں آب رسانی کے کام آتا ہے۔ اس کے آگے جب ہماری لاریاں بڑھیں تو پھر ایک بڑا خطرناک موڑ آیا۔ ایک طرف ندی اور دوسری طرف سر بلند چٹان تھی۔ یہاں سے کوہستانِ "رتہ" کی دو ہزار فٹ بلند چوٹی صاف نظر آ رہی تھی جہاں ذکا خیل قبائل کے ساتھ مینا رہتے ہیں، اس کے ساتھ ہی ایک طرف سطح مرتفع "لورگی شنواری" تھا۔ یہ سطح مرتفع سات میل لمبی اور تین میل چوڑی ہے جو لنڈی خانہ (لنڈی کوتل) پر آکے ختم ہو گئی تھی۔ لنڈی خانہ میں انگریزوں کے وقت کا ایک قلعہ بھی دیکھنے میں آیا۔ پہاڑوں سے گھری ہوئی تنگ وادی میں لنڈی خانہ کی بستی تھی جہاں ایک چھوٹی سی چھاؤنی اور پہاڑ کے دامن میں ایک بازار تھا۔ یہ خیبر کی ایک مشہور منڈی بھی ہے، جہاں بازار لگتا ہے اور لوگ دور دراز سے اپنی ضرورت کا سامان، بلکہ مویشی تک خریدنے آتے ہیں اور یہیں ریلوے لائن بھی آکے ختم ہو جاتی ہے۔

لنڈی خانہ سے تورخم قریب ہی تھا۔ اب ہمارے سفر کی آخری منزل آنے میں تھوڑی دیر باقی رہ گئی تھی کہ لاریوں کی رفتار سست پڑنے لگی اور ہم ایک کوہستانی نالے کے کنارے تھوڑی دور چلنے کے بعد ٹھہر گئے۔ میں نے کھڑے ہو کے باہر دیکھا تو ہماری چاروں لاریاں اور کمانڈنگ آفیسر کی جیپ جس میں ہمارے کمپنی کمانڈر بھی سوار تھے، آگے پیچھے ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ اتنے میں ہمارے حوالدار میجر صاحب اتر کر جیپ کے قریب گئے اور سلوٹ کیا۔ جب وہاں سے واپس آئے تو ہمیں "ڈسماؤنٹ" (اترنے) کا حکم دیا اور ہم لوگ دو دو چار چار کی ٹولیاں بنا کر ادھر ادھر گھومنے لگے۔ جنبی پہاڑوں کے پُرپیچ مناظر بڑے رومان انگیز تھے جس جگہ ہم کھڑے تھے وہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد تھی جس کی علامت کے لئے ایک گیٹ بھی بنا ہوا تھا اس میں لوہے کی موٹی سی زنجیر لگی ہوئی تھی اور سڑک کو بند کر دیا گیا تھا پھر اسی کے آگے دور تک تار کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ گیٹ پر لکڑی کی تختی پر لکھا ہوا تھا۔ "پاکستان ـــ

---

[1] اماہ کی کہانی کا پس منظر خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر اس کا انداز اور پلاٹ کا انوکھا پن اتنا دلچسپ ہے کہ اس سے آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"افغانستان سرحد" اور ساتھ ہی دوسری سطر میں تحریر تھا "بغیر اجازت نامہ دکھائے اس سرحد کو پار نہیں کیا جا سکتا ہے" یہیں سے ڈیورنڈ لائن گزرتی ہے۔

میں اور نواز خان، اور گل بگیاڑ باتیں کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے "مولائی افغان میل" نامی بس کھڑی تھی جس میں سے پاکستان کی ڈاک اتاری جا رہی تھی۔ نواز خان اور گل بگیاڑ کے لئے یہ کوئی نئی جگہ نہ تھی مگر میرے لئے تو یہ اجنبی جگہ تھی۔ وادی خیبر کی آخری چوکی "تورخم" جہاں دو مملکتوں کی سرحدیں آ کر ملتی ہیں بڑی رومان انگیز معلوم ہو رہی تھی۔ اسی نے نئی نئی تہذیبوں اور کلچر سے برصغیر کو روشناس کرایا تھا اور تاریخ میں اسی سے روشناس ہو گیا تھا۔ اصل رہگذر جہاں سے باہر کے لشکر، قافلے اور رہرو آتے اور کبھی گزرے تھے اب اپنا روپ بدل چکی تھی۔ اس کی جگہ پختہ، صاف و شفاف کولتار کی کالی چمکتی سڑک نے لے لی تھی جسے انگریزوں نے ۱۸۷۹ء "دوسری جنگ افغانستان" کے دنوں میں بنوایا تھا اور پھر ۱۹۲۰ء میں اسے دوگنا چوڑا کر کے موٹروں کی آمد و رفت کے قابل بنا دیا تھا۔

دوپہر ہو چکی تھی لیکن ابر چھانے کی وجہ سے فضا بڑی خوشگوار ہو رہی تھی۔ خنک ہوا کے جھونکے بڑا لطف دے رہے تھے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جنت کی کسی سربلند وادی میں بیٹھا ہوا آنے والے زمانے کے سہانے خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ زمانہ جس کا آغاز ہمارے "دورِ انقلاب" نے کیا ہے اور جس کا حیرت آفریں اثر مشرقی و مغربی پاکستان کے گوشے گوشے کی طرح درۂ خیبر اور اس کے ارد گرد کے تاریخی علاقے میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہ طلسمی اثر ہے جس سے سرحد کی چٹانیں ایک نئے ولولہ و جوش کے ساتھ جاگ اٹھی ہیں اور برصغیر کی تاریخ میں ایک نئے ولولہ و جوش کے ساتھ جاگ اٹھی ہیں اور برصغیر کی تاریخ میں ایک نیا پہلے سے کہیں زیادہ شاندار کردار ادا کرنے کو تیار ہیں اور یہ بات بھی کچھ کم علامتی حیثیت نہیں رکھتی کہ ہمارا یہ سفر پاکستان ہی کے جری اور مایۂ ناز "جوانانِ تیغ بند" کی معیت میں ہوا جو برصغیر کے نئے "تاریخ گر" ہیں۔

★

"منزل یہی ہے کٹھن بھی یہی ہے" —— بقیہ صفحہ ۴۳

جائے۔ افراد ہوں یا جماعت، ان کی صحیح نشو و نما اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ مادہ و روح پر یکساں توجہ دیں۔ جیسا کہ اسلام میں کیا گیا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لئے کبھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح برتی جاتی ہے۔ اور یہی ہمارا مقصود ہونا چاہئے۔

"اشتراکیت" اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے گمراہ کن حربے استعمال کرتی ہے۔ وہ بھوک، ننگ، غریبی، زبردستی جیسے الفاظ برتتی ہے جس سے انسان خود بخود بہک جاتا ہے۔ وہ ایک عیار شعبدہ باز کی طرح انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اور امیر غریب، ادنیٰ اعلیٰ چھوٹے بڑے کا سوال پیدا کر کے سادہ لوح لوگوں کو بہکاتی بھی ہے اور بظاہر کامیاب بھی ہے حالانکہ بڑی سیدھی سی بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی قسم کا فرق و امتیاز بالکل فطری ہے، ناگزیر ہے۔ انسانی قدر و شرف کی حد تک مساوات ممکن بھی ہے اور لازمی بھی۔ لیکن ہر اعتبار سے مکمل مساوات صریحاً محال ہے۔ اور اقتصادی بنیاد پر بھی اس کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا ہم کتنی ہی جد و جہد کیوں نہ کریں طبقاتی امتیاز ہرگز دور نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنی ظاہری شکل میں نہیں تو کسی اور شکل میں ضرور برقرار رہے گا۔ یہ اشتراکیت بڑی عیاری سے تصویر کے اس دوسرے رخ کو نظروں سے اوجھل رکھتی ہے۔ اور اپنے نظریات کو سو فیصدی صحیح ظاہر کرتی ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں وہ ادھوری صداقت کو مکمل صداقت قرار دیتی ہے اور اس طرح ایک بنیادی غلطی ہی نہیں کھلم کھلا بد دیانتی سے کام لیتی ہے۔ با ایں ہمہ دلفریب اور پُر فریب نظریات کی کشش مسلم ہے۔ خصوصاً طلبہ کے خام، غیر تربیت یافتہ اذہان کے لئے ایسے نظریے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ مدرسوں اور کالجوں کی چار دیواری میں انہیں بیرونی دنیا کے مسائل و حقائق کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ اور کوئی کرمِ کتابی زندگی کی اصلیتوں سے کیسے آگاہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے بظاہر خوش آہنگ نظریے ان ناتجربہ کار لوگوں پر جادو کا اثر کرتے ہیں۔ اور وہ بے اختیار انہی کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ بنابریں ہمارے نظام تعلیم کو فکر انگیز بنانے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ طلبہ کتابوں اور کالجوں ہی کی دنیا میں بند نہ رہیں۔ ان کا دنیا و مافیہا سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ان میں بصارت کے ساتھ بصیرت اور خبر کے ساتھ نظر بھی پیدا ہو۔ وہ نظریات اور شعائر کو سمجھنے اور پرکھنے کی اہلیت پیدا کریں۔ زندگی کے مسائل کو سمجھیں اور انہیں تجربہ کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اسلئے کہ صاحبِ شوق و آرزو ہی نہیں، صاحب عقل و فہم کو بھی "دل نہ دہد بہ کلیات" کے مسلک پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ ورنہ نہ افراد کی صحیح طور پر نشو و نما ہو سکے گی نہ جماعت کی جو افراد ہی کی ہیئتِ اجتماعیہ کا دوسرا نام ہے۔ اور اس طرح وہ زندگی میں بھی صحیح کردار ادا نہیں کر سکیں گے۔

ہماری نئی نسلوں، ہمارے نوجوانوں کو ان امور پر غور کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اور اب خوش قسمتی سے ایک دانا بینا توانا حکومت اور اس کے بیدار مغز اراکین نے ساری قوم کے ارباب علم و دانش اور خواص و عوام سے مشورہ کر کے نظامِ تعلیم کو ہر اعتبار سے کار آمد اور حیات افروز بنا دیا ہے۔ طلبہ کو بھی لازم ہے کہ اس تبدیل شدہ صورتِ حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور کسی عمرانی معاشی، فلسفیانہ، نفسیاتی یا سائنسی نظریہ کو فی الفور قبول کر لینے کی بجائے اس کو عقل و بصیرت کی روشنی میں پرکھنا چاہئے۔ صرف اسی طرح ہم وہ عقل سلیم کی راہ پا سکتے ہیں جسے صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں خالص اسلامی تصور کے مطابق قرآن مجید کے الفاظ میں "صراطِ مستقیم" قرار دیا ہے۔

"ایک جوئے کہستاں کی موجِ رواں" بقیہ صفحہ۲۔

موجزن ہو، اور وہ ہندوستان کو جس کی عظمت کے نشان اس مجموعے میں جگہ جگہ موجود ہیں زیادہ پُرعظمت بنانے میں حصہ لیں۔

سلسلۂ ادبیہ کو زبانِ اردو کے طلبا کی ادبی رہنمائی کے لئے ہر طرح مکمل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خدا کرے یہ طلباء کے مذاقِ ادب کو لطیف اور معیارِ قابلیت کو بلند کرنے میں کامیاب ثابت ہو۔

اس ضمن میں شیخ عبدالحمید صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ پروفیسر طریقۂ تعلیم ٹریننگ کالج لاہور، کی عنایت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جنہوں نے اس سلسلے کی موجودہ کتابوں کے مسودات کو بغور ملاحظہ کیا، اور جنکے مشورے اس سلسلے کی ترتیب و تدوین میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ (مؤلفین)"

کسی نے درست کہا تھا کہ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

اگر ان متفرق پاروں میں بھی جو اقبال کی نسبت سے اہمیت رکھتے ہیں، اس عہد آفریں شخصیت کی چند در چند جھلکیاں نظر آئیں اور ہمارے ذوقِ تجسس کو لیے اور آثار کی تلاش پر آمادہ کریں تو عجب نہیں۔ بہرحال یہ متاعِ گراں بہا جب بھی اور جہاں بھی دستیاب ہوں اس کا مشتاقانِ ادب تک پہنچنا ضروری ہے۔

"دریچہ" (افسانہ) بقیہ صـ۳۷

ہواخوری کے لئے جاتا۔ اس وقت گہرا اندھیرا ہوتا۔ کبھی کبھی مرغ کے بانگ دینے کی آواز کانوں میں آجاتی۔ شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر ہم لوگ چلا پھرا کرتے۔ چاروں طرف کہر چھایا ہوتا۔ ماگھ مہینے کی برفیلی ہوائیں شروع ہوگئی تھیں۔ اس کے باوجود تاج آپا روزانہ رمنا میدان جانے کے لئے مجبور کرتیں۔ دوپہر کو ہم دونوں کمرے میں بند ہوکر ریڈیو سنتے، لیکن شام کو وہ باہر نہ جاتیں۔ تنہا کمرے میں بیٹھیں۔ میں تفریح کے لئے نکل جاتا۔ پندرہ دن گزر گئے تو میں اُنہیں چاٹگام پہنچا آیا۔ اس کے بعد سے میں ماموں کے گھر نہیں جا سکا۔ دل جو نہیں چاہتا تھا۔ میں ہاسٹل میں منتقل ہوگیا۔

اور آج وہی تاج آپا بیوہ ہوکر ڈھاکہ واپس آگئی ہیں ——

"قلب ولا" میں پھر اداسیوں اور مایوسیوں کا پہرہ ہے۔ ان کے شوہر پیرٹ کے کسی حادثہ کا شکار ہوگئے تھے۔

لیکن میں کس طرح شانتی نگر جاؤں گا۔ وہ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں نہیں کر سکیں گی۔ اُن کے ہونٹوں کی شادابیاں تو اُڑ چکی ہیں۔ بھری آنکھیں ان کو اس حالت میں دیکھ کر برس پڑیں گی۔ میں ان کو اس روپ میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ ان کی کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں نہیں ہوں گی، ان کی مانگ کا ٹیکہ غائب ہوگا، ان کے گلے کا طلائی ہار اُتر گیا ہوگا، کانوں میں آویزے نہیں ہوں گے۔ جسم پر ریشمی ساڑی نہیں ہوگی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آج شام سے تاج آپا دریچے کی سلاخیں پکڑ کر منتظر نگاہوں سے خلاء میں گھورتی رہیں گی —— مگر ان کے انتظار کا پھل شاید کبھی نہ ملے گا۔ میں ان سے مل نہیں سکتا۔ میرے دل کے نہاں خانے میں اُن کی یاد کا، آتش فشاں دہکتا رہے تو اچھا ہے۔

کون جانتا ہے کہ یہ کہانی جسے میں نے خونِ جگر سے تحریر کیا ہے کبھی شائع بھی ہو سکے گی۔ شائع ہو بھی گئی تو کیا شانتی نگر کے "قلب ولا" کی تاج آپا اسے پڑھ سکیں گی اور جب تک یہ کہانی وہ پڑھ نہ لیں گی انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں اُن سے کیوں نہ مل سکا۔

بقیہ "سیرِ پانچویں درویش کی" صـ۳۸

اے درویشوں، یہ اقلیم جو کپڑے کے ایک ایک تار کو ترستی تھی اب اُس پر کپڑوں کی ہُن برستی ہے اور اتنا بنا رہے ہیں کہ خود بھی پہنتے ہیں اور دوسروں کو بھی بھجوا رہے ہیں یہ ہمارے بھاری کارخانوں کا ہی طفیل ہے کہ گرم کپڑے کی بھی ریل پیل ہے ہرنائی جتوں اور قائد آباد کے مقاموں کو اس گرما گرم مال کے تیار کرنے کی سعادت حاصل ہے۔

اے پاک طینت درویشوں، نمائش میں پھرتے پھرتے آپ کے قدم بوجھل ہوگئے اس لئے آپ کی زحمتِ کام فرسائی پر یہ خادم نادم ہے، معافی کا خواستگار اور رخصت کا طلب گار ہے۔ ویسے یہ نمائش بہت پہلودار، اور باوقار ہے۔ پھر اس ملک کی صناعتوں کا حال ایک داستان ہے۔ بڑی طولانی، ہرچند کہ وہ نہ قصہ ہے نہ کہانی یہاں تو بس ایک جھلک تھی دکھانی، اے صاحبو، وہ دکھائی اور اس فرض سے سبکدوش ہوا۔ اگر جہاں نوردی سے فرصت پائی تو آپ درویشوں کو حال کسی اور سیر کا سناؤں گا —— اللہ بس باقی ہوس

مگر ٹھہریئے، جاتے جاتے کچھ اور بھی یاد آگیا۔ دیکھتے ہی تو جلتے اس پر زمانے نے اپنے مولف سے کیا کیا الٹے سیدھے نقش اُبھارے ہیں کہ ذرا کسی چیز کی جھلک پائی اور کوئی نقش یا نقشہ سامنے آگیا موہن جودڑو اور ہڑپہ جو دو نامی گرامی دیار اس قطعۂ پاک کے ہیں آثارِ قدیمہ کا کھوج لگانے والوں نے ان سے کیا کیا انوکھے نقش اور برتن اور کھلونے کھود کر نکالے ہیں۔ سبحان اللہ طرح طرح کی مہریں کسی پہ بیل کسی پہ بارہ سنگھا ہر ایک طلسم حیرت آبنوسی بہ تقاضہ کہ ملا بہت۔ فرنگی ہنروروں کو مشغلہ ہاتھ آیا۔ یا دکار قدیمی نقشوں سے سجایا، دنیا بھر میں سامانِ تجارت بنا کر بھجوایا۔ ایسا اگر ہمارے دلیس کی مٹی ہوتی پر اپنی تہذیب پھر سے جگ اٹھے گی۔

ترقی اردو بورڈ کراچی کے رکن سید یوسف بخاری صاحب ہر قسم کے خانگی اور لوک گیتوں پر ایک مبسوط کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ضروری معلومات کی فراہمی باعث شکریہ ہوگی۔

رسوئی

رسوئی بناسپتی

آدم لمیٹڈ - جوڑیا بازار - کراچی

جسم میں تازگی

جلد ۱۳ شمارہ ۱۲

ماہِ نو

دسمبر ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

یادِ قائد اعظمؒ :

"شمعِ ضیا پوش"

بیگم صدیق علی خان

وہ ہستی پھر ہماری یادوں کی سلسلہ جنبانی کرتی ہے جس کے عزمِ غیر متزلزل، انتھک کوششوں اور صحیح رہنمائی نے برصغیر میں بسنے والے منتشر و پریشان مسلمانوں کی سیاسی زندگی اور ذہنی کیفیات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا، جس نے علامہ اقبالؒ کے تصورِ پاکستان کو حقیقت مجسم بنا کر دنیا کے نقشے پر اس بیسویں صدی میں ایک نئے ملک کے رنگین خطوط مرتسم کر دیئے، جس نے سر سیدؒ مرحوم اور مولانا محمد علی جوہرؒ کے لگائے ہوئے پودے کو سرسبز اور بار آور کیا اور مسلمانانِ برصغیر کے پیروں سے غلامی کی زنجیریں کاٹ کر حکیم ملت کی اس پیشین گوئی کو واقعات میں تبدیل کر دیا کہ ؎

میر سد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

زمانہ صدیوں کروٹیں بدلتا ہے، عناصرِ فطرت مدتوں بے چینی سے ترتیب و ترکیب میں مصروف رہتے ہیں، دنیا عرصۂ دراز تک تڑپ تڑپ کر دعائیں کرتی ہے تب کہیں ایک ہستی پیدا ہوتی ہے جس کے ارادوں کے سامنے وقت کی طاقتیں سرِ تسلیم خم کرتی ہیں، حتیٰ کہ زندگی خود اس کے وجود پر ناز کرتی ہے ایسے انسان کبھی بزرگوں اور ولیوں کے مقدس پیکر، کبھی علماء و فلاسفہ اور کبھی مصلح و رہنمایانِ قوم کی صورت میں جلوہ گر ہو کر قوموں اور ملکوں کی قسمت بدلتے رہے ہیں۔ انہیں عظیم المرتبت افراد میں سے ہمارے قائد اعظم محمد علی جناح بھی تھے۔

تقریباً دو ہزار سال قبل حضرت عیسیٰؑ ۲۵ دسمبر کو علمبردار روحانیت و معلمِ اخلاق کے روپ میں انسانیت کی اصلاح کے لئے کرۂ خاکی پر جلوہ فرما ہوئے۔ اُن کی صدائے قم باذن اللہ سے مُردے جی اٹھے۔ ٹھیک اسی مبارک تاریخ کو ۱۸۷۶ء میں قدرت نے کراچی میں وہ شخصیت پیدا کی جس نے مسلمانانِ برصغیر کو سیاسی و قومی موت کے پنجے سے چھڑا کر ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے زندگی بخشی۔

مجھے قائد اعظمؒ سے ملنے اور دور سے دیکھنے کے بار ہا موقعے ملے ہیں۔ میں نے آپ کو بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ بھی دیکھا اور بحیثیت گورنر جنرل پاکستان بھی۔ لیکن جس قدر قربت کا شرف میرے شوہر (نواب) صدیق علی خاں صاحب کو بحیثیت سالارِ اعلیٰ آل انڈیا مسلم نیشنل گارڈس اور ممبر لیجسلیٹو اسمبلی دہلی حاصل رہا ہے، وہ مجھے نصیب نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا تاہم قائد اعظمؒ کے متعلق جو میرے تاثرات ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ صرف ایک بے باک مسلمان، دور بیں، رہنما اور ماہر سیاسیات ہی نہیں تھے بلکہ شفیق و مہربان دوست، قدر شناس اور ہمدرد و بزرگ بھی تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب سی۔ پی۔ کی کانگریس گورنمنٹ نے ۱۹۴۱ء میں میرے شوہر کو دوبارہ بستۂ زنجیر و رسن کیا تھا۔ تاکہ اس کانفرنس کو ناکام بنایا جائے جو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (سی۔ پی) کی طرف سے منعقد ہونے والی تھی۔ یہ وہ کانفرنس تھی جس میں قائد اعظم محض اپنے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے شرکت فرمانے والے تھے اور جس کی کامیابی کے لئے میرے شوہر شب و روز تگ و دو کر رہے تھے۔ بہرحال کانفرنس ہو کر رہی اور قائد اعظم بھی تشریف لائے۔ چونکہ میں اپنے شوہر کی گرفتاری کی وجہ سے پریشان تھی، زیادہ تر اس لئے کہ کانگریس گورنمنٹ ان کے ساتھ نہایت سخت سلوک کر رہی تھی، میں نے قائد اعظم کی خدمت میں سلام عرض کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اُن کی فرودگاہ پر گئی۔ محترمہ فاطمہ جناح صاحبہ جن کی بھائی سے والہانہ محبت ضرب المثل ہے، مجھ سے پہلے ملیں اور نہایت شفقت سے نواب صاحب کے متعلق دریافت کرتی رہیں۔ میں نے قائد اعظمؒ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ محترمہ نے جو ہمیشہ قائد اعظم کی انتہائی مصروفیات سے پریشان خاطر رہتی تھیں اور مزید مصروفیات پیدا کرنے سے پہلو تہی کرتی تھیں، میرے خیال سے ملاقات کا انتظام کر دیا۔ اگرچہ قائد اعظم نہایت مصروف تھے تاہم تھوڑی دیر کے لئے اندر تشریف لائے۔ مجھ سے ملتے ہی فرمایا "صدیق علی خاں کو کانگریس گورنمنٹ نے پکڑ لیا ہے، مگر گھبرانے کی بات نہیں۔

یہ ہمارا پہلا مسلم لیگی ہے جو دو مرتبہ جیل گیا"۔ اس کے بعد باہر چلے گئے اور میں گھر لوٹ آئی۔ اگرچہ مجھے کسی قدر اطمینان تو ہوا تھا لیکن بے چینی کا ازالہ نہ ہو سکا۔ دوسرے روز صبح ناگپور کے ممتاز لیڈر، ابراہیم خاں فنا نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ قائد اعظم نے اپنی ورکنگ کمیٹی میں میرے شوہر کی رہائی کے مطالبہ کی تجویز پاس کی اور اسی وقت، یعنی رات کے دو بجے چیف سکریٹری، سی پی گورنمنٹ کو روانہ کی۔ جب تک اس کا جواب موصول نہیں ہوا آپ برابر برآمدے میں ٹہلتے رہے اور بے چین رہے۔

مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں کہ تجویز پاس کرنے سے پہلے یا بعد کا واقعہ ہے۔ لیکن یہ بخوبی یاد ہے کہ کانفرنس کے انعقاد کے زمانہ میں ہی عیدِ قرباں آئی۔ میں عید کیا مناتی، لیکن میرے قائد کو میرا خیال آیا اور وہ عیدگاہ جاتے ہوئے محترمہ فاطمہ جناح صاحبہ کے ساتھ میرے ظلمتکدہ پر ضیا بار ہوئے اور مجھے اپنے ہمراہ لیجانے کی عزت بخشی۔ راستے میں بہت کم گفتگو ہوئی مگر نماز کے بعد محترمہ فاطمہ جناح صاحبہ مجھے سمجھاتی رہیں، کیونکہ دفعتاً میری آنکھوں نے ضبط کو خیرباد کہد یا تھا۔

یہ تھے ہمارے بلند پایہ قائد اعظم جو اپنے کام کرنے والوں پر یوں شفقت و عنایت کرتے تھے اور ان کی دلجوئی فرماتے تھے۔ وہ انسانی جذبات و کیفیات کو چہروں سے پڑھ لیتے تھے اور اپنے تأثر کا اظہار عمل سے کرتے تھے۔

قائد اعظمؒ نے جن اصولوں کو قوم کا لائحۂ عمل بنایا تھا خود آپ اس کا زندہ نمونہ تھے۔ آپ نے مسلمانانِ برصغیر کو، جو مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ایک پرچم کے نیچے جمع کر کے اُن میں اتحاد و اتفاق کی روح بیدار کر دی، یقینِ محکم کی فولادی طاقت کا مظاہرہ پاکستان کو حاصل کر کے کیا۔ یہ بھی یقینِ محکم تھا جس نے مسلمانوں کو جان و مال قربان کرنے پر تیار کر دیا جو تنظیم آپ نے مسلمانانِ برصغیر میں پیدا کی تھی اس کی مثال تاریخ کے اوراق پر کہیں نظر نہیں آتی۔ قائد اعظم کے حکم پر منظم ہو کر مسلمانوں کا بچہ بچہ مصروفِ عمل ہو جاتا تھا۔ خود قائد اعظمؒ اتحاد و اتفاق کا عملی نمونہ، یقینِ محکم کا مکمل مجسمہ اور تنظیم کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

بیادِ قائدؒ:

منزل نما

بشیر فاروق

چراغِ رہگذر ہیں قائدِ اعظمؒ کی تدبیریں
یقین و عزمِ محکم سے ہوئیں تابندہ تقدیریں

نشاں مٹ کر رہا آخر خداوندانِ باطل کا
عیاں ہو کر رہیں اقبال کے خوابوں کی تعبیریں

مثالِ آفتابِ تازہ ہم ابھرے ہیں مشرق سے
ہمارے ذوقِ حریت کی دیکھے کوئی تاثیریں

جسے کل تک زمانہ ذرّۂ ناچیز کہتا تھا
اسی ذرّے کی پھیلیں شرق سے تا غرب تنویریں

ابھی کچھ اور بھی عظمت بڑھے گی اپنے پرچم کی
ابھی کچھ اور گونجیں گی جہاں میں اپنی تکبیریں

ابھی مانندِ انجم اور نکھرے گا چمن اپنا
ابھی کچھ اور بھی ابھرے گا خورشیدِ وطن اپنا

بہ فیضِ قائدِ اعظم ہر اک طرزِ سخن بدلا
ہماری ذہنیت بدلی، نظر بدلی، چلن بدلا

طلسمِ سامری ٹوٹا نگاہِ مردِ مومن سے
غرورِ کجکلاہی کا وہ اندازِ کہن بدلا

وفا ناآشنا شیخِ حرم کا تذکرہ کیا ہے
ہمارے دیدہ ور نے تو مزاجِ برہمن بدلا

ہمارے ساقیٔ محفل نے طرزِ میگساری سے
مذاقِ میکشی بدلا، طریقِ انجمن بدلا

ہوا یوں نغمہ زن وہ انجمن میں طائرِ ملت
زبانِ قوم بدلی اور ہر سازِ کہن بدلا

جلایا تھا جنہوں نے بارہا اپنے ہی گلشن کو
خدا کا شکر ہے ان باغبانوں کا چلن بدلا

کچھ اس انداز سے صبحِ بہار آئی گلستاں میں
کلی کا روپ بدلا اور شجر کا پیرہن بدلا

ماہِ نو، کراچی، دسمبر ۱۹۶۰ء

سحر تا سحر

(قائدِ اعظم سے ایوب خاں تک)

عاصمہ حسین

تخئیل کی سیمیں چادر پر۔ پھر ہے وہی سورج ضَوگستر۔ لایا جو جلو میں تازہ سحر
ہرچند اس نور کے پیکر کو پنہاں ہوئے مدت بیت گئی
رہ رہ کر پھوٹی پڑتی ہے ہر پور سے اس کے جوت نئی
ہر ایک کرن میں دیپ کئی

ہر دیپ میں شانِ صبحِ دگر۔ ہر تارِ نظر میں رقصِ شرر۔ ہر لہر سراسر موجِ گہر
خورشیدِ جہاں افروز وہی جو ساتھ اک عالمِ نو لایا
جو اپنے فروزاں پیکر سے آزاد سحر کی ضو لایا
اک نور ہی نور کی رَو لایا

پھر اس کی تابِ پنہانی۔ لائی اک اور ہی تابانی۔ نور اور ضیا کی طغیانی
اُبھری اک پیکرِ روشن سے ہر اور اُجالوں کی دُنیا
مانند فرازِ طور ہوئی پُر نور خیالوں کی دُنیا
زرکار مثالوں کی دُنیا

یہ صبحِ فروزاں خندہ زناں۔ یہ نور کے پیکر رقص کناں۔ ہنگامۂ جشنِ بے پایاں
یوں برق اندام شعاعوں سے ناپید ہوئے ظلمت کے نشاں
ہے آن کی آن میں اور ہوا اس پھیلی ہوئی دھرتی کا سماں
بدلا ہے یکایک دورِ زماں

بے آب کنارے گردوں کے، شمعوں کی طرح لَو دے اٹھے۔ کیا شوخ دئیے ہر اور جگے!
وادی وادی، پریاں پریاں، چوٹی چوٹی، افشاں افشاں
صحرا صحرا، دریا دریا، پربت پربت، میداں میداں
روشن روشن، رخشاں رخشاں

بے نور شبستاں روشن ہیں۔ تاریک کہستاں روشن ہیں۔ اندھیارے گلستاں روشن ہیں

اب دور ہوا، کافور ہوا، گھر گھر سے لپکتا تھا جو دھواں

دیپوں کا سجیلا تار بندھا، شمعوں کی قطاریں بے پایاں

اک سلسلۂ بے حد و کراں

اب تاریکی کا دور گیا۔ اب تیرہ شبی کا دور گیا۔ ظلمات گری کا دور گیا

وہ دور کہ ظلمت چھائی تھی، ہر چار طرف طوفاں طوفاں

ہر سمت سیاہی پھیلی تھی، گھنگھور گھٹائیں قہر نشاں

اب دنیا کے وہ طور کہاں

اب اور ہی رنگ اور روپ ہوا۔ ہر سایہ سراسر دھوپ ہوا۔ ہر چیز کا روپ انوپ ہوا

اب بیت گیا، اب بیت گیا، وہ دورِ خزاں وہ دورِ خزاں

اعجازِ بہار سے اور ہوئے، صحرا و بیاباں سحر فشاں

اب رنگ پہ آئی بزمِ جہاں

یہ دور ہے دورِ نو یکسر۔ یہ دور ہے ضو ہی ضو یکسر۔ یہ دور ہے لَو ہی لَو یکسر

یہ دور سراپا دورِ سحر، جمہور کی سلطانی کا نشاں

یہ دور ہے دورِ تاب و تواں، یہ دور ہے دورِ عظمت و شاں

اک تو بہ ہے جس کی روح رواں

ہے نور بداماں رات سبھی۔ انجم بگریباں تاریکی۔ تارے ہیں، ہلال میں تاب نئی

کچھ اور ہوئے ہیں شام و سحر، کچھ اور زمانے کے عنواں

کچھ اور ہیں دھرتی کے تیور اور لیل و نہارِ پاکستاں

سو خلد یہاں، سو خلد وہاں

یہ صبحوں کی صبحِ نور افشاں۔ تابندہ جبیں، فرخندہ نشاں، صد طورِ تجلّی در داماں

اک اور ہی لَو سے روشن ہے، اک اور ہی سورج سے تاباں

ہے شرق سے تا غرب اس کی ضیا اور اس کا فروغِ بے پایاں

اب اوج پہ ہے خورشیدِ جواں

★

راہے کہ من رفتم[1]

(ایک خط)

ڈاکٹر محمد صادق

کرمی خاور صاحب "ماہ نو" ابھی تک نہیں آیا۔ کل ایک خاتون نے نہایت ماتمی انداز میں بتایا کہ آپ کے خلاف "ماہ نو" میں ایک پرزور مضمون نکلا ہے۔ کالج سے رسالہ منگوایا اور پڑھا۔ جواباً ذیل کی سطور ارسال خدمت ہیں:

زیر بحث مضمون کا موضوع دراصل ترکستان کی سیاحت ہے۔ میں نے اپنی دانست میں اس کا عنوان "آزاد کا سفر ترکستان و ایران" تجویز کیا تھا۔ رسالہ دیکھنے پر آپ کو لکھا کہ لفظ "ترکستان" کیونکر رہ گیا۔ آپ نے لکھا کہ مسودہ میں صرف ایران لکھا ہے۔ ترکستان ندارد۔ بہرحال اس کا عنوان "آزاد کا سفر ترکستان و ایران" ہے۔ سارا مضمون پڑھ جائیے۔ صرف ترکستان کا ذکر ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اس کی تائید ہوتی ہے:۔

"......ان دنوں روس کا بڑھتا ہوا سورج ہندوستانی سیاست کے لئے ایک مستقبل کابوس تھا۔ یعنی وہ وسط ایشیا کے مسلمان ممالک کو اپنے حیطۂ اقتدار یا اختیار میں لا کر ہندوستان پر حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ اس کے سدباب کے لئے برطانوی حکومت نے ایران اور افغانستان سے معاہدے کئے۔ روس نے پہلے خیوا کے حکمران پر یہ الزام لگایا کہ وہ روسی باشندوں کو غلام بنا کر فروخت کرتا ہے، اور اس پر حملہ کر دیا لیکن یہ حملہ ناکام رہا۔ جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسط ایشیا میں قدم بڑھائے۔ اور ۱۸۶۴ء میں روس بڑھتے ہوئے خیوا، خجند اور بخارا کی حد تک پہنچ گیا۔"

"ان ممالک نے انگلستان اور ہندوستان سے مدد طلب کی۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں بمقام لاہور لارڈ لارنس اور سفیر خجند کی ملاقات ہوئی۔ تین سال بعد بخارا کا سفیر بھی ہندوستان آیا۔ لیکن یہ سفارت بھی ناکام رہی اور روس نے بخارا اور خجند پر قبضہ کر لیا۔"

"برطانوی حکومت مخصوں میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ تاہم وہ خواہاں تھی کہ روس کے جارحانہ اقدامات سے جو واقعات ان ممالک میں رونما ہوئے ہیں، ان کے متعلق قابلِ وثوق اطلاعات حاصل کرے۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ ایک خفیہ مشن ان ممالک میں بھیجا جائے جو ان کا دورہ کرے اور ان کے سیاسی حالات پر رپورٹ مرتب کر کے پیش کرے۔ حکام کی نظر میں اس کام کے لئے ڈاکٹر لائٹنر سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔ وہ نہ صرف عربی اور ترکی کے عالم تھے بلکہ ان دونوں زبانوں کو بے تکان بول سکتے تھے۔ علاوہ ازیں انہیں اسلامیات پر بھی پورا عبور حاصل تھا[2]۔ چنانچہ انہیں اس وفد کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس کے صرف دو رکن تھے۔ آزاد اور پنڈت من پھول۔ جن کا انتخاب ڈاکٹر لائٹنر کے ایما سے ہوا۔"

---

[1] اسے ہماری فروگزاشت سمجھئے۔ مضمون کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں عنوان میں تصحیح کرنی چاہئے تھی اور آغا صاحب کو بھی۔ مگر وہ کبھی اعرابی ہی کے ساتھ ہو لئے!۔ (مدیر)

[2] اس سلسلہ میں ایک پتے کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر کو فروری ۱۸۸۵ء میں پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کے عہدہ کا جائزہ لینا تھا مگر وہ آٹھ ماہ تک ایسا نہ کر سکے۔ کیوں؟ کاغذات میں اس کی بظاہر دانستہ صراحت نہیں کی گئی (مدیر)

اس اقتباس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں (۱) میرے مضمون کا موضوع ترکستان کی سیاحت ہے۔ (۲) یہ سفر علمی معلومات کی خاطر اختیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ سراسر سیاسی اغراض و مقاصد پر مبنی تھا۔ دوسرے سفر یعنی سیاحت ایران کا میں نے اپنے مقالہ میں ان الفاظ سے آغاز کیا ہے :-

"سفرِ ایران، آزاد کا ایک پرانا خواب تھا۔ اس کی نوعیت ادبی حج کی تھی جس کی وجہ اور غرض و غایت پر روزنامچے میں بسیط بحث کی گئی ہے۔"

باقی وہ تمام پیش پا افتادہ باتیں جن کا ذکر آغا اشرف نے اپنے تبصرہ میں کیا ہے اور جو سیر ایران سے ماخوذ ہیں، سب کی سب میرے مقالے میں موجود ہیں۔

ایک اور بات۔ آغا صاحب کا یہ دعویٰ درست نہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس مشن کی تفاصیل کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ بیشتر میرے مضمون میں درج ہے جو آج سے دو برس پہلے لکھا گیا تھا اور جس کا مواد میں نے اپنے پنجاب یونیورسٹی کے منظور شدہ تحقیقی مقالہ مصنفہ ۱۹۳۹ء سے لیا ہے۔

میں یہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ زیرِ بحث مضمون کی تصنیف کا واحد مقصد قارئین تک وہ نادر سوال نامہ پہنچانا تھا جو مولانا آزاد اور ان کے شرکار کو گورنمنٹ کی طرف سے ملا تھا اور جس کی نقل آغا اشرف کو کہیں نہیں ملی۔ چنانچہ چند ماہ قبل جب وہ میرے ہاں تشریف لائے تو وہ بہت دیر تک پوچھا کئے کہ وہ نادر مسودہ[1] مجھے کہاں سے ملا۔

رہا یہ سوال کہ کیا ڈاکٹر لائٹنر بھی اس وفد کے ہمراہ گئے تھے اس کی بابت آغا اشرف کے بڑے بھائی آغا طاہر "مکتوباتِ آزاد" کے صفحہ ۱۴۰-۱۳۹ پر لکھتے ہیں :-

"ڈاکٹر لائٹنر ...... ۱۸۷۶ء (؟) میں سنٹرل ایشیا میں پولٹیکل خدمات پر بھی گئے تھے تو مولانا آزاد کو ساتھ لے گئے تھے۔ اس کی توثیق کے لئے میں نے مولوی خلیل الرحمن[2] کو لکھا جنہوں نے ذیل کی اطلاعات سے مجھے مستفید فرمایا :

'وہ پنڈت من پھول اور لیٹنر کے ہمراہ ایران د

---

[1] یہاں ایک اور بات کا اضافہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس کی صداقت کی غالباً آپ توثیق کر سکیں گے۔ جب چند ماہ پیشتر آغا اشرف صاحب میرے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے صراحت سے فرمایا کہ وہ کراچی میں آپ کے دفتر تشریف لے گئے اور "ماہِ نو" کے جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے کو حاصل کیا اور میرے مضمون کی بابت آپ سے بات چیت کی۔ اب جب اس بات کو کئی مہینے گذر چکے ہیں، وہ اپنے مضمون مطبوعہ "ماہِ نو" اکتوبر ۱۹۶۰ء میں لکھتے ہیں : جب 'ماہِ نو' (سارے مضمون میں اضافہ بشکل ہمزہ اور رسالہ اور جملہ مقامات کے نام بلا واوین*) کے جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں ڈاکٹر صادق کا مضمون بعنوان 'آزاد کا سفرِ ایران' پڑھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔" کیا یہ بات آغا اشرف کی "معصوم" حیرت سے زیادہ حیرت انگیز نہیں؟ زیبِ داستان کی خاطر بات کو کہیں سے کہیں لے جانا ایک نہایت عمدہ ادبی خوبی ہے اور وہ خصوصیت سے آغا اشرف کا حصہ ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ! (*ہم ادارہ نے املا وغیرہ کو اسی لئے بحالہ رہنے دیا تھا۔ کافی عرصہ ہوا، اپنی کتاب کی اشاعت سے قبل آغا صاحب دفتر "ماہِ نو" یعنی شعبۂ اردو میں تشریف لائے تھے اور اس پرچے کی فرمائش کی تھی جس میں ڈاکٹر صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا۔ یہ پرچہ انہیں فی الفور ہی شعبۂ مذکور میں بتوسط ظفر قریشی، نائب مدیر مہیا کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ان کی کتاب اور آزاد کے بارے میں بیرونی ذرائع سے ذاتی تحقیقات کے متعلق کراچی کے بعض اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں جن کو ایک طرح کے اعلانات ہی سمجھنا چاہئے۔ ہم نے ڈاکٹر صادق اور "ماہِ نو" دونوں سے اپنے ملاقۂ خاص کی بنا پر اس دانستہ پہلو ہی پر کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور اب یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کیونکہ آغا صاحب نے ڈاکٹر صادق کے ساتھ ان کے برادرِ خورد (یعنی مدیر) کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ آغا صاحب کی عمر اس وقت غالباً اڑتالیس کے لگ بھگ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیق ۱۹۳۰ء کے بعد شروع کی ہوگی یعنی کوئی ۳۰ برس پہلے، جب آغا صاحب کے آغازِ تعلیم ہی کا زمانہ ہوگا۔ مدیر)

[2] مولوی خلیل الرحمن مؤلف "اخبار اندلس" آپ نے اپنا تعارف مجھ سے ان الفاظ میں کیا تھا "پہلے عرض کر دوں کہ مولوی آزاد اور ان کے خاندان سے مجھے کیا تعلق ہے۔ تاکہ آپ کو میری حیثیت معلوم ہو جائے۔ میں چیف کورٹ میں یکم فروری ۱۸۸۹ء نوکر ہوا...... چیف کورٹ میں آغا ابراہیم (آغا اشرف کے والد) کے ماتحت کیا گیا۔ یہ کہنا چاہئے یکم فروری ۱۸۸۹ء سے میرا تعلق مولوی آزاد مرحوم سے پیدا ہوا۔۔۔ مجھے بچہ سا دیکھ کر آغا صاحب (آغا ابراہیم : مدیر) کی والدہ محترمہ نے مجھ سے مادرانہ سلوک ...... حضرت آزاد خود بھی شناسا تھے۔ ان کی شفقتیں ہونے میں دیر لگی۔ مگر شروع ہوئیں تو دیوانہ ہونے تک قائم رہیں۔" مورخہ دسمبر ۱۹۳۷ء

ترکستان گئے۔ غالباً بلکہ یقیناً لیٹنر کی سفارش پر آزاد
اور من بھول نے فقیری بھیس کیا اور لیٹنر نے عالمگیر
(؟) اختیار کیا اور خوب نمازیں پڑھائیں۔ آزاد نے
ایران و ترکستان میں تنور بھی جھونکا اور روٹیاں بھی
پکائیں۔"

باقی رہا یہ سوال کہ مولانا آزاد دو دفعہ ایران گئے تھے یا صرف
ایک دفعہ ۱۸۶۴ء اور ۱۸۸۵ء میں یا صرف ۱۸۸۵ء میں تو اسکے
دو جواب ہو سکتے ہیں۔ اگر ایران سے مطلب تہران، اصفہان، شیراز
وغیرہ ہے۔ تو آپ صرف ایک دفعہ ایران تشریف لے گئے۔ اس پر
"سیر ایران" شاہد ہے اور اگر ایران سے مراد مشرقی اور شمالی ایران کے
کچھ حصے بھی ہو سکتے ہیں تو مولانا دو دفعہ ایران تشریف لے گئے۔ دوسرے
الفاظ میں سیاحت ترکستان کے دوران میں انہوں نے ایران کا کچھ حصہ
بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کے، دو طرح کے ثبوت ہو سکتے ہیں۔ داخلی اور خارجی۔
داخلی شواہد سے مراد خود ان کے اپنے بیانات و اشارات ہیں جو ان کی
تصانیف میں ملتے ہیں۔

داخلی شواہد سب کے سب "نگارستان پارس" اور "سخندان
پارس" سے لئے گئے ہیں۔ اوّل الذکر بموجب آغا طاہر "سخندان" سے پہلے
کی تصنیف ہے۔ "سخندان" دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے کے لیکچر
ہند ایرانی تقابلی لسانیات پر ہیں۔ یہ ۱۸۷۲ء میں دئے گئے اور اسی سال
"رفاہ عام پریس" میں چھپ گئے۔ دوسرے حصّہ کے گیارہ لیکچر ۱۸۷۴ء
میں دئے گئے۔ ان کتابوں سے ذیل کے اقتباسات قابل غور ہیں:۔

"نگارستان" (سن تصنیف قبل از ۱۸۷۲ء) صفحہ ۷۱-۷۲
تعجب ہے کہ پندنامہ۔ یعنی کریما ایران میں نہیں۔ وہاں کے اکثر اہل
کمال سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کلام سعدی کا معلوم ہوتا ہے۔"

"سخندان پارس"۔ تمہید صفحہ ۴:۔ "انہیں کے لئے بمبئی گیا
پھر ایران تک سفر کیا۔ موبدوں
اور دستوروں سے ملا۔۔۔"

" حصّہ اول صفحہ ۱۳: "کوہستان ایران و خراسان کے
کوّے دیکھے۔ چیل سے ذرا چھوٹے ہوتے
ہیں اور بولنے میں صاف کُلُغ کُلُغ آواز
دیتے ہیں۔"

"سخندان پارس" حصّہ دوم صفحہ ۱۱۰: "ایران میں طلبا کو کتب الٰہیات
عربی زبان میں پڑھتے دیکھ کر مجھے خیال آیا۔"

" " صفحہ ۱۴۱: "اب حال یہ ہے کہ مجتہدان حقیقی یعنی
علمائے دیندار کو تو بادشاہی معاملات کی
کچھ پرواہ ہی نہیں۔ علمائے دنیا دار عالم
بے اختیاری میں تڑپتے ہیں اور کچھ نہیں
کر سکتے۔ میں نے خود دیکھا چپکے چپکے کہا
کرتے ہیں۔"

" " " ۱۵۵: "بازاروں کے ذکر میں یہ بات اہل وطن
کو جتانے کے قابل ہے کہ خراسان اور
ترکستان کے گاؤں گاؤں میں ہفتہ بہفتہ
یا ہفتہ میں دو دفعہ بازار لگتا ہے چھ
کوسی، پنج کوسی گاؤں کے لوگ۔ کوئی
گھوڑے پر۔ کوئی گدھے پر، کوئی پیادہ
اندھیرے منہ گھروں سے چل کھڑے
ہوتے ہیں۔ ان میں ہر قسم کے پیشہ ور
لوگ ہوتے ہیں۔ ۸۔ ۹ بجے تک وہاں
پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر سے گاؤں کا بچہ
بچہ بلکہ عورتیں بھی برقع اوڑھ کر نکلتی ہیں
۔۔۔ اپنا اپنا مال دیتے ہیں۔ مبادلہ میں
اپنی ضرورت کی چیز خریدتے ہیں۔ گھوڑا۔
گدھا۔ گائے۔ بھینس، بکری۔ دنبہ۔
مرغی۔ انڈے تک موجود ہوتے ہیں۔"

" " " ۱۵۸: "ایران کے بازاروں میں اور اکثر
قہوہ خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ
سرو قد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں
کا انبوہ اپنے ذوق و شوق میں مست
اسے گھیرے ہوئے ہے۔"

"سخندان پارس" حصّہ دوم صفحہ ۱۶۲، ۱۶۱: "ان (ایرانیوں) کے گھر پنجاب
کے گھروں سے بالکل برخلاف ہیں۔ دہلی۔
آگرہ۔ لکھنؤ کے گھروں سے کچھ ملتے جلتے ہیں۔

"..... اس ولایت کے اشراف اگرچہ غریبی کی حالت میں ہوں۔ مگر اتنا صحن ضرور رکھتے ہیں کہ دو دو تین تین درخت سیب بہی، ناشپاتی، انار، انگور وغیرہ کے اور دو دو تین تین کیاریاں گلکاری کی ہوں۔ اس میں خانہ بخانہ نہر کا گذر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہندوستان کے گھروں میں دالانوں کے در کشادہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ انہیں کمروں کی طرح دروازوں سے قبضہ میں رکھتے ہیں کہ برف اور ہوا سے بچاؤ رہے۔ ان بند حجروں میں تابدان یا دگیر۔ کھڑکیاں رکھتے ہیں۔ دیواروں میں بخاریاں۔ آتش دان بناتے ہیں اور گرم جوشی میں کبھی جی چاہتا ہے تو چاہ سے بڑھ کر پلاؤ بھی وہیں دم دیتے ہیں۔"

" " ۶۸-۱۶۷: خصوصیات ملک کے ذکر میں اگر وہاں (ایران) کے حماموں کا ذکر نہ کیا تو کچھ کہا ہی نہیں۔ بڑے بڑے کمرہ در کمرہ اور حجرہ در حجرہ لداؤ کی عمارتیں ..... نامی بادشاہوں کے دربار اور ملاقاتوں کے جلسے ان کے جنگی معرکے سب عالم تصویر میں عیاں ہوتے ہیں۔ بوستاں میں شیطان کی تصویر اور شیطان کی گفتگو کی حکایت پڑھ کر میں حیران تھا۔ جب وہاں جا بجا ایسی تصویریں دیکھیں اس حکایت کا مزا آگیا۔ حمام میں اکثر دوست آشنا مل کر داخل ہوتے ہیں۔ سماوار چی چا تیار لئے بیٹھا ہوتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر ایک حقہ پیا۔ ایک ایک پیالی چاء کی پی۔ مزاج میں گرمی آئی۔ دوسرا کمرہ جامہ کن کہلاتا ہے۔ وہاں جا کر کپڑے اتارے۔ ایک حقہ پیا اور طبیعت گرمائی۔ پھر حمام کے کمرے میں داخل ہوئے۔ طبیعت میں عجیب فرحت اور مستی پیدا ہوتی ہے کہ بغیر شعر خوانی اور ترنم کے رہا نہیں جاتا۔ تماشہ یہ ہے کہ ان کمروں میں معمولی آواز سے بھی باتیں کرو تو ایسی گونجتی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ تب معلوم ہوا کہ سکندر نامہ میں

ع: سرودے بگرمابہ در گفتہ گیر کا یہ مطلب ہے۔ ایک ایک آدمی کو کئی کئی حمامی لپٹ جاتے ہیں۔ کوئی پانی ڈالتا ہے۔ کوئی کیسہ کر کے ملتا ہے۔ کوئی مشتمل کرتا ہے کبھی بٹھا کر اور کبھی لٹا کر کبھی دائیں کروٹ کبھی بائیں کروٹ اور اس طرح کل کل دباتے ہیں کہ عمر بھر کی کلفتیں اتر جاتی ہیں۔ نہانے کے لئے بھی کئی کئی کمرے ہوتے ہیں۔ سب میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے حوض بھرے ہوئے ہیں۔ ہر کمرہ میں ۵-۵-۶-۶ بیٹھے نہا رہے اور سب کے سر منڈے گول گول یکساں ہنڈیاں عجب بہار دیتی ہیں ...... وہیں سے نکلتے ہوئے بھوک کا یہ زور ہوتا ہے کہ پیٹ میں آگ لگ اٹھتی ہے۔ وہیں سے کسی دوکان پر چلے گئے۔ روٹی۔ کلے۔ پائے۔ کباب۔ شب دیگ کھائی اور لمبی لمبی ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے گھر چلے آئے۔"

موسم بہار میں بلبل کے چہکنے کی بابت لکھتے ہیں:-

سخندان: صفحہ ۲-۱۸۱: "اس زور شور سے بولتی ہے کہ بعض موقع پر جب چہہ چہہ چہہ کر کے جوش و خروش کرتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سینہ پھوٹ جائے گا ..... میں ایک فصل بہار میں اسی ملک میں تھا۔"

یہ رہے داخلی شواہد۔ اب خارجی شواہد کی طرف آئیے:۔
"نگارستان" کے اشتہار میں آغا طاہر لکھتے ہیں:۔

"مشرقی زبانوں کے محقق نے ہندوستان
اور پنجاب سے نکل کر ترکستان و ایران تک
تحقیق کا دامن بچھایا۔ آخری سفر ایران
کے بعد اپنے سفر کے حالات مولانا نے
ایک دلچسپ لیکچر میں خود بیان فرمائے ہیں"

اور "تمہید" میں لکھتے ہیں:۔

"آپ نے ایران کے کئی سفر کئے۔ اور یہ
حضرت آزاد کا جگر اور حوصلہ تھا کہ سفر
کی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیل کر فارس کی
سرزمین میں پہنچے۔ وہاں کے دستوروں اور
موبدوں سے ملے۔ ژند۔ پاژند۔ دری۔
پہلوی۔ سعدی۔ زابلی۔ کابلی فارسی
زبانوں کی الگ الگ جدا جدا چھان
پھٹک کی۔ ایرانی تورانی قوموں کے میلے ٹھیلے
دیکھے..... اور "سخندان پارس" کا ایسا
تحفہ بنایا..... اس سے پہلے دوسرا حصہ
بھی تیار کر لیا تھا (وہ "نگارستان پارس"
نام رکھا"

یاد رہے کہ یہ کتاب ۷۴-۱۸۷۳ء میں تصنیف ہوئی تھی۔
مولانا کی دیوانگی پر ایک رپورٹ ان کی خدمات کی بابت محکمہ تعلیم میں
تیار کی گئی تھی۔ جس کی نقل مجھے ڈاکٹر محمد شفیع وڈین، شعبۂ علوم مشرقی سے
ملی۔ اس میں لکھا ہے: ... "اس کے بعد انھوں نے سینٹرل ایشیا اور
ایران میں سفر کیا۔ اور۔ مولانا کی سیاسی خدمات بھی ہیں۔ اس سلسلے میں
وہ وسط ایشیا اور ایران گئے..... ایران کا سفر انھوں نے دوبارہ
کیا۔ دوسرا سفر غالباً ۱۸۸۵ء میں کیا..." اس رپورٹ کے ساتھ
مولانا کے صاحب زادہ، آغا ابراہیم کی ایک درخواست انگریزی
میں منسلک ہے جس میں لکھا ہے:۔

THE MAULVI HAD BEEN TO CENTRAL
ASIA AND PERSIA AND HAS RENDERED
VARIOUS SERVICES. HE SAYS THEY ARE
OF SUCH A CONFIDENTIAL NATURE THAT
IT WOULD NOT BE PROPER TO SEND
ANY OFFICIAL STATEMENT OF THEM.

(مولانا وسط ایشیا اور ایران تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے متنوع
خدمات انجام دی ہیں۔ وہ (آغا ابراہیم) کہتا ہے کہ یہ خدمات ایسی راز دارانہ نوعیت
کی ہیں کہ ان کے متعلق کوئی سرکاری بیان ارسال کرنا مناسب نہ ہوگا)۔
غرض کہاں تک لکھا جائے۔ چھٹا اور ساتواں لیکچر ایسے ہی
دلچسپ چشم دید واقعات پر مبنی ہیں۔ کاش آغا اشرف نے انہیں غور
سے پڑھا ہوتا!
اوپر کے بیانات میں چند ایسے ہیں جنہیں آزاد نے مسودہ
میں سفر ایران کے بعد بڑھایا ہے۔ لیکن بیشتر ۱۸۷۴ء والے مسودہ
میں ہو بہو موجود ہیں[2]۔
بہر حال مندرجہ بالا مثالوں سے صرف تین نتیجے اخذ کئے
جا سکتے ہیں:۔

(۱) آزاد ایران گئے تھے۔
(۲) وہ سراسر غلط بیانی کر رہے ہیں اور اَن دیکھی
چیزوں کو ایسے بیان کر رہے ہیں گویا وہ
چشم دید واقعات ہیں۔
(۳) یا انہیں الہام ہوتا تھا۔ اب قارئین خود
فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کونسا نظریہ
درست ہے؟

---

[1] زہے قسمت! ایران و ترکستان کا فرق نہ سمجھنے میں آغا صاحب کے والد بزرگوار بھی میرے شریک ہیں۔
[2] یہ مسودہ آغا باقر صاحب کے پاس ہے۔ چند دن ہوئے دیکھنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

پاکستانی ادب کی تشکیل

(۲)

اختر ضیائی

ادب کے ساتھ ہمارے یہاں بے شمار اضافتیں رائج رہی ہیں۔ ترقی پسند ادب، اصلاحی ادب، تعمیری، تاریخی ادب اور اب پاکستانی ادب کی تشکیل کے امکانات زیرِ بحث ہیں۔ یہ بحث نئی نہیں لیکن جس سطح پر اس کے متعلق اب بات چلی ہے وہ نئی ہے۔

اگر ادب کی مجرد حیثیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ادب ایک آفاقی سچائی ہے۔ جو جغرافیائی حد بندیوں اور نسلی امتیازات سے بالاتر رہ کر انسانوں کی وسیع تر برادری سے متعلق ہے۔ ادب انسانوں کے روحانی عوامل کی تاریخ ہے۔ یہ ادب انسانی احساسات، تجربات اور خواہشات کا آئینہ ہے خواہ وہ یورپ میں ہو یا ایشیا میں، چین میں ہو یا عرب میں ہم کسی دور کے ادب سے اس کی زندگی کے تمام گوشوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں یہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں دور میں فلاں سرزمین کس تمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ غرض ادب ایک ایسا آئینۂ اوقات ہے جس میں صدیوں کے تسلسل کا ایک ایک لمحہ اپنی ہمہ رنگیوں کے ساتھ منعکس ہے۔ اس سے آگے جب ذرا ہم انفرادیت پسند ہوتے ہیں تو ادب خطّوں، تہذیبوں اور نسلوں کا نمائندہ بن جاتا ہے اور ہم اسے ایرانی ادب، یونانی ادب اور پاکستانی ادب کا نام دینا چاہتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا ادب کو حقیقت میں کسی اضافت کی ضرورت ہے؟ کیا محض ادب ان خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا جن کی کسی ملک، تہذیب یا خاص تحریک کو ضرورت ہوتی ہے؟ جب ادب انسانی زندگی کا سچا ترجمان ہے بلکہ جب وہ انسانی زندگی کی محرومیوں، کامرانیوں، ضرورتوں اور تقاضوں کا آئینہ دار ہوتا ہے، تو ادب کہلاتا ہے۔ بہرحال وہ زندگی کو بنانے، سنوارنے اور تعمیری قوتوں کو آگے لے جانے والی طاقت ہوگا اور انسانی زندگی کی گیرائی اور گہرائی ہر کہیں ظاہری تغیرات کے باوصف یکساں ہوگی۔ اس طرح ادب کو کسی اضافت کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایرانی ادب ایرانی انسانوں، ایرانی تہذیب و ثقافت اور ایرانی اقدار کا غماز ہوتے ہوئے اپنی اندرونی کیفیت اور بیرونی ساخت و پرداخت سے شناخت کیا جا سکے گا اور پاکستانی اپنی ہیئت اور ترتیبِ معنوی سے پکار اٹھے گا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اس کے لئے کسی پہلے سے طے شدہ پروگرام اور باہمی معاہدہ کی ضرورت نہیں کہ ہم ادیبوں کو ایک خاص انداز سے سوچنے اور لکھنے کے بارے میں ہدایات دیں یا اپنے دور کے ادبی ذخیرہ کی چھان پھٹک کر کے پاکستانی ادب کی تلاش کا سلسلہ چلائیں۔

جناب جمیل الدین عالی نے اپنی نشری تقریر میں مختلف زاویوں سے موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے اور ابتدا میں "مقصدی ادب" پر بحث کی ہے ہم سوچتے ہیں مقصدی ادب کیا ہے؟ کیا ادب اور مقصدی ادب دو الگ الگ چیزیں ہیں؟ ادب میں مقصد سے کیا مراد ہے؟ ہمارے نزدیک کوئی ادبی تحریر یا بلکہ غیر ادبی بھی بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ ادب بذاتِ خود ایک مقصد ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی طبقہ کے نزدیک مقصد کی توجیہہ کیا ہے۔ ایک طبقہ سیاست کو مقصدِ حیات بنا کر تمام معاشرتی ناہمواریوں کا علاج کرنا چاہتا ہے۔ ایک طبقہ ادب میں مذہبی تبلیغ اور اخلاق کی تدریس کو بنیاد سمجھتا ہے۔ ایک طبقہ تاریخ اور فرقہ وارانہ احساسات کے خاکے میں حسن و عشق کی رنگ آمیزی سے ایک قسم کے مجاہدانہ اجتہاد کی نیو ڈالنا چاہتا ہے اور ایک طبقہ محض جنس کی تجارت کو ادبی خدمت کا نام دینا چاہتا ہے۔ دراصل ادب میں مقصدیت کا جو غلغلہ ہے اگر اسے ادب سے الگ کر کے دیکھا جائے تو حلقہ بندی اور انفرادیت پسندی باقی رہ جاتی ہے!

مقصدی ادب کے بارے میں جناب وحید الحسن ہاشمی نے محض اشاروں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ جو بات انہوں نے اٹھائی ہے اس کی صراحت میں طویل طویل بحث کے باوجود وہ ادب اور پاکستانی ادب کی حدود متعین نہیں کر سکے اور میں کافی کوشش کے باوجود ان کے نقطۂ نظر سے آگاہ نہیں ہو سکا۔ بات اپنے مشہور ادیبوں کے ناموں

سے چلی ہے اور نوجوانوں تک پہنچ کر ختم ہو گئی ہے حالانکہ زیر بحث مسئلہ قطعی طور پر ناطق اور واضح ہے اور کسی قسم کے ابہام اور مستقبل کی توقعات کے حسین خوابوں میں گم ہو جانے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک طویل عرصہ خواب زندگی کے باعث ہم دو ٹوک بات کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں اور حقیقت سے دوچار ہونے کی سکت نہیں رکھتے حالانکہ اجتماعی مسائل اور قومی بنیادوں پر سوچتے ہوئے ہمیں کلیتہً راست گو اور بیباک ہونا چاہیئے، خاص کر ان حالات میں جب ہم ایک حوصلہ مند قیادت کی سرکردگی میں از سر نو اپنے معاملات سمجھنے اور سلجھانے لگے ہیں، ہمیں چاہیئے کہ فراخدلی سے گزشتہ زمانوں کی فردگزاشتوں کو تسلیم کریں اور آئندہ کے لئے مثبت اور ٹھوس نظریات کو فروغ دینے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

ہاں تو بات ادب کی ہے جو انسانوں کا ساتھی ہے۔ اگر صحیح معنوں میں ادب ہے تو وہ اپنے دور کے بدیہی تقاضوں سے غافل نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے دور کی مسرت[1] جو تحریکوں کا حامی اور متقابل عناصر کا مخالف ہوگا۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ ادب دراصل وہی ہے جو عصری آدرشوں کا علمبردار ہے تو اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہوگا، خود بخود فنا ہو جائے گا۔ یہ انسانوں کو بہتر مستقبل کی طرف لے جانے والا ہے جیسا کہ حالی نے کہا ہے "ادب کو پہلے ادب ہونا ہے جس کے اجزا اور عناصر بالکل الگ ہیں"۔ لیکن اس سے آگے کہتے ہیں" پھر پاکستانیت کی تشخیص بھی کرنی ہے"!! آپ نے اس کی زحمت نہیں کی۔ غالباً اس سے ان کی یہ مراد ہے کہ ہمارے کلچر اور تہذیب کی نمائندگی کرنے والا ادب پاکستانی ہے۔ اس طرح مختلف مراحل سے گزر کر بحث اپنے نقطۂ آغاز میں ضم ہو جاتی ہے اور وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلچر اور تہذیب کی نمائندگی سے "ادب" وجود میں آئے گا یا "پاکستانی ادب"۔ کیا ادب کیلئے اضافت لازمی ہے؟

اس سے آگے خود کلچر اور تہذیب کا بڑا جھمیلا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہم کسی ادب میں ایک ملک کے مشہور مقامات کے اسماء، رسومات اور معاشرتی رجحانات وغیرہ کا تذکرہ کریں تو ایسی تحریریں اس ملک کے نام سے ادبی تشکیل پائیں گی؟ اس طرح ہمیں بحث میں آگے جانے سے قبل ان سوالات پر غور کر لینا چاہیئے۔

کیا برطانیہ میں مقیم امریکی مصنفین کی انگریزی تصانیف کو انگریزی ادب، امریکی ادب، برطانوی ادب کے نام سے یاد کیا جائے؟ پاکستان کے سرحدی علاقہ اور افغانستان کے پشتو ادب کو کس سے منسوب کیا جائے؟ مشرقی و مغربی پنجابیوں اور بنگالوں کے پنجابی اور بنگالی ادب کو اگر مزید مخصوص کرنا ہو تو اسے کن کن ذیلی خانوں میں جگہ ملے گی؟ کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے علی الترتیب ہندوستانی ادب اور پاکستانی ادب کے عنوان کے تحت آئیں گے؟ اور کیوں؟ محض اس لئے کہ مصنفین الگ الگ ملکوں کے باشندے ہیں۔ فراق گورکھپوری، اثر لکھنوی، عدم اور احسان دانش کی غزلیات میں خطِ مغائرت کن اصولوں کے تحت کھینچا جائے؟ امیر خسرو، حافظ شیرازی، غنی کاشمیری اور غالب کی فارسی غزلیات کی تقسیم کیا ہوگی؟ کیا یہ غزلیات کشمیری، ہندی اور ایرانی ادب کا نام پائیں گی؟ علیٰ ہذا القیاس۔ یہ سب باتیں مجھے اس لئے دہرانا پڑیں کہ جناب حالی نے اپنی تقریر میں چند ادبا کے نام گنوا کر پاکستانی ادب کی نشاندہی کی تھی۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ منٹو کے افسانے اپنے کرداروں اور ماحول کے باعث پاک و ہند کے نمائندہ ہیں، اس لئے وہ ہندوستانی ادب کہلائیں گے۔ جسیم الدین کی شاعری میں اگر پدما اور میگھنا کی طغیانیاں اور مانجھیوں کی آوازیں جھلکتی ہیں تو وہ بنگالی ادب سمجھی جائے گی۔ نسیم حجازی کے ناولوں کی توضیح کی جائے تو وہ اپنی مجموعی حیثیت سے "ماضی کا ادب" یا "ادب نما تاریخی چربے" یا ایسا ہی کوئی نام پائیں گے۔ ایم اسلم کے "رقصِ ابلیس" اور قدرت اللہ شہاب کے "یا خدا" کو "وقتی ادب" کہا جائے گا۔ اسی نقطۂ نظر سے ان مصنفین کی تخلیقات کو پرکھا جائے تو ہمیں ان میں پاکستانیت کا سراغ نہیں ملتا۔ اس طرح پاکستانیت کی تشخیص ممکن نہیں۔ شیر افضل جعفری کی غزل جھنگ اور پنجاب کی مٹیاروں کی عشوہ سازیوں کی ترجمان تو ہو سکتی ہے لیکن پاکستان کے تہذیبی اور ثقافتی سرمائے کی امانت دار نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ پاکستانیت کے مکمل طور پر وجود میں آنے کے لئے برسوں کے تدریجی ارتقاء و تعمیر کی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر ہم

باقی ص۵۳ پر

---

[1] حالی کی "اجتماعی مسرت" کے بارے میں وحید الحسن ہاشمی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے قطع نظر مسرت اپنے سینکڑوں پہلوؤں کے باوجود انسانی بہبود، خوشگوار اور خوشحال زندگی اور اس دلی طمانیت کی مظہر ہے جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

آکاسِ ادب :

"بھول بھلیاں"

یوسف بخاری

اصنافِ شاعری میں ایک صنف پہیلی کی بھی ہے۔ علماء متقدمین نے اسے اقسامِ بدیع کی ایک شاخ قرار دیا ہے جو خود علمِ بلاغت کا ایک جزوِ اعظم ہے۔ اس صنفِ لطیف کی شان اور ندرت یہ ہے کہ یہ بیک وقت فنی بھی ہے اور غیر فنی بھی۔ عروض کے قواعد کی پابندی بھی ہے اور آزادی بھی۔ کبھی آپ اسے بالکل منظم پائیں گے اور کبھی اس کے بولوں میں قافیے کی حد تک صرف تک بندی ہوگی یہی نہیں بلکہ آپ کو بے شمار ایسی پہیلیاں بھی ملیں گی جو تمام تر نثر میں ہوں گی۔ ان میں بھی تک بندی اور قافیہ پیمائی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ لیکن ان موزوں اور غیر موزوں اعلیٰ اور ادنیٰ متین اور شوخ پہیلیوں کا چھوٹے سے چھوٹا بول بھی آپ کو ادب کے ایسے انمول جواہر پیش کریگا جو مختلف لغات کے خزانوں میں بھی بڑی مشکل سے ہی ملیں گے۔

نظم و نثر کے ان منظم اور غیر منظم موتیوں میں آپ کو جا بجا توریہ اور ایہام سے واسطہ پڑے گا۔ کہیں آپ استعاروں، کنایوں اور اشاروں کے ذریعے دل کی باتیں اور من کے بھید سنیں گے۔ "تل اوٹ پہاڑ اوٹ" کے مصداق آپ ہر پہیلی کی اوٹ میں ایک پہاڑ کھڑا دیکھیں گے لیکن "بوجھ" کے اتنے سے کا ننھا سا تیشہ، اپنی ہلکی سی ضرب سے اس پربت کو رائی سے کائی کر کے مسمار کر دے گا! آن کی آن میں دل کے عقدے اور من کے بھید ظاہر ہو جائیں گے۔ پہیلی کے بول ایسے انمول ہیں جو جیون کا رس بن کر امرت کی صورت کانوں میں ٹپکتے اور دلوں میں اتر جاتے ہیں۔ ان کی دل کش گونجیں جیون کا روپ دھارتی اور بڑھاتی ہیں۔ دکھے دلوں کا دارو بنتی ہیں۔ یہ ہماری خانگی معاشرت، قومی تہذیب کی سچی تصویریں ہیں۔ شاعری کی روح اور آرٹ کی جان ہیں۔

فی الحقیقت ہماری یہ پہیلیاں بچوں، بچوں کی دادی، نانی اور گھر کی الھڑ خادماؤں کی دماغی اپج، افتادِ مزاج، سادہ لوحی، معصومیت

کردار ان کے اوضاع و اطوار، خیالات و افکار اور مشاغلِ زندگی کی ایسی بے پناہ معلومات مہیا کرتی ہیں جن کا مطالعہ اور مشاہدہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

گرمی اور جاڑے کی مختصر اور طویل راتوں کے سناٹے میں بچے نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے اپنے جھرمٹ میں اپنی دادی یا نانی کو کھینچ بلاتے ہیں، ہر روز ایک نئی اور طویل کہانی سن کر ہی دم لیتے ہیں۔ انہی پرسکون گھڑیوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ دادی اور نانی اماں طویل کہانی کی کلفت اور دماغ پاشی کی صعوبت سے محفوظ رکھنے کیلئے بچوں کے تقاضوں کے باوجود ان کے مطالبہ کو ٹال جاتی ہیں لیکن بچے نہیں مانتے۔ اصرار اور ضد کرتے ہیں۔ بالآخر دادی یا نانی اماں مجبور ہو کر ان کی پہلی فرمائش کی تلافی اس طرح کرتی ہیں کہ چند دلچسپ پہیلیاں چھیڑ دیتی ہیں۔ بچے ان کی بوجھ بتانے میں گم ہو جاتے ہیں اور یوں ان غریب بوڑھیوں کو تھوڑا بہت دماغی سکون مل جاتا ہے!

پہیلیوں میں ایسی پہیلیاں بھی پائی جاتی ہیں جو ضرورت سے زیادہ شوخ بلکہ عریاں ہونے کی وجہ سے طبع سلیم کے لئے بار ہوتی ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ایسی پہیلیوں کو خارج اور نظر انداز کرنا لازم ہے۔ البتہ وہ پہیلیاں قابلِ معافی سمجھی جا سکتی ہیں جن میں شوخی اور ظرافت کے ساتھ ساتھ متانت بھی پہلو بہ پہلو موجود ہو۔ دراصل پہیلیاں علماء، فضلاء اور دیگر بزرگ شخصیتوں کے لئے نہیں ہیں، نہ وہ ان کا موضوع ہی ہیں اور نہ بطورِ خاص ان کے گوش گزار کرنے کے لئے وضع کرنے والوں نے ان کو وضع کیا تھا۔ ان سے لطف اندوز اور سود مند ہونے والا طبقہ تو بالعموم معمر عورتیں اور وہ چھوٹے بڑے بچے ہیں جن کی دل بستگی کے لئے ان پہیلیوں میں ہر قسم کا خام اور پختہ مواد فراہم کیا گیا ہے۔

کہانیوں اور داستانوں کی ادبی و تاریخی حیثیت اور

خاکہ افادیت کے مقابلے میں پہیلیوں کی اس افادیت میں کس قدر گہرائی اور گیرائی ہے کہ عورتوں اور بچوں کو عقل و دانش کا جوہر عطا کرتی ہیں۔ ان کو پہیلی کی بوجھ بتا دینے کا ذرا سا یا انعام کا لالچ کہ جو پہیلی بوجھے گا وہی عقل مند ہے اور وہی "بادشاہ" ہوگا، ان کے غور و فکر کے دھارے کو کس قدر تیزی اور روانی بخشتا ہے۔ ان کی ناکامیابی کے اندیشے کو کامیابی سے اور شکست کے پیش آئند احساس کو مبدل بہ فتح کرنے میں یہ معمولی سا لٹکا، پہیلی کی یہ ذرا سی دھمکی یا یہ پیارا کوسنا کہ "پہیلی بوجھ یا گاؤں چھوڑ دو، جو بوجھ نہ بتلائے گا وہ گدھا اور بے وقوف ہوگا، اُنکو عقل مند اور بادشاہ بننے کی فکر میں غلطاں و پیچاں کر دیتا ہے۔ ان کی سمجھ اور بوجھ کی نظری صلاحیتوں کو کس قدر ابھارتا اور چمکاتا ہے۔

پہیلی کا وجود دنیا کی تقریباً تمام مشہور زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ پہیلی دراصل ہندی لغت ہے، اس کا مادۂ اشتقاق سنسکرت پرہیلکا ہے۔ عربی میں "لغز" فارسی میں "چیستان" یا "معمہ"، انگریزی میں "رڈل" (RIDDLE) اور دکھنی میں اسے مسئلا (عربی۔ مسئلہ) کہتے ہیں جس طرح مختلف زبانوں میں اس کے مختلف نام ہیں اسی طرح قدیم اساتذہ نے پہیلی کی متعدد قسمیں بھی قرار دی ہیں۔ اس وقت صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ اردو ادب میں پہیلی کے علاوہ مکرنیاں یا کہہ مکرنیاں، دو سخنے، نسبتیں اور انملیاں، وغیرہ کا شمار بھی پہیلیوں ہی میں ہوتا ہے۔

گو ہم نے اس بحرِ عمیق سے عربی اور فارسی کے بھی کچھ موتی نکالے ہیں لیکن زیادہ عنصر ہندی آمیز اردو اور دکھنی پہیلیوں وغیرہ کا ہے۔ ان میں اکثر پہیلیوں کو اور خاص طور پر کہہ مکرنیوں کو حضرت امیر خسرو دہلویؒ سے منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ ابھی تک یہ بات کسی صریح شہادت سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہے۔ مگر یہ تسلیم ہے کہ ادب کے ایسے سینکڑوں جواہر تھے جو زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو چکے ہیں یہی حال پہیلیوں کا بھی ہوا کہ ماضیٔ بعید اور قریب میں وہ ہر کس و ناکس کی زبانوں پہ کھیلتی رہیں، مگر ہماری غفلت کے ہاتھوں ان میں جائز و ناجائز تصرفات ہوئے غلط اور بھونڈی نقل در نقل اور طباعت کی موشگافیوں نے بھی ان کا حلیہ بگاڑ لہٰذا ہیئت بھی بدل گئی۔ چنانچہ اب اصل اور نقل میں تمیز کرنا بھی محال ہے۔

گزشتہ چند صدیوں میں ملکی اور قومی انقلابات کا ایک کرشمہ یہ بھی تھا کہ دیگر مختلف ممالک اور اقوام کی طرح غیر منقسم ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو سنسکرت اور ہندی سے اور برادرانِ وطن کو عربی و فارسی سے بیگانگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ اگر زبانوں کا سمبندھ اور سنجوگ قائم رہتا تو عربی اور فارسی کے پہلو بہ پہلو مسلمان سنسکرت اور ہندی سے بھی واقف ہوتے اور پہیلیوں کا یہ خزانہ جو آج بھی ہندی کتب خانوں میں محفوظ ہوگا بہت کچھ ہمارے پاس ہوتا۔ ذرا غور کیجئے کہ صرف علماء ہنود نے چیستان کی اس قدر قسمیں وضع کی ہیں کہ ان کے مقابلے میں کسی قوم کے ادب میں اتنی نہیں پائی جاتیں۔ ان اقسام سے قطع نظر، پہیلی کیونکر وجود میں آئی پہیلی کا ماخذ ایجاد اور تاریخی ماخذ کیا ہے۔ مختلف ممالک اور اقوام کے پہیلی کے متعلق کیا خیالات ہیں۔ زمانہ قدیم میں پہیلی کے مختلف النوع استعمال، پہیلی کی تعریف۔ خواص۔ لوازم فنی مرتبہ۔ شعریت۔ مختلف زبانوں میں پہیلی کا انداز، امتحان۔ لب و لہجہ، قدیم و جدید مطبوعہ و غیر مطبوعہ پہیلیوں کے مجموعے۔ ان کی بیشمار تعداد، ذرا انہی چند موٹے موٹے عنوانات پر نظر ڈالئے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ موضوع جو بظاہر نہایت روشن، شگفتہ اور ہلکا پھلکا نظر آتا ہے کتنا قدیم، کتنا عظیم، کتنا اہم اور کتنا دشوار ہے۔ بہرحال کچھ پہیلیاں از قبیل مشتے نمونہ از خروارے پیش ہیں:۔

پہیلی: آسمان:

بستی تمام یک چادر (دکھنی)

یعنی: (ایک چادر ساری بستی)

(آسمان کو ایک ایسی بڑی چادر سے تشبیہ دی ہے جس کے نیچے ساری دنیا آباد ہے)۔

کہہ مکرنی: ہوا:

رات دن جا کو ہے گون کھلے دوارے آوے بھون ہندکا
واکو ہر ایک بتا دے کون اے سکھی ساجن؟ نا سکھی پون (خسرو)

عورت اپنی سکھی سے کہتی ہے کہ رات ہو یا دن وہ ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ اگر دروازے کھلے ہوئے ہوں تو وہ گھر میں گھس آتی ہے۔ اس کی تعریف کرنا اور اس کا نام ہر ایک آدمی کا کام نہیں لیکن اے میری سکھی تو تو بڑی سیانی ہے بھلا بتا تو سہی وہ کون ہے۔ سکھی بولی۔ ساجن! عورت نے کہا۔ ہائے رام۔ اری وہ تو ہوا ہے!

پہیلی: آسمان اور چاند:

نکے تلاب میں چاندی کا کٹھورا (دکھنی)

یعنی (سوکھے تالاب میں چاندی کا کٹورا)
(آسمان کو خشک تالاب سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں چاندی کا کٹورا یعنی چاند چھلک رہا ہے)۔

پہیلی: آسمان، چاند، سورج:

کالی ماں کے گورے پوت — ان دونوں کے نئے کرتوت
بھائی کو ہے بھائی سے لاگ — ایک ہے ٹھنڈا ایک ہے آگ

آسمان کو کالی ماں سے تشبیہ دی گئی ہے اور گورے پوتوں سے مراد روشن چاند اور سورج ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کا فعل و عمل عجیب و غریب ہے۔ مزاج میں ایک کو دوسرے سے دشمنی ہے۔ چاند ٹھنڈا ہے اور سورج آگ کی طرح گرم۔

پہیلی: دھوپ:

نر سے پیدا ہووے نار
ہر کوئی اس سے رکھے پیار — ہندی
ایک زمانہ اس کو کھاوے — (خسرو)
خسرو پیٹ میں وہ نا جاوے

سورج کو نر (مرد) اور دھوپ کو نار (عورت) سے تشبیہ دی ہے۔ دھوپ سب کو اچھی لگتی ہے۔ اگر دھوپ نہ ہو تو دنیا کے ہزاروں کام بگڑ جائیں۔ ایک زمانہ یعنی دنیا کے تمام لوگ جاڑے میں دھوپ کھاتے یعنی سردی کی تکلیف سے بچنے کے لئے دھوپ میں بیٹھ کر گرم ہوتے ہیں۔ آخری بول کا مطلب بھی یہی ہے دھوپ پیٹ میں نہیں جاتی بلکہ جسم کو سینک پہنچاتی ہے۔

پہیلی: پرچھائیں:

ایک ناری کا میلو رنگ
لگی رہے وہ پی کے سنگ
اجیاری میں سنگ براجے — (ہندی)
اندھیاری میں چھوڑ کے بھاگے

پرچھائیں کو میلی (کالی) عورت سے تشبیہ دی ہے جو اپنے پی (گھر والے یعنی ہر چلنے پھرنے والے) کے ساتھ ساتھ رہتی ہے لیکن ہر وقت نہیں صرف روشنی اور دھوپ کے وقت، اور جہاں اندھیرا چھایا یہ جھٹ سے غائب ہو جاتی ہے۔ اردو میں یہی مفہوم اس شعر میں پایا جاتا ہے:

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

پہیلی: پرچھائیں:

عجب طرح کی ہے اک نار
اس کا کیا میں کروں بچار
نِس دن ڈولے پی کے سنگ — ہندی
لاگ رہے وا کے انگ — (خسرو)
دِیا برے تو وہ شرمائے
ڈھگ سے سرک وہ دور ہو جائے

اس پہیلی میں بھی پرچھائیں کو عورت سے تشبیہ دی ہے۔ شاعر حیران ہے کہ اس پرچھائیں کا ذکر کن الفاظ میں کرے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ تمام دن پی (چلنے پھرنے والا یا والی) کے ساتھ چلتی پھرتی رہتی ہے۔ قدم بہ قدم اس کے ساتھ چلتی ہے لیکن جہاں شام ہوئی چراغ جلا۔ روشنی پھیلی تو وہ جھٹ چپکے سے سرک جاتی ہے مثل مشہور ہے چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے۔

کہہ مکرنی، چاند:

اونچی اٹاری پلنگ بچھایو
میں سوئی میرے سر پر آیو — ہندی
کھل گئیں انکھیاں بھئی آنند — (خسرو)
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی چند

عورت اپنی سکھی سے کہتی ہے کہ جب میں اپنے مکان کی بالائی منزل پر پلنگ بچھا کر سو جاتی ہوں تو کچھ دیر بعد وہ میرے سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے آنے سے میری آنکھوں میں کچھ ایسی ٹھنڈک پہنچتی ہے کہ وہ سوتے سوتے کھل جاتی ہیں۔ لیکن اے سکھی بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں چاند کی تعریف کر رہی ہوں اور تو اسے میرا ساجن سمجھ رہی ہے۔

پہیلی: چاند:

چاندی کا کٹورا، چور ڈرتا، اٹھا نہیں سکتا — دکھنی
(چاندی کا کٹورا، چور ڈرتا، اٹھا نہیں سکتا)

یہ بالکل گونگی پہیلی ہے۔ پہیلی کے اصول کے مطابق اسے پہیلی بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں چاند کا کوئی اتا پتا نہیں دیا۔ پھر بھی اس کا مطلب یوں نکالا جا سکتا ہے کہ چاند اتنا اونچا ہے کہ انسان کا

اس کا پہنچنا محال ہے۔ لیکن علم میں بڑی طاقت ہے، امریکہ اور روس کے سائنس داں چاند تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں کیا عجب کہ ایک دن ہم چاند کو پالیں۔

پہیلی، تارے:

پات صدرخ پھول تبق، مالی گوندھ نہ سکے، بادشاہ پہن نہ سکے — دکنی

یعنی (پھولوں بھرا طباق، مالی گوندھ نہ سکے، بادشاہ پہن نہ سکے)

اس پہیلی میں لفظ صدرخ مہمل ہے صرف تبق (طبق معنی طباق یا تھال) تک ملانے کے لئے لایا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ پھول (تارے) دو چار، دس بیس، سو دو سو نہیں، لاکھوں کروڑوں ہیں اور ایسے انوکھے ہیں کہ ان کو نہ مالی گوندھ کر ہار بنا سکتا ہے اور نہ بادشاہ جیسا دولت مند اور مقتدر شخص انہیں پہن سکتا ہے۔ طباق سے آسمان بھی مراد ہو سکتا ہے۔

کہہ مکرنی: تارا،

رات سمے وہ میرے آوے
بھور بھئی وہ گھر اُٹھ جاوے — ہندی
یہ اچرج ہے سب سے نیارا — (خسرو)
اے سکھی ساجن! نا سکھی تارا

عورت اپنی سکھی سے کہتی ہے کہ وہ رات کے وقت میرے پاس آتا ہے اور صبح سویرے منہ اندھیرے چلا جاتا ہے۔ اس کی یہ انوکھی چال سب سے نیاری اور بڑی پیاری ہے۔ سکھی بولی: کیا وہ ساجن ہے، اس نے جواب دیا: نہیں پگلی، تارا!

پہیلی، آسمان۔ بارش۔ بجلی،

نیلی سیج پہ گوری رانی
رو رو کہے اپنی کہانی — ہندی
اس کا رونا سب کو بھائے
ہنسے تو سارا جگ جل جائے

نیلے آسمان کو نیلی سیج سے تشبیہ دی ہے اور گوری رانی سے مراد بھورے بادل ہیں۔ رو رو کر کہانی کہنے کا اشارہ بادلوں کا گڑگڑانا اور برسنا ہے اور ہنسنا بجلی کا چمکنا اور زمین پر گرنا ہے مطلب یہ ہے کہ نیلے آسمان سے بارش کے بادل برساتے ہیں۔ اس بارش کو لوگ رحمت سمجھتے ہیں۔ بارش نہ ہو تو انسان پیاسا مر جائے اور اناج کا کال پڑ جائے

اسی طرح اگر بجلی کڑک کڑا کر گر پڑے تو جس مقام پر گرے وہ برباد ہو جائے۔

پہیلی، اولا:

بھر مٹھی موتی دے
ہاتھ لگائے چوری آئی — ہندی
دیکھی راجا کی چترائی

اولے کی پہیلی ہے جو کبھی کبھی بارش کے ساتھ آسمان سے برسا کرتے ہیں۔ راجا نے ہنسی ہنسی میں اپنی رانی کو کچھ اولے دئے۔ وہ رانی کے ہاتھ میں پہنچتے ہی ہاتھ کی گرمی سے گھل گئے اور پانی بن کر غائب ہو گئے۔ رانی کے قریب ہی اس کی سہیلی بھی کھڑی تھی۔ رانی بولی سکھی تو نے میرے راجا کی چترائی دیکھی۔ مجھے اولے دے کر مفت میں چور بنا دیا!

پہیلی: شبنم:

اوگھٹ گھاٹ گھڑا نہ ڈوبے
ہاتھی کھڑا نہائے
پیپل پیڑ پھننگ تک ڈوبے — ہندی
چڑیا پیاسی جائے

زمین کو اونچی نیچی ہونے کی وجہ سے اوگھٹ (ناہموار) گھاٹ کہا گیا ہے۔ گھاٹ وہ جگہ ہے جہاں سے پانی پیتے اور بھرتے ہیں۔ اس پہیلی میں شبنم کی تعریف بھی ہے اور برائی بھی۔ شاعر کہتا ہے کہ جب شبنم گرتی ہے تو پیپل ہو یا کوئی اور درخت چوٹی سے جڑ تک شبنم میں ڈوب جاتا ہے۔ اگر ہاتھی باہر کھڑا ہو تو وہ بھی سر سے پاؤں تک پانی میں نہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی ننھی منی چڑیا کو پیاس لگے تو اسے ایک قطرہ بھی میسر نہیں آتا۔ غریب یونہی پیاسی، ترستی اور پھڑکتی رہ جاتی ہے۔

پہیلی، پانی:

پانی ما اور پانی باپ
اس کا اشارہ بوجھیں آپ — (انشا)

عربی زبان میں پانی کو ما کہتے ہیں۔ اگر اس "ما" میں نون غنہ (ں) اور بڑھا دیں تو اُردو کا لفظ "ماں" (والدہ) بن جاتا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کو پالتے ہیں۔ پانی سے تمام انسان اور حیوان پرورش پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے پانی انسان اور حیوانات کی ماں اور باپ ہوا۔

صدر پاکستان کا دورۂ سعودی عرب
و
متحدہ عرب جمہوریہ

حرم کعبہ کی زیارت کے بعد

نماز جمعہ (حرم شریف)

حجر اسود کی تعظیم

'' نشان پاکستان ،، : جلالتہ الملک سلطان سعود کو پرخلوص پیشکش

صدر پاکستان کا دورۂ ممالک عرب

(۲)

آشنا با آشنا !

قدیم آثار مصر کی سیر
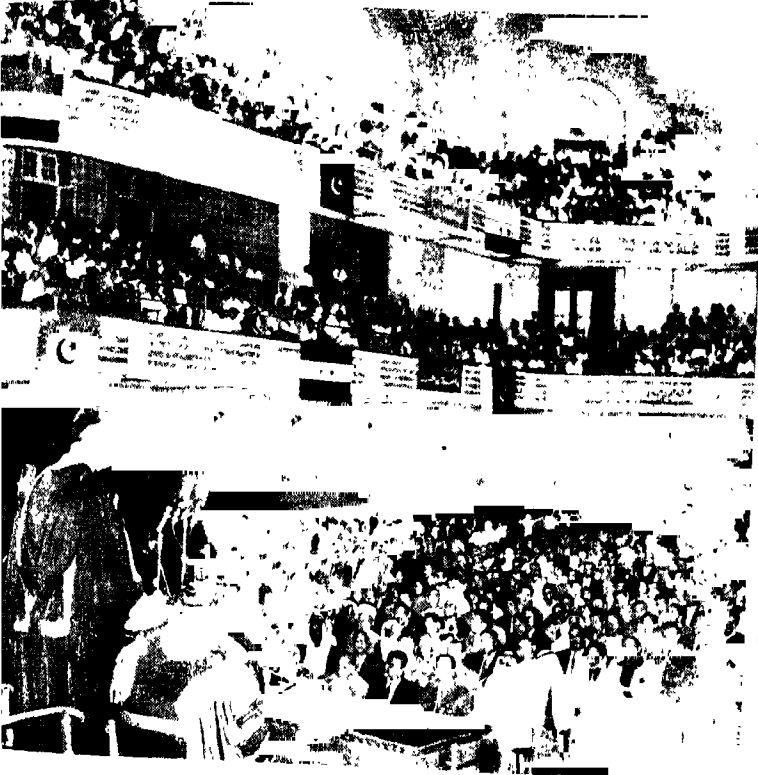
علمی اعزاز (دارالعلوم قاہرہ)

پرجوش عوامی خیرمقدم (قاہرہ)

کہہ مکرنی، پانی:
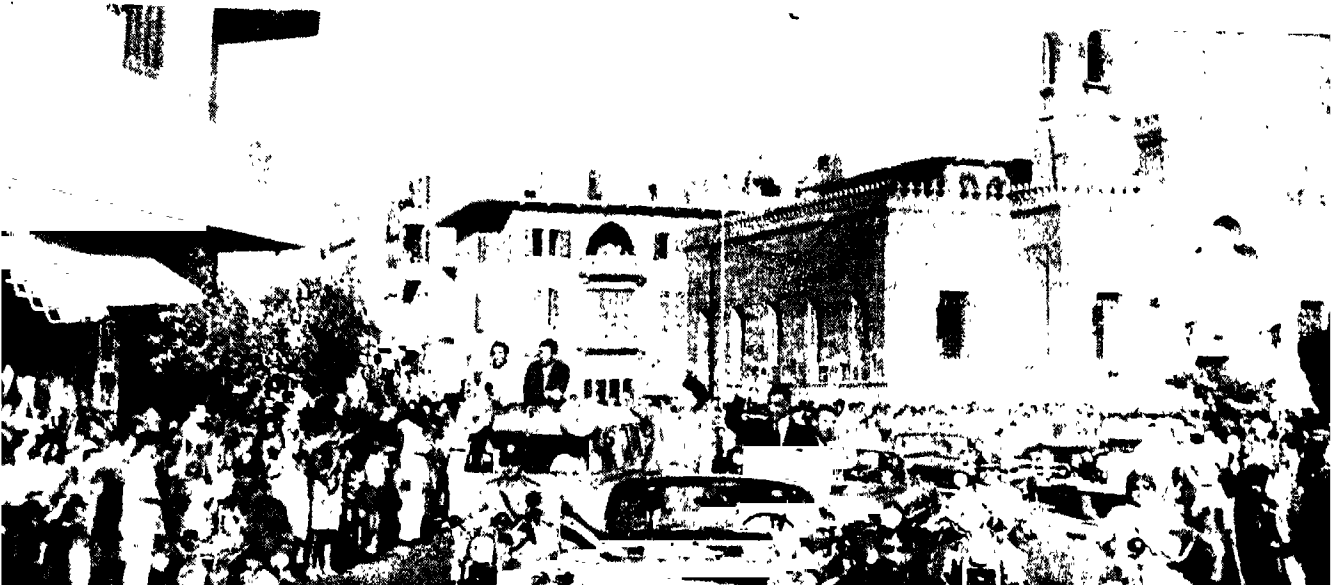
وا بن موکو چین نہ آوے
وہ میری تس آن بجھاوے
ہے وہ سب گن بارہ بانی (ہندی)
اے سکھی ساجن نا سکھی پانی

عورت اپنی سکھی سے کہتی ہے کہ اس کے بغیر مجھے کل نہیں پڑتی، چین نہیں آتا۔ سچ پوچھو تو وہی میری تس (پیاس) بجھاتا ہے۔ وہ اپنے ہنر اور فن میں طاق ہے لیکن سکھی تو سمجھی یہ میں کس کی تعریف کر رہی ہوں۔ وہ میرا ساجن نہیں، پانی ہے۔

پہیلی: فوارہ:

جل سے ترور اونچا ایک
پات نہیں پر ڈال اینک
اس ترور کی سیتل چھایا (خسرو)
نیچے ایک نہ بیٹھن پایا

پانی کے فوارے کو ترور (درخت) سے تشبیہہ دی ہے اور ڈال سے مراد پانی کے ننھے ننھے قطروں کی وہ مہین مہین دھاریں یا پھوار ہیں جو فوارے سے پھوٹتی ہیں اور درخت کی شاخوں کی طرح چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ یہ پھوار بڑی خوشگوار ہوتی ہیں لیکن بھیگ جانے کے ڈر سے کوئی ان کے نیچے نہیں بیٹھتا۔

پہیلی: سال، مہینہ، دن:

ییک سندرخ، بارا خانے۔ ییک ییک خانے میں تیس تیس دانے
آدھے اُجلے، آدھے کالے (دکھنی)

یعنی: (ایک صندوق بارہ خانے، ہر خانے میں تیس تیس دانے آدھے گورے، آدھے کالے)

پورے سال کو صندوق سے، بارہ مہینوں کو بارہ خانوں اور ہر مہینے کے تیس تیس دنوں کو دانوں سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ تشبیہہ چاند کے مہینوں کے حساب سے دی گئی ہے۔ آدھے اُجلے سے مراد چاند کے وہ پندرہ دن ہیں جب چاند گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے اور راتیں اندھیری ہو جاتی ہیں۔

کہہ مکرنی: گرمی:

بیساکھ میں میری ڈھگ آوت ہے
موکو، ننگو سیج پہ ڈارت ہے (ہندی)
نہ سووے نہ سوون دیت ادھرمی (خسرو)
اے سکھی ساجن نا سکھی گرمی

عورت اپنی سکھی سے کہتی ہے کہ بیساکھ کے مہینے میں وہ میرے پاس آتا ہے اور مجھے گھڑی چار پائی پر ڈال دیتا ہے۔ وہ ایسا ظالم اور کٹھور ہے کہ نہ تو خود سوتا ہے اور نہ مجھ کو سونے دیتا ہے، لیکن اے میری بھولی سکھی کہیں تو میرے ساجن کو نہ سمجھ بیٹھیو۔ توبہ! خدا نہ کرے وہ ایسے ہوں۔ میں تو اس ناس پٹی گرمی کا ذکر کر رہی ہوں!

پہیلی: جاڑا:

ایک کنیا نے بالک جایا
وا بالک نے جگت ستایا
مارا مرے نہ کاٹا کٹے
وا بالک کو ناری کھائے

وقت اور موسم ہمیشہ ادلتے بدلتے رہتے ہیں کبھی گرمی کا موسم آتا ہے، کبھی برسات کا اور کبھی جاڑے کا گویا ایک موسم دوسرے موسم کو جنم دیتا ہے، اسی خیال کو سامنے رکھ کر امیر خسرو نے یہ پہیلی کہی ہے۔ انہوں نے موسم کو ایک کنواری لڑکی سے تشبیہہ دی ہے اور جاڑے کو بالک (بچہ) کہا ہے۔ جاڑے کے موسم میں لوگ سردی کی شدت سے ٹھٹھر جاتے ہیں اور سخت تکلیف محسوس کرتے ہیں دوسرے بول کا بھی یہی مطلب ہے کہ یہ جاڑا بڑا پریشان کن ہے، نہ مارے مرتا ہے اور نہ کاٹے کٹتا ہے۔ لیکن اس کا علاج بھی اسی ناری (آگ) کے پاس ہے۔ آگ کے پاس بیٹھو تو سردی دور ہو جاتی ہے۔ یہ بے مثل پہیلی ہے۔ جب تک کنیا (موسم) نے بالک (جاڑے) کو جنم نہیں دیا وہ کنواری رہی اور جب اس نے بالک کو جنم دے دیا تو ناری (بیاہی ہوئی عورت) ہو گئی۔ بلاغت یہ بھی ہے کہ ہندی میں نار اور ناری عورت اور آگ دونوں معانی میں آتا ہے؛

★

سُگن رُوپ

(دُپنچم کے بعد - بڑھت)

جعفر طاہر

صبح در صبح تجلائے رخِ سیم تناں، شمس وَشاں، روز رُخاں پھیل چلا ہے اب تو
ایک درویشِ جگر تافتۂ عرش و فروزندۂ گیتی کا یہ اعجازِ ہنر، ذوقِ نظر بھی دیکھو
سیل در سیل یہ بکھری ہوئی کرنیں ہیں کہ زلفوں کے ہنڈولوں میں زلیخائے صبا جھولتی ہے
زندگی حسنِ برشتہ کی سحر تاب جبیں، خوش گہہِ معصوم و پُر انوار کے لب چومتی ہے
خار خارِ دلِ ہستی ہے کہ فوارۂ انوار بنا روشنیاں چار سو برساتا ہے
شبنمیں برجِ گہر بار سے یوں جھانکتی ہیں جیسے کوئی شوخ کھڑا خود سے بھی شرماتا ہے
سایۂ رستانِ گراں خواب اُٹھے، گرم دلاں نیند سے رہ رہ کے بڑے چاؤ سے بیدار ہوئے
آنکھیں مل مل کے للت جاگی، وہ انگڑائیاں لے لے کے ہنسی دونوں جہاں مطلعِ انوار ہوئے
بھیرویں باغ میں گانے لگی جیسے کوئی البیلی ندی پھولوں کی آغوش میں شرما کے بہے
گن کلی چہرے پہ سپنوں کے مچلتے ہوئے آنچل کو ہٹا کہنے لگی "سیّاں کہاں رات رہے"
شاخ در شاخ ہوا کھیلتی ہے، ناچتی ہے، کتنے بھنور جال کھڑی بُنتی ہے
شیشۂ ساعتِ ہستی میں تڑپتے ہوئے ذرّوں کے مری روح گُہر چُنتی ہے
وقت اک ذرّۂ ناچیز ہے، پھیلا ہوا صحرا بھی ہے اور میں تو کھڑا سوچتا ہوں
پھیل جاؤں یا کسی نار کی آغوش میں چپ چاپ پڑا سویا رہوں، سویا رہوں، سویا رہوں
اک نظر اور غمِ کون و مکاں، کارگہہِ جان و جہاں، مرحلۂ دشتِ تپاں کچھ بھی نہیں
ایک بوسہ جو عنایت ہو تو پھر بارِ غمِ کوہ گراں، سلسلۂ عمرِ رواں کچھ بھی نہیں
کوئی شرما کے جو بڑھتا ہے تو گردشِ گردِ دراں بھی اُدھر سوچ کے، کچھ دیکھ کے رُک جاتا ہے
وقت وہ بڑھتا ہوا سایہ ہے جو چاہنے والوں کی طرف بڑھتا ہے اور پاؤں پہ جھک جاتا ہے
بام تا بام اُبھرتے ہوئے لہرا کے مچلتے ہوئے خورشید کسی دورِ طرب کار کی تمہید بنے
کتنی مشتاق و پژوہندہ نگاہیں طلبِ جلوۂ و صد آرزوئے دید لئے
گوش در گوش یہ آویزۂ ارماں کی للک، آرزوئے عیش کا یہ حُسن و جمال

کانپتی پلکوں کے پیغام یہ نشور نگاہوں کی صدا پھیلی ہوئی نکہت وخوشبوئے وصال
مرمریں بانہوں کے یہ جال، یہ انگڑائیوں کے دام، یہ تلواروں کی بنتی ہوئی محراب تپاں
یہ پرم روپ، تسی وندیاں، سنسکار، پرم دھام، سری راگ یہ صد سرو رواں
شاہد وشعر وشراب وشفق وشعلہ رخاں، شوخ زباں، شرم شبستاں ہائے
دل نہادان جنوں مست وجگر چاک زخودرفتہ وجاں دادہ وحیراں ہائے
"گل وگلزار کے ادرنگ وہمہ رنگ" پہ یہ نغمہ وآہنگ، یہ گاتے ہوئے دل کا رسیں
طبلک وچنگ ومزامیر ودف وبربط ونے، مادی گہہ خلد بریں
اسپ وشمشیر وکمند وعلم وتیر وکمان وقلم دکنج وکتاب
نوجواں پو یہ کناں، نعرہ زناں محو تگ وتازوجہاں، پاؤں میں یک گوئے خراب
نیلمیں رمنے۔ مہکتے ہوئے تن مست فضائیں۔ یہ سگن روپ کی گاتی ہوئی دھوپ
تال، تالاب، کنول، کنڈ، بھرے جھنڈ، گھٹا۔ دھرتی کا پربھاؤ یہ البیلا سروپ
شال میں شالی کے لپٹے ہوئے فردوس، جنوں زار، یہ پٹ سن کی ردائیں زرتار
ناریاں، سانوریاں، کامنیاں، جن کے بھرے جوڑوں پہ تقدیر کے بیچاک نثار
کوئی سنتھال کی دوشیزۂ خودسر ہے توسلہٹ پہ ابھرتا ہوا سورج کوئی
کتنی آکاس مکھی دیویاں، شبھ نام چرن کملیاں، گج گامنیاں، بند رُدئی
ہائے یہ تال یہ توڑے یہ تڑپ کون نرت کار یہ گت ناچتی ہے
ناتواں ہیں سے گلہ کیا جو کہے کون یہ نادان گمت ناچتی ہے

ہا یہ بنگال کا ناچ
میری دھرتی کے مہ وسال کا ناچ،
آر دھنگ روپ
جیسے چھاؤ دھوپ
نرکھت انوپ
بھے چک توبھوپ
کرڈھک ڈھک گتی ڈامبرو باجے
ٹا ڈھا ٹا ڈھا ٹا ڈھا

بس ہاتھ رنگ

چھبی انگ انگ

مُوہے شیش گنگ

لئے گوری سنگ

پیے بھنگ اڑنگ سو کرت کا جے

تا ڈھا تا ڈھا تا ڈھا

اوڑھے لال شال

گلے راج مال

چلے ہنس چال

کرے دیکھ بھال

ات چندر بھال ہیں سدا براجے

تا ڈھا تا ڈھا تا ڈھا

اردھنگ روپ

جیسے چھاؤں دھوپ

بجے چک تو بھوپ

نرکھت انوپ

کر ڈھمک ڈھمک گتی ڈابرو باجے

تا ڈھا تا ڈھا تا ڈھا

★

افسانہ

حمید کاشمیری

سفارت خانے کے قریب پل پر سے گذرتے ہوئے اس نے حسب معمول میگزینوں کا گٹھا پل پر رکھا اور کمر سیدھی کرنے کے لئے تھوڑی دیر بیٹھ گیا۔ اس وقت تقریباً ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے سفارت خانے میں دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوگا اور سفارتی افسر اور عملہ کے دیگر ملکی و غیر ملکی افراد جب صدر دروازے سے باہر نکل رہے ہوں گے تو وہ میگزینوں کا گٹھا لئے دروازہ پر کھڑا بڑی تیزی سے ٹائم، نیوز ویک، لائف، پوسٹ، لک اور اسی قسم کے دوسرے رسائل فروخت کرنے میں مصروف ہوگا اور شام تک اسی سفارت خانے کے باہر کھڑے کھڑے اپنے تمام تازہ رسائل فروخت کر دے گا اور چند ایک پرانے رسائل اس کے پاس رہ جائیں گے جو وہ دکاندار کو واپس لوٹا دے گا، اور پھر خوش خوش ہنستا گاتا واپس گھر کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ راستے میں ایک جگہ حلیم کھائے گا، ایک جگہ قلفی اور پھر ہو سکا تو کسی گرما گرم فلم کا شو دیکھنے کی کوشش بھی کرے گا مگر پھر بھی گھر دینے کے لئے روپیہ دھیلی اس کے پاس ضرور بچ رہی ہوگی اور وہ رات کو کسی فلمی حسینہ کے خیال میں بڑے آرام کی نیند سو سکے گا۔ وہ اس سفارت خانے کے باہر گذشتہ تین چار سال سے تنہا میگزین فروخت کر رہا ہے اور اس پھاٹک کے سامنے کھڑا ہونے کا پانچ روپیہ ہفتہ یہاں کے چوکیدار کو کرایہ ادا کرتا ہے اور اس کرایہ کے عوض چوکیدار نے اُسے صرف اجازت ہی نہیں دے رکھی ہے بلکہ یہ معاہدہ بھی کر رکھا ہے کہ وہ کسی اور اخبار فروش کو یہاں اخبار رسالے بیچنے کی اجازت نہیں دے گا۔ لہٰذا اس کے علاوہ کبھی کوئی ادھر آکر یہاں رسائل فروخت کرنے کے لئے نہیں آیا اور آیا بھی تو چوکیدار نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کے طرح بھگا دیا کہ اس نے دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا۔ اس طرح یہ سفارت خانہ اس کے لئے معقول آمدنی کا ذریعہ بن گیا اور وہ اپنے ہم پیشہ اخبار فروش لڑکوں سے کئی گنا زیادہ کمانے لگا۔

پل پر تھوڑی دیر سستا کر اس نے ایک راہ گیر سے وقت پوچھا اور پھر اپنے میگزینوں کو بازوؤں کے زور پر تھوڑا سا اوپر اٹھا کر اندازے سے بوجھ کا وزن کیا۔ ایسا کرنے سے اس کا چہرہ تھوڑی دیر کے لئے سرخ ہو گیا اور گردن کی رگیں تن گئیں۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ وزن کم سے کم پینتیس سیر ضرور ہوگا۔ وہ ایک دن چند دوسرے اخبار فروش لڑکوں کے ساتھ ایک کانٹے پر تلا تھا تو اس کا اپنا وزن بمشکل پینتیس سیر نکلا تھا تاہم اس بوجھ سے اسے قطعی تشویش نہیں ہوئی بلکہ وہ اس خیال سے مطمئن ہو گیا کہ تھوڑی دیر میں یہ بوجھ اتر جائے گا اور اس کے بدلے میں کرارے کرارے ہلکے پھلکے نوٹوں کا ننھا سا سرد سا گیں بوجھ اُسے مل جائے گا جو اسکی رگوں میں نیا خون دوڑا دے گا۔

"یہ پاکستانی نوٹ بھی کتنے اچھے ہوتے ہیں اور ان پر جو چاند تارا بنا ہوتا ہے وہ آسمان والے چاند تارے سے کتنا اچھا ہوتا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں نوٹوں کے حسن کے بارے میں سوچا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ میگزینوں کا گٹھا اٹھا کے اوپر کندھے پر اٹھا لیا اور تیز تیز قدموں سے سفارت خانے کے پھاٹک پر پہنچا تو وہ ہونٹوں کے اندر دبی دبی سیٹی بجا رہا تھا۔ اور اس کی نگاہیں ٹاور پر لگے ہوئے گھڑیال پر تھیں۔ وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا جیسے گھڑیال نے اسے کوئی بہت ہی اچھی خبر سنا دی ہو۔ اس نے ایسی نظروں سے جیسے کسی محبوب کو دیکھ رہا ہو، گھڑیال کی طرف دیکھا اور پھر ان میگزینوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کے نیچے اتارنے لگا اور ابھی اتارنے نہیں پایا تھا کہ اسے پھاٹک کے دوسری جانب قریب ہی ایک اور اخبار فروش لڑکا نظر آیا جو اسی کی طرح میگزینوں کا گٹھا اپنے بازوؤں کے حلقے میں لئے بہت مضطرب کھڑا تھا۔ وہ وہیں تھم گیا۔ کھڑے کھڑے اس نے قہر آلود نگاہ اس نووارد لڑکے کے چہرے پر اُسے مرعوب کرنے کے لئے ڈالی۔ لیکن وہ اسے قطعی نظر انداز کر گیا۔ اس بے نیازی سے وہ تاؤ کھا گیا اور دھیرے دھیرے اس کے قریب جا کر جھڑکی دینے کے سے انداز میں بولا،

"بھگ بے بھگ یہاں سے۔"

"کیا ہے بے؟" اس نے منہ ٹیڑھا کرکے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔

"بتاؤں کیا ہے؟" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور اسے مرعوب کرنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے میگزینوں کے گٹھے کو بڑے زور سے کندھے پر جھٹکا دے کر کہنے لگا:

"میں کہہ رہا ہوں بھگ جا یہاں سے نہیں تو ..... "

"کیوں بھگ جاؤں؟ کسی کے باپ کی سڑک تھوڑی ہے"

اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ اور اس کے جواب سے وہ چراغ پا ہو گیا۔ وہ گذشتہ کئی سال سے یہاں رسالے فروخت کر رہا تھا مگر اس قسم کے جواب سے وہ چراغ پا ہو گیا۔ وہ گذشتہ کئی سال سے یہاں رسالے فروخت کر رہا تھا مگر اس قسم کے جواب اس نے کبھی سفارت خانے کے علاقے میں کسی اخبار فروش سے نہیں سنے تھے۔ لیکن اس کے تیور ہی اور تھے۔ اس کو دیکھ کر اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اور اخبار فروشوں سے کچھ مختلف ہے اور آسانی سے جانے والا نہیں معلوم ہوتا ہے لہٰذا اس نے آخری بار اُسے للکار کر پوچھا۔

"ابے میں کہہ رہا ہوں جاتا ہے یہاں سے کہ جوتے کھائے گا؟"

"جوتے کھلانے والا پیدا ہی نہیں ہوا" وہ نہایت ہی اعتماد سے بولا:

"ابے اکڑ رہا ہے؟"

"ہاں اکڑ رہا ہوں۔ اور اگر کسی کو کچھ کرنا ہے تو کر لے؟"

"سوچ لیو پھر"

"سوچ لیا"

"تو پھر لے سالے" اس نے اپنے غصے اور قہر کا اظہار کرنے کے لئے دھڑام سے میگزینوں کا گٹھا نہایت بے دردی سے زمین پر پھینک دیا اور تمام رسالے بکھر گئے ویسے وہ یہ جانتا تھا کہ میگزین انڈے تو ہیں نہیں کہ ٹوٹ جائیں گے۔ اور اس عمل سے وہ اخبار فروش کو خائف بھی کر سکتا تھا۔ مگر وہ ذرّہ بھر خائف نہ ہوا۔ اور جواب میں اس نے بھی اپنے میگزین بازوؤں کے حلقے سے نیچے پھینک دئے اور ہاتھ پھیلا کر سخت گیر لہجے میں بولا:

"آجائے جس نے ماں کا دودھ پیا ہے"

وہ یہ جواب سن کر غصے سے نیم پاگل سا ہو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے نووارد اس کے روزی کے ہاتھ کاٹنے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کی روزی کے بہتے دھارے کا رُخ اس کی طرف سے اپنی طرف موڑ دینے چاہتا ہو۔ وہ اُس کی اس حرکت اور ارادے کو لمحہ بھر کے لئے بھی برداشت نہ کر سکا۔ اور زخمی شیر کی طرح وحشیانہ طریقے سے گھونسا تان کر بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اور گھما کے ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ مگر نووارد نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس کے وار کو خالی کرتے ہوئے ایک جما ہوا گھونسا نیچے سے اس کے پیٹ میں دھنسا دیا اور اس کی سانس جیسے لمحہ بھر کے لئے رُک گئی۔ منہ سے تکلیف کے انداز میں ہائے نکلی اور آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور ابھی وہ سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ نووارد نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اوپر سے اس کی گردن پر دے مارے۔ وہ لڑکھڑایا اور لڑکھڑاتے ہوئے منہ کے بل گرنے والا تھا کہ نووارد نے نیچے سے اس کی ٹھوڑی پر ایک زوردار مکا جڑتے ہوئے اُسے سیدھا پاؤں کے بل کھڑا کر دیا۔ اور جب وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تو نووارد نے اس کے دہانے پر تابڑ توڑ چند پھر پور ہاتھ مارے اور وہ پیٹھ کے بل دور کچھ فاصلے پر جا گرا اور پھر پڑا رہا۔ اس دوران میں چند تماشبین ان کے اردگرد جمع ہو گئے تھے مگر لڑائی کے یک طرفہ زور اور جلدی ختم ہو جانے کی وجہ سے مایوس ہو کر منتشر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد سفارت خانے میں دوپہر کا وقفہ ہوا تو پھاٹک پر نووارد کھڑا بڑے فاتحانہ انداز سے ٹائم، نیوز ویک، لائف، پوسٹ اور اسی قسم کے دوسرے میگزین فروخت کر رہا تھا اور وہ کچھ فاصلے پر بیٹھا اپنا پیٹ پکڑے درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ سوجا ہوا تھا اور آنکھ کے نزدیک ہلکا سا زخم ہو گیا تھا۔ اس کے میگزین اس کے اردگرد بکھرے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اور اسے اپنی شکست سے جو شرمندگی محسوس ہو رہی تھی وہ اسے جسمانی تکلیف سے زیادہ اذیت ناک معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے نووارد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت بھی نہیں تھی جو پھاٹک پر کھڑا ادھر ادھر رسالے فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ کافی دیر تک کرب و ندامت کی شدید کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد آخر کار وہ ایک ہاتھ سے پیٹ کو دباتا ہوا اور دوسرے سے کمر سہلاتا ہوا اٹھا اور نظریں جھکائے دھیرے دھیرے چوکیدار کی طرف چل پڑا جو غالباً پھاٹک سے کچھ فاصلے پر دیوار کے سائے میں کرسی پر بیٹھا کافی دیر سے اُن کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اور جس کی مداخلت نہ کرنے پر اُسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ اُسے چوکیدار سے شکایت کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی تھی

مگر اس کے بغیر چارہ نہیں تھا اس لئے کہ نو وارد کو محض اپنی قوت بازو کے بل پر باہر نکال دینے کا اب وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"لالہ، دیکھو وہ لڑکا یہاں پہنچ تک گیا۔ میں نے منع کیا تو آگے سے لڑنے کو آیا۔ میں ہٹ آیا سوچا دفتر کا معاملہ ہے دھنگا فساد سے بدنامی ہوگی تم جری اسے منع کر دو کہ یہاں سے چلا جائے۔"

اس نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے اور درد پر قابو پاتے ہوئے چوکیدار سے کچھ اس لہجے میں کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ چوکیدار کے منہ میں اس وقت نسوار تھی جس کی وجہ سے اس کے اوپر نیچے کے ہونٹ آپس میں جڑے ہوئے تھے اور جبڑے کسی حد تک نیم دائروں کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور ٹھوڑی کو یوں نیچے کی طرف لٹکا رکھا تھا جیسے کسی نے زبردستی اسے ٹیلیفون کے آہنی کھمبے کی چوٹی پر بٹھا رکھا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور مسلسل نسوار کی چسکی کا سرور لیتا رہا جو لحظہ بہ لحظہ اس کے چہرے کے خط و خال تبدیل کر رہی تھی۔

"لالہ سن رہا ہے میں کیا کہہ رہا ہوں"۔ وہ کافی وقفے کے بعد پھر لالہ سے مخاطب ہوا۔ ابکے لالہ نے گردن کو دو تین دفعہ آگے پیچھے جھلایا اور ڈشت باندھ کے دور فاصلے پر پمپ کی طرح تھوک کا پرنالہ پھینک دیا۔ جس سے اس کا منہ کھل گیا جبڑوں کی پھونک نکل گئی اور ٹھوڑی اس طرح سیدھی ہو گئی جیسے وہ ٹیلیفون کے کھمبے کی آہنی چوٹی سے نیچے اتر آیا ہو۔

"کیا بولا تم" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"ارے میں کہہ رہا ہوں وہ لونڈا یہاں اخبار بیچ رہا ہے اُسے بھگا دیو۔" اس نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"بھائی وہ ہم سے پوچھا" لالہ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"ارے تم سے پوچھا" وہ بدک کر بولا "میں تم کو پانچ روپیہ ہفتہ دے رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ تم سے پوچھا ہے۔"

"وہ ہم کو چھ دیتا ہے" چوکیدار نے دھیرے سے جیسے اُسے تیر مار دیا ہو۔ وہ تڑپ اٹھا۔

"ارے لالہ دیکھو یہ بات اچھی نہیں۔ میں چار سال سے بیچ رہا ہوں اور ہمیشہ لین صاف رکھی۔ ذرا انصاف کرو۔"

"بھائی ہم کیا انصاف کرے ہمارے کو جو جاستی پیسہ دے گا ہم اس کو رکھے گا۔ ہر چیز کا دام جاستی ہو گیا ہے۔ اور تم چار سال سے پانچ روپیہ دے رہا ہے۔ ہمارے کو بھی تو پیسہ مانگتا ہے۔" چوکیدار نے جملہ مکمل کر کے ایک چٹکی اور نسوار کی منہ میں ڈال لی۔

اس پر ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ چپ کھڑا دیوانہ وار ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے پیٹ کی تکلیف اب رفع ہو چکی تھی اور نو وارد سے پٹ کر اس کی جو رسوائی اور ذلت ہوئی تھی اس کا احساس بھی جاتا رہا تھا اب اسے صرف اپنے مستقبل کی فکر تھی جو اسے خطرے میں معلوم ہوتا تھا اور اس کی روزی جیسے دامن چھڑا کر آسمان کی طرف اڑ جانے کے لئے پھڑپھڑا رہی تھی۔

"میں بھی تمہیں چھ دوں گا لالہ۔ اُسے بھگا دیو۔" وہ کچھ دیر سکوت کے بعد سوچ کر بولا۔

"وہ ہم کو سات دیتا ہے۔" چوکیدار نے کاروباری طریقے سے جواب دیا۔

"ارے یہ کیا بات ہوئی لالہ۔ تو ابھی کہہ رہا تھا چھ دیتا ہے ابھی کہہ رہا ہے سات۔"

"وہ ایسا بولا کہ جتنا تم دے گا اس سے ایک جاستی دیگا۔"

"ارے یہ تمہاری زبان نہیں ہے لالہ۔ تم مسلمان نہیں ہو۔" اس نے دل برداشتہ ہو کے رقت بھری آواز میں کہا۔

"خبردار کافر کا بچہ جو ہم کو ایسا بات بولا" چوکیدار چراغ پا ہو کر گرجا۔ "دوسرا بات ہم کو ایسا بولا تو ہم ایسی مار دے گا کہ تم چھ کر سے کی مار کو بھول جائے گا۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ مسلمان ہے! اور تم لوگ کے مافق بے دین نہیں —— ابھی یہاں سے چلا جا اگر زندگانی مانگتا ہے تو۔"

اور چونکہ وہ زندگانی "مانگتا" تھا لہٰذا چپکے سے واپس پلٹ آیا۔ اپنے بکھرے ہوئے میگزین سمیٹے۔ نفرت اور حسرت سے ایک نگاہ سفارت خانے کی بلڈنگ کو دیکھا اور پھر وہی نظر نو وارد اور چوکیدار پر ڈالتے ہوئے سڑک کے کنارے کنارے بغیر کسی منزل اور ارادے کے چل پڑا۔

چند روز بعد وہ ایک بہت بڑے زیر تعمیر ہوٹل کے سامنے کھڑا رنجیدہ صورت بنائے زمین کی سطح سے ہوٹل کی نامکمل چوٹی تک بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کا اپنا ہوٹل ہو اور اس کی تکمیل کا وہ نہایت بے چینی سے انتظار کر رہا ہو۔ سفارت خانے کا پھاٹک چھوٹنے کے بعد اس نے بے حد ٹھوکریں کھائی تھیں۔ شہر اور اس کے

مقامات میں گھوم گھما کے اس نے میگزین بیچنے کی کوشش بھی کی مگر وہ اس تعداد کا دس فی صد حصہ بھی نہ بیچ سکا جو وہ سفارت خانے کے سامنے بیچا کرتا تھا۔ شہر میں جتنے بڑے بڑے ہوٹل سفارت خانے اور اسی قسم کے دوسرے معزز و معقول دفاتر و مقامات تھے وہاں پہلے ہی سے کوئی نہ کوئی اخبار فروش جگہ سنبھالے موجود تھا اور جن کی موجودگی میں اس کا وہاں جانا محال تھا۔ لہٰذا اس نے آئندہ کے لئے اس زیرِ تعمیر ہوٹل کو منتخب کیا جس کی پانچ منزلوں کی چھتیں پڑ چکی تھیں اور اس نے سنا تھا کہ ابھی مزید کئی منزلیں اور بھی بنیں گی۔ اس ہوٹل کی تکمیل سے پہلے ہی سارا شہر بھر میں اسکی دھوم تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور بڑا ہوٹل زیرِ تعمیر تھا مگر اس کی اتنی شہرت نہیں تھی لہٰذا بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اس ہوٹل کو منتخب کیا تھا اور اب اس کی تکمیل کا اسے ہوٹل کے مالکان سے بھی زیادہ بے چینی سے انتظار تھا۔ ہوٹل کے چاروں طرف رستے بندھے ہوئے تھے۔ پاڑیں لگی ہوئی تھیں اور راج مزدور کیڑوں مکوڑوں کی طرح چھتوں اور دیواروں کے ساتھ چپکے ہوئے عمارت کو تکمیل تک پہنچانے میں مصروف تھے۔ نیچے زمین پر سامان ڈھونے والے مزدوروں کے سر پر ایک آدمی ہاتھ میں چھڑی لئے کھڑا مزدوروں کو کسی ریوڑ کی طرح ہانک رہا تھا۔ اس کا بازو چھڑی سمیت لگاتار فضا میں لہرا رہا تھا اور منہ سے بہت کرخت آواز میں کچھ مہمل جملے نکل رہے تھے جن کا مطلب صرف مزدوروں ہی کی سمجھ میں آرہا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے بڑی تفصیلی نظر سے ہوٹل کا جائزہ لیا اور اسے اس کی ہر چیز اچھی لگنے لگی۔ اس کے چاروں طرف بندھے ہوئے رستے اور پاڑیں۔ دیواروں اور چھتوں سے چپکے ہوئے مزدور اور مزدوروں کو ریوڑ کی طرح ہانکنے والا آدمی۔ سب پر اسے پیار آنے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ ہوٹل کی اصلی شکل اس نامکمل شکل سے کتنی اچھی ہوگی۔ اور یہ اصل شکل دیکھنے کے لئے اس کا جی تڑپ اٹھا اور اسے وقت کی سست رفتاری سے شکایت پیدا ہوگئی۔ وقت کتنا آہستہ چل رہا ہے۔ بلکہ رینگ رہا ہے۔ اور ہوٹل بنانے والے مزدور کتنے بے حس و حرکت ہیں۔ بلکہ ساکت و جامد ہیں۔ وہ وقت کی سست روی سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا اور تخیل کی ایک تیز اڑان کے ساتھ وقت اور اس کی ہر چیز کو پیچھے چھوڑ کر بہت دور آگے نکل گیا۔ کئی مہینے آگے جہاں ہوٹل بالکل مکمل تھا۔ راج مزدوروں کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ غالباً وہ کسی اور زیرِ تعمیر ہوٹل کے ساتھ مکھیوں کی طرح چپکے ہوں گے۔ مگر وہاں اب گرد کا ذرہ تک نظر نہیں آرہا تھا۔ دیواریں شیشے کی طرح چمک رہی تھیں اور ہوٹل کے گرد چاروں طرف صاحب لوگوں کی بڑی بڑی رنگین کاریں کھڑی تھیں اور وہ میگزینوں کا گٹھا اپنے بازوؤں پر سنبھالے دروازے پر کھڑا دھڑا دھڑ فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ اور صاحب لوگ جن کے ساتھ اپنی گورے گورے ملائم پنڈلیوں والی میمیں تھیں ہاتھ بڑھا بڑھا کر ٹائم، نیوز ویک، لائف، پوسٹ اور اسی قسم کے دوسرے رسائل خریدنے میں مصروف تھے اور اس نے گنتی کئے بغیر کتنے بے ترتیب نوٹ جیب میں جمع کر لئے تھے۔

"آہا یہ نوٹ......"

"ارے ہٹ بھئی راستے سے..." کسی نے زور سے اس کی پیٹھ میں کوئی چیز چبھوتے ہوئے کہا۔ وہ چونک گیا۔ اس کے تخیل کی اڑان ٹوٹ گئی اور وہ واپس اپنی سطح پر آن گرا۔ اس نے بدک کر پیچھے دیکھا تو ایک گدھا گاڑی والا لاٹھی کی نوک سے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اسے گدھا گاڑی اندر ہوٹل کے صحن میں لے جانی تھی۔ اس نے معذرت کے سے انداز سے گدھا گاڑی والے کی طرف دیکھا اور جلدی سے راستہ چھوڑ دیا۔ ایک سرسری نگاہ پھر ہوٹل کی دیواروں کے ساتھ چپکے ہوئے مزدوروں کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ ہوٹل کے پھاٹک میں کرسی پر اونگھتے ہوئے چوکیدار کی طرف بڑھنے لگا۔

"لالہ....." اس نے چوکیدار کے قریب پہنچ کر آہستہ سے آواز دی۔ چوکیدار نے کسی افیونی کی طرح آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

"لالہ یہ ہوٹل کب بنے گا؟" اس نے ملتجیانہ لہجے میں پوچھا۔

"تم ہوٹل کا چاچا ہے؟" چوکیدار نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"بات یہ ہے کہ لالہ کو..." اس نے چوکیدار کے برابر میں ہی زمین پر بیٹھ کر کہنا شروع کیا۔ "ہوٹل بڑی شوشان والا ہے جب بن جائے گا تو میں یہاں اخبار رسالے بیچوں گا روڈ پہ۔ تم جو ہفتہ مقرر کرو گے تمہیں برابر دوں گا پر خیال رکھیو کوئی دوسرا یہاں نہ بیچے۔"

"تم ہم کو پیسہ دے گا تو ہم دوسرے کو گولی مار دے گا۔ فکر کا بات نہیں۔ تم ہمیشہ ادھر بیچو۔" چوکیدار نے اسے بھرپور تسلی دی اور وہ مطمئن ہوگیا۔

"پھر یہ سرا بنے گا کب لالہ" اس نے پھر تجسس سے پوچھا۔

"ہم کو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ پانچ چھ مہینے سے جاستی نئیں لگے گا۔" چوکیدار نے اندازہ لگایا۔ "ٹھیکیدار کا منشی ہمارا پہچان والا ہے۔ ہم اس کو بولے گا وہ ٹھیکیدار کو بولے گا کہ کام ذرا جلدی ختم کرا دے۔"

"اللہ خوش رکھے لالہ تم تو بڑے جی دار آدمی ہو۔ آؤ ایک ایک کپ چائے پی لیں بے تُستر گرم پانی ہی تو ہے۔" اس نے چوکیدار کا ہاتھ پکڑا اور خیمہ میں مزدوروں کے چائے خانے کی طرف لے گیا۔ جہاں اصرار کر کے اس نے چوکیدار کو چائے کے ساتھ بند بھی کھلایا۔ اور پھر ہوٹل کی تکمیل تک دن ہفتے اور مہینے اس نے چوکیدار کے ساتھ اس طرح گھل مل کے گذارے کہ دونوں میں ناقابلِ شکست دوستی قائم ہوگئی وہ ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر کے روزانہ جو کچھ کماتا اس کا نصف حصہ چوکیدار کے ساتھ مل کر چائے پینے اور بند کھلانے میں صرف کر دیتا۔ اس یقین کے ساتھ کہ جب وہ ہوٹل کے پھاٹک پر میگزین بیچنے شروع کرے گا تو اتنی رقم ایک ٹھوکر سے کما لے گا۔

گذشتہ رات ہوٹل کا افتتاح ہو چکا ہے کسی بڑے وزیر نے کیا تھا۔ وہ رات گئے تک پھاٹک پر چوکیدار کے ساتھ بیٹھا چہل پہل سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ایسی پُر رونق رات اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اتنی بہت ساری روشنیاں جو آنکھوں کو چکا چوند کر دیں اور جو زمین کے سینے میں اتری ہوئی باریک سوئی کو بھی ڈھونڈ نکالیں اور ان روشنیوں کو وہ دیکھ کر بے حد خوش ہو رہا تھا اور پھاٹک سے آنے جانے والی حسین جمیل ملکی و غیر ملکی عورتوں کے لباس سے سینٹ کی نکلتی ہوئی خوشبو کی لپٹوں کو اپنی رگ رگ میں محسوس کر رہا تھا اور ہر ہوا کے جھونکے کو اس طرح سونگھتا تھا جیسے وہ گلاب کا پھول ہو۔

"کیا خوشبو آ رئی ہے لالہ" اس نے سرور میں جھوم کر چوکیدار کا ہاتھ دبا دیا تھا "اللہ قسم جندگی تو یہ لوگ گجار رئیے ہیں — مولا کی جات سلامت رکھے۔ عورتیں نئیں ہیں حوریں ہیں حوریں۔ جان پڑے ہے عطر کا گسل کر کے آئی ہیں!"

"تم پاگل ہے۔" چوکیدار نے ناک سکیڑتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا "یہ لوگ کے نخرا اُٹھرا پر نہ جا بھائی۔ یہ پلید لوگ ہوتا ہے ....؟"

"مارے باپ رے ....." اس نے ہنستے ہوئے ایک جھرجھری لے کر کانوں کو ہاتھ لگا دیا تھا۔ "کا بات کرے ہے لالہ تم نے تو سارا مجا کرکرا کر دیا۔" مگر اس نے جھوٹ بولا تھا اس کا مزا ذرا بھی کرکرا نہیں ہوا تھا وہ نصف رات تک جگ مگ کرتی رات میں چمکتے ہوئے چہروں زرق برق ملبوسات اور عریاں و نیم عریاں حقائق تمدن کی ان کیفیات کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ اور جب یکے بعد دیگرے کاریں وہاں سے روانہ ہونے لگیں تو اس وقت وہ بھی ہشاش بشاش گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو گئے تھے اور خدا خدا کر کے وہ عمارت تیار ہو گئی تھی جس کا ایک ایک بلاک اس نے گن ڈالا تھا اور اب صرف ایک صبح کا انتظار باقی رہ گیا تھا جہاں سے اس کی زندگی کا نئے سرے سے آغاز ہونے والا تھا اور اب وہی امیدوں سے بھری صبح اُسے مقناطیسی قوت سے ہوٹل کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں تازہ ترین میگزینوں کا گٹھا تھا جو آج ہی صبح اس نے ایک اسٹال سے نقد دام دے کے خریدے تھے۔

ہوٹل کے سامنے پہنچ کر ہوٹل کی سی حسین مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور وہ میگزینوں کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے کر پھاٹک کی طرف روانہ ہو گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جب وہ پھاٹک کے پاس پہنچا تو ایک باوردی پہرے دار نے اسے آگے بڑھنے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہاں کوئی چیز فروخت نہیں کی جا سکتی۔

"کیوں؟" اس نے حیرت اور تاسف کے ملے جلے لہجے میں پوچھا

"صاحب کا آرڈر یہی ہے۔" پہرے دار نے اُسے مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ "پھر یہاں کیا بیچو گے تم؟ یہاں تو ہر چیز موجود ہے۔ وہ دیکھو۔" اس نے پھاٹک کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور وہ جونہی سیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہی دم بخود ہو گیا جیسے اس کی روح پرواز کر گئی ہو۔ سیڑھیوں میں ایک بہت ہی خوبصورت بک اسٹال لگ گیا تھا۔ اور رنگ برنگے رسالے اور کتابیں ہوٹل کی سیڑھیوں کے اندر اور باہر سب طرف پھیلے ہوئے تھے جہاں ہر آنے جانے والا اپنی مرضی کا میگزین بڑی ہی آسانی سے دیکھ اور خرید سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ سوکھے ہوئے تنے کی طرح کھڑا رہا۔ مردہ جسم اور مردہ جان بن کے۔ چوکیدار نے اُسے دیکھا تو ہمدردی کا اظہار کرنے کے لئے اس کے پاس آ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے لالہ۔ یہ تو جُلم ہے، جُلم۔ کرے کوئی اللہ

(باقی ملاحظہ ۵۳ پر)

افسانہ:

"کوئی نہیں! کوئی نہیں!!"

محمد عمر میمن

انجمنِ خواتین کی ایک ادبی نشست کی صدارت کر کے جب وہ بوجھل قدموں سے گھر جا رہی تھی تو گیٹ سے کچھ اُدھر خالہ معصومہ کے گھر کی کھڑکی اسے کھلی دکھائی دی جس میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ کر باہر دبیز تاریکی کے سینے کو چیرتی ہوئی مدھم روشنی کا ہالہ سا بنا رہی تھیں۔

جانے کیوں، کھڑکی کے نزدیک سے گزرتے وقت اس کے قدم آپ ہی آپ رُک سے گئے۔ اندر سے چند جانی پہچانی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی باہر آ رہی تھی... اور یہ آوازیں ـــ جن میں استہزائی قہقہوں کا ملا جلا شور بھی تھا۔ اور ہلکی ہلکی مکھیوں ایسی مسلسل بھنبھناہٹ بھی، ایک مربوط آہنی حلقے کی مانند سرعت سے اس کی جانب لپکیں اور پل بھر میں اُسے اس طور پہ جکڑ کر رکھ دیا کہ وہ باوجود ایک اختیاری کوشش کے بھی ایک قدم آگے نہ بڑھا سکی۔

آوازیں تھیں "اے بھنّو! میری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا، اپنی بیگم حمید کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنی جوان جان لڑکی کو بالکل بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں نہیں۔ اس کی یہ بے راہی اپنے شوہر کے گھر میں تو شاید کبھی بھی لگتی، یہ ماں باپ کے گھر میں یہ کھُل کھیل رہی ہے۔ ڈھلتی عمر ہے، پر ماں کو تو دیکھو جیسے کچھ ہوش ہی نہیں۔ کان پر جوں بھی کاہے کو رینگے گی، پھر اس دن طبیعت ہی ہری ہو جائے گی جب لاڈلی ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگوا دے گی"

معصومہ کے گھر آئی ہوئی محلہ بھر کی عورتوں میں سے شاید کسی نے لب کشائی کی تھی۔

"مگر بیگم حمید شادی کیوں نہیں کر دیتیں اس شتر بے مہار کی۔ ہیں، معصومہ؟"

"میں کیا جانوں نوج ـــ بس تمہاری یہی باتیں تو مجھے زہر لگتی ہیں" معصومہ تلخ لہجے میں بولی "محلہ بھر میں نگوڑی اللہ ماری میں ہی تو رہ گئی ہوں نا۔ میں نے ہی تو ٹھیکہ لے رکھا ہے نا جیسے کہ معلوم کرتی پھروں اس کی ماں کا کیا ارادہ ہے!"

"اے ہے بوا ـــ ذری سی بات کیا کہہ دی کہ ادھم مچا دیا۔ تم سے بات کون کرے۔ ہاں نہیں تو ـــ اب لو تمہیں تو اُن کے ہاں آتی جاتی رہتی ہو، ـــ تمہیں نہ معلوم ہوگا تو کسے معلوم ہوگا۔ ذری پوچھ لیا تو اس میں ناراض کیوں ہوتی ہو"

"اے نا بہن! جائے میری جوتی! توبہ ہی بھلی۔ ابھی جاؤں تو بیچ بازار سر پہ سو جوتیاں لگوا دینا۔ ذری اس دن اتو میاں کو ایسا بخار چڑھ آیا تھا کہ اترتا ہی نہ تھا۔ بڑی تلاش کی مگر کمبخت نہ ملا۔ جانے زمین کھا گئی تھی کہ آسمان نگل گیا تھا۔ تمہارے یہاں منّے کو بھجوایا تو معلوم ہوا گھر پہ نہیں ہو، بس تب مجبور ہو کر ذری وہیں چلی گئی تھی۔ تھرما میٹر لینے اور گئی بھی کون گھنٹہ دو گھنٹہ کو تھی۔ بس یہ گئی اور تھرما میٹر لے فوراً الٹے پاؤں لوٹ آئی۔ ہائے نوج مجھے کیا پڑی کہ اس موئی کے گھر جاتی پھروں ـــ ہاں نہیں تو" معصومہ خالہ نے اپنی پوزیشن کی وضاحت فرمائی۔

باہر ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ اور گزرتی رات فضا کی بوجھل پلکوں میں سمائی جا رہی تھی۔

"ہائے اللہ ـــ! جب دیکھو یہی مصیبت۔ ناطقہ بند کر دیا ہے۔ تو یہ ہے بھئی جہاں چار عورتیں مل بیٹھیں گی دوسروں میں عیب ڈھونڈیں گی۔ زبان تو دیکھو۔ کترنی کی طرح چبڑ چبڑ چلی ہی جا رہی ہے۔ ہنہ ـــ" اس نے مارے نفرت کے لب سکیڑ لئے۔ "نہیں کرتے شادی ان کی بلا سے۔ یہ کیوں ہوئی جا رہی ہیں تو یلی دوسروں کے غم میں خدائی فوجدار کہیں کی۔ خدا بچائے ان جاہل عورتوں سے صاحب! ہمیں نہیں کرنی شادی وادی۔ پھر... !" اُس نے دل ہی دل میں کہا:

اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ محلہ والیوں سے تو اس سے زیادہ کی امید کرنا ہی نری حماقت تھی۔ پر یہ معصومہ خالہ! کتنی چھوٹی کتنی لغو اور اوچھی ہیں۔ ابھی پرسوں ہی امی کہہ رہی تھیں اگر بیٹھیں تو

گھٹنوں اٹھنے کا علم نہ لیا دوپہر کا کھانا، پھر سہ پہر کی چائے پیئے بغیر ٹلنے کا نام ہی نہ لیا۔ جب دیکھو امی کے گھٹنوں سے لگی بیٹھیں ہیں اور اب یوں معصوم بن رہی ہیں، جیسے ان کے سوا اب کوئی شریف، نجیب کا ہے کو زمین پر رہ گیا ہے۔ اسے تو معصومہ خالہ سے ایسی حماقت کی امید نہ تھی۔

"دنیا کے لوگ ہیں اپنی معاشرت اور انفرادی کردار کی تمام تر خامیوں کے ساتھ جیتے ہیں۔ چلو ہٹاؤ۔ کون پروا کرے ان کی آخر کہاں تک میں ان کی زبان روکتی پھروں گی۔ یہ میرا قطعی انفرادی فعل ہے، نہیں کرتی شادی۔ انہیں کیا۔"

وہ اپنے خیالات کے تانے بانوں میں الجھی، مستغرق بڑھتی جارہی تھی۔ رات کافی بیت چکی تھی یہی کوئی ساڑھے دس گیارہ کا عمل تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں نقرئی پینٹ میں رنگا ہوا آہنی گیٹ بے طرح جگمگا رہا تھا۔ اس نے دھیمے سے اُسے دھکا دیا اور بنگلے کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ نیم دائرے کی صورت میں پورٹیکو تک جاتی ہوتی سرخ سرخ بجری والی سڑک پر ریت کے ذرے اس کے سینڈلوں تلے آکر شور مچاتے رہے یکلخت وہ سڑک سے لان میں آگئی جہاں خنک گھانس کی پلکیں شبنمی ہو رہی تھیں۔ اس نے سینڈل اتار کر ننگے پیروں سے گھاس کی اس نم آلود خنکی کو محسوس کیا۔ ہلکی ہلکی فرحت بخش ٹھنڈک کی مدھم مدھم لہریں اس کے سارے جسم میں دھیمے دھیمے سرایت کرنے لگیں۔ ایسا کرتے ہوئے اسے بڑا سکون ملا۔ اس نے اپنی نیند کے نشے سے بوجھل گلابی آنکھیں بند کرلیں اور سب کچھ بھول کر اس ہلکی ہلکی تازگی بخش خنکی کے زیرِ اثر چند لمحات کے لئے ساکت وصامت کھڑی ہوگئی۔ "ہائے اللہ یہاں کتنی فرحت بخش تازگی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ اور کچھ دیر پہلے سنی ہوئی ان مدھم مدھم سرگوشیوں، مکھیوں کی سی مسلسل بھنبھناہٹ اور استہزائیہ قہقہوں کی ساری تلخی کو جس سے اس کا سارا "موڈ آف" ہوگیا تھا اور اس کے وجود میں اکتاہٹ اور بدمزگی سی پیدا ہوگئی تھی۔ بالکل فراموش کردیا — پھر وہ سینڈل پیروں میں ڈال کر پورٹیکو کی طرف بڑھ گئی۔ برآمدے کے دائیں سرے والے کمرے کی بتی ہنوز جل رہی تھی۔ وہ سیدھی کمرے میں چلی گئی۔ امی ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ اور آنے والی سردی کے پر زور اہتمام کے طور پر اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے دبیز اونی سوئٹر بن رہی تھیں۔ قالین پہ اُون کا گولا اِدھر اُدھر حرکت کر رہا تھا۔ ددر ایرانی بلی اپنے تمام فاختئی رنگ لیے نرم نرم بالوں میں سر چھپائے اونگھ رہی تھی۔ بجی صوفے پہ چت تھا اور ڈبیزی امی کی نرم نرم ممتا سے گرم زانوؤں پہ سر دیئے۔ ہلکے ہلکے نیند کی پُرسکون وادیوں میں گم تھی۔

"شہنی — یہ کیا؟ اتنی رات گئے — ؟"

امی نے سوئٹر بنتے بنتے یکلخت سلائیاں روک لیں اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔

"امی — میں تو مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ کیا کروں۔ یہ لوگ پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"شہنی بیٹی — میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارے بھلے کے لئے ہی کہہ رہی ہوں۔ اس پہاڑ ایسی زندگی کو بلا کسی ہمدرد ساتھی کے بھلا کس طرح تن تنہا گزارو گی بیٹی، تم نے سوچا اس کے بارے میں۔ آج ننہال ماموں کی بیوی اپنے فرید کا رشتہ لے آئی تھیں۔ میں بات کروں نا؟"

"ہائے اللہ امی — آپ کو تو کوئی وقت ہی نہیں سوجھتا جب دیکھو یہی تذکرے لئے بیٹھی ہیں۔ بھئی اس سے بگڑتا ہی کیا ہے۔ ابھی نہیں امی — پلیز — مجھے سخت نیند آرہی ہے۔ شب بخیر۔" وہ بڑی بیزاری سے بولی اور فوراً اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اسے ڈر تھا، وہ ایک لمحہ بھی رُکی تو امی یہی تذکرہ لے بیٹھیں گی جس کو سنتے سنتے اس کے کان پک گئے ہیں۔

بے چاری امی کے لبوں سے ایک آہ نکل کر رہ گئی۔ شہنی کا برقع اتروانے کے سلسلے میں ہی انہیں کون سے کم پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ اپنے پرائے — بزرگوں پرکھوں، رشتہ داروں سبھی نے انہیں، آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ "جوان بیٹی کو بدنام کرنے کا ارادہ ہے کیا۔" تایا ابا صدیوں کی روایتوں کو یوں اچانک متزلزل پاکر جھنجھلا کر کہہ اٹھے تھے۔ اور مشرقی کمروں میں امی پہروں اس جملے کے تیز، نوکیلے، جگر میں پیوست ہوجانے والے پیکان کی تمام تر سوزش کو سینے پر لئے، آشفتہ سر، نیم دیوانی، باؤلی سی روتی رہی تھیں — "ہائے اللہ — انہیں اتنا بھی رحم نہ آیا یہ کہتے وقت۔ کون ماں ہوگی ایسی" سسکیاں ڈوب ڈوب کر پھر ابھرتی رہیں، بات ہی ایسی تھی۔

تایا ابا سے رشتے ناطے کی ڈور تو اسی دن ٹوٹ گئی تھی۔ بی شہنی نے برقع کیا اُتار پھینکا تھا سارے خاندان کی ناک کٹوا دی تھی، صدیوں کی قائم کردہ روایات کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اپنے پرائے امی کے جگر کو حسب استطاعت چھید کر خاموش ہو بیٹھے

تھے اور خان بہادر کے گھر کی اس تبدیلی کو بحالت مجبوری قبول کر لیا تھا۔ لیکن موقع ملتے ہی وہ پھر اپنے تمام زہریلے تیروں سمیت آن پہنچے، اور طنز میں بجھے جملوں کی بھرمار سے امی کو خوب خوب آڑے ہاتھوں لیتے۔ اور اب تو اس قسم کے جملے سن سن کر بے چاری امی کے کان پک گئے تھے۔

"لڑکی دن بدن آزاد اور بد اطوار ہوتی جا رہی ہے۔ ہائے نوج لو اور لو ایسی آزادی بھی کس کام کی اس کے برابر کی لڑکیاں تو اب تک تین تین چار چار بچوں کی مائیں بن گئی ہیں اور ایک یہ ہے کہ شادی کا نام ہی نہیں لیتی۔ چھی چھی۔"

اور جو ذرا شاطر قسم کی تھیں اور جنہیں لگائی بجھائی میں ازلی کیف ملتا تھا وہ یہ سب کہنے سے بھی نہ چوکتیں۔

"ہم اندھے تھوڑی ہیں۔ جوان لڑکی ہے اور پھر یہ فرنگی چلن، یہ جوہر روز اتنے سارے غیر مردوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے تو اسے کیا کہیں، اگر ہر طرح کی آزادی ہے تو پھر شوہر اور گھرداری کا طوطا کون پالے۔ شوہر بھلا اسے کیوں اتنی آزادی دینے لگا!"

اور امی انہیں سن سن کر مشرقی گھروں کی سیلی ہوئی فضاؤں میں دروازے بند کئے پہروں پڑی سسکتی رہتیں۔

"ہائے انہیں کون سمجھائے! ان کی زبان سے دوسروں کے جذبات کس طرح مجروح ہوتے ہیں۔" تن تنہا امی جان ان تیزابی جملوں کو سہتی رہتیں۔ مارے غم کے ہونٹ کاٹ لیتیں۔ خون پیتی رہتیں۔ رہے خان بہادر تو انہیں اس قسم کے گھریلو معاملات سے کب سروکار تھا۔ ان کے خیال میں تو لڑکی جو چاہے اپنی مرضی سے کرتی پھرے۔ بس شام کو لان پر آہنوسی تپائی پر اُن کے اور ان کے دوستوں کے لئے نقرئی پیالیوں میں کافی مل جایا کرے۔ یا دن بھر ڈرائنگ روم کی پر اسرار خاموشی میں بیٹھے، ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں، کتابیں پڑھی جائیں... اس سے زیادہ اپنی زندگی سے انہیں کچھ مطلوب نہ تھا۔

کتنی ہی بار سمجھایا ـــ پرہاں تھیں، شہنی کے اصرار نے ہر بار خاموش کر دیا۔ وہ شادی نہیں کرے گی امی سمجھاتے سمجھاتے ہار گئیں۔ اب تو آنسو ہی ان کا سہارا تھے۔

انہیں خیالات میں غرق وہ سوئٹر کے پھندے الٹ پلٹ کر گئیں۔ آنسو آنکھوں میں پلکوں کی نرم نرم چلمن سرکائے قطار اندر قطار آ گئے۔ انہوں نے سوتی ہوئی ڈیزی کو بے اختیار چھاتی سے بھینچ لیا۔ "گڑیا بیٹی ـــ تُو تو مجھے یوں دکھ نہ دے گی نا؟" انہوں نے اٹھ کر ٹیبل لیمپ کا نیلگوں بلب گل کر دیا۔ اور وہیں اپنے خیالات کی تمام المناکیوں کو ذہن میں سموئے ننھی ڈیزی کو سینے سے چمٹائے قالین پر لیٹ گئیں۔

جب وہ بوجھل سی اپنے کمرے میں پہنچی تو نیند اس کی آنکھوں کے کناروں میں بری طرح بھر چکی تھی اور تھکن سے ان میں شہابی ڈورے پھیل گئے تھے۔ اس نے کسمسا کر پہلو بدلا اور جلد ہی نیند سے ہم آغوش ہو گئی۔ صبح پھر اسے ایک جلسے میں جانا تھا ـــ!

جب کافی دن چڑھ آیا اور کھڑکی کے شیشوں سے سورج کی گرم گرم کرنیں اس کے چہرے پر آگ برسانے لگیں تو وہ جاگ گئی۔ تکیہ پر کمر ٹیک کر اس نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل میں آویزاں بیضوی آئینہ پہ یونہی ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر اپنی ہیئتِ کذائی کا جائزہ لیا۔

"اوہ" ـــ انگڑائی لیتے ہوئے وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ "عجیب بے ہنگم زندگی ہے یہ بھی۔ صبح جلسہ شام میٹنگ۔ بھاگ دوڑ۔ اِدھر جاؤ۔ اُدھر جاؤ ـــ صبح سے شام تک اور بسا اوقات رات گئے تک ـــ ان جلسوں کو اٹینڈ کرتے کرتے ایک ایک ہڈی بول جاتی ہے۔"

وہ اکتائی ہوئی سی تھی مگر اسے یاد آیا۔ اب سے صرف چند سال قبل ہی کیا اس کے دل میں شہرت اور نام حاصل کرنے کی تمنا انگڑائیاں نہ لیتی تھیں۔ اور مشہور بننے کے لئے اس نے کیا کچھ نہیں کیا۔ رات گئے تک پڑھنا، ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا۔ کس قدر جاں گسل کاوشوں اور مسلسل عرق ریزی کے بعد کہیں جا کر وہ اس موجودہ حیثیت تک پہنچ پائی ہے، مگر جب اس کی یہ آرزو پوری ہو گئی اور دنیائے ادب اس کو ایک مشہور اور باشعور ادیبہ کی حیثیت سے جان گئی تو یہ کیا؟ بجائے موجودہ زندگی پر قانع ہونے کے وہ کچھ بیزار اور اکتائی ہوئی سی نظر آتی ہے ... ہونہہ! ہونہہ!

"سچ ہے" سلیپر پاؤں میں ڈالتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ "آرزو کی تکمیل، آرزو کی موت ہے!"

اتوار کا خوشگوار دن تھا۔ مگر اس کی خوشگواری میں اس کے لئے اب کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ یہ دن تو اس کے لئے سب سے مشغول دن تھا۔ صبح سے شام تک دنیا بھر کی ادبی محفلوں میں اس کی شمولیت اک جزو لاینفک بن چکی تھی۔ اور اگر کبھی وہ انکار بھی کر دیتی تو مجلس انتظامیہ کے اراکین دنیا بھر کی خوشامدیں کر کے اسے تنگ کر دیتے کہ پھر اسے ہاں کہتے ہی بنتی۔ "عجیب زندگی ہے یہ بھی،" ... وہ انہی خیالات

میں غرق رہی پھر غسل خانے میں جاکر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا طبیعت کی ساری گرانی سستی اور کسلمندی ٹھنڈے پانی کے ساتھ بہہ گئی۔ اور وہ تازہ دم ہو کر ناشتہ کی ٹیبل پر جم گئی۔ ناشتہ کرکے گھنٹہ بھر امی سے باتیں کیں اور پھر گھر سے نکل گئی — راستہ بھر اس کے ذہن میں کل شب کے سنے ہوئے خالہ معصومہ اور ان کے گھر آئی ہوئی عورتوں کے جملے گردش کرتے رہے۔ اگر، اگر کبھی وہ شادی کرلے تو...؟ نہیں نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا وہ شادی نہیں کرے گی، اس سے اس کی تمام فکری اور ادبی صلاحیتوں کا خون ہو جائے گا۔ اس کے گھٹنوں سے لگے بچے اسے کچھ نہ کرنے دیں گے۔ صبح سے شام تک بچوں کی دیکھ بھال "اُن" کی خدمت! گھر کی دیکھ بھال بھلا کیسے کرسکے گی اور نہ ذہن میں پھوٹتے ادبی شاہکاروں کے سوتوں کی نکاسی کا انتظام کرسکے گی نہ — محض زندگی ہی تو ٹھوس، جامد مجرّد حقیقت ہے باقی تمام اقدار روایات اور رسوم اضافی ہیں۔ کیوں نہ ایک دائمی حقیقت کا پیچھا کیا جائے، کیوں نہ اضافی اقدار کو چھوڑ کر منبع اور سرچشمے ہی کو اپنایا جائے" — وہ خود فراموشی کے عالم میں جانے کیا کیا سوچتی رہی، کیسی کیسی تصویریں اس کے ذہن نے بنائیں۔ اور بنا کر بگاڑیں، پھر بنائیں پھر بگاڑیں۔ اس کے تصوّر میں امّی کا چہرہ گھوم گیا۔ ان دو محبت چھلکاتی آنکھوں کا فسوں، مشرقی کمروں کی چپ چاپ تنہائیوں میں دھیمے دھیمے سلگتی ہوئی امّی کا سوگوار چہرہ — اف اس نے اس ماں کو کتنے غم دیئے ہیں۔ کتنے غم دیئے، مگر وہ کیا کرے، وہ کیا کرے وہ شادی نہیں کرسکتی، — اس سے وہ مرجائے گی — وہ مرجائے گی —!

وہ عجیب سی شام تھی، گھر جب وہ لوٹی تو اس کے چہرے پر عجیب یاس انگیز افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔ عجیب سی مایوسی — ایسی مایوسی جو زندگی میں یکایک کسی چیز کی کمی کے احساس سے ہونے لگے۔ کسی عزیز شئے کے چھن جانے سے ہو یا نرم ملائم جذبوں کو ٹھکرا کر۔ امّی نے اس کی آنکھوں میں جب ان گہرے سایوں کو دیکھا تو کہا:

"کیوں شہنی — کیا بات ہے؟ جی تو ٹھیک ہے نا!"

"کچھ نہیں امّی — بس ذرا طبیعت بوجھل ہے"۔ اور وہ کچھ اور کہے سنے بغیر چل دی۔ اپنے کمرے میں جاکر اس نے دروازے بند کرلئے — اور نڈھال سی ہو کر بستر پر گر پڑی۔

اس کے دماغ میں ہلچل سی مچی تھی۔ اسے آج اپنے خیالات کا، اپنے نظریات کا خون ہوتا نظر آیا تھا۔

دو لکڑی کی پتلی پتلی بیساکھیوں کے درمیان لیڈی محمود کا لٹکتا ہوا، مفلوج وجود — اس کے ذہن میں شام کی دعوت کا منظر گھوم گیا۔ پکے ستھرے چکنے ٹائل فرش پر لیڈی محمود کی بیساکھیوں کی ٹک ٹک۔ اسے یوں محسوس ہوا اب اس کا ذہن فرش ہے۔ جس پر یہ بوجھ، یہ آوازیں دھیمے دھیمے ضربیں لگا رہی ہیں۔

دو بیساکھیوں کے درمیان اس لٹکتے ہوئے مفلوج وجود سے اسے ہمیشہ محبت رہی تھی۔ اس نے اس مفلوج زندگی کے بارے میں غور بھی کیا تھا۔ لیکن آج تو عجیب بات پیش آئی تھی... دعوت میں جب مہمانوں نے میوزیکل چیئرز کھیل کی خواہش کا اظہار کیا تو یکلخت لیڈی محمود کے چہرے پر اپنی محرومی کے ماتمی رنگ پھیل گئے، گہرے سیاہ رنگ! ان کی آنکھوں میں درد بھری تنہائیاں اُمڈ آئیں۔ اور اس نے دیکھا دو موتی کانپ کر ان کے دامن میں بھی جذب ہو گئے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ لیڈی محمود کے شوہر بھی وہیں کھڑے تھے اور اپنی بیوی کی اس متغیر حالت کو دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھے اور اپنی مفلوج بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر انہیں بہت دیر تک تکتے رہے، ان کی آنکھوں میں اعتماد تھا اور ان کی آنکھیں ان دو مایوس نظروں کو خوش رہنے کا درس دے رہی تھیں — یکایک وہیں ستون سے لگے کھڑے کھڑے اسے محسوس ہوا جیسے محمود کی نگاہیں ان مایوس نظروں سے کہہ رہی تھیں،

"تم جی چھوٹا نہ کرو جی! اپنی مشترکہ زندگی میں میں نے چند بہت پیاری سی شامیں تمہارے ساتھ گزاری ہیں اور چند بہت دل آویز چمکیلے دن بھی تو — اور انسان کی ساری زندگی میں نہیں چند لمحات کی مسرت کے علاوہ کیا ہوتا ہے۔ جلد یا بدیر ہر انسان ان لمحات کو پالیتا ہے۔ اور میں نے یہ لمحات پالئے ہیں، اس سے زیادہ کی خواہش تحصیل حاصل ہے۔ یہ چند لمحات ہی تو سرمایۂ حیات ہوتے ہیں۔ ایک عابد کی عبادت کا مآل جب برسوں کی عبادت کے بعد صرف چند لمحات کے لئے احساس کی اس سرمدی کیفیت میں اس کے دل کے خوابیدہ منتظر دریچے کسی الہامی روشنی سے وا ہو کر منور

ہو جاتے ہیں۔ میں بھی تمہاری معیت میں اپنی زیست کے یہ لمحات گزار گیا ہوں، اور اب اس سے زیادہ انسان کس چیز کی خواہش کر سکتا ہے؟ تم ناحق رنجیدہ ہوتی ہو، میرے لئے تم اب بھی حسین ہو، اور اب بھی بسا اوقات تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکنے سے اس معبد کا گمان ہوتا ہے جس کا آہنی دروازہ کسی شدید آوار جھونکے سے کھل گیا ہو اور عبادت گاہ کی تمام جھلملاتی روشنیاں سامنے آگئی ہوں.... ہم یہیں بیٹھیں گے اور ان انسانوں کو کھیلتے دیکھ کر ان کی مسرتوں میں ان کے جلیس، ان کے شریک بنیں گے"!

کتنی مٹھاس تھی، ان دونوں کی نظروں میں! محمود کا پیام آنکھوں ہی آنکھوں میں بوجھل مفلوج وجود نے پڑھ لیا اور اب وہ گہری مایوس آنکھیں اعتماد چھلکا رہی تھیں۔ وہ مبہوت ان آنکھوں کو دیکھتی ہی رہی۔ اس کے خیالات اس کے نظریات اس کی نظروں کے آگے ڈھلنے لگے، اور ڈولتے ڈولتے عدم کی طرف لوٹ گئے جیسے وہ محض پرچھائیاں تھے، ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ اور تب وہ مضطرب دل اور لڑکھڑاتے قدموں سے بغیر رُکے لوٹ آئی تھی... اب بھی اس کے ذہن میں وہی منظر گھوم رہا تھا۔ اسے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی، ـــ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ شام کے سائے بہت دیر ہوئی لرز لرز کر ڈوب چکے تھے اور اب تو شب کی گہری تاریکی مسلط تھی، وہ کھانے پر بھی نرگسی تکیوں میں منہ دیئے وہ مستقل کچھ سوچے جا رہی تھی۔

پلنگ پر لیٹے لیٹے اس کا سارا بدن احساس تنہائی کے کسی انجانے درد سے چٹختا رہا۔ آج پہلی بار، جانے کیوں اسے اپنی زندگی انتہائی خشک اور اجاڑ محسوس ہوئی، اور پہلی بار اپنے بے کیف دنوں اور راتوں کی طویل سنسان تنہائیوں کا احساس ہوا۔ پلنگ پر ادھر ادھر بے چینی سے کروٹیں بدلتے بدلتے وہ تھک گئی، اس کا ذہن الجھا الجھا مضطرب تھا۔ اس نے کسمسا کر پہلو بدلا اور دھیرے سے پلنگ سے اتر کر بائیں باغ کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف نکل آئی۔ لوہے کے سرخ ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر وہ باغ میں دودھیا چاندنی میں نہائی کیاریوں کو تکنے لگی۔ کیاریوں کے بیچ میں اس نے تنہا دھیمے دھیمے جلتے ہوئے سرخ گلاب کو چاندنی میں سر جھکائے کسی سوچ میں غرق دیکھا۔ سرخ گلاب! ہائے یہ کیوں، دھیمے دھیمے، جیسے اپنی ہی آگ میں، جل جل کر سُرخ ہو رہا ہے۔ اُسے کیا غم ہے! کہیں گلاب اور وہ دونوں ایک ہی غم کے مارے ہوئے تو نہیں؟ تنہا اکیلے اداس۔ اس نے ہولے سے بوجھل پپوٹوں کو پتلیوں پر گر جانے دیا۔ اور ادھ کھلتے ہوئے، پرانی یادوں کے جھکتے ہوئے راستوں پر، بھٹکنے لگی، ـــ اس کے سامنے ماضی تھا ـــ اور یادیں!

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ دن ڈھلے جب وہ گھر آرہی تھی تو صدر میں کسی سینما کے نزدیک ہی اس نے ایک نوجوان جوڑے کو خوش خوش جاتے دیکھا تھا بس وہ ان کی آنکھوں کو گھورتی رہ گئی تھی۔ وہ آنکھیں جو اس سنجوگ پر مسکرا رہی تھیں، ایک دوسرے میں جھانک جھانک کر اپنے تمام ملائم نازک کچے کچے کلیوں ایسے شاداب جذبوں کی تکمیل ڈھونڈ رہی تھیں۔ عورت کی آنکھوں میں عجیب، محبت کی مدھم مدھم آنچ تھی۔ نرم نرم ملائم ملائم جذبے جو بے اختیار ان کی آنکھوں میں منعکس ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ اتنے اعتماد سے مرد کی آنکھوں میں اپنے جذبوں کی تکمیل تلاش کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "تم جو ایک مرد ہو، ــ میرے لئے سب کچھ ہو، تمہیں میری ضرورت ہے نا؟ مجھے بھی ہے! ہم دونوں اپنی خوشیاں اپنے سارے دکھ درد آپس میں بانٹ لیں گے"۔ اتنا یقین، اتنا اعتماد، بس وہ تو مسلسل اسے تکتی رہی، اسے وہ جوڑا بہت مسرور دکھائی دیا تھا جو ہنسی خوشی زندگی کی پرپیچ وادیوں ایک دوسرے کے سہارے بڑے یقین سے آگے بڑھ رہا تھا..... اور وہ اجنبی بالکل غیر ارادی اور غیر اختیاری طور پر اس مسرور عورت سے ٹکرا گیا تھا اور اس ہلکی سی ٹکر سے اس کا پرس دور جا پڑا تھا۔ یکایک تیزی سے اس کا شوہر آگے بڑھا اور پرس اٹھا کر پھر ان ملائم نازک ہاتھوں میں تھما دیا۔ عورت کے لبوں پر ایک طویل چمکیلی لبریز محبت مسکراہٹ رینگ گئی، دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ دونوں پھر ایک دوسرے میں اپنی تمام خوشیوں کی تکمیل تلاش کرتے مست مست آگے بڑھ گئے۔ جیسا ان کا سب کچھ مشترک تھا۔ ان کا ہر راز، ہر غم ہر خوشی ہر بات۔ وہ جانے کیا سوچتی رہ گئی۔

مگر یہ کیسے خیالات ہیں جو آج اس کے ذہن میں گھوم پھر کر آرہے ہیں، اس نے آج سے پہلے تو کبھی اس زاویئے سے نہیں سوچا تھا۔ یہ کیا بات ہے! یہ کیوں ہے؟!

اور اس دن جب وہ پروفیسر احمد رمیش کو خط پوسٹ کرنے صدر پوسٹ آفس گئی تھی تو ٹکٹ کے لئے کیوں کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں دکھنے لگی تھیں "ہائے اللہ توبہ! آج یہ عورتیں بھی تمام کام دھندہ گرہستی چھوڑ کر ٹکٹ لفافے خریدنے آگئی ہیں" لمبی قطار کو کائی دیر تک سرکتے نہ پا کر وہ تقریباً جھلا کر اپنے آپ سے بولی تھی۔ "جلدی کیجئے نا بھئی، کیا بیٹھے اونگھ رہے ہیں؟" مارے جھنجھلاہٹ کے اس نے دور ہی سے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو جلد کام کرنے کی تاکید کی تھی، اور وہ عجیب خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا تھا:

"محترمہ! بہت جلدی میں ہیں! اپنا لہجہ درست کیجئے"

وہ خجل سی ہو کر رہ گئی تھی، اتنے سارے آدمی تھے وہاں! ٹھیک ہے وہ اس لئے تو نہیں پیدا کی گئی کہ گھنٹوں کیو میں اپنے نازک بدن کو تکلیف دئے کھڑی رہے۔ اور وہ جو عورت کونے میں بڑے اطمینان سے کھڑی تھی۔ نجانے کیوں اسے اتنا مطمئن دیکھ کر اسے اپنی محرومی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ اس کا شوہر ابھی ابھی اسے کونے میں کھڑے رہنے کی ہدایت کر کے اطمینان سے لفافے وغیرہ خریدنے لائن میں شامل ہو گیا تھا ـــــ وہ اس سے یہ کہہ کر آیا تھا "دیکھو! تم جو اتنی پیاری سی ننھی منی گڑیا ہو تو اس لئے نہیں کہ سارا دن کیو میں کھڑے کھڑے گزار دو، تمہاری نازک ٹانگیں اتنی محنت کے لئے نہیں بنی ہیں۔ تم ٹھہرو میں یہ سب کام کر لوں گا۔ اس کے بدلے مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ بس رات کو دھیمے دھیمے میرے تھکے ماندے بوجھل پپوٹوں پر اپنی ملائم انگلیاں پھیر دینا" اور اب وہ کونے میں کھڑی ملائم ملائم محبت بھری نظروں سے اس ہستی کو دیکھے جا رہی تھی، جو اس کی زیست کی تکمیل تھی۔

ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے اسے اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ ان میں چبھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے کہنیاں وہاں سے ہٹا لیں اور اپنے دکھتے ہوئے جسم کو پھر پلنگ پر ڈال دیا۔ پھر بھی سکون نہ ملا تو اس نے گیلری میں جا کر بلا ضرورت گلاس بھر کر چند گھونٹ یخ پانی کے قطرے حلق میں ٹپکائے اور پھر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

آسمان پر ماہ نیم ماہ کا مہجور شہزادہ بادل کے ایک دبیز سرمئی ٹکڑے سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ فطرت کو بھی ایک ساتھی کی تلاش ہے اسے محسوس ہوا کل جب تنہا گلاب کے نزدیک ہی کہیں دوسرا گلاب کھلے گا تو پہلا گلاب ساتھی کو پا کر اپنی طویل گمنام سوچوں کے حصار سے نکل کر آنے والے کا استقبال کرے گا۔ لے دے کر اپنی زندگی کے واقعات یاد آ رہے تھے اس نے تو کسی سے محبت نہیں کی، اس کا دل تو کسی کے لئے نہیں دھڑکا، اس نے پہروں چوکھٹ سے لگ کر کسی آنے والا کا پلکیں ولکے انتظار نہیں کیا ہے۔ نہ کبھی اس کے آنچل کا دہکتا ہوا شعلہ بوئے حبیب سے کبھی عنبریں ہوا ہے۔ یہ نظریں تو کبھی کسی کے لئے نہیں چونکی ہیں، یہ اس کے وجود کی کتنی بڑی کمی ہے اور اب تو طویل تھکا دینے والے پچھتاوے۔ دلوں کی نہایت بے دردی سے ٹھکرا دینے کے پچھتاوے کسی کی محبت کی میٹھی میٹھی گلابی گلابی آگ کی مدھم آنچ میں کہیں کمروں کی نیم روشن فضا میں نہ سلگنے کے پچھتاوے! محبت تو زندگی کا لطیف ترین احساس ہے! چھپ چھپ کر ڈر ڈر کر دل کی تمام متلاطم دھڑکنوں کے درمیان کیا ہوا وہ اقرار ہے جب کوئی ساری دنیا کا پیار نظروں میں سمیٹے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائے اور کسی خاموش کیفے کے پرسکون تنہا فیملی روم میں ڈرتے ڈرتے جھجکتے، سہمتے ہوئے اس کا گداز لانبا سا سرخ ناخنوں والا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چھوئے پھر اسے بڑی اپنائیت اور ملائمت سے دبائے، جب کانچ کی چوڑیاں کسی کی انگلیوں سے مس ہو کر جھنکار پیدا کریں اور پھر اچانک وہ خوبصورت گداز سا ہاتھ چھو کر اس کی لکیروں میں چھپی ہوئی اپنی تقدیر تلاش کرے! ہائے یہ ملائم ہاتھ تو کسی کے محبت بھرے لمس سے ناآشنا ہی رہے ہیں ـــ زندگی کی کتنی بڑی کمی ہے، محرومی ہے!

وہ سوچتی ہی رہی۔

پھر اسے کالج یاد آیا اور کالج کے تمام لڑکے جو نزدیک سے گزرتے ہوئے اسے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس نے گول زینے پر ریلنگ کے سہارے رک کر کسی کا بھی انتظار نہ کیا، کسی کا بھی راستہ نہ روکا اور روکنے والوں کے آگے سے دامن جھٹک کر چل دی۔ اس نے کسی کے لئے بھی راستہ پر دو گھڑی ٹھہر کر بھی اپنا آنچل نہ بچھایا۔ اور کتنے ہی جذبات سے چھلکتے ہوئے دل اپنے اندر اس کو اپنانے کی چاہت لئے ہی جل جل کر راکھ ہو گئے! وہ کسی کے نزدیک بھی نہ آ سکی۔ اس محرومی، ناکامی، کسی چیز کے یکلخت کھوئے جانے اور کسی کی چاہت کی مدھم مدھم آنچ میں نہ جلنے کا احساس تو اسے آج ہو رہا تھا ... وہ کسی کی طرف ملتفت ہی نہ ہوئی، بس اسے تو ایک ہی خواہش تھی، وہ ایک مشہور ادیبہ بن جائے۔

اور مشرقی کمروں کی پھیلی ہوئی نیم روشن فضاؤں میں امی کا اداس چہرہ جیسے دیکھ رہا تھا، نہ جانے، کون سے حسرت کے مارے آنچل کتنی ہی بار تر ہوئے ہوں گے، اور تکیہ کے ریشمیں غلاف نم! یکایک اس احساس سے کہ اس نے امی کو کتنے غم دیئے ہیں، اس کا دل جلنے لگا۔

یہ آج اس کی روح کو کیا ہو گیا ہے؟ اس کا انداز کس قدر اجنبی ہے آج! اضطراری، اضطرابی، وحشیانہ۔ یہ اس کی روح کے گرد آج کیسی گہری مایوسی اور تیرگی پھیل گئی ہے! یہ کیسا خلا ہے کیسے ماتمی رنگ ہیں! کوئی چیز آج اس کے اندر کیوں ٹوٹ پھوٹ گئی ہے، نظریات ریت کے گھروندوں کی طرح ڈھ گئے ہیں!؟

چاند کی سیمیں کرنیں اب اس کے چہرے سے کھیل رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ گہرے اندھیروں اور مدھم روشنیوں میں اسے اپنا سایہ بھی بہت پُراسرار اور اجنبی محسوس ہوا۔ اس کا ایک ایک رنگ کسی انجانے درد سے آپ ہی آپ چٹخنے لگا۔ اسے شدت سے محسوس ہوا وہ بہت تنہا ہے، اکیلی ہے، زندگی میں کہیں کوئی بہت بڑا خلا موجود ہے!

اسے اپنی اس بدلتی ہوئی کیفیت پر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ کیسے جذبات تھے جو آج اس قدر اچانک طور پر اس کے ذہن میں پیدا ہوئے تھے اور ایک تاثر کی طرح دھیرے دھیرے اپنا تسلط جما رہے تھے۔

"مہن! اس کی آزادی" اپنے شوہر کے گھر میں تو بھلی بھی لگتی پر ماں باپ کے گھر میں! جب آزادی کی ہوا لگ جائے تو پھر اللہ ہی والی ہے!"

آوازیں لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئیں، مدھم مدھم سرگوشیاں، سسکیوں ایسی مسلسل بھنبھناہٹ اور ہلکے ہلکے استہزائی قہقہے، اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ لیکن ذہن میں آوازوں کا شور بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ اسے محسوس ہوا اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔

اُف ایسی تنہائی، اداسی، محرومی، ارمان کا یہ روح فرسا احساس تو اہرام مصر کے تاریک سنگلاخ ماحول میں بھی نہ ہوتا ہوگا۔

یکایک اسے محسوس ہوا وہ تو مرچکی ہے بہت پہلے اور اب تو اس کی بجائے حنوط کی ہوئی ممی رکھی ہوئی ہے۔ جذبات اور احساسات سے قطعی عاری ممی —!

ناگاہ کوئی سہما ہوا آنسو کا قطرہ آپ ہی آپ پلکوں کی نازک چلمن سرکا کر ملائم بے داغ رخساروں کی مخملیں سطح سے الجھنے لگا....
تب وہ اپنے وجود کی ساری تھکن اور درد کو لئے آگے بڑھی، اور نڈھال جسم کو بستر پر ڈال دیا۔

دور مشرقی کمروں کی تاریک فضا میں امی کی الجھی الجھی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ اور ننھی ڈیزی کے محو خواب چہرے کی ملائم جلد کو ترکر رہی تھیں!

ہوا کا ایک آوارہ مزاج جھونکا دبے پاؤں در آیا اور دبے سروں میں بے کیف دنوں اور طویل سنسان راتوں کی انمٹ تنہائیوں کا بے رحمی سے مذاق اڑاتا گزر گیا — اور وہ متلاطم سینے سے اپنی زندگی کے اس معظیم خلا کو چمٹائے سسکتی ہی رہی •

سنہری کلس

یونس احمد

پاکستان بنا تو مشرقی پاکستان میں بنگالی ادب کو ان گنت مسائل سے دو چار ہونا پڑا۔ اس ادب کا کُل سرمایہ مغربی بنگال میں رہ گیا تھا۔ کچھ ادیب ہجرت کرکے یہاں آ گئے، کچھ چلے گئے۔ جو آئے وہ زندگی کے نئے نئے مسائل میں گھر گئے۔ یہاں نہ پریس تھا، نہ نشر و اشاعت کی سہولتیں میسر تھیں۔ حتیٰ کہ ایک اخبار بھی نہ تھا۔ کبھی یہ ادیب جھنجلا جاتے، کبھی اُن کی آرزوئیں مایوسیوں کی گھٹاؤں میں چھپ جاتیں۔ لیکن جب اُمیدوں کی شفق پھوٹتی اور وہ اپنے دلوں میں طمانیت محسوس کرتے تو قلم لے کر بیٹھ جاتے اور منتشر خیالات کو کاغذ پر جمع کرکے عوام کے سامنے پیش کر دیتے۔ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ رہا، خیالات قابو میں آ گئے، مسائل کے حل سامنے آتے چلے گئے۔ شاعری کی جھیل جو خشک ہو چلی تھی پھر اُمڈ پڑی اور اُس پر خوش رنگ پھولوں کی بہار ہلکورے لینے لگی۔ ادب کے انمول جواہر کی جوت نے جیسے اندھیارے میں دمک ہی دمک پھیلا دی ہو۔ ادب اور فن جو صدیوں سے بنگال کی روح و زندگی ہیں اور یہاں کی روایت بن چکے ہیں، پھر پروان چڑھ رہے ہیں۔ حیات نفسِ تازہ سے سرشار و کیف بار ہے۔

قیام پاکستان کو کُل تیرہ سال ہوئے ہیں لیکن اس مختصر عرصے میں مشرقی پاکستان میں ثقافت نے ترقی کے بہت سارے زینے طے کرلئے ہیں۔ شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، رقص، موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی۔ غرضیکہ ہر فن اپنے معراج کو پہنچ گیا ہے۔ ہر موضوع پر طبع آزمائی کی گئی اور لوک ادب کو زندہ کیا گیا، جو مشرقی پاکستان کا قدیم ترین ادب ہے۔ اس میں اس کے دل کی دھڑکنیں ہیں، آنسوؤں کا سیل رواں ہے، خلش اور ارتعاش ہے۔ اس میں یہاں کی کامنی نازنینوں کے تبسم کی گلکاریاں ہیں، ان کی شرمیلی، لجاتی اور کسمساتی جوانیاں ہیں۔ ان کے جذباتِ دروں کی حدت ہے۔ اس ادب میں زندگی کا ہر زاویہ سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ دکھ سکھ، آنسو اور چمکاریں، شادی بیاہ، ملن اور برہ کی راتیں، یتیم کی جدائی میں بارہ ماسی گیتوں کی دردناک تانیں۔ مختصر یہ کہ اس ادب میں بہت کچھ ہے۔ اس کو جسیم الدین نے پروان چڑھایا اور روشن یزدانی نے اس کی نوک پلک درست کی ـــ روشن یزدانی بھی جسیم الدین ہی کی طرح گاؤں کی داستانیں اُسی کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ گاؤں جو مشرقی پاکستان کی روح ہے، گاؤں جہاں کاشتکار اور مانجھی چاندنی راتوں میں اپنی اپنی تخلیق کردہ داستانیں سناتے ہیں۔

لوک ادب کی طرح مشرقی پاکستان میں "پوتھی ادب" بھی بے حد مقبول ہے۔ یہ صنف بھی بہت قدیم ہے۔ اس میں پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی، اولیاء کرام کے شاندار کارنامے اور کربلائے معلیٰ کے واقعات بڑے ہی مؤثر پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ زبان قطعی دیہاتی لیکن عربی اور فارسی کے الفاظ سے بھرپور ہے۔ فضا اور ماحول بھی مقامی ہیں۔ ادب کی یہ صنف ایک طرح سے مرتی جارہی تھی لیکن روشن یزدانی نے لوک ادب کی طرح اسے بھی نوبخشی۔ پوتھی ادب در اصل لوک ادب ہی کی ایک صنف ہے۔ ان دونوں کا امتزاج دیکھنا ہو تو روشن یزدانی کی مقبولِ انام کتاب ـــ "خاتم النبیین" اٹھا کر دیکھئے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

"بنگلا ہماری مادری زبان ہے۔ لیکن اس میں حضرت رسولؐ خدا کی سیرت پاک پر چند ہی کتابیں لکھی گئی ہیں جو انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اَن پڑھ ہے، اور پچاسی فیصد افراد بے پڑھے ہیں۔ لیکن جو پندرہ فیصد پڑھے لکھے افراد ہیں اُن میں بھی اچھے اور معیاری ادب سے لطف اندوز ہونے کا ذوق پروان نہیں چڑھا۔ اس کے باوجود خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ ہمارا معاشرہ جتنا اَن پڑھ ہے اس کا دل اتنا ہی

زندگی سے بھرپور ہے۔ اس کی بصیرت اتنی ہی تیز ہے۔ فرصت کے اوقات گزارنے کے لئے وہ آج بھی زندہ و پائندہ ادب سے جی بہلاتا ہے۔ وہ ہے پوتھی ادب۔ آج بھی گاؤں میں پوتھی کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ ایک شخص بآواز بلند سر یلی لَے میں "شہید کربلا" — یا "قصص الانبیاء" پڑھتا ہے اور چاروں طرف بیٹھے ہوئے اَن پڑھ اور پڑھے لکھے لوگ توجہ سے سنتے ہیں۔ چنانچہ اس معاشرہ کے دسترخوان پر میں نے بھی اپنی تخلیق رکھی ہے جو مٹی کی زبان اور مٹی ہی کے سُروں میں لکھی گئی ہے۔ وہ تخلیق ہے۔ "خاتم النبیینؐ" اسی باعث اس کی زبان سہل اور آسان ہے۔ قطعی گاؤں کی زبان"!

"خاتم النبیینؐ" میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، رسولِ خدا کی ولادت باسعادت سے لے کر رحلت تک کے واقعات نظم میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر بنگلا میں اور بھی کتابیں موجود ہیں۔ لیکن اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پوتھی اور لوک ادب کا حسین امتزاج ہے۔ فضا اور زبان گاؤں کی ہے۔ بڑی ہی رسیلی سجیلی، عام فہم، رواں دواں، کہیں کہیں جو استعارے استعمال کئے گئے ہیں وہ بھی ماورائی نہیں بلکہ گاؤں کی فضا اور ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابہام کا نام ونشان تک نہیں۔ ہر واقعہ صاف ستھرے انداز میں بیان کیا گیا ہے جس میں اثر آفرینی کے ساتھ ساتھ خیالات کی جولانیاں بھی ہیں۔ تصویر کشی اور منظر نگاری کا تو کوئی جواب نہیں۔ رسولِ خدا کی ولادت باسعادت سے پیشتر کے حالات اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

"چاند ستاروں کی روشنی ماند پڑ چکی ہے، دن کا اجالا بھی
اماوس کی رات میں ڈھک گیا ہے،
گلبن میں پھول نہیں کھلتے، بھونرے کا نشہ اتر چکا ہے،
جنگل اور صحرا میں طیور کے چہچہے نہیں سنائی دیتے،
بادِ صبحگاہی سے کیلے کے پتوں میں جنبش تک نہیں۔
دریاؤں کی لہریں ساکت ہیں آبشار خاموش ہے
اور چیت کی بے پناہ گرمی کی آگ دہک رہی ہے!"

اور جب ولادت باسعادت کی گھڑی آن پہنچی تو شاعر کے احساسات پر روشنی کی پھوار پڑنے لگی۔ اس نے اپنے چاروں طرف نور کا ہالہ دیکھا اور اس کے دل میں مسرت و انبساط کے کنول جل اٹھے۔ اُس نے اُس سمے کی تصویر یوں اتاری ہے:

"وہ رات گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی — ساکت، خاموش
آسمان پہ نہ چاند تھا نہ تارے تھے۔ مگر یکایک نورِ صبح
تبسم کی طرح بکھر گیا تھا۔
خیمہ کے باہر چراغ کی زرد روشنی دم توڑ رہی تھی۔
لیکن غیبی روشنی کو دیکھ کر عورتیں چونک پڑیں اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگیں — "کیا رات بیت گئی؟"
آسمان پر چاند تارے تو ہیں نہیں، پھر ہیرے، نعروں کی یہ روشنی کہاں سے امڈی چلی آرہی ہے؟
چڑھتے آسمان کے نیچے سیمرغ بانگ کیوں دینے لگا۔
ریت کے دیس میں ریت کا سمندر آج اس طرح کیوں زرافشاں ہے؟
اس صحرا میں کہیں پھول ہی نہیں مگر ———
یہ پھول کہاں کھل اٹھا جس کی نکہت بیز مہک سے من بیکل ہے۔
ریگستان میں مسافر چلتے چلتے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔
رات گہری نیند میں ڈوبی ہوئی ہے مگر یہ رونق، یہ نور یہ چہل کیوں ہے؟
جنگل بن میں بہار نہیں پھر یہ طیور کیوں چہک رہے ہیں۔ اور آدھی رات کو دل بادِ صبحگاہی کے ساتھ کیوں بہا جا رہا ہے؟"

روشن یزدانی کو منظر نگاری کے علاوہ جذبات آفرینی پر بھی کامل قدرت ہے۔ جب وہ مسرت و انبساط کا منظر کھینچتا ہے تو پوری فضا اس سرمستی و سرخوشی میں غرق ہو جاتی ہے اور جب وہ رنج وغم کی تصویر اتارتا ہے تو فضا بھی ماتمی بن جاتی ہے، اور قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خود اس کی ذات اس فضا میں مقید ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں صورتوں میں وہ جو استعارے اور تشبیہات استعمال کرتا ہے، ان کا کوئی جواب نہیں۔

بی بی خدیجہؓ جب دنیا سے سدھاریں تو اس اندوہناک سانحہ کا اثر حضورؐ پر جو ہوا ہوگا وہ تو ظاہر ہے لیکن روشن یزدانی نے اس واقعۂ دلدوز کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لکھتے ہیں:

"سچا ندھ پوش ہو رہا ہے، وقت کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔
اس کے چراغ کی لو بھی آہستہ آہستہ مدھم پڑتی جا رہی ہے۔
بی بی خدیجہ اکثر علالت کا شکار رہیں
اور اس طرح اس زندگی کی مسرتوں کے دن ڈوبنے لگے۔
درخت کے پتے جھڑنے لگے، شاخیں خشک ہوگئیں، اور
بیلیں مرجھا گئیں۔
چراغ کا تیل بھی دھیرے دھیرے سوکھتا گیا۔
بی بی خدیجہ کہنے لگیں ——" میری ناؤ کنارے سے لگ
گئی ہے۔ اب میں دلیس جاتی ہوں ——
لیکن آپ کو یوں چھوڑ کر جاتے ہوئے دل پر چھری سی چل رہی ہے۔
آپ کو تنہا کیسے چھوڑ جاؤں!
باندی سے نہ جانے کتنے گناہ سرزد ہوئے ہیں،
اب مجھے معاف کرکے میرے دل کو مسرت سے ہمکنار کیجئے"
رسول خدا بولے —" معاف کیا میں نے تمہیں۔
میں کایا ہوں اور تم چھایا — جیسے بن اور ہوا۔
تمہارے بنا میں فردوس بریں کی چوکھٹ پہ قدم تک نہیں
رکھوں گا۔
یہ سن کر خدیجہ بی بی ہنس پڑیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے
جس طرح دن ڈھلے سے سورج ہنستے ہنستے چھپ جائے"
اقدام ہجرت بڑے حوصلے وصبر کا امتحان تھا۔ مگر حضورؐ نے جب
اس راہ پُرخطر پہ قدم رکھے، طرح طرح کے خیالوں نے انہیں گھیر لیا۔
اس وقت آپ کے دل کی جو کیفیت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کون
لگا سکتا ہے۔ لیکن روشن یزدانی نے اس واقعہ کی بھی بڑی ہی دلدوز
تصویر کشی کی ہے۔ مثلاً یہ ٹکڑہ ملاحظہ ہو:
"خاک وطن سے جدا ہوتے وقت نبی کریمؐ کا دل فگار تھا۔ آنکھیں
اشکبار تھیں۔
وطن چھوٹ رہا تھا، مگر وطن کی کشش دامنگیر تھی!
اس وقت ان کی آنکھیں یوں رو رہی تھیں گویا ساون کی
جھڑی لگ گئی ہو۔
(کیونکہ) خاکِ وطن شتیل پانی سے کم نہیں۔ یہ بستر استراحت ہے۔
ایسے وطن کو الوداع کہتے ہوئے بھلا دل کیسے مانتا۔
وطن کی محبت درحقیقت زنجیر پا ہے جو اپنی طرف کھینچتی ہے۔
اس سے جدا ہونے پر بھی، اس کی محبت دل سے نہیں جاتی۔
وطن کی محبت اتنی استوار ہوتی ہے کہ شجر و حجر پیچھے چھوٹ جانے
کے باوجود بھلائے نہیں جاسکتے۔
تھوڑی دور جاکر رسولؐ خدا پھر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں۔
وطن چھوٹ رہا ہے لیکن اس کی کشش برابر کھینچ رہی ہے۔
آپ نے دونوں آنکھوں سے خاک پاک کو دیکھا۔ نہ جانے پھر
دیدار ہو نہ ہو!۔

بنگلا ادب (یہاں میری مراد صرف مشرقی پاکستان کے بنگلا
ادب سے ہے) کی دیگر اصناف کی طرح ڈرامہ نگاری نے اگرچہ کوئی نمایاں
ترقی نہیں کی لیکن پچھلے چند سال سے دو چار ڈرامہ نگار اچھی اچھی چیزیں
پیش کر رہے ہیں۔ ان ڈرامہ نگاروں میں اکبر الدین، عسکر ابن شیخ
اور منیر چودھری کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ حال ہی میں
ایک نئے ڈرامہ نگار، سید عبدالستار (قلمی نام تیرس رسا یعنی بے مغز
زبان") نے شاہکار ڈرامہ" کوبی دا" (شاعر بھائی) تخلیق کرکے ہر مکتب
خیال کے لوگوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ یہ ڈرامہ تین ایکٹ کا
المیہ ہے اس کا پس منظر باغی شاعر، قاضی نذرالاسلام کی گوناگوں زندگی
ہے۔ ڈرامہ نگار دیباچہ میں لکھتا ہے:۔
"کوبی دا" نہ سوانح ہے اور نہ تاریخ۔ یہ ناٹک ہے اور صرف
ناٹک۔ شاعرانہ شعور، ایک زعیم عصر اور اس کی انفرادیت کا خاکہ
—— نذرالاسلام کے کردار کے یہ تین روپ ہیں جن کے گرد یہ ناٹک
گھوم رہا ہے"
ایکٹ ۱ اور منظر ۱ سے پہلے ابتدائیہ ہے جس میں کل چار کردار
پیش کئے گئے ہیں: نذرل، نرگس (نذرل کی پہلی بیوی) پرآمیلا (نذرل
کی دوسری اور موجودہ بیوی) اور نرگس کی روح۔ پہلا منظر یوں شروع
ہوتا ہے:۔
"منظر —— تخئیل"
نذرل کی خوابگاہ!
خاموش اور ساکت رات۔ پچھلے حصہ میں ایک چارپائی جس پر
نذرل اکیلا ہی محو خواب ہے۔ بستر پہ پہلے ہلکی تاریکی رہتی ہے پھر اندھیرا

گم ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ساز یتیم بجھنا اٹھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بستر پر رنگین روشنی کی پھوار سی گرنے لگتی ہے۔ خواب کی دیوی داخل ہوتی ہے۔ درمیان میں باریک، ہلکا پردہ لٹک رہا ہے۔ پردے کے اس سمت نیند کا ماتا نذرل ہے۔ تمثیل کے آہنگ پر گردش میں ڈوبا ہوا رقص سامنے آتا ہے جس سے نیند کے ماتے نذرل کے شباب کی والہانہ کیفیت کا اظہار مقصود ہے۔ چہرے پر بھرپور جوانی کا جوش جھلکتا ہے۔

(پس منظر سے آواز)

"کون جانے میں اکیلا مسافر کہاں جا رہا ہوں؟
دونوں طرف دکھ سکھ کے دو کنارے ہیں اور درمیان میں میں
ہوں اور پانی کی لہریں!
زندگی کے پربت سے ہوتے ہوئے اپنے ہی بہاؤ میں بہا جا رہا ہوں۔
ایک رہگذر سے دوسری رہگذر کی طرف، دن رات چین آرام
سے بے پروا!
میں بھاگا جا رہا ہوں، نہ جانے کہاں۔ اور کچھ ہیں کہ دونوں
طرف میرے لئے دام بچھاتے ہیں۔
شاید وہ سمجھتے ہیں کہ میں پہاڑوں کو چیر کر اُن ہی کی طرف آ رہا
ہوں"

نیند کا ماتا نذرل —— اوّل اوّل اس کے چہرے پر مسرت و انبساط کی چمک ہے، وہ پُرسکون ہے۔ لیکن پھر اس کے رگ و پے میں بجلی کی سی کیفیت سما جاتی ہے۔

پس منظر سے آواز:۔

"میں جانتا ہوں، مجھے سب معلوم ہے کہ دونوں کناروں
سے وہ والہانہ انداز میں بلا رہی ہیں اور جھیل کی طرف سے کنول کی آواز
آ رہی ہے — اب رک بھی جاؤ یہیں اک گھر بسانا ہے۔

باہر سے نرگس داخل ہوتی ہے۔ ایک تمثالِ خوبی، جمالِ مالامال بھرپور جوانی، چال میں رقص کی دلربائی لئے ہوئے۔

پس منظر سے آواز:

"میں کل کل کرتی ہوئی رواں دواں ہوں، بہتی جا رہی ہوں،
گھر میں عورتیں سرگوشیاں کر رہی ہیں کہ میرا ساحل کہاں ہے۔
ٹھہر نہیں سکتی۔
ٹھاکر کی بیٹی جو ٹھہری ہیں۔ میری ناؤ لعل و گہر سے لدی ہوئی
چلی جا رہی ہے"

نیند کے ماتے نذرل کے سامنے نرگس نمودار ہوتی ہے نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ حیرت و استعجاب اور مسرت و سرخوشی کی فضا میں دو دل گرفتہ ہو جاتے ہیں۔ یکایک اندیشہ ہائے دور و دراز کی گہری پرچھائیں چہرے پر پڑتی ہے اور نذرل بڑی تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ نرگس بھی عالمِ اضطراب میں اس کے ساتھ ہی نکل جاتی ہے۔ کچھ دیر کے لئے اسٹیج پر اندھیرا سا رہتا ہے۔ روشنی مدھم ہے۔ ساز بج رہا ہے۔

پس منظر سے آواز:

"بدبخت حسینہ، چھپ چھپ کر آدھی رات کو میرے اُوپر
آتی ہے۔
میں اس سے کہتا ہوں: چل اے ماہِ درخشاں میرے ساتھ
کہ تیری شکل جانی پہچانی ہے!"

پرامیلا داخل ہوتی ہے۔ روپ کی رانی، سندری۔ جو دیکھے اس کے دل پر خنجر سا چل جائے۔ نذرل اسے دیکھ رہا ہے مگر خاموش ہے۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے —— محبت کا وار چل چکا ہے۔ لیکن فوراً ہی نذرل کے دل میں نرگس سما جاتی ہے۔ وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ اور پرامیلا یکایک اس کے نزدیک آ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ساز بجنے لگتا ہے۔

اس ڈرامہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک کشمکش ہے۔ اضطراب اور لگن ہے۔ اس میں نذرل کی زندگی کے دو اہم روپ یعنی رومان اور بغاوت کی خوبصورت انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ اس ڈرامہ میں ایک دو نہیں درجنوں کردار ہیں کوئی کردار بھی غیر اہم نہیں۔ مکالمے رواں اور چست۔ ہر کردار کو خوب ابھارا گیا ہے لیکن نرگس ہمارے سامنے تھوڑے ہی وقفے کے لئے آتی ہے حالانکہ اس کردار کو بھی ابھارا جا سکتا تھا کیونکہ نذرل اس سے علیٰحدگی اختیار کرنے کے باوجود برابر اپنے دل میں خلش محسوس کرتا رہا۔ اس سلسلے میں نرگس کے نام نذرل کا وہ آخری خط بھی پیش کیا جا سکتا ہے جسے اس نے اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے۔ اس نے اس خط میں اعتراف کیا ہے کہ اس کے دل میں اس کی محبت کی جو آگ بھڑکی تھی اُس کے شعلے سرد نہیں ہو سکے۔ البتہ ڈرامہ نگار نے ایک اور جگہ نرگس کا ذکر کیا ہے۔ جس وقت پرامیلا اپنی سہیلی چپالا سے اپنا دکھ بیان کرتی ہے
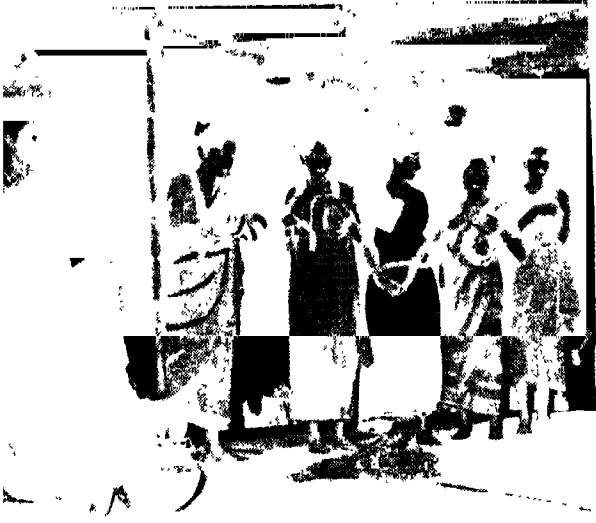
ناگ ناچ

مشرقی پاکستان

فصل کی کٹائی پر خوشی کی ترنگ
(کوی جسیم الدین کی نظم " نقشی کاتھر ماٹھ " سے)

نرت رس (نذرل کا گیت)

حیف! تاراج خزاں

گھر باڑی سب تباہ!

ریلوے اسٹاف کولونی (چاٹگام)

تباہی کا ایک اور المناک نظارہ (چاٹگام)

. زدوں کی امداد کے لئے والہانہ سرگرمیاں

یوں سہیلیوں میں یوں بات چیت ہوتی ہے :

چھایا: تیری آنکھیں یوں سرخ اور سوجی ہوئی کیوں ہیں؟ روتی رہی تھی کیا؟

پرامیلا: ہاں، ساری زندگی تو روتے ہی بیت گئی!

چھایا: ساری زندگی؟

پرامیلا: ہاں یونہی سمجھو۔ باپ کے مرنے کے بعد سے دکھوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب تک چل رہا ہے۔

چھایا: لیکن اب تجھ جیسی خوش بخت اور کون ہوگی؟ تیرا میاں اتنا بڑا شاعر ہے۔ اتنا مشہور گانک! اتنی خوبیوں کا آدمی کہاں ملتا ہے بھلا۔ ان کے گانے سن کر لطف اندوز کون نہیں ہوا!

پرامیلا: کبھی میں بھی لطف اندوز ہوتی تھی۔

چھایا: اور اب؟

پرامیلا: ہر سوال کا جواب نہیں دیا جاتا پیاری۔ آج تجھ سے دل کی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ سوچا تھا اپنا ایک گھر بساؤنگی چھوٹا سا ہی سہی۔ مگر یہ بھی نہ ہوا!

چھایا: جانے دے ان باتوں کو پرامیلا۔

پرامیلا: نہیں میں کہونگی۔ ایک ماہ کے بعد کل رات نذرل گھر لوٹے ہیں۔ آنے کے فوراً بعد ہی پھر گراموفون کمپنی چلے گئے۔

چھایا: ایک ماہ تک کہاں رہے؟

پرامیلا: اپنے کسی دوست کے گھر سنگیت کی مجلس جمتی ہوگی۔ ایک خانہ بدوش کی زندگی بھی مجھ سے بہتر ہوگی پچھلے سال کہاں کہاں نہ گئی۔ آج ہگلی تو کل کرشن نگر۔ ابھی "سوغات" کے دفتر پھر یان بگان — پھر مسجد باڑی۔ یہ تو زندگی کا ایک رُخ ہوا۔ دوسرا رُخ بھی ہے۔ یہ دیکھ (ایک رسالہ دکھاتے ہوئے جس میں نذرل کی ایک نظم چھپی ہے)۔

چھایا: یہ تو نذرل کی نظم ہے

پرامیلا: شام کو ہی پڑھتی رہی۔ یہاں سے پڑھ، اونچی آواز سے۔

چھایا: (پڑھ کر سناتی ہے) "کیا شاعر کی شاعری محض تخیل ہے"؟
نہیں رانی تم نہیں سمجھوگی، آگ ہی آگ جلے تب چولہا ٹھیک گرم ہوتا ہے، سن سن کرتا ہے"

پرامیلا، مگر یہ رانی کون ہے؟

پرامیلا: انہی نے تو میری زندگی تباہ کردی ہے!

چھایا: کون ہے وہ؟

پرامیلا: میری سوکن — نرگس!

چھایا: مگر نذرل نے تو اُسے طلاق دیدی ہے۔

پرامیلا: پر وہ نذرل کو نہیں چھوڑتی۔ ڈائن کی طرح دن رات اس کے پیچھے پیچھے گھومتی ہے۔ نذرل کی اور بھی کئی عشقیہ نظمیں ہیں جو اس ہی تأثر کا نتیجہ ہیں۔ اُف!"

اس قسم کے المیہ مکالمے جا بجا ہیں۔ فضا شروع سے آخر تک المیہ ہی ہے۔ البتہ کہیں کہیں جب نذرل اپنے احباب کے درمیان ہوتا ہے تو مجلس طربیہ ہو جاتی ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ نذرل کی زندگی دکھوں کا الاؤ ہے۔ پریشانیاں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں۔ بڑے لڑکے بلبل کی موت نے تو اس کی ساری خوشیاں ہی چھین لیں اور پھر پرامیلا کی جان لیوا بیماری۔ غرضیکہ اس کو ذہنی سکون کبھی نہ ملا —

"کوبی دا" اونچے درجہ کی ایک اچھی تخلیق ہونے کے باعث ادب عالیہ میں شمار کی جا سکتی ہے کیونکہ اس نے نذرل کی امر شخصیت کی مہر جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت کردی ہے ؛

درشن

صہبا اختر

آنکھیں جن میں کشمیری جھیلوں کا گہرا پن —

پلکیں جن کے سائے سلائے بھڑکے روپ اگن

زلفیں جیسے کجلی بن کے ناگ اٹھائے پھن

چہرہ جیسے آتی جاتی صبحوں کا درپن

جھمک جھمک کرتے سینے میں چھنک چھنک دھڑکن

چاند سے ماتھے کو چھونے کی کرن کرن ان بن

چال کہ جیسے شبنم پی کر جھومے مست پون

لاکھ ستاروں کی آنکھوں سے دیکھے نیل گگن

ہاتھ کو ہاتھ چھوئے تو باجیں ان دیکھے کنگن

بن گھنگھرو بن پائل اس کے پیروں میں چھن چھن

اس کی راس سے ساری لیلا دیکھے پیت سپن

کیا جانے کب آ کے کرے گی پورا پریم وچن

من مندر میں جانے کب ہو اب اس کا درشن

صہبا جس دیوی کے لئے لکھتے ہیں روز بھجن

غزل

محشر بدایونی

مجھے لشکرِ حوادث میں نہیں ہے خوفِ سفر کی
تو پھر اتنی کج ہے ویسے ہی کلاہ میرے سر کی

کوئی رَو چلے اُدھر سے تو نہیں ہے خیر ادھر کی
اِسے چھوڑیئے کہ محکم ہے بہت فصیل گھر کی

اِسی وہمِ دشت و طوفاں میں اُلجھ کے رہ گئے ہم
کبھی فاصلوں کو سوچا کبھی وقت پر نظر کی

مجھے گردِ شہسواراں نہ کرے بہت پریشاں
میں کوئی شجر نہیں ہوں میں زباں ہوں رہگذر کی

اسی خوفِ روزِ محنت میں ہر ایک رات گزری
لگی آنکھ اِدھر کہ آہٹ سے میں جاگ اُٹھا سحر کی

مری چُپ کا اک سبب ہے یہ کرم بھی میکدے کا
ہے کشید بند مجھ پر ہی مرے دل و جگر کی

نہیں قدر جس میں شبنم کی اُس اندھی رہگذر میں
میں دِیا جلائے بیٹھا ہوں دُکاں لئے ہنر کی

احمد سعدی

میں نے جتنے شیش محل سپنوں کے بنائے، تم نے توڑے
کسی کے ٹوٹے من درپن بھی آج تلک تم نے ہیں جوڑے

سُکھ کے پیچھے بھاگ نہ پگلے، دکھ کو اپنا میت بنا لے
دُکھ کے دن ہوتے ہیں زیادہ، سُکھ کے دن ہوتے ہیں تھوڑے

میرے پیار کی گرمی سے ہر پل جلتی ہیں تیری سانسیں
لاکھ تو اپنا بھید چھپائے، لاکھ تو مجھ سے مُکھ کو موڑے

ہر جگ میں دکھ جھیل کے تیرے پیار کو میں نے امر کیا ہے
کبھی تو بھٹکا ہوں جنگل میں، کبھی تو پتھر پر سر پھوڑے

دھیان نگر کا میں ہوں راجہ، روپ، جوانی مرے خزانے
پھر بھی سپنوں کے محلوں میں سوتا ہوں میں بیچ کے گھوڑے

آج بھی تیری یاد مجھے کیوں پہروں بے کل کر دیتی ہے
ایک زمانہ بیت چکا ہے، اب تو تیرا ساتھ بھی چھوڑے

دھن کا پکّا ایک مسافر بیت نگر آ پہنچا سعدی
لاکھ بچھائے سمے کے ہاتوں نے اس کی راہوں میں روڑے

کوئٹہ اور اسکے نواح کی صحافت

— عبدالصمد حقانی

جب کسی پٹھان یا بلوچی قبائلی ملک کے ہاں کوئی نووارد مہمان آتاہے یا ملاقات ہوتی ہے تو "السلام علیکم" کے بعد میرِ مجلس تمام حاضرین کی اجازت سے اس نووارد سے ایک سوال کرتاہے جو تعارف یا دریافتِ احوال کا مترادف ہے۔ اسے "حال دینا" کہتے ہیں۔ نووارد جب "حال دے" چکتاہے تو میرِ مجلس کے توسط سے اور حاضرین کی اجازت سے اُن کا "حال لیتا" ہے۔ یہ محض تعارف نہیں ہوتا بلکہ شب و روز کا "اخبار" یا "سفرنامہ" یا "روزنامچہ بیانی" ہوتی ہے۔ اس میں آپ بیتی تو خیر ہوتی ہی ہے لیکن ہر شخص استعداد اور دائرہ معلومات کے مطابق سیاسی، ادبی، علمی اور معاشرتی موضوعات پر بھی اپنی آرا۔ اور معلومات پیش کرتا رہتا ہے اور سلسلۂ گفتگو جاری رہتاہے۔ نہ صرف معمولی معاملات بلکہ دس پندرہ روز کے واقعات بھی جو قبائل اور دیہات میں پیش آئے، زیرِ بحث آتے ہیں۔ گویا صحافتی زبان میں اسے "نیوز بلیٹن" سمجھئے۔

"حال دینا" قبائلیوں میں قدیم الایام سے چلاآتاہے مجھے ٹکئی قبیلہ کے ایک سردار صاحب کی جاگیر میں سفر کا اتفاق ہوا۔ سفر کئی گھنٹے کا تھا اور بہت اکتا دینے والا۔ راستہ میں دیہات کے غریب قبائلی بھی نظر پڑے۔ اتفاق سے ایک غریب آدمی سے ملاقات ہوئی جو اپنے بچے کے لئے کسی لذیذ غذا کی تلاش میں نکلا تھا کیونکہ اس کا بچہ کئی روز سے ضد کر رہا تھا کہ ستو اور اونٹنی کا دودھ پیتے پیتے اس کا دل اکتا چکاہے۔ جب اس حاجت مند سے ملنا ہوا تو وہ اپنا دکھ سب کچھ سب بھول گیا اور چھوٹتے ہی دور دراز سے آنے والے مسافروں سے اس نے "حال دینے" کی درخواست کی۔ سفر کی منزلوں کا حال بتایا گیا۔ اور ہمراہیوں کی اجازت سے ہم نے اس کا بھی "حال لیا"۔ راہگیر غریب نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ہمارے پاس زادِ سفر کے طور پر کافی سامان تھا، اس میں سے ہم نے اس بھائی کی بھی مدد کی۔

اس رسم کے بیان اور اس واقعہ کے دہرانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ سابق بلوچستان میں "صحافت" کی ابتدا قدیم الایام سے چلی آتی ہے۔ اور سب سے پہلے ان "چلتے پھرتے اخباروں" نے ہی خبر رسانی کا آغاز کیا۔ کوئٹہ اور قلات کے نواح میں صحافت سے دلچسپی اسی خبر پسندی کا نتیجہ ہے۔ قبائلیوں کی اس خبر پسندی کا ہی یہ اثر ہے کہ شاید ہی کوئی گاؤں، تحصیل یا قصبہ ایسا ہو جہاں کوئی ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہانہ جریدہ ہفتہ عشرہ میں پہنچ نہ جاتا ہو۔ بے شک بہت سے اَن پڑھ ہیں۔ مگر پڑھے ہوئے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ مساجد کے امام صاحبان، نوجوان تعلیم یافتہ، نیم خواندہ دکاندار تک ان اخباروں کو سنا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے سرخیوں پر رائے زنی ہوتی ہے۔ پھر خبروں پر۔ اس کے بعد آئندہ آمدِ اخبار تک رائے زنی ملتوی رہتی ہے۔ لوگ خبریں جلد نہیں بھول جاتے بلکہ دو دو چار چار سال تک پرانی پرانی خبروں کے حوالے دورانِ گفتگو میں آتے رہتے ہیں۔ اگر کسی سالانہ جرگہ، مجلس یا محفل میں کسی خبر رسانی یا اخبار نویس یا کسی مدیر سے ملاقات ہو جائے تو بڑا لطف آتا ہے۔ اخبار نویس تو ظاہر ہے کہ کچھ خبریں بھول چکا ہوتاہے مگر پڑھنے والے اسے گھیر لیتے ہیں اور وہ بڑے صبر و سکون کے ساتھ ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہتاہے۔

اب میں کوئٹہ کی صحافت کا کچھ حال عرض کرتا ہوں یعنی اپنا "حال دیتا ہوں"۔ مرحوم میر خلیل الرحمٰن صدیقی بانی و مدیر "اتحاد" یہاں کے پرانے شہری صحافی و مدیر تھے۔ ان کا بیان تھا کہ یہاں سے سب سے پہلا روزانہ اُردو اخبار "راست گو" کے نام سے جاری ہوا تھا۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا اور جنگی ضرورتوں کے پیشِ نظر نکلا تھا۔ آج کل جو "کوئٹہ ٹائمز" کا پریس ہے وہیں سے نکلا تھا۔ اور اردو ٹائپ میں چھپتا تھا۔ میر صاحب (مرحوم) ہی اس کے مدیر تھے۔

بلوچستان ٹائمز" ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک ایک پارسی تھے اور "موزنگ گزٹ" کے نام سے ایک اور اخبار بھی پہلے نکال چکے تھے۔ مگر یہ اخبار کم اور اشتہار زیادہ تھا۔ "کوئٹہ ٹائمز" بھی اسی طرح کا اخبار تھا۔ ۱۹۴۴ء میں میں بھی میدانِ صحافت میں آیا اور دیکھا کہ اس وقت تک یہ اخبار اسی نوعیت کا تھا۔ یہ دور سیاسی چپقلشوں کا دور تھا جاتی کشاکش علیحدہ تھی۔ گروہ بندیاں اور ووٹ جیتنے کی مہمیں الگ تھیں۔ ہر ایک ٹولی کو اخبار اور صحافتی استعانت کی ضرورت تھی اور ان باتوں کو یہاں کے اخباروں سے بڑا فروغ ملا۔ مگر اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس نواح میں صحافت اور ادارت کا تجربہ اور سیاست فہمی کا فروغ عام ہوگیا۔

۱۹۳۰ء تک تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد عملی زندگی کے میدان میں آچکی تھی۔ اس وقت انگریز حاکموں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس علاقہ کے لوگ سیاسی شعور سے دور رہیں اور نئی حیات کے تقاضے یہاں کے غیور، جنگجو اور دلیر انسانوں کو نہ گرما سکیں۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا جب لاہور اور علی گڑھ کی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد تعلیم یافتہ نوجوان اپنے علاقوں میں واپس آتے اور ان کے ساتھ نئی زندگی کی لہریں پیدا ہوتیں تو ان کے ساتھ "سیاست"، "انقلاب لاہور"، "زمیندار لاہور" اور "مدینہ" (بجنور) جیسے اخبارات بھی یہاں لوگ منگوانے لگے اور اس طبقہ کے نوجوانوں کی سرکاری نگرانی کردی گئی۔

۱۹۳۱ء میں سندھ، بلوچستان اور پنجاب کے قبائلی وطن دوستوں نے جیکب آباد میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے لوگوں کی سیاسی، مجلسی اور اقتصادی حالت بہتر بنائی جائے اور انفرادی کوششوں کو چھوڑ کر اجتماعیت کی طرف انہیں لایا جائے تاکہ تحفظِ حقوق کا کام کیا جاسکے۔ نواب یوسف علی خان (مرحوم) (مجل مگسی) اس کانفرنس کے روح و رواں تھے۔

۱۹۳۸ء تک یہاں کیفیت یہ تھی کہ کراچی اور جیکب آباد سے اردو اخبارات منگوایا کرتے تھے۔ مگر جب ہفت روزہ "استقلال" کوئٹہ سے جاری ہوا تو مقامی ضروریات کو کافی تاجت ہوا۔ اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اس وقت سے نسیم تلوی کا "بلوچستان جدید"، محمد حسین عنقا کا "بولان" اور اسلم اچکزئی (مرحوم) کا "نوجوان" اور "کمالِ ہند"

نیز مولانا محمد حسین (مرحوم) کا "الحنیف" یہاں زیادہ پڑھے جاتے تھے۔ یہ لوگ اپنے وطنِ مالوف سے کوسوں دور تھے مگر پھر بھی اہلِ وطن کی ضروریات اور حقوق کے لئے امکان بھر کام کررہے تھے۔ بہت لوگ دہلی اور لاہور کے اخباروں کے مقالات میں بھی اپنے دل کی دھڑکنیں سنتے تھے۔

اس وقت فرنگی سیاست نے بلوچستان میں اخبار نکالنا بڑا مشکل بنا دیا تھا۔ کیونکہ سرکاری قدغن اور احتساب بہت سخت تھا۔ خاص کر واضح ذی شعور سیاسی پالیسی رکھنے والے اخبارات پھر مگر ۱۹۳۵ء میں جب "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" بنا اور سب جگہ سیاسی حقوق ملنے لگے تو یہاں بھی بیداری کی نئی لہر پیدا ہوئی۔

قائدِ اعظمؒ اور میر غلام بھیک نیرنگ نے مرکزی اسمبلی میں بلوچستان کے لئے صوبائی اختیارات کا پرزور مطالبہ کیا مگر پھر بھی اس علاقہ کو سیاسی حقوق انگریزوں نے نہ دیئے۔ لیکن سیاسی سرگرمیاں ترقی کرتی رہیں۔ اور "استقلال" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار بھی جاری ہوا۔ اور ۱۸ اگست ۱۹۵۰ء تک چلتا رہا۔ قدوس صہبائی صاحب اس کے مدیر تھے۔ نامساعد حالات کی وجہ سے یہ اخبار بند ہوگیا۔ اس کے بند ہونے کے بعد "پاسبان"، "الاسلام"، "بلوچستان سماچار" اور "جمہور"، "تنظیم" اور "خورشید" جاری ہوئے۔ "پاسبان" اب تک شائع ہو رہا ہے۔ اور بے لاگ آزاد رائے کا حامل ہے۔

"الاسلام" مولانا عبدالکریم کی ادارت میں نکلتا تھا اور شاخ مسلم لیگ (بلوچستان) کا ترجمان تھا۔ قاضی محمد عیسیٰ خان اس کے طابع و ناشر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا نے اس اخبار سے الگ ہوکر "میزان" جاری کیا اور اب تک شائع ہو رہا ہے۔ پالیسی صلح کل ہے۔ کسی زمانہ میں "استقلال" اور "میزان" میں معاصرانہ چشمک بھی چلی تھی۔ جسے لوگ بڑے چٹخارے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ مولانا کے علیحدہ ہونے کے بعد مشہور صحافی محمد ایوب کرمانی (مرحوم) بھی "الاسلام" کے مدیر رہے تھے۔

"جمہور" بلوچستان مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کا نقیب تھا۔ "بلوچستان سماچار" ایک صاحب مسٹر لوڈھی نے جاری کیا تھا۔ یہ دراصل سول اینڈ ملٹری پریس کوئٹہ کی ملکیت تھا۔ اور کوئٹہ میں رہنے والے ہندوؤں کے حقوق کا علمبردار تھا۔

"تنظیم" بھی مسلم لیگ کا حامی اخبار تھا۔ مشہور صحافی و انشاپرداز نسیم حجازی سب سے پہلے ایڈیٹر تھے۔ عبدالمجید بھٹی کے برادرِ اصغر رشید بھٹی صاحب بھی اس سے متعلق رہے۔

میر غلام محمد شاہوانی (مرحوم) علی گڑھ کے تعلیم یافتہ "اور" نوائے بلوچستان" سے متعلق تھے۔ پھر اس سے الگ ہو کر انہوں نے اپنا ایک اخبار "نوائے وطن" جاری کیا۔ ان پر پبلک سیفٹی ریگولیشن کی دفعہ ۲۱ کے تحت مقدمہ بھی چلا اور سزا دی گئی۔ اور اخبار بھی ایک سال کے لئے بند کیا گیا۔ بعد میں میر صاحب رہا ہوگئے اور پابندی کی معیاد بھی گذر چکی تھی مگر اخبار دوبارہ جاری نہ ہو سکا۔

فروری ۱۹۴۹ء میں قاضی نورالحق صاحب نے "ترجمان" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا اور ۱۹۵۵ء تک جاری رہا۔ لیکن وہ مقامی سیاست بازوں کی روش سے متفق نہ تھے اس لئے اخبار کچھ اور ہاتھوں میں منتقل ہوگیا اور وہ عامل صحافی کی حیثیت سے "پاکستان ٹائمز" سے متعلق ہوگئے۔

اسی طرح ایک اور اخبار رشید ملک صاحب نے "صداقت" کے نام سے جاری کیا۔ نواب محمد اکبر خاں بگٹی اس کے طابع و ناشر تھے۔ ۱۹۵۰ء میں "ترجمان" کی افادیت ختم ہوگئی تھی اس لئے بند ہوگیا۔ "صداقت" اب بھی جاری ہے۔

انقلاب اکتوبر سے پہلے ملک کی سیاست جس قدر گندی ہو چکی تھی سب کو معلوم ہے اور اخبار نویسی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ نئے دور نے ان تمام برائیوں کی اصلاح کر دی ہے۔ اصلاحِ صحافت کا سلسلہ وحدتِ مغربی پاکستان کے بعد شروع ہوگیا تھا اور موجودہ دور نے اس میں اضافہ ہی کیا ہے پہلے یہ ہوتا تھا کہ اخبار آئے دن نکلتے اور مدیر و مالک دورے پر نکل جاتے جو مدیر نہ گری اور دام و درم کی بات کے سوا اور کچھ نہ ہوتے تھے۔ اس سے پیشۂ صحافت بڑا بدنام ہوگیا۔ یہ صحافی چندے اکٹھے کرتے اور طرح طرح کے دام تزویر بچھاتے اور اپنا الو سیدھا کرتے تھے ایسے صحافیوں نے ملک کی دھڑے بندی میں بھی حصہ لیا مگر نئے دور میں اب یہ چیزیں ختم ہو چکی ہیں۔ اب ہر اخبار کی اشاعت کے لئے ہر ماہ ایک معین تعداد میں نکالنا ضروری ہوگیا ہے اور اب ایسے لوگ جو صحافت کے لئے باوقار نہ ہوں اور استطاعت بھی نہ رکھتے ہوں اخبار نہیں نکال سکتے

اب جو اخبار نکلتے ہیں ان میں ترقی کی گنجائش ہوتی ہے۔ اب انقلابی حکومت نے جو قانون کو استوار تر کر دیا ہے تو اس سے کوئٹہ اور بلوچستان ہی میں نہیں بلکہ ہر کہیں ایک صحت مند فضا پیدا ہوگئی ہے اور وہی لوگ اس پیشہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو واقعی اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔ سرکاری اشتہارات کے سلسلہ میں بھی روش اب منصفانہ اور معقول و مستحکم ہو چکی ہے۔ انقلاب اکتوبر سے پہلے سیاسی لوگوں کے اثر میں رہنے والی حکومتوں کے زمانہ میں اخباروں کی "سیاہ فہرست" اور "سفید فہرست" بنائی جاتی تھی۔ مگر اب صرف کاروباری اصول و معقولیت و انصاف کو دخل ہے اب صحافیوں کی سہولت کے لئے کوئٹہ کے ٹاؤن ہال میں ایک خوبصورت پریس روم بھی بنا دیا گیا ہے جہاں صحافی جمع ہو سکتے ہیں۔ اور تبادلۂ خیال اور اطلاعات فراہم کر سکتے ہیں۔ صحافیوں سے ادبی، معاشی و ثقافتی موضوعات پر معلومات عامہ کے لئے مضامین بھی تیار کراتا ہے جس سے اخباروں کو بڑی مدد ملتی ہے۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں کوئٹہ کے چند ادبی جرائد کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ علاقۂ کوئٹہ میں "رہبرِ نسواں" بطور ماہنامہ جاری ہوا مگر اب اسے پندرہ روزہ کر دیا گیا ہے اور خواتین کی دلچسپی اور افادہ کے ساتھ ساتھ دیگر امور پر بھی اس کی نظر ہے۔ "کوہسار" کے نام سے عبدالعزیز خاں صاحب نے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا تھا۔ مگر بعد میں اسے بھی ہفت روزہ کر دیا گیا۔ یہی کیفیت یہاں کے پشتو ماہنامہ "گلستان" کی بھی ہوئی ہے۔

نئی حکومت نے ملکی اصلاحات کا جو سلسلہ قائم کیا ہے اس کی ایک کڑی صحافت کی ترقی و بہتری بھی ہے۔ اس ہی ضمن میں کوئٹہ کے اخبارات کا معیار بلند کرنے کے لئے گروپ سازی کی گئی ہے۔ اس کا نام "ڈیلی گروپ" ہے۔ اس میں "اتحاد"۔ "زمانہ"۔ "تنظیم"۔ "نعرۂ حق"۔ "باغ و بہار" "صداقت" اور "کوہسار" شامل ہیں۔ ہفت روزہ "زمانہ" کے بانی برکت علی آزاد صاحب ہیں جو آج کل جیکب آباد سے "صبح سندھ" کے نام سے ایک سندھی جریدہ بھی شائع کرتے ہیں۔ "نعرۂ حق" آزادی سے بہت قبل سے کوئٹہ و سکھر سے بیک وقت شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر مشہور صحافی مولانا [illegible] ہیں۔ "باغ و بہار" پہلے بچوں کے رسالے کی حیثیت سے نکلا تھا اور مولانا فیض اللہ انصاری اس کے مدیر تھے۔ مگر بعد میں اسے بھی روزنامہ بنا دیا گیا اور یہی کیفیت "کوہسار" کی بھی ہوئی۔ ابتداً وہ ایک ادبی

ماہنامہ تھا۔ مگر یہاں ایک اچھے اور معیاری ماہنامہ کے لئے زمین کچھ سنگلاخ ثابت ہوتی ہے اس لئے یہ بھی کچھ زیادہ دیر ماہنامہ نہ رہ سکا۔

اس سے قبل محکمۂ اطلاعات اور صحافیوں کے درمیان تعاون زیادہ خوشگوار اور استوار نہ تھا لیکن جب سے کوئٹہ کے ریجن میں محکمۂ اطلاعات کی اسسٹنٹ ڈائریکٹریٹ قائم کی گئی ہے یہ سلسلۂ تعلقات و تعاون بہت عمدگی کے ساتھ قائم ہو چکا ہے اور ان کی گروپ سازی وغیرہ کے اقدامات سے صحافت، ادارت و اطلاعات کے مشاغل کو باہمی تعاون اور افہام و تفہیم سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اس طرح کوئٹہ میں ڈیلی گروپ کریڈٹ اینڈ تھرفٹ کوآپریٹیو سوسائٹی کا قیام بھی ہے جسے یہاں کے محکمۂ اطلاعات کی خوشگوار کوششوں کا ثمرہ کہنا بجا ہوگا۔ ملک میں یہ غالباً پہلا اور بے نظیر تجربہ ہے چنانچہ اُس وقت کے گورنر مغربی پاکستان اور حالیہ وزیر قومی تعمیر و اطلاعات اختر حسین صاحب نے بھی اس کوشش کو بہت سراہا تھا۔ اور اس مفید اقدام کی نیویارک کے عالمی جریدے "ٹائم" تک میں تعریف کی گئی تھی۔

غرض صحافیوں کے اصلاح احوال کی یہ کوشش، پریس کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں آنے والی اصلاحات صحافت اور دیگر اقدامات کو انقلابی حکومت کی ترقی پسندانہ کوششوں کا ایک اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے اور ان ہی کی وجہ سے حکومت، عوام اور صحافت کے سہ گونہ تعاون سے ملک میں سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظم و ضبط پیدا کیا جا رہا ہے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انقلابی حکومت کے دور میں تمام ملک کی طرح کوئٹہ ریجن میں بھی ایک نہایت مہتم بالشان زرّیں دور کا آغاز ہو رہا ہے اور صدرِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی تشریف آوری یہاں کی فضا پر ہر اعتبار سے سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی ہے اور ہم صحافت ہی نہیں، ہر میدانِ زندگی کے بارہ میں انتہائی اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ:

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

زیرِ تعمیر: — بقیہ صفحہ ۲۹

ائے کوئی" اس نے رقت آمیز لہجے میں چوکیدار سے کہا اور پھر
یک لمحہ نہیں رُکا اور اس کے منہ سے ہمدردی کے دو بول سُننے
یری تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہوٹل کے علاقے سے باہر نکل گیا اور
یر کوئی میگزین فروخت کئے چلتا رہا اور چلتے چلتے جب وہ ایک اور
یرِ تعمیر ہوٹل کے سامنے سے گذر رہا تھا تو اس کے پاؤں خود بخود رک
لئے۔ اس ہوٹل کی بھی اس نے بہت دھوم سُنی تھی مگر اتنی نہیں جتنی
ں ہوٹل کی جسے وہ کھو چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر کھڑا ہو کر ہوٹل کی
یوارں اور چھتوں کے ساتھ چپکے ہوئے مزدوروں کو دیکھتا رہا۔
پر اس نے سوچا کہ اگر یہاں بھی ٹھکانہ بن جائے تو زندگی سنبھل سکتی
ہے۔ اور اسی زندگی کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لئے وہ آگے
بڑھا اور ہوٹل کے پھاٹک کا تفصیلی نگاہ سے جائزہ لیا لیکن اسے
ظاہر سیڑھیوں کے اندر یا باہر کسی بک اسٹال کے بننے کے کوئی آثار
ظر نہیں آئے۔ وہ کسی حد تک اس کی بناوٹ سے مطمئن ہو گیا۔ پھر
س کی نگاہ چوکیدار پر پڑی جو قریب ہی کچھ فاصلے پر کھڑا تھا وہ دھیرے
دھیرے اس کے قریب چلا گیا، اور مسکین سی صورت بنا کے پوچھا۔

"ارے بھئی لالہ یہ ہوٹل کب بنے گا؟"

"اس میں ابھی چھ سات مہینے لگے گا"۔ چوکیدار سیدھا سادا
آدمی تھا جس نے بغیر کسی حیل و حجت کے جواب دے دیا۔

"جب یہ بن جائے گا تو ہم یہاں اخبار رسالے بیچے گا لالہ" وہ
بغیر کسی تمہید کے حرفِ مطلب پہ آ گیا۔ "تم یہاں کسی اور چھوکرے
کو نہ آنے دیجیو۔ میں آدھا کمیشن تمہیں دوں گا۔ منظور؟"

"ایک دم منظور" چوکیدار نے مسرت آمیز لہجے میں کہا "تم
چھوکرا لوتا ہے ہم یہاں چڑی کو پر نہیں مارنے دے گا"۔ اور اس کا
مرجھایا ہوا چہرہ یکلخت کھل اٹھا اور کچھ دیر پہلے مایوسی اور ناامیدی
کے جو غبار اس پر چھا گئے تھے جیسے ایک جنبش سے چھٹ گئے۔

"تو آؤ پھر لالہ چاء پئیں۔ اس شہر میں چائے کے علاوہ
رکھا ہی کیا ہے"۔ اس نے چوکیدار کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور دونوں
چائے خانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس کا ایک اور قلعہ بننا شروع ہو چکا تھا!

پاکستانی ادب کی تشکیل: — بقیہ صفحہ ۱۷

سے پاکستانی ادب کی کھوج لگانے لگیں تو بات مقصدی ادب سے
ل کر مقصدی ادب پر ہی جا کر رکے گی۔ اگر ہم اپنے موجودہ ادبی اثاثہ کو جانچیں
یں تو اس کے لئے ہمیں مختلف عنوانات تراشنے پڑیں گے اور یہ سب کچھ
ے ملکی حالات کے باعث ہے جو ایک طویل عرصہ تک منضبط اور مرتب
ہو سکے۔ اگر ہم بات کو یہیں ختم کرنا چاہیں تو ہمیں کہنا چاہیئے کہ کسی ملک
تہذیبی، تمدنی، اور ثقافتی اقدار کو انفرادیت اور تشخص کے لئے جن مراحل
گزرنا پڑتا ہے ہم ابھی بہت دور ہیں۔ جوں جوں ہمارا قومی شعور متشخص اور
ہوتا جائے گا پاکستانیت کی تشکیل و تکمیل ہوتی جائے گی اور لامحالہ
سے ادب میں بھی اس کی جھلک اُبھرتی گی۔

اس بحث کا ایک اور پہلو بھی ہے جس پر ابتدائی سطور میں اظہار
کیا گیا ہے کہ ادب اور پھر عظیم ادب آفاق پر محیط ہے۔ وہ کائنات
کی روح اور انسانی محسوسات کا نمائندہ ہے۔ اُسے ملکوں اور قوموں
کے دائروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور ادب اگر ادب ہے تو جہاں
کہیں بھی ہے اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہے۔ شیکسپیئر کا ادب پہلے انسانی
ہے پھر انگریزی اور اس کی عظمت اس کی فنی ہمہ گیری اور تاثر کی گہرائی
دونوں میں مضمر ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل میں اگر پاکستان
نے کسی شیکسپیئر، کسی گورکی، کسی برنارڈ شا کو جنم دیا تو اس کا ادب پہلے
انسانی ہوگا پھر اُسے کوئی دوسرا نام دیا جا سکے گا۔

(اس سلسلۂ گفتگو کو ایک حد تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس لئے
کوشش کیجیے کہ بحث اہم ترین نکات پر مشتمل ہوتے ہوئے نہایت پُر مغز، مدلل اور
مختصر ہو۔ اس کی سطح نہایت بلند ہو۔ اسی لئے "تنقیحات برائے بحث" شمارہ اکتوبر
میں بحث کے اہم نکات اور مرکز و محور کو متعین کر دیا گیا ہے۔ مدیر)

پنجابی ادب

مولانا محمد سرور

اس کتاب میں سابق پنجاب کی سرزمین کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے بعد یہاں کی ترقی یافتہ زبان، اس کے ادب و انشاء اس کی عہد بہ عہد نشو و نما اور لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قدیم شعراء و ادباء کے کلام کے نمونے اور تراجم بھی پیش کئے گئے ہیں جن سے پنجابی ادب کے شعری سرمایہ کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔

ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ قیمت صرف بارہ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

"رائٹرز گلڈ" کے دس نئے ادبی انعامات

"رائٹرز گلڈ" (انجمن مصنفین پاکستان) نے حال ہی میں حسب ذیل ادبی انعامات کا اعلان کیا ہے:

مختصر افسانہ، شعر، ایک ایکٹ ڈرامہ، تنقیدی مقالہ اور مزاح (نظم و نثر) کی بہترین تخلیق پر اردو اور بنگالی کے لئے ایک ایک ہزار روپے کے دس انعامات —!

انہیں "انعامات سالگرہ انجمن مصنفین" کہا جائے گا۔ اور ہر سال انجمن کی تقریب سالگرہ، ۳۱ جنوری کو ان کا اعلان ہوا کرے گا۔

جن تخلیقات کو اس دفعہ زیر غور لایا جائے گا اس کے لئے مدت دسمبر ۱۹۶۰ء سے نومبر ۱۹۶۱ء تک رکھی گئی ہے۔ اور انعامات کا پہلا اعلان ۳۱ جنوری ۱۹۶۲ء کو کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں قواعد زیر اجراء ہیں۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے سلسلے میں عنقریب ایک اعلان کیا جائے گا۔

قومی انعامی بونڈ میں امید اور اطمینان کے ساتھ روپیہ لگائیے

آپ جب چاہیں اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں

عظیم الشان
اور پُرشکوہ
ZEALPAK

عمدہ صفائی کے لئے
آپ کے گھر میں وِم ضروری ہے!
"وِم" ہر قسم کی گھریلو صفائی کیلئے نہایت پُر اثر چیز ہے۔ چاہے کھانے پکانے کے
برتن ہوں یا شیشے اور تام چینی کا سامان، چاہے فرش ہو یا بیسن "وِم" سب کیلئے یکساں
کارآمد ہے۔ "وِم" سے اپنا گھر آئینہ کی طرح صاف رکھئے۔ بہترین نتائج کے لئے "وِم" کو
گیلے کپڑے کے ساتھ استعمال کیجئے یا ڈبہ ہی سے اسے گیلی سطح پر چھڑک کر مل دیجئے
تھوڑی دیر بعد اس سطح کو پانی سے دھو دیجئے اور خشک ہونے دیجئے۔
smooth cleaning ★ for
VIM
★ for
لیور برادرس کی عمدہ مصنوعات میں سے ایک
V.4-193UD

اب تو میرے

"دیوار پر تصویریں نہ بناؤ"

آج سے ہزاروں سال پہلے کی بات ہے کہ انسان غاروں میں رہتا تھا اور غار ہی کی کھُردُری دیواروں پر تصویریں بنایا کرتا تھا۔ پھر جوں جوں اُس کا ذہن ترقی کرتا گیا توں توں غاروں کی دیواریں مٹی کی تختیوں چرمی صفحوں اور کاغذ کے تختوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔

گذشتہ سو سال میں انسان نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں ان میں تیل اور تیل کی مصنوعات کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے چنانچہ آج نہ صرف کا غذ اور روشنائی کی صنعتوں میں تیل کا استعمال عام ہے بلکہ ہم تیل کے بغیر ان صنعتوں کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔

برما شیل کا آپکی زندگی سے گہرا تعلق ہے